سالنامہ
پیامِ تعلیم

ماہنامہ
پیام تعلیم
نئی دہلی
شمارہ ۱
ایڈیٹر
محمد حسین حسان ندوی
ـہ میٹڈ
جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵
شاخ
اردو بازار
دہلی ۶
پرنس بلڈنگ
بمبئی ۳ (بی۔آر)
سالانہ چندہ چھ روپے قیمت سالنامہ دو روپے

نیا سال مُبارک
اس نئے سال کی خوشی میں سالنامے کا حسین تحفہ قبول کیجیے۔ مگر بس اتنا ہی نہیں، ایک بات اور
—— یہ بات آپ کو بھی یقیناً اچھی لگے گی —— پوچھیے کیا؟
دیکھیے اگر آپ نیچے دی ہوئی کتابوں میں سے پانچ یا اس سے زیادہ روپوں کی کتابیں منگوائیں
گے تو مکتبہ آپ سے محصول ڈاک نہ لے گا اور آپ کو کم سے کم سوا روپے کی بچت ہو جائے گی۔
تو بس اس رعایت سے فایدہ اٹھائیے۔ اپنی پسند کی کتابوں کے نام اور ان کی قیمت منی آرڈر سے
بھیج دیجیے —— یہ رعایت صرف ان کو مل سکے گی جن کے منی آرڈر دفتر میں ۱۵ فروری سے پہلے وصول ہو جائیں گے
ہاں ایک بات اور یاد رکھیے۔ فرمائش بھیجتے وقت خط یا منی آرڈر فارم پر یہ حرف ضرور لکھیے
س۔ پ۔ ت
بھولیے گا نہیں!
مذہب
رسول پاک 1/50
سرکارِ دو عالم 2/00
پیارے رسول 0/45
چار یار 0/30
مسلمان بیبیاں 0/05
کہانیاں
الو غاں کی۔ 2/50
پاک کہانیاں (دو حصے) 2/10
ترکوں کی کہانیاں 0/55
چقماق کی ڈبیا 0/40
چاملی بی 0/31
اس سے کیا کرنہ جانا 0/37
چپاوت کا آدم خور شیر 0/35
خربوزہ شہزادے کا سر بن گیا 0/30
مزے دار پہیلیاں 0/65
سفید ہاتھی 0/25
شاہی موچی 0/25
گلنار بیگم 0/31
گھڑی ساز کی بیٹی 0/25
حلیم 0/37
ایک ٹانگ کا بادشاہ 0/30
انوکھی ملاقات 0/35
بھوغالی 1/00
گلابو چوہیا 0/45
ظالم کسان 0/35
ناول
کوے واوا 1/75
تین اناڑی 1/40
جن حسن عبدالرحمٰن (۲ حصے) 4/00
ڈاکو کی گرفتاری 0/50
خیالی پلاؤ 1/75
معلومات
انوکھا عجایب خانہ (۲ حصے) 1/80
بجلی کی کہانی 0/50
مقناطیس کی کہانی 0/44
قدرت کے کرشمے 0/42
چٹانوں کی کہانی 1/75
ہماری پارلیمنٹ 1/50
ٹیگور 1/25
دادا نہرو 1/50
سمندر کے نیچے 2/00
ڈرامے
پریم کی جیت 0/37
شمو کی عید 0/50
کیمپ فائر کی نقلیں (۲ حصے) 1/50
آؤ ڈراما کریں 0/60
اپنی فرمائش اور منی آرڈر اس پتے پر بھیجیے
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

فہرست

سے

اپنے پیامیوں کی خدمت میں

ہم عید کی مبارک باد پیش کرتے ہیں

نئے سال (۱۹۶۸ء) کی مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

اور نئے سال کے تحفے میں یہ سالنامہ پیش کرتے ہیں۔

خدا کرے یہ تحفہ آپ کو پسند آئے!

اسے بہتر سے بہتر بنانے میں ہم نے اور ہمارے ساتھیوں نے اپنی سی کوشش کی ہے۔ آپ بتائیے کہ ہماری یہ کوششیں کتنی کامیاب ہیں۔

اس پرچے میں آپ کو کہانیاں ملیں گی، ڈرامے ملیں گے، تاریخی اور معلوماتی مضمون ملیں گے، مزاحیہ مضمون ملیں گے، نظمیں ملیں گی۔ شاید ایک نئی بات بھی آپ محسوس کریں۔ اس مرتبہ دیس کی اور دیس سے باہر کی زبانوں کی لوک کہانیاں خاص طور پر شائع کی جارہی ہیں۔ دوسری زبانوں کی بچوں کی کہانیوں کے ترجمے شایع کیے جارہے ہیں۔

آپ کو ایک اور تبدیلی نظر آئے گی بہت خوش گوار تبدیلی۔ نئے سال کی خوشی میں اس کا سائز بڑا کر دیا گیا ہے۔ سائز بڑا کرنے سے رسالے میں مضمون بھی زیادہ آئیں گے اور یہ آپ کی نظروں میں زیادہ جنچے گا بھی۔

مضمون نگاروں کی فہرست میں آپ کچھ نئے نئے نام بھی پائیے گا۔ جناب احمد اللہ قادری، جناب سہیل عظیم آبادی، جناب رام لال، جناب اقبال متین، جناب دینا ناتھ، جناب ستیش بترا، جناب مرزا شکور بیگ وغیرہ۔

قریب قریب سبھی آپ کی اردو زبان کے نامی گرامی ادیب ہیں ہمیں یقین ہے کہ یہ سب آیندہ بھی ہماری سرپرستی فرماتے رہیں گے۔

۱۹۴۷ء سے پہلے حیدرآباد کے قریب قریب سبھی مدرسوں میں آپ کا پیام تعلیم سرکاری طور پر خریدا جاتا تھا۔ یہ تو آپ جانیے اب بہت دور کی بات ہوگئی۔ پر اب اس کی جگہ ادبی سرپرستی نے لے لی ہے۔ خود اس سالنامے کی محفل میں حیدرآباد کے لکھنے والوں نے سب سے زیادہ حصہ لیا ہے۔ آپ کو یقین نہیں آتا تو ہم نام گنائے دیتے ہیں۔ دیکھیے: سعادت نظیر صاحب، اکبرالدین صاحب، احمد اللہ قادری صاحب، غلام ربانی صاحب، غلام یزدانی صاحب، اقبال متین صاحب، اظہر افسر صاحب، قیصر سرمست صاحب، حکیم یوسف حسین صاحب، مرزا شکور بیگ صاحب اور وقار خلیل صاحب

اور ہاں ہمارے یوسف ناظم صاحب بھی تو حیدرآبادی ہیں اور عادل جعفری صاحب؟

جناب اسد اللہ قادری (ایم۔ایل۔سی) اور اقبال متین ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے ۱۹۴۴ء سے پہلے بھی پیام تعلیم کو کسی نہ کسی حیثیت سے نوازا تھا اور وقار خلیل صاحب بھی۔ ان سب بزرگوں اور ساتھیوں کو ایک جگہ جمع کرنے میں وقار صاحب سے ہمیں بڑی مدد ملی ہے اور ہمیں یقین ہے کہ ان کی توجہ سے حیدرآباد کے نئے نئے ادیبوں کی سرپرستی حاصل ہوگی۔

پیام تعلیم کے سرپرستوں میں بعض بزرگ تو بڑی شفقت سے کام لیتے ہیں کم سے کم سالنامے کے لیے ایک نہ ایک مضمون ضرور بھیج دیتے ہیں۔ ہمارے محترم ساتھی جناب ابراہیم صاحب انھی لوگوں میں ہیں۔ ان کا مضمون "جنتل اسکول" پڑھیے۔ یہ کہانی بھی ہے ایک حد تک تاریخ بھی اور دلی کی نکھری ستھری زبان کا ایک نمونہ بھی۔

ان کے علاوہ محترم غلام ربانی صاحب، غلام ربانی صاحب، البدر الدین صاحب، صدیقی صاحب، حکیم یوسف صاحب، مولانا عبد السلام صاحب، سال کے سال ضرور سرپرستی فرماتے ہیں اور ایک طرح سے ہمیں شاباش بھی۔ ان کا ڈراما ایک مدت سے ہمارے پاس محفوظ تھا۔ اسے آپ سالنامے میں پڑھیے۔

خیال تھا کہ سالنامے کی ضخامت زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سو صفحے رکھی جائے گی اتنی ضخامت چھوٹے سائز کے پیام تعلیم کے دو سو صفحوں کے برابر ہوتی مگر بڑھتے بڑھتے نوبت ۱۸۴ صفحوں تک پہنچ گئی۔ باوجود اس کے ہمارے مستقل عنوانوں کے لیے گنجائش پھر بھی نہ نکل سکی۔ ہمیں اس کا افسوس ہے۔ انشاء اللہ اس کمی

کی کسر اگلے پرچے میں پوری کر دی جائے گی۔

پچھلے پرچے میں ایک مسلسل کہانی "اقبال نصیب" کے عنوان سے چھپی تھی۔ اس کا صحیح نام "اقبال مند" ہے۔ غلطی سے ایسا ہو گیا۔ اقبال نصیب (شاعر) اور مسیح الدین صاحب دونوں معذرت قبول فرمائیں۔

۱۹۴۷ء سے پہلے پیام تعلیم کی طرف سے ایک انجمن قائم کی گئی تھی پیام برادری کے نام سے۔ یہ انجمن اتنی مقبول ہوئی کہ تھوڑے ہی دنوں میں شہروں شہروں اس کی شاخیں قائم ہو گئیں ۱۹۴۷ء اس کے لیے بھی ملک الموت بن کر آیا۔

پرانے پیامیوں کی خواہش تھی کہ اسے پھر سے قائم کیا جائے۔ ہمارے ساتھی شاہد علی خاں صاحب کو یہ تجویز خاص طور سے پسند ہے اور وہی اسے دوبارہ قائم کرنے میں پیش پیش ہیں طے کیا گیا ہے اس وقت صرف دلی میں برادری قائم کی جائے اور تجربہ کامیاب ہو تو اس کی شاخیں پورے ہندوستان میں پھیلا دی جائیں۔

مارچ ۱۹۶۸ء میں سید احمد وصی صاحب کی ایک نظم شائع ہوئی تھی "دشمن کا گیت" یہ نظم گورنمنٹ بیسک پرائمری اسکول اجمیر کو اتنی پسند آئی کہ اس نے اسے اپنا ترانہ بنا لیا۔ سنا ہے راجستھان ریڈیو نے بھی اسے ریکارڈ کرنے کی فرمائش کی۔ نظم کی اس مقبولیت پر ہم احمد وصی صاحب کو مبارک باد دیتے ہیں۔

ذاکر نمبر کے ٹائٹل پر "پیام تعلیم" سلک اسکرین سے چھاپا گیا تھا۔ پیامیوں کو یہ جدت بہت پسند آئی۔ اس سے جناب اخضر صاحب اور جاوید سلمہٗ کی ہمت بڑھی اور اس مرتبہ وہ

سالنامے کا پورا ٹائیٹل سلک اسکرین پر چھاپ رہے ہیں۔ امید ہے کہ یہ ٹائیٹل آپ کو بہت پسند آئے گا۔

پیام تعلیم کے خریدار بڑھانے میں ہمارے پرانے ساتھی اور مخلص دوست برابر کوشش کرتے رہتے ہیں خصوصاً محمد حسین صاحب حیدرآبادی، مرزا عزیز بیگ اور آج کل بریلی کے میاں شعیب شمسی وغیرہ۔

ہم کئی مہینے سے پیامیوں سے پیام تعلیم کے خریدار بنانے کی درخواست کر رہے ہیں۔ کم سے کم پانچ خریدار بنانے پر انعام کا اعلان بھی ہو چکا ہے۔ خوشی کی بات ہے ہمارے ان ساتھیوں نے ہماری اس درخواست پر کان دھرا ہے۔ جناب اے انجم زماں کاظمی صاحب نے دو اور جناب عرفان شبلی صاحب نے چار خریدار مرحمت فرمائے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے دوسرے ساتھی بھی جلد اس طرف توجہ فرمائیں گے۔

ایک عرصے سے پیام تعلیم میں ننھے پیامیوں کی تصویریں چھپ رہی ہیں۔ دن بدن ان کی تعداد بڑھتی ہی جاتی ہے۔ پیامیوں نے یہ سلسلہ بہت پسند کیا ہے۔ ہماری خواہش بھی یہی ہے کہ یہ سلسلہ قائم رہے مگر پیام تعلیم پر اس کا بوجھ بہت پڑ رہا ہے۔ آج کل چھوٹے سے چھوٹے سائز کا بلاک کم سے کم پانچ روپے میں بنتا ہے۔ اس لیے مجبوراً یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ آیندہ جو پیامی تصویر کے ساتھ پانچ روپے بھیجیں گے صرف انھی کی تصویر چھپ سکے گی۔ اس میں بھی پیام تعلیم کے خریداروں کو بہرحال ترجیح دی جائے گی۔

قلمی دوستی کے سلسلے میں بھی صرف انھی پیامیوں کے نام شائع ہوں گے جو رسالے کے مستقل خریدار ہوں گے۔ عمر کا خیال خاص طور سے رکھا جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ عمر سولہ سال ہونا چاہیے۔

ذاکر نمبر پر رایوں کے سلسلے میں ہم نے انعامی مقابلے کا اعلان کیا تھا۔ زور اس بات پر دیا تھا کہ رائیں جچی تلی ہوں۔ جوش میں آکر نہیں ہوش میں آکر دی جائیں۔ بہت سے پیامیوں نے اپنی رائیں بھیجیں۔ یہ دیکھ کر تو بڑی خوشی ہوئی بڑا اطمینان ہوا کہ پیامیوں نے متفقہ طور پر ذاکر نمبر پسند کیا ہے لیکن ہمارے پیامیوں نے یہ رائیں زیادہ تر جوش میں آکر لکھی ہیں جچی تلی رائیں بس تھوڑی سی ہیں۔ ان میں سے مظفر احمد امام، ین کی رائے کو فیصلہ کرنے والے صاحب نے پہلے نمبر پر رکھا ہے اور یوسف کاظمی کو دوسرے نمبر پر۔

ہم نے انعام ایک ہی رکھا تھا مگر فیصلہ کرنے والے صاحب کی خواہش کے مطابق پہلے صاحب کے نام پیام تعلیم ایک سال کے لیے اور دوسرے صاحب کے نام چھ مہینے کے لیے جاری کر دیا جائے گا۔

اب ہم سالنامے کے لیے اسی طرح کے انعام کا اعلان کرتے ہیں۔ آپ اپنے سالنامے کے لیے پوری آزادی کے ساتھ رائے لکھ کر ہمیں بھیجیے۔ یہ رائے بھی بس جچی تلی ہو۔ خالی تعریف سے کام نہ چلے گا۔ یہ بھی بتائیے کہ کون کون سے مضمون پسند آئے، کیا کیا چیزیں اور ہوتیں جو سالنامے کو چار چاند لگا دیتیں۔ ٹائیٹل کے بارے میں بھی ضرور لکھیے۔

اس مرتبہ مضمونوں کی ترتیب میں تھوڑی بہت بے ترتیبی ہو گئی ہے۔ ایک تو ہمارے لبرٹی آرٹ پریس کا مطالبہ تھا کہ کاپیاں جلد بھیجی جائیں دوسرے بہت سے اچھے اچھے مضمون دیر میں ملے۔ ہمارے محترم شاعر نیّر صاحب کی نظم تو اس وقت ملی جب آخری کاپیاں پریس میں جا رہی تھیں۔ ہمیں امید ہے کہ مضمون نگار اور شاعر حضرات مضامین کے آگے پیچھے ہونے کا خیال نہ کریں گے۔

جناب اختر بریلوی

رُباعیات

نیا سال

دشمن کو بھی تم دوست بنا کر دیکھو
اب قلب پہ پیار سے بڑھا کر دیکھو
[illegible]
اسے بھی نیا سال منا کر دیکھو

کیوں اپنی مروت کی نمائش کر دو
کیوں لئے خیالات کو بدل دو
جو کام کہ تم پچھلے برس کر نہ سکے
اس کام کی اس سال پہ تکمیل کرو

ہر سمت میں ترا نام جو بالا ہو جائے
ایسا اگر ہو جائے تو ایسا ہو جائے
کردار بھی اعلیٰ ہو تو تعلیم کے ساتھ
سچ کہتا ہوں سونے پہ سہاگا ہو جائے

استاد کی، ماں باپ کی تکریم کرو
تعظیم کے قابل ہیں یہ تعظیم کرو
رکھو گے بزرگوں کی بزرگی کا خیال
اس سال کو اس شرط پہ تسلیم کرو

عید

سنتے ہیں کہ اس سال بھی عید آئی ہے
عید آئی ہے پیغام طرب لائی ہے
ہر سو میں ہے خوشیوں کے ترانوں کی کھنک
ماحول میں بجتی ہوئی شہنائی ہے

ہر ذرے کے پہلو میں توانائی ہے
ہر سمت مسرت کی گھٹا چھائی ہے
بچے بھی ہیں خوش پیر و جواں بھی خوش ہیں
عید آئی ہے، عید آئی ہے، عید آئی ہے

دل عیش سے معمور جہاں ہوتا ہے
اس کو کوئی اندازہ کہاں ہوتا ہے
تاروں کے چراغوں کی بڑھی لَو اتنی
ذروں پہ ستاروں کا گماں ہوتا ہے

طوفان رسیدوں پہ بھی کچھ غور کرو
اس سن[1] کے شہیدوں پہ بھی کچھ غور کرو
جن بچوں کے اس عید میں ماں باپ چھٹے
اُن بچوں کی عیدوں پہ بھی کچھ غور کرو

[1] سن ہجری مراد ہے۔

جناب سید ابو نسیم فریدآبادی

۱۹۲۰ء میں تحریکِ ترکِ موالات کا بڑا زور تھا۔
یہ ذکر اسی زمانے کا ہے مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی نے علی گڑھ میں ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ وہاں کے طلبا کو کالج چھوڑنے پر آمادہ کر رہے تھے۔

انہی دنوں مسٹر آصف علی بیرسٹر نے ہمارے اسکول (احمدیہ مدرسہ) کو تاکا اور ایک دن تانگے میں بیٹھ کر والنٹیرز کو لے کر چلے۔ خدا معلوم ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب (مولوی فضل الدین) کو کیسے سن گن مل گئی کہ ادھر ان کا تانگا اسکول کے بیرونی دروازے کے قریب پہنچا ادھر انھوں نے اسکول کے تمام دروازے بند کروا کر قفل لگوا دیے۔

"اے وہ آ گئے!" کا نعرہ اوپر کی منزل کی جماعتوں میں گونجا۔ ڈیسک کو ڈھول سمجھ کر کچھ لڑکوں نے تاشے بجائے۔ دو تین منٹ کے اندر تمام جماعتوں میں غدر سا مچ گیا۔ نیچے کی جماعت والے اوپر آتے اور اوپر والے اپنے کمرے کی چھت پر جا پہنچے۔ عجیب سماں تھا۔ کوئی نیچے سے دیکھتا تو سوچتا کہ اتنی بڑی فوج چار چھ کے مقابل میں قلعہ بند کیوں ہو گئی ہے؟ یہ محصور فوج باہر نکلنے کو بے چین تھی مگر راستے سب بند تھے۔

نیچے ایک والنٹیر بگل بجا رہا تھا۔ اوپر سے قلعہ بند ہوا اور خدا معلوم کیا کچھ کہہ رہے تھے۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔

اس وقت بھائی اتو (عرف اتو تو نگے) "سردارِ اعظم" نہیں ہوئے تھے۔ ان کو آٹھویں جماعت میں داخل ہوئے تین سال ہی ہوئے تھے ----- وہ ہر جماعت میں اسی رفتار سے رک رک کر آگے چلتے تھے۔۔۔ مگر ان میں سردارِ اعظم بننے کی صلاحیت چھٹی جماعت سے تھی۔ اس حصار کو توڑنے کی ایک تدبیر انہوں نے سوچی اور فوراً بیان فرما دی۔ وہ یہ تدبیر تھی کہ برجوں کے کٹہرے میں رسیاں باندھ کر ساری فوج نیچے اترے۔

"رسیاں کہاں سے آئیں؟"

"بورڈروں کے پلنگ کی ادوان نکال لاؤ!"

ہمارا ہائی اسکول گڑھیا کی وضع کا تھا (شاید اب بھی ہے) شمالاً جنوباً فوج کی بیرکیں تھیں جن میں سا ٹھ ستر بورڈر مقیم تھے۔ مغرب کی طرف مسجد، ایک بغل میں دفتر اور ہیڈ ماسٹر صاحب کا کمرہ۔ دوسری بغل میں دالان جہاں چھٹی جماعت گرمیوں میں دھوپ سینکتی اور سردیوں میں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں کھاتی۔

منٹوں میں پلنگوں کی رسیاں اور ادوان

لنگر ملایا۔ اس بار بھی میں نے انھیں دھوبی پاٹ مارا تیسری بار وہ بولے "اب کے سہی" میں نے کہا آجاؤ۔ اس مرتبہ وہ پٹ گرے بارے ان کو اتنا گرگڑا کہ دوسرے دوساتھیوں نے کہا

"اُٹھ کر ہو جائے"

الغرض دس بارہ مرتبہ ہاتھ ملے، "یا علی" کا روایتی نعرہ گونجا اور چچا نتوں چاروں خانے چت نظر آئے۔ دس سال کا یہ بیر پورا ہو گیا اور ہم "گہرے ترین" دوست بن گئے۔

نیشنل اسکول میں پڑھائی تو وہی ہوتی تھی جو ہم پڑھتے آئے تھے البتہ ایک نئی بات یہاں دیکھی۔ ہفتے کی آدھے دن کی پڑھائی کے بعد تقریروں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا۔ اس گھنٹے لڑکے استاد صدر بن جاتے تھے اور دو چار لڑکے مقرر، باقی "حضرات" ہوتے تھے۔

یہ خاصا سنجیدہ اسکول تھا، ساری دلی کے اسکولوں سے تھوڑے تھوڑے لڑکے یہاں آئے تھے بس تو اور ان کی پارٹی کا کوئی جاں باز آ نکلا ہیڈ ماسٹر فضل الدین صاحب نے گھر گھر چکر لگا کر لڑکوں کے والدین کو سمجھایا کہ اپنے بچوں کو سنبھالو ورنہ۔۔۔۔۔

میرا اور چچا نتوں کا جوش بمشکل چھ مہینے قائم رہا بات یہ تھی کہ یہاں ہمارے عربک اسکول کی سی کوئی بات نہ تھی کہاں وہ بادشاہی بارعب عمارت، کہاں یہ تنگ کمروں اور ذرا سے صحن کا مکان۔ کہاں وہ صحرائے اعظم سے ذرا ہی چھوٹا کھیل کا میدان اور کہاں یہ دریبے کی تنگ گلیاں۔۔۔۔ یہاں ہم ہاکی کھیلتے تو دکان دار بڑبڑاتے۔ فٹ بال میسر ہی نہ آئی۔ کرکٹ کا تو ذکر ہی کیا۔

پھر سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ اپنے پرانے ساتھی چھوٹ گئے تھے۔ بورڈنگ میں چار چھ پنچھی مزید آئے اور ہمارا شور و غل بہت بڑھا تو مکان دار نے مکان خالی کروانے کا نوٹس دیا۔ بھلا اس گھریلو قسم کے مکان کے کواڑ ہماری "پیش بازی" کی کیا تاب لاتے۔ مہینہ بھر کے اندر چوکھٹیں ہی چوکھٹیں رہ گئیں۔ کواڑ کے "ڈبوں" کا دلیا بن گیا۔ اس مکان کے چھجے کچھ نیچے نیچے تھے۔ ہم اس پر پتنگ کر ورزش کے گھنٹے کی کسر پوری کرنے لگے تو چھجے کی سلیں کھسکنے لگیں۔ کٹرہ دینا بیگ چھوٹی سی گلی تھی۔ اگرچہ دھوبی بے شمار بستے تھے گلی کے بچوں کا نکلنا تو بالکل بند نہ ہوا مگر دھوبیوں کی لادی جب ہمارے سامنے سے گزرتی یا بیل کی دُم اتنی مروڑی جاتی کہ وہ لادی پھینک کر جان بچاتا، یا دھوبی کا مُنا اڑانے پر ایسے تڑاخے دار چانٹے کھاتا کہ کلّا سہلاتا گھر واپس جاتا اور ایک دو منٹ بعد اس کی ماں گالیوں سے زیادہ کوسنے اور کوسنوں سے زیادہ فریاد کرتی آتی مگر یہاں اتنے میں میدان صاف ہوتا اور جھینک کر چلی جاتی اور دوسرے دن زیادہ بے سُری آواز سے گاتی آتی۔

القصہ ہم کو یہاں سے اٹھا کر پہاڑی بھوجلہ پہ پھینکا گیا۔ یہاں بزرگ کا مکان تھا جو ہیڈ ماسٹر فضل الدین صاحب سے پہلے عربک اسکول کے ہیڈ ماسٹر رہ چکے تھے۔

نیشنل اسکول چند سال تک گھٹنیوں چلا۔ جب جامعہ دلی میں آئی تو یہ قطرہ (نیشنل اسکول) سمندر میں مل گیا۔ اسکول کا فرنیچر، کتابیں اور کیا اور کیا سب چیزیں جامعہ کے حوالے کر دی گئیں۔

اے خدا

جناب خورشید احمد جامی

اے خدا تجھ سے اور کیا مانگوں
بس یہی رات دن دعا مانگوں

زندگی دے بہار دے مجھ کو
آدمیت کا پیار دے مجھ کو

جوش دے دے وطن کی خدمت کا
نور سینے میں ہو محبت کا

بات دل میں مری اُتر جائے
زندگانی وطن کے کام آئے

آج چھوٹا ہوں کل بڑا ہوں گا
آرزو دیس کی نباہوں گا

گیت پیارے وطن کے گاؤں گا
ہر بُرائی کو میں مٹاؤں گا

فضل تیرا جو اے خدا ہو گا
جب مجھے تیرا آسرا ہو گا

زندگی کا وقار لاؤں گا
اس چمن میں بہار لاؤں گا

جو پیدا کرے وہ ماں نہیں

(ایک گجراتی کہانی)

بابو بھائی جوشی

ترجمہ : حمید عثمانی
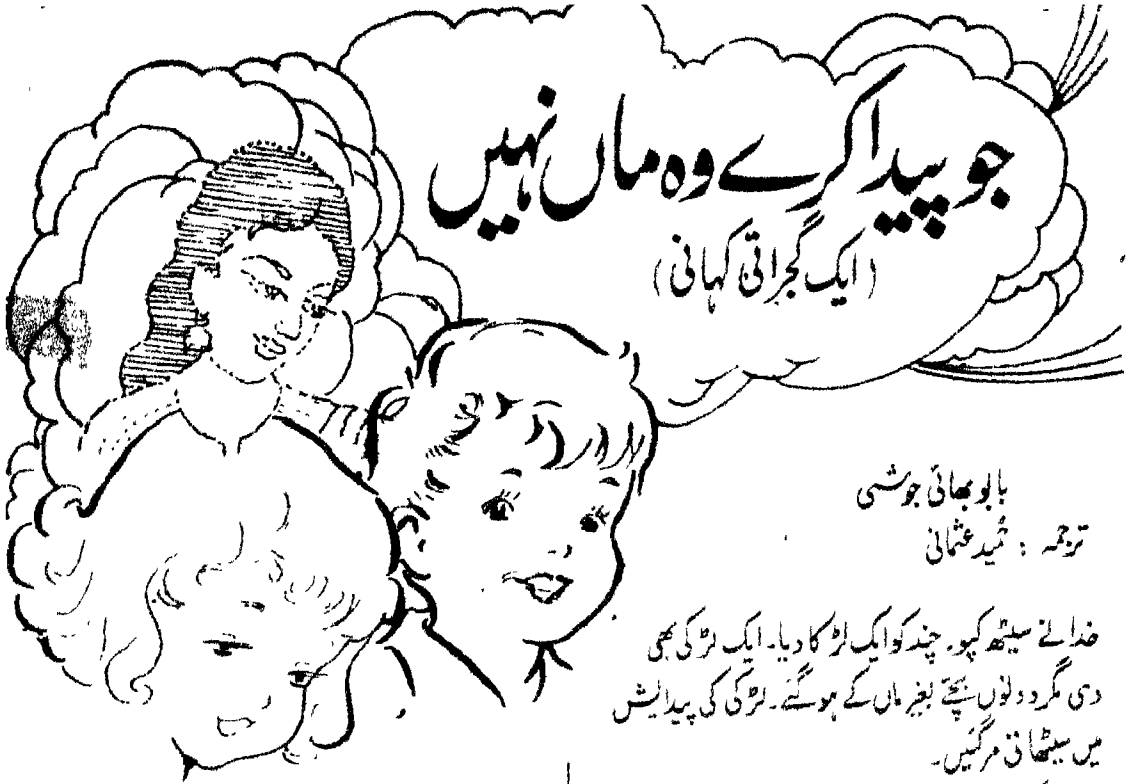
خدا نے سیٹھ کپور چند کو ایک لڑکا دیا۔ ایک لڑکی بھی دی مگر دونوں بچے بغیر ماں کے ہو گئے۔ لڑکی کی پیدائش میں سیٹھانی مرگئیں۔

سیٹھ کے سر پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ غم کے بادل چھا گئے بن ماں کے بچوں کی پرورش کیسے کریں۔ سیٹھ جی کو اس بات کی بڑی فکر تھی۔

ان کے کاروبار پر ان باتوں کا بہت اثر پڑا۔ وہ خود نہیں تیار تھے مگر ساتھ والوں کے کہنے سننے سے انھوں نے دوسری شادی کر لی۔

نئی سیٹھانی نے جب گھر میں قدم رکھا تو سیٹھ نے بھرائی ہوئی آواز میں ان سے کہا "سیٹھانی، بن ماں کے بچوں کو ماں مل جائے اس لیے ہم نے دوسری شادی کی ہے۔ یہ بیچارے کس کی گود میں اچھلیں کودیں یہ کمی پوری کرنا اب تمہارا فرض ہے۔" بات کرتے کرتے سیٹھ کی آنکھوں میں گرم گرم آنسو بھر آئے۔

سیٹھانی بولیں "بہت اچھا سیٹھ جی۔ ان باتوں کے لیے آپ کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ میں مرنے والی کی جگہ آتی ہوں تو ماں کی جگہ اب میں ہی ہوں۔ آپ کسی بات کی فکر نہ کریں۔"

سیٹھانی کی اطمینان دلانے والی باتوں سے سیٹھ کا دل بہت خوش ہوا۔

پورا گھر خوشی سے بھر گیا۔

سیٹھ جی اپنے کاروبار میں لگ گئے۔

بچے ماں کی گرم گرم گود میں چھپ گئے۔

لڑکے کا نام رامو ہے۔

لڑکی کا نام شنتو ہے۔

رامو دس برس کا ہو گیا۔

شنتو آٹھ برس کی ہو گئی۔

پر خدا کو کچھ اور ہی منظور ہوا۔

نئی سیٹھانی کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔

دو برس بعد ایک لڑکی پیدا ہوئی۔
شمو ان چاروں میں سب سے زیادہ پیاری اور ہوشیار ہے
تینوں بھائی بہنوں کا بہت خیال رکھتی ہے۔
سیٹھ کی زندگی بہت اطمینان سے کٹ رہی ہے۔ وہ پھولے نہیں سماتے۔ اسی طرح وقت گزرتا گیا۔

پھر سیٹھانی کا دل بدل گیا
ان کے دل میں حسد کی آگ پیدا ہو گئی
اپنے اور پرائے بچوں میں انھیں فرق محسوس ہونے لگا
شمو یہ سب سمجھتی تھی
ماں کے دل کی بات دھیرے دھیرے اس کی سمجھ میں آنے لگی تھی مگر باپ کے سامنے کبھی اس نے اپنی تکلیفوں کا ذکر تک نہیں کیا۔
اپنے بچوں کے مقابلے میں سیٹھانی رامو اور شمو کو کم پیار کرنے لگی۔
کچھ بھی ہو آخر خون تو خون ہی تھا۔
سیٹھ کو اپنے کاروبار سے فرصت ہی نہیں ملتی۔
کبھی مہینے دو مہینے میں گھر کا چکر لگا جاتے ہیں۔
دوسرے تیسرے مہینے تھکے ماندے گھر آتے [illegible] کے سامنے بس چپ ہی رہتی۔ سیٹھ کو کسی بات کا علم نہیں۔
ایک بار سیٹھ پردیس سے واپس لوٹے
نئے نئے قسم کے بڑھیا پھل لائے
پھل دے کر سیٹھ نے کہا
"سیٹھانی یہ پھل سب بچوں کو دے دینا"
سیٹھانی نے کہا "بہت اچھا"
دوسرے دن سیٹھ چلے گئے۔
سیٹھانی نے اپنے بچوں کو تو پھل دیے۔

رامو نے بہت ضد کی مگر اس کو ڈرا دھمکا کر باہر نکال دیا۔
ایک کونے میں دونوں بھائی بہن بیٹھ کر رونے لگے۔
رامو روتے روتے بولا
"بہن ماں ہمارے ساتھ ایسا برتاؤ کیوں کرتی ہے؟"
شمو نے کہا
"یہ ہماری ماں نہیں ہے۔"
"تو ہماری ماں کہاں گئی ہے؟"
"ہماری ماں خدا کے گھر گئی ہے۔"
"کب واپس آئے گی؟"
"[illegible] جب بڑے ہو جائیں گے تب واپس آئے گی۔"
رامو نے کہا "چھوٹے بھائی بہن کو پھل ملے ہم کو کیوں نہیں ملے" رامو ضد کرنے لگا۔
"[illegible]" کہہ کر شمو نے بھائی کو بہلا لیا
رات ہوئی
رامو کو پھر وہی بات یاد آئی
"بہن مجھے پھل دو"
شمو پریشان ہو گئی۔
اس کے سوا بھائی کا اور کوئی نہیں، شمو یہ بات سمجھتی تھی۔ وہ اپنے دکھ چپ چاپ برداشت کر لیتی مگر بھائی کو خوش رکھنے کی کوشش کرتی۔
پر آج رامو کو کس طرح سمجھائے۔
پھل کہاں سے لائے۔
شمو پچھواڑے کے صحن میں گئی۔
ماں نے جو چھلکے پھینکے تھے وہ چن لیے، انھیں صاف کر کے بھائی کو دے دیے۔ رامو ان کو جلدی جلدی کھانے لگا۔
پچ پچ پچ بن ماں کے بچوں کا

یہی حال ہوتا ہے۔

نرسنگھ مہتا نے سچ کہا ہے

جن لڑکوں کی ماں مری،

باپ کی الفت ساتھ گئی۔

ماں بس ماں،

باقی جنگل کی ہوا۔

خدا کسی کو بغیر باپ کا کر دے، بغیر ماں کا نہ کرے۔ ماں زندہ رہتی ہے تو چاہے بن پڑے سب دکھ جھیلتی ہے مگر بچوں پر آنچ نہیں آنے دیتی۔ پر باپ بے چارہ کیا کرے کوئی نوکری یا کاروبار کرنا پڑتا ہے اور دوسرے کام بھی اس کے سر رہتے ہیں اس لیے بچوں کی پرورش کا فرض کبھی ٹھیک سے پورا نہیں کر پاتا۔

بھائی بہن کے دکھوں کا ذکر تو پہلے ہی کسی سے نہ کرتی تھی

وقت گزرنے پر نئی ماں کی اور بھی قلعی کھلی۔

رامو اور شنو اس کو ایک آنکھ نہ بھاتے تھے۔ وہ ان دونوں کو کبھی چین سے نہ بیٹھنے دیتی تھی کوئی نہ کوئی کام کرواتی رہتی تھی۔

رامو سے یہ برداشت نہ ہو سکا۔

جن کی بات اس کے دل میں گڑ گئی تھی۔

بیر کے درخت میں جب بیر پکنے لگے تو ماں خدا کے گھر سے واپس آئے گی۔

ایک رات کی بات ہے۔

رامو صحن میں گیا۔

بیر کا تنا پکڑ کر کہنے لگا۔

بیر بھائی بیر بھائی بیر پکا دو۔ جلدی ماں آئے۔ یہ تو دوسرے

کی ماں ہے۔ کتنا لاڈ پیار کرتی ہے کس طرح گود میں لے کر کھلاتی ہے اور بھائی ہم ماں کے بغیر کیا کریں۔ بیر بھائی مہربانی کر کے جلدی کرو۔"

رامو بلبلا کر رو پڑا۔

اب رامو کا روزانہ کا کام تھا کہ جب رات ہوتی تو وہ بیر سے آ کر یہی درخواست کرتا۔ ایک رات رامو بیر سے

یہی درخواست کر رہا تھا تو بیر نے سچ مچ رامو کی درخواست سن لی اور ماں کو بھیج دیا۔

"بیٹا رامو"

"آپ کون ہیں؟"

"بیٹا میں تمہاری ماں ہوں میرے بچے تو مجھ کو روز یاد کرتا تھا لے

میں تیرے لیے کتنا اچھا کھانا لائی ہوں۔"
یہ کہہ کر اس نے رامو کو اٹھا لیا اور پیار کرنے لگی۔ پھر اچھے اچھے کھانے بھی دیے۔

"ماں کیا تم چلی جاؤ گی؟"

"ہاں بیٹا مگر ہر روز رات کو تمھیں دیکھنے آیا کروں گی۔ لیکن یہ بات کسی اور سے نہ کہنا جس دن کہہ دو گے اس دن سے میں پھر کبھی نہ آؤں گی۔"

رامو نے کہا "بہن سے بھی نہ کہوں"

"نہیں کسی سے بھی نہ کہنا"

اب ماں اور رامو روز اسی طرح ملنے لگے۔ رامو نے اب ضد بھی کرنا ختم کر دی۔ اپنی بہن کو پریشان بھی نہ کرتا۔ سمجھ دار بن گیا ہے۔ ماں ملی تو سارے دکھ بھول گیا۔

پردیس سے سیٹھ جی واپس آئے

شمو نے مجبور ہو کر باپ سے کچھ کہنا چاہا مگر نئی سیٹھانی کے بارے میں انھوں نے زیادہ سننا پسند نہیں کیا۔ شمو کا رہا سہا سہارا بھی ٹوٹ گیا

دوسرے دن سیٹھ چلے گئے۔

پچھلی سات پشتوں کی باتیں بتا ڈالتا تھا۔

سادھو کے درشن کے لیے پورا گاؤں اُمنڈ پڑا۔ کوئی اپنے بچّے کی آئندہ زندگی کے بارے میں سوالات کرتا تو کوئی مصیبتوں کو دور کرنے کی تدبیر دریافت کرتا۔

سادھو بہت عجیب تھا۔

کوئی آتا تو اس سے اس کی زندگی کے سارے واقعات بتا ڈالتا۔ کتنے بال بچّے ہیں۔ کتنی زمین جایداد ہے۔ کوئی بات اس سے چھپی نہ رہتی۔

اس شہر کے لوگوں کو بہت اعتقاد ہو گیا۔

نئی سیٹھانی نے سوچا کیوں نہ بچّوں کے بارے میں پوچھ کر دیکھوں۔

سیٹھانی سادھو کے پاس گئی

سیٹھانی جی کی باری سب سے آخر میں آئی۔

سیٹھانی کو دیکھتے ہی سادھو یوں اُٹھا۔

"بھیک بھی دو۔ ہو جاؤ نہ رہتی۔"

کافی دن گزر گئے۔ سیٹھ بہت دور کسی ملک میں جا پہنچے۔

شہر میں ایک سادھو آیا۔

سادھو میں بہت سے کمالات تھے۔

سیٹھانی چونک پڑیں۔

"کیا بات ہے مہاراج"

سادھو بولا "تم گنہ گار معلوم ہوتی ہو۔ مجھ کو تمھارے ہاتھ

ناپاک معلوم ہوتے ہیں"

سیٹھانی نے کہا "یہ کیسے؟"

سادھو بولا "تمھارے دو بچے سوت کے ہیں نا؟"

سیٹھانی شرمندہ سی ہوگئیں۔ ہچکچاتے ہوئے انھوں نے کہا "ہاں ہیں"

"تم ان کو بہت دکھ دیتی ہو، مجھ کو تمھارے چہرے سے سب کچھ پتا چل گیا ہے۔ مگر یہ بات یاد رکھنا تم جتنا دکھ اپنے سوت کے بچوں کو دوگی اتنا دکھ تمھارے بچوں کو بھی ہوگا۔ تم بے بچوں کی ہو جاؤ تو کچھ تعجب نہیں۔"

یہ سن کر سیٹھانی کا تو جیسے خون خشک ہوگیا اور چہرہ بالکل اتر گیا۔ ان کے جرم پر سے پردہ ہٹ چکا تھا۔ وہ سوچنے لگیں کہیں وہ بے بچوں کی ہو گئیں تو؟ سیٹھانی سادھو کے قدموں پر گر کر گڑگڑا گڑگڑا کر رونے لگیں۔ "مہاراج کوئی طریقہ بتاؤ جس سے یہ گناہ دھل جائیں۔"

"اس طرح کے گناہوں کی تلافی کس طرح ہوسکتی ہے۔ بچے تو معصوم ہوتے ہیں۔ تم ان کو بھلا کس طرح دکھ دیتی ہو۔ سیٹھ نے تم پر بھروسا کیا، مگر تم نے ان کو کتنا دھوکا دیا"

"سادھو مہاراج مجھ سے بہت بڑی بھول ہوئی۔ کوئی تدبیر بتائیے" سیٹھانی خوشامد کرنے لگیں

سادھو نے کہا "صرف ایک طریقہ ہے جس سے گناہوں کی تلافی ہوسکتی ہے، تم سیٹھ کے سامنے اپنی غلطی تسلیم کرلو۔ ان سے معافی مانگو تو خدا بھی معاف کردے۔"

سیٹھانی فوراً اپنے گھر لوٹیں۔

رامو اور شمو کو سینے سے لگا کر ان کے سروں پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔

سورج پورب کے بجائے پچھم سے کیسے نکلا؟

یہ الٹی گنگا کیسے بہنے لگی؟

رامو اور شمو کے دن پھر گئے۔ سیٹھانی سیٹھ جی کا انتظار کرنے لگیں مگر سیٹھ دنیا کے نہ جانے کس کونے میں جا پہنچے تھے ان کی واپسی میں ابھی آٹھ دس مہینے باقی تھے۔

آخر کار ایک دن سیٹھ جی واپس آئے۔

اپنی غلطیاں تسلیم کرکے سیٹھانی نے معافی مانگ لی۔

سیٹھ جی کو انھوں نے سادھو کی سب باتیں بتائیں۔

"سادھو نے تم کو جو نصیحتیں کی ہیں ان پر ضرور عمل کرو" سیٹھ جی نے کہا "تم پر بھروسا کرکے میں نے دو بن ماں کے بچوں کو تم کو سونپا تھا۔ وہ تو تمھارے نصیب سے سادھو آگیا ورنہ ان بے چاروں کی نہ جانے کیا حالت ہوتی۔"

سیٹھانی بولیں "مجھ سے غلطی ہوتی معاف کردیجیے۔"

سیٹھ جی نے کہا "اگر سچے دل سے تم تلافی کی کوشش کروگی تو خدا ضرور معاف کردے گا۔"

سیٹھ کے گھر کے پاس ایک کمہار اور ایک کمہارن رہا کرتے تھے۔ وہ سیٹھ کی غیر موجودگی میں بھی اکثر ان کے گھر آیا جایا کرتے تھے۔

کمہارن سب کچھ جانتی تھی۔ بے ماں کے بچوں کی تکلیفیں اس سے دیکھی نہ جاتی تھیں۔ مگر وہ کر ہی کیا سکتی تھی۔ سیٹھ کبھی گھر پر رہتے ہی نہ تھے۔ اگر ایک دن کے لیے آئے تو دوسرے ہی دن پھر روانہ ہو جاتے تھے۔ ان باتوں کی بھلا سیٹھ جی کو کیسے خبر ہو پاتی۔ سیٹھ تو ہمیشہ پردیس ہی کی خاک چھانا کرتے تھے۔

رامو روز بیر کے پاس جاتا ہے یہ بات کسی کو نہیں معلوم تھی۔

ایک دن کی بات ہے۔

سیٹھ کمہار کے گھر گئے۔ سیٹھ جی

تو دیکھ کر کمہار اور کمہارن سوچ میں پڑ گئے کہ ابھی تک تو
سیٹھ کبھی نہیں آتے تھے آخر آج کیا بات ہوئی۔
سیٹھ کے ہاتھ میں ایک تھیلی تھی وہ اس تھیلی کو کمہارن کو
دے کر بولے
"اصلی ماں کا یہ انعام ہے۔"
کمہارن سوچنے لگی کہے تو کیا کہے۔ اس نے پوچھا "یہ کیسا
انعام ہے سیٹھ جی؟"
"راموکی ماں بننے کا۔"
کمہارن کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔
سیٹھ جی بولے "ہم نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لیا
ہے۔ رات کو بیر کے نیچے تم راموکی ماں بن کر آتی ہو۔ اس
بات کا بھی مجھ کو علم ہے۔ غیر ذات برادری کی ہو کر بھی اتنی
محبت اور اتنی انسانیت دکھائی۔"
کمہارن بولی "مجبور ہو کر مجھ کو یہ کام کرنا پڑا۔ میں روز رات کو
راموکو روتے سنتی تھی۔ مجھ سے یہ نہیں برداشت ہو سکا۔ اسی
لیے میں نے ایسا کیا۔ کوئی بھول چوک ہوئی ہو تو معاف کیجیے گا۔"
"معافی تو ہم کو تم سے مانگنا چاہیے۔ پیدا کرنے کے بعد جو کام
ہم نہ کر سکے وہ تم نے پورا کر دکھایا۔ جو پالے پوسے وہ ماں
جو پیدا کرے صرف وہی ماں نہیں۔"
کمہارن نے پوچھا "مگر آپ ہماری بات کیسے جان گئے؟"
سیٹھ جی نے جواب دیا "پچھلی بار جب میں آیا تھا تو شمو نے
تھوڑی سی بات بتائی تھی۔ اس روز پوری رات مجھ کو نیند
نہ آئی۔ میں نے راموکو بیر کے نیچے بولتے دیکھا۔ جب اور
تلاش کی تو تم کو بھی پہچان گیا۔ ان باتوں کے لیے مجھ کو
سادھو کا بھیس بدلنا پڑا۔"
کمہارن نے کہا "تو اس طرح
سادھو بن کر آپ ہی آتے تھے؟"

سیٹھ نے کہا "اور نہیں تو کیا۔ سادھو کہیں اس طرح
کے ہوتے ہیں۔ وہ تو خود میں ہی تھا۔ اس گاؤں کے
قریب قریب سب ہی لوگوں کو میں جانتا ہوں۔ ان کے
متعلق بہت سی باتوں کا بھی مجھے علم ہے اسی لیے جو کچھ
بتاتا تھا وہ سچ نکلتا تھا۔ اس سے سب لوگ مجھ پر
یقین کرنے لگے۔
اس بات پر زوردار قہقہے گونج اٹھے۔
کمہارن نے کہا "مجھے سونے کے سکوں کی ضرورت نہیں
اگر دینا ہے تو وہ چیز دیجیے جو میں خود ہی مانگوں۔"
سیٹھ نے کہا "مانگو ضرور مانگو جو مانگوگی دوں گا۔"
کمہارن نے کہا "جب تک راموسمجھ دار نہ ہو جائے اس وقت
تک بیر کے نیچے روز رات کو راموکی ماں بن کر راموسے
ملنے کی اجازت دے دیجیے، نہیں تو اس کا دل ٹوٹ جائے گا۔"
سیٹھ نے کہا "اچھا لیکن تم بھی میری اتنی سی بات مان لو"
یہ کہتے ہوئے سیٹھ نے کمہار اور کمہارن کو سونے کے سکوں
کی تھیلی پیش کر دی۔
سب لوگ بے انتہا خوش ہوئے۔

جناب سعادت نظیرؔ

عید

ہر برس دنیا میں کیسی دھوم سے آتی ہے عید
جیسے ہر دل میں خوشی کی لہر دوڑاتی ہے عید

جس طرف دیکھو ادھر ہے روشنی ہی روشنی
ذرّے ذرّے میں نظر آتی ہے گویا زندگی

کیف میں ڈوبی ہوئی ملتی ہے ہر گھر کی فضا
پھرتی ہے اٹکھیلیاں کرتی ہوئی ٹھنڈی ہوا

کھیلتا ہے کتنے ہونٹوں پر تبسم عید میں
اور جاگ اٹھتا ہے نغموں کا ترنم عید میں

جو بڑے ہیں اپنے چھوٹوں کو وہ دیتے ہیں دعا
اور ہر چہرہ دکھائی دیتا ہے ہنستا ہوا

دوست آپس میں گلے ملتے ہیں کتنے پیار سے
دل کی حالت کھلتی ہے رفتار سے گفتار سے

پھول سی نازک امیدوں کا خزانہ عید ہے
مختصر یہ ہے کہ خوشیوں کا زمانہ عید ہے

نیند کے پیاسے

جناب رام لعل

ایک مسافر جس کا نام ماکو تھا چلتے چلتے ایک نگری کے پاس پہنچا۔ وہ بہت تھکا ہوا تھا۔ کئی روز سے اسی طرح چلتا آرہا تھا۔ اسے ابھی بہت دور جانا تھا۔ اس نے سوچا کچھ دیر آرام کرلے پھر آگے کو چل پڑے گا۔ ایک گھنے پیڑ کی چھاؤں میں زمین پر چادر بچھائی اور اپنی گٹھری سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ لیٹتے ہی اُسے گہری نیند آگئی

اُسے سوئے ہوئے ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ وہاں دو سپاہی آنکلے جو اُسی نگری کے راجا کے تھے۔ ماکو کو سویا ہوا دیکھ کر وہ سپاہی بہت حیران ہوئے۔ حیران ہونے کے ساتھ ساتھ انھیں کچھ خوشی بھی ہوئی۔ انھوں نے فوراً ماکو کو جگایا اور پوچھا ـــــ "اے بھائی تم کون ہو؟ کہاں کے رہنے والے ہو؟ کیا تم ہمیں نیند کا راز بتا سکتے ہو؟"

ماکو نے نیند سے بوجھل آنکھیں مل کر انھیں غور سے دیکھا اور کہا ـــــ "میں کہانی کار ہوں، میرا نام ماکو ہے۔ میں اُدھر پہاڑوں کے پیچھے ایک گاؤں میں رہتا ہوں جو یہاں سے سینکڑوں میل دور ہے۔ لیکن تم لوگوں نے یہ کیا بات پوچھی ہے، نیند کے راز والی، میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ بھلا نیند کا بھی کوئی راز ہوتا ہے!"

سپاہی بولے ـــــ "تم اتنے بھولے مت بنو ماکو! تم ضرور نیند کا راز جانتے ہو۔ ہم نے تمھیں سوتے ہوئے دیکھا ہے۔ جب تم خود سونا جانتے ہو تو دوسروں کو بھی نیند کا راز بتا سکتے ہو۔"

ماکو بولا ـــــ "ارے بھائی سونا کونسا مشکل کام ہے۔ جب آدمی چلتے چلتے یا کام کرتے کرتے تھک جاتا ہے تو اُسے نیند آہی جاتی ہے۔ تم لوگ دن بھر نوکری کرتے ہو اور رات کو گھر جاتے ہو تو تمھیں کیا نیند نہیں آتی؟ اس میں راز کی بات کون سی ہوگئی بھلا۔ جاؤ جاؤ مجھے سونے دو۔ تھوڑی دیر آرام کرکے مجھے ابھی کئی ہزار میل آگے جانا ہے۔"

سپاہیوں نے اسے سونے

نہ دیا۔ بولے — "دیکھو ماکو! تمھیں اگر اپنی جان پیاری ہے تو ہمیں نیند کا راز بتا دو۔ نہیں تو ہم تمھیں پکڑ کر اپنے راجا کے پاس لے چلیں گے۔ تمھیں معلوم نہیں ہے۔ اس نگری کے کسی آدمی کو کبھی نیند نہیں آتی۔ سب لوگ ہمیشہ جاگنے کی وجہ سے پریشان رہتے ہیں۔ دنیا کے کتنے بڑے بڑے ویدوں، حکیموں اور ڈاکٹروں سے علاج کرایا گیا لیکن کوئی بھی اس نگری کے لوگوں کو نیند دلانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اب تو راجا نے حکم دے رکھا ہے کہ ہماری نگری کے پاس کوئی بھی آدمی سوتا ہوا پایا جائے تو اُسے پکڑ کر اُس کے سامنے لے جائیں۔ وہ اس سے پہلے نیند کا راز معلوم کرتے ہیں — نہیں بتاتا تو راجا کے حکم سے اُسے مار دیا جاتا ہے۔"

"مار دیا جاتا ہے؟" ماکو نے گھبرا کر پوچھا۔

سپاہی بولے — "ہاں اُسے فوراً مار ڈالنے کا حکم دے دیا جاتا ہے۔ اب تک کتنے ہی ایسے لوگ مارے جا چکے ہیں۔ اس لیے چلو راجا کے پاس اور یا تو اسے نیند کا راز بتا دو ورنہ اسی سزا کے لیے تیار ہو جاؤ جو کئی دوسرے بھگت چکے ہیں۔"

ماکو سوچ میں پڑ گیا۔ اب کیا کرے! انھیں کیسے سمجھائے کہ نیند تو ایک فطری چیز ہے۔ دنیا کا ہر جاندار جس میں انسان بھی شامل ہے، دن رات کے کسی وقفہ میں آرام کی غرض سے سوتا ضرور ہے۔ انسان کی اپنی بنائی ہوئی مشین کو بھی کبھی نہ کبھی آرام ضرور کرنے دیا جاتا ہے ورنہ وہ جلد ہی گھس کر ٹوٹ جاتی ہیں لیکن اس نگری کے انسان بہت عجیب ہیں کبھی سوتے ہی نہیں! ہمیشہ جاگتے کیسے رہ سکتے ہیں؟ ڈاکٹری نکتہ نظر سے تو مسلسل جاگنے والے انسان کو پاگل ہو جانا چاہیے۔

ماکو نے ان سپاہیوں کو غور سے دیکھا اور پوچھا "کیا تم لوگ بھی ہمیشہ جاگتے رہتے ہو؟"

وہ بولے — "ہاں نہیں تو کیا؟ ہم بھی بہت پریشان ہیں۔ جاگتے رہنے کی وجہ سے ہر وقت کام میں لگا رہنا پڑتا ہے۔ یہاں سب لوگوں کی یہی حالت ہے۔ دن ہو یا رات، سب لوگ کام میں لگے رہتے ہیں۔"

ماکو نے پوچھا۔ "ہر وقت کام کرتے رہنے کی وجہ سے لوگ تو بہت ہی دھن دولت والے ہوں گے!"

سپاہی بولے — "اور نہیں تو کیا! یہاں تو گھر گھر میں دولت کے انبار لگے ہیں۔ کام کی یہاں کبھی کمی نہیں رہی جتنا مال تیار ہوتا ہے چاہے اناج ہو یا دوسری چیزیں، باہر کے بیوپاری سونا چاندی دے کر لاد لاد کر لے جاتے تھے لیکن ان چیزوں کے بدلے میں کوئی بھی یہاں کے لوگوں کے لیے نیند لے کر نہیں آتا۔ جو آدمی یہاں نیند لے کر آ جائے اُسے تو دھن دولت دے کر نہال کر دیا جائے گا۔ یہ راجا کا حکم ہے لیکن وہ لوگ بھی اب ڈر کے مارے نہیں آتے۔ نیند کا راز نہ بتانے کی وجہ سے مار دیے جاتے ہیں۔"

ماکو بہت غریب آدمی تھا۔ دھن دولت کی تو اُسے ضرورت تھی ہی لیکن وہ انھیں نیند کا راز کہاں سے لا کر دے! سپاہی اُسے پکڑ کر راجا کے پاس لے چلے۔ راستے میں اسے دیکھ کر لوگ پیچھے پیچھے ہو لیے۔ اس نگری میں یہی دستور تھا۔ جو شخص بھی سویا ہوا پایا جاتا تھا اس کی زبان سے نیند کا راز معلوم کرنے یا پھر اُسے قتل ہوتا ہوا دیکھنے کے لیے نگری کے سارے لوگ جمع ہو جاتے تھے۔

راجا کے محل کے بہت بڑے احاطے میں سب لوگ جمع ہو گئے۔ ماکو ایک اونچے چبوترے پر زنجیروں سے جکڑا ہوا کھڑا تھا۔ سامنے ایک سجے ہوئے تخت پر راجا اور اس کے کئی وزیر بیٹھے تھے۔ وہ سب اس سے بار بار نیند کا راز پوچھتے تھے اور ساتھ ساتھ موت کی دھمکی بھی دیتے جاتے تھے۔

ماکو سر جھکائے خاموش کھڑا تھا۔ ہر گھڑی یہی سوچ رہا تھا کہ ان جاگتے ہوئے لوگوں کو سلانے کا کون طریقہ، کونسا گر اپنائے!

اچانک اُسے ایک تجویز سوجھ گئی اور یقین ہو گیا کہ وہاں سب کو سُلانے میں ضرور کامیاب ہو جائے گا۔ اس نے مطمئن ہو کر راجا سے پوچھا "مہاراج اگر میں نے آپ سب کو نیند کی گود میں پہنچا دیا تو کیا مجھے کچھ انعام بھی ملے گا؟"

راجا نے جواب دیا ہاں انعام ضرور ملے گا اور منہ مانگا ملے گا۔ بولو کیا چاہتے ہو؟ سونے چاندی سے تمھارا گھر بھروا دوں؟"

ماکو بولا "نہیں مہاراج مجھے سونا چاندی بالکل نہیں چاہیے۔ میری ایک اور ہی خواہش ہے۔ شاید آپ کو بہت عجیب سی لگے۔ میں بہت غریب آدمی ہوں۔ پتہ نہیں کسی جنم میں میں بھی راجا بن سکوں گا یا نہیں! میری صرف یہی خواہش ہے کہ اگر میں نے آپ کو سلا دیا تو انعام میں تھوڑی سی دیر کے لیے اس راج گدی پر بیٹھنے کی اجازت دے دیجیے گا۔"

یہ سُن کر راجا ہنس پڑا۔ بولا "مجھے منظور ہے۔ میں اور میری نگری کے لوگ جتنی دیر تک سوتے رہیں گے تب تک تم اس نگری کے راجا سمجھے جاؤ گے۔ اور اسی راج گدی پر بیٹھا کرو گے۔ اب ہمیں جلدی سے سُلا دو۔"

ماکو راجا کے وعدے سے بہت خوش ہوا۔ پھر سب کو مخاطب کر کے بولا "میں کہانی کار ہوں نگری نگری گھوم کر کہانیاں سنانا ہی میرا کام ہے۔ کیا تم کہانی سننا پسند کرو گے؟"

ان لوگوں نے آج تک نہ کوئی کہانی سُنی تھی نہ اس کا نام ہی جانتے تھے اس لیے بہت دلچسپی سے ماکو کی کہانی سننے لگے۔

ماکو اپنی کہانیاں گا کر سنایا کرتا تھا۔ اس نے انھیں کتنی ہی کہانیاں سنائیں۔ ایک سے ایک دلچسپ۔ کہانیاں سنتے سنتے لوگوں کو نیند آنے لگی یہاں تک کہ وہ جہاں جہاں بیٹھے تھے وہیں لیٹتے گئے۔ چند گھنٹوں کے اندر سب کے سب سو گئے۔

یہ دیکھ کر ماکو بہت خوش ہوا۔ اس قدر خوش کہ بس کچھ نہ پوچھیے۔ راجا کے وعدے کے مطابق اب وہی نگری کا راجا تھا۔ اس نے جلدی سے راجا کی شان دار پوشاک پہن لی۔ سر پر تاج بھی رکھ لیا اور اپنی گٹھری کو راج گدی کے نیچے چھپا کر راج گدی پر بیٹھ گیا۔

راج گدی پر بیٹھتے ہی اس نے خادموں کو پکارا اور حکم دیا کہ وہ فوراً اس کے سامنے بہترین قسم کے کھانے اور شربت لے کر آئیں۔ لیکن اس کے حکم کو پورا کرنے کے لیے کوئی بھی خادم سامنے نہ آیا۔ ماکو نے انھیں پھر آواز دی۔ پھر بھی جب کوئی خادم اس کی خدمت میں حاضر نہ ہوا تو اسے یاد آ گیا۔ راجا کے خادم بھی تو اس کی کہانیاں سنتے سنتے گہری نیند سو چکے ہیں۔ جب تک وہ سوتے رہیں گے کوئی بھی اس کی خدمت نہیں کر سکے گا۔ یہ دیکھ کر وہ بہت پچھتانے لگا۔ اس کا راج گدی پر بیٹھنا تو بے کار ہی ہو گیا۔ جب سارے لوگ سوتے رہیں گے تو وہ راجا کس کا کہلائے گا!

وہ شاہی پوشاک پہنے ہوئے ساری نگری میں گھوم گیا۔ کہیں بھی کوئی آدمی جاگتا ہوا دکھائی نہ دیا۔ سب کے گھر دوار کھلے پڑے تھے۔ دھن دولت اور اناج وغیرہ سے بھرے ہوئے۔ ان کی حفاظت کرنا بھی اب ماکو کے ذمّہ تھا۔ چڑیاں اور کوّے اور دوسرے جانور اب بلا کھٹکے اناج کو تباہ کرنے لگے۔ ماکو اکیلا کہاں کہاں رکھوالی کرتا — کہاں کہاں بھاگ کر انھیں روکتا۔ آس پاس کے علاقوں کے ڈاکو اور چور

بھی آنے لگے۔ ماکو ان سے بھی اکیلا نہیں نپٹ سکتا تھا۔ اس نے
سوتے ہوتے لوگوں کو جگانے کی کوشش کی لیکن کوئی بھی نہ جاگا۔
زندگی میں پہلی ہی بار تو انھوں نے نیند جیسی چیز کا ذائقہ چکھا تھا
وہ تو اب مزے سے خراٹے ہی لیتے رہے۔

ماکو بالکل بے بس ہو گیا۔ چور ڈاکو نگری کا سارا دھن
دولت لوٹ کر لے گئے۔ پرندے اور جانور اناج اور فصلیں چٹ
کر گئے۔ ماکو کو اپنا کھانا بھی خود ہی پکانا پڑتا تھا۔ اب تو اُسے خود
ہی فصلیں بھی اگانی پڑ گئیں۔ ایک کھیت میں ہل چلا کر اس نے بیج
بویا۔ اُسے پانی دیا اور اتنی سخت محنت کی جتنی اس نے پہلے
کبھی نہیں کی تھی۔

اس طرح کافی عرصے تک وہ نگری میں اکیلا رہا۔ سخت
محنت کے تجربے نے اسے ایک نئی کہانی دے دی۔ ہل چلاتے
چلاتے اور فصلیں اگاتے اگاتے اس نے اپنی نئی کہانی کی دھن
تیار کی۔ وہ کہانی گا کر ہی تو سنایا کرتا تھا۔

جب کہانی پوری ہو گئی تو ایک دن اس نے راج بھون
کے کھلے احاطے میں سوتے ہوئے لوگوں کے درمیان راج گدی
پر بیٹھ کر انھیں وہ کہانی گا کر سنائی۔ اس میں اس نے اپنی روح
کا سارا درد بھر دیا۔ ایک اکیلے انسان کی ساری محنت اور
تنہائی کا حال بھی کہہ سنایا۔ اور اس آنے والے دن کا بھی ذکر
کیا جب اس نگری کے سوتے ہوتے لوگ اچانک جاگ اٹھیں
گے اور اپنے دھن دولت اور اناج کو لٹا ہوا دیکھیں گے اور وہ
یہ بھی دیکھیں گے کہ ان کے کھیتوں میں ایک ہی آدمی کتنے عرصے
تک اکیلا ہل چلاتا ہے اور اناج اگاتا ہے تو ان کی آنکھیں کھل
جائیں گی وہ اس آدمی کی محنت کی داد دیں گے اور اس کے ساتھ
پھر سے محنت مزدوری کرنے لگیں گے تاکہ ان کی نگری میں پھر
سے ہر چیز کے انبار لگ جائیں۔

یہ کہانی سناتے سناتے ماکو
نے صبح کر دی۔ جب صبح کا اجالا ہر طرف پھیل گیا تو سوتے
ہوتے سارے لوگ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ ان کا راجا بھی جاگ گیا
ان سب نے ماکو کو راج گدی پر بیٹھے دیکھا۔ سب اس کے گرد
جمع ہو گئے۔

ماکو نے دیکھا اب سب کی نیند کھل گئی ہے اس
لیے اس کی حکومت بھی ختم ہو گئی ہے اس لیے اس نے
راج گدی چھوڑ دی۔ شاہی پوشاک اور تاج بھی اتار کر رکھ
دیا اور راج گدی کے نیچے سے اپنی گٹھری نکال کر کندھے پر
رکھ لی ـــ وہ وہاں سے اب چلا جانا چاہتا تھا لیکن راجا
نے اُسے روکا اور کہا ـــ "ماکو اب تم یہیں رہو۔ تم ہمیں
اسی طرح کہانیاں سنا سنا کر سلایا کرو اور جب ہم سو جایا
کریں تو اس نگری پر تم راج کیا کرو۔"

لیکن ماکو نے کہا ـــ "نیند اچھی چیز نہیں ہے
آپ لوگ اب کبھی نہ سوئیں تو اچھا ہے کیونکہ آپ کو معلوم
نہیں کہ جب آپ سوئے ہوئے تھے تو چوروں ڈاکوؤں اور
جانوروں وغیرہ نے آپ لوگوں کا کتنا بڑا نقصان کیا ہے۔
آپ لوگوں سے تو مجھے جاگتے رہنے کا راز ملا ہے۔ یہ راز اب
میں دوسری نگریوں کے لوگوں کو جا جا کر سناؤں گا ـــ
خدا حافظ!"

یہ کہہ کر ماکو وہاں سے چل کھڑا ہوا۔

جناب عرشی اجمیری

(گورنمنٹ پرائمری اسکول برہاؤ اجمیر کے بچے روزانہ یہ دُعا ترانے میں پڑھتے ہیں)

دُعا

دُعا یہ بصد التجا مانگتے ہیں
ترا فضل ہم اے خدا مانگتے ہیں

تو واحد ہے یکتا ہے معبود ہے تو — نظر سے نہاں دل میں موجود ہے تو
ہیں شاہ و گدا تیرے در کے بھکاری — ترے در سے شاہ و گدا مانگتے ہیں
دُعا یہ بصد التجا مانگتے ہیں --------

ہیں ہم طالبِ علم اے ربِّ اکبر — زر و دولتِ علم ہم کو عطا کر
کسی اور شے کی نہیں ہم کو خواہش — فقط اک یہی مدعا مانگتے ہیں
دُعا یہ بصد التجا مانگتے ہیں --------

نہیں اے خدا اور کچھ دل میں حسرت — ہمیں دے ہمارے وطن کی محبت
وطن کے لیے جان قربان کر دیں — یہ جذبہ ہم اہلِ وفا مانگتے ہیں
دُعا یہ بصد التجا مانگتے ہیں --------

چمن ہے ہمارا یہ اسکول یا رب — یہ بچے ہیں اس باغ کے پھول یا رب
پھلے اور پھولے ہمیشہ یہ گلشن — بصد عاجزی یہ دُعا مانگتے ہیں
دُعا یہ بصد التجا مانگتے ہیں --------

یہی اِلتجا ہے الٰہی ہمارے — رہیں شاد ماں باپ و استاد سارے
ہو عرشی پہ بھی تیری رحمت کا سایا — یہ بچے یہی مدعا مانگتے ہیں!
دعا یہ بصد التجا مانگتے ہیں ترا فضل ہم ----

ابوالکلام

شانتی رنجن بھٹاچاریہ

تایا یوسف ناظم
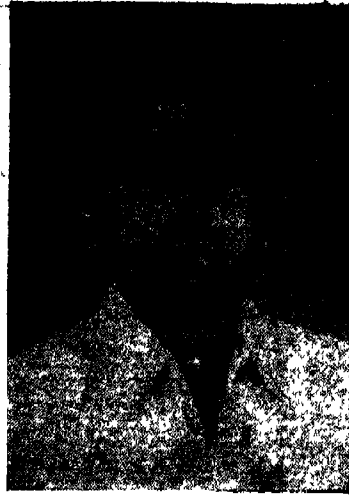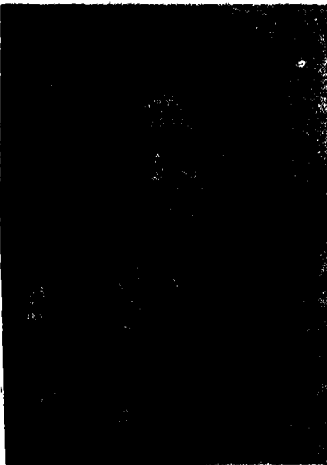
عادل جعفری

محمد یوسف پاپا
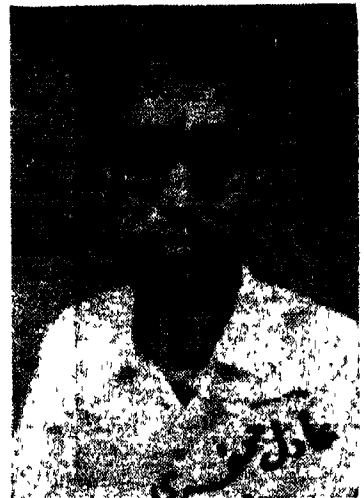
خلیق انجم اشرفی
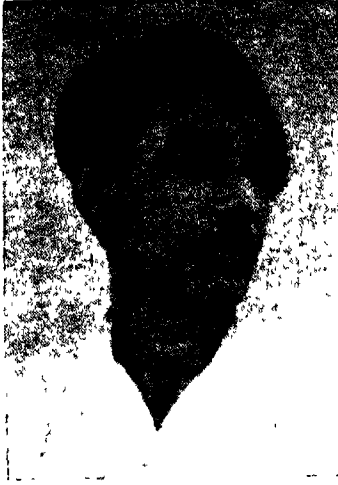
اقبال مہدی
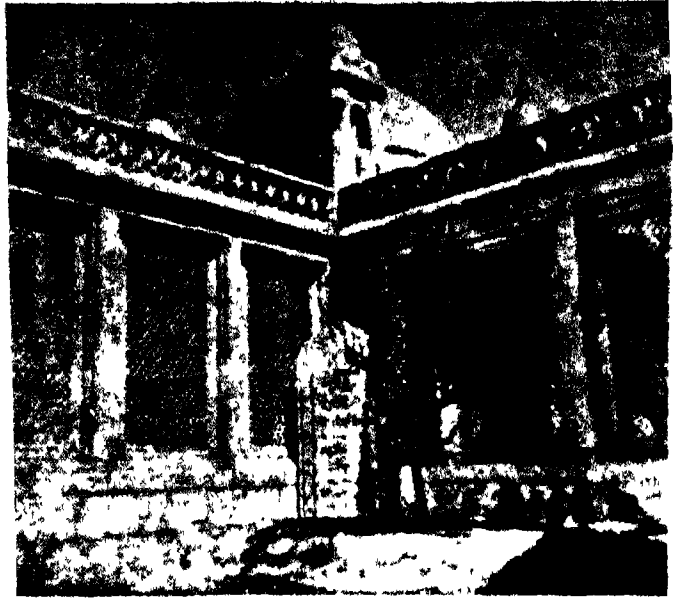
مزار شہنشاہ اورنگ زیب' خلدآباد' (مضمون: میں نے کیا دیکھا ص۳۴)

سعادت صدیقی

مقبرہ سلطان قلی قطب شاہ۔ (مضمون ص۲۵)

جناب محمد اکبر الدین صدیقی

گنبد سلطان محمدؐ قلی قطب شاہ

سلطان محمد قلی قطب شاہ دکن کا بہت بڑا بادشاہ تھا۔ اکبر اعظم اور محمد قلی قطب شاہ دونوں ایک ہی زمانے میں گزرے ہیں۔ شمالی ہند کی تاریخ میں اکبر کی جتنی اہمیت ہے دکن میں اتنی ہی محمد قلی قطب شاہ کی ہے۔ وہ بڑے کھلے دل کا دور اندیش بادشاہ تھا۔ اس نے اپنی رعایا کے آرام و آسایش کے لیے کئی کام کیے۔ خدا سے ڈرنے والا اتنا تھا کہ جب اس نے حیدرآباد کا شہر بسایا تو دعا کی۔ اس دعا کا ایک شعر یہ ہے:

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر
(سے)

رکھیا جیوں تو دریا میں مین یا سمیع
(رکھا جیسے تو نے ۔۔۔ مچھلی)

کہتا ہے کہ اے خدا میرے شہر کو لوگوں سے اس طرح آباد کر دے جیسے تو نے دریا کو مچھلیوں سے آباد کر رکھا ہے۔ جب اس نے شہر بسایا تو ممکن ہے کہ چار چھ لاکھ کی آبادی ہو لیکن اللہ میاں نے اس کی دُعا قبول کر لی اور آبادی بڑھتے بڑھتے اب پندرہ لاکھ ہو گئی ہے۔ محمد قلی قطب شاہ نے جب حیدرآباد کو آباد کر کے پایۂ تخت بنایا اس وقت آگرہ اکبر کا پایہ تخت تھا، بیدر، بریدیوں کا، احمد نگر نظام شاہیوں کا، بیجا پور، عادل شاہیوں کا، ایلچ پور (برار) عماد شاہیوں کا۔ اسی طرح بنگال میں لکھنوتی، گجرات میں سورت وسط ہند میں مالوہ اور جنوب میں وجیا نگر بھی سلطنتوں کے دار الخلافے تھے لیکن ان میں آج کوئی بھی دار الخلافہ یا پایہ تخت یا حکومت کا مرکز نہیں۔ اور حیدرآباد محمد قلی قطب شاہ کی دعا کی برکت سے ہمیشہ پایہ تخت رہا اور آج بھی حکومت آندھرا پردیش کا مستقر ہے۔

محمدؐ قلی صرف حیدرآباد بسانے والے ایک بادشاہ کی حیثیت سے ہی مشہور نہیں بلکہ وہ دکھنی، فارسی اور تلنگی زبانوں کا بہت بڑا شاعر بھی تھا۔ آج ہمیں سب سے پہلے اردو شاعر کا جو مکمل دیوان ملتا ہے وہ اسی کا ہے۔ اس کے ڈیڑھ ہزار صفحے ہیں اور پچاس ہزار سے زیادہ شعر اس میں موجود ہیں۔ اکبر کی طرح اس کے دربار میں بھی بڑے بڑے عالم، فاضل، شاعر، انجینیر، خوشنویس اور فن کار جمع تھے جن کے شاندار کام آج ہمارے سامنے موجود ہیں۔

بادشاہوں کی یہ خواہش رہی ہے کہ مرنے کے بعد ان کی نشانی باقی رہے اسی لیے وہ اپنے مقبرے شاندار بناتے اور اس میں دفن ہوتے۔ دکن میں بہمنی بادشاہوں نے بھی کیا اور پھر قطب شاہی عادل شاہی اور برید شاہی بادشاہوں نے اپنے اپنے گنبد بنائے مگر ان کی موت سے پہلے

نیدنا مکمل رہے تو ان کے جانشینوں نے ان کی تکمیل کی۔
ہندوستان میں صرف قطب شاہی بادشاہوں
کی قبریں ایک جگہ ہیں اس کا نام لنگر فیض آثار ہے۔
اس خاندان کا آخری بادشاہ ابوالحسن قطب شاہ
تھا جس کو اورنگ زیب عالمگیر نے گولکنڈہ فتح کرکے گرفتار
کیا اور دولت آباد میں نظر بند کیا جہاں گیارہ سال قید رہ کر
اس نے وفات پائی اور وہیں دفن ہوا۔
محمد قلی قطب شاہ نے بھی اپنے باپ چچا اور دادا
کے گنبدوں کو دیکھ کر اپنے انجینیروں کو ان سے زیادہ شاندار
گنبد بنانے کا حکم دیا۔
انجینیروں نے ایک نقشہ تیار کیا۔ پہلے دو سو فٹ
لمبا مربع چبوترہ بنایا یعنی چالیس ہزار مربع فٹ جگہ گھیر لی
بنیاد کو سطح زمین تک لاکر یہاں سے چبوترے کے ہر پہلو
پہ ۲۸، ۲۸ کمانیں تعمیر کیں اس طرح ۱۳½ فٹ بلند چبوترہ
تیار کیا۔ محمد قلی قطب شاہ کا مزار انھیں کمانوں کے بیچ میں
سطح زمین پر ہے۔ اب اس کے بعد اس چبوترے کے
درمیان ایک اور چبوترہ پونے چار فٹ بلند بنایا۔ اس کا ہر پہلو
۱۲۶½ فٹ ہے۔ اس چبوترے کے درمیان محمد قلی کے گنبد
کا چبوترہ ہے جو اس دوسرے چبوترے سے بھی کچھ اونچا
ہے۔ زمین سے اس چبوترے کی بلندی ۲۰ فٹ کے قریب
آجاتی ہے۔
روضہ کے اطراف میں پہلے چبوترے کا شاندار
وسیع و عریض سطح فرش ہر موسم میں عجب بہار دکھاتا
ہے اور اپنے بنانے والوں کی عظمت کا سکہ ہمارے دلوں
پر بٹھاتا ہے۔ انگریزی حکومت کے دور میں چاندنی راتوں
میں اس چبوترے پر ڈنر ہوتے
سرکاری دعوتیں ہوتیں۔ لوگ
منظر کا لطف اٹھاتے۔ آج بھی یہاں پک نک منانے لوگ
کثرت سے آتے اور لطف اٹھاتے ہیں۔ ہندوستان میں کسی
گنبد کے ساتھ اتنا لمبا چوڑا چبوترہ اور کہیں نہیں ہے۔
دوسرے چبوترے کے درمیان میں محمد قلی قطب
شاہ کے روضے کی چار دیواری ہے جس کے اطراف باہر کی طرف
بہت اونچا وارانڈہ ہے جس میں سالم پتھر کا ایک ایک ستون
دے کر ان ستونوں پر ایرانی یا مسلم اندلسی کمانیں بنانے کی
بجائے ہندوستانی وضع کے لیے پتھر کے شہتیر یا نائیں رکھی
گئی ہیں۔
وارانڈے کی چھت بھی پتھر کی چوڑی چوڑی سلوں
کو جوڑ کر بنائی گئی ہے۔ وارانڈے کے اندر کی طرف یعنی
روضہ کے باہر کی طرف کمانوں کی شکل دے کر اس میں باریک
اور خوبصورت نقش و نگار بنائے گئے ہیں۔
روضے میں داخل ہونے کے لیے مشرق اور جنوب
میں دو دروازے ہیں جن کے اطراف کثرت سے نقش و نگار
اور بیل بوٹے بنے ہیں۔ روضہ میں پہنچنے کے بعد اندر کی سطح
پر سات سات فٹ کی تین بند کمانیں ہیں۔ یہ کمانیں کمرے کو
اوپر کی جانب ہشت پہلو میں تبدیل کرتی ہیں تاکہ اس پر
گنبد کی تعمیر کا ڈول ڈالا جا سکے۔ اس طرح جو کمرہ ہمیں
نیچے چار کونوں والا نظر آتا ہے وہ کافی بلندی پر اوپر دیکھیں
تو ہشت پہلو نظر آتا ہے۔ اس کے بعد گنبد کی دیواریں
شروع ہو جاتی ہیں۔
کمرے کے بیچوں بیچ محمد قلی قطب شاہ کی قبر کا
تعویز ہے جو سنگِ سیاہ کا ہے۔ یہ سیڑھی کی وضع کا ہے
یعنی نچلا حصہ بڑا ہے جس کا طول دس فٹ دو انچ اور
چوڑائی پانچ فٹ نو انچ ہے۔
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مختلف سائز کی

پتھر کی سلیں پہلے بڑی پھر اس سے چھوٹی اس پر اور ذرا چھوٹی اس طرح مسلسل بنائی گئی ہیں لیکن اصل میں یہ تعویذ ایک ہی پتھر کا ہے۔ اس پر کلمہ طیبہ، آیۃ الکرسی اور محمد قلی قطب شاہ کا نام ولدیت، عمر، مدت سلطنت اور تاریخ وفات کندہ ہیں۔

اس گنبد کو اگر ہم دور سے دیکھیں تو ایک خاص دل کشی اور دل آویزی محسوس ہوتی ہے اور طبیعت خوش ہو جاتی ہے۔ اگر ہم بیجاپور کے گنبدوں کو دیکھیں تو ان کی بھاری بھرکم ہیئت دل پر عجیب خوف کا احساس پیدا کرتی ہے۔ بہمنی سلاطین کے مقبروں کو دیکھیں تو دل پر رنج و ملال اور افسردگی چھا جاتی ہے۔ قطب شاہی گنبدوں خصوصاً ابراہیم، محمد قلی، قطب شاہ، حیات بخشی بیگم اور عبداللہ قطب شاہ کے گنبد دیکھنے والے کا دل لبھاتے ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ ان کی خوبصورتی نزاکت، بانکپن اور دل آویزی کی کیفیتوں کو دیکھتے رہیں۔ ہماری زبان سے بے ساختہ بنانے والوں کی تعریف نکل جاتی ہے۔ وسیع ورانڈے ان کے سامنے چھجے، ان کے خوبصورت نقش و نگار گل بوٹے اوپر چھوٹی چھوٹی کمانوں کی قطار، گنبد کے اطراف ایک بڑا کنگن اور اس پر کنول کے پتے، جالی دار کھڑکیاں گنبد کی گول خوبصورت اور سڈول ساخت اور پھر کلس۔ ہر چیز اپنی طرف کھینچ لیتی ہے اور فارسی کا یہ مصرعہ صادق آتا ہے۔

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

علامہ اقبالؒ نے جب ان گنبدوں کی سیر کی تو وہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور "گورستان شاہی" کے عنوان سے نظم لکھی۔ آپ بڑے ہو جائیں تو یہ نظم ضرور پڑھیں۔

اَبّو خاں کی بکری

ڈاکٹر ذاکر حسین

کسی زمانے میں ذاکر صاحب نے بچوں کے لیے بہت سی مزیدار اور سبق آموز کہانیاں رقیہ ریحانہ کے نام سے رسالہ پیام تعلیم کے لیے لکھی تھیں۔ ان کہانیوں کو اب ہم نے کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ کتاب میں سات سہ رنگی تصویر ہیں۔ عمدہ کتابت، آفسٹ کی طباعت، گیٹ اپ کے اعتبار سے کتاب اپنی نظیر آپ ہے۔

قیمت دو روپے پچاس پیسے

میر تقی میر

حسین حسان

مکتبہ جامعہ نے ایک پروگرام بنایا ہے کہ اردو کے بڑے بڑے شاعروں اور ادیبوں کی زندگی کے حالات ذرا بڑے لڑکوں کے لیے لکھے جائیں۔ میر تقی میر اس سلسلے کی پہلی کتاب ہے۔ زبان سادہ اور انداز بیان بہت دلچسپ۔ کتاب پڑھ کر آپ اردو کے سب سے بڑے شاعر کے حالات سے واقف ہو سکیں گے۔ آپ کو اندازہ ہوگا کہ میر نے انتہائی پریشانیوں کے باوجود کس لگن سے اردو زبان کی خدمت کی ہے۔

قیمت ایک روپیہ

میر انیس

حسین حسان

ادیبوں اور شاعروں کی زندگی کے سلسلے کی دوسری کتاب ہے اس کتاب کو بھی حسین حسان صاحب نے سادہ اور دلچسپ انداز میں لکھا ہے۔

قیمت
ایک روپیہ پچیس پیسے

جناب اقبال متین

مجھے پہچانو

میں تمہارے ساتھ ہی تمہارے ہی گھر میں پیدا ہوئی۔ تم ٹھمک ٹھمک کر اپنی امی کی گود میں جا چھپے تو میں بھی تمہارے من اور دل میں چھپ گئی۔ پھر وقت نے تمھیں غوں غوں کرنا سکھایا۔ میں سمجھ گئی کہ اب تمھیں میری ضرورت پڑے گی۔

کچھ دن میں نے تمہاری مجبوری کا تماشہ دیکھا اور جی ہی جی میں اپنی اہمیت پر پھولی نہ سمائی۔ سوچ سوچ کر مزے لیتی رہی کہ اب تم اپنی امی کے بعد میری ہی اہمیت کو محسوس کروگے۔

ایک دن تمھیں بہت بھوک لگی۔ ہوا یوں کہ تم اس دن اجالا پھیل جانے پر بھی جاگے نہیں میٹھی میٹھی نیند کے مزے لوٹتے رہے۔ تمہاری امی نے جب تمھیں گہری نیند میں دیکھا تو بڑے پیار سے آنکھوں ہی آنکھوں میں چوما۔ میٹھی نیند سے تمھیں جھنجوڑ کر اٹھانا انھیں اچھا نہ لگا۔ یہ سوچ کر وہ اپنے کام میں جٹ گئیں کہ تم اٹھوگے تو تمھیں پیٹ بھر کر دودھ پلا دیں گی۔

ادھر تم اٹھے لیکن وہ اپنے کام میں مصروف تھیں۔ انھیں یاد ہی نہ رہا کہ اپنے منّا کو دودھ پلانا ہے۔ ادھر تمہارا یہ حال کہ پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ اب تم نے رونا شروع کیا۔

میں تمہارے ذہن میں بیٹھی یہ تماشا دیکھ رہی تھی مجھے تمہاری حالت پر بڑا ترس آیا۔ میں نے آہستہ سے تمہارے ذہن میں رینگنا شروع کیا اور تمہاری زبان تک آپہنچی۔ تمہاری سوکھی زبان میری آمد سے کچھ یوں تر ہوئی جیسے چٹخارے لے رہی ہو۔

لیکن کام پھر بھی نہ بنا۔ اب تم بھوک سے بیتاب ہو اٹھے اور بلک بلک کر رونے لگے۔ تمہاری یہ حالت دیکھ کر میری آنکھیں نم ہوگئیں اور مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں تیزی سے تمہارے ہونٹوں تک پہنچی اور فضا میں بکھر گئی——

اماں —— اماں ——

اور جب تمہاری یہ آواز تمہاری امی کے کانوں سے ٹکرائی تو وہ دیوانہ وار بھاگتی ہوئی آئیں۔ چٹ چٹ تمہارے ہونٹ چومے۔ تمھیں گود میں اٹھا کر بھینچا۔ سینے سے چمٹایا۔ دعائیں دیں اور تم مزے سے دودھ پینے لگے۔ مجھے تمہاری مدد کرکے کتنی خوشی ہوئی تھی۔ کتنی خوشی ہوئی تھی کاش تم اندازہ کر سکتے۔ تمہاری امی ایک ایک سے کہتی پھریں کہ منا مجھے پکارنے لگا ہے۔

پھر تو تم میرے دوست ہوگئے اور میں بھی تمہاری ہو رہی۔ اب تم مجھے بڑے پیار سے برتنے لگے اور میں بھی تمہارے

اور تمھاری امی کے درمیان بات چیت کا وسیلہ بن گئی۔
بہت اترائی کہ اب قدم قدم پر تمھیں مجھ سے سابقہ پڑے گا۔
اور واقعی وہی ہوا جو میں نے سوچا تھا۔ تم میرے ساتھ کھیل کود کر پروان چڑھنے لگے۔ اپنی امی سے ۔اماں دودو کہہ کر دودھ مانگا۔ آبا آبا کہہ کر اس میں چینی ملوائی اور خوب ہی بھر کے پیا۔ تمھارا جب بھی پیٹ بھرا میں نے بھی محسوس کیا کہ مجھے دنیا بھر کی دولت مل گئی۔

اب تم نے آبا بھی کہنا شروع کر دیا' آنا بھی، بھائی بھی، اب تم اپنی بہن کو بھی بی بی کہہ کر بلانے لگے۔ تم نے جس جس کو پکارا سب تمھارے دیوانے ہوئے۔ تمھیں محبتیں ملتی گئیں اور میں جی ہی جی میں خوش ہوتی رہی کہ جو پیار تمھیں مل رہا ہے اس میں میرا اپنا بھی تو حصہ ہے۔

تمھارے گھر میں تمھارے ساتھ میری بھی تو حکمرانی تھی۔ ہر زبان پر میں تھی۔ ہر لب کو چومنے کا مجھے حق تھا۔ میں تمھارے گھر کی فضاؤں میں ہوا کے دوش پر تیرتی پھرتی اور آہستہ سے تمھارے کانوں کے ذریعے تمھارے ذہن میں پہنچ کر ایک نیا روپ دھار لیتی۔ ایسا روپ جو تمھاری عمر اور تمھاری معصومیت کو اپنے میں سمٹ کر تمھارے ہونٹوں تک آتا تو اتنا کومل اتنا پیارا سا لگتا کہ لوگ تمھیں چوم چوم لیتے

مجھے پہلے پہلے توتلی کہہ کر پکارا گیا۔

اب میں نے اپنے خزانے سے ایک ایک موتی چن چن کر نکالا اور تمھاری نذر کیا۔ میں تمھارے نازک ہونٹوں سے پھول بن کر جھڑتی رہی اور سارے گھر والے پھول چنتے رہے۔ پھر تمھارے ننھے منے احساسات اور جذبات نے میرا پلا اس طرح سہارا لیا کہ میں نے بھی تمھاری زبان سے ادا ہوتے وقت اپنی صورت کے بگڑ جانے میں بھی ایک حسن محسوس کیا۔

تم مسکراتے تو میں ہونٹوں کی چاندی ہوتی۔
تم آنسو بہاتے تو میں کہر بن کر گھر بھر میں پھیل جاتی۔ تم نے جو محسوس کیا اپنے دل اور دماغ سے محسوس کیا لیکن میری زبان سے ادا کیا۔ تم نے جو کچھ دیکھا جو سنا سب تمھارا تھا لیکن جب تم نے اظہار کرنا چاہا تو سب مجھے سونپ دیا۔

تم نے کھلونے لیے تم نے مٹھائیاں کھائیں، تم تماشے دیکھے۔ تمھاری یہ ساری کامیابیاں میری سفارش کے بغیر نہیں ہوئیں۔ ہوتے ہوتے تم چار سال کے ہو گئے

تمھیں یاد ہے۔ ان چار برسوں میں کہاں کہاں میں تمھارے ساتھ رہی۔ تمھاری امی کی گود میں، میں تمھارے ساتھ تھی۔ تمھاری بے معنی آواز بن کر، تمھاری قلقاری بن کر۔

اپنے بابا کی انگلی پکڑے جب تم بازار کا چکر لگاتے تو شیشے کے مرتبانوں سے جھانکتی ہوئی کھٹی میٹھی گولیاں سوندھے سوندھے بسکٹوں کو دیکھ کر تمھارا جی للچاتا۔ میں خود تمھاری مدد کو پہنچتی۔ تمھارے ہونٹوں پر ناچتی اور پھر کر تمھارے بابا کے کانوں میں یوں رس گھولتی کہ بسکٹ اور گولیاں تمھاری ننھی سی جیب میں ہوتیں۔

تم صحن میں گر پڑتے۔ تمھارے گھٹنوں پر چوٹ لگتی۔ جوں ہی تم بلکنے لگتے میں تمھارے ہونٹوں کی محراب سے کود پڑتی اور لپک کر تمھاری امی کو تمھارا دکھ درد سنا آتی۔ رات کو جب تم لحاف میں دبک جاتے تو میں تمھاری امی کے ہونٹوں پر مزے مزے کی کہانیاں بن کر تمھیں رجھاتی۔ پھر جب تمھاری آنکھیں جھپنے لگتیں تو میں ہی لوریاں بن کر اس میٹھی نیند کو بلا کر لاتی جو تمھاری آنکھوں میں سما جاتی۔

لیکن آج مجھ پر یہ بات بھی کھلی ہے تم نے سوچا بھی! تم جب مدرسے میں داخل کیے گئے تو میں بھی تمھارے ساتھ تھی۔ مگر مدرسے کے گیٹ پر تم نے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ مجھے گیٹ ہی پر چھوڑ کر جب تم اکیلے اسکول میں داخل ہوئے تو میں تمھاری واپسی تک گیٹ پر موجود رہی کہ شاید تمھیں میری ضرورت پڑے۔

واقعی کوئی بات دل کی گہرائی سے محسوس ہو تو سچی ہوتی ہے۔ میرا اندازہ صحیح نکلا۔ اجنبی ماحول نے چہروں اور نامانوس آوازوں کے اس جنگل میں تم ایسا بوکھلائے کہ رو پڑے۔ تمھارے چھوٹے سے دل پر اتنی اداسیاں چھا گئیں کہ تم نے بے تحاشا اپنی امی کو پکارنا چاہا۔ تمھیں میری مدد چاہیے تھی۔ میں لپک کر اس بات کا خیال کیے بغیر تم تک پہنچی کہ اسکول کے گیٹ میں مجھے داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے اور تمھاری مدد کی۔ تمھاری امی کو تمھارے دل کی باتیں سمجھائیں اور انھیں اسکول کے بند ہونے تک روک رکھا اور خود پچھلے پاؤں گیٹ پر واپس چلی آئی۔ میرا کتنا جی چاہا ہوگا کہ میں بھی دن بھر تمھارے ساتھ کلاس میں رہوں۔

کاش تم سمجھ سکتے تیز دھوپ میں تپتی زمین پر تنہا چھوڑ کر تم اسکول میں داخلے پر رضامند کیسے ہو گئے میرے ساتھی! میں یہ غم کیسے بھلا سکوں گی۔ میں نے محسوس کر لیا کہ اب مجھ پر وہ سب کچھ بیت جانے والا ہے جو ہر اس شے پر بیتا ہے جس کی محبتیں دلوں میں مر جاتی ہیں۔ لیکن مجھے بھی تو اپنی زندگی سے پیار ہے۔ میں بھی تو چاہتی ہوں کہ تمھارے ساتھ گھروں اور کھیل کے میدانوں سے اسکول اور کالجوں تک جاؤں۔ تمھارے ساتھ ساتھ پھلوں پھولوں۔ سو میں تمھاری ناقدری اور بے وفائی [illegible]

اب میں تمھیں چھوڑنے کے لیے روز ہی اسکول تک آتی اور تمھاری واپسی تک گیٹ پر منتظر رہتی۔ تم سے بات کرنے کے لیے ترستی۔ اس ایک ایک لفظ کے لیے ترستی جسے اپنے ہی جسم سے الگ کر کے میں نے تمھارے مزاج کے مطابق تراش خراش کے تمھاری آواز کی نذر کیا تھا۔

تم جوں ہی اسکول کے باہر آتے میں تمھارے ساتھ ہو جاتی۔ پھر تمھارا میرا ساتھ دوسرے دن تک پھر اس طرح رہتا کہ اب چھوٹے گا نہیں۔

کھیل کود، ہنسی مذاق، غم غصہ، شکوہ شکایت، مار پیٹ اور پھر دوستی۔ کتنے ہی مرحلوں سے تمھارے ساتھ گزرتی۔ یوں لگتا جیسے تم اور میں جدا ہو کر ایک دوسرے کا تصور ہی نہیں کر سکتے اور اگر اس کی کوشش کرتے ہیں تو کوئی ادھوری سی شخصیت بنتی ہے جو عجیب عجیب سی نیم تن، نیم جاں سی لگتی ہے۔

جب تم اسکول میں داخل ہوئے تھے تو مجھے کچھ یوں ہی سے لگے تھے جیسے تمھارا آدھا وجود چھین لیا گیا ہو۔ میں سوچتی رہی۔ تم نے یہ ذلت گوارہ کیسے کر لی۔ میں سوچتی رہی تمھاری غیرت کو کیا ہو گیا ہے۔ مجھے یقین تھا تمھارے دل میں میرے لیے پیار ہے لیکن پھر کونسی ایسی مجبوری ہے کہ تم اسکول کی چار دیواری میں پہنچ کر مجھے دشمن کی نظر سے دیکھتے ہو۔ اور پھر باہر آتے ہو تو میں تمھاری زندگی کا جز بن جاتی ہوں۔ یہ کیسی مصلحت ہے کہ تم نے ہونٹ سی لیے۔ یہ کیسی درس گاہیں کیسے مدرسے ہیں جن میں پہلا سبق ہی اپنوں سے بے رخی اور بے وفائی کا پڑھایا جائے گا۔

تم کچھ سوچ کر اداس ہو رہے تھے شاید یوں محسوس کر رہے ہو گے کہ

باقی ص ۱۲۹ پر

مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی

استاد کا دل

دارالعلوم ندوۃ العلماء کا نام تو آپ نے سنا ہوگا۔ لکھنؤ میں گومتی ندی کے کنارے ایک بہت اچھی تعلیم گاہ ہے اب سے ۷۷ برس پہلے (۱۳۱۱ھ میں) اس مدرسہ کی بنیاد پڑی تھی اس مدرسہ کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی تعلیم کے ساتھ نئے یوروپی علوم کی تعلیم بھی دی جائے۔ عربی زبان کے ساتھ انگریزی بھی پڑھائی جائے تاکہ دینی کام کے کرنے والے دنیا کے حالات سے بھی باخبر رہیں، وقت کی نئی ضرورتوں کو سمجھ سکیں اور زمانہ کے پیچیدہ معاملات کو اسلامی اصول کی روشنی میں حل کر سکیں۔

اب سے کوئی چالیس برس پہلے کی بات ہے ندوے میں ایک بڑے اچھے اور قابل بزرگ تھے۔ مولانا عبدالودود صاحب مرحوم وہ ضلع اعظم گڑھ (یو۔پی) کے ایک گانوں جیراج پور کے رہنے والے تھے۔ بہت ذہین تھے، بہت ذی علم اور معاملہ فہم تھے۔ اعلیٰ درجہ کی علمی قابلیت کے ساتھ انتظامی کاموں کا بھی بہت اچھا سلیقہ تھا۔

اس انتظامی صلاحیت کی وجہ سے تعلیمی خدمت کے علاوہ انھیں ایک بورڈنگ کی نگرانی بھی سپرد کی گئی تھی۔ انھوں نے بہت اچھا انتظام کیا۔ کئی سال یہ سلسلہ جاری رہا۔

ایک دن لڑکے بورڈنگ کے احاطے میں کھیل رہے تھے کسی لڑکے کا گیند ایک ملازم کے لگ گیا۔ ملازم کو تکلیف پہنچی اور اس نے غصے میں گیند پھینک دی۔

لڑکوں کو اپنی غلطی اور ملازم کی تکلیف کا خیال کرکے خاموش ہو جانا چاہیے تھا مگر وہ ملازم سے بے حد ناراض ہوئے جتنا ڈانٹ پھٹکار سکتے تھے ڈانٹا پھٹکارا پھر مولانا کی خدمت میں جاکر اس کی شکایت کی۔

مولانا نے تحقیقات کی تو معلوم ہوا کہ ملازم کو کافی تکلیف پہنچی ہے۔ انھوں نے لڑکوں کو سمجھایا کہ ملازم بھی آدمی ہے اسے بھی چوٹ لگتی ہے تمہاری گیند سے اسے تکلیف پہنچی اور اس نے درد کی شدت سے متاثر ہوکر ناگواری کے چند جملے کہہ دئے تو تمھیں برا نہ ماننا چاہیے۔

مگر لڑکوں نے اس فیصلے کو پسند نہیں کیا اور الٹے مولانا سے ناراض ہوگئے آپ جانیے وہ جاگیرداری کا زمانہ تھا ایک خادم کو مخدوم زادوں کے ہاتھ سے چاہے کتنی ہی تکلیف پہنچ جائے وہ اُف نہیں کر سکتا تھا۔ اسلامی مدرسہ کے طالب علم رات دن پڑھتے تھے اور پڑھ پڑھ کر دوسروں کے سامنے بیان کرتے تھے کہ اسلام نے آقا و غلام اور مالک و ملازم کے درمیان اونچ نیچ کے پرانے دستور ختم کر دیے ہیں اسلام کی فضیلتیں بیان کرتے وقت وہ بڑے فخر سے کہتے تھے ؎

تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے

لیکن اونچ نیچ کا سیکڑوں برس کا

ذہن چند برس کی تعلیم سے بالکل بدل نہیں سکتا تھا۔ مولانا کے منصفانہ فیصلے سے لڑکے بپھر گیے۔ ہر شخص کی زبان پر یہ الفاظ تھے۔

ہم اس طرح ذلیل کیے جائیں گے
نوکر کی یہ ہمت کہ اس نے ہماری شکایت
کی اور پھر مولانا کی یہ زیادتی کہ اس کو
برخاست کرنے کے بجائے الٹی ہم کو نصیحت
کرتے ہیں۔

طالب علموں کا جوش تو مشہور ہے ایک بار جب آجاتا ہے تو پھر سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ جلسہ ہوا، مشورے ہوئے پرجوش تقریریں کی گئیں اپنی عزت وشان کے حوالے دیئے گیے نتیجہ یہ ہوا کہ اس بورڈنگ ہی میں نہیں سارے دارالعلوم میں آگ لگ گئی۔ مطالبہ کیا گیا کہ ملازم کو فوراً برخاست کر دیا جائے ورنہ ہم اسٹرائیک کر دیں گے۔

دوسرے دن اسٹرائیک ہو گئی جس کا سلسلہ کئی دن جاری رہا۔ آخر کار معاملہ دارالعلوم کے ناظم (سکریٹری) کے کے سامنے پیش ہوا مجلس منتظمہ کے ارکان سے مشورہ ہوا اور لڑکوں کے اس خلفشار کو روکنے کی اس کے سوا اور کوئی تدبیر نظر نہ آئی کہ ان کا مطالبہ منظور کر لیا جائے۔ مولانا نے بورڈنگ کی نگرانی سے استعفا دے دیا۔ اس طرح مولانا کے وقار کو بھی صدمہ پہنچا، مالی نقصان بھی ہوا اور ان کی نیکنامی پر بھی اثر پڑا۔ مگر انھوں نے صبر وضبط کے ساتھ اس حادثہ کو برداشت کیا

اس واقعہ کو چھ سات مہینے گزر گیے سالانہ امتحان کا زمانہ قریب آیا۔ امتحان سے پہلے حساب صاف ہونا ضروری ہے مدرسہ اور بورڈنگ کے مطالبات جب تک ادا نہیں ہوتے طلباء کو امتحان میں شریک ہونے کی اجازت نہیں دی جاتی۔

اس وقت ایک طالب علم پر بہت بڑی رقم باقی تھی۔ یہ صاحب پچھلی اسٹرائیک کے بڑے پرجوش لیڈر تھے۔ انھی کی سرکردگی میں مولانا کے خلاف ایجیٹیشن ہوا تھا۔ انھی کی رہنمائی میں طالب علموں نے مخالفانہ جلسے کیے تھے اور مولانا کی عزت ووقار کو صدمہ پہنچایا تھا۔ انھی کی بدولت مولانا کی نیکنامی بدنامی سے بدلی تھی اور مالی نقصان برداشت کرنا پڑا تھا۔

ان صاحب پر اب بڑا نازک وقت آپڑا تھا بقائے کے ادا کرنے کی ان میں سکت نہ تھی اور اس کے بغیر امتحان دینے کی اجازت نہیں مل سکتی تھی۔ مختلف لوگوں کے پاس گیے لیکن کسی نے ضرورت کے مطابق ان کی مدد نہ کی۔

اس پریشانی کی حالت میں دیکھ کر بعض ساتھیوں نے مشورہ دیا کہ مولانا عبدالودود کے پاس جاؤ وہ کوئی راہ ضرور نکالیں گے۔ لیکن مولانا کے ساتھ جو بدسلوکی وہ کر چکے تھے اس کے بعد ان کی خدمت میں حاضر ہونے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

مگر جب امتحان کا وقت بالکل سر پر آگیا اور سال بھر کی محنت برباد ہوتی نظر آئی تو بے حیا بن کر مولانا کے مکان پر حاضر ہوئے، اطلاع کرائی، مولانا نے بلا لیا۔

یہ سمجھتے تھے کہ مولانا خوب بگڑیں گے۔ ڈانٹیں گے۔ اسٹرائیک کی بدسلوکی کا ذکر کر کے بے ادبی اور گستاخی کی باتوں کو گنائیں گے لیکن ان کی شفقت اور محبت وہمدردی سے یہ آس بندھی تھی کہ ڈانٹ پھٹکار کر امتحان میں شریک ہونے کی کوئی تدبیر بتائیں گے لیکن ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب انھوں نے یہ دیکھا کہ مولانا نے بڑی توجہ سے ان کا حال سنا پھر ایک حرف کہے بغیر اٹھے اور گھر کے اندر جا کر پوری مطلوبہ رقم لے آئے اور کہا لو یہ روپیہ لے جاؤ اور مدرسہ کا بقایا ادا کر کے

باقی صـ پر

جناب اظہر عزیز

نئے گیت گاؤ

نیا سال آیا نئے گیت گاؤ

خوشی سے یہ سارا جہاں جھوم اٹھے　　زمیں ہی نہیں آسماں جھوم اٹھے

وہ مستی ہو گل گلستاں جھوم اٹھے　　چمن تو چمن باغباں جھوم اٹھے

کچھ اس طرح چہکو ہنسو گنگناؤ

نیا سال آیا نئے گیت گاؤ

زمانہ تمھیں لاکھ سمجھے نہ قابل　　تم اپنے فرائض سے ہونا نہ غافل

جو ہنس ہنس کے سہہ لوگے تھوڑی سی مشکل　　تو قدموں کو خود بڑھ کے چومے گی منزل

اگر نام کرنا ہے کچھ کر دکھاؤ

نیا سال آیا نئے گیت گاؤ

کوئی دوست اب پھر بچھڑنے نہ پائے　　کوئی دل غموں سے اجڑنے نہ پائے

پھر اب کوئی لڑنے جھگڑنے نہ پائے　　بنی بات پھر سے بگڑنے نہ پائے

وہ پیغام اہل جہاں کو سناؤ

نیا سال آیا نئے گیت گاؤ

مولانا مقبول احمد سیوہاروی

کیا دیکھا

اورنگ زیب عالمگیر کے حالات پڑھنے کے بعد بڑا شوق ہوا کہ اس بادشاہ کی قبر پر چلنا چاہیے اور فاتحہ پڑھنا چاہیے۔ کون عالمگیر—؟ وہی مغل شہنشاہ جس نے اپنے ذاتی خرچ کے لیے شاہی خزانہ سے کبھی کوئی پیسہ نہیں لیا جس نے قرآن پاک اپنے قلم سے لکھ لکھ کر ہدیہ کیے اور اپنا خرچ چلایا۔ جس نے اسلام کا قانون سمجھنے اور سمجھانے کے لیے ایک بڑا محکمہ قائم کیا اور بڑے بڑے عالموں کو بلایا اور جن باتوں میں مسلمانوں کو شک اور اختلاف تھا صحیح طور پر بتلوایا اور ایک ایسی کتاب تیار کی کہ اگر کسی کو اسلامی قانون سمجھنے اور سمجھانے میں الجھن ہو جائے تو اس کتاب کو دیکھ کر وہ الجھن سلجھ جائے۔ اس کتاب کا نام فتاویٰ عالمگیری ہے اور تمام عربی مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہے۔

ہمیں شوق تھا کہ اس بادشاہ کی قبر دیکھیں جس نے کبھی کھانے پینے میں، رہنے سہنے میں، بیاہ شادی میں فضول خرچیاں نہ کیں جس نے اپنے محل کو سونے چاندی سے آراستہ نہیں کیا اور جواہرات سے نہیں سجایا۔

ہم دیکھیں کہ اس کی قبر کا گنبد کتنا بڑا ہے گنبد پر سونے چاندی کا کلس لگا ہوا ہے یا نہیں!

اچھا آؤ پہلے وہ شہر دیکھیں جہاں اس نے چوبیس برس گزارے۔

اس شہر کا نام اورنگ آباد ہے۔ اورنگ آباد نام اسی لیے ہے کہ چوبیس برس تک اورنگ زیب یہاں رہا ہے۔

اورنگ آباد کی سب سے عجیب چیز پانی کے وہ نل ہیں جو کسی زمانے میں تمام شہر کو پانی پہنچاتے تھے۔ ان نلوں اور پانی کے خزانوں کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ انگریزوں کو اپنی انجینیری پر بڑا غرور تھا۔ مگر ان نلوں کی درستی نہ کرا سکے۔ اور یہ سینکڑوں برس کی مفید ایجاد برباد ہو کر رہ گئی۔

یہ نل لوہے کے نہ تھے مٹی کے تھے اس لیے کتنی ہی دھوپ کیوں نہ ہو پانی ٹھنڈا ہو کر آتا۔

اورنگ آباد کی آب و ہوا بہت اچھی ہے۔

اورنگ زیب کے زمانے میں اس شہر کی آبادی سترہ لاکھ تھی اور میلوں تک محل باغ اور سڑکیں پھیلی ہوئی تھیں اب سب کھنڈر ہیں اور ویرانوں میں جو دو رنگ چلے گئے ہیں عمارتوں کے نشانات ملتے ہیں۔

اورنگ آباد میں ایسی کوئی عمارت نہیں جو شاہ جہاں کی بنائی ہوئی عمارتوں

کا نمونہ پیش کرنے کے لیے فقط رابعہ دورانی کا مقبرہ تاج محل آگرہ کے نمونے پر بنا ہوا ہے۔

رابعہ دورانی اورنگ زیب کی بیگم تھیں۔ ان کا اصل نام دل رس بانو تھا۔ یہ مقبرہ ان کے بیٹے شہزادہ محمد اعظم خاں نے تعمیر کرایا ہے اور پورے سات برس میں تیار ہوا ہے۔ چھ لاکھ اڑسٹھ ہزار دو سو تین روپیہ سات آنے خرچ ہوئے ہیں۔ پانچ سو گز لمبائی اور تین سو گز چوڑائی ہے

آگرہ کے تاج محل کی بلندی بہت زیادہ ہے۔ اس کے قیمتی پتھر اس کا حسن و جمال دیکھنے والے پر جادو کا اثر ڈالتے ہیں رابعہ دورانی کا مقبرہ سطح کے لحاظ سے نیچا ہے۔

اورنگ آباد کی خاص عمارتوں میں ایک پن چکی ہے۔ کسی زمانے میں یہاں ایک درویش رہتے تھے جن کا نام مسافر شاہ تھا۔

یہ چکی پانی کے زور سے چلتی تھی اور اس کا آٹا ان طلباء کو دیا جاتا تھا جو مدرسوں میں پڑھتے تھے۔ یہ سب انتظام بادشاہ کی طرف سے تھا چکی تو اب نہیں چلتی چکی کے پاٹ رکھے ہوئے ہیں۔

حضرت نظام الدین اورنگ آبادی کا مزار بھی اسی شہر میں ہے سنا ہے کہ ان کی درگاہ کا وقف اٹھائیس ہزار روپیہ سالانہ کا ہے۔

مسافر شاہ کی درگاہ کی جاگیر بھی چالیس ہزار روپیہ سالانہ کی ہے شہنشاہ اورنگ زیب کے رہنے کا مکان بھی اورنگ آباد میں ہے اور اصلی حالت میں موجود ہے۔ اس مکان کا سلسلہ دور تک چلا گیا ہے اسے قلعہ ارک کہتے ہیں۔

یہ تمام عمارت بالکل سادہ ہے چھوٹی اینٹ کی بنی ہوئی ہے یونانی طرز کی عمارت ہے۔ ان سب عمارتوں میں شہنشاہ عالمگیر کے رہنے کی جگہ دیکھ کر دل پر بڑا اثر ہوتا ہے اور مغلوں کے پر تکلف ایوان خاص نگاہ سے گر جاتے ہیں۔

شہنشاہ کے بیٹھنے اور آرام کرنے کی جگہ اتنی نیچی ہے کہ اگر ذرا لمبا آدمی کھڑا ہو تو اس کا سر چھت سے لگ جائے۔

اسی مکان کے سامنے پانچ چھ قدم کے فاصلے پر ایک مسجد ہے جہاں بادشاہ بیٹھ کر کلام پاک لکھا کرتے تھے۔ اور قرآن پاک ہدیہ کر کے اپنی ضرورتیں پوری کرتے تھے۔ اور اسی مسجد میں پانچوں وقت نماز پڑھتے تھے۔ اور آرام کے لیے تنگ مکان کی کسی کوٹھری میں آرام کرتے تھے۔

بادشاہ کا غسل خانہ ایک تنگ جگہ ہے غسل خانہ کا فرش کچا ہے جس کے ایک طرف گھڑا رکھنے کی جگہ ہے۔ نشان اب تک بنا ہوا ہے۔ اس غسل خانے کو دیکھ کر خیال بھی نہیں گذر سکتا کہ یہ کبھی اولوالعزم بادشاہ کے غسل کی جگہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنگ مرمر کے فرش پر غسل نہیں فرمایا تھا اس لیے اس دیندار بادشاہ نے بھی پسند نہیں کیا کہ شاہانہ عشرت کدے بنا کر عیش پرستی کا نشان چھوڑ جائے۔

مغل بادشاہوں کے جہاں جہاں حمام بنے ہوئے ہیں ان میں راحت و آسایش کی ایسی عجوبہ کاریاں ہیں کہ انسان دنگ رہ جاتا ہے لیکن یہاں کوئی چیز بھی نہیں ہے۔

قلعہ ارک کی ہر عمارت نقش و نگار جواہرات کی پچی کاری اور چمک دمک سے خالی ہے۔

آپ نے اورنگ آباد دیکھ لیا اب خلد آباد چلیے جہاں اس بادشاہ کی آخری آرام گاہ ہے۔

خلد آباد کی آب و ہوا بہت اچھی ہے یہاں بیمار جاتے ہیں اور اچھے ہو جاتے

ہیں جسم کی بیماریاں بھی دور ہو جاتی ہیں اور روح کی بیماری
بھی جاتی رہتی ہے کیوں کہ اسی خلد آباد میں بڑے بڑے مقدس
بزرگ آرام کر رہے ہیں شہنشاہ اورنگ زیب کی قبر بھی یہیں
ہے۔ مگر جب ہم نے قبر دیکھی تو حیرت سے دیکھنے لگے کہ ایک
سادہ قبر ہے جس پر تلسی کا پودا ہوا سے لہراتا رہتا ہے۔ نہ سنگ
مرمر کا صحن ہے۔ نہ عالیشان گنبد ہے نہ بلند دروازہ ہے نہ
قبر پر مخمل اور زری کی چادر ہے۔

یہ وہ قبرستان ہے۔ جہاں بڑے بڑے درویشوں
عالموں اور شاعروں کی قبریں ہیں۔

یہی وہ قبرستان ہے جس میں حضرت خواجہ برہان الدین
غریب کی قبر ہے، حضرت شیخ زین الدین عراقی کی قبر ہے، حضرت
خواجہ حسن علا سنجری کا مرقد ہے۔

حضرت شیخ برہان الدین غریب وہ بزرگ ہیں جنھوں
نے مدتوں حضرت خواجہ نظام الدین اولیا دہلوی کی خدمت
میں رہ کر عبادت و ریاضت کی پھر انھیں اجازت دی گئی کہ
دکن جا کر مخلوقِ الٰہی کی رہنمائی کریں۔ حضرت زین الدین عراقی
وہ ہیں جو عراق سے ہندوستان آئے جنھیں اپنے علم پر بڑا ناز تھا
مگر خواجہ برہان الدین غریب کو دیکھتے ہی سارا غرور اور ناز
ختم ہو گیا۔ اور ان کا روحانی فیض حاصل کر کے مرید ہو گئے۔
اور خواجہ برہان الدین کی جگہ دکن میں مخلوقِ خدا کو سچا اور اچھا
راستہ بتانے لگے۔ خواجہ حسن علا سنجری وہ ہیں جو شاہی فوج
میں افسر رہے اور حضرت خواجہ نظام الدین کی پاک مجلسوں میں
بیٹھے اور جو کچھ خواجہ نظام الدین کی زبان سے نکلا وہ لکھ کر
ایسی یادگار کتاب چھوڑ گئے جسے لوگ پڑھتے ہیں اور آنکھوں
سے لگاتے ہیں۔ کیوں کہ اس کتاب میں حضرت خواجہ
نظام الدین اولیا کے ارشادات
اور [illegible] ہیں۔ شہنشاہ اورنگ
زیب نے اپنی وفات کے وقت وصیت کی تھی کہ میری قبر شیخ زین
الدین عراقی کی قبر کے قریب بنائی جائے تاکہ ان کے پڑوس کے
صدقہ سے حساب کتاب کی سخت پکڑ نہ ہو۔

شہنشاہ اورنگ زیب نے ۱۱۱۸ھ ہجری میں وفات
پائی ہے۔ وفات احمد نگر میں ہوئی تھی۔

اب ایک حیرت انگیز بات سنو اور وہ یہ ہے کہ ہندستان
کے بڑے بڑے بزرگوں کی قبر پر قرآن پاک روزانہ ختم ہونے
کا کہیں انتظام نہیں رہا ہے۔ مگر شہنشاہ اورنگ زیب کی قبر پر
وفات سے لے کر اب تک روز کے روز ایک قرآن ختم ہوتا ہے۔

ایک مدرسہ حفظ القرآن جس میں بچوں کو قرآن کا
حافظ کرایا جاتا ہے۔

کیا ہندوستان میں کسی بڑے سے بڑے بادشاہ،
بڑے سے بڑے بزرگ، عالم درویش کی مثال بتائی جا سکتی
ہے جہاں قرآن خوانی اور ثواب پہنچانے کا ایسا سلسلہ رہا ہو۔

نہ معلوم خدا کو اس جلیل القدر اور عظیم ہستی کی ایسی
کیا بات پسند آئی کہ اس کا یہ مرتبہ ہے۔

دشمن بدنام کریں یا دوست بے قدری کریں۔
خدا کے یہاں تو اس کی منزلت اور عزت ہے۔

کہاں ہیں اکبر، جہانگیر، ہمایوں اور بابر کوئی بھی
اس کی ہمسری نہیں کر سکتا۔

اس کی حکومت مرنے کے بعد بھی بدستور ہے اور
فیض جاری ہے۔ روزانہ ایک من بیس سیر کا لنگر تقسیم ہوتا ہے
اور لنگر بھی اسی طرح جاری ہے جیسے قرآن خوانی جاری ہے۔

جب ہم نے قبر پر فاتحہ پڑھی تو ہمارے دل میں ایک
آرزو پیدا ہوئی۔ وہ آرزو یہ ہے کہ اب بھی کیا ایسے حاکم اور بادشاہ
جنم لیں گے۔ جو سادہ مزاج ہوں اور عیش پرست
نہ ہوں۔

جناب فوق فاروقی

"نئی پود کے
بچّے کے نام"

تو اک پھول ہے مہکا مہکا — تو اک گیت ہے میٹھا میٹھا
تیرے لب پر جو ہے تبسم — تجھ پہ نچھاور ماہ و انجم
مستقبل کا تو ہے سہارا — ممتا کی آنکھوں کا تارا
باپ کے دل کی آس ہے تو ہی — خوشیوں کا احساس ہے تو ہی
تجھ سے روشن گھر کا آنگن — تو ہے تو سندر ہے جیون
تیری شرارت من کو لبھائے — تو ہونٹوں پر پھول کھلائے
اندھیاروں میں نور بنے گا — قوم و وطن کی لاج رکھے گا
امن کے نغمے تو گائے گا — دنیا کو یہ سمجھائے گا

انساں سے سنسار ہے سب کچھ
پیار ہے جیون پیار ہے سب کچھ

جناب غلام یزدانی
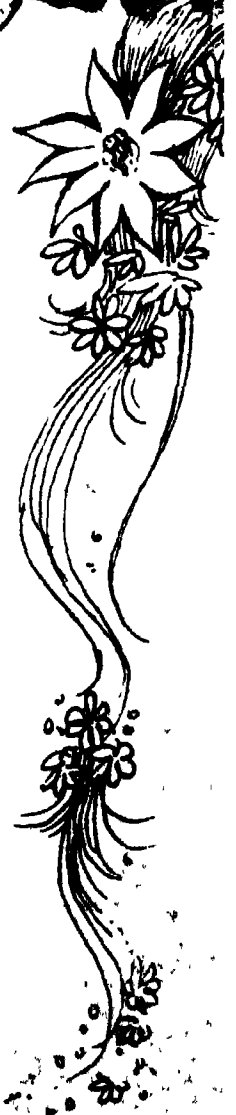
میں ایک بڑا بھائی ہوں

(چھوٹوں سے معافی کے ساتھ)

بچپن میں ایک چھوٹی سی شہزادی کی کہانی سنی تھی جس نے ایک رات سوتے وقت دعا مانگی کہ صبح تک اپنے سارے بہن بھائیوں میں وہ سب سے بڑی ہو جائے اور اسی رات پریوں کی ملکہ نے اسے سب سے بڑا کر دیا۔

اس کے بعد کیا ہوا یہ تو کوئی بڑی بہن ہی جانے مگر اس میں شک نہیں گھر میں چھوٹوں کی حیثیت بہت گری ہوئی ہوتی ہے۔ گھر کا ہر بڑا، چاہے وہ برس دو برس ہی بڑا کیوں نہ ہو چھوٹوں پر حکومت جتایا کرتا ہے۔ جسے دیکھو اپنا رعب جماتا ہے۔ ذرا سی بات ہوتی امی نے ڈانٹ دیا۔ صبح ذرا دیر سے سو کر اٹھے ابا جان نے خبر لی۔ ذرا بھائی جان کی پتنگ کو ہاتھ لگایا انھوں نے کان کھینچے۔ باجی آپا کی بلی کو ذرا پیار کیا اور انھوں نے آنکھیں دکھائیں۔

کہیں آنا جانا ہوا تو وہ بھی بڑوں کے رحم و کرم پر۔ چاہیں تو ساتھ لے جائیں نہیں تو بسور کر چپ ہو جاتے۔ غرض یہ کہ ہر وقت چھٹ پنے کی وجہ سے جان مصیبت میں رہتی ہے۔ کون ہے جو ان حالات سے اکتا کر جلد سے جلد بڑا ہو جانا نہیں چاہتا۔

مگر ہر نعمت کی قدر اس کے چھن جانے کے بعد ہوتی ہے۔ جب چھوٹے تھے تو بڑے ہونے کی تمنا تھی اور اب بڑے ہیں تو چھوٹے ہونے کی دعا مانگتے ہیں۔ اگر آپ نہ چھوٹے ہیں نہ بڑے یعنی اپنے والدین کے اکلوتے لاڈلے ہیں تو آپ کی بات الگ ہے۔

ایک طرح سے آپ فایدے میں بھی ہیں اور نقصان میں بھی۔ فایدے میں یوں کہ اللہ میاں نے فضل کیا اور آپ کو بڑا بھائی نہ بنایا اور نقصان میں اس لیے کہ آپ چھوٹا بھائی بننے کے فایدوں سے محروم رہ گئے۔

ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ آگے چل کر آپ کے یہ جملہ حقوق محفوظ نہ رہ سکیں۔ لیکن مجھے ڈر ہے ایسی صورت میں بھی آپ تو آپ صرف بڑے ہی بن سکتے ہیں اور بڑے ہونے کے کیا معنی ہیں اسے بس وہی خوب سمجھتے ہیں جو "بھیا" "بھائی صاحب" یا "بھائی جان" کہلاتے ہیں۔

دادی اماں اللہ بخشے کہا کرتی تھیں "پوت ہوئے سیانے دلدّر گئے بیگانے" اس وقت تو ہم یہ کہاوت سن سن کر خوش ہوا کرتے تھے کہ یہ ہماری ہی شان میں

کہی جا رہی ہے مگر اب کچھ دنوں سے اس کا ٹھیک ٹھیک مطلب سمجھ میں آنے لگا ہے اور وہ یہ کہ بڑے صاحب زادے ماشاء اللہ اب سیانے ہو گئے اور والد صاحب کو گھر کی ساری ساری ذمہ داریوں سے نجات مل گئی۔

نتیجہ یہ کہ اب بڑے صاحب زادے ہیں اور گھر کے سارے کام کاج۔ کسی کا جوتا بازار سے خرید کر لاؤ، کسی کے کپڑے درزی کے ہاں دو۔ کسی کی اوڑھنی رنگوا کر لاؤ۔ کسی کی سہیلی کو دعوت کا بلاوا دے کر آؤ۔ کسی کو حساب کراؤ تو کسی کو سائنس پڑھاؤ۔ انہیں راست بازی پر مضمون لکھ کر دو تو ان کے فراک کے لیے کاڑھنے کو عمدہ سا گل کا ڈزاین بناؤ۔ گھر میں کوئی مہمان آئے تو اس کی تواضع کرو۔ کسی کے ہاں شادی بیاہ یا کسی تقریب میں کوئی نہ جا سکے تو وہاں اس کی نمایندگی کرو۔ کنبہ میں کوئی بیمار پڑے تو سب کی طرف سے اس کی مزاج پرسی کو جاؤ۔ خاندان بھر کے خطوں کے جواب دو۔ اور پھر روزمرہ کے گھر کے کام کاج رہے وہ الگ۔

بزرگوں کو تو خیر چھوڑ یے وہ اس عمر کو پہنچنے تک بہت کام کر چکتے ہیں اور ہمارا فرض ہے کہ بڑے ہونے کے بعد ان کے سارے کام خود سنبھال لیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا گھر کے سارے فرض صرف بڑے بھائی کے لیے ہی رہ گئے ہیں اور چھوٹے پر ان کی کوئی ذمہ داری نہیں؟

گھر کے کسی معمولی سے کام کے لیے چھوٹے بھائی صاحب سے کہیے۔ کیا مجال جو کبھی ہاں کر دیں۔ کیسا ہی ضروری کام ہو صاف جواب دیں گے "مجھے فرصت نہیں" "آج ہمارا فٹ بال فاینل ہے" "شام کو ایک دوست کے ہاں دعوت ہے"...... اگر مجبوراً انھیں کسی کام کا وعدہ کر لینا پڑے تو اس بات کا یقین نہیں کہ وہ کام ہو جائے گا۔ دوسرے دن پوچھیے تو بڑے اطمینان سے کہہ دیں گے "میں بھول گیا بھائی جان" اور اگر کبھی کوئی کام کرنا ہی پڑا تو اسے ایسا بگاڑیں گے کہ پھر بھول کر بھی کوئی ان سے کسی کام کے لیے نہیں کہے گا۔

اپنی چیزوں کو برتنا ہر آدمی کا قانونی حق ہے مگر بڑے بھائی کی چیزوں کو استعمال کرنا چھوٹے بھائی اپنا پیدایشی حق سمجھتے ہیں۔ ضرورت کے وقت کپڑے ڈھونڈو تو غایب، جوتے دیکھیے تو لاپتہ۔ معلوم ہوا چھوٹے صاحب پہن گئے ہیں۔ اب اگر ان کے میلے کپڑے دھوبی کے ہاں نہ ڈلواؤ یا ان کے جوتوں کی مرمت خود نہ کراؤ تو بس اپنوں سے بھی ہاتھ دھو لو۔ وہ مزے سے آپ کی چیزیں استعمال کرتے رہیں گے۔

کسی کتاب کی ضرورت پڑے اور اسے الماری میں تلاش کیجیے تو ناممکن ہے کہ مل جائے۔ چھوٹے میاں کے کسی دوست کے پاس ہوگی۔ پھر مزے کی بات یہ کہ اس کی خبر ہمیں تو کبھی ہوتی نہیں خود انھیں اکثر معلوم نہیں ہوتا کہ یہ کتاب انھوں نے کسے دی ہے۔

اب اگر لے جانے والے صاحب خیر سے ایماندار ہیں اور کتابیں غلطی سے واپس کرنا بھی جانتے ہیں تو ممکن ہے سال دو سال میں جب انھیں خیال آئے لوٹا دیں ورنہ کسی کو کتاب دینا کھونے کے برابر ہے۔

اپنے آپ کو عقلمند سمجھنے میں کوئی برائی نہیں مگر اس کے ساتھ ہی دوسروں کو بے وقوف سمجھنا عقلمندی نہیں۔ چھوٹے بھائی اپنے آپ کو تو خیر سب سے زیادہ عقلمند

سمجھتے ہی ہیں مگر بھائی جان ان کی نظروں میں کچھ ہوتے ہی
نہیں۔ وہ انھیں کچھ سمجھتے ہی نہیں۔ بات بات میں الٹی سیدھی
بحث شروع کر دیں گے غلطی کریں گے اور اپنی غلطی پر اڑے رہیں گے۔
ارادے کے ایسے پکے کہ جو ایک دفعہ کہہ دیں گے
وہ کرکے رہیں گے اور جو کہا جائے وہ کبھی نہیں کریں گے۔
خود گھر کی پھلی تک نہیں پھوڑتے مگر دوسروں کے کام میں
برائی نکالنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

بات بات پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں گھر کا کھانا
انھیں پسند نہیں آتا مگر کھانے بیٹھتے ہیں تو سب سے زیادہ
ترکاری کھا جاتے ہیں اور میٹھے پر تو سارا حق انھیں کا ہوتا ہے۔

بڑے بھائی بہت جلد ان سب چیزوں کے عادی
ہو جاتے ہیں۔ ان کا تو بس ایک کام ہے اور وہ ہے کام کرنا۔
جتنا زیادہ کام کرتے ہیں اتنا ہی ان کے سر تھوپا جاتا ہے۔
آخر میں یہ نوبت ہو جاتی ہے کہ جب کبھی گھر میں کسی ضروری
کام کا ذکر ہو تو اس کے ساتھ یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ اسے
"بڑا" ہی کرے گا۔

"پھر ان سب چیزوں کے ہوتے ہوئے اگر کوئی
کام ذرا وقت پر نہ ہو تو ہر ایک کو شکایت بھائی جان سے
چھوٹوں کو چھوڑیے اگر بڑوں سے بھی کبھی مجبور ہو کر
چھوٹے میاں کی شکایت کیجیے تو ہمدردی تو رہی ایک طرف
جواب ملے گا "بھئی تم بڑے ہو، وہ چھوٹا ہے۔ آخر بچہ
ہی تو ہے۔" چلیے چھٹی ہوئی۔ چھوٹے ہمیشہ سے والدین
کے لاڈلے ہوتے ہیں۔

داستان بڑی لمبی ہے۔ مختصر یہ کہ چھوٹے بھائی
اپنی بے فکری اور آزاد پوزیشن کو خوب سمجھتے ہیں اور اس سے پورا
پورا فایدہ اٹھاتے ہیں اور بڑے
بھائی دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ شروع
شروع میں تو چھوٹوں پر ان کا کچھ تھوڑا بہت رعب رہتا ہے
مگر ذرا بڑے ہوتے ہی وہ ہاتھ پیر نکالتے ہیں کہ پھر کچھ
کہتے نہیں بنتی۔

اس کے بعد تو وہ والدین کی نہیں سنتے بھائی جان
کس شمار میں ہیں۔ دوسری طرف بڑے بھائی پر الٹی ہی گزرتی
ہے عمر کے ساتھ ساتھ ان کی پریشانیاں اور مشکلیں بڑھتی
ہی جاتی ہیں۔ اب تک تو صرف چھوٹوں سے ہی شکل تھی بڑے
ہوئے تو بڑوں کو بھی بھگتنا پڑتا ہے۔

نہ جانے کیا بات ہے جیسے جیسے بچے بڑے
ہوتے جاتے ہیں امی اور ابا میاں میں لڑائی بڑھتی جاتی ہے اور
جب کبھی لڑائی ہوتی ہے مقدمہ بڑے صاحبزادے کے آگے
پیش ہوتا ہے اس لیے کہ اب وہی گھر کے بڑے کہلانے لگتے
ہیں۔ ادھر لڑائی ہوئی اور ہمارا لکھنا پڑھنا ختم سب کام کاج چھوڑیے
اور دونوں طرف کے بیانات سنیے۔ ظاہر ہے زیادتی دونوں
میں سے کسی ایک کی ضرور ہوتی ہے مگر اب شکل یہ
کہ ان کی وکالت کرو تو وہ خفا، ان کی طرف داری کرو تو یہ
خفا اور اگر جھگڑے کو نبٹانے کے لیے غیر جانبداری
کی پالیسی اختیار کرو تو دونوں خفا۔

بڑی بہنوں کا حال تو معلوم نہیں نہ جانے
ان پر کیا گزرتی ہے مگر ہاں بڑے بھائی جتنے بھی ملے
سب کو جھینکتے ہی دیکھا۔ اپنا تو یہ حال ہے کہ بس
گھبرا کے یہ کہتے ہیں ؎

"سگ باش برادر بزرگ مباش"

جناب یوسف ناظم

نیچے سے اوپر تک

پاجامہ :۔ آدمی کے لباس میں سب سے زیادہ ضروری چیز پاجامہ ہے۔ پاجامے کے اصل میں دو حصّے ہوتے ہیں، لیکن ان دونوں کو اس طرح جوڑ دیا جاتا ہے کہ یہ پھر الگ نہیں ہو سکتے پاجامے کے دونوں حصّے الگ کر دیے جائیں تو یہ کسی کام کے نہیں رہتے۔ نفاق کا نتیجہ یہی ہوا کرتا ہے۔

پاجامے کو کمر کے گرد ازاربند کی مدد سے باندھا جاتا ہے۔ ازاربند ڈالنے کے لیے پاجامے کے اوپری حصّے میں ایک نالی بنا دی جاتی ہے۔ اس نالی کو نیفہ کہا جاتا ہے۔ نیفے کے بغیر پاجامہ تیار ہی نہیں ہو سکتا۔ (پاجامہ جب دُھلائی کے لیے لانڈری میں دیا جائے تو اس میں سے ازاربند فوراً نکال لینا چاہیے ورنہ دھوبی یہ ازاربند کبھی واپس نہیں کرے گا۔) پاجامہ پہن کر آدمی "کمربستہ" ہو جاتا ہے۔

بہت تنگ مُہری کے پاجامے کو 'چوڑی دار پاجامہ' کہا جاتا ہے۔ اسے پہن لیا جائے تو اس میں گھٹنوں کے قریب تک چوڑیاں بن جاتی ہیں۔ مرد بے چارے کانچ کی یا سونے چاندی کی چوڑیاں نہیں پہن سکتے، اس لیے ان کے لیے یہ خوبصورت پاجامہ ایجاد کیا گیا۔ مردوں کی ٹانگیں عورتوں کے ہاتھوں کی طرح دکھائی دینے لگتی ہیں۔ ان چوڑیوں میں البتّہ آواز نہیں ہوتی۔ اس پاجامے کو پہننے کے لیے ایک گھنٹہ اور اسے اتارنے کے لیے دو گھنٹے لگتے ہیں۔ اتارتے وقت اسے ادب سے زمین یا پلنگ پر بیٹھ کر بڑی محبت کے ساتھ چُمکار چُمکار کر اتارنا پڑتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ آدمی سی، سی بھی کرتا جاتا ہے جیسے کسی بڑی تکلیف میں مبتلا ہو۔ چوڑی دار پاجامہ اتارنے کے بعد آدمی بالکل تھک جاتا ہے اور کوئی اور کام بالکل نہیں کر سکتا۔

جو لوگ اور کوئی ورزش نہیں کرتے، دن میں ایک مرتبہ ضرور یہ پاجامہ پہن کر اتارا کرتے ہیں۔ اس طرح بھوک کھل جاتی ہے۔

پتلی ٹانگوں والے جب اس پاجامے سے شوق کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے دواخانے سے ٹانگوں پر پٹیاں بندھوا کر چلے آ رہے ہوں۔

موٹے لوگ اس پاجامے میں بالکل پھنس جاتے ہیں اور اس کے باہر نہیں نکل سکتے جب تک اس کے اندر رہتے ہیں مشکل سے سانس لیتے ہیں۔ چوڑی دار پاجامے کو انسان سے اتنی محبت ہو جاتی ہے کہ وہ اس کی ٹانگوں سے جدا ہونا نہیں چاہتا۔

بہت زیادہ ڈھیلے پائنچوں کے پاجامے ایئرکنڈیشنڈ کمروں کی طرح ہوتے ہیں۔ یہ پاجامہ پہن کر آدمی ایسا محسوس کرتا ہے جیسے شملہ کی پہاڑی پر کھڑا ہو۔ چھوٹے قد کے لوگ ایسا پاجامہ پہن کر بالکل اُستواز نظر آتے ہیں۔

34126 ایسے پاجاموں پر دو طرح کی استری ہوتی ہے۔ آڑی استری اور کھڑی استری۔ آڑی استری وہ جس کی وجہ سے

پاجامہ لفافہ بن جاتا ہے۔ کھدی استری سے پاجامہ لمڑی کے
نوجوان کی طرح اٹن شن حالت میں کھڑا ہو جاتا ہے کھڑی
استری کا پاجامہ پہن کر آدمی بہت خوش رہتا ہے اور سمجھتا ہے
اس نے کمال کر دیا۔

بہت زیادہ ڈھیلے پائنچوں کے پاجامے کا فایدہ یہ
ہے کہ سڑک پر چلتے وقت آدمی کسی اور کے دھکے سے نہیں خود
اپنے پائنچوں میں الجھ کر منہ کے بل گر سکتا ہے۔ یہ پاجامہ کچھ
اس ترکیب سے سیا جاتا ہے کہ اس کے پائنچوں میں آدمی کے
پاؤں کا الجھنا ضروری ہو جاتا ہے۔

اس پاجامے کا ایک اور فایدہ یہ ہے کہ یہ پاجامہ آدمی
سے ہمیشہ دو قدم آگے چلتا اور منزل پر آدمی سے ہمیشہ دو فٹ
پہلے پہنچتا ہے۔ اس پاجامے کا تیسرا فایدہ یہ ہے کہ آدمی سڑک
پر ننگے پاؤں بھی چل سکتا ہے۔ اس کے ڈھیلے پائنچوں میں اُس
کے پاؤں کسی کو نظر ہی نہیں آتے۔

اور بھی پاجامہ اس پاجامے کو کہتے ہیں جو چوڑی دار
نہ ہو لیکن ٹانگوں سے تقریباً لپٹ کر رہے۔ یہ تکیے کے غلاف
کی طرح ہوتا ہے اور آسانی سے اُترتا اور چڑھتا ہے۔ تکیے
کے غلاف پر پھول بنائے جاتے ہیں لیکن اس پاجامے کو بغیر
پھولوں کے پہنا جاتا ہے۔ پھولوں والا رنگین پاجامہ صرف
سرکس کے جوکر پہنا کرتے ہیں۔

ایک اور پاجامہ ہوتا ہے جو اوپر سے گنبد کی شکل کا ہوتا
ہے اور پائنچوں کے پاس بالکل تنگ۔ اسے پہن کر آدمی غبارہ
معلوم ہونے لگتا ہے۔ یہ اصل میں پٹھانی پاجامہ ہوتا ہے جو
چھ گز کپڑے سے کم میں سل نہیں سکتا۔ اسے ایک آدمی سی بھی
نہیں سکتا۔ کم سے کم دو آدمی مل کر اسے سیتے ہیں۔ بچے اس
پاجامے کو دیکھ کر کبھی کبھار ڈر بھی
جاتے ہیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا
کہ اس کے اندر ہوا کیسے بھر گئی ہوگی۔ جب یہ پاجامہ اتارا جاتا
ہے تو اس میں سے ہوا خود بخود نکل جاتی ہے۔

پاجامہ ہی وہ لباس ہے جس میں سیدھے اور الٹے
پائنچے کی قید نہیں۔ آدمی اس کا رخ بدل کر بھی پہن سکتا ہے۔ اگر
سامنے کی طرف روشنائی کا دھبّہ ہو تو وہ پیچھے چلا جاتا ہے۔
ایسی سہولت کسی اور لباس میں نہیں۔ آدمی شروع ہی پاجامے
سے ہوتا ہے ــــ آدمی خود کب پاجامہ بن جاتا ہے پھر کبھی سنانا۔

شلوکہ: شلوکہ بہت پرانی قسم کا لباس ہے
ہندوستان سے جاتے وقت انگریز اسے اپنے ساتھ تو نہیں
لے گئے لیکن بنیان یہاں چھوڑ گئے۔ شلوکے کی جگہ بنیان نے
لے لی ہے اور اب بہت کم لوگ شلوکہ پہنتے ہیں۔ شلوکہ آدمی کے
اوپری حصے کا لباس ہے لیکن یہ لباس ہے بھی اور نہیں بھی
ہے اس لیے کہ اس کے پہننے سے جسم کا کچھ حصہ چھپتا ہے اور
نہیں اس لیے کہ صرف شلوکہ پہن لینا کافی نہیں۔ شلوکے کے اوپر
کرتا پہننا ضروری ہے۔ کرتے کے بغیر شلوکہ ایسا ہی لگتا ہے جیسے
صرف طشتری رکھی ہو اور پیالی نہ ہو۔

شلوکہ پہن کر آدمی ایک انچ موٹا ہو جاتا ہے اور
اس کا وزن بھی دو ڈھائی سو گرام بڑھ جاتا ہے۔ آدمی نے
شلوکہ اصل میں اس لیے پہننا شروع کیا کہ اس میں جیبیں ہوتی
ہیں۔ کاڑی کی ڈبی (یا سلائی) بیڑی، تمباکو کی شیشی، چھالیا
کی تھیلی وغیرہ وغیرہ آدمی گھر میں بھی ساتھ لیے لیے پھر سکتا ہے۔

روپے پیسے رکھنے کے لیے ہشیار لوگ شلوکے میں
اندر کی طرف جیب لگواتے ہیں۔ یہ جیب مشکل سے کٹتی ہے
شلوکے کی جیب کاٹنے والی ترکیب ابھی دریافت نہیں ہوئی۔
شلوکے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک واسکٹ
کی شکل کے جو کتاب کی طرح کھلتے
اور بند ہوتے ہیں۔ دوسرے بنیان کی

طرح جو ہاتھوں کی طرف سے نہیں، سر کی طرف سے پہنے جاتے ہیں۔ یہ شلوکے کھلا نہیں کرتے اور ہمیشہ ایک ہی حالت میں رہتے ہیں۔

کُرتا:۔ ہاں یہ مکمل لباس ہے اور شاندار بھی۔ پاجامہ اور کرتا پہن کر آدمی پوری طرح آدمی بن جاتا ہے۔ کرتے اور پاجامے میں آدمی گردن تک چھپ جاتا ہے۔ کرتے میں دو آستینیں ہوتی ہیں۔ ایک آستین والا کرتا ابھی تک کسی نے نہیں پہنا۔ ان دونوں آستینوں کو پاجامے کے پائنچوں کی طرح ادلا بدلا نہیں جا سکتا۔ سیدھی آستین ہمیشہ سیدھی ہی آستین رہے گی اور الٹی ہمیشہ الٹی کیوں کہ کرتے کا آگا پیچھا ہوا کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ آدمی سامنے کی طرف چلتا ہے۔ اگر کرتے میں دونوں طرف گلے بنے ہوں تو آدمی کی سمجھ میں نہ آئے کہ اسے کس طرف چلنا ہے۔ صرف پاجامہ پہن کر آدمی اسی لیے گھر کے باہر نہیں جاتا کیوں کہ اسے معلوم نہیں ہوتا کہ اسے آگے چلنا ہے یا پیچھے جانا ہے۔

پیچھے کی طرف سے کرتا ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آدمی کی پیٹھ پر کوئی پردہ ڈال دیا گیا ہو۔ کرتے کے سامنے کی طرف ایک دروازہ ہوتا ہے جسے گریبان کہتے ہیں۔ آدمی کرتا پہننے کے بعد یہ دروازہ بند کر دیتا ہے۔ دروازہ بند کرنے کے لیے گریبان کے ایک پلنتھ میں کاج بنے ہوتے ہیں ـــــ یوں سمجھو کافی اچھا انتظام ہوتا ہے۔

کرتے میں کالر نہیں ہوا کرتا۔ کالر اس چیز کو کہتے ہیں جو قمیص کے گلے میں لگی ہو اور ایسی معلوم ہو جیسے خرگوش کے کان الٹی طرف سے قمیص میں لگا دیے گئے ہوں۔ کرتا ہمیشہ سادہ گلے کا ہوتا ہے۔

بعض لوگ کرتے کے گریبان بلکہ کندھوں پر بھی بیل کڑھوایا کرتے ہیں۔ یہ بیل رنگین بھی ہوتی ہے اور سفید بھی۔ بعض کرتوں پر تو پھول بھی کڑھے ہوتے ہیں۔ کیا کہنے ہیں۔ رنگین بیل اور کڑھے ہوئے پھولوں کے کرتے کملا نہرو پارک نظر آتے ہیں۔ ایسا کرتا پہننے سے دوسروں کو بہت فایدہ پہنچتا ہے۔

کرتے کی آستینیں بہت کار آمد ہوتی ہیں۔ بچے ان سے ناک پونچھتے ہیں۔ بڑی عمر کے لڑکے اور مرد ان آستینوں کو کھانا کھاتے وقت سالنوں میں ڈبوتے ہیں اور جب کبھی غصے میں آتے ہیں تو آستین اوپر چڑھا لیتے ہیں۔ لڑتے وقت بھی آستین اوپر چڑھانا ضروری ہے بغیر آستین اوپر چڑھائے لڑنا کمزوری کی نشانی ہے ـــــ بازار جانا ہو تو آستین میں ایک آدھ نوٹ اور ریزگاری رکھ کر آستین اوپر چڑھا لینی چاہیے۔ عقلمند لوگ آستینوں سے کئی کام لیتے ہیں۔ وہ آستین کو صرف نمائش کی چیز نہیں سمجھتے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کرتا وہی اچھا ہوتا ہے جو ہاتھ کا سلا ہوا ہو۔ اُوشا یا سنگر مشین سے سلے ہوئے کرتے سے آدمی کی قیمت کم ہو جاتی ہے۔ کرتے کا پچھلا دامن کئی کام آتا ہے۔ چھوٹے بچے جب ریل گاڑی کا کھیل کھیلتے ہیں تو اسی دامن کی مدد سے ٹرین کے ڈبے جوڑتے ہیں۔ یوں کہنا چاہیے کہ کرتے کا پچھلا دامن ڈبوں کی شنٹنگ کے کام آتا ہے۔ کرتے کے اگلے دامن میں بچے گڑ، چنا اور مونگ پھلی وغیرہ جیسی چیزیں رکھ سکتے ہیں۔ بڑی عمر کے لوگوں کا دامن البتہ صاف رہنا چاہیے اور یہ دامن کسی کے سامنے پھیلانا بھی نہیں چاہیے۔

عمدہ کرتا وہ ہوتا ہے جو ڈھیلا اور لمبا ہو۔ تنگ کرتے میں آدمی خوشی سے پھول کر کپا نہیں ہو سکتا۔ خوش ہونے کے لیے ڈھیلا کرتا ضروری ہے اور گھٹنوں تک تو آنا ہی چاہیے ورنہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آدمی ادھورا رہ گیا ہے۔ بعض لوگ تو پنڈلیوں تک کے لیے کرتے پہنتے ہیں ایسے لوگوں کو کوئی اور کام ہوتا ہی نہیں ہے

جناب پروفیسر امانت

غبارے والا

غباروں کی رنگین دنیا سجادی
دکاں اک سرِ راہ میں نے لگادی
سڑک پر جہاں بھی کھڑا ہو گیا ہوں
کلی دل کی بچوں کے میں نے کھلادی
نکل آئے گھر سے کئی شوخ بچے
گلی میں جونہی میں نے جاکر صدا دی
بھری گیس اور ڈور سے باندھ کر پھر
غباروں کی ٹولی ہوا میں اُڑادی
مرے پاس رنگوں کی دلکش بہاریں
'چلے جس کو لینا ہو، قیمت لگادی'
غبارے ذریعہ ہیں روزی کا میری
غریبی نے محنت مشقت سکھادی
غبارے سکھاتے ہیں اونچا ہی اُڑنا
بڑے کام کی بات میں نے بتادی

جناب سید احمد اللہ قادری

عورتوں کا شہر

آپ کو یہ سن کر بڑی حیرت ہوگی کہ اب سے قریب قریب چار سو پچھتر سال پہلے بھارت میں ایک شہر ایسا بھی تھا جہاں صرف عورتیں راج کرتی تھیں وہاں مردوں کا گزر نہیں تھا! آپ سوچ میں پڑ گیے ہوں گے کہ بھلا یہ شہر کہاں تھا؟ کیسا تھا؟ اس کے بسانے والے کون تھے؟

تو سینے۔ مالوے میں ایک بادشاہ غیاث الدین خلجی گزرا ہے۔ وہ ۸۷۲ ہجری میں تخت پر بیٹھا اس نے گدی پر بیٹھنے کے بعد دربار منعقد کیا۔ اپنی ریاست کے امیروں، افسروں اور قابل و ممتاز لوگوں کو طلب کیا۔ اور ان سے کہا کہ میں نے ولی عہد کی حیثیت سے مسلسل چونتیس ۳۴ سال دوسرے ملکوں پر حملے کیے اور میری عمر کا زیادہ وقت جنگ و جدل میں بسر ہوا۔ اب میں اپنے پڑسیوں سے لڑنا جھگڑنا نہیں چاہتا۔ اطمینان و سکون کی زندگی کا خواہش مند ہوں اور ایسا کام کرنا چاہتا ہوں جس کے باعث میرا نام رہتی دنیا تک قائم رہے۔ اس نے حیاتِ دوام[1] پانے کے لیے یہ کیا کہ قلعے کے اندر عورتوں کے واسطے ایک عظیم الشان شہر بسایا۔ یہ قلعہ اتنا وسیع تھا کہ لاکھوں عورتیں اس میں سما سکتی تھیں۔ اس شہر میں صرف حسین و جمیل عورتیں رکھی گئی تھیں۔ جن کی آنکھیں ہرنی کی آنکھوں کے مانند تھیں۔ اس مقام پر ہرنی کی مثال اس لیے دی کہ اس کی آنکھیں انتہائی خوبصورت ہوتی ہیں اور ان میں بڑی کشش (لبھاؤ) ہوتی ہے۔

ایک قدیم مورخ تھا حکیم محمد قاسم فرشتہ۔ یہ اب سے چار سو سال پہلے گذرا ہے اس نے ہندوستان کی ایک مستند اور مفصّل تاریخ لکھی ہے۔ اور اپنی کتاب کا نام ہی تاریخ فرشتہ رکھا ہے۔ فرشتہ نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ سلطان غیاث الدین خلجی کے محل میں دس ہزار کنیزیں تھیں۔ بادشاہ نے قلعے میں جو زنانہ شہر آباد کیا تھا۔ اس میں صرف عورتیں ہی رہا کرتی تھیں۔ عورتیں ہی وزیر تھیں، عورتیں ہی وکیل تھیں، عورتیں ہی حکیم تھیں، عورتیں حافظِ قرآن تھیں۔ عورتیں موذن تھیں۔ عورتیں خبردار، نویسندہ[2] و منجم[3]

---

[1] حیات کے معنی زندگی دوام کے معنی ہمیشہ یعنی ایسی زندگی جو ہمیشہ قائم رہے

[2] غالباً اس سے مراد منشی اہل کار یا کلرک ہے۔

[3] علم نجوم یعنی ستاروں کے علم کا ماہر یا اس علم کی بنیاد پر پیشین گوئی کرنے والا جوتشی

ہیں۔ غرض دنیا کے اکثر علوم سے واقف تھیں اور انھیں بہت سے ہنر آتے تھے۔ زرگری۔ آہن گری۔ تیر گری۔ کمان گری۔ کوزہ گری۔ ترکش دوزی۔ محمل بانی۔ جامبانی۔ نجاری۔ خیاطی اور شعبدہ بازی کے سوا وہ کشتی کا فن بھی خوب جانتی تھیں۔

پانچ سو ترکن عورتیں نشانہ پر تیر اس طرح چلاتیں کہ مرد دیکھ کر شرم سے پانی پانی ہو جاتے۔ اس پھرتی سے وہ شکار پر تیر مارتیں کہ بہادروں کے چھکے چھوٹ جاتے اور دل دھڑکنے لگتے۔ یہ عورتیں نیزے کو ہاتھ میں تھام کر اور ترکش کو کمر سے لٹکا کر اس طرح استادہ رکھتی رہتیں جس طرح ہمارے بہادر سپاہی ملک کی سرحدوں پر پہرہ دے رہے ہیں۔

پانچ سو حبشی عورتیں ایسی تھیں جو تفنگ اندازی میں مشاق اور تلوار چلانے میں طاق تھیں اور مردانہ لباس پہنتی تھیں۔

اس شہر میں بڑے بڑے بازار بھی تھے۔ جہاں خوب خرید و فروخت ہوتی۔ عورتیں ہی دوکاندار تھیں عورتیں ہی خریدار اس بازار میں بے حد چہل پہل رہتی۔ ایک ہزار عورتیں قرآن پاک کی حافظ تھیں۔ بادشاہ جب کپڑے بدلتا تو ان کپڑوں پر کلام مجید ختم کر کے دم کیا کرتی تھیں مسجدوں میں اذان عورتیں دیا کرتیں۔ نماز پڑھایا کرتیں عدالت اور پولس کی افسر بھی عورتیں ہوتیں۔ بادشاہ نے انھیں زر و جواہر سے مالا مال کیا تھا۔

یہ شہر جس قلعے میں تھا اس شہر کا نام مانڈو تھا۔ یہ مالوے کا مشہور تاریخی مقام تھا۔ مانڈو کے بارے میں آپ زیادہ واقف نہیں ہوں گے تقریباً پانچسو ستر سال پہلے سلطان ہوشنگ غوری نے مانڈو کا نام بدل کر شادی آباد رکھا تھا۔

مانڈو یا مانڈن اصل میں ایک لوہار کا نام تھا جو راجہ بکرماجیت سے سوا سو برس قبل راجے چند پنوار جے سنگھ دیو کے عہد میں گزرا ہے۔ تاریخ کی کتابوں میں اس شہر کی نسبت ایک داستان اس طرح درج ہے۔

مانڈو ایک لوہار تھا، اس کے پاس ایک شخص آیا اور گھاس کاٹنے کی درانتی یہ کہہ کر دی کہ پتھر پر گھسنے سے پیتل کی ہو گئی ہے گھاس نہیں کٹ رہی ہے۔ اس درانتی کو لے کر لوہے کی دوسری درانتی دو۔ اس شخص نے پیتل کی درانتی اور پتھر مانڈو کے حوالہ کیا اور اس کے معاوضہ میں لوہے کی درانتی لے کر چلتا بنا۔ اس پتھر کی خاصیت یہ تھی کہ لوہے کی جس شئے پر رگڑا جاتا وہ چیز خالص سونا بن جاتی۔ ایسے پتھر کو "پارس" کہا جاتا ہے۔ مانڈو یہ پتھر اور درانتی لے کر راجہ کے پاس گیا اور اس سے حقیقت حال بیان کی۔ راجہ سے خواہش کی کہ پتھر اور درانتی لے لیجیے اور اس کے بدلے میرے نام سے ایک شہر بسا دیجیے۔ راجہ نے وہ نایاب پتھر مانڈو سے حاصل کر لیا اور اس کے نام سے ایک شہر بسا دیا۔

بعض مورخ اس واقعہ کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ سنگ پارس لوہار نے راجہ کی نذر کر دیا۔ راجہ نے لوہار کے نام سے شہر بسا دیا۔ جب شہر کی تعمیر مکمل ہو گئی تو راجہ نے دریائے نربدا کے کنارے ایک بہت بڑا جشن منانے کا اہتمام کیا اور اپنی ساری دولت برہمنوں میں بانٹ دی اور پروہت کو دان دینا بھول گیا۔ راجہ کے پاس جب کوئی چیز باقی نہیں بچی تو اس نے پروہت کو سنگ پارس پیش کیا۔ راجہ پر پروہت کو بے حد غصہ آیا کہ سب کو زر و جواہر تقسیم کرنے کے بعد میرے لیے کچھ نہیں رکھا اور ایک پتھر دیا۔ پروہت نے جوش میں آ کر اس پتھر کو زور سے پھینکا اور وہ پتھر دریا میں گرا۔ راجہ نے پروہت سے اس پتھر کی خوبیاں بیان کیں تو بہت پچھتایا اور غوطہ خور راجہ کے حکم سے برسوں دریائے نربدا میں پتھر تلاش کرتے رہے، جو نہیں ملا۔

اس واقعہ کے ہزاروں برس بعد ۱۰۰۷ ہجری میں شہنشاہ اکبر آسیر نامی

بقیہ صفحہ ۸۴ پر

جناب سُہیل عظیم آبادی

سچّا اور جھوٹا

(عرب کی ایک لوک کہانی)

یہ کہانی بہت پرانی ہے۔ بغداد میں ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا وہ بڑا عالم تھا۔ اور اُسے شاعری کا شوق بھی تھا۔ اور شاعروں کی قدر کرتا تھا۔ اس نے بہت سے شاعروں کو بلا کر اپنے دربار میں جگہ دی سب کی تنخواہیں مقرر کر دیں۔

مگر کچھ ہی دنوں کے بعد اس نے دیکھا کہ سب شاعر آپس میں لڑتے ہیں۔ ایک دوسرے سے حسد کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتے ہیں جب دربار میں آتے ہیں تو خوشامد کی باتیں کرتے ہیں۔ اس کی تعریف کرتے ہیں اور انعام چاہتے ہیں۔

صرف ایک شاعر ایسا تھا جو بادشاہ کے بلانے پر ہی دربار میں جاتا تھا۔ مگر اس کی خوشامد کرتا اور نہ اس کی تعریف میں شعر ہی پڑھتا۔ اس شاعر کا نام عامر تھا۔

بادشاہ نے تھوڑے ہی دنوں میں سارے شاعروں کو پہچان لیا کہ کون کیسا ہے۔ اور ان کو سبق دینا چاہا۔ ایک دن اس نے سارے شاعروں کو دربار میں بلایا اور اعلان کیا کہ جو میری سچی تعریف کرے گا اس کو ایک سچا ہیرا انعام میں دیا جائے گا۔ یہ سن کر سارے شاعروں نے تیاریاں شروع کر دیں۔ بادشاہ کی تعریف میں خوب خوب شعر کہے۔ زمین آسمان ایک کر دیا ہر شاعر خوش تھا کہ سچا موتی اُسے انعام میں ملے گا۔

ایک دن بادشاہ نے سارے شاعروں کو پھر سے دربار میں بلایا اور کہا کہ جس نے جو کچھ اس کی تعریف میں لکھا ہے وہ سنائے۔ ایک شاعر نے آگے بڑھ کر اپنی نظم سنائی۔ دربار کے سارے لوگوں نے تعریف کی اور بادشاہ نے اُسے ایک ہیرا انعام دیا۔ وہ سلام کر کے بیٹھ گیا۔

اس کے بعد دوسرا شاعر اٹھا اور اپنا لکھا سنایا۔ اس کی بھی تعریف ہوئی۔ بادشاہ نے اسے بھی ایک ہیرا انعام دیا۔ اسی طرح سارے شاعر آئے۔ اور ہیرا انعام لے کر بیٹھ گئے۔ عامر بیٹھا رہا تو بادشاہ نے کہا۔

"تم نے کیا لکھا ہے۔ سناؤ۔"

عامر نے کہا۔

"اگر بادشاہ سلامت میری جان بخش دیں تو سناؤں"

بادشاہ نے کہا۔

"تمہاری جان بخش دی گئی ——— سناؤ"

عامر نے سنایا۔

"اے بادشاہ تو عالم اور عقلمند ہے شاعروں کی عزت کرتا ہے لیکن گھوڑے اور گدھے کو ایک ہی اصطبل میں باندھتا ہے اور اس طرح اُس کی بہت سی کمزوریاں گنا دیں۔ درباریوں کا خون سوکھ گیا اب اس شاعر کی شامت آگئی۔ ضرور مارا جائے گا۔ مگر جب وہ سنا چکا تو بادشاہ نے اُسے بھی ایک ہیرا انعام دیا۔

دربار ختم ہوا تو سارے شاعر جوہری کے پاس گئے کہ ہیرے کی قیمت لگائیں اور عامر کو بھی اپنے ساتھ لیتے گئے۔ جوہری نے سب کے ہیرے دیکھ کر بتایا کہ سب کے ہیرے جھوٹے ہیں۔ صرف عامر کا ہیرا سچا ہے۔

دوسرے دن پھر بادشاہ نے شاعروں کو دربار میں بلایا اور پوچھا۔
انعام پاکر کون خوش اور کون رنجیدہ ہے۔
شاعروں نے شکایت کی کہ عامر کے ہیرے کے سوا سارے ہیرے جھوٹے ہیں۔
بادشاہ ہنسا اور بولا۔
"اس میں تعجب کی کیا بات ہے جن لوگوں نے جھوٹی تعریف کی تھی۔ انھیں جھوٹا ہیرا ملا۔ اور جس نے سچ بات کہی اسے سچا ہیرا ملا۔"
بادشاہ کا جواب سن کر سارے شاعر شرمندہ ہوگئے۔

بقیہ عورتوں کا شہر

قلعہ فتح کرنے کی غرض سے ہاتھی کے ذریعہ دریائے نربدا پار کر رہا تھا تو ہاتھی کی زنجیر یکایک سونے کی ہوگئی۔ جس پر بادشاہ کو بہت اچنبا ہوا۔ بادشاہ سمجھ گیا کہ دریا میں کہیں سنگ پارس پڑا ہے۔ اس کو حاصل کرنے کے لیے شہنشاہ پھر اسی راستے سے لوٹا مگر اس دفعہ ہاتھی کی زنجیر سونے کی نہیں ہوئی۔ وہ سنگِ پارس شہنشاہ اکبر کے ہاتھ بھی نہیں آیا۔

جناب رؤف خیر

بوجھو تو مانیں

قطرۂ غم اس کو میٹھی نہر ہے — دل یقیں کرتا نہیں یہ زہر ہے
دستِ پاکستان میں کے کٹ گئے — یہ پون آہوں کی جیسے لہر ہے
شاعرِ اقبال بھی شاعر تھے کیا — جن کا اک اک شعر بانگِ دہر ہے
مانگ لے نذیر رب سے ترے — پیارے نا مانگنا بھی قہر ہے

دوستو بوجھو ہے گر نظر وسیع
ملک ہر مصرعہ میں ہے یا شہر ہے

سکھر ۱۔ امر ۲۔ [illegible] ۳۔ [illegible] ۔ پہنچا [illegible]
[illegible]

جناب جمشید اشرف

لطیفے

(۱) ایک بیوقوف کا گدھا کھو گیا تھا۔ لوگ اسے تسلی دینے آئے تو دیکھا کہ سجدے میں پڑا ہے اور خدا کا شکر ادا کر رہا ہے لوگوں نے کہا کہ یہ شکر کا کونسا موقع ہے! اس نے کہا: "اس لیے کہ میں اس پر سوار نہیں تھا ورنہ تین دن سے میں بھی کھویا ہوا ہوتا۔"

(۲) ایک شخص ایک منشی جی کے پاس آیا اور کہا کہ خط لکھ دیجیے۔ منشی جی نے کہا "میرے پیر میں درد ہو رہا ہے"۔ اس نے کہا کہ میں تمھیں کہیں بھیج تھوڑی رہا ہوں! منشی جی بولے "یہ بات تو تمھاری ٹھیک ہے مگر جس کو خط لکھا جائے گا وہ مجھے بلائے گا کیوں کہ کوئی دوسرا میرا لکھا ہوا خط نہیں پڑھ سکتا۔"

(فارسی سے ترجمہ)

جناب علقمہ شبلی

نیا سال آیا

(۱)

نیا سال آیا!
نیا سال آیا!
زمانے کے مالک!
کرم ہے یہ تیرا
نیا سال تو نے
ہمیں پھر دکھایا

گئے سال ہم نے
بہت دکھ اٹھائے
کہیں باڑھ آئی
بہے کھیت سارے
کہیں قحط سے بھی
پڑے جاں کے لالے

کہیں ناچتی تھی
تعصب پرستی
لہو کا پیاسا
تھا بھائی کے بھائی
دلوں میں تھی نفرت
لبوں پر دہائی

(۲)

دعا ہے ہماری
بصد خاکساری
نیا سال لائے
کرن روشنی کی
کھلیں دل کی کلیاں
ہو رخصت غریبی

زمیں مسکرائے
گگن گن گنائے
دلوں میں ہوں روشن
دیے دوستی کے
ہر اک ہونٹ پر ہوں
مسرت کے نغمے

دلوں میں ہو نفرت
نہ لب پر شکایت
ہنسی، پھول، نغمہ
ہوں ہر اک کی دولت
ہم اپنی زمیں کو
کریں رشک جنت

خدایا دعا ہے
یہی التجا ہے

جناب مشہود مفتی

شکاری پرندے

عقاب

یہ پرند قوت اور بہادری کے لیے مشہور ہے۔ بہت پُرانے زمانے میں فوج کے جھنڈوں پر عقاب کی شبیہ یا تصویر ہوتی تھی۔ شاہ اُر (Ur) کی شاہی مُہر کچھ بادشاہوں کے سکے اور ترکمان شہزادوں کے جھنڈے عقاب کی شبیہ سے آراستہ ہوتے تھے۔

یونان کے ابتدائی دور میں عقاب کو یونان کے سب سے بڑے دیوتا کا پیامبر تصور کیا جاتا تھا۔ لوگ اس کو جنت کا پرندہ سمجھتے تھے۔

یہ سب شاید اس وجہ سے تھا کہ اونچی سے اونچی اڑان میں عقاب کا جواب نہیں۔ قدیم رومی فوج کے جھنڈے پر نیزے کے سہارے چاندی کے عقاب کی شبیہ لگی رہتی تھی۔ آج بھی بہت سے ملک اس نشان کو زیبایش کے لیے جھنڈوں پر استعمال کرتے ہیں۔

عقاب اور اس طرح کے دوسرے پرندوں کی تقریباً ... قسمیں دنیا میں پائی جاتی ہیں۔ انھیں ہم چار بڑے حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ چیل، شاہین، عقاب اور دوسرے پرندے۔

ان پرندوں کے پر چوڑے، ٹانگیں مضبوط، پنجوں کے ناخن بے انتہا تیز، چونچ ناخن سے بھی زیادہ تیز اور قدرے مڑی ہوئی ہوتی ہے۔

بہت سے عقابوں کی آنکھیں ہلکی رنگین ہوتی ہیں لیکن شکار کے وقت بہت خوفناک ہو جاتی ہیں۔ ان میں بہت سے تیز اڑنے والے ہوتے ہیں، بہت سے سُست رفتاری سے پرواز کرتے ہیں اور بہت سے صرف آسمان پر چکر لگانا پسند کرتے ہیں۔ دنیا میں یہ سب سے زیادہ اڑنے والے پرندے مانے جاتے ہیں۔

ڈک ہاک

DUCK HAWK

فضا کا شہنشاہ مانا جاتا ہے۔ اس کے بازو لبے اور سرے پر نکیلے ہوتے ہیں۔ اس قسم کے بڑی ذات

کے شاہین تیز ترین اڑنے والی چڑیوں اور بطخوں کو بغیر کسی دقت کے پکڑ لیتے ہیں۔ پیٹ بھرا ہو تو یہ پرندہ کسی ایسے مقام پر بیٹھتا ہے جہاں سے کھلا آسمان اور فضا میں پرواز کرتے ہوئے پرندے آسانی سے نظر آتے ہیں۔

یہ پرندہ اپنے شکار سے تفریح کرتا ہے۔ اڑتی ہوئی چڑیوں پر یکایک حملہ کرتا ہے، اپنے پنجوں سے ایک آدھ چڑیا کو نیچے گراتا ہے۔ پھر ان کے ساتھ چکر لگاتا ہوا نیچے کی طرف پرواز کرتا ہے اور قبل اس کے کہ چڑیا زمین پر گرے اسے پھر پنجوں میں دبوچ لیتا ہے۔ اکثر اس پرندے کا جوڑا (NIGHT HAWK) پر جھپٹتا ہے۔ یکایک اپنے پنجوں سے اس چڑیا پر اتنی کاری ضرب لگاتا ہے کہ وہ لڑکھڑاتی نیچے گرنے لگتی ہے۔ اتنے میں دوسرا اسے ہوا ہی میں پھر پکڑ کر اپنے ساتھی کی طرف اچھال دیتا ہے۔ اس طرح یہ شکار کو فضا ہی میں ایک دوسرے کی طرف اچھالتے چلتے ہیں۔ اکثر یہ بالکل تفریح کے موڈ میں مختلف چڑیوں کا پیچھا کرتا ہے لیکن کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا۔ مرغابیوں کو انتہائی بلندیوں سے نیچے بھاگنے پر مجبور کر دیتا ہے اور مرغابیاں بھاگ کر جان بچانے کے لیے نیچے پانی میں گم ہو جاتی ہیں۔ دراصل یہ اپنے شکار کو پکڑ کر نہیں مارتا بلکہ فضا میں پرواز کے دوران اپنے پنجوں سے برابر کاری ضربیں لگاتا ہے۔ یہاں تک کہ شکار دم توڑ دیتا ہے۔

گوس ہاک GOSHAWK

شاہین کی یہ قسم سب سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ اس کا ٹھکانا شمالی امریکہ کے شمالی اور مغربی پہاڑ ہیں۔ سب سے تیز اڑنے والی چڑیا بھی اس کے پنجے سے نہیں بچ سکتی۔

شمالی حصے کے شاہین کی غذا قطبی خرگوش اور قطب شمالی کا وہ جانور ہے جو گھونس جیسا ہوتا ہے۔

یہ بہت ظالم پرندہ ہوتا ہے۔ اس کا شکار اگر اتر کر جھاڑیوں میں چھپتا ہے تو یہ زمین پر دھاوا کرکے مارتا ہے۔ مرغیوں کے بچے آدمیوں کے بیچ سے بڑی دلیری سے اٹھا کر لے جاتا ہے۔ ان بچوں پر جھپٹتے وقت اگر آپ اسے بندوق کا نشانہ بنانا چاہیں اور آپ کا نشانہ چوک جائے تو یہ اس وقت تو ٹل جاتا ہے لیکن چند ہی منٹ بعد پھر لوٹ کر حملہ آور ہوتا ہے۔

دوسرے شکاری پرندوں سے لڑنے میں بالکل نہیں ہچکچاتا۔ بڑے الو جیسے خوفناک پرندے سے یہ برابر کی ٹکر لیتا ہے۔ یہاں تک کہ دونوں ایک دوسرے کی ضربوں سے مر جاتے ہیں۔

رف لیگڈ ہاک ROUGH LEGGED HAWK

اس شاہین کی اوسط لمبائی ۲۲ انچ ہوتی ہے۔ یہ بہت خوبصورت اور چیل سے ملتا جلتا پرندہ ہوتا ہے۔ آواز بھی چیل سے ملتی جلتی ہوتی ہے۔ امریکہ کے میدانی علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ گلہری اور کتے اس کی مرغوب غذا ہے۔

یہ پرندہ بھی چیل سے ملتا جلتا ہے۔ پانی کے اوپر تیں فٹ سے سو فٹ تک کی بلندی پر پرواز کرتا ہے، جونہی مچھلی نظر آئی اور اس نے پانی میں غوطہ لگایا۔
یہ پانی میں کافی گہرائی تک اتر جاتا ہے۔ کبھی کبھی بڑی مچھلیوں پر حملہ کر دیتا ہے اور بڑی مچھلی اسے کھینچ کر انتہائی گہرے پانی میں لے جا کر مار دیتی ہے۔ اکثر سمندر کے کنارے بڑی قسم کی مردہ مچھلیاں دیکھنے میں آئی ہیں جن کی پشت پر اس چڑیا کے پنجے گڑے ہوئے ملے ہیں۔
چٹانوں کے بالائی حصے میں اور چھتوں کے چھجوں کے نیچے اس کا گھونسلا ہوتا ہے۔ یہ گھونسلا اتنا بڑا ہوتا ہے کہ ننھی منی چڑیاں اس کے گھونسلے کے نیچے اپنا گھونسلا بنا لیتی ہیں اور بے فکری سے رہتی ہیں۔ یہ ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتا۔

اکثر ان کا جوڑا کے کا شکار کرتا ہے۔ کتا جب اپنا ٹھکانا چھوڑ کر کافی آگے بڑھ جاتا ہے تو ایک اس کے ٹھکانے کے قریب جا کر کھڑا ہو جاتا ہے تاکہ کتا بھاگ کر اپنی جائے پناہ میں نہ پہنچ سکے اور دوسرا اسے شکار کر لیتا ہے۔

بحری عقاب

بحری جادوگر

دور سے اس پرندے کو دیکھ کر بطخ کا گمان ہوتا ہے۔ اس کی انتالیس قسمیں ہیں۔ امریکہ میں اس کو بحری جادوگر کہتے ہیں۔ انڈے پر بیٹھی ہوئی اس چڑیا سے آنکھیں چار ہوتے ہی یہ انڈوں کو گھاس پھوس اور تنکوں میں چھپا کر آن کی ان میں نظروں سے اوجھل ہو تی ہے اور پھر ڈھونڈے نہیں ملتی۔ اس سے زیادہ پھرتیلا شاید ہی کوئی پرندہ ہو۔ مشہور ہے کہ بندوق کی گولی سے زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ یہ پانی میں غوطہ لگاتی ہے۔ بندوق کی گولی بعد میں پہنچتی ہے یہ اس کی آواز ہی پر غوطہ مار کر اپنے کو پانی میں محفوظ کر لیتی ہے۔
اس کے بچے پیدائشی تیراک ہوتے ہیں۔ انڈوں سے نکلنے کے چند ہی گھنٹوں

بعد کسی مشاق تیراک کی طرح تیرنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ آرام
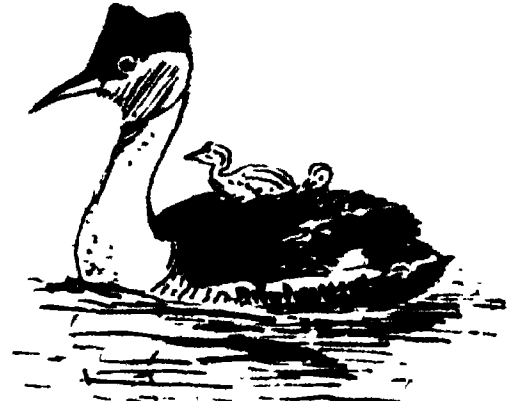
سے والدین کی پیٹھ پر بیٹھے بیٹھے سوتے ہیں۔ خطرے کے وقت یہ چڑیا بچوں سمیت پانی میں غوطہ لگا جاتی ہے۔ بچے پانی میں غایب ہو جاتے ہیں لیکن پھر جلد ہی پانی کی سطح پر گیند کے مانند ابھرنے لگتے ہیں۔

یہ چھوٹی مچھلیاں، جھینگا اور کیڑے مکوڑے کھاتی ہے۔

کارمورانٹ

اس غوطہ خور پرندے کو سمندر کے پانی، چٹانی ساحل اور اس کی مچھلیوں سے محبت ہوتی ہے۔ تیرتے وقت اس کے پیر باری باری حرکت کرتے ہیں لیکن شکار کے وقت اس کے دونوں پیر ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور تیرنے کی رفتار بہت تیز ہو جاتی ہے۔ یہ چڑیا بھی تیرنے اور غوطہ لگانے میں ماہر ہوتی ہے۔ اس کے بچے بھی بلا کے تیراک ہوتے ہیں۔

ایک بار کارمورانٹ کا ایک بچہ سروکے درخت پر چڑھتے ہوئے پانی میں گر کر پھڑپھڑانے لگا۔ پھر اس نے دھیرے دھیرے تیرنا شروع کیا۔ ایک مگرمچھ نے اس کا پیچھا کیا۔ زندگی اور موت کی اس بھاگ دوڑ میں بچہ دوبار پانی میں غوطے لگا کر مگرمچھ کے منہ سے بال بال بچ گیا۔ یہ پرندہ دیر تک پانی میں ٹھہر سکتا ہے۔

برٹش کولمبیا کی کارمورانٹ سمندر میں ایسے مقامات پر شکار کرتی ہے جہاں پانی بڑے ڈراونے انداز میں چٹانوں پر سر پٹکتا ہے اور پانی کی سطح پر جھاگ پیدا ہوتا رہتا ہے۔ ایسی طوفانی کیفیت میں یہ چڑیا پانی کی گہرائیوں سے مچھلی نکال لاتی ہے۔ ایک بار ایک شکاری کے جال میں پھنس کر یہ چڑیا پانی سے برآمد ہوئی تھی۔ یہ جال ایک سو بیس فٹ کی گہرائی سے باہر نکالا گیا تھا جہاں پانی کے زور کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

جاپان میں یہ پرندہ رات کے اندھیرے میں ٹارچ کی روشنی میں شکار کرتا ہے۔ اگر کوئی کارمورانٹ بڑی مچھلی پکڑ لیتی ہے جس کو پانی سے نکالنا اس کے بس کا نہ ہو تو اس کے دوسرے ساتھی اس کی مدد کرتے ہیں۔ چین میں ان چڑیوں کی باقاعدہ تربیت گاہیں قایم ہیں۔

ماہی خور

۱۹۱۸ء میں جب امریکہ جنگ سے

وچار تھا تو اس پرندے پر بھی آفت آئی۔ امریکہ میں غذائی بحران ہوا۔ لوگوں کو غذا کے لیے مچھلی کی ترغیب دی گئی۔ اس سے ایک طرف تو مچھلی کی مانگ بڑھی اور دوسری طرف مچھلی کا کاروبار کرنے والوں نے اودھم مچایا کہ ماہی خوروں کی وجہ سے مچھلیاں بہت کم دستیاب ہو رہی ہیں۔

ٹیکساس کے صوبے سے سرکاری طور پر تصدیق کی گئی کہ ساحل سمندر پر ہزارہا ماہی خور روزانہ اتنی مچھلیاں کھا جاتے ہیں جتنی لوگوں کو سال بھر میں بھی میسر نہیں آسکتیں۔ فلاریڈا کے ایک محقق نے لکھا کہ فلاریڈا کے ساحل پر ایک لاکھ ماہی خور آباد ہیں اور یہ روزانہ لاکھوں لاکھ روپے کی مچھلیاں کھا جاتے ہیں۔ اخبارات نے اس چڑیا کے خلاف مہم چلائی۔ گورنمنٹ پر اس پرندے کو ناجائز طور پر حفاظت میں لینے کا الزام آیا اور یہ مخالفت اس درجہ بڑھی کہ ۱۰ جون ۱۹۱۸ء کی رات میں کچھ لوگوں نے اس پرندے کے سرکاری ٹھکانے پر حملہ کر دیا اور اس کے تقریباً چار سو بچے مار دیے۔

ان حالات کے پیش نظر گورنمنٹ نے ایک تحقیقاتی کمیشن بٹھایا۔ کمیشن کے لوگوں نے ان پرندوں کے ٹھکانوں کا بغور مطالعہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ ڈیڑھ میل لمبے ساحل پر صرف پینسٹھ ہزار ماہی خور بستے ہیں۔ ان کے ٹھکانوں پر ان کی اگلی ہوئی سینکڑوں مچھلیاں پڑی سڑ رہی تھیں ان میں کوئی مچھلی بھی ایسی نہیں تھی جس کو وہاں کے لوگ بطور غذا استعمال کرتے تھے۔ کمیشن کی رپورٹ شایع ہونے کے بعد ہی یہ پرندہ امریکی عتاب سے بچ سکا تھا۔

یہ پرندہ دو الگ الگ رنگوں کا پایا جاتا ہے بھورا اور سفید

بھورا ماہی خور

بھورا ماہی خور چار فٹ لمبا ہوتا ہے۔ پروں کو پھیلا کر اس کی لمبائی ۹ فٹ ہو جاتی ہے۔ چونچ نو انچ سے

تیرہ انچ تک لمبی ہوتی ہے اور وزن ساڑھے سات پونڈ سے گیارہ پونڈ تک ہوتا ہے اس کی چونچ کے نیچے ایک تھیلی ہوتی

ہے۔ اس تھیلی میں بڑی گنجائش ہوتی ہے۔ اس میں تین چار گیلن پانی سما جاتا ہے۔ غوطہ لگا کر جب یہ پرندہ پانی سے دھیرے دھیرے سر اٹھاتا ہے تو پانی تھیلی سے نکل جاتا ہے اور مچھلیاں رہ جاتی ہیں۔ پھر یہ اپنی چونچ اوپر اٹھاتا ہے اور مچھلیاں حلق کے راستے اس کے پیٹ میں پہنچ جاتی ہیں۔ خوراک کی تلاش میں یہ اپنے ٹھکانے سے پچاس پچاس میل دور سمندر پر پرواز کرتا ہے اور کافی بلندی سے اڑتے ہوئے پانی میں داخل ہو کر یہ اپنا شکار پکڑتا ہے۔

سفید ماہی خور

شمالی امریکہ کی آبی چڑیوں میں سب سے بڑی چڑیا ہوتی ہے۔ پروں کو پھیلا کر اس کی لمبائی آٹھ سے دس فٹ تک ہوتی ہے اور وزن پندرہ سے بیس پونڈ۔

اس کے شکار کرنے کا طریقہ بھورے ماہی خور سے مختلف ہوتا ہے۔ بھورا ماہی خور تو پانی میں غوطہ لگا کر اپنا شکار پکڑتا ہے لیکن یہ پانی کی سطح پر تیرتے ہوئے شکار کرتا ہے۔ اکثر ٹولیوں میں ایک مشترکہ محاذ قایم کر کے شکار کرتے ہیں۔ سو ڈیڑھ سو کا ایک غول نیم دایرے کی شکل میں اپنے پروں کو پانی کی سطح پر پھڑپھڑاتا کنارے کی طرف بڑھتا ہے۔ آواز سے اس حلقے کی مچھلیاں خوفزدہ ہو کر سمٹتی چلی جاتی ہیں اور یہ بہ آسانی انھیں چونچ سے پکڑ پکڑ کر کھاتے ہیں۔ اکثر جھنڈ کے جھنڈ کارمورانٹ ان کے سروں سے گزرتے ہوئے غوطے لگا لگا کر ان کے شکار کی مچھلیاں اڑا لے جاتے ہیں اور یہ بے چارے دیکھتے رہ جاتے ہیں۔

یہ پرندہ بڑی دقت سے زمین سے اوپر اٹھتا ہے لیکن فضا میں ایک بار بلند ہو جانے کے بعد بہت خوبصورتی اور شان سے اڑتا رہتا ہے اکثر ان کے غول آسمان کی ان بلندیوں کو چھو لیتے ہیں جہاں ہماری آپ کی نگاہیں نہیں پہنچ سکتیں۔

جناب عبدالمتین نیازؔ

رات کی رانی

دن ڈھل گیا تو گاتی ہوئی شام آگئی
خوش ہے زمانہ ساعتِ آرام آگئی

آئیں گے تھوڑی دیر میں تاروں کے کارواں
کھولے گا چاند دوستو اک نور کی دکاں

ٹھنڈک سی دوڑ جائے گی پھر تو بدن بدن
سامان راحتوں کے سجیں گے چمن چمن

آتے ہی رانی رات کی خوشبو لٹائے گی!
انساں کو رنگ رنگ کے جلوے دکھائے گی

گونجے گا لوریوں کا ترنّم فضاؤں میں
چمکے گا زندگی کا تبسّم فضاؤں میں

پائیں گے پھر سکون تھکے ہارے سب دماغ
انسان کو ملے گا غموں سے ذرا فراغ

بچوں کو پالنے میں جُھلائے گی ماںتا
یعنی تھپک تھپک کے سُلائے گی ماںتا

آتے ہی وہ سجائے گی کچھ رنگ برنگ خواب
ہوگا طلوع پھر سے مسرت کا آفتاب

لائے گی رانی رات کی سوغات نیند کی
پھر ہوگی کُل جہان پہ برسات نیند کی

دو جاسوس لڑکے

کام کرنے والے: موتی
نجو
کمال
چچا
انسپکٹر
دوکاندار

(ایک پہاڑی سڑک پر دو ہم عمر لڑکے موتی اور نجو کھڑے ہیں۔ دور گاؤں کے کچھ کچے مکان نظر آ رہے ہیں۔)

موتی (لمبا سانس لیتا ہے) آہا ہا۔ کتنی ٹھنڈی ہوا ہے۔
نجو مگر یہ بھی معلوم ہے ہم گھر سے کتنی دور چلے آئے ہیں
موتی دور چلے آئے ہیں تو کیا ہوا، سیر کرنے تو اس گاؤں میں آئے ہیں۔
نجو (بائیں جانب اشارہ کرتا ہے) پہاڑی کے نیچے ادھر جو گھر نظر آ رہے ہیں وہ کونسی بستی ہے موتی؟
موتی ہوگا کوئی گاؤں واؤں، مگر اتنا مجھے معلوم ہے کہ ہم اپنے گھر سے اور گاؤں سے دو میل دور چلے آئے ہیں۔ یہ دیکھو میل والا پتھر۔
نجو آؤ کچھ دیر یہاں بیٹھیں۔ دم لے کر چلیں گے۔
موتی موسی پریشان تو نہ ہوں گی کہ یہ دونوں بچے کہاں نکل گئے۔ انھوں نے ہمارے گھر سے نکلتے وقت ہی کہا تھا "زیادہ دور نہ جانا۔ یہ نیا گاؤں ہے کہیں اپنے گاؤں کا راستہ ہی بھول جاؤ"
نجو تو کیا تم راستہ بھول گئے ہو؟
موتی نہیں نہیں ایسا تو نہیں ہے۔ دور موٹر دیکھ رہے ہو سڑک کے موڑ پر گھومتی ہوئی کتنی اچھی معلوم ہو رہی ہے۔
نجو اب وہ ہمارے سامنے ہی سے گذرے گی اور خوب خاک اڑائے گی۔
موتی بالکل نیا موڈل ہے۔

(موٹر زور سے قریب آتی ہے اور گزر جاتی ہے موٹر میں سے ایک لڑکے کی چیخ بھی سنائی دیتی ہے۔)

موتی یہ کیسی آواز تھی؟
نجو اور موٹر سے یہ کپڑا بھی تو گرا ہے۔
موتی دیکھوں؟ یہ تو رومال ہے، موٹر میں کوئی بیٹھا ہوا بچانے کے لیے چلّا رہا تھا۔
نجو کوئی مذاق تو نہ کرتا ہوگا۔
موتی نہیں نجو، سچ مچ کوئی مصیبت میں ہے۔ تم نے چیخ نہیں سُنی۔
نجو ہاں کسی نے چیخ تو ماری تھی۔
موتی میں نے موٹر کو اچھی طرح دیکھا ہے۔ اس میں صرف

ایک لڑکا اور ایک آدمی بیٹھا تھا۔

نجو میرا خیال ہے کہ وہ لڑکے کی آواز تھی۔

موتی موٹر اتنی تیزی سے گئی ہے معلوم ہوتا ہے کوئی بہت جلد کسی مقام پر پہنچ جانا چاہتا ہے۔ دیکھو موٹر تمہاری دکھائی ہوئی پہاڑی کے نیچے والے گاؤں میں جا رہی ہے — نجو —

نجو ہاں

موتی آؤ ایک کام کریں، چل کر دیکھیں یہ موٹر کہاں ٹھہرتی ہے۔

نجو تو یوں کہو تم کھوج لگانا چاہتے ہو کہ اصلی قصہ کیا ہے۔

موتی ہاں یہی ارادہ ہے۔ آؤ۔

نجو چلو۔

موتی پتہ ہے ہم کیا کریں گے؟

نجو کیا؟

موتی پہلے تو سیدھے ہم اس گاؤں میں پہنچیں گے۔ پھر موٹر کے پہیوں کے نشان سے یا لوگوں کو کار کا رنگ بتا کر پوچھ لیں گے کہ وہ کس طرف گئی ہے۔

نجو اور اگر وہ کار اس بستی سے آگے بڑھ گئی تب؟

موتی یہ بھی ہمیں یہاں سے صاف دکھائی دے گا کہ موٹر اس گاؤں میں ٹھہرتی ہے یا اور آگے نکل جاتی ہے۔ موٹر اگر بستی سے آگے چلی گئی تو پھر ہم اس کا کھوج نہیں نکال سکتے۔

نجو موتی —

موتی ہاں۔

نجو موٹر اس بستی سے آگے نہیں گئی، وہیں کہیں غائب ہوئی ہے۔

موتی آؤ تو سہی دیکھیں کیا ہوتا ہے۔

(موتی اور نجو جلدی جلدی چلتے ہیں اور پھر دوڑنے لگتے ہیں۔)

منظر ۲ (ویران سے گاؤں کی ایک چھوٹی سی دکان، کوئی بوڑھا دکان کے سامنے بیٹھا ہے۔)

(داہنی جانب سے موتی اور نجو داخل ہوتے ہیں۔)

نجو بہت چھوٹی سی بستی ہے اور وہ بھی سونی سونی۔ موتی یہ دیکھو موٹر کے پہیوں کے نشان اسی دکان کے سامنے سے آگے گئے ہیں۔

موتی آؤ ذرا دوکاندار سے پوچھیں۔

نجو سلام دادا!

دکاندار (کھانستا ہے)۔ جیتے رہو، جیتے رہو بچو۔ تم لوگ کون ہو، ادھر کیسے آ گئے؟

موتی ایسے ہی آ گئے دادا سیر کرنے کو۔

دکاندار اس گاؤں میں کیا سیر کرو گے بیٹا یہ تو بالکل اجڑ گیا۔ کچھ تو لڑائی بھڑائی سے گھر صاف ہو گئے اور کچھ لوگ بیماری پھیلنے کے ڈر سے آس پاس کے گاؤں میں جا بسے ہیں۔ ابھی شام ہی ہے مگر کوئی چلتا پھرتا دکھائی دے رہا ہے؟

نجو ہاں یہ تو ہے۔

موتی تم نہیں گئے دادا؟

دکاندار میرا کیا ہے بیٹا، میں بڈھا بے چارہ، مر گیا تو کیا اور لٹ گیا تو کیا۔ اور بھی میرے جیسے کچھ لوگ اس بستی میں ہیں۔

موتی دادا یہ بتاؤ کوئی نیلے رنگ

کی موٹر ابھی ابھی یہاں سے نکلی ہے؟

دکاندار: نیلے رنگ کی موٹر۔ ہاں ہاں ابھی تو اس طرف گئی ہے۔ کوئی شہر کا صاحب ہے اس کی موٹر ہے۔ ابھی دو تین دن ہوئے ہیں اس نے یہ پاس والا گھر کرائے پر لیا ہے۔

نجو: کون سا گھر دادا؟

دکاندار: اُدھر مڑ جاؤ، سامنے ہی ایک چھوٹا سا اونچا بنگلہ دکھائی دے گا۔ کیا تم ان شہر کے صاحب سے ملنے آئے ہو؟

موتی: ہاں ہم دونوں ان ہی صاحب سے ملنے آئے ہیں۔

نجو: اچھا دادا چلتے ہیں۔ جب لوٹیں گے تو تم سے ملتے جائیں گے۔ سلام!

دکاندار: جاؤ بیٹا خدا تمھیں خوش رکھے۔

(نیلے رنگ کی موٹر تیزی سے قریب آتی ہے اور گزر جاتی ہے)

موتی: اوفوہ نجو بڑی دیر ہوگئی۔ وہ موٹر والا تو واپس چلا گیا۔

دکاندار: ہاں بیٹا یہی صاحب ہے۔ اب کیسے ملو گے، وہ تو چلا گیا۔

موتی: کوئی بات نہیں دادا۔ آؤ نجو وہ گھر دیکھ لیں جس میں یہ رہتے ہیں۔ دادا ہم لوگ گھر دیکھ کر ابھی آتے ہیں۔ صاحب سے جب وہ آئیں گے تب مل لیں گے۔

دکاندار: ہاں ہاں جاؤ بیٹا (کھانستا ہے)

(موتی اور نجو کسی قدر آگے بڑھتے ہیں۔)

موتی: تم نے دیکھا نجو، اس وقت موٹر میں وہ لڑکا نہیں

نجو: ہاں صرف ایک آدمی اکیلا گیا ہے۔

موتی: اسی لیے تو میں ذرا وہ گھر دیکھنا چاہتا ہوں دیکھو یہاں پہیوں کے نشان رک گئے ہیں اور موٹر گھمانے کے بھی نشان ہیں۔

منظر ۳: ایک چھوٹے سے اونچے بنگلے کے سامنے زمین پر موٹر کے پہیوں کے ایسے نشان ہیں جیسے موٹر بار بار گھومی ہو موتی اور نجو بائیں جانب سے داخل ہوتے ہیں۔

نجو: چھوٹا سا اونچا پکا مکان، اور تو ایسا آس پاس کوئی گھر نہیں۔

موتی: بس بس یہی گھر ہے مگر نجو اس کا تو دروازہ باہر سے بند ہے قفل بھی پڑا ہوا ہے۔

نجو: ہاں قفل ہے۔ تو کیا وہ لڑکا.....

موتی: وہ لڑکا اس گھر میں بند ہے۔

نجو: اب کیا ہوگا؟

موتی: اب کیا ہوگا؟ (دونوں بنگلے کے سامنے والی سیڑھی پر بیٹھ جاتے ہیں۔)

نجو: (اچانک کھڑا ہو جاتا ہے) آؤ موتی، اس گھر کے چاروں طرف گھوم پھر کر دیکھیں، شاید کوئی دروازہ ہو۔

موتی: ہاں بالکل ــــ آؤ ــــ

منظر ۴: (گھر کا پچھلا حصہ۔ ایک طرف گھنی جھاڑی ہے۔ موتی اور نجو داہنی جانب سے آتے ہیں۔)

موتی: دبے دبے چلو نجو، بہت آہستہ۔ کہیں وہ آدمی واپس نہ آجائے۔ مجھے تو وہ بڑا ہی خطرناک آدمی معلوم ہوتا ہے۔

نجو: ادھر تو گھنی جھاڑی ہے۔

موتی: تم میرا ہاتھ پکڑ لو دونوں بچ بچ کر چلیں گے۔ نجو دیکھا، اس طرف دیوار میں تو کھڑکیاں بھی ہیں۔ سچ مچ کسی شہر والے نے یہاں مکان بنوایا ہے۔

نجو: اور کرایے پر بسنے والا بھی تو شہری ہی ہے۔

موتی: مگر یہ شہری بڑا چالاک معلوم دیتا ہے۔ اس نے ایسے ویسے معمولی کام کے لیے یہاں شہر سے اتنی دور ایک اجاڑ بستی میں گھر کرایے پر نہیں لیا ضرور کوئی خاص کام ہے۔

نجو: اگر ہم کھڑکی کھٹکھٹائیں تو..... اندر تو سوائے اس لڑکے کے کوئی اور ہے نہیں۔

موتی: ہاں مگر کوئی ہوا تب؟

نجو: تب کہہ دیں گے ہم راستہ بھول کر ادھر آگئے ہیں۔

موتی: ٹھیک ہے لو آؤ میرے کندھوں پر چڑھ جاؤ اور آہستہ سے کھڑکی کھٹکھٹاؤ، آؤ جلدی کرو

(نجو موتی کے کندھوں پر چڑھ کر کھڑکی تھپتھپاتا ہے)

نجو: کوئی جواب نہیں۔

موتی: آؤ دوسری کھڑکی تھپتھپائیں

(دو تین مرتبہ کھڑکی تھپتھپائی جاتی ہے)

نجو: کچھ نہیں گھر سنسان ہے۔

موتی: سنو سنو کچھ آواز ہو رہی ہے۔

نجو: کوئی کھڑکی کے کواڑ زور سے اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔

موتی: تم پوری طاقت سے اُدھر دھکیلنے کی کوشش کرو

(کھڑکی کے پٹ دو تین مرتبہ ہاتھ مارنے پر کھل جاتے ہیں اور کھڑکی میں کمال نظر آتا ہے)

کمال: تم کون ہو؟

نجو: پہلے یہ بتاؤ تم کون ہو، کیا یہ تمھارا ہی گھر ہے ارے تم تو رو رہے ہو۔ کیا بات ہے؟ موتی ذرا سنبھالے رہنا مجھے۔

کمال: مجھے چچا نے قید کر دیا ہے۔

نجو: چچا نے؟ کیا یہ گھر تمھارا نہیں، تمھارے پتا ہیں؟

کمال: ابا کا نام صفدر حسین ہے۔

موتی: سیٹھ صفدر حسین، وہ تو بڑے لکھ پتی ہیں، ان سے پوچھو نجو پھر تمھارے چچا نے تمھیں یہاں کیوں قید کر دیا ہے؟

نجو: تمھارے چچا نے تمھیں یہاں قید کیوں کر دیا ہے؟

کمال: معلوم نہیں۔ آج دوپہر کو میں باغیچہ میں کھیل رہا تھا۔ انھوں نے مجھے اپنے پاس بلایا۔ ابا نے چچا سے ملنے کو منع کر رکھا ہے مگر انھوں نے مجھے مٹھائی کا لالچ دیا اور موٹر میں بٹھا کر یہاں لے آئے۔ ابھی ابھی گئے ہیں۔ میرے منہ پر رومال باندھ دیا تھا پھر راستے میں کھول دیا۔ میں چلّایا بھی مجھے بچاؤ مجھے بچاؤ مگر وہ ہنستے رہے، "اب کون بچائے گا تجھے؟ میں تیری جان لے کے رہوں گا۔" وہ مجھے یہاں مار ڈالیں گے تم کون ہو مجھے بچالو، مجھے یہاں سے نکالو!

موتی: ڈرو نہیں، ڈرو نہیں! ہم تمھیں بچائیں گے ہم تمھیں یہاں سے نکال لیں گے۔

کمال: مگر جلدی کرو وہ خوفناک آدمی پھر آ جائے گا۔ کیا میں نیچے کود پڑوں؟

موتی: نہیں نہیں ایسا نہ کرنا

ہمارے ساتھ بھاگتے ہوئے اگر اس آدمی نے دیکھ لیا تو بہت برا ہوگا۔ تم یہیں ٹھہرو، اس آدمی کو ضرور کچھ سزا ملنی چاہیے۔ نجو۔ تم کھڑکی سے اندر چلے جاؤ

نجو اور تم ....؟

موتی ڈرو نہیں تم اندر جاؤ میں بھی ابھی آتا ہوں، جاؤ تم اندر --- اور کھڑکی بند کر لو۔

(نجو کھڑکی کے اندر چلا جاتا ہے، کھڑکی بند ہوتی ہے)

منظر ۵ وہی سڑک والی دکان۔

موتی (ہانپ رہا ہے) دادا، --- دادا یہاں پولیس چوکی کہاں ہے؟

دکاندار کیا بات ہے بیٹا۔ پولیس چوکی کیوں؟ بہت گھبرائے ہوئے ہو۔

موتی اس لیے دادا، ایک آدمی نے ایک لڑکے کو یہاں قید کر رکھا ہے۔ اُسی تمہارے شہر والے صاحب نے۔

دکاندار شہر کے صاحب نے قید کر رکھا ہے (کھانستا ہے) چلو میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ بڑا بدمعاش معلوم ہوتا ہے، اس طرف سے پولیس چوکی آؤ ---

---

منظر ۶۔ (اس کمرے کا اندرونی حصہ جس میں کمال قید ہے۔ صرف ایک لکڑی کا تخت، کرسی اور اسٹول ہے۔)

نجو تم نے تخت پر کرسی اور اسٹول رکھ کر کمال کر دیا۔

کمال میرا نام بھی کمال ہے، تمہارا نام کیا ہے؟

نجو میرا نام نجو ہے۔

کمال اور اس لڑکے کا جو تمہیں یہاں چھوڑ گیا ہے؟

نجو وہ موتی ہے۔ بڑا ہوشیار ہے۔ میرا بھائی جیسا دوست ہے۔

کمال تم بھی تو کچھ کم ہوشیار نہیں ہو۔

نجو (ہنستا ہے)

کمال تم دونوں یہاں کیسے پہنچ گئے؟

نجو میں اور موتی یہاں سے کچھ دور ایک گاؤں ہے وہاں اپنی موسی سے ملنے آئے ہیں۔ یونہی ٹہلنے کو نکل گئے تھے، پہاڑی کے اس طرف ہم میل والے پتھر کے پاس بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ تمہاری موٹر گزری اور تمہاری چیخ سنائی دی۔ موتی نے کہا جانے کیا بات ہے کوئی مدد کے لیے چیخ رہا ہے، آؤ دیکھیں۔ ہم تو یونہی مذاق سمجھ رہے تھے مگر یہاں تو بات سچ مچ ڈراونی نکلی۔

کمال تمہیں یہاں آتے ہوئے ذرا بھی ڈر نہیں لگا! تم دونوں بڑے بہادر ہو۔ اب موتی کہاں گیا ہے؟

نجو کسی کو مدد کے لیے بلانے گیا ہوگا۔

کمال یہاں تو ساری بستی سونی معلوم دیتی ہے، مدد کے لیے کون ملے گا۔

(موٹر کی آواز سنائی دیتی ہے)

کمال وہ آ گیا --- اب کیا ہوگا۔ سنو سنو آواز سنو موٹر کھڑی ہو گئی، اب وہ اندر آئے گا۔

نجو موتی نے بڑی دیر کر دی

کمال (آہستہ سے) قدموں کی

آواز سنو، وہ اسی کمرے کی طرف آرہا ہے۔ تمھیں دیکھ کر وہ کیا کہے گا۔ تم کسی طرف چھپ جاؤ، جلدی کرو۔

نجو: آؤ ایسا کریں اس کھڑکی سے نیچے کود جائیں۔

کمال: زمین بہت نیچے ہے چوٹ لگ جائے گی۔

نجو: کچھ نہیں لگے گی، آؤ جلدی کرو۔ دیکھو وہ دروازہ کھول رہا ہے۔ چلو تم چڑھو۔۔۔۔

چچا: خبردار ——

کمال: (چیخ مارتا ہے) نجو!

چچا: تو کون ہے بے، یہاں کیسے آیا؟ ابے بولتا کیوں نہیں —؟

نجو: میں ... میں ...

چچا: ہوں تو تیرا بھی کچھ انتظام کرنا ہی ہوگا (زور سے) بیٹھ جا اسٹول پر، ذرا بھی ہلا تو گولی سے اڑا دوں گا۔ بتا کون ہے تو۔ بولتا کیوں نہیں، بول!

نجو: میں — میں ایک لڑکا ہوں۔

چچا: وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ یہاں کیسے آیا — (طمانچہ مارتا ہے) ہوں۔

نجو: آہ!

چچا: ہوں کیا کام ہے تیرا یہاں، کہاں رہتا ہے تو بول (پھر طمانچہ مارتا ہے)

کمال: تم اسے کیوں مارتے ہو چچا، اسے نہ مارو، چچا

(نجو اور چچا کے بیچ میں آجاتا ہے)

چچا: ہٹ اُدھر چچا کا بچہ۔ اس سے تو میں اچھی طرح نبٹوں گا۔ چھڑانے آیا ہوگا شاید تجھے، ہوں دوست بنے چلا ہے دیکھتا ہے یہ پستول!

(جیب سے پستول نکالتا ہے) تیار ہوجا۔

کمال: نہیں ابن چچا نہیں، تم مجھے مار دو۔ اسے نہ مارو چچا۔

چچا: ہٹ جا اُدھر۔ ہیں؟ یہ کیسی آواز ہے، کون ہے یہاں، یہاں کون آسکتا ہے؟ میں کہتا ہوں کمال ہٹ جا، میں اسے گولی سے اڑا دوں گا — ہٹ جا — ہٹ

(زور سے دروازہ کھلتا اور انسپکٹر داخل ہوتا ہے)

انسپکٹر: خبردار —

چچا: کون — انسپکٹر؟

انسپکٹر: ہاں اپنے ہاتھ اوپر کرلو

(دکاندار اور موتی بھی اندر آجاتے ہیں)

دکاندار: انسپکٹر صاحب یہی ہے وہ شہر کا صاحب۔

انسپکٹر: آپ کو تو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ اب آپ سیٹھ صفدر حسین کے اکلوتے بچے کا خون کرنا چاہتے تھے۔ ہنہہ، دولت تو آپ کو کیا ملے گی، ذرا جیل کی ہوا کھائیے۔ ہاتھ آگے بڑھاؤ، میں تمھیں گرفتار کرتا ہوں۔

(ہتھکڑی پہنا دیتا ہے)

کمال: مجھے بچائیے انسپکٹر صاحب مجھے بچائیے۔

انسپکٹر: تم ڈرو نہیں، اب تمھیں کوئی نہیں ستا سکتا چلو میں تمھیں موٹر میں شہر پہنچا دوں، سیٹھ صاحب پریشان ہوں گے۔

کمال: انسپکٹر صاحب یہ دونوں لڑکے موتی اور نجو بڑے بہادر ہیں۔

انسپکٹر: ہاں بہت ہوشیار اور سمجھدار بچے

تو تم اس خونی کے ہاتھ سے کبھی نہ بچ سکتے تھے
واہ میرے ننھے جاسوسو، خوب، میں تمھاری اس
بہادری سے بہت خوش ہوا ہوں، چلو سیٹھ
صاحب کے گھر تم بھی میرے ساتھ چلو۔ وہ بھی
تم دونوں سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔

کمال موتی، لو یہ میری انگوٹھی لے لو۔ اسے قبول
کرو۔ اور نجو تم میرا یہ فونٹن پین لے لو۔ ایسے

انسپکٹر لے لو بچو۔ سیٹھ صاحب تمھیں اور بھی بہت
کچھ دیں گے۔

کمال سمجھو یہ میری دوستی کا پہلا تحفہ ہے۔۔۔۔
لے لو۔

(موتی اور نجو انگوٹھی اور قلم لے لیتے ہیں)
(پردہ گرتا ہے)

جناب محمد یوسف پاپا

بنانے والا

کتابیں، کاپیاں، کاغذ، قلم، نب اور پیمانے
چیونگ گم، چائے، بسکٹ اور عمدہ چٹ پٹے کھانے

ہزاروں کرسیاں، میزیں، مسہری اور الماری
قناتیں، شامیانے، خوب صورت ٹینٹ سرکاری

مساجد اور مندر، چرچ، ہیکل اور گردوارے
منقش قصرِ شاہی اور باغیچوں کے فوّارے

مشینیں، کارخانے، ٹینک، راکٹ اور طیارے
ہواؤں میں اُڑاتے ہیں جنھیں ہلکے وہ غبارے

یہ لمبی ریلوے کی گاڑیاں، یہ ٹریکٹر، موٹر
یہ کولر، ریڈیو، پنکھے، سنیما اور بجلی گھر

مرے بچو! یہ انسانوں نے سب چیزیں بنائی ہیں
یہ چیزیں حضرتِ انساں کی صدیوں کی کمائی ہیں

کروڑوں اور بھی چیزیں ہیں اس دنیائے فانی میں
کہ جن کا تذکرہ ہے آج انساں کی کہانی میں

مشینیں جس قدر ہیں سب کو انساں ہی چلاتا ہے
بگڑتی ہیں اگر ان کو تو انساں ہی بناتا ہے

بتاؤ ریڈیو کیا بن بنائے خود ہی بنتا ہے
بنا ہاتھوں سے پرزوں کو لگائے خود ہی بنتا ہے؟

بٹن جب تک نہیں دبتا ہے گھنٹی بج نہیں سکتی
کوئی محفل کسی حالت میں خود ہی سج نہیں سکتی

اگر تم رنگ اور کاغذ اٹھا کر میز پر رکھ دو
برش کے ساتھ پانی بھی منگا کر میز پر رکھ دو

کرو اب انتظار اس کا کہ اک تصویر بن جائے
مگر دیکھو کوئی بچہ وہاں جانے نہیں پائے

تو یوں تم مدتوں بیٹھے رہو کچھ بن نہ پائے گا
کوئی تصویر بن جائے نہیں وہ وقت آئے گا

پتہ اس سے چلا کوئی بھی شے خود بن نہیں سکتی
اگر چادر نہ تانی جائے خود ہی تن نہیں سکتی

ہر اک شے کا بلاشک اک بنانے والا ہوتا ہے
ہر اک چلتی ہوئی شے کا چلانے والا ہوتا ہے

مگر ایسی بھی کچھ چیزیں ہیں جو بالکل نرالی ہیں
کسی انسان کی محنت سے نہیں وہ بننے والی ہیں

تم ان چیزوں میں لے سکتے ہو بے شک چاند تاروں کو
زمیں کو اور سورج کو خزاں کو اور بہاروں کو

یہ زندہ کائنات آخر اسے کس نے بنایا ہے؟
زمیں کو چاند سورج کو بھلا کس نے چلایا ہے

پتہ اس سے چلا کوئی نہ کوئی ایسی طاقت ہے
بنایا جس نے ان چیزوں کو یہ اس کی عنایت ہے

اسی طاقت کو ہم اللہ یا رحمٰن کہتے ہیں
خدا کہتے ہیں، ایشور، گاڈ یا بھگوان کہتے ہیں

مرے بچو! خدا ہی نے تو ہم سب کو بنایا ہے

اسی نے آسماں کو چاند تاروں سے سجایا ہے

محترمہ آصفہ مجیب

کیتکی کے پھول

(ایک لوک کہانی)

ایک تھا راجا۔ اس کی سات رانیاں تھیں پر اولاد سے محروم تھا۔ ایک دن ایک فقیر بھیک مانگنے آیا۔ چھ رانیوں نے تو اسے بھگا دیا۔ چھوٹی رانی بھیک لے کر خود فقیر کے پاس آئی۔ فقیر نے پوچھا "بی بی تم اتنی اداس کیوں ہو؟" چھوٹی رانی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے بولی "اللہ نے سب کچھ دیا پر اولاد نہیں دی اسی دکھ میں سلگ رہی ہوں۔ بابا دعا کرو۔ راجا کی آرزو پوری ہو۔ اس کو وارث ملے۔"

اللہ کا کرنا کچھ عرصے بعد اولاد ہونے کی خوش خبری سنائی دی۔ راجا پرجا خوشیاں منانے لگے مگر چھ رانیاں جل گئیں۔ انھوں نے سوچا، اب تو چھوٹی رانی کی ہی قدر ہوگی۔ ہم کو کون پوچھے گا کہ کس کھیت کی مولی ہیں۔ چھوٹی رانی کو خدا نے دو پھول سے پیارے بچے دیے۔ ایک بیٹی اور ایک بیٹا۔

حسد بری بلا ہے۔ دوسری رانیوں نے ایک چال چلی۔ بچوں کو چھپا کر کھائی میں پھنکوا دیا اور خبر اڑا دی کہ بچے نہیں خاک پتھر تھے۔ چھوٹی رانی بیمار ہے۔ ہمارے بھاگ ایسے کہاں جو اولاد ہوتی۔

سب پر غم پھٹ پڑا چھوٹی رانی دکھیا ہاتھ مل کر رہ گئی۔ رنج اور غصہ میں راجا نے اس کو ماما، باندیوں کے ساتھ ایک الگ کوٹھری میں ڈلوا دیا۔ اور کہا "بس اب یہ کوّے ہنکایا کرے۔" بیچاری کی قسمت پھوٹ گئی۔

کئی برس یوں ہی بیت گئے۔ ایک دن راجا کا سپاہی کہیں باغ میں جا رہا تھا۔ اس کی نظر کھائی میں کیتکی کے دو خوب صورت مہکتے پھولوں پر پڑی۔ اس نے بڑھ کر چاہا کہ توڑ لے تو ہاتھ وہاں تک نہیں پہنچے۔ ڈالی اوپر چڑھ گئی۔ ایک پھول نے دوسرے پھول سے پوچھا:

"کہو بہن کیتکی راجا کا سپاہی پھول توڑنا چاہتا ہے ڈالی جھک جائے یا اور اوپر چڑھ جائے؟"

دوسرے پھول نے جواب دیا: "ہرگز نہیں اور اوپر چڑھ جائے۔"

یہ تماشا دیکھ کر سپاہی دنگ رہ گیا۔ بھاگا ہوا راجا صاحب کے پاس آیا اور قصہ سنایا۔ راجا کو یقین نہیں آیا کہا "ہٹو، کیا بکواس ہے۔ یہ سب من گھڑت ہے۔ پھول کوئی انسان ہیں؟ یہ نہیں ہو سکتا۔" پھر وزیر سے کہا "آپ جا کر دیکھیے

کیا اصلیت ہے ؟"

وزیر پہنچا، پھول توڑنے کو ہاتھ بڑھایا تو پھر وہی ہوا۔ پھول اوپر اٹھ گئے۔ وہ حیرت زدہ واپس آیا اور راجا سے عرض کیا" حضور بات بالکل سچ ہے۔ کیا عجیب پھول ہیں۔ نہ دیدہ نہ شنیدہ۔ سارا باغ مہک رہا ہے۔ خوشبو روح میں بسی جا رہی ہے۔"

راجا بڑا حیران ہوا پھول دیکھنے اور توڑنے کے لیے بے چین ہو اٹھا۔ خود آیا۔ پھول دیکھ کر بڑا پیار آیا۔ بڑے چاؤ سے ہاتھ بڑھا دیا۔ ایک پھول نے دوسرے سے پوچھا،

"ہمارے ابا حضور راجا صاحب آئے ہیں، ڈالی جھک جائے ؟"

دوسرے نے جواب دیا" نہیں اوپر چڑھ جائے" پھول اوپر اٹھ گئے۔

راجا پریشان کھڑا تھا۔ اس نے اپنا سر تھام لیا" یہ مجھے ابا حضور کہہ رہے ہیں۔ جب مجھے اولاد کی خوش خبری سنائی دی اور آس بندھی تو اچانک قسمت پر پتھر پڑ گئے۔ خاک پتھر ملے — یہ کیا بھید ہے — ؟"

اس نے رانیوں کو بلوایا۔ ایک ایک کر کے سب پھول لینے کو بڑھیں مگر ہر دفعہ ڈالی ہٹ ہٹ گئی۔ ساری ریاست یہ انوکھا تماشہ دیکھنے کو اکٹھی ہو گئی۔ میلا سا لگ گیا۔ جب سب ہار گئے تو وزیر نے کچھ سوچ کر راجہ کو رائے دی" عالیجاہ اب چھوٹی رانی کو بلوائیے۔ وہ کیوں رہ جائیں۔"

دوسری رانیاں کھنکیں اور بول اٹھیں" کوئی ضرورت نہیں انھیں بلانے کی۔ بھلا جب ہمارے پاس پھول نہ آئے تو اس کوا ہنکنی کے پاس کیا آئیں گے۔ چلو ہٹو سب لوگ یہاں سے۔ پھول جائیں بھاڑ میں"

راجا نے ان کی بات نہیں سنی اور فوراً چھوٹی رانی کو حاضر ہونے کا حکم دیا۔

ماتا کی ماری رانی جیسے ہی آئی لپک کر پھولوں کی طرف بڑھی۔

ایک پھول نے دوسرے سے پوچھا" بہن کیتکی، اماں جان آئی ہیں کوا ہنکنی۔ ڈالی جھک جائے کہ اوپر چڑھ جائے؟"

دوسرے نے جواب دیا" بالکل نہیں ان کے قدموں پر گر جائے"

پھول رانی کے قدموں پر گر پڑے اور زمین پر آتے ہی دو حسین پیارے پیارے بچے بن گئے۔ رانی نے جلدی سے لپٹا لیا، پیار کیا اور رونے لگی۔ راجا پرجا سب حیران رہ گئے۔ راجا نے بڑھ کر بچوں کو پیار کیا اور پوچھا" یہ کیا ماجرا ہے ؟"

بچوں نے بتایا: " جب ہم دنیا میں آئے دوسری ماؤں کو جلانے کیا سوجھی ہمیں زندہ دفن کروا دیا۔"

یہ سن کر راجا غم اور غصے سے کانپ اٹھا اور حکم دیا" ان سب کو جان سے مار ڈالو، ان کا مر جانا ہی بہتر ہے۔"

دونوں بچوں نے ہاتھ جوڑ کر باپ سے کہا،

" ابا حضور ہماری خوشی یہ ہے کہ ان کو معاف کر دیجیے۔ یہ ہماری مائیں ہیں۔"

دونوں نے انھیں بچا لیا۔ اب تو سب رانیاں بچوں سے بے حد خوش ہو گئیں۔ ان سے پیار اور محبت کرنے لگیں۔ ہر وقت جان چھڑکتیں۔ راجا نے خدا کا شکر ادا کیا اور سب خوش و خرم رہنے لگے۔

آج سے پانسو برس پہلے کی دنیا آج کل کی دنیا سے آدھی تھی۔ اس وقت کے جغرافیہ میں ایشیا، یورپ اور افریقہ کا شمالی اور مشرقی حصہ شامل تھا، سمندروں کا حال بہت کم معلوم تھا۔ جہاز بادبانی ہوتے تھے جو ساحل کے پاس پاس چلتے تھے اور اگر ہوا مخالف ہوتی تو ان کو ٹھہرنا پڑتا تھا۔ بعض اوقات چٹانوں سے ٹکرا کر تباہ ہو جاتے تھے۔ جگہ جگہ سمندری لٹیروں کا ڈر تھا اور ان کی لوٹ مار کی کوئی داد و فریاد نہ تھی۔ اس زمانے میں کولمبس پیدا ہوا جس نے جہاز کو اپنا گھر بنایا اور سمندر اس کی دنیا تھی۔

کرسٹوفر کولمبس ۱۴۳۸ء میں اٹلی کے شہر جنیوا ں پیدا ہوا۔ اسکول میں اسے جغرافیہ سے بہت دل چسپی ی۔ اس کے باپ نے اسے پاویا (PAVIA) یونیورسٹی ںمیں بھیج دیا جہاں اس نے جیومیٹری، جغرافیہ، ہیئت اور ازرانی کی تعلیم پائی۔ ابھی وہ چودہ برس کا تھا کہ جہاز نی کے لیے چلا گیا۔ بحیرہ روم کے تجارتی اور جنگی جہازوں کام کرتا رہا۔ ایک دفعہ اس کے جہاز کو آگ لگ گئی۔ وں کے ساتھ وہ بھی سمندر کود پڑا۔ اتفاق سے ایک چپو اس کے ہاتھ لگ گیا جس کی مدد سے وہ کنارے پر پہنچ گیا۔

اس زمانے میں پرتگال کے لوگ دنیا میں سب سے بڑے جہاز راں تھے۔ انہوں نے افریقہ کے ساحل کے گرد چکر لگانے شروع کیے اور یہ کوشش کی کہ کسی طرح ہندوستان کا سمندری راستہ معلوم کریں۔ اس زمانہ میں یورپ کے لوگ ہندوستان کی دولت کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ وہاں سونے اور جواہرات کے ڈھیر ہیں۔

کولمبس کی عمر ۲۷ سال کی تھی، وہ پرتگال چلا گیا۔ وہاں اس کو پرتگالی جہازوں میں سفر کا بہت کچھ تجربہ ہو گیا۔ انہی دنوں اس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اگر کوئی جہاز برابر مغرب کی طرف چلتا رہے تو وہ ایک دن مشرق میں پہنچ جائے گا۔ مشرق میں ایشیا ہے، وہاں سے ہندوستان پہنچ سکتے ہیں۔ جب وہ اپنا یہ خیال لوگوں پر ظاہر کرتا تو کوئی اس کی بات نہیں سمجھتا تھا۔ اس نے دس برس کوشش کی مگر پرتگال کے بادشاہ نے اس

کی مدد نہیں کی۔

مایوسی کے عالم میں وہ اسپین پہنچا اور شاہ فرڈی نینڈ کے دربار میں پیش ہوا۔ ملکہ ازابیلا کو اس سے ہمدردی پیدا ہوگئی۔ اس نے بادشاہ سے کہا۔ اس شخص کی ضرور مدد کرنی چاہیے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ ملک کے بڑے بڑے عالموں کو بلایا جائے اور کولمبس اپنا خیال ان کے سامنے ظاہر کرے۔ اگر وہ مان لیں تو ہم مدد کریں گے۔ اس زمانہ میں وہاں سلامنکا (SALAMANKA) یونیورسٹی بہت مشہور تھی چنانچہ وہیں کونسل کے سامنے کولمبس پیش ہوا اور یہ گفتگو ہوئی:۔

سینٹ اوگسٹاین، کولمبس تمہارا خیال ہے کہ زمین کے دوسری طرف بھی دوسری دنیا ہے؟

کولمبس، جی ہاں مقدس باپ، جس طرح ہم یہاں چلتے پھرتے ہیں، اسی طرح ہمارے قدموں کے نیچے زمین کی دوسری طرف کے لوگ بھی چلتے پھرتے ہیں۔

لیکٹن ٹیوس، تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ پاتال میں بھی لوگ رہتے ہیں جو ٹھیک ہمارے قدموں کی سیدھ میں کھڑے ہیں اور جب چلتے ہیں تو ان کی ٹانگیں اوپر کی طرف ہوتی ہیں اور سر نیچے کی طرف لٹکے ہوتے ہیں۔

اوگسٹاین، کولمبس تمہارے خیال میں دنیا کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جہاں تمام چیزیں الٹی ہوتی ہیں۔ وہاں درخت اُگتے ہیں تو ان کی شاخیں نیچے کی طرف بڑھتی ہیں، بارش ہوتی ہے تو نیچے سے اوپر کی طرف اولے پڑتے ہیں تو وہ بھی اوپر کی طرف!

کولمبس: مقدس باپ، زمین گول ہے اور گول چیز جب ادھر ہو تو اس کے نیچے اوپر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

لوگسٹاین: (بگڑ کر) کون کہتا ہے زمین گول ہے؟ تم نے زبور نہیں پڑھی۔ زمین فرش کی طرح پھیلی ہوئی ہے اور اس پر آسمان کا شامیانہ تنا ہوا ہے۔

لیکٹن ٹیس۔ یہ لوگ جو اپنے آپ کو فلسفی کہتے ہیں جب کوئی غلطی کرتے ہیں تو اسے نباہنے کے لیے طرح طرح کی بے تکی باتیں کیا کرتے ہیں۔

اوگسٹاین: اچھا کولمبس یہ بتاؤ، کوئی آدمی بحر اوقیانوس کو پار کرکے دوسری طرف کی دنیا میں گیا ہے؟

کولمبس: جی نہیں، مگر مجھے امید ہے، خدا کی مدد سے ضرور وہاں پہنچ جاؤں گا۔

لیکٹن ٹیس: تو گویا تم پہلے انسان ہوگے جو اُس دنیا کو آباد کروگے۔

کولمبس، جی نہیں، وہاں پہلے سے لوگ آباد ہیں۔

لیکٹن ٹیس، غلط، بالکل غلط! وہاں انسان کی نسل ہو ہی نہیں سکتی۔ انجیل مقدس میں آیا ہے کہ دنیا کے تمام آدمی حضرت آدم کی اولاد ہیں۔ جب وہاں کوئی آدمی پہنچا ہی نہیں تو وہاں انسانوں کی آبادی کیسے ہوسکتی ہے!

اوگسٹاین: اچھا تھوڑی دیر کے لیے ہم فرض کیے لیتے ہیں کہ زمین گول ہے اور تم مغرب کی طرف چلتے چلتے وہاں پہنچ گئے تو پھر وہاں سے واپس کس طرح آؤگے؟

کولمبس (خوش ہوکر) بالکل اسی طرح چلا آؤں گا جس طرح جاؤں گا۔

اوگسٹاین: (طنزیہ طور پر) جب تم زمین کے نیچے کی طرف چلے جاؤگے تو پھر جہاز اوپر کی طرف کس طرح چڑھ

سکے گا۔
کولمبس: مقدس باپ میں نے ابھی کہا تھا کہ زمین گول ہے، اس میں اوپر نیچے کا سوال پیدا نہیں ہوتا سمندر کی سطح ہر جگہ ہموار ہے
لیکن نیس: تم کو معلوم ہے سمندر کتنی دور تک پھیلا ہوا ہے؟ کتابوں میں لکھا ہے اگر کوئی جہاز بحر اوقیانوس کو پار کرنا چاہے تو اس کو تین برس لگیں گے۔ اتنی مدت کا کھانا پانی تم کیسے لے جا سکتے ہو؟ نتیجہ یہ ہوگا تم خود تو مروگے ہی، ساتھ میں اپنے ساتھیوں کو بھی تباہ کردوگے۔
اس امتحان میں کولمبس کو نہ صرف فیل کیا گیا بلکہ پاگل ٹھہرایا گیا۔ چنانچہ جب وہ گلیوں میں سے گزرتا تو لڑکے اس کے پیچھے تالیاں بجاتے تھے۔
یہ زمانہ اس پر بڑی تنگی سے گزرا۔ جغرافیہ کی کتابیں اور نقشے بیچ کر گزر کرتا رہا۔ اس نے اپنے بھائی کو انگلستان بھیجا کہ شاید وہاں کا بادشاہ ہنری ہفتم اس کی مدد کرے۔ مگر وہاں بھی مایوسی ہوئی۔ پھر فرانس میں کوشش کی وہاں بھی ناکامی ہوئی، مگر وہ اپنی دھن کا پکا سمجھدار لوگوں پر اپنا خیال ظاہر کرتا رہا۔ اتفاق سے ایک پادری سے اس کی ملاقات ہوئی۔ ملکہ پر اس کا بہت اثر تھا۔ اس کی سفارش سے وہ پھر ملکہ ازابیلا کے سامنے پیش ہوا اور یہ گفتگو ہوئی۔
ازابیلا: تم کو معلوم ہے کولمبس، آج کل ہم لوگ جنگ میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ہم نے عربوں کو ملک کے بڑے حصے سے نکال دیا ہے مگر جنوب میں ابھی ان کی حکومت باقی ہے۔ اصل میں یہی وجہ تھی کہ حکومت تمہاری مدد نہ کرسکی۔
کولمبس: ملکۂ عالیہ، اگر میری مدد ہو جائے تو مجھے امید ہے کہ میں نئے نئے جزیرے دریافت کروں گا اور ملک میں دولت کے ڈھیر لگ جائیں گے۔
ازابیلا: مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ اگر حکومت نے تمہاری مدد نہ کی تو میں اپنے زیور اور جواہرات بیچ کر تمہاری مدد کروں گی۔ بتاؤ کیا چاہیے تم کو؟
کولمبس (خوش ہو کر) خدا ملکۂ عالیہ کو سلامت رکھے، مجھے چند جہازوں کا ایک چھوٹا سا بیڑا چاہیے اور جہازیوں کے کھانے پینے کے لیے کچھ روپیہ۔
ازابیلا: اس کا انتظام کر دیا جائے گا۔
کولمبس: ملکۂ عالیہ اگر اجازت ہو تو کچھ اور عرض کروں۔
ازابیلا: اجازت ہے۔
کولمبس: مجھ کو ایڈمرل کا خطاب دے دیا جائے اور میرے ساتھیوں کو میرا حکم ماننے کی ہدایت دی جائے۔
ازابیلا: ایسا ہی ہوگا۔ اب تم جا سکتے ہو۔
سترہ سال کی کوششوں کے بعد آخر وہ دن آگیا جس کا کولمبس کو انتظار تھا۔ اس کو دو چھوٹے اور ایک بڑا جہاز دیا گیا اور ۳ اگست ۱۴۹۲ء کی صبح کو اس کا چھوٹا سا بیڑا روانہ ہوا۔
شروع میں چند روز تو اس کے ساتھی خوش رہے مگر جب چلتے چلتے ایک مہینا ہو گیا تو گھبرانے لگے۔ دو ایک سخت طوفان ایسے آئے کہ ان کے جی چھوٹ گئے اور کولمبس کے خلاف سازش ہونے لگی۔ چنانچہ ایک دن طوفان کا زور کم ہونے کے بعد:

ایک: (آہستہ سے کاناپھوسی کرتے ہوئے) کیوں بھئی اب کب تک ہم ان لہروں سے لڑتے رہیں گے؟

دوسرا: ہم کو یہ بھی معلوم نہیں ہم کہاں جا رہے ہیں۔

تیسرا: خود کولمبس کو بھی معلوم نہیں، وہ ہمیں کہاں لیے جا رہا ہے۔

پہلا (غصّہ سے) لے کہاں جا رہا ہے، موت کے مُنہ میں دھکیلنے کو۔ اب ہم سمندر میں ایسی جگہ پہنچ گئے ہیں جہاں آج تک کوئی نہیں آیا۔

دوسرا: بس اسی طرح ہم مغرب کی طرف چلتے رہیں گے اور ایک دن ختم ہو جائیں گے۔

پہلا: ارے بھئی سلامینکا کی کونسل میں جو بڑے بڑے عالم بیٹھے تھے انہوں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا "یہ بے وقوف آدمی ہے، خیالی دنیا میں رہتا ہے۔"

دوسرا: سنا ہے ہمارے کھانے پینے کا ذخیرہ بھی کم ہو گیا ہے، اب کیا ہوگا۔

تیسرا: وہی ہوگا جو بے وقوفوں کا انجام ہوتا ہے۔

پہلا: میں تو کہتا ہوں ...... ہم ....

دوسرا: ہاں ہاں کہو رک کیوں گئے؟

پہلا: کولمبس کو سمندر میں پھینک دیں سے اور واپس چلیں۔

دوسرا: مگر اس کو ہمارا ایڈمرل بنایا گیا ہے۔ حکومت ہم پر مقدمہ چلائے گی۔

تیسرا: (آہستہ سے) ارے بھئی کہہ دیں گے وہ ستارے دیکھنے کے لیے اوپر چڑھا تھا، گر پڑا، بس......

پہلا: (گھبرا کر) چپ ہو جاؤ، کولمبس آ رہا ہے۔

کولمبس: (قریب آ کر) دوستو! کیا ہو رہا ہے۔

پہلا: ہم پریشان ہیں صاحب۔ آخر ہمارا انجام کیا ہوگا؟

کولمبس: (پیار سے) ارے تم کو تو خوش ہونا چاہیے۔ اب ہم جاپان کے قریب آ گئے ہیں اور بہت جلد ہندوستان پہنچ جائیں گے۔

دوسرا: یہ تو آپ کئی دن سے کہہ رہے ہیں۔

کولمبس: کل تم نے لکڑی کا ایک تختہ بہتا ہوا دیکھا تھا، آج کئی پرندے اڑتے ہوئے نظر آئے اور یہ دیکھو، یہ جو جھاڑی کی ہری ٹہنی میرے ہاتھ میں ہے ابھی میں نے لہروں میں سے اٹھائی ہے۔ اس میں بیر بھی لگے ہوئے ہیں، اب تو پورا یقین ہو گیا ہم خشکی کے قریب آ گئے ہیں۔ (پیار سے) دنیا میں تمہاری بہادری کے چرچے ہوں گے۔ اوہ! پھر طوفان کا زور بڑھنے لگا، جاؤ جلدی اپنی اپنی جگہ چلے جاؤ۔

غرض کولمبس اپنے ساتھیوں کو اسی طرح دلاسا دیتا رہا اور مغرب کی طرف چلتا رہا۔ آخر ایک دن پو پھٹتے ہی ایک سرسبز جزیرہ نظر آیا۔ بیڑے میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور کولمبس نے کنارے پر اتر کر اسپین کا جھنڈا گاڑ دیا۔ کولمبس سمجھا کہ وہ جاپان پہنچ گیا ہے لیکن یہ مقام ویسٹ انڈیز کا جزیرہ ہسپاملا (HISPAMALA) تھا۔ وہاں کے حالات معلوم کر کے وہ اسپین واپس آ گیا جہاں اس کا شاندار استقبال ہوا۔ اس کے بعد اس نے تین سفر اور کیے جن میں جمیکا کیوبا اور دوسرے جزیرے دریافت کیے۔ اسی تلاش میں ایک دن جنوبی امریکہ کے ساحل پر قدم رکھا اور اس طرح امریکہ دریافت ہوا۔ وہ ۲۰ مئی ۱۵۰۶ء میں مرا۔ شاہ فرڈیننڈ نے اُس کے مقبرے پر یہ الفاظ کھدوائے: "کولمبس نے ہم کو ایک نئی دنیا دی۔"

جناب حرمت الاکرام

چودھویں رات

مسکراتی چاندنی جادو جگاتی چاندنی
کتنی دلکش ہے یہ روحوں میں سماتی چاندنی

آسماں سے آئی ہے کتنا حسیں تحفہ لیے
رات کو انوار کی چادر اوڑھاتی چاندنی

کام چاندی کا دکھاتی ہے زمیں کی شال پر
پیڑ سے پیپل کے یہ چھن چھن کے آتی چاندنی

چومتی ہے خاک کے ذرّوں کو کس انداز سے
اپنے اجلے پیار کی چاندی لٹاتی چاندنی

جیسے کھوئی جا رہی ہے خامشی کی گونج میں
چپکے چپکے ساز پر فطرت کے گاتی چاندنی

اوٹ میں بیلوں کے چھپتی پھر رہی ہے کس طرح
اک دلہن کی طرح شرماتی لجاتی چاندنی

کر رہی ہے چھاؤں میں پھولوں کی چھپ چھپ کے سنگھار
اپنے ہی جلوں کے دریا میں نہاتی چاندنی

فرش سبزہ پر کہیں کیا کیا مچلتی، اینڈتی
کوہساروں پر کہیں دھونی رماتی چاندنی

دوستی گنگا کی لہروں سے نبھاتی اک طرف
ایک جانب ریت کی محفل سجاتی چاندنی

جناب ستیش بترا

سُنیل کی مصیبت

سنیل نہایت ہوشیار لڑکا تھا۔ ایک دن درجے میں ماسٹر جی نے پردھان منتری شری لال بہادر شاستری کے سندیش "جے جوان، جے کسان" کے بارے میں بہت اچھی اچھی باتیں بتائیں۔ انھوں نے بتایا کہ جہاں دیش کی حفاظت ضروری تھی وہاں بڑھتی ہوئی آبادی اور دیش کی ترقّی کے لیے اناج، سبزیاں اور دوسری کھانے پینے والی چیزوں کی پیداوار بڑھانا بھی ضروری تھا۔ سُنیل نے فوراً دل میں ٹھان لی کہ وہ شاستری جی کے کہے پر اپنے بس بھر چلنے کی کوشش کرے گا۔

اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ بڑا ہو کر فوج میں افسر بنے گا لیکن وہ اس سے بھی پہلے دیش کے دوسرے کاموں میں پورا حصّہ لے گا۔ اس نے اپنے پتا جی سے اجازت لے کر اپنے مکان کے پچھواڑے کچھ کیاریاں بنانا شروع کر دیں۔ اُس کا جوش دیکھ کر اس کے ماتا پتا نے اس کی ہمّت بڑھائی۔ اُس کے لیے بازار سے کچھ کتابیں لے آئے۔ ان میں لکھا تھا سبزیاں کیسے اگانی چاہئیں، ان میں کھاد اور پانی کب کب ڈالنا چاہیے، زمین کیسے تیار کرنی چاہیے، بیج کیسے لگانا چاہیے۔

پڑوس میں چودھری منگل سین رہتے تھے۔ اُن کے ہاں سبزی، بھٹے بلکہ گیہوں تک خوب ہوتا تھا۔ اگرچہ چودھری صاحب کی مونچھیں کافی خوفناک تھیں اور سُنیل کو ہمیشہ اُن سے ڈر لگتا لیکن اب اُس نے صلاح مشورے کے لیے اُن کے ہاں جانا شروع کر دیا۔

اُسے یہ جان کر بڑی حیرانی ہوئی کہ چودھری صاحب شکل سے جتنے خوفناک معلوم ہوتے تھے، دل کے اتنے ہی نرم تھے۔ انھوں نے سُنیل کو بہت سی کارآمد باتیں بتائیں۔ اُس کی پیٹھ ٹھونک کر کہا: "بیٹا مجھے تمھارا یہ شوق دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم بہت بڑے آدمی بنو گے!" اور پھر انھوں نے اپنے سب سے بہترین بیج نکال کر اُسے بونے کے لیے دے دیے۔

سُنیل نے زمین کو اچھی طرح سے کھودا۔ اسے تیار کیا اور چودھری صاحب کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بیج بو دیے۔ اگلے دن اس نے کیاریوں کو سینچا اور پھر وہ بیج پھوٹنے کا بڑی بے تابی سے انتظار کرنے لگا۔

پانچ سات روز بعد جب وہ ان کیاریوں کے پاس سے گزر رہا تھا تو اس کی نگاہ اچانک ان ہرے بھرے کلّوں پر پڑی جو بیج سے پھوٹ رہے تھے۔ وہ خوشی سے تالیاں بجانے لگا۔ اس کے ماتا پتا، چھوٹی بہن ریکھا اور پاس پڑوس کے بچے سب کیاری کے گرد اکٹھے ہو گئے اور وہ نہایت

...ن فخر سے اُن کو پھوٹتی ہوئی نرم نرم نازک کونپلیں دکھانے لگا۔ ...یوس کی مرغیاں بھی چیخ اٹھیں۔ گویا وہ بھی ان سب کی خوشی ...یں شامل تھیں۔

آنگن کے دوسری طرف ایک وکیل صاحب کا مکان تھا۔ یہ مرغیاں انھی نے پال رکھی تھیں۔ سفید سفید ولایتی مرغیاں! سنیل کو یہ مرغیاں بہت اچھی لگتی تھیں۔ وہ انھیں کبھی کبھی اپنی گود میں اٹھا لیتا۔ ان کو اپنی گردن اور گالوں سے لگا لیتا۔ اُن کی راحت بخش گرمی اسے نہایت ہی بھلی لگتی۔ مرغیاں بھی اپنی گول گول آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتیں اور بنا شور مچائے اس کی گود میں دیر تک بیٹھی رہتیں۔ گویا وہ اسے اپنا حق سمجھتی ہوں۔

ایک دن جب سنیل اسکول سے واپس لوٹا تو اس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ اس کی کیاریوں میں مرغیاں آرام سے ٹہل رہی تھیں اور انھوں نے بہت سی ہری ہری کونپلیں چٹ کر لی تھیں۔ وہ غصّے سے پاگل ہو اٹھا۔ اس نے زور سے "شو" کر کے مرغیوں کو اپنے آنگن سے بھگا دیا۔ اُسے کبھی سپنے میں بھی خیال نہیں آیا تھا کہ وہ مرغیاں جنھیں وہ بے حد پیار کرتا تھا اس کی محنت پر یوں پانی پھیر دیں گی۔

وہ غصّے سے جلایا ہوا سیدھا وکیل صاحب کے پاس گیا۔ اس نے بتایا کہ وہ کس طرح شاستری جی کے کہنے کے مطابق دیش کی پیداوار میں تھوڑا بہت اضافہ کرنا چاہتا تھا۔ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ وکیل صاحب آنگن میں ایک دیوار اٹھوا لیں تاکہ مرغیاں سنیل کے آنگن میں آکر کھیتی کو برباد نہ کر سکیں۔

وکیل صاحب تھوڑی دیر کچھ سوچتے رہے پھر کہا،

"دیکھو صاحبزادے میں تمھارے خیالات کی قدر کرتا ہوں۔ میں نے بھی مرغیاں دیش کی خوراک میں اضافہ کرنے کے لیے پال رکھی ہیں۔ تمھارا مقصد اور میرا مقصد ایک ہے۔ رہا دیوار کا سوال تو بھئی یہ دیوار تم کیوں نہیں اٹھوا لیتے؟ نقصان تمھارا ہو رہا ہے میرا نہیں!"

سنیل اس دلیل کے سامنے ہکا بکا رہ گیا۔ وہاں سے چلا آیا۔ اس کے دماغ میں آیا کہ اگر وہ ان مرغیوں میں سے کسی ایک کی ترکاری بنا لے تو وکیل صاحب کو معلوم ہو جائے گا کہ نقصان کس کا ہو رہا ہے۔ لیکن وہ ایسا کیسے کر سکتا تھا۔ بھلا ان سفید سفید پیاری سی بے زبان مرغیوں سے یوں کیسے بدلہ لے سکتا تھا۔ اگر ان مرغیوں کو معلوم ہوتا کہ ان کے اس عمل سے اُسے کس قدر دکھ ہوا ہے تو شاید وہ ایسا کبھی نہ کرتیں اور پھر اگر مرغی مار دی جاتے تو اس میں دیش ہی کا تو نقصان تھا۔ دیش کو اس مرغی کے انڈے نہیں مل سکیں گے۔ یہ تو پیداوار بڑھانے کی جگہ پیداوار کم کرنے کی تجویز تھی!

سنیل اس رات اپنے بستر پر دیر تک کروٹیں بدلتا رہا سوچتا رہا۔ سوچتے سوچتے اچانک ایک ترکیب اس کی سمجھ میں آگئی اور پھر وہ مطمئن ہو کر سو گیا۔

اگلے دن اسکول سے لوٹتے وقت وہ بازار سے دو تین انڈے خرید لایا اور اس نے ان انڈوں کو اپنے آنگن میں کسی جھاڑی، لکڑی کی پرانی پیٹی اور ٹوٹی ہوئی چارپائیوں کے نیچے نہایت احتیاط سے چھپا دیا۔ تھوڑی دیر بعد جب وکیل صاحب ٹہلنے کے لیے اپنے آنگن میں آئے تو اس نے چوری کے انداز میں چھپائی ہوئی جگہ سے اس طرح انڈا نکالا کہ وکیل صاحب کی نظر اس پر پڑ جائے۔ پھر اس نے اپنی چھوٹی بہن ریکھا کو آواز دی۔ جب وہ قریب آگئی تو اس نے اونچی آواز میں اور کچھ دبے لفظوں میں کہا۔

"ہماری کھیتی تو مرغیاں برباد کر گئیں۔ لیکن لو۔۔۔ وہ ہمیں کچھ دے بھی گئی ہیں۔ اور پھر تھوڑی دیر میں دوسری

بقیہ صفحہ ۱۱۴ پر

لکڑی کے لٹھے سے ایٹمی جہاز تک

لاکھوں سال پہلے جنگلوں میں رہنے والے انسان کو کچھ تجربوں کے بعد معلوم ہوا ہوگا کہ پانی میں گر جانے سے آدمی ڈوب کر مر جاتا ہے۔ دوسری طرف اس نے کچھ جانوروں کو تیرتے ہوئے دیکھا ہوگا اور کچھ کوشش کے بعد خود بھی تیرنا سیکھ لیا ہوگا۔

لیکن جھیلوں، ندیوں اور سمندروں میں صرف تیر کر ہی تو کام نہیں چلایا جا سکتا تھا۔ شکار کے لیے اسے کسی ایسی چیز کی ضرورت محسوس ہوتی ہوگی جس میں وہ خود بغیر بھیگے بیٹھ سکے اور کچھ سامان رکھ سکے۔ یہ ضرورت کشتی کی ایجاد کی ماں تھی۔

بہت سی دریافتیں اور بہت سی ایجادیں محض کسی اتفاقی حادثے کے رونما ہونے سے ہوئیں۔ سیب کو درخت سے نیچے گرتا دیکھ کر نیوٹن نے سوچا سیب ہمیشہ نیچے ہی کیوں گرتا ہے اور اس نے زمین کی کشش کا اصول دریافت کر لیا۔ جیمس واٹ کو بھاپ کے زور سے بار بار اچھلتا ہوا کیتلی کا ڈھکن دیکھ کر بھاپ کا انجن بنانے کا خیال آیا۔

اسی طرح پانی میں ڈوبتے ہوئے کسی آدمی کو کسی لکڑی کا سہارا مل گیا ہوگا۔ ڈوبتے کو تو تنکے کا ہی سہارا بہت ہوتا ہے یہ تو لکڑی کا لٹھا تھا۔ اس طرح اس کو معلوم ہوا ہوگا کہ لکڑی کا سہارا لے کر انسان آسانی سے پانی پر سفر کر سکتا ہے۔

اس دریافت کے بعد اس نے لکڑی کے لٹھے میں اپنے بیٹھنے اور سامان رکھنے کی جگہ بنائی ہوگی —— یا تو اپنی بھدی کلہاڑی سے چھیل کر یا آگ سے جلا کر۔ یہ جگہ تو اس نے محض بیٹھنے کے لیے بنائی ہوگی مگر بعد میں اس

کو معلوم ہوا ہوگا کہ لکڑی کے کھوکھلے ہو جانے کی وجہ سے
اس کی کشتی ہلکی بھی ہو گئی تھی اور آسانی سے پلٹ بھی نہیں
سکتی تھی۔

دراصل خلا کی وجہ سے ہی کوئی بھاری چیز پانی
پر تیر سکتی ہے۔ آپ نے ملک کے مختلف حصوں میں
کسان اور چرواہوں کو کسی جانور کی کھال میں ہوا بھر کر
چار گھڑوں کو ڈنڈوں سے باندھ کر یا پکّی سوکھی لوکی کے
خولوں کو جوڑ کر تیرنے کا ذریعہ بناتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ ان
سب چیزوں میں خلا ہوتا ہے۔ اس خلا کی وجہ سے کافی وزنی
ہونے پر بھی ہوا کے دباؤ کے اصول کے مطابق، پانی میں
ڈوب نہیں پاتیں ـــــ لکڑی کے لٹھوں کے علاوہ انسان
نے ابتدا میں اس طرح کی چیزوں کا بھی استعمال تیرنے کے
لیے کیا ہوگا۔ لکڑی کے لٹھوں کو جوڑ کر بیڑا بھی بنایا جاتا تھا۔

پرانی کشتیوں کی ایک اور شکل
دیکھنے میں آتی ہے۔ بانس یا پیڑ کی شاخوں کو جوڑ کر
ایک ٹوکری سی بنائی جاتی تھی
اس کے [illegible] کسی جانور کی کھال
مڑھ دی جاتی تھی۔ کھال کی وجہ سے یہ "کشتی" مضبوط
بھی ہو جاتی تھی اور پانی بھی اس کے اندر نہیں آسکتا تھا۔
یہ اتنی ہلکی ہوتی تھی کہ لے جانے والا اسے بڑی آسانی
سے اپنی کمر پر باندھ کر کہیں لے جا سکتا تھا۔

یہ بات یاد رکھیے کہ کسی چیز کو ایجاد کرنا مشکل
ہوتا ہے۔ پھر اس میں ترقی تو دھیرے دھیرے آسانی سے
ہوتی ہی رہتی ہے۔ نہ جانے کتنے تجربات کے بعد کتنی
مدت میں ابتدائی انسان نے لکڑی کے تختوں کو جوڑ کر
موجودہ کشتی سے ملتی جلتی کشتی بنائی ہوگی۔

ایسی کشتی پہلے پہل کب بنی؟ اس کا جواب دینا
مشکل ہے کیوں کہ انسانی تاریخ پر جہاں تک نظر جاتی ہے
کشتی کا وجود نظر آتا ہے۔ مصر، چین، ہندوستان،
بابل، عراق کی قدیم تہذیبوں میں کافی بڑی اور ترقی یافتہ
کشتیوں کا ذکر ملتا ہے اور اس سے بھی پہلے پانی کے
طوفان میں حضرت نوحؑ کے کشتی بنانے کا ذکر قرآن کریم
میں ہے۔ قرآن شریف کے علاوہ بائبل، منوسمرتی اور
پارسیوں کی مذہبی کتاب
ژند اوستا میں بھی ایک سیلاب

اور ایک کشتی کا ذکر مختلف ناموں سے ملتا ہے۔ بہرحال کشتی
انسان کی بہت پرانی ایجاد ہے۔

گو یونان کی قدیم تہذیب میں بھی جنگی اور تجارتی
جہازوں کا ذکر ملتا ہے مگر دور دراز تک سفر کرنے والے
مضبوط، خوبصورت اور آرام دہ جہاز بنانے کے فن میں
اہلِ روم نے خاص طور سے ترقی کی۔ روم کی سلطنت
تقریباً ڈھائی ہزار سال پہلے ایک وسیع اور عظیم الشان
سلطنت تھی۔ سمندر پار کے دور دراز علاقوں میں روم کی حکومت
تھی۔ کارتھیج اور مصر میں رہنے والوں پر رومیوں نے بحری
بیڑے سے ہی حملے کیے تھے۔ اہلِ روم کے پاس دو طرح
کے جہاز ہوتے تھے۔ ایک تجارتی اور دوسرے جنگی۔

تجارتی جہاز مضبوط اور بڑے ہوتے تھے اور
بادبان سے چلتے تھے۔ جہاز کے اوپری حصے پر اونچی اونچی
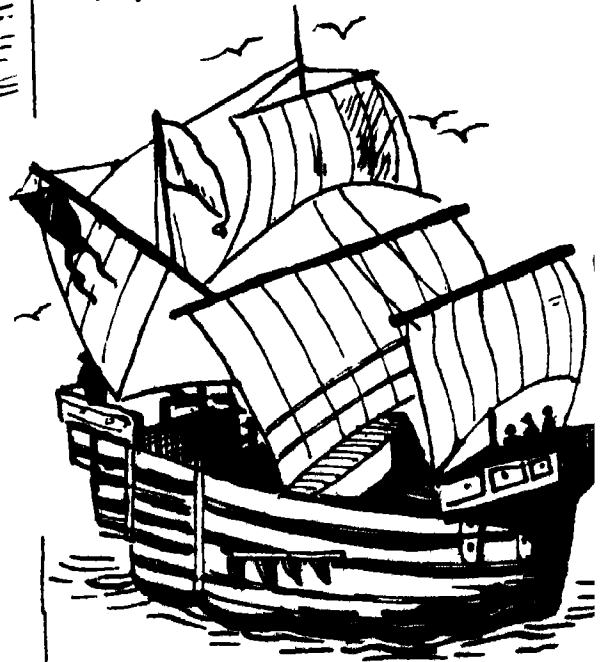
لکڑیوں میں مضبوط کپڑے
کے بڑے بڑے پردے
باندھ دیے جاتے تھے جن میں ہوا بھر جاتی تھی یہی بادبان
کہلاتے تھے۔ جن کی مدد سے ہوا کے رخ پر جہاز خود بخود
چلتے رہتے تھے۔ ہوا کی رفتار اگر سست ہوتی تو جہاز بھی
سست رفتار سے چلتے اور ہوا تیز ہونے پر جہاز پانچ
سات میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل لیتے تھے۔ زیادہ تیز ہوا
میں بادبان پھٹنے، جہاز کے الٹ جانے اور ڈوب جانے
کا خطرہ برابر رہتا تھا

تجارتی سامان لے جانے والے بڑے بڑے
جہازوں میں سوداگر لوگ اپنا سامان بھر کر دور دراز
ملکوں میں لے جاتے اور جب سمندر میں مخالف سمت
میں ہوا چلنے لگتی تو اپنے وطن لوٹ آتے۔ ان سوداگروں
کے لیے یہ جاننا اور حساب لگانا بہت ضروری تھا کہ کس
رُخ کو کب ہوا چلتی ہے اور کتنے دنوں تک چلتی رہتی ہے۔

رومیوں کے جنگی جہاز تجارتی جہازوں سے زیادہ
خوبصورت ہوتے تھے۔ یہ جہاز مچھلی، بطخ، ہنس یا کسی
دوسرے جاندار کی شکل کے بنے ہوتے تھے۔
تجارتی جہازوں کی طرح یہ جہاز
ہوا کے رحم و کرم پر نہیں ہوتے

تھے۔ ان کو چلانے کے لیے چپوؤں کا استعمال کیا جاتا تھا۔
اندازہ لگائیے کہ سیکڑوں آدمیوں کو لے جانے والے یہ جہاز
کتنے چپوؤں سے چلتے ہوں گے۔ ان کو چلانے کے لیے سو
سو تک ملاّح پتوار چلاتے تھے۔

اس زمانے کے دستور کے مطابق لڑائی میں جو
سپاہی گرفتار ہوتے تھے انھیں غلام بنایا جاتا تھا اور ان
سے ہر طرح کا محنت مشقت کا کام لیا جاتا تھا۔ جہاز چلانے
کا کام بھی انھی غلاموں سے لیا جاتا تھا۔ عمر بھر یہ لوگ
جہازوں میں پتوار چلانے کے کام میں لگے رہتے تھے۔ یہ غلام
جہاز میں دونوں طرف ایک کے پیچھے ایک بیٹھ کر
لگاتار چپو چلاتے رہتے تھے۔ بڑے جہازوں میں ملاّحوں
کے لیے نیچے اوپر دو یا تین منزلیں بنا کر اور ان کے چپو
جہاز کی دیواروں میں بنی ہوئی چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں سے
نکلوا کر بھی جہاز چلوائے جاتے تھے۔

جس طرح فوج کے کوچ کے وقت نقارہ بجا رہتا
ہے اسی طرح سب چپو چلانے والے بھی نقارے کی
آواز پر ایک ساتھ حرکت دیتے تھے۔ نقارہ دن رات بجتا
رہتا تھا، چپو دن رات چلتے رہتے تھے۔ غلاموں کی ڈیوٹی
بدلتی رہتی تھی۔ ایک رومی سپاہی لمبا سا چمڑے کا کوڑا لیے
ملاّحوں کے سر پر سوار رہتا اور جہاں کسی ملاّح نے سستی
کی کہ سپاہی نے شڑاپ سے کوڑا لگایا۔

انیسویں صدی کے شروع تک جہاز تو بہت بڑے
بڑے بن چکے تھے لیکن ابھی تک چلتے تھے سب انسانی ہاتھوں
سے۔ انیسویں صدی کی تیسری دہائی میں جہازوں کو چلانے
کے لیے بھاپ کی طاقت کا استعمال ہونے لگا۔ اس سے
ملاّحوں کی سخت محنت اور
بادبان کے جھنجھٹ سے تو
نجات مل گئی لیکن جہازوں کی بناوٹ میں کوئی بڑی تبدیلی
نہیں ہوئی۔ پرانے ڈھنگ کے جہازوں میں ہی انجن لگائے
گئے۔

لیکن انیسویں صدی کے آخر تک جہازوں کی
بناوٹ، رفتار، مضبوطی اور سائز میں حیرت انگیز ترقی ہوئی
اب جہاز سمندر کے سینے پر پہاڑ جیسی موجوں کے خطرے
سے بے نیاز ہزاروں میل کا سفر بے خطر کرنے لگے۔ وہیل
مچھلی جو پہلے جہازوں کو الٹ دیتی تھی اب معمولی سی چیز
بن کر رہ گئی۔ جہاز اب اتنے مضبوط ہو چکے تھے کہ اب
عام طوفان ان کو برباد نہیں کر سکتے تھے۔ یورپ سے
افریقہ تک اور یورپ سے ہندوستان و چین تک
مسافروں اور سامان کی آمد و رفت معمولی سی بات بن کر رہ
گئی۔

یہی وجہ تھی کہ اب کپتان کک کی آسٹریلیا کی
دریافت اتنی سنسنی خیز نہیں ثابت ہوئی جتنی پندرھویں
صدی کے آخر میں کولمبس کی امریکہ کی دریافت ——
کولمبس، واسکوڈی گاما اور میگلان نے جن دنوں عظیم بحری
سفر کیے تب جہاز چھوٹے اور کمزور ہوتے تھے، ہوا یا چپوؤں
کے سہارے سست رفتار سے چلتے تھے اور کبھی کبھی حادثہ
شکار ہو جاتے تھے۔

ان دنوں سمندری راستوں سے بھی واقفیت
بہت کم تھی۔ مہینوں تک ان لوگوں کو حدِ نگاہ تک پھیلے
ہوئے بھیانک سمندر کے علاوہ کوئی چیز دکھائی نہ دیتی
تھی۔ ان کو یہ یقین بھی نہ ہوتا تھا کہ وہ اپنی منزل تک
صحیح سلامت پہنچ جائیں گے۔ کتنا پُرخطر ہوتا تھا وہ
سفر اور کتنے بہادر تھے وہ
جہاز راں!

فن جہازرانی میں عرب ہمیشہ سے مشہور رہے ہیں۔
الف لیلہ میں بہت سی کہانیاں جہازی سفر یا جہازی تباہی
سے بنی ہیں لیکن فن جہازرانی کی سب سے زیادہ ترقی اسپین
پرتگال، ہالینڈ اور انگلینڈ کے باہمی عناد، دشمنی یا رقابت
کی وجہ سے ہوئی۔ ان ملکوں میں سترھویں اٹھارویں اور
انیسویں صدی میں تجارت کے معاملے میں ایک دوسرے
سے آگے بڑھنے کا جذبہ اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ اس
نے دشمنی کا رنگ اختیار کر لیا تھا۔

ظاہر ہے کہ اس رقابت کی وجہ سے جہاز بنانے
کے فن کی ترقی میں مدد ملی۔ یہ سب کچھ صحیح ہے لیکن جہاز
رانی میں اہم تبدیلی اور غیر معمولی ترقی انیسویں صدی کے
آخر میں ہی ہوئی۔

اور آج ـــــ بیسویں صدی میں تو اتنے
بڑے بڑے جہاز بنا لیے گئے ہیں جن کا حال سن کر تعجب
ہوتا ہے۔ ان جہازوں پر پورا کا پورا شہر آباد ہوتا ہے۔
تفریح گاہیں، ہوٹل، سنیما، کلب، کھیل کے میدان، اسپتال
غرض سبھی کچھ ہوتا ہے۔ مسافروں
کا کھانا تیار کرنے کے لیے ایک
بڑا مطبخ اور ضرورت کا تمام سامان رکھنے کے لیے گودام!
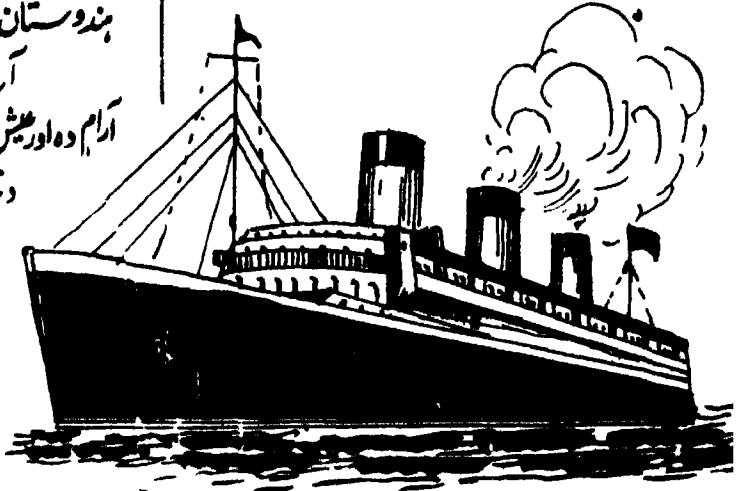
پرانا ادب جہاز تباہ ہونے کی کہانیوں سے بھرا
پڑا ہے لیکن اب جہاز ڈوبنے کا حادثہ شاذونادر ہی ہوتا
ہے۔ آج کے بحری جہازوں نے طوفانوں پر فتح پالی ہے
دنیا کا سب سے بڑا سفری جہاز انگلینڈ کا "کوئین ایلزبتھ"
ہے اور سب سے بڑا باربردار جہاز امریکہ کا ہے جو
لاکھوں ٹن سامان لے جا سکتا ہے۔

ہندوستان میں بھی اب بڑے بڑے جہاز بننے
لگے ہیں۔ "ناناوتی" فوجی جہاز ہے اور اس کی وسعت کا اندازہ
اس بات سے لگ سکتا ہے کہ اس کے عرشہ (اوپری حصّہ)
پر ہوائی اڈّا بنا ہوا ہے جہاں سے ضرورت کے وقت
ہوائی جہازوں کو اُڑانے یا اتارنے کا کام لیا جاتا ہے۔
"جل اوشا" اور "جل وہار" نام کے دو بڑے جہاز بھی
ہندوستان کے ہیں۔

آج مسافروں کو لے جانے کے لیے بڑے چھوٹے
آرام دہ اور عیش و عشرت کے سامان سے لیس بہت سے جہاز
دنیا میں موجود ہیں۔ باربرداری کے مختلف
سامانوں کے لیے بھی مختلف قسم کے جہاز ہوتے
ہیں۔ پھل اور کھانے پینے کی دوسری اشیاء
لے جانے والے جہازوں میں ریفریجریٹر کی
طرح ٹھنڈے گودام ہوتے ہیں ان میں
رکھے رہنے سے دو چار روز میں خراب
ہو جانے والی چیزیں کئی ہفتے تک خراب نہیں ہوتیں۔
مٹی کا تیل اور پٹرول لے جانے کے لیے
خاص طور کے جہاز استعمال کیے جاتے ہیں۔ ان میں بڑے
بڑے ٹینک ہوتے ہیں۔ اس کے
علاوہ سمندر کی چھان بین کرنے

کے لیے جغرافیائی اور تحقیقات کرنے کے لیے مخصوص قسم کے جہاز ہوتے ہیں۔

کچھ جہاز پانی کے اندر اندر چلتے ہیں ان کو پن ڈبی یا سب میرین (SUB MARINE) کہا جاتا ہے۔ پانی کے بے اندازہ دباؤ کو برداشت کرنے کے لیے ان جہازوں کو بہت ہی مضبوط بنایا جاتا ہے۔ لڑائی میں ان پن ڈبی جہازوں کو دشمن کے جہاز کو چپ چاپ تباہ کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

بحری فوج کے جہازوں پر بڑی بڑی توپیں، بے اندازہ گولا بارود اور ہزاروں سپاہی موجود رہتے ہیں۔ ہمارا ناناوتی جہاز بحری فوج کا جہاز ہے۔ ان جنگی جہازوں کے عرشہ پر ہوائی اڈے بھی بنے ہوتے ہیں۔

چند سال پہلے ایک ایسا جہاز بنایا گیا تھا جو برف سے جمے ہوئے سمندر سے نیچے نیچے ہو کر قطب شمالی کو پار کر آیا۔ روس نے ایٹمی طاقت سے چلنے والا جہاز بھی بنا لیا ہے جو جمے ہوئے سمندر پر برف کی تہہ کو توڑتا پگھلاتا آگے بڑھتا جاتا ہے۔

بڑے بڑے جہاز بنانے کے لیے معمولی سرمایے سے کام نہیں چلتا۔ ایک عام جہاز کو بنانے پر دس بارہ کروڑ روپیہ کی لاگت آتی ہے۔ جنگی جہازوں، ایٹمی جہازوں اور تیز رفتار جہازوں کی لاگت تو اس سے کئی گنا ہو جاتی ہے۔

اک ذرا سوچیے کہ ایک تنہا انسان لکڑی کے لٹھے پر یا لکڑی کی ناکشتی میں بیٹھا ہوا پانی پر سفر کر رہا ہے۔ معمولی سی لہر اس کی کشتی کو پلٹ سکتی ہے۔ حدِ نظر تک پھیلے ہوئے پانی میں وہ خطرات سے گھرا ہوا ہے ـــ اور پھر ـــ آج کے جہازوں پر نظر ڈالیے ـــ انسان نے کتنی حیرتناک ترقی کی ہے!

جناب جمشید اشرف

فارسی کے لطیفے

(۱) لوگ ایک جنازے کو لیے جا رہے تھے۔ ایک فقیر اور اس کا بچہ راستے میں کھڑے تھے۔ بچے نے باپ سے پوچھا "ابا! اس میں کیا ہے؟" باپ نے کہا "بیٹا! اس میں آدمی ہے۔" بچے نے پھر پوچھا "اس کو کہاں لیے جا رہے ہیں؟" فقیر نے جواب دیا "ایسی جگہ کہ جہاں نہ کھانے کے لیے کچھ ہوگا نہ پینے کے لیے۔ نہ روٹی ہوگی، نہ پانی۔ نہ ٹھنڈ ہوگی نہ گرمی۔ نہ سونا ہوگا نہ چاندی۔ نہ بوریا ہوگا بستر....."

لڑکے نے بڑی معصومیت سے کہا "بابا! کہیں یہ ہمارے گھر تو نہیں لیے جا رہے ہیں!"

(۲) ایک شخص نے اپنے دوست سے کہا "میری آنکھ میں درد ہو رہا ہے کیا کرنا چاہیے؟" دوست نے جواب دیا "پچھلے سال میرے دانت میں درد ہوا تھا، میں نے تو اسے نکلوا دیا تھا۔"

(۳) ایک آدمی نے اپنے نوکر سے کہا "اگر تم صبح صبح دو کوّے ایک جگہ بیٹھے دیکھو تو مجھے خبر کر دینا۔ یہ اچھا شگون ہے میرا تمام دن خوشی خوشی گزرے گا۔"

ایک دن نوکر نے صبح کے وقت دو کوّے ایک جگہ بیٹھے دیکھے اور مالک کو خبر کر دی۔ جب تک مالک آئے آئے ایک کوا اڑ گیا تھا۔ مالک بہت غصہ ہوا اور نوکر کی کوڑے سے خبر لی۔ اسی وقت مالک کے ایک دوست نے اُس کے (مالک) لیے کھانا بھجوایا۔ نوکر نے کہا:

حضور والا! آپ نے ایک کوا دیکھا تو آپ کو کھانا ملا، اگر دو کوّے دیکھتے تو یہی ملتا جو مجھے ملا ہے۔"

بندۂ شکم

جناب حکیم یوسف حسین خاں

مدت کے بعد بچو! موقع جو پا رہا ہوں
میں بندۂ شکم کا قصہ سُنا رہا ہوں
تصویر کھینچتا ہوں اک زندگی کی یعنی
بالکل صحیح ہے میری واللہ! یہ کہانی
جھوٹ اور غلط بیانی اس میں ذرا نہیں ہے
اے روٹی کھانے والو! میرا خدا نہیں ہے؟
جس بات کا تعلق ان واقعات سے ہے
اس کو غلط بتانا ناممکنات سے ہے
باور نہ ہو تو مجھ کو اس پیٹ کی قسم ہے
میرے ہی دوستوں میں وہ بندۂ شکم ہے

ہے سب میں درجہ اوّل اس کی شکم نوازی
کھانے میں اس سے دیکھوں لے جائے کون بازی
بالفرض ہاسٹل کی رونق اگر ہے ہم سے
سچ ہے کہ چل رہا ہے مطبخ اسی کے دم سے
جس روز سے ورائیٹی معمول ہو گیا ہے
اس بندۂ شکم کا یہ رول ہو گیا ہے
لے کر کئی پلیٹیں، کونے میں جائے گا وہ
پھر بیٹھ کر دوزانو ایک ایک کھائے گا وہ
بس دَم کے دم میں روٹی سالن ہیں دونوں "تھا"
توبہ ہے میری توبہ! یا مظہر العجایب
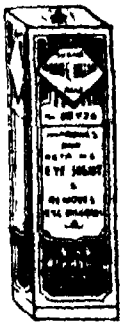
دو تین مرتبہ تو نوبت ہوئی یہاں تک
ظالم نے کھا کے چھوڑیں دہی کی ہڈیاں تک
اس پر بھی پیٹ اس کا کہتا ہے "لاؤ کھانا"
اِس دوزخِ شکم کا آخر کوئی ٹھکانا؟

کھا کر جو کوئی باقی ٹیبل پہ چھوڑ جائے
وہ بھی بلا تکلّف گلک میں ان کے جائے
پہلے تو احتیاطاً دیکھیں گے دائیں بائیں
موقع ملے تو جھوٹا کھانا چُرا کے کھائیں
جب مل گیا تو نازل اس پر عتاب ہوگا
یعنی پلیٹ تک کا خانہ خراب ہوگا
کچھ دیر میں وہاں پر باقی ہی کیا رہے گا
حسرت بھری نظر سے کتا تکا کرے گا

میں نے جو اُن سے پوچھا حقبیٰ کا غم نہیں ہے
بولے کہ کچھ نہیں ہے جب تک شکم نہیں ہے

زخمی چیتا

جناب مناظر عاشق ہرگانوی

ٹارچ کی روشنی میں نشانہ لگاکر گولی چلاتے ہی ایک دہاڑ سنائی دی۔ اچانک درخت کی ڈالی چرچرا اٹھی اور رسّی کا بنا ہوا پندرہ فٹ اونچا مچان ڈالی کے ٹوٹتے ہی زمین پر آرہا۔ قسمت اچھی تھی ہاتھ سے ڈبل بیرل کی بندوق چھوٹ کر پتھر پر جا ٹکرائی اور گولی پتوں کو چیرتی نکل گئی۔ اونچائی سے گرنے پر بھی زیادہ چوٹ نہیں لگی۔ مچان ٹوٹنے سے رسّیاں اس قدر الجھ گئی تھیں کہ بیچ میں لٹکتی سی رہیں اور میں جھولتا ہوا زمین پر آگیا۔ جیسے جھولے کی پینگ بھری ہوا ور بیچ میں ہی رسّی کنارہ کرگئی ہو۔

پر اس وقت چوٹ ووٹ کا ہوش کسے تھا، جان بچانے کی فکر تھی۔ زخمی چیتا کسی لمحے حملہ کرسکتا تھا۔ لیکن اگلے پندرہ منٹ تک کچھ ہل چل نہیں ہوئی۔ رات آدھے چاند کی تھی جنگل اتنا گھنا تھا کہ چاندنی نیچے تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

کچھ دیر سانس روکے پڑا رہا۔ پھر خود کو سنبھالا۔ گھٹنوں اور ٹخنوں پر سے چمڑا چھل گیا تھا۔ پتلون بُری طرح پھٹ گیا تھا لیکن جسم کے دوسرے حصّے محفوظ تھے۔ بندوق کا پتہ نہیں تھا۔ نہ ٹارچ جلاکر گاؤں کی طرف جاسکتا تھا جیسے تیسے خود کو سنبھالتا ایک درخت پر چڑھ گیا۔
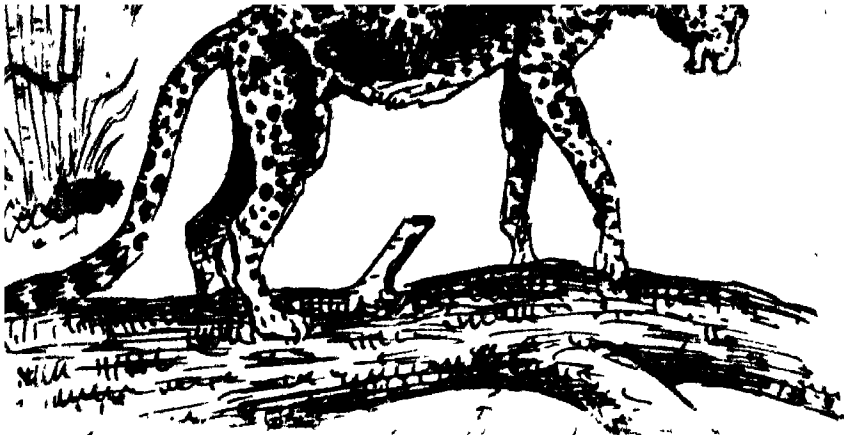
شکار میں ہمیشہ ایک سے دو کا ہونا اچھا ہے لیکن اس دن میں اکیلا ہی چلا آیا تھا۔ پچھلے کئی ماہ سے یہ چیتا لوگوں کو پریشان کر رہا تھا۔ گاؤں کے کُتّے مویشی وغیرہ کو تو صاف کرتا ہی تھا لیکن اب وہ اتنا دلیر ہو چلا تھا کہ راہ چلتے آدمیوں کو زخمی کرنے لگا تھا۔ تین زخمی آج بھی اسپتال میں پڑے اسے کوس رہے تھے۔ گاؤں کے پنچایت والوں نے کلکٹر کو رپورٹ دی تھی اور ہمیں اس چیتے کو ختم کرنے کا حکم ملا تھا۔

میں اور میرے ساتھی کنور صاحب دونوں ہی چل پڑے۔ گرمی کے دن تھے۔ ایک دو مقامی شکاریوں کو بھی ساتھ لینے کی بات تھی۔ مگر یہ نہیں ہوسکا۔

یہ گاؤں شہر سے چالیس میل دور تھا۔ ہم لوگ جیپ سے تین بجے روانہ ہوئے اور راستے میں رکتے ہوئے پانچ بجے تک اس گاؤں تک آپہنچے جہاں سے گاڑی آگے نہیں جاسکتی تھی۔

جیپ گرام پنچایت کے سپرد کرکے ہم لوگوں کو تین میل تک پہاڑی پگڈنڈیوں سے اترتے چڑھتے کافی وقت لگا اور جب ہم گاؤں میں داخل ہوئے تو سورج چھپنے کی

تیاری کر رہا تھا۔

سفر کی تھکان کی فکر چھوڑ کر ہم نے شکار کے بارے میں مزید جانکاری حاصل کی اور (سوکھی پہاڑی ندی) کے کنارے پھیلے ہوئے جنگل میں گھس گئے۔

گاؤں والوں نے ہمیں وہ سب جگہیں دکھائیں جہاں چیتے نے شکار کیے تھے۔ ہم نے ندی کا وہ حصہ بھی دیکھا جہاں آگے چٹانیں ہونے کی وجہ سے پانی اکٹھا ہو رہا تھا اور جہاں سور، شیر، چیتا اور جنگلی جانور پانی پینے ضرور آتے ہوں گے۔

ہم لوگوں نے بہت کوشش کی کہ چیتوں کے پنجوں کے نشان ہیں یا تازہ مارا ہوا، آدھا کھایا ہوا شکار ملے لیکن اس دن ہمیں کچھ اور زیادہ معلوم نہ ہو سکا اور ہم اپنی تلاش دوسرے دن کے لیے چھوڑ کر گاؤں لوٹ آئے۔

دوسری صبح پو پھٹنے سے پہلے ہی ہم دونوں بندوقیں لے کر جنگل کی طرف چل پڑے۔ آج ہم ایک بھی لمحہ ضایع کرنا نہیں چاہتے تھے کیونکہ شکاری اور جواری کا ایک ہی داؤ بیٹھتا ہے۔ یا تو بازی مات یا پھر ہار۔ ایک بار شکار ہاتھ سے نکل گیا تو پھر اس کا کچھ بھروسا نہیں۔

سورج کے دو بانس چڑھ آنے تک ہم جنگل میں بھٹکتے رہے لیکن اس کا اندازہ ضرور ہو گیا کہ آیندہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ چیتے کو گھیرنے کے لیے ہم نے چار مقام مقرر کیے جو ایک دوسرے سے میل ڈیڑھ میل کے فاصلے سے زیادہ نہیں تھے۔ گاؤں والوں کو راضی کر کے ہم نے چار بکرے منگوائے اور تین بجے سے ہی ان بکروں کو مقررہ مقام پر بندھوا دیا۔

ہمارا پروگرام یہ تھا کہ دو جگہوں پر بکرے باندھ کر دو آدمیوں کو درخت پر بٹھا دیا جائے تاکہ بکرے پر نگاہ رکھیں جیسے ہی چیتا بکرے پر حملہ کرے یہ شور و غل کر کے اسے بھگا دیں پھر موقع پا کر شکاری وہاں پہنچ جائیں اور چیتے کے لوٹنے پر اس کا شکار کریں۔

چیتے کا لوٹنا یقینی تھا ___ وہ اپنے شکار کیے ہوئے جانور کو بعد میں کھاتا ہے ___ اور باقی دو جگہوں پر ہم لوگ رسیوں کا مچان بنا کر بیٹھیں اور اگر چیتا آ جائے تو شکار کر لیں۔

ایک دن اچانک دل میں یہ خواہش ابھری کہ میں اکیلا ہی کیوں نہ اس چیتے کا شکار کر دوں لیکن مجبوری یہ تھی کہ کنور صاحب ساتھ تھے پھر بھی انھیں ایسی جگہ پر بٹھایا جہاں چیتے کے آنے کی سب سے کم امید تھی۔ یہی نہیں میں نے چاروں مقام پر دو تین چکر بھی لگا لیے کہ چیتا بکرے تک پہنچا یا نہیں لیکن سورج غروب ہونے تک وہ نہیں آیا۔

بالآخر ہم لوگوں نے وہ رات جنگل میں ہی گزارنے کا پروگرام بنایا۔ رات بھر جاگنا ضروری تھا اس لیے ہم نے کچھ بسکٹ کھا کر اور گرم گرم چائے پی کر ہی تشفی کر لی۔

رفتہ رفتہ سناٹا چھا گیا۔ رات کا قافلہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا اور ہمیں ایسا محسوس ہونے لگا جیسے رات بھی چوکنی ہو گئی ہو ___ اور ہم انتظار کرتے رہے لیکن چیتا آدھی رات تک میرے بکرے تک نہ آیا۔ جن دو درختوں پر اور دو لوگ بیٹھے ہوئے تھے وہاں چیتا چکر کاٹ چکا تھا اور بکرے تک پہنچنے سے پہلے ہی بھگا دیا گیا تھا۔

اے لیجیے آدھی رات کے وقت چیتا میری طرف بڑھا اور بکرے پر حملہ کر بیٹھا اور اسی تڑا کر منہ میں دبائے بھاگ جانے کی کوشش

کرنے لگا۔ ایسے ہی وقت میں میں نے ٹارچ کی روشنی ڈال کر نشانہ لیا تھا اور دہاڑ سنائی دی تھی۔ مجھے دوسرا فائر کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

سویرے تڑکے ہی سب لوگ موقعۂ واردات پر پہنچے۔ گاؤں میں نہ جانے کیسے یہ خبر پھیل گئی کہ میں چیتے کی لپیٹ میں آگیا ہوں اور بری طرح زخمی ہو گیا ہوں پچاسوں لوگ مجھے دیکھنے دوڑ پڑے۔ کنور صاحب نے فرسٹ ایڈ کٹ سے معمولی چوٹوں کی مرہم پٹی کی اور میں اگلی مہم کے لیے تیار ہو گیا۔ گاؤں والوں کو وہیں ٹھہرا لیا تھا۔

سب سے پہلے میں نے اپنی بندوق سنبھالی۔ ٹارچ کا شیشہ ٹوٹ کر بکھر گیا تھا لیکن بندوق صحیح سلامت تھی۔ بکرا مرا پڑا تھا۔ چیتے کے نشان بتا رہے تھے کہ گولی لگتے ہی وہ زمین پر گر پڑا تھا۔ جس جگہ وہ گرا تھا وہاں خون کے دھبے تھے۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ میری گولی اسے لگی ضرور، لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کتنا زخمی ہوا تھا۔ بہر حال اب اسے کھوج نکالنا ضروری تھا کیونکہ زخمی جانور دوسرے جانوروں کے برعکس زیادہ خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔ پھر یہ تو جنگلی چیتا تھا جو آج نہیں تو کل گاؤں والوں سے اپنا بدلہ ضرور لے گا۔

پہلے ہم نے یہ پتہ لگانا ضروری سمجھا کہ چیتا کس سمت گیا ہے اور کہاں تک گیا ہے اس کے لیے ہم نے خون اور پنجوں کے نشان کو منتخب کیا۔ بکرے سے لگ بھگ دو تین فرلانگ کی دوری تک ہمیں خون کی بوندیں نظر آتی رہیں اس کے بعد چیتا ندی میں اتر گیا اور وہاں سے پہاڑی میں کسی جگہ چھپا بیٹھا تھا۔

دو تین میل کے گھیرے کی پہاڑی کا چکر کاٹ کر ہم نے یہ اندازہ کر لیا کہ چیتا پہاڑی چھوڑ کر نہیں گیا ہے کیوں کہ ہمیں چیتے کے پنجوں کے نشان یا خون کے دھبے آگے نظر نہیں آئے اس لیے یہ طے تھا کہ چیتا اسی پہاڑی کی جھاڑیوں میں چھپا بیٹھا ہے

اسے باہر نکالنے کے لیے ہانکا لگوانا ضروری تھا زخمی شیر اور چیتے کو ڈھونڈنے کے لیے ہاتھی سے ہانکا لگوانا اچھا رہتا ہے لیکن ہمارے لیے یہ ممکن نہیں تھا لہٰذا پیدل ہانکے کا خطرہ مول لینا پڑا۔

پہاڑی کے درختوں پر ہم نے پاس پاس آدمی بٹھا دیے اور انھیں کہہ دیا کہ جوں ہی چیتا ہانکا توڑ کر کے جانے لگے وہ اسے شور و غل کر کے ہماری طرف لوٹا دیں۔

کنور صاحب پہاڑی کے اوپر پگڈنڈی پر چڑھ گئے جہاں سے وہ ڈیڑھ سو گز کی دوری تک چاروں طرف اچھی طرح سے دیکھ سکتے تھے۔

اس وقت میں درخت پر نہیں چڑھ سکتا تھا، اس لیے مجھے ہانکے والوں کے ساتھ رہنا پڑا۔ آدھے چاند کی طرح دائرہ بنا کر ہم نے پہاڑی کو گھیر لیا اور شور کرتے پوٹاش کی گولیاں چھوڑتے جھاڑیوں کو پیٹنے لگے۔

ہم لوگوں نے پہاڑی کے پیچھے سے ہانکا شروع کیا تھا اور آدھی سے اوپر پہاڑی پار کر چکے تھے۔ ہانکے میں کچھ سور، جنگلی مرغ، خرگوش وغیرہ نکل کر بھاگے مگر چھپا ہوا چیتا کہیں نہیں دکھائی دیا۔ ایک لکڑ بھگا بھی ملا جسے کنور صاحب نے گولی چلا کر مار گرایا۔

پہاڑی کے سرے پر پہنچ کر ہم سبھی لوگ تھوڑی دیر سستانے بیٹھ گئے۔ یہاں سے دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ پہاڑی کے دائیں طرف ڈھلان ہے اور یہ ڈھلان ندی کو پار کر کے

دوسری طرف گھنے جنگل سے جا ملی تھی۔

اگر چیتا ایک بار ہانکے کی ڈوری پار کر کے اس گھنے جنگل میں گھس گیا تو ہمارا سب کیا کرایا چوپٹ ہو جائے گا۔

میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ چیتا یہاں سے ہانکا توڑ کر نکلنے کی کوشش ضرور کرے گا اور ہماری کوشش یہ تھی کہ اسے گھیر گھار کر کھلی جگہ میں کنور صاحب کی طرف بڑھائیں اور اسے آسانی سے نشانہ پر لیا جا سکے۔

نہ جانے کیا سوچ کر میں نے اپنی پوزیشن بدل لی اور پہاڑی کے داہنی سمت والی ٹولی کے ساتھ ہو لیا، جدھر وہ جنگل پڑتا تھا۔ ہم نے پھر تیزی سے ہانکا شروع کیا۔ سارا جنگل ہو ہو اور پٹاخوں کی آواز سے گونج اٹھا۔

اچانک پہاڑی کے بائیں جانب سے درختوں پر چڑھے لوگوں نے کپڑے ہلا کر خبر دی کہ چیتا اپنی جگہ سے اٹھ کر روانہ ہو چکا ہے۔ اب ہم ہوشیار ہو گئے۔ بائیں طرف پہلے وہاں سے چیتے کو بھگانے کی آوازیں آنے لگیں۔

چیتا رکتا، تھمتا، لوٹتا آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔ جہاں بھی رکنے کی کوشش کرتا درخت پر چڑھے لوگ اسے بھگا دیتے۔ آہستہ آہستہ وہ پہاڑی کے نیچے کی طرف کنور صاحب کی سمت میں آگے بڑھنے لگا۔

وہ کنور صاحب کے درخت سے دو سو گز کی دوری تک پہنچ چکا تھا اور وہاں اٹھی ہوئی ایک چٹان کی اوٹ میں کھڑا ہو کر اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ کدھر جائے۔

اچانک اس نے بجلی کی سی تیزی سے چھلانگ لگائی اور دوڑنے لگا۔ اس کا رخ گھنے جنگل کی سمت تھا یہ سب اتنی تیزی سے ہوا کہ کنور صاحب کو گولی چلانے کا موقع ہی نہ ملا۔ ہانکے کی وجہ سے پہلے وہ مخالف سمت جا رہا تھا لیکن اب وہ جنگل میں گھسنے کے لیے دوڑا جا رہا تھا وہ بجلی کی تیزی سے میری طرف آ رہا تھا۔

خوش قسمتی سے اس طرف چڑھائی تھی اس لیے مجھے سنبھلنے کا موقع مل گیا۔ مشکل سے ڈیڑھ منٹ گزرے ہوں گے کہ میں اور چیتا آمنے سامنے آ گئے۔ دونوں کی دوری لگ بھگ دس گز رہی ہوگی۔ چیتا رک گیا اور اس کی چمکتی شعلہ برساتی آنکھیں مجھ پر ٹک گئیں۔

چیتا چاہتا تھا کہ میں اس کے راستے سے ہٹ جاؤں اور میں اس کوشش میں تھا کہ چیتا اگر کنی کاٹ کر نکلے تو میں گولی چلاؤں۔ لیکن ہم دونوں کی یہ خواہش پوری نہ ہوئی۔ چیتا ایک بار غرایا اور اس نے میرے اوپر چھلانگ لگا دی۔ میں پہلے سے ہی تیار تھا۔ چیتے کے جست لگاتے ہی لبلبی دبا دی۔ گولی اس کی پیٹھ میں لگی اور وہ گر پڑا۔ پھر بھی اس کی جست اتنی لمبی اور تیز تھی کہ میرے پاس ہی آ کر گرا۔ میں تیزی سے پانچ چھ گز پیچھے ہٹ گیا اور بندوق سیدھی کر لی۔ لیکن اتنا وقفہ کافی تھا۔ چیتا ایک بار اچھلا اور اس کے دونوں اگلے پنجے میرے بدن میں پیوست ہو گئے۔ آگ کی ایک لہر یہاں سے وہاں تک دوڑ گئی۔ مجھ پر غشی سی طاری ہونے لگی۔

لیکن آپ جانیں زندگی سب کو عزیز ہوتی ہے جان بچانے کی فکر نے میرے حواس درست کر دیے اور میں اس کے کھلے جبڑے میں، جو میری گردن کی طرف بڑھ رہے تھے، بندوق کا کندا ٹھونسنے لگا۔ لیکن وہ پیچھے ہٹنے اور پنجہ چھڑانے کی بجائے بندوق کے کندے کو منہ میں دبا کر چبانے لگا۔

بندوق کا کندہ چباتے وقت

جناب عبدالمنان نسیم

چاند

امّی! چاند بڑا اچھا ہے
سارے جگ کو چمکاتا ہے

دور اندھیروں کو کرتا ہے — دِل کو خوشیوں سے بھرتا ہے
اِس کے اجیالے میں اپنی — روز ہوتی ہے آنکھ مچولی
رات مزے سے ہے کٹ جاتی — چلتی ہے ہر روز کہانی
چلنے پھرنے میں ڈر کیسا — جب ہو چاروں سمت اجالا
اور زمیں پر روز ہے ہوتا — کھیل اندھیرے اُجیالے کا
امّی چاند بہت اچھا ہے — سب کے من کو خوش کرتا ہے
ساری رات چمکتا ہے وہ — سب کی خدمت کرتا ہے وہ

اللہ نے اِس واسطے اس کا
چمکایا ہے نور سے چہرہ

جناب احسان الحق

اِس کو نہ پڑھیے..... فایدہ ہوگا

(نوٹ: اگر کسی پڑھنے والے کو اس مضمون سے فایدہ پہنچے تو اس کا ذمہ دار مصنف نہیں ہوگا۔)

فقیروں کی صدا ہوتی ہے "دینے والے کا بھلا اور نہ دینے والے کا بھی بھلا" لیکن ہم ایسے فقیر ہیں جو غلطی سے بڑبڑاتا رہتا ہے "پڑھنے والے کا بھلا اور نہ پڑھنے والے کا بھی بھلا"۔

تمھارا اگر پڑھنے میں جی نہیں لگتا ہے تو میاں صاحب زادے، اسکول کی کتاب کھول کر نہ دیکھو شکایت ہوگی تو تمھارے ابا جان کو ہوگی مجھے کیوں ہونے لگی۔ میں خود بھی ایک زمانے میں تمھاری طرح تھا۔

لیکن خدا جھوٹ نہ بلوائے ایک عادت ضرور تھی جو تمھاری عمر سے ساتھ لگی تھی اور آج تک پیچھے پڑی ہے اور اب —— جب کہ میں تم سے کئی گنا زیادہ سالگرہیں منا چکا ہوں، پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس عادت نے مجھے بے انتہا فایدہ پہنچایا ہے۔ کبھی شرمندگی سے بچایا ہے اور کبھی لاج رکھی ہے۔

تو بھئی عادت یہ ہے کہ مجھے رات کو نیند نہیں آتی جب تک کچھ پڑھ نہ لوں۔

پچھلے ہفتے بمبئی سے دہلی پہنچا۔ جامعہ نگر میں جونہی قدم رکھا تمھارے ایڈیٹر صاحب سے بھینٹ ہوگئی۔ جیسے کوئی ٹکٹ چیکر ریل کا ٹکٹ طلب کرتا ہے بالکل اسی انداز میں انھوں نے فرمایا "پیام تعلیم کے سالنامے کے لیے آپ مضمون لائے؟" یقین جانو میں بے ٹکٹ پکڑا گیا۔ مضمون لکھنے کا وعدہ ہوگیا اور پھر ہم دونوں کافی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ مُنّے میاں کی پان کی دکان سامنے تھی انھوں نے پانوں کی ایک پڑیا بھیج دی نتیجہ یہ ہوا کہ باتوں کا سلسلہ دراز ہوگیا۔ پان کی پڑیا کا اخباری کاغذ کتھے چونے کے زخم کھاتے ہوئے میرے ہاتھ میں تھا۔ کاغذ پر جانے کیا کچھ لکھا ہوا تھا میں نے کوشش کرکے سارے کا سارا پڑھ ڈالا اور پھر اخبار کا یہ ٹکڑا تمھارے ایڈیٹر صاحب کے آگے بڑھا دیا۔ اس میں کسی تجربے کار آدمی نے لکھا تھا:

مگر مچھ کا دل آدمی کے دل کی طرح ہوتا ہے اور سب سے عجیب بات یہ ہے کہ مگر مچھ کے مرنے کے بعد بھی بہت دیر تک اس کا دل دھڑکتا رہتا ہے اس لیے شکار کرنے کے بعد فوراً اس کی کھال اتارنے کی کوشش نہیں کرنا

چاہیے، کیا خبر وہ پھر منہ مار دے۔"
دیکھا آپ نے چلتے چلتے پڑھنے والے کا بھلا ہو گیا۔
بات آئی گئی ہوئی لیکن رات کو جب میں سونے کے لیے لیٹا
تو سوچنے لگا کہ کیوں نہ اپنی اس عادت کے نفع نقصان
کا حساب کتاب تمھارے سامنے رکھ دوں۔

رات کافی ہو گئی ہے موسم سرد ہے اور بستر گرم
ہے جلدی سے سو جاؤ مگر نیند کیسے جب تک تھوڑا سا
پڑھ نہ لو گے۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر بس یونہی ایک کتاب
اٹھالی۔ یہ کتاب اس وقت میرے ہاتھ میں ہے ایگر ڈیل
نے لکھی ہے، اس کا موضوع ہے "تعلیم کے طریقے"۔ میں
نہ تعلیم کے طریقوں کو جانتا ہوں نہ اس مضمون سے میرا کوئی
واسطہ ہے۔ مجھے تو صرف سونے سے پہلے پڑھنے کی عادت
ہے۔ میں کتاب بیچ میں سے کھولتا ہوں۔ اس میں لکھا ہے۔

"ایک پروفیسر صاحب کلاس میں پڑھاتے
وقت اپنی گھڑی کی چین کو مستقل گھماتے
جا رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ابھی ٹوٹ
جائے گی لیکن ان کا لیکچر بدستور جاری تھا۔
پھر وہ پڑھاتے پڑھاتے سامنے رکھے ہوئے
لیمپ کی طرف بڑھے، اس کا بلب اتار لیا۔
بلب کو اچھال اچھال کر کیچ کرتے رہے
لیکن لیکچر کا سلسلہ بدستور جاری رکھا۔
تھوڑی دیر بعد وہ بلب ان کے ہاتھ سے
گرا ایک زوردار دھماکا ہوا اور اسی کے
ساتھ انھوں نے اپنا لیکچر ختم کر دیا پھر
کہنے لگے، مجھے معلوم ہے کہ تم میں سے
کسی لڑکے نے میرا لکچر
غور سے نہیں سنا
تمھاری توجہ تو کبھی میری گھڑی کی چین
پر ہوتی تھی کبھی بلب کے ٹوٹنے کا خدشہ
ہوتا تھا اور ہاں کبھی کبھی میرے لکچر کی
آواز بھی تمھارے کانوں میں آجاتی تھی۔
ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ تمھیں میرے
لکچر کی ایک بات بھی یاد نہ ہوگی۔"

نتیجہ یہ نکلا کہ اگر توجہ بٹ جائے تو حافظہ کمزور
ہو جاتا ہے۔ مجھے بالکل ایسا لگا جیسے کسی نے میری اپنی
بیماری یعنی حافظے کی خرابی کا علاج بتا دیا ہو، جیسے کسی نے
مجھ سے کہا ہو "لیجیے صاحب یہ تحفہ سنبھال کے رکھیے اور اب
اطمینان سے سو جائیے۔"

کتاب ہاتھ سے گر گئی، میں بے خبر سو گیا۔ صبح اٹھ
کر سوچنے لگا کتاب میں ٹھیک ہی لکھا تھا "توجہ بٹ جائے
تو حافظہ کمزور ہو جاتا ہے"، اب تم بھی سوچو نا، اگر میں
تمھاری طرف ایک گیند اچھالوں تو تم اسے کیچ کر لوگے لیکن
اگر تین چار گیندیں ایک ساتھ پھینکوں تو شاید سب کے
سب تمھارے ہاتھ سے گر جائیں۔

اب جامعہ نگر میں میرا دوسرا دن شروع ہوا۔
مصروفیت میں سارا وقت نکل گیا۔ رات پھر آگئی۔ بستر
پر لیٹنے کے بعد پھر وہی آواز ——— دل کی آواز
"سونا چاہتے ہو تو کچھ پڑھو، کچھ بھی پڑھو۔ جو مل جائے وہ پڑھو"
ادھر اُدھر ہاتھ مارا کہ شاید کہیں کوئی کتاب
یا رسالہ ہاتھ لگ جائے۔ میز صاف پڑی تھی۔ پلنگ کے
نیچے جو کوڑا چھپا یا گیا تھا اس میں ایک بڈھا کھوسٹ رسالہ
جھانکتا ہوا نظر آیا۔ احتیاط سے اٹھا کر جھاڑا تو کئی کیڑوں
نے مل کر احتجاج کیا اور "واک
آوٹ" کر گئے۔ میں رسالہ اٹ

پلٹ کرتا رہا۔ پڑھنا شروع کیا تو کلینڈروں کے سلسلے میں کسی نے تحقیقی مضمون لکھا تھا:

کلینڈروں کی ایجاد یونانیوں نے کی تھی۔ جولیس سیزر نے اس میں طرح طرح کی اصلاحیں کی تھیں اور ایک مہینے کا نام بدل کر اپنے نام کی مناسبت سے جولائی رکھ دیا تھا۔ اپنی شان دکھانے کے لیے انھوں نے اس مہینے کے دن بھی ۳۱ کر دیے تھے۔ ان کے بعد جو بادشاہ تخت پر بیٹھا اس کا نام آگس ٹس سیزر تھا اس نے جولائی کے بعد کے مہینے کا نام (جو پہلے کچھ اور تھا) بدل کر اگست رکھ دیا۔

ظاہر ہے اگر اس مہینے کے دن جولیس سیزر والے مہینے سے کم ہوتے تو شان میں فرق آتا۔ اس لیے آگس ٹس نے فروری کے مہینے سے ایک دن لے کر اگست میں شامل کر دیا اور اس طرح فروری بے چارہ ۲۸ دن کا رہ گیا۔

کسی نے چپکے سے میرے کان میں کہا "یہ رہا تمھارا تحفہ اس کو اپنے دماغ میں چھپا لو اور اب خاموشی سے سو جاؤ۔"

جواب طلب امور کے لیے جوابی کارڈ یا ٹکٹ ضرور روانہ کیجیے

منیجر

بقیہ انوکھا وکیل

کے باعث محنت مزدوری کرتا ہے۔ اگر اس مفلس معصوم اور بے گناہ لڑکے کو ایک آدمی عرصے تک اس قدر تنگ کرتا رہا جب کہ خود استغاثہ نے بھی مانا ہے اور لڑکے نے غصے میں آکر ایک ڈنڈا اسے رسید کیا تو کیا وہ لڑکا قاتل گردانا جا سکتا ہے کیا امریکہ یہ برداشت کرے گا کہ طاقت ور محض طاقت کے زعم میں کمزور اور غریب کو دبائے۔ اگر ایسا ہے تو لڑکا سزائے موت کا حق دار ہے۔ اب فیصلہ عدالت کے ہاتھ میں ہے۔

بچو! جانتے ہو عدالت نے کیا فیصلہ دیا۔ بہت سوچ بچار کے بعد عدالت نے لڑکے کو صاف بری کر دیا۔ ابراہیم لنکن نے لڑکے اور اس کی ماں کو اپنے پاس رکھا اور اس طرح احسان کا بدلہ چکایا۔ ادھر اس واقعہ کا اخباروں میں اتنا چرچا ہوا کہ لوگ ابراہیم لنکن کے گرویدہ ہو گیے اور بغیر مزید کوشش کیے وہ پارلیمنٹ کے ممبر منتخب کر لیے گیے۔

بقیہ استاد کا دل

امتحان میں شریک ہو جاؤ۔

اس شرافت کے برتاؤ سے اس طالب علم پر جو اثر ہوا وہ تو ہوا ہی جس نے سنا وہ بھی دنگ رہ گیا پیغمبر اسلام علیہ السلام کا یہ ارشاد سب نے سنا تھا کہ

"جو تم پر زیادتی کرے اسے تم معاف کر دو"

لیکن بہت کم ہوں گے جو مولانا کی طرح اس پر عمل کی مثال قائم کر سکیں۔

جناب نزہت عابدی

ریل کا سفر

سگنل ہوگئی اور گھنٹی بجی   وہ جھنڈی ہری گارڈ کی ہل گئی
وہ چھوٹی وہ کھسکی وہ چلتی بنی   جو لیٹ آئے تھے ان کی گاڑی گئی
چلی جب تو ان سے بھی ملتی چلی   الگ اور جو لائنیں تھیں پڑی
کہا جانے سگنل نے کیا کان میں   جھپٹنے لگی آن کی آن میں
گیا کھمبا اور تار بکھرے سبھی   وہ جھولے ڈو سمٹے وہ اٹھے سبھی
لگی گھومنے مینڈ ناچے درخت   لگے گھومنے گھر دکاں اور تخت
وہ گھومے اکیلے دُکیلے کھجور   سڑک باغ تالاب نزدیک و دور
ہرٹ گھوما وہ بن گھمائے ہوئے   وہ ہل چل پڑا بن چلائے ہوئے
وہ کھمبے وہ پھاٹک وہ جھاڑی وہ پل   وہ ٹیلے وہ لڑکے جو کرتے ہیں غل
ہر اک شے کو چکر کھلاتی چلی   بڑا ہی تماشا دکھاتی چلی
ارے واہ! گاڑی نے یہ کیا کیا   دیے پاٹ ندی کے دونوں ملا
ہر اک شے کا نقشہ بدلتی چلی   عجب چال پر چال چلتی چلی
جو تھے پاس انھیں چھوڑ کر بڑھ گئی   جو تھے دور انھیں ساتھ لے کر چلی
وہ گھومی وہ لہرائی اڑتی چلی   کہ جنگل کے پیڑوں میں تتلی چلی
کنول جھیل کے اور ندی کی ریت   فلک نیلگوں دھان کے سبز کھیت
وہ اودی گھٹاؤں کا اک سلسلہ   ادھر دیکھو وہ کیسا بادل اٹھا
بھلا سا ہوا سارے جنگل میں شور   وہ لمبی دموں والے رنگین مور
وہ پچھم میں پھیلی ردائے شنیل[1]   سفر کیا ہے ٹیکنیکلر[2] کی ہے ریل
سماں ہر گھڑی ہے نیے سے نیا   یہ آیا وہ آیا وہ آکر گیا!
کبھی کچھ کبھی کچھ کبھی کچھ سماں   فضا و ہوا و زمین آسماں

بہر کیف گرم سفر ریل ہے
سفر ریل کا کھیل ہی کھیل ہے

[1] ایک قسم کا کپڑا
[2] کئی رنگوں والی فلم

ڈاکٹر شانتی رنجن بھٹاچاریہ

جوتے کی ایجاد

(رابندرناتھ ٹیگور کی ایک مشہور لمبی نظم "جوتے کی ایجاد"
کا نثر میں آزاد ترجمہ۔)

شہنشاہِ وقت مہاراجہ ہابو کو اپنے نکمے شاہی
نمک خواروں پر غصّہ آیا۔
شہنشاہ پر بڑی مشکل آپڑی تھی۔
وہ رات بھر سوچتے رہے تھے۔ سوچتے سوچتے
تھک گئے تھے۔
مشکل پھر بھی آسان نہ ہوئی تھی۔
انھوں نے وزیرِ اعظم گوبورائے کو بلا کر فرمایا
سنو مابدولت کی بات سنو
کل رات بھر میں اس مسئلے پر سوچتا رہا ہوں۔
رات بھر مجھے نیند بالکل نہیں آئی
مسئلے کا کوئی حل پھر بھی نظر نہیں آیا
مسئلہ یہ ہے کہ جب
بھی اپنی مملکت کی
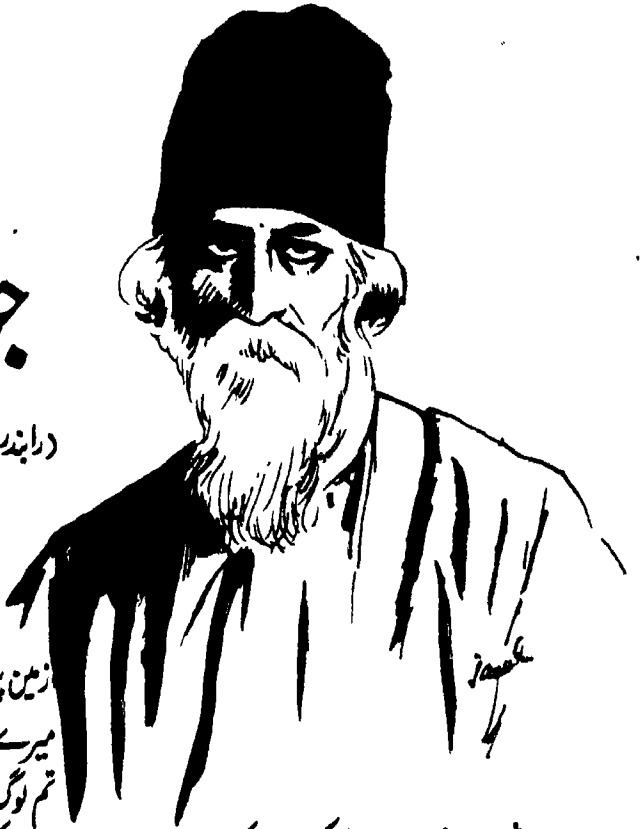
زمین پر اپنے شاہی قدم رکھتا ہوں
میرے ان قدموں میں دھول لگ جاتی ہے
تم لوگ مفت کی تنخواہ پاتے ہو
مجھ پر کیا گذرتی ہے یہ تم کیا جانو
مجھ کو ایسا لگتا ہے کہ تم لوگوں کو میری خدمت کرنے
کی پرواہ ہی نہیں ہے۔
ذرا سوچو تو آخر میں اس ملک کا شہنشاہ ہوں
یعنی اس زمین اس دھرتی کا مالک ہوں
پھر اس زمین کی یہ مجال کہ
جب میں اس کے سینے پر اپنے نازک قدم رکھوں
اس کے سینے پر جو غبار، جو گرد ہے
وہ میرے قدموں سے لگ جائے
اس طرح وہ میرے قدموں کی توہین کرتی ہے
یہ کیسا ظلم ہے، یہ کیسی ناانصافی ہے
میں اسے برداشت نہیں کرسکتا
جاؤ فوراً اس کا کوئی حل نکالو!

ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا
تم سب کی خیر نہیں
شاہی حکم سُن کر وزیر اعظم گوبو پر جیسے بجلی گر پڑی۔ آسمان ٹوٹ پڑا۔
وہ مارے ڈر کے کانپنے لگا، پسینے پسینے ہوگیا۔
اس کے دوست احباب میں جس نے بھی یہ خبر سُنی
سب کے سب پریشان ہوگئے، سب کی نیند حرام ہوگئی
سب کے گھر ماتم کدے بن گئے
گھروں میں کھانا تک پکنا بند ہوگیا
آخر کار گوبو روتا روتا حضور کے دربار میں حاضر ہوا
شہنشاہ کے قدموں پر جا گرا
رو رو کر اُس نے یوں فریاد کی
جہاں پناہ گستاخی معاف ہو
چھوٹا مُنہ بڑی بات ہوگی
لیکن جہاں پناہ خود ہی غور کریں
اگر جہاں پناہ کے قدموں میں دھول نہ لگے گی
تو ہم لوگوں کا کیا حال ہوگا
ہمیں آپ کے قدموں کی دھول کہاں سے نصیب ہوگی!
مہاراجہ نے اک ذرا سوچا اور پھر سر ہلا کے کہا
خوب! بات ٹھیک ہے
لیکن سوال پھر بھی حل نہ ہوا
پہلے اس مسئلے کا حل پیش کرو کہ پاؤں میں دھول نہ لگے
اس کے بعد یہ سوال سامنے آئے گا کہ
تم لوگوں کو میرے قدموں کی دھول کیوں کر ملے!
پہلے دھول کو لگنے سے روکو
پھر قدم کی خاک کے مسئلے
پر غور کرنا۔
اگر یہ معمولی سا مسئلہ حل نہ ہوگا
تو پھر میں تم کو موٹی موٹی تنخواہیں دے کر
انعام واکرام دے کر، پانچ ہزاری دس ہزاری منصب دے کر
بڑی بڑی جاگیریں دے کر
کیا خواہ مخواہ تمھیں برسوں سے پال رہا ہوں!
آخر تم لوگ کس مرض کی دوا ہو
جاؤ میرے سامنے سے ہٹ جاؤ
جو کام دیا گیا ہے پہلے اُسے پورا کرو
بعد میں جو مسئلہ پیدا ہوگا
اس پر (یعنی بعد کی بات پر) بعد میں غور کرنا۔ سمجھا!
شاہی حکم سے سب کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا
وزیر اعظم گوبو اور دوسرے بڑے بڑے عہدے دار فکر میں ڈوب گئے
وزیر اعظم نے سلطنت کے کونے کونے سے اور دور دراز کے ملکوں سے
نامی گرامی عالموں اور پنڈتوں کو بُلایا
اور پھر یہ سب مل بیٹھے
موٹی موٹی کتابیں کھول کر، آنکھوں پر عینک لگائے،
وہ سب چھان بین میں لگ گئے
سوچتے سوچتے ان کے دماغ پھٹنے لگے
سروں میں درد ہونے لگا
سر کے درد کو ہلکا کرنے کے لیے انھوں نے مَن مَن بھر ناس سونگھا
آخر کئی دن تک سوچ بچار کرنے کے بعد وہ سب
شہنشاہ کی خدمت میں حاضر ہوکر بولے

مہاراج اگر یہ دھرتی نہ ہو، مٹی نہ ہو تو فصل کیسے پیدا
ہوگی؟
اناج کہاں سے آئے گا؟ لوگ کھائیں گے کیا؟
مہاراج نے غصے سے فرمایا
اگر اتنا بھی ممکن نہیں ہے تو یہ سائنس داں کس لیے ہیں؟
بادشاہ کو سمجھانے میں ناکام ہو کر وہ سب لوٹ آئے اور
پھر سوچ میں ڈوب گئے
کیا کیا جائے دھول سے نجات پانے کا راستہ کیا ہے
آخر سب شاہی ملازموں نے اپنے اپنے ہاتھوں میں جھاڑو
لی
اور فیصلہ کیا کہ سلطنت کے تمام راستوں کو جھاڑو سے اس
طرح صاف کر دیں
کہ دھول کا نام نہ رہے
جب دھول ہی نہ ہوگی تو ظاہر ہے شاہی قدموں میں نہ
لگے گی۔
لیکن جب سب مل کر جھاڑو دینے لگے تو نتیجہ یہ ہوا کہ
فضا میں دھول ہی دھول ہوگئی
اس دھول سے شہنشاہ کا منہ تک بند ہوگیا
تمام شاہی ملازموں کی آنکھوں میں دھول سے اندھیرا
چھاگیا
اتنی گرد اڑی کہ آسمان تک ڈھک گیا
سورج کی تیز کرنیں بھی دکھائی نہ دیتیں
دھول کی بدولت بہت سے لوگ کھانستے کھانستے مر گئے
ریاست بھر میں اندھیرا چھاگیا۔
شہنشاہ نے تنگ آکر غصے سے کہا:
نالائقو! کہاں تو تم دھول کو
ختم کرتے جارہے تھے اور کہاں
تم نے پوری سلطنت کو دھول سے بھر دیا
بند کرو یہ بدتمیزی
اس کے بعد؟ دھول کا اڑنا بند کرنے کے لیے اکیس لاکھ
بھشتی بلوائے گئے
یہ اپنی مشکوں میں پانی لانے اور راستوں پر چھڑکنے لگے
دیکھتے دیکھتے تمام تالابوں اور ندیوں کا پانی خشک ہونے لگا
پانی کی جگہ کیچڑ باقی رہ گئی
ندیوں میں کشتیوں کا چلنا بند ہوگیا۔ آبی جانور پانی کے لیے
تڑپ تڑپ کر مرنے لگے۔
اور دوسری طرف تمام راستوں میں پانی بھر گیا۔ محلوں میں
پانی بھر گیا
نتیجہ! سب کو سردی، زکام، کھانسی نے آدبایا
لوگ ان بیماریوں سے مرنے لگے
پھر مہاراج نے فرمایا
دھول کی جگہ اب کیچڑ۔ یک نہ شد دو شد
تم سب بالکل گدھے ہو!
ایک بار اور مشورے کے لیے سب مل بیٹھے
وزیر، نواب، جاگیردار، منصب دار، امیر، عالم، پنڈت
اور حکومت کے سب عہدے دار
یہ سب سوچتے رہے سوچتے رہے۔ سوچتے سوچتے سب
کے سر چکرانے لگے، دماغ پھٹنے لگے
مگر افسوس! دھول کا مسئلہ حل نہ ہوا
کسی نے کہا: پوری دھرتی پر فرش بچھا دو!
کسی نے کہا: بادشاہ کو محل میں بند کردو!
ایک ایسے کمرے میں بند کردو جس میں کہیں بھی کوئی سوراخ
نہ ہو۔ اگر مہاراج ایسے کمرے
میں بند رہیں، کہیں باہر قدم نہ

نکالیں
تو ان کے قدموں میں دھول لگنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوگا
مہاراج نے یہ سُن کر فرمایا:
ٹھیک بالکل ٹھیک، لیکن اگر میں محض دھول کے ڈر سے مٹّی کے ڈر سے دن رات ایک کمرے میں بند پڑا رہوں تو میری سلطنت ہی مٹّی میں مل جائے گی اور تم سب مزہ کروگے۔
تب سب نے مل کر کہا:
تو پھر موچی کو بلائیں اور حکم دیں کہ چمڑے سے تمام دنیا کو ڈھانک دیا جائے۔ یہ ایک بڑا کارنامہ بھی ہوگا اور رہتی دنیا تک آپ کا نام زندہ رہے گا
سب نے گردن ہلا کر کہا:
واہ واہ! کیا خوب سوجھی ہے۔ یہ کام منٹوں میں ہو جائے گا اگر کوئی قابل چمار مل جائے
سرکاری کام کاج چھوڑ چھاڑ سب سرکاری ملازم ایک قابل چمار کی تلاش میں نکل پڑے
لیکن ہائے ری قسمت!
نہ زمین ڈھانکنے کے لایق چمڑا ملا نہ اس کام کو انجام دینے کے لیے لایق چمار ملا۔
جب ہر طرح ناکامی ہوئی تو چماروں کا ایک بوڑھا سردار شاہی دربار میں حاضر ہوا اور مُسکرا کر بولا:
جہاں پناہ اگر حکم ہو تو عرض کروں!
ایک ایسی ترکیب بتاؤں جس سے یہ مسئلہ آسانی سے حل ہو جائے
آپ تمام زمین کو چمڑے سے ڈھانکنے کے بجائے بس اتنا کیجیے کہ اپنے قدموں کو چمڑے سے ڈھانک لیجیے۔

بس یہی اس مسئلے کا آسان حل ہے
شہنشاہ نے فرمایا:
واہ واہ کیا خوب۔ کتنا آسان نسخہ ہے۔ کتنی معمولی بات ہے اور اس معمولی بات اس معمولی مسئلے کو حل کرنے کے لیے تمام نامی گرامی وزیر اور منصب دار، تمام شاہی ملازم سب کے سب جھک مارتے رہے۔
وزیرِ اعظم گوبو نے غصّے سے کہا:
کم بخت موچی! اسے فوراً گرفتار کر کے قید میں ڈال دیا جائے۔ اس نے شاہی قدموں کی توہین کی ہے۔ شاہی قدموں کو چمڑا پہنا دیا ہے
پھر اُس نے چپکے سے کہا
مجھے بھی یہ معلوم تھا کہ کیوں کر اس موچی نے یہ نسخہ حاصل کیا ہے۔
اس دن سے شہنشاہ جوتا پہننے لگے اور جبھی سے جوتا پہننے کا رواج ہوا۔
اس طرح وزیر اعظم گابو کی جان بچی
اور ریاست میں پھر سے امن چین کے دن لوٹ آئے۔

جناب مرزا شکور بیگ

مُبارکباد

گڑیوں کی شادی
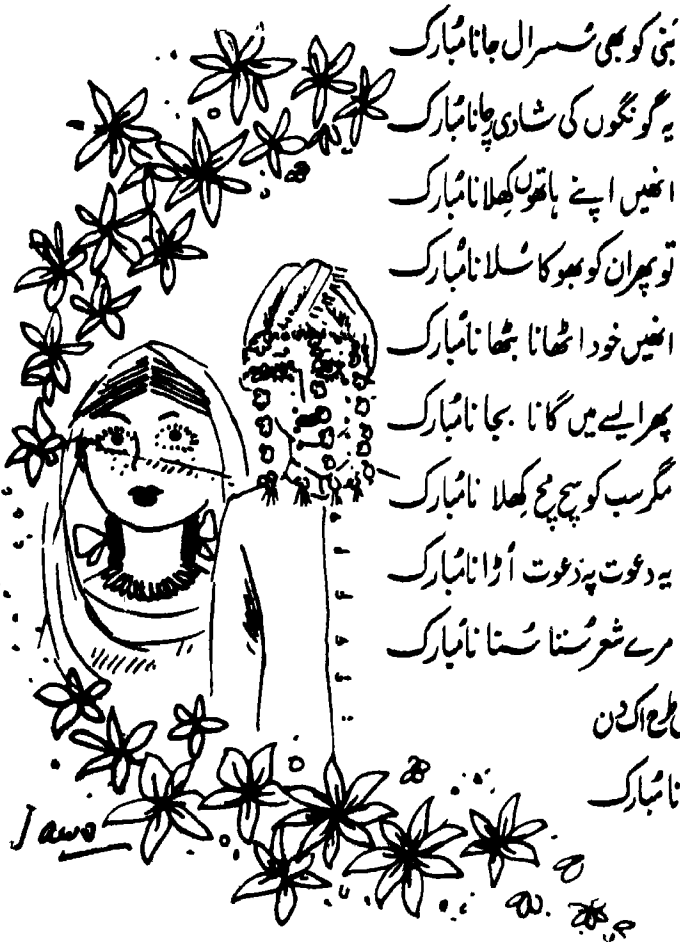
بنے کو بنی بیاہ لانا مُبارک
بنی کو بھی سُسرال جانا مُبارک

دلہن ہے جو گونگی تو دولہا بھی گونگا
یہ گونگوں کی شادی رچانا مُبارک

ہیں دلہا دلہن دونوں کاہل بلا کے
انھیں اپنے ہاتھوں کِھلانا مُبارک

یہ دیوانے اس پر بھی کھاتے نہیں ہیں
تو پھر ان کو بھوکا سُلانا مُبارک

یہ اپنی جگہ سے سرکتے نہیں ہیں
انھیں خود اٹھانا بٹھانا مُبارک

مُبارک سلامت کی ہے دھوم گھر میں
پھر ایسے میں گانا بجانا مُبارک

یہ مانا کہ شادی ہے چُپ چُپ کی شادی
مگر سب کو بیچ مچ کِھلانا مُبارک

ہے چوتھی، ولیمہ، جمعگی[1] بھی باقی
یہ دعوت پہ دعوت اُڑانا مُبارک

یہ گڑیوں کے سر پر رہو تم سلامت
مرے شعر سُننا سُنانا مُبارک

تمھارے بزرگوں کو اس طرح اک دن
تمھاری بھی شادی رچانا مُبارک

[1] یہ حیدرآباد کی رسم ہے۔ جس طرح شمالی ہند میں چار "چالے" ہوتے ہیں، حیدرآباد میں چار جمعے ہوتے ہیں۔ دو دلہن والوں کی طرف سے دو دلہا والوں کی طرف سے۔ ان میں دولہا دلہن کی دعوت ہوتی ہے اور انھیں نیے جوڑے دیے جاتے ہیں۔ حیدرآباد کے لوگ اُسے "جمعگی" کہتے ہیں۔

جناب عبداللہ ولی بخش قادری

ایک تھے بھیّا ٹال مٹول

آج تو سارا معاملہ ہی گڑبڑ ہوگیا۔ جلدی جلدی مُنہ دھونا شروع کیا تو آنکھوں میں صابن گھس گیا۔ دانت صاف کرنے کے لیے منجن کا ڈِبّا کھول رہے تھے تو وہ ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ سارا منجن زمین پر گر گیا۔ کم بخت ایک موزہ بھی نہ جانے کہاں چلا گیا۔ بہت ڈھونڈا مگر اُسے نہ ملنا تھا — نہ مِلا۔ جیسے تیسے کپڑے پہن پہنا کر ناشتے کی میز پر پہنچے۔ وہ بھی کچھ روٹھی روٹھی سی نظر آئی۔ سب چیزیں یوں ہی پڑی ہوئی تھیں۔ اپنی پسند کی ہر چیز قریب قریب صاف ہو چکی تھی۔ جو کچھ موجود تھا وہ بھی آدھا پَونا اور ٹھنڈا۔ پھر ساتھ دینے والا کوئی نہیں۔ بھائی جان ناشتہ کر کے جا چکے تھے، آپا بھی موجود نہیں تھیں۔ ابّا جان ناشتہ کرنے کے بعد اپنے کمرے میں اخبار پڑھنے لگے تھے۔ امّی کی آواز باورچی خانے سے آرہی تھی۔ مگر سوچنے کا بھی وقت نہ تھا، اُلٹا سیدھا کچھ کھایا پیا۔ بس یوں کہیے کہ مُنہ جُوٹھا ہوگیا۔ ناشتے میں کچھ مزا ہی نہ آیا۔ جلدی سے بستہ اٹھایا اور بھاگتے دوڑتے مدرسے کا رخ کیا۔

ہانپتے کانپتے مدرسے پہنچے۔ پھاٹک کے اندر گھستے ہی دِل دَھک سے ہوگیا۔ کوئی باہر نہ دکھائی دیا۔ درجوں میں پڑھائی ہو رہی تھی۔ چوروں کی طرح اپنے درجے میں پہنچے۔ سب نے دیکھا مگر کوئی کچھ نہ بولا۔ ماسٹر صاحب نے بھی کچھ نہ کہا۔ اس بات سے اور بھی شرم آئی۔

لڑکے باری باری سے اپنا اپنا "گھر کا کام" دکھا رہے تھے۔ اب جو اپنی حساب کی کاپی نکالی تو جان سوکھ گئی۔ ہائے اللہ! اب کیا ہوگا! دیر سے بھی آئے اور کام کر کے بھی نہ لائے۔ اسی سوچ بچار میں باری بھی آگئی۔ ماسٹر صاحب کی میز تک جانے کی کس میں ہمت تھی۔ بس کسی طرح کھڑے ہوگئے۔ کچھ ایسا لگا جیسے سب لڑکے ہمیں کو تاک رہے ہیں۔ آنکھیں آپ سے آپ زمین پر گڑ گئیں۔ ماسٹر صاحب نے دوبارہ بلایا مگر نہ پاؤں اٹھے، نہ آواز نکلی۔

اتنے میں دیکھا کہ ماسٹر صاحب پاس کھڑے ہوئے نرمی سے پوچھ رہے ہیں کیا بات ہے؟ بولتے کیوں نہیں

بڑی مشکل سے اتنا کہہ سکا کہ "کام پورا نہیں ہے"
"تین دن کی چھٹی میں کیا کرتے رہے؟" ماسٹر صاحب
نے کندھے پر پیار کا ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا

پہلے تو جی چاہا کہ رو پڑوں۔ پھر سوچا کہ جھوٹ موٹ کا کوئی بہانہ بنا دوں۔ لیکن ماسٹر صاحب سامنے کھڑے تھے۔ سچی بات بتائے بغیر نہ رہا گیا۔ اپنے آپ ہی منہ سے الفاظ نکلنے لگے "چھٹی کے دوسرے دن کام کرنے کے لیے سوچا تھا۔ تھوڑا سا تو کام ہی تھا لیکن اُس دن کچھ جی نہ چاہا۔ اگلے روز پر چھوڑ دیا۔ جب چھٹی کا تیسرا دن آیا تو پھر نہ معلوم کیا ہو گیا۔ ہاں، رات کو خیال آیا۔ اُس وقت کچھ ٹھنڈ سی لگ رہی تھی۔ بس یہ طے کر کے سو گیا کہ صبح سویرے اُٹھ کر کر لیں گے کام ہی کتنا ہے۔ صرف پندرہ سوال ہی تو ہیں وہ بھی بالکل آسان مگر آج اُٹھنے میں ہی دیر ہو گئی"

یہ سب کیسے کہا، خدا معلوم! لیکن کہا ضرور۔

اپنے آپ پر غصہ آرہا تھا اور رہ رہ کر آرہا تھا۔ کچھ عجب حال تھا کہ اتنے میں یہ الفاظ کان میں پڑے کہ "واہ بھیا ٹال مٹول!" اور دیکھا کہ ماسٹر صاحب اپنی میز کی طرف لوٹ رہے ہیں۔

پر یہ بھیا ٹال مٹول اپنے دم کے اکیلے نہیں ہیں ان کے بھائی بند آپ کو ہر جگہ مل جائیں گے۔ کیا محلہ کیا مدرسہ ہر جگہ ہی نظر آجائیں گے۔ بے چارے کبھی اچھے خاصے کھرے تھے لیکن اب اپنے اوپر کاہلی کا زنگ لگا بیٹھے ہیں اور اپنا کوئی کام وقت پر پورا نہیں کر پاتے۔

نہ جانے کیا بات ہے یہ اپنے کام کو ایک دفعہ ٹالتے ہیں تو وہ کام پھر مشکل سے ہی کبھی پلٹ کر اپنی صورت انھیں دکھاتا ہے۔ اُن میں آج کا کام کل پر رکھنے کی ایسی عادت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ کسی "کام" کے نہیں رہتے عزیز، رشتہ دار اُن سے ناراض کہ خط کا جواب دنوں میں مل پاتا ہے۔ اُستاد اُن سے خفا کہ مدرسے کا کام کر کے نہیں لاتے۔ یہ بے چارے اپنے آپ سے پریشان۔ جہاں جاتے ہیں اپنی چال ڈھال سے پہچان لیے جاتے ہیں۔

اوّل تو ہر جگہ دیر سے پہنچتے ہی ہیں اور وہ بھی کچھ گھبرائے گھبرائے سے۔ نہ بال ٹھیک سے سنورے ہیں نہ لباس ہی معقول نظر آتا ہے۔ کبھی قمیص کے بٹن غلط لگے ہوئے ہیں تو کبھی جوتے کے تسمے ٹھیک نہیں بندھے ہیں۔ مُنہ بھی آدھا پونا ہی دُھلا ہے۔ صاف پتہ چلتا ہے کہ وقت کا خیال نہیں رکھا گیا۔ اب انھیں اب چلیں کرتے کرتے آخری منٹ آگیا ہے اور یہ پھر سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے ہیں اور انھیں کسی بات کی سُدھ نہیں رہی ہے۔

جب ظاہری طور طریقے ہی ایسے ہوں تو پھر کام کیسے بنے۔ بزرگوں کی نگاہوں میں کیسے جگہ پائیں۔ برابر والوں میں کیسے نام حاصل کریں۔ پڑھائی لکھائی کیسے پوری ہو۔ ہم اپنے سب کام خوبی کے ساتھ پورا کر سکتے ہیں مگر کر نہیں پاتے اس لیے کہ بھیا ٹال مٹول بن گئے ہیں۔ سب کچھ جانتے بوجھتے ہیں لیکن اپنی کاہلی کی بنا پر ہمیشہ پھسڈی رہ جاتے ہیں۔ یہ بچارے اپنی طرف سے آج کا کام کل پر چھوڑتے ہیں اور وہ اکثر بالکل ہی چھوٹ جاتا ہے۔ امتحان میں اس وجہ سے نہیں رہ جاتے کہ نالائق ہیں بلکہ اس لیے یہ ذلت اٹھانی پڑتی ہے کہ ٹال مٹول کرتے ہیں، کاہل ہیں۔

مگر یہ کوئی ایسی کمزوری بھی نہیں ہے جسے دور نہ کیا جاسکے

ی لیے اسے چھوڑا بھی جا سکتا ہے۔ ہر بار ہمارا دل
م نہ کرنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کر لیتا ہے۔
اپنے آپ کو خود ہی دھوکا دے کر مطمئن ہو جاتے
ں۔

"ارے اس وقت لیمپ پر کیڑے بہت آ رہے
ں"۔ "یہ نب خراب ہے"۔ "وہ پینسل اچھی نہیں"۔
فلاں کاپی مدرسے میں رہ گئی ہے"۔ ایسا ہی کچھ سوچا اور
وقت کی پڑھائی کو ملتوی کر دیا۔

پر کیا واقعی یہ سچ مچ کی مجبوریاں ہیں؟ اگر ذرا
غور کیا ہوتا اور کام کو کام سمجھا ہوتا تو ان معمولی معمولی
وں کی وجہ سے کام کو اُٹھا نہ رکھتے۔ اور آج سے اگر جی
ٹھان لیں کہ اپنی ذمہ داری کو ٹالیں گے نہیں تو ساری
لت بہت جلد ٹھیک ہو سکتی ہے۔

بس شرط یہی ہے کہ جو طے کر لیں، اُسے کر کے
ڑیں۔ چھوٹے موٹے دھندے ہر وقت ہی ساتھ لگے
ہتے ہیں۔ مثلاً جوتوں پر پالش کرنی ہے، ترکاری خریدنے
لیے بازار جانا ہے، ابا جان کے کسی دوست کو کچھ پیغام
جانا ہے، کتابوں کی الماری صاف کرنی ہے۔ بال کٹوانا
، نہانا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اور پھر اپنی پڑھائی لکھائی
، کچھ استادوں کا بتایا ہوا کام کرنا ہے، کچھ پڑھا
سبق یاد کرنا ہے اور کچھ اپنی طبیعت سے پڑھنا لکھنا
۔ اپنے کسی شوق کے کام کو پورا کرنا ہے جیسے کسی کو
نے جمع کیے ہوئے ٹکٹ کاپی یا البم میں ڈھنگ سے
نے ہیں، کسی کو کوئی تصویر بنانی ہے۔ اب کیا کیا گنیں
ور نہ معلوم ایسے کتنے کام!
بیح اپنے ساتھ نیے کام

ے گرتی ہے۔ چڑھ رہے ہیں اور کچھ اور بیچ ہو جاتے
ہیں۔ اب اگر اپنے کاموں کی طرف سے منہ موڑ لیا جائے
اور آنکھیں بند کر لی جائیں تو وہ اپنے آپ پورے نہیں
ہو جائیں گے۔ کام تو کرنے سے ہی پورا ہوتا ہے اور
جب وقت پر کیا جائے تب ہی اس کا حق ادا ہوا کرتا
ہے۔ بس انھیں ترتیب کے ساتھ کرتے رہنے کی ضرورت
ہے۔ اپنے کاموں کو ان کی ضرورت اور اہمیت دھیان
میں رکھ کر ایک ڈھنگ سے کر لینے کا پروگرام بنا لینا چاہیے
ایک فہرست سی تیار کر لی جائے پھر انھیں شروع کیا
جائے۔ پہلا کام، دوسرا کام، تیسرا کام، لیجیے ایک
ایک کر کے سب ختم! اور وقت پر ختم!!

(اٹلی کی لوک کہانی)

جناب سعادت صدیقی

گدھے گنجے کیوں ہوتے ہیں

بہت زمانے کی بات ہے — کسی گھنے جنگل میں بلوط کے ایک درخت پر ایک گدھ رانی رہا کرتی تھیں — ان کا شوہر بہت نکما تھا کام چور تھا انھیں کبھی پیٹ بھر کھانا نصیب نہ ہوتا تھا درخت کے تنے میں ایک بہت بڑا بل تھا۔ اس بل میں ایک موٹا تازہ خوب صورت سا خرگوش رہتا تھا جب کبھی گدھ رانی کی نظر اس خرگوش پر پڑتی تھی ان کا دل للچانے لگتا تھا وہ دن رات یہی سوچا کرتی تھیں کہ کسی طرح موقع ملے اور میں خرگوش کو ہڑپ کر جاؤں —

ایک دن کی بات ہے گدھ رانی اپنے گھونسلے میں بھوک سے نڈھال پڑی تھیں اور خرگوش اپنے بل میں سو رہا تھا — گدھ رانی نے موقع غنیمت جانا اور ایک ترکیب سوچی — انھوں نے کچھ اینٹیں پتھر وغیرہ اکٹھا کیے اور بل کا سوراخ بند کر دیا۔ اور اپنے دل میں سوچنے لگیں کہ اب خرگوش باہر نہ نکل سکے گا۔ اور بھوک سے بیتاب ہو کر مر جائے گا۔ اس کے بعد میں اُسے کھا لوں گی۔

جب خرگوش کی آنکھ کھلی اس نے دیکھا کہ بل کا راستہ بند ہے۔ اس نے گدھ رانی سے بہت منت سماجت کی۔ لیکن انھوں نے ایک نہ سنی اور کہنے لگیں "مجھے سخت بھوک لگی ہے میں تم کو کھاؤں گی۔

خرگوش نے سوچا کہ اب منت سماجت سے کوئی کام نہ چلے گا۔ وہ خاموش ہو کر بیٹھ رہا۔ اس طرح چپ سادھے اسے کافی دیر ہو گئی۔ گدھ رانی کو یقین ہو گیا کہ اب اس کا کام بن گیا ہے اور وہ اسے اچھی طرح کھا سکیں گی۔ وہ کان لگا کر خرگوش کی آواز سننے لگیں۔ جب کافی دیر تک انھیں کوئی آواز نہ سنائی دی تو انھوں نے سمجھا کہ خرگوش مر گیا ہے۔ ان کے منہ میں پانی آنے لگا۔ انھوں نے جلدی جلدی بل کے سوراخ پر سے پتھر وغیرہ ہٹانا شروع کر دیے اور بل میں گھسنے کی کوشش کرنے لگیں۔ ابھی وہ گھسنے بھی نہ پائی تھیں کہ خرگوش نے چھلانگ لگائی اور وہاں سے بھاگ کر اپنے ایک دوست کے ساتھ رہنے لگا۔

کئی دن بیت گئے گدھ رانی خرگوش کے بارے میں بھول گئیں۔ ان کے بچے انڈوں سے باہر نکل آئے تھے۔ ایک دن وہ اپنے بچوں کو لیکر سیر کو نکلیں۔ بچوں کے ساتھ وہ خرگوش کے دوست کے گھر کے سامنے سے گذر رہی تھیں۔ انھیں خیال بھی نہ تھا کہ خرگوش

بقیہ صفحہ ۱۰۵ پر

جناب نسیم منانی

جنگل جاگ رہا ہے

پہلا اور آخری منظر

[ہرا بھرا جنگل رنگ برنگے پرند اور چرند پاس ہی سانپ کی طرح بل کھاتی اور دودھ کی طرح سفید نہر آگے بڑھتی چلی جارہی ہے، اس میں ننھی منی مچھلیاں اپنے اپنے کھیل میں معروف ہیں، جیسے گاؤں کے تالابوں میں ننھے منے معصوم بچے ایک دوسرے پر پانی اچھال کر نہا رہے ہوں تیر رہے ہوں، مینڈک بے چارے پھدک رہے ہیں۔ جیسے اسکول کی بچیاں اور بچے اپنے سالانہ کھیلوں میں تھیلے کی دوڑ (sack Race) میں پھدکتے ہوئے گرتے پڑتے آگے بڑھتے ہیں

اس سہانے پیارے جنگل میں نہ شیر دھاڑتا ہے نہ ہاتھی چنگھاڑتا ہے۔ البتہ کوئل ضرور کوکتی ہے اور وہ کوک رہی ہے۔ چڑیاں چوں چوں کر رہی ہیں۔ کبوتر اپنی غٹرغوں فرما رہے ہیں۔ مور چنگھاڑ رہا ہے اور طوطا اپنی رٹ لگا رہا ہے، ایک طرف گلہری درخت کی ٹہنی پر بیٹھی چٹ چٹا رہی ہے۔ مولانا الو اپنے پٹھے کے ساتھ ہو کر فرما رہے ہیں۔ بندر میاں طرح طرح کی آوازیں نکال رہے ہیں کبھی کالی پلٹن کے سپاہی مسٹر کالے خاں کائیں کائیں کرتے کسی الو کے پٹھے پر جھپٹ رہے ہیں۔ کبھی بندر کے سر پر ٹھونگ مار گویا مذاق فرمانے کی کوشش کر رہے ہیں جھینگر اپنی جھنکار میں معروف ہیں، مکھی بھنبھنا رہی ہے غرض اچھی خاصی راگ رنگ کی سبھا جمی ہوئی ہے۔ ہندوستانی، کرناٹک اور یوروپی موسیقی جنگل کی سہانی موسیقی کی اولاد ہیں، فطری خوبصورتی کے ساتھ جنگل من بہلاوا امن کا مسکن نظر آرہا ہے۔ لیکن پیٹ کی خاطر شیر کی دھاڑ، ہاتھی کی چنگھاڑ، چیتے اور لومڑی کی مکاری، سانپ کی پھنکار، جنگلی کتوں کی بھوں بھوں شہری کتوں کی وفاداری اور غلامی اور شکاریوں کی شکار سے دلچسپی امن کے لیے زبردست خطرہ بن جاتی ہے۔

آج کا موسم سہانا ہے۔ وقت سہانا ہے مور صاحب جھنگارتے ہوئے نہر کے کنارے تشریف لاتے ہیں، سانپ پھنکار کر ڈسنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور حضرت مور اس کے پھن کو زخمی کر دیتے ہیں۔]

مور :- ایک جنگل میں رہتے ہو۔ یہیں مرنا اور جینا ہے۔ آدمیوں کی طرح مال ومتاع چھوڑ جانا تھوڑی ہے۔؟ نیک حیوانوں کی طرح نیک نام "رہتے جنگل" تک چھوڑ جاتا ہے۔ ع

نیک ناموں کے نشاں باقی رہیں گے حشر تک

سانپ :- کیا کروں۔ ایک تو ازل کا بیرا پھر اس ڈر سے کہ تم مجھے مار نہ دو، میں تمہیں ڈسنا چاہتا تھا۔

مور :- ڈر بری بلا ہے۔ آدمیوں کی طرح تم سانپوں کی فوج بنا کر ہم پر دھاوا بول سکتے ہو۔

سانپ :- اس کا کیا کیا جائے کہ مور قوم ازل سے ہماری دشمن ہے۔ انسانیت کی بو صرف تم میں پا رہا ہوں۔

مور :- میں تم سے یہی امید رکھتا ہوں۔ بچھو کی زندگی سے سبق لو۔ ورنہ زمانے کا کچھوا موت کے پانی میں تمہیں بھی سلا دے گا۔ اور شہر کی طرف بھی مت جایا کرو۔ وہاں اپنی بھائی برادری نہیں بستی انسان بستے ہیں۔

سانپ :- چوہوں اور انڈوں کی تلاش میں چلا جاتا ہوں مگر معاملہ بڑا خطرے کا ہے۔ کئی ساتھیوں کا پھن کچل دیا گیا۔ کسی کی کمر کے منکے کھسکا دیئے گیے۔ سنا ہے پہلے جب شامت آتی تھی تو بھیڑیا شہر کا رخ کرتا تھا۔ اب معاملہ الٹا ہے۔ زمانہ بدل گیا۔ چال غضب کی چل گیا۔

مور :- ہاں بھیڑیا تو اب شہر میں بسنے لگا ہے۔۔ میری سنو میری مانو۔ تم بدنام زمانہ قوم ہو۔ بد اچھا بدنام برا

انسان ہاتھی کو رام لکشمن کرتا ہے۔ تمہارا منہ پوپلا کر تمہیں تماشہ بنا پیسے کماتا ہے

سانپ :- بھائی پیٹ بُری بلا ہے۔ بھوک لگتی ہے تو دھرم کی نیا بھی پیٹ کے ندی نالوں میں ڈانوا ڈول ہو جاتی ہے۔ اب اجازت دو پاس والے جنگل میں چوہے پلیگ سے مر رہے ہیں۔ اور شہر میں لوگ انھیں مار رہے ہیں۔ اس لئے حیوان برادری کے ناطے عدم تشدد کا مارا انھیں مارنے کے بجائے صرف نگل لے گا۔

(سانپ سلام کر، رینگتا ہوا آگے نکل جاتا ہے)

مور :- تم نہیں سدھرو گے۔ نہیں سدھرو گے، مر جاؤ گے۔

(ایک شور ہوا اور مور نے دیکھا کہ مختلف چرند پرند اپنی اپنی بولیاں بولتے آپس میں ہنستے کھیلتے چلے آ رہے ہیں۔ جب وہ سب قریب پہنچ کر رک گیے تو مور آگے بڑھتا ہے)

مور :- خیر تو ہے۔ زعفران کا کھیت تو نہیں دیکھا بہت خوش نظر آ رہے ہو۔

ہرن بھائی مورا خوب بہت خوب!! کیا یاد کرو گے یار ایک انسان کا شعر تمہارے حسب حال سناتا ہوں فرمایا ہے

سب چرند و پرند :- ارشاد بزرگ محترم، ارشاد!

ہرن :- میں یہ شعر ترنم سے پڑھوں گا تاکہ ہر کس و ناکس کی سمجھ میں آجائے۔

بگلا :- یار اب اپنی چوکڑی بھر بھی۔

ہرن :- ہوں۔۔۔ ں۔۔۔ ن۔۔ (گنگناتے ہوئے) سنو بھی، آخر شعر یاد آ ہی گیا ؎

پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
(مور کی طرف دیکھ کر)
جلنے نہ جانے گُل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

پرند و چرند :- واہ واہ، کیا کہنے، بہت خوب

مور :- دوستو، عزیزو، میں گل کی طرح خوبصورت ضرور ہوں، تمہارے طنز نے اس گل کو گُل کر دیا۔ دل کی کلی کو مرجھا دیا خیر اب بتاؤ آخر بات کیا ہے بتاؤ، میں پیشگی ہی بنا قصور و خطا و جرم معافی مانگ رہا ہوں۔

کوّا :- بتاؤ بتاؤ، یار چنکبرا، بتاؤ ہماری بہادری کی بات ہضم نہ کر جانا۔

چنکبرا :- قے کر دوں گا۔ (سب ہنستے ہیں) دوستو آج صبح خدا جانے کس کا منہ دیکھا تھا۔

مور :- پاک و شفاف آئینے کی سی نہر میں ہر صبح اپنی صورت دیکھا کرتے ہو۔

چنکبرا :- نہیں یار تمھیں خوبصورت سمجھ کے دیکھ گیا تھا۔ (سب ہنستے ہیں) اب سنو!

مور :- کچھ کہو بھی میرے بھائی۔

چنکبرا :- تلاشِ معاش میں ذرا اپنے مسکن سے دور بانسوں کی جھیل* تک پہنچ گیا تھا۔ سنا ہے اور پڑھا بھی ہے کہ بانس کی نئی نئی پتیاں بڑی مزیدار ہوتی ہیں، سائنس کا طالب علم ہوں۔ سوچا منہ کی لیبوریٹری میں عملی طور پر آزما ہی لوں۔ اس سے پہلے کہ عمل شروع کروں، داڑھ چلے اور ستر بلا ٹلے۔ آنکھوں نے وہ دیکھا جس کا تصور بھی نہ تھا۔ میرے اللہ! توبہ میری توبہ! ہزار ہزار توبہ!

مور :- تیری توبہ سے توبہ! وقت کی قدر نہیں تمھیں جلدی بتاؤ نا؟

چنکبرا :- جلدی بتادوں تو مزہ نہ آئے گا۔ خیر! میری بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی، پھر روشنی سے بے نیاز ہوتی نظر آئیں۔ جلدی میں بانس پر چڑھنے کی کوشش کی جس طرح کسی بے وقوف الو کی دُم۔ . . . . (مجھے مولانا الو معاف کریں میری نیت بری نہیں ہے) ہاں تو بے وقوف الو کی دُم کی بیان کی ہوئی کہانی کی طرح جس میں دریا کو آگ لگی اور مچھلیاں پیڑوں پر چڑھ گئیں، پھر دوسرے بے وقوف مہا الو دوست نے (الو کی طرف کنکھیوں سے دیکھ کر) اپنے بے وقوف دوست پر ہنستے ہوئے کہا۔ "بدھوا گائیں بھینس ہوئیں جو پیڑوں پر چڑھ بیٹھیں؟" غرض ہم ہنسے بغیر ون ٹو تھری بولے بنا بھاگ کھڑے ہوئے۔

مور :- الو کی دُم، بھاگے کیوں؟ کیا دیکھا؟ بھوت دیکھا کہ چڑیل، شیر دیکھا کہ شیطان یا انسان؟ ہونہہ؟

چنکبرا :- شیر دیکھا۔

مور :- (تعجب سے) شیر! شیر! لے رے! شیر! باپ رے باپ!

چنکبرا :- ہم بھاگنے لگے، اتنے میں . . . خبر اپنے وطن میں آگ کی طرح

---

* دکن میں بانسوں کے جنگل کی بجائے بانسوں کی جھیل کہا جاتا ہے

بھیلی۔ قد کے چھوٹے عقل کے بڑے میاں خرگوش
کو بھی خبر کر دی گئی تاکہ وہ کوئی ترکیب نکالیں مگر
انھوں نے کہلوا بھیجا کہ آج کل ان کا موڈ آؤٹ
ہے۔ مگر الو میاں نے فرمایا کہ بھائیو! مجھے دن میں
نظر نہیں آتا، کبھی چوہا سامنے آجائے تو آنکھیں
روشن ہو جاتی ہیں۔ مگر کوے ماما نے فرمایا (کوا فخر
سے اپنا سینہ پھلاتا ہے) کہ دوستو، سب کو مل کر
حملہ کرنا ہے، اب "جے جنگل" سے سارا جنگل گونج اٹھا
اور تمھیں اس کی آواز نہ آئی؟ ذرا اونچا سنتے ہو نا

مور :۔ اس میں کیا شک ہے

چینکبرا :۔ بندر ماما نے اپنے بیسیوں ساتھیوں کے ساتھ
کھکھیانا اور منہ بنا بنا کر چڑانا اور ڈرانا شروع
کر دیا۔ طوطے نے اپنی فیملی سمیت رٹ لگانی شروع
کر دی۔ دوسرے موروں نے چنگھاڑنا شروع
کیا کم بخت سانپ بانبی میں گھس گیا۔ کچھوا اپنے
شاگردوں سمیت اپنے آپ کو سمیٹے ایسا لڑھکنے
لگا جیسے گول مٹول پتھر پہاڑ سے گر رہے ہوں اتنے
میں کوے ماما نے اپنی فوج کے ساتھ دشمن پر حملہ کیا
اور چونچ سے وہ کام لیا کہ شیر کی کھال سے خون کے
ننھے منے قطرے جھانکنے لگے۔ دوسرا حملہ اس زور
سے ہوا کہ شیر کی ایک آنکھ اللہ کو پیاری ہو گئی۔

کوا :۔ اب معلوم ہے شیر نے کیا کہا؟

مور :۔ کیا کہا بھلا؟

کوا :۔ اس جنگل کی ہوائی فوج بڑی طاقت ور
ہے۔ میں نے ناحق اس جنگل میں گھسنے کی حماقت
کی، ہتھ تیری کی!

مور :۔ اللہ نے تمھیں
خوبصورتی نہیں دی۔ ویسے چونچ بھی تمھارے جسم
کی طرح کالی کلوٹی بدصورت ہی سہی، مگر اس نے
خوب کام لیا۔ اور دوست سچ ہے کہ اللہ میاں
ہر کسی میں ایک خوبی عنایت کر دیتے ہیں۔

کوا :۔ ایک برائی بھی دیتے ہیں اور وہ جناب میں
ہے وہ جسم کس کام کا جو اپنی شریف جنگلی قوم کے
کام نہ آئے

مور :۔ نہیں یار۔ ذرا اونچا سننے لگا ہوں نا، اس لئے
پتہ نہیں چلا ورنہ ضرور دشمن کے خلاف جنگل کا
ساتھ دیتا۔

چینکبرا :۔ جانے دو یار آج شیر کے شکست کھا کر سیدھے
الٹے پاؤں بھاگنے کی خوشی میں تمھارا خوبصورت
ناچ ہو جائے۔ یہ کسر پوری کر دو، سارے گلے
شکوے ہم واپس لیے لیتے ہیں۔

کوا :۔ ہاں یار "جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا" کا
انسانی محاورہ بدل دو۔

مور :۔ چلو بی کوئل سہانا راگ چھیڑو، ہم ناچیں گے

کوئل :۔ نا بابا ہمیں شرم آتی ہے۔

مور :۔ دھت تیری کی! شرم کس بلا کا نام ہے؟
اور یہ تری بلا ہے۔ تم میں کیسے آگئی۔

کوئل :۔ شرم و حیا عورت میں نہیں تو مردوں میں
آئے گی کیا۔؟

پپیہا :۔ رانی کیا انسانوں کی سی باتیں کرنے لگیں
عورت کی جگہ مادہ اور مرد کو کاٹ کر نر کہو نا!

کوئل :۔ بھول ہوئی راجا۔

پپیہا :۔ چلو رانی گا بھی دو، آج
موسم بھی سہانا ہے۔ آسمان سے

رِم جھم برس کر تھم چکا ہے، صاف ستھرا اور نکھرا جنگل اور تمھارا لگا تا مزہ دے گا اور موتیا گلاب کی کلی، چنپا کلی، انار کلی، سب قسم کے ناچ ناچیں گے۔

سب چرند و پرند :- ہاں ہاں، ناچو بھیا ناچو، تِک دِھنا دِھن، گاؤ، بی کوئل گاؤ آن ..... ن ..... ں

(مور ناچنے اور کوئل کوکنے لگتی ہے پپیہا پی پی کرتا ہے پھول مسکراتے ہیں۔ پتے ہوا کے ساتھ مل کر تالیاں بجاتے ہیں مور ناچتے ناچتے رونے لگتا ہے مورنی آگے بڑھ کر ان آنسوؤں کو پی لیتی ہے)

سب چرند و پرند :- بات کیا ہے، بات کیا ہے؟

(کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا جاتی ہے۔ کوئی نہیں بولتا)

کوّا :- ارے یار نر، عورت یعنی مادہ کی طرح کیوں رونے لگے۔؟

کوئل :- (برا مان کر) عورت انسانوں میں ہوتی ہے، ہاتھ کنگن کو آرسی کیا رونے والا مور ہے کوئل نہیں

مور :- دوستو، بی بیو، چرند و پرند صاحبان، اصل بات کہتا ہوں نقلی نہیں کہتا ہوں۔ صبح اس آئینے کی طرح صاف نہر میں ناچتے ناچتے اپنی صورت دیکھی، خوبصورت جسم اللہ نے بنایا۔ گل بوٹے کھلائے لیکن پاؤں پر نظر پڑی تو جی رونے کو چاہا، رو بیٹھے۔ اب صبح کی بات یاد آگئی تو دل رو دیا۔ آنکھیں چھلک پڑیں، یہ پیر نہ دیتا اللہ میاں تو کون سی کمی رہ جاتی۔

کوّا :- لو لے ایا ہج اور نہ چلنے کیا کچھ ہوتے۔

بارہ سنگھا :- (مسکرا کر) میرے نادان خوبصورت دوست مجھے دیکھو، دیکھ لیا۔؟

مور :- ہاں ہاں۔ دیکھ لیا۔

بارہ سنگھا :- لمبے خوب صورت سینگ دیکھ رہے ہو؟

مور :- کسی سوکھے پیڑ کی بارہ ڈالیاں۔

بارہ سنگھا :- (مسکرا کر) ہاں! خوبصورت پیڑ کی پھولوں سے لدی ٹہنیاں! سمجھے؟ ان پر مجھے بڑا ناز تھا۔ فخر تھا، بجا فخر تھا اور اپنے دبلے پتلے بدصورت پاؤں دیکھ کر میں بھی کبھی رو دیا تھا۔ لیکن ایک قصہ سنو،

مور :- قصہ! کہانی!!

سب چرند و پرند :- کوئی الف لیلیٰ کی کہانی سناؤ۔

ہرن :- الف لیلیٰ انسانوں میں سنائی جاتی ہے، البتہ چڑیوں کی الف لیلہ بچوں کو پڑھ کر سنائی جا سکتی ہے۔ لیکن اس کا مصنف جنگلی شہزادہ نہیں ہے، انسانوں کی بستی میں رہتا ہے وہ۔

پپیہا :- دیکھ یار! اچھی بات دشمن میں بھی ہو تو اسے اپنانا چاہیے "انسان ہماری نظر میں ہزار برے سہی، وہ ہمارا ہزار شکار کرنے والے سہی مگر ہم میں سے بہتوں کا ذکر چاندنی رات میں گا کر کرتے ہیں۔

اُلّو :- مجھے انسانی محاورہ استعمال کرنا پڑے گا۔ صرف الّو کی دم فاختہ کیے جا رہے ہو۔ کام کی بات کرو۔

سب چرند و پرند :- (ہنس کر) الّو کی دم فاختہ۔

(سب قہقہہ لگاتے ہیں، الّو میاں پیلے پیلے کر طوطے کی طرح آنکھیں

پھرتے ہوتے، پیروں میں سر کو چھپا کر باہر نکال لیتے ہیں۔)

بارہ سنگھا :- ہاں تو دوستو! اب قصہ یوں شروع ہوتا ہے
اس سرسبز و شاداب جنگل میں منگل منا رہا تھا، یعنی اکیلے اکیلے مزے اڑا رہا تھا۔ اکیلے میں پو بارہ اور درِ دسر ہے دوسرا، ساتھی دکھ میں ہی بھائے سکھ میں اڑچن کہلائے۔ اس بات کا آپ سب کو پتہ، جانے ڈالی ڈالی قبہ قبہ۔

اُلّو :- اماں میری دُم، کیا اختر راستے کا پتھر ادر میرے برابر جیسی عبارت رٹے جا رہے ہو، جانور ہو۔ آسان اور سلیس زبان میں کہو۔ پنڈت اور ملّا بننے کی کوشش میں ڈھینچوں ڈھینچوں نہ بن جاؤ۔

بارہ سنگھا :- مختصر بولوں۔ رس گھولوں۔ میں ہر زبان میں ماہر ہوں۔ اور خاص کر جنگل کی ٹکسالی زبان میں۔ سنو میرے دوستو۔ تمہید کے بغیر عرض ہے اس میں انکساری کو دخل نہیں ہم اپنے معدے میں غذا اسٹاک کر رہے تھے۔ جگالی کی نوبت نہ آئی تھی کہ لتے ہیں، توبہ! میری توبہ، جل تو جلال تو، آئی بلا کو ٹال تو کا ورد شروع کر دیا۔

بگلا :- خوب میاں خوب! کیا مرچ مسالہ لگا رہے ہو مگر داستان کو اور نمکین کرو گے تو کڑوی ہو جائے گی، ہونہہ۔ اب کہہ بھی چکو یار،

بارہ سنگھا :- جو کام دیر میں ہوتا ہے وہ ٹھیک ہوتا ہے جس کہانی میں سسپنس نہ ہو وہ پھیکی ہوتی ہے، خیر سنو دوستو، میں نے جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو کے بول، ایک دو تین بار کیوں دہرائے اس کا راز بیان کرتا ہوں۔ توبہ میری! اچھے ہی دانتوں کے بیچ ہری گھاس آئی کہ آواز آئی: بھوں بھوں۔ بھوں بھوں! شکاری کتوں کو دور سے دیکھ کر جان نکل گئی۔

اُلّو :- ارے یار جھوٹ نہ بول۔ خدا لگتی کہہ، جان نکل گئی تو تُو زندہ کہاں رہا؟

بارہ سنگھا :- تیری ہی دستی تیرا ہی گلا۔ جو بھی بکے گا الو کی دُم فاختہ۔ جان نکل جانا محاورہ ہے اس میں جانور سچ مچ نہیں مرتا۔ مرنے کے قریب ضرور ہو جاتا ہے۔ انسان نے تیرے نام کے جو محاورے بنائے اور تیرے پٹھوں سمیت جو بھی تیرے واسطے سے اپنوں کو گالی دی، وہ دشمن بھی حق بجانب تھا۔

اُلّو :- لڑنے کی بات نہ کر، جانور ہے تو، اتنا یاد رکھ

بگلا :- ارے چپ! اگل ڈال جلدی سے کہانی!

(بارہ سنگھا کچھ کہنا چاہتا ہے)

ہاں ہاں کہا یا ہی اُگلا جاتا ہے، اب آگے چل۔

بارہ سنگھا :- ہاں تو الو کی طرف دیکھ کر مارے ڈر کے جان نکل گئی۔ شکاری بندوقیں تانے گھوڑوں پر عزرائیل یا جیسے پریم راج کی طرح تشریف لائے تھے۔ میں چوکڑیاں بھرتا ہوا آگے بڑھا لیکن ایک جگہ نہر کے قریب میرے خوبصورت سینگ بُری طرح جھاڑی میں اٹک گئے۔ منٹ لمحوں میں تبدیل ہوا چاہتے تھے۔ میں تھک ہار کر رونے لگا۔ مرنا برحق تھا۔

پپیہا :- جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

بارہ سنگھا :- جیسے ہی شاعر کے فرزند ارجمند، قصہ سن، کتوں کی آواز اب قریب آنے لگی اور موت اپنے سارے ہتھیاروں کے ساتھ سامنے بالکل روبرو، اُف!

بگلا :- فارسی نہ بگھار یار ایرانی، آخر وہ کیسی تھی؟

بارہ سنگھا :- بھیانک! . . . . بیچ میں کچھ نہیں سنو

سب چرند و پرند :- ہاں ہاں کہے جاؤ بھائی۔ کہانی مزیدار ہے۔

بارہ سنگھا :- یہ جگ بیتی نہیں آپ بیتی ہے اور اس میں جان پر بن نہ جائے تو مزہ ہے۔ ورنہ مزہ کرکرا، اور جرم بنا سزا۔ دائیں بائیں دیکھا تو قریب کوئی نہیں تھا ایک الّو کا پٹھا ؎

کوئی امید بر نہیں آتی کوئی صورت نظر نہیں آتی
موت کا ایک دن معین ہے نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

گا رہا تھا۔ بڑا غصہ آیا۔ چاہا کہ پانی پی پی کر کوسوں لیکن بُرا وقت تھا اور موت کا تصوّر مارے ڈال رہا تھا۔ ایسے وقت باپ دادا کی کہانی یاد آ رہی تھی۔ تاریخ پھر دھرائی جا رہی تھی۔ کیا کروں کیا نہ کروں۔ ایک دن وہ تھا کہ دادا محترم اور والد محترم نے اپنے پاؤں کی بدصورتی کو جی بھر کر، پانی پی پی کر کوسا تھا لیکن مصیبت میں پیروں ہی نے ساتھ دیا۔ یہی سینگ لے ڈوبے۔ اب میں نے توبہ کی اللہ میاں سے کہہ دیا کہ باپ دادا کی ناشکری تھی۔ باپ دادا کے خون کے اثر نے سب کچھ کہلوایا تھا۔ اب اللہ کا نام لے آنکھیں بند کر "یا جنگل مدد" کے نعرے کے ساتھ جھٹکا جو لگایا تو آنکھ کھل گئی۔

(ہا ہا ہا سب چرند و پرند ہنسنے لگے)

سب چرند و پرند :- خواب سے تسلا گئے تھے۔

بارہ سنگھا :- نہیں تو کیا۔ بات سچی ہوتی تو مر گیا ہوتا زندہ ہوں اب بات سمجھ میں آگئی ہے۔ جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو کے منتر کے ساتھ پیروں کو بھی چاہنے لگا ہوں۔ البتہ یار پانی میں سینگوں کو دیکھ کر خوش ضرور ہو لیتا ہوں۔

اُلّو :- حسین چہروں پر دل للچا ہی جاتا ہے

کوّا :- تم اور حسن کی بات!

الّو :- تم نے آئینہ دیکھا ہے،

کوّا :- کالے ہیں تو کیا ہوا دل والے ہیں، گردے والے ہیں۔ بہادر ہیں۔ اچھے کے باز کی طرح اچھے جوڑ باز ہیں۔ کھلاڑی ہیں۔

بگلا :- لڑو نہیں، ایک حمام میں سب ننگے ہیں۔ ننگے کا لفظ نہیں کہوں گا۔ حیوانوں میں حیا آدھا ایمان ہے۔

مورنی :- بھائیو اور بہنو! آپ تمام اجازت دیں اور خاموش رہیں تو اپنے پیارے مور سے ایک بات پوچھوں،

سب چرند و پرند :- اجازت ہے۔

مورنی :- (مور سے نہایت ادب سے) بھیا بارہ سنگھا کی کہانی خواب و حقیقت سے کچھ سبق لیا کہ نہیں؟

مور :- تم چپ رہو، تم خوبصورت تھوڑی ہو،

مورنی :- چرند و پرند میں صورت سے زیادہ سیرت ہونی چاہیے آپ تو ناحق بگڑتے ہیں بھی تھوڑا کرتے ہیں اور انسانوں کی سی باتیں کرتے ہیں۔

کوّا :- بھائی بھائی ٹھیک کہتی ہے، انسانی دنیا کا زوال اسی وقت ہوا جب بناوٹی صورت کے مقابلے بے چاری سیرت کو "بے چاری" اور غریب سمجھا گیا۔

مور :- ہاں میں نے تاریخ پڑھی ہے لیکن کیا کروں، بیوی عقل کی بات بھی کہتی ہے تو غصہ آتا ہے، آخر شوہر ہوں نا،

مورنی :- میں معاف کرتی ہوں، آپ بھی معاف کریں۔ غصہ اور دکھ میں شوہر تو شوہر ہاں باپ بھائی بہنوں اور بیوی تک کو نصیحت کی بات اور اونچی زوردار آواز نہیں بھاتی۔

(مینا پریشان اُڑ کر آتی ہے)

مینا :- جنگلی کتوں کی فوج جنگل میں گھس چکی ہے۔ بہادر شیر سے لڑنا اور بات ہے لیکن ان کتوں کے منہ لگنا ان سے لڑنا دل گردے کا کام ہے۔

کوّا :- میں شہر اور گاؤں، گاؤں اور جنگل ہر جگہ کا تجربہ رکھتا ہوں۔ انسانوں کی جنگی چالیں بھی میں نے سیکھی ہیں سکندر گریٹ وار بھی دیکھی ہے۔ مور میاں اب اٹھو، ہوائی فوج کا ساتھ دو۔ تم جٹ طیارے کا کام کر سکتے ہو۔

ہرن :- ہم یعنی بدولت ہرن، چنکیرا اور بارہ سنگھا اپنی اپنی فیملی سمیت سینگوں سے دشمن کو روکیں گے اور وطن یعنی جنگل کے لیے ہم شہید ہونے میں دریغ نہ کریں گے۔

کوّا :- ٹھیک ہے۔ ہم ہوائی حملہ کریں گے۔ ان پر کنکریاں بھی برساؤ ان کا ابرہا کے ہاتھیوں کا سا حشر ہو۔

(جنگلی کتوں کے سونگنے کی آواز آتی ہے)

سب چرند و پرند :- اب سوچنے کا نہیں عمل کا وقت ہے۔ بجلی کی روشنی کی طرح چمک کر دشمنوں پر بجلی کی طرح گرنا ہے۔

کوّا :- اٹن شن! وَن ٹو تھری پانچ لفٹ رائٹ لفٹ رائٹ،

(ہرن، چنکیرا، بارہ سنگھا اور کچھوؤں کی پیدل فوج آگے بڑھتی ہے پرندوں کی ہوائی فوج کوّے کی کمان میں تیزی سے ہوا میں اُڑتی نظر آتی ہے۔)

"باقی گدھے گنجے کیوں ہوتے ہیں ...

یہاں رہتا ہوگا۔ خرگوش انھیں دیکھ کر یاغ یاغ ہوگیا۔ دوڑا دوڑا باورچی خانہ گیا۔ دہکتے ہوئے کوئلوں اور گرم راکھ سے تسلا بھرا۔ جب گدھے رانی بچوں سمیت برآمدے کے پاس سے گزرنے لگیں تو اس نے جھٹ تسلا ان پر الٹ دیا۔ انھوں نے اپنے اپنے پروں سے گرم راکھ اور کوئلے تو جھاڑ دیے لیکن اس عرصے میں ان کے اور بچوں کے سروں کے بال جل گیے۔

یہی وجہ ہے کہ گدھے گنجے ہوتے ہیں اور انھیں خرگوشوں سے اتنی نفرت ہے کہ وہ اب تک خرگوش کی ہڈیاں بھی نہیں کھاتے ہیں۔

مکتب کی سمت دوڑو

جناب وقار خلیل

جاگا فلک پہ سورج اور چاند سو گیا ہے
مکتب کا اپنے بچو اب وقت ہو گیا ہے

مکتب جو لیٹ پہنچے استاد خوش نہ ہوں گے
تم ان سے کیا پڑھو گے غصے میں جب وہ ہوں گے

اچھا ہے دل لگا کر اپنا سبق پڑھو تم
رٹنا بہت برا ہے اس سے مگر بچو تم

علم و عمل سے ہوگی اپنے وطن کی عظمت
اپنے وطن کی عزت ہندوستاں کی رفعت

بالک گھروں کی جے ہو ہر گلستاں کی جے ہو
ہندوستاں کی جے ہو جنت نشاں کی جے ہو

جاگا فلک پہ سورج اور چاند سو گیا ہے
مکتب کا اپنے بچو اب وقت ہو گیا ہے

ٹڈا

[illegible]

بڑا سہانا دن تھا۔ سنہری دھوپ ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ زمین پر ہریالی کا فرش بچھا تھا۔ بچے کھیل رہے تھے، اچھل کود رہے تھے۔ وہیں گھاس پر ایک ٹڈا بھی خوشی سے پھدکتا اور گاتا جاتا تھا۔ ایک چیونٹی گھاس کے کنارے کنارے گیہوں کا دانہ اٹھائے جا رہی تھی۔ دانا وزنی تھا اور چیونٹی تھی چھوٹی۔ اسے اتنا بوجھ اٹھانے میں کافی پریشانی ہو رہی تھی۔ ٹڈے نے جو یہ دیکھا تو پوچھا:

"کیوں جی بی چیونٹی یہ اتنا وزن اٹھائے کہاں جا رہی ہو؟"

چیونٹی نے دانہ چھوڑ کر ذرا دم لیا اور بولی: "یہ دانا گھر لے جا رہی ہوں، حفاظت سے رکھوں گی۔"

"کیا ضرورت ہے، کھانا تو خوب مل رہا ہے۔ آؤ ہم تم مل کر کوئی کھیل کھیلیں!" ٹڈے نے کہا۔

لیکن بی چیونٹی نے ٹڈے میاں کی بات نہ مانی اور دانہ اٹھا کر اپنے گھر کی طرف چل دیں تاکہ دانہ گودام میں رکھ دیں اور برسات میں بھوکوں نہ مرنا پڑے۔ ٹڈے میاں کھاتے، کھیلتے اور گاتے رہے۔

برسات آئی تو ٹڈے میاں نے گزارا کر لیا۔ لیکن جاڑا آیا تو لگے بھوکوں مرنے۔ ان کے پاس نہ کھانے کے لیے کوئی چیز تھی نہ رہنے کے لیے کوئی گھر تھا۔ آخر مجبور ہو کر بی چیونٹی کے پاس کھانا مانگنے گئے لیکن بی چیونٹی نے صاف انکار کر دیا اور ٹڈے میاں اپنا سا منہ لے کر لوٹ آئے۔ سردی میں اکڑتے اور بھوکوں مرتے رہے۔

ایک دن جب ہم ٹہلنے کے لیے صبح باغ میں پہنچے تو دیکھا کہ ٹڈے میاں گھاس پر مرے پڑے ہیں۔ ہم نے بھی بھائی جان کی طرح ٹڈے میاں کی نبض دیکھی، انھیں الٹ پلٹ کر دیکھا اور آخرکار اس نتیجے پر پہنچے کہ ٹڈے میاں سچ مچ اللہ کو پیارے ہو چکے۔ ہمیں بے حد افسوس ہوا۔

ہمارے بھائی جان ڈاکٹر ہیں۔ وہ کل ہی کہہ رہے تھے کہ پہلے لاشوں کو چیر پھاڑ کر جسم کی بناوٹ دیکھی جاتی ہے پھر آہستہ آہستہ مرض کو پہچاننا اور علاج کرنا وغیرہ سکھایا جاتا ہے۔

میں نے نغمی سے کہا "نغمی کیوں نہ ہم بھی ٹڈے میاں کو اٹھا لے جائیں اور انھیں چیر پھاڑ کر دیکھیں کہ یہ آخر ہیں کیسے؟"

نغمی نے میری بات مان لی اور ہم دونوں ٹڈے میاں کو اٹھا لائے۔ ایک میز کھڑکی کے قریب رکھی۔ میز کے اطراف تین کرسیاں رکھیں اور بھائی جان کو بھی

بلائے تاکہ اگر کچھ سمجھ میں نہ آئے تو فوراً پوچھ سکیں۔ ہم نے پہلے ٹڈے میاں کی لاش کو اوندھا لٹا دیا۔

اس کا رنگ ہرا تھا۔ ہم نے بھائی جان سے پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ ٹڈے کو خدا نے اس لیے ہرا بنایا ہے کہ دشمنوں سے اپنی حفاظت کر سکے۔ آپ بھی جانتے ہیں کہ ٹڈا اگر گھاس پر موجود ہو تو بالکل دکھائی نہیں دیتا جب یہ بالکل ہمارے قریب سے اُچھل کر دوسری جگہ جا بیٹھتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ یہاں پر ٹڈا موجود تھا۔ اس کے دشمن اسی وجہ سے اس کا آسانی سے شکار نہیں کر سکتے۔

ٹڈے کو اُوپر سے دیکھنے پر اس کے جسم کے تین حصے دکھائی دیئے۔ (۱) سر (۲) سینہ اور (۳) پیٹ۔ سر کے دونوں جانب دو انڈے کی شکل کی بڑی بڑی آنکھیں بھی تھیں۔

"بھائی جان دیکھیے نا کس قدر بڑی بڑی آنکھیں ہیں اِس کی!" نغمی بولی۔

"ہاں جسم کی مناسبت سے آنکھیں بڑی ضرور ہیں لیکن عجیب بات تو یہ ہے کہ ٹڈے کی ان دو آنکھوں کے علاوہ تین چھوٹی آنکھیں اور ہوتی ہیں۔" بھائی جان نے یہ کہہ کر ہمیں حیرت میں ڈال دیا۔

"پانچ آنکھیں ہوتی ہیں!!" میں نے بھائی جان سے پوچھا "ہماری تو دو ہی آنکھیں ہوتی ہیں اور ہم اُن سے اچھی طرح دیکھ سکتے ہیں۔ پھر ٹڈے کو پانچ آنکھوں کی ضرورت کیوں ہوتی ہے؟"

"بھئی ٹھیک ہے۔ تمھاری دو آنکھیں ہوتی ہیں اور تم اُن سے اچھی طرح سے دیکھ سکتے ہو کیوں کہ اللہ میاں نے تم کو گردن دی ہے اور ٹڈے بے چارے کے گردن نہیں ہوتی۔ یہ بے چارہ ہماری طرح اپنی آنکھوں کو حرکت دے سکتا ہے اسی لیے یہ ضروری ہے کہ ٹڈے کی زیادہ آنکھیں ہوں۔" بھائی جان نے سمجھایا۔

"کیا ہی اچھا ہوتا کہ اللہ میاں ہمیں بھی پانچ آنکھیں دیتے اور ہم گردن کو حرکت دینے سے بچ جاتے۔" نغمی نے کہا۔

یہ سُن کر بھائی جان بہت ہنسے اور بولے، "ہاں گردن کو تو حرکت دینے سے بچ جاتے لیکن ساتھ ہی تمھاری آنکھیں دیکھ کر ایسا لگتا جیسے چہرے پر آنکھوں کے بدلے شیشے کی گولیاں جڑی ہیں۔ اور بغیر گردن کے دھڑ پر رکھا سر یوں لگتا جیسے گھڑے پر کدو دھرا ہو۔"

سر کے سامنے کے حصے میں دو مونچھیں نظر آئیں۔ یہ جھینگر کی مونچھوں کی طرح لانبی نہیں بلکہ چھوٹی سی تھیں۔ ان کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے کئی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو جوڑ کر بنی ہوں۔ میں جب اس کی مونچھوں کو غور سے دیکھ رہی تھی تو بھائی جان نے کہا: "ٹڈے کی یہ دو مونچھیں بڑی ہی کار آمد ہوتی ہیں۔ ان سے یہ غذا تلاش کرتا ہے۔ ان پر جو باریک رواں ہے اس کے ذریعہ وہ اسی طرح محسوس کر سکتا ہے جیسے ہم اپنی انگلیوں سے چھو کر کوئی چیز معلوم کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ سونگھنے کا کام بھی ان ہی مونچھوں سے لیتا ہے۔"

سر کے نیچے کی طرف منہ ہوتا ہے اس کے جبڑے مضبوط ہوتے ہیں جن کی مدد سے یہ پودوں کے پتے، کلیاں، پھول وغیرہ کتر کر کھاتا ہے منہ کے قریب بھی دو ایک چھوٹے چھوٹے بال موجود ہوتے ہیں

میں نے بھائی جان سے ان کا کام پوچھا تو بولے:
"ٹِڈّے کے مُنہ میں زبان نہیں ہوتی کہ یہ کھائی جانے والی چیز کا مزہ معلوم کر سکے۔ ان بالوں سے ٹِڈّا چکھنے کا کام لیتا ہے۔"
سر کے بعد سینہ ہے۔ سینے کے ساتھ چھ ٹانگیں جُڑی ہیں جن کی مدد سے یہ اچھلتا ہے۔ یہ چلتا نہیں بلکہ ایک جگہ سے دوسری جگہ اُچکتا ہے۔ سینے کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے یہ تین مختلف حصّوں کے ایک دوسرے کے ساتھ جڑنے سے بنا ہے اور ہر حصّے کے ساتھ دو ٹانگیں جڑی ہیں۔
"بھائی جان جھینگر کی بھی چھ ٹانگیں ہوتی ہیں لیکن وہ اچھلتا نہیں چلتا ہے۔ ٹِڈّا اچھلتا ہے دوڑ نہیں سکتا ایسا کیوں ہے؟" نغمی نے پوچھا۔
"سُنو، ٹِڈّے کے پیروں کی بناوٹ دوسرے کیڑوں کے مقابلے میں مختلف ہوتی ہے۔ اللہ میاں نے اس کے پیروں کو اچھلنے کے لیے بنایا ہے چلنے کے لیے نہیں۔" بھائی جان نے سمجھایا۔
"لیکن بھائی جان یہ اچھلتا کس طرح ہے؟" میں نے پوچھا۔
"دیکھو ٹِڈّے کی چھ ٹانگیں ہیں لیکن یہ سب سائز میں یکساں نہیں بلکہ پچھلی ٹانگیں اگلی ٹانگوں سے لمبی ہیں جب ٹِڈّا اُچھلنا چاہتا ہے تو یہ اپنی پچھلی ٹانگوں کو قوت سے سیدھا کر دیتا ہے اور ایک جگہ سے اچھل کر دوسری جگہ جا بیٹھتا ہے۔ ٹِڈّا خود تو ایک ڈیڑھ انچ سے زیادہ نہیں ہوتا لیکن دو ڈھائی فٹ کی چھلانگ لگا سکتا ہے۔" بھائی جان بولے۔
نغمی حیرت سے آنکھیں پھاڑے کچھ دیر تک تو سوچتی رہی پھر بولی:
"بھائی جان مگر جب میں چھلانگ لگاتی ہوں تو چار پانچ فٹ سے زیادہ نہیں۔"
بھائی جان ہنسے اور ہنسی کو شکل سے روک کر کہنے لگے۔ "ٹھیک کہتی ہو۔ اگر تم بھی ٹِڈّے کے اچھلنے کے اصول کو اپنا لو تو ستر پچھتر فٹ کی چھلانگ تو آسانی سے لگا سکتی ہو۔ جب کہ موجودہ طریقے سے چھلانگ لگانے کا ریکارڈ بیس بائیس فٹ سے زیادہ نہیں ہے۔"
"تو بھائی جان ہم کل سے اسی طریقے سے چھلانگ لگانے کی کوشش کیوں نہ کریں! کیوں نغمی؟" میں نے کہا۔
بھائی جان نے قہقہہ لگا کر کہا: "نہیں بھئی، ایسی حماقت بھی نہ کرنا، کہیں چہرہ زخمی کر بیٹھو۔ اور تمھیں اتنی لمبی چھلانگ لگانے کی ضرورت کیا ہے؟ خدا نے تمھیں اچھا ذہن دیا ہے۔ اس سے کام لو اور نت نئی مشینیں بناؤ، اپنی رفتار بڑھاؤ اور ساتھ ہی ہوا میں بھی پرواز کرو۔"
"ارے اس کے سینے پہ چار پر بھی ہیں!" نغمی اچانک بول پڑی۔
"لیکن بھائی جان ٹِڈّا جب اچھلتا ہے تو چَٹ کی سی تیز آواز آتی ہے۔ کیسے آتی ہے یہ آواز؟ جب کہ ٹِڈّے کے مُنہ میں زبان نہیں ہوتی!"
بھائی جان مُسکرائے اور بولے: "بھئی میں تو سمجھتا تھا کہ کہانیوں کے کابل تمھارے روپ میں پھر پیدا ہو گئے ہیں۔ مگر تم تو چھپی رستم نکلیں۔"

"کون سے کاہل بھائی جان؟" میں نے پوچھا

"بھئی وہی کاہل جو اپنے سینے پر گرا ہوا پھل اُٹھا کر نہ کھا سکے اور تیسرے آدمی سے کھلانے کے لیے کہا اور تیسرا آدمی یہ کہتا ہوا چلا گیا ـــ منہ کھول کر لیٹے رہو اللہ میاں تمھارے منہ میں ہی پھل ٹپکا دیں گے۔" بھائی جان نے کہا۔

"نغمی اب جب تمھیں بھوک لگے تو تم بھی یہی کرنا۔" میں نے شرارت سے کہا۔

نغمی روٹھنے لگی تو بھائی جان اُسے مناتے ہوئے بولے، "ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ ہماری نغمی دراصل بڑی تیز ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر نظر رکھتی ہے۔" وہ نغمی کو دیکھ کر مُسکرائے اور نغمی کی جیسے گردن اکڑ گئی۔ پھر کہنے لگے۔ "ٹِڈا اچھلتے وقت جو آواز پیدا کرتا ہے وہ اپنے پروں کو ایک دوسرے کے ساتھ تیزی سے رگڑ کر پیدا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ ٹِڈا ایک جگہ خاموش بیٹھ کر بھی آواز پیدا کرتا ہے۔ یہ آواز وہ اپنی پچھلی لمبی ٹانگوں کو پروں پر رگڑ کر پیدا کرتا ہے۔"

سینے کے بعد پیٹ کا حصّہ ہے۔ یہ بھی کئی حصّوں سے مل کر بنا ہے۔ جوڑ صاف دکھائی دیتے ہیں۔ میں نے بھائی جان سے پوچھا ـــ "ٹِڈے کا آواز کرنے کا مقصد کیا ہوتا ہے؟"

بھائی جان بولے ـــ "بھئی جس طرح تم آپس میں باتیں کرتے ہو اسی طرح ٹِڈے بھی ان آوازوں کے ذریعے آپس میں باتیں کرتے ہیں۔"

"بھائی جان اس کے کان کہاں ہوتے ہیں؟" نمی نے پوچھا۔

"وہ کان تمھاری طرح باہر کو نکلے ہوئے نہیں ہوتے بلکہ اس کے پیٹ پر ہوتے ہیں اور آسانی سے دیکھے نہیں جا سکتے۔ بھائی جان نے کہا۔

"بھائی جان اس کی ناک کہاں ہوتی ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

بھائی جان مُسکرا دیے اور بولے، "ٹِڈے کے ناک تو نہیں ہوتی لیکن یہ سانس لیتا ہے۔"

میں نے اپنی معلومات کی دھاک بٹھائی، "یقیناً ـــ بھلا کوئی سانس لیے بغیر بھی زندہ رہ سکتا ہے؟"

میری بات کو صحیح جان کر کہنے لگے۔ "لیکن اس کے سانس لینے کا طریقہ ہم سے مختلف ہوتا ہے۔ سانس لینے کے سوراخ اس کے پیٹ اور سینے پر ہوتے ہیں۔ کبھی تم اسے ہاتھ میں پکڑ کر دیکھنا اس کا پیٹ سانس لینے اور خارج کرنے کی وجہ سے مسلسل پھولتا اور پچکتا رہتا ہے۔"

"بھائی جان ٹِڈا انڈے دیتا ہے کہ بچے؟" میں پوچھنے لگی۔

"ہاں بھئی انڈے دیتا ہے۔ ٹِڈی زمین میں سوراخ کرکے اپنے انڈے بند کر دیتی ہے۔ پھر کچھ عرصے بعد ان انڈوں سے بچے نکل آتے ہیں۔ بس صرف ان کا سَر جسم کی مناسبت سے کسی قدر بڑا ہوتا ہے۔"

"کیا یہ بڑے ٹِڈے کے برابر ہوتے ہیں؟" نغمی نے پوچھا

"نہیں بھئی یہ بڑے ٹِڈے سے چھوٹے ہوتے ہیں اور خوب کھا کر آہستہ آہستہ بڑے ہو جاتے ہیں۔ اس عرصے میں وہ کئی بار اپنی جلد بدلتے ہیں۔ پہلے ان کے پَر نہیں ہوتے لیکن بڑے ہونے پر ان کے پَر نکل آتے ہیں۔"

بھائی جان نے بتایا۔

"بھائی جان مرنے کے بعد جسم کو جو چیر پھاڑ کر امتحان کیا جاتا ہے اس کو کیا کہتے ہیں؟" میں نے پوچھا

بھائی جان نے حیرت سے پوچھا۔ "کیوں بھلا — ؟ پوسٹ مارٹم کہتے ہیں۔"

ہم دونوں نے ایک ساتھ کہا — "تو بھائی جان ہم نے بھی آج ٹِڈے میاں کا پوسٹ مارٹم کیا ہے۔"

بھائی جان ہنسے اور بولے۔ "ہاں اب تو تم دونوں ماشاء اللہ ٹِڈے کے ڈاکٹر ہو گئے۔

"بھائی جان اس ٹِڈے کا فایدہ کیا ہے؟ خواہ مخواہ ایک جگہ سے دوسری جگہ اُچکتا پھرتا ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے ٹِڈے بالکل اچھے نہیں لگتے۔ سخت بدتمیز ہوتے ہیں۔ ہری گھاس پر بیٹھ جاؤ تو بنا بتائے چٹ سے پاس آجاتے ہیں اور بغیر کچھ بتائے نکل بھاگتے ہیں۔"

"بھئی ٹِڈا بے کار تو نہیں۔ کئی پرندے اسے بطور غذا کے استعمال کرتے ہیں اور ان پرندوں کو ہم غذا کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ یا یوں کہو ٹِڈوں کو استعمال کرتے ہیں

میں اور نعمی ایک ساتھ بولے — "واہ ہم کیوں ٹِڈے کھائیں گے۔"

"مت کھانا — نہ کھاؤگی تو بھوکوں مروگی"

بھائی جان مسکرائے۔ سائنس دانوں نے معلوم کیا ہے کہ ٹِڈا بہترین غذا ثابت ہو سکتا ہے — خیر، لیکن ٹِڈا انسانوں کو بے حد نقصان بھی پہنچاتا ہے۔ اُن کے دَل کے دَل ایک مقام سے دوسرے مقام تک اُڑ کر جاتے ہیں اور کسی کھیت میں اُترتے ہیں تو تیار فصل منٹوں میں چٹ کر جاتے ہیں۔ یہ ٹِڈی دل کہلاتا ہے — ٹِڈوں کی تعداد اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے اندھیرا چھا گیا ہے۔ یا یوں لگتا ہے جیسے بادل گھر آئے ہوں۔"

"بھائی جان ان سے فصلیں کس طرح بچائی جا سکتی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"اس کی ایک ہی ترکیب ہے اور وہ یہ کہ جب ٹِڈی دَل کسی کھیت پر اُتر جائے تو اُسے آگ لگا دی جائے۔ اس طرح ایک کھیت تو جل جاتا ہے لیکن دوسرے کھیت بچ جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ٹِڈی دَل سے بچنے کی کوئی اور دوا یا ترکیب نہیں۔ اب یہ میز صاف کرو اور ٹِڈے میاں کو کہیں دفن کرآؤ ورنہ یہ یہاں پڑے رہیں گے تو چیونٹیاں انھیں اپنے پیٹ کی قبر میں دفن کرلیں گی۔" بھائی جان نے کہا۔

اور ہم دونوں ہنس پڑے۔

(...بقیہ سُنیل کی شکل....)

جگہ سے انڈا نکالتے ہوئے وہ چلّایا

"ارے ریکھا — لو! یہ ایک اور — آج تو مزہ ہی آگیا۔ شام کے کھانے کا بڑھیا انتظام ہو گیا"

وکیل صاحب چپ چاپ یہ تماشا دیکھتے رہے۔

اگلے دن صبح ہی دو مزدور دیوار چننے میں مصروف تھے اور وکیل صاحب خود کھڑے نگرانی کر رہے تھے۔

"ارے کم بختو! اب جلدی سے دیوار چن ڈالو — کچہری جانے میں دیر ہو رہی ہے۔"

جناب بزمی بھارتی

بڑا آدمی کون؟

جس کو دنیا میں سب لوگ اچھا کہیں ۔ جس کو ایماندار اور سچا کہیں
جس کو نفرت ہو ہر اک بُرے کام سے ۔ جس کو رغبت ہو تعلیم کے نام سے
جھوٹ، چوری، دغا سے جو دامن بچائے ۔ جو مشقّت سے خود اپنی روزی کمائے
بغض، کینہ، حسد پاس جس کے نہ آئے ۔ حرص و مکر و ریا جس کو چھونے نہ پائے
جو سہارا ہو کمزور و مجبور کا ! ۔ جس کے سینے میں ہو درد مزدور کا
جو بڑوں کا ادب اپنے کرتا رہے ۔ اور چھوٹوں سے جو کام لے پیار سے
جو تعصب کی دنیا سے بیزار ہو ۔ مقصدِ زندگی جس کا ایثار ہو
جو پریشانیوں میں بھی ہنستا رہے ۔ جو اندھیرے گھروں میں اجالا کرے
جو پڑوسی کا ہمدرد و غم خوار ہو ۔ ظلم کے حق میں جو تیز تلوار ہو
جو بُرائی کے بدلے بھلائی کرے ۔ بھولے بھٹکوں کی جو رہنمائی کرے
جو مصیبت سہے دوسروں کے لیے ۔ اور حق بات بے خوف ہو کر کہے
جس پہ اپنے پرائے بھروسا کریں ۔ جس کے اخلاق کا لوگ چرچا کریں
جو کسی سے اگر کوئی وعدہ کرے ۔ وقت پر اپنے وعدے کو پورا کرے
جو مصیبت زدوں کا نگہبان ہو ۔ خدمتِ آدمی جس کا ایمان ہو
دولتِ علم سے جو محبت کرے ۔ چاندی سونے کے سکوں سے نفرت کرے
جس کی تقریر ہو پھول کی پنکھڑی ۔ جس کی تحریر ہو موتیوں کی لڑی

گلشنِ امن سے جس کی ہے دوستی
درحقیقت وہی ہے "بڑا آدمی"

جناب دینا ناتھ گردھر

انوکھا وکیل

آپ نے امریکہ کا نام سنا ہوگا۔ ساتویں، آٹھویں درجوں میں پڑھنے والوں نے تو اس براعظم کا جغرافیہ بھی پڑھا ہوگا۔ ویسے تو امریکہ ایک بہت بڑا براعظم ہے۔ اور دو چھوٹے براعظموں شمالی امریکہ اور جنوبی امریکہ میں بٹا ہوا ہے۔ امریکہ میں کتنے ہی ملک ہیں اور کتنی ہی حکومتیں۔ ایک دوسرے سے الگ اور آزاد۔ اسی امریکہ کا ایک حصہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کہلاتا ہے۔ اس میں پچاس سے زیادہ ریاستیں شامل ہیں۔ جس طرح ہمارے ہندوستان میں بہت سی ریاستیں یا صوبے ہیں۔

جیسے ہندوستان کا سب راج کاج راشٹرپتی یا صدر جمہوریہ کے نام سے چلتا ہے، اسی طرح ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا راج کاج بھی وہاں کے پریذیڈنٹ یعنی صدر کے نام سے چلتا ہے۔ یہ ملک بھی کسی وقت ہماری طرح انگریز کا غلام تھا مگر اسے آزاد ہوئے بہت عرصہ ہو گیا ہے۔ اب یہ ملک پوری دنیا میں سب سے ترقی یافتہ اور مالدار ملک ہے۔ اسے ترقی دینے اور خوشحال بنانے میں اس کے ہر صدر نے بہت کام کیا ہے۔ ان میں سے کچھ تو بہت مشہور ہیں۔ جارج واشنگٹن۔ ابراہیم لنکن۔ روزویلٹ، کینیڈی کا نام تو رہتی دنیا تک باقی رہے گا۔ آج ہم ان میں سے ابراہیم لنکن کا تھوڑا سا حال اور ان کی زندگی کا ایک دلچسپ واقعہ آپ کو سناتے ہیں۔

ابراہیم لنکن ۱۸۰۹ء میں امریکہ کے ایک بہت غریب گھرانے میں پیدا ہوا۔ ابراہیم لنکن کے باپ جنگل میں لکڑی کاٹنے کی مزدوری کرتے تھے۔ اس لیے ابراہیم لنکن کے لیے کسی تعلیم کا بندوبست نہ ہو سکا اور اس بچے کو چھوٹی سی عمر میں روزگار کے لیے دوڑ دھوپ کرنی پڑی۔

لڑکپن میں ہی وہ کھیتوں میں مزدوری کرتا کشتیوں میں سامان لادنے اتارنے کا کام کرتا کشتیاں کھیتا چلاتا۔ لکڑیاں کاٹتا اور چیرتا۔ ایک چھوٹے بچے کے لیے یہ کام کتنے سخت ہیں۔ پر اسے کرنا پڑتے۔

اس نے ایک چھوٹی سی پرچونی کی دوکان بھی کی لیکن وہ چلی نہیں۔

مگر یہی مفلس اور نادار لڑکا اپنی خداداد لیاقت و ذہانت، ہمت و جرأت کے سہارے ایک دن امریکہ کا صدر بنا۔ صدر بھی وہ جسے آج امریکہ والے اپنا بہترین رہنما مانتے ہیں۔ اس نے محنت مزدوری کے ساتھ ساتھ پڑھنا لکھنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ وہ کامیاب وکیل بن گیا۔

اچھا تو لیجیے وہ واقعہ بھی سنیے جسے سننے کے لیے آپ بے چین ہوں گے۔

۱۸۴۶ء کی بات ہے۔ امریکن پارلیمنٹ کے انتخابات ہونے والے تھے۔ ابراہیم لنکن پہلی بار اس کے لیے امیدوار کھڑے ہوئے تھے۔

آپ نے پچھلی سردیوں میں دیکھا ہوگا۔ انتخابات کے موقع پر بڑا ہنگامہ رہتا ہے۔ امیدوار اپنے اپنے حلقے میں جاکر تقریریں کرتے ہیں۔ لوگوں کو اپنے حق میں اور اپنی پارٹی کے حق میں ووٹ دینے کے لیے بڑھ چڑھ کر باتیں کرتے ہیں۔ یہی حال اس وقت امریکہ میں بھی تھا۔

جمعرات کی شام کو ابراہیم لنکن اپنے دفتر میں بیٹھے اگلے دن ہونے والے ایک جلسہ میں تقریر کے لیے مصالحہ اکھٹا کر رہے تھے کہ انھیں ایک خط ملا۔ پہلے تو انھوں نے خط کو سرسری طور پر پڑھا۔ مگر جب ایک بار پڑھ چکے تو بار بار اور بڑے غور سے پڑھتے رہے اور پھر اچانک اپنے پاس بیٹھے ہوئے دوستوں اور حمایتوں سے کہا "کل جلسہ میں وہ تقریر نہیں کریں گے۔"

سب لوگ حیران ہوگئے کہنے لگے "اس جلسے پر تو آپ کی کامیابی اور ناکامی کا انحصار ہے یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔"

ابراہیم نے صاف صاف کہہ دیا کہ مجھے ایک ایسا ضروری کام آپڑا ہے جس پر میں پارلیمنٹ کی ممبری قربان کر سکتا ہوں۔ سب لوگ مایوس ہوگیے۔

ابراہیم لنکن رات کو وہاں سے تن تنہا پیدل نکل پڑے کسی کو ساتھ نہیں لیا۔ اور سڑکوں کھیتوں اور وادیوں میں سے ہوتے ہوئے صبح دس بجے بائیس میل دور ایک قصبے میں جا پہنچے اور سیدھے وہاں کی کچہری کا رخ کیا۔ وہاں ایک قتل کا مقدمہ پیش تھا۔ عدالت کا کمرہ لوگوں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔

ابراہیم سب سے پیچھے بیٹھ گیے۔ مقدمہ پیش ہوا ایک پندرہ سولہ برس کے دبلے پتلے صورت شکل سے بہت غریب لڑکے پر اپنے سے دگنی عمر کے ایک آدمی کو قتل کرنے کا الزام تھا۔

جب مقدمہ پیش ہوا تو عدالت نے ملزم سے پوچھا آیا اس کا کوئی وکیل ہے۔

لڑکے نے روتے روتے جواب دیا کہ اس کا کوئی وکیل نہیں ہے۔ وہ تو اتنا غریب ہے کہ وہ اور اس کی ماں پیٹ بھر کھانا بھی نہیں کھا سکتے۔

عدالت نے کہا کہ کیا وہ سرکار کے خرچ پر وکیل لینا منظور کرے گا۔ اتنے میں پیچھے کی قطار میں سے ایک آدمی اُٹھ کر عدالت کے کٹہرہ پر آیا اور کہا کہ وہ اس لڑکے کی طرف سے بطور وکیل پیش ہونا چاہتا ہے۔

عدالت کے معلوم کرنے پر اس نے بتایا کہ وہ ایک سند یافتہ وکیل ہے اور اس کا نام ابراہیم لنکن ہے۔ عدالت نے انھیں ملزم کی طرف سے پیش ہونے کی اجازت دے دی۔

سرکاری وکیل نے قتل سے متعلقہ واقعات بیان کیے۔ موقعے کے گواہوں نے قتل کے واقعے کی تصدیق کی اور ملزم کو شناخت کیا۔ مگر ابراہیم لنکن اس کئی گھنٹے کی کاروائی کو خاموشی کے ساتھ سنتے رہے۔ کسی گواہ پر انہوں نے جرح نہ کی۔ جب استغاثہ کی طرف سے کاروائی ختم ہوئی تو عدالت نے صفائی کے وکیل ابراہیم لنکن سے جواب دینے کو کہا

ابراہیم لنکن نے کہا کہ میں اس مقدمے کے کسی قانونی پہلو پر بحث نہیں کروں گا۔ مجھے سرکاری گواہوں کے بیانوں اور سرکاری وکیل کی دلیلوں پر کچھ نہیں کہنا میں صرف ایک کہانی سنا کر عدالت سے رخصت لوں گا۔ اس کے بعد عدالت جو فیصلہ کرے گی۔ درست ہوگا۔ اور انھوں نے کہانی یوں

شروع کی۔

کوئی بیس بائیس سال ہوئے ایک غریب لڑکا روزگار کی تلاش میں اپنے گاؤں کو خیرباد کہہ کر کچھ دور واقع ایک قصبہ میں آیا۔ شام ہوگئی تھی۔ سردی زور پکڑ رہی تھی۔ نہ کھانے کے لیے کچھ پاس تھا، نہ سردی سے بچاؤ کے لیے اوڑھنا بچھونا۔

اس نے ایک مکان کے دروازے پر دستک دی مکان بھی کسی غریب کا معلوم ہوتا تھا کھڑکیوں پر شیشے نہ تھے ٹاٹ لگا ہوا تھا۔ دیواریں خستہ تھیں۔ ایک عورت نے دروازہ کھولا۔ بن بلائے مہمان کو "خوش آمدید" کہا۔ کمرہ بس ایک ہی تھا جس میں مالک مکان، اس کی بیوی اور تین بچے رہتے تھے۔ ایک ہی چارپائی تھی۔

گھر والوں نے اسے کھانا کھلایا۔ چارپائی سونے کو دی اور خود سب لوگ نیچے فرش پر پڑ رہے۔ صبح ہوئی تو مہمان سے حال احوال پوچھا۔ لڑکے نے بتایا کہ وہ بہت غریب اور نادار ہے اور تلاشِ معاش میں ادھر آیا ہے وہ نہ پڑھا لکھا ہے، نہ کوئی کام یا ہنر جانتا ہے۔

مکان کا مالک اسے اپنے ساتھ جنگل میں لے گیا اور اپنے ساتھ لکڑیاں کاٹنے پر لگایا۔ اس کی لکڑیوں سے جو دام ملتے وہ اسی لڑکے کو دے دیتا۔

جب کچھ دنوں بعد وہ لڑکا اس قابل ہوگیا کہ اپنا خرچ چلا سکے تو اس نے پڑوس میں ایک کمرہ لے لیا دن کو وہ کام کرتا۔ شام کو ایک اسکول میں جا بیٹھتا اور پڑھنا لکھنا سیکھتا۔ ہوتے ہوتے لڑکا عمر کے ساتھ تعلیم میں ترقی کرتا گیا۔ اور وکیل بن گیا۔ وہ اس قصبے کو چھوڑ ایک بڑے شہر میں جا بسا جہاں وکالت کرنے کے زیادہ موقع تھے۔

کل ہی اس وکیل کو ایک خط ملا جس میں اس عورت نے جس نے کبھی اس وکیل کو بڑی محبت سے گھر میں جگہ دی تھی۔ لکھا کہ اس کے چلے جانے کے بعد اس عورت پر بہت بری گزری۔ اس کا شوہر اور دونوں بڑے لڑکے یکے بعد دیگرے اللہ کو پیارے ہوئے۔ وہ مدت سے بیمار پڑی ہے۔ تیسرا لڑکا جواب پندرہ سال کا ہوگیا ہے، مفلسی کی وجہ سے تعلیم نہیں حاصل کرسکا۔ وہ ایک کسان کے یہاں کام کرتا تھا۔ اور اس سے ان دونوں کی بمشکل گذر اوقات ہوتی تھی۔ وہاں کھیتوں میں سے ایک ہٹا کٹا تیس پینتیس سال کا آدمی خواہ مخواہ چھیڑتا اور پریشان کرتا تھا۔ لڑکے اور دوسرے لوگوں کے کہنے پر بھی وہ آدمی اپنی حرکتوں سے باز نہ آتا تھا۔ ایک دن اس کا لڑکا ایک بیل گاڑی میں بھوسا بھر کرلے جا رہا تھا کہ اس آدمی نے اسے روک لیا اور بے حد تنگ کیا۔ طیش میں آکر لڑکے نے ایک ڈنڈا بھرپور ہاتھ سے اس کے سر پر مارا اور وہ آدمی سر پھٹ جانے سے وہیں مرگیا۔

اتنا کہہ کر ابراہیم لنکن نے وہ خط اپنی جیب سے نکالا اور عدالت کی میز پر رکھ دیا۔ لڑکا اور اس کی ماں ابھی تک انھیں نہ پہچان سکے تھے۔ اب وہ حیران اور ششدر رہ گئے۔

ابراہیم لنکن نے عدالت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ میری کہانی ختم ہوئی۔ وہ لڑکا آج قتل کے الزام میں حاضرِ عدالت ہے، اس کی ماں ادھر کونے میں بیٹھی رو رہی ہے۔ وہ وکیل ابراہیم لنکن بھی عدالت میں موجود ہے۔ اس کہانی کے بعد اب مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ یہ لڑکا جسے اس عمر میں اپنا جزدان بغل میں دبا کے اسکول میں جانا چاہیے مفلسی

باقی صفحہ ۔۔۔ پر

جناب فخر رضوی

تتلی رانی
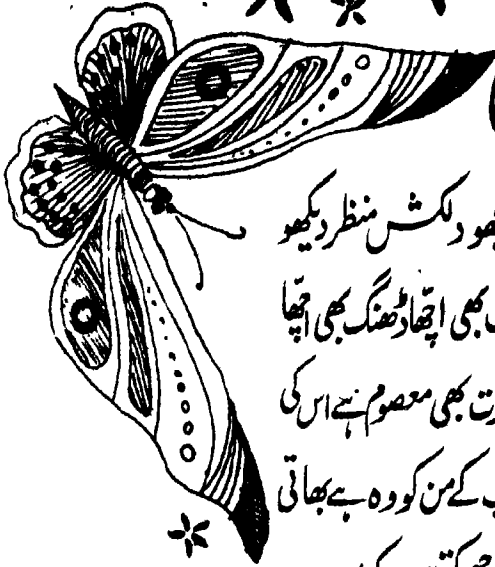
مُنّی دوڑو، ننھی دوڑو — دیکھو دلکش منظر دیکھو
کتنا پیارا رنگ ہے اس کا — رنگ بھی اچھا ڈھنگ بھی اچھا
گلشن گلشن دھوم ہے اس کی — صورت بھی معصوم ہے اس کی
پھول کلی ہیں اس کے ساتھی — سب کے من کو وہ ہے بھاتی
کبھی یہاں ہے کبھی وہاں ہے — پلک جھپکتے ہی وہ کہاں ہے
کہاں سے آتی کہاں ہے جاتی — رات میں کیوں وہ نظر نہ آتی
نظر وہ شب میں آئے بھی کیوں — غیر کے دیس میں جائے بھی کیوں

کیوں کہ وہ ہے دن کی رانی
نام ہے اس کا تتلی رانی

جناب ایم۔این۔خان امروہوی

چیونٹیوں کے شہر میں

کہتے ہیں ہمارا یہ زمانہ سائنسی زمانہ، سائنسی دور ہے۔ ہم اپنی سائنسی ترقی پر بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں آج کے جدید ترین شہر دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن آئیے ہم آپ کو ایک ایسے شہر کی سیر کرائیں جسے دیکھ کر آپ حیران رہ جائیں گے۔

تو بھئی تیار ہیں نا آپ اس عجیب و غریب شہر کی سیر کے لیے۔۔۔۔؟ لیکن اس کے لیے آپ کو ہمارے ساتھ امریکہ تک چلنا ہوگا۔ گھبرائیے نہیں اس کے لیے آپ کو ٹکٹ لینے کی ضرورت نہ ہوگی اور نہ اپنا پیارا گھر چھوڑنا پڑے گا۔ گھر بیٹھے (اس مضمون کے ذریعہ) آپ امریکہ پہنچ جائیں گے اور اس عجیب و غریب شہر کی سیر بھی کر لیں گے۔

دیکھیے ہم جنوبی امریکہ میں ایمیزن کے قریب پہنچ گئے۔ وہ سامنے دریائے ایمیزن دور تک موجیں مارتا، بل کھاتا چلا گیا ہے۔ لیکن اس کے آس پاس تو کہیں کسی عجیب و غریب شہر کے آثار دکھائی نہیں دیتے۔

ہمت نہ ہاریے، ذرا آگے چلیے۔ ارے وہ دیکھیے!

دائیں جانب جو گہرا سا گڑھا ہے۔ ارے دیکھیے یہاں تو بہت سی چیونٹیاں جمع ہیں۔ کچھ آ رہی ہیں، کچھ جا رہی ہیں۔ آنے والیوں کے مُنہ میں درختوں کی پتّیاں اور پھولوں کی پنکھڑیوں کے ٹکڑے دبے ہوئے ہیں۔ یہاں کی تو زمین بھی کچھ بھُربھُری ہے۔ چلیے آگے چلتے ہیں اُس گڑھے کے پاس۔ یہ دیکھیے اس گڑھے کا قُطر تقریباً پچاس فٹ ہے۔ یہی تو اس شہر کا صدر دروازہ ہے۔ چلیے اسی میں چلتے ہیں۔

بس اب ہم شہر میں پہنچ گئے۔ یہ سطحِ زمین سے تقریباً ۲۰ ۲۲ فٹ نیچے ہے اور ایک بڑے دایرے کی شکل میں بسا ہوا ہے لیکن یہاں تو کوئی انسان نظر نہیں آ رہا ہے۔ جدھر دیکھیے چیونٹیاں ہی چیونٹیاں ہیں۔۔۔۔۔ جی ہاں، یہی بات تو عجیب و غریب ہے اس شہر کی جسے دیکھنے ہم امریکہ تک دوڑے چلے آئے۔

ایک خاص قسم کی چیونٹیاں ہیں انھیں 'اٹّا' (ATTA) چیونٹیاں کہتے ہیں۔ یہ بہت ہی زیادہ عقلمند چیونٹیاں ہیں۔ یہ سائنسی ترقی میں بھی کسی سے پیچھے نہیں ہیں یہ چیونٹیاں چھوٹے چھوٹے شہر بنا کر رہتی ہیں۔ ہر شہر

کی آبادی لاکھوں تک جا پہنچتی ہے۔ ان کی حکمراں ایک رانی ہوتی ہے۔ ان کے یہاں ہر کام کے لیے الگ محکمہ ہوتا ہے۔ کھیتی باڑی کا محکمہ الگ، گھر بنانے کا محکمہ الگ، صفائی کا محکمہ الگ، انتظام کا محکمہ الگ، حفاظت کا محکمہ الگ۔

وہ جو ہم نے شہر میں داخل ہوتے وقت بہت سی چیونٹیاں دیکھی تھیں وہ کھیتی باڑی کے محکمے سے تعلق رکھنے والی کاشتکار چیونٹیاں تھیں۔

کھمبی گھاس کا آٹا چیونٹیوں کی من بھاتی غذا ہے۔ یہ چیونٹیاں کھمبی گھاس کی کھیتی کرتی ہیں۔ کاشتکار چیونٹیاں گروہ بنا کر یا ٹولیوں میں بٹ کر اپنے زمین دوز شہر سے نکلتی ہیں۔ کھیتی کے لیے کوئی اچھی سی نرم جگہ تلاش کرتی ہیں۔ اُسے صاف اور ہموار کرتی ہیں پھر اس میں پتیوں اور پنکھڑیوں کے ٹکڑے ڈالے جاتے ہیں جو بعد میں گل کر کھاد بن جاتے ہیں۔ اس کھیت میں کھمبی بو کر یہ چیونٹیاں واپس اپنے شہر کو چلی جاتی ہیں۔

جب فصل پک کر تیار ہو جاتی ہے تو فصل کی کٹائی کا کام شروع ہوتا ہے۔ یہ کام محکمۂ غذا کا ہے جو انتظام کے محکمے کے تحت آتا ہے۔ اس محکمے کی ہزاروں چیونٹیاں صبح ہی صبح کھیت پر پہنچ جاتی ہیں اور فصل کاٹ کر زمین دوز شہر میں پہنچاتی ہیں۔ وہ سامنے بڑے ناریل نما محل کے بائیں جانب جو لمبے لمبے اور چوڑے کمرے دکھائی دے رہے ہیں وہ اناج کے شاہی گودام ہیں۔ ان ہی گوداموں میں ان چیونٹیوں کا کھانا بھرا رہتا ہے۔

چلیے اسی سڑک پر اور آگے بڑھتے ہیں۔ یہ دیکھیے ہم اس بڑے ناریل نما محل کے پاس پہنچ گئے۔ یہ اصل میں چیونٹیوں کی رانی کا محل ہے۔ اس کے نچلے حصے کی طرف نظر ڈالیے جہاں کئی چھوٹے بڑے سوراخ نظر آ رہے ہیں۔ یہ سوراخ محل میں داخل ہونے کے راستے ہیں۔

آپ سوچ رہے ہوں گے اتنے دروازوں کی کیا ضرورت ہے؟ تو سنیے! رانی کے محل کی صفائی کرنے والی مہتر چیونٹیوں کے لیے الگ دروازہ ہے۔ کھانا لے جانے والی خدمت گار چیونٹیوں کے لیے الگ۔ فوجیوں کے لیے الگ۔ انڈوں کی نگرانی اور حفاظت کرنے اور بچوں کی پرورش کرنے والی نرس چیونٹیوں کے داخل ہونے کے لیے الگ دروازہ ہے۔

ارے یہ کمرہ تو بالکل پختہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سیمنٹ سے بنایا گیا ہے۔ اس کی دیواریں دیکھیے کتنی مضبوط اور موٹی ہیں! کم سے کم تین چار انچ تو ہوں گی۔ رانی صاحبہ اسی کمرے میں تو رہتی ہیں۔

یہ رانی عام چیونٹیوں سے ہزار گنا بڑی ہوتی ہے۔ روزانہ ہزاروں انڈے دیتی ہے۔ ان انڈوں کو شاہی محل کی خادمائیں بڑی حفاظت سے رکھتی ہیں جب انڈوں سے بچے نکل آتے ہیں تو ان بچوں کو الگ الگ ٹولیوں میں بانٹ دیا جاتا ہے اور ہر ٹولی کو الگ الگ طرح کے کھانے دیے جاتے ہیں اور الگ الگ کام سکھائے جاتے ہیں۔ کسی ٹولی کو کھیتی باڑی کا کام سکھایا جاتا ہے تو کسی کو لڑائی جھگڑے کا۔ کسی کو انتظام کا سلیقہ سکھایا جاتا ہے تو کسی کو شاہی آداب۔ بڑے ہو کر یہ چیونٹیاں اپنے اپنے کام کی مناسبت سے الگ الگ محکموں میں شامل ہو جاتی ہیں۔ ان میں کچھ چیونٹیاں معمولی مزدور بنتی ہیں تو کچھ افسر بن جاتی ہیں۔

سڑک کے دونوں طرف چھوٹے چھوٹے کمرے نظر آ رہے ہیں نا یہ سب ان چیونٹیوں کے گھر ہیں۔ اس کے بعد والے ذرا بڑے گھر افسروں کے ہیں اور ان کے بعد والے گھر مختلف محکموں میں کام کرنے والی چیونٹیوں کے ہیں۔

صدر دروازے کے پاس دیکھیے کچھ بڑی چیونٹیاں نظر آ رہی ہیں وہ سپاہی چیونٹیاں ہیں۔ جگہ جگہ ان کی چوکیاں ہیں۔

چلیے اب باہر چلیں۔ یہ تو تھا زمین دوز شہر لیکن اگر زمین پتھریلی ہو تب ان بے چاری چیونٹیوں کے لیے زمین دوز شہر بنانا ٹیڑھی کھیر ہے۔ ایسی جگہوں پر بھی ان کی عقلمندی ہی کام آتی ہے۔ یہ مٹی کے چھوٹے چھوٹے ذرّے جمع کرتی ہیں اور ان سے اونچے اونچے ڈھیر بناتی ہیں جو عام طور سے ۲۰۔ ۲۱ فٹ اونچے ہوتے ہیں ان ڈھیروں کے اندر ہی شہر بسائے جاتے ہیں۔ شمالی افریقہ کے گرم پتھریلے علاقوں میں اسی طرح کے چیونٹیوں کے شہر پائے ملتے ہیں۔ کہا جاتا ہے" ایلز بیتھ ویل "کے مقام پر ان چیونٹیوں نے تقریباً ۶۵ فٹ اونچا ڈھیر بنا رکھا ہے جس میں ان کا عظیم الشان ملک آباد ہے۔

لیجیے ہم صدر دروازے پر پھر پہنچ گئے۔ لیکن یہ کیا؟ ہزاروں چیونٹیاں دائیں طرف سے باہر جا رہی ہیں اور ہزاروں چیونٹیاں بائیں طرف سے اندر شہر میں جا رہی ہیں۔ ان کی قطاروں میں کہیں کہیں بڑی چیونٹیاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ ان کا نظم و ضبط تو دیکھیے سب ایک قطار میں چل رہی ہیں۔ کیا مجال جو قطار کہیں بھی ٹوٹی ہو۔ ذرا غور سے دیکھیے۔ اندر آنے والی چیونٹیاں اپنے مُنہ میں کبھی گھاس کے

ٹکڑے دبائے لا رہی ہیں لیکن باہر جانے والی چیونٹیوں کے مُنہ خالی ہیں۔ شاید کسی پکے ہوئے کھیت کی کٹائی ہو رہی ہے۔

چلیے ہم بھی دیکھیں بھلا کہاں کٹ رہا ہے ان کا کھیت! چلیے ان باہر جانے والی چیونٹیوں کا پیچھا کریں اب ہم شہر کے صدر دروازے سے کافی دور آ گئے ہیں لیکن کھیت تو کہیں نظر نہیں آ رہا ہے۔ چیونٹیوں کی قطار دور تک چلی جا رہی ہے۔ خیر ہم بھی ان کا پیچھا کرتے ہیں۔ لیجیے وہ نظر آ گیا کھیت۔ اس درخت کے پاس۔ یہیں تو فصل کٹ رہی ہے۔ کچھ چیونٹیاں کاٹ رہی ہیں کچھ اُسے جمع کر کے چھوٹے چھوٹے ڈھیر بنا رہی ہیں۔ انھیں ڈھیروں میں سے یہ چیونٹیاں گھاس کے ٹکڑے مُنہ میں دبائے شہر کی جانب روانہ ہو جاتی ہیں۔ جس طرح قطار بنا کر آ رہی ہیں اسی طرح قطار میں جا رہی ہیں۔

کیوں نہ ان کا راستہ روک کر ان کی عقل کا امتحان لیا جائے۔ لائیے یہ بڑا پتھر ان کے راستے میں رکھے دیتے ہیں۔ لیجیے جناب سڑک بند ہو گئی، آمد و رفت بھی رُک گئی۔ پتھر کے دونوں طرف بے چاری چیونٹیاں پریشان ہیں۔ وہ دیکھیے بڑی بڑی سب چیونٹیاں پتھر کے پاس جمع ہو گئیں۔ بڑی چیونٹیاں جو دراصل ان کی پولیس کے سپاہی ہیں اپنی مونچھوں سے دائیں اور بائیں طرف کی چیونٹیوں کو چھو رہی ہیں۔ لیجیے انھوں نے شاید پولیس کی بات مان لی۔ سب اپنے مُنہ کی گھاس زمین پر

رکھ کر واپس لوٹ رہی ہیں۔ واپسی میں ہر چیونٹی دوسری
چیونٹی کو اپنے منہ سے چھوتی جا رہی ہے۔ وہ دیکھیے ابھی
تو دو منٹ بھی نہیں ہوئے شہر میں اس حادثے کی خبر
بھی پہنچ گئی۔ پولیس کی ایک بڑی جماعت اسی طرف آ رہی
ہے۔ یہ دیکھیے پولیس کی جماعت اس پتھر کے پاس پہنچ گئی
کچھ پولیس والے پتھر کے چاروں طرف گھومنے کے بعد مزدوروں
کو اپنی مونچھوں کے اشارے سے کچھ حکم دے رہے ہیں۔

اب ان مزدوروں نے پتھر کے کنارے کنارے
کوڑا کرکٹ صاف کر کے نئی سڑک بنانا شروع کر دی۔ شاید
انھیں یہی حکم ملا تھا۔ یہ دیکھیے سڑک بن کر طیار ہو گئی۔ کتنی
محنتی اور عقلمند چیونٹیاں ہیں!

بڑے تعجب کی بات یہ ہے کہ حادثے کی اطلاع
اتنی جلدی شہر تک پہنچ گئی۔ ہم نے صرف انھیں ایک
دوسرے سے مونچھیں ملاتے دیکھا تھا۔ اگر مونچھوں کی لمبائی
اور پتھر سے شہر کا فاصلہ ناپ کر اور ان چیونٹیوں کی تعداد معلوم
کر کے حساب لگایا جائے تب بھی اتنی ذرا سی دیر میں خبر کا
شہر تک پہنچنا ناممکن معلوم ہوتا ہے۔

کچھ لوگوں کے خیال میں سپاہی چیونٹیوں کی سننے
کی قوت بہت ہی زیادہ ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ شہر
سے کافی دور ہونے والے شور و غل کو بھی فوراً سن لیتی ہیں۔
رینجر یونیورسٹی کے ماہر علم الحیوانات ڈاکٹر بی۔ فارسٹ
کہتے ہیں کہ ان کے بدن کے کچھ حصے طرح طرح کی عجیب و
غریب آوازیں پیدا کرتے ہیں۔ مختلف باتوں کے لیے مختلف
قسم کی آوازیں پیدا کی جاتی ہیں۔ ان آوازوں کی مدد سے
حادثے کی اطلاع حادثے کے مقام پر موجود سپاہی شہر کے
سپاہیوں کے لیے نشر کر دیتا ہے
جسے سن کر وہ فوراً نکل پڑتے ہیں۔

چلتے چلتے ایک اور عجیب و غریب بات بھی بتلاتے
چلیں، قدرت نے ان کو ایک بڑی حیرت انگیز خاصیت سے نوازا
ہے۔ ضرورت پڑنے پر یہ ہوا میں گھل جاتی ہیں۔ اگر انھیں قید
کر دیا جائے تو بھی یہ دیواریں پار کر کے اپنے جسم کو پھر اصلی
حالت میں لے آتی ہیں!

جی ہاں، آپ اسے مذاق یا جھوٹ مت سمجھیے۔ یہ
بات سائنسدانوں نے بہت سے تجربوں کے بعد معلوم کی ہے۔
تجربے کے لیے سائنسدانوں نے رانی کا محل توڑ کر رانی پر رنگ
چھڑک دیا تاکہ پہچاننے میں آسانی ہو۔ محل کو شیشے کے
ایک مضبوط خول سے ڈھک دیا گیا۔ اگلے دن جب اس کا
دوبارہ معاینہ کیا گیا تو سائنسداں یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ
شیشے کا خول اپنی جگہ پر موجود ہے لیکن رانی کا کہیں پتہ
نہیں۔ اس جگہ سے تھوڑی دور چیونٹیوں کا ایک نیا شہر نظر
آیا۔ جب اس کے محل کا معاینہ کیا گیا تو دیکھا کہ رنگین رانی
وہاں پر مزے سے بیٹھی ہے۔ سائنسدانوں نے سوچا شاید چیونٹیوں
نے رانی کے محل کو شیشے سمیت سرکا لیا ہوگا یا کوئی چھوٹی سی
سرنگ کھود کر اسے نکال لے گئی ہوں گی لیکن بعض دفعہ تو
شیشے کا خول رکھنے کے چند منٹوں کے اندر ہی اندر رانی غائب
ہو گئی۔ تب سائنسدانوں کو یقین کرنا پڑا کہ یہ چیونٹیاں اپنے جسم
کو بہت ہی ننھے ننھے ذرّوں میں تبدیل کر کے موٹی موٹی دیواروں
کو بھی پار کر سکتی ہیں اور پھر اپنے جسم کو اصلی شکل میں
لا سکتی ہیں۔

عجب خدا کی قدرت ہے! کیا انسان اتنی سائنسی
ترقی کے باوجود بھی سائنس میں ان چیونٹیوں سے پیچھے
نہیں؟ کتنی عجیب و غریب ہیں یہ چیونٹیاں اور ان کا
شہر!

سالِ نو

جناب سیف سہسرامی
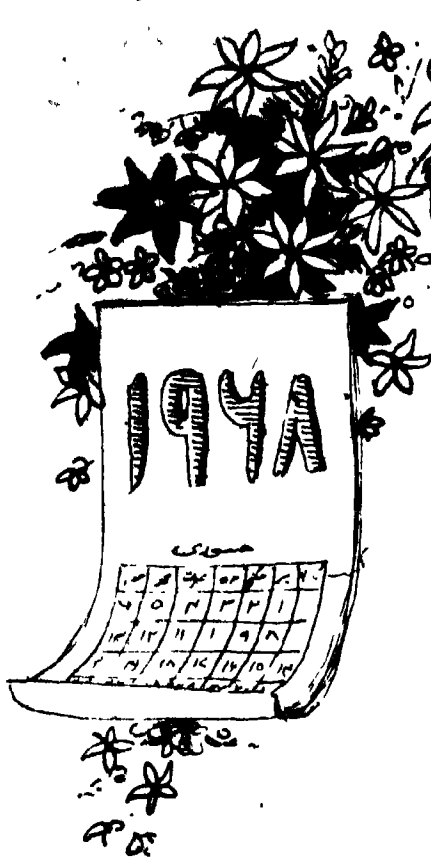
سال نو تیری برکتوں کی قسم
صبح نو جب بھی مسکرائی ہے
ہم نے کرنوں کے پھول چن چن کر
بزم علم و ہنر سجائی ہے

سال نو تیری برکتوں کی قسم
ہم پیامی یہ عہد کرتے ہیں
جس طرح تیرے شوخ جلوں نے
ذرہ ذرّہ کو جگمگایا ہے
غنچہ غنچہ کو تازگی دی ہے
ننھے پھولوں کو گدگدایا ہے
ہم بھی علم و ہنر کی کرنوں سے
ساری دنیا کو جگمگا دیں گے
جس پہ جنت کو رشک آجائے
اپنی دھرتی کو یوں سجادیں گے

مشعل علم لے کے ہاتھوں میں
بڑھتے جائیں گے ہم صدا آگے
جھوم کر ہم تری فضاؤں میں
گاتے جائیں گے پیار کے نغمے

جو بچے سینما دیکھنے کے شوقین ہیں وہ ٹارزن کے عجیب و غریب کارناموں سے واقف ہوں گے۔ کچھ بچے تو ایسے ڈراونے فلمی منظر دیکھنا پسند نہیں کرتے جنھیں دیکھ کر دہشت معلوم ہونے لگے اور کچھ انسان کی بہادری، جواں مردی اور بے جگری کی کہانیاں بڑے شوق سے سنا اور فلم کے پردے پر دیکھنا پسند کرتے ہیں۔

پچھلے زمانے میں دوسری طاقتور مخلوق (دیو جن وغیرہ) سے مقابلہ کرا کے انسان کو اپنی عقل اور جسمانی طاقت کی مدد سے فتح مند بنانے کی غرض سے بہت سی کہانیاں لکھی گئی ہیں اور آج کل طاقتور جنگلی درندوں پر انسان کو فتح دلا کر انھیں زیر کر لینے کی فلمی کہانیاں عام طور سے ٹارزن کے نام سے فلم کے ذریعہ دکھائی جا رہی ہیں۔

آپ سوچتے ہوں گے کہ آخر یہ ٹارزن ہے کیا بلا؟ جس کے نام سے آسمان کو مار باندھا گیا ہے مگر آپ کو موجودہ زمانے کے ہر دل عزیز افسانوی ادب کا ذوق ہے تو آپ نے ضرور پڑھا ہوگا کہ ٹارزن کے نام بے شمار کہانیاں چھپ چکی ہیں اور ان کی عام مقبولیت دنیا کی تمام فرضی اور خیالی کہانیوں سے کہیں زیادہ ہے۔

ان کہانیوں میں یہ بتایا گیا ہے کہ ٹارزن نام کا ایک انگریز بچہ کہیں جنگل میں گم ہو گیا تھا جو بن مانسوں میں پل کر جوان ہوا اور اس نے اپنی بہادری و جواں مردی کے ایسے ایسے کرشمے دکھائے کہ جنگلی دنیا لوہا مان گئی

جس طریقے سے ٹارزن کے کارنامے بتائے جاتے ہیں وہ بظاہر ناممکن معلوم ہوتے ہیں۔ اب تک یہی سمجھا جاتا تھا کہ ٹارزن نام کا کوئی وجود نہیں تھا اور یہ سب من گھڑت کہانیاں ہیں۔ لیکن حال ہی میں جو معلومات ٹارزن کے بارے میں ملی ہے۔ اس سے یہ قیاس ہو چلا ہے کہ ٹارزن کی کہانیاں بالکل جھوٹی نہیں ہیں اور ان کی کچھ نہ کچھ اصلیت ضرور ہے اور جس شخص کو ان کہانیوں کا ہیرو بنایا گیا ہے وہ کسی اونچے طبقے اور اچھے خاندان کا انگریز تھا

کہا جاتا ہے کہ ولیم چارلس نام کا ایک نوجوان انگریز رئیس تھا جس کا جہاز افریقہ کے ایسے ساحل سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا جو گھنے اور بھیانک جنگلوں کے بیچ میں تھا ۱۸۶۸ء سے ۱۸۸۳ء تک لگ بھگ پندرہ سال تک ولیم چارلس جسے ولیم چارلس یلڈن بھی کہتے ہیں جنگلی جانوروں میں گھرا رہا۔ اور اس نے پندرہ سال تک جنگل میں رہ کر جس طرح کی زندگی بسر کی وہ ٹارزن کی کہانیوں سے

ملتی جلتی ہے۔

پندرہ سال تک جنگل کی آوارگی کے بعد وہ لندن واپس آکر رئیسوں کی طرح رہنے بسنے لگا۔ لندن کے ایک مشہور اخبار "لندن ٹائمس" نے ولیم چارلس ملڈن کی جنگلی زندگی پر کئی مضمون لکھے اور اس کی دیکھا دیکھی دوسرے اخباروں نے خوب بڑھا چڑھا کر اس واقعے کو بیان کیا انہی اخباروں کے ذریعے ملڈن کی افریقہ کے جنگلوں کی تعجب میں ڈالنے والی کہانیاں ساری دنیا میں مشہور ہوگئیں۔

اس کے پچاس سال بعد ایک انگریز ادیب "ایڈگر رائیس ورلوز" نے ان کہانیوں کو زیادہ رنگین اور دلچسپ بنا کر بہت سے ناول انگریزی زبان میں لکھ کر چھپوا دیے۔ جس سے ٹارزن کا نام بہت زیادہ شہرت پا گیا کیونکہ ٹارزن کے کارنامے یلڈن کی کہانیوں سے کم و بیش ملتے جلتے تھے۔

اس واقعہ کی اصلیت کا پتہ اس طرح چلا کہ ۱۹۳۶ء میں لارڈ یلڈن کے اکلوتے پوتے کی وفات ہوئی۔ ان کے کوئی اولاد نہیں تھی اس لیے انھوں نے مرنے سے پہلے اپنی جائیداد یتیم خانوں اور خیراتی اسپتالوں کے لیے وقف کر دی لیکن ان کے وصیت نامے میں ایک ضروری شرط یہ تھی کہ بیس سال تک اس وصیت اور ان کی خاندانی دستاویزوں کو چھپا کر رکھا جائے اور کسی پر ظاہر نہ کیا جائے۔

بیس سال بعد جب ان کاغذوں کو عدالت کے سامنے کھولا گیا تو اس میں اسٹریٹ ہم کے چودھویں لال لارڈ ولیم چارلس یلڈن کے ہاتھ کا لکھا ہوا پندرہ سال تک افریقہ کے جنگلوں میں جنگلی جانوروں کے ساتھ زندگی گذارنے کے دلچسپ اور حیرت میں ڈالنے والے واقعات کا بیان تھا جو باریک حرفوں سے پندرہ سو صفحوں پر لکھا گیا تھا جس کی ابتدا ان الفاظ سے شروع ہوتی تھی۔ "میں گیارہ سال کی عمر میں اپنے ماں باپ سے ناراض ہو کر فرار ہو گیا تھا۔ میں نے اپنا اصلی نام بھی بدل دیا اور ہندوستان جانے والے ایک جہاز پر کیبن بوائے کی جگہ نوکری کر لی تھی۔ انگلینڈ سے افریقہ تک ہمارا جہاز بخیر و خوبی چلتا رہا لیکن جب گھانا کی کھاڑی میں پہنچا تو اسے بڑے خوفناک اور شدید طوفان کا سامنا کرنا پڑا۔ آخر بہتر گھنٹے تک طوفانی جھٹکے کھانے کے بعد سارا جہاز تباہ و برباد ہو گیا۔

جب طوفان کا زور کم ہوا تو میں نے خود کو جہاز کے ایک لٹھے پر اکیلا بیٹھا ہوا پایا جو تیزی سے ایک طرف بہتا چلا جا رہا تھا اور تھوڑی دیر بعد کنارے سے جا لگا۔"

اس زمانے کے جہاز رانی محکمے کے کاغذوں کو تلاش کرنے سے ولیم چارلس یلڈن کے بیان کی تصدیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ ۱۸۶۸ء میں لندن سے ہندوستان جانے والا انٹیلا نامی ایک تجارتی جہاز طوفانی زد میں آکر افریقہ کے کسی ساحل سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا تھا۔ اس جہاز پر جانے والے سب لوگ ہلاک ہو گئے تھے۔

جس جگہ گیارہ سال کی عمر کا ملڈن افریقی ساحل پر جہاز کے تختے پر بیٹھا جا پہنچا تھا وہ آج کل "پائن تے نوتہ" کہلاتا ہے۔ جو فرنچ اور افریقہ کا ایک ملا ہوا حصہ ہے ولیم کا بیان ہے کہ ساحل کے کنارے میں گز تک ریت کا ذخیرہ ہے اور بعد میں گھنا جنگل ہے۔ میں بڑی دیر تک ریت پر بے ہوش پڑا رہا جب ہوش آیا تو بہت زیادہ تکان محسوس ہو رہی تھی اور ڈر کے مارے بدن کا رواں رواں کانپنے لگا کہ کہیں اس خوفناک جنگل میں آدم خور شیر۔ درندے یا جانور یا وحشی آدمی حملہ نہ کر دیں اور میں ان کے منہ کا نوالہ بن کر رہ جاؤں

اُدھر بھوک پیاس سے براحال ہو رہا تھا کمزوری کی وجہ سے ایک قدم بھی اٹھانا دشوار تھا۔ مگر مرتا کیا نہ کرتا پیٹ کی آگ تو بجھانی ہی تھی جنگلی پھلوں کی تلاش میں جنگل کے اندر گھس گیا ابھی میں پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا تھوڑی ہی دور چلا ہوں گا کہ گوریلا قسم کے بن مانسوں کی بستی نظر آئی۔ میں اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر ادھر مڑ گیا وہاں پہنچتے ہی ان سب نے مجھے کچھ اس طرح گھور کر دیکھا جیسے اس سے پہلے کسی گورے آدمی کو دیکھا ہی نہ ہو۔ میں ان سے ڈر کر بھاگا نہیں بلکہ پاس جا کر اشارے سے اپنا منہ اور پیٹ بتا کر کھانے پینے کی خواہش ظاہر کی وہ سب آپس میں باتیں کر کے بڑے جوش و خروش سے خوشیاں مناتے رہے۔

اور جب انکا شور و غل کم ہوا تو انھوں نے خود اپنے ہاتھ سے جنگل کے پھل میوے اور جنگلی پیڑ پودے لا کر مجھے کھلاتے۔

ولیم چارلس کو یہ جنگلی غذا ایسی پسند آئی کہ وہ خوب شکم سیر ہو کر کھا گیا اور اتنی زیادہ کھا گیا کہ میری بیماری کا سبب بن گئی۔

جب بن مانسوں کو میری علالت کا اندازہ ہوا تو ایک بن مانس عورت نے مجھے اپنی حفاظت میں لے لیا اور بہت دیر تک اپنی گود میں لیے اِدھر اُدھر ٹہلتی رہی۔

جب میری بیماری جاتی رہی تو بن مانسوں کے گروہ نے مجھے بھی اپنی جماعت میں شامل کر لیا۔

انگلینڈ میں بھی میں اپنے ہم سن بچوں سے چست و چالاک اور طاقت ور تھا اس لیے بن مانسوں کے خاندان میں شامل ہو جانے کے بعد ان کی طرح میں نے بھی ایک اونچے پیڑ پر جھونپڑے جیسا گھر بنا لیا۔

یہاں دو تین میل کے فاصلے پر ایک گاؤں تھا۔ میں ایک رات کو وہاں جا کر کچھ چاقو چھریاں۔ بھالے اور تیر کمان چرا لایا تاکہ ان ہتھیاروں کی مدد سے ضرورت کے وقت اپنی حفاظت کر سکوں۔ اب میں نے جنگلی غذاؤں سے پیٹ بھرنا کم کر دیا اور زیادہ تر سیر و شکار میں مصروف رہنے لگا۔ اس طرح بن مانسوں کے دل پر میرا رُعب بھی بیٹھ گیا تھا۔

میرا روزانہ کا معمول تھا کہ کسی نہ کسی وقت جنگل سے ملے ہوئے سمندری ساحل پر ایک آدھ چکر ضرور لگا لیتا کہ اتفاق سے اگر کوئی جہاز ادھر آ نکلے تو اس میں سوار ہو کر اپنے وطن پہنچ جاؤں اور اس وحشی دنیا سے چھٹکارا مل جائے۔

اسی دوران میں افریقہ کے دوسرے حصے کے وحشی قبیلوں میں لڑائی چھڑ گئی اور مجھے اپنے ساتھیوں کے ساتھ بہت دن تک جنگل میں چھپا رہنا پڑا کہ کہیں وحشیوں سے مقابلہ ہو جانے پر ان کے زہریلے تیروں کا نشانہ نہ بن جائیں۔

بہت دن تک میں اپنے ساتھیوں کے اشاروں پر ناچتا رہا میں نے ان کی زبان سیکھنے کی بہتری کوشش کی مگر پوری طرح کامیاب نہ ہو سکا۔ ٹوٹے پھوٹے الفاظ اور اشاروں سے ان کی باتیں سمجھتا اور اپنی باتیں انھیں سمجھا دیا کرتا تھا۔

اگر کوئی بن مانس بھولے بھٹکے لڑنے والے وحشیوں کے تیر سے زخمی ہو جاتا تو میں اس کے زخموں کو مٹی کی پٹیاں باندھ کر ٹھیک کر دیتا۔ جب میں شکار کا گوشت پکانے، سردی سے بچنے یا جنگلی درندوں سے محفوظ رہنے کے لیے لکڑیاں اکٹھی کر کے آگ جلاتا تو بن مانس میرے اس عمل کو جادو کا کرتب سمجھ کر خوش ہوتے اور کبھی کبھی احسانمندی یا شکر گزاری کے طور پر آگ کے چاروں طرف ناچنے کودنے لگتے۔

تھوڑی محنت اور کوشش سے میں نے خود اپنے ہاتھوں سے تیر کمان بنانے کی مشق کر لی جن سے میں کافی شکار لے آتا۔ اور جنگل میں

رہنے والوں کی طرح خود اپنی حفاظت کر لیتا تھا۔ شکار کی کھال
کے بنائے ہوئے کپڑے اپنے بدن سے لپیٹ کر اور خود ساختہ
ہتھیاروں سے بن سنج کر جنگل جنگل بے خوف و خطر گھومتا پھرتا تھا
مگر جیسے جیسے بڑا ہوتا گیا اس جنگل سے نکل کر مہذب دنیا میں پہنچ
جانے کی خواہش بھی بڑھتی گئی۔ میں نے سنا تھا کہ افریقہ کے کسی علاقے
میں کچھ گورے بھی رہتے ہیں لیکن ان سے جا کر کس طرح ملا جائے
یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ کیونکہ اتنی دور جانے سے
وحشیوں کے جنگل میں پڑ جانے کا اندیشہ تھا۔ چھ برس تک اسی
ادھیڑ بن میں رہا مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ اب میں اپنے ہم جنس کی
صورت دیکھنے کو ترس رہا تھا اور انسانی دنیا سے دور تنہائی
کی زندگی بری طرح اکھرنے لگی تھی۔

ایک دن اچانک انسانی صورت کی زیارت ہوئی۔ ہوا
یہ کہ میں پڑوسی گاؤں میں چوری کے ارادے سے گیا تھا وہاں
مجھے حبشیوں نے گھیر لیا۔ لیکن امید کے خلاف طرح طرح کے پھل
اور میوے کھلائے اور پانچ دن تک مہمان رکھنے کے بعد بہت
سے پھل دے کر رخصت کیا۔

وہاں سے واپس آکر ایک مہینے اپنے پرانے ساتھیوں
کے ساتھ رہا اور پھر اسی گاؤں میں جا کر حبشیوں کے ساتھ رہنے
لگا۔ اور پورے پانچ سال تک وہیں رہا۔

ان پانچ برسوں میں پانچ حبشنوں سے شادی
کرنا پڑی جس حبشن کی شادی ہو جانے کے بعد ایک سال تک
اولاد نہیں ہوتی اسے حبشی اپنے بھالوں سے چھید کر ہلاک کر دیتے ہیں

اس زمانے میں بن مانسوں کے ساتھ بھی میرا ملنا جلنا
ہوتا رہا کبھی تو میں خود ان کی بستی میں جا کر مل آتا اور کبھی وہ خود
حبشیوں کی سرحد تک آکر بلا لیتے اور مجھ سے باتیں کر جاتے۔

جب حبشیوں کو میرے اور
بن مانسوں کی دوستی کا پتہ چلا تو وہ
بہت خوش ہوئے اور انھوں نے اسی دن سے بن مانسوں کا شکار
کرنا بند کر دیا کیوں کہ ان کی نظر میں ایک انسان کا بن مانسوں
سے میل جول عجیب اور بڑا کرشمہ تھا۔

آخر جب مجھے افریقہ کے جنگلوں میں رہتے ہوئے بارہ
سال ہو گئے اور میری عمر ۲۳ سال کی ہو گئی تو حبشیوں کے کچھ
فرقوں میں دوبارہ لڑائی چھڑ گئی۔ میں نے اپنے گاؤں والے حبشیوں
کا ساتھ دیا۔ اور اپنی عملی تدبیروں سے دشمنوں پر فتح پائی اور حبشیوں
کو مخالف جماعت پر چھاپا مار کر خود حفاظتی کے طریقے بھی سکھائے
اب حبشی مجھ سے بہت مانوس ہو گئے تھے اور ڈرنے
بھی لگے تھے مگر میرا دل یہاں سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ ایک مرتبہ
جب میں حبشیوں کے ساتھ دشمنوں کو کھدیڑتا ہوا اپنے گاؤں
سے ڈھائی میل دور نکل گیا تو ان کی آنکھ بچا کر جنگل میں چھپ گیا
اور ان کا ساتھ چھوڑ کر کسی ہم جنس کی تلاش میں دوسری طرف
نکل گیا۔

ابھی زیادہ دور نہیں جا سکا تھا کہ لوتو گالا نام کے
جنگلی قبیلے نے گھیر لیا۔ اتفاق سے ان لوگوں کی بولی حبشیوں
سے ملتی جلتی تھی اور جسے میں تھوڑا بہت استعمال کر کے کام
نکال لیا کرتا تھا۔

یہ لوگ حبشیوں سے زیادہ مہربان نکلے انھوں نے
مجھے اپنے گروہ میں شامل کر لیا اور اپنی ذات کی دو نوجوان خوب
صورت لڑکیوں سے میری شادی کر دی ۱۸۶۸ء تک میں انھی
لوگوں کے ساتھ رہتا بستا رہا۔ مجھے معلوم ہوا کہ اس مقام سے
جہاں ہم مقیم تھے سو میل کے فاصلے پر چاری ندی کے کنارے
گوروں کی آبادی ہے اس لیے ایک رات اپنے بیوی بچوں کو چھوڑ
کر اس آبادی کی تلاش میں نکل پڑا۔ بائیس دن کی ان تھک
کوشش اور رات دن سفر کرنے کے بعد
آخر خدا نے میری محنت ٹھکانے

لگایا اور میں اس گوری آبادی میں پہنچنے میں کامیاب ہو گیا
یہ انگریزوں کے بجائے فرانسیسوں کی بستی تھی۔ اور وہ لوگ
انگریزی زبان بالکل نہیں جانتے تھے ادھر میں خود پندرہ
سال تک جنگلی لوگوں میں رہ کر اپنی زبان میں صفائی کے ساتھ
باتیں کرنا بھول گیا تھا۔ اور میرا روپ رنگ بھی بدل کر گورے
کی جگہ بھورا ہو گیا تھا۔ اس لیے فرانسیسوں کو بڑی مشکل سے اپنی
بپتا سنا سکا اور وہ بھی ادھوری۔ کیونکہ میری باتیں وہ اچھی طرح
سمجھ نہیں پاتے تھے۔

انھوں نے سوڈان میں رہنے والے انگریز افسروں
سے میرے متعلق خبریں پہنچائیں اور اس طرح تین فرانسیسیوں
کے ساتھ رہتے گزر گئے۔ آخر کار جس سال سوڈانیوں اور انگریزوں
میں بہت بڑی لڑائی ہوئی میں بمشکل تمام اپنے وطن لندن واپس
پہنچ پایا۔ اور اپنا خاندانی اعزاز دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب
ہو سکا۔

کچھ دنوں بعد عیش و عشرت کی زندگی نے جنگلی زندگی
کو خواب و خیال بنا دیا اور اس کے خیال سے بھی دہشت ہونے
لگی۔"

یہ ہے اس دلچسپ داستان کا مختصر حصہ جسے خود
لارڈ یلڈن نے قلم بند کیا ہے۔ اسکی لندن واپسی کے بعد ہی
اخباروں میں چرچے ہونے لگے تھے۔ مگر اس کے اعزاز و اکرام
نے اس کا اصلی نام ظاہر نہیں ہونے دیا تھا اور ان واقعات کو
ٹارزن کے فرضی نام سے نسبت دے کر کہانیاں بنائی گئیں۔
لندن میں آکر اپنا پہلا اعزاز و وقار حاصل کرنے کے بعد لارڈ
یلڈن نے ایک اوسط گھرانے کی خوبصورت نوجوان لڑکی سے
شادی کر لی تھی ۱۸۸۹ء میں ان کا لڑکا ایڈون چارج پیدا ہوا
اور ۱۹۱۹ء میں اس کی وفات ہوئی
لارڈ یلڈن کے پوتے نے کبھی شادی
بیاہ نہیں کیا اور ۱۹۳۵ء میں مرتے وقت جو وصیت کی تھی۔
اسے بیس سال بعد ۱۹۵۵ء میں کھولنے پر لارڈ یلڈن کا راز کھل سکا۔

یہ راز زیادہ عرصے تک شاید اس لیے ظاہر نہیں کیا
گیا کہ کہیں حبشیوں کی اولاد سے کوئی لارڈ یلڈن کی جائیداد پر
اپنا حق نہ جتانے لگے فرانسیسی افسروں نے ۱۸۸۵ء میں لارڈ
یلڈن کا اپنے پاس آنا ڈائیری میں بتایا ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے
کہ یلڈن نے ۱۵ سال جس حبشی علاقے میں گزارے وہاں کی
نسل کا رنگ گورا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ لارڈ یلڈن کی انگریزیت
کا اثر ہو۔

بقیہ دیوبند

باہر کی جانب ہے اگر آپ چاہیں تو مدرسے میں اطلاع دے
کر یہاں ٹھہر سکتے ہیں اوپر صحن میں گملوں میں لگے ہوئے
خوشنما پودے آپ کا استقبال کریں گے۔ بستر پنکھا فرش
میز کرسی چارپائی ہر قسم کا آرام ملے گا۔

دارالافتا :- یہ عمارت مسجد سے ملی ہوئی ہے
یہاں سے ہر سال ساری دنیا میں لاکھوں فتوے (دینی
مسائل کے جواب) بھیجے جاتے ہیں۔ یہاں برابر علما کام
میں لگے رہتے ہیں اور زبانی یا خطوط سے پوچھے جانیوالے
مسئلوں کا جواب کتابوں سے تلاش کرکے لکھتے رہتے ہیں۔

ایک چیز دارالعلوم میں بڑی قیمتی اور نایاب ہے
جو ترکی نے تحفے کے طور پر مدرسے کو دی تھی۔ ترکی میں حضور
صلی اللہ علیہ وسلم کا کرتا محفوظ ہے۔ ہر سال وہ غلاف جس
میں یہ کرتا رکھا ہے بدلا جاتا ہے اور یہ غلاف کسی جگہ بھیج دیا
جاتا ہے۔ دارالعلوم کو یہ غلاف بدلے میں ملا ہے۔ ہزاروں
افراد یہاں آکر اس کی زیارت کرتے ہیں۔ کبھی تم دارالعلوم
تو عمارتوں کے علاوہ اس کی زیارت بھی کرنا اسکی برکت کا
تمھیں خود اندازہ ہوگا۔

ظلمتیں صاف کہہ رہی ہیں آج
رہ نہیں سکتا اب ہمارا راج
دیکھو کروٹ بدل رہا ہے سماج

ہم زمانہ بدلنے والے ہیں
بن کے سورج نکلنے والے ہیں

دیپ جلتے ہیں ٹمٹماتے ہیں
لَو بھڑکتی ہے تھرتھراتے ہیں
موت کا گیت گنگناتے ہیں

ان کی فطرت بدلنے والے ہیں
بن کے سورج نکلنے والے ہیں

ناگ جیسی سیاہ راتوں میں
رہ سکے گا نہ کوئی گھاتوں میں
آ سکے گا نہ کوئی باتوں میں

روشنی ہم اگلنے والے ہیں
بن کے سورج نکلنے والے ہیں

نفرتوں کی نفاق کی دیوی
چل سکے گی نہ بات اب تیری
خوب کھیلی ہے خون سے ہولی

وار اب تجھ پہ چلنے والے ہیں
بن کے سورج نکلنے والے ہیں

جشنِ ہستی منائے گی دُنیا
امن کا گیت گائے گی دُنیا
جنگ کو خوں رُلائے گی دُنیا

رُخ عالم بدلنے والے ہیں
بن کے سورج نکلنے والے ہیں

آؤ کچھ اس کا اہتمام کریں
خیر مقدم کا انتظام کریں
اس کے آثار کو سلام کریں

شمعِ مرلے کے جلنے والے ہیں
بن کے سورج نکلنے والے ہیں
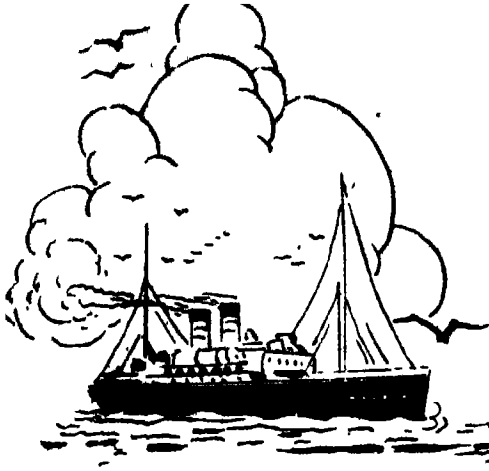
جناب ابوالکلام

دہلی سے نیویارک

آخری قسط

اگست ۶۷ء کے بعد اس دلچسپ مضمون کا سلسلہ قائم نہ رہ سکا تھا۔ ابوالکلام صاحب اپنی غیر معمولی مصروفیت اور بیماری کے سبب اسے مکمل نہ کر سکے تھے۔ مصروفیت تو اب بھی بہت ہے مگر ہمارے اصرار پر تھوڑا بہت وقت نکال کر مضمون مکمل کر ہی لیا۔ یہ اس مضمون کی آخری قسط ہے اور غیر معمولی طور پر دلچسپ۔

اگست کے پرچے میں ابوالکلام صاحب کا جہاز نہر سوئز میں تھا اور جوں کی چال چل رہا تھا۔ اب آگے آپ خود پڑھیے۔

ایڈیٹر

آج سولہ جون ہے۔ دن کے بارہ بجے جہاز کے کپتان نے ہمیں بتایا کہ دن کے دو بجے ہمارا جہاز پورٹ سعید سے روانہ ہو جائے گا۔ ہم سب لوگ چلنے کی تیاری میں مصروف ہو گئے اور انتظار کرنے لگے کہ جہاز کب چلتا ہے۔ انتظار کی گھڑیاں قریب تر ہوتی گئیں۔ اور ہم نے دیکھا کہ جہاز کے افسر بڑی تیزی سے ادھر اُدھر آجا رہے ہیں۔ کچھ لوگ جہاز کے اگلے سرے پر کھڑے ہیں۔

غور سے دیکھا تو کپتان صاحب بھی وہاں موجود ہیں۔ دو بج چکے لیکن جہاز چلنے کا نام نہیں لیتا۔ ۲ سے ۲½ ہوئے ۲½ سے تین بجے لیکن جہاز جہاں کھڑا تھا وہیں کھڑا ہے۔ اب ہم کچھ پریشان سے ہوئے کہ اللہ ماجرہ کیا ہے جہاز کیوں نہیں چلتا۔ جہاز کے افسروں کے چہرے پر کچھ زیادہ سنجیدگی نظر آنے لگی۔ ہر افسر کچھ پریشان سا دکھائی دیتا۔

اتنے میں ہم نے دیکھا کہ جہاز کا انجینئر ادھر آ رہا ہے خاں صاحب سے نہ رہا گیا پوچھ ہی بیٹھے۔ انجینئر صاحب بات کیا ہے جہاز کیوں نہیں چلتا۔ انجینئر صاحب شریف آدمی تھے۔ نرمی سے بولے۔ بھائی کیا بتائیں جہاز کے دونوں لنگر آپس میں اسطرح الجھ گئے ہیں کہ سلجھتے ہی نہیں۔ ہم سب اس کوشش میں ہیں کہ اس مصیبت سے نجات ملے تو چلیں۔

اب ہم سمجھ گئے کہ معاملہ کیا ہے۔ ہم سب دوست آپس میں باتیں کرنے لگے۔ کہ اگر خدانخواستہ یہ سلجھے ہی نہیں تو کیا ہوگا۔

ہم اس مسئلہ پر بحث کر ہی رہے تھے کہ دو غوطہ خور غوطہ خوری کا لباس پہنے جہاز پر آئے اور جہاز کے اگلے سرے کی طرف جانے لگے تھوڑی دیر میں وہ دونوں جہاز کے اگلے سرے کے دونوں طرف رسّوں کے ذریعے پانی میں اترنے لگے۔ ہمارا بہت دل چاہا کہ ہم نزدیک جاکر دیکھیں کہ غوطہ خور کیا کریں گے۔ لیکن وہاں جانا ممکن نہ تھا۔ وہاں سب افسر موجود تھے اور چونکہ مسئلہ نازک تھا اس لیے ہم نے وہاں جانے کی کوشش ترک کر دی۔

کوئی آدھا گھنٹے بعد وہ غوطہ خور پانی سے باہر نکل آئے۔ اور ہماری طرف ہوتے ہوئے جہاز سے اتر کر پورٹ سعید کی طرف روانہ ہوگئے۔ بعد میں دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ انھوں نے پانی میں اتر کر لنگروں کو سلجھانے کی بہت کوشش کی لیکن جب وہ اپنے اس ارادے میں ناکامیاب رہے تو انھوں نے گیس کی ٹورچ سے لنگروں کی زنجیریں کاٹ کر لنگروں کو الگ کرلیا اور اس طرح اس مشکل کو حل کیا۔

لنگروں کے سلجھتے ہی جہاز کے تمام افسروں کے چہروں پر جو ہوائیاں اڑ رہی تھیں وہ ایک دم غائب ہوگئیں اور سب لوگ پھر خوش خوش نظر آنے لگے۔ تھوڑی ہی دیر میں جہاز نے بھونپو بجایا اور جہاز پورٹ سعید سے چل دیا۔ ہم نے گھڑی دیکھی تو اس وقت شام کے چھ بجے تھے یعنی ہمارا جہاز ۱۲ گھنٹے لیٹ ہوگیا۔ جہاز کے چلتے ہی جہاز کی زندگی معمول پر آگئی۔ وہی چہل پہل وہی خوش گپیاں۔ وہی ہنسی مذاق۔

پورٹ سعید سے باہر نکل آنے کے بعد چند گھنٹوں میں ہم بحر روم Mediterranean Sea میں داخل ہوجائیں گے اس سمندر میں داخل ہوتے ہی ہمارے دائیں ہاتھ کی طرف ترکی۔ اٹلی اور بعد میں اسپین کے ملک آئیں گے۔

بائیں ہاتھ کی طرف جو ممالک آئیں گے ان میں لیبیا اور الجیریا وغیرہ کے ملک ہوں گے۔ پورٹ سعید سے لیکر جبرالٹر تک کی کھائی تک ہیں۔ بحر روم میں چلنا ہوگا اس کا فاصلہ لگ بھگ ۲۲۶۰ میل ہے اور ہمیں اس فاصلہ کو طے کرنے میں تقریباً ۱۱۳ گھنٹے لگیں گے۔ یہ تو شاید آپ جانتے ہی ہوں کہ بحر روم کی آب و ہوا کس چیز کے لیے مشہور ہے ؟ اگر نہ جانتے ہوں تو ہم بتائے دیتے ہیں۔ اس آب و ہوا میں پھلوں میووں کی اچھی کاشت ہوتی ہے۔ اسی لیے بحر روم کا علاقہ پھلوں اور میووں کے لیے بہت مشہور ہے۔

ہمیں بتایا گیا کہ ہمارا جہاز آبنائے جبرالٹر کو ۲۸ جون کے قریب پار کرلے گا یعنی ۲۲۶۰ میل کا فاصلہ ہم ۶ دن میں طے کریں گے۔ ابھی تک ہم جس علاقہ سے گزر رہے ہیں اس علاقہ میں ہم نے شدید گرمی محسوس کی ہے۔ لیکن بحر روم میں داخل ہوتے ہی ایسا لگتا ہے جیسے آب و ہوا بالکل ہی بدل گئی ہے۔

یوں سمجھو کہ اس علاقہ کا موسم ہندوستان میں دہلی کے اکتوبر۔ نومبر کے مہینوں کے موسم سے ملتا جلتا ہے۔ نہ بہت گرمی نہ بہت سردی ہاں صبح کے وقت اور رات کے وقت ذرا خنکی محسوس ہوتی ہے۔ اور جی چاہتا ہے کہ سوئٹر وغیرہ پہن لیں۔ لیکن ہم نے ابھی تک کسی گرم کپڑے کا استعمال نہیں کیا ہے۔ ہاں رات کو بہت دیر تک جہاز کے ڈیک پر تفریح نہیں کرسکتے۔ اپنے اپنے کیبن میں اندھیرا ہوتے ہی داخل ہو جانا پڑتا ہے۔

بحر روم میں ہمیں بہت سے جہاز آتے جاتے ملے ان جہازوں میں مال ڈھونے والے جہاز بھی تھے سواری کے جہاز بھی تھے۔ مگر زیادہ تعداد سواری کے جہازوں کی تھی۔ سامنے سے آنے والے جہازوں میں ولایت اور امریکہ سے آنے والے جہاز

شامل تھے۔

آج کل دن بھر کھیل کا شغل رہتا ہے۔ کپتان صاحب اور انجینئر صاحب کی ٹیم سے ہماری ٹیم کا خوب مقابلہ رہتا ہے اور ہم سب مل کر اس بات کی پوری کوشش کرتے ہیں کہ ہماری ٹیم کی فتح ہو۔ فتح اکثر ہماری ہوتی ہے۔ یہ بات دوسری ٹیم کو ناگوار گزرتی ہے۔

بحرِ روم کے سفر کے یہ ۳ دن کیسے گزر گئے ہمیں محسوس بھی نہ ہوا۔ ہنستے کھیلتے اتنی جلدی بیتے جیسے ہم کل پورٹ سعید سے چلے ہوں۔ ابھی ابھی کپتان صاحب نے بتایا ہے کہ ہمارا جہاز آبنائے جبرالٹر سے آج ۲۲ جون کو قریب ۱۱ بجے دن گزرے گا۔

اس وقت دن کے ۱۰ بجے ہیں لیکن ابھی سے ہماری آنکھیں جبرالٹر کو دیکھنے کے لیے مشتاق ہیں۔ پہاڑ کا اونچا حصہ بہت دھندلا دھندلا سا ہمیں نظر آ رہا ہے۔ لیکن جوں جوں ہمارا جہاز اس سے قریب ہوتا جائیگا یہ پہاڑ اور نمایاں ہوتا جائے گا۔ اس وقت جہاز کے اکثر لوگ ڈیک پر چڑھ آئے ہیں یہ سب جبرالٹر کی طرف نظریں جمائے ہیں۔ ۱۱ بجے کے قریب ہمیں پہاڑ بالکل صاف نظر آنے لگا۔ لیکن باوجود پوری کوشش کے اسپین کی سرزمین کا کوئی حصہ نہیں دکھائی دیا ہمارے دریافت کرنے پر لوگوں نے بتایا کہ یہ آبنائے تقریباً ۲۵-۳۰ میل چوڑی ہے ظاہر ہے دوسرا کنارہ ہمیں کیسے نظر آتا۔ اگر زمین گول نہ ہوتی تو شاید ہم اس کی زمین کو دیکھ سکتے۔ لیجیے صاحب آدھ گھنٹے کے اندر اندر آبنائے جبرالٹر کو بھی ہم پار کر لیں گے۔ جبرالٹر کو دیکھنے کے بعد ہمیں یہ شعر یاد آنے لگا۔

بہت شور سنتے تھے ہاتھی کی دم کا
وہاں جاکے دیکھا تو رسّا بندھا تھا

جس چیز کو دیکھنے کا اتنا شدید انتظار تھا۔ وہ صرف ایک سوکھا پہاڑ تھا نہ اس پر کوئی درخت اور نہ کوئی خاص عمارت۔ عمارتیں ہونگی بھی تو ہمیں کیسے نظر آتیں۔ ہم پہاڑ سے قریب ۲ میل دور سے گزر رہے تھے۔

آبنائے جبرالٹر کے شمال میں اسپین کا ملک ہے اور جنوب میں جبرالٹر پہاڑ۔ یہ پہاڑ کیا ہے بس ایک چٹان سمجھو۔ تقریباً ¾ ۲ میل لمبی ہے اور ¾ میل چوڑی۔ اس کی اونچائی سمندری سطح سے ۱۴۰۸ فٹ ہے یہ چٹان چونے کے پتھر LIME stone کی بنی ہوئی ہے۔ سنہ ۱۷۰۴ء سے یہ انگریزوں کے قبضے میں ہے۔

آبنائے جبرالٹر بحرِ روم کو بحرِ اقیانوس سے ملاتی ہے۔ جبرالٹر ایک آزاد بندرگاہ بھی ہے یعنی بغیر محصول کے سامان درآمد اور برآمد کیا جاتا ہے۔ جہاز پر ایک صاحب نے ہمیں بتایا کہ پہاڑ پر پینے کے پانی کی بہت کمی ہے۔ اس لیے شبنم کا پانی جمع کیا جاتا ہے اور وہ پینے کے استعمال میں آتا ہے۔ جبرالٹر کی بندرگاہ کو جہاز کوئلہ لینے کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔ انگریزوں نے اسے فوجی بیڑہ بھی بنا رکھا ہے۔ کہتے ہیں دوسری عالمی جنگ کے دوران آبنائے جبرالٹر کے نیچے سمندر کے اندر ادھر سے ادھر جانے کے لیے سرنگیں Tunnels بھی بنائی گئی تھیں۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد اسپین جبرالٹر پر اپنی ملکیت کا دعویٰ بھی کیا تھا لیکن انگریزوں نے اسے تسلیم نہیں کیا۔

نقشے میں دیکھنے سے آپ کو معلوم ہوگا کہ جبرالٹر کا پہاڑ فوجی اعتبار سے کتنی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ سمجھیے اگر انگریز اپنے دل میں یہ ٹھان لیں کہ وہ آبنائے جبرالٹر سے کسی جہاز کو گزرنے نہ دیں گے تو اسپین کے جنوبی حصہ کو۔ اٹلی کو، ترکی کو

الجیریا کو۔ لائبریا کو۔ مصر کو اور یوں کہیے کہ ان تمام ملکوں کو جو آبنائے جبرالٹر کے مشرق میں واقع ہیں، سمندری راستے سے جہازوں کے ذریعہ کوئی سامان نہیں پہنچ سکتا۔ نیز مسافروں کی آمد و رفت بھی بند ہو سکتی ہے۔ گویا آبنائے جبرالٹر ایک سمندری دروازہ ہے جس کی چابی یعنی جبرالٹر انگریزوں کے قبضہ میں ہے۔ جب چاہیں یہ دروازہ کھولیں جب چاہیں اسے بند کریں اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ جبرالٹر کی اہمیت بھی نہر سوئز سے کم نہیں ہے۔

آبنائے جبرالٹر سے گزرتے ہی ہمارا جہاز بحر اقیانوس میں داخل ہو گیا۔ یہاں سے سیدھا ہمارا جہاز امریکہ کے بندرگاہ بوسٹن جائے گا۔ جبرالٹر سے بوسٹن کا فاصلہ ۲۸۰ میل ہے اگر حالات ٹھیک رہے تو یہ سفر ۱۱ گھنٹوں میں طے ہو جائے گا۔ امید ہے کہ ۲۶ یا ۲۷ جون کو ہم بوسٹن پہنچ سکیں گے

آبنائے جبرالٹر سے نکلتے ہی ہمارا جہاز ناک کی سیدھ میں بوسٹن کے لیے چل پڑا۔ یہ پورا سفر ہمیں شمالی بحر اقیانوس میں طے کرنا ہوگا، اگر ہم یہاں سے لندن جانا چاہیں تو لندن کا سفر یہاں سے بمشکل ۲ دن کا ہوگا لیکن لندن کو ہم شمال میں چھوڑتے جا رہے ہیں۔

جوں جوں ہم آگے بڑھ رہے ہیں سردی زیادہ محسوس ہونے لگی ہے اب ہم سے بھی نہ رہا گیا۔ گرم کپڑے نکال لیے۔

جیسے ہی ہم بحر اقیانوس میں داخل ہوئے کہرے کی سی کیفیت محسوس ہو رہی ہے موسم صاف نہیں ہے۔ رات میں تو یہ کہرا بہت زیادہ ہو جاتا ہے۔ کل رات تو اتنا کہرا تھا کہ اگر دو گز پر کوئی چیز ہو تو وہ بھی مشکل سے نظر آتی تھی۔

جب جہازوں کو ایسے موسمی حالات سے گزرنا پڑتا ہے تو جہاز اپنے بھونپو برابر بجاتے رہتے ہیں۔ تاکہ سامنے سے آنے والے جہاز سے ٹکر نہ ہو جائے۔ اب دن کو جب بھونپو بج رہے ہیں تو نہ جانے رات کو کیا صورت ہوگی۔ معلوم ہوتا ہے ساری رات بھونپو ہی بھونپو ہر طرف بجتے رہیں گے۔ اللہ خیر کرے بڑی مشکل سے بحر عرب کی طوفانی حالت سے نکل کر آئے تھے پھر یہ دوسری مصیبت کہاں سے نازل ہو گئی۔

جبرالٹر سے چلے ہمیں دوسرا دن ہے یعنی آج کی رات بارہ بجے کے بعد ۲۴ جون کی رات ہوگی۔ یہ دو دن کا سفر کس مشکل سے گزرا ہے خدا جانتا ہے۔ جدھر دیکھو کہرا ہی کہرا، چاروں طرف کہرا اپنے اپنے کیبن میں بند ہیں۔ کریں تو کیا کریں۔ دن بھر گپ شپ لگاتے رہے۔ رات آئی تو کہرا کا منظر دیکھنے ڈیک پر گئے۔ کچھ نہ پوچھیے عجیب بھیانک سماں تھا۔ ہر طرف کہرا اور اس کہرے میں بھونپو کی آوازیں۔ اللہ کی پناہ۔ ہم جیسے جواں مرد کا دل بھی بھونپو کی آواز سے دہل جاتا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم اپنے کیبن میں لوٹ آئے اور کمبل اوڑھ کر لیٹ رہے۔ نیند کسے آتی بس خان برادرس سے گپ شپ ہوتی رہی۔ لیکن موضوع گفتگو صرف کہرا تھا۔ قریب ۱۲ بجے کے ہم سب سو گئے۔ اور سب کی آنکھیں لگ گئیں۔ بھونپو برابر بج رہا تھا۔

مشکل سے ایک دو گھنٹے گزرے ہوں گے کہ جہاز اس زور سے دھماکے کے ساتھ ڈگمگایا کہ ہم سب اپنے اپنے برتھ سے فرش پر آ گرے۔ کوئی نیچے تھا تو کوئی اوپر۔ گرتے ہی خان برادرس اس طرح چلائے کہ الاماں "ارے کیا ہو گیا۔ خدا خیر کرے۔ جلدی پہنو لائف جیکٹس بھاگو" یہ سنتے ہی سب نے لائف جیکٹس پہنے اور پہنتے ہی اس زور سے سب کیبن سے باہر نکل کر لائف بوٹوں (Life Boats) کی طرف ڈیک پر بھاگے کہ اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے۔ ڈیک پر

ہم سے پہلے جہاز کے افسر خود پہنچ چکے تھے اور وہ کسی دوسرے جہاز کے افسر سے بحث و مباحثہ کر رہے تھے۔ ایک کہتا تھا تمہاری غلطی سے جہاز ٹکرایا۔ دوسرا کہتا تھا نہیں تمہاری غلطی سے۔ ہم نے صرف یہ دیکھا کہ ہمارے جہاز سے قریب ۲۰ گز پر ایک دوسرا جہاز کھڑا تھا اور اس کی روشنیاں صرف مدھم مدھم سی نظر آ رہی تھیں۔ صرف آوازیں صاف سنائی دیتی تھیں لیکن آدمی نظر نہیں آ رہے تھے یہ تو تو، میں میں کا سلسلہ قریب ۵ امنٹ تک رہا اس کے بعد دونوں جہاز پھر اپنے اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔

دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ہمارے جہاز کا صرف رفتار ناپنے کا آلہ (Speeds matre) ٹوٹ گیا تھا۔ لیکن دوسرے جہاز کا زیادہ نقصان ہوا تھا۔ دوسرا جہاز لندن سے ہندوستان جا رہا تھا اور اس پر ریل کے انجن لدے ہوئے تھے۔ اس حادثہ کے بعد رات بھر ہمیں نیند نہیں آئی، خان برادرس نے کیبن میں پہنچتے ہی دو رکعت نماز شکرانہ ادا کی۔ رات بھر یہی چرچا رہا کہ اللہ میاں نے کس طرح ہم سب کی جانیں بچائیں۔ اگر یہ ٹکر ذرا اور شدید ہو جاتی تو جہاز کے ساتھ ساتھ ہم سب لوگ بحر اقیانوس میں اس طرح دفن ہو جاتے کہ بقول غالب

نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

صبح جب ہوئی تو دیکھا کہرا کچھ کم ہو چلا تھا لیکن پھر بھی فضا صاف نہ تھی پچھلی رات کو جہازوں کی ٹکر نے ہمارے دلوں میں جو دہشت پیدا کر دی تھی وہ ابھی باقی تھی۔ ساتھیوں کے دل سہمے ہوئے تھے لیکن ہمیں یقین تھا کہ جوں جوں وقت گزرے گا موسم صاف ہوتا جائے گا یہ دہشت کم ہوتی جائے گی اور ہوا بھی ایسا ہی۔ دن کے دو بجے کے قریب مطلع بالکل صاف تھا۔ کہرا چھٹ گیا تھا۔ اور دھوپ نکل آئی تھی۔

لیکن میرے دل میں ایک کسک باقی تھی۔ مجھے یہ جاننے کی خواہش تھی کہ اس خاص جگہ پر اتنا کہرا ہوتا کیوں ہے۔ ڈیک پر جب کپتان صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں نے ان سے یہ سوال پوچھ ہی ڈالا۔ وہ فرمانے لگے۔ شمالی بحر اقیانوس میں انگلش چینل (English Channel) کی طرف سے جنوب کی جانب کولڈ کرنٹ (Cold Currents) یا ٹھنڈے پانی کا بہاؤ ہوتا ہے اور جنوبی بحر اقیانوس کی جانب سے گلف اسٹریم (Gluf Stream) کے ذریعہ وارم کرنٹ (Warm Currents) یعنی گرم پانی کا بہاؤ شمال کی جانب ہوتا ہے جس علاقہ میں کہرا تھا یہ وہ علاقہ ہے جہاں ٹھنڈے پانی کا بہاؤ گرم پانی کے بہاؤ سے آکر ملتا ہے۔ لہذا ٹھنڈے پانی کے بہاؤ کے اوپر کے علاقہ کی ہوا جو سرد ہوتی ہے جب گرم پانی کے بہاؤ کے اوپر کے علاقہ کی ہوا سے گرم ہوتی ہے، جب ملتی ہے تو کہرا پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ حالت اس سمندری علاقہ میں سال بھر ایسی ہی رہتی ہے۔ اس لیے یہ علاقہ جہاز رانی کے لیے بڑا مخدوش قرار دیا گیا ہے۔ آئے دن یہاں ایسے ہی واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ اور کبھی کبھی کافی جانی اور مالی نقصان کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک جہاز اس مخدوش علاقہ میں رہتا ہے قانوناً اسے برابر بھونپو بجانا پڑتا ہے۔ تاکہ خدانخواستہ جہاز آپس میں کہیں ٹکرا نہ جائیں۔ جب کہرے کی وجہ معلوم ہو گئی تو دل کو ذرا تسلی ہو گئی۔ اور جان کر بھی اطمینان ہوا کہ اب امریکہ تک موسم بالکل صاف ملے گا۔

جوں جوں ہمارا جہاز امریکہ سے نزدیک ہوتا جا رہا ہے موسم میں بھی کافی

تبدیلی محسوس ہو رہی ہے۔ کڑاکے کی سردی کا جو عالم پچھلے دنوں رہا تھا خاص طور سے اس علاقہ میں جہاں کہر اتھا۔ وہ اب بالکل نہیں ہے بس گلابی جاڑے جیسا موسم ہے۔ موسم بڑا ہی خوشگوار ہے۔ دھوپ میں اتنی تپش نہیں ہے۔ ہمارا زیادہ وقت ڈیک پر گزر رہا ہے اور ہمیں یقین دلا دیا گیا ہے ۲۶ جون کو سویرے کوئی ۸ بجے کے قریب ہم امریکہ کی بندر گاہ بوسٹن پہنچ جائیں گے۔

آج ۲۵ جون ہے سویرے ہی سے ہر شخص چاہے مسافر ہو یا جہاز کا افسر خوش خوش نظر آتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہم کل سویرے امریکہ پہنچ جائیں گے، امریکہ جس کو دیکھنے کی آرزو سے دل بے چین ہے اور جب سے اس جہاز پر سوار ہوئے ہیں امریکہ کے خیال کے سوا کوئی دوسرا خیال ذہن میں آتا ہی نہیں۔

آج میں نے بھی اپنے سامان کا جائزہ لیا ہے۔ اور اسے ترتیب سے اپنے بکسوں میں جما دیا ہے۔ خیال یہ ہے کہ کل سویرے کسے اتنی فرصت ملے گی کہ تسلی سے سب کام انجام دیا جا سکے۔

ابھی تک ہم اس جہاز کو اپنا گھر سمجھتے رہے ہیں۔ لیکن کل اس گھر کو خالی کرنا ہوگا اور شاید زندگی میں پھر اس جہاز میں قدم نہ رکھ سکیں گے۔ آج دن بھر ہم جہاز کی ہر چیز کو اس طرح دیکھتے رہے جیسے کسی ہمسفر کو سفر کے ختم پر جدا ہوتے ہوئے خدا حافظ کہتے ہیں۔

اس سفر میں جہاں مسافر ساتھیوں سے دوستی ہو گئی ہے وہاں جہاز کے افسروں اور ملازموں سے بھی اس قسم کے تعلقات ہو گئے ہیں جیسے یہ لوگ برسوں سے ہمارے ساتھ رہتے چلے آئے ہوں۔ میرے دل میں آیا کہ کیوں نہ اس تصویر کو جو میں نے سفر کے دوران میں جہاز پر بنائی ہے کپتان کو بطور ایک حقیر تحفہ کے پیش کروں۔

دل میں بات آئی تھی کہ میں بے چین ہو گیا۔ اور اس موقع کی تلاش میں رہا کہ یہ تصویر کب پیش کی جائے۔ جب میں نے دیکھا کہ کپتان صاحب اپنے دفتر میں موجود ہیں تو میں تصویر لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ انھوں نے میرے اس تحفہ کو بہت خندہ پیشانی سے قبول کیا۔ اور میرے اس فعل کو بہت پسند کیا۔ تصویر کی پشت پر میں نے سفر کی تاریخ اپنا نام اور پتہ بھی لکھ دیا تھا۔ تاکہ انھیں یاد رہے کہ یہ تصویر کب اور کس نے انھیں دی تھی۔ ان سے جدا ہوتے وقت کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے اپنے کسی بزرگ سے جدا ہو رہے ہیں۔ اور یہ واقعہ ہے کہ اس سفر کے دوران کپتان صاحب نے ہمارے تمام ساتھیوں کے ساتھ ایسا سلوک کیا تھا جیسے کوئی باپ اپنے بیٹوں کے ساتھ کرتا ہے۔

آج ۲۶ جون ہے اور سویرے کے ۴ بجے ہیں۔ ہم سب ساتھی بہت سویرے اٹھ بیٹھے ہیں اور ہر ایک اپنی جگہ خوش نظر آ رہا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ہر ایک کو اپنی منزل مقصود ملنے والی ہے۔ آج سب نے اپنے اچھے اچھے کپڑے نکالے ہیں۔ تاکہ امریکہ والے کہیں یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ ہندوستان کے باسی کپڑا پہننا بھی نہیں جانتے۔

صبح ۶ بجے تک ہم سب نے اپنا سامان پیک کر ڈالا اور جوں ہی سورج نکلا ہم سب جہاز کے ڈیک پر چڑھ گئے تاکہ امریکہ کی سرزمین کو دیکھ سکیں۔ امریکہ کی سرزمین کیا ہوگی عید کا چاند ہوگی۔ نظریں گاڑے ہوئے ہیں کہ زمین نظر آ جائے۔ میری آنکھیں کمزور ہیں۔ ان سے عید کے چاند کو دیکھنے میں بھی

دشواری ہوتی ہے بھلا امریکہ کی سرزمین میں کیسے دیکھ پاتا ساتھیوں کے ساتھ کھڑا ہوں اور ساتھی ہیں کہ نگاہیں گاڑے کھڑے ہیں۔

ٹھیک ۷:۲۰ پر زمین کا کچھ حصہ خان برادرس کو نظر آگیا۔ پھر کیا تھا۔ امریکہ زندہ باد کا وہ زوروں سے نعرہ لگایا کہ جہاز کا سارا ڈیک گونج اٹھا۔ ہم سب ساتھی ایک دوسرے سے بغلگیر ہوئے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم ایک دوسرے سے عید مل رہے ہیں۔ دھیرے دھیرے امریکہ کی سرزمین جو دھندلی دھندلی سی نظر آنے لگی تھی، صاف ہوتی چلی گئی۔ ایسا معلوم ہونے لگا جیسے بوسٹن ایک اچھا خاصا بڑا شہر ہے۔ شہر کے خد و خال اب بالکل صاف نظر آنے لگے۔ جہاں امریکہ پہنچ جانے کی خوشی تھی وہاں اب یہ غم بھی تھا کہ میرے ساتھی مسافر اب بوسٹن پہنچتے ہی مجھ سے جدا ہو جائیں گے اور یہ تعلقات جو اس سفر کے دوران آپس میں قائم ہوئے تھے وہ ختم ہو جائیں گے۔ لیکن دل یہ کہتا ہے یہ گمان صحیح نہیں ہے۔

لیجیے بوسٹن کا بندرگاہ آگیا۔ جہاز بندرگاہ سے دور رک گیا۔ ڈاکٹر، اور پائلٹ اور امگریشن آفیسر کا انتظار ہے۔ ان کے آتے ہی جہاز بندرگاہ میں داخل ہو جائے گا۔ اور پھر ہم سب باری باری جہاز سے زمین پر اتر آئیں گے تو اب یہ سمجھیے صاحب ہم امریکہ پہنچ گئے۔ اللہ میاں کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس نے اس سفر کو بخیر و خوبی انجام دے دیا۔ لیکن زمین پر اترتے ہی دل نے یہ محسوس کیا کہ جو مزہ منزل مقصود کے حاصل کرنے کے انتظار میں آتا ہے وہ مزہ منزل مقصود کے مل جانے میں نہیں۔ اب یہ دعا کرو کہ ہم اپنی تعلیم جلد ختم کر کے تم لوگوں میں آملیں۔ اچھا خدا حافظ والسلام

معلوم ہونے لگے۔ اب معاملہ بس سے باہر ہو چکا تھا۔ امی سے مدد مانگے بغیر چارہ نہ تھا۔ دونوں چپکے چپکے شور کرنے لگے۔

ان کی یہ بھاگ دوڑ دیکھ کر اور غسل خانے میں سہمی سہمی آوازیں باتیں سن کر امی سمجھ گئیں کہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔ وہ اٹھیں اور غسل خانے میں آموجود ہوئیں۔ دیکھا ایک گال دبائے سی سی کر رہی ہے دوسرا قمیص کے دامن سے انگلی دبائے پریشان کھڑا ہے۔ قمیص کے دامن پر خون کے دھبے ہیں۔ گھبرائیں۔ بولیں، "یہ تم لوگ اسکول کا کام کرنے بیٹھے تھے یا لڑائی پر گئے تھے۔"

اصل حقیقت معلوم ہوئی تو دونوں پر خوب ڈانٹ پڑی۔ "اپنی چیزوں کو سنبھال کر نہیں رکھتے اور گڑبڑ کرتے پھرتے ہیں۔"

پھر امی نے سلیم کی انگلی پر دوا لگائی۔ پٹی باندھی اور بڑی مشکل سے سلمہ کے دانتوں میں سے لکڑی کا ٹکڑا نکالا۔ ابا کو معلوم ہوا تو وہ بھی ناراض ہوئے۔ انھوں نے کہا: ہر کام کو کرنے کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔ صحیح طریقہ غلط طریقے سے کام کرنے سے کام بھی خراب ہوتا ہے اور نقصان بھی ہوتا ہے۔

انتظار

جناب عادل جعفری

آٹھ بجنے کو ہیں اب ڈاکیہ آتا ہوگا — آج محبوب رسالہ مرا لاتا ہوگا

یوں تو ہیں اور رسالے بھی جدید اور قدیم — میں بہت شوق سے پڑھتا ہوں "پیامِ تعلیم"

کتنے ہی اچھے مضامین، کہانی قصّے — اتنے دلچسپ کہ ہوں یاد زبانی خود سے

نظمیں ایسی کہ پڑھی جائیں سنانے کے لیے — دل مچل جائیں جنھیں جھوم کے گانے کے لیے

اس دفعہ تو وہ بڑی شان سے نکلا ہوگا — خاص نمبر جسے کہتے ہیں وہ پرچہ ہوگا

مُسکراتی ہوئی تقدیر لیے آئے گا — صدرِ جمہور کی تصویر لیے آئے گا

جو کمالات ہیں ان میں وہ دکھائے گا ہمیں — ان کے بچپن کے بھی حالات بتائے گا ہمیں

آگیا! آگیا وہ ڈاکیہ! دوڑیں جلدی — خط الگ رکھ کے رسالے ذرا کھولیں تو سہی

یہ ہے "شب خون" یہ "افکار" یہ ہے "صبحِ نو" — فارسی کا یہ رسالہ ہے "سخن" یہ "بانو"

یہ "مسرت" ہے یہ "بچپن" یہ "کہانی" امّی — آج بھی پھر گیا اُمیّد پہ پانی امّی

آئیں ابّا تو کہوں اُن سے یہ بعد از تسلیم
ڈاکیہ آج بھی لایا نہ "پیامِ تعلیم"

انتظار کے بعد

جناب عادل جعفری

آگیا، آگیا امی وہ ہمارا پرچہ   جان و دل سے بھی زیادہ ہے جو پیارا پرچہ

پوچھیے اس سے کہاں راہ میں ستاتا تھا   ہر مہینے میں تو پہلی ہی کو آجاتا تھا

کیوں نہ ہوتی اسے آنے میں طوالت امی   اس دفعہ بڑھ گئی ہے اس کی جسامت امی

دیکھیے صدر کی تحریر بھی تصویر بھی ہے   خواب بھی ساتھ ہے اور خواب کی تعبیر بھی ہے

ننھے ہونٹوں پہ یہ تھوڑی سی ہنسی ہے امی   اُن کے بچپن کی بھی تصویر چھپی ہے امی

اس زمانے میں بھی چہرے سے ذہانت تھی عیاں   علم کے ساتھ عمل کرنے کی ہمت تھی جواں

صاف ظاہر تھا بڑے ہو کے نمایاں ہوں گے   پیارے بھارت کے لیے فخر کا ساماں ہوں گے

حسنِ تدبیر کو تقدیر نے انعام دیے   اُن کے ہاتھوں نے بڑے ہو کے بڑے کام کیے

جامعہ ملیہ کے تھے یہ سہارا امی   انہی ہاتھوں نے علی گڑھ کو سنوارا امی

دامنِ چاک کے یہ ہاتھ رفوگر بھی رہے   نائبِ صدر سے پہلے یہ گورنر بھی رہے

ملک کے درد کی یہ ہاتھ دوا کرتے ہیں   اب فرائض یہ صدارت کے ادا کرتے ہیں

چاہتے ہوں جو یہ کرنا وہ سرانجام کریں   یہ دعا ہے کہ ابھی اور بڑے کام کریں

ملک سے دور جہالت کا اندھیرا ہو جائے
ہر طرف علم کا پُر نور سویرا ہو جائے

ب رشید وحیدی

دار العلوم دیوبند

یہ جو دہلی ہے دہلی۔ ہندوستان کی راجدھانی بھارت کا دل، ارے بھائی وہی دہلی جہاں سے تمہارا پیام تعلیم نکلتا ہے۔ تو بس اسی دہلی سے شمال کی طرف سفر کرو تو غازی آباد، میرٹھ، مظفر نگر ہوتے ہوئے سہارن پور جا پہنچو گے، اسی لائن پر ایک چھوٹا سا اسٹیشن دیوبند کا آتا ہے۔ دیوبند کوئی بہت بڑا قصبہ نہیں ہے۔ بہت چھوٹا بھی نہیں۔ ہاں پہلے معمولی سا قصبہ تھا۔ گاؤں سے کچھ بڑا۔

ایک بار اس گاؤں نما قصبے میں ایک بزرگ سید احمد شہید گزرے تو فرمانے لگے "اس جگہ تو مجھے علم کی بو آتی"۔ اور وہ بو دار العلوم کی صورت میں سامنے آگئی۔

تمہیں شاید معلوم ہو کہ ۱۸۵۷ء میں ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف ایک عام لڑائی ہوئی تھی۔ اس لڑائی میں سارے ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی شریک تھے۔ جب اس لڑائی کا طوفان تھما تو سارے ہندوستانی بھائیوں کا بہت نقصان ہو چکا تھا۔ دولت اور حکومت گئی تو گئی، ہماری تعلیم ہماری تہذیب پر بھی اثر پڑنے لگا تھا۔ اب انگریز حاکم تھے اور ہمارے آقا تھے۔ وہ اپنی تہذیب کو بھی ہمارے اوپر مسلط کرنا چاہتے تھے اور کر رہے تھے۔

تب ہمارے بزرگوں میں سرسید نے مولانا قاسم صاحب نانوتوی نے اور ایک اور بزرگ حاجی امداد اللہ صاحب نے سوچا کہ ہندوستانیوں کو صحیح علم دینا چاہیے۔ اخلاق و شرافت کی دولت دینی چاہیے تاکہ وہ انگریزوں سے کسی طرح کم نہ رہیں۔ اور ان میں کمتری کا احساس پیدا نہ ہونے پائے اسی دیوبند میں ایک بزرگ صوفی حاجی عابد صاحب رہتے تھے۔ انھوں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر ایک مکتب قائم کیا۔ ایک چھوٹی سی مسجد میں (جسکو چھتے کی مسجد کہتے ہیں) ایک انار کے درخت کے نیچے بسم اللہ ہوگئی وہ مسجد اور وہ انار کا درخت آج بھی دیوبند میں موجود ہے۔

دیوبند میں ایک صاحب تھے جن کا نام محمود تھا انہوں نے ایک بچے کو (اتفاق سے اس کا نام بھی محمود ہی تھا) پڑھانا شروع کر دیا — لیجیے دار العلوم کی جو آج ایشیا

کی سب سے بڑی دینی یونیورسٹی ہے یوں بنیاد پڑ گئی۔

بعد میں وہ بچہ محمود محمود الحسن اور پھر شیخ الہند مولانا محمود الحسن بن کر سارے عالم میں مشہور ہوا۔ یہ وہی شیخ الہند تھے جنہوں نے علی گڑھ میں ہماری جامعہ ملیہ قائم کی تھی پھر عابد صاحب تو خدا کی یاد میں لگ گئے مگر ان کے اس لگائے ہوئے چمن کو اُن کے ایک ساتھی مولانا محمد قاسم صاحب نے پروان چڑھانا شروع کیا اور اپنے علم خلوص اور لگن سے آسمان تک پہنچا دیا۔

اس کے بعد حضرت مولانا قاسم صاحب کے ایک دوسرے ساتھی مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے دارالعلوم کی طرف توجہ فرمائی۔ یہ بہت بڑے عالم تھے بہت بڑے صوفی تھے انہوں نے دارالعلوم کو حدیث و فقہ قرآن و تفسیر کا خزانہ دیا۔ اور اب دارالعلوم سارے ہندوستان میں مشہور ہونے لگا دُور دُور سے طلباء آآکر داخلہ لینے لگے۔

دارالعلوم میں ان بزرگوں نے حدیث و قرآن کی تعلیم کے ساتھ طالب علموں کی صحیح تربیت کا بھی انتظام کیا۔ ایسی فضا ایسا ماحول پیدا کیا کہ طالب علم اسلامی سیرت اور سادگی کے ساتھ زندگی بسر کریں۔ دارالعلوم کے استادوں نے یہ بھی طالب علموں کے دلوں میں ڈال دیا تھا کہ انگریز ہمارا سخت دشمن ہے ہمیں تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنے ملک کو انگریزوں سے چھڑانے کے لئے ہر قسم کی لڑائی لڑنا ہوگی۔

دارالعلوم کے سب سے بڑے شیخ حاجی امداد اللہ اور انکے دو شاگرد مولانا قاسم صاحب اور مولانا رشید احمد صاحب پھر ان کے بعد حضرت شیخ الہند اور انکے شاگرد مولانا حسین احمد مدنی اور دوسرے بزرگوں نے اپنے ملک کی خدمت میں قیدیں کاٹیں گرفتار ہوئے۔ میدانِ جنگ میں لڑائی کی دشمنوں کو مارا۔ اس طرح دارالعلوم ایک چھاؤنی بھی بنی رہی جہاں سے ہندوستان کے جانباز سپاہی ملک کی خدمت کے لیے برابر نکلتے رہے۔

جس طرح ملک کی دوسری یونیورسٹیوں سے بڑے بڑے لوگ پیدا ہوئے۔ دارالعلوم سے بھی ہمارے ملک کے نہایت عظیم انسانوں نے جنم لیا۔ یہی نہیں دارالعلوم سے پڑھ کر نکلنے والوں میں۔ جاوا، سماٹرا، برما، سیلون افریقہ، مصر، عرب، ٹیونس، مراکش، الجزائر ادھر آسام، بنگال، پشاور، سندھ، بلوچستان، افغان، ایران غرض ساری دنیا کے لوگ شامل ہیں۔

آج بھی تم دنیا کے کسی حصے میں جاؤ دارالعلوم کے پڑھے ہوئے لوگ ضرور ملیں گے۔ جو اپنی اپنی جگہ علم و دین کی خدمت کر رہے ہیں۔

دین اور مذہب کی خدمت کے علاوہ دارالعلوم سے پڑھ کر نکلے ہوئے لوگوں میں بڑے بڑے سیاسی لیڈر، مصنف، ادیب، ماہر تعلیم اور ہر قسم کے لوگ ملیں گے۔ جن کو دارالعلوم نے اپنے سایہ میں رکھ کر علم و حکمت کا خزانہ بخشا ہے۔

دارالعلوم کا انتظام

دارالعلوم میں شروع ہی سے مفت تعلیم کا انتظام ہے۔ بورڈنگ میں رہنے والے بہت سے طلباء سے تعلیم، کتابوں، رہنے کے کمرے، بجلی، سردی میں گرم پانی، طبی مدد، کھانا، کپڑا کسی چیز کے پیسے نہیں لیے جاتے۔

دارالعلوم میں عربی، فارسی، اردو، ہندی، انگریزی حساب وغیرہ کے علاوہ طب، خوشخطی، چمڑے کا کام، جلد سازی، کپڑے سلائی، قرآن، تدریس وغیرہ بھی

سکھایا جاتا ہے۔

دارالعلوم کی عمارت پرانے بادشاہوں کے محلوں کی طرح بڑی شاندار ہے اور بہت دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ ایک بہت بڑے احاطے میں مدرسے کا چمن ہے۔ گرمی میں آپ جائیں تو اسی چمن میں گھاس کے فرش پر جگہ جگہ چٹائیاں اور بستر بچھاتے ہوئے لالٹینیں جلائے ہوئے دارالعلوم کے لڑکے آپ کو پڑھتے ہوئے ملیں گے۔ رات کو دو تین بجے تک پڑھائی ہوتی ہے۔

دارالعلوم کے لڑکے اپنے استادوں کا بڑا ادب کرتے ہیں اگر ان کے سامنے چھوٹے سے چھوٹا بڑے سے بڑا کوئی استاد آجائے یہ لوگ ادب سے کھڑے ہو جاتے ہیں

ایک بڑی شاندار مسجد مدرسے کے بیچ میں ہے اور سارے مدرسے میں ہر مسجد کی اذان کی آواز سنائی دیتی ہے۔ کیونکہ اذان لاؤڈ اسپیکر پر ہوتی ہے۔ اذان سنتے ہی ہر طالب علم اپنے اپنے کمروں سے نکل کر مسجد کی طرف چل پڑتا ہے اور اتنی بڑی مسجد پوری طرح بھر جاتی ہے۔

ایک بہت بڑا مطبخ ہے اس میں لڑکوں کا کھانا پکتا ہے اور ٹھیک وقت پر ہزار ڈیڑھ ہزار لڑکوں کو تقسیم کیا جاتا ہے۔

یہاں تعلیم میز کرسی پر نہیں ہوتی تمام درجوں میں ٹاٹ کا فرش ہے اسی پر بیٹھ کر لڑکے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ہاں کتابوں کے لیے اونچی اونچی تپائیاں ہوتی ہیں. تاکہ کتاب کی بے ادبی نہ ہو۔

جمعہ کے دن صبح ہی سے ہر لڑکا جمعہ کی نماز کے لیے تیاری کرنے لگتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہر جگہ نل پر کپڑے دھوتے ہوئے آپ کو طلبا ملیں گے۔ کچھ لڑکے جمعہ کو خود ہی کھانے پکاتے کا پروگرام بناتے ہیں اور اس طرح چھٹی کا یہ دن بہت مسرتوں میں گذرتا ہے۔

دارالعلوم کو حکومت سے کوئی مدد نہیں ملتی سارے ہندوستان کے مسلمان چندہ دیکر اس کا خرچ چلاتے ہیں تم میں سے بہت سے بچے ایسے ہونگے جن کے والدین دار العلوم کو چندہ دیتے ہوں گے۔ دارالعلوم کی طرف سے دس پندرہ ملازم سارے سال پورے ملک میں گھومتے رہتے ہیں وہ جگہ جگہ تقریریں کرتے ہیں اور مدرسے کے لیے پیسہ جمع کرکے لاتے ہیں۔

یہاں امتحان سال میں تین بار ہوتے ہیں۔ سہ ماہی۔ ششماہی اور سالانہ۔ سالانہ امتحان شعبان یعنی رمضان سے ایک مہینہ پہلے ہو جاتا ہے۔ اور پھر ایک ماہ رمضان کی چھٹی ہو جاتی ہے اور لڑکے اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں۔ جو لڑکے ہندوستان سے باہر ملکوں کے ہوتے ہیں وہ مدرسے ہی میں ٹھہرتے ہیں۔ رمضان میں ان کے کھانے پینے کا سارا انتظام مدرسے کی طرف سے ہوتا ہے۔

دارالعلوم کی سند یا ڈگری کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جامعہ ملیہ۔ جامعہ ازہر مصر، مدینہ یونیورسٹی، مدینہ منورہ نے منظور کر لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں سے فارغ ہو کر لڑکے ان جگہوں میں سے کسی جگہ بھی جا کر تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔ دارالعلوم کے پڑھے ہوئے لوگوں کی تعداد ۱۲۸۳ھ سے لیکر ۱۳۸۲ھ تک سو سال کے قریب یہ رہی ہے۔

ہندوستان میں —— تین ہزار سات سو چھیانوے

پاکستان میں —— تین ہزار ایک سو اکیانوے

افغانستان میں —— ایک سو نو

روس اور سائبیریا میں —— ستر

چین —— چوالیس
برما —— ایک سو چوالیس
ملائیشیا —— اٹھائیس
انڈونیشیا —— ایک
عراق —— دو
کویت —— دو
ایران —— گیارہ
سیلون —— دو
جنوبی افریقہ —— چودہ
سعودی عرب —— دو
شام —— ایک
یمن —— ایک

اب آؤ دارالعلوم کی بعض عمارتوں کی سیر کریں

اس مختصر سے مضمون میں چند ہی عمارتوں کا حال لکھا جا سکتا ہے کبھی دیوبند آنا ہو تو —— دارالعلوم ضرور جانا۔ سب سے پہلے نودرہ کی عمارت دکھائیں۔ نودرہ دارالعلوم کی سب سے پرانی عمارت ہے۔ اس کے بارے میں مشہور ہے کہ چند بزرگوں کے درمیان یہ بحث چل رہی تھی کہ دارالعلوم کی عمارت کہاں سے شروع کی جائے۔ یہ مسئلہ طے نہیں ہوا رات کو مولانا قاسم صاحب نے خواب دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لکڑی سے زمین پر ایک جگہ لکیر کھینچ کر فرمایا "یہاں سے عمارت شروع ہونی چاہیے"۔ صبح کو بزرگوں نے دیکھا کہ اسی جگہ لکیر کا نشان ہے جہاں آج نودرہ کی عمارت ہے ایک بڑا سا دالان جس کے نو بڑے بڑے در ہیں اسی لیے اس کو نودرہ کہتے ہیں۔ اب اس میں طلبا رسائل پڑھتے ہیں اور مطالعہ کرتے ہیں۔

دارالحدیث:- یہ ایک نہایت بڑے ہال کی صورت میں بنا ہے۔ اس میں حدیث کا سبق پڑھایا جاتا ہے اس کے چاروں طرف خوبصورت جالی لگی ہوئی ہے بہت سے دروازے ہیں۔ ہال میں بہت ترتیب سے بجلی کے قمقمے اور پنکھے لگے ہوئے ہیں۔ دارالعلوم کا بڑا جلسہ اسی ہال میں ہوتا ہے۔ اس میں ہزاروں آدمی آرام سے بیٹھ سکتے ہیں۔

کتب خانہ:- یہ کتب خانہ بہت بڑا ہے جس میں ہر قسم کی اردو، فارسی، عربی، انگریزی، ہندی کی کم سے کم ایک لاکھ کتابیں ہیں۔ یہاں سے دارالعلوم کے طلباء کو مفت کتابیں دی جاتی ہیں۔ جسے وہ پڑھ کر جاتے ہوئے واپس کر دیتے ہیں پھر دوسرے سال وہ نئے لڑکوں کے کام آتی ہیں۔ یہ کتب خانہ بھی بہت شاندار عمارت میں ہے۔ جالی دار کواڑ ہیں۔ چاروں طرف خوبصورت گیلریاں ہیں۔ اندر بڑی بڑی الماریوں میں کتابیں سلیقے سے رکھی ہوئی ہیں۔ کتابیں نہایت آسانی سے مل جاتی ہیں۔ بہت سے ملازم ہر وقت خدمت کے لیے حاضر رہتے ہیں۔

مسجد:- نہایت خوشنما پتھر کے پھولوں سے سجی ہوئی دو منزلہ مسجد اپنی شان دکھلا رہی ہے۔ اس میں ایک حوض ہے۔ حوض کے چاروں طرف نل لگے ہیں جن میں سردیوں میں گرم پانی کا انتظام رہتا ہے۔ امام نیچے رہتا ہے مگر ایسا انتظام ہے کہ اوپر کی منزل میں نماز پڑھنے والوں کو برابر آواز جاتی ہے۔

مہمان خانہ:- نہایت خوبصورت عمارت ہے ہر قسم کے آرام و آسائش کا انتظام، نئے انداز کی یہ تعمیر مدرسے سے

باقی صفحہ ۱۲۹ پر

جناب کیف احمد صدیقی

اردو کی کہانی اردو کی زبانی

میں سارے ہند کی ہوں مادری زباں بچو
جو سن سکو تو کہوں اپنی داستاں بچو

وہ لوگ آج مرے قتل پر ہیں آمادہ
کہ جن کو میں نے سنائی تھیں لوریاں بچو

میں دشمنوں کی نگاہوں میں آج مجرم ہوں
کبھی میں خود ہی عدالت کی تھی زباں بچو

وطن میں رہ کے بھی رہتی ہوں بے وطن کی طرح
میں اجنبی سی ہوں اپنوں کے درمیاں بچو

دیارِ ہند میں میرا کوئی مقام نہیں
مگر میں دہر کی ہوں تیسری زباں بچو

مجھے یہ خوف ہے دورِ جنوں کے دیوانے
اڑا نہ دیں مرے دامن کی دھجیاں بچو

یہ دور میری حفاظت نہ کر سکا لیکن
کسی طرح نہ مٹے گا مرا نشاں بچو

مجھے یقین ہے اک روز نوجواں ہو کر
تمہیں بنو گے کبھی میرے پاسباں بچو

جناب خالد عرفان

بوتل میں چمن اور جن

میں نے پچھلے سالنامے میں آپ سے کہا تھا کہ میرے بتائے ہوئے تجربوں میں کبھی کبھی آپ کو اپنے ماسٹر صاحب یا اپنے ابا جی سے بھی مدد لینی ہوگی۔ آج میں آپ کو دو ایک دلچسپ تجربے اور بتا رہا ہوں جن کے لیے دو چار چیزیں یا تو آپ کو خریدنی پڑیں گی یا سائنس کے ماسٹر صاحب آپ کی مدد کریں گے اور ہاں بھئی ذرا دیکھیں آپ کتنے ہوشیار کاریگر ہیں۔

آج کے تجربوں کی ایک خصوصیت اور ہے۔ آپ کی بنائی ہوئی چیزیں محفوظ بھی کی جا سکیں گی۔

ہر دن مدرسے میں پانچ چھ گھنٹے گزارنے کے بعد آپ کا ذہن تھک جاتا ہوگا ـــــ ہے نا! پھر سے تر و تازہ بننے کے لیے بھلا آپ کیا کرتے ہیں؟ گھر آتے ہیں، منہ ہاتھ دھوتے ہیں، ناشتہ کرتے ہیں، چائے یا دودھ پیتے ہیں اور پھر ـــــ یا تو کھیل کے میدان کی طرف چلے جاتے ہیں یا کسی پارک یا باغ کی طرف سیر سپاٹے، ہوا خوری کے لیے نکل جاتے ہیں۔

اگر میں اسی طرح کا ایک چمن آپ کے اپنے ڈرائنگ روم (بیٹھنے کے کمرے) میں لگوا دوں تو بھلا کیسا رہے؟

تب کیا آپ یہیں رہ جائیں گے؟ نہیں بھئی یہ ٹھیک نہیں۔ سیر و تفریح کے لیے رنگین پھولوں کے علاوہ تازہ اور پاک و صاف ہوا بھی نہایت ضروری ہے۔ آپ سیر کے لیے باقاعدہ جایا کریں اور اس چمن سے اپنے کمرے کی زینت اور رونق بڑھائیے۔

میں جس چمن کا ذکر کر رہا ہوں اس کو آپ کیمیائی چمن کہہ لیجیے۔ یہ ہے بھی کیمیائی اشیاء کا بنا ہوا اور یہ کھلے گا پانی کے اندر۔ اس کے لیے نہ تو بڑی جگہ کی ضرورت ہوگی نہ مٹی کی نہ اس کے کھلنے کے لیے دنوں انتظار کرنا پڑے گا۔ ہے نا مزے کی بات!

تو بس اس کے لیے آپ کو ایک شیشے کا بکس نما برتن یا مربہ یا اچار کی خالی بڑے منہ والی بوتل لینی ہوگی اور اس کی تہہ میں کوئی آدھا انچ موٹی ریت کی تہہ پھیلا دینی ہوگی۔ کسی کیمسٹ (کیمیائی اشیاء بیچنے والا، دوائیاں نہیں) کی دکان سے سوڈیم سلی کیٹ (SODIUM CILICATE) لے آئیے گا اور اس کو اتنے پانی میں حل کر لیجیے کہ مزید حل نہ ہو۔ اس محلول (گھول) میں اسی قدر پانی اور ملا لیجیے گا۔ اور اس کو شیشے میں بھر دیجیے۔ یہ ہوئی آپ کے چمن کی زمین اور فضا۔ اب

ان میں بیج بونے ہیں۔ یہ بیج مختلف دھاتوں کے مختلف رنگ کے پانی میں آسانی سے گھلنے والے نمک ہیں۔ آپ اسی کیمسٹ کے ہاں سے تھوڑی مقدار میں نیچے لکھے ہوئے نمک جتنے مل سکیں انھیں حاصل کر لیجیے۔

۱۔ کاپر سلفیٹ Copper Sulphate (تانبے کا سلفیٹ)

۲۔ فیرس سلفیٹ Ferrous Sulphate (لوہے کا سلفیٹ)

۳۔ زنک سلفیٹ Zinc Sulphate (جست کا سلفیٹ)

۴۔ نکل سلفیٹ Nickel Sulphate

۵۔ کوبالٹ کلورائڈ Cobalt Chloride

۶۔ میانگنیس کلورائڈ Manganese Chloride

ان نمکوں کی قلمیں بنی ہوئی ہیں تو بہت اچھا ہے اگر موٹے موٹے ڈلے ہیں تو ان کو کچھ کچل لیجیے۔ دیکھیے اتنا نہ کچلیے گا کہ باریک سفوف بن جائیں کوئی ½ انچ موٹی قلمیں سی رہیں۔ اب ان کو ہوشیاری کے ساتھ اس محلول میں ڈال دیجیے کہ وہ تہہ میں بیٹھ جائیں۔ آپ ان بیجوں کو اس طرح ڈالیے کہ اگنے پر رنگ بھلے معلوم ہوں۔

اب آپ کا کام ختم ہوا۔ آپ چپ چاپ اس کے آگے بیٹھے رہیے اور جادو دیکھیے۔ چند ہی ثانیوں میں آپ کے سامنے رنگوں کا چمن کھلنے لگے گا، شاخیں پھوٹنے لگیں گی، اِدھر اُدھر پھیلنے لگیں گی۔ کچھ ہی لمحے بعد یہ اوپر اٹھتی چلی جائیں گی۔ کوئی ایک یا دو گھنٹوں کے اندر اندر آپ کے سامنے رنگا رنگ اور مختلف شکلوں کا ایک چمن سا اگ آئے گا۔

ایک یا دو دن تک آپ اس کو اسی طرح ہلائے بغیر رکھ چھوڑیے گا۔ پھر ایک ربر کی نلکی کی مدد سے ان شاخوں کو چھوئے بغیر محلول کو نکال دیجیے گا اور اس کی جگہ تازہ پانی بھر دیجیے گا اور اپنے ڈرائنگ روم کی درمیانی میز یا کونے والی میز پر رکھ دیجیے گا۔ اب

چمن پر ہمیشہ بہار چھائی رہے گی۔ درخت تازہ رہیں گے اس پر خزاں اسی وقت آئے گی جب آپ ان درخت کی شاخوں کو توڑ پھوڑ دیں گے یا مرتبان کے سمندر میں آپ کے ہلانے سے طوفان اٹھ کھڑا ہوگا۔

اتنا خوش نما چمن کیسے کھل گیا؟ اس کی وجہ اپنے سائنس کے ماسٹر صاحب سے پوچھیے، وہ ضرور آپ کو بتا دیں گے۔ میں صرف اتنا بتا دوں کہ اس سارے جادو کا انحصار ایک طبیعاتی عمل پر ہوتا ہے جس کے ذریعہ کوئی رقیق اور پتلا سیال مادہ گاڑھے سیال مادّے کی طرف نفوذ کرتا ہے۔ اسی عمل کے ذریعہ جڑیں زمین میں پائے جانے والے سیال نمک، پانی اور غذا حاصل کرتی ہیں اسی کے اصول پر خود ہمارے جسم میں کئی الجھے ہوئے یا پیچیدہ عمل انجام پاتے رہتے ہیں۔

ایک اور مزے دار تجربہ ہے، بالکل آسان اور اس میں بھی پانی ہی کی ایک خصوصیت کام آتی ہے۔ "جادو کی کشتی" بنانا ہے آپ کو۔ بھلا بتائیے اس کشتی کی کیا خصوصیت ہوگی؟ یہی کہ یہ پانی کی سطح پر اپنے آپ

تیرے گی۔ نہ تو کوئی چپو ہوگا نہ بادبان نہ کوئی انجن لگا ہوگا۔ "ہلدی لگے نہ پھٹکری، رنگ چوکھا آئے"!

گتے کا ایک ٹکڑا لیجیے اس پر کشتی کی شکل بنا کر
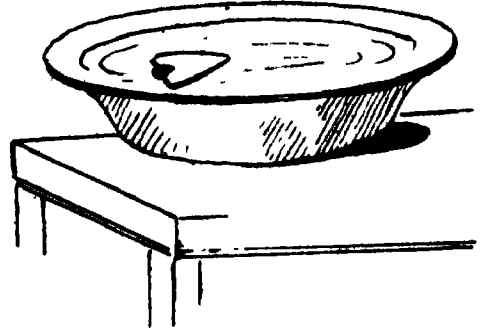
کاٹ لیجیے۔ جس طرح شکل میں بتایا گیا ہے وہاں ایک ۷ کی شکل کا خانہ بنا لیجیے اور اس میں صابن کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا پھنسا دیجیے۔ بس آپ کی جادوئی کشتی تیار ہے۔ اس کو پانی سے بھرے کسی چوڑے برتن میں چھوڑ دیجیے۔ آپ دیکھیں گے تھوڑی ہی دیر میں وہ سطح پر تیرنے لگے گی۔ جتنا چوڑا برتن ہوگا اتنی دیر تک وہ تیرتی رہے گی۔ اور اس وقت تک تیرتی رہے گی جب تک پانی کی سطح پر یہاں سے وہاں تک صابن کا دودھیا رنگ نہ پھیل جائے۔ پھر سے کشتی کو دوڑانا ہے تو بس آپ کو پانی بدل دینا ہوگا۔ ہوتا یہ ہے کہ جیسے جیسے صابن گھلتا ہے ویسے ویسے کشتی کے پیچھے پانی کا دباؤ کم ہوتا جاتا ہے اور چونکہ اس کے آگے سادہ پانی کا دباؤ زیادہ ہوتا ہے، وہ آگے بڑھنے لگتی ہے۔

یہ تو تھی جادو کی کشتی۔ اس کے پیچھے جو طاقت کام کرتی تھی وہ آپ کو نظر نہیں آ رہی تھی۔ اب آئیے آپ کو دخانی کشتی بنانے کی ترکیب بتا دوں۔ یہاں بادبان لگا دکھائی دے گا اور بھاپ کا انجن بھی لگا ہوگا۔ اس کو "جٹ انجن" کہہ لیجیے۔ اس کشتی کے اصول کو سمجھ جائیے تو تیز رفتار جٹ طیاروں یا فوجی راکٹ کا اصول بھی سمجھ میں آ جائے گا۔ اسی اصول کو اپنا کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بھی سو سال پہلے کشتیاں بننے لگی تھیں۔ اس قسم کی پہلی دخانی کشتی کہا جاتا ہے اسکندریہ کے "ہیرون" نے بنائی تھی۔

آپ کو سائنس کے ماسٹر صاحب نے بتایا ہوگا کہ ہر عمل کا ایک ردِّ عمل بھی ہوتا ہے جو عمل کی مخالف سمت میں ہوتا ہے اور اسی قدر طاقتور ہوتا ہے جس قدر کہ عمل۔ فوجی راکٹ یا جٹ طیارے جب اڑتے ہیں تو آپ نے دیکھا ہوگا آسمان پر اپنے پیچھے دھوئیں کی ایک سفید سی لکیر بناتے چلے جاتے ہیں۔ اصل میں پچھلی طرف یعنی ان کی دُم میں ایک نلکی سی لگی ہوتی ہے جس سے بھاپ یا کوئی دوسری گیس بڑی تیز رفتاری اور دباؤ سے نکلتی ہے۔ اس کا دباؤ اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ اس کے ردِّ عمل میں اسی قدر تیز رفتاری سے طیارہ یا راکٹ یا کشتی آگے نکل جاتی ہے۔ وسیع آسمان میں اوپر کی طرف یا بے کنار سمندر میں آگے کی طرف۔

چلیے اسی طرح کی ایک چھوٹی سی کشتی بنا ڈالیں۔ اس کے لیے آپ کو اپنی امی یا باجی کی مدد لینی ہوگی۔ ان سے کہہ سن کر کوئی ٹوتھ پاوڈر یا فیس پاوڈر کا چھوٹا سا خالی ڈبہ لیجیے۔ اب ایک سوئی سے اس کے پیندے میں کنارے کے قریب ایک سوراخ سا بنا لیجیے۔ اس کو کسی موٹے تار پر اس طرح چڑھا لیجیے گویا کسی اسٹینڈ پر لگا ہوا ہے۔ اب اس ڈبے میں آدھے حصے تک

پانی بھر دیجیے۔ یہ ہوگا آپ کی کشتی کا بوائلر۔ اب ذرا دوڑ
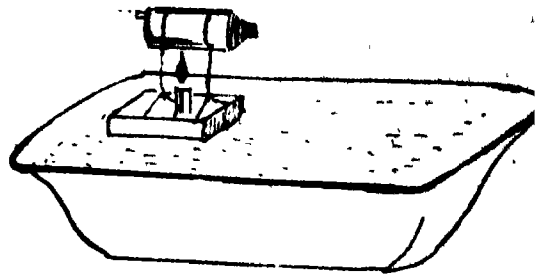
کر غسل خانے تک جائیے اور وہاں سے اپنی امی کی اجازت لے کر صابن کے ڈبے کا ڈھکن یا نچلا حصّہ (جس میں سوراخ نہ ہو) لے آیئے۔ اس میں بوائلر کو فٹ کر دیجیے اس طرح کہ پیندا باہر کی طرف رہے۔ اب اس کو پانی سے بھرے ایک ٹب میں چھوڑ دیجیے۔ کسی ایک کنارے کی طرف اس طرح کہ پیندا باہر کی طرف ہی رہے۔ ایک چھوٹی سی موم بتی جلا کر اس کو بوائلر کے نیچے درمیانی حصّے میں رکھ دیجیے۔ تھوڑی ہی دیر میں پانی ابلنے لگے گا اور پھر بوائلر کے سوراخ سے بھاپ نکلنی شروع ہوگی۔ جب بھاپ تیزی سے نکلنے لگے گی تو کشتی چل پڑے گی۔ مخالف
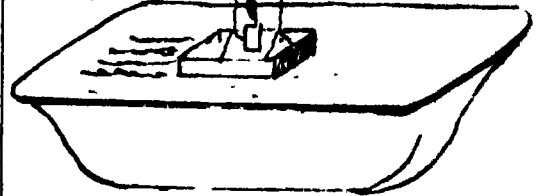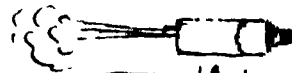
سمت میں تیزی کے ساتھ ۔۔۔۔۔ کیسے آیا نا مزا !!

اب آخر میں ایک اور آسان سا مزے دار تجربہ کر لیجیے۔ اور اپنے دوستوں کو بھی حیران کیجیے۔

جب بھی آپ شرارت کرتے ہیں، ادھم مچاتے ہیں آپ کو شیطان ہی کے خطاب سے یاد کیا جاتا ہے نا! اگر اسی طرح کا ایک شیطان آپ کے ہاتھ لگ جائے تو کیا کریں گے آپ؟ ـــ خوب نچائیں گے نا اُس کو!

میں جس کھلونے کی بات کر رہا ہوں وہ شاید بنا بنایا بازار میں بھی مل جائے۔ ایک لمبی سی بوتل ہوتی ہے جس میں پانی بھرا ہوتا ہے۔ اس پانی میں ایک جوکر کی شکل کا یا اژدھے کی شکل کا چھوٹا سا پتلا تیرتا ہوگا۔ یہی ہوگا آپ کا ساتھی شیطان۔ بوتل کے منہ پر ربر کی جھلی سی لگی رہتی ہے جس پر دباؤ ڈالنے سے پتلا غوطہ لگا کر تہہ تک پہنچ جاتا ہے۔ دباؤ کے ساتھ ساتھ وہ اندر ہی اندر عجیب حرکتیں کرنے لگتا ہے۔ اندر کی طرف دوڑا جاتا ہے کبھی اوپر کی طرف بھاگا چلا آتا ہے۔ کبھی آدھے فاصلے پر دَم سادھے کھڑا رہتا ہے۔ اس ننھے سے کھلونے نے تین سو سال سے بڑوں اور چھوٹوں کا یکساں دل بہلایا ہے۔ اب یہ آپ کا دل بھی بہلائے گا، آپ کے دوستوں کو بھی خوش کرے گا۔ لیکن اس کی شکل بازار میں ملنے والے کھلونے جیسی نہیں ہوگی۔ یہ اس لیے کہ آپ اس کو آسانی سے تیار کر سکیں۔

اپنی امی سے کہہ کر ایک شربت کا لمبا سا گلاس لے لیجیے یا کوئی کھلے منہ والی بوتل بھی کام دے گی۔ اس میں کچھ پانی بھر دیجیے۔ پھر اپنے ابا سے کہہ کر کسی ڈاکٹر صاحب کے ہاں سے ایک ننھی سی خالی شیشی منگوا لیجیے۔ وہی جس میں ٹیکہ (انجکشن) لگانے کی دوا بھری ہوتی ہے۔ یہی شیشی شیطان ہوگی۔ اس خالی شیشی کو الٹا کر کے تیزی سے پانی کے اندر اس طرح ڈبو دیجیے کہ کچھ پانی اس کے اندر چلا جائے اور یہ شیشی الٹی ہی اندر تیرنے لگے۔

اب اس بڑی بوتل میں یا گلاس میں اوپر تک لبالب پانی بھر دیجیے۔

بس آپ کا جادوئی شیطان تیار ہے۔ اپنے دو چار دوستوں کو اکٹھا کر لیجیے اور کہیے کہ میرے ہاتھ میں جادو ہے اور میں اس شیطان کو ہاتھ کے اشارے پر نچا سکتا ہوں۔ وہ ہنسیں گے۔ آپ اس بوتل یا گلاس کے مُنہ پر اپنی ہتھیلی ڈھانپ دیجیے اور ہتھیلی سے پانی پر دباؤ زیادہ اور کم کرتے رہیے۔ آپ نے ہتھیلی جو دبائی ننھی سی شیشی اندر چلی جائے گی۔ آپ نے دباؤ کم کیا وہ اوپر آجائے گی۔ کچھ دیر کی مشق کے بعد آپ کو اتنی مہارت حاصل ہو سکے گی کہ اس شیطان کو بوتل کے درمیان پانی کے اندر ہی اندر ایک ہی مقام پر روک کر نچا سکیں گے۔
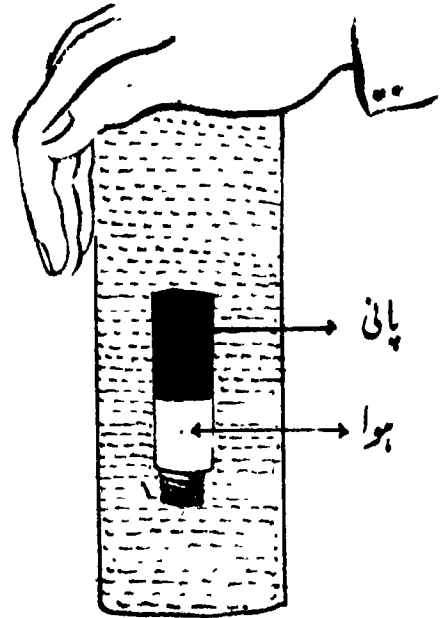
جانتے بھی ہیں ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اگر غور سے دیکھیں گے تو پتہ چل جائے گا راز معلوم ہو جائے گا۔

بات بالکل معمولی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہوا پر دباؤ ڈال کر اس کے حجم کو کم کیا جا سکتا ہے۔ آپ فٹ بال کے بلیڈر یا سائیکل کے پہیے کے ٹیوب میں ہوا بھرتے ہیں تو محدود رقبہ میں زیادہ ہوا کو بند کر دیتے ہیں نا! اس کے برخلاف پانی پر یا کسی سیال سے پر دباؤ ڈال کر اس کا حجم کم نہیں کیا جا سکتا۔ آپ جب بھی اپنی ہتھیلی سے پانی کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں، پانی دبنے سے تو رہا۔ لیکن اس ننھی سی شیشی میں پانی اور ہوا دونوں ایک ساتھ بھرے ہوتے ہیں نا! جب آپ اوپر سے دباؤ ڈالتے ہیں تو فوراً ہی شیشی کے اندر دب کر اس کا حجم کم ہو جاتا ہے اور اس طرح پانی کی مقدار ہوا کی مقدار سے بڑھ جاتی ہے اور اس کے ابھرنے کی صلاحیت کم ہو کر شیشی ڈوب جاتی ہے۔ بازار میں جو کھلونا ملتا ہے 'وہی ناچنے والا شیطان' اس کے پیر یا دُم میں ایک سوراخ ہوتا ہے جس کی راہ دباؤ کا اثر اس کے اندر کے پانی اور ہوا پر پڑتا ہے۔

چلتے چلتے ایک بات بتا دوں۔ آپ نے آب دوز کشتیوں کے بارے میں تو ضرور سنا ہوگا۔ وہی جو سمندر کے اندر ہی اندر، سطح سے بہت نیچے تیرتی چلی جاتی ہیں۔ خاص کر جنگ کے زمانے میں تو ان کی مدد سے دشمن کے جنگی جہازوں کو نیچے کی طرف سے حملہ کر کے ان کو بے کار کر دیا جاتا ہے۔ تو جناب ایسی کشتیوں کے پانی کے اندر غوطہ لگانے یا اوپر اٹھ آنے کا اصول بھی یہی ہے۔ اسی شیطانی کھلونے کا!

کہیے پسند آئے یہ کھیل!!

جناب محمد شفیع الدین نیّر

عید مبارک

خدا کا شکر ہے آنکھوں نے یہ گھڑی دیکھی
خدا کا شکر ہے پھر عید کی خوشی دیکھی

خوشی سے پھول بھی پھولے نہیں سماتے ہیں
کھلی کھلی سی چمن میں کلی کلی دیکھی

زباں پہ ہے گُلِ سوسن کے عید کا نغمہ
خوشی سے آنکھ میں نرگس کے روشنی دیکھی

نہ پوچھیے کہ ہے بچّوں کے دل کی کیا حالت
عجیب اُن کی چُہل، اُن کی دل لگی دیکھی

خوشی سے چہرے بنے ہیں سبھی کے بن کے گلاب
خوشی سے کھیلتی ہر ہونٹ پر ہنسی دیکھی

چہل پہل نظر آئی جدھر نگاہ اٹھی!
ہر ایک سمت ہنسی، ہر طرف خوشی دیکھی

گلے ملے جو محبت سے ٹوٹ کر باہم
ہر ایک دل میں بسی صلح و آشتی دیکھی

غرض خوشی کا یہ عالم ہے آج دنیا میں
ہر ایک چیز جو دیکھی نئی نئی دیکھی

خدا کرے ہو مبارک یہ سب کو عید سعید
نصیب سب کو ہمیشہ مسرّتوں کی دید

جناب اقبال مہدی

ایک دن کیا ہوا

سلیم اور سلمہ ہوم ورک کرنے بیٹھے۔ امی اور ابا دونوں یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

سلمہ نے بستے سے کاپی نکالی، پینسل نکالی، پینسل کی نوک ٹوٹی ہوئی تھی اب کیسے لکھا جائے۔ ابا نے جو پینسل تراش لا کر دیا تھا وہ کبھی کا کھو چکا تھا۔

سلمہ نے پینسل کی لکڑی کو ناخن سے توڑ کر نوک نکالنے کی کوشش کی۔ ناخن دکھنے لگا، کامیابی نہ ہوئی۔ پینسل کی لکڑی کو اینٹ پر گھسا۔ لکڑی کے ساتھ نوک بھی گھس گئی دانت سے چھیلنا چاہا۔ پینسل تو نہ بنی لکڑی کا ایک ٹکڑا دو دانتوں کے بیچ میں جا پھنسا۔ دانتوں میں تکلیف ہونے لگی۔

سلیم نے پوچھا "کیا بات ہے؟"

سلمہ نے کہا، "یہ پینسل نہیں بن رہی ہے"

سلیم نے سلمہ سے پینسل لے لی۔ اُسے غور سے دیکھا سے معلوم ہوا کہ پینسل کو ناخن سے چھیلنے، اینٹ پر گھسنے اور دانتوں سے چھیلنے کی ترکیبیں ناکام ہو چکی ہیں۔ بولا "چھری لے آؤ میں بنائے دیتا ہوں"

دانت کی تکلیف کی وجہ سے سلمہ گال دبائے اٹھی اور باورچی خانے سے ترکاری کاٹنے والی چھری ڈھونڈ کر لا دی چھری کند تھی اس سے بھی پینسل نہ بنی۔

سلمہ اپنی تکلیف میں مبتلا تھی۔ کبھی تھوکتی کبھی ناخن کی مدد سے دانتوں میں سے پینسل کی لکڑی کا ٹکڑا نکالنے کی کوشش کرتی۔ سلیم بہن کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ چھری رکھ کر اٹھا اور ابا جان کے داڑھی بنانے کے سامان کے ڈبے میں سے ایک بلیڈ نکال لایا۔

بلیڈ تیز تھا۔ اس سے پینسل کی لکڑی تیزی کے ساتھ چھلنے لگی۔ سلیم خوش ہوا کہ سلمہ کی شکل کو اب وہ حل کر دے گا۔ اچانک بلیڈ پینسل سے پھسل کر انگلی کے گوشت میں اتر گیا۔ گہرا زخم لگا۔ خون نکل آیا۔

خون کو دیکھ کر سلیم نے پینسل اور بلیڈ کو پھینک دیا۔ زخم کو دوسرے ہاتھ کے انگوٹھے اور انگلی سے دبایا۔ پھر انگوٹھا اٹھا کر دیکھا۔ خون تیزی سے بہنے لگا۔ فرش پر ٹپکنے لگا۔ دونوں گھبرا گئے۔ سلیم نے انگلی دبائی اور بھاگ کر غسلخانے پہنچا۔ سلمہ بھی پیچھے پیچھے آئی۔ پانی کی دھار کے نیچے بھی خون نہ رکا۔ پانی میں مل کر بہت زیادہ نکلتا ہوا معلوم ہونے لگا۔

زیادہ خون نکلتا ہوا دیکھ کر سلمہ بھی گھبرائی بولی،

"بھائی جان کپڑا رکھیے" سلیم نے فوراً قمیض کے دامن سے انگلی دبائی۔ کچھ دیر بعد انگلی نکال کر دیکھی۔ خون جاری تھا پھر دامن سے انگلی دبائی۔ دامن پر خون کے دھبے اور ...

آہا بھئی ہم ٹھیک بڑھ رہے ہیں

محمد حسین حسان

ایک ملک تھا بہت عجیب و غریب بس یوں سمجھو کہ وہاں رہ کر آدمی آدمی بن جاتا تھا۔ اس ملک میں ایک لڑکا رہتا تھا رشید۔ اس کا گھر گلی میں مسجد کے پاس تھا۔

رشید شاید اس ملک میں نیا نیا آیا تھا۔ اس کے ماں باپ نے اسے آدمی بننے کے لیے بھیج دیا تھا جبھی تو وہاں اس کا کوئی ساتھی تھا نہ ہم درد جو اسے اچھی اچھی باتیں بتائے۔ اچھے اچھے مشورے دے۔ بس ایک سرپرست تھا جس کے پاس وہ ٹھہرا ہوا تھا۔

رشید کی عمر اچھی خاصی تھی، پر عمر کو دیکھتے قد بہت چھوٹا تھا۔ بالشتیا تو خیر کیا، بونا کہہ لو۔

ایک دن رشید نے اسکول میں ماسٹر سے یہ کہتے سُن لیا: "بھئی مجھے تو ڈر ہے یہ رشید میاں اتنے کے اتنے ہی رہیں گے اور نہیں بڑھیں گے۔"

یہ سُن کر رشید کو بہت دُکھ ہوا۔ اس نے سوچا اگر وہ نہ بڑھا تو سچ مچ بونا ہو کر رہ جائے گا۔ ایک بار سرکس میں اس نے ایک بونا دیکھا تھا بڑی دلچسپی کے ساتھ، پر خود بونا بننے کی اسے ذرا خواہش نہ تھی۔ وہ دن بھر اسی پریشانی میں رہا۔ رات بھی اسی سوچ میں آنکھوں میں کٹ گئی صبح ہوئی تو وہ اپنے سرپرست کے پاس پہنچا اور اپنی بپتا سُنائی۔

سرپرست نے کہا: "بھئی تمھیں ایک خواب کی ضرورت ہے خواب کی۔ یہ چیز تمھیں جوہری بازار میں حاجی عبداللہ کی دکان پر ملے گی۔"

رشید دوڑا دوڑا جوہری کی دکان پر پہنچا حاجی عبداللہ موجود تھے۔ رشید کو اپنی طرف آتے دیکھ کر بولے: "آؤ میاں آؤ، کہو کیا چاہیے؟"

رشید نے ادب سے سلام کیا اور بولا: "حاجی جی مجھے ایک خواب چاہیے خواب!"

حاجی جی: "اچھا تو اوپر آجاؤ۔ دیکھو خواب اس کونے میں رکھے ہیں۔ تمھیں کیسا خواب چاہیے؟ میرے پاس تو ہر طرح کے ہیں۔ چھوٹے بڑے، اچھے بُرے۔ ہاں تھوڑے سے ڈراونے خواب بھی ہیں۔"

رشید: "پر مجھے تو ایسا خواب چاہیے جس کی مدد سے میرا قد بڑھ جائے۔"

حاجی جی: ہاں ہاں ایسا خواب بھی ہے۔ خوب لمبا سا۔ بہت مزے کا۔ ایک ایسے شخص کا جو تمھاری طرح اپنا قد

بڑھانا چاہتا تھا۔ لو یہ لو"

حاجی عبداللہ نے ایک چیز اٹھا کر رشید کو دی کچھ کچھ بلبلے جیسی مگر ذرا چپٹی چپٹی۔ اس پر دھنک کی تصویر سات رنگوں کی۔ چوکھٹا آئینے کا سا گول گول۔

رشید: "اور اس کے دام؟"

حاجی جی: "دام وام کیا۔ خوابوں کی کچھ ایسی قیمت نہیں ہوتی۔ تم اسے جیب میں رکھ لو اور اکثر دیکھتے رہو۔ دو چار روز یہی کرتے رہو۔"

رشید نے خواب جیب میں رکھا اور حاجی جی کا شکریہ ادا کیا۔ وہ اسے اکثر دیکھا کرتا۔ اس کے گھر میں ایک قد آدم آئینہ لگا تھا۔ اس آئینے کے چوکھٹے میں اس نے اپنے قد کے برابر نشان لگا رکھا تھا۔ کئی دن بعد وہ اس آئینے کے پاس آیا۔ ابھی وہ کچھ یونہی سا بڑھا تھا۔

وہ سیدھا اپنے سرپرست کے پاس پہنچا اور اسے یہ بات بتائی۔

سرپرست نے کہا: "تمھیں ڈھکے چھپے خیالوں کی ضرورت ہے۔ یہ خیال بھی تمھیں حاجی عبداللہ کی دکان پر ملیں گے۔"

رشید میاں پھر حاجی عبداللہ کی دکان پر پہنچے۔
حاجی عبداللہ نے آگے بڑھ کر کہا: "آؤ میاں، کچھ اور چاہیے؟"

رشید: "مجھے ڈھکے چھپے خیال چاہئیں"

حاجی جی: "تو آؤ، ادھر آؤ۔ دیکھو اس طرف کی الماری میں خیال ہی خیال رکھے ہیں۔ تمھیں کیسے خیال چاہئیں ہمارے یہاں تو ہر طرح کا مال ہے۔ لمبے خیال، مختصر خیال، بڑے خیال، چھوٹے خیال۔"

رشید: مجھے تو ایسے خیال چاہئیں جو میرا قد بڑھانے میں مدد کریں۔"

حاجی جی: "ہاں ایسے خیال بھی ہیں، یہ لو"

حاجی عبداللہ نے ایک چھوٹی سی پوٹلی اٹھائی خوب بندھی ہوئی اور گانٹھ پر مہر لگی ہوئی۔

رشید: "میں انھیں کھول بھی سکتا ہوں؟"

حاجی جی: "نہیں میاں نہیں، یہ بالکل ڈھکے چھپے خیال ہیں۔ انھیں کھول کے نہیں دیکھتے۔ بہت اچھے اور خوب لمبے خیال ہیں۔ بہت سے اچھے اور نیک آدمیوں نے انھیں سوچا ہے۔"

رشید: "اور ان کی قیمت؟"

حاجی جی: "ایک آنہ، خیالوں کا بنانا خوابوں کے مقابلے میں ذرا مشکل ہے۔"

رشید: "مگر میں ان کا کروں کیا؟"

حاجی جی: "دن میں اپنی ٹوپی میں رکھو۔ رات کو لحاف میں دبا لو مگر انھیں اکثر سوچتے رہو، دو چار روز یونہی کرتے رہو۔"

رشید نے ایک آنہ حاجی جی کے حوالے کیا، پوٹلی اپنی ٹوپی میں رکھی اور دوکان سے باہر نکل آیا۔

چند دن بعد وہ پھر بڑے آئینے کے پاس گیا۔ اب بھی وہ کچھ زیادہ تیزی سے نہیں بڑھ رہا تھا۔ یہ بات اس نے اپنے سرپرست سے کہی۔

سرپرست نے کچھ سوچ کر کہا: "تمھیں اب مقصد کی ضرورت ہے، یہ بھی اسی دکان پر ملے گا۔"

رشید میاں پھر دکان پر پہنچے۔ حاجی عبداللہ نے پھر اسی نرمی اور محبت سے کہا: "آؤ میاں رشید! کہو اب کس چیز کی ضرورت ہے؟"

رشید: "حاجی صاحب مقصد چاہیے، مقصد، جو مجھے بڑھنے میں مدد دے۔"

حاجی جی: "جی میرے پاس مقصد بھی ہے۔ آپ کے مطلب کی چیز،"

حاجی عبداللہ نے الماری سے ایک چیز نکالی اور کہا: "دیکھو، یہ ہے۔" یہ دو لمبی سنہری سلاخیں تھیں، ان کے بیچ میں بہت سی چھوٹی چھوٹی سلاخیں لگی تھیں۔

رشید: "بھئی حاجی صاحب یہ تو سیڑھی سی معلوم ہوتی ہے۔"

حاجی جی: "ہاں بھئی اور مقصد کیا ہوتے ہیں، زینے ہی تو ہوتے ہیں۔ انہی کے ذریعے تو لوگ اوپر آسمانوں تک چڑھتے ہیں۔ تم اس پر دن میں کئی کئی دفعہ چڑھنا پھر دیکھنا تمہارا قد کیسا جلدی جلدی بڑھتا ہے۔"

رشید: "مگر میں انھیں لے کیسے جاؤں، یہ تو بہت لمبا ہے!"

حاجی جی: "ارے! دیکھو یہ اس طرح چھوٹا ہو جاتا ہے۔ (حاجی جی نے دونوں سرے دونوں ہتھیلیوں سے دبا دیئے) اب تم اسے آسانی سے لے جا سکتے ہو جب اسے استعمال کرنا چاہو تو یوں کھول لینا (ہاتھ کے اشارے سے کھول دیتا ہے) دیوار پر لگا دینا اور ڈنڈوں کے ذریعے چڑھ جانا۔ اسے اپنی جیب میں رکھ لو یا ہاتھ میں لے جاؤ کسی کو نظر نہ آئے گی۔ بس چند دن استعمال کر کے دیکھو۔"

رشید: "اور قیمت؟"

حاجی جی: "جو کچھ تمہارے بٹوے میں ہے اس سے کہیں زیادہ۔ مقصد کا بنانا اور اسے ٹھیک رکھنا بہت مشکل کام ہے۔ اسے ٹھیک رکھنے کے لیے تمہیں ہر روز کچھ نہ کچھ خرچ کرنا پڑے گا۔ بس تم تھوڑے تھوڑے دام ادا کرتے رہو۔"

رشید نے تھوڑے سے دام نکال کر حاجی عبداللہ کو دیئے، مقصد کو اپنی جیب میں رکھا اور گھر آیا۔ کئی دن تک وہ اس پر خوب اترتا چڑھتا رہا۔ تین چار دن بعد آئینے کے پاس پہنچا۔

رشید! ارے بے چارہ بھونچکا رہ گیا وہ خوب لمبا ہو گیا تھا خوب لمبا۔ مگر دبلا ایسا جیسے سینک سلائی۔ اس نے سرکس میں ایک ایسا لمبا بے ڈول آدمی بھی دیکھا تھا۔ اسے دیکھ کر اسے سچ مچ ڈر لگنے لگا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ذرا زور کی ہوا چلی اور یہ گرا اور گرتے ہی ٹکڑے ٹکڑے۔ اس نے سوچا یونہی تاڑ کی طرح بڑھتا چلا گیا تو نہ جانے کہاں تک نوبت پہنچے۔ بھلا اس بے ڈول لمبائی اور اس بونے پن میں فرق ہی کیا ہے۔

وہ سیدھا اپنے سرپرست کے پاس پہنچا اور کیفیت بتائی۔ وہ دیر تک سر جھکائے رہے اور بولے:
"بس ایک چیز اور ہے، دل، اس سے تم جتنے لمبے ہو گے اتنا ہی تمہارا جسم بڑھے گا اور تم اچھے خاصے نظر آؤ گے۔"

رشید: "مگر دل تو میرے پاس ہے۔"

سرپرست: "ہاں ہے، مگر تمہیں ایک دل کی اور ضرورت ہے۔ یہ بھی تمہیں اسی دکان سے ملے گا۔"

رشید میاں پھر حاجی عبداللہ کی دکان پر پہنچے حاجی جی نے پوچھا: "کہیے میاں، اب کیسے آپ نے تکلیف کی؟"

رشید: "حاجی جی مجھے دل چاہیے دل جو مجھے بڑھنے میں مدد دے۔"

حاجی عبداللہ ایک خوبصورت سا

دل ہاتھ میں لے کر بولے: "دیکھو یہ ہے دل، سچ مچ کا ہرا دل۔ بہت ہی نادر۔ بہت ہی قیمتی۔ میرے پاس جتنے بھی دل ہیں ان سب میں بہترین۔ تم اسے اپنے سینے پر لگانا، بائیں طرف۔ اصلی دل کے اوپر۔ اس دل کی یہ عجیب و غریب خاصیت ہے۔ جو اپنے سینے پر لگا لیتا ہے وہ اپنے کو بالکل بھول جاتا ہے۔ دوسروں ہی کا خیال اس کے دل میں سمایا رہتا ہے۔ بس وہ دوسروں کی خوب مدد کرتا ہے۔"

رشید: "تو پھر اس کی قیمت بھی زیادہ ہوگی۔"

حاجی جی: "تمھارے پاس جتنے بھی دام ہیں۔"

رشید: "جتنے بھی دام ہیں؟"

حاجی جی: "ہاں تمھارے پاس جتنے بھی دام ہیں وہ سب دے دو۔ یہ بہت ہی قیمتی چیز ہے۔ بہت ہی قیمتی۔"

رشید نے اپنا بٹوا حاجی جی کی میز پر خالی کر دیا اور وہ ہرا دل وہیں اپنے سینے پر لگا لیا۔ بائیں طرف، اصلی دل کے اوپر۔

پھر تو دوسروں کا خیال اس کے دل پر اتنا چھا گیا، اتنا چھا گیا کہ اپنے آپ کو بالکل بھول گیا۔ یہ بھی محسوس نہ ہوا کہ خود اس کے اندر کیا تبدیلی ہو رہی ہے۔

ایک دن وہی ماسٹر صاحب بولے: "بھئی اب تو یہ لڑکا واقعی بڑھ رہا ہے۔"

یہ سن کر رشید کو جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آگئی بھاگا بھاگا آئینے کے پاس گیا۔ ہاں بھئی اب تو وہ اچھا خاصا خوبصورت لڑکا بن گیا تھا۔ اب میاں رشید کی خوشی کا کیا پوچھنا بے اختیار ان کے منہ سے نکل گیا "آہا بھئی اب تو ہم ٹھیک بڑھ رہے ہیں۔" سب لڑکے مسکرا مسکرا کر ان کی طرف دیکھنے لگے۔

(انگریزی سے اپنایا گیا)

جناب سید محمد شفیع تمنا کلکتوی

نیا سال

مبارک ہو بچو
نیا سال سب کو
نئے ولولے ہوں
بلند حوصلے ہوں
جواں ہوں ارادے
بنو شاہزادے
ہر اک کام پیارا
ہو بچو تمھارا
وہ چھیڑو ترانہ
کہ بدلے زمانہ
نہ چھوٹے بڑے کا
ہو اب کوئی جھگڑا

سبھی ہوں برابر
بساطِ زمیں پر
یہی ایک نعرا
رہے بس تمھارا
ہیں سب اپنے بھائی
نہیں غیر کوئی
نیا سال آیا
یہ پیغام لایا
کرو کام اچھے
بنو نیک بچے

جناب قیصر سرمست

تقریباً سبھی درندے یعنی شکاری جانور اپنے شکار کو دوڑ کر پکڑتے ہیں جیسے بھیڑیا وغیرہ۔ بعض لپک کر یا چھلانگ لگا کر دبوچ لیتے ہیں۔ ایسا شکار کرنے والوں کا تعلق "بلی" کے خاندان سے ہوتا ہے جیسے شیر، ببر پیوما اور بور بچہ وغیرہ۔

سمندر میں بھی مختلف جانداروں میں شکار کے مختلف طریقے پائے جاتے ہیں۔ بڑی مچھلیوں کی زیادہ تعداد کی گذر بسر چھوٹی مچھلیوں اور مختلف جانوروں پر ہے مگر یہ مچھلیاں شکار کے لیے دوڑ دھوپ نہیں کرتیں پانی میں چپ چاپ اپنے کو ساد ھے رکھتی ہیں۔ جیسے ہی کوئی جانور قریب آتا ہے جھپٹ پڑتی ہیں

مچھلیوں کے شکار کا طریقہ بہت انوکھا ہوتا ہے مثلاً ایک مچھلی کی پیشانی پر ایک "گل" ہوتا ہے جسے وہ شکار کے وقت اپنے منہ کے آگے کر لیتی ہے۔ جوں ہی کوئی مچھلی قریب آتی ہے وہ اسے اپنے منہ اور "گل" کے درمیان کر لیتی ہے۔ اور "آگے کھائی پیچھے کنواں"
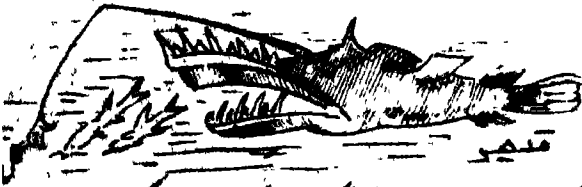
کے بمصداق دوسری مچھلی آگے پیچھے حرکت نہیں کر سکتی اور شکار ہو جاتی ہے۔

سیل اور سمندری ببر (SEA LION) کے دانت انتہائی نوک دار اور تیز ہوتے ہیں۔ عام طور پر سمندری

جانوروں کی جلد بہت چکنی ہوتی ہے۔ اگر کند دانت ہوتے تو انھیں پکڑنے میں بڑی دقت ہوتی۔

دنیا میں بعض جانور اپنی جسامت سے دوگنی اور تگنی چیز بھی نگل سکتے ہیں جیسے جنگلی مینڈک اور سوادر مچھلی۔

یہ مینڈک کئی انچ لمبے سانپ کو نگل لیتا ہے اور
سوادر مچھلی اپنی جسامت سے تین گنا بڑی مچھلی
نگل لیتی ہے۔ مچھلی نگلنے کے بعد اس کا
پیٹ پھول کر گول کپا"
ہو جاتا ہے۔

جن درندوں اور پرندوں کے پنجے ہوتے ہیں
وہ ان سے شکار پکڑنے کا کام لیتے ہیں۔ اس کی سب سے
عمدہ مثال بلی اور عقاب وغیرہ ہے۔
چیل اور عقاب وغیرہ اپنے پنجوں سے شکار کو پکڑتے ہیں پھر منہ
یا چونچ سے نوچ نوچ کر کھاتے ہیں۔

شکار کا سب سے اذیت ناک اور گھناؤنا طریقہ جس کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اژدھوں
کا ہے۔ اژدھے اپنے شکار کو لپیٹ کر اور دبا کر بھینچتے ہیں۔ اس طرح دبنے اور بھینچنے سے شکار نہ صرف مر جاتا ہے بلکہ

اس کی ہڈیاں پسلیاں ٹوٹ جاتی ہیں اور وہ دب دبا کر پتلا بھی ہو جاتا ہے اور اژدھے کو اسے نگلنے میں کوئی دشواری نہیں

ہوتی۔اژدھوں اور سانپوں میں بھی اپنی جسامت سے دوگنا اور تگنا نگلنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔

سبزی خور جانوروں کو یہ سہولت ہے کہ انھیں ہر جگہ غذا مل جاتی ہے۔ گوشت خور جانوروں کو اپنا شکار ڈھونڈنا پڑتا ہے اور کافی محنت اور کوشش کے بعد پیٹ کی آگ بجھانے کا موقع ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے جانور اپنے لیے جنگل کا ایک خاص علاقہ مخصوص کر لیتے ہیں۔ اس علاقے کی وسعت کا دارومدار جانور کی اپنی قوت طاقت اور بہادری پر ہے۔

آپ تو جانتے ہیں کہ شیر جنگل کا شہنشاہ ہے اسی لیے وہ اپنی شکارگاہ کے لیے کافی بڑا علاقہ مختص کر لیتا ہے اور وہ کسی قیمت پر یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی دوسرا درندہ اس کے علاقے میں آکر شکار کھیلے لیکن جب یہ علاقہ جانوروں سے خالی ہو جاتا ہے تو انھیں کسی دوسرے علاقے کا رُخ کرنا پڑتا ہے۔

آپ کو یہ سُن کر شاید یقین نہیں آئے گا کہ بعض جانور کفایت شعاری کے اصول پر شکار کرتے ہیں شکار چونکہ ہر وقت اور آسانی سے نہیں ملتا اس لیے گوشت خور جانور اپنے شکار کو محفوظ کر لیتے ہیں اور کئی کئی دن تک اسی پر گزارا کرتے ہیں۔

آخر میں بعض سمندری جانوروں کا ذکر کر دینا ضروری ہے۔ ان جانوروں کے مُنہ پر رگ پٹھوں سے بنی ہوئی مضبوط اور لچک دار مونچھیں سی ہوتی ہیں۔ ایسے جانور پانی میں ایک جگہ چمٹے ہوئے رہتے ہیں۔ جب بھی کوئی شکار ان کی مونچھوں کے قریب آتا ہے تو وہ اسے دبوچ لیتے ہیں۔ اس قسم کے جانوروں کی نمائندگی "جیلی فش" اور "اسکواڈ" کرتے ہیں۔
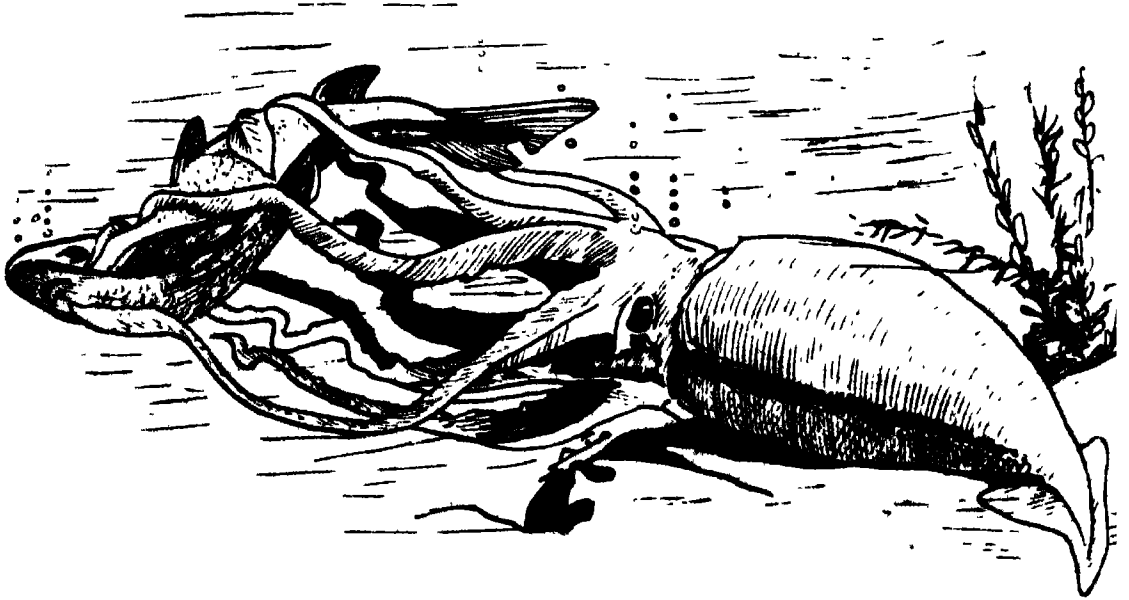
بعض جانوروں کی ان مونچھوں میں ایسے غدود بھی ہوتے ہیں جن میں زہر بھرا رہتا ہے اور جس کے اثر سے شکار بے حس اور بے دم ہو جاتا ہے۔

محترمہ عائشہ رفیق شاستری

تکلی کا جنم
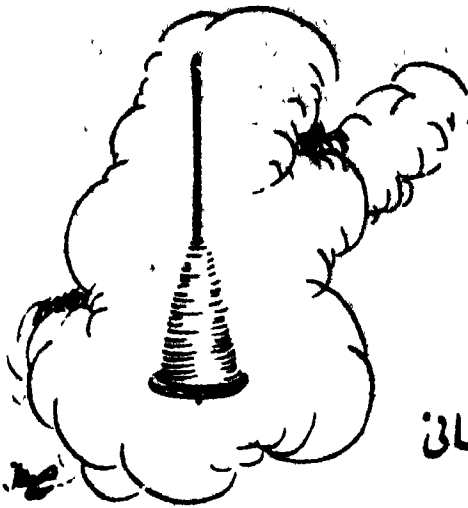
مدھیہ پردیش کی لوک کہانی

سورگ' جنت' میں ایک دیوی رہا کرتی تھی۔ اس کا نام تھا 'پھرکی'۔ وہ بنائی کے کام میں بڑی ماہر تھی۔ اس کی وجہ سے دور دور تک اس کی شہرت تھی۔ پھرکی کی شہرت ہوتے ہوتے سورگ جنت کی رانی کے کانوں میں پڑی وہ شہزادیوں کی تربیت یعنی بنائی کا کام سکھانے کے لیے کسی ہنرمند دیوی کی تلاش میں تھیں۔ انھوں نے اپنی سہیلیوں سے کہا "سنتی ہوں پھرکی بنائی کا کام بہت ہوشیاری سے کرتی ہے۔ کہو تو اسے یہیں بلوا لوں۔ اور وہ یہیں رہ کر شہزادیوں کو بنائی سلائی کا کام سکھایا کرے۔"

ایک سہیلی کو یہ بات کچھ اچھی نہیں لگی۔ اس نے کہا "اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ بنائی کے کام میں پھرکی ہی سب سے زیادہ ہنرمند ہے۔ میرا کہا مانیے اور ایک مقابلہ کرا ڈالیے جس میں ساری دیویاں جمع ہوں۔ اور جو دیوی مقابلہ جیت لے۔ اسی کو اس کام پر مامور کر دیا جائے۔"

رانی کو یہ بات بہت پسند آئی اور اس نے ایک جلسہ کیا۔ جس میں بنائی سلائی کا کام جاننے والی سینکڑوں دیویاں آئیں لیکن بازی پھرکی کے ہاتھوں رہی۔ رانی نے اسے بہت سا انعام دیا اور کہا۔ "آج سے تم میری سہیلی ہو تم مزے سے یہیں رہو اور شہزادیوں کو سلائی بنائی کا کام سکھاؤ۔"

پھرکی کی قسمت جاگ اٹھی۔ وہ رانی کے ہاں رہنے لگی۔ شہزادیاں روز اس سے سلائی بنائی کا کام سیکھتیں۔ رانی پھرکی کے کام سے بہت خوش تھی اور اسے انعام واکرام سے مالا مال کرتی رہتی

پر اب کیا ہوا؟ دھیرے دھیرے پھرکی خوب مال دار ہو گئی جس سے اس کے اندر گھمنڈ پیدا ہونے لگا۔ اب وہ اور تو اور رانی کی سہیلیوں سے بھی سیدھے منھ بات نہیں کرتی تھی پھرکی کا یہ برتاؤ رانی کی سہیلیوں کو ناگوار گزرا۔ اور ایک دن انھوں نے رانی سے پھرکی کی شکایت کی۔

"آپ کے سر چڑھانے کی وجہ سے پھرکی کسی سے سیدھے منھ بات نہیں کرتی۔ جب دیکھو گھمنڈ سے منھ پھلائے رہتی ہے۔ آپ ہی بتایئے وہ اب ہماری پیاری جنت میں کیسے رہ سکتی ہے۔"

یہ سن کر رانی آگ بگولا ہو گئی۔ بولی "ایں؟ پھرکی گھمنڈ کرنے لگی ہے؟ تب تو وہ دیوی ہی نہیں رہی۔ میں اسے ابھی سزا دوں گی لے پکڑ کر میرے سامنے حاضر کرو۔"

دو تین دیویاں دوڑی دوڑی گئیں اور اُسے پکڑ لائیں۔ رانی اسے دیکھتے ہی بگڑ کر بولی۔

"کیوں ری پھرکی میں یہ کیا سن رہی ہوں؟ تو گھمنڈ کرنے لگی ہے؟ جانتی ہے گھمنڈ کرنے والوں کو کیا سزا ملتی ہے؟ اسے فوراً جنت سے نکال دیا جائے۔ کوئی گیا گھمنڈ کرنے کے بعد تو خود میں بھی جنت میں رہنے کی حقدار نہیں ہوں یہاں کا یہی دستور ہے۔"

پھرکی سہم کر بولی "اب تو غلطی ہوگئی رانی جی بس اس بار مجھے معاف کر دیجیے۔ پھر کبھی ایسی غلطی کروں تو آپ کی جوتی میرا سر۔"

رانی نے کہا "تمھاری خاطر قانون نہیں توڑا جا سکتا تمھیں سزا ضرور ملے گی اور جنت کو چھوڑ کر زمین پر جانا پڑے گا۔ ہاں میں ایک رعایت ضرور کر سکتی ہوں تو جس شکل میں پسند کرے میں تجھے زمین پر بھیج دوں۔ بتا تو کس شکل میں جانا پسند کرے گی۔"

اسی وقت وہاں ایک فقیر آ پہونچا جو کپڑوں کے بجائے پتوں کا چغا پہنے ہوئے تھا۔ اُسے دیکھ کر سبھی دیویوں کو بہت تعجب ہوا۔ رانی نے اس سے پوچھا "آپ کون ہیں اور کہاں کے رہنے والے ہیں۔ آپ جیسی شکل و صورت کا ہمارے یہاں تو کوئی آدمی نہیں ہے۔"

فقیر نے جواب دیا "میں ایک معمولی آدمی ہوں زمین کا رہنے والا ہوں۔"

رانی نے کہا "اچھا تو آپ انسان ہیں!! زمین پر بستے ہیں۔ لیکن انسان تو گھمنڈی ہوتا ہے۔ وہ کبھی جنت میں نہیں آسکتا۔ آپ یہاں کیسے آگئے؟"

فقیر نے کہا "میں نے گھمنڈ چھوڑ کر بہت دنوں تک ریاضت کی ہے۔ اپنی ساری زندگی قوم کی خدمت کے لیے وقف کر دی تبھی تو میں یہاں تک پہنچ سکا ہوں۔"

رانی یہ سن کر بہت خوش ہوئی اور کہا "آپ جیسے مہاتما کی زیارت کر کے مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میرے لائق کوئی کام ہو تو مہربانی کر کے بتائیے۔"

فقیر نے کہا۔ "دیوی! زمین پر رہنے والے انسان بڑے دکھی ہیں۔ وہ کپڑا پہننا بھی نہیں جانتے بے چارے جسم پر پتے لپیٹ لپیٹ کر اپنے دن کاٹتے ہیں۔ آپ مہربانی کر کے کوئی ایسی چیز مجھے دیجیے جس سے وہاں کے لوگ سوت کات سکیں کیونکہ روئی کی تو زمین پر افراط ہے۔ جہاں ایک بار لوگوں نے سوت کاتنا سیکھا۔ پھر کپڑا تیار ہونے کیا دیر لگتی ہے؟"

رانی نے کہا "اچھا تشریف رکھیے۔ خدا نے چاہا تو آپ کی خواہش پوری ہوگی۔"

اس کے بعد رانی نے پھرکی سے پھر وہی سوال کیا کہ وہ کس شکل میں زمین پر جانا پسند کرے گی۔ پھرکی نے آنکھوں میں آنسو بھر کر جواب دیا "میں تو یہاں سے کسی بھی حالت میں جانا نہیں چاہتی مگر آپ مجھے بھیجنا ہی چاہتی ہیں تو ایسی شکل بنا کر بھیجیے۔ جس سے میں تمام انسانوں کی خدمت کر سکوں۔ ان کا دل بہلا سکوں اور ان کی نظروں میں میری عزت بھی قائم ہو جائے۔"

رانی مسکرا کر بولی "پھرکی تو سچ مچ بڑی ہوشیار ہے۔ تو نے ایک ساتھ تین ایسی بڑی بڑی باتیں مانگی ہیں۔ جس سے تو زمین پر بھی ہمیشہ دیوی بن کر رہے گی۔ خیر کوئی بات نہیں میں تجھے اسی شکل میں بھیجوں گی جس سے تیری خواہش پوری ہونے میں کوئی رکاوٹ نہ رہے۔" یہ کہہ کر رانی نے چلو میں تھوڑا سا پانی لیا۔ اور کچھ منتر پڑھ کر پھرکی پر چھڑک دیا۔ پھرکی تکلی بن گئی

اور مالی نے وہ تکلی فقیر کو دے دی تکلی لے کر فقیر نے پوچھا اس سے کیا ہوگا۔ یہ تو بہت چھوٹی چیز ہے۔"

مالی نے جواب دیا۔ "چیز چھوٹی ضرور ہے۔ مگر اس سے لوگوں کا بہت بڑا کام نکلے گا۔ اس سے لوگوں کو سوت ملے گا جس سے انسانوں کے لیے کپڑے بنے جائیں گے۔ بچوں کے کھلونوں کا کام دے گی۔ اور فرصت کے وقت سیانوں کا دل بہلائے گی وہ جاہیں گے تو آپس میں خوش گپیاں کرتے ہوئے بھی اس سے سوت نکالتے رہیں گے۔ آپ اس تکلی کو لے جائیے کہتے ہیں اسی تکلی سے انسان نے کاتنا سیکھا اور تکلی کی ترقی کے ساتھ ہی ساتھ انسانی تہذیب کی ترقی ہوتی گئی۔

بقیہ زخمی چیتا۔

اس کے پنجے میرے جسم پر ڈھیلے پڑ گئے اور میں نے موقع غنیمت سمجھ کر اپنی پوری طاقت سے اسے دھکیل دیا۔ وہ پیچھے گرا۔ بندوق بھی اس کے منہ سے چھوٹ گئی۔ جلدی سے میں نے بندوق اٹھالی لیکن اتنی دیر میں چیتا پھر جست لگانے کے لیے بدن سمیٹ رہا تھا۔ میں نے بغیر نشانہ لیے لبلبی دبا دی۔

اسے میری خوش قسمتی کہیے کہ گولی اس کی کھوپڑی توڑتی ہوئی نکل گئی۔ چیتا دو تین فٹ ہوا میں اُچھلا اور زمین پر ڈھیر ہوگیا۔ گولی کی آواز پر کنور صاحب اور دوسرے لوگ درختوں سے اتر کر دوڑ پڑے ـــــ مجھ پر ایک بار پھر غشی طاری ہو رہی تھی ـــــ

بقیہ گینڈا

تک کوئی چودہ بچے کا وقفہ ہوتا ہے۔ جب تک یہ بچے خود غوطہ لگا کر مچھلی پکڑنا نہیں سیکھ لیتے اس وقت تک ان کا گزارا اس چربی پر ہوتا ہے جو ان کی کھال کے نیچے موجود رہتی ہے اور صدری (Jacket) کی طرح ان کے جسم کی حفاظت بھی کرتی ہے۔ تین سال کی عمر کے بچے مکمل جوان ہو جاتے ہیں اور خود انڈے دینے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

مذہبی کتابیں ہندی میں

مکتبہ جامعہ نے بچوں کے لیے بہت سی عمدہ مذہبی کتابیں شایع کی ہیں۔ یہ کتابیں مسلمانوں کے ہر طبقہ میں پسند کی گئیں اور ان کے بیسیوں ایڈیشن چھپ کر فروخت ہو چکے ہیں۔ آج بھی یہ کتابیں بہت سے اُردو مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہیں۔ ہندی کی تعلیم عام ہونے کے باعث اس کی ضرورت سمجھی گئی کہ ان کتابوں کو ہندی رسم الخط میں شایع کیا جائے چنانچہ ہم نے دو کتابیں ہمارے نبیؐ اور آں حضرتؐ ہندی پڑھنے والے بچوں کے لیے بہت احتیاط سے شایع کی ہیں۔

آں حضرتؐ ہندی میں حضرت محمدؐ کے نام سے چھپی ہے

ہمارے نبیؐ	۸۰ پیسے
حضرت محمدؐ	۸۰ پیسے

جناب خلیق انجم اشرفی

حیرت انگیز غوطہ خور پرندہ

گینٹ

گینٹ دنیا کا حیرت انگیز غوطہ خور پرندہ ہے
ایک انگریز ماہر حیوانات ان غوطہ خور چڑیوں کی چابک دستی
کا اعتراف ان الفاظ میں کرتا ہے۔

"اولمپک کھیلوں کے میدان کے باہر غوطہ خوری کا
بہترین مظاہرہ گینٹ چڑیاں پیش کرتی ہیں۔"

یہ چڑیاں پانی کی سطح سے تقریباً پچاس فٹ
اوپر تک اڑان کرتی ہیں اور اس کے بعد فضا ہی میں اچانک
اپنے پروں کو بند کرکے گولی کی طرح سیدھی نیچے آتی ہیں اور
پانی کی سطح سے اس زور سے ٹکراکر اس میں غایب ہوجاتی ہیں
کہ پانی کی چھینٹیں ہوا میں دس دس فٹ اوپر تک اچھلتی ہیں۔

سفید رنگ، زرد رنگ کی نوک دار چونچ، بطخ
جیسے پیر۔ یہ ہے گینٹ کا پورا حلیہ۔ یہ سمندری چڑیا زیادہ تر
انگلینڈ، آیرلینڈ اور اسکاٹ لینڈ
میں پائی جاتی ہے۔ کبھی کبھی یہ
فلوریڈا کے ساحلوں پر بھی نظر آجاتی ہیں۔

بہت سی دوسری سمندری چڑیوں کی طرح گینٹ
کی خوراک بھی مچھلی ہے اور وہ اپنی یہ خوراک انھی حیرت انگیز
اور قابلِ دید غوطوں کے ذریعہ حاصل کرتی ہے۔ کبھی کبھی ایسا
ہوتا ہے کہ غوطہ لگاتے وقت وہ مچھیروں کے سطح سمندر پر لگائے
ہوئے جالوں میں پھنس جاتی ہے۔

اس کے غوطوں کی قوت کا اندازہ اس بات سے
کیا جاسکتا ہے کہ وہ ان جالوں سے ۸۰ فیٹ تک کی گہرائی
سے نکالی گئی ہے۔ مچھیروں کا کہنا ہے کہ جب کبھی گینٹ
زندہ نکال لی جاتی ہے تو وہ چار چار پانچ پانچ زندہ مچھلیاں
اگلتی ہے۔

حیرت انگیز بات یہ نہیں کہ یہ مچھلیاں گینٹ کے
منہ میں رہنے کے باوجود زندہ رہتی ہیں بلکہ یہ ہے کہ اگر
انھیں اسی وقت پانی میں ڈال دیا جائے تو وہ اس طرح
تیرتی چلی جاتی ہیں جیسے اس کے منہ میں اتنی دیر تک رہنے
کے باوجود ان پر کوئی اثر نہ ہوا ہو۔

گینٹ سال میں ایک بار انڈے
دیتی ہے اور اس کے انڈے

دینے کی جگہیں مخصوص ہوتی ہیں جہاں وہ فروری کے آخر سے لے کر اکتوبر تک رہتی ہے۔ اپنے گھونسلے یہ چٹانوں کے ابھرے ہوئے حصوں پر بناتی ہے۔ ان گھونسلوں کے بنانے میں وہ سمندری گھاس کا استعمال کرتی ہے۔ یہ گھاس رفتہ رفتہ خشک ہو کر چٹان کے اس ابھرے حصے سے چپک جاتی ہے۔

ان کے گھونسلے ایک موسم سے دوسرے موسم تک کام دیتے ہیں۔ دوسرے موسم میں بھی وہ نئے گھونسلے بنانے کے بجائے پرانے ہی گھونسلوں کی اتنی مرمت کر لیتی ہے کہ وہ اگلے موسم تک رہنے کے قابل ہو جائیں۔ ماہر حیوانات کو گینٹ کے گھونسلوں سے بعض اوقات بڑی عجیب اور حیرت انگیز چیزیں ملی ہیں ان چیزوں میں مکھن لگانے کے چمچے، گولف کی گیندیں، ربر کے جوتے اور مور کی دم شامل ہیں۔

مادہ گینٹ صرف ایک انڈا دیتی ہے یہ انڈا ازرقی مائل نیلا ہوتا ہے۔ اس کو سینے کا کام نر اور مادہ دونوں باری باری انجام دیتے ہیں۔ بچہ تقریباً چوالیس دن کے بعد نکلتا ہے جس کے لیے والدین کو گھنٹوں اور کبھی کبھی دنوں تک بلاہلے جلے انڈے پر بیٹھے رہنا پڑتا ہے۔ جب مادہ چڑیا اس طرح انڈے پر بیٹھتی ہے تو نر اس کے لیے مچھلی شکار کر کے لاتا ہے۔

گینٹ کبھی کبھی غلط انڈے پر بھی بیٹھ جاتی ہے ایک آدمی کا کہنا ہے کہ ایک بار اس نے دیکھا کہ ایک گینٹ دوسرے گھونسلے تک گئی جہاں ایک دوسری گینٹ اپنا انڈا سے رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ گینٹ اپنے انڈے سے اٹھی اور جھومتی ہوئی ایک دوسرے گھونسلے کی طرف گئی جو چند گز کی دوری پر تھا۔ اتفاق سے اس گھونسلے میں بھی اس وقت کوئی نہ تھا انڈے کو دیکھ کر یہ گینٹ جھٹ اس پر بیٹھ گئی اور اسی درمیان میں پہلی والی گینٹ نے دوسری گینٹ کے انڈے پر قبضہ جما لیا۔

بچہ گینٹ جب انڈے سے نکلتا ہے تو اندھا اور گنجا ہوتا ہے۔ اس وقت اس کے پیر چھوٹے اور سر بڑا ہوتا ہے مگر چوبیس گھنٹے کے اندر ہی اندر اس میں اتنی طاقت آجاتی ہے کہ وہ اپنے پر پھیلا سکے۔ انڈے سے نکلنے کے آٹھویں دن اس کی آنکھیں کھلتی ہیں اور نویں دن

ایک گینٹ غوطہ لگاتی ہوئی

زور زور سے چیخنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ انڈے سے نکلنے کے بعد سات دن تک ماں باپ اس سے انڈے ہی جیسا سلوک کرتے ہیں یعنی وہ اب بھی اسے سیتے ہیں۔ بس اتنا ضرور ہو جاتا ہے کہ کھانے کے وقت وہ اسے چھوڑ دیتے ہیں۔

انڈے دینے سے بچے کی پہلی پرواز
باقی صفحہ ۱۶۲ پر

اُٹھو رے ساتھیو ہم کو نئی دنیا بسانا ہے
زمینِ ہند کو اپنا لہو دے کر سجانا ہے

یہ دشت و کوہ و دریا یہ سمندر چاند یہ سورج
عزائم کی بلندی سے انھیں بھی آزمانا ہے

بڑھو علم و عمل کی مشعلیں لے کر ہر اک جانب
جہالت اور غریبی کے اندھیروں کو مٹانا ہے

کرو وہ کام جس سے اہلِ دنیا دنگ رہ جائیں
ہمیں اپنے وطن کی شان دنیا میں بڑھانا ہے

زباں پیاری ادب پیارا بزرگوں کی دُعا پیاری
ہمیں اچھے عمل سے ہی مقدّر کو بنانا ہے

اٹھیں طوفاں آئیں آندھیاں ہمت نہ ہاریں گے
ہمیں ہر آزمائش میں قدم آگے بڑھانا ہے

خدا دے تندرستی حوصلہ جوشِ صداقت کا
وطن کی زندگی کو خوشنما گلشن بنانا ہے

(عرب کی ایک لوک کہانی)

جناب [illegible]

سمجھ دار وزیر

عرب کا ایک بادشاہ تھا۔ یہ بادشاہ بڑا ظالم تھا۔ رعایا کو ستانے میں اسے بڑا مزہ آتا تھا۔ بات بات پر رعایا کو سخت سزائیں دیتا اور گاؤں کے گاؤں جلا ڈالتا۔ اس کی حکومت میں سینکڑوں گاؤں ویران ہو چکے تھے۔ رعایا پریشان تھی۔ لوگ اپنے گھروں کو چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔

وزیر کو بہت فکر ہوئی اس نے اپنے جی میں کہا اگر یہی حال رہا تو سارا ملک تباہ ہو جائے گا۔ اس نے سوچا کہ کسی طرح بادشاہ کو سمجھانا چاہیے کہ ظلم کرنا بری بات ہے۔ اسے ہر روز سمجھاتا بھی لیکن بادشاہ پر اس کی باتوں کا کوئی اثر نہ ہوتا۔

ایک رات بادشاہ کے دماغ میں نہ جانے کیا آیا کہ سپاہی بھیج کر وزیر کو بلوایا۔ وزیر بھی گھبرایا، نہ جانے کیا بات ہے جو اتنی رات گئے بلاوا آیا ہے مگر وہ اٹھ کر بادشاہ کے محل میں پہنچا۔

بادشاہ نے وزیر کو دیکھتے ہی کہا:

"میرا دل گھبرا رہا ہے، میرے ساتھ سیر کو چلو۔"

بادشاہ اور وزیر گھوڑوں پر سوار ہو کر سیر کو نکلے اور محل سے نکل کر تھوڑی دیر میں شہر کے باہر چلے گئے۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ دونوں ایک گاؤں کے پاس پہنچے جسے دو دن پہلے بادشاہ کے حکم سے اجاڑ دیا گیا تھا۔ بادشاہ کو یہ حال دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔

یکایک ایک درخت پر الو بول اٹھا۔ پہلا الو چپ ہوا تو دوسرا بول اٹھا پھر تیسرا بول اٹھا۔ اور اس کے بعد تینوں چپ ہو گئے۔ وزیر جانوروں کی بولی سمجھتا تھا۔ بادشاہ نے پوچھا: یہ الو آپس میں کیا باتیں کر رہے ہیں۔

سمجھ دار وزیر کو موقع مل گیا، بولا:

"جان کی سلامتی پاؤں تو بتاؤں۔"

بادشاہ نے جان بخشی اور بتانے کو کہا

وزیر نے کہا:

"پہلا الو اپنی بیٹی کا بیاہ دوسرے الو کے بیٹے سے کرنا چاہتا ہے دوسرے الو نے سوال کیا کہ بیٹی کو جہیز میں کیا دوگے؟ پہلے الو نے کہا کہ یہی ویران گاؤں دے گا جس میں اس کے بچے بڑھیں۔ لیکن دوسرے الو نے کہا: "وہ ایک ویران گاؤں پر راضی نہ ہوگا وہ جہیز میں سات ویران گاؤں چاہتا ہے جس میں اس کے کئی پشت کے الو رہ سکیں۔ تیسرے الو نے دوسرے الو سے کہا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں، خدا بادشاہ سلامت کو زندہ رکھے سات گاؤں تو کیا سینکڑوں بلکہ ہزاروں گاؤں ویران ہو جائیں گے سارا ملک ویران ہو جائے گا۔ پھر تم سارا ملک لے لینا۔

بادشاہ سمجھ گیا اور بولا: "ان الوؤں سے کہہ دو کہ اس ملک سے چلے جائیں۔ اب کسی کو ستایا نہیں جائے گا اور کوئی گاؤں ویران نہیں ہوگا۔

بادشاہ محل میں واپس آیا اور وزیر کو بہت سا انعام دے کر واپس کیا۔

جناب خورشید شیدائی

مُلّا نصرالدین کے لطیفے

آپ نے شیخ چلّی، لال بجھکّڑ اور مُلّا دوپیازہ کا نام سُنا ہوگا۔ ان کے مزے دار لطیفے رہتی دنیا تک لوگوں کو ہنساتے رہیں گے۔ شیخ چلی اور لال بجھکّڑ کے متعلق کچھ یقین سے نہیں کہا جا سکتا لیکن مُلّا دوپیازہ کے بارے میں تو سب ہی جانتے ہیں کہ وہ اکبر بادشاہ کے دربار کا ایک رتن تھا تاریخ کی کتابوں میں آپ نے ان کا حال ضرور پڑھا ہوگا۔

ہر ملک میں ایک نہ ایک شیخ چلی یا لال بجھکّڑ گزرا ہے ترکی میں بھی ایک لال بجھکّڑ تھا۔ اس کا نام تھا مُلّا نصرالدین —— مُلّا صاحب آج سے ساڑھے سات سو سال پہلے (۱۲۰۸ء) میں ترکی کے ایک گاؤں "ہرتو" میں پیدا ہوئے۔ بڑے قابل اور عالم فاضل آدمی تھے مگر ہنسی مذاق ان کی گھٹی میں پڑا تھا۔ جان بوجھ کر ایسی باتیں کرتے کہ لوگ بے اختیار ہنس پڑتے۔ ہم آپ کو ملا صاحب کے چند لطیفے سُناتے ہیں۔

ایک مرتبہ ملا جی حجامت بنوانے گئے۔ حجام ازاری تھا اس نے آپ کی داڑھی بنانی شروع کی تو گال جگہ جگہ سے کٹ گیا۔ حجام نے کٹی ہوئی جگہوں پر روئی چپکا دی۔ ملا صاحب نے آئینہ دیکھا تو بولے —— "بس بھئی —— ! دوسرا گال رہنے دو ایک گال پر تم نے کپاس بو دی ہے، دوسرے پر میں گندم بوؤں گا۔"

ایک دن مُلّا جی نے لوگوں سے کہا "جب میں مر جاؤں تو مجھے کسی پرانی قبر میں دفن کرنا۔"

لوگوں نے حیرت سے پوچھا "کیوں —— ؟"

مُلّا جی بولے —— "بات یہ ہے کہ منکر نکیر مُردوں سے حساب کتاب لینے قبرستان میں آئیں گے تو وہ سمجھیں گے کہ اس قبر کے مردے کا حساب ہم لے چکے ہیں —— اور اس طرح میں حساب دینے سے بچ جاؤں گا۔"

مُلّا جی اپنے مکان کی چوتھی منزل پر تھے ایک سائل نے مُلّا کو نیچے بلایا اور کہا "میں سائل ہوں میری کچھ مدد کیجیے۔"

مُلّا سائل کو اپنے مکان کی چوتھی منزل پر لے گئے اور کہا —— "میں آپ کی فی الحال کوئی مدد نہیں کر سکتا۔"

مُلّا جی ایک دعوت میں بن بلائے شامل تھے۔ کسی نے پوچھا "آپ کس کے دوست ہیں۔"

مُلّا نے کھانے کی طرف اشارہ کر کے کہا "اس کے"

ایک دن مُلّا جی اپنے گدھے کو پیٹ رہے تھے کہ کسی نے کہا "اس بے چارے کو کیوں اتنی بے رحمی سے مار رہے ہو۔؟"

مُلّا نے کہا —— "معاف کیجیے گا میں نہیں جانتا تھا کہ اس سے آپ کی کوئی رشتہ داری ہے۔"

وضو ٹوٹ گیا

جناب عبدالمنان عمؔ بھابی

ایک تھا مرغا سُندر پیارا — سیدھا سادا، بھولا بھالا
صبح سویرے وہ اٹھ جاتا — گیت خدا کی حمد کے گاتا
اک دن گھر کی چھت پر چڑھ کر — کہنے لگا اللہ ہے برتر
اتنے میں اک بلّی آئی — دیکھ کے مُرغے کو للچائی
سوچا اس کو کیسے پھنسائیں — اور اپنی خوراک بنائیں
اک تدبیر اُسے پھر سوجھی — پھر مرغے سے وہ یوں بولی
سُن کے تمہاری پیاری اذاں — پہنچی ہوں میں آج یہاں
آؤ نیچے اے ہم راز — ادا کریں پھر مل کے نماز
اتنے میں اک کتّا آیا — کئی دنوں کا بھوکا پیاسا
دیکھ کے کُتّے کو بیچاری — فوراً اس نے لمبی تانی
بلّی کو جب بھاگتے دیکھا — شان سے پھر وہ مرغا بولا
ٹھہرو ٹھہرو اے بی میاؤں — تم کو نمازِ فجر پڑھاؤں
پہلے تو بلّی شرمائی — پھر اس نے یوں بات بنائی

ٹوٹ گیا ہے وضو تو اپنا
بہتر ہے تم پڑھ لو تنہا

ای مجھے پہچانو' کا

ہستہ آہستہ اپنی کوئی قیمتی چیز کھو رہے ہو لیکن تمھاری اِن'
ھارے ابا نے تو اس طرح آنکھیں پھیری ہیں جیسے مجھ سے
یں تم سے انھیں خدا واسطے کا بیر ہے۔ کاش میں انھیں سمجھا
کتی کہ مجھے بھولنے والا تمھا انھیں بھی بھول سکتا ہے۔ کاش ان
ں سمجھ میں آتا کہ آج مجھے نہ پہچاننے والی بھولی بھالی نظریں
وئی عجب نہیں جو کل انھیں بھی نہ پہچان سکیں۔

تم سے چھوٹ کر میں بلک بلک روتی رہی ہوں تم
ے جب بھی مجھے جدا کیا گیا میں نے سسک سسک کر یوں
انس لی ہے جیسے تمھارے سینے میں جگہ نہ ملی تو اس وسیع
نیا میں میرا دم گھٹ جائے گا۔

میں سہمی سہمی ڈری ڈری تمھاری کتابوں کے
تے میں جھانک کر دیکھتی ہوں اور غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے
ں جب اس بستے میں میرے لیے کہیں کوئی جگہ نہیں ہوتی،
ں چپکے سے کھسک آتی ہوں۔

پھر تمھارے ہونٹوں پر موتی بن کر رُلتی ہوں۔
ھاری زبان سے پھول بن کر جھڑتی ہوں۔ اور جب اپنی
ندگی کا یقین ہونے لگتا ہے تو تمھاری چھوٹی سی میز کی
ف بڑھتی ہوں کہ شاید تم نے مجھے یہاں کہیں کسی کونے میں
سپار رکھا ہو۔ لیکن میں یہاں بھی خود کو نہیں پاتی۔ آنسو چھپا
ر تمھاری میز کے پاس کھڑی تمھیں تکتی ہوں۔ ان ہونٹوں
ی ایک ایک جنبش کو تکتی ہوں جو ہلتے ہیں تو میرا سہارا لیے بغیر
طلب ادا نہیں کرسکتے۔

تم جانتے ہو یقیناً جانتے ہو کہ میرے سینے میں
ی خزانے دفن ہیں۔ میں نے سوچا تھا کہ یہ سارے خزانے
ے دریغ تم پر لٹا دوں گی۔ تمھیں مجھ سے میرا یہ حق تو نہیں
ینا چاہیے۔

میں نے تم سے کب
کچھ مانگا ہے۔ میں تو تمھیں سب کچھ دینا چاہتی ہوں۔ کتنی
مدت تک میں تمھارے ساتھ رہی۔ تمھارے ساتھ کھیلی تمھارے
ساتھ پلی بڑھی۔ تم نے میرا نام تک نہیں پوچھا لیکن میں نے
تمھارے نام کے لیے اپنے ہی جگر کا کوئی ٹکڑا کاٹ کر دے دیا۔

لیکن اب میں ہار رہی ہوں۔ میں تنہا تنہا سی رہی
ہوں اکیلی اکیلی پھر رہی ہوں۔ اب تو میرا یہ حال ہو گیا ہے کہ
میرے ہی لوگ مجھ پر ترس کھانے کے بہانے ظلم ڈھانے کے
درپے ہیں۔ تم نے آنکھیں کیا پھیریں کہ اب تو جس کا جی چاہتا
ہے میری غمخواری کرنے لگتا ہے۔ کوئی کہتا ہے میرا لباس بدل
دو۔ میں زندہ رہ جاؤں گی۔ گویا میں خود کچھ نہیں ہوں۔ جو
کچھ ہے میرا لباس ہے۔

کوئی سوٹ پہنا کر مجھے صاحب بنانا
چاہتا ہے تاکہ میں زندہ رہوں۔ کوئی
گیروے کپڑے پہنا کر مجھے سادھو بنانا
چاہتا ہے تاکہ میں زندہ رہوں۔ میں تو
چیختی ہوں آخر یہ جو کچھ میں نے پہن رکھا
ہے یہ سب کچھ آج کیوں بُرا ہو گیا؟

اور پھر تم نے لباس تبدیل کر کے کتنے مرنے والوں
کو آج تک بچا لیا ہے؟ کپڑے تبدیل کرنے سے شخصیت مر جاتی
ہے۔ لباس بدل کر آدمی بہروپیا تو بن سکتا ہے لیکن لباس
بدل دینے سے کوئی مریض شفا نہیں پا جاتا۔

اور پھر میں اپنے پہناوے میں بھی تو سجل ہوں۔
میرا اپنا لباس بھی تو مجھ پر سجتا ہے اور یہی پہناوا
یہی لباس میری پہچان ہے، میری صورت ہے۔ میرا مزاج
ہے میری فطرت ہے۔

میں یہ سب کچھ کھو کر جب خود کو بھی نہ
پہچان سکوں گی تو تم مجھے پہچان

سکو گے
مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ میری زندگی کو صرف تمہارے قرب کی ضرورت ہے۔
میرے کھلے، سادہ صفحوں کو تمہارے قلم کا لمس چاہیے۔
میری گرد میں اَٹی ہوئی کتابوں کو تمہاری نظروں کی حرارت چاہیے گرمی چاہیے۔
آؤ میری طرف بڑھو کہ میں تمہارا حق ہوں۔
مجھے اپنے ننھے منے بستے میں چھپا لو۔
مجھے بس اتنا سہارا دو کہ میں تمہاری چھوٹی سی میز تک پہنچ سکوں۔
میں تمہارے بستے اور تمہاری میز تک پہنچ لوں تو جینے کے جتن کر لوں گی۔ مجھے یہ سب گُر آتے ہیں۔ میں جینے کا سلیقہ جانتی ہوں۔ یہ بھی جانتی ہوں کہ کسی سمندر کو کوئی ریتیلا میدان پی نہیں سکتا۔
میری کہانی سن کر بھی مجھے نہ پہچاننے والے میرے ننھے ساتھی۔
مجھے غور سے دیکھو۔ اس سے پہلے کہ وقت نکل جائے مجھے پہچان لو۔
میرا نام "اُردو زبان" ہے۔

بوجھو تو جانیں

(۱)
شہر شہر میں نگر نگر میں
رہتا ہوں میں بڑوں کے گھر میں
مجھ سے خبریں باہر جائیں
باہر کی خبریں بھی آئیں

---

(۲)
میں لوگوں کا ساتھ ہوں دیتا
پھر بھی ہوں پاؤں میں رہتا

---

(۳)
مجھ میں کچھ بھی جان نہیں ہے + کسی سے بھی پہچان نہیں ہے
پھر بھی کرتا ہوں میں بات + سب کرتے ہیں معلوم حالات

---

(۴)
میرے گھر میں کوئی آئے   آئے تو وہ باہر نہ جائے

---

(۵)
تتلی مجھ سے آس لگائے   ہوا مری سب کو مہکائے

---

(۶)
میں ہوں کھیت میں رہنے والا + پہنوں میں موتی کی مالا
کون ہوں میں تم جان گئے کیا + مجھ کو تم پہچان گئے کیا؟

---

(۷)
بانس کا سا ڈنڈا ہوں میں بس
ہر دم مجھ میں رہتا ہے رس

محمد یقین الدین (اجمیر)
درجہ ششم (راجستھان)

(۱) ٹیلیفون (۲) جوتا (۳) پنکھا
(۴) مکڑی کا جالا (۵) پھول
(۶) بھٹا (۷) گنا

جناب شفق سہسرامی

شیرشاہ سوری کا مقبرہ

اپنے دیس ہندوستان کی تاریخ میں شیرشاہ سوری کا بہت بڑا مرتبہ ہے۔ وہ اپنی بہادری، حوصلے کی بلندی اور سوجھ بوجھ کی بدولت ایک معمولی سپاہی سے ترقی کرکے ہندوستان کا بادشاہ بن بیٹھا۔ آپ جانیے آجکل بڑے بڑے لوگوں کی سینچری منانے کا رواج بہت ہوگیا ہے۔ بہار خصوصاً سہسرام کے لوگ دسمبر (۶۷) میں شیرشاہ کی سنیچری منا رہے ہیں۔

جو سچ پوچھو تو شیرشاہ کی کہانی ایک ہونہار لڑکے کی کہانی ہے اور اس ہونہار لڑکے کا واسطہ سوتیلی ماں سے پڑا۔ اس سوتیلی ماں نے اس لڑکے کے ساتھ وہ سب زیادتیاں کیں جو ادنیٰ درجے کی سوتیلی مائیں اپنی سوتیلی اولاد کے لیے روا رکھتی ہیں۔ جب تک بن پڑا وہ ان زیادتیوں کو ہنسی خوشی سہتا رہا جب بات حد سے گذر گئی تو بے یار و مددگار گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ جون پور چلا گیا۔

جون پور پہنچ کر اس نے عربی اور فارسی پڑھی اور پھر وہاں کے صوبے دار کے ہاں نوکری کرلی۔ ایک مرتبہ وہ صوبے دار کے ساتھ شکار کو گیا۔ اور ایک خونخوار شیر کو تلوار کے ایک وار سے دو ٹکڑے کردیا۔ صوبے دار نے خوش ہوکر اسے شیرخاں کا خطاب دیا اور یوں سمجھو کہ جبھی سے وہ ترقی کے زینے پر چڑھنے لگا اور بس چڑھتا ہی گیا۔

اور اپنی سوجھ بوجھ اور خوش تدبیری سے شیرخاں نے اتنی طاقت حاصل کرلی کہ مغل شہنشاہ ہمایوں کے مقابلے پر آگیا اُسے شکست دی اور اس کی جگہ خود بادشاہت کی گدی سنبھال لی۔ شیرخان کی جگہ شیرشاہ کہلایا۔

شیرشاہ کو حکومت کا موقع بہت کم ملا بس پانچ سال مگر ان پانچ سال کی تھوڑی سی مدت میں اس نے سچ مچ معجزہ کر دکھایا۔

شیرشاہ نے سب سے بڑی بات تو یہ کی کہ ادھر سے چھور تک پختہ سڑکیں بنوائیں پہلی سڑک اس نے پنجاب سے سنار گاؤں تک بنوائی جو بنگال میں دریائے شور سے پانچ فرلانگ کے فاصلے پر ہے۔ یہی سڑک اب گرانڈ ٹرنک روڈ کہلاتی ہے۔ دوسری آگرے سے برہان پور تک تیسری آگرے سے جودھ پور تک چوتھی لاہور سے ملتان تک ان کے کنارے سایہ دار درخت لگوائے۔ ایک ہزار سات سو سرائیں بنوائیں۔ ہر سرائیں میں ہندو مسلمانوں کے لیے الگ الگ کمرے تھے۔ کمروں کے دروازوں پر پانی کے مٹکے رکھے رہتے تھے ہندوؤں کو پانی پلانے کے لیے برہمن اور مسلمانوں کے لیے مسلمان ہوتے تھے۔ سینکڑوں برس گذر گئے مگر یہ سڑکیں اب بھی آمد و رفت کا ذریعہ بنی ہوئی ہیں۔

اس نے گھوڑوں کے سدھار کے لیے داغنے کے رواج کو پھر سے قائم کیا۔ ہوتا یہ تھا کہ جاگیردار اور فوج کے افسر گھوڑوں کی تعداد تو کم کردیتے لیکن حکومت سے پورے گھوڑوں کا خرچ وصول کرتے تھے۔ اس کے علاوہ عمدہ گھوڑے

فروخت کر کے ان کی جگہ سے گھوڑے معائنہ کے وقت لے آتے اور رشوت وغیرہ کے ذریعہ اپنا کام نکال لیتے۔ شیر شاہ کی حکومت سے پہلے یہ بات چلی آرہی تھی اس کی روک تھام کے لیے علاؤالدین خلجی نے گھوڑوں کو داغنے کا قاعدہ شروع کیا تھا۔ جو گھوڑے سرکاری ہوتے انھیں داغ دیا جاتا تھا اس طرح ان کی پہچان رہتی تھی۔ لیکن یہ رسم ختم ہو گئی تھی۔ شیر شاہ نے داغنے کی رسم کو پھر سے جاری کیا اس کے علاوہ ہر فوج کے سپاہی کا حلیہ بالتفصیل لکھا جاتا ہے۔ اس لیے ضروری تھا کہ اکثر افسر سپاہیوں کی پوری تعداد نہ رکھتے اور معائنہ کے وقت کرایہ کے آدمی لاکر پیش کر دیتے۔ لیکن جب شیر شاہ نے پورا حلیہ لکھنے کی رسم جاری کی تو یہ شرارت بھی ختم ہو گئی۔

وہ بڑا جنگجو تھا اس کے ساتھ ہر وقت ایک لاکھ پچاس ہزار پیادے رہتے تھے۔ اس نے سہسرام میں اپنے لیے مقبرہ بنوانا شروع کیا تھا لیکن وہ اسے مکمل نہ کرا سکا اس کے بیٹے سلیم شاہ نے اسے پورا کیا۔

یہ مقبرہ تالاب کے بیچوں بیچ بڑی شان سے کھڑا ایک شہنشاہ کی عظمت کا اب اعلان کر رہا ہے جس وقت مقبرے کی بنیاد ڈالی جا رہی تھی شیر شاہ نے اعلان کیا تھا اس کی بنیاد اس شخص کے ہاتھوں پڑے گی جس نے تہجد کی نماز کبھی قضا نہ کی ہو۔ پورے سہسرام میں ایک بھی ایسا آدمی نہ نکلا، اگر کوئی تھا تو وہ خود شیر شاہ تھا۔

مقبرے کے اندر شیر شاہ اور اس کے عزیزوں، رشتے داروں کی قبریں ہیں۔ مقبرے میں قرآن شریف کی آیتیں پتھروں پر کندہ ہیں۔ کہتے ہیں جب شیر شاہ کا انتقال ہو گیا اور دلی پر پھر سے ہمایوں کا قبضہ ہو گیا تو وہ سہسرام آیا اور شہر کے داخلی دروازے سے توپ کا ایک گولا روضے پر مارا لیکن گولا عمارت کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکا سوائے ایک بڑے سوراخ کے جواب بھی موجود ہے۔ گولے سے عمارت کو نقصان اس لیے نہیں پہنچا کہ اندر قرآن پاک کی آیتیں تھیں۔

ایک دلچسپ واقعہ اور بیان کیا جاتا ہے شیر شاہ کی قبر پر سونے کا ایک گھنٹہ رکھا رہتا تھا۔ ایک چور نے اُسے چرانا چاہا۔ اور وہ تالاب تیر کر (پہلے مقبرے کے اندر جانے کے لیے راستہ نہیں تھا راستہ تو انگریزوں کے وقت میں بنا ہے) جب وہ چور مقبرے میں پہنچا تو رات کے بارہ بج رہے تھے چور نے گھنٹے کو بجا کر بھاگنا چاہا لیکن اس کا ہاتھ پہنچوں سے کٹ کر اس گھنٹے کے ساتھ چھت میں ٹنگ گیا۔ اب لوگ دوسری منزل کے روشندان سے اسے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو بڑی دلچسپ بات ہوتی ہے جس روشندان سے دیکھیے الگ چیز معلوم ہوگی۔ کسی میں سے کبوتر معلوم ہوگا کسی میں طوطا، کسی میں ہاتھ، کسی میں گھنٹہ اور کسی میں ہنسوا، مقبرہ دیکھنے ملکی اور غیر ملکی لوگ برابر آتے رہتے ہیں اور ہر آنے والا اس ہاتھ کو ضرور دیکھتا ہے۔

مقبرے سے کئی سرنگیں مختلف مقامات کو گئیں ہیں۔ ایک رہتاس کے قلعہ کو دوسری دہلی کو۔ انگریزوں نے اس کا بھید معلوم کرنے کی بہت کوشش کی لیکن ایک تو وہ مخدوش ہو گئی تھیں پھر روشنی اندر جا کر دھندلی ہو جاتی اور اندر بڑی بھیانک آوازیں بھی گونجنے لگتیں۔ مجبور ہو کر سرنگ کے دہانے کو بند کرا دیا اور اس پر انگریزی میں شیر شاہ کی مختصر کندہ کر دی۔ مقبرے کے چاروں طرف بہت بڑا تالاب ہے۔ مقبرے کے اندر گلاب اور موسمی پھولوں کے تختے ہیں، گلاب ہر رنگ کا ہے جو ہر موسم میں مسکراتا رہتا ہے

جناب اکرام احمد

ایپی ڈائی اسکوپ

تصویروں کا شوق کسے نہیں ہوتا کسی کو دیکھنے کا شوق ہوتا ہے کسی کو بنانے کا، جمع کرنے کا۔ عمارتوں کی تصویریں جانوروں کی تصویریں، پھولوں کی تصویریں۔ دوست دیکھتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تصویر بہت چھوٹی ہے اور دیکھنے والے بہت سے۔ ہر ایک چاہتا ہے کہ پہلے میں دیکھوں۔ ہم آپ کو ایک ایسا آلہ بنانا سکھاتے ہیں جس سے آپ چھوٹی تصویر کو بڑا کر کے اپنے دوستوں کو دکھا سکیں۔

اس آلے کا نام ایپی ڈائی اسکوپ — (Epidia-scope) ہے۔ سینما گھروں میں اس کے ذریعہ اشتہار دکھائے جاتے ہیں۔ اچھے اسکولوں میں اس کے ذریعہ استاد چھوٹی تصویر کو بڑا کر کے پوری جماعت کو دکھاتے ہیں اس کی کم از کم قیمت ہزار بارہ سو روپے ہوتی ہے ہم آپ کو یہاں ایک آسان اور سستا ایپی ڈائی اسکوپ بنانے کی ترکیب بتاتے ہیں۔

ضروری سامان ۱۔ ایک کنویکس لینس (Convex lens) یہ کسی بھی چشمے والے کی دکان سے مل سکتا ہے۔

۲۔ دو چھوٹے ہموار آئینے۔ یہ بساطی کی دکان سے مل سکتے ہیں۔

۳۔ ایک ۱۰۰ واٹ کا بلب

۴۔ بلب ہولڈر، تار، پلگ وغیرہ

۵۔ گتا،

۶۔ گتے کا ڈبہ بنانے کے لیے قینچی، لئی، کاغذ وغیرہ

بنانے کی ترکیب

سب سے پہلے گتّے کا 25 سینٹی میٹر لمبا 15 سینٹی چوڑا اور ۴۰ سینٹی میٹر اونچا ایک ڈبہ بنا لیجیے
۴۰ سینٹی میٹر × 25 سینٹی میٹر سائز کے ایک گتے کو اس طرح لگایے کہ یہ دروازے کی طرح کھل سکے بند ہو سکے۔ ڈبے کے اندر کالا کاغذ چپکا دیجیے۔
گتے کے کواڑ میں 15 سینٹی میٹر لمبی اور آدھی سینٹی میٹر چوڑی ایک دراز بنا لیجیے (جیسا کہ شکل نمبر ۱ میں دکھایا گیا ہے) اس دراز کے ذریعہ تصویر رکھنے اور بدلنے میں آسانی ہوگی۔
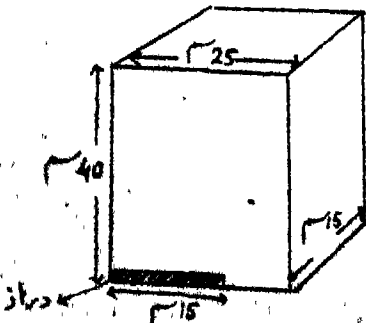
شکل نمبر ۲ میں دکھائے گئے طریقے سے ڈبے کے اوپر کے حصے میں ایک

ہوا آئینہ ۴۵ کا زاویہ بناتے ہوئے چپکا دیجیے۔

موٹے کاغذ کو لپیٹ کر ایک ایسی نلی بنایئے جس میں لینس فٹ کیا جا سکے۔ اب اوپر والے آئینے کے سامنے ایک اتنا بڑا گول سوراخ بنایئے کہ لینس والی نلی پھنستی ہوئی جائے۔

سامنے کی دیوار میں نیچے کی طرف ایک ۱۰۰ واٹ کا بلب لگایئے۔ بلب کا نچلا حصّہ سیاہ کر دیجیے۔ بلب کے اوپر دوسرا آئینہ اس طرح لگایئے کہ بلب کی روشنی اس آئینے سے ٹکرا کر تصویر پر پڑے اور پھر وہاں سے ٹکرا کر اوپر والے آئینے پر پڑے۔ لیجیے ایپی ڈائی اسکوپ تیار ہے۔

استعمال کا طریقہ
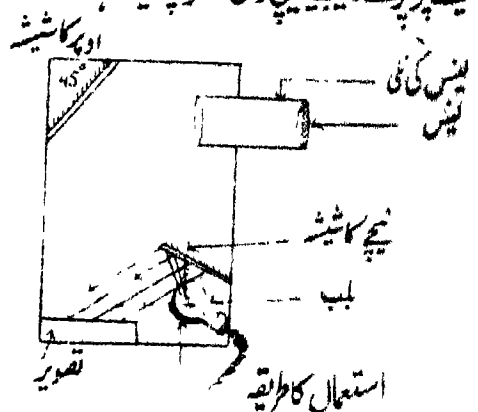
اندھیرے کمرے میں ایپی ڈائی اسکوپ لے جایئے کمرے کی دیوار سے تقریباً ۲ میٹر کی دوری پر اس طرح رکھیے کہ لینس دیوار کی طرف رہے۔ دراز سے کوئی تصویر ڈبے کے اندر رکھ دیجیے۔ بلب جلایئے۔ دیوار پر بڑی سی تصویر دکھائی دے گی۔ اگر دھندلی ہو تو لینس کی نلی کو آگے پیچھے کھسکا کر فوکس کر لیجیے۔ اپنے دوستوں کو بلا کر دکھایئے۔ سب آپ کی کارگری کی داد دیں گے۔

اگر دیوار پر کاغذ لگا دیا جائے تو اس سے چھوٹی تصویر کا چارٹ بنانے میں بھی آسانی ہو جائے گی۔ بڑی تصویر کرکے پنسل سے ٹریس کر لیجیے۔

لطیفے

(۱) ایک شخص ایک فقیر کی پگڑی لے کر بھاگ گیا۔ فقیر قبرستان میں جا کر بیٹھ گیا۔ لوگوں نے کہا وہ تو تمھاری پگڑی لے کر شہر کی طرف بھاگا ہے تم قبرستان میں کیوں بیٹھے ہو؟

فقیر نے کہا "آخر کار تو اسے یہیں آنا ہے۔"

(۲) ایک چور ایک آدمی کے گھر گھوڑا چوری کرنے گیا۔ اتفاق سے پکڑا گیا۔ مالک مکان نے کہا "اگر تو مجھے گھوڑا چوری کرنے کی ترکیب بتا دے تو میں تجھے چھوڑ دوں گا۔" چور نے کہا "اچھا" اور گھوڑے کی رسّی کھولی، لگام پکڑی اور اس پر سوار ہو گیا اور تیزی سے گھوڑا لے بھاگا اور بولا: "دیکھو اس ترکیب سے چوری کی جاتی ہے۔"

(۳) ایک فقیر نے ایک کنجوس آدمی سے سوال کیا۔ کنجوس نے کہا "اگر تو میری ایک بات مان لے تو جو تو مانگے گا دوں گا۔" فقیر نے کہا "وہ کیا بات ہے؟" کنجوس نے کہا: "آئندہ مجھ سے کبھی کوئی چیز نہ مانگنا!"

(فارسی سے ترجمہ)
جمشید اشرف

جناب سید ابراہیم فکری

مور

ایک مشہور کہاوت تو آپ نے سنی ہوگی۔ ”جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا۔“ اس کہاوت کا مطلب ہے اگر دوستوں اور عزیزوں سے دور یا پردیس اور غیر جگہ میں اپنی سخاوت اور فیاضی، امیری یا مال و دولت رکھے تو وہ کس کام کی۔ اسے کون جانچنے، دیکھنے اور پرکھنے جاتا ہے۔ مال و دولت کا مزا اور لطف اپنے ہی دیس میں ہے۔ ایسے ہی موقعوں پر یہ مثل بولتے ہیں۔

ڈیل ڈول میں یہ گدھ کے برابر ہوتا ہے۔ ہمارے دیس میں قریب قریب سب ہی علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ لنکا اور برما میں بھی مور ہوتے ہیں۔ مگر اتنے خوب صورت اور اتنے خوش رنگ نہیں ہوتے۔ چونچ اس کی لمبی نوکدار سیدھی دو انچ کے برابر۔ سر پر تاج یا کلغی پنکھے جیسی ترچھی، گھونگرالے بال نیلے نیلے رنگ کے۔ گردن گہری نیلی، چمکیلی، مخمل جیسی تنی ہوئی۔ جسم تین سوا تین فٹ لمبا، سلیٹی بھورے ہرے ہرے پروں سے آراستہ۔ وزن تقریباً پانچ کلو۔ دُم ساڑھے چار فٹ لمبی، سینکڑوں پروں سے سجی ہوئی۔ لمبے پروں کے دونوں طرف نیلے اودے باریک اور مہین مہین سے بال۔ کنارے پر پیسوں کے برابر گول گول آدھے چاند یا آنکھ جیسے داغ اور نشان۔

جب دُم پھیلاتا ہے تو ایک ڈھال سی بن جاتی ہے۔ جس میں سینکڑوں آنکھیں دکھائی دیتی ہیں۔ اس کی رنگ برنگی دُم ہی میں اس کی خوب صورتی چھپی ہوئی ہے اس کی دُم کے رنگ تو اصل میں دو یا تین ہی ہیں یعنی نیلے، ہرے اور کالے۔ مگر جب ایک رنگ کی پرچھائیاں دوسرے رنگوں پر پڑتی ہے تو کئی رنگوں کی چمک دمک نظر آنے لگتی ہے۔

اس کے پروں کی نمائش گرمی کے جانے اور بارش کے آنے سے زیادہ تر دیکھنے میں آتی ہے۔ لوگوں کا عام خیال ہے کہ یہ بارش کے موسم کی پیشین گوئی کرتا ہے اور اس سلسلے میں اس سے بہت ہی کم غلطی ہوتی ہے۔ مور کو اپنے پروں اور دُم پر ناز ہے اس کا رنگیلا اور سجیلا پن اور زیادہ نکھر آتا ہے جب اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کی مادہ ”مورنی“ اسے دیکھ رہی ہے۔

”مور“ ایک خاص انداز سے پاؤں اٹھا کر اپنے پروں سے بھری دم اٹھائے جنگلوں میں چلتا ہے تو بہت ہی بھلا لگتا ہے اور دیکھنے والوں کو اتنے پروں کے ساتھ جنگل میں تیزی سے چلنا تعجب میں ڈال دیتا ہے۔ اس لیے کہ اتنا بڑا بھار اس کے ساتھ ہونے پر بھی اس کی لچک ہوشیاری اور تیزی میں ذرا فرق نہیں آتا۔

پت جھڑ کے موسم میں اس کے پر جھڑنے لگتے ہیں اور جب درختوں پر پتے آنے شروع ہوتے ہیں تو اس کے پر بھی نکلنے

شروع ہو جاتے ہیں۔ ہر سال پر جھڑتے ہیں اور ہر سال نکلتے ہیں۔

مور اپنی مورنی کے سامنے ناچنے کا شوقین ہے۔ وہ مورنیوں کے جھنڈ کے سامنے لگاتار ناچتا ہے اور جب چند مور باری باری ناچنے پر آتے ہیں تو جنگل میں منگل ہو جاتا ہے۔ ناچتے وقت اس کے پر سیدھے ہو کر پھیل جاتے ہیں اور ان میں تھرتھراہٹ سی آجاتی ہے۔ پھر یہ گردن تانے پروں کو پھیلائے اپنے پروں کو ایک خاص انداز سے اٹھاتا ہے۔ کبھی مورنی کے سامنے ہوتا ہے تو اپنے چھتر سمیت گھوم جاتا ہے یا اس وقت اپنے حسن کے ہر ہر پہلو کی جی کھول کر نمائش کرتا ہے۔ بڑے جوش اور ولولے کے ساتھ ناچتا ہے اس وقت اس کی آنکھوں سے خوشی کی وجہ سے ایک قسم کا رس (بوند) ٹپکنے لگتا ہے۔

مور کے پیر بڑے بھدے اور بدصورت ہوتے ہیں اس کے خوبصورت جسم اور رنگ برنگے پروں سے بالکل میل نہیں کھاتے یہی بدنما پیر اسے ناچنے میں رکاوٹ ڈالتے ہیں۔ لوگوں میں یہ بات مشہور ہے کہ جب یہ اپنے بدصورت پیروں کی طرف دیکھتا ہے تو شرما جاتا ہے اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگتے ہیں اور ناچتے ناچتے رک جاتا ہے۔

مور کے پیر بدنما کیوں ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں ابلیس حضرت آدم و حوا کے پاس جنت میں مور ہی کی مدد سے پہنچا تھا۔ یہ سانپ کی شکل میں مور کے پیروں سے لپٹ کر جنت میں جا داخل ہوا۔ آدم پر تو اس کا بس نہیں چلا۔ ہاں حضرت حوا کو بہلا پھسلا کر خدا کے حکم کی نافرمانی کروا دی۔ اور آدم و حوا دونوں کے دونوں جنت سے نکالے گیے اور انھیں دنیا میں بسا دیا گیا۔ مور کو ادھر یہ سزا ملی کہ اس کے پیروں کو بدصورت کر دیا گیا۔ اور مور اور سانپ میں دشمنی ہمیشہ کے لیے ٹھن گئی۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ بدنما پیر دے کر خدا نے اس کے حق میں اچھا ہی کیا ورنہ یہ بہت مغرور ہو جاتا اور شاید خدا کی طرف سے دیے گیے اس حسن کا احسان ناشکری ہوتا۔

مورنی مور کی طرح رنگیلی سجیلی نہیں ہوتی جسم میں نر سے چھوٹی وزن میں بھی ہلکی۔ دُم بھی مور کے مقابلے میں چھوٹی سی، گہرے بھورے رنگ کی۔ اس کے سر پر بھی مور کی طرح تاج یا کلغی ہوتی ہے مگر اس پر بھی وہ اتنی خوبصورت نہیں لگتی۔

اگر مورنی بھی مور کی طرح خوش شکل اور رنگ برنگے پروں سے سجی ہوئی ہوتی تو انڈوں کی دیکھ ریکھ کا کام بہت مشکل ہو جاتا مورنی جھاڑیوں اور غیر آباد مکانوں کی چھتوں پر انڈے دیتی ہے۔ اس زمانے میں مور اپنی مادہ سے بہت چھیڑ چھاڑ کرتا ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ انڈوں کو توڑ ڈالتا ہے۔

تیس دن میں بچہ تیار ہو جاتا ہے۔ اس کے ننھے ننھے بچے ٹینس کی گیند کے برابر ہوتے ہیں۔ ان کی لمبی گردن پر تیلی سی اونچی اٹھی ہوئی کلغی ہوتی ہے۔ بچے بڑی تیزی سے بڑھتے ہیں۔ کچھ دنوں بعد ان کی بھدی شکل بھی بدل جاتی ہے اور اپنی ماں کی طرح ان کا بدن بھی سڈول ہو جاتا ہے۔ تین برس کی عمر میں نر کے پر اور رنگ و روپ میں نکھار اور خوبصورتی پورے طور پر چھا جاتی ہے۔

مورنی تین سال کی عمر میں انڈے دینے لگتی ہے مگر یہ لگاتار انڈے نہیں دیتی۔ ایک جھول میں کم سے کم تین اور زیادہ سے زیادہ پانچ انڈے۔ انڈے دینے کا زمانہ جون سے اگست تک ہوتا ہے۔

مور پیدائشی طور پر ایک باز

شرمیلا اور خود پسند ہے مزاج میں چڑچڑا پن بھی ہے۔ آواز بھی بے حد تیز ہوتی ہے چھوٹی آواز کا آن کا آن جیسی ہوتی ہے ایک بار میں چھ سے آٹھ مرتبہ سر اور گردن کی حرکت کے ساتھ بولتا ہے۔ تیز آواز بڑی بلی کی طرح ہوتی ہے یعنی "می یا ون" یا منیہ آؤ۔

یہ زیادہ اڑ نہیں سکتا اس لیے چلنے والے پرندوں میں گنا جاتا ہے۔ اپنے پیروں کو بڑھا کر چلتا ہے اور عام طور پر اسی وقت اڑتا ہے جب کوئی پہاڑ، ندی، نالہ پار کرنا ہو یا ایکا ایکی اسے اپنا بچاؤ کرنا ہو۔ یہ کھیت کھلیان کو نقصان نہیں پہنچاتا۔ خوشوں اور بالوں کو خراب نہیں کرتا نہ انھیں نوچتا کھسوٹتا ہے۔

مور اپنے حسن و جمال کے ساتھ ایک مفید پرندہ بھی ہے۔ سانپ کے کاٹنے پر اس کی ہڈی گھس کر لگانے سے زہر دور ہو جاتا ہے۔ اس کے پر جلا کر جلے ہوئے زخم پر لگانا بڑا مفید ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بیسوں بیماریوں میں کام آتا ہے۔ اس کے پروں سے ٹوکریاں اور پنکھے بنائے جاتے ہیں مزاروں اور مندروں میں اس کے پروں کے مورچھل استعمال ہوتے ہیں۔

کچھ پرندوں کی خاص نسلوں کو "محفوظ پرند" قرار دینے کے سلسلے میں ۱۹۶۰ء میں پرندوں کی بین الاقوامی کونسل کا ایک جلسہ دنیا کے سب سے بڑے شہر جاپان کی راجدھانی ٹوکیو میں ہوا اس کونسل نے یہ سفارش کی تھی کہ ہر ملک کو سرکاری طور پر کسی پرندے کو اپنا "قومی پرند" قرار دینا چاہیے۔ ہندوستان کے سامنے بہت سے پرندے تھے اس موقع پر ہندوستان نے قومی پرند کے طور پر مور کا انتخاب کیا۔ اب ہم سب کا فرض ہے قومی سرمائے کی طرح اس کی پوری حفاظت کریں اور پورا پورا خیال کریں قدرت کے اس انمول پرند کو نقصان نہ پہنچے۔

بچّوں کیلئے مضمون نگاری کا عظیم الشان کل ہند مقابلہ

منجانب:- ادارہ "بیدار" نمبر ۳/۴۰ کٹّہ تالاب میر جملہ حیدر آباد ۲ء

بچوں میں ادبی دلچسپی پیدا کرنے اور ان کے اندر ادبی اخلاقی ذوق کو ابھارنے کے لیے ادارہ "بیدار" حیدر آباد کی جانب سے کل ہند پیمانے پر بچوں کا ایک تحریری مقابلہ منعقد کیا جا رہا ہے جس میں ملک کے بارہ سال سے اٹھارہ سال تک کے تمام بچے بچیاں حصّہ لے سکتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ملک کے نوجوان اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والے تمام بچے بچیاں اس مقابلہ میں زیادہ سے زیادہ شریک ہو کر اپنے بلند ذوق کا ثبوت دیں گے۔ اس مقابلہ کے لیے کوئی خاص عنوان مقرر نہیں اپنی مرضی سے کسی بھی عنوان پر کوئی مضمون، کہانی یا افسانہ لکھ سکتے ہیں جو کم سے کم پانچ اور زیادہ سے زیادہ پندرہ صفحات پر مشتمل ہو مضمون ان کا اپنا اور انتہائی پاکیزہ، اخلاقی سبق آموز اور عبرت انگیز ہونا ضروری ہے غیر مہذب اخلاق سے گرے ہوئے اور ذہن و دماغ کو خراب کرنے والے مضامین قطعی قابل قبول نہ ہوں گے۔ اوّل۔ دوم سوم اور چہارم ہونے والے مضامین، کہانیوں یا افسانوں پر علی الترتیب چالیس، پچیس، پندرہ اور دس روپے کے نقد انعامات دیے جائیں گے اور انھیں ملک کے مشہور بچوں کے رسالوں میں شائع کیا جائے گا اور ادارہ کی طرف سے کتابی شکل میں بھی شائع کیا جائیگا۔ اس کے علاوہ خصوصی ترغیبی انعامات بھی رکھے گئے ہیں جو کتابی شکل میں دیے جائیں گے مضامین کی وصولی کی آخری تاریخ ۲۰ جنوری ہے مزید تفصیلات، شرائط، فارم ... کیلیے اپنے ... کے دو ٹکٹ روانہ فرمائیں۔

اور وطن کی شان بڑھاؤ

جناب بدرالدین

چنو آؤ منّو آؤ
بھیّا آؤ بہنا آؤ
آؤ ہم سے ہاتھ ملاؤ
اور وطن کی شان بڑھاؤ

تم سب ہو بھارت کے نواسی
سُندر دیش کے سُندر باسی
اب تو لگا دو جان کی بازی
اور وطن کی شان بڑھاؤ

تم ہو پڑھنے والے بچے
آن پہ لڑنے والے بچے
اب بن جاؤ بات کے سچے
اور وطن کی شان بڑھاؤ

تم اس دیش کے ویر بنو گے
ہمت کی تصویر بنو گے
سب کے لیے دل گیر بنو گے
اور وطن کی شان بڑھاؤ

آؤ اب کچھ کام دکھاؤ
بستر لو اسکول کو جاؤ
بڑھتے جاؤ چڑھتے جاؤ
اور وطن کی شان بڑھاؤ

صرف خدا سے ڈرنا سیکھو
نیک چلن پر چلنا سیکھو
سچائی پر مرنا سیکھو
اور وطن کی شان بڑھاؤ

تعلیمی میلے کی رپورٹ

جامعہ کا تعلیمی میلا ہمیشہ اکتوبر کے آخری ہفتے میں منایا
تا ہے۔ جامعہ کی بنیاد آج سے ۴۶ سال پہلے ۱۹ر اکتوبر
پڑی۔ اس سال میلے کی تاریخیں ۲۶ - ۲۷ - ۲۸ اکتوبر
ر کی گئی تھیں۔

لیکن جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں۔ میلے کی تیاری
توں پہلے سے شروع ہو جاتی ہے۔ اور جامعہ کی آبادی
دن ہو یا رات ایک خاص چہل پہل اور رونق نظر آتی ہے
معہ کے بچے اور بڑے اس میلے کے لیے ایسی تیاری کرتے
ے عید یا دیوالی کے لیے کرتے ہیں۔

آخر خدا خدا کر کے ۲۶ر تاریخ آئی۔ صبح ساڑھے
بجے میلے کا پروگرام شروع ہوا۔ جامعہ کے سابق طالب علم
م حارث صاحب نے میلے کا افتتاح فرمایا اور بڑے
کلے الفاظ میں جامعہ کی تاریخ اور اس کے مقاصد پر
ڈالی۔

اس کے فوراً بعد زبان کے مسئلے پر سمپوزیم ہوا۔
مسئلے سے دلچسپی رکھنے والے پڑھے لکھے طبقے نے اس
حصّہ لیا۔ دوسری طرف عورتوں کے پنڈال میں افسانے
محفل آراستہ کی گئی۔ محترمہ صالحہ عابد حسین
دوسری اردو، ہندی افسانہ
خواتین نے اس میں حصّہ لیا۔

شام کو (مدرسہ ثانوی کے اہتمام میں) گاندھی
ٹرافی کے مقابلے شروع ہوئے۔ معمول کے مطابق دہلی شہر
کے ہائر سکنڈری اسکولوں نے ان مقابلوں میں حصّہ لیا۔ یوں تو
ان مقابلوں کا سلسلہ ۲۱ر اکتوبر سے شروع ہو گیا تھا۔

۲۱ر اکتوبر کی سہ پہر کو "فوری مصوّری" کا مقابلہ ہوا۔ اس
کے علاوہ وقت کے وقت عنوان دے کر انگریزی، اردو
ہندی میں مضمون لکھوائے گئے۔ ان چاروں مقابلوں
میں دہلی کے اسکولوں کے لڑکوں اور لڑکیوں دونوں نے
شرکت کی۔

لیکن ۲۶ر کی شام کو صرف فوک سانگ، گروپ سانگ
ایکشن سانگ، مونو ایکٹنگ کے مقابلے تھے۔ یہ مقابلے غیر معمولی
طور پر دلچسپ تھے۔ پنڈال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ مجموعی طور پر
ام بی گرلز ہائر سیکنڈری اسکول کے نمبر سب سے زیادہ تھے۔ اس
لیے گاندھی ٹرافی اسی اسکول کو ملی۔ مدرسہ ثانوی جامعہ اور
بھارتیہ ودیا بھون پبلک اسکول دوم آئے تھے۔ جامعہ کی
روایت کے مطابق بھارتیہ ودیا بھون کو رنر اپ قرار دیا گیا۔

۲۷ر اکتوبر کی صبح کو بیت بازی کا مقابلہ تھا۔ یہ
مقابلہ ہمیشہ دلچسپ ہوتا ہے۔ اس مرتبہ بھی بہت
کامیاب رہا۔ بعض بچوں سے
اچھی اچھی نظمیں بھی پڑھوا کر سنی گئیں۔

یہ نقلہ مدرسہ ثانوی کی رپورٹ سے ہم بیدھوں کا نون نقل کر رہا ہے۔ اس کا مطلب آپ کے ڈرائنگ کے ماسٹر صاحب ہی سمجھا سکیں گے۔

شام کو مدرسہ ابتدائی کے اہتمام میں نہرو ٹرافی کے مقابلے ہوئے۔ اس مرتبہ ایک نئی بات ہوئی شہر کے پرائمری اسکولوں کے علاوہ مڈل اسکول بھی ان مقابلوں میں شریک ہوئے۔ مدرسہ ابتدائی کے علاوہ شہر کے ۲۵ مدرسوں نے ان مقابلوں میں حصہ لیا۔

مصوری اور تحریری و تقریری مقابلے پہلے ہی ہو گئے تھے۔ تحریری مقابلے میں ایک عنوان کا اعلان پہلے سے کر دیا گیا تھا "آج کے بچے کل کے لیڈر" دوسرا عنوان وقت کے وقت دیا گیا تھا۔ تندرستی ہزار نعمت ہے۔

۲۷ر اکتوبر کی شام کو نظم پڑھنے۔ ایکشن سانگ جانوروں کی آوازوں کی نقل اتارنے اجتماعی گیت یا اسکٹ وغیرہ کے مقابلے ہوئے۔ یہ پروگرام ڈھائی بجے شروع ہوا اور وہیں سات بجے جا کر ختم ہوا۔ لوگوں کی دلچسپی کا یہ حال تھا اتنا لمبا چوڑا اینڈال آخر تک بھرا رہا۔

یہ سن کر آپ کو خوشی ہو گی کہ اتنا اہم اتنا شان دار پروگرام بچوں کی حکومت (مدرسہ ابتدائی جامعہ) کے صدر محمد راشد سلمہ نے بہت ہی سلیقے سے بڑی خوش اسلوبی سے چلایا۔

ان مقابلوں میں مجموعی حیثیت سے مدرسہ ابتدائی جامعہ کے نمبر سب سے زیادہ تھے اور مڈل اسکول مٹیا محل جامع مسجد دہلی کا نمبر دوسرا تھا۔ مگر جامعہ کی پرانی روایت کے مطابق نہرو ٹرافی اسی مدرسہ کو دی گئی۔ پچھلے سال بھی یہی مدرسہ ٹرافی لے گیا تھا۔

محترم شیخ الجامعہ محمد مجیب صاحب نے آخر میں مختلف آئٹموں میں اوّل، دوم، سوم آنے والے بچوں کو انعام تقسیم کیے اور تالیوں کی گونج اور خوشی کے نعروں کے درمیان ٹرافی اردو اسکول مٹیا محل کو مرحمت فرمائی۔

۲۸ر اکتوبر کی صبح کو نرسری اسکولوں کے بچوں کا پروگرام بڑا مزے دار بہت دلچسپ تھا۔ اس کے بعد محفل موسیقی، جامعہ کے کالجوں اور اسکولوں کے بچوں نے اس میں حصہ لیا۔

شام کو مکتبہ جامعہ کی طرف سے فن اور فنکار کے زیر عنوان اردو میں ڈرامے کی ترقی کی تاریخ کو ڈرامائی انداز میں پیش کیا گیا۔ یہ دہلی یونیورسٹی کے ڈاکٹر محمد حسن صاحب کی جدت تھی اور غیر معمولی طور پر پسند کی گئی۔

۲۹۔ اکتوبر کو جامعہ کا یوم تاسیس منایا گیا نو یا ساڑھے نو بجے جامعہ کے لڑکوں اور لڑکیوں نے مضمون پڑھے اور جامعہ کی تاریخ اور جامعہ کے مقاصد پر روشنی ڈالی۔ آخر میں شیخ الجامعہ صاحب نے بھی مختصر سی تقریر فرمائی۔

شام کو کانووکیشن کا جلسہ ہوا۔ بڑی شان و شوکت اور اہتمام کے ساتھ کالج، ٹیچرس کالج اور رورل انسٹی ٹیوٹ کے لڑکوں اور لڑکیوں کو سندیں دی گئیں۔ امیر جامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین صدر جمہوریہ ہند جلسے کے صدر تھے۔

وائس چانسلر یا شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب نے جامعہ کی سالانہ رپورٹ دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر گنگولی نے کانووکیشن ایڈریس پڑھا۔

اور یہاں اسی جلسہ میں جناب امیر جامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے ایک ہزار روپے کا نہرو انعام جامعہ کالج کے طالب علم کرشن مورتی گن پتی کو مرحمت فرمایا۔ گن پتی کی مادری زبان تامل ہے یہ انگریزی مضمون نگاری اور مباحثوں میں کئی انعام لے چکے ہیں۔ اپنے اسکول کی پارلیمنٹ میں ڈپٹی اسپیکر بھی رہ چکے ہیں۔

کانووکیشن کا جلسہ کے بعد رجسٹرار آفس کے لان پر معزز مہمانوں کو چائے پلائی گئی۔ یہ اس سلسلے کی گویا آخری تقریب تھی۔

اِدھر اُدھر سے

دل بدل دیا۔

کسی کے دل میں بُرائی کی جگہ نیکی پیدا ہو جائے تو کہتے ہیں اس کا دل بدل گیا۔ آپ نے اس طرح کے دل بدلنے کے کتنے ہی قصے پڑھے اور سنے ہوں گے اور کتنے ہی ایسے لوگوں کو اپنی نظروں سے دیکھا بھی ہوگا۔ مگر ایک آدمی کا دل آپریشن کے ذریعہ کسی دوسرے آدمی کے جسم میں منتقل کر دیا جائے۔ یہ انوکھی بات آپ نے کبھی نہ سنی ہوگی۔

سنتے بھی کیسے یہ عجیب و غریب کرشمہ تو پہلی بار ابھی چند دن پہلے کیپ ٹاؤن میں ہوا ہے۔ جنوبی افریقہ کے ڈاکٹروں کی ایک ٹیم نے ایک ۲۴ سالہ لڑکی کا دل ایک ۵۵ سالہ آدمی کے جسم میں منتقل کر کے اس آدمی کی جان بچالی اور ساری دُنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ خود اس لڑکی کا کیا حشر ہوا ہوگا جس کا دل کاٹ کر دوسرے آدمی کے جسم میں منتقل کیا گیا تھا۔ بھئی وہ لڑکی تو اس آپریشن کے ہونے سے کچھ گھنٹے پہلے ایک کار کے حادثہ کا شکار ہو کر مر گئی تھی اور ڈاکٹروں نے بڑی ہوشیاری سے اس کے دل کو محفوظ کر لیا تھا۔

۵۵ سالہ وکانسکی پچھلے ایک مہینے سے اسپتال میں زیرِ علاج تھے۔ ڈاکٹر ان کے دل کی حالت کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے کہ ایک رات کار کے حادثہ میں شکار اس عورت کی لاش اسپتال لائی گئی۔ لاش بری طرح کچل گئی تھی۔ مگر ڈاکٹروں نے دیکھا کہ اسکا دل ابھی اس حالت میں ہے کہ بجلی کے جھٹکوں سے حرکت میں لاسکتے ہیں۔ لڑکی کے باپ کی اجازت سے ڈاکٹروں نے لڑکی کے جسم سے دل نکال کر الگ کر لیا۔ پھر وکانسکی کے سینے میں آپریشن کر کے ان کے دل کی جگہ اس دل کو منتقل کر دیا۔ اس سارے عمل میں پانچ گھنٹے لگے اور ڈاکٹروں کی یہ ٹیم اس عجیب و غریب تجربے کے لیے رات کے پچھلے پہر کام پر لگ گئی۔ عجلت نہ کرتے تو مردہ جسم سے آپریشن کر کے نکالا ہوا یہ دل کسی کام کا نہ رہ جاتا۔

وکانسکی صاحب ایک ہفتے کے اندر ہی پرہیزی کھانا کھانے کے قابل ہو گئے ہیں۔ اگر ڈاکٹروں کو اس عمل میں کامیابی ہوتی رہی تو انھوں ہی کی طرح مردہ آدمیوں کے دل کے جان بلب مریضوں کی جان بچائی جا سکے گی۔

مہاراشٹر لرز اٹھا

پچھلے دنوں کوئنا نگر میں زبردست زلزلہ آیا۔ اکیلے کوئنا کے قصبے میں دو سو سے زیادہ آدمی مر گئے۔ ہزاروں مکان گر گئے۔ کوئنا ہی نہیں مہاراشٹر اور گجرات تک کے دور دراز کے علاقے میں جھٹکے محسوس کیے گئے۔ بمبئی شہر کا جنوبی حصہ تو خاص طور سے بری طرح متاثر ہوا۔ پہلی بار رات کے آخری پہر میں اس کا جھٹکا

[illegible] اور [illegible] کے ہلکے جھٹکے آتے رہے

[illegible] کرنا میں ایک بہت بڑا باندھ اور بجلی گھر ہے۔ اس بجلی گھر سے بمبئی اور مہاراشٹر کے دوسرے شہروں کو بجلی سپلائی ہوتی ہے۔ بمبئی اور اس کے آس پاس کی بستیوں اور چھوٹے شہروں کے درمیان چلنے والی بجلی کی ریل گاڑیاں اسی کی بجلی سے چلتی ہیں۔ اس دن بڑی خیر ہوئی کہ زلزلہ کا پہلا جھٹکا کوئنا میں آیا اور کوئنا بجلی گھر کے انجینروں نے جرأت اور ہوش مندی سے کام لے کر بجلی سپلائی کرنے کا کنکشن فوراً کاٹ دیا۔ اس وقت مختلف لائنوں پر بجلی کی کئی ریل گاڑیاں چل رہی تھیں۔ بجلی کا کنکشن کٹتے ہی سب کی سب گاڑیاں رُک گئیں اسی حالت میں مسافروں نے جھٹکے وہاں محسوس کیے۔ اگر بجلی گھر کے انجینروں نے ایک دو سیکنڈ کی دیر کی ہوتی تو پھر جو نقصان ہوتا اس کا اب اندازہ لگانا بھی مشکل ہے۔ کیا عجب جو چلتی ہوئی گاڑیاں زلزلہ کی لپیٹ میں آ کر الٹ جاتیں اور انجام آپ سوچ لیجیے۔

کچھ ماہرین کا خیال ہے کہ یہ زلزلہ ۱۹۳۴ء کے بہار اور کوئٹہ کے زلزلہ سے بھی زیادہ شدید تھا۔ کچھ بھی ہو مرکزی حکومت نے اس کی جانچ کے لیے ایک کمیٹی قائم کرنے کا اعلان کیا ہے۔ زلزلے سے تباہ علاقے میں ریلیف کا کام تیزی سے ہو رہا ہے۔ سارے ملک میں چندے اکٹھے کیے جا رہے ہیں۔ کوئنا میں ایک مہمان خانہ ہے جہاں سرکاری افسر اور وزیر وغیرہ آ کر ٹھہرتے تھے۔ ایک بار یہاں پنڈت نہرو بھی آ کر ٹھہرے تھے۔ یہ مہمان خانہ اب چند ٹوٹی پھوٹی دیواروں کی شکل میں باقی رہا ہے۔ مگر ایک عجیب بات یہ ہوئی کہ ایک دیوار پر ایک قومی رہنما کی شیشے کے فریم میں لگی ہوئی تصویر بالکل صحیح سلامت دیوار پر ٹنگی باقی بچی

کیا زلزلے کی پیشین گوئی ہو سکتی ہے

تاشقند میں اپریل ۱۹۶۶ء میں ایک زبردست زلزلہ آیا تھا۔ روسی سائنسدان اس زلزلے کی وجہ دریافت کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ پچھلے مہینے تاشقند میں زلزلہ پیمائی کی ایک کانفرنس ہوئی تھی جس میں ازبکستان کے سائنس دانوں نے بتایا کہ تاشقند میں زلزلہ آنے سے ۱۰ اور ۲۰ گھنٹے پہلے ہی وہ اس کی پیشین گوئی کر سکتے ہیں اور وہ نہ صرف یہ بتا سکتے ہیں کہ زلزلہ اگلے چند گھنٹوں میں کس وقت آئیگا بلکہ وہ کتنی شدت کا ہوگا۔ اس کی بھی وہ پیشین گوئی کر سکتے ہیں۔

دنیا کے معمر ترین انسان آسام کے ۱۸۲ سالہ منشی امید علی کو اعزاز

منشی امید علی جن کی عمر ۱۸۲ سال ہے۔ غالباً ایشیا بلکہ دنیا کے سب سے معمر انسان ہیں۔ آئندہ سال ان کے اعزاز میں آگرے میں استقبالیہ کا اہتمام کیا جائے گا۔ منشی امید علی موضع کرشن بانی (آسام) کے رہنے والے ہیں ۱۷۸۵ء میں پیدا ہوئے وہ خوشحالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ معمر افراد کی عزت افزائی کرنے کے لیے آگرے میں ایک ادارہ ہے جس کا نام وردھا جن سمان سمتی ہے۔ اس نے منشی امید علی کو اس تقریب میں شرکت کرنے کے لیے آگرہ آنے کی دعوت دی ہے۔

سمتی کے صدر مسٹر ہری کرشن گپتا نے ایک خبر رساں ایجنسی کے نمائندہ کو بتایا کہ اگر منشی امید علی آگرہ نہ آ سکے تو ان کے گاؤں میں ان کی تاجپوشی کا اہتمام کیا جائیگا۔ انھیں اس موقعے پر ایک سرپا اور چنہ پیش کیا جائے گا۔ (آگرہ کی نئی ہوئی خبریں)

نئے سال کی خوشی میں
خاص رعایت
بچوں کے لیے بلاک سے چھپی اور ہندوستان کے مشہور آرٹسٹ ڈی بدری کی بنائی ہوئی رنگین تصویروں والی
کتابوں کی قیمت آدھی کردی گئی
انوکھی ملاقات
مصنف: پروفیسر عبدالغفور۔ اصل قیمت ۶۲/۰ رعایتی قیمت ۳۰ پیسے
جی کتے اور جھاؤ چوہے کی دل چسپ ملاقات اور نوک جھونک۔ کون جیتا؟ ہم کیوں بتائیں کتاب منگائیے اور پڑھیے۔
اپنے آپ معلوم ہو جائے گا۔
ایک ٹانگ کا بادشاہ
مصنف غلام عباس۔ اصل قیمت ۱/۰ رعایتی قیمت صرف ۴۵ پیسے
بادشاہ کی ٹانگ شیر نے چبا ڈالی۔ بادشاہ نے اعلان کیا کہ جو کوئی نئی ٹانگ لادے گا اس کی شادی شہزادی سے کردی جائے گی۔ کون ٹانگ لایا؟ کس سے شہزادی کی شادی ہوئی یہ اس کتاب میں پڑھیے۔
رسول پاکؐ
سلطانہ آصف فیضی کی لکھی ہوئی انوکھے انداز اور آسان زبان میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے حالات
رعایتی قیمت صرف ۴۵ پیسے
گلابو چوہیا اور غبارے
مصنف: قدسیہ زیدی۔ اصل قیمت ۹۰ پیسے رعایتی قیمت ۴۵ پیسے صرف
اللہ بخشے گلابو چوہیا بڑی ہی رحم دل تھیں۔
ظالم کسان
مصنف: محمد شفیع الدین نیر۔ اصل قیمت ۹۰ پیسے رعایتی قیمت ۴۵ پیسے
ایک کمزور بونے نے ایک ظالم کسان کو کس طرح سیدھے راستے پر لگایا۔
جلّو مرغابی
مصنف قیصر حسین زیدی۔ اصل قیمت دو روپے رعایتی قیمت ایک روپیہ صرف
جلّو نام کی مرغابی، اس کے آٹھ چھوٹے چھوٹے بچوں کی نرالی داستان۔
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵
برانچ
اردو بازار دہلی ۶
برانچ
پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳

پیام تعلیم

کلینڈر ۱۹۶۸ء

عبدالمجید آنیکل (ضلع بنگلور)					ستمبر دسمبر	جنوری اپریل جولائی	اکتوبر	مئی	فروری اگست	مارچ نومبر	جون
۲۹	۲۲	۱۵	۸	۱	اتوار	پیر	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	ہفتہ
۳۰	۲۳	۱۶	۹	۲	پیر	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	ہفتہ	اتوار
۳۱	۲۴	۱۷	۱۰	۳	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	ہفتہ	اتوار	پیر
	۲۵	۱۸	۱۱	۴	بدھ	جمعرات	جمعہ	ہفتہ	اتوار	پیر	منگل
	۲۶	۱۹	۱۲	۵	جمعرات	جمعہ	ہفتہ	اتوار	پیر	منگل	بدھ
	۲۷	۲۰	۱۳	۶	جمعہ	ہفتہ	اتوار	پیر	منگل	بدھ	جمعرات
	۲۸	۲۱	۱۴	۷	ہفتہ	اتوار	پیر	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ

پرنٹر پبلشر سید احمد علی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے برقی آرٹ پریس دریا گنج دہلی میں آفسٹ پر چھپوا کر جامعہ نگر [illegible]

نگاہِ بلند ---------- سید صفی احمد حیدرآباد

ٹھیک ہے نا؟ -------- زو بشیر خاں لال خاں پٹنہ

New Delhi-25.

شیخ الجامعہ محمد مجیب صاحب اُردو مڈل اسکول مٹیا محل جامع مسجد کے بچوں کو نہرو ٹرافی مرحمت فرما رہے ہیں

پیام تعلیم

پیامِ تعلیم
جلد ۵
فروری ۱۹۶۸ء
شمارا ۲
ایڈیٹر
محمد حسین حسّان ندوی
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر نئی دہلی
شاخ
اردو بازار
دہلی ۶
شاخ
پرنس بلڈنگ
بمبئی ۳
سالانہ چندہ چھ روپے
فی پرچہ ۶۰ پیسے

نئے سال کی خوشی میں
خاص رعایت
بچوں کے لیے بلاک سے چھپی اور ہندوستان کے مشہور آرٹسٹ ڈی۔ بدری کی بنائی ہوئی رنگین تصویروں والی
کتابوں کی قیمت آدھی کردی گئی
انوکھی ملاقات
مصنف: پروفیسر عبدالغفور۔ اصل قیمت ۶۲/۰ رعایتی قیمت ۳۰ پیسے
جمی کتے اور جھاؤ چوہے کی دل چسپ ملاقات اور نوک جھونک۔ کون جیتا؟ ـــ ہم کیوں بتائیں کتاب منگائیے اور پڑھیے۔ اپنے آپ معلوم ہو جائے گا۔
ایک ٹانگ کا بادشاہ
مصنف غلام عباس۔ اصل قیمت ۷۰/۰ رعایتی قیمت صرف ۳۵ پیسے
بادشاہ کی ٹانگ شیر نے چبا ڈالی۔ بادشاہ نے اعلان کیا کہ جو کوئی نئی ٹانگ لائے گا اس کی شادی شہزادی سے کردی جائے گی۔ کون ٹانگ لایا؟ کس سے شہزادی کی شادی ہوئی یہ اس کتاب میں پڑھیے۔
رسول پاکؐ
سلطانہ آصف فیضی کی لکھی ہوئی انوکھے انداز اور آسان زبان میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے حالات
رعایتی قیمت صرف ۵۰ پیسے
گلابو چوہیا اور غبارے
مصنفہ: قدسیہ زیدی۔ اصل قیمت ۹۰ پیسے رعایتی قیمت ۴۵ پیسے صرف
اللہ بخشے گلابو چوہیا بڑی ہی رحم دل تھیں۔
ظالم کسان
مصنف محمد شفیع الدین نیر۔ اصل قیمت ۷۰ پیسے رعایتی قیمت ۳۵ پیسے
ایک کمزور بونے نے ایک ظالم کسان کو کس طرح سیدھے راستے پر لگایا۔
جلّو مرغابی
مصنف قیصر حسین زیدی۔ اصل قیمت دو روپے رعایتی قیمت ایک روپیہ صرف
جلّو نام کی مرغابی، اس کے آٹھ چھوٹے چھوٹے بچوں کی نرالی داستان۔
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵
برانچ پرنس بلڈنگ بمبئی ۳ (بی۔آر)
برانچ اردو بازار دہلی ۶

فہرست

بچوں سے باتیں

ہمارے پیامیوں کو حیرت ہے۔ ہمارے بہت سے بزرگ "پیام تعلیم" کے بہت سے شیدائی بھی اچنبھے میں ہیں۔ بھلا کیوں؟

اس مہنگائی کے زمانے میں ذاکر نمبر کے تھوڑے ہی دنوں بعد ہم اتنا ضخیم نمبر نکال سکے۔ اتنا ضخیم اتنا شاندار! اتنا ہی نہیں۔ اتنا ضخیم نمبر ٹھیک وقت پر عید سے پہلے بلکہ کہیں کہیں سال کے "نئے دن" سے پہلے پیامیوں کے ہاتھوں میں پہنچ گیا۔

تقریباً سبھی پیامیوں کو ایک بات اور بھی پسند آئی۔ ہم نے سائز بڑا کر دیا ہے۔ اس تبدیلی کی وجہ سے مضمونوں کے لیے گنجائش زیادہ نکل آئی ہے۔

یہی سالنامہ پرانے سائز پر چھپتا تو تین سو صفحوں سے زیادہ جگہ گھیرتا۔ سالنامہ کا ٹائیٹل تو سو فی صدی لوگوں نے پسند کیا ہے۔

بہت سے بزرگوں بہت سے پیامیوں نے سالنامے کے بارے میں اپنی رائیں ہمارے پاس بھیجی ہیں۔ ان کا خلاصہ آپ کو اس نمبر کے آخری صفحوں میں ملے گا۔

شاکرہ ندیم سلمہا نے آپ کے سالنامے کے لیے ایک مشہور امریکی مصنف کی کہانی کا ترجمہ کیا تھا۔ بہت اچھی بہت ہی مزے دار کہانی کا۔ پر یہ لمبی بہت ہو گئی تھی۔ سالنامے میں ہم اس کے لیے گنجائش نہ نکال سکے۔ یہ آپ اس پرچے میں پڑھیے اور اپنی رائے بتائیے۔

پیام تعلیم کے بہت سے سرپرست اور پیام تعلیم کو اپنا سمجھنے والے بہت سے پیامی اس کو مقبول بنانے اس کی خریداری بڑھانے کی کوششوں میں برابر لگے ہوئے ہیں۔ ان سب کے نام ہم کسی اگلے پرچے میں شایع کر سکیں گے۔

ہاں پچھلے پرچے میں ہم برادر محترم مولانا حفیظ الدین صاحب کا نام لکھنا بھول گئے تھے۔ حفیظ صاحب نے ہماری ہمیشہ مدد فرمائی ہے اور اب آپ نے نئے جوش کے ساتھ اپنی کوششیں شروع کر دی ہیں۔ شکور حسین صاحب زیدی نے تو ازراہ نوازش تین خریداروں کے پتے بھی مرحمت فرما دیئے ہیں

اگر سارے پیامی اسی جوش سے کام لیں تو پیامیوں کی برادری کہیں سے کہیں پہنچ جائے اور بھی پیام تعلیم کو بھی چار چاند لگ جائیں۔ یہ ترقی کے قدم آگے ہی بڑھاتا ہے۔

دسمبر میں جن پیامیوں کی خریداری کی مدت ختم ہو گئی تھی بسرخ

نشان کے ذریعے انھیں اس کی اطلاع دے دی گئی تھی۔ یہ بھی بتادیا گیا تھا کہ ۲۵ جنوری تک ان کا چندہ نہ آیا تو اگلا پرچہ (سالنامہ) انھیں نہ بھیجا جائے گا۔

اور سالنامہ بھیجتے وقت اس پر عمل بھی کیاگیا تاہم جنوری کے آخری یا فروری کے پہلے ہفتے تک پیامی اپنا چندہ (مبلغ چھ روپے) بھیج دیں گے تو ان کی خریداری "جاری" سمجھی جائے گی۔ چندہ وصول ہونے پر انھیں ۶۸ء کا سالنامہ بھی بھیج دیا جائے گا۔

فروری سے خریداری شروع کرنے والے پیامی اس سالنامے کے مستحق نہ ہوں گے۔ ہاں ۶۷ء کا سالنامہ (قیمتی ۱/۵۰) ان کی خدمت میں مفت نذر کیا جائے گا۔

ایک بات منیجر صاحب نے اور فرمائی ہے۔ جنوری سے خریداری شروع کرنے والے پیامی (نئے یا پرانے) سالانہ چندہ کے علاوہ ساٹھ پیسے اور بھیجیں تاکہ سالنامہ انھیں رجسٹری سے بھیجا جاسکے۔

منیجر صاحب نے یہ بھی بتایا ہے کہ سالنامے غائب ہونے کی بہت سی شکایتیں آرہی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔ ان پیامیوں کو ہم پرچہ بھیجنے کے پابند ہیں! اخلاقاً پابند ہیں۔ اگر وہ رجسٹری سے پرچہ منگا لیتے تو ایک طرف ہمیں دو روپے کا نقصان نہ ہوتا۔ دوسری طرف خود انھیں یہ خوبصورت تحفہ عید سے پہلے مل جاتا۔

سالنامے میں ہم نے ایک انعامی مقابلے کا اعلان کیا تھا۔ آپ اپنے سالنامے کے بارے میں پوری آزادی کے ساتھ اپنی رائے لکھ کر بھیجیے۔ اور اسے بھیجنے کی آخری تاریخ لکھنا یاد نہ رہا۔ سو اب آپ یہ بات دھیان میں رکھیے کہ زیادہ سے زیادہ ۱۵ ر فروری تک آپ کی رائیں پیام تعلیم کے دفتر میں پہنچ جائیں۔

سالنامہ پریس جاچکا تھا کہ اچانک برادرم محمد یوسف صاحب بی۔اے جامعہ کے انتقال کی خبر ملی۔ انّا للّٰہ وانّا الیہ راجعون۔ مرحوم جامعہ سے بی اے کرنے کے بعد مکتبہ میں کام کرنے لگے۔ یہاں سے علیحدگی کے بعد خود اپنا کاروبار سنبھالا۔ "شاہراہ" کے نام سے ایک بہت اچھا علمی و ادبی رسالہ نکالا۔ شاہراہ بک ڈپو بھی قایم کیا۔ بہت اچھی اچھی کتابیں شایع کیں۔ علمی بھی ادبی بھی۔ لوگوں سے کام کرانے کا بڑا اچھا سلیقہ تھا۔ اچھے اچھے لکھنے والوں کا ایک حلقہ قایم کرلیا تھا۔ ان تمام مصروفیتوں کے باوجود جامعہ سے دلی لگاؤ تھا۔ انجمن طلبار قدیم کے سرگرم ممبر تھے۔ ابھی عمر زیادہ نہیں تھی۔ پر دل کا روگ لگ گیا تھا۔ افسوس ہے کہ اسی دل کی بیماری نے کام تمام کیا۔ ہمیں اپنے اس عزیز کی موت کا دلی صدمہ ہے خدا ان کی بیوی بچوں کو دوسرے عزیزوں کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔ ا

جناب کوثر اعظمی

اے وطن

علم و فن کے دیے اب جلائیں گے ہم
حسنِ اخلاق کے گل کھلائیں گے ہم
اور بنائیں گے ہم
تجھ کو رشکِ چمن
اے وطن، اے وطن!
اے وطن، اے وطن! میرے پیارے وطن!!

●

بول میں بات میں، چال میں، ڈھال میں
پریم ہوگا چلن اب تو ہر حال میں
اب نہ جنجال میں
ہوگا تن یا کہ من
اے وطن، اے وطن!
اے وطن، اے وطن! میرے پیارے وطن!!

●

گھپ اندھیری سی یہ رات ڈھل جائے گی
تیرگی، روشنی میں بدل جائے گی
اب پھل جائے گی
مسکراتی کرن!
اے وطن، اے وطن!
اے وطن، اے وطن! میرے پیارے وطن!!

●

غم نہ کر اب کہاں غم کی پرچھائیاں
بج رہی ہیں مسرت کی شہنائیاں
کیسی تنہائیاں
ہے سبھی انجمن
اے وطن، اے وطن
اے وطن، اے وطن! میرے پیارے وطن!!

●

تیرے سیوک وہ تیرے سپاہی اٹھے
راہِ امن و محبت کے راہی اٹھے
مسکراہی اٹھے
پھر ترے تیغ زن
اے وطن، اے وطن
اے وطن، اے وطن! میرے پیارے وطن

●

ظلم سے پیار کی جنگ ٹھن جائے گی
روٹھی انسانیت اب تو من جائے گی
اور بن جائے گی
تیری دھرتی گگن
اے وطن، اے وطن!
اے وطن، اے وطن! میرے پیارے وطن!!

●

امریکی کہانی مصنف ایل فرینک بوم

مترجم محترمہ شاکرہ ندیم

انوکھا سفر انوکھے ساتھی

ڈروتھی نے اپنے ساتھیوں کو خدا حافظ کہا۔ اور پیلے کھرنجے کی سڑک پر چل پڑی۔ چلتے چلتے کئی میل دور نکل گئی۔ سوچا ذرا کے ذرا ستانا چاہیے۔ سڑک کے کنارے ایک منڈیر پر بیٹھ گئی۔

کھیت والے نے بیچ کھیت میں پرندوں کو اڑانے کے لیے جھوٹ موٹ کا آدمی کھڑا کر رکھا تھا۔ ڈروتھی بہت دلچسپی سے اس آدمی کو دیکھنے لگی۔

اس کا سر کیا تھا بس یوں سمجھو ایک چھوٹا سا تھیلا تھا۔ اس تھیلے میں گھاس پھوس یا بھوسا بھر دیا گیا تھا۔ آنکھیں، ناک اور منہ مختلف رنگوں سے بنائے گئے تھے۔ سر پر ایک نیلا ہیٹ بھی تھا اور یہ جنٹل مین صاحب خیر سے ایک نیلا سوٹ بھی پہنے ہوئے تھے۔ پھٹا پرانا، میلا کچیلا۔ اور ہاں پیروں میں پرانے دھرانے جوتے بھی تو تھے۔ ایسے ہی جیسے اس دیس میں سب پہنے ہیں۔

ڈروتھی نے دیکھا کہ اس آدمی کی ایک آنکھ دھیرے دھیرے جھپکنے لگی، اس نے سوچا میری آنکھیں دھوکہ کھا رہی ہیں۔ بھلا کھیتوں کا گھاس والا آدمی بھی اس طرح پلک جھپک سکتا ہے۔ اشارے کر سکتا ہے؟

پرمنے کی بات تو ایک اور تھی۔ لے لیجیے یہ میاں صاحب اب تو سر بھی ہلانے لگے بہت ہی دوستانہ انداز میں پھر تو

ڈروتھی سے نہ رہا گیا دوڑی دوڑی اس کے پاس جا پہنچی۔

"آداب عرض ہے" گھاس پھوس والے آدمی نے کہا

"ارے ارے کیا تم بول بھی سکتے ہو!" ڈروتھی نے حیران ہو کر پوچھا۔

"جی اور کیا، میں بول بھی سکتا ہوں کہئے مزاج کیسے ہیں؟"

"خدا کا شکر ہے۔ آپ اپنا مزاج بتائیے۔" ڈروتھی نے بہت ادب سے کہا۔

"میرا مزاج۔ ہونہہ میرے مزاج کو آپ کیا پوچھتی ہیں!" گھاس پھوس والے آدمی نے مسکرا کر کہا "آپ ہی دیکھیے۔ مجھے یہاں باندھ کر کھڑا کر دیا ہے۔ بس اس لیے کہ دن رات کوؤں کو ہنکاتا رہوں اڑاتا رہوں"

"تو کیا آپ نیچے نہیں اتر سکتے۔" ڈروتھی نے پوچھا۔

"جی نہیں، یہ بانس میری پیٹھ میں کیلوں سے جڑ دیا گیا ہے اگر آپ اسے کسی طرح میری پیٹھ میں سے نکال لیں تو میرا چھٹکارا ہو سکتا ہے سچ جانیے میں آپ کا بہت احسان مانوں گا۔"

ڈروتھی نے اپنے دونوں ہاتھ اور ایڑیاں اوپر اٹھا کر اسے جیسے تیسے بانس سے الگ کر لیا وہ نیچے زمین پر آ رہا۔ اس کے اندر گھاس پھوس ہی تو بھرا تھا۔ اس لیے بالکل ہلکا پھلکا تھا۔

"میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں آپ نے مجھے نئی زندگی بخش دی" اس نے اتنا کہا اور ڈروتھی کے ساتھ ہو لیا۔

ایک جھوٹ موٹ کے آدمی کو اس طرح باتیں کرتے اور چلتے پھرتے دیکھ کر وہ بڑے اچنبھے میں تھی۔

یہ بانس کا آدمی ایسا لگتا تھا جیسے سچ مچ انسان کی جون میں آ گیا ہو۔ لے لیجیے اس نے جمائی بھی لی۔ جیسے تھکن اتار رہا ہو اور پھر بولا۔ "اچھا بھئی اب آپ یہ بتائیے کہ آپ کون ہیں؟ کہاں سے آ رہی ہیں اور کہاں جا رہی ہیں؟"

ڈروتھی نے جواب دیا "میں اس وقت امیرالڈ (EMARALD) شہر جا رہی ہوں۔ وہاں کے سب سے بڑے جادوگر سے یہ کہنا ہے کہ وہ مجھے واپس میرے گھر بھیج دے۔"

"اچھا ۔۔۔! بھلا یہ شہر ہے کہاں۔ اور یہ جادوگر کون صاحب ہیں" جھوٹ موٹ کا آدمی جیسے کچھ سوچ میں پڑ گیا تھا۔

"ارے۔ آپ کو معلوم نہیں" ڈروتھی تعجب سے بولی

"بھلا مجھے کیسے معلوم ہو سکتا تھا۔ آپ جانیں میرے بدن میں تو خالی گھاس پھوس بھرا ہے۔ میرے سر میں دماغ کہاں ہے" بانس کا آدمی اداس ہو کر بولا۔

"واقعی! یہ تو بہت افسوس کی بات ہے" ڈروتھی کو اس پر ترس آنے لگا۔

"اگر میں آپ کے ساتھ امیرالڈ شہر جاؤں تو کیا جادوگر مجھے دماغ دے دیگا۔ آپ کا کیا خیال ہے؟ آپ خود ہی سوچیے بغیر دماغ کے میری گزر کیسے ہوگی" بانس کے آدمی کو اس بات کی بڑی فکر تھی

"میں کہہ نہیں سکتی پھر بھی آپ بڑی خوشی سے میرے ساتھ چل سکتے ہیں۔ جادوگر نے دماغ نہ بھی دیا تو آپ کا نقصان کیا" ڈروتھی نے بڑے ہمدردانہ انداز میں کہا۔ اور دونوں ساتھ ساتھ روانہ ہو گئے۔

چلتے میں بانس کے آدمی نے پھر بولنا شروع کیا۔ "مجھے اس کا تو افسوس نہیں کہ میرے ہاتھ پیر بانس کے بنے ہوئے ہیں۔ کوئی میری ناک پر گھونسا مار دے گا یا میرے بدن میں سوئی چبھو دے گا تو مجھے کوئی تکلیف نہ ہوگی پر یہی لوگ مجھے بے وقوف سمجھیں تو ظاہر ہے مجھے بہت دکھ ہوگا۔ مجھے یہ بات بالکل پسند نہیں کہ میرے سر میں بھوسا بھرا ہوا رہے اور میں لوگوں کو احمق نظر آؤں اگر میرے سر میں بھی ایسا ہی دماغ ہو جیسے آپ کے سر میں ہے۔ میں بھی آپ کی طرح باتوں کو سوچ سمجھ سکوں تو کیسا رہے۔"

"میں آپ کی پریشانی دکھ اور تکلیف کو اچھی طرح سمجھتی ہوں۔" ڈروتھی کو اس پر واقعی بہت رحم آ رہا تھا "میں آوز کے جادوگر سے کہوں

گی کہ وہ آپ کے لیے جو کچھ بھی کر سکتا ہے ضرور کرے۔"

"بہت بہت شکریہ۔"

چلتے چلتے دونوں کھیت کی منڈیر کے پاس آگئے اور منڈیر پار کرکے سڑک پر پڑ گئے۔ ڈورتھی نے بانس والے آدمی کو منڈیر پار کرنے میں مدد دی۔ اُسے اٹھا کر سڑک پر رکھ دیا۔ اور دونوں اس پیلی سڑک پر امیر اللہ شہر کی طرف چل پڑے۔

مگر ڈورتھی کے ننھے منے کتے ٹوٹو کو یہ نیا ساتھی بالکل اچھا نہ لگا۔ پہلے تو اس نے بانس والے آدمی کے چاروں طرف چکر لگانا شروع کیے جیسے کچھ سونگھ رہا ہو۔ شاید اسے شک تھا کہ اس گھاس پھوس کے آدمی میں کہیں چوہوں نے اپنا گھر نہ بنا لیا ہو۔ وہ غرّا رہا تھا کبھی کبھی بھونکنے لگتا تھا۔ اس کا انداز بہت ہی غیر ہمدردانہ تھا۔

"دیکھیے آپ ٹوٹو کی بالکل پرواہ نہ کیجیے یہ کاٹتا نہیں ہے۔"

"جی نہیں مجھے بالکل ڈر نہیں لگ رہا ہے۔ یہ کاٹ بھی لے تو گھاس پھوس کو بھلا اس سے کیا تکلیف پہنچے گی۔ اچھا لائیے اپنی یہ ٹوکری مجھے دے دیجیے میں اسے آسانی سے اٹھا سکتا ہوں۔ آپ اسے لیے لیے تھک جائیں گی۔ میرے تھکنے کا کوئی سوال ہی نہیں۔ اور ہاں لیجیے میں آپ کو ایک بھید کی بات بتا دوں میں دنیا میں بس ایک ہی چیز سے ڈرتا ہوں۔

"بھلا وہ کیا چیز ہے۔ غالباً کھیت کا کسان ہوگا جس نے آپ کو بنا کر اس کھیت میں لا کھڑا کیا ہے؟"

"جی نہیں۔ جلتی ہوئی دیا سلائی۔"

ڈورتھی اپنے ساتھیوں سمیت اسی پیلی سڑک پر آگئی اور آگے چل پڑی۔ اچانک کہیں قریب سے کسی کے کراہنے کی آواز آئی اور ڈورتھی ٹھٹک پڑی۔

"یہ کیا چیز تھی؟" ڈورتھی نے سہمی سہمی آواز میں پوچھا۔

"میری سمجھ میں بھی کچھ نہیں آیا۔" بانس والے آدمی نے جواب دیا۔ "اچھا آئیے قریب چل کر دیکھیں۔"

اتنے میں پھر ویسی ہی آواز آئی۔ ایسا لگا جیسے یہ آواز ان کے پیچھے سے آرہی ہو۔ وہ پیچھے کی طرف مڑ گئے۔ جنگل میں چند ہی قدم آگے بڑھے ہوں گے کہ کوئی چیز چمکتی ہوئی نظر آئی اور درخت کی شاخوں میں سے چھن چھن کر جو کرنیں آرہی تھیں انھیں کرنوں کی بدولت چمک رہی تھی۔

وہ دوڑتی دوڑتی آگے بڑھی پھر ایک دم رک گئی جیسے کسی نے اس کے پیر پکڑ لیے ہوں اور مارے حیرت کے اس کی چیخ نکل گئی۔

ایک بڑے سے پیڑ کا کچھ حصہ کٹا پڑا تھا اور اس کے پاس ہی ایک آدمی ہاتھ میں کلہاڑی لیے کھڑا تھا۔ پورا کا پورا ٹین کا آدمی سر، کندھے، ٹانگیں وغیرہ باقی حصے میں جوڑ دی گئی تھیں۔ وہ بالکل بے حس و حرکت کھڑا تھا جیسے لڑھلنے پڑکنے کی اس میں سکت ہی نہیں ہے۔

ڈورتھی اور بانس کے آدمی نے بہت حیرانی اور تعجب سے اس کی طرف دیکھا تو ادھر ٹوٹو صاحب نے زور زور سے بھونکنا شروع کیا۔ ایک ٹانگ میں منہ بھی مار دیا اور اپنے ہی دانت زخمی کر لیے۔

"کیا آپ ہی کراہ رہے ہیں۔"

"جی ہاں" ٹین کے آدمی نے جواب دیا "ہیں

ہی کراہ رہا تھا۔ پورا ایک سال اسی طرح کراہتے بیت گیا ہے مگر کسی نے میری آواز سنی نہ کوئی میری مدد کو آیا۔"

"میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟" ٹین کا آدمی کچھ ایسے اُداس اُداس اور غمگین لہجے میں باتیں کر رہا تھا کہ ڈروتھی کو اس پر بڑا ترس آیا۔

"تیل کا ڈبہ اٹھا لائیے اور میرے جوڑوں میں مل دیجیے۔" ٹین کے لکڑہارے نے جواب دیا۔ "ان پر بری طرح زنگ لگ گیا ہے کہ میں انہیں ذرا بھی حرکت نہیں دے سکتا اگر ان کو تیل سے صاف کر دیا گیا تو میں بالکل ٹھیک ہو جاؤں گا۔ ٹین کا ڈبا میری جھونپڑی میں الماری میں رکھا ہے۔"

ڈروتھی دوڑی دوڑی جھونپڑی میں گئی، ٹین کا ڈبا اٹھا لائی اور ٹین کے لکڑہارے سے پوچھنے لگی "بتائیے آپ کے جوڑ کہاں ہیں؟"

"پہلے میری گردن پر تیل ملیے۔" گردن پر بہت زنگ تھا — ڈروتھی تیل ملتی گئی اور بانس والا آدمی سر کو دھیرے دھیرے اِدھر اُدھر گھماتا رہا۔ آخر زنگ صاف ہو گیا گردن آسانی سے اِدھر اُدھر مڑنے لگی۔ اور ہوتے ہوتے ٹین کا لکڑہارا خود اپنی گردن اِدھر اُدھر کرنے لگا۔

"اب میرے بازوؤں میں تیل مل دیجیے۔" ڈروتھی اس کے بازوؤں میں تیل ملنے لگی۔ بانس والے آدمی نے آہستہ آہستہ بہت احتیاط سے انھیں موڑنا شروع کیا۔ آخر زنگ صاف ہو گیا اور وہ ایسے چمک گئے جیسے بالکل نئے ہوں۔ ٹین کے لکڑہارے نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس نے اپنی کلہاڑی نیچے کی یہ اب تک جوں کی توں پیڑ کی طرف جھکی ہوئی تھی۔

"اُف وہ کتنا آرام ملا۔ یہ کلہاڑی نہ جانے کب سے یونہی اوپر ہوا میں اٹھی ہوئی تھی۔ کتنی خوشی کی بات ہے کہ اب میں اسے اپنی مرضی سے نیچے رکھ سکتا ہوں۔"

"اچھا اب اگر آپ میری ٹانگوں کے جوڑوں پر بھی تیل مل دیں تو میں بالکل ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

ڈروتھی اور اس کے ساتھی نے ٹانگوں پر خوب تیل ملا۔ انھیں اچھی طرح رگڑ رگڑ کر صاف کیا اور وہ لکڑہارے کی مرضی کے مطابق ہلنے جلنے لگیں۔ ٹین کا لکڑہارا ایسا لگتا تھا جیسے ان کے احسان سے دبا جا رہا ہو۔ اس نے بار بار ان کا شکریہ ادا کیا۔ کہنے لگا "اگر آپ لوگ اِدھر نہ آ نکلتے تو میں نہ جانے کب تک اسی طرح کھڑا رہتا۔ آپ نے سچ مچ میری جان بچا لی۔ مجھے دوبارہ زندگی بخشی۔ مگر آپ لوگ اِدھر کیسے آ نکلے؟"

"ہم سب سے بڑے جادوگر آوز سے ملنے امیر اللہ شہر جا رہے ہیں۔" ڈروتھی نے جواب دیا۔ "اور آج کی رات آپ کی جھونپڑی میں گزارنے کے لیے رک گئے ہیں۔"

"مگر آپ بڑے جادوگر آوز سے کیوں ملنا چاہتی ہیں؟"

"میں چاہتی ہوں کہ وہ مجھے اپنے وطن کنساس بھیج دے اور بانس کا آدمی چاہتا ہے کہ اس کے سر میں گھاس پھونس کی جگہ دماغ ہو جائے۔"

ٹین کا لکڑہارا ایک ذرا کے ذرا گہری سوچ میں پڑ گیا پھر بولا:۔ "تو کیا وہ مجھے ایک دل بھی دے سکتا ہے؟"

"کیوں نہیں۔" ڈروتھی بولی۔ "وہ بانس والے آدمی کو دماغ دے سکتا ہے تو آپ کو دل بھی اسی آسانی سے دے سکتا ہے۔"

"سچ مچ! اچھا تو آپ مجھے بھی اپنے ساتھ امیر اللہ شہر چلنے کی اجازت دیجیے۔ میں بھی وہاں پہنچ کر جادوگر سے مدد کی درخواست کروں گا۔"

"ہاں ہاں ضرور ضرور۔" بانس کے آدمی نے خوش ہو کر کہا۔ "آپ بھی ہمارے قافلے میں شریک ہو جائیے۔" ڈروتھی نے اس کی تائید کی۔

اور اب ٹین کے لکڑہارے نے کلہاڑی اپنے کندھے پر رکھی اور یہ قافلہ جنگل سے نکل کر پیلی سڑک پر آ گیا۔ ٹین کے لکڑہارے نے ٹین کا ڈبا ڈروتھی کی ٹوکری میں رکھ لیا تھا۔ راستے میں ہیں

مینھ برسنے لگا اور اس پر زنگ چڑھ گیا تو میں ناکام نہ چلے گا۔

یہ نیا ہمسفر اتفاق سے ان کے لیے بہت ہی مفید ثابت ہوا۔ تھوڑی ہی دور آگے بڑھ کر جنگل بہت گھنا ہو گیا تھا۔ پیڑوں اور ان کی شاخوں نے سڑک کو ڈھک لیا تھا۔ ان میں سے راستہ نکالنا اور آگے بڑھنا ناممکن معلوم ہوتا تھا۔ اس وقت ٹین کے لکڑہارے نے مشکل آسان کی۔ کلہاڑی کی مدد سے راستہ صاف کرتا چلا گیا۔ اور یہ ننھا منا قافلہ بڑی سہولت سے اپنا سفر جاری رکھنے میں کامیاب ہوا۔

ڈورتھی اس وقت لکڑہارے کے اس کارنامے سے بہت متاثر تھی۔ بہت خوش تھی۔ اچانک اس کے ساتھی بانس والے آدمی کا پیر ایک گڑھے میں پڑ گیا بے چارے گر پڑے اور سڑک کے ایک طرف لڑھکنے لگے۔ ڈورتھی اپنے خیالوں میں گم تھی کہ اسے خبر بھی نہ ہوئی۔ آخر ان کو اسے اپنی مدد کے لیے پکارنا پڑا۔

"آپ اس گڑھے سے بچ کر کیوں نہ چلے؟" ٹین کے لکڑہارے نے پوچھا۔

"میں کچھ زیادہ جانتا وانتا نہیں"، بانس والے آدمی نے جواب دیا۔ "آپ تو جانتے ہیں میرے دماغ میں گھاس پھونس بھرا ہے جبھی تو میں جادوگر کے پاس جا رہا ہوں۔ اس سے دماغ کے لیے درخواست کروں گا۔"

"اچھا اچھا یہ بات ہے۔ مگر بھئی دنیا میں دماغ ہی تو سب سے اچھی چیز نہیں ہے۔"

"کیا آپ کے پاس دماغ ہے"؟

"جی نہیں، میرا سر تو بالکل خالی ہے بالکل کھوکھلا ہے۔ لیکن کبھی یہ دونوں چیزیں میرے پاس تھیں۔ ان دونوں کا تجربہ کیا اور مجھے تو دل ہی زیادہ اچھا لگا۔"

"یہ کیوں؟"

"ایک دن مجھے اپنے بدن میں تیل لگانے کی ضرورت تھی۔ مگر بھول گیا۔ اتنے میں مینھ برسنے لگا اس سے پہلے کہ میں اس خطرے کو محسوس کروں میرے جسم میں زنگ لگ گیا اور یونہی کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ پورا ایک سال بیت گیا۔ آپ لوگوں نے اس مصیبت سے چھٹکارا دلایا۔ کیسی مصیبت کے دن تھے۔ مگر پورے ایک سال میں جس نقصان کو میں نے سب سے زیادہ محسوس کیا وہ دل کا کھو جانا تھا۔ جس وقت مجھ میں محبت اور پیار کا جذبہ تھا میں اپنے آپ کو دنیا کا سب سے خوش نصیب انسان سمجھتا تھا۔ اور انسان میں محبت کا جذبہ جبھی تو پیدا ہو سکتا ہے جب اس کے پاس دل بھی ہو۔ بس اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ جادوگر سے دل کے لیے درخواست کروں گا۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں" بانس کا آدمی بولا "مگر بے دماغ کے آدمی کو دل مل بھی گیا تو وہ کام میں کیسے لائے گا۔"

"کچھ بھی ہو میں تو دل ہی لوں گا اس لیے کہ دماغ کسی کو خوشی نہیں بخشتا اور خوشی ہی دنیا میں سب سے بڑی نعمت ہے۔"

ان دونوں میں یہ باتیں ہو رہی تھیں اور ڈورتھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ قدم بڑھائے چلی جا رہی تھی جنگل اب بھی گھنا تھا اور سڑک وہی پیلی اینٹوں کی مگر سڑک پر سوکھی ٹہنیاں اور سوکھے پتّے جیسے بچھے ہوئے تھے اور سب مسافروں کو قدم بڑھانے میں اچھی خاصی دقت ہو رہی تھی۔

اس جنگل میں چڑیاں بھی بس اکا دکا تھیں۔ پرندے تو سورج کی روشنی اور کھلے میدان کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ مگر کبھی کبھی درختوں کے اندر چھپے ہوئے جنگلی جانوروں کے غرانے کی آوازیں آنے لگتی تھیں اور ننھی ڈورتھی کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بھلا کیوں یہ غرا رہے ہیں۔ مگر اس کا کتا ٹوٹو سب بھید کو سمجھتا تھا جبھی تو وہ ڈورتھی کے پاس آ گیا تھا۔ چپ چاپ چلا جا رہا تھا۔ اور غرانے کی آواز سن کر بھونک بھی نہیں رہا تھا۔

"کتنی دیر میں ہم اس جنگل کو پار کر لیں گے؟"

ننھی ڈورتھی نے ٹین کے لکڑہارے سے پوچھا۔

"یہ تو میں بھی نہیں بتا سکتا۔ میں کبھی امیرالڈ شہر گیا نہیں۔ ہاں میرے باپ ایک بار ہو آئے ہیں۔ اس وقت میں بالکل چھوٹا سا تھا۔ وہ کہتے تھے بڑا لمبا سفر ہے اور خطرناک علاقہ سے گذرنا پڑتا ہے تاہم شہر کے آس پاس کا علاقہ جہاں جادوگر رہتا ہے بہت خوب صورت ہے۔ پر مجھے جب تک تیل کا یہ ڈبا ہے مجھے تو ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے نہ بانس کے آدمی کو اور تمھاری پیشانی پر بھی کسی نیک جادوگرنی کے چومنے کا نشان ہے اس لیے تمھیں بھی کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔"

"مگر ٹوٹو کا کیا ہوگا۔" ننھی ڈورتھی پریشان ہو کر بولی۔ "اس کی حفاظت کیسے ہوگی؟"

"اسے کوئی خطرہ پیش آیا تو ہم سب مل کر اس کی حفاظت کریں گے"

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک خوفناک دہاڑ سنائی دی اور دوسرے ہی لمحہ میں کیا دیکھتے ہیں ایک شیر صاحب بیچ سڑک پر تشریف رکھتے ہیں۔ انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اپنے پنجے سے بانس والے آدمی کے ایک تھپڑ رسید کیا۔ بے چارہ لڑھکتا پڑھکتا سڑک کے کنارے جا پڑا۔ دوسرا وار لکڑہارے پر ہوا۔ وہ بھی سڑک پر گرا۔ شیر کے لیے تعجب کی بات یہ تھی کہ اس حملے کا اس پر ذرا بھی اثر نہ ہوا۔ اب رہے ننھے منے ٹوٹو صاحب انھیں اور تو کچھ نہ سوجھا بھونکتے ہوئے چلے سیدھے شیر کی طرف۔ شیر نے بھی اپنا منہ کھولا جیسے ٹوٹو کو کاٹنا چاہتا ہو۔

ڈورتھی سہمی ہوئی تھی مگر یہ دیکھ کر کہ ٹوٹو موت کے منہ میں جا رہا ہے ایک دم جھپٹ پڑی۔ ڈر وغیرہ سب بھول گئی۔ شیر کی ناک پر پوری طاقت سے گھونسا مارا۔

"خبردار جو تم نے ٹوٹو پر حملہ کرنے کی جرأت کی۔ تمھیں شرم نہیں آتی۔ اتنے بڑے ہو کر اس ننھی سی جان پر حملہ کر رہے ہو۔"

"میں نے تو اسے نہیں کاٹا۔"

بات کرتے ہیں وہ اپنے پنجے سے ناک سہلا رہا تھا۔

"نہیں تم اس پر حملہ کرنے والے تھے۔ تم اتنے بڑے جانور ہو جنگل کا بادشاہ کہلاتے ہو مگر بزدل ہو۔"

"یہ میں خود جانتا ہوں" شیر نے اپنی گردن شرم سے نیچی کر لی۔ "مجھے برابر اس کا احساس ہے۔ مگر سمجھ میں نہیں آتا اس بزدلی سے کیسے پیچھا چھوٹے۔"

"میں کیا جانوں" وہ ابھی تک غصے میں تھی۔ "مجھے تو اس بے چارے گھاس پھونس سے بھرے آدمی کا خیال آرہا ہے جس پر تم خواہ مخواہ حملہ کر بیٹھے۔ اسی بانس والے آدمی پر۔"

ڈورتھی دوڑی دوڑی بانس والے آدمی کے پاس گئی۔ اسے اوپر اٹھا کر اس کے پیروں پر کھڑا کیا۔ اس کے کپڑے وپڑے ٹھیک کیے۔ شیر نے یہ دیکھ کر بڑے اچنبھے سے پوچھا! "ارے! کیا سچ مچ اس میں گھاس پھونس بھرا ہے۔"

"جی ہاں! اس میں گھاس پھونس بھرا ہے" ڈورتھی کا غصہ ابھی کم نہ ہوا تھا۔

"جبھی یہ حضرت اتنی آسانی سے لڑھکتے پڑھکتے چکر کھاتے دور جا گرے تھے۔ اور کیا ان دوسرے صاحب میں بھی بھوسا بھرا ہے۔؟"

"نہیں یہ ٹین کے بنے ہوئے ہیں۔" اور ڈورتھی نے ٹین کے لکڑہارے کے پاس

جاکر اسے کھڑے ہونے میں مدد دی۔

"اوہ ہو جبھی، میرے ناخن جیسے کند ہو گئے جس وقت میں نے اپنے پنجوں سے حملہ کیا تو ایک ٹھنڈی لہر تیزی سے پیٹھ تک دوڑ گئی۔ اور یہ ننھا جانور کیا ہے جس سے آپ کو اتنی محبت ہے۔"

"یہ میرا کتا ہے ٹوٹو۔"

"تو کیا یہ بھی گھاس پھونس سے بھرا ہوا ہے یا ٹین کا بنا ہوا ہے۔"

"جی نہیں یہ گوشت پوست کا جانور ہے۔"

"اوہ بڑی انوکھی، بڑی عجوبہ مخلوق ہے۔ سچ بہت ہی ننھا منا جانور۔ اب جو میں اس کی طرف نظر ڈالتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ مجھ جیسے بزدل کے سوا کوئی اس پر حملہ کرنے کا خیال بھی دل میں نہ لائے گا۔"

"مگر یہ بزدلی تم میں کہاں سے آگئی؟" ڈروتھی نے اس کو دیکھ کر اچنبھے میں آکر بولی۔

"یہ سچ مچ اتنا بڑا تھا اتنا بڑا تھا جیسے چھوٹا موٹا گھوڑا۔"

"کیا بتاؤں! یہ بھی ایک راز ہے۔ ایسا لگتا ہے۔ جیسے میں بزدل ہی پیدا ہوا تھا۔ جنگل کے سبھی جانور مجھے دلیر اور بہادر سمجھتے ہیں۔ بھلا شیر تو ہر جگہ جنگل کا بادشاہ مانا جاتا ہے۔ اب آپ پوچھیں میں نے یہ بات کیسے جانی تو بھئی جب میں زور سے دہاڑتا ہوں تو جنگل کا ہر باسی سہم جاتا ہے۔ اور میرے راستے سے ہٹ جاتا ہے۔ جب کبھی کسی آدمی کا سامنا ہو جاتا ہے تو میں بری طرح ڈر جاتا ہوں۔ بس فوراً دہاڑنے لگتا ہوں اور وہ دہاڑ سنتے ہی بڑی تیزی سے بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔"

"اگر ہاتھی، چیتے، سوور میرے مقابلے پر آجائیں تو سوائے بھاگنے کے مجھ سے اور کچھ نہ بن پڑے لیکن جیسے ہی وہ میری دہاڑ سنتے ہیں اِدھر اُدھر ہو جاتے ہیں اور میں انھیں جانے دیتا ہوں۔"

"مگر یہ بات تو ٹھیک نہیں جنگل کے بادشاہ کو اتنا بزدل تو نہ ہونا چاہئیے۔" بانس والے آدمی نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"یہ میں جانتا ہوں۔" شیر کی آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے۔ اور وہ انھیں اپنی دم سے پونچھ رہا تھا۔ "یہ میرے لیے بڑے غم کی بات ہے اور اس چیز نے میری زندگی کو اجیرن بنا دیا ہے جب کبھی کوئی خطرہ سامنے ہوتا ہے تو میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگتا ہے۔"

"آپ کو کہیں دل کا مرض تو نہیں ہے؟" ٹین کے لکڑہارے نے پوچھا۔

"ہو سکتا ہے۔"

"اگر آپ کو دل کا مرض ہے۔" لکڑہارے نے اپنی بات جاری رکھی۔ "پھر تو آپ کو خوش ہونا چاہیئے۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ آپ کے پاس دل ہے۔ مجھے دیکھئے میرے پاس دل ہی نہیں ہے۔ اس لئے دل کی بیماری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"بہت ممکن ہے۔" جنگل کا بادشاہ سوچ میں پڑ گیا۔ "اگر میرے پاس دل نہ ہوتا تو میں

بزدل بھی نہ ہوتا۔"

"آپ کے پاس دماغ ہے؟" بانس کے آدمی نے پوچھا۔

"غالباً ہے مگر کبھی میرا دھیان اس بات کی طرف نہیں گیا۔"

"میں بڑے جادوگر کے پاس دماغ لینے جا رہا ہوں۔" بانس والا آدمی بولا۔ میرے دماغ میں گھاس پھوس بھرا ہے۔"

"اور میں اپنے لیے دل مانگنے جا رہا ہوں۔" ٹین کا آدمی بول اٹھا۔

"اور میں بڑے جادوگر سے یہ درخواست کروں گی کہ مجھے اور ٹوٹو کو کنساس واپس بھیج دے۔" ڈوروتھی صاحبہ نے فرمایا۔

"اچھا تو اگر آپ پسند کریں تو میں بھی آپ کے ساتھ ہو جاؤں۔ بنا ہمت اور دلیری کے میری زندگی اجیرن ہو گئی ہے۔"

"بڑی خوشی سے بڑی خوشی سے —— آپ کے ساتھ ہونے سے دوسرے جنگلی جانوروں سے حفاظت ہو جائے گی۔ میرے خیال میں تو وہ آپ سے بھی زیادہ بزدل ہیں۔ بھلا آپ انھیں اتنی آسانی سے ڈرا دیتے ہیں۔"

"وہ واقعی بزدل ہیں۔" شیر بولا۔ "مگر اس بات سے مجھ میں ذرا بھی ہمت اور دلیری پیدا نہیں ہوتی۔ اور جب تک مجھے اپنی بزدلی کا احساس رہے گا میں خوش نہیں رہ سکتا۔"

اور یہ چھوٹا سا قافلہ پھر اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔ شیر صاحب ڈوروتھی کے کندھے سے کندھا ملائے ڈگ بھرتے شاہانہ انداز سے چلے جا رہے تھے۔ شروع شروع میں ٹوٹو کو یہ نیا ساتھی بالکل نہ بھایا۔ اس کم بخت کو ذرا بھی موقع ملتا کچا ہی چبا جاتا۔ مگر دھیرے دھیرے یہ خفگی دور ہو گئی۔ ہوتے ہوتے دونوں بہت اچھے ساتھی بن گئے۔

اس دن کوئی اور ایسی بات نہ ہوئی جو ان کے سفر میں رکاوٹ ڈالتی۔ ہاں ایک بار ٹین کے لکڑہارے کا پیر ایک بھونرے پر پڑ گیا وہ بے چارہ کچل گیا۔ لکڑہارے کو اس کا بڑا رنج ہوا۔ وہ ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتا تھا کہ کسی کو اس سے تکلیف نہ پہنچنے پائے۔ وہ چل رہا تھا اور مارے غم کے آنسو اس کے گالوں پر بہہ رہے تھے۔ یہ اس کے جبڑوں تک پہنچ گئے۔ آہستہ آہستہ زنگ لگنے لگا۔

اچانک ڈوروتھی اس سے کوئی بات پوچھ بیٹھی۔ پر زنگ لگ جانے سے بے چارہ لکڑہارا منہ بھی نہ کھول سکتا تھا جواب کیا دیتا۔ وہ خود بہت گھبرا گیا پریشانی ظاہر کرنے کے لیے طرح طرح کی حرکتیں طرح طرح کے اشارے کرنے لگا۔ ڈوروتھی تو کچھ نہ سمجھ پائی مگر بانس کے آدمی نے لکڑہارے کی اس پریشانی کو بھانپ لیا۔ فوراً تیل کا ٹین اٹھا لایا اور اس کے منہ کو تیل سے صاف کیا۔ زنگ صاف ہو گیا تو لکڑہارا پہلے کی طرح بولنے چالنے لگا۔

"اس وقت مجھے ایک بڑا سبق ملا ہے۔" لکڑہارا بولا۔ "ایک ایک قدم دیکھ کر چلنا چاہیے۔ پھر کوئی کیڑا کوڑا پیروں تلے روند گیا تو میں یقیناً رو پڑوں گا۔ آنسوؤں سے میرے جبڑوں میں زنگ لگے گا اور میں گونگا بن جاؤں گا۔"

اور لکڑہارا اب سچ مچ بہت ہی احتیاط سے قدم اٹھا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سڑک پر تھیں۔ کوئی کیڑا کوڑا رینگتا ہوا دکھائی دیتا تو اس سے بچ کر نکل جاتا۔ یہ بات وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے پاس دل نہیں ہے۔ اسی لیے وہ بڑی احتیاط کرتا تھا کہ کسی کے ساتھ زیادتی نہ ہونے پائے۔

"آپ لوگوں کے پاس تو دل ہے۔" لکڑہارا بولا۔ "یہ آپ کی رہنمائی کرتا ہے۔ غلط راستے پر نہیں پڑنے دیتا۔ میرے پاس نہیں ہے اس لیے مجھے بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ جادوگر مجھے دل دے گا تو اتنی پریشانی نہ ہوگی۔"

جناب اطہر عزیز

سردی کا موسم

آگیا بچو! یہ اب سردی کا موسم آگیا
دیکھ کر جس کی ادا سورج بھی اب شرما گیا
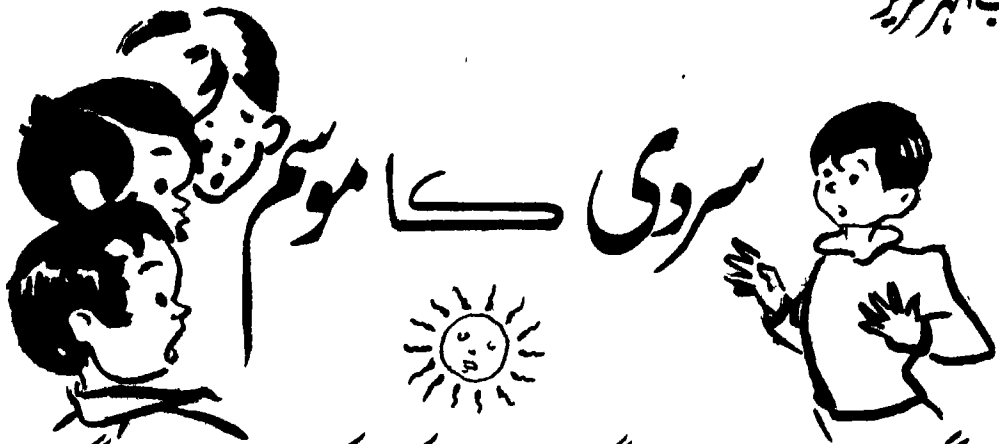
جاڑا کیا آیا انگیٹھی پر اتر آئی بہار
کانپتے جسموں کو اب ملنے لگا ہے کچھ قرار

اِس کی اِک جانب اگر بچوں کی ہے ٹولی کوئی
دوسری جانب لگی ہے کچھ بڑوں کی بھیڑ بھی

کوئی قصہ گو ہے تو لب پر کسی کے گیت ہے
جیسے جاڑے سے نپٹنا اِک طرح کی جیت ہے

گفتگو کے وقت کا تو اور کچھ ہی ہے سماں
بات کرتے ہیں اگر منہ سے نکلتا ہے دھواں

دن گذرتا ہے تو رات آتی ہے اٹھلاتی ہوئی
ہر طرف بس برف ہی کا مینہ برساتی ہوئی

چاند بھی نکلا ہے گویا تھرتھراتا کانپتا
اونگھتی کرنوں کی چادر سے بدن کو ڈھانپتا

ہے وہ ٹھنڈک لب، زباں، انگلیاں تک سرد ہیں
اور آنکھوں کی تو دونوں پتلیاں تک سرد ہیں

گرم چادر جسم پر گو اپنے ہے پھیلی ہوئی
پھر بھی سردی ہے کہ رونگٹوں تک سے ہے لپٹی ہوئی

موسم سرما کی یوں تو ہے حسیں ہر اک ادا
کاش اس میں گرمیوں کی آنچ بھی ہوتی ذرا

بچھو

محترمہ فرزانہ انصاری

میں اور نغمی آبا کے ساتھ نمائش گیے تو کھلونوں کی دُکان پر میری نظر پلاسٹک کے بچھوؤں پر پڑی۔ مجھے شرارت سوجھی اور میں نے نغمی کو بھی اس طرف متوجہ کیا۔ پھر کیا تھا۔ ہم دونوں نے آبا سے ضد کرکے پانچ چھ بچھو خرید لیے۔

جب ہم رات میں خوب گھوم پھر کر کھلونوں اور مٹھائی سے لدے پھندے گھر پہنچے تو اپنے سارے کھلونے وغیرہ تو سب کو خوب اترا اترا کر دکھائے لیکن بچھو صاف چھپا گیے۔ کھانا وغیرہ کھا پی کر سب اپنے اپنے بستر پر جا لیٹے تو ہم دونوں بھی لیٹ گیے اور یوں ظاہر کیا جیسے بڑی گہری نیند میں ہوں۔ گھنٹہ بھر دم سادھے پڑے رہے۔ جب اطمینان ہو گیا کہ سب سو رہے ہیں تو ہم دونوں آہستہ سے اٹھے۔ ایک بچھو جا کر دادی اماں کے پاندان میں رکھا۔ دوسرے نے آپا جان کے تکیے پر جگہ پائی۔ تیسرا بھائی جان کی کتابوں پر رکھا گیا۔ اور چوتھا گوند کی مدد سے امی جان کی الماری پر چپکا آئے۔

جب ہم دونوں دبے پاؤں اپنے بستر پر پہنچے تو دوسرے دن کا خیال کرکے ہنسی چھوٹ گئی۔ میں نے منہ میں چادر کا کونہ ٹھونس لیا اور نغمی کو گھور کر دیکھا۔ نغمی کی ہنسی رکتی نہ تھی۔ ڈر تھا کہ کوئی جاگ نہ جائے۔ آخر اس بے چاری نے بھی چادر کا سہارا لیا ہم دیر تک سوچ سوچ کر ہنستے رہے اور خدا جانے کب سو گیے۔

صبح ہماری آنکھ سب سے پہلے امی کی چیخ سن کر کھلی امی چیخ رہی تھیں: "ارے بچھو ہے کوئی مارو" ہمارا نوکر دوڑا ہوا آیا اور اس نے چپل اٹھا کر بچھو کے رسید کی۔ بچھو پر کوئی اثر نہ ہو۔ وہ اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں۔ بھلا سچ مچ بچھو ہوتا تو اثر بھی ہوتا۔ نوکر کو کچھ شبہ ہوا پھر وہ غور سے دیکھ کر بولا "بی بی جی یہ تو پلاسٹک کا بچھو ہے"۔ امی کو بے حد غصہ آیا کہنے لگیں "ضرور یہ نظیر اور نغمی کی شرارت ہوگی۔ ٹھیرو ابھی ٹھیک کرتی ہوں"۔ ہم دونوں چپکے سے کھسک آئے اور چھپ گیے۔

دوسری باری آپا جان کی تھی اور ہم انکے قریب ہی منڈلا رہے تھے۔ جیسے ہی آپا جان نیند سے جاگیں ان کی نظر بچھو پر پڑی اور وہ بستر سے اچھل کر بھاگیں اور آبا سے ٹکرا گییں۔ آبا نے جھلا کر کہا۔

"دیکھ کر چلو"

آپا نے ہکلا ہکلا کر بتایا ان کے بستر پر ایک بڑا موٹا تازہ بچھو موجود ہے ہم دونوں کو ہنسی آگئی اور باہر بھاگ گیے۔ ورنہ آپا جان ہمارے گالوں کو کشمیری سیب بنا دیتیں

دادی اماں نے جب پان کھانے کے لیے پان دان کھولا تو مت پوچھیے کس قدر مزہ آیا اور دادی اماں نے ہمیں کتنی صلواتیں سنائیں۔ اگر وہ کر سکتیں تو دونوں کی خوب پٹائی کرتیں مگر ہم کہاں ان کے ہاتھ آنے والے تھے۔

مگر جب بھائی جان کی نگاہ اپنی کتابوں پر تشریف رکھے بچھو پر پڑی تو وہ چپ چاپ باہر نکل آئے دونوں کے کان پکڑے اور کمرے میں لا کر کہا۔

"فوراً مرغا بن جاؤ"

مجھے ہنسی آگئی ——— "بھائی جان مرغا یا مرغی"!
لیکن بھائی جان کو ہنسی بالکل نہ آئی اور انھوں نے ہم
دونوں کے کان پکڑ کر کمرے کے دو مختلف گوشوں میں کھڑا کر دیا اور
حکم دیا کہ ایک گھنٹے تک ہم اسی حال میں کھڑے رہیں۔ ہم گھنٹے بھر
تک اسی طرح دیوار کی طرف منھ کیے کھڑے رہے اور سب ہم پر ہنستے رہے
بھائی جان شام کو کالج سے لوٹے تو ان کے ہاتھ میں
ایک بڑا سا بچھو دھاگے سے بندھا لٹک رہا تھا۔ مگر ہم نے ذرا
بھی توجہ نہ دی۔ ہم بھائی جان سے ناراض تھے اور کیوں نہ ہوتے
بھائی جان ہم دونوں کے پھولے ہوئے منھ دیکھ کر
مسکرائے اور بچھو کو ہمارے پاس ہی فرش پر چھوڑ دیا۔ چھوڑنا
تھا کہ وہ تیزی سے ایک طرف کو بھاگ نکلا اور ہم دونوں ساری
ناراضگی بھول کر اس کے پیچھے دوڑے کہ کہیں بھاگ نہ جائے۔
وہ زیادہ دور نہ جا سکا۔ دھاگا تو بھائی جان کے ہاتھ میں تھا۔ انھوں
نے دھاگے کو کھینچ کر بچھو کو گھسیٹ لیا۔ اور اب ہم نے دیکھا کہ بچھو
دُم سے بندھا تھا اور غصہ سے اپنی دم کو بار بار اپنی پیٹھ پر سے
منھ کی طرف موڑ رہا تھا۔ ہم دونوں کی دلچسپی دیکھ کر بھائی جان
مسکرائے اور بولے۔
"ذرا دیکھو تو اس کے جسم کی بناوٹ کیسی ہے؟ لیکن
ہماری ہمت نہ ہوئی کہیں کاٹ لے تو ——— بھائی جان نے
خود ہی چمٹے کی مدد سے بتانا شروع کیا۔ "دیکھو اس کے جسم کو دو
حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ (۱) سر اور سینہ ایک دوسرے
سے جڑا ہوا۔ (۲) پیٹ یا شکم اور دُم۔"
"بھائی جان ذرا اس کی دُم دکھایئے گا" نغمی نے کہا۔
"کیسے پیچھے موڑ رہا ہے" بھائی جان نے مسکرا کر کہا۔ "موڑ
نہیں رہا ہے۔ بلکہ ڈنک مار رہا ہے۔ بچھو کی دُم کے آخری
سرے پر ایک چھوٹی سی زہر کی تھیلی
ہوتی ہے جس کے منھ پر ایک خمدار نوکیلا
کانٹا یا ڈنک ہوتا ہے یہ ڈنک اس قسم کا ہوتا ہے کہ جب تک
بچھو اپنے پیٹ کے پچھلے حصے کو اوپر نہ اٹھائے زہر ڈنک کے
ذریعہ خارج نہیں ہوتا۔"
"بھائی جان اس میں زہر ہوتا کہاں ہے؟" میں
نے پوچھا۔
"وہ بھی دُم کے آخری حصے میں زہر جمع ہوتا ہے اور
ڈنک کے ذریعہ بچھو اسے اپنے شکار کے جسم میں داخل کرتا ہے۔"
"بھائی جان پھر تو بچھو بڑا ہی موذی ہوتا ہے۔ بھلا
یہ دوسروں کے جسم میں زہر کیوں داخل کرتا پھرتا ہے؟ ابھی
پرسوں ہی امی کے بچھو نے کاٹ لیا تھا انھیں کس قدر تکلیف
ہوئی تھی۔ نغمی نے کہا۔
"یہ اپنے زہر کے ذریعہ شکار کرتا ہے۔ یہ تو اس کا
ہتھیار ہے جس کے ذریعہ شکار کر کے وہ غذا حاصل کرتا اور اپنی
حفاظت کرتا ہے۔ اس کے زہر کی وجہ سے ہی تو تم اس سے
ڈر رہی ہو۔ اگر یہ بھی تتلی کا سا کیڑا ہوتا تو اب تک تم دونوں
نے اسے مار ڈالا ہوتا" بھائی جان نے کہا۔ بات سچ تھی ہم تتلیاں
بہت پکڑتے ہیں۔
"اس کی کتنی آنکھیں ہوتی ہیں؟" میں نے پوچھا۔
"اور کہاں ہوتی ہیں؟" نغمی نے پوچھا۔
"اس کے دو سے لے کر پانچ تک اور بعض حالات
میں تو آٹھ تک آنکھیں ہوتی ہیں۔ یہ آنکھیں اس کے پیٹ کے
اگلے حصے میں ہوتی ہیں" بھائی جان نے کہا۔
"اور بھائی جان اس کے مونچھیں تو ہیں نہیں؟ پھر
اسے راستہ کیسے نظر آتا ہے؟" نغمی نے کہا۔
"ہاں جھینگر اور ٹڈے کی طرح اس کی مونچھیں نہیں
ہوتیں۔ لیکن دیکھو اس کے منھ کے
سامنے دو شکنجے کے سے اعضا موجود

ہیں۔" بھائی جان نے کہا۔

"بھائی جان شکنجہ کسے کہتے ہیں؟" نغمی بیچ ہی سے بات کاٹ کر بولی۔

"جس کے ذریعہ کوئی چیز مضبوطی سے پکڑی جاتی ہے۔ اسے شکنجہ کہتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"ان شکنجہ نما اعضاء کے ذریعہ بچھو اپنی غذا تلاش کرتا اور مضبوطی سے پکڑے رہتا ہے۔" بھائی جان نے کہا۔

"اور اس کی آنکھیں؟" میں نے پوچھا اس لیے کہ مجھے بچھو کی آنکھیں کہیں بھی نظر نہیں آرہی تھیں۔

"پیٹ کے اگلے حصے پر پانچ یا آٹھ آنکھیں موجود ہوتی ہیں لیکن اس کا منھ سامنے کی طرف دونوں شکنجہ نما ہاتھوں کے بیچ میں ہوتا ہے۔" بھائی جان نے کہا۔

"بچھو کے کان کہاں ہوتے ہیں بھائی جان؟" نغمی نے پوچھا۔

"بھئی اس کے کان بھی پیروں پر ہوتے ہیں۔ دراصل بچھو کی سننے اور دیکھنے کی قوت دوسرے کیڑوں کے مقابلے میں بہت کم ہوتی ہے۔" بھائی جان نے کہا۔

"بھائی جان کیا یہ بھی جھینگر کی طرح ہر چیز کھا جاتا ہے یا ٹڈے کی طرح صرف پودوں کی پتیاں وغیرہ کھاتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بھئی چھوٹے کیڑے اسے بہت پسند ہیں یہ اپنے اگلے ہاتھ نما اعضاء کے ذریعہ کیڑوں کو پکڑ لیتا ہے اور پھر اپنی دُم کے ذریعہ ڈنک مار کر انھیں ہلاک کر دیتا ہے اور کھا لیتا ہے۔"

"لیکن یہ ہمیں کیوں ڈنک مارتا ہے؟ کتنی تکلیف ہوتی ہے۔" نغمی نے کہا۔

"ہاں ——" بھائی جان آہستہ سے مسکرائے۔ "بھئی وہ ڈنک اپنی حفاظت کے لیے بھی مارتا ہے۔ تاکہ کوئی اسے ختم نہ کر دے۔"

"یہ بھائی جان بچھو انڈے کہاں دیتا ہے؟ دادی اماں تو کہتی ہیں کہ بچھو کے بچے ماں کی پیٹھ پھاڑ کر نکل آتے ہیں اور ان کی ماں بے چاری مر جاتی ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں بھئی۔" بھائی جان زور سے ہنسے۔ "دراصل بچھو انڈے نہیں دیتی اس کے بچے زندہ پیدا ہوتے ہیں جنھیں مادہ اپنی پیٹھ پر بنی تھیلی میں لیے پھرتی ہے۔ جب بچے کچھ بڑے ہو جاتے ہیں یعنی ایک بار جلد بدل لیتے ہیں تو اپنی ماں کی پیٹھ سے اتر آتے ہیں اور اپنی آزاد زندگی شروع کرتے ہیں۔"

"اس کے پھیپھڑے کہاں ہوتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"یہ بھی اپنے پیٹ کے ذریعہ سانس لیتا ہے۔ اس کے پیٹ پر آٹھ سوراخ ہوتے ہیں۔ اگر ان سب کو بند کر دیا جائے تو بچھو تھوڑی دیر میں مر جاتا ہے۔" بھائی جان نے کہا۔

"یہ بھی چیونٹیوں کی طرح زمین میں کالونی بنا کر کیوں نہیں رہتے یا پھر شہد کی مکھیوں کی طرح چھتا بنا کر کیوں نہیں رہتے؟" نغمی نے پوچھا۔

"یہ بھی بڑے جاہل، اُجڈ اور گنوار ہوتے ہیں۔ ہمیشہ لڑتے رہتے ہیں تم دونوں کی طرح ——" بھائی جان مسکرائے۔

"ہم جاہل، اجڈ اور گنوار نہیں ہیں۔" ہم دونوں کو غصہ آگیا —— "نہ ہوگے" بھائی جان لاپروائی سے بولے۔ "ایک بچھو جب دوسرے کو دیکھتا ہے تو فوراً دونوں میں لڑائی ٹھن جاتی ہے اور جیتنے والا ہارنے والے کو کھا جاتا ہے۔ کیا سمجھے؟"

"گیدڑوں کی طرح ——" نغمی کو بڑا افسوس ہو رہا تھا۔ بھائی جان نے ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے جوتا اٹھا کر بچھو کے رسید کیا بے چارہ آچور بن کر رہ گیا۔

"لیکن بھائی جان —— بچھو بس صرف کالے رنگ کے تو نہیں ہوتے۔"

باقی صفحہ

جناب دینا ناتھ گردھر

حوصلہ مند سپاہی

اس صدی کے پہلے آدھے حصے میں دنیا میں دو بڑی بھیانک لڑائیاں ہو چکی ہیں۔ ان لڑائیوں میں کروڑوں انسان مارے گئے۔ اربوں روپے کا مالی نقصان ہوا۔ عالی شان شہر مٹی میں مل گئے اور ان لڑائیوں کے بعد جو بیماریاں پھیلیں، ان سے بے اندازہ جانی نقصان ہوا۔ پھر فصلوں کی تباہی سے دنیا کو بھوک کا سامنا کرنا پڑا۔ پہلی لڑائی ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۹ء تک دوسری ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۵ء تک کے سالوں میں ہوئی۔

دوسری لڑائی کے آخری دور میں اتحادی فوجیں جرمنی پر چڑھ رہی تھیں۔ ایک طرف سے روسی دوسری طرف سے امریکی اور انگریزی فوجیں جرمنی میں داخل ہو گئی تھیں، جرمنی فوجیں بھی بڑی دلیری سے مقابلہ کر رہی تھیں اور حملہ آور فوجوں پر بھاری گولہ باری کر رہی تھیں۔ اسی گولہ باری کے وقت ایک گولہ امریکی فوج کی ایک چھوٹی سی ٹکڑی پر گر کر پھٹا۔ اس ٹکڑی میں اس وقت جتنے آدمی تھے ان میں سے تین تو وہیں ڈھیر ہو گئے، تیس آدمیوں کو شدید زخم آئے ان زخمی سپاہیوں میں ایک کا نام ہیریسن تھا۔ اس کا بایاں بازو بالکل اڑ گیا۔ دائیں گھٹنے کی ہڈی اڑ گئی۔ چہرہ بری طرح جھلس گیا۔ اس کے ساتھیوں نے کندھے اور ٹانگ سے خون کو روکنے کے لیے اپنی فوجی پیٹیاں اس کے زخموں پر کس کر باندھ دیں۔

گولہ باری کے بعد اسے ڈاکٹروں نے دیکھا تو قطعی لاعلاج قرار دے دیا اور مردہ سمجھ کر اپنے تین مردہ ساتھیوں کے ساتھ وہیں چھوڑنے کا فیصلہ کیا ہیریسن اس وقت درد سے نڈھال تھا۔ زخموں کی وجہ سے زندگی سے مایوس تھا پھر بھی اس نے ڈاکٹروں سے التجا کی کہ اسے یوں نہ چھوڑ دیں کسی فوجی ہسپتال میں پہنچا دیں۔ ڈاکٹروں نے رحم کھا کر اسے نارمنڈی کے امریکی فوجی ہسپتال میں پہنچا دیا۔ یہاں کے ڈاکٹروں نے بھی چاہا کہ اس کا نام ان لوگوں میں شامل کر دیا جائے جو میدانِ جنگ میں مارے گئے۔ لیکن ہیریسن نے یہاں بھی انھیں اس بات پر آمادہ کر لیا کہ اس کا علاج کیا جائے تاکہ وہ دل میں یہ حسرت لے کر نہ مرے کہ اس کا صحیح علاج نہ ہوا۔

نارمنڈی کے ہسپتال میں اس پر کئی اپریشن کیے گئے۔ ان اپریشنوں میں اس نے جس حوصلہ اور ہمت کا مظاہرہ کیا ان سے ڈاکٹر نہ صرف متاثر ہوئے بلکہ ان کی اپنی ڈھارس بھی بندھی۔ حالانکہ اس دوران ہیریسن کو کبھی کبھی انتہائی شدید درد اور گہری ناامیدی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ایک بات جو اسے بہت پریشان کرتی تھی، یہ تھی کہ اگر وہ زندہ بچ اٹھا تو وہ بالکل ناکارہ انسان ہوگا۔ جسے اپنی تمام عمر دوسروں کے سہارے اور مدد پر بھروسا کرنا پڑے گا۔

ایک دن ہسپتال میں اسے اچانک بچپن کا ایک واقعہ یاد آیا جس نے اس کی کایا پلٹ کر دی۔ اس کے خاندان میں عام دستور تھا کہ ہر اتوار کو وہ لوگ اپنے دوستوں سے ملنے جاتے یا انھیں اپنے گھر بلاتے تھے ان صحبتوں میں بڑے بوڑھے اکثر

اپنی مفروضہ تکلیفوں کا رونا روتے۔ ہیریسن نے اس وقت دل میں عہد کیا تھا کہ چاہے کیسے ہی ناخوشگوار حالات کیوں نہ ہوں، چاہے وہ ادھ مرا ہو جائے۔ بڑا ہو کر وہ ان تکلیفوں سے نہ تو گھبرائے گا نہ مایوس ہوگا۔ یہ حلف یاد آتے ہی اس نے سوچا کہ اب صحیح طور پر امتحان کا وقت آیا ہے۔ اس نے اپنے دل میں کہا۔

"ہیریسن! اب صورت حال کا دلیری سے مقابلہ کرو۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ تم سدا اپنے دکھڑے روتے رہو اور دنیا کے رحم و کرم کے امیدوار بنے رہو اور لوگ تم سے دور دور بھاگیں یا پھر اپنی تکالیف سے بے نیاز ہو کر دوسروں کی مدد کرو۔"

ہیریسن کو اب اپنے بارے میں فیصلہ کرنے میں آسانی ہو گئی اور اس روز سے اس کے اندر ایک بھاری تبدیلی ہو گئی وہ سارا دن ہنستا ہنساتا۔ دوسرے ساتھی مریضوں کو تسلی دیتا، انہیں لطیفے اور گانے سناتا۔ ان سے دوستانہ مذاق کرتا۔ گویا وہ خود خوش رہتا اور دوسرے مریضوں کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا۔ اس کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ دوسرے مریض بھی ہیریسن کی پیروی کرنے لگے اور ہسپتال کا ماحول بھی بدل گیا۔

اس دوران میں امریکہ سے اس کی بیوی اس سے ملنے آئی۔ وہ ہیریسن کی شکل دیکھ کر بہت گھبرائی لیکن جلد سنبھل گئی ہیریسن نے کہا کہ میرا بایاں بازو ہے ہی نہیں۔ دائیں ٹانگ ناکارہ ہے چہرہ بدنما ہو گیا ہے۔ دائیں ہاتھ کی بھی اپریشن کے بعد تین انگلیاں کاٹ دی گئی ہیں۔ ایسی حالت میں اگر تم طلاق لے لو تو مناسب ہوگا۔ اس کی بیوی یہ سن کر بہت غم زدہ ہوئی۔ لیکن سنبھل کر اس نے کہا کہ جب تک تم زندہ ہو جس شکل صورت میں ہو، میں تمھاری ہوں۔

ہیریسن کی بیوی نے اس روز سے صرف دو انگلیوں میں قلم تھام کر لکھنے کی مشق شروع کر دی اور تھوڑے دنوں میں اس میں مہارت حاصل کر کے ہیریسن کو ایسا کرنے پر آمادہ کیا۔ ہیریسن کو ایک اور شغل مل گیا اور کچھ ہی عرصہ میں وہ بھی لکھنے لگا۔

جب ہیریسن کے زخم بھر گیے۔ تو اسے مزید علاج کے لیے امریکہ لایا گیا اور سان فرانسسکو کے فوجی ہسپتال میں داخل کیا گیا۔ جرمنی اور امریکہ میں کل ملا کر ستائیس مہینے ہیریسن ہسپتال میں رہا۔ اس عرصہ میں اس کے تیس بڑے اور اتنے ہی معمولی اپریشن ہوئے۔ تب کہیں وہ اس قابل ہوا کہ لکڑی کی بغل گھوڑی پر سہارا لے کر چل پھر سکے۔

اب اسے یہ فکر لاحق ہوئی کہ وہ کوئی کام کرے۔ مگر کام کرنے کے لیے روپیہ درکار ہوتا ہے۔ وہ اس کے پاس کہاں تھا۔ اس کی بیوی ملازمت کرتی تھی جس سے بمشکل گذر اوقات ہوتی تھی، پس انداز کچھ نہ ہو سکتا تھا۔ اتفاق سے اس کی ملاقات ایک پرانے دوست سے ہوئی۔ دوست نے اسے بتایا کہ وہ آفس فرنیچر بنانے کا کام شروع کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس نے ہیریسن کو دعوت دی کہ وہ اس کے ساتھ شرکت کرے۔ سرمایہ دوست نے دیا کام ہیریسن نے سنبھالا۔

جنگ کے بعد صنعت و حرفت، تجارت و کاروبار معمول پر آ رہے تھے۔ فرنیچر کا کام چل نکلا اور دو تین سالوں میں یہ کاروبار بہت بڑے پیمانے پر آ گیا اور اس سے بہت معقول آمدنی ہونے لگی۔ آج یہ امریکہ میں فرنیچر کے سب سے بڑے کاروباری اداروں میں سے ایک ہے۔ کچھ عرصے بعد ہیریسن نے ایک اور دوست کے ساتھ سائنس کا سامان اور اس متعلقہ دوائیاں بنانے کا کام شروع کیا۔ وہ بھی خوب پھولا پھلا اور آج وہ بھی ایک اہم کاروباری ادارہ شمار ہوتا ہے۔ ہیریسن ان دونوں اداروں کا سب سے بڑا ڈائرکٹر ہے۔

امریکہ میں ہفتہ میں پانچ دن کام ہوتا ہے۔ ہفتہ اتوار چھٹی رہتی ہے۔

جب سے ہیریسن نے کام شروع کیا ہے، وہ ہر ہفتہ کے دن صبح سے رات تک سان فرانسسکو اور نواح کے ہسپتالوں میں جاکر وہاں مریضوں سے خوش گپیاں کرتا، ان کی ہمت بڑھاتا اور ان کی پھل اور مٹھائی سے تواضع کرتا ہے۔ امریکہ کی سرکار نے ایک بار اس کام کے لیے ایک سالانہ مقررہ رقم کی پیشکش کی تھی۔ مگر اس نے یہ پیشکش منظور نہ کی اس کا یہ معمول اب تک برابر جاری ہے۔ ہیریسن آج ایک بہت خوش گوار زندہ دل اور نیک انسان کی زندگی بسر کر رہا ہے اور اس کا کاروبار دن بدن بڑھ رہا ہے۔ یہ سب اس کے حوصلے اور جرأت کی برکت ہے۔

خدا ہم سب کو ایسا حوصلہ اور جرأت عطا فرمائے۔

جناب فوق فاروقی

سالنامے کا گیت

خوش "پیامی" ہیں کہ پیارا سالنامہ آگیا
سالِ نو آیا ہمارا سال نامہ آگیا
ٹائیٹل بھی خوب ہے دیکھو بہت ہی خوب ہے
رنگ اس کے دل نشیں ہیں دل کو یہ محبوب ہے
ہائے کیا پیاری ہیں نظمیں پڑھیے چٹخارے کے ساتھ
بہتے رہیے بس سرور و کیف کے دھارے کے ساتھ
اور مضامیں وہ کہ معلومات کا دفتر کہیں
سوچ میں ہیں سب کسے کمتر کسے برتر کہیں
جو کہانی بھی پڑھی منھ سے یہ نکلا لاجواب
کرنے والوں نے کیا ہے کتنا اچھا انتخاب
اور لطیفے قہقہوں کی ایک دنیا لائے ہیں
سچ تو یہ ہے ہنستے ہنستے پیٹ میں بل آئے ہیں
قابلِ داد و ستائش ہیں مدیرانِ "پیام"
سالنامے کو کیا شایع جو کر کے اہتمام
لکھنے والوں کی بھی محنت اس میں کوئی کم نہیں
جس نے جو کچھ لکھا ہے وہ لکھا ہے پیارا دل نشیں
الغرض یہ سالنامہ ایک دستاویز ہے
اس کا ایک اک حرف جیسے عزم سے لبریز ہے

جناب ایم ۔ عالم گیر

دنیا میں کتابوں کی سب سے بڑی دکان

بہت سے پیامی دنیا کی سب سے بڑی لائبریری کے بارے میں تھوڑا بہت ضرور جانتے ہوں گے ۔ آئیے آج میں آپ کو دنیا کی سب سے بڑی کتابوں کی دُکان کے بارے میں کچھ بتاؤں۔

کتابوں کی یہ سب سے بڑی دُکان لندن میں ہے، اس کی بنیاد آج سے کوئی ساٹھ برس پہلے پڑی تھی ۔ یہ ۱۹۰۴ء کی بات ہے ۔ ولیم فائل اور گلبرٹ فائل نامی دو بھائیوں نے سخت محنت و مطالعہ کے بعد سول سروس کا امتحان دیا تھا، لیکن بد قسمتی سے امتحان میں وہ ناکامیاب ہوئے ۔

بعد میں جب انھوں نے دیکھا کہ امتحان کے دوران کام آئی ہوئی کتابیں اب کسی مصرف کی نہیں رہیں تو سبھوں کو فروخت کرنے کا ارادہ کیا ۔ جلد ہی سب کی سب کتابیں اچھی قیمت پر بک گئیں ۔ یہ دیکھ کر وہ کچھ اور پرانی کتابیں خرید کر مناسب نفع پر فروخت کرنے لگے ۔ دھیرے دھیرے ان کا یہ کاروبار ترقی کرنے لگا ۔ اچھی آمدنی اور عمدہ مستقبل کی امید پر آخر کار ڈبلو اینڈ جی فائل نام کی دکان وجود میں آئی ۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ شروع شروع میں کتابوں کی یہ خرید و فروخت کسی دکان میں نہ ہوتی ۔ بلکہ وہ اپنی کتابوں کا ذخیرہ اپنی والدہ کے باورچی خانے میں رکھتے تھے ۔ چند کتابیں نمک کی بوتل کے پیچھے تو چند مصالحوں کے ڈبے کے درمیان گھسی رہتی تھیں۔

جب کام کچھ زیادہ بڑھ گیا تو انھوں نے ایک چھوٹی سی دُکان کرایے پر لے لی ۔ مگر چند ہی برسوں بعد یہ بھی ناکافی ثابت ہونے لگی تو ۱۹۱۲ء میں ٹن بنانے کے ایک خالی کارخانے میں کاروبار شروع کیا ۔ اس کے بعد دن پر دن کاروبار میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہونے لگی ۔

اور آج فائل کی ہی دُکان دنیا میں کتابوں کی سب سے بڑی دکان ہے اور لندن میں چیرنگ کراس کے قریب بارہ عظیم الشان عمارتوں میں یہ کاروبار پھیلا ہوا ہے ۔ جہاں پچاس لاکھ کتابوں کا ذخیرہ چالیس میل لمبی الماریوں میں ہر وقت موجود رہتا ہے ۔

جب میں پہلی مرتبہ فائل کی دُکان پر گیا تو اس کی وسعت اور کتابوں کی ریل پیل دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا ۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ واقعی یہ کسی انسان کا قائم کیا ہوا ہے ۔ پوری عمارت میں ہر طرف طرح طرح کی آوازوں اور مختلف زبانوں کی بے آہنگی پھیلی ہوئی تھی ۔ فائل کی دُکان کے ملازم کوئی خاص لباس پہنے ہوئے نہیں تھے ۔ نہ وہ کسی قسم کا بلا یا شان لگائے ہوئے تھے ۔ اس لیے غلطی سے میں نے بہتیرے افراد کو کلرک وغیرہ سمجھ کر مخاطب کیا لیکن حقیقت معلوم ہونے پر سخت پشیمانی ہوئی ۔ اسی درمیان میں ایک بوڑھی عورت نے بتایا کہ لوگ اسے ہمیشہ دکان کی ملازمہ خیال کرتے ہیں ۔ صرف اس لیے

کہ وہ یہاں برابر مطالعہ کے لیے آتی رہتی ہے۔

منتظموں نے مجھے بتایا کہ انھیں ہر ماہ تقریباً دس لاکھ آرڈر موصول ہوتے ہیں۔ لیکن شاید ہی ایسا کبھی ہوتا ہے کہ غلطی سے کسی کو غیر مطلوبہ کتاب بھیج دی جاتے یا خریدنے والے کو کسی قسم کی شکایت کا موقع ملے، اس کے علاوہ یہ سارا کام نہایت تیزی سے ہوتا ہے۔

ساری دکان میں دن بھر ہنگامہ رہتا ہے۔ ہزاروں کتابیں خریدنے والے، سینکڑوں مطالعہ کرنے والے اس کے علاوہ ساڑھے چھ سو ملازمین اور چوکیدار وغیرہ مل کر دکان کو کسی شہر کا نمونہ بنائے رکھتے ہیں۔

فائل کی بین الاقوامی شہرت کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہاں ہر قسم کی کتاب مل جاتی ہے۔ چاہے وہ کوئی نایاب یا قدیم ایڈیشن کی کتاب ہو یا پھر اس کی جلد کسی خاص طرح کی ہو۔ غرض ہر موضوع اور ہر نوعیت کی کتاب یہاں مل سکتی ہے۔

ایک بار ایک سنکی مزاج مال دار شخص نے آڈر دیا کہ اسے ایسی کتاب کی ضرورت ہے جس کی جلد انسانی چمڑے سے بنی ہو۔ بظاہر اس انوکھی فرمائش کا خیال کسی دیوانے کے دماغ میں آسکتا ہے۔ لیکن فائل کے ماہرین نے بغیر کسی تردد کے انسانی چمڑے سے بنی جلد والی کتاب کی تلاش شروع کر دی اور وہ اس میں کامیاب رہے۔ انھوں نے ۱۸۴۳ء کی چھپی ایک فرانسیسی کتاب VIGNETTES DESMYSTERES DE PARIS تلاش کر لی جس کی جلد کتاب کی مصنفہ کی وصیت کے مطابق خود اس کے چمڑے سے بنائی گئی تھی۔ اس نوعیت کے کتنے ہی مرحلے فائل کے ملازمین رات دن جھیلتے رہتے ہیں۔

فائل کی دکان صرف ایک کاروباری قسم کے کتب فروش کی دکان نہیں ہے بلکہ ایک بہت عظیم لائبریری کا بھی کام دیتی ہے۔

روزانہ سینکڑوں پڑھے لکھے لوگ یہاں آکر مطالعہ کرتے ہیں یا حوالہ کی قیمتی کتابوں سے مستفید ہوتے ہیں بہت سے لوگ تو اپنا کھانا وغیرہ ساتھ لے کر آتے ہیں اور اس دوران میں مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔

ہاں یہاں پر ایک دلچسپ واقعہ بیان کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ جسے میں نے فائل کے ہاں ایک مستقل مطالعہ کرنے والے سے سنا تھا۔ چند سال قبل ایک شخص کو مقام سوہو کے نزدیک چھرا گھونپ دیا گیا تھا۔ وہ شخص اس علاقے سے دوڑتا ہوا فائل کی عمارت میں پہنچا اور ٹھیک اس سیکشن میں جا کر دم توڑا جہاں جاسوسی اور پراسرار کتابوں کا ذخیرہ تھا۔

ان سب کے علاوہ یہ مشہور دکان دوسری جنگ عظیم کے دوران جاسوسی کاموں کے لیے کافی کارآمد ثابت ہوئی تھی۔ دشمنوں کے جاسوسوں نے کتابوں کی الماریوں کو کثرت سے پیغام بھیجنے اور وصول کرنے کے لیے استعمال کیا تھا۔

۴ر جون ۱۹۶۳ء کو ولیم فائل نے ۸۱ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ لیکن وہ دکان جو باورچی خانے میں قایم ہوئی تھی، اب تک نہایت شان و شوکت کے ساتھ سارے عالم کی خدمت کرنے میں مشغول ہے۔ اور اب بھی دنیا میں کتابوں کی سب سے بڑی دکان ہے۔

*

دنیا کی چھوٹی اور بڑی لوک کہانیاں

ام نارائن اپادھیائے
ترجمہ
جناب شرف الدین

آیئے آج آپ کو دنیا کی کچھ چھوٹی بڑی لوک کہانیاں سنائیں۔ کچھ کہانیاں چھوٹی کیوں ہوتی ہیں؟ اسے جاننے کے لیے سب سے پہلے اودھ (یوپی) کی ایک لوک کہانی سنیے۔

(۱) ایک تھا ڈھیلا ایک تھا پتا۔ دونوں نے یہ صلاح کی کہ جب ہم پر مصیبت آئے گی ہم ایک دوسرے کی مدد کریں گے
ڈھیلے نے کہا "جب آندھی آئے گی تو میں تمھیں بچاؤں گا۔"
پتے نے کہا "اور جب پانی آئے گا تو میں تمھیں بچاؤں گا۔"
اتفاق کی بات ایک دن آندھی اور پانی دونوں ایک ساتھ آئے۔ اور انجام کار آندھی کی وجہ سے پتا اُڑ گیا اور ڈھیلا پانی میں گھل گیا۔

اگر آندھی اور پانی ایک ساتھ نہ آتے تو ہماری کہانی بھی آگے بڑھتی۔

(۲) اب اسی بارے میں چیکوسلوواکیا کی ایک کہانی سنیے۔
ایک آدمی تھا۔ اُسے جنگل میں ایک خوب صورت پیٹی ملی۔ آگے بڑھا تو ایک چابی ملی۔ اس نے چابی سے پیٹی کو کھولا، اس کے اندر ایک کوٹ تھا۔ اس نے اُسے پہننا چاہا۔ لیکن کوٹ چھوٹا تھا
یہ کوٹ لمبا ہوتا تو ہماری کہانی بھی لمبی ہوتی۔

(۳) چیکوسلوواکیا کی ایک کہانی اور سنیے اور دیکھیے انھوں نے کہانی چھوٹی کرنے کا کتنا اچھا گُر نکالا ہے۔
ایک گڈریا تھا۔ اس کے پاس ایک کالا ڈراؤنا کتا تھا۔۔۔۔۔

لیکن تم تو ڈر رہے ہو۔ اس لیے میں آگے کہانی نہیں کہہ سکتا۔

(۴) اب اپنے ملک کی ایک بہت ہی پرانی لوک کہانی سنیے۔
ایک تھے بھگوان جی۔ انھوں نے ایک مٹکا بنایا۔ مٹکا بن گیا، تو انھوں نے اُسے ٹھونک بجا کر دیکھنا چاہا۔ اتنے میں وہ ان کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا۔ وہ بہت گھبرائے اور ان ٹکڑوں کو جوڑنے کی کوشش کرنے لگے۔

لیکن اگر ٹوٹے ہوئے مٹکے کو جوڑا جا سکتا، تو آدمی بھی امر ہوتا اور اس کی کہانی کبھی ختم نہ ہوتی۔

اب دنیا کی سب سے بڑی کہانی سنیے۔

(۵) ایک بادشاہ تھا۔ اس کو کہانی سننے کا بہت شوق تھا۔ اس نے اپنے ملک میں منادی کرا دی جو کوئی اسے اتنی لمبی کہانی سنائے گا جسے سنتے سنتے بادشاہ خود ہار مان جائے تو اس شخص کو وہ اپنا آدھا ملک انعام دے گا۔ پر بھئی اگر کہانی سنانے والا ہار گیا تو بادشاہ اس کا سر کاٹ لے گا۔

بادشاہ کی یہ منادی سن کر کتنے ہی لوگ آئے۔ کسی نے ایک دن تک کسی نے دو دن تک کہانی سنائی۔ مگر کوئی بھی بادشاہ کی شرط نہ جیت سکا بے چارے کو اپنی جان گنوانی پڑی
ایک دن ایک آدمی آیا۔ اور بولا میں بادشاہ کو کہانی سناؤں گا۔ وزیروں نے اُسے بہت سمجھایا مگر وہ نہ مانا۔ سو اُسے

راجا کے پاس بھیج دیا گیا۔ اس نئے کہانی سنانے والے کو دیکھ کر بادشاہ بہت خوش ہوا اور اپنے تخت پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "اچھا اب اپنی کہانی شروع کرو۔"

کہانی کہنے والے نے کہا "حضور کہانی تو شروع کرتا ہوں مگر آپ کو 'ہنکار' برابر دینا پڑے گی۔"

بادشاہ راضی ہو گیا۔ تب اس نے کہانی شروع کی۔

"ایک تھا راجا۔ وہ اپنی رعایا کو بہت چاہتا تھا۔ ایک دن اس نے سوچا۔ اگر اپنے ملک میں قحط پڑا تو کیا ہوگا؟ سوچتے سوچتے اسے ایک تدبیر سوجھی۔ اس نے اپنے وزیروں کو بلایا اور حکم دیا۔ ایک گودام بنایا جائے، جو ایک میل لمبا ہو ایک میل چوڑا ہو ایک میل اونچا ہو اور اس گودام کو چاولوں سے بھر دیا جائے۔"

بادشاہ کا حکم تھا فوراً ہی گودام تیار کر کے چاولوں سے بھر دیا گیا۔"

اتنی کہانی سن کر راجا بہت خوش ہوا اور بیچ میں ہنکاری بھری۔ "پھر کیا ہوا؟"

کہانی سنانے والے نے کہا "اب راجا بہت خوش ہوا اس کی فکر دور ہو گئی۔ لیکن قسمت کی بات کہ اس گودام میں ایک چھوٹا سا سوراخ رہ گیا۔ وہ سوراخ ایسا تھا کہ ایک چڑیا اندر جا کر باہر آ سکتی تھی۔ یہ بات دیکھتے دیکھتے ایک چڑیا سے دوسری کو دوسری سے تیسری کو اور ہوتے ہوتے ساری دنیا کی چڑیوں تک پھیل گئی۔ تمام چڑیاں وہاں آ کر جمع ہو گئیں۔" بادشاہ نے بے چینی سے پوچھا "پھر کیا ہوا؟"

کہانی کار بولا "پھر ایک چڑیا سوراخ سے اندر جا کر ایک دانہ لے کر پھُر ہو گئی۔"

بادشاہ نے پوچھا "پھر کیا ہوا؟" کہانی کار نے کہا۔ "پھر ایک اور چڑیا اندر گئی ایک دانہ چونچ میں ڈال کر پھُر ہو گئی۔"

"پھر؟" "پھر ایک اور چڑیا اندر سے دانہ لے کر اڑ گئی۔"

بادشاہ نے ذرا تلخی سے کہا "پھر پھر کیا کرتے ہو آگے کہانی کہو۔"

کہانی سنانے والا بولا "آگے کہانی کیسے کہوں؟ ابھی تو راجا کا گودام بھرا پڑا ہے اور دنیا بھر کی چڑیاں باہر کھڑی ہیں۔ جب تک گودام خالی نہیں ہوتا بات کیسے آگے بڑھے؟"

بادشاہ جان گیا کہ یہ کہانی اس کی زندگی میں تو ختم ہونے والی نہیں، سوا چار ہو کر اسے کہانی سنانے والے سے ہار مان لی اور اسے آدھا ملک انعام میں دے دیا۔

جناب حرمت الاکرام
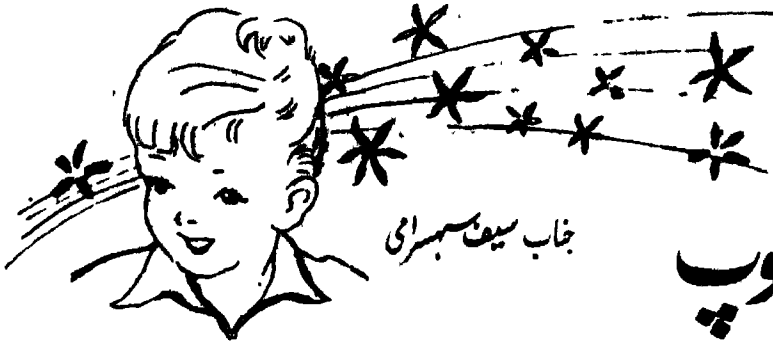
جاڑوں کی دھوپ

دیکھو، وہ آکاش سے اتری سندر مکھڑے والی دھوپ
جھوم رہی ہے پیڑوں، پودوں پر کیا کیا متوالی دھوپ
کیاری کیاری گھوم رہی ہے پیار لٹاتی کرنوں کا
جاڑا اک باغیچہ ہے، باغیچے کی ہے مالی دھوپ
گھر کے آنگن سے پھیلی ہے کھیتوں اور میدانوں تک
سرد ہواؤں سے کرتی ہے بچوں کی رکھوالی دھوپ
صبح ہوئی تو ناشتے کی تیاری میں سلگا کر آگ
ماں نے پوچھا کیا کھاؤ گے، منا بولا خالی دھوپ
ٹھٹھرے ہوئے جسموں سے کہتی ہے، مجھ کو سمجھو انمول
چھتوں، منڈیروں پر لہراتی، ناچتی ڈالی ڈالی دھوپ
اتراتی ہے اُجلے چہرے اور سنہرے آنچل پر
سورج کی جگمگ جگمگ کرتی گودوں کی پالی دھوپ
گیت خوشی کے چھیڑ رہی ہے کھیل کود کی محفل میں
بچوں کا دل بہلانے کو بجا رہی ہے تالی دھوپ

جناب سیف سہسرامی

دعا

خدایا نیکیوں کی خو عطا کر
بہارِ علم کی خوشبو عطا کر
مرے دل میں وفا کا نور بھر دے
جہالت کا اندھیرا دُور کر دے
مرے دامن کو پھولوں سے سجا دے
مجھے علم و ہنر دے حوصلا دے
وہ ہندو ہوں کہ مسلم، سکھ، عیسائی
رہیں سب بن کے یارب بھائی بھائی
نہ آپس میں کسی سے دشمنی ہو
نہ چوری ہو نہ قتل و رہزنی ہو
نہ بھڑکیں جنگ کے شعلے خدایا
جہاں میں راج ہو بس دوستی کا
خدایا میں وطن کے کام آؤں
زمانے میں بھلا سا نام پاؤں

جناب قدیر جاوید پرکی

پہلا انعام

"میں کہتی ہوں آج کچھ پکانے کے لیے بھی لاؤ گے یا معمے ہی بھرتے رہو گے؟" مرزاجی کی بیگم نے برتن دھوتے ہوئے کہا۔ لیکن مرزاجی تو معما حل کرنے میں محو تھے۔ انہوں نے شاید سنا بھی نہیں یا سنی ان سنی کر دی۔

انھیں معمے میں ڈوبا دیکھ کر وہ جھنجلا گئیں اور دیگچی زور سے زمین پر پٹک کر تیزی سے بولیں۔

"اچھا تو تم معما بھرتے رہو میں پڑوسن کے یہاں جا رہی ہوں ــــ اور نہیں ــــ تو ــــ"

"نیک بخت ــــ" مرزاجی نے جھکی ہوئی گردن اوپر اٹھائی ناک پر عینک درست کی اور بڑی عاجزی سے بولے "بس پانچ منٹ اور صبر کر لو۔ خاکہ پورا کر کے سودا لا دوں گا۔"

"نجانے تمہاری گھڑی میں۔ پانچ منٹ کتنی دیر میں بجیں" ان کی بیوی مونھ ہی مونھ میں بڑبڑائیں اور پھینکی ہوئی دیگچی اٹھا کر نل پر دھونے لگیں۔

تقریباً کوئی پندرہ بیس منٹ بعد مرزاجی نے خاکے وغیرہ سمیٹے اور تھیلا لے کر سبزی لینے چلے۔ راستے میں ان کے دو چار معمے والے دوست مل گئے پھر کیا تھا معمے کی باتیں ہونے لگیں بعض لفظوں کے بارے میں بحث چھڑ گئی اور تھیلا بغیر سبزی کے ان کے ہاتھ میں جھولتا رہا۔

"میں دعوے سے کہتا ہوں کہ اس بار اشارہ نمبر گیارہ میں صرف روزہ ہی درست لفظ ہے۔" مرزاجی کے دوست ساجی نے زور دے کر کہا۔ ان کے دوسرے ساتھی ان کے اس چیلنج کو برداشت نہ کر سکے اور ان سے زیادہ پُرزور الفاظ میں بولے:

"اگر روزہ نکلے تو آج سے عابد حسین مت کہنا۔"

غرض ان لوگوں میں اسی طرح معمے میں آنے والے الفاظ کے بارے میں تبادلۂ خیالات ہوتا رہا۔ اور آخر میں جب مرزاجی ان کے پاس سے چلے تو ساجی نے دو نئے لفظ انھیں سمجھائے یعنی اب ان کے پاس نکلنے والے دس الفاظ ہو گئے۔

دل ہی دل میں وہ چارٹ کا پروگرام بناتے ہوئے سبزی لے کر گھر واپس آئے جہاں ان کی بیوی ان کے انتظار میں آگ بگولا ہو رہی تھیں بیوی نے انھیں بہت لتاڑا مگر وہ دو نئے لفظوں کی خوشی میں کچھ نہ بولے اور برابر یہی کہتے رہے۔ "ارے نیک بخت خدا کا شکر ادا کرو کہ دو لفظ اور مل گئے ہیں۔"

"میں تو ہر وقت ہی خدا کا شکر ادا کرتی ہوں ــــ اصل شکر تو اس وقت ہوگا جب اس بیماری سے تمھاری جان چھوٹے گی۔" بیوی نے تنک کر تیزی سے کہا۔

"دیکھنا انشاء اللہ اب کی بار پہلا انعام اپنی ہی مقدر میں لکھا ہے۔" انھوں نے معمے کے کاغذات کھولتے ہوئے کہا اور پھر بیوی کی بات پر دھیان دیئے بغیر خاکوں میں ڈوب گئے۔

نئے الفاظ کی خوشی میں انھوں نے اس بار ۶۴
خاکوں کے بجائے ۱۲۸ خاکے لگائے صرف اس وجہ سے کہ یہ
دو نئے لفظ جو ساہنی نے انھیں دیے ہیں وہ ایسے تھے کہ ان
کی نظر ان تک پہنچی ہی نہیں تھی بس اس باعث انھوں نے خاکوں
کی تعداد بڑھادی تاکہ پہلا انعام یقینی طور پر لے سکیں۔
دوسرے روز جب معمّے کے جانے کا وقت ختم ہوگیا
تو ساہنی اور عابد حسین پھر ان سے ملے۔ اور خاکوں کے بارے میں
پوچھا کتنے حل بھیجے ہیں؟ انھوں نے دونوں کو بیٹھک میں
بٹھانے کے بعد بڑے فخریہ انداز میں بتایا کہ اس بار انھوں نے
۱۲۸ حل بھیجے ہیں۔
"تو پھر کیا ہے ——" ساہنی نے قبل از وقت
مبارک باد دیتے ہوئے کہا۔
"مبارک ہو اب کی پہلا انعام آپ ہی کا ہے۔"
"آمین —— ثم آمین ——" انھوں نے
بڑے خلوصِ دل سے ساہنی کی بات پر کہا۔ اور پھر ان کے لئے
ناشتے کا بندوبست کرنے چلے گیے۔
"اس کا مطلب یہ ہوا کہ اپنا جادو چل گیا ——" ان
کے اندر چلے جانے پر ساہنی نے عابد حسین سے سرگوشی کی۔
"بالکل ——" عابد حسین نے کہا۔ اور پھر چند پل
کے لیے خاموشی چھاگئی۔ ابھی وہ لوگ خاموش ہی تھے کہ مرزا جی
آگیے۔ اور پھر جو انھوں نے اسّی ہزار کے پہلے انعام کے خواب
دیکھنا شروع کیے ہیں تو اللہ کی پناہ تمام پروگرام بنا ڈالے سب کچھ
ہوگیا جیسے روپیہ اسی وقت ان کے ہاتھ میں آگیا —— انہی
پروگراموں کے دوران میں ناشتہ آگیا اور اس طرح پہلے انعام
کا پروگرام بناتے بناتے ناشتے سے فراغت پاکر ساہنی اور عابد
انھیں چلتے چلتے پھر مبارکباد دے گیے
آخری تاریخ سے تیسرے دن

صحیح حل آنا تھا۔ لہٰذا تیسرے ہی دن پہلی ڈاک سے مرزا جی
کے نام صحیح حل آفس سے آگیا۔ مرزا جی ہمیشہ اپنے حلوں کے ساتھ
صحیح حل کے لیے لفافہ ضرور بھجوایا کرتے تھے۔ جب صحیح حل کو انھوں
نے اپنے حلوں سے ملایا تو ان کے چارٹ میں ایک خاکہ بالکل درست
تھا —— وہ مارے خوشی کے چیخ اٹھے۔
"مار دیا —— مار دیا ——"
"اے ہے کیا مار دیا ——" ان کی بیوی پان لگاتے
ہوئے وہیں سے بولیں۔
مولا نے بچالیا کیا ناگ تھا؟
"اُرے نہیں ——" وہ خاکے اور صحیح حل لیے بیوی
کے پاس تیزی سے آئے اور درست خاکہ انھیں دکھایا۔
"میں نہ کہتا تھا کہ اب کی بار میں پہلا انعام ضرور لونگا
سو دیکھ لو میرا یہ خاکہ بالکل درست ہے —— واہ میرے مولا
واہ —— تو نے خوب سنی۔"
اور اس دن شام کو تار بھی آگیا جس میں تحریر تھا۔
"ہمیں آپ کو یہ اطلاع دیتے ہوئے
بڑی مسرت ہو رہی ہے کہ اس بار آپ
نے پروانہ ادبی معمّہ عنا میں پہلا انعام
اسّی ہزار روپے تنہا حاصل کیا ہے ——"
واصف حسین۔ جنرل منیجر
اس تار نے تو گویا مرزا جی کو بالکل ہی دیوانہ کر دیا
بس اب تو تار تھا اور وہ تھے۔ جہاں کوئی ملا اور جھٹ انھوں
نے تار اسے دکھایا۔ ساہنی اور عابد حسین بھی انھیں مبارکباد دینے
آئے اور ان سے پہلے انعام کی خوب خوب مٹھائی وصول کی۔
جس نے بھی ان سے مانگی وہ خالی ہاتھ واپس نہیں لوٹا سینکڑوں
روپے مٹھائی اور ناشتے وغیرہ میں انھوں
نے صرف کردیے۔ ادھر تو مرزا جی

لوگوں کو خوب خوب مٹھائیاں اور ناشتے کرا رہے تھے ادھر ساہنی اور عابد حسین میں گفتگو ہو رہی تھی۔

"بھئی اب تو اس اللہ کے بندے سے کہہ دو ورنہ بیچارے کا مٹھائی میں بھرکس نکل جائے گا۔" عابد حسین نے ساہنی سے کہا۔ اور پھر وہ دونوں سیدھے مرزاجی کے پاس آئے۔ وہ اسوقت دو چار دوستوں کو لئے بیٹھے تھے اور بڑی خوشی خوشی انعامی رقم کے بنائے پروگرام انھیں سنا رہے تھے۔

"آیئے آیئے ———" مرزاجی نے ان دونوں کا بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا:

"ارے بھئی یہ سب ان ساہنی صاحب کی مہربانی کا نتیجہ ہے جو بندے نے پہلا انعام پایا ہے۔ نہ یہ دو الفاظ بتاتے نہ پہلا انعام آتا۔" انھوں نے ساہنی کی تعریف اپنے دوستوں سے کی۔

"مرزاجی ———" ساہنی نے مسکراتے ہوئے کہا "مہربانی میری نہیں بلکہ پہلی اپریل کی تھی۔"

"کیا مطلب" مرزاجی کی باچھیں فرطِ حیرت سے پھیل گئیں

"مطلب بالکل صاف ہے کہ آپ کو فرسٹ اپریل فول بنایا گیا ہے اور ——— میں ———"

عابد حسین نے درمیان میں بول کر انھیں بتایا اور ان پر غشی کا سا دورہ پڑ گیا۔

"اُف میرے مولا یہ میں کیا سن رہا ہوں ———"

کہتے کہتے وہ کرسی سے نیچے آ رہے۔ سب نے ٹھیک سے انھیں آرام کرسی پر لٹایا۔ اور پانی کے چھینٹے منہ پر مارے تقریباً پانچ منٹ بعد وہ ہوش میں آئے اور ساہنی کی صورت دیکھتے ہی اسے مارنے کو لپٹ گئے۔

"میں تمھیں مار ڈالوں گا — مار ڈالوں گا ———" کہتے کہتے ان کی

زبان لڑکھڑانے لگی اور ساہنی نے گلاس میں پانی ان کی طرف بڑھا دیا۔

"مرزاجی مذاق کی باتوں میں قتل وغیرہ کا پروگرام اچھا نہیں ہوتا ——— لیجیے پانی ———"

"دور ہو جاؤ میری نظروں سے ———" وہ دھاڑے لیکن ساہنی وہیں ڈٹا رہا۔

"آپ بھی خوب ہیں ———" وہ ہنس کر بولا "میں نے ہی پہلا انعام دلوایا اور مجھ ہی کو بھگا رہے ہیں۔ واہ صاحب یہ بھی ایک ہی رہی۔"

ابھی یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ تار والا مرزاجی کے نام تار لے کر آیا۔

"یہ تار ہے صاحب آپ کا ———"

"تار؟" مرزاجی کے ساتھ ساتھ ساہنی اور عابد حسین کے منہ سے بیساختہ نکلا۔

"کیسا تار؟"

"پہلے انعام کا" تار والے نے فارم ان کے آگے بڑھایا اور دستخط کرا کر لفافہ انھیں دے کر چلا گیا۔ اب جو مرزاجی نے تار پڑھا تو اس میں وہی پہلے تار کی عبارت جوں کی توں موجود تھی۔ چند منٹ قبل جس چہرے پر حزن و ملال چھا گیا تھا اس چہرے پر اب بے پایاں مسرت جھلک رہی تھی۔ اور ساہنی اور عابد حسین گویا چور بنے ایک طرف خاموش کھڑے تھے۔

"بھئی یہ بھی ایک ہی رہی۔" مرزاجی کے دوستوں میں سے ایک صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بنانے چلے تھے مرزاجی کو فرسٹ اپریل فول۔ اور بن گئے خود ہی اپریل فول ———"

یہ بات بتانے کی تو شاید ضرورت نہیں کہ وہ بنا ہوا صحیح حل اور تار ساہنی نے بھیجا تھا۔

محمد قاسم صدیقی

۷ کروڑ سال پرانی ایک عجیب و غریب مچھلی

۱۹۳۸ء میں جنوبی امریکہ کے ساحل پر کچھ مچھیروں نے ایک عجیب و غریب قسم کی مچھلی پکڑی۔ اس کی لمبائی ۵ فٹ تھی۔ جسم کی رنگت ہلکی نیلی تھی اور جلد پر کھُردرے قسم کے نشان ابھرے ہوئے تھے۔ اس کی دم ایک مثلث کی شکل کی تھی۔ اس عجیب و غریب قسم کی مچھلی کو دیکھ کر مچھیروں نے یہ طے کیا کہ اس کو نہ بیچا جائے۔ انھوں نے اس مچھلی کی حفاظت کی اور اسے سڑنے گلنے سے بچانے کی کوشش کی۔ انھیں کیا خبر تھی کہ یہ مچھلی دنیا میں ایک تہلکا مچا دے گی۔ اس عجیب و غریب مچھلی کا نام بھی آپ کو عجیب سا لگے گا۔ لے ٹی مارا چلو منیل (LATIMARA CHALOMNAL) اس عجیب و غریب مچھلی کو سائنسدانوں کے پاس پہنچایا گیا لیکن اس میں کافی وقت لگ گیا۔ اس وقت نے مچھلی کو خراب کر دیا اور اس کے اندرونی ملائم اعضا سب خراب ہو گئے۔ کچھ ہڈیاں بھی بیکار ہو گئیں۔

سائنس دانوں نے جب اس مچھلی کو دیکھا تو ان لوگوں کی حیرت کی انتہا نہیں رہی۔ یہ چھ یا سات کروڑ سال قبل ناپید ہو چکی تھی۔ یہ مچھلی اس قبیلہ سے تعلق رکھتی تھی جو اب سے ۶۔۷ کروڑ سال قبل ختم ہو چکا تھا۔ سائنس دانوں نے اس مچھلی کے بارے میں یہ بھی بتایا کہ آج سے ۴ ارب سال (چار سو ملین سال) پہلے یہ مچھلی دنیا میں پیدا ہوئی تھی۔ دنیا میں جتنے ریڑھ کی ہڈی والے جانور پائے جاتے ہیں سب اسی مچھلی کے خاندان سے ہیں۔

۱۹۳۸ کے بعد سے اس مچھلی کی تلاش زوروں سے شروع ہوئی ہزاروں روپیہ کے انعامات رکھے گیے اور اعلان کیا گیا کہ جو اس مچھلی کو پکڑے گا اور اچھی یا تازہ حالت میں دستیاب کر کے دے گا اس کو انعام ملے گا۔ چنانچہ اس تلاش میں کامیابی ہوئی۔ اور اس قسم کی ایک اور مچھلی ۱۹۵۳ میں دستیاب ہوئی تار کے ذریعہ پروفیسر جے۔ بی۔ ایل۔ اسمتھ J.B.L SMITH کو مطلع کیا گیا۔ اب پروفیسر اسپیشل جہاز کے ذریعہ اس جگہ پہنچ گیے جہاں یہ ملی تھی۔ پروفیسر نے سب سے پہلے اس کی حفاظت کا انتظام کیا اور اس کے اندرونی ملائم اعضاء کو سڑنے اور گلنے سے بچا لیا۔

یہ مچھلی آج کل ایک زندہ فاسل LIVING FOSSIL کے نام سے پکاری جاتی ہے۔ بعد کی دریافت سے معلوم ہوا کہ یہ مچھلی دنیا میں اس وقت غائب ہوئی تھی جب DIANASOUS ڈائناسس اس دنیا سے ختم ہوئے تھے۔

آج بھی اگر کوئی شخص اس مچھلی کو پکڑے تو اس کو ۱۰۰ سو پونڈ نقد انعام ملے گا۔ اعلان اس طرح ہے۔

"اگر کوئی شخص اس مچھلی کو پکڑے تو اس کے جسم کو نہ چیرے اور اندرونی اعضاء کو صاف نہ کرے بلکہ اس کو کسی قریب کے کولڈ اسٹورنے میں رکھ دے یا کسی ذمہ دار افسر کو اطلاع دے یا ایک تار کے ذریعہ PROF J.B.L SMITH پروفیسر اسمتھ کو مطلع کرے جو رہوڈس یونیورسٹی گراہم ٹاون میں پروفیسر ہیں۔ اس انعام کی گارنٹی جنوبی افریقہ کی سائنس کونسل کے شعبہ نے دی ہے۔"

شکاری بادشاہ

شعیب اعظمی

آپ نے تاریخ میں بہت سے بادشاہوں کے نام پڑھے ہوں گے۔ جو اپنے جنگی کارناموں کے لیے مشہور ہیں اور اُس کے ساتھ ساتھ ان میں سے کچھ بادشاہ اپنے محبوب مشغلوں کی وجہ سے تاریخ میں اپنا مقام پیدا کر گیے ہیں۔ جیسے بابر بادشاہ کو باغ لگوانے سے کافی دلچسپی تھی۔ شیر شاہ کو سڑکیں اور سرائیں بنوانے کا شوق تھا۔ جہانگیر کو پھولوں کے چمن اور پارک بنوانے میں لطف آتا تھا۔ ان بادشاہوں کی یہ یادگاریں آج بھی پائی جاتی ہیں۔ جیسے شاہ جہاں کا تاج محل اور جامع مسجد ہے۔ اسی بنا پر شاہ جہاں کو محلوں کا بادشاہ بھی کہا جاتا ہے۔

انھی قسم کے بادشاہوں میں ایک نام فیروز شاہ تغلق کا ہے۔ اس کا محبوب مشغلہ شکار تھا۔ آیئے ہم آج اس بادشاہ کے حالات پڑھ کر یہ اندازہ لگائیں کہ کیا ہم سچ مچ فیروز تغلق کو شکاری بادشاہ کا خطاب دے سکتے ہیں۔

فیروز تغلق کو شکار کا شوق بچپن سے تھا اور اس کی حکومت کے زمانے میں شکار کا مشغلہ بھی حکومت کے اور ضروری کاموں کی طرح ایک اہم جزبن گیا تھا۔ جب وہ اپنے چچا زاد بھائی محمد بن تغلق کے زمانہ میں نائب امیر حاجب تھا اس وقت بھی اس کو اپنے اس شوق کی بنا پر بڑے بھائی سے باتیں سُننا پڑتی تھیں۔

محمد بن تغلق کہا کرتا تھا کہ فیروز شاہ بہت سمجھ دار اور عقل مند ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس کو شکار کا شوق بہت زیادہ ہے۔ اور اس مشغلہ میں فضول وقت گنواتا ہے۔ محمد تغلق نے بار بار فیروز شاہ کو نصیحت کی تھی کہ پرندوں اور جانوروں کے شکار کو چھوڑ کر ملکی پرند کا شکار کرے یعنی دوسری سلطنتوں کو فتح کرے۔ لیکن فیروز شاہ کا یہ شوق کم نہ ہوا اور محمد تغلق کے بعد جب اس نے دہلی کے تخت پر قدم رکھا تو اس کا یہ شوق اور زیادہ ترقی کر گیا اور جس طرح اس نے بنگال، بہار، اُڑیسہ، گجرات اور سندھ ایسی جگہوں کو فتح کرنے کے لیے ایک مضبوط فوج تیار کی تھی اسی طرح شکار کا ایک الگ محکمہ بنایا تھا جس میں ہزاروں آدمی ملازم تھے اور کافی روپیہ خرچ کیا جاتا تھا۔

بادشاہ کے شکار خانے میں تمام قسم کے جانور رکھے جاتے تھے۔ چوپائے جانور الگ اور پرندے الگ، ہر جانور پر دو دو تین تین آدمی شاہی نگہبان مقرر ہوتے تھے۔ یہ شاہی جانور پانچ الگ الگ جگہوں میں جن کو پایہ گاہ کہتے تھے رکھے جاتے تھے۔

بادشاہ کا ایک شکرہ خانہ بھی تھا ۱۲۰۰ شکاری گھوڑے ان شکروں کے ساتھ ہوتے تھے۔ ان سب کی دیکھ بھال کے لیے بڑے بڑے امیر مقرر کیے جاتے تھے جن میں دو نام تو مشہور ہیں۔ ایک ملک ڈبلان تھا امیر شکار تھا اور دوسرا ملک خضر اس کا نایب تھا۔

بادشاہ جب شکار کے لیے نکلتا تھا تو بڑے امیروں کے علاوہ پینتالیس اور دوسرے افسر اپنی اپنی جگہ پر مقرر ہو کر اس کے ساتھ چلتے تھے اور پھر جانوروں کی دیکھ بھال کرنے والے

ملازموں کے علاوہ بادشاہ کے ٹھہرنے اور آرام کرنے کے لیے فراش خانہ اور خواب گاہ کا سامان بھی ساتھ ہوتا تھا۔

یہ شکاری عملہ بالکل فوج کی طرح روانہ ہوتا تھا۔ بادشاہ بیچ میں ہوتا تھا اور اس کے داہنے طرف درندے شکاری جانوروں کا غول ہوتا جس کو میمنہ کہتے تھے اور بائیں طرف پرندوں کا غول ہوتا تھا جس کو میسرہ کہتے تھے میمنہ میں خاص طور سے چیتوں کا غول ہوتا تھا اور میسرہ میں شکروں اور بازوں وغیرہ کا اور دونوں طرف ان کے نگہبان بادشاہی فوج کے ساتھ روانہ ہوتے تھے۔

فیروز شاہ نے شکاری جانوروں میں سب سے زیادہ چیتے جمع کیے تھے۔ ان کی گنتی کرنا بہت مشکل تھا۔ اسی طرح شکاری کتوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ شکاری پرندوں میں باز شکرے، بہری اور شاہین وغیرہ بھی اَن گنت تھے۔

بادشاہ کے شوق کی وجہ سے اور دوسرے افسران اپنا کام بڑی ذمہ داری سے انجام دیتے تھے۔ بادشاہ کو خوش کرنے کے لیے ہر ایک افسر اپنا کارنامہ دکھاتا۔

فیروز شاہ کے زمانہ میں دو تاریخ لکھنے والے ضیاالدین برنی اور شمس سراج عفیف لکھتے ہیں کہ بادشاہ جب شکار کے لیے سفر کرتا اور شکار کی جگہ شکار میں مشغول ہوتا تو بہت زیادہ خوش اور بشاش رہتا اور جو شخص اس وقت اپنی خواہش اور آرزو بادشاہ کے سامنے عرض کرتا بادشاہ فوراً اس ضرورت کو پوری کرنے کا حکم دیتا۔

جب بادشاہی قافلہ جنگل اور شکار کی جگہ پہنچ جاتا تو اس کے ساتھی بہت سے گروہوں میں بٹ جاتے اور شکار گاہ کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیتے۔ اس طریقہ کو صف بندی کہتے تھے۔ فیروز تغلق کی صف بندی سات سات آٹھ آٹھ دن تک چلتی رہتی تھی اور اس کا دائرہ سینکڑوں کوس تک کا ہوتا تھا۔

برنی اور عفیف نے ان جانوروں کے نام خاص طور پر لکھے ہیں جن کے شکار میں بڑی دوڑ دھوپ کرنا پڑتی ہے اور فیروز تغلق خاص طور سے دلچسپی لیتا تھا۔ ان میں گورخر، ہاتھی، بھیڑیا، ہرن، نیل گائے، شیر اور چیتے کا ذکر بہت دلچسپ ہے۔

گورخر گھوڑے کی قسم کا ایک جانور ہے جس کے جسم پر سفید دھاریاں ہوتی ہیں۔ اس کی عادت ہے کہ ایسی جگہ رہتا ہے جہاں اسّی اسّی کوس تک پانی نہیں پایا جاتا۔ اس کو جب پیاس لگتی ہے تو یہ اسّی کوس کا سفر کر کے پانی پیتا ہے اور پھر اپنی جگہ واپس آجاتا ہے۔

ہندوستان میں گورخر دیپالپور میں اور سرستی کے مقام پر پایا جاتا ہے۔ اس کا شکار گرمیوں میں ہوتا ہے۔ فیروز تغلق گورخر کے شکار کے لیے بہت تیاری کرتا اور حکم دیتا کہ تیز اور تازہ دم گھوڑے لائے جائیں۔ بادشاہی امیروں کو حکم دیا جاتا کہ وہ اپنے لیے تین دن رات کے لیے کھانے اور پینے کا سامان باندھ لیں اور یہ تمام سامان اونٹوں اور گھوڑوں کی پیٹھ پر باندھ کر روانہ کیا جاتا۔

عفیف کا بیان ہے کہ ایک بار تغلق سرستی میں گورخر کا شکار کھیلنے روانہ ہوا۔ وہ سفر کے وقت اپنے خیمہ میں روانہ ہوا اور رات بھر سفر کر کے صبح کو گورخر کے جنگل کے قریب پہنچا اور تقریباً پندرہ کوس کے گھیرے میں صف بندی کی اور آہستہ آہستہ چار کوس کے دائرے میں بہت سارے گورخر گھیر لیے گئے۔
بادشاہ نے رات بھر قیام کیا اور صبح دم گورخر کا شکار شروع ہوگیا۔ اور اس طرح تقریباً ستر کوس کا سفر کر کے شکار میں کامیاب ہوا۔

فیروز تغلق کو ہاتھیوں کے جمع کرنے کا بہت شوق تھا اور ان کا شکار بڑے اہتمام سے کرتا تھا۔ ایک بار جب وہ جاج نگر کے راجہ پر حملہ آور ہوا تو معلوم ہوا کہ وہاں کے جنگل میں سات خونخوار

ہاتھی اور ایک ہتھنی ہے۔ بادشاہ نے جنگ کا ارادہ چھوڑ کے ہاتھیوں کے شکار پر کمر باندھی اور جنگل کے چاروں طرف دس گز چوڑا اور سات گز اونچا ایک باندھ بندھوایا اور بیچ میں صرف دو راستے خالی رکھے جن کے سامنے بڑے بڑے کٹہرے بنوا دیے۔

تیاری ہو چکی تو بادشاہ کے چند بڑے ہاتھی اُن کے پیلبانوں کے ساتھ لاکر کٹہروں کے پاس کھڑے ہو گیے اور جنگل کے ایک طرف سے ڈھول اور باجا بجانے والوں کا گروہ شور کرتا ہوا داخل ہوا۔ جنگل کے تمام ہاتھیوں نے بھاگنا شروع کیا اور ان کے بھاگنے سے جنگل کے بڑے بڑے درخت ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے تھے۔

جب وہ کسی کنارے پر پہنچتے تو ڈھول اور باجے کا شور ان کو وہاں سے بھاگنے پر مجبور کرتا۔ اس طرح سارے ہاتھی گیدڑوں کی طرح جنگل میں بھاگتے بھاگتے تھک گیے۔ اس قدر تھک گیے کہ اپنے لیے چارہ تلاش کرنے کی سکت نہ رہی۔

اب شاہی پیلبان اپنے ہاتھیوں کے ساتھ جنگل میں داخل ہوئے اور درختوں پر بیٹھ گیے۔ جب یہ مست ہاتھی ان درختوں کے پاس سے آہستہ آہستہ گذرتے تو یہ لوگ درخت سے کود کر ان کی پیٹھ پر سوار ہو جاتے اور رسیوں اور زنجیروں سے انھیں جکڑ لیتے اس طرح فیروز تغلق نے آٹھوں ہاتھیوں کو زندہ پکڑوا لیا اور جب دہلی واپس ہوا تو یہ آٹھوں ہاتھی جن کو بڑے اچھے رنگوں سے رنگ کر سجایا گیا تھا۔ شہر میں سب سے پہلے داخل ہوئے۔

ہرن، نیل گائے کا شکار صف بندی سے زیادہ کامیاب ہوتا تھا۔ کبھی کبھی یہ صف بندی کئی دن میں ہوتی تھی اور جب گھیرا مکمل ہو جاتا تو سب سے پہلے بادشاہ اپنا تیر یا نیزہ پھینکتا اگر کوئی بڑا جانور شیر، جنگلی بھینسا قسم کی کوئی چیز آجاتی تو پہلے بادشاہ اس پر حملہ کرتا۔

بھاگنے والے جانوروں پر شکاری کتّے دوڑائے جاتے اور بڑے بڑے شکرے اور بہریاں تیزی سے اڑ کر ان کی آنکھوں میں اپنے پنجے ڈال دیتیں بھاگنے والا جانور اندھا ہو کر بے بس ہو جاتا تو گرفتار کر لیا جاتا۔ چیتے بھی بھاگنے والے جانوروں کو ایک ہی جست میں پکڑ لیتے شیروں کو جنگلی بھینسوں کی پیٹھ پر بیٹھ کر نیزے سے ہلاک کیا جاتا۔ بعض اوقات ہرنوں کو جال میں پھنسایا جاتا۔ پرندوں کو باز، ترّی اور شاہین اڑا کر پکڑ لیا جاتا تھا۔ اس طرح مچھلیوں کا شکار بھی جال سے کیا جاتا۔

فیروز تغلق کا یہ شوق اتنا بڑھ گیا تھا کہ جنگ کرتے کرتے جانوروں کے شکار میں لگ جاتا۔ ایک بار جب وہ سندھ میں جنگ کر رہا تھا وہاں کا راجہ سے ملنے کے لیے آیا۔ مگر بادشاہ نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی وہ اس وقت بھیڑیے کے شکار میں مصروف تھا۔

فیروز شاہی کہ اس شوق کی وجہ سے دہلی کے آس پاس کے تمام جنگل جانوروں سے خالی ہو گیے تھے۔ صرف بدایوں کا ایک جنگل شکاری جانوروں کے لیے باقی رہ گیا تھا۔

بادشاہ کے شوق کا عالم یہ تھا کہ چند جانور دربار میں بادشاہ کے سامنے باندھے جاتے۔ کچھ داہنے طرف اور کچھ بائیں طرف۔ اس میں شبہ نہیں کہ بادشاہ نے اپنے زمانے میں شکار کی حد کر دی۔ کبھی کبھی اتنا شکاری گوشت اکٹھا ہو جاتا کہ سڑ کر خراب ہو جاتا تھا۔

لیکن کچھ دنوں کے بعد فیروز تغلق نے یہ انتظام کیا کہ لوہے کی دو بڑی بڑی دیگیں تیار کرائیں ان میں سے ہر ایک میں سو جانوروں کا گوشت پک سکتا تھا۔ ان دیگوں کے لیے دس پائے کے دو چولھے بھی بنوائے تھے۔ ان برتنوں کو ایک سو بیس کہار بادشاہ کے ساتھ سفر میں لے جاتے تھے۔ جب شکار مارا جاتا تو ان دیگوں میں پکتا اور بادشاہ کے ساتھ رہنے والوں کے علاوہ وہاں

کے لوگوں میں تقسیم بھی کیا جاتا۔

عفیف کہتا ہے کہ فیروز تغلق کو شکار کا جیسا کچھ شوق تھا اس کے پہلے کے بادشاہوں کے ہاں اس کی مثال نہیں ملتی۔ ایران کے ایک بادشاہ اسمٰعیل صفوی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ایک بار کے شکار میں اس نے ۶۲ ہزار جانور شکار کیے تھے مگر جو شوق اور انتظام اور جوش ہم فیروز تغلق میں پاتے ہیں وہ ہمیں کم سے کم ایشیا کے کسی بادشاہ میں نہیں ملتا ہے۔ اس لیے اگر ہم اسے شکاری بادشاہ کا خطاب دیں تو شاید غلط نہ ہو۔

ٹیگور

ٹیگور ہمارے دیس بلکہ ساری دنیا کے بڑے آدمی مانے جاتے ہیں۔ ان کی بے شمار سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں، بہت اچھی اچھی۔ مگر یہ کتاب بچوں کے لیے ہے۔ مصنف نے ان کی زندگی کے حالات کا منظر کھینچ دیا ہے۔ اس مختصر سی کتاب کو پڑھ کر آپ کو اندازہ ہوگا کہ ٹیگور یوں ہی ٹیگور نہیں بن گیے۔ انھوں نے پڑھنے لکھنے میں بچپن سے خوب محنت کی ہے۔ جی لگا کر پڑھا ہے۔ اور دھیرے دھیرے ان کی شاعری ان کی نثر ساری دنیا کے لیے ایک پیغام بن گئی ہے۔

صفدر حسن صاحب نے بڑی محنت بڑے سلیقے سے بچوں کے لیے لکھی۔ انداز بیان سادہ، سہل اور بہت ہی دلچسپ ہے۔ — قیمت ۱/۲۵

مکتبہ جامعہ۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

جناب عبدالمنان نسیم شولاپوری

سردی کی رات

توبہ یہ سردی کی راتیں — کانپ رہی ہیں پیٹ میں آنتیں

بجتی جاتی ہے بتیسی — ایسی تیسی اس سردی کی

سی سی سی کرتے جائیں — سب کے جسم ٹھٹھرتے جائیں

کھڑکی بند دروازہ بند ہے — منہ روشندانوں کا بند ہے

پھر بھی جانے کس رستے سے — سردی آئی اندر گھس کے

چھت بھی ٹھنڈی کپڑے ٹھنڈے — بستر ٹھنڈے، صوفے ٹھنڈے

ہر کوئی کونے میں دب کر — کانپ رہا ہے تھر تھر تھر تھر

ناک ستانے شوں شوں کر کے — کتے روئیں کوں کوں کر کے

نیند اڑی، آرام نہ آئے — موٹی کمبل کام نہ آئے

مُنّا، منّی اوندھے سوئے — پیٹ میں اپنے لے کر گھٹنے

سوتی ہیں بستر کے اوپر — نانی اماں گٹھڑی بن کر

گرم انگیٹھی چائے کی پیالی — وہ ٹھنڈی ہے یہ ہے خالی

ہا ہا، ہو ہو کرنے والو

جوں توں کر کے رات گذارو

آہا ہا ہا! بلّی رانی — چوہوں کی موسی، مرغوں کی نانی
کالی، پیلی، چتلی، بھوری — تن کی اجلی من کی میلی
اپنے فن میں یکتا ہے بلّی — چوہوں سے پوچھو کیا ہے بلّی
جس چوہے پر داؤ لگائے — وار نہ اس کا خالی جائے
اور کہیں جو موقع پائے — مرغی کی مرغی چٹ کر جائے
چپکے چپکے گھر میں آئے — آنکھوں میں سب کی دھول دے جائے
دودھ دہی جو رکھا پائے — پی نہ سکے تو اوندھا جائے
صورت کتنی بھولی بھولی — خصلت جیسے شیر کی بچّی
ایک مثل مشہور ہے یہ بھی — شغل ہے بچّوں کا تفریحی
ابّو، ابّو، دلّی جاؤ — دلّی سے اک بلّی لاؤ!

راج محل ہے اس کا دلّی
آبادی کی شیر ہے بلّی

جناب مصطفےٰ رشید

لکھوں تو کیا لکھوں

سنئے صاحب میں اسکول میں پڑھتا ہوں۔ تاریخ جغرافیہ سب کچھ پڑھا ہے۔ کبھی کبھی چوری چھپے ناول اور قصے بھی پڑھتا ہوں۔ مگر مجھے مضمون لکھنا نہیں آتا۔

ایک دفعہ میں نے سوچا جب میں نقشہ جانتا ہوں تاریخ جانتا ہوں تو مضمون کیوں نہیں لکھ سکتا اور قلم لے کر بیٹھ گیا مگر سمجھ میں ذرا نہ آیا کہ لکھوں تو کیا لکھوں۔ کبھی قلم دانتوں سے پکڑتا کبھی کاغذ پر کہنیاں ٹیک کر بیٹھ جاتا، کبھی ٹہلنے لگتا۔ مگر سمجھ میں پھر بھی نہ آتا تھا کہ لکھوں تو کیا لکھوں، پھر میں آنکھیں بند کرکے بیٹھ گیا اور دیر تک بیٹھا رہا، لیجیے صاحب۔ میری ساری ہشیاری ختم ہوگئی۔ مضمون کا کوسوں تک پتہ نہ تھا، پھر کاغذ پر الٹی سیدھی لکیریں کھینچنے لگا۔ جیسے دو ٹانگیں ہوتی ہیں پھر ایک چہرہ بنایا سر پر سینگ، لمبا منھ، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، بڑی سی ناک، توند نکلی ہوئی، سر پر پھندے دار ٹوپی کمر میں گھنگرو، اس کے نیچے لکھا۔

"شیطان" لاحول ولا قوۃ یہ کیا؟

کہاں اچھا سا مضمون کہاں یہ بھونڈی تصویر، پھر سوچا شیطان ہی نے میرے دل میں گھمنڈ پیدا کیا تھا کہ میں بڑا ہشیار ہوں۔

مجھے یاد ہے ایک دفعہ ماسٹر صاحب نے ایک شعر کا مطلب لڑکوں سے پوچھا تھا تو میں سب سے اول نمبر پر آیا تھا۔ وہ شعر تھا۔

اکبر ہمیں شک نہیں تری تیزی میں
اور تیرے بیان کی دل آویزی میں
شیطان عربی سے ہے ہند میں بے خوف
لاحول کا ترجمہ کرا انگریزی میں

میں نے اس کے معنے بتائے تھے کہ ماسٹر صاحب جب کوئی لاحول پڑھتا ہے تو شیطان پر بڑے زور سے آگ کا ایک کوڑا لگتا ہے اور وہ بلبلا کر بھاگ جاتا ہے مگر ہندوستان کے لوگ عربی کم جانتے ہیں اور لاحول کا مطلب بھی کم سمجھتے ہیں۔ انھیں تو اپنے دیس کے مقابلہ میں انگریزی بولی اچھی لگتی ہے اور یہ سب جانتے ہیں کہ شیطانی دھندے اسکولوں میں زیادہ ہوتے ہیں۔ اس لئے اگر انگریزی پڑھنے والوں کے لئے لاحول کا ترجمہ انگریزی میں ہو جائے تو شیطان کی ہمت ٹوٹ جائے گی اور جب بھی شیطان کسی کو بہکائے گا جھٹ سے انگریزی لاحول پڑھ دیا کریں گے اور شیطان پر ایسا کوڑا لگے گا کہ پیچھے پھر کر نہ دیکھے گا اور اسکول سے دم دبا کر بھاگ جائے گا۔

اسی طرح ہیڈ مولوی صاحب نے ایک دن میرا امتحان لیا تھا، فرمانے لگے۔ میاں لڑکے ہمارا خدا ہر دم ہمارے ساتھ ہے۔ میں نے کہا کہ میرا شیطان بھی میرے ساتھ ہے۔ اور ہر وقت ساتھ رہتا ہے۔

مولوی صاحب نے کہا، لاحول ولا قوۃ۔

میں نے کہا سنیے!! اسکول آتا ہوں تو سوچتا ہوں آج کیا بہانہ کروں اور فوراً ایک نیا بہانہ میری سمجھ میں آجاتا ہے۔ اگر شیطان میرے ساتھ نہ ہوتا تو بہانہ کیسے سمجھ میں آتا۔

پھر دیکھیے کسی کی خوب صورت پنسل، قلم اور چاقو دیکھتا ہوں تو جی میں آتا ہے کہ چپکے سے چھپا لوں، شیطان میرے ساتھ نہ ہوتا تو چوری کا خیال جی میں کیوں آتا۔

شیطان میرا پیچھا گھر پر بھی نہیں چھوڑتا اور میں کبھی ابا کی جیب میں سے پیسے نکال لیتا ہوں چھوٹی بی بی کا دودھ پی جاتا ہوں اور پانی سے منھ صاف کر کے یوں بیٹھ جاتا ہوں جیسے کسی بات کی مجھے خبر نہیں ہے۔ نعمت خانہ کا کواڑ کھول دیتا ہوں تاکہ اماں دیکھ کر سمجھ لیں کہ بلی نے پیا ہوگا۔ اب آپ ہی بتائیے کہ یہ کام میرا تھا یا شیطان کا۔ اور شیطان ہر وقت میرے ساتھ رہتا ہے یا نہیں۔

تو بھائیو! اس دن سے میں سمجھنے لگا تھا کہ میں بڑا ہشیار ہوں مگر اس وقت میری ساری شیخی کرکری ہوگئی ہے اور سیٹی پٹاخ بھول گیا ہوں، کبھی چڑیا بناتا ہوں اور چونچ کے نیچے باریک نقطے پھیلا دیتا ہوں کہ دانہ ہے۔ کبھی ٹانگیں اور پنجے بناتا ہوں مگر مضمون ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا۔ کم بخت شیطان نے قلم پکڑ لیا ہے۔

میں نے سوچا ذرا سو رہوں جاگ کر لکھوں گا۔ مگر نیند نہ آئی۔ تو کیا کسی کتاب میں سے نقل کر لوں۔ مگر یہ بھی نہ ہو سکا۔

اب آپ ہی بتائیے کہ میں اتنا لمبا چوڑا لڑکا مضمون نہیں لکھ سکتا تو کتنے شرم کی بات ہے پھر کان کھجانے لگا اور ناک ملنے لگا۔ بس اب ہار کر یہی دعا مانگتا ہوں کہ اگر شیطان کو پکڑ سکوں تو آتنی لاحول پڑھوں کہ بچہ کو چھٹی کا دودھ یاد آجائے۔ کم بخت، پاجی کہیں کا بات تیرے کی۔

بچھو صفحہ ۱۸ کا بقایا۔

میں نے کہا۔ بھائی جان کالا بچھو لے آئے تھے۔

"کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ اور اسی لحاظ سے ان کی لمبائی بھی مختلف ہوتی ہے۔ افریقہ اور جنوبی امریکہ میں تو دس انچ کے بچھو بھی دیکھے گیے ہیں"۔

"ایک فٹ لانبے"! مجھے بڑی حیرت ہوئی۔

"ہاں قریب قریب" بھائی جان نے کہا "بچھو کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ دنیا کے قدیم ترین جانداروں میں سے ہے۔ اور پھر کمال تو یہ ہے کہ ان لاکھوں کروڑں سالوں میں اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی"۔

"آپ کو کیا خبر۔ ؟" مجھے یقین نہیں آیا۔

"خیر اس طرح ہوئی کہ امریکہ اور دوسری جگہوں پر جو بچھو کے پتھرائے ہوئے جسم ملے ہیں ان میں اور آج کے بچھو میں کوئی فرق نہیں ہے"۔

"یہ پتھرائے ہوئے جسم کیا کہلاتے ہیں ——؟" نغمی نے پوچھا۔

"انھیں فاسل Fossil کہتے ہیں اور یہ صرف بچھو کے ہی نہیں دوسرے اور بھی کئی جانداروں، پیڑوں، پتوں اور پھولوں کے بھی پائے گیے ہیں" بھائی جان نے سمجھایا پھر بولے "بس اب بھاگ جاؤ"۔

جواب طلب امور کے لیے جوابی کارڈ یا ٹکٹ ضرور روانہ کیجیے۔

منیجر۔

اقبال مند

مسیح الزماں صدیقی

"میاں، بابو، اوبچہ، کدھر؟ اسٹیشن گیٹ پر ماسٹر نے مجھے روک لیا۔ کہاں سے آرہے ہو؟ ٹکٹ نکالو!"

ٹکٹ کا نام سن کر میں چکرا گیا۔ لیکن سنبھل کر بولا۔

"بھائی، کہیں سے نہیں آرہا ہوں۔ میں تو یہیں کا رہنے والا ہوں!"

"اچھا خیر۔ پہلے ٹکٹ نکالو بعد میں بہانے تراشنا۔"

"بہانے؟" میں گھبرا کر بولا

"بھائی۔ بہانے کی کیا بات ہے۔ میں یہیں کا رہنے والا ہوں۔"

"پھر تم اسٹیشن کے اندر کیسے آگئے اور یہ بے تحاشہ بھاگے کیوں جارہے ہو؟" ماسٹر نے ڈانٹ کر پوچھا۔

"دراصل — میں وطن جارہا تھا۔ مگر بات کچھ ایسی ہوگئی ہے کہ اب بجائے وطن جانے کے واپس ہو رہا ہوں۔"

"وطن؟ اس نے تعجب سے پوچھا۔ کونسا وطن تم تو کہہ رہے تھے کہ یہیں کے رہنے والے ہو؟ تم جھوٹے ہو۔ بلا ٹکٹ آرہے تھے۔ اور اب بہانے بناتے ہو۔ سچ سچ بتاؤ۔ ورنہ پولیس کے حوالہ کرتا ہوں۔"

پولس کا نام سن کر میرے ہاتھ پیر سرد ہوگئے۔ میں نے کہا

"جناب! میں اسی شہر کے دارالعلوم میں پڑھتا ہوں۔ میری تعلیم مکمل ہوچکی ہے اور اب میں اپنے وطن حیدرآباد جارہا تھا۔ آپ خواہ مخواہ شبہ میں پڑ رہے ہیں۔"

پھر میں نے اپنے بیگ سے اسکول کے کاغذات اور اسناد وغیرہ نکال کر بتلائے، تب کہیں جاکر وہ سرد پڑا اور جانے کی اجازت دیدی۔

لیکن میں ابھی آگے بڑھا ہی تھا کہ اسٹیشن ماسٹر نے جلدی سے میرا ہاتھ پکڑلیا اور بولا "لڑکے! تم ہم کو دھوکہ دیکر چھوٹ جانا چاہتے ہو؟"

"دھوکا؟ — دھوکا کیسا؟" میں نے حیرت سے کہا

"تم یہیں کے رہنے والے ہو؟"

"جی ہاں!"

"تم اپنے وطن حیدرآباد جارہے تھے؟"

"جی ہاں!"

"پھر تم نے حیدرآباد کا ٹکٹ کیوں نہیں لیا؟"

"لیا تھا۔ میں نے ٹکٹ لیا تھا!"

"بکتے ہو! لاؤ بتاؤ کہاں ہے وہ ٹکٹ؟"

"وہ — وہ میں نے . . . . " اچانک آواز آئی

"لوگوں کو جتا جتا کر اپنی نیکی برباد مت کرو۔"

اور میں آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

"چپ رہو!" ماسٹر نے گرج کر کہا اور مجھے دونوں ہاتھوں سے مضبوط پکڑ لیا۔ اور بولا۔

"تم بلا ٹکٹ سفر کرنا چاہتے تھے۔ تم نے پلیٹ فارم ٹکٹ بھی نہیں لیا۔ تم نے جرم کیا ہے تم مجرم ہو" پھر زور سے آواز دی۔

"نرسنگ! ۔ ادھر آؤ۔"

ایک موٹا تگڑا آدمی دوڑا آیا۔ "فرمائیے" اس نے آتے ہی پوچھا

ے کہانی کا پہلا حصہ دسمبر میں چھپ چکا ہے۔

"اس لڑکے کو پولس کے حوالے کرو۔ اس نے پلیٹ فارم بھی نہیں لیا۔ اور حیدرآباد تک بلاٹکٹ سفر کرنا چاہتا تھا۔"

"جی! بہت بہتر۔" اور وہ مجھے گھسیٹتا ہوا تھانے کی طرف لے چلا۔

(۸)

تھوڑی دیر بعد ہم دونوں ریلوے پولس اسٹیشن پر تھے۔

وہ مجھے اندر لے گیا۔

میز پر مسٹر امین صاحب بیٹھے تھے۔

امین صاحب نے مجھے سر سے پیر تک دیکھا اور نرسنگ سے بولے کیا بات ہے؟

سرکار — "یہ بلاٹکٹ سفر کرنا چاہتا تھا۔ اس نے پلیٹ فارم بھی نہیں لیا۔ اور گیٹ کے اندر بلاٹکٹ پکڑا گیا ہے۔"

پھر امین صاحب نے میری طرف دیکھا اور بولے

"کیا تم بلاٹکٹ سفر کرنا چاہتے تھے؟"

"جی نہیں!" — میں نے مختصر سا جواب دیا۔

"پھر تم نے ٹکٹ کیوں نہیں لیا؟"

جی میں آیا سب کچھ کہہ دوں ٹکٹ لینے اور ضرورت مند کو دینے کی پوری تفصیل بتا دوں۔ مگر ایک انجانی قوت نے مجھے ایسا کرنے سے روک دیا۔ اور میں نے صرف اتنا کہا۔

"لیا تھا!"

"پھر کہاں ہے وہ ٹکٹ؟"

"جی — وہ —" اور میں خاموش ہو گیا۔

"امین صاحب! یہ لڑکا بڑا چالاک معلوم ہوتا ہے۔ یہ ایسے نہیں بتائے گا" نرسنگ نے مجھے گھورتے ہوئے امین صاحب سے کہا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔ تم جاؤ ہم اس سے نپٹتے ہیں۔"

نرسنگ چلا گیا تو امین صاحب نے میرا نام پوچھا۔ "لڑکے! تمھارا نام کیا ہے؟"

"اقبال مند"

"اقبال مند!" امین صاحب نے تعجب سے پوچھا۔ اور ان کے چہرے پر حیرت کے آثار پیدا ہوئے۔ مگر جلد ہی انھوں نے اپنی حالت پر قابو پالیا اور پکارا۔

"نرپش اسے لے جاؤ۔"

نرپش ایک پولس والے کا نام تھا۔

لے جاؤ کا نام سن کر میرے بدن میں جھرجھری سی آگئی گرگڑتا بھی کیا؟ چپ کھڑا رہا۔

نرپش نے میرا ہاتھ پکڑا اور چلنے کا حکم دیا۔

میں نے اپنا بیگ ساتھ لینا چاہا مگر امین صاحب نے اس کی اجازت نہیں دی اور بولے۔

"کل جب عدالت میں تمھارا فیصلہ ہو جائے گا۔ اور تم چھوٹ جاؤ گے تو تمھارا بیگ لوٹا دیا جائے گا۔ اب تم جا سکتے ہو۔"

"لیکن کہاں؟" میں نے پوچھا!

"نرپش کے ساتھ حوالات میں!"

اُف فوہ! — میں کانپ گیا۔

(۹)

یہ ایک کوٹھری تھی۔ اور بھی کئی لوگ بند تھے۔ وہ سب لوگ مجھے گھور گھور کر دیکھنے لگے۔ گویا میں آدمی نہیں کوئی اور ہی مخلوق ہوں۔ ایک شخص نے مجھے دیکھتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہا۔

"لڑکا تو شریف معلوم ہوتا ہے!"

"ہاں ہاں، میں بھی وہی دیکھ رہا ہوں۔" دوسرے نے جواب دیا۔

پھر اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا۔

میں انجان بن کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ مگر اس نے پھر پکارا۔

"بابو۔ ادھر آؤ۔"

مجبوراً مجھے پاس جانا پڑا۔ "وہ بولا بیٹھو"

اور میں بیٹھ گیا تو اس نے پوچھا۔
"تمھیں یہاں کیوں لایا گیا؟"
میں چپ رہا۔ تو دوسرے نے کہا۔
"کچھ چرایا تھا؟"
"جی نہیں!"
"پھر کیا بلا ٹکٹ آئے تھے؟"
"نہیں!"
"پھر آخر تمھیں کیوں لایا گیا ہے؟"
جواب میں مجھے رونا آگیا۔ میرے آنسو دیکھ کر وہ بولا
"یہاں تمھارا کوئی نہیں؟"
"جی نہیں!"
"تم کہاں کے رہنے والے ہو؟"
"حیدرآباد کا — یہاں کے دارالعلوم میں پڑھتا تھا۔ اور اب پڑھ لکھ کر حیدرآباد ہی جا رہا تھا۔ مگر بدقسمتی سے یہاں آگیا" میں نے تفصیل بتادی۔
"مگر کیوں آئے؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔
"بس یہ نہ پوچھئے!"
وہ بیزار آگیا۔ دوسرا بولا "جانے بھی دو کمبخت اسکول میں پڑھنے والے ایسے ہی ہوتے ہیں کبھی دنگا فساد تو کبھی مار پیٹ، اس نے بھی کسی سے لڑائی جھگڑا کیا ہوگا۔ پکڑا گیا۔"
مجھے ان لوگوں کی باتیں سن کر رونا آگیا۔
پہلے نے پوچھا۔
"کیا تمھیں زبردستی پکڑا گیا؟"
"ہاں کچھ ایسا ہی سمجھئے" میں بولا
غرض اس قسم کے سوالات و جوابات میں سارا دن گذر گیا
رات آئی وہ بھی گذر گئی خدا خدا کر کے
دوسرا دن آیا۔ دس بجے اور دروازہ کھلا، نریش اور دوسرے کئی سپاہی اندر آئے اور ہمیں ریلوے کورٹ چلنے کا حکم دیا۔

یہ ایک بڑا سا ہال تھا۔ اس ہال کے سرے پر اونچی جگہ تھی اور اس اونچی جگہ پر ایک میز کرسی رکھی تھی، یہ مجسٹریٹ کے لیے تھی۔ ہم سب لوگوں کو ایک کنارے بٹھا دیا گیا۔ یہاں پولیس اسٹیشن کے صدر امین صاحب بھی موجود تھے تھوڑی دیر بعد مجسٹریٹ صاحب بھی آگئے اور عدالت جمی۔ ایک کے بعد ایک کا نام پکارا جانے لگا۔ اور ان کے فیصلے ہوتے رہے یہاں صرف ایک ہی فیصلہ تھا۔
جرمانہ — یا جیل!
پانچ روپیہ سے لیکر ایک سو روپیہ تک کا جرمانہ اور دس دن سے لے کر سال بھر تک کی قید! مجرم یا تو فوراً رقم دے کر چھوٹ جائے یا پھر جیل میں سڑے۔
میرا نام بھی پکارا گیا۔
مجھ سے پوچھا گیا۔
"کیا تم بلا ٹکٹ سفر کرنا چاہتے تھے؟"
"نہیں — میں نے ٹکٹ لیا تھا!"
"پھر کہاں ہے وہ ٹکٹ؟"
"وہ — میں نے" — اور میں خاموش ہوگیا۔
"ہاں ہاں بولو" مجسٹریٹ نے کہا۔
"یہ میں نہیں بتاؤں گا۔"
"تم عدالت کے ساتھ مذاق کرنا چاہتے ہو، تم نے ٹکٹ بھی نہیں لیا اور پلیٹ فارم بھی، لہٰذا تمھیں پانچ روپیہ نقد کا جرمانہ کیا جاتا ہے۔ عدم ادائیگی کی صورت میں دس دن قید کی سزا۔ دوسرے سپاہی نے مجھے الگ لے جا کر پوچھا۔ کیا تم جرمانہ ادا کر رہے ہو؟"
"لیکن میرے پاس تو صرف سوا روپیہ ہے" میں نے کہا
"اچھا تو پھر جیل کی ہوا کھاؤ" — اور اس نے مجھے جیل کے افسر کے حوالے کر دیا

باقی صفحہ ۴۴ پر

جناب فاخر اعظمی

نہ گھبرا کے طوفاں سے ڈھونڈھو کنارا
سفینہ بڑھاؤ، امنڈنے دو دھارا
کہ جیتا وہی یاں جو ہمت نہ ہارا
یہی ساتھیو وقت کا ہے اشارا
یہی ساتھیو وقت کا ہے اشارا

مشقت کرو عیش و راحت کو چھوڑو
محبت کو اپناؤ نفرت کو چھوڑو
یہ عادت بری ہے اس عادت کو چھوڑو
نہیں اس کے ساتھ آدمی کا گذارا
یہی ساتھیو وقت کا ہے اشارا

نہیں جس نے اپنی حقیقت کو جانا
لگاتا ہے ٹھوکر اُسے کل زمانا
نہیں اس کو ملتا کہیں پھر ٹھکانا
نہیں کوئی دیتا پھر اس کو سہارا
یہی ساتھیو وقت کا ہے اشارا

ستم بھول جاؤ، الم بھول جاؤ
ترقی کی جانب قدم پھر بڑھاؤ
ہو انساں تو انسان کے کام آؤ
یہی مقصدِ زندگی ہے تمہارا
یہی ساتھیو وقت کا ہے اشارا

جناب تصدیق سہاروی

نکولائی گوگول

یہ ایک روسی مصنف کی زندگی کا خاکہ ہے۔

نکولائی واسلوچ گوگول یوکرین کے ایک زمیندار کا دبلا پتلا لڑکا، اس کا خاندان قزاقستان سے منتقل ہو کر یوکرین میں آباد ہو گیا تھا، گوگول یکم اپریل ۱۸۰۹ء میں پیدا ہوا تھا۔ سولہ سال کا ہوا تو باپ چل بسا، انیس سال کی عمر میں سینٹ پیٹرز برگ (موجودہ لینن گراڈ) پہنچا، جہاں شاہی دفتر میں کلرک بن گیا۔

اس زمانہ میں روس پر بادشاہ کی حکومت تھی۔ جسے زار کہتے تھے۔ سینٹ پیٹرز برگ میں گوگول کو اپنے وطن یوکرین کی یاد ستائی اس سے متاثر ہو کر گوگول نے مختصر کہانیاں لکھیں۔ کہانیوں کی اس کتاب کا نام "دیکانکا کی ایک شام" رکھا۔ یہ کتاب ۱۹۳۱ء میں شائع ہوئی اس دور کے نقادوں نے ان کہانیوں کی بہت تعریف کی۔

گوگول کی قابلیت دیکھ کر سینٹ پیٹرز برگ کی یونیورسٹی کے حکام نے اسے شعبۂ تاریخ میں لیکچرر مقرر کر دیا لیکن گوگول شرمیلا اور خاموش طبیعت کا نوجوان تھا اس نے کلاس روم میں لیکچر دینے کے بجائے ایک مضمون پڑھ کر سنایا۔ یہ مضمون اتنا دلچسپ تھا کہ کسی طالب علم نے کوئی سوال نہیں کیا حالانکہ مضمون میں تاریخی واقعات کے بجائے چند تاریخی کہانیاں دلچسپ انداز میں بیان کر دی گئی تھیں۔

دوسرے دن گوگول نے اپنے منھ پر پٹیاں لپیٹ لیں اور دانت کے درد کا بہانہ بنایا۔ کچھ دن کے بعد اس نے ملازمت سے استعفاء دیدیا۔

۱۸۳۵ء میں گوگول نے کہانیوں کا دوسرا مجموعہ شائع کیا۔ اس مجموعہ کا نام "مرگورڈ" تھا۔ کتاب میں کہانیوں کے علاوہ ایک مختصر ناول بھی شامل تھا، ناول میں قزاقستان کے باشندوں کی زندگی پیش کی گئی تھی۔

"مرگورڈ" کے بعد گوگول نے اپنا مشہور ڈرامہ "انسپکٹر جنرل" لکھا اس ڈرامہ کے بارے میں عام رائے یہ ہے کہ روسی ادب کا بہترین طربیہ (کمیڈی) ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے۔ کہ ایک قصبہ میں رشوت خوری کا بازار گرم ہے۔ ہر ادنیٰ اعلیٰ سرکاری ملازم رشوت خوری کا عادی ہے اتفاق سے ایک نوجوان کا قصبہ میں گزر ہوتا ہے۔ رشوت خور ملازموں کو شبہ ہوتا ہے کہ یہ نوجوان سرکاری انسپکٹر ہے جسے رشوت خوروں کو پکڑنے کے لیے بھیجا گیا ہے جب یہ ڈرامہ اسٹیج پر کھیلا گیا تو سرکاری افسروں نے اسے "زار" کی حکومت پر طنز تصور کیا۔ شہنشاہ زار پر نکتہ چینی کی سزا پھانسی یا جلاوطنی تھی۔ سزا کے خوف سے گوگول روس سے نکل گیا اور یورپ کی سیاحی کرتا رہا۔

۱۸۴۲ء میں گوگول کی مشہور کتاب "مردہ روحیں" کا پہلا حصہ شائع ہوا۔ اس کتاب میں ان کھیت غلاموں کا ذکر ہے جو جاگیردار کی ملکیت سمجھے جاتے تھے۔ اور جنھیں جاگیردار کھیتوں کے ساتھ فروخت کرنے کا حق رکھتا تھا۔ جاگیردار کو ان کھیت غلامو

پر ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا۔ اگر کوئی کمبخت غلام مر جاتا تو بھی حکومت ٹیکس وصول کر لیتی تھی۔ گوگول نے دکھایا ہے کہ ایک شخص مختلف جاگیروں پر جا کر ایسے کمبخت غلاموں کو خریدتا ہے جو مر چکے ہیں اس طرح بغیر کھیتوں کے وہ ایک بڑا جاگیردار بن جاتا ہے۔

اس کتاب کی اشاعت پر بھی زار کی حکومت بہت ناراض ہوئی۔ گوگول نے موقع کی نزاکت کو بھانپ کر روس سے فرار اختیار کیا فلسطین کے مقدس مقامات کی زیارت کو چلا گیا۔

جب گوگول دوبارہ روس واپس آیا تو ایک مشہور پادری نے آہستہ آہستہ اپنا اثر جمانا شروع کر دیا۔ گوگول اس پادری سے متاثر ہو گیا۔ پادری نے گوگول کو ترغیب دی کہ وہ "مردہ روحیں" کا دوسرا حصہ تباہ کر دے۔ گوگول نے ایک دن اس کتاب کو اشاعت سے قبل شعلوں کی نذر کر دیا۔

یہ عظیم مصنف ۲۱ فروری ۱۸۵۲ء کو مر گیا!

دنیا کے اس بڑے مصنف اور ادیب کی موت غریبی اور فاقہ کشی کی وجہ سے ہوئی۔

جناب جمشید اشرف

لطیفہ

آٹھ آنے تو بھی ۔ ۔ ۔ !

ایک فقیر ایک سبزی بیچنے والے کے پاس گیا اور سودا خریدنے میں جلدی کی۔ سبزی بیچنے والے نے فقیر کو گالی دی فقیر کو غصہ آگیا اور ایک جوتا اس کے مار دیا۔ سبزی بیچنے والا کوتوال کے پاس گیا اور دعویٰ دائر کیا۔ کوتوال نے فقیر کو بلا کر پوچھا کہ تو نے اس کو کیوں مارا۔ فقیر نے کہا کہ اس نے مجھے گالی دی تھی۔ کوتوال نے کہا کہ فقیر خطا تو تو نے بہت بڑی کی ہے۔ مگر چونکہ تو فقیر ہے۔ اس لیے تجھے سزا نہیں دینا چاہتا۔ لہذا اس کے بدلے آٹھ آنے اس کو دیدے کہ تیری غلطی کی سزا یہی ہے۔ فقیر نے ایک روپیہ اپنی جیب سے نکال کر کوتوال کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اور ایک جوتا کوتوال کے سر پر مارا اور کہا کہ یہی انصاف ہے تو آٹھ آنے تو بھی پکڑ اور آٹھ آنے اسے دے۔

(فارسی سے)

اقبال سند صفحہ ۱۴ کا بقایا۔

(۱۱)

دوسرے دن جیل کا دروازہ کھلا اور صدر امین صاحب تشریف لائے۔ مجھے دیکھا سلام کیا اور دو چار ادھر ادھر کی باتیں کر کے چلے گئے۔ دوسرے دن وہ پھر آئے اور دو چار باتوں کے بعد پوچھا "بیٹے۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ تم نے بلا ٹکٹ سفر کیا ہے؟ یا کرنے والے تھے!"

"امین صاحب!" میں نے چیختے ہوئے کہا۔

"میں آپ سے کہہ چکا ہوں کہ میں نے ٹکٹ لیا تھا میں کبھی ایسا سوچ بھی نہیں سکتا کہ بلا ٹکٹ سفر کر کے مجرم بنوں۔"

"پھر وہ ٹکٹ تم نے کیا کیا؟"

"اصل سوال یہی ہے۔ مگر یہ میں نہیں بتاؤں گا نہیں بتاؤں گا۔"

اور امین صاحب چلے گئے۔

دو روز بعد وہ پھر آئے اور بولے۔

"میں نے اسٹیشن گیٹ ماسٹر سے پوچھا ہے۔ مگر وہ بھی یہی کہتا ہے کہ تم نے ٹکٹ نہیں لیا خیر جو بھی ہوا۔ اب تو تمھیں اس کی سزا مل بھی گئی۔ اگر تم چاہو تو میں تمھیں رہا کروا دوں؟"

"امین صاحب! آپکی ہمدردی کا شکریہ! آدھی سزا تو میں بھگت ہی چکا ہوں باقی بھی پوری کر لوں گا" میں نے کہا اور اندر چلا گیا۔ امین صاحب بھی مایوس لوٹ گئے۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ اچانک امین صاحب کو مجھ سے ہمدردی کیوں ہو گئی ہے۔

باقی آئندہ

دمنک کی بات سن کر سنجیوک دم بخود رہ گیا۔ جب کچھ حواس درست ہوئے تو کہنے لگا: دربارداری سچ مچ بہت بکھیڑے کا کام ہے۔ یہ تو دھوکے کی ٹٹی ہے۔ راجاؤں کے دل تو جیسے ہوتا ہی نہیں۔ میں نے بھی شیر کے ساتھ دوستی کا دم بھر کر کتنی بڑی حماقت کی ہے۔ دوستی اپنے ہم پلہ لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ اب اگر میں اسے خوش کرنے کی کوشش کروں تو وہ بھی بے فایدہ ہے کیوں کہ غصے کا عموماً کوئی نہ کوئی سبب ہوتا ہے اور جب وہ سبب دور ہو جائے تو غصہ بھی اُتر جاتا ہے۔ مگر جو غصہ بلا وجہ ہو اس کا کوئی علاج نہیں۔ یقیناً پنگ لک کے آس پاس لگے رہنے والے جانوروں نے ہی حسد کی آگ بجھانے کے لیے اُسے میرے خلاف ورغلایا ہوگا۔ خدمت گزاروں میں تو آقا کی خوشنودی حاصل کرنے کا مقابلہ لگا رہتا ہے۔ وہ کسی دوسرے کا آقا کے قریب آنا برداشت کیسے کر سکتے ہیں۔

یہ سُننا تھا کہ گیدڑ میاں اس سے ہمدردی فرمانے لگے "دوست اگر تم سمجھتے ہو کہ پنگ لک شیر کو تم میٹھی باتوں سے خوش کر سکتے ہو تو وہی کر دیکھو"

سنجیوک بولا: "مگر دوست یہ سچی تدبیر نہیں ہے ایک بار میں راجہ کو خوش کر لوں گا مگر اس کا قرب چاہنے والے پھر کوئی نہ کوئی بہانہ تراش کر اُسے میری طرف سے گمراہ کر دیں گے۔ جس طرح گیدڑ اور کوے نے مل کر اونٹ کو شیر کے ہاتھوں مروا ڈالا تھا۔"

دمنک بولا: "وہ کیسے ذرا یہ کہانی مجھے بھی تو سناؤ!"

تب سنجیوک بیل نے اونٹ کوے اور شیر کی کہانی سنانی شروع کی:۔

اونٹ کی شامت

ایک جنگل میں ست لولا نام کا ایک شیر رہا کرتا تھا۔ کوا، گیدڑ اور تیندوا اُس کے خاص خادم تھے۔ ان کے علاوہ جنگل کے سارے جانور اس کی خدمت گزاری میں لگے ہی رہتے تھے۔ ایک دن اس جنگل میں کہیں سے بھٹک کر ایک اونٹ آگیا۔ اس عجیب و غریب جانور کو دیکھ کر شیر کو بہت حیرانی ہوئی اس نے اپنے خدمت گزاروں

سے دریافت کیا کہ یہ کونسا جانور ہے، بستی کا رہنے والا ہے یا جنگل کا؟

کوّے میاں پیڑ پر بیٹھے یہ تماشا دیکھ رہے تھے شیر کا سوال سنتے ہی بول پڑے، میرا گذر جنگل اور بستی ہر جگہ ہوتا ہے میں بتاؤں یہ اونٹ بستی کا رہنے والا جانور ہے۔ آپ اسے کھا کر اپنی بھوک مٹا سکتے ہیں۔

شیر گرج پڑا: "ہرگز نہیں یہ میرا مہمان ہے۔ گھر آئے دشمن کو بھی نہیں مارنا چاہیے پھر یہ تو ہم پر بھروسہ کرکے ہمارے گھر آیا ہے۔ اسے مارنا پاپ ہے۔ اسے میری طرف سے جان کی امان کا قول دے کر میرے پاس لاؤ میں دریافت کروں گا کہ اس کے اس طرح جنگل میں آنے کا کیا مقصد ہے۔

شیر کا حکم پاتے ہی کئی جانور بھاگے بھاگے اونٹ کے پاس آئے اور اسے مست مولا شیر کے دربار میں حاضر کر دیا۔ اونٹ نے شیر کو اپنی بپتا سنائی کہ وہ کس طرح اپنے گروہ کے دوسرے اونٹوں سے بچھڑ کر جنگل میں تنہا رہ گیا ہے۔

شیر نے پیار سے اُسے دلاسا دے کر یہ اطمینان دلایا کہ اس جنگل میں وہ اطمینان سے رہ سکتا ہے اور اب گاؤں واپس جاکر اُسے ناحق بوجھ ڈھوتے ڈھوتے پھرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب آ گئے ہو تو اسی جنگل کے پھل پھلاری پر گزر کرو۔ تمھاری چہل قدمی کے لیے یہ جنگل چھوٹا نہیں ہے۔

شیر سے یقین دہانی ملنے پر اونٹ آرام سے جنگل میں رہنے لگا۔

شیر اور ہاتھی کی لڑائی

کچھ دن بعد اس جنگل میں ایک متوالا ہاتھی آ گیا۔ اس ہاتھی سے اپنے ساتھیوں اور خدمت گزاروں کی حفاظت کے لیے مست مولا شیر کو اس سے دو دو ہاتھ کرنا پڑے۔ اس لڑائی میں جیت تو شیر کی ہوئی مگر اپنا وار آنے پر ہاتھی نے بھی شیر کو اپنی سونڈ میں لپیٹ کر کچھ اس طرح جھٹکا دیا تھا کہ ان کا بھی کچومر نکل گیا تھا۔ پھر اُس کا ایک دانت بھی شیر کے پیٹ میں بُری طرح گڑ گیا تھا
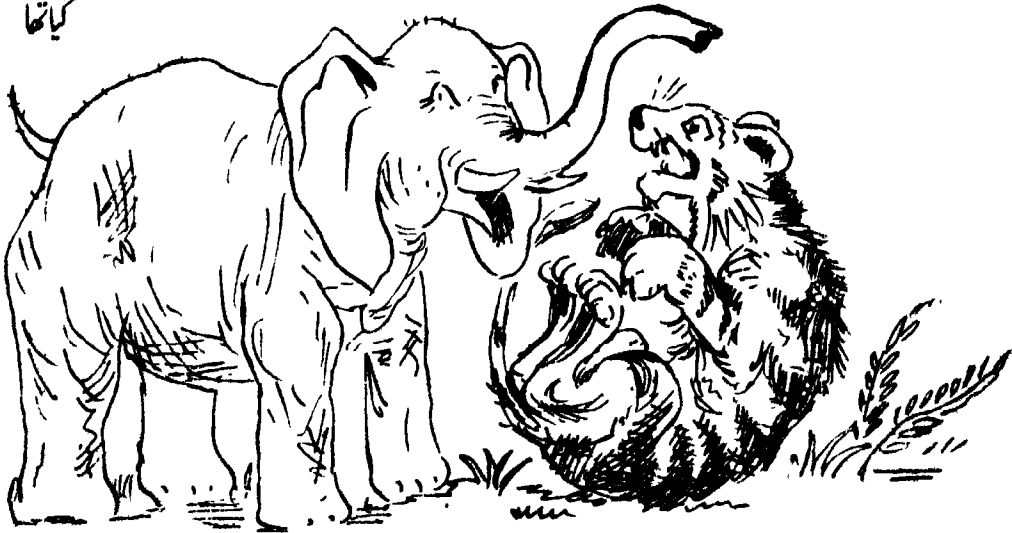
غرض ہاتھی سے لڑائی میں جیتنے کے بعد شیر میاں بالکل اپاہج ہو گئے۔ دوڑنے بھاگنے کے تو قابل ہی نہ رہے کہ شکار وغیرہ کر سکتے اور جلدی ہی فاقوں پر گزرنے لگی۔ ان کی جھوٹن پر زندہ رہنے والے دوسرے جانوروں کا تو کہنا ہی کیا۔ کئی کئی دن ہو گئے اور ایک لقمہ بھی حلق کے نیچے نہیں پہنچا۔

شیر کو اپنے سے زیادہ اپنے ماتحتوں کی بھوک مٹانے کی فکر تھی۔ ایک دن اس نے سبھی کو ایک جگہ جمع کر کے کہا: تم لوگوں کی حفاظت کے لیے مجھے ہاتھی سے جو لڑائی لڑنی پڑی اس میں مَیں بُری طرح گھایل ہو گیا ہوں مگر ایسا گیا گزرا بھی نہیں ہوں کہ اگر تم لوگ کوئی شکار یہاں تک لے آؤ مار کر گرا بھی نہ سکوں۔ اک ذرا دوڑنے دھوپنے سے مجبور ہو رہا ہوں۔ تم لوگ شکار یہاں لاؤ تو میں اُسے مار کر تم لوگوں کی بھوک مٹانے کا بندوبست کر دوں۔

گیدڑ اور کوّے کی سازش۔

شیر کی بات سُن کر کوّا، چیتا، گیدڑ اور بھیڑیا شکار کی تلاش میں نکلے مگر بے نتیجہ۔ پھر گیدڑ اور کوّے نے ایک سازش کی۔ گیدڑ نے کہا: کوّے مہاراج! اس طرح جنگل جنگل مارے مارے پھرنے سے کیا فایدہ کیوں نہ اس اونٹ کا ہی صفایا کرا دیا جائے۔ خوب پیٹ بھر کر سب کی دعوت ہو جائے گی۔

کوّا سوچ میں پڑ گیا۔ کہنے لگا: مگر گیدڑ میاں تم یہ کیوں بھولتے ہو کہ شیر نے اسے خود جان کی امان کا قول دے رکھا ہے۔ وہ بھلا اس پر انگلی کیوں اٹھانے لگا؟

اب گیدڑ نے رازدارانہ انداز میں کہنا شروع کیا: مگر میں نے اس کی ایک ترکیب پہلے ہی سوچ رکھی ہے۔ تم ذرا یہیں رکو، میں خود شیر کے پاس جاتا ہوں۔

گیدڑ بھاگا بھاگا شیر کے پاس آیا اور بہت عجز و انکساری کے ساتھ کہنے لگا: "آقا ہم نے سارا جنگل چھان ڈالا مگر کوئی جانور ہاتھ نہ لگا۔ اب تو مارے بھوک کے ہم لوگوں سے ایک قدم بھی چلا نہیں جاتا۔ آپ کی حالت بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ اجازت دیں تو اونٹ کو ہی مار کر بھوک مٹائی جائے۔"

یہ سُننا تھا کہ شیر غصّے سے غضب ناک ہو گیا کہنے لگا: "تجھے شرم نہیں آتی مجھ سے قول توڑنے کی بات کہنے آیا ہے۔ اب کبھی ایسی بات زبان پر لایا تو تیری کھال کھینچ کر رکھ دوں گا۔ کچھ تو سوچا ہوتا کہ اس غریب کو میں نے جان بخشی کا قول دے رکھا ہے۔"

گیدڑ نے شیر کا غصہ کم کرنے کے لیے چکنی چپڑی باتیں کیں پھر کہنے لگا: "مگر آقا آپ یہ نہ سمجھیے کہ آپ کے قول کا ہمیں پاس نہیں ہے۔ آپ اسے خود نہ ماریے لیکن اگر وہ خود ہی آپ کی خدمت میں اپنی جان نذر کرے تو اسے قبول کرنے میں کیا حرج ہے۔ اس سے تو آپ کو کوئی پاپ نہیں لگے گا۔ اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو ہم میں سے ایک ایک اپنی جان آپ کے لیے قربان کر دے گا جس سے کہ آپ کی بھوک مٹ سکے۔ جو جسم اور جان اپنے آقا کے کام نہ آئے اس پر ہزار بار لعنت۔ آقا کی حفاظت کرنا تو خدمت گزاروں کا اولین فرض ہے۔

اب مست مولا پگھل پڑے۔ کہنے لگے خیر اگر تم لوگ یہی ٹھیک سمجھتے ہو تو بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔

شیر سے اتنی بات کرنے کے بعد گیدڑ اپنے ساتھیوں کے پاس

واپس آیا اور سب کو اپنی سازش میں شامل کرکے بتایا کہ کس
طرح سب کو باری باری شیر کے سامنے جاکر اس کی بھوک
کو مٹانے کے لیے اپنے جسم کی قربانی پیش کرنی ہے۔
اس نے انھیں یہ بھی بتایا کہ شیر ان میں سے کسی کو بھی نہیں
چھوئے گا اور جیسے ہی اونٹ میاں اپنی قربانی پیش کریں
گے وہ اس کی تکا بوٹی کر دے گا۔ اس طرح بہت دن بعد
جنگل میں پھر ایک شاندار دعوت ہو جائے گی۔

منصوبے کے مطابق سب سے پہلے کوّے میاں
ڈال سے اتر کر نیچے آئے اور شیر کے سامنے جاکر کہنے لگے
"آقا اس حقیر کی حقیقت ہی کیا مگر جو کچھ میرے جسم میں
ہے آپ کے لیے حاضر ہے۔ آپ اسے کھا کر اپنی بھوک
مٹائیے۔ آپ کی جان بچے گی تو مجھے بھی جنت میں جگہ ملے
گی۔ جو آقا کے لیے جان کی قربانی دیتا ہے جنت کے
دروازے اس کے لیے کھل جاتے ہیں۔ آپ دیر نہ کیجیے، بس
مجھے کھا جائیے۔"

گیدڑ کوّے کے اس کامیاب ڈرامائی انداز کو
دیکھ کر بہت خوش ہوا کہنے لگا: "ارے کوّے تو اتنا چھوٹا
ہے، اگر مالک نے تجھے کھا بھی لیا تو کیا اس سے ان کی
بھوک مٹ جائے گی۔ تیرے جسم میں گوشت ہوگا ہی کتنا
تو جا ڈال پر بیٹھ میں خود اپنے آپ کو قربانی کے لیے
پیش کرتا ہوں تاکہ مجھ پاپی کو جنت میں جگہ مل جائے۔"

گیدڑ نے جب شیر کے سامنے خود کو قربانی کے
لیے پیش کیا تو تیندوے نے اسے ہٹاتے ہوئے کہا: "تیری
بھی بھلا کیا بساط۔ اتنے تھوڑے سے گوشت سے بےچارے
مالک کا کیا بھلا ہوگا۔ پھر تیرے ناخن اتنے زہریلے ہیں کہ
جو کھائے اس پر زہر کا اثر ہو
جائے۔ میں خود کو قربانی کے
لیے پیش کرتا ہوں تاکہ مجھے کھا کر مالک کی کچھ تو بھوک مٹے۔

یہ منظر دیکھ کر اونٹ نے دل میں سوچا کہ شیر کسی
کو مار تو رہا نہیں ہے کیوں نہ وہ اپنے آپ کو بھی قربانی کے
لیے پیش کرکے مفت کا ثواب حاصل کرے۔ یہ سوچ کر
اس بار اونٹ نے تیندوے کو ہٹاتے ہوئے کہا تم نہیں
میں اپنے آپ کو قربانی کے لیے پیش کرتا ہوں۔۔۔۔

ابھی اونٹ اس کے آگے اور کچھ کہنے بھی نہیں پایا
تھا کہ شیر کا اشارہ پاکر گیدڑ، تیندوا، چیتا وغیرہ اونٹ
پر ٹوٹ پڑے اور اس کا پیٹ پھاڑ کر سب نے اپنی اپنی
بھوک مٹائی۔

یہ کہانی سناکر سنجیوک بیل نے دمنک گیدڑ سے
کہا تبھی میں کہتا ہوں کہ کسی کی فریب کی باتوں میں آکر
اُن پر یقین نہیں کرنا چاہیے اور بادشاہ کے درباری
اور خوشامدی کوئی نہ کوئی سازش کرکے جسے چاہیں جان
سے مروا سکتے ہیں۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ کسی ذلیل نے میرے
خلاف راجہ کے کان بھر دیے ہیں۔ اب ایک دوست کے
ناطے تمھیں بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔

دمنک نے موقع غنیمت جان کہنے لگا "میرے
خیال میں ایسے آقا کی خدمت بے سود ہے۔ اچھا ہے کہ تم
کسی دوسرے ملک میں جاکر رہو۔

سنجیوک نے اپنے دل کی بات کہہ ڈالی: "مگر
ایسے خونخوار کو دشمن بناکر کہیں بھی میں اطمینان سے نہیں
رہ سکتا۔ مجھے تو موت کا اندیشہ ہر وقت مار ڈالے گا۔
اس سے تو ایک بار دو دو باتیں کرلینا ہی اچھا۔

(باقی آئندہ)

جناب واحد پریمی

خواہشیں

(بڑے لڑکوں کے لیے)

اس طرح ظلمتوں کو شب غم مٹائیں گے
ہم اپنے خوں سے بزم میں شمعیں جلائیں گے

آلامِ روزگار کے بدلے نشاط کو
افسانۂ حیات کا عنوان بنائیں گے

اے باغباں نظامِ چمن ہم کو سونپ دے
ہم خونِ دل سے بزم گلستاں سجائیں گے

ممکن نہیں کہ عزم ہمارا بدل سکے
ہم دار پر بھی آکے یونہی مسکرائیں گے

واحد ہو جس میں امن و مساوات کا پیام
ہم سازِ زندگی پہ وہی گیت گائیں گے

جناب اقبال مہدی

ایک دن کیا ہوا

ایک دن کلاس میں سلمیٰ کی استانی نے اس کی بنائی ہوئی تصویر کی بہت تعریف کی۔ کلاس کی سب بچیوں کو اس کی بنائی ہوئی تصویر دکھائی، اور کہا تم بھی اتنی اچھی تصویریں بنایا کرو۔

سلمیٰ خوشی کے مارے پھولی نہ سما رہی تھی اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ زمین پر نہیں ہے ہوا میں اڑ رہی ہے جیسے اس میں کچھ وزن ہی نہ ہو۔

اس دن باقی وقت اسکول میں گزارنا اس کے لیے مشکل ہو گیا۔ چھٹی کی گھنٹی بجتے ہی بھاگی۔ گھر دور نہ تھا پھر بھی یہ فاصلہ بہت لمبا معلوم ہو رہا تھا۔ گھر تک بھاگ کر آئی اور آتے ہی سب کو یہ خوش خبری سنائی۔ اس کی خوشی میں سب شریک ہوئے

سلیم نے کہا: "دیکھوں کون سی تصویر تھی" امی اور ابا نے بھی وہ تصویر دیکھی۔ شاباشی دی اور کہا: "اسی طرح اور مضمونوں میں بھی محنت کرو اور اچھا کام کرو۔ کلاس میں اچھے نمبروں سے پاس ہو۔ تب تمھاری استانی صاحبہ تم سے اور بھی خوش ہوں گی۔"

کچھ دیر بعد سب لوگ اپنے اپنے کاموں میں لگ گیے۔ سلمیٰ کا دل کسی اور کام میں نہیں لگ رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ بس تصویروں پر تصویریں بناتی رہے۔

بمشکل اس نے ہاتھ منھ دھویا، کھانا کھایا۔ کھانا کھا کر بجائے آرام کرنے یا کھیلنے کے، اپنا بستہ لے کر بیٹھ گئی۔ اس میں سے رنگوں کا ڈبہ نکالا، ڈرائنگ کی کاپی نکالی اور تصویریں بنانی شروع کر دیں۔ ایک، دو، تین، چار... پوری کاپی تصویروں سے بھر دی۔ شام کو سلیم کے ساتھ بھی نہیں کھیلی۔ رات میں بھی سونے سے پہلے اسکول کا کوئی اور کام نہ کیا جس مضمون کی کاپی یا کتاب نکال کر بیٹھی ہاتھ خود بخود تصویریں بنانے لگے۔

اگلے دن اسکول میں جب گھر کا کام دیکھا گیا تو اس کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ ڈانٹ بھی پڑی اور سزا بھی ملی۔

گھر آئیں تو اداس تھیں۔ سلیم کا منھ بھی پھولا ہوا تھا۔ آج استاد نے ان کی کاپیوں اور کتابوں پر جگہ جگہ طرح طرح کی تصویریں بنی ہوئی دیکھیں تو اسے ڈانٹا: "تم اپنی کاپیوں اور کتابوں کو بھی ٹھیک نہیں رکھ سکے تصویریں ان پر بنائی جاتی ہیں؟"

سلیم کو کچھ پتہ نہ تھا۔ اس نے ان پر تصویریں نہیں بنائی تھیں۔ وہ حیران ہوا۔ دیکھا تو معلوم ہوا سلمیٰ کی حرکت ہے۔ اس کی کچھ اور کاپیوں اور کتابوں پر بھی سلمیٰ نے تصویریں بنا ڈالی تھیں۔ اسے بہت غصہ آیا۔ گھر پہنچتے ہی امی سے شکایت کی۔

اتنے میں سلمیٰ بھی گھر پہنچ گئی۔ پھر کیا ہوا تم خود ہی سوچ سکتے ہو۔

ابا جان کو معلوم ہوا تو انھوں نے سلمیٰ کو ڈانٹا تو نہیں سمجھا دیا کہ "ہر کام ایک حد کے اندر اچھا ہوتا ہے۔ اس حد سے گزر جائے تو اچھا کام بھی برا ہو جاتا ہے۔"

خدا جانے سلمیٰ کچھ سمجھی یا نہیں سمجھی۔

ابا جان نے یہ بھی بتایا کہ "ہر مضمون پر برابر دھیان دینا چاہیے۔ باقی مضمون چھوڑ کر صرف ایک مضمون لے کر بیٹھ جانا اچھی بات نہیں۔ ہر مضمون کی کاپی پر اسی مضمون کا کام کرنا چاہیے۔ اسکول کی کاپی پر اسکول کا کام اور گھر کی کاپی پر گھر کا کام۔

سالنامہ ملا

حسان صاحب

تسلیم

بچوں نے ممبئی کے بک اسٹال پر "پیام تعلیم" کا سالنامہ نمبر کا ٹائیٹل دیکھتے ہی خریدنے کی ضد کی۔ اور میں نے انھیں پرچہ دلا دیا۔

راستہ بھر بچے پرچہ کے پُرلطف مضامین سے لطف اندوز ہوتے رہے۔

وہ جو نظم "بوجھو تو سہی" (روف خیر) چھپی ہے نا بڑی مزیدار رہی۔ بچوں نے اسے بہت پسند کیا۔ اگرچہ نظم کا پہلا مصرع مجھے سمجھانا پڑا۔ تب وہ ساری کی ساری نظم کے ہر مصرع سے شہر یا ملک کا نام ڈھونڈنے میں کامیاب ہوئے۔

دوسرے مضامین نظم ونثر بھی بہت پسند آئے جشید اشرف کے لطیفوں (جو دراصل طنزیہ خاکے ہیں) سے میں براہ راست متاثر ہوا۔ خاص طور پر وہ جنازے والا طنزیہ۔

بچوں سے اب پیام تعلیم تو خیر کیا چھوٹتا۔ دوبارہ سہ بارہ پڑھے جا رہے ہیں اور میں ان سے جھگڑوں گا بھی نہیں۔

حکیم اعجاز الحق قریشی شولاپور

سفر سے واپسی پر سالنامہ ملا۔ دیکھتے ہی جی کھل اٹھا۔ اور بے ساختہ یہ مصرع زبان پر آگیا۔ ع

حاسد کی چشم بد سے بچائے خدا اسے

سالِ رواں کا اس سے حسین تحفہ اور کیا ہو سکتا ہے! مبارک باد قبول فرمائیے۔

سیف سہسرامی ۔

"پیام تعلیم" کا سالنامہ عین عید کے دن موصول ہوا۔ اس کے ٹائیٹل کو دیکھتے ہی طبیعت خوش ہوگئی۔ سالنامے نے عید کی مسرت کو دوگنا کر دیا۔ سب سے زیادہ مجھے "مجھے پہچانو" "میں بڑا بھائی ہوں" "استاد کا دل" "مرغی چینا" "چیونٹوں کے شہر میں" خاص طور پر پسند آئے۔ اور سبھی مضمون بہت اچھے ہیں۔ مثلاً "بوتل میں جن اور جن" "انوکھا کھیل" وغیرہ اور سب ہی نظمیں کافی مزیدار ہیں۔

میری طرف سے اتنے خوبصورت اور معلوماتی نمبر پر دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔ میں اپنی ہم جولیوں کو "پیام تعلیم" کی خریدار بنانے کی کوشش میں لگی ہوئی ہوں۔ امید کرتی ہوں کہ میری کوشش کامیاب ہوگی۔ انشاءاللہ۔

خالدہ خاتون

شکریہ شکریہ

اور پھر شکریہ کے بعد عید مبارک نیا سال مبارک اور اتنا اچھا سالنامہ نکالنے کی مبارک باد۔

محترم آپ کی انتھک کوشش سے ہمارا دل بہت خوش ہوا اور آپ کا عظیم الشان سالنامہ ہماری خوشیاں لیے ہوئے ہمیں ملا —— ہر مضمون اور ہر نظم بس اپنا جواب آپ ہے۔ ٹائیٹل بھی لاجواب ہے۔

محمد شعیب شمسی بریلی۔

"پیام تعلیم" یقینی ہر اعتبار سے اتنا اچھا اور دلکش ہے کہ آپ کی ہمت و محنت کی نیز حسن انتخاب کی داد دیئے بنا نہیں رہا جاتا۔ اس قدر عمدہ اور جامع سالنامہ پر دلی مبارک باد قبول فرمائیے —— سالنامہ اول سے سالنامہ ثانی بازی لے گیا —— سرورق بہت اچھا لگا ترتیب

سبھی کہانیاں اچھی ہیں۔ علقمہ شبلی، اخضر بریلوی، شفیع تمنا، سیف سہسرامی اور کیف احمد صدیقی کی نظمیں بہت پیاری ہیں۔

فخر رضوی۔ سہسرام

"پیام تعلیم" کا سالنامہ اپنے دامن میں ہزاروں خوش نما پھول لیے موصول ہوا۔

ستمبر میں اتنا ضخیم ذاکر نمبر نکلنے کے بعد مجھے اتنے شاندار سالنامہ کی امید نہ تھی لیکن اس کا سرورق دیکھ کر ہی طبیعت خوش ہوگئی۔ اپنی سادگی اور پرکاری کے ساتھ یہ سالنامہ گزشتہ تمام سالناموں پر سبقت لے گیا ہے۔

گل دستے کے سبھی پھول خوشبودار اور دل و دماغ کو معطر کرنے والے ہیں۔ میری طرف سے اتنا خوبصورت سالنامہ نکالنے پر دلی مبارک باد قبول فرمائیے۔

شفق سہسرامی

سالنامہ نظر نواز ہوا، بیحد دلچسپ بہت خوبصورت اور عالی شان ہے اس کی آمد سے عید کی خوشیاں دوبالا ہوگئیں۔ نظمیں مضامین، تصاویر بہت پسند آئیں، خاص کر اس کا تبدیل شدہ سائز نظر میں جچنے والا ہے۔ اس تبدیلی پر مبارک باد!! خدا کرے یہ بچوں کا ماہنامہ اسی طرح دن دونی رات چوگنی ترقی کرتا جائے۔ ہمارے ہونہار اور کل کے ہونے والے قوم کے ستاروں کی رہنمائی کرتا جائے اور زبانِ اُردو کا پرچم لہراتا جائے۔

عبدالمنان نسیم۔ پونا ٹریننگ کالج

ذاکر نمبر تو پسند آیا۔ سالنامہ تو اور زیادہ نمبر لے گیا ہے۔ سرورق پسند آیا۔

وہ دن دور نہیں جب پیام تعلیم ہر شہر ہر قصبہ کے مدرسوں سرکاری کتاب مانا جائے گا۔

شہزاد اقبال ناگور

سالنامہ میں شائع شدہ کہانیاں نظمیں۔ ڈرامے تاریخی واقعات معلوماتی مضامین تمام کے تمام واقعی اپنی مثال آپ رکھتے ہیں۔ صرف ایک بار پڑھ لینے سے جی نہیں بھرتا بار بار پڑھنے کے باوجود بھی کچھ دیر کے لیے رسالہ ہاتھ میں لیے الٹ پلٹ کیے بغیر تسلی ہی نہیں ہو رہی ہے ——— آپ کی جواں ہمتی کا یہ بین ثبوت ہے کہ "پیام تعلیم" تیزی کے ساتھ ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ ہماری تو یہی دُعا ہے کہ یہ ہماری مذہبی زندگی، ہماری قومی زندگی، ہماری ادبی تاریخ اور ہماری تہذیب تمدن کا روشن چراغ بنے تاکہ ہم سب اور نئے لوگ اس کے اجالے میں آسانی سے قدم بڑھا سکیں۔ آمین!!

عبدالمجید آنیکل (ضلع بنگلور)

آپ کا سالنامہ اس سال بیحد اچھا رہا۔ مجھے سالنامہ میں ہر چیز پسند آئی۔ سب سے زیادہ خوبصورت سالنامہ کا ٹائیٹل ہے۔ کیونکہ اس سال اتنا خوبصورت ٹائیٹل کسی بھی پرچہ کا نہ ہو سکا۔ آپ نے بڑی محنت خوبصورتی سے اس کو تیار کیا جس کی تعریف محال ہے۔ ذاکر نمبر بھی بہت خوبصورت تھا۔

شیخ احمد علی۔ اندور

ہم آپ کے راست مستقل خریدار تو نہیں لیکن ہمارے شہر اورنگ آباد (مہاراشٹر) میں آپ کی ایجنسی کے مستقل خریدار ضرور ہیں اور ہر ماہ "پیام تعلیم" خرید کر شوق سے پڑھتے ہیں۔ آج سے دو چار روز قبل ایجنٹ صاحب نے سالِ رواں کا زیرِ نظر سالنامہ پیام تعلیم" ہمارے حوالے کیا۔ ہر مضمون، ہر کہانی، ہر نظم کو بڑے شوق سے ہم نے پڑھا اور پڑھنے کے بعد بے اختیار دلی جذبات نے ہمیں مجبور کیا کہ آپ کو فوراً مبارک باد کا خط لکھیں۔ تو ہماری جانب سے اس گراں قدر علمی و ادبی معلوماتی و تاریخی سالنامہ [illegible] کی اشاعت پر دلی مبارک باد قبول فرمائیے۔

شبیر احمد عثمانی، مبشر احمد عثمانی۔ اورنگ آباد۔

بڑوں کی کوششیں

عقیدت (شردھا)

میں آج تھکی ہوئی تھی جیسے ہی کالج سے آئی میری
سہیلی کی چھوٹی بہن دوڑی دوڑی آئی اور کہنے لگی۔ دیدی می
برے تایا جی آئے ہیں۔ آؤ دکھاؤں۔ میں نے کہا چلو تمہارے
تایا جی سے بھی مل آئیں۔ میں ان کے گھر گئی اور دیکھا کہ اس کی
ائی بھی آئی تھی۔ میں نے کہا تائی جی نمستے۔ انھوں نے آشیرواد
یا۔ پھر میری سہیلی کملا مجھے اپنے تایا جی کے پاس دوسرے
مرے میں لے گئی۔ میں نے نمستے کیا۔ اور ان کو دیکھ کر حیران
ہوگئی۔ دھوتی کرتا پہنے ٹوپی اوڑھے، بڑی بڑی مونچھیں
ہوئی لمبی لمبی بالکل مہاتما سے معلوم ہو رہے تھے۔ میں شردھا
سے بھر گئی۔ انھوں نے پہلے میری تعلیم کے متعلق پوچھا۔ میں نے
تایا کہ گیارھویں میں سنسکرت میں اچھے نمبر لیے ہیں۔ تو انھوں نے
گیتا کے شلوک سمجھائے۔ اس طرح گیتا کے شلوک سن کر میری
ساری تھکن ختم سی ہوگئی۔

شلوچنا

بیسک پہلا سال (جامعہ)

گھر، پارک، لان، پھول، گملے۔

(اوپر کے لفظوں پر مشتمل ایک واقعہ)

خیالوں کی دنیا ۔ سپنوں کا جہاں
انسان کدھر جاتا ہے کہاں سے کہاں۔
میں نے ایک خواب دیکھا
ن ہرا بھرا ایک لڑکی جا رہی تھی۔ میں ایک
خوب صورت گھاٹی میں پہنچی۔ جہاں ایک خوب صورت گھر تھا۔ گھر
کے باہر باغ بغیچے تھے۔ وہاں ایک خوبصورت چمن بھی تھا اور
ایک طرف کافی بڑا پارک تھا جس میں کھیلنے کودنے کی کافی چیزیں
موجود تھیں۔ میں گھر کے لان میں گھومنے لگی۔ وہاں گملے سوکھے
پڑے تھے جن میں خوبصورت پھول لگتے ہیں۔ گملوں میں پانی
دیتے ہوئے سوچنے لگی کاش کہ یہ میرا گھر ہوتا۔ یہ تیرا ہی تو گھر
ہے۔ میرے کانوں میں یہ آواز آئی اور میں چونک کر جاگ گئی۔

اوشا

ڈپلوما بیسک دوسرا سال (جامعہ)

کبھی کبھی خواب بھی سچا ہو جاتا ہے۔

ابھی کچھ دن پہلے ٹور (سیر و سفر) میں جانے کا
سلسلہ چل رہا تھا۔ جو جانا چاہتا تھا اس سے دستخط کرائے
جا رہے تھے۔ اس دن دستخط کرانے کی آخری تاریخ تھی۔ میں
ٹور میں جانے کے بارے میں اپنے گھر والوں سے پوچھ کر نہ آئی
تھی پر جانے کو دل چاہ رہا تھا۔ آخر میں نے دستخط کر ہی دئے۔
رات کو میں نے سوچا کہ گھر والوں سے پوچھنا تو ضرور چاہیے۔
تو اسی رات مجھے خواب دکھائی دیا کہ میرے پتا جی
یہاں آئے ہیں اور میں نے ٹور پر جانے کے لیے تو انھوں نے
کہا "چلی جانا" میں صبح اٹھی اور میں نے اپنی سہیلیوں کو (اپنا
خواب) بتایا۔ اس دن پتا جی بھی یہاں آگئے۔ تو میں نے وہی
خواب کی بات ان کے آگے دہرائی تو وہ بہت خوش ہوئے اور
انھوں نے کہا چلی جانا۔ میں بھی بہت خوش ہوئی اور میں نے
سوچا کہ کبھی کبھی خواب بھی سچے ہو جاتے ہیں۔

شانتی دیوی

بیسک ڈپلوما۔ دوسرا سال (جامعہ)

قلمی دوستی

نام محمد یاسین عمر ۱۶ سال
پتہ: معرفت جناب عنایت اللہ صاحب
محلہ کھنیکاں۔ مالیر کوٹلہ (پنجاب)
مشغلہ: پیام تعلیم اور دوسری بچوں کی کہانیاں پڑھنا۔ ڈراموں اور مباحثوں میں حصہ لینا۔

نام محمد رفعت اللہ رفیع عمر ۱۴ سال
مشغلہ۔ اچھی اچھی کتابیں شوق سے پڑھنا، تقریریں کرنا، نماز پڑھنا، قلمی دوستی لائبریری جانا۔ وغیرہ۔
پتہ۔ شاہد منزل ۴۰۲/۱۴ منڈی بازار۔ ورنگل (اے پی)

نام۔ سید اعجاز عمر ۹ سال
پتہ۔ طارق منزل
دھونڈبس بارسی ٹاکی۔ ضلع آکولہ
مشغلہ۔ پیام تعلیم پڑھنا، سیر و تفریح کرنا۔ تصاویر جمع کرنا۔ اچھے پرچوں کا مطالعہ کرنا۔

نام۔ جے۔ الطاف احمد تخلص گوہر۔
عمر ۱۵ سال
غلہ۔ قلمی دوستی، کرکٹ کھیلنا، سائیکل چلانا۔ ڈاک ٹکٹ جمع کرنا
پتہ۔ جے الطاف احمد۔ ولتور (مدارس)
ین۔ اے۔ ڈی۔ ٹی۔

نام۔ ڈی سردار حمید عمر ۱۴ سال
پیشہ۔ آٹھویں جماعت ۵/۵ آر۔ یم ہیچ اسکول
گنتکل ضلع اننت پور (اے پی)
مشغلہ۔ کہانیاں پڑھنا۔ قلمی دوستی کرنا۔ اسٹامپ جمع کرنا

نام سلیم محمد عمر ۱۵ سال
تعلیم دسویں جماعت
پتہ۔ گورمینٹ بوئیس ہایر سیکنڈری اسکول
پورٹ بلیر۔ انڈمان۔

نام۔ ایس۔ ایم۔ قمر جمیل عمر ۱۶ سال
مشغلہ قلمی دوستی کرنا۔ دوستوں کی تصاویر جمع کرنا۔
افسانے پڑھنا۔ نماز پڑھنا۔
پتہ۔ معرفت ایس۔ ایم۔ ایوب صاحب
محلہ چوکھنڈی سہسرام (بہار)

نام عشرت اعظم خاں سرو عمر ۱۳ سال
پتہ امپریل مڈیکل ہال۔ روہتاس۔ شاہ آباد
مشغلہ۔ نئے نئے پرچوں کا مطالعہ اور پیام تعلیم پڑھنا۔

نام۔ مقبول احمد سراج
مشغلہ ٹکٹ جمع کرنا، مذہبی کتابیں اور تمام اخبار و میگزین پڑھنا
پتہ۔ معرفت سی۔ اے محمد اسماعیل دی موتی پور شوگر فیکٹری
پوسٹ آفس۔ موتی پور ضلع مظفر پور (بہار)

نام۔ اے اے انصاری معرفت
پتہ۔ عادل بک ڈپو مسلم پورہ سرچے نمبر ۱۵۔ مالیگاؤں (ناسک)
مشغلہ۔ رسالوں کا مطالعہ، ورزش۔

بچوں کی کوششیں

انوکھا تجربہ

عکرمہ کوثر

ان کا اصلی نام تو جانے کیا تھا لیکن لوگ انھیں کالے خان، کالے خاں کہہ کر پکارتے۔ کالے خاں یوں تو تھے نہایت ہی بھولے بھالے اور سیدھے سادے سے لڑکے بس ذرا شکل کالی کلوٹی تھی، اور شاید یہی وجہ تھی کہ ان کا نام کالے خاں پڑ گیا۔

کالے خاں کے پاس عقل تو اچھی ہی سی تھی لیکن تھے بڑے ہی ہمت ور اور دھنی۔ جو بات جی کو لگ جاتی چاہے کتنی ہی مشکل اور خطرناک کیوں نہ ہو۔ اسے کیے بغیر چین نہ لیتے۔

ایک دن کی بات ہے کالے خاں دوستوں میں بیٹھے ریڈیو سن رہے تھے۔ خبروں کا پروگرام چل رہا تھا۔ خبروں سے کالے خاں کے پلّے اور کچھ تو نہ پڑا البتہ جنگ کی خبروں میں ہوائی جہاز سے چھتری کے ذریعہ اترنے کی بات سن کر وہ چونک پڑے اور بڑے تعجب سے پوچھا۔

"اے منے! تو کیا سچ مچ ہوائی جہاز سے لوگ کود پڑتے ہیں؟" "ہاں جی اور کیا؟" منے نے جواب دیا۔

"ارے انھیں ہوائی جہازوں سے جو آسمان پر چیل کی طرح اُڑتے ہیں؟"

"ہاں ہاں انھیں جہازوں سے، آخر اس میں حیرانی کی کیا بات ہے؟"

"تو کیا وہ زمین پر گر کر مر نہیں جاتے؟"

"کالے خاں! تم بھی نرے گاودی ہو" منے نے جواب دیا۔ بھلا مر کاہے کو جائیں گے۔ آخر وہ چھتری بھی تو لیے ہوتے ہیں۔

"تو چھتری سے کیا ہوتا ہے؟"

"ارے بیوقوف!" منے نے کہا "جہاز سے کودنے پر چھتری کھل جاتی ہے اور وہ کودنے والوں کو سنبھال کر آہستہ آہستہ زمین پر اتار دیتی ہے۔"

یہ بات سن کر کالے خاں کو تعجب تو بڑا ہوا مگر ساتھ ہی انھوں نے دل میں ٹھان لیا کہ وہ اس کا تجربہ ضرور کریں گے۔

بس پھر کیا تھا بھاگے بھاگے گھر پہنچے اور چھتری لے کر گاؤں کے تالاب کی طرف چل دیئے۔ تالاب کے کنارے برگد کا ایک پرانا درخت تھا۔ درخت کی ایک شاخ دور تک تالاب کے اوپر پھیلی ہوئی تھی۔ کالے خاں درخت پر چڑھ کر اسی شاخ کے سرے جا بیٹھے۔ اطمینان سے چھتری کھولی اور اس کے دستے میں پاؤں رکھے، ہاتھ سے ڈنڈی تھامی اور نیچے کی طرف چھلانگ لگا دی۔

مگر یہ کیا؟ —— چھلانگ لگاتے ہی چھتری ایک دم سے الٹ گئی۔ تیلیاں ٹوٹ کر کھو گئیں اور کالے خاں اڑا ڑا دھڑام کر کے گہرے پانی میں غوطہ لگاتے چلے گیے۔ وہیں کنارے پر گاؤں کے بہت سے لڑکے اپنے مویشی چرا رہے تھے۔ انھوں نے یہ حال دیکھا تو دوڑ کر کالے خاں کو پانی سے باہر نکالا جب ان کے حواس ٹھکانے لگے تو لڑکوں نے پوچھا۔ کالے خاں یہ کیسا کھیل

تھا؟ اور جواب کالے خاں نے جب انھیں پوری کہانی [illegible] کے خوب ہنسے اور سب نے مل کر ایک زوردار نعرہ لگایا۔

"کالے خاں زندہ باد"

انتقام

آصف اختر نقوی
ثانوی دوم جامعہ

باجی کا اس اتوار کو پکنک منانے کا پروگرام تھا۔
میں نے باجی سے کہا "ہم بھی چلیں گے"۔
باجی نے کہا "تم لڑکیوں کے ساتھ جاکر کروگے کیا"۔
مگر میں نے ضد کی تو مجھے لے چلنے پر تیار ہوگئیں۔ میں خوشی خوشی اپنے دوستوں کے پاس گیا اور ان سے کہا "باجی اس اتوار کو پکنک پر جارہی ہیں تم لوگ چلوگے"۔ وہ لوگ راضی ہوگیے۔
تو جناب باجی نے مجھ سے خوب کام لیے اور میں نے خوشی خوشی سب کام کردیئے۔
اتوار کا دن آیا۔ باجی کی سہیلیاں صبح سے آئی ہوئی تھیں اور جانے کا انتظام کررہی تھیں باجی نے کہا "جاؤ ساجد ذرا بازار سے تم کچھ سنترے اور کیلے وغیرہ لے آؤ"۔ اور میں خوشی خوشی چلا گیا۔ مگر جب میں واپس آیا تو معلوم ہوا کہ گھر میں نہ باجی ہیں نہ باجی کی سہیلیاں ہیں۔ ہاں میرے سب دوست موجود ہیں۔ میں نے انور سے پوچھا باجی کہاں گئیں۔ تو اس نے جواب دیا "وہ تو اپنی سہیلیوں کے ساتھ چلی بھی گئیں"۔
میں نے کہا اور تم لوگوں نے روکا بھی نہیں! جاوید نے کہا "میں نے ان سے کہا کہ ساجد کو آجانے دیجیے۔ تو انھوں نے کہا "اچھا جب تک وہ نہ آئے تب تک تم لوگ بڑے کمرے میں بیٹھو ہم اور کچھ انتظام کریں۔
"پھر کیا ہوا"۔ رفیق بولا۔
جب میں ایک کام سے کمرے کے باہر آیا تو کیا دیکھتا ہوں نہ باجی ہیں نہ باجی کی سہیلیاں"۔ ہم نے چھوٹے بھائی ماجد سے پوچھا "تم نے امی سے پوچھا تھا کہ وہ کہاں گئیں"۔
ماجد بولا۔ ہاں پوچھا تھا۔ مگر انھوں نے تو اس بارے میں لاعلمی ظاہر کی۔
میں نے اپنے دل میں کہا اچھی بات ہے میں بھی باجی کی چالاکی سمجھ گیا۔ باجی نے مجھے بازار اور میرے دوستوں کو بڑے کمرے میں اس لیے بھیجا تھا۔
مگر میں بھی کچی گولیاں نہیں کھیلا ہوں، میں بھی ایسا بیوقوف بناؤں گا کہ زندگی بھر یاد کریں گی۔
جاوید نے پوچھا "مگر کس طرح"۔
یہ کریں گے تم سب وہاں چل کر چھپ جانا اور میں باجی سے جاکر کہوں گا "ماجد چھت سے گر کر بڑی طرح زخمی ہوگیا۔ میں نے اپنے چہرے پر اس طرح کے آثار نمایاں کیے کہ جیسے یہ واقعہ سچ ہو۔
"یہ ترکیب ٹھیک ہے۔ کیونکہ جب باجی وہاں سے چلیں گی تو ظاہر ہے کہ ان کی سہیلیاں بھی ان کے ساتھ چلیں گی۔ اور بس! چل دو"۔
ہم چاروں دوست آزاد پارک کی طرف روانہ ہوگیے جب ہم پہنچے تو معلوم ہوا کہ باجی وغیرہ بڑے مزے سے گراموفون سن رہی ہیں۔ ترکیب کے مطابق سب دوست تو آس پاس چھپ گیے اور میں چہرہ پر گھبراہٹ کے آثار پیدا کرکے ان کے پاس گیا اور ان سے کہا

"باجی باجی ماجد چھت سے گر کر بری طرح زخمی ہوگیا ہے" وہ ایک دم گھبرا گئیں اور سامان اکٹھا کرنے لگیں۔ تو میں نے کہا "آپ جلدی جائیے۔ میں یہ سامان لے آؤں گا"۔
خیر وہ لوگ تو جلدی سے

وہاں سے روانہ ہوئیں اور ادھر ہم نے تالی بجائی اور سب
دوست جو آس پاس چھپے ہوئے تھے نکل کر آگئے اور ہم لوگوں
نے خوب مزے سے گانا سنا کھانا کھایا اور خوب پکنک منائی
ان لوگوں نے وہاں جاکر واپس آنے کی زحمت نہ کی۔

ایس ایم۔ صباح الدین شوق

کبڈی

آؤ کھیلیں کھیل کبڈی   کوئی دوڑے کوئی بھاگے
کوئی پیچھے کوئی آگے   کتنا اچھا کھیل کبڈی
آؤ کھیلیں کھیل کبڈی

دھرتی پر ہم کھیل جائیں   کھیتوں میں ہم کھیل جائیں
کتنا سستا کھیل کبڈی   آؤ کھیلیں کھیل کبڈی
آؤ کھیلیں کھیل کبڈی

کشتی کر لو کسرت کر لو   اپنے تن میں طاقت بھر لو
کھیل سکو گے تبھی کبڈی   آؤ کھیلیں کھیل کبڈی
آؤ کھیلیں کھیل کبڈی

ہنس ہنس جیتیں ہنس ہنس ہاریں   بھارت ماں کے پران سہاریں
تبھی بنے گا کھیل کبڈی   آؤ کھیلیں کھیل کبڈی
آؤ کھیلیں کھیل کبڈی

(ہندی سے اپنایا)

توصیف احمد نعمانی

انوکھی ترکیب

ایک دفعہ کا ذکر ہے دو دوست ریل میں سفر کر رہے تھے
چلتے چلتے گاڑی میں سے ایک دوست سعید کی تھیلی گر گئی جس میں
۲۰ روپیہ تھے۔ مگر وہ زنجیر نہ کھینچ سکا کیونکہ زنجیر پچاس یا اس سے
زیادہ روپے کا مال گرنے پر کھینچی جاتی
ہے۔ سعید نے تھیلی کے گرتے ہی
اپنے دوست کا اس طرف متوجہ کیا۔ سعید نے جھٹ اپنی ایک تھیلی
جس میں تقریباً دو سو روپے تھے باہر پھینک دی اور فوراً زنجیر کھینچ
کر ریل رکوا دی۔ اتنے میں گارڈ آپہنچا تو سعید نے کہا۔ میری تھیلی
نیچے گر گئی ہے۔ گارڈ نے اسے سامان لانے کی اجازت دے دی اور
وہ اتر کر اپنی تھیلی کے ساتھ اپنے دوست سعید کی تھیلی بھی لے آیا اور
اس طرح اس نے اپنے دوست کی مدد کی۔

رشیدہ بی بی

جنگل کا راجا

جنگل میں ایک بوڑھا شیر رہتا تھا۔ بیٹھے بیٹھے اسے
خیال آیا کہ چلو چل کر دیکھیں، ہماری رعایا ہماری تعظیم پہلے کی طرح کرتی
ہے یا نہیں۔ پہلے اسے ملا تیندوا۔ شیر نے پوچھا۔
"بتاؤ جنگل کا راجا کون ہے؟"
تیندوے نے سر جھکا کر جواب دیا۔ "جی آپ ہیں"۔
شیر نے شاہی انداز سے اسے دیکھا اور آگے بڑھ گیا
آگے اسے ریچھ ملا۔ اس سے بھی گرج کر اس نے یہی سوال پوچھا۔
"بتاؤ جنگل کا راجا کون ہے؟"
"آپ ہی ہیں جنگل کے طاقتور راجا"! ریچھ نے کہا۔
کئی جانوروں سے اسی طرح سوال پوچھے اور وہی جواب پائے
اب شیر کی ملاقات ایک بڑے ہاتھی سے ہوئی۔ شیر نے اس سے
بھی یہی سوال پوچھا۔ ہاتھی کو یہ سوال بڑا ہی بُرا لگا۔ اس نے جواب
دینے کے بجائے شیر کو سونڈ میں پکڑ کر کئی گز دور پھینک دیا۔ شیر
اٹھا اور دھیرے دھیرے چلتا ہوا ہاتھی کے پاس آکر بولا۔
"میرے سوال کا اگر جواب معلوم نہیں تھا تو معافی مانگ
لیتے، کوئی ہرج نہیں تھا بھلا اتنا گرم کیوں ہو گئے تھے!"

مرتبہ
جناب محمد اقبال

اسکولوں کی تعلیمی اور تفریحی سرگرمیاں

انجمن خیر الاسلام بوائز ہائی اسکول بمبئی کا جلسہ

یوم آزادی

بمبئی ۱۵ اگست بیسویں یوم آزادی کی تقریب میں خیر الاسلام ہائی اسکول (بوائز) بمبئی ۸ کے ہال میں تقریر اور نظم خوانی کے مقابلے کا جلسہ بڑی دھوم دھام سے منایا گیا۔

جلسہ کی صدارت اسماعیل خان صاحب نے فرمائی۔ اس جلسہ کے افتتاح سے قبل اسکول کے پرنسپل عبدالغنی سروگرہ صاحب نے پرچم کشائی کی رسم اپنے مبارک ہاتھو سے فرمائی اور اسکول کے آر۔ ایس۔ پی۔ اسکاوٹ و دیگر طلباء نے ترنگے جھنڈے تلے سلامی دی۔ پھر تقریری مقابلے شروع ہوئے۔ یہ مقابلے مرہٹی۔ ہندی اور اُردو میں تھے۔

جج صاحبان نے اپنے فیصلے کے مطابق تقریری مقابلے میں سینئر گروپ میں اول انعام، دوم انعام کا حقدار محمد فاروق (نہم الف) اور محمد طاہر (دہم ب) کو قرار دیا اور جونیئر گروپ میں اول اور دوم انعام بالترتیب اقبال احمد (نہم ب) اور محمد ہارون (دہم الف) کو دیا۔ اس کے بعد نظم خوانی میں سینیر گروپ کا انعام محمد امیر الدین (دہم ب) کو ملا۔ اور جونیر گروپ کا انعام محمد رفیق (نہم) ، نے حاصل کیا۔

ناگپاڑہ میونسپل اردو اسکول میں

جشن آزادی

ناگپاڑہ میونسپل اردو اسکول اور بمبئی میونسپل اُردو سیکنڈری اسکول کے طالبات نے جشن آزادی بڑے جوش وخروش سے منایا۔ جلسے کی کاروائی شروع کرنے سے پہلے ایک طالب علم نے قرآن شریف کی آیت کی تلاوت کی۔ اس کے بعد جلسے کی کاروائی شروع کی گئی۔ جلسہ کی صدارت بمبئی میونسپل سیکنڈری اسکول ناگپاڑہ کابینہ کے وزیر اعظم اکبر علی صاحب نے کی۔ لڑکوں نے قومی جھنڈے کے سامنے بڑے جوش وخروش سے سلامی دی۔ سلامی کے بعد چھوٹے بچوں نے قومی جھنڈے پر ایک نظم پڑھی۔ جماعت ہفتم کے ایک طالب علم نے ملک کی آزادی کے متعلق بڑے جوش وخروش سے تقریر کی۔ میونسپل سیکنڈری اسکول کے ایک طالب علم نے آزادی کی بیسویں سال گرہ پر تقریر کی۔ اس کے بعد چھوٹے بچوں نے ایک مزاحیہ ڈرامہ پیش کیا۔ ڈرامہ ختم ہونے کے بعد ایک طالب علم نے انگریزی میں تقریر کی۔ آخر میں صدر جلسہ نے انگریزی میں تقریر کی۔ تقریر کے بعد دو بچوں نے قومی ترانہ گایا۔

صغرا آبادی میونسپل اردو اسکول میں پارلیمنٹ کا قیام

۵ / اگست کو صغرا آبادی میونسپل اردو اسکول میں جناب چوگلے عبداللطیف کی صدارت میں ایک جلسہ ہوا جس میں اسکول پارلیمنٹ کے ممبران چُنے گیے جن کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔

صدر۔	شہاب الدین صاحب	نائب صدر	مقصود احمد صاحب
وزیر اعظم	جمال الدین	اسپیکر	نظام الدین
وزیر تعلیم	اختر حسین (ہفتم)	نائب وزیر تعلیم	محمد فاروق (ہفتم)
وزیر صحت	بشیر احمد (ہفتم)	نائب وزیر صحت	اشرف علی (پنجم)
وزیر قانون	عبدالرزاق (ہفتم)	نائب وزیر قانون	محمد عمر (ششم)
وزیر داخلہ	عبدالرحیم (ہفتم)	نائب وزیر داخلہ	محمود (ششم)
وزیر خارجہ	محمد یونس (ہفتم)	نائب وزیر خارجہ	محمد قاسم (چہارم)
وزیر نشرو اشاعت	محمد نذیر (ہفتم)	نائب وزیر نشرو اشاعت	سید احمد (ششم)

آخر میں صدر مدرسہ جناب محمد ایوب انصاری نے ممبران کو مبارک باد پیش کی اور فرمایا کہ "پارلیمنٹ کا ممبر چنا جانا جتنا آسان ہے اس سے کہیں زیادہ مشکل اس کے فرائض کو انجام دینا ہے لیکن مجھے امید ہے کہ شری رحمت علی صاحب شری چوگلے صاحب اور شری مظفر عباس صاحب کی نگرانی میں یہ پارلیمنٹ اپنا کام بخوبی انجام دے گی۔

سینٹ زیویرس کی غالب ٹرافی ایم ڈی کالج نے جیتی

واجد صبیحہ سلطانہ، حنیفہ پالکا اور راشد میر نے انعامات پائے

۲۵ / اگست ۶۷ء کی شام کو بمبئی کے سینٹ زیویرس کالج ہال میں اردو سوسائٹی آف سینٹ زیویرس کالج بمبئی کی طرف مرزا غالب ٹرافی کے لیے انٹر کالجیٹ اردو تقریری مقابلہ ہوا صدارت مشہور شاعر اخترالایمان صاحب نے فرمائی اور ناظم کے فرائض پروفیسر ڈاکٹر سید محی الدین نے انجام دیئے۔ اس مقابلے میں بمبئی کے دس کالجوں کے اٹھارہ طالب علموں نے حصہ لیا۔ ہر ایک کو زیادہ سے زیادہ سات منٹ تقریر کرنے کی اجازت تھی۔

سب سے پہلے صوفیا کالج کی طالبہ نفیس قمر کو بلایا گیا۔ انھوں نے اپنی تقریر کا عنوان "امن عالم میں انسانیت کی بقا" رکھا تھا ان کے بعد مندرجہ ذیل مقررین آئے مشتاق مومن (سدہم کالج)، سید شاہین معصومہ (سد عارتھ کالج)، شبیر حسن (ایم ڈی کالج)، عبدالقادر کمدانی (دویاس کالج)، ظہیر صدیقی (نیشنل کالج)، مومن مشتاق (اسمعیل یوسف کالج)، سلطان علی (رون کالج)، صبیحہ سلطانہ (ایم ڈی کالج)، واجد منداسے (زیویرس کالج)، پیر محمد (سد عارتھ کالج)، نیاز مومن (سدہم کالج)، عبدالرحمان (کے سی کالج)، مس خورشید اسمعیل (نیشنل کالج)، راشد منچری (کے۔ سی کالج)، حنیفہ پالکا (صوفیہ کالج)، زہرہ ہوردانی (زیویرس کالج)، سید حسن (اسمعیل یوسف کالج)،

اس مقابلے میں شاہد علی خاں صاحب یوسف ناظم صاحب اور عزیز قیسی صاحب نے جج کے فرائض انجام دیئے۔ فاضل ججوں کے فیصلے کے مطابق ٹرافی بہارشی دیانند کالج نے حاصل کی۔ اس کے دونوں مقررین صبیحہ سلطانہ اور بشیر حسن نے بڑی اچھی تقریریں کیں۔

انفرادی انعامات میں پہلا انعام سینٹ زیویرس کالج کے واجد منداسے نے حاصل کیا۔ دوسرا انعام بہارشی دیانند کالج کی صبیحہ سلطانہ نے حاصل کیا تیسرا انعام مس حنیفہ پالکا کو ملا۔

گوریکر صاحب کی تقریر۔

سینٹ زیویرس

کالج کی اُردو سوسائٹی کے بانی پروفیسر جناب گوریکر نے مہمانوں اور سامعین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا مرزا غالب ٹرافی کا یہ مقابلہ کا اکیسواں سال تھا۔ انھوں نے مختصراً اس کی غرض و غائت پر روشنی ڈالی۔

مشاعرہ

مقابلے کا نتیجہ سنانے سے پہلے

اختر الایمان صاحب کی صدارت میں ایک مشاعرہ ہوا۔ جس میں رفیعہ شبنم عابدی، پروفیسر مجاہد حسین مجاہد، ماہر اکبانی، انجم رومانی، یوسف ناظم، کامل چاندپوری، عزیز قیسی، ندا فاضلی، اور خود صدرِ مشاعرہ نے اپنا کلام سنایا۔

مرسلہ

جامعہ ہائر سیکنڈری اسکول کی نمایاں کامیابی

مشتاق اختر

دہلی یونیورسٹی کے سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن میں ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، نومبر کو دہلی کے ہائر سیکنڈری اسکولوں کے درمیان عظیم الشان تعلیمی و ثقافتی مقابلوں کا انعقاد ہوا۔

اس میں جامعہ ہائر سیکنڈری اسکول (مدرسہ ثانوی جامعہ ملیہ) نے نمایاں کامیابی حاصل کی۔

ہندی کی فی البدیہہ تقریر EXTEMPORE SPEECH کے مقابلہ میں جامعہ ہائر سیکنڈری کے طالبِ علم شفیق احمد خاں نے اول انعام حاصل کیا۔

مونو ایکٹنگ میں اول انعام جاوید لطیف نے حاصل کیا۔ اور نظم خوانی و مونو ایکٹنگ کے دوسرے مقابلہ میں دوم انعام آصف اختر کو ملا۔

—✱—

مجلس طلبہ جامعہ ہائر سیکنڈری اسکول کی بزم مسند نشینی۔

۲۳ نومبر کی شام کو محمد علی ہال میں مجلس طلبہ (اسٹوڈنٹ کونسل) کے عہدیداروں کے اعزاز میں حسب روایت بزم مسند نشینی کا انعقاد ہوا۔

عالی جناب ڈاکٹر مس کمودی (مشیرۂ مالیات وزارت تعلیم) نے شرکت کی اور شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب نے جلسہ کی صدارت فرمائی۔

مجلس طلبہ کے عہدیداروں نائب صدر محمد اسحاق، جنرل سکریٹری کفیل احمد، ناظم کھیل شمیم احمد، مہتمم کتب خانہ مختار عثمانی، مدیر المصور عامر قدوائی اور مدیر امنگ نکہت یاسمین کا تعارف بالترتیب جاوید لطیف، آصف اختر، شفیق احمد خاں، عتیق الرحمن عبداللہ طارق اور رفعت زیدی نے انتہائی دلچسپ انداز میں کرایا۔

معتمد جلسہ سید غضنفر حسین زیدی نے یونین (مجلس طلبہ) کی کارگذاری سنائی اور نائب صدر جناب محمد اسحاق صاحب نے اپنا معیاری خطبۂ صدارت پیش فرمایا۔

آخر میں شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب کی نصیحت آمیز تقریر کے بعد معزز مہمان ڈاکٹر مس کمودی نے ایک بصیرت افروز تقریر فرمائی جس میں خوشی و مسرت کے اظہار کے ساتھ جامعہ کی خصوصیات و روایات کا تذکرہ اور اس سلسلہ میں موصوفہ کی تعریف و توصیف خصوصاً قابل ذکر ہے۔

آپ نے فرمایا "جامعہ ملیہ اپنی خصوصیات و روایات کی بنا پر ممتاز اور ملک کی دوسری درسگاہوں سے فائق ہے ان خصوصیات کی بقا اور بڑھتی ہوئی روز افزوں تعلیمی ترقی سے مجھے خوشی ہوئی۔ طلبہ کی تقریر و تحریر دیکھ کر اندازہ ہوا کہ جامعہ نے کس قدر اور دوسری ترقیوں کے ساتھ ساتھ تعلیمی ترقیاں بھی کرلی ہیں!"
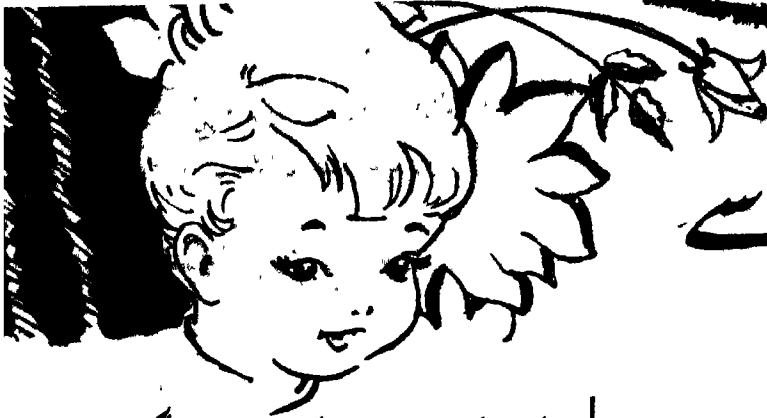
دل بدلنے کے کچھ اور تجربے :-

سالنامے میں آپ نے دل کے بدلے جانے کی خبر پڑھی تھی۔ آپریشن کے بعد مسٹر وکانسکی کی حالت کافی اطمینان بخش تھی مگر ان پر نمونیا کا حملہ ہو گیا۔ اور پھیپھڑوں کی خرابی کی وجہ سے یہ دنیا سے چل بسے۔ اس لیے آپریشن کرنے والے ڈاکٹروں کی رائے میں یہ موت دوسرے اسباب کی بنا پر ہوئی ہے۔ مریض کا بدلا ہوا دل مرنے کے بعد بھی اچھی حالت میں تھا۔ مطلب یہ کہ اس سے آپریشن کی کامیابی پر حرف نہیں آتا۔

کیپ ٹاؤن کا دوسرا تجربہ :-

اسی کیپ ٹاؤن (جنوبی افریقہ) کے انہی ڈاکٹروں نے ایک دوسرا تجربہ اور کیا۔

کیپ ٹاؤن میں ۵۸ سالہ ڈاکٹر فلپ بلے برگ کے سفید فام جسم میں ایک کالے حبشی کا دل دھڑک رہا ہے۔ آپریشن کے بارھویں تیرھویں دن تک ان کی حالت برابر بہتر رہی ہے۔ ڈاکٹر فلپ کافی خوش نظر آتے ہیں۔ پرہیزی کھانا بھی کھانے لگے ہیں۔ ابھی انہیں بستر سے نیچے اترنے کی اجازت نہیں ملی ہے۔ مگر جلد ہی انہیں ایک خاص طرح کی کرسی پر بیٹھنے کی اجازت مل جائے گی۔ ڈاکٹروں کی ایک ٹیم ہر پندرہ منٹ کے بعد ان کی حرارت، خون کے دباؤ اور دل کی دھڑکن کی جانچ کر رہی ہے۔

ڈاکٹروں کی رائے میں مسٹر فلپ کی حالت اتنی اچھی ہو گئی ہے کہ چند دن بعد ان کے بارے میں روزنامہ بلیٹن یا خبر نامہ شائع کرنے کی ضرورت نہ رہے گی۔

کیلی فورنیا میں :-

اسی طرح کیلی فورنیا میں ۵۴ سالہ مسٹر کاسک کے جسم میں ۶ جنوری سے ایک ۴۳ سالہ خاتون کا دل دھڑک رہا ہے۔ شری متی وسبینا کا انتقال دماغ کی نس پھٹ جانے سے ہو گیا تھا۔ جسے ہیمرج کہتے ہیں۔ مگر بھی ان کا حال زیادہ امید افزا نہیں دل بدلنے کے دس دن بعد بھی ان کی حالت کافی نازک بتائی جاتی ہے۔ ان کے جسم کا خون کئی بار بدلا جا چکا ہے۔ مگر ان کی حالت ابھی اسی طرح تشویش ناک ہے۔

اپنے دیس کے ڈاکٹر کیا کہتے ہیں :-

دل بدلنے کے ان واقعات کا ہمارے دیس کے ڈاکٹر بھی بہت دلچسپی سے مطالعہ کر رہے ہیں۔ دہلی کے ایک مشہور ڈاکٹر نے تو ایک بہت دلچسپ بات کہی ہے: دل کے بدل جانے کے بعد انسان کے سوچنے اور محسوس کرنے کا ڈھنگ بھی بدل سکتا ہے۔ مثلاً ایک بوڑھے آدمی کے جسم میں ایک جوان عورت کا دل لگا دیا جائے اور پھر وہ بڑے میاں خدا کی قدرت سے زندہ سلامت بچ بھی رہیں

تو ان کے سوچنے سمجھنے کا ان کی خواہشوں کا وہ پہلا انداز نہیں ہو سکتا بہرحال آئندہ اس سلسلے میں بہت دلچسپ تجربوں کی توقع ہے

اوہیو کے ایک مجرم کی دلچسپ وصیت :-

اوہیو کے ایک نوجوان کو باپ کے قتل کے جرم میں پھانسی دی جانے والی تھی اس نوجوان نے اعلان کیا ہے کہ پھانسی کے بعد اس کا مردہ جسم کسی اسپتال کو دے دیا جائے تاکہ اس کے کارآمد اعضاء دوسروں کے جسم میں منتقل کیے جا سکیں ۔

ننھے سفیر :-

انگلستان کے دو ننھے سفیر آج کل ہندوستان آئے ہوئے ہیں انگلستان کے ایک روزنامہ اخبار نے ۲۰ سال سے کم کے لڑکوں اور لڑکیوں کا ایک مقابلہ کرایا تھا اور اوّل آنے والوں کو انہیں ساری دنیا کا سفر کرانے کا وعدہ کیا تھا اس انعامی مقابلے میں لڑکوں میں مسٹر مائکل گینس اور لڑکیوں میں مس پٹریکا گرشا اوّل آئیں تھیں چنانچہ اعلان کے مطابق یہ دونوں دنیا کی سیر کو نکلے ہوئے ہیں اور ملکوں ملکوں کے نوجوانوں سے ربط قائم کر رہے ہیں دوستی اور تعلقات بڑھا رہے ہیں یہ دونوں اب تک امریکہ اور آسٹریلیا کا دورہ کر چکے ہیں ۔ ہندوستان سے یہ لوگ بیروت جائیں گے ۔

سیٹ رزرو کرانے یا جگہ محفوظ کرانے کا نیا ریکارڈ :-

ہانگ کانگ اور کلکتہ کے درمیان ہوائی سفر کے لیے ۲۵ طالب علموں کی ایک جماعت یا گروپ کے لیے ۴ سال پہلے سیٹیں رزرو کرائی گئی ہے ۔ پھر سمجھے آپ ! یہ گروپ ۲ نومبر ۱۹۷۱ء میں ہوائی سفر کرے گا ۔ ابھی تک زیادہ سے زیادہ دو مہینے پہلے ہوائی جہاز کی سیٹ رزرو کرانے کا رواج تھا ۔ چار سال کی مدت غالباً پوری دنیا کے لیے ایک نیا ریکارڈ ہے ۔

کوئنا نگر کے بعد سسلی :-

سالنامے میں آپ کوئنا نگر کے زلزلے کا حال پڑھ چکے ہیں ۔ بڑی تباہی آئی تھی ۔ سینکڑوں آدمی مرے ایک ہزار کے قریب زخمی ہوئے ، مالی نقصان کروڑوں کا ہوا اور اب پندرہ جنوری کو اٹلی کے ایک مشہور جزیرے سسلی میں زلزلہ آیا ہے ۔ یورپ میں اسکوپ جے (یوگوسلاویہ) کے بعد یہ دوسرا ہیبت ناک زلزلہ آیا ہے ۔ کوپ جے کا زلزلہ ۱۹۶۳ء میں آیا تھا ۔ اس زلزلے میں لگ بھگ ۶۰۰ سو آدمی مرے ہیں ۔ ڈر یہ ہے کہ عمارتوں کے ملبے میں اور بہت سی لاشیں ملیں گی ۔

کہتے ہیں سسلی میں ۱۹۰۸ء کے بعد ایسا شدید زلزلہ آیا ہے گاؤں کے گاؤں کئی قصبے اور شہر بالکل کھنڈر بن گئے ہیں بہت سے شہروں کی عمارتوں کو شدید نقصان پہنچا ہے ۔ آج کل سسلی میں سخت سردی پڑ رہی ہے پارہ صفر سے نیچے ہے ۔ ایسی سخت سردی میں لوگوں نے کھلے میدانوں میں پناہ لی ہے آپ ان بے چاروں کی پریشانی کا اندازہ کیجیے ۔

ادھر مشہور آتش فشاں پہاڑ اِتنا لاوا اُگل رہا ہے یہ لاوہ لگ بھگ آٹھ سو میٹر تک بہتا چلا گیا ہے ۔ اس کے راستے میں جو چیز بھی آئی ہے برباد ہو گئی ہے ۔

اس تباہی و بربادی نے تمام دنیا کو متوجہ کر دیا ہے برطانیہ اور امریکہ کے علاوہ بہت سی چھوٹی بڑی حکومتیں مدد کے لیے دوڑ پڑی ہیں ۔

اب سے لگ بھگ ساٹھ برس پہلے سسلی میں اس سے بھی زیادہ شدید زلزلہ آیا تھا ۔ اس وقت پچاس ہزار آدمی مرے تھے مسینا شہر

بالکل تباہ ہو گیا تھا۔ یہ دسمبر ۱۹۰۸ء کی بات ہے۔

ان زلزلوں نے کروڑوں جانیں لیں:۔

یوں سمجھیے کہ جب سے تاریخ لکھنے کا رواج ہوا ہے۔ دنیا میں ان زلزلوں نے کروڑوں آدمیوں کی جانیں لی ہیں۔ دور کیوں جائیے اسی صدی (۱۹۲۰ء) میں چین کے ایک صوبے کان سو (KANSU) میں ایک لاکھ اسی ہزار آدمی مرے تھے۔

۱۹۲۳ء میں ٹوکیو (جاپان) کے علاقے میں جانی نقصان کے علاوہ مالی نقصان لگ بھگ دس ہزار ملین پونڈ کا ہوا تھا ۱۹۳۴ء میں کوئٹے کے زلزلے میں پچاس ہزار آدمی مرے تھے۔

جنوری ۱۹۳۹ء میں اسی طرح زلزلہ چلی میں آیا تھا یہاں تیس ہزار آدمی مرے تھے۔ اگست ۱۹۴۹ء میں ایکوڈور کے علاقے میں پانچ ہزار جانیں ضائع ہوئی تھیں اور شہروں کو نقصان پہنچا تھا۔

کوپ جے میں ۱۹۶۳ء میں جو زلزلہ آیا تھا اس میں ایک ہزار نو سو بیس جانیں ضائع ہوئیں اور شہر پانچ میں سے چار حصے ملبے کا ڈھیر ہو گیا۔

تین سال پہلے آغادیر (مراکو) کے زلزلے میں بارہ ہزار آدمی مرے اور دو ہی مہینے بعد لار (جنوبی ایران) کے علاقے میں زلزلہ آیا اور ساڑھے تین ہزار آدمیوں کی جان لے کر ٹلا۔

ستمبر ۱۹۶۲ء میں قزوین (شمالی جنوبی ایران) کے علاقے میں دس ہزار آدمی زلزلے کا شکار ہوئے اور اس کے چار سال بعد ورٹو (مشرقی ترکی) میں دو ہزار دو سو بیالیس آدمی مرے۔

پچھلے سال جولائی میں دو شدید زلزلے آئے۔ ایک ادا پازاری (ADAPAZARI) (مغربی ترکی) میں دو سو سے زیادہ آدمی ہلاک ہوئے۔ دوسرا کراکاس (وینیز ویلا) میں پیاسا دو سو ستر آدمی مرے۔

اور پھر دسمبر کے آخر میں کوئٹا نگر میں اور پندرہ جنوری کو سسلی میں کوئٹا نگر میں اور آس پاس کے علاقے میں ہفتی تک اب بھی زلزلے کے جھٹکے محسوس ہوتے ہیں۔ سسلی میں بھی تباہی کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ یوں سمجھئے کہ قیامت سے پہلے قیامت آگئی ہے۔ اسٹیٹس مین

وہ ہنر جسے صرف چالیس لوگ جانتے ہیں:۔

ویس باڈن (ڈاڈ) مصنوعی آنکھیں بنانے کے ہنر کو دنیا کے صرف چالیس کاریگر جانتے ہیں اور اس طرح اس سے زیادہ نادر نایاب دستکاری کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ ایسے ہی بے مثل و یک دست کاریگروں میں سے ایک استادِ فن مغربی جرمنی کے شہر ویس باڈن کے ۶۵ سالہ فرانز کرسٹ بھی ہیں۔ اس فن میں پہلے شیشے کی باریک و نفیس تاروں سے آنکھوں کے ڈیلوں اور پپوٹوں پر قدرتی رگوں اور نسوں جیسی ڈوریاں بنائی جاتی ہیں۔ پھر کالے رنگ کے شیشے کا ایک ننھا سا گول ٹکڑا جوڑ کر پتلی تیار کر دی جاتی ہے۔ اس مقصد کے لیے شیشے بنانے کی جو ترکیبیں استعمال ہوتی ہیں وہ صدیوں سے انہی بنانے والوں کے حلقوں میں سینہ بسینہ محفوظ چلی آتی ہیں۔ فرانز کرسٹ عنقریب ریٹائر ہونے والے ہیں۔ انہوں نے اپنے ایک ملاقاتی کو صرف اتنا بتایا کہ وہ آنکھیں ایک خاص قسم کے دودھ کی طرح گورے چٹے پتھر کے شیشے کو انتہائی بلند درجہ حرارت پر پگھلا کر تیار کرتے ہیں۔

(اطلاعات جرمنی)

نیچے کے دائرے میں سرخ نشان کا مطلب یہ ہے کہ اس مہینے کے بعد آپ کی مدت خریداری ختم ہو جاتی ہے۔

ہمیں امید ہے کہ آپ اپنے پیارے پیامِ تعلیم کی سرپرستی جاری رکھیں گے۔

براہِ کرم مبلغ چھ روپے کا منی آرڈر اس مہینے کی ۲۵ تاریخ تک ہمیں بھیج دیجیے تاکہ یہ سلسلہ قایم رہے۔ آپ کی طرف سے کوئی اطلاع نہ ملی تو ہم سمجھیں گے کہ آپ کو پرچہ پسند نہیں آیا اور افسوس کے ساتھ اسے بند کر دیں گے۔

منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر لکھنا نہ بھولیے۔

آپ کا خریداری نمبر ہے
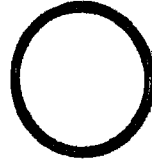
منیجر

اچھے بچوں کے لیے اچھی اچھی کتابیں

مذہب		ناول اور کہانیاں	
ہمارے نبی	۰/۴۰	ستاروں کی سیر	۱/۷۵
آں حضرت	۰/۵۰	بچوں کی کہانیاں	۰/۳۷
ہمارے رسول	۱/۲۰	پرندوں کا ایکا	۰/۲۰
خلفاء اربعہ	۱/۵۰	تانبیل خاں	۰/۳۰
نبیوں کے قصے	۰/۸۰	جنگو کی بلی	۰/۲۵
ارکانِ اسلام	۰/۴۵	چھوٹی لالٹین	۰/۳۱
عقایدِ اسلام	۰/۵۰	چوہوں کی کانفرنس	۰/۴۵
معلومات		چنبیلی	۰/۵۰
		شہزادی گلنار	۰/۴۰
آدمی کی کہانی	۱/۲۵	شہزادی گلفام	۰/۵۰
تاریخ ہند کی کہانیاں		شیدلا	۰/۵۰
(۴ حصے)	۳/۲۵	لال مرغی	۰/۵۰
دہلی	۱/۵۰	مزہ چکھائیں گے	۰/۳۵
دنیا کے بسنے والے	۰/۷۵	ننھا ٹیو	۰/۳۰
دنیا کے بچے	۰/۶۵	ہمت کا پھل	۰/۳۵
سمندر کے کنارے	۱/۳۰	جوہی کی ڈالی	۰/۷۵
سماجی زندگی (۴ حصے)	۲/۹۸	جھوٹا لڑکا	۰/۳۰
مفید معلومات (۴ حصے)	۵/۵۰	زعفران پریوں کے دیس میں	۰/۴۴
گاندھی بابا کی کہانی	۳/۰۰		
میر تقی میر	۱/۰۰	شاہی لباس	۰/۲۵
میر انیس	۱/۲۵	غیر ذمہ دار لڑکا	۰/۵۰

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

پرنٹر پبلشر سید احمد دہلوی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لئے لبرٹی آرٹ پریس دریا گنج دہلی میں آفسٹ پر چھپوا کر جامعہ نگر سے شایع کیا

عقیل الرحمٰن (بمبئی)

No. D. 1457. February, 1968.

Payam -i- Taleem

New Delhi-25.

پیام تعلیم

ڈاکٹر راجندر پرشاد

پیدائش ستمبر ۱۸۸۴ء وفات فروری ۱۹۶۳ء

پیام تعلیم
ایڈیٹر
محمد حسین حسّان ندوی
جلد ۵
شمارہ ۳
مارچ
۱۹۶۸ء
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵
شاخ
اردو بازار
دہلی ۶
شاخ
پرنس بلڈنگ
بمبئی ۳
سالانہ چندہ چھ روپے
فی پرچہ ۶۰ پیسے

کیا پڑھوں ؟ فوٹو جاوید اشرف

فہرست

بچوں سے باتیں

فروری کے قریب قریب سبھی مضمون بچوں کو بہت اچھے لگے۔ شاکرہ ندیم کی کہانی "انوکھا سفر انوکھے ساتھی" بچوں نے دلچسپی سے پڑھی۔ فرزانہ انصاری کے "بچھو" کی ایک بچی (صفیہ خاتون) نے اس طرح داد دی ہے "کاش معلومات کی نصابی کتابوں کے مضمون بھی اتنے ہی دل چسپ ہوتے۔" اسی طرح "حوصلہ مند سپاہی" "لوک کہانیاں" "شکاری بادشاہ" "پہلا انعام" "اقبال مند" بہت پسند کیے گئے۔ اقبال مہدی کے مضمون "ایک دن کیا ہوا" کے بچے منتظر رہتے ہیں۔

نظموں میں حرمت الاکرام صاحب کی "جاڑوں کی دھوپ" اطہر عزیز کی "سردی کا موسم" نسیم شولاپوری کی "سردی کی رات" یوں کہیے کہ وقت کا تحفہ تھیں۔ بچوں نے انھیں مزے لے لے کر پڑھا۔ دوسری نظموں میں "اے وطن" "بلی رانی" "سالنامے کا گیت" وغیرہ بھی پسند کی گئیں۔

اس پرچے میں "کھیدا" والا مضمون یقین ہے کہ آپ کو بہت پسند آئے گا۔ یہ ہم نے خاص طور سے لکھوایا ہے۔ محترمہ صالحہ عابد حسین اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے بہت دنوں سے پیام تعلیم کے لیے کچھ نہ لکھ سکی تھیں۔ اس مرتبہ انھوں نے بھی ایک اچھی سی کہانی مرحمت فرمائی ہے۔ ابن بطوطہ والا مضمون فروری کے پرچے میں نہیں چھپا تھا۔ پیامیوں کا تقاضا ہے کہ یہ سلسلہ جاری رکھا جائے۔ اس پرچے سے اسے پھر شروع کیا جا رہا ہے۔ پنچ تنتر میں اب کے آپ کو زیادہ مزہ آئے گا۔ ایک ہی کہانی میں کئی کئی کہانیاں پڑھیے۔ "پھر تعارف" کے عنوان سے دو مزاحیہ نظمیں اور ایک مزے دار ڈراما "عقل مند آدمی"

ہمارے ننھے پیامیوں کو شکایت تھی کہ پیام تعلیم میں ہمارے مطلب کی چیزیں کم ہوتی ہیں۔ بچیوں کو بھی شکایت تھی۔ ہمیں بھی یہ چیز بہت کھٹکتی تھی۔ اصل میں بچوں کے لیے لکھنا مشکل ہے۔ چھوٹے بچوں کے لیے تو اور بھی مشکل ہے۔ شکر ہے کہ اس سلسلے میں ہماری کوششیں کچھ کچھ کامیاب ہو رہی ہیں۔ محترمہ سلمیٰ جاوید نے مدد کا وعدہ فرمایا ہے۔ ننھے پیامی اس پرچے میں ان کی نظم پڑھیں گے۔ بہت پیاری نظم ہے۔ انشاءاللہ آئندہ بھی اسی طرح کی چیزوں کا سلسلہ جاری رہے گا۔

۱۹۶۷ء کے سالنامے سے ہندوستان کے مجاہدین آزادی پر مضامین کا سلسلہ شائع کرنے کا خیال تھا۔ سالنامے میں ایک مضمون چھپا بھی مگر مضمون نگار صاحب نے اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے آئندہ کے لیے معذرت کر دی اور یہ سلسلہ جوں کا توں رہ گیا ہمیں اس کا بہت افسوس تھا۔ تاہم ہم نے ہمت نہیں ہاری۔ موزوں آدمی کی تلاش جاری رکھی۔ شکر ہے کہ مولوی مقبول احمد صاحب نے ہماری درخواست پر یہ کام اپنے ذمے لے لیا ہے۔

اس پرچے سے یہ سلسلہ پھر شروع کیا جا رہا ہے۔ مولانا نے بھی اپنا سلسلہ حضرت شاہ ولی اللہؒ سے شروع کیا ہے۔

سالنامے پر اپنے پیامیوں کی اور بزرگوں کی کچھ رائیں پچھلے پرچے میں چھپ چکی ہیں مگر ان کا سلسلہ بند نہیں ہوا۔ یہ رائیں اتنی زیادہ آئیں کہ ہمیں حیرت ہوگئی۔ ہمیں امید نہیں تھی کہ ہماری ناچیز کوشش کو آپ اتنا سراہیں گے۔ اس مرتبہ ان بزرگوں کی رائیں زیادہ آئی ہیں جو بے لاگ بات کہنے کے عادی ہیں، کسی کی رو رعایت نہیں کرتے۔ ایک بزرگ جناب وحید الدین خاں صاحب تو اس قدر متاثر ہوئے کہ پورا ایک مضمون لکھ ڈالا، مضمون ہی نہیں ایک برجستہ نظم بھی۔ بہت دلچسپ بہت مزے دار۔ ان کی یہ دونوں چیزیں اسی پرچے میں الگ الگ شائع کی جا رہی ہیں۔

سالنامے کے بعد خریداروں کی تعداد بھی نسبتاً تیزی سے بڑھ رہی ہے یہ اس بات کی علامت ہے کہ پیامی اپنے پرچے کو دن بدن زیادہ پسند کر رہے ہیں۔ پھر بھی ہمیں ابھی اطمینان نہیں۔ آپ کو یہ پرچہ پسند ہے اور یقیناً ہے تو ہم آپ میں سے ہر ایک پیامی سے یہ امید رکھتے ہیں کہ آپ اس کے خریدار بنانے میں زیادہ سے زیادہ جوش و خروش سے کام لیں گے تاکہ اگلے سال ہم آپ کا سالنامہ کہیں زیادہ بہتر کہیں زیادہ شاندار نکال سکیں اور مکتبہ سے ذرا سی بھی مدد لیے بغیر نکال سکیں۔ ہمارا یہ اعلان بھی یاد رکھیے کہ اگر آپ نے پانچ خریدار بنا دیے تو پیام تعلیم آپ کے نام مفت جاری کر دیا جائے گا۔ پورے ایک سال کے لیے!

پیام تعلیم کی اشاعت بڑھانے کے سلسلے میں جو پیامی اور بزرگ ہماری مدد فرما رہے ہیں ان کا ذکر ان صفحوں میں برابر آتا رہتا ہے۔ ابھی ابھی ہمارے منیجر صاحب نے اطلاع دی ہے کہ جناب ظفر عالم صاحب (سری وردھن) نے تین خریدار بنائے ہیں۔ دلی شکریہ! امید ہے کہ ظفر عالم صاحب اپنی کوششوں کو آیندہ بھی جاری رکھیں گے۔

"سالنامے پر رائیں" لکھنے پر جو ہم نے اعلان کیا تھا اس سلسلے میں بہت کم پیامیوں نے توجہ کی ہے۔ لیجیے ہم تاریخ اور بڑھائے دیتے ہیں۔ آپ دس مارچ ۶۸ء تک اپنی رائیں ہمیں بھیج دیں۔

تعلیمی سرگرمیوں کی رودادیں ہمارے پاس زیادہ تر مہاراشٹر سے آتی ہیں۔ پیام تعلیم دوسری ریاستوں کے بہت سے اسکولوں میں بھی جاتا ہے۔ ان اسکولوں کے نگران یا ہیڈ ماسٹر صاحبان بھی اس طرف توجہ فرمائیں اور اپنے اپنے اسکولوں کی تعلیمی و تفریحی سرگرمیوں کا حال ہمیں بھیجتے رہیں تو کتنا اچھا ہو!

نیچے کے دائرے میں سرخ نشان کا مطلب یہ ہے کہ اس مہینے کے بعد آپ کی مدتِ خریداری ختم ہو جاتی ہے۔

ہمیں امید ہے کہ آپ اپنے پیارے پیام تعلیم کی سرپرستی جاری رکھیں گے براہ کرم مبلغ ۶ روپے کا منی آرڈر اس مہینے کی ۲۵ تاریخ تک ہمیں بھیج دیجیے۔ تاکہ یہ سلسلہ قائم رہے۔ آپ کی طرف سے کوئی اطلاع نہ ملی تو ہم سمجھیں گے کہ آپ کو پرچہ پسند نہیں آیا اور افسوس کے ساتھ اسے بند کر دیں گے۔

منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر لکھنا نہ بھولیے۔

آپ کا خریداری نمبر ــــــ ہے۔

"منیجر"

محترمہ صالحہ عابد حسین

بالک ہٹ

وہ عمر کی اس منزل پر پہنچ چکا تھا جہاں بچپن اور نوجوانی پہلے پہل ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں۔ اس بارہ تیرہ سال کے معمول سے زیادہ بلند قامت نوجوان کے تندرست اور سڈول جسم میں گرم خون کی گردش شروع ہو گئی تھی اور وہ اس سن کے سب نوعمر لڑکوں کی طرح اپنے آپ کو کڑیل جوان سمجھنے لگا تھا۔

اور ایک دن جب اسکول سے واپس آتے ہوئے اچانک وہ ٹھوکر کھا کر گر پڑا تو اس نے اپنے گھٹنے کی چوٹ کی ذرا پرواہ نہ کی۔ فوراً کود کر کھڑا ہو گیا۔ اور اپنے پاجامے پر پڑی ہوئی گرد جھاڑنے لگا۔ کہیں اسے کسی نے گرتے ہوئے دیکھ تو نہیں لیا۔ کوئی ہنس تو نہیں رہا۔۔

گھر پہنچا تو چائے تیار تھی اور اس کے ابا امی اور بڑا بھائی اور تینوں چھوٹے بھائی سب کے سب میز کے گرد بیٹھے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ بھی ہاتھ منھ دھو کر خاندان کے خوش دل مجمع میں شامل ہو گیا۔

رات کی دعا پڑھتے وقت اس نے اپنے گھٹنے میں کچھ زیادہ تکلیف محسوس کی۔ مگر اس نے کسی سے ذکر نہیں کیا۔ اتنی سی چوٹ پر ہائے وائے کرنا لڑکیوں کا شیوہ ہے نہ کہ اس جیسے کڑیل جوان کا۔

اگلے دن وہ اٹھا تو ٹانگ کا درد اور بڑھ گیا تھا مگر اس نے اب بھی کسی سے نہیں کہا۔ حسب معمول صبح سب لوگ ساتھ ساتھ سیر کو گئے ناشتہ کیا پھر فارم میں کام کرتا رہا اور دس بجے اسکول چلا گیا۔ واپسی پر ٹانگ کا ورم اور بڑھ گیا۔ اور اب تکلیف سہارنا خاصا مشکل نظر آ رہا تھا۔ مگر یہ اس کی قوت ارادی اور قوت برداشت کی ہتک تھی توہین تھی کہ وہ درد سے ہار مان لے۔ وہ بیماری سے جنگ کرتا رہا اور کسی کو اس کی تکلیف کی خبر نہ ہوئی ہی کہ اُن چاروں بھائیوں کو بھی نہیں جن کے ساتھ وہ ایک ہی کمرے میں سوتا تھا۔ اصل میں وہ امی کو پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ جب سے ان کا ایک بچہ مرا تھا وہ دوسرے بچوں کی بیماری سے بہت پریشان ہو جاتی تھیں۔

چوتھے دن وہ پلنگ سے نہ اٹھ سکا۔ آج اتوار کا دن تھا۔ ابا اور امی سویرے ہی خرید و فروخت کیلیے شہر چلے گئے تھے اور گھر پر بچوں کا راج تھا وہ پلنگ پر لیٹا رہا۔ دوسرے بھائیوں نے کھانا پکایا اور سب نے مل کر لطف سے کھایا۔ وہ تکلیف سے کتنا ہی بے چین ہو پر یہ اسے گوارہ نہ تھا کہ بھائیوں کی خوشی میں کھنڈت ڈالے۔

مگر رات کو جب ابا اور امی شہر سے واپس آئے تو دیکھا کہ وہ تیز بخار میں بھُن رہا ہے اور اس کا پاؤں

گھٹنے سے اوپر تک سوج کر کپا ہو گیا ہے۔

امّی کے دل پر جو کچھ گزری ہو پر پچھلے صدمے نے انھیں اور زیادہ مستقل مزاج بنا دیا تھا۔ انھوں نے فوراً پانی گرم کر کے پاؤں کی سنکائی شروع کر دی اور رات بھر سر پر ٹھنڈے پانی کا کپڑا رکھتی رہیں۔

پرانے دوست اور خاندانی ڈاکٹر نے جب صبح آ کر اس ذہین اور تندرست لڑکے کی یہ حالت دیکھی تو اس کے ماتھے کی لکیریں اور زیادہ گہری ہو گئیں اور چہرے پر فکر و تردّد کے آثار نظر آنے لگے۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ڈاکٹر نے کہا مطلب یہ کہ لڑکے کی جان بچانے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ اس کی ٹانگ کاٹ دی جائے۔"

ڈاکٹر نے اگرچہ یہ الفاظ بہت آہستہ سے کہے تھے مگر وہ — جو نہایت توجہ اور غور سے ڈاکٹر کے ہونٹوں کی حرکت کو دیکھ رہا تھا۔ فوراً اس کا مطلب سمجھ گیا۔ "ہرگز نہیں ڈاکٹر صاحب، میں ہرگز اپنی ٹانگ نہیں کٹواؤں گا۔ میں اپاہج بن کر زندہ رہنا نہیں چاہتا۔ مجھے مرنا منظور ہے مگر اسے برداشت نہیں کر سکتا۔"

"دیر کرنا خطرناک ہے۔ جتنی زیادہ دیر ہوگی ٹانگ کو اور زیادہ اوپر سے کاٹنا پڑے گا۔" ڈاکٹر نے ابّا سے کہا۔

"نہ کبھی نہیں ہرگز نہیں آپ میری ٹانگ نہیں کاٹ سکتے۔" اس کی آواز میں استقلال اور غصے کا رنگ مل چلا تھا۔

امّی نے اپنی چھلکتی ہوئی آنکھیں بیٹے کی طرف گھمائیں سر جھکا لیا۔ ڈاکٹر نے ابّا اور امّی دونوں کو باہر آنے کا اشارہ کیا اور باہر لے جا کر دونوں کو سمجھانے لگا کہ اس کی جان اس قیمت پر بچائی جا سکتی ہے کہ اس کو اپنی ٹانگ سے ہمیشہ کے لیے ہاتھ دھونا پڑے۔ امّی کی آنکھوں سے جھر جھر آنسو بہہ رہے تھے۔ ابا گہری فکر میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اندر سے اس نے آواز دی۔ "بھائی۔ بھیا۔ ذرا مہربانی کر کے میرے پاس آنا۔ بڑا بھائی بھاگتا ہوا چھوٹے مریض بھائی کے کمرے میں داخل ہوا۔

درد اور کرب سے لرزتی ہوئی بلند آواز باہر سنائی دی۔ بھیا اگر میں بے ہوش ہو جاؤں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ اب میں درد کو زیادہ نہیں سہار سکتا ۔ ۔ تو تم مجھ سے وعدہ کرو کہ ان لوگوں کو میری ٹانگ نہ کاٹنے دو گے ۔ ۔ ۔ وعدہ کرو ۔ ۔ ۔ وعدہ کرو بھائی ۔ ۔ ۔"

اور جب وہ کمرے کی طرف بڑھے تو دیکھا کہ چودہ سالہ بڑا بھائی اپنے پورے قد کو تانے دروازے میں کھڑا ہے ۔ ۔ ۔ چھوٹے بھائی کی حفاظت کے لیے۔ اس نے اپنی آنکھیں ڈاکٹر کی آنکھوں میں ڈال دیں۔

"نہیں آپ اس کی ٹانگ کو چھو بھی نہیں سکتے ڈاکٹر صاحب۔"

"لیکن بیٹے ۔ ۔ ۔ ۔ تم جانتے ہو اس کا نتیجہ ۔ ۔ تم بعد میں پچھتاؤ گے اپنی ضد پر۔"

"کچھ بھی ہو ۔ ۔ ۔ ۔ پر میں وعدہ کر چکا ہوں میں نہیں کٹنے دوں گا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں اپنی جان دے دوں گا پر اس کی ٹانگ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نہیں نہیں ۔ ۔ ۔ تم نہیں کاٹ سکتے اسے ۔ ۔ ۔ ۔"

بیمار کی ضد اور دوسرے کی ہٹ دونوں کا مقابلہ کیا جا سکتا تھا اگر ماں باپ یہ سمجھ لیتے کہ بچے کی جان اس صورت میں بچائی جا سکتی ہے کہ اس کی ٹانگ کاٹ دی جائے مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انھیں خود بھی اس کا پورا یقین نہ تھا۔

"ڈاکٹر صاحب! آج رات اور دیکھ لیں ۔ ۔ ۔ شاید اس کی حالت بہتر ہو جائے اور ٹانگ نہ کاٹنا پڑے"

دو دن اور دو رات مسلسل بڑا بھائی چھوٹے

بھائی کے پلنگ کے پاس بیٹھا رہا۔ وہ کھانا کھانے تک کے لیے وہاں سے نہ ہٹا سونا اور آرام کرنا تو بڑی بات ہے۔

جیسا کہ ڈاکٹر کو اندیشہ تھا۔ ٹانگ کا ورم اور بخار زیادہ بڑھ گیا۔ چھوٹا بھائی بالکل بے ہوش پڑا تھا مگر بڑا بھائی اپنی ہٹ پر قائم تھا —— اس لیے کہ وہ بھائی سے وعدہ کر چکا تھا کہ ہرگز اس کی ٹانگ کٹنے نہیں دے گا۔ ۔ ۔ ۔ اس لیے بھائی کا لنگڑے ہو کر زندہ رہنا اس کی موت سے زیادہ بھیانک تھا —— اور سب سے زیادہ اس لیے اس نے امید کا دامن نہیں چھوڑا تھا —— اسے ڈاکٹر سے زیادہ اپنے خدا پر بھروسہ تھا —— وہ ضرور اچھا کر دے گا۔ اس کے پیارے بھائی کو۔

ابا اور امی بے قرار تھے پر ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کریں تو کیا۔ وہ جانتے تھے اگر انھوں نے ڈاکٹر کا کہنا مان لیا تو ان کے دونوں بیٹے زندگی بھر انھیں معاف نہ کریں گے —— چھوٹے کی ہدایت اور بڑے کی ضد —— وہ خوب سمجھتے تھے اپنے بچوں کی طبیعت کو۔

ڈاکٹر آتا اور غصے اور مایوسی سے ہونٹ چباتا اور پاؤں پٹکتا چلا جاتا —— ایک مرتبہ وہ طیش میں پکار اٹھا "یہ قتل ہے صریحی قتل —— میں برداشت نہیں کر سکتا اس کو۔" غصے میں وہ تیزی سے باہر نکل گیا اور دروازہ اس کے پیچھے بند ہو گیا ——

ماں باپ کے دل میں بھی ذرا دیر کے لیے یہ خیال آیا واقعی کیا وہ اپنے ہاتھوں سے اسے مار رہے ہیں۔ دوسرا کوئی علاج کارگر نہیں ہوتا تو کیا ان کا فرض نہیں کہ ڈاکٹر کی ہدایت پر عمل کریں اور اسے ٹانگ کاٹنے کی اجازت دے دیں۔

لیکن اچانک —— تینوں کے دل میں ایک ہی وقت ایک اور خیال آیا۔ کیا وہ خدا پر بھروسا چھوڑ بیٹھے صرف ڈاکٹر پر بھروسا کر رہے ہیں۔ کیا وہ اس کے دادا کی بیماری کا واقعہ بھول گئے جب سب ڈاکٹروں کے خیال کے برخلاف وہ اچھے ہو گئے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ کیا خدا کے لیے یہ مشکل ہے کہ وہ اسے اچھا کر دے۔

وہ تینوں حضورِ قلب اور اعتماد کے ساتھ پلنگ کے پاس ہی دوزانو ہو کر اس کی صحت اور سلامتی کے لیے اپنے رب سے دعا مانگ رہے تھے۔ مایوسیوں کا آخری سہارا اسی قادرِ مطلق کی ذات ہے۔

ماں اور باپ بڑا بھائی اور چھوٹے بھائی سب کے سب صبح و شام دن اور رات پروردگار سے اس کی صحت کے لیے دعا مانگتے رہے اور ایک دن اور ایک رات —— اس امید و بیم کی حالت میں کٹ گئی۔

اگلے دن ڈاکٹر نے آکر جب اس کی ٹانگ کا معائنہ کیا تو امید کی ہلکی سی ایک کرن اس کی آنکھوں میں چمکی —— ورم برابر اتر رہا تھا۔

اگلے دن وہ آنکھیں کھولے مسکرا رہا تھا اور سارا خاندان بارگاہ ایزدی میں سجدۂ شکر ادا کر رہا تھا —— ڈاکٹر سوچ رہا تھا اس کی تندرستی کی وجہ کیا ہے۔ یہ کوئی معجزہ تھا جو دعاؤں سے ظہور میں آیا یا ان دونوں بھائیوں کی بالک ہٹ کی لاج خدا کو رکھنی منظور تھی یا مریض کی قوت ارادی اور قوت برداشت کا کرشمہ تھا۔ یا خود اس کی غلطی۔

اور پورے خاندان کے لیے، ڈاکٹر کے اور سب سے زیادہ بڑے بھائی کے لیے وہ دن کیسا روشن، کیسا حسین، کتنا پرمسرت تھا۔ جب تین ہفتہ بعد وہ زرد اور کمزور لیکن ہمت اور استقلال کی زندہ مورت، اپنی دونوں ٹانگوں پر کھڑا مسکرا رہا تھا۔

ڈاکٹر کے چہرے پر اطمینان تھا۔ امی اور ابا کی

باقی صفحہ ۱۱۸

مُنّا بابو

محترمہ سلمیٰ جاوید

آؤ دکھاؤں اپنی پٹاری
چیزیں ہیں کیا نیاری پیاری
جان کو اپنی یوں کھوتے ہو؟
مُنّا بابو کیوں روتے ہو؟ اوں اوں، اوں اوں، اوں اوں، ـــــ اوں

دیکھو یہ مٹی کا بندر
بیٹھا ہوا ہے بن کے مچھندر
پاس کوئی جب اس کے آئے
مُنہ پھیلا کر شور مچائے، خوں خوں، خوں خوں، خوں خوں، ـــــ خوں

دیکھو کتنا اچھا باجا!
سب باجوں میں ہے یہ راجا
منہ میں لگا کر پھونک جو مارے
کیا پیاری آواز نکالے، پوں پوں، پوں پوں، پوں پوں ـــــ پوں
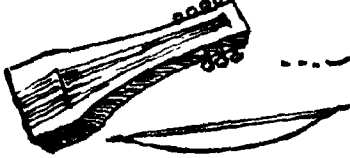
یہ تو اک سارنگی ہے
پیٹ اس کا نارنگی ہے
دل کی گرہ کو کھولے گی
اور یوں رو کر بولے گی، رؤں رؤں، رؤں رؤں، رؤں رؤں ـــــ رؤں

یہ تو روئی کی گڑیا ہے
پوپلی ہے اور بڑھیا ہے
جب بھی یہ سو رہتی ہے
خراٹے یوں بھرتی ہے، گھوں گھوں، گھوں گھوں، گھوں گھوں ـــــ گھوں

دیکھو ربڑ کی یہ چڑیا
منہ ہے کتنا اچھا سا
پیٹ ذرا گر دب جائے
منہ سے تب آواز آئے، چوں چوں، چوں چوں، چوں چوں ـــــ چوں

لمبی گاڑی ہے یہ ریل
دیکھو گے کچھ اس کا کھیل
یہ فراٹے بھرتی ہے
اور منہ سے یوں کرتی ہے، شوں شوں، شوں شوں، شوں شوں ـــــ شوں

کھیدا

جناب مجیب احمد خاں

جانوروں کی دنیا میں ہاتھی کو ایک خاص حیثیت حاصل ہے۔ یہ حیثیت اس کو اپنے دیو قامت جسم، بے حساب طاقت اور سمجھ بوجھ کی بدولت حاصل ہوئی ہے۔ اس کی انہی خوبیوں نے انسان کو اپنی طرف متوجہ کیا اور آدمی نے ہاتھی کو پکڑنے، سدھانے اور اپنے کام میں لانے کے جتن کیے۔

ہندوستان میں پچھلے دو ڈھائی ہزار برس سے ہاتھیوں کو پکڑنے اور سدھانے کے مختلف طریقے رائج ہیں۔ اس عرصے میں ہزار ہا ہاتھی جنگل سے پکڑے گئے، ان کو سدھایا گیا اور ان سے طرح طرح کے کام لیے گئے۔ امن اور جنگ دونوں صورتوں میں انسان کی جو خدمت ہاتھی نے انجام دی ہے وہ کسی دوسرے جانور کے بس کی بات نہیں۔

ہاتھی کو پکڑنے کا پہلا اور سب سے پرانا طریقہ

اس طریقے میں ہاتھیوں کے روز آنے جانے والے راستے پر V شکل کی دس بارہ فٹ گہری، اتنی ہی لمبی اور ۸ فٹ چوڑی خندق کھود دی جاتی ہے۔ اسے پتلی اور کمزور لکڑیوں سے پاٹ دیا جاتا ہے اور پھر اس کے اوپر گھاس اور مٹی اس طرح بچھا دی جاتی ہے کہ وہ ہموار زمین معلوم ہوتی ہے۔ دیکھنے والا یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہاں کوئی خندق بھی ہے۔

جب کوئی ہاتھی ادھر سے گزرتا ہے تو خندق کا پٹاؤ اس کے بوجھ کو نہیں سنبھال پاتا اور بے چارہ ہاتھی اس میں گر جاتا ہے۔ خندق گاؤدم اور گہری ہوتی ہے اس لیے ہزار کوشش کے باوجود ہاتھی باہر نہیں نکل پاتا۔ کئی دن تک اس کو بھوکا پیاسا خندق میں پڑا رہنے دیتے ہیں۔ پھر ایک آدمی ہر روز اس کو تھوڑا بہت کھانا دینا شروع کرتا ہے۔ جب ہاتھی اس آدمی سے مانوس ہو جاتا ہے تو خندق کو چوڑا کر کے ہاتھی کو باہر نکال لیتے ہیں اور سدھے ہوئے ہاتھیوں کی مدد سے اس کو فیل (ہاتھی) خانے میں لے جاتے ہیں جہاں آہستہ آہستہ اس کو سدھا لیا جاتا ہے۔ لیکن یہ طریقہ کچھ اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ خندق میں گرنے سے ہاتھی کے سخت چوٹ لگتی ہے۔ اکثر ہاتھ پیروں کے [illegible] اتر جاتے ہیں کبھی کبھی تو

ہاتھ یا پیر کی ہڈی بھی ٹوٹ جاتی ہے اور سب کیا کرایا بے کار ہو جاتا ہے اس لیے اب اس طریقے کو صرف پاگل یا خطرناک ہاتھی کو پکڑنے کے لیے کام میں لاتے ہیں۔

دوسرا طریقہ

ہاتھی کو املی بہت پسند ہے اس لیے پکی ہوئی املی میں بہت سی افیم یا اور کوئی نشہ آور چیز ملا دی جاتی ہے اور اُس کے بڑے بڑے لڈو بنا کر جنگل میں اس جگہ ڈال دیتے ہیں جہاں ہاتھی رہتے ہیں۔ ان لڈوؤں کو کھا کر ہاتھی افیمچی کی طرح پینک میں آجاتا ہے اور اتنا غفیل ہو کر کہیں پڑ رہتا ہے۔ اسی حالت میں لوگ اس کو رسیوں سے جکڑ دیتے ہیں اور پھر آہستہ آہستہ سدھا لیتے ہیں۔

تیسرا طریقہ

جنگلی ہاتھیوں کو پکڑنے کے لیے کچھ ہاتھی خاص طور پر سدھائے جاتے ہیں۔ ان سدھے ہوئے ہاتھیوں کو "کُمکی" کہتے ہیں۔ کمکی ہاتھیوں کو جنگل کے کسی ایسے راستے کے کنارے جو جنگلی ہاتھیوں کی گزرگاہ ہوتی ہے، تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چھپا کر کھڑا کر دیتے ہیں۔ پھر کسی جنگلی ہاتھی کو گھیر کر اُسی راستے پر لایا جاتا ہے جب یہ ہاتھی پہلے کمکی کے سامنے سے گزرتا ہے تو کمکی اس کے پیچھے دوڑتا ہے اور اس کو کھدیڑتا ہوا آگے کی طرف لے جاتا ہے یہاں تک کہ دوسرے کمکی کی جگہ آجاتی ہے۔ اب پہلا کمکی رک جاتا ہے اور دوسرا کمکی جنگلی ہاتھی کے پیچھے لگ لیتا ہے۔ اس طرح باری باری ہر کمکی جنگلی ہاتھی کو میلوں کھدیڑتا چلا جاتا ہے۔ بے چارہ جنگلی ہاتھی آخر کار تھک کر نڈھال اور بے دم ہو جاتا ہے۔ اس حالت میں اس کو رسیوں سے باندھ کر کمکی ہاتھیوں کی مدد سے فیل خانے میں لے آتے ہیں اور سدھا کر کام پر لگا لیتے ہیں۔

ان طریقوں کے علاوہ جنگلی ہاتھی پکڑنے کے کئی اور طریقے بھی ہیں لیکن سب سے اچھا اور کامیاب طریقہ وہ ہے جسے "کھیدا" کہتے ہیں۔ اس طریقے سے ہاتھی نہ صرف صحیح سالم حالت میں پکڑ لیا جاتا ہے بلکہ ایک ہی وقت میں بہت سے ہاتھی ہاتھ آجاتے ہیں۔

"کھیدا" ہندی لفظ ہے اس کا مطلب ہے "خندق یا کھائی"۔ اب یہ لفظ جنگلی ہاتھی پکڑنے کے ایک خاص طریقے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جب اس طریقے سے ہاتھی پکڑنا چاہتے ہیں تو کسی ایسے جنگل میں جہاں ہاتھی کثرت سے ہوتے ہیں، چھ سات ایکڑ زمین کو، تھوڑی جگہ چھوڑ کر اس V شکل کی کھائی سے گھیر لیا جاتا ہے۔ یہ کھائی آٹھ نو فٹ گہری، اوپر سے اتنی ہی چوڑی اور نیچے صرف دو یا ڈیڑھ فٹ چوڑی رکھی جاتی ہے۔ اس کھائی کے ساتھ ساتھ موٹے موٹے لٹھے بڑی مضبوطی سے پاس پاس گاڑ دیے جاتے ہیں۔ ان لٹھوں کو موٹی موٹی رسیوں سے آپس میں خوب مضبوط باندھ دیا جاتا ہے۔ اس طرح لٹھوں کی ایک مضبوط دیوار بن جاتی ہے۔ اس کی اونچائی زمین سے دس بارہ فٹ ہوتی ہے۔

اس گھیرے دار دیوار میں جو جگہ خالی چھوڑی جاتی ہے وہاں لٹھوں کا بنا ہوا ایک ایسا دروازہ لگایا جاتا ہے جو رسیوں کے ذریعہ آسانی سے اٹھایا گرایا جا سکے۔ لٹھوں کی دیوار کو ہری بھری شاخوں اور پتوں سے چھپا دیا جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہونے لگتا ہے جیسے ایک کھلا ہوا میدان گھنے جنگل سے گھرا ہو۔

دروازے کے دونوں طرف کے کھمبوں سے باہر کی طرف پھیلی ہوئی کافی دور تک، لٹھوں کی دو اور دیواریں قیف کی شکل میں کھڑی کر دی جاتی ہیں۔ ان دیواروں کو بھی شاخوں اور پتوں سے

چھپا دیا جاتا ہے۔ اس کی شکل کچھ اس طرح بن جاتی ہے۔ اسی کو کھیدا کہتے ہیں۔

لٹھوں سے بنی ہوئی کھیدے کی دیوار

کھیدا

دوسرا گھیرا جس میں لاکر ہاتھیوں کو گرفتار کیا جاتا ہے

اٹھنے گرنے والا دروازہ

دروازہ
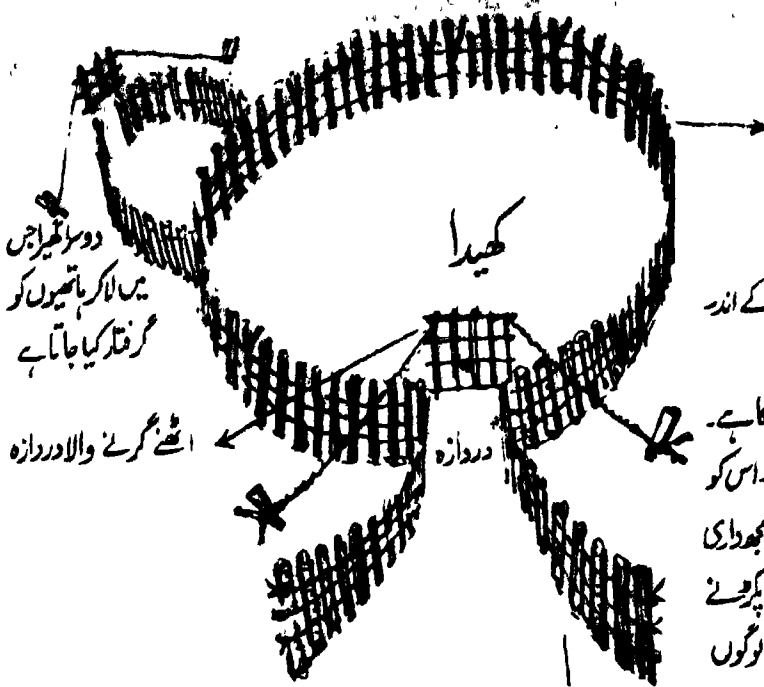
کھیدا تیار ہو گیا ——— اب اس کے اندر جنگلی ہاتھیوں کو کیسے لایا جائے؟

یہ کام بڑی ہوشیاری اور چالاکی کا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہاتھی بڑا سمجھ دار جانور ہے۔ اس کو اس جال کے اندر لانے کے لیے اور بھی زیادہ سمجھ داری اور مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ کام ہاتھی پکڑنے والے تجربے کار لوگوں کی نگرانی میں تربیت یافتہ لوگوں کی مدد سے کیا جاتا ہے۔

جب کھیدے کی تعمیر کا کام مکمل ہو جاتا ہے تو اچھے موسم اور مناسب وقت پر ہزاروں تربیت یافتہ آدمیوں کی ٹولیاں بیسیوں میل لمبے چوڑے جنگل میں پھیلا دی جاتی ہیں۔ یہ ٹولیاں دن رات کی محنت، ہوشیاری اور چوکسی سے ہاتھیوں کے چھوٹے چھوٹے جھنڈوں کو آہستہ آہستہ کھیدے کے قریب کے جنگل میں جمع کر لیتی ہیں۔ یہ کام اتنے خاموش اور غیر محسوس ڈھنگ سے کیا جاتا ہے کہ بے چارے ہاتھیوں کو پتہ بھی نہیں چل پاتا کہ وہ کسی سازش کا شکار بننے والے ہیں۔

جب کھیدا کرنے والے ذمہ داروں کو یہ یقین ہو جاتا ہے کہ تمام ہاتھی کھیدے کے قریب کے جنگل میں اکٹھے ہو گئے ہیں تو پورا علاقہ ان کو چاروں طرف اس طرح گھیر لیتا ہے کہ

صرف کھیدے کی سمت جانے کا راستہ کھلا رہے۔ اس کے بعد مقررہ وقت پر ہاتھوں میں جلتی ہوئی مشعلیں لیے ہوئے لوگ ہر طرف سے ڈھول کھٹکھٹے اور بگل بجاتے اور بندوقوں کے ہوائی فائر کرتے کھیدے کی طرف بڑھنا شروع کرتے ہیں۔ اس شور و غل سے پریشان ہو کر ہاتھی ادھر ادھر بھاگ نکلنے کی کوشش کرتے ہیں مگر ہر طرف انھیں وہی ہڑبونگ اور خطرہ نظر آتا ہے۔ مجبوراً وہ آہستہ آہستہ کھیدے کی طرف بڑھنے لگتے ہیں کیوں کہ یہی راستہ بچ نکلنے کا نظر آتا ہے۔ جب سب ہاتھی کھیدے کی قیف نما دیواروں کے قریب پہنچ جاتے ہیں تو چاروں طرف سے اور زیادہ شور و غل کرتے اور بندوقیں چھوڑتے لوگ ایک ساتھ ہلہ بول دیتے ہیں۔ بے چارے ہاتھی چیختے چلاتے، ہوا میں سونڈیں اٹھائے حیران و پریشان کھیدے کی طرف بے تحاشا بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ کھیدے کے اندر داخل ہوتے ہی ان کو کھلا میدان

پیام تعلیم

دکھائی دیتا ہے۔ وہ اطمینان کی سانس لیتے ہیں اور سامنے نظر
آنے والے جنگل میں گھس کر غائب ہونے کے لیے آگے بڑھتے
ہیں ـــــ مگر یہ کیا؟ یہ تو کھیدے کی دیوار ہے جس نے ان
کا راستہ روک لیا ہے۔ پیچھے لوٹتے ہیں۔ اے لیجیے وہ راستہ بھی
جس سے وہ داخل ہوئے تھے غائب تھا ـــ دروازہ گرایا
جا چکا ہے۔ اب ان کے چاروں طرف لٹھوں کا بنا ہوا ایسا
جنگل ہے جس سے باہر نکلنا ان کے بس کی بات نہیں۔ کھیدے
کے اندر آئے ہوئے سب ہاتھی گھر گئے۔ بے چارے اپنی اپنی سونڈیں
اٹھائے، کان پھٹپھٹاتے بدحواسی کے عالم میں اِدھر سے اُدھر
بھاگتے دوڑتے ہیں مگر نکلنے کا راستہ نہ اِدھر نظر آتا ہے نہ اُدھر۔

دوسری طرف ان لوگوں کی خوشی کا کیا پوچھنا جنھوں
نے دن رات ایک کرکے اور جان کی بازی لگا کر ان دیو پیکروں
کو قید کیا ہے۔

ہاتھی گھر گئے مگر اب ان کو قابو میں کیسے لایا جائے؟
اس کام میں ہاتھیوں کو کھیدے میں لانے سے بھی زیادہ
تجربے، ہوشیاری اور مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس میں وقت
بھی بہت لگتا ہے۔

ایک ضروری بات تو بتانا بھول ہی گئے ـــــــ
کھیدے کی دیوار سے ملا ہوا چالیس پچاس فٹ قطر کا لٹھوں سے
بنا ہوا ایک بہت مضبوط گھیرا اور بھی بنایا جاتا ہے۔ اس گھیرے
میں اٹھنے گرنے والے دو دروازے رکھے جاتے ہیں۔ ایک تو
اس گھیرے کی دیوار میں جس کے ذریعہ باہر سے گھیرے کے اندر
داخل ہوا جا سکے اور دوسرا گھیرے اور کھیدے کی مشترک
دیوار میں۔

جب ہاتھیوں کو گھیرے میں آئے ہوئے دو تین دن
گزر جاتے ہیں تو مشترک دیوار کا دروازہ تھوڑی دیر
کے لیے آہستہ سے اٹھا دیا جاتا ہے۔ کھیدے
کے اندر چکر لگاتے ہوئے ہاتھیوں میں سے دو ایک ہاتھی جیسے
ہی اس دروازے میں سے گھیرے کے اندر داخل ہوتے ہیں،
دروازہ گرا دیا جاتا ہے۔ اب باہر والا دروازہ کھلتا ہے۔
اس دروازے میں سے سدھے ہوئے کُمکی ہاتھی داخل ہوتے ہیں۔
یہ دروازہ بھی گرا دیا جاتا ہے۔ ان کمکی ہاتھیوں کی پیٹھ سے تجربہ کار
مہاوت چپکے ہوتے ہیں۔ مہاوتوں کے کپڑے ہاتھی کے رنگ
سے ملتے جلتے ہوتے ہیں۔ دور سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے
وہ آدمی نہیں، کمکی کے جسم کا ہی حصہ ہیں۔ اب ایک ایک جنگلی
ہاتھی کو دُو دُو کمکی ہاتھی آہستہ آہستہ گھیرے کی دیوار کے قریب
لے آتے ہیں اور اس کو اپنے بیچ میں بھینچ کر اس طرح دبا لیتے ہیں
کہ بے چارہ جنگلی ہاتھی نہ آگے بڑھ سکتا ہے نہ پیچھے ہٹ سکتا
ہے۔ اسی لمحے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ایک مہاوت کمکی کی پیٹھ
سے اتر کر زمین پر آتا ہے اور پلک جھپکتے میں رسّی کا مضبوط
پھندا جنگلی ہاتھی کے پچھلے اور اگلے پیروں میں ڈال کر دیوار
کے مضبوط لٹھے سے باندھ دیتا ہے۔ کمکی ہاتھی خوب جانتے
ہیں کہ اس وقت ان کا مہاوت کیا کر رہا ہے اس لیے وہ ایسی
حرکتیں کرتے رہتے ہیں جس سے جنگلی ہاتھی کی تمام توجہ ان ہی
کی طرف لگی رہتی ہے۔ اس بے چارے کو پتہ بھی نہیں چل پاتا
کہ اس کے ہاتھ اور پیر کب باندھ دیے گئے۔

بس اس طرح ایک ایک دُو دُو کرکے کھیدے
کے تمام ہاتھیوں کو چھوٹے گھیرے میں لاکر گرفتار کر لیا جاتا
ہے اور کھیدے کا کام پورا ہو جاتا ہے۔

اب مسئلہ آتا ہے ہاتھیوں کے سدھانے کا۔ یہ
کام اور بھی زیادہ مشکل اور صبر آزما ہے۔

کئی روز تک ان جنگلی ہاتھیوں کو بھوکا پیاسا رکھا
جاتا ہے۔ بھوک اور پیاس کے مارے ان کا برا حال
ہو جاتا ہے۔ مضبوط رسّوں سے زور آزمائی

کرتے کرتے بے چارے نڈھال اور کمزور ہو جاتے ہیں۔ اس وقت سدھانے والے ہوشیار اور تجربہ کار مہاوت ان کے قریب آنا شروع کرتے ہیں اور طرح طرح کی مزے دار چیزیں ان کو کھانے کے لیے دیتے ہیں۔ ہر ہاتھی کا کوئی نہ کوئی نام بھی رکھ دیا جاتا ہے۔ جب مہاوت اس کے پاس جاتا ہے تو اسی نام سے اس کو مخاطب کرتا ہے۔ آہستہ آہستہ جنگلی ہاتھی ان سے مانوس ہو جاتے ہیں۔ مہاوتوں اور ہاتھیوں کا درمیانی فاصلہ دن بدن کم ہونے لگتا ہے اور
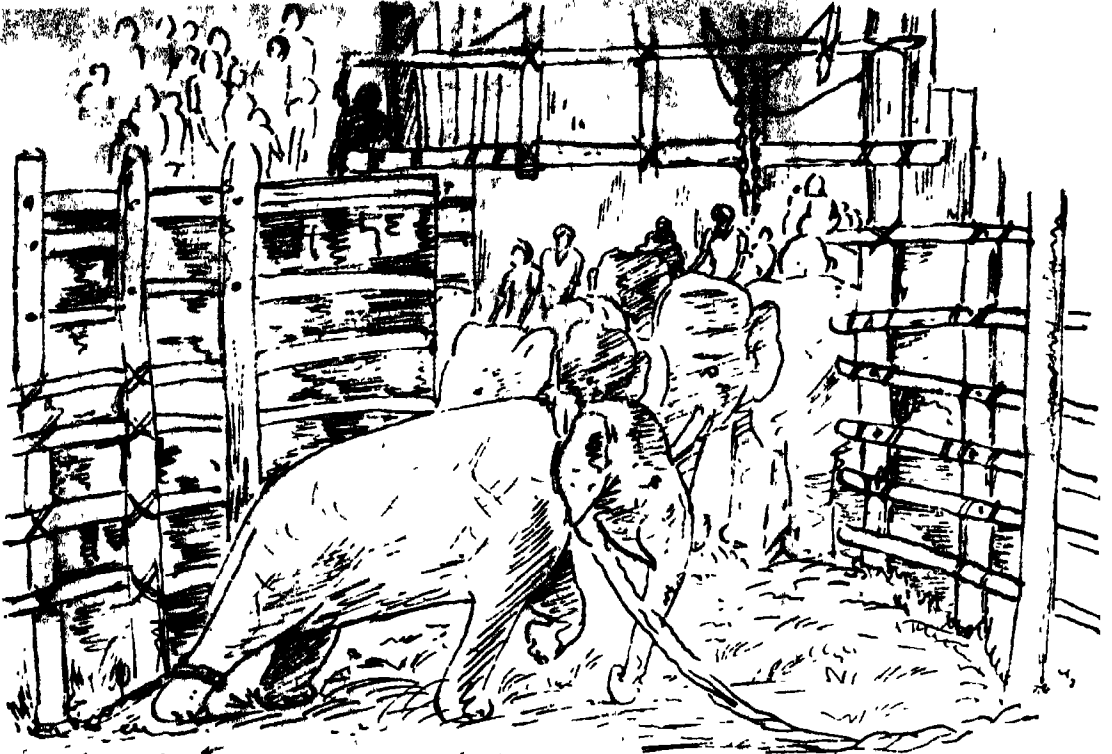
بالآخر ایک دن وہ بھی آ جاتا ہے جب جنگلی ہاتھی مہاوت کو اپنا جسم چھونے اور سونڈ سہلانے کی اجازت دے دیتے ہیں۔۔۔ دونوں میں محبت کا رشتہ قایم ہو جاتا ہے اور رفتہ رفتہ یہ دوستی پکی ہو جاتی ہے۔

اب پیروں کی رسیاں کھول دی جاتی ہیں اور ان کو کُمکی ہاتھیوں کی نگرانی میں روزانہ تالاب پر لے جایا جاتا ہے جہاں وہ سب مل کر نہاتے اور خوش ہوتے ہیں جب اس طرح کافی دن گزر جاتے ہیں تو ان کو فیل خانوں میں لے آیا جاتا ہے، جہاں ان کو مختلف کاموں کی تربیت اور ٹریننگ دی جاتی ہے جنگلی ہاتھی اب جنگلی نہیں رہتے بلکہ ان کا رشتہ انسان سے ہمیشہ کے لیے قایم ہو جاتا ہے۔

چلتے چلتے آپ کو یہ بھی بتا دیں کہ ہمارے دیس کی ریاست میسور کے جنگلوں میں ہاتھی بہت پائے جاتے ہیں اور ہر آٹھ دس سال کے بعد سرکاری طور پر کھیدے کے ذریعے ہاتھی پکڑے جاتے ہیں۔

سدھے ہوئے ہاتھیوں کی
مدد سے جنگلی ہاتھیوں کو
قابو میں لایا جا رہا ہے ۔

اس طریقے سے باقاعدہ طور پر ہاتھی پکڑنے کا کام حیدر علی نے اٹھارویں صدی میں شروع کیا تھا مگر اس کو اس میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ انیسویں صدی کے وسط میں انگریزوں نے بھی ایک کوشش کی مگر وہ بھی ناکام رہی۔ ۱۸۷۳ء میں جی۔ پی سینڈرسن نے بڑے اہتمام اور انتظام کے ساتھ کھیدے کا پروگرام بنایا جس میں اس کو بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کے بعد سے کھیدے کے طریقے کو بہتر سے بہتر بنانے کی مسلسل کوششیں کی جانے لگیں۔ جب سے اب تک سب ملا کر کوئی ۲۴ کھیدے کیے گئے جن میں لگ بھگ ۲۰۰۰ ہاتھی پکڑے جا چکے ہیں۔

آخری کھیدا اسی سال جنوری میں ہوا تھا جس میں ۴۷ ہاتھی پکڑے گئے۔ ان میں ۸ بڑے بڑے دانتوں والے نر ہاتھی تھے۔

ہاتھیوں کے پکڑنے کے اس منظر کو دیکھنے کے لیے ریاستی سرکار کی طرف سے بہت معقول انتظام کیا گیا تھا۔ دنیا کے کونے کونے سے دو ہزار سے زیادہ سیاح اور جنگلی جانوروں کی زندگی سے دلچسپی رکھنے والے لوگ اس حیرت انگیز تماشے کو دیکھنے آئے تھے۔ کہتے ہیں کہ اس تماشے کو دیکھنے کی فیس

پانچ سو روپے فی کس رکھی گئی تھی۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ سرکار نے اس کھیدے پر لگ بھگ سات لاکھ روپے خرچ کیے۔

جناب اعجاز اختر

راجندر بابو

لوگ راجندر بابو کو کئی ناموں سے جانتے ہیں۔ زیادہ تر تو انھیں بابو کہتے ہیں۔ ہاں پڑھے لکھے ڈاکٹر راجندر پرشاد کہتے ہیں۔ وہ سادگی کا مجسمہ تھے۔ ان کو کسی نے کبھی کسی پر ناراض ہوتے نہیں دیکھا۔

ایک بار گاندھی جی نے کہا تھا "اس دیش میں ایک آدمی ہے اگر میں اس کو زہر کا پیالہ بھی دے دوں اور کہوں کہ پی لو تو وہ بغیر پوچھے کچھے پی لے گا۔ اس آدمی کا نام ہے راجندر پرشاد"

گاندھی جی کو ان پر اتنا بھروسہ تھا۔ راجندر بابو بھی ان کو بہت مانتے تھے۔

گاندھی جی سے راجندر بابو کی پہلی ملاقات کا قصہ بڑا مزے دار ہے۔ پٹنہ کے ایک شاندار محل کے پھاٹک پر اندھیری رات میں ایک گاؤں کا آدمی آیا۔ کھادی کے کپڑے پہنے لاٹھی لئے دوپٹہ باندھے۔ سیدھا سادھا سا۔ محل کا سنتری کہنے لگا "تو اس وقت بابو سے نہیں مل سکتا نہ یہاں ٹھہر سکتا ہے۔"

وہ آدمی نہ اندر جا پایا نہ پھاٹک پر ٹھہر سکا۔ پاس ہی کنویں کے چبوترے پر چادر اوڑھ کر لیٹ گیا۔ سردیوں کی ٹھنڈی رات جیسے تیسے گزری اور ادھر سورج نکلا اور ادھر وہ کوٹھی کے دروازے پر کھڑا تھا۔

سنتری نے کہا "ذرا ہٹ کر کھڑا ہو، تو اندر سے بلانے پر ہی اندر جا سکتا ہے۔" وہ سیدھا آدمی ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اتنے میں اندر سے ایک کار باہر نکلی۔

گاؤں کا سیدھا سا آدمی اس طرف دیکھنے لگا۔ کار میں ایک صاحب بیٹھے تھے جو نہایت قیمتی لباس پہنے ہوئے تھے یہ راجندر بابو تھے۔ انھوں نے گاؤں کے آدمی کو دیکھا۔ کار رکی اور سنتری سے پوچھا۔ یہ گاؤں والے کون ہیں؟"

سنتری بولا "بابو یہ رات بھی آیا تھا اور صبح سے ملنے کی راہ دیکھ رہا ہے۔

راجندر بابو نے دھیان سے ادھر دیکھا۔ موٹر سے نیچے اترے اور ان کی طرف بڑھے۔ گاؤں والا بھی ان کی طرف چلا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پہچانا۔ سلام ہوئی پھر بابو نے کہا۔ "میں نے آپ کا انتظار رات کو بھی کیا۔ آپ کب آئے؟"

اس نے کہا "رات کو اسٹیشن سے سیدھا یہیں آیا اندر آنے سے مجھے روک دیا گیا تو پاس والے کنویں پر رات بتائی اور ملاقات کے لئے پھر یہاں آکر کھڑا ہو گیا۔"

راجندر بابو سکتے میں آ گئے۔ دونوں ساتھ ساتھ پیدل ہی کوٹھی کی طرف گئے۔ وہ گاؤں والا سیدھا سادھا آدمی اور کوئی نہیں مہاتما گاندھی تھے۔ یہ بابو کی باپو سے پہلی ملاقات تھی۔ اس کا راجندر بابو پر بہت گہرا اثر ہوا جن کی وجہ سے باپو کو اتنی تکلیف اٹھانا پڑی۔ وہ سارے ٹھاٹ باٹ راجندر بابو نے اسی وقت چھوڑ دیئے اور سادگی کو اپنا ایمان بنا لیا۔

دوسرا واقعہ ہے صداقت آشرم کا۔ آزادی سے پہلے راجندر بابو اسی جگہ رہتے تھے ایک دن انھوں نے اپنی تقریر میں کہا۔

کمانے والے کو کمائی میں پہلا حق ہونا چاہیئے۔۔ درخت لگانیوالے کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ پہلے اپنی پسند کے پھل کھائے۔ آشرم میں بہت سے بچے بھی یہ باتیں سن رہے تھے۔ یہ بچے وہیں رہتے تھے۔ ایک بچہ بڑا شریر تھا۔ اس نے راجندر بابو کا امتحان لینے کی ٹھانی۔

راجندر بابو جب صبح منہ ہاتھ دھوتے تب آشرم کا کوئی بچہ نیم کی تازہ مسواک توڑ کر لا دیتا تھا۔ یہ ایک معمول سا بن گیا تھا۔ اس دن اس شریر بچے نے یہ کام اپنے ذمے لے لیا۔ اس نے مسواک کے لیے دو ڈنڈیاں توڑیں۔ ایک سیدھی اور ایک ٹیڑھی میڑھی۔ دونوں کو اس نے راجندر بابو کے سامنے پیش کیا۔

ٹیڑھی مسواک اس کے ہاتھ سے اٹھاکر چباتے ہوئے راجندر بابو بولے۔

"بیٹا! یہ تم نے توڑی ہیں اس لیے اچھی مسواک سے تم دانت صاف کرو۔"

بابو کی بات سننا تھی کہ بچہ رونے لگا۔ بڑی دیر بعد بولا۔

"بابو میں گنہگار ہوں۔ نیچ ہوں۔ مسواک دینے کے بہانے میں نے آپ کا امتحان لینے کی ٹھانی تھی۔"

راجندر بابو اس کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے بولے۔

"شاباش۔! تمھارا امتحان لینے کا طریقہ بہت نرالا ہے۔"

ایسے تھے ہمارے ہندوستان کے پہلے صدر۔ جو ۳ دسمبر ۱۸۸۵ء کو پیدا ہوئے اور ۲۸ فروری ۱۹۶۳ء کو ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔

جناب
اطہر عزیز

کسان

نہیں ہے یہ کوئی کہانی جہاں کی
یہ ہے زندگی دیس کے نوجواں کی
وہ لائے جہاں میں خوشی کا سویرا
مگر اس کے گھر میں اندھیروں کا ڈیرا
میسر اسے کوئی راحت نہیں ہے
زمانے سے پھر بھی شکایت نہیں ہے
غموں سے یہ مانا بہت چور ہے وہ
مگر پھر بھی دیکھو تو مسرور ہے وہ
مشقت و محنت ہے گر کام اس کا
زمانے کی خدمت ہے پیغام اس کا
لٹا کر پسینوں کے موتی جبیں سے
اگاتا ہے سونا وہ بنجر زمیں سے
فقط کام کرنے کو رہتا ہے بے کل
ہوئی صبح اور چل پڑا لے کے وہ ہل
یہ ممکن نہیں کوئی رہ جائے بھوکا
بہادے گا ایک ایک قطرہ لہو کا
ہے اس کے ہی دم سے یہ رونق جہاں میں
اسی کا ہے ڈنکا زمیں آسماں میں
ہے جب تک کہ باقی یہ جسم اور یہ جاں
کبھی بھول سکتے نہیں اس کا احساں

عقلمند آدمی

جناب م۔ ندیم

(انور، داروغہ اصطبل، سپاہی، وزیر اور مسخرہ وغیرہ)

(پہلا منظر)

(شام کا وقت باغ کا ایک حصہ انور ٹہل رہا ہے)

انور ۔ (اپنے آپ سے) یہاں کتنا سکون ہے شہر کے مقابلہ میں۔ کسی نے سچ کہا ہے۔ تنہائی میں کوئی مصیبت نہیں پہنچتی۔

(اسی وقت ایک طرف سے اصطبل کا داروغہ چند سپاہیوں کے ساتھ آتا ہے۔ اِدھر اُدھر دیکھتا ہے انور پر نظر پڑتی ہے)

داروغہ :۔ (انور سے) تم نے کوئی گھوڑا تو ادھر سے جاتے نہیں دیکھا ؟ شہزادے کا گھوڑا ہے۔ ہم لوگ صبح سے تلاش کر رہے ہیں۔ اب تک اس کا پتہ نہیں چل سکا۔

انور :۔ کیا آپ اس مشکی گھوڑے کو تلاش کر رہے ہیں جس کے نعل چاندی کے ہیں، لگام سونے کی ہے، جس کا قد ۱۵ بالشت کے قریب اونچا ہے۔ دُم ساڑھے تین فٹ لمبی ہے ؟

داروغہ : ہاں۔ ہاں۔ وہی۔ بالکل وہی۔ جلد بتاؤ وہ کہاں ہے ؟ کدھر گیا ؟ تم نے اس کو کب دیکھا اور کہاں دیکھا ؟

انور :(مسکراتے ہوئے) حضور میں نے ایسا کوئی گھوڑا نہیں دیکھا، بھلا پھر کیسے بتا سکتا ہوں کہ وہ کہاں گیا ؟

داروغہ : (نرمی سے) میاں مذاق مت کرو۔ ہم لوگ بہت پریشان ہیں، جلد بتا دو۔

انور : اجی آپ سے مذاق کرنے والے پر لعنت۔ میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ میں نے ایسا کوئی گھوڑا دیکھا ہی نہیں ہے۔

داروغہ : (غصہ ہوکر) سیدھے سیدھے بتلاتے ہو ورنہ چوری کے جرم میں گرفتار کروں گا۔

(اسی وقت ایک سپاہی گھبرایا ہوا آتا ہے۔ اِدھر اُدھر دیکھتا ہے)

سپاہی : کیا آپ میں سے کسی نے ایک کتّا تو نہیں دیکھا ؟ شہزادی کا کتّا ہے۔ صبح سے غائب ہے۔ شہزادی نے رو رو کر سارا محل سر پر اٹھا لیا ہے۔ اگر یہ کتا نہ ملا تو میری جان کی خیر نہیں۔

انور : کیا آپ اس جھبرے کتے کو تلاش کر رہے ہیں جس کے کان لمبے ہیں، اس کا قد بہت چھوٹا ہے، گھنی اور لمبی سی دم ہے اور دائیں پیر کے پنجہ میں کچھ عیب ہے۔ کچھ کچھ لنگڑا تا بھی ہے ؟

سپاہی :۔ ہاں۔ ہاں۔ وہی، بالکل وہی

میں اسے دور سے پہچان سکتا ہوں۔ شہزادی کا
کتا جو ٹھہرا۔ جلد بتاؤ کہاں ہے ؟

انور : (مسکراتے ہوئے) میں نے ایسا کوئی کتا نہیں دیکھا
پھر کیسے بتا سکتا ہوں کہ کہاں ہے ؟

سپاہی: لے میاں تم مذاق کرتے ہو۔ یہاں جان پر بنی ہے،
کھانا پینا حرام ہے۔ جلد بتا دو۔ کہاں ہے ؟

انور : میری آپ سے دوستی نہیں۔ آپ میرے رشتہ دار
نہیں، بھلا میں کیوں آپ سے مذاق کرنے لگا ؟
میں تو سیدھی سچی بات کہتا ہوں کہ میں نے کوئی کتا
نہیں دیکھا ۔

داروغہ : (غصہ ہوکر) سپاہیو ! پکڑ لو اس بدمعاش کو،
ضرور اس نے گھوڑے اور کتے کو چرایا ہے۔
لے چلو بادشاہ سلامت کے سامنے، وہاں یہ سب
بتا دے گا ۔

انور : (گڑگڑا کر) حضور داروغہ جی ..... مجھے چھوڑ
دیجیے ۔ میں بے قصور ہوں۔ آپ قسم لے لیجیے ۔
میں نے آپ کا گھوڑا اور کتا نہیں دیکھا میں جھوٹ
نہیں بولتا .....

(سپاہی انور کو گرفتار کر لیتے ہیں)

(دوسرا منظر)

(بادشاہ کا دربار، وزیر اور امیر ہاتھ باندھے کھڑے
ہیں ۔ بادشاہ تخت پر بیٹھا ہے ۔ داروغہ مع سپاہیوں
کے حاضر ہوتا ہے، انور کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں
پڑی ہیں ۔ آنے والے کورنش بجالاتے ہیں ۔)

داروغہ : حضور انور، گھوڑے اور کتے کا چور
حاضر ہے ـــ دونوں جانوروں کا حلیہ تو
بتاتا ہے۔ مگر یہ نہیں قبولتا کہ وہ ہیں کہاں ۔

بادشاہ : (غصہ ہوکر) اچھا اس سے پہلے کہ میں چور سے
سوال کروں، اس کے پچاس دُرّے لگائے جائیں۔

انور : حضور انور ـــ میں ایک شریف آدمی ہوں میں
چور نہیں ہوں ۔ آپ میرے چال چلن کی تحقیق فرما
سکتے ہیں

مسخرہ :- واہ میاں ۔ یہ تم نے ایک ہی کہی، ہر آدمی شریف
ہے ۔ جب تک کہ وہ شریف ہے ۔ جب تک چور
پکڑا نہیں جاتا ۔ چور نہیں ہوتا۔ یہی بات قاتلوں اور
ڈاکوؤں کے لیے سچ ہے ۔ اگر تم چور نہیں ہو تو
واویلا مت کرو۔ تقدیر پر بھروسہ رکھو، خدا جو کرتا
ہے وہ بہتر ہی ہوتا ہے ۔

انور : افسوس ..... کسی نے سچ کہا ہے، جب بادشاہ
کے کان اور آنکھیں انصاف کی طرف سے بند
ہو جاتی ہیں تو ظالموں کے ہاتھ مظلوموں پر ظلم
کے لیے آزاد ہوتے ہیں ۔

بادشاہ (غصہ سے) لے جاؤ اس کم بخت کو اور پچاس
درّے فوراً لگاؤ تاکہ اس کی زبان بند ہو جائے ۔

انور : (مسخرہ کی طرف منھ کرکے) نصیحت کرنا آسان
ہے ۔ پچاس درّے کھانا اتنا آسان نہیں ہے ۔
نہایت تکلیف دہ عمل ہے ۔

(جلاد پیٹھ پر درّے لگاتا ہے۔ انور تکلیف سے
چلاتا ہے)

(ایک قاصد حاضر ہوتا ہے ۔ بادشاہ کے سامنے
کورنش بجالاتا ہے)

قاصد : حضور انور مبارک ہو، شہزادے کا گھوڑا
اور شہزادی کا کتا دونوں خیریت

سے بل گئے۔

بادشاہ : (خوش ہو کر) بہت خوب کہاں ملے؟

قاصد : کتا شاہی باغ کی نالی سے نکل کر شہر کے کتوں کے ساتھ کھیلتا ہوا دور نکل گیا تھا۔ اور شہزادہ کا گھوڑا شاہی اصطبل کا راتب کھاتے کھاتے شاید منہ کا مزہ بدلنے کے لیے ندی کے کنارے معمولی گھاس چرنے چلا گیا تھا۔ (قاصد کورنش بجا کر واپس چلا جاتا ہے)

بادشاہ : بے قصور چور کو حاضر کیا جائے!

(انور کو حاضر کیا جاتا ہے۔ تکلیف کے مارے اس کا برا حال ہے)

بادشاہ : تم کو خوش ہونا چاہیے کہ شاہی گھوڑا اور کتا مل گیا ورنہ تم کو اور سزا دی جاتی۔

انور : (کراہتے ہوئے) حضور بعض گھوڑے اور کتے انسانوں کے مقابلہ میں زیادہ خوش قسمت ہوتے ہیں کیوں کہ بادشاہ ان پر مہربان ہوتا ہے۔

بادشاہ : اب تم سچ سچ بتاؤ کیا ماجرا ہے؟ تم برابر یہی کہتے رہے کہ تم نے ان دونوں جانوروں کو نہیں دیکھا۔ بغیر دیکھے تم نے ان کا ہو بہو حلیہ کیوں کر بیان کیا؟

انور : حضور خطا معاف۔ یہ بات تو میں پچاس درّے کھا کر اب بھی کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اس وقت تک ان دونوں خوش قسمت جانوروں کو نہیں دیکھا ہے۔ بس بات اتنی سی ہے کہ میں آج شہر کی بھیڑ بھاڑ سے گھبرا کر شہر کے کنارے ایک باغ میں ٹہلنے کو نکل آیا۔ (کراہتا ہے) یہ میری بدقسمتی ہی تو ہے کہ میں ہر چیز کو بہت غور سے دیکھتا ہوں۔

میں نے زمین پر کتے کے پنجہ کے نشان دیکھے۔ اگلے پنجوں کے نشان ہلکے تھے، جیسے ان پر کسی نے ہلکے ہاتھ سے جھاڑو پھیر دی ہو۔ پس میں نے غور کر کے یہ نتیجہ نکالا کہ اس کتے کا قد چھوٹا ہے کہ جب وہ گردن نیچی کر کے چلتا ہے تو اس کے کان زمین کو چھوتے ہیں۔ کہیں کہیں بیچ میں گھسٹن سی تھی اور موٹی سی لکیر بن گئی تھی... اس کو دیکھ کر میں نے نتیجہ نکالا کہ اس کتے کی لمبی بالوں والی دم بھی ہے۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ دائیں پنجے کا نشان بائیں پنجہ کے نشان سے کم گہرا تھا۔ پس میں نے جان لیا کہ دائیں پنجہ میں کچھ عیب ہے۔ اور وہ تھوڑا تھوڑا لنگڑاتا ہے۔

میں ذرا آگے بڑھا تو میں نے گھوڑے کے نشان دیکھے۔ یہ نشان نہ تو بہت بڑے تھے نہ بہت چھوٹے تھے۔ یہ کسی اچھی نسل کے گھوڑے کے تھے۔

ان نشانوں کے فاصلے کو دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ یہ بہترین چال اور رفتار والا گھوڑا ہو سکتا ہے، قریب ہی ایک پتھریلی زمین پر اس گھوڑے کے نعل کا چمک دار نشان تھا۔ مجھے یہ فیصلہ کرتے دیر نہیں لگی کہ اس کے نعل چاندی کے ہیں۔ اور ایسا گھوڑا صرف شاہی اصطبل کی زینت ہو سکتا ہے۔ جب میں ذرا اور آگے بڑھا تو سات فٹ کے چوڑے راستہ پر دونوں جانب درختوں کی جو قطاریں تھیں، ان کی دھول سات سات فٹ کے متواتر فاصلہ سے صاف تھی۔ جیسے کسی نے جھاڑو سے صاف کی ہو۔ میں نے نتیجہ نکالا کہ اس گھوڑے کی دم ساڑھے تین فٹ لمبی ہے۔

جب میں ذرا اور آگے بڑھا تو میں نے دیکھا کہ درخت کی وہ شاخیں جو پانچ فٹ کے قریب اونچی

تھیں۔گھوڑے نے ان پر منھ مارا تھا اور ان
کو چبایا تھا۔اس سے اونچی اور شاخیں تھیں۔تو میں
نے اندازہ لگایا کہ اس گھوڑے کی اونچائی پانچ
فٹ ہو سکتی ہے۔
ایک درخت کے تنے میں گھوڑے کے بال چپکے
دیکھ کر میں نے اس کے رنگ کا اندازہ لگایا تھا اور
ایک چٹان پر سنہرا سا نشان دیکھ کر جو گھوڑے کی
لگام کی رگڑ سے بنا تھا میں نے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ
اس گھوڑے کی لگام سونے کی ہے۔بس ظلِ الٰہی
خطا معاف یہ فضول خرچی بادشاہ کو ہی زیب دیتی ہے
کہ وہ جانوروں کو سونا پہنائے۔عام انسان بادشاہ
کی برابری نہیں کر سکتا۔

بادشاہ: (حیرت سے) خدا کی قسم مابدولت کی نظر سے اب
تک تم سے زیادہ عقلمند آدمی نہیں گذرا۔ ہمارے
کوتوال کو داروغہ کو سب کو تمھاری شاگردی کرنا
چاہیے۔ہم بہت خوش ہوئے۔

وزیر: (جلدی سے) حضور انور آپ کی خوشی ہماری
سب کی خوشی ہے۔مگر ایک اہم بات عرض کردوں
ایسے عقل مند لوگوں پر ٹیکس لگنا چاہیے۔۔۔اس
مد سے خزانہ کو معقول آمدنی ہو سکتی ہے۔ اس
عقل مند آدمی سے بھی ٹیکس وصول کیا جانا چاہیے۔

بادشاہ: مابدولت تمھاری اس معقول تجویز سے متفق ہیں
فوراً عقل مندوں کی مردم شماری کی جائے اور
حساب لگا کر پیش کیا جائے کہ عقل مندوں پر ٹیکس
سے خزانہ کو کتنی آمدنی سالانہ ہو سکتی ہے۔

مسخرہ: حضور انور۔یہ بتانا کون سی بڑی بات
ہے۔سارے ملک میں صرف ایک
ہی سب سے بڑا عقل مند انسان ہے اور وہ
اس ملک کا بادشاہ یعنی حضور آپ۔کیا بادشاہ کے
ہوتے ہوئے کسی کو عقل مند آدمی کہلانے کا حق
ہے؟ اور پھر حضور ٹیکس دے کر ہر جاہل آدمی
اپنے کو عقل مندوں کی فہرست میں دیکھنا پسند
کرے گا۔۔ یقیناً حضور اس گستاخی کو برداشت
نہیں کر سکتے۔

بادشاہ۔ (سوچ کر) تم ٹھیک کہتے ہو میاں مسخرے۔۔۔
تمھاری بات نہایت معقول ہے۔(وزیر سے)
وزیراعظم مابدولت نے فیصلہ بدل دیا ہے۔عقل
مند شماری کا فیصلہ منسوخ کیا جائے۔۔۔ہاں
اس بے قصور چور کو پانچ ہزار خالص سونے کی
اشرفیاں انعام میں دی جائیں۔میرا خیال ہے
پچاس قدموں کا یہ مناسب معاوضہ ہوگا۔

مسخرہ: کیوں نہیں۔۔۔بادشاہ کا فیصلہ ہمیشہ مناسب ہوتا
ہے۔(انور کی طرف مخاطب ہو کر) یقیناً اب تم
سوچ رہے ہو گے کہ کاش میرے سو درے لگتے
تو میں دس ہزار اشرفیوں کا حقدار ہوتا۔مگر تمھارا
پچھتانا فضول ہے۔ہر انسان کو وہی ملتا ہے
جس کا وہ مستحق ہوتا ہے۔"

انور: (کورنش بجالاتا ہے) "حضور کا اقبال بلند ہو اور
آپ کی سلطنت قیامت تک قائم رہے۔

بادشاہ: اب جب بھی ہماری کوئی چیز کھوئے گی مابدولت
تم کو ضرور یاد کریں گے۔

مسخرہ: میاں انور اب تم اپنی عقل کو پہلے سے زیادہ
تیز رکھنا کہ بادشاہ کے سامنے زبان کی تیزی
نہیں عقل کی تیزی کام دیتی ہے۔تم یقیناً

خوش قسمت انسان ہو کہ جب بادشاہ کوئی چیز بھول جائے گا تو تم کو یاد کرے گا۔ مگر تم میرا سبق یاد رکھنا۔

(دربار برخاست ہوتا ہے۔ انور خوش خوش اشرفیوں کی تھلیاں لے کر باہر نکلتا ہے پیچھے پیچھے مسخرہ بھی آتا ہے)

مسخرہ : (دھیمے لہجہ میں) میاں انور، آج تم اپنی قسمت سے بچ گئے۔ آیندہ خیال رکھنا، بے سوچے سمجھے زبان مت کھولنا۔ یہ اشرفیاں لے کر آج ہی اس شہر سے کہیں دور چلے جانا۔ ورنہ تم کو نہیں معلوم کہ بادشاہ کے اصطبل میں کئی ہزار گھوڑے ہیں اونٹ ہیں، ہاتھی ہیں۔ چڑیا خانے میں کبوتروں اور بلبلوں کی تعداد ان گنت ہے۔ محل میں سینکڑوں غلام ہیں باندیاں ہیں اور حرم میں ان گنت عورتیں ہیں۔ ہر روز کچھ نہ کچھ کھوتا ہی رہتا ہے۔ تم پکڑے جاؤگے اور مصیبت میں مبتلا ہو جاؤ گے۔

انور : " بھائی آپ کی نصیحت کا بہت بہت شکریہ۔ میں آج ہی اس سلطنت سے باہر ہو جاؤں گا۔

(دونوں چلے جاتے ہیں۔)

{ پردہ گرتا ہے }

جناب پروفیسر امانت پونا

مرغی

مجھے کہتی ہے دنیا ساری مرغی
نشاں میرا ہے دیکھو سرخ کلغی
تمھیں سے مجھ کو بچو! واسطہ ہے
مرے انڈے تمھارا ناشتہ ہے
مرا گھر بانس کا ٹاپا یا ڈربا
مرا گھسنا نہیں کچھ اس سے رتبا
مرے بچے جو کہلاتے ہیں چوزے
پھرا کرتے ہیں ہر دم ساتھ میرے
سکھاتی ہوں انھیں میں دانہ چگنا
زمیں پر دوڑنا، پھرتی سے اُڑنا
سویرے بانگ جو دیتا ہے مرغا
وہ کہتا ہے "اٹھو لے میرے آقا"!
لو پھر سورج نے کام اپنا سنبھالا
ہوا جگ میں اُجالا ہی اُجالا
مرے بچے بھی دانہ چگ رہے ہیں
خدا کے سامنے سب جھک رہے ہیں
عبادت میں لگے دھرتی کے باسی
بجالاؤ خدا کا شکر تم بھی

جناب شمیم ہاشمی

عید کی خوشیاں

کتنی نیاری کتنی پیاری
آئی عید کھلی پھلواری

عید کا پیارا پیارا دن ہے
اور دنوں سے نیارا دن ہے
اللہ اکبر اللہ اکبر
ملنا سب سے خوش ہو ہو کر

نئی نئی پوشاک ہماری
رنگ برنگی پیاری پیاری
گھر گھر سب سے ملنے جائیں
دودھ سویاں مل کر کھائیں

ارشد حبیب بن ٹھن کر نکلے
منّے ننھے تن کر نکلے
خوشی منائیں خوشی منائیں
گیت خوشی کے مل کر گائیں

اپنے رب کو سجدہ کرنے
بچّے بوڑھے مل کر نکلے
عید مبارک عید مبارک
یاروں کی ہو دید مبارک

مولانا مقبول احمد سیوہاروی

سفرنامہ ابن بطوطہ

(دسمبر ۱۹۶۷ء سے سلسلہ ملایئے)

کربلا

مشہور جگہ ہے۔ یہیں حضرت امام حسینؓ کا روضہ ہے۔ روضے کے ساتھ ایک بڑا مدرسہ اور خانقاہ ہے۔ جہاں ہر ایک مسافر کو کھانا ملتا ہے۔ روضہ کے دروازے پر ریشمی پردے پڑے رہتے ہیں اور جب تک دربان اندر جانے کی اجازت نہ دے کوئی نہیں جا سکتا۔ جو کوئی جاتا ہے۔ اوّل آستانے کو بوسہ دیتا ہے۔ آستانہ چاندی کا بنا ہوا ہے۔ قبر پر سونے چاندی کی قندیلیں لٹکتی ہیں۔ یہاں بھی آپس میں جھگڑے رہتے ہیں اور سارا شہر بے رونق ہے۔

بغداد

بغداد تاریخی شہر ہے۔ برسوں عباسی خاندان کا دار الحکومت رہا ہے۔ مامون الرشید، ہارون الرشید اور ان کے باپ دادا بڑے دبدبے اور طاقت کے بادشاہ گزرے ہیں۔ اندلس کے ایک بزرگ جنھوں نے بڑے بڑے شہروں کی سیر کی ہے اور جن کا نام ابن جبیر ہے لکھتے ہیں کہ بغداد جیسا تھا ویسا ہی رہتا تو نہ جانے کیسا ہوتا۔ اب تو یہ ایک ٹھیکرا ہے۔

دجلہ کا پانی صاف شفاف، کشتیوں کا پل، جس پر رنگ برنگے لباس پہنے ہر گھڑی لوگ گذرتے ہیں۔ بڑے بڑے محل، لمبے لمبے بازار جس میں دنیا کی ہر چیز مل جاتی ہے۔ اونچی سے اونچی مسجدیں، ایک سے ایک مدرسہ جن میں بڑے بڑے عالم پڑھاتے ہیں اور سینکڑوں شاگرد حلقہ باندھ کر بیٹھتے ہیں۔ سڑکیں صاف ستھری، تازہ پھلوں کے ڈھیر، غرض دنیا کی تمام نعمتیں بغداد میں اکٹھا ہو گئی ہیں۔ باوجود اس کے کہ بڑے بڑے مدرسے ویران ہو گئے ہیں۔ محل اور ایوان ٹوٹے پڑے ہیں۔ بغداد پھر بغداد ہے۔ عباسیوں کے زمانے میں تو نہ جانے کیا ہوگا۔

گیارہ بڑی مسجدیں ہیں جن میں جمعہ ہوتا ہے۔ جگہ جگہ حمام ہیں۔ جن پر سیاہ کوتنار کا روغن ہے۔ یہ حمام اتنے چمک دار ہیں کہ کسوٹی کے بنے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

کوتنار ایک چشمے سے نکلتا ہے۔ یہ چشمہ کوفے اور بصرے کے درمیان ہے۔ اس کے سوتوں سے کوتنار ہر وقت نکلتا رہتا ہے۔ اور گارے کی طرح جم جاتا ہے۔ جسے کھرچ کر لاتے ہیں۔

ہر حمام میں درجہ بدرجہ نہانے کے کمرے ہیں۔ دیواروں کی بنیادوں سے لے کر آدھی دیوار تک کوتنار۔ پھر چونے اور سرخی کا پلاستر، بیچ میں سنگِ مرمر کا حوض جس میں صاف شفاف پانی آتا جاتا رہتا ہے۔ حوض کی ٹونٹیوں میں، ایک سے ٹھنڈا پانی نکلتا ہے ایک سے گرم۔ غسل کرنے والا جب تک چاہے حمام میں رہ سکتا ہے۔ اکیلا غسل کرے یا کسی کو شریک کر کے

حمام والا یا حمامی ہر ایک غسل کرنے والے کو دو لنگیاں دیتا ہے۔ ایک باندھ کر نہانے کے لیے، دوسری نہا کر باندھنے کے لیے۔ صاف کپڑا دے دیا جاتا ہے۔ یہ انتظام دوسرے اسلامی شہروں میں نہیں ہے۔

بغداد میں ایسا کوئی محلہ نہیں جس میں جامع مسجد اور دو تین حمام نہ ہوں۔ مغربی حصہ اگرچہ اجاڑ ہے پھر بھی تیرہ محلے ہیں اور ہر محلہ ایک چھوٹا سا شہر ہے۔

حضرت معروف کرخی

حضرت معروف کرخی مشہور بزرگ گذرے ہیں۔ ان کی قبر یہیں ہے۔ قریب ہی ایک دوسری عمارت ہے۔ اس میں ایک تعویذی قبر ہے تعویذ پر لکھا ہے کہ یہ حضرت عونؒ کا مزار ہے۔ عونؒ حضرت علی کی اولاد میں تھے۔

بغداد کا پوربی رخ

بغداد کے پوربی رخ میں اچھے اچھے بازار ہیں۔ مدرسہ نظامیہ اور مستنصریہ بھی یہیں ہیں۔ ان مدرسوں میں چاروں مذہبوں (حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی) کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ہر ایک مذہب کے لیے الگ الگ محل ہیں۔ مدرسہ نظامیہ کی شہرت اور اس کی اعلیٰ تعلیم ضرب المثل بن گئی ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ اسی مدرسے میں پڑھاتے تھے۔

استاد کی نشست گاہ (بیٹھنے کی جگہ) ایک کرسی ہے جس پر صاف ستھرا کپڑا ہوتا ہے۔ استاد کالا امامہ اور کالا چغہ پہن کر آتا ہے۔ چہرے پر اطمینان اور وقار ہوتا ہے۔ ایک آدمی اس کے دائیں اور ایک آدمی بائیں ہوتا ہے۔ استاد تقریر کر چکتا ہے تو یہ دونوں اس تقریر کو دہراتے ہیں۔

مدرسہ کے اندر طالب علموں کے لیے حمام اور وضو خانے بنے ہوئے ہیں۔ بغداد کے اس حصہ میں تین مسجدیں اور ہیں۔ جامع الخلیفہ، جامع السلطان، جامع الرصافہ۔

جامع الخلیفہ

جامع الخلیفہ شاہی محلات کے قریب ہے بہت بڑی مسجد ہے۔ سقائے، غسل خانے، وضو کے مقامات بکثرت بنے ہوئے ہیں۔

جامع الخلیفہ میں میری ملاقات، سراج الدین ابوجعفر قزوینی سے ہوئی اور میں نے حدیث کی مشہور کتاب مسند دارمی ان سے سُنی۔ دارمی کے مصنف کا پورا نام ابی محمد عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن الفضل بن بہر الدارمی ہے۔

جامع السلطان شہر سے باہر ہے

جامع الرصافہ میں عباسی بادشاہوں کی قبریں ہیں۔ مہدی، ہادی، امین معتصم وغیرہ کی۔ معتصم کے بعد عباسیوں کا اقتدار ختم ہو گیا تھا

رصافہ کے قریب امام اعظم ابوحنیفہ کا گنبد اور خانقاہ ہے۔ سارے بغداد میں یہی خانقاہ ہے جہاں ہر مسافر کو کھانا ملتا ہے۔ اس کے بعد ہی امام احمد بن حنبل کی قبر ہے۔ کہتے ہیں جب امام بن حنبل کی قبر پر گنبد بنایا گیا آپ سے آپ ٹوٹ کر گر پڑا۔

بغداد کے رہنے والے زیادہ تر حنبلی مسلک پر چلتے ہیں

حضرت ابوبکر شبلی، سری سقطی، بشر حافی، داؤد طائی حضرت جنید بغدادی رحمہم اللہ کے مزار بھی یہیں ہیں۔ یہ سب بڑے رتبے کے بزرگ گزرے ہیں۔

بغداد والے ہر جمعہ کو کسی نہ کسی کے مزار پر ضرور جاتے ہیں۔ اور فاتحہ پڑھتے ہیں۔

سلطان ابوسعید خاں بہادر

اس زمانے میں خراسان اور عراق کا بادشاہ بغداد آیا تھا۔ ابوسعید بہادر خان اس کا نام ہے خان بادشاہ کو کہتے ہیں ابوسعید کے باپ کا نام تھا "خدا بندہ"۔ کہتے ہیں مسلمان ہونے کے بعد لوگ اسے "خدا بندہ" کہنے لگے۔ ورنہ باپ نے اس کا نام "خربندہ" یعنی گدھے کا غلام رکھا تھا۔

تاتاریوں کا دستور ہے کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو جو آدمی سب سے پہلے گھر میں داخل ہوتا ہے۔ اسی کے نام پر بچے کا نام رکھ دیتے ہیں۔ خدا بندہ پیدا ہوا تو سب سے پہلے گدھے کی لید اٹھانے والا گھر میں آیا۔ اسے سب لوگ "خربندہ" کہتے تھے۔ بس اسی کے نام پر بچے کا نام رکھ دیا گیا۔

اس کے بھائی کا نام بھی ایسا ہی بے تکا تھا "قازان" "قازان" ہانڈی کو کہتے ہیں۔ اس کے پیدا ہونے پر ایک لڑکی گھر میں آئی تھی جس کے ہاتھوں میں ہانڈی تھی۔ تو بس ان صاحبزادے کا نام "قازان" پڑ گیا۔ قاضی مجد الدین کے ذکر میں خدا بندہ کا حال ہم لکھ چکے ہیں۔ اسی نے قاضی صاحب کو کتوں کے سامنے ڈال دیا تھا۔ کتے شیخ کے پاؤں چومنے لگے تھے اور خدا بندہ نے توبہ کی تھی۔

اسی خدا بندہ کا لڑکا ابوسعید بہادر خاں بڑا فاضل اور سخی ہے۔ ابھی کم عمر ہے۔ میں نے اسے دیکھا تو داڑھی مونچھ تک نہ نکلی تھی، بہت خوب صورت ہے اس کا وزیر غیاث الدین محمد خواجہ رشید کا بیٹا ہے۔ جب میں نے دیکھا تو یہ دونوں کشتی میں بیٹھے تھے اور دجلہ کی سیر کر رہے تھے۔ دائیں بائیں دو کشتیوں میں عرب لوگ اور گویے تھے۔

ابوسعید کشتی سے اتر کر جب چلا تو بہت سے اندھوں نے راستہ روک لیا اور اپنی مصیبت بھری کہانی سنانے لگے کہ ہم نہ چل پھر سکتے ہیں نہ پیٹ بھر کھانے کو ملتا ہے۔

ابوسعید نے اندھوں کی خدمت کا حکم دیا کہ اندھے جہاں جائیں ان کا ہاتھ پکڑ کر لے جایا جائے۔ کھانے پینے کا خرچ اور ان کی دیکھ بھال کرنے والوں کی تنخواہ شاہی خزانے سے مقرر کر دی۔

بغداد سے ابوسعید چلا تو میں بھی اس کے کارواں میں شریک ہو گیا اور دس دن تک اس کارواں کے ساتھ رہا۔ اس کے بعد دس دن اور سفر کرکے تبریز پہنچا اور شہر سے باہر ایک مقام پر جسے "الشام" کہتے تھے مسافر خانے میں ٹھہر گیا۔

یہاں روٹی، گوشت، بگھارے چاول اور مٹھائی کھانے کو دی گئی۔ "قازان" کی قبر یہیں ہے۔ قبر کے ساتھ ایک بڑا مدرسہ اور خانقاہ ہے۔

خانقاہ کے آس پاس صاف شفاف نہریں بہتی ہیں۔ ہرے بھرے درخت لہلہاتے ہیں۔

دوسرے دن بغداد کی دروازے سے شہر میں داخل ہوئے۔ یہاں قازان بازار کے نام سے بہت بڑا اور عمدہ بازار بنا ہوا ہے۔ جوہری بازار تو ایسا ہے کہ روح خوش ہو جاتی ہے۔

سوداگروں کی دکانوں پر خوب صورت لڑکے کمر سے ریشمی پٹکے باندھے کھڑے رہتے ہیں اور زیور اور جواہرات خریداروں کو دکھاتے ہیں۔ خریداروں میں ترک عورتیں زیادہ تھیں اور جی کھول کر سامان خرید رہی تھیں۔

عطارہ بازار بھی خوب ہے۔ مشک، عنبر، زعفران اور ہر قسم کے اعلیٰ عطر ملتے ہیں۔ یہاں سے جامع مسجد گئے۔ یہ مسجد وزیر علی شاہ جلیان نے تعمیر کرائی ہے۔

مغربی کونے کے دائیں طرف ایک بڑا مدرسہ ہے اور بائیں طرف
خانقاہ ہے۔ خانقاہ کا پورا فرش سنگ مرمر کا ہے۔ خانقاہ میں سے
ایک نہر نکلتی ہے۔ اس نہر کے کناروں پر رنگ برنگے پھولوں
کے پودے ہیں۔ انگور اور چنبیلی کی بیلیں پھیلی ہوئی ہیں۔
مسجد میں روزانہ عصر کے بعد شہر والے آتے ہیں
اور سورۂ یٰسین اور عم یتساءلون پڑھتے ہیں۔

ہم ایک رات تبریز میں رہے تھے کہ سلطان ابو سعید
خاں کا حکم پہنچا کہ وہ ملنا چاہتے ہیں اس لئے تبریز کے عالموں
سے ملاقات نہ ہو سکی۔ سلطان نے میرا وطن پوچھا اور جب سلطان
کو معلوم ہوا کہ میں تبریز جا رہا ہوں تو محمل کی سواری، سفر خرچ
اور خلعت دیا اور خواجہ معروف نے میرے لئے ہر قسم کی
سہولت مہیا کر دی۔

ابھی حجاز کے قافلوں میں دو مہینے کی دیر ہے۔ اس
لئے میں نے سوچا کہ موصل اور دیار بکر وغیرہ بھی دیکھتا چلوں۔
حربہ کے قلعہ المعشوق ہو کر ساترہ (جو کسی زمانے میں
عباسیوں کا دارالحکومت بھی رہ چکا ہے (یہ ۲۲۳ھ اور ۲۴۸ھ
کی بات ہے معتصم باللہ کا زمانہ تھا) اس کے بعد تکریت (جو
سلطان صلاح الدین ایوبی کی جائے ولادت ہے) اور عقرہ
ہوتا ہوا موصل پہنچ گیا۔

ساترہ ویران ہے۔ کبھی اس کی بڑی شان تھی یہاں
بھی صاحب الزمان کا مشہد ہے تکریت کے لوگ خوش اخلاق اور
مہمان نواز ہیں۔ پرانا شہر ہے مضبوط قلعہ بھی ہے۔
عقرہ ایک گاؤں ہے۔ دجلہ کے کنارے آباد ہے۔
ایک طرف ایک اونچا ٹیلا ہے۔ شاید قلعہ ہوگا جو اب ٹوٹ پھوٹ
کر مٹی کا ڈھیر بن گیا ہے۔ عقرہ سے موصل تک مکانات اور
گاؤں چلے گئے ہیں۔
قبارہ میں کولتار کے چشمے ہیں۔ کھود کر
حوض بنا دیتے ہیں اور اسے جمع کر لیتے ہیں۔ گارے جیسا ہوتا
ہے۔ جس میں بو آتی ہے۔ چشموں کے اطراف میں ایک بہت بڑا
تالاب ہے۔ اس میں کالے رنگ کی لہریں آتی ہیں تو کائی جیسی
جمی چیز کناروں پر آجاتی ہے۔ یہ کولتار ہے۔ اس کے قریب ایک
دوسرا چشمہ ہے جس کا پانی آگ جلا کر سکھا دیتے ہیں اور ٹکڑے
کاٹ کاٹ کر لے جاتے ہیں۔

موصل

بڑا شان دار شہر ہے موصل کا قلعہ مشہور ہے۔ شہر پناہ
اتنی لمبی چوڑی ہے کہ اس کی چوڑائی میں چھوٹی چھوٹی برجیاں
کثرت سے بنی ہوئی ہیں۔ دارالسلطنت دہلی کے سوا نہ میں نے
ایسا کوئی قلعہ دیکھا نہ ایسی مضبوط شہر پناہ دیکھی۔

قلعے میں جامع مسجد بھی ہے۔ دجلہ کے کنارے
موصل کی سرائے بہت شان دار ہے۔ اس میں بازار، دکانیں، حمام
مسجد بھی کچھ ہے۔ شہر میں جامع مسجدیں دو ہیں، ایک پرانی
ایک نئی۔ موصل کا چوک بھی بہت خوب صورت ہے۔

موصل میں جرجیس علیہ السلام کا مشہد ہے۔ ایک
ٹیکری ہے۔ جسے حضرت یونسؑ کی ٹیکری کہتے ہیں کہ حضرت یونس
نے اپنی امت کو حکم دیا تھا کہ اس ٹیکری پر جا کر دعا مانگیں
تا کہ خدا کا عذاب ٹل جائے۔ ٹیکری کے قریب ایک گاؤں
ہے۔ گاؤں کے پاس ایک ویرانہ ہے۔ جہاں کے کھنڈر دیکھ
کر دل لرز جاتا ہے۔

(باقی آئندہ)

جناب خورشید شیدائی

مُلّا نصر الدین کے لطیفے

ایک دن ایک ان پڑھ آدمی مُلّا جی کے پاس آیا اور کہنے لگا" مُلّا جی! یہ خط پڑھ کر مجھے سنا دیجیے---!!

خط عربی زبان میں تھا۔ مُلّا جی نے عذر پیش کیا۔

"معاف کیجیے۔ میں عربی نہیں جانتا۔"

وہ شخص کہنے لگا " اتنی بڑی تو آپ کے سر پر پگڑی ہے۔ اور آپ عربی نہیں پڑھ سکتے ---!"

یہ سنتے ہی مُلّا نصر الدین نے اپنی پگڑی اتار کر آنے والے کے سر پر رکھ دی اور کہنے لگے "اگر پگڑی سر پر رکھ کر خط پڑھا جا سکتا ہے۔ تو صاحبزادے اب خط خود ہی پڑھ لو"

ایک دن ایک نجومی مُلّا جی کے پاس آیا اور کہنے لگا "میں علم غیب جاننے والا ہوں۔"

مُلّا جی نے پوچھا۔ "میرا پڑوسی کون ہے؟"

"مجھے کیا پتہ" ۔ نجومی نے جواب دیا۔

"آپ جب میرے پڑوسی کو نہیں جان سکتے تو تاروں اور آسمان کی باتیں کیسے جان سکتے ہیں؟"

ایک دن مُلّا نصر الدین کے گھر میں آگ لگ گئی۔ ان کے پڑوسیوں نے کہا" مُلّا جی عجیب آدمی ہو تمہارے مکان میں آگ لگ گئی ہے اور تم آرام سے بیٹھے ہو۔"

مُلّا جی نے مسکرا کر کہا۔ "ہم میاں بیوی میں یہ طے ہو چکا ہے کہ گھر کے سب کام بیوی کرے گی اور گھر کے باہر کے کام میں کروں گا۔ لہٰذا آپ بجائے میرے، یہ بات میری بیوی سے کہیے۔"

ایک دن مُلّا جی اذان دینے کے بعد بے تحاشا بھاگنے لگے۔ لوگوں نے پوچھا "کیوں مُلّا جی یہ کیا حرکت؟"

مُلّا جی نے کہا "میں یہ معلوم کرنے کے لیے بھاگ رہا تھا کہ میری آواز کہاں تک جاتی ہے۔"

ایک دن مُلّا جی اپنے ایک دوست سے ملنے گئے اور اس کی طبیعت پوچھی۔ دوست نے کہا بخار تو ٹوٹ گیا ہے۔ مگر گردن میں سخت درد ہے۔"

مُلّا نے ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔ "گھبراؤ نہیں، اللہ نے چاہا تو جیسے بخار ٹوٹا ہے ویسے ہی گردن بھی ٹوٹ جائے گی"

مُلّا جی کی بیوی زمین پر کوئی بھاری بھرکم چیز گرنے کی آواز سن کر گھبرائی ہوئی مُلّا جی کے پاس آئیں اور پوچھا۔ "کیا گرا؟"

"گھبرانے کی بات نہیں۔ میرا عمامہ کرسی سے فرش پر گر گیا تھا"

"صرف عمامہ گرنے سے اتنی آواز تو نہیں ہوتی۔"

"تم سچ کہتی ہو نیک بخت اتفاق سے میں بھی عمامہ کے اندر تھا۔"

مُلّا جی اپنے ایک دوست کے ہاں گئے۔ دوست نے کھانے کے ساتھ شہد بھی پیش کیا۔ شہد مُلّا کی دل پسند خوراک تھی۔ فوراً شہد چاٹنے لگے۔ دوست نے کہا۔ "میاں روٹی کے ساتھ شہد کھاؤ۔"

"کیوں؟"

"خالی شہد کھانے سے دل جلتا ہے۔" دوست نے کہا۔

"فی الحال آپ کا دل جل رہا ہے۔ مُلّا جی نے کہا جب میرا دل جلے گا دیکھا جائے گا۔"

جناب مسیح الدین صدیقی

اقبال مند

(مسلسل)

خدا خدا کر کے پہاڑ جیسے بھاری یہ دس دن گذر گئے۔ اور مجھے جیل سے رہا کر دیا گیا۔

میں جیل سے سیدھا پولس اسٹیشن پہنچا۔ امین صاحب اپنی میز پر بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اچھل پڑے اور جوش میں آ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولے "بیٹھو بیٹے۔ بیٹھو"

نہیں امین صاحب! مجھے جلدی جانا ہے اب اجازت دیں اور مجھے میرا بیگ واپس کر دیں۔

بیگ تو تمھیں ملے گا ہی! مگر میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں، تھوڑی دیر اور ٹھہر جاؤ۔

مجبوراً مجھے ٹھہرنا پڑا۔

امین صاحب نے جلدی جلدی اپنا کام ختم کیا۔ اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ پھر ڈرائیور کو گاڑی لانے کا حکم دیا۔ نریش سے کہہ کر میرا بیگ منگوا لیا۔ اور خود اسے اٹھا کر بولے "چلو" کہاں میں نے تعجب سے پوچھا۔

"میرے مکان"

"امین صاحب! اب آپ مجھ کو کونسی سزا دینا چاہتے ہیں؟ میں نے پوچھا۔

"بیٹے گھبراؤ نہیں۔ تم سے کچھ باتیں کرنا ہیں۔ مکان پر چل کر دیں گے"

پھر ہم موٹر میں چل کر بیٹھ گئے۔ اور گاڑی فراٹے بھرنے لگی۔

تھوڑی ہی دیر میں گاڑی امین صاحب کے دروازے پر رک گئی۔ یہ ایک چھوٹا سا خوبصورت مکان تھا۔ امین صاحب مجھے اپنے ساتھ اندر لے گئے۔

مجھے دیکھ کر امین صاحب کی بیگم، اور ان کی صاحبزادی صاحبہ چونک گئیں۔

"پاپا یہ کون ہیں؟"

سب بتاتا ہوں، پہلے ہمارے بیٹے کو غسل کراؤ! امین صاحب بولے۔

اور میرے لاکھ انکار کے باوجود مجھے غسل کروا کر نئے کپڑے پہنائے گئے۔ امین صاحب کی اس مسلسل ہمدردی کی وجہ اب بھی میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

جلد ہی دسترخوان بھی چن گیا۔

امین صاحب۔ ان کی بیگم، صاحبزادی اور میں اس دسترخوان پر صرف چار ہی آدمی تھے۔

کھانے کے بعد چائے کا دور چلا، جب اس سے بھی فراغت ملی تو امین صاحب بولے۔

بیٹے تمہاری ہی طرح میرا بھی ایک لڑکا تھا۔ اس کا نام بھی اقبال تھا۔ لیکن آج تین سال ہو گئے کوئی اسے بھگا کر لے گیا۔ چپہ چپہ ڈھونڈ مارا۔ شہر بھر کی پولس کو اس کی تلاش کے لئے لگا دیا گیا۔ اخبارات اور ریڈیو کے ذریعہ اس کے گم ہو جانے کے اعلان کیے گئے۔ فلموں کے ذریعہ

اس کی [illegible] میں دکھائی گئیں۔ لوٹانے والے کو سینکڑوں روپیہ انعام دینے کا وعدہ کیا گیا۔ مگر سب بے سود ثابت ہوا۔ غم کی وجہ سے میری اور ان کی (امین صاحب نے بیگم صاحبہ کی طرف اشارہ کیا) صحت خراب ہو گئی۔ اس کی بہن فرزانہ کی آنکھیں رو رو کر سوج گئیں مگر کچھ نہ ہوا۔ اقبال نہ ملنا تھا نہ ملا۔ " جب دن گذر جاتے ہیں تو بڑے بڑے حادثے، غم انسان دھیرے دھیرے بھول جاتا ہے۔ ہمارے دلوں کا زخم بھی دھیرے دھیرے بھرنے لگا" لیکن آج سے دس دن پہلے" امین صاحب کی آواز بھرا گئی۔ وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولے۔

" جب تمھیں اسٹیشن سے پکڑ کر لایا گیا اور میرے نام پوچھنے پر تم نے اپنا نام اقبال مند بتایا۔ تو گویا اس وقت سے میرے دل پر جیسے بجلی سی گری ہے سارے زخم نئے سرے سے تازہ ہو گئے ہیں۔ راتوں کی نیند اور دن کا آرام حرام ہو گیا ہے۔ اقبال کی صورت میری آنکھوں میں بھرنے لگی۔ اور اس کی یاد نے مجھے تڑپا کر رکھ دیا ہے "

" میں نے سوچا کم از کم تمھاری ہی دلجوئی کر دوں تاکہ مجھے کچھ چین نصیب ہو سکے۔

" بیٹا تم سوچ رہے ہو گے کہ پھر میں نے تمھیں جیل کیوں بھجوایا" تو بیٹا بات یہ ہے کہ جب تمھیں پکڑ کر لایا گیا تو میرے دل نے گواہی دی کہ تم بے قصور ہو اور تمھیں زبردستی پکڑ لایا گیا ہے، میں چاہتا تو تمھیں فوراً چھڑوا دیتا۔ مگر میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔ اگر تم نے واقعی جرم کیا ہوتا تو اس سے تمھاری ہمت بڑھ جاتی، اور تم آئندہ کے لیے شیر ہو جاتے"

" خیر جو کچھ ہوا۔ اب تو تم مجھے بتا ہی دو گے کہ اصل ماجرا کیا ہے۔ میں تو تمھیں اب بھی بے قصور سمجھتا ہوں"

میں نے کہا۔ امین صاحب! اب تو میں سزا بھی بھگت چکا ہوں۔ ان دنوں مجھے جو کچھ تکلیف اٹھانا پڑی وہ اب اپنی بات آپ کو بتا دینے سے ختم تو نہیں ہو جائیں گی "

" ہاں، یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن پھر بھی " امین صاحب نے مجبور کیا۔

اندر سے ضمیر کی آواز آئی۔

" خبردار — لوگوں کو جتا جتا کر اپنی نیکی برباد نہیں کرتے!"

اس آواز کے آگے میں مجبور ہو گیا۔ اور بولا " امین صاحب! بس اتنا جان لیجیے کہ میں نے ٹکٹ لیا تھا۔ اس کے آگے کیا ہوا؟ یہ میں نہیں بتاؤں گا "

" کیا حرج ہے، بتا بھی دو " امین صاحب نے اصرار کیا۔

" حرج ہے حرج ہے۔ میں نہیں بتاؤں گا۔ "

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

" ارے ارے — بیٹھو تو سہی! امین صاحب نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے بٹھا دیا " خیر صاحب نہ بتاؤ "

انھوں نے اپنی جیب سے ایک لفافہ نکال کر مجھے دیتے ہوئے بولے۔

" یہ لو — اسے میری طرف سے رکھ لو۔ اس میں ٹکٹ کے پیسے ہیں "

نہیں امین صاحب! — مجھے مزید شرمندہ نہ کیجیے " میں بولا۔

" نہیں بیٹا — میرا دل نہ دکھاؤ۔ میں تمھارے چچا کی طرح ہوں۔ مجھے اپنا سمجھو، امین صاحب نے لفافہ زبردستی میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

پھر وہ اپنی صاحبزادی سے بولے۔ فرزانہ بیٹی۔ اقبال مند کا بیگ اندر لے جاؤ۔ امین صاحب نے اپنی بیگم سے کہا۔

کاش، آج اقبال بھی ہمارے پاس ہوتا۔ اور وہ مجھ سے
اندر سے دل اور ضمیر نے کہا۔
"اقبال ــــ ! امین صاحب کو دلاسہ دو، اور ان کے
بیٹے کی تلاش کرو تاکہ ایک دکھی دل کو سکون مل سکے۔ یہی موقع
ہے۔ جب ان کے بیٹے کو تم تلاش کرکے لاؤ گے تو یہ تمھارے
لیے کتنی دعائیں دیں گے۔ یہی تمھارے کام آئیں گی۔" پھر جیسے
ابا جان کی آواز آئی۔
بیٹا ــــ جہاں جہاں بھی تمھیں عمل کا موقع ملے فوراً
میدان میں کود پڑو۔ اور جتنا ہو سکے کر گذرو۔"
"امین صاحب ! ــــ" میں نے کہا۔
"میں ابھی چھوٹا ہوں۔ تو کیا ہوا۔ لیکن میرے ارادے
بلند ہیں۔ آپ قطعی رنج نہ کریں۔
اقبال بھائی کو میں تلاش کرکے لاؤں گا۔ اور خدا نے
چاہا تو ضرور کامیاب ہوں گا۔
"بیٹا ــــ" انھوں نے مجھے سینے سے لگا لیا۔"
پھر بولے۔
"نہیں بیٹا ــــ تمھارا یہ حوصلہ ہی میرے لیے بہت
ہے۔ اب تم سیدھے اپنے وطن جاؤ اور اقبال کی تلاش
میں نہ پڑو۔ انشاء اللہ ہم صبر کریں گے۔
"امین صاحب ــــ میں نے فیصلہ کر لیا ہے چاہے
کچھ ہو جائے۔ میں اقبال بھائی کو تلاش کروں گا۔ یہ میرا فرض
ہے۔ میں اپنا فرض ادا کرکے ہی دم لوں گا۔" میں اٹھ کھڑا ہوا۔
"اب مجھے اجازت دیجیے۔"
"مگر بیٹا۔ یہ تو سوچو تم اسے کہاں تلاش کرو گے؟"
اگر خدا کو منظور ہے تو وہ مجھے اقبال تک، یا اقبال
کو مجھ تک پہنچا دے گا۔ میں صرف اللہ کے بھروسے پر
جا رہا ہوں۔ اور اس کا بھروسہ بہت ہے۔ آپ لوگ تو بس
میرے لیے دعا کریں۔ اگر آپ لوگوں کی دعائیں میرے ساتھ
ہوں گی تو میں بہت جلدی اپنی منزل تک پہنچ جاؤں گا۔
تھوڑی دیر ہی میں فرزانہ بھی میرا بیگ لے کر آ گئیں۔
"ارے ! میرے سامنے کھولا۔ اس میں تو گرما گرم پراٹھے
قیمہ، روٹیاں، کباب، میٹھا، اور خدا جانے کیا کیا بھر دیا گیا تھا۔ اور
اس کی خوشبو تمام کمرے میں پھیل رہی تھی۔
امین صاحب بولے "بیٹے یہ بیگ بھی رکھ لو۔ سفر
میں تمھیں جب بھوک لگے تو خوب سیر ہو کر کھانا۔ اور ہمارے لیے
دعائیں کرنا۔ اور ہاں یہ لو۔ امین صاحب نے اپنا شناختی کارڈ
میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ اسے اپنے پاس رکھو۔ اس میں
میرا نام، پتہ اور ٹیلیفون نمبر ہے۔ اگر خدا نخواستہ کوئی ضرورت
پڑ جائے تو مجھے فوراً مطلع کرنا۔ میں حتی المقدور تمھاری مدد کی
کوشش کروں گا۔"
کچھ سوچ کر امین صاحب نے پھر کہا۔
"بیٹا۔ میں پھر کہتا ہوں تم اپنے ارادے سے باز
آجاؤ۔ اور بجائے اقبال کو تلاش کرنے کے سیدھے اپنے وطن پہنچو۔"
اب میرا وطن، اور میری منزل صرف اقبال بھائی کی
تلاش و جستجو ہے۔ آپ لوگ خوب دعائیں کیجیے میں جاتا ہوں ــــ
خدا حافظ۔"
اور میں اقبال کی تلاش میں چل پڑا۔

یہاں سے رخصت ہو کر میں سیدھا ریلوے اسٹیشن
پہنچا۔ مگر پوچھنے پر معلوم ہوا کہ آج کی آخری گاڑی بھی چھوٹ
چکی ہے اور اب کل تک کوئی گاڑی نہ جائے گی۔ مایوسی کی ایک
لہر سر سے پیر تک دوڑ گئی۔ مگر کرتا بھی کیا؟ خیر کل ہی سہی آج
کی رات بھی یہیں گذار دیں گے۔
یہ سوچ کر میں ایک مسجد میں پہنچا۔ وضو کیا نماز

پڑھی اور خوب دعائیں کرکے اپنا بیگ ایک جگہ حفاظت
سے رکھا اور لیٹ کر سو گیا۔

ابھی تھوڑی ہی دیر گذری ہوگی کہ موذّن صاحب
تشریف لائے اور مجھے جگا دیا۔ پھر بولے۔

میاں اپنے گھر جاکر لیٹو۔ کیا مسجد کو بھی کوئی سرائے
ورائے سمجھ رکھا ہے؟ چلو جلدی اٹھو میں مسجد بند کر رہا ہوں
یہاں رات کے وقت سونے کی اجازت نہیں۔

مرتا کیا نہ کرتا۔ اچھا۔ اپنا بیگ سنبھالا۔ اور کسی
دوسری مسجد کی تلاش میں آگے بڑھا۔

رات کا اندھیرا کافی بڑھ چکا تھا۔ سڑکیں ویران
تھیں۔ تمام بازار اور دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ مسجدوں میں
قفل پڑ چکے تھے۔

جب کافی تلاش و جستجو کے بعد بھی کوئی مسجد نہ ملی
تو سخت تشویش ہوئی۔ اور ایک انجانے خوف کی وجہ سے
میں کانپ گیا۔ اب رات کہاں بسر ہوگی؟

مگر دل مضبوط کیا۔ سوچا اپنے ساتھ تو اپنے اللہ
میاں ہیں، پھر ڈر کاہے کا!

جیل کے دس دن اندھیری کوٹھری میں آرام سے
گذار دیے۔ آج ایک رات کسی مکان یا دکان کے چبوترے پر
سو کر گذر دیں گے۔

اس خیال کے آتے ہی ہمت بندھی۔ اور اب میں ایک
اچھا سا "چبوترہ" تلاش کرنے لگا۔ جلد ہی دکان کا صاف ستھرا
چبوترہ مل گیا۔ جھاڑ پونچھ کرکے اپنا بیگ رکھا اور اس پر سر
رکھ کر سو گیا۔

جب آنکھ کھلی تو حیرت کی انتہا نہ رہی میں کہاں
ہوں؟ میں کہاں ہوں؟ میں نے اپنے آپ
سے پوچھا۔ نہ وہ سڑک، نہ وہ بازار، اور نہ ہی وہ دکان اور
اس کا چبوترہ! گھبرا کر میں چیخ پڑا۔!
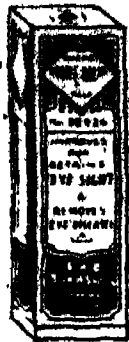
"میں کہاں ہوں! میں کہاں ہوں!

"خبردار جو ذرا بھی آواز نکالی"

ایک ڈراؤنی صورت والے آدمی نے اپنی آنکھیں
اور دانت نکال کر کہا۔

میں نے جب اس کی دھمکی پروا کیے بغیر چیخنا چاہا
تو اس نے اپنی جیب سے ایک چمکتا ہوا چاقو نکالا اور بولا۔
اسے دیکھ لے؟ ابھی تیرا خاتمہ کر دوں گا۔ جو ذرا
بھی چوں کی، بالکل خاموش رہ!

میں سمجھ گیا اب میں بالکل بے بس ہوں۔ اور یہ
شخص مجھے بھی اغوا کرکے لے جا رہا ہے۔ چیخنا چلانا بے کار
تھا۔ ہوشیاری اور عقل و سمجھ سے کام مناسب تھا۔ اس لیے
میں نے کہا۔

مگر بھیّا ـــ آپ مجھے کہاں لے جا رہے ہیں؟

"اپنی 'جنّت' میں۔ اس نے کہا ـــ اور تجھے
وہاں خوب میوے ملیں گے۔ بس ایک شرط ہے تم بالکل خاموش
رہو۔ ـــ "جنت" "میوے"!! میں نے بناوٹی خوشی کا
اظہار کرتے ہوئے کہا۔ پھر تو میں بہت خوش ہوں۔ میں ہرگز
نہیں چیخوں گا۔ کیونکہ میوے تو بہت اچھے لگتے ہیں۔ اور جنت!
آہا ـــ اس کے لیے تو میں مارا مارا پھر رہا ہوں۔

"اچھا۔" اسے بھی حیرت سے کہا۔

پھر کیا ہوا۔ وہ شخص کون تھا۔ یہ جاننے کے لیے
اپریل کا شمارہ ضرور پڑھیے۔

(۱)

تعارف

مدرسہ ثانوی (جامعہ) کی مسند نشینی کا حال پچھلے پرچے میں شائع ہو چکا ہے۔ اس تقریب کے موقع پر ایک رسم بہت انوکھی ادا کی جاتی ہے۔ بہت انوکھی بہت دل چسپ۔ نئے چنے ہوئے لوگوں کا تعارف کرایا جاتا ہے۔ مزاحیہ انداز میں۔ کیا مضمون اور کیا پڑھنے کا مزاحیہ انداز۔ بس دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اب کے ایک بات اور نئی کی گئی تعارف کے سلسلے میں نثر کے علاوہ نظم کا بھی سہارا لیا گیا۔ بچوں کو اور بڑوں کو، سب کو بہت مزہ آیا دو نظمیں نیچے دی جاتی ہیں آپ بھی لطف اٹھائیے۔

ایڈیٹر۔

انھیں دیکھو یہی تو آپ کے جاوید سیّد ہیں
بوقت گفتگو دیکھو ذرا ان کی پریشانی
مگر ہنسنے پہ کچھ حضرت کا ایسا حال ہوتا ہے
ذرا کچھ چست ہے پتلون اور اوپر سے جاکٹ ہے
نہ صاحب چپ ہی رہتے ہیں نہ صاحب شور کرتے ہیں
سینما دیکھنے میں سینکڑوں لوگوں سے آگے ہیں
وزن تک یاد ہے اب تک انھیں سندر بیتا کا
کبھی جب گنگناتے ہیں تو ایسے سر نکلتے ہیں
سنا کچھ آپ نے موصوف کرکٹ کے کھلاڑی ہیں
یہ جس انداز سے جیتے ہیں کوئی جی نہیں سکتا

کسی برگد کے اونچے پیڑ کی مانند جیّد ہیں
نظر نیچی، زباں بے بس، عرق آلود پیشانی
کہ آنکھیں بند ہو جاتی ہیں چہرہ لال ہوتا ہے
یہیں پر بس نہیں یارو، لگی کوٹ پہ پاکٹ ہے
مگر کوئی جو مل جائے تو گھنٹوں بور کرتے ہیں
ٹکٹ کے واسطے روئے ہیں یہ راتوں کو جاگے ہیں
سیتا، کلپنا کا، سادھنا کا اور انیتا کا
کہ جو سنگیت کی چھاتی پہ چڑھ کر مونگ دلتے ہیں
بھلا میں کیسے کہہ سکتا ہوں یہ بالکل اناڑی ہیں
یہ جتنی دال پی لیتے ہیں کوئی پی نہیں سکتا

جہاں میں آپ کی سی خوبیوں کے لوگ کم نکلے
ہزاروں خوبیاں ایسی کہ ہر خوبی پہ دم نکلے

سرزمین کٹک مبارک باد — اے اڑیسہ رہے سدا تو شاد
تیرے فرزند کو ملا اعزاز — تیرا دل بند ہے ہوائی جہاز
مل گیا ہے کفیل کو یہ خراج — یعنی سکریٹری بنے ہیں آج
شکل و صورت پہ آساں تو نہ جا — امتحاں لے کے دیکھ پھر بتلا
ایسا رستم تجھے ملا ہی نہیں — اس سے کانپے ہے آسمان و زمین
ان کا ہر کام ہے شریفانہ — خیر سے آپ ٹھہرے مولانا
ثانوی میں ہے آپ کی تعلیم — خود ہیں کالج کے ہاسٹل میں مقیم
اس طرح دو جگہ ہوئے تقسیم — رحم فرمائے ان پہ رب کریم
اب جو سکریٹری بنے ہیں آپ — ثانوی کے دھلیں گے سارے پاپ
وعظ و تقریر کا زمانہ ہے — لب پہ تبلیغ کا ترانہ ہے
جس نے بھی چھوڑ دی ایک وقت نماز — ایسا جھپٹیں گے اس پہ جیسے باز
آپ کی شان کیا بیان کروں — اپنے قبضے میں ہو تو سب لکھ دوں
سند نامے کے آپ ماہر ہیں — شاعروں میں فدائے ساحر ہیں
ناولوں سے بھی خاص رغبت ہے — کہتے ہیں ناولوں میں لذت ہے
پنج وقتہ نماز پڑھتے ہیں — اور پڑھ کر بہت اکڑتے ہیں
جیسے دنیا میں اک ہی ہیں بزرگ — سب انھیں مان لیں کہ ہیں یہ بزرگ
غلبہ ہوتا ہے جب تصوف کا — ذکر کرتے ہیں نیک لوگوں کا
اور جب رنگ پہ اترتا ہے — بانی آخر وہیں پہ مرتا ہے
جاتے رہتے ہیں یہ کناٹ پلیس — لیکن اکثر بدل بدل کر بھیس
تیل و سرمے سے پاؤڈر تیار — جان لیجیے گئے سپر بازار
فطرتاً نیک اور شرمیلے — شرم و غیرت سے رہتے ہیں پیلے
بات کرتے ہیں مسکراتے ہیں — ایک جملے میں جھینپ جاتے ہیں
دورِ ماضی کی یادگار ہیں آپ — حال سے پھر بھی ہوشیار ہیں آپ
دودھ پینے کی ایسی عادت ہے — چائے کے نام سے بھی نفرت ہے
زینتِ چشم جب سے چشمہ ہے — شانِ محبوبیت نمایاں ہے
جیسے کوؤں میں ہوتی ہے اک چیل — ایسے سکریٹری ہوئے ہیں کفیل
یہ ہیں کمزور بوجھ بھاری ہے — سر پہ کیسی یہ ذمہ داری ہے

جناب شمیم احمد پرویز

روپ بدلتی مچھلیاں

سمندر کے اندر کی دنیا اور اس کے اندر بسنے والے جان داروں کے بارے میں اب بھی ہمیں آپ کو بہت کم باتیں معلوم ہیں مگر ہمارے سائنس داں برابر کھوج میں لگے ہیں۔ ان کی بدولت ہمیں نئی نئی باتیں معلوم ہوتی رہتی ہیں۔

امریکہ میں ایلی گیٹر شیل بھتی ایک جگہ ہے جہاں سائنسداں تحقیق اور کھوج میں ہمہ تن مصروف ہیں اور اس کھوج کی بدولت بہت دل چسپ باتیں معلوم ہوئی ہیں شلاً سمندری جانوروں کی عادتیں اور ان کے رہن سہن کے بارے میں جانکاری کے لیے رات میں اور دن میں دونوں وقت غوطے لگائے گئے اور یہ دیکھ کر سائنسداں حیران رہ گئے کہ سمندر کے اندر بسنے والی بہت سی مچھلیاں رات میں اپنا رنگ بدل لیتی ہیں۔ ان میں اپنا رنگ بدل لینے کی خاصیت قدرت کی دین ہے اور ایسا وہ اپنی حفاظت کے لیے کرتی ہیں۔

رات میں انھیں اپنے دشمن سے خطرہ رہتا ہے اس لیے وہ رات آتے ہی اپنا رنگ روپ بدل ڈالتی ہیں۔ اور ان کے دشمن انھیں پہچاننے میں ناکام رہتے ہیں۔

اسکوئیڈ نام کی مچھلی جسے سیاہی چھوڑ مچھلی بھی کہتے ہیں خطرے کا احساس ہونے پر کالا رنگ چھوڑنے لگتی ہے جس کے اندر یہ اپنے کو چھپا کر دشمن کو دھوکا دے دیتی ہے۔

اسکوئیڈ مچھلی دن میں شیل میں کہیں چھپی رہتی ہے اور رات میں خوراک کی تلاش میں نکلتی ہے اس وقت یہ اپنے کو چھپانے کے لیے رنگ بدل لیتی ہے۔ دن میں یہ نارنجی لال رنگ کی رہتی ہے لیکن رات میں بالکل سفید ہو جاتی ہے۔

گرنٹ مچھلی دن میں چمکیلے رنگ کی رہتی ہے لیکن رات میں یہ پوری سفید رنگ کی ہو جاتی ہے یا اس کے جسم پر سیاہ دھبے ابھر آتے ہیں۔ یہ مچھلیاں دن میں اپنے گروہ کے ساتھ رہتی ہیں لیکن رات آتے ہی گروہ سے الگ ہو کر چارے کی تلاش میں نکل پڑتی ہیں۔

اسپینی گرنٹ مچھلی کا جسم دن میں دھاری دار
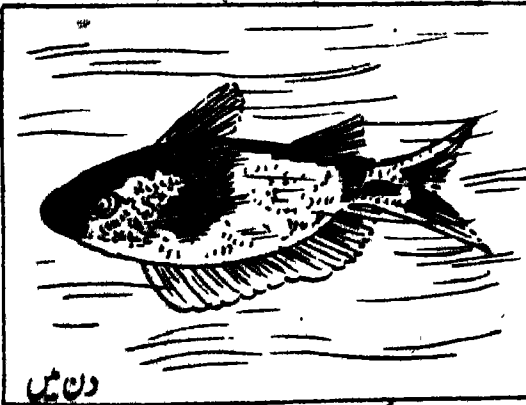
رہتا ہے لیکن رات میں یہ کئی ملے جلے رنگوں کی ہو جاتی ہے۔ اس کی جلد کے پیلے نشانات رات میں مٹ

رات میں

تے ہیں۔ رات میں سرجن مچھلی کا چمکیلا نیلا رنگ
نیا اور سیاہی مائل دھاریوں میں بدل جاتا ہے۔
بٹر فلائی مچھلی بڑی چنچل ہوتی ہے۔ رات میں

دن میں
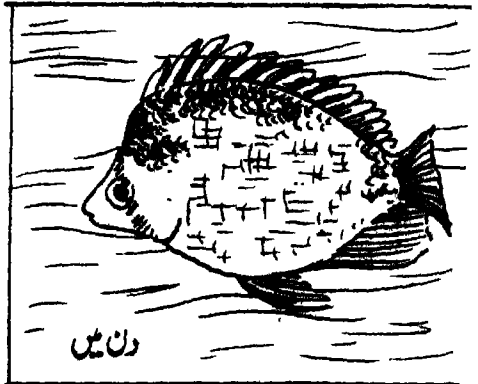
ں کی دم پر سیاہی کا دھبہ ابھر آتا ہے اور سر پر سیاہی
ڑی دھاری نکل آتی ہے جس میں اس کی آنکھیں
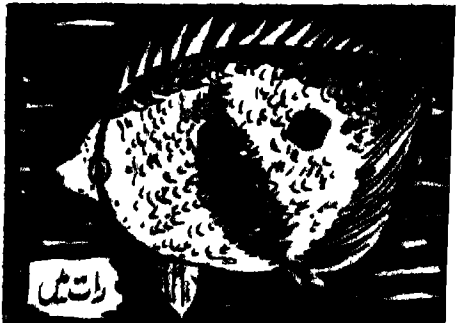
رات میں

جاتی ہیں۔ اس کی دم پر رات میں ابھرے ہوئے سیاہ
ی کی وجہ سے دم ہی سر والا
معلوم ہوتی ہے اور اسی

دھوکے میں پڑ کر دشمن دم پر حملہ کر دیتا ہے اور مچھلی آسانی
سے بھاگ نکلتی ہے۔

یورک فش مچھلی کی دم دن میں پیلی اور
رات میں کالی ہو جاتی ہے۔

گوٹ فش دن میں پیلی رہتی ہے لیکن رات

دن میں

میں اس پر لال دھبے اُبھر آتے ہیں۔ اس کے منہ

رات میں

کے پاس نکلی ہوئی دانت نما چیز رات میں حلق کے نیچے چھپ
جاتی ہے۔

کالی شرینپ مچھلی رات میں اتنی سفید اور شیشے
جیسی ہو جاتی ہے کہ اس کے آر پار دیکھا جا سکتا ہے۔ اس
کے علاوہ دوسری مچھلیوں کے رنگ بھی رات کے وقت اپنے
اصل رنگوں سے ہلکے پڑ جاتے ہیں اور
تیرتے وقت مشکل سے دکھائی دیتے ہیں۔

خوب رہا

جناب وحیدالدین خاں

اے ایڈیٹر تری عظمت کے میں گن گاؤں گا
تو ہے ناصب ترا فن واقعی منصوب رہا

یہ دسمبر بڑی مشکل سے گزارا میں نے
اپنے یوسف کے لیے صورتِ یعقوب رہا

واقعہ یہ ہے کہ ہم کو کوئی پرچا نہ جچا
چشمِ طالب میں جمالِ رخِ مطلوب رہا

عیب سے صرف مبّرا ہے پیامِ تعلیم
جو بھی پرچہ رہا اس دور میں معیوب رہا

چن لیا سیکڑوں پرچوں میں پیامِ تعلیم
تیرا محبوب رسالہ مرا محبوب رہا

قدر و قیمت میں بڑھا اور قد و قامت میں بڑھا
پہلے بھی خوب تھا اور اب تو بہت خوب رہا

باغِ اردو کے مہکتے ہوئے پھولوں کو چُنا
سچ تو یہ ہے کہ ترا حُسنِ نظر خوب رہا

چند لفظوں میں کروں تیری سعی کی تعریف؟
حُسن اکہ یہ سال ترے نام سے منسوب رہا

نظم اخضرؔ نے مری عید کو کر ڈالا تباہ
بزمِ عشرت میں وہ غالب تھی میں مغلوب رہا

ماں[1] کی اصلاح کی تصویر بہت عمدہ رہی
خوب ٹرنیند کے پیلگے کا بھی اسلوب رہا

تیرے اسلوب کی تعریف کروں گا گردھرؔ
اس وکالت میں انوکھا ترا اسلوب رہا

فارسی قند سے لب بند ہوئے جاتے ہیں
جو لطیفہ بھی رہا اپنی جگہ خوب رہا

غمؔ کی یہ نظم "وضو ٹوٹ گیا" پوچ رہی
سالنامے میں یہ مضمون ہی معیوب رہا

نظم میں حضرت اخضرؔ رہے اب کے اوّل
نثر میں "نیشنل اسکول" بہت خوب رہا

"آ مصوّر ترے ہاتھوں کی بلائیں لے لوں"
ٹائیٹل خوب رہا، خوب رہا، خوب رہا

[1] جو پیدا کرے وہ ماں نہیں

مولانا مقبول احمد سیوہاروی

مجاہدین آزادی

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی

ہمارا ہندوستان بھی کیسا اچھا دیس ہے جن لوگوں نے بھی اپنا وطن چھوڑ کر ہندوستان کا رخ کیا، ہندوستان انہیں اتنا اچھا لگا کہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ کوئی دکن میں آکر بس گیا کسی نے پنجاب پسند کیا کوئی اتر پردیش آگیا۔

کوئی اجمیری بنا، کوئی اَوَدھی کوئی دہلوی، کوئی گجراتی ان میں بڑے بڑے عالم ہوئے ایسے عالم کہ رہتی دنیا تک اپنا نام چھوڑ گئے۔ کوئی سنت اور صوفی بنا اور ایسا بنا کہ انسانوں کی خدمت میں تمام عمر گذار دی، انھیں پریم سندیسا سنایا اور یہ سکھایا کہ انسان کا کام کسی سے دشمنی رکھنا اور بیر رکھنا نہیں ہے، انھوں نے نہ ہریجن سے چھوت چھات کی نہ کسی کو اپنے سے نیچا سمجھا سب کو اپنے پاس بٹھایا سب سے ملے سب کے دکھوں کو سنا اور سب کے دکھوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔

اسی دیس ہندوستان میں اب سے بہت دنوں پہلے ایک خاندان آیا تھا۔ یہ عرب کے سب سے اونچے خاندان قریش سے تھا۔ یہ شاہ ولی اللہؒ کا خاندان تھا، ان کا ذکر پڑھنے سے پہلے یہ سن لیجیے کہ ان کے خاندان کے بڑے بوڑھے سب سے پہلے رہتک شہر میں آئے تھے، یہ شہر دلّی کے قریب ہے اور یہیں انھوں نے رہن سہن اختیار کیا تھا۔ ان میں سب کے بڑے شمس الدین مفتی تھے۔

شمس الدین مفتی نے رہتک میں رہ کر لوگوں کو بتایا کہ کسی کا مال لوٹنا اچھا نہیں، کسی کو دھوکا دینا اچھا نہیں، انسان انسان سب برابر ہیں غریب بھی انسان ہیں امیر بھی انسان ہیں۔ انھوں نے یہ سوچ کر کہ انسانوں کی تعلیم کے لیے ایک مدرسہ بنانا چاہیے، رہتک میں مدرسہ بنایا۔ جب یہ مدرسہ بنا تو رہتک والے اپنے بچوں کو اسی مدرسہ میں پڑھانے لگے، پھر کچھ دن بعد مفتی شمس الدین کی اولاد رہتک چھوڑ کر دلّی آگئی۔

شیخ شمس الدین کا کنبہ خوب پھلا پھولا، بیٹے پوتے نواسے ہوئے، ان میں عالم بھی ہوتے اور سپاہی بھی جنھوں نے لڑائی کے میدان میں اپنے جوہر دکھائے، ان میں شیخ وجیہہ الدین کا نام مشہور ہے۔

یہ زمانہ شاہ جہاں کی حکومت کا تھا جس نے دلّی کا لال قلعہ اور جامع مسجد بنائی ہے۔

شاہ جہاں بادشاہ کے چار بیٹے تھے۔ دارا شکوہ شجاع، مراد، اورنگ زیب۔

اورنگ زیب ان سب میں بڑا دین دار تھا۔

پھر جب شاہ جہاں کے بیٹے آپس میں حکومت کے لیے لڑے تو شیخ وجیہہ الدین نے اورنگ زیب عالم گیر کا ساتھ دیا۔ وہ عالم گیر کو حق پر سمجھتے تھے۔

اس لڑائی میں اورنگ زیب کا ایک بھائی شجاع بنگالے کی طرف بھاگا تو عالم گیر کی فوجوں نے اس کا پیچھا کیا جس فوج نے پیچھا کیا ان میں شیخ وجیہہ الدین بھی تھے۔ شجاع کی فوجوں میں ایک ہاتھی بڑا خوں خوار

تھا۔ وہ [illegible] ہاتھی کے پیچھے پیچھے سپاہی [illegible] آگے بڑھ رہے تھے۔ شیخ وجیہ الدین ہاتھی کے قریب آ گئے۔ جوں ہی ہاتھی نے سونڈ اٹھائی شیخ وجیہ الدین نے تلوار کا ایسا ہاتھ مار کر سونڈ کے دو ٹکڑے ہو گئے۔

ہاتھی چنگھاڑتا ہوا پلٹا تو ان سب نوجوانوں کو جو ہاتھی کے پیچھے آ رہے تھے کچلتا چلا گیا اور شجاع ہار گیا۔

عالم گیر شیخ وجیہ الدین کی دلیری اور بے خوفی دیکھ رہا تھا لڑائی جیت لی تو انھیں اپنے پاس بلایا بڑی تعریف کی اور اپنے ہاتھ سے ایک بہت قیمتی تلوار ان کی کمر سے باندھ دی۔

اب آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ اس خاندان میں فقط مولوی اور مسجد کے امام ہی نہ تھے۔ بہادر اور جاں باز بھی تھے۔ کچھ دن بعد شیخ وجیہ الدین ڈاکوؤں کا مقابلہ کرتے کرتے شہید ہو گئے۔

شیخ وجیہ الدین شہید کو بڑے بڑے بزرگوں اور درویشوں نے یہ بشارت دی تھی کہ تمہارا ایک ایسا بیٹا پیدا ہوگا جس کی نسل سے آگے کو تمہارا نام چلے گا۔ پھر دیکھیے انہی شیخ وجیہ الدین کے بیٹے شاہ عبدالرحیم پیدا ہوئے، شاہ ولی اللہ کے والد بزرگوار۔

شاہ عبدالرحیم کی بچپن کی ایک بات ہم آپ کو سناتے ہیں۔ جس سے آپ کی سمجھ میں آ جائے گا کہ وہ کیسے تھے!!

جس محلہ میں شاہ عبدالرحیم رہتے تھے۔ اسی میں بخارا کے ایک درویش آ کر ٹھہر گئے تھے۔ ان کا نام خواجہ ہاشم تھا۔ شیخ عبدالرحیم بھی ان کے پاس جاتے تھے۔

ایک دن خواجہ ہاشم بولے "میں تمہیں ایسا وظیفہ بتاتا ہوں جس سے خوب مال دار ہو جاؤ"

شاہ عبدالرحیم نے جواب دیا۔ حضرت مجھے [illegible] کی کوئی تکلیف نہیں ہے۔ میرا خدا ہر بڑے سے بڑا ہے اور خدا ہی میرا کارساز ہے مجھے وظیفہ نہیں چاہیے۔

شاہ عبدالرحیم کا شہرہ سن کر عالم گیر بھی ان سے ملنا چاہتا تھا۔ ایک دن دربار کے ایک امیر کو یہ پیغام دے کر بھیجا کہ میں حضرت سے ملنا چاہتا ہوں۔ شاہ عبدالرحیم نے ایک پرچہ پر بادشاہ کو جواب دیا۔

"خدا کے خاص بندوں کا یہ کہنا ہے
کہ سب سے برا درویش وہ ہے جو
امیروں کے دروازے پر جائے' میں
آپ کے پاس آؤں گا اور آپ مجھ کو بلائیں
گے تو خدا کے نزدیک یہ پسندیدہ نہ
ہوگا۔
بزرگوں نے فرمایا ہے کہ جس کا نام
شاہی رجسٹر میں لکھا جاتا ہے۔ خدا
کے دفتر سے اس کا نام کاٹ دیا
جاتا ہے۔"

عالم گیر کے پاس یہ تحریر پہنچی تو اس نے غور سے پڑھا اور یہ کاغذ تعویذ بنا کر اپنے پاس رکھ لیا۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی

شاہ ولی اللہ فقط دلّی میں نہیں ہندوستان میں نہیں، ایشیا کے تمام علمی حلقوں میں مشہور ہیں۔ ان کے علمی کمالات' ان کی بے مثال کتابیں' بخاری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پر پورا عبور' قرآن کے مطالب کی بھی تفسیر' تصوف کی کامل واقفیت سے عرب اور ہندوستان کے بڑے بڑے باکمال حیران ہیں۔ ان کی کتابوں

میں شاہ صاحب نے جو کچھ بتایا ہے سند کے طور پر اسے
پیش کرتے ہیں۔

تاریخ جاننے والے حدیث جاننے والے شاہ صاحب
کا لکھا ہوا پڑھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ حق بات وہی ہے جو شاہ
صاحب لکھ گئے ہیں۔

شاہ صاحب نے اپنے بزرگوں سے بھی پڑھا اور
عرب کے عالموں سے بھی پڑھا۔ عرب سے واپس آئے تو دلی
میں ہزاروں کو عالم بنا دیا

شاہ صاحب کا بچپن

شاہ صاحب کسی بات پر ضد نہ کرتے تھے، کوئی
بزرگ اور بڑا بات کرتا تو سر جھکا کر اس کی بات سنتے اور
آہستگی سے جواب دیتے۔ باپ کے سامنے ہمیشہ اپنی نگاہ
نیچی رکھتے، کبھی پاؤں پھیلا کر نہ بیٹھتے۔

ایک دفعہ شاہ صاحب کے ایک عزیز شاہ صاحب
کو باغ میں لے گئے۔ واپس آئے تو ان کے باپ شاہ
عبدالرحیم نے پوچھا باغ کی سیر سے تم نے کیا فائدہ حاصل
کیا۔ ہم تو اتنی دیر تک (جب سے تم گئے اور آئے) رسول اللہ
صلے اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھتے رہے۔ یہ سن کر حضرت
شاہ ولی اللہ چپ ہو گئے۔ اور پھر کبھی ادھر ادھر بے کار
گھومنے کا خیال دل میں نہ آیا۔

شاہ صاحب نے اپنے بچپن میں یہ کبھی نہ کہا کہ
یہ کھانا اور یہ کپڑا مجھے پسند نہیں ہے۔ پھر ان باتوں کا
یہ اثر تھا کہ باپ ان پر اتنی شفقت کرتے تھے کہ شاہ صاحب
نے اس کا ذکر اپنی کتابوں میں بھی کیا ہے

شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ مجھے جو کچھ
حاصل ہوا ہے، باپ کی دعاؤں سے حاصل ہوا ہے۔

شاہ صاحب نے اپنی پوری زندگی علم کی خدمت میں گزاری۔
ایک طرف طالب علموں کا جمگھٹ رہتا۔ لوگ مسئلے پوچھتے تو
شاہ صاحب ایسا جواب دیتے تھے کہ سننے والے کو تسکین
ہو جاتی۔

اپنے دوسرے علمی کاموں کے علاوہ شاہ صاحب
کا ایک اور علمی کارنامہ ہے وہ فقط مسلمانوں کے لیے نہیں
عالم انسانیت کے لیے ایسی یادگار چھوڑ گئے ہیں اور ایسی
روشنی دے گئے ہیں جس سے سینکڑوں چراغ روشن ہو گئے۔

لوگ اللہ کا کلام قرآن پاک پڑھتے تھے مگر
یہ نہیں جانتے تھے کیا پڑھ رہے ہیں اور قرآن ہمیں کیا
سکھاتا ہے۔

جس زمانے کا یہ ذکر ہے عام طور سے ہندوستان
کے شہروں میں فارسی بولی جاتی تھی۔ حضرت شاہ ولی اللہ
نے فارسی میں کلام پاک کا ترجمہ کیا۔ یہ پہلی کوشش تھی
جس سے مسلمانوں اور دوسری قوموں کو معلوم ہوا کہ قرآن پاک
فقط دعا یا وظیفہ نہیں ہے، اس میں حکمت ہے تعلیم ہے
زندگی گذارنے کے طور طریقے ہیں۔

یہ ترجمہ ہو گیا تو کچھ ملا بڑے گھبرائے کہ اب تو
سب ہی لوگ قرآن سمجھنے لگیں گے۔ ہمیں کون پوچھے گا،
اور حضرت شاہ صاحب کے قتل کے درپے ہو گئے۔ مگر
ان کی کچھ نہ چلی۔ پھر حضرت شاہ ولی اللہ کے فرزند شاہ
عبدالقادر نے اور حضرت شاہ رفیع الدین نے اردو ترجمہ کیا۔

یہ ترجمے پرانے ہو گئے ہیں مگر بہت سے لوگ
کہتے ہیں کہ جیسی برکت اور جیسا فائدہ ان ترجموں میں ہے دوسرے
ترجموں میں نہیں ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ اورنگ زیب کے
دور حکومت میں ۱۱۱۴ھ بدھ کے دن سورج

گئے پیدا ہوئے۔ پانچ برس کی عمر میں مکتب میں بٹھایا گیا۔ دو سال میں کلام پاک ختم کیا۔ نماز پڑھنے لگے، رمضان کے روزے رکھنے لگے۔ فارسی اور فارسی کے ساتھ عربی چلنے لگی۔
دسویں برس عربی کی کتاب شرح ملا جامی ختم ہو گئی، تیرہ برس کی عمر میں ہر علم میں کامل ہو گئے تھے۔ قرآن و حدیث صرف و نحو اور تفسیر میں۔ اور بڑے بڑے عالموں میں ان کا شمار ہونے لگا۔
چودہ سال کی عمر میں فضیلت کی پگڑی باندھی گئی۔
حضرت شاہ ولی اللہ نے جن کتابوں کو اپنے بزرگ باپ سے پڑھا تھا ان کا نام لکھا ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ میں ہر کتاب میں سے جو کوئی سوال کرتا تھا۔ ایسا جواب دیتا تھا کہ سوال کرنے والا دنگ رہ جاتا تھا۔
سترہ سال کی عمر میں باپ اللہ کو پیارے ہوئے اور گھر کا، مدرسہ کا تمام بوجھ حضرت شاہ ولی اللہ پر آ پڑا اور پورے بارہ سال تک شاہ صاحب اپنے باپ کے مدرسہ رحیمیہ میں پڑھاتے رہے۔
کچھ دن بعد خیال آیا کہ حدیث کا علم مکہ اور مدینہ کے عالموں سے حاصل کرنا چاہیے جس گھر سے یہ علم چلا ہے وہیں جا کر سیکھا جائے تو کیا کہنا۔
ایک سال تک مکہ معظمہ رہے اور کچھ دن مدینہ منورہ میں گذارے اس زمانہ کے عرب کے مشہور عالموں میں شیخ ابو طاہر تھے جن سے شاہ صاحب نے حدیث کی سند حاصل کی۔
عرب کے عالموں میں شیخ وفد اللہ بھی بڑے عالم تھے۔ ان سے بھی حدیث کی سند لی۔
ابھی ابھی آپ نے پڑھا ہے کہ شاہ صاحب نے قرآن کا فارسی میں ترجمہ کیا تو دلی کے کٹھ ملا ان کے مخالف ہو گئے۔ ان کا واقعہ بھی سن لیجیے۔ مولویوں نے عام لوگوں میں یہ بات پھیلا دی کہ فارسی ایران کی زبان ہے اور کافرانہ زبان ہے۔ شاہ ولی اللہ نے کافرانہ زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ اس لیے ایسے آدمی کو مار ڈالنا روا ہے۔ اور عصر کے وقت بہت سے لفنگوں کو لے کر فتح پوری کی مسجد میں پہنچ گئے۔ شاہ صاحب کے ساتھ بہت تھوڑے سے آدمی تھے۔ دشمن ایکسو سے بھی زیادہ تلواریں باندھے کھاری باولی کی طرف جو دروازہ ہے جم کر کھڑے تھے کہ شاہ صاحب نکلیں تو انھیں قتل کر ڈالیں مگر شاہ صاحب ذرا نہ ڈرے۔ اور ڈرتے بھی کیوں وہ تو مجاہدانہ عزم رکھتے تھے۔ بس ایک پتلی سی لکڑی لے کر دروازہ کے باہر نکلے اور اللہ اکبر کا ایسا پر جوش نعرہ لگایا کہ سارا مجمع ادھر ادھر ہو گیا اور شاہ صاحب نکلے چلے گئے۔

شاہ صاحب کی ایک کتاب حُجَّةُ اللّٰهِ الْبَالِغَة ہے۔ یہ ایسی کتاب ہے جسے پڑھ کر ہندوستان، عرب، مصر اور افریقہ کے عالم حیرت کرتے ہیں کہ شاہ صاحب نے قرآن و حدیث کی باتوں کو کتنے دل نشیں پیرایہ اور کیسی مضبوط دلیلوں سے سمجھایا ہے۔ شاہ صاحب لکھتے ہیں۔
ایک دن عصر کی نماز کے بعد خدا سے لو لگائے بیٹھا تھا کہ سرکار دو عالم محمد رسول اللہ کی روح مبارک ظاہر ہوئی حضور کی روح مجھ پر چھا گئی معلوم ہوتا تھا جیسے مجھ پر چادر اڑھا دی ہے۔
ایک دوسرا خواب بیان کرتے ہیں۔
امام حسن و امام حسین میرے گھر تشریف لائے ہیں اور امام حسن ایک قلم لیے ہوئے ہیں جس کی نوک ٹوٹی ہوئی ہے۔ حضرت حسن یہ قلم مجھے دینا چاہتے تھے۔

فرمانے لگے میرے نانا محمد رسول اللہ کا قلم ہے حسینؓ اس کو درست کردیں تو دوں گا۔ حسینؓ کے سوا یہ قلم کسی سے درست نہ ہوگا۔ امام حسینؓ نے قلم لیا اور درست کر کے مجھے دے دیا پھر ایک چادر جس کی ایک دھاری سفید اور ایک سبز تھی کسی نے لاکر ان دونوں اماموں کے سامنے رکھ دی امام حسینؓ نے فرمایا یہ چادر بھی میرے نانا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے اور مجھے اڑھادی۔ میں نے چادر کی تعظیم کی اور اسے سر پر رکھ لیا۔

یوں تو خواب کی تعبیر بڑی لمبی ہے مگر اتنی بات صاف نظر آتی ہے کہ تھوڑی سی مدت میں سینکڑوں رسالے عربی فارسی زبان میں لکھ دینا اور اس اندازِ بیان میں جیسی حدیثوں کا اندازِ بیان ہے لکھنا یہی حسنی اور حسینی فیضان کا کرشمہ تھا۔

کتابیں بھی ایسی جن میں ادب بھی ہے فلسفہ بھی ہے۔ حدیث بھی ہے فقہ اور تصوف بھی ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ کے زمانہ میں مسلمان بڑے امیر تھے۔ مگر سب دین سے غافل تھے اور اپنی غرضوں میں مبتلا تھے۔ شریعت الہٰی کی طرف دھیان نہ تھا۔ درویشوں میں بھی زیادہ ایسے ہی تھے کہ مریدوں سے خدمت اور خدا کا راستہ بتانے کی جگہ دن رات ان سے کام لیتے تھے۔

امیر جن کا کام غریبوں کی سیوا کرنا ہے۔ دن رات ناچ رنگ میں پڑے تھے۔ غریب پڑوسی بھوکا مرتا اور ان کے کتے دودھ پیتے۔ عالم مفتی اور امام ذرا ذرا سی بات پر آپس میں جھگڑتے۔

حضرت شاہ صاحب نے ایسے عالموں، درویشوں اماموں اور مفتیوں کو خوب ڈانٹا ہے اور بے خوف ہو کر برا کہا ہے اور خدا کے خوف سے ڈرایا ہے۔

پیروں اور درویشوں کی ایسی خبر لی ہے کہ بٹ مار اور لیٹرا تک لکھ دیا ہے۔

شاہ صاحب نے واعظوں سے مخاطب ہو کر کہا ہے اے واعظو! تم گھڑی ہوئی حدیثیں لوگوں کو سناتے ہو اللہ کی مخلوق کی زندگی تم نے تنگ کر رکھی ہے کیا تمھارے کام وہی ہیں جنھیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ کرتے تھے۔

شاہ صاحب کا زمانہ وہ تھا کہ مغل حکومت دم توڑ رہی تھی مسلمانوں کے مدرسوں میں فلسفہ اور فقہ کی کتابوں کے سوا کچھ نہ پڑھایا جاتا تھا حضرت شاہ صاحب نے پچاس برس اپنے باپ کے مدرسہ میں پڑھایا اور حدیث، قرآن اور تفسیر قرآن کا ایسا چراغ روشن کیا کہ آج تک وہ چراغ روشن ہے اور اب تک حدیث و قرآن کی روشنی چمک رہی ہے اور ہندوستان کے باہر کے رہنے والے بھی ہندوستان ہی سے حدیث و قرآن کی سندیں لے کر جارہے ہیں پھر دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں جتنی دین داری ہندوستان میں ہے شرک کے کاموں میں جتنی نفرت یہاں ہے کسی دوسری جگہ نہیں ہے اور یہ سب اسی خاندان ولی اللّٰہی کا فیض ہے اور یہی سب سے بڑا جہاد ہے جس کا ثواب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جاری رہے گا۔ انشاء اللہ۔

حضرت شاہ صاحب کے چار صاحبزادے ہوئے۔ شاہ عبدالقادر، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالغنی، شاہ عبدالعزیز رحمہم اللہ تعالےٰ۔

شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین کا ترجمہ کلام پاک اردو زبان میں پہلا صحیح ترجمہ ہے۔ اور یہ چاروں اپنے وقت کے بڑے عالم اور مجاہد گذرے ہیں۔

(باقی آئندہ)

جناب رفیق شاستری

پنچ تنتر کی کہانیاں

مسلسل

دمنک نے جب سنجیوک بیل کو لڑائی کے لیے آمادہ دیکھا تو وہ دل میں ڈرا کہ کہیں اس بیل کے سینگ سچ مچ پنگلک شیر کے پیٹ میں نہ گھپ جائیں اگر ایسا ہوا تو بڑا غضب ہو جائے گا۔ اس لیے اس نے پھر سنجیوک کو اس جنگل کو چھوڑ کر چلے جانے کی تلقین کی اور کہا ـــــ دوست تمھارا کہنا بھی ٹھیک ہے مگر آقا اور نوکر کی لڑائی سے کیا فائدہ۔ اگر دشمن مضبوط ہو تو موقع بچا جانا ہی عقلمندی ہوتی ہے۔ طاقتور سے لڑنا اچھا نہیں ہوتا۔ نہیں تو اس کی وہی حالت ہوتی ہے جو سمندر سے ٹکرا کر ٹیٹری کی ہوئی تھی۔

یہ سنتا تھا کہ سنجیوک چونکا اس نے کہا، ٹیٹری کی کیا بات تم نے کہی ذرا مجھ کو بھی تو سنا دو۔

ٹیٹری کے انڈے

سمندر کے کنارے ٹیٹری کا ایک جوڑ رہتا تھا۔ انڈے دینے کا وقت آیا تو ٹیٹری نے ٹیٹرے سے کہا ہمیں سمندر سے ہٹ کر کوئی محفوظ جگہ ڈھونڈ لینی چاہیے مگر ٹیٹرے نے اس کی بات پر دھیان نہ دیا اور یہ کہہ کر ٹال دیا تم بے کار کی فکر مت کرو۔

ٹیٹری نے اس پر اسے یاد دلایا کہ سمندر میں جب جوار بھاٹا آتا ہے تو اس کی لہریں متوالے ہاتھی کو بھی بہا لے جا سکتی ہیں۔ ہم لوگوں کی کیا حقیقت ہے اس لیے ہمیں سمندر سے دور کوئی جگہ چن لینی چاہیے۔

ٹیٹرے نے بہت گھمنڈ سے اس کا جواب دیتے کہا۔ سمندر کی یہ مجال نہیں کہ وہ میرے بچوں کے ساتھ ـــ بد سلوکی کرے وہ مجھ سے ڈرتا ہے۔ تم بلا خوف اسی جگہ انڈا دو۔

کہیں سمندر نے ٹیٹرے کی یہ بات سن لی۔ اس نے سوچا یہ ٹیٹرا تو بہت گھمنڈی ہے۔ اسے اس کی سزا ملنی چاہیے۔ شاید یہ آسمان کی طرف پیر اٹھا کر اس لیے سوتا ہے کہ وہ گرتے ہوئے آسمان کو اپنی ٹانگوں پر سنبھال لے گا۔ اس کا غرور ضرور توڑنا چاہیے یہ سوچ کر اس نے جوار آنے پر ٹیٹری کے انڈوں کو

لہروں میں بہا دیا۔

ٹیٹری جب دوسرے دن آئی تو انڈوں کو بہتا دیکھ کر بہت روئی اور ٹیٹرے سے کہا۔ یہ کیا بے وقوفی ہم لوگوں نے کی میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ لہریں انڈے بہا لے جائیں گی مگر تم اپنے گھمنڈ میں کب کسی کی سنتے ہو۔ جو اپنے عزیزوں اور دوستوں کی باتوں پر دھیان نہیں دیتا اس کی وہی حالت ہوتی ہے جو اس بے وقوف کچھوے کی ہوئی تھی جس نے اپنے دوستوں کا کہا نہ مان کر منہ کھول دیا تھا۔

ٹیٹرے نے کہا۔ ایں یہ کچھوے کی کیا بات تم نے کی۔

ٹیٹری نے کہا۔ اچھا تو پہلے بیوقوف کچھوے کی کہانی سنتے چلو۔

بے وقوف کچھوا:

ایک تالاب میں ایک کچھوا رہتا تھا اس تالاب پر دو ہنس آیا کرتے تھے۔ کچھوے کی ان ہنسوں سے دوستی ہو گئی۔ تینوں میں بہت گاڑھی چھنتی تھی۔

ایک سال ایسا ہوا کہ بارش بالکل نہیں ہوئی اور تالاب سوکھنے لگا۔ ہنسوں کو یہ دیکھ کر کچھوے کے حال پر بہت ترس آیا۔ کچھوے نے بھی ڈبڈبائی آنکھوں سے کہا تالاب سوکھ رہا ہے اور اس کے سوکھنے کے بعد میری جان بھی نہیں بچے گی۔ تالاب کے سوکھنے کے ساتھ کچھوے کی جان بھی سوکھتی جاتی۔

بہت غور کے بعد یہ طے کیا گیا کہ دو ہنس جنگل سے ایک بانس کی چھڑ لائیں گے۔ کچھوا اس چھڑ کو منہ سے پکڑے گا اور ہنس اس چھڑ کو مضبوطی سے پکڑ کر اڑتے ہوئے دوسرے تالاب تک پہنچ جائیں گے۔
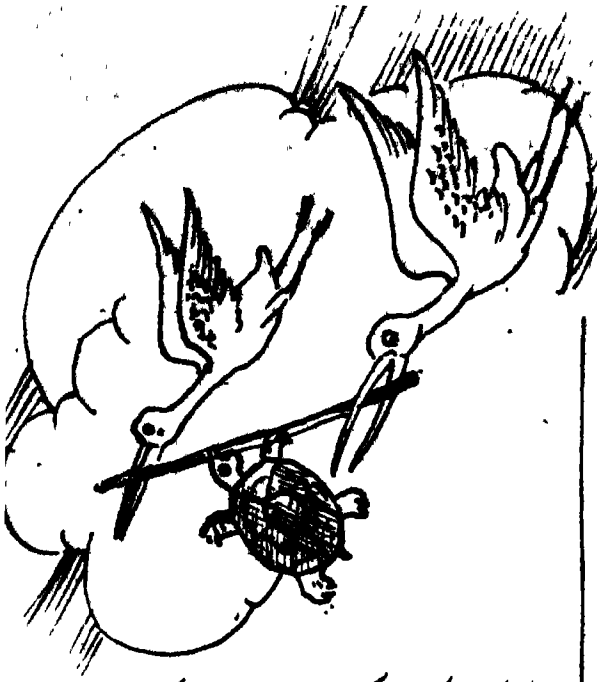
ہنسوں نے کچھوے سے اچھی طرح تاکید کر دی کہ چاہے کچھ ہو جائے تم اپنا منہ نہ کھولنا۔ زبان ہلائی کہ گئے کام سے۔ تم کسی بھی طرح کی لالچ، غصے یا خوشی میں آکر زبان نہ ہلانا یہ تمھارے لیے بڑی آزمائش کا موقع ہے۔

کچھوے نے اطمینان دلایا۔ اور چھڑ کو بہت مضبوطی کے ساتھ اپنے منہ سے پکڑ لیا۔ ہنسوں نے اب لکڑی کے دونوں کنارے چونچوں میں پکڑ کر اڑان بھرنی شروع کی اور اپنے پروگرام کے مطابق دوسرے تالاب کی جانب اڑنے لگے۔

لوگوں نے جو یہ انوکھی سی چیز دیکھی کہ دو ہنس ایک کچھوے کو اڑائے لیے جا رہے ہیں تو انھیں بڑا اچنبھا ہوا اور وہ لوگ شور مچاتے اور تالیاں بجانے لگے۔ کچھوے نے ایک بار گردن جھکا کر نیچے دیکھا پھر اسے ہنسوں کی بات یاد آگئی اور وہ پہلی طرح چپ رہا۔

مگر اب لوگوں کے شور شرابے کی آواز بڑھتی جا رہی تھی۔ یہ شور سن کر کچھوے سے نہ رہا گیا

ان نے سوچا کہ ان لوگوں کو ڈانٹ کر خاموش کر دینا چاہیے۔
ابھی اس کی زبان سے ارے ۔ ۔ ۔ یہ ۔ ۔ ۔ شور ۔ ۔ ۔
کیسا ہے ۔ ۔ ۔ پوری طرح نکلنے بھی نہ پایا تھا کہ منہ کھلتے ہی
کچھوا زمین پر آ رہا۔ بے چارے کی ہڈی پسلی ایک ہو گئی۔

×........×........×

ٹیٹری نے یہ کہانی سنا کر کہا کہ اسی لیے میں کہتی ہوں کہ اپنے ہمدردوں کے مشورے پر نہ چلنے والا آدمی برباد ہو جاتا ہے۔ پھر عقلمندوں میں بھی انہی کی عقل کام آتی ہے جو دوراندیشی سے کام لے کر مصیبت آنے سے پہلے ہی اس کا حل سوچ چکے ہوتے ہیں۔ جو لوگ دور اندیش نہیں ہوتے وہ برباد ہو جاتے ہیں۔

ٹیٹرے نے پوچھا وہ کیسے۔ تب ٹیٹری نے مچھیرے کی یہ کہانی سنائی۔

جو ہو گا دیکھا جائے گا

ایک تالاب میں تین مچھلیاں رہتی تھیں۔ ایک دن مچھیروں نے انھیں دیکھ لیا اور سوچا اس تالاب میں خوب مچھلیاں ہیں۔ کل اس میں جال ڈالوں گا۔

چھوٹی مچھلی نے ان کی بات سن کر سب مچھلیوں کو بلایا اور کہا۔ "آپ ان مچھیروں کی بات سن ہی لی ہے۔ اب ہمیں راتوں رات اس تالاب کو چھوڑ کر کسی دوسرے تالاب میں چلے جانا چاہیے۔ دم بھر بھی دیر کرنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔

منجھولی مچھلی نے بھی اس کی بات کی تائید کی اور کہا ــــ بہن تم ٹھیک کہتی ہو پردیس میں جانے کا ڈر لوگوں کو اکثر بزدل اور کم ہمت بنا دیتا ہے۔ اپنے ہی کنویں کا پانی پئیں گے۔ یہ کہہ کر جو لوگ زندگی بھر کھارا پانی پیتے ہیں وہ بزدل ہوتے ہیں۔ اپنی ہی نگری کا راگ وہی لوگ الاپتے ہیں جو نگری کے باہر قدم نکالنے کی ہمت نہیں رکھتے۔

ان دونوں کی باتیں سن کر بڑی مچھلی ہنس پڑی اور کہنے لگی "کسی راہ چلتے آدمی کی باتوں سے ڈر کر ہمیں اپنے آبائی وطن کو نہیں چھوڑ دینا چاہیے۔ قسمت میں ہو گا تو ہم یہاں بھی محفوظ رہیں گے اور قسمت اچھی نہ ہوئی تو کہیں جا کر بھی جال میں پھنس جائیں گے۔ تم لوگوں کو جانا ہو تو جاؤ میں تو کہیں نہیں جاتی۔ یہیں آرام سے ہوں"۔

بڑی مچھلی کو آمادہ نہ پا کر چھوٹی اور منجھلی مچھلیاں اپنے بال بچوں کے ساتھ پاس کے تالاب میں چلی گئیں۔ اگلے دن سویرے مچھیروں نے تالاب میں جال ڈال کر ساری مچھلیوں کو پکڑ لیا۔

×........×........×

یہ کہانی سنا کر ٹیٹری نے کہا کہ جو لوگ دوراندیشی سے کام نہیں لیتے اور "جو ہو گا دیکھا جائے گا" کہہ کر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں۔ وہ تباہ ہو جاتے ہیں ہمیں ہر مصیبت کا حل پہلے سے سوچ لینا چاہیے"۔

یہ بات سن کر ٹیٹرے نے ٹیٹری سے کہا کہ تو مجھے اس بڑی مچھلی جیسا بے وقوف نہ سمجھ تو نے ابھی میری عقل کا کھیل کہاں دیکھا ہے میں ابھی اپنی چونچ سے پانی نکال نکال کر سمندر کو سکھا دیتا ہوں۔ پانی سوکھ جائے گا تو اس کا سارا گھمنڈ ہوا ہو جائے گا۔

یہ سن کر ٹیٹری بہت ہنسی اور کہنے لگی "سمندر کے ساتھ تیری دشمنی کچھ زیب نہیں دیتی اس پر غصہ اتارنے سے کیا حاصل؟ اپنی طاقت کا اندازہ کر کے ہی ہمیں کسی کی دشمنی مول لینی چاہیے۔

نہیں تو آگ میں جلنے والے پتنگے کی سی حالت ہو جائے گی۔

مگر ان باتوں کا ٹٹیرے پر کوئی اثر نہ ہوا اور وہ چونچوں سے پانی نکال نکال کر سمندر سکھانے کی ڈینگ ہانکتا رہا۔ اس پر ٹٹیری نے اسے منع کرتے ہوئے کہا کہ جس سمندر کو گنگا جمنا جیسی سیکڑوں ندیاں ہر وقت اپنے پانی سے بھر رہی ہوں اُسے بھلا تو اپنی چونچ سے بوند بھر پانی اٹھا کر سکھا سکتا ہے۔

مگر ٹٹیرا اپنی بات پر اڑا رہا یہ دیکھ کر ٹٹیری نے کہا — اگر تو نے سمندر کو سکھا ڈالنے کی ضد ہی کر رکھی ہے تو دوسرے چرند پرند سے بھی مشورہ کر کے کوئی قدم اٹھا۔ کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ چھوٹے چھوٹے بہت سے لوگ مل کر اپنے سے بہت بڑے کو بھی ہرا دیتے ہیں۔ جیسے چڑیا، ہُدہُد اور مینڈک نے مل کر ہاتھی کو مار دیا تھا۔

یہ سننا تھا کہ ٹٹیرے نے چڑیا اور ہاتھی کی کہانی سننے کا اصرار کیا۔ ٹٹیری نے کہا اچھا تو پہلے وہی کہانی سن لو۔

باقی آئندہ

جناب اقبال مہدی

ایک دن کیا ہوا

دوپہر کے کھانے کے بعد سلیم اور سلمٰی کو کچھ دیر آرام کرنے کے لئے کمرے میں لٹا دیا گیا۔ امی باہر برآمدے میں کوئی کام کرنے لگیں۔

سلیم اور سلمٰی کو نیند نہ آئی۔ لیٹے لیٹے کھیلنے لگے۔ کھیلتے کیا گُدے کود پھاند کرنے لگے۔ اتنے میں "چٹ" سی ایک آواز ہوئی اور ایسا لگا جیسے پلنگ کچھ ڈھیلا ہو گیا ہو۔

دونوں نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ پتہ چلا کہ پائنتی کی رسّی ٹوٹ گئی ہے۔ دونوں خوب ہنسے۔ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ خوب اچھلے کودے۔ پلنگ اور ڈھیلا ہوتا چلا گیا۔ جب بہت ڈھیلا ہو گیا تب دونوں کو فکر ہوئی۔

سلیم نے کہا "آؤ۔ یہ پائنتی کی رسی جوڑ دیں۔"

سلمٰی نے بھی اتفاق کیا۔ "ہاں نہیں تو امّی ڈانٹیں گی۔"

دونوں پلنگ سے اترے۔ سلیم نے رسّی کے ٹوٹے ہوئے دونوں کناروں کو ملانا چاہا۔ دونوں کے درمیان فاصلہ زیادہ تھا۔ کھینچنے پر بھی دونوں قریب نہ آسکے۔ "اب کیا کیا جائے؟" سلیم سوچنے لگا ——— آدمی سوچے تو ہر مشکل کام کا حل نکل آتا ہے۔ سلیم کی سمجھ میں بھی ایک ترکیب آگئی۔ اس نے پلنگ کے ایک کنارے سے پائنتی کی رسی کسنی شروع کی۔ تاکہ اس طرح کچھ ڈھیل نکل آئے اور ٹوٹی ہوئی رسّی کے کنارے ایک دوسرے کے ساتھ باندھے جا سکیں۔

کچھ ڈھیل نکلی لیکن دونوں کنارے پھر بھی نہ مل سکے۔ اب سلیم پلنگ کے دوسرے کنارے سے پائنتی کی رسی کو کستا ہوا لایا۔ کنارے بھی دور رہے۔

"اب کیا ہو؟" سلیم اپنا سر کھجانے لگا۔

سلمٰی نے ترکیب بتائی "یہ بندھی ہوئی رسی کو ایک طرف سے کھول لو اور اُس طرف سے بہت سی ڈھیل نکالتے ہوئے لے جاؤ۔"

ترکیب معقول تھی۔ سلیم نے بندھی ہوئی رسّی کو کھولنا چاہا۔ گرہ سخت تھی۔ نہ کھل سکی۔ سلمٰی نے کوشش کی۔ اس سے بھی نہ کھلی۔ پھر دونوں نے مل کر کوشش کی۔ آخر گرہ کھل گئی۔ اب کام آسان ہو گیا۔ سلیم نے جلد ڈھیل نکال کر رسّی کو جوڑ دیا۔

یہ کام ختم کر کے ذرا اطمینان ہوا۔ سلیم ستانے کھڑا ہو گیا۔ پائنتی کی رسّی کسنے میں اس کے ہاتھ میں جگہ جگہ پھانسیں چبھ گئی تھیں۔ اس وقت تو پریشانی میں محسوس نہ ہوا۔ اب وہ تکلیف دینے لگیں۔ ٹٹول ٹٹول کر ہاتھ میں سے پھانسیں نکالنے لگا۔ جب پھانس کھٹکتی تو وہ "سی" کرتا۔ سلمٰی ہنس پڑتی۔ سلیم بھی کبھی ہنس دیتا، کبھی جھنجھلا جاتا۔

اب پلنگ کو کسنے کا سوال تھا۔ سلیم نے رسّی کا کھلا ہوا کنارہ سلمٰی کے ہاتھ میں دیا اور خود پائنتی کسنی شروع کی۔ ایک بار کسنے کے بعد بھی پلنگ کافی ڈھیلا رہا۔ دوبارہ کسنا شروع کیا۔ اس مرتبہ کام زیادہ سخت محسوس ہوا۔ ہاتھ بھی تھک گئے تھے۔ کمر بھی دکھنے لگی تھی۔ اور پھانسیں پھر لگ رہی

تھیں۔ برابر زور دینے کے بجائے جھٹکے دے کر کسنے لگا۔
ایک مرتبہ جب جھٹکا دیا۔۔۔۔۔

تو رسّی کمزور تھی، کھٹ سے ٹوٹ گئی۔ کمر کے بل پیچھے گرا۔ ٹانگیں اور ہاتھ اوپر اٹھے رہ گئے۔ سر میں چوٹ آئی۔ اسے گرا ہوا دیکھ کر سلمہ کو زور سے ہنسی آئی۔ دیر تک ہنستی رہی۔

سلیم جھینپ کر اٹھا۔ سلمہ کے ساتھ خود بھی ہنسنے کی کوشش کی۔ کپڑے جھاڑے، سر سہلایا اور پھر رسّی جوڑنے کی فکر کرنے لگا۔

سلمہ برابر ہنسے جا رہی تھی۔ سلیم چڑ گیا۔ "کیا کھی کھی، کھی کھی کئے جا رہی ہو۔ پائنتی توڑ دی۔ اب کس رہا ہوں تو کسواتی نہیں۔"

وہ پھر کنارے پر سے ڈھیل نکال کر لایا اور رسّی جوڑ دی۔ سلمہ اب بھی اس کا گرنا یاد کر کے ہنس پڑتی تھی۔ سلیم نے ڈانٹ کر کہا "کس کر پکڑو رسّی"۔ سلمہ نے رسّی کا کنارہ کھینچا۔ سلیم نے پھر پائنتی کسنا شروع کی۔ آخر تک پہنچنے والا تھا کہ سلمہ کو پھر ہنسی آئی۔ سلیم نے پھر ڈانٹا "کس کر کھینچو"۔ سلمہ نے ایک دم سے جو رسّی کو کھینچا تو جھٹکا کھا کر رسّی پھر ٹوٹ گئی اور سلمہ زور سے پیچھے جا کر گری۔ سر میں سخت چوٹ آئی رونے لگی۔

امی بہت دیر سے دونوں کی دھما چوکڑی اور ہنسنے اور لڑنے کی آوازیں سن رہی تھیں۔ رونے کی آواز سن کر ان سے صبر نہ ہوا اور کمرے میں آگئیں۔ دیکھا کہ سلمہ زمین پر پڑی رو رہی ہے، سلیم پلنگ کی پائنتی کھڑے ہاتھوں میں سے پھانسیں نکال رہے ہیں۔ پلنگ جھولا ہو رہا ہے۔ پائنتی ٹوٹی ہوئی ہے۔ بہت ناراض ہوئیں بولیں "کھانے کے بعد یہ آرام ہو رہا ہے؟"

سلیم اور سلمہ کیا جواب دیتے۔ چپ رہے اور دوسرے پلنگ پر جا کر لیٹ رہے۔

جناب سیف سہسرامی

ہم پیامی ہیں

ہم پیامی ہیں ہم پیامی ہیں
ہم ہمالہ کی آنکھ کے تارے
ساری قوموں کو جان سے پیارے

بھائی چارہ ہماری فطرت ہے
ہم سے گلشن میں رنگ و نکہت ہے

ہم نہ گورے ہیں اور نہ کالے ہیں
محفلِ ہند کے اُجالے ہیں

پڑھنے لکھنے سے کام رکھتے ہیں
جذبۂ عشق عام رکھتے ہیں

گنگا جمنا کے تیز رو دھارے
ہم ہیں علم و ہنر کے شہ پارے

ہم کو اک دوسرے سے الفت ہے
مل کے رہنا ہماری عادت ہے

ننھے منے ہیں بھولے بھالے ہیں
ہم بہادر ہیں ہم جیالے ہیں

اونچا بھارت کا نام رکھتے ہیں
دوستی کا پیام رکھتے ہیں

سیف امن و اماں کے حامی ہیں
ہم پیامی ہیں ہم پیامی ہیں

سالنامہ ملا

مکرمی جناب ایڈیٹر صاحب السلام علیکم

ذاکر نمبر کے بعد خیال یہ تھا کہ آپ اب کے سالنامہ شاید نہ نکالیں۔ مگر یہ خیال سالنامے کے اعلان کے بعد قایم نہ رہ سکا۔ مگر ذہنی رو نے ایک اور رخ اختیار کر لیا یعنی میں نے سمجھ لیا کہ آپ رسمی طور پر ایسا کرنے کے لیے مجبور ہیں۔ رسالہ جاری رکھنے کے لیے سالنامہ نکالنا ہی پڑے گا۔ لیکن۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بارے خدا خدا کر کے دسمبر کے تین ہفتے گزارے لیکن چوتھے ہفتے میں انتظار شدید ہو گیا۔ یہ شدت صرف اپنے خیال کی تسکین کے لئے تھی کہ جو کچھ ہم نے سوچا آخر وہی ہوا نا۔ لیکن ۲۸ دسمبر نے ہمارے غرور کو توڑ دیا۔ اور ساتھ ساتھ اپنی پیش بینی پر ملامت کرنے لگا۔

پرچہ ملا۔ دیکھا اور دیکھتا ہی رہا بس ورق سے نظریں ہٹانا بھی چاہیں مگر نہ ہٹیں۔ اس پر انگلیاں پھیر کر دیکھیں۔ ایک ورق الٹ کر دیکھا کہ شاید اس میں گڑھے ہوں مگر پچھلے صفحہ پر کچھ بچے معصوم بوسہ بازی میں مصروف تھے۔ رسالہ پھر بند کر دیا نگاہیں پھر جم گئیں۔ پلک اپنی حرکت بھول گئے ذہن ایک بالکل سادہ ورق بن گیا۔ اب آنکھیں بند ہو چکی تھیں۔ رنگوں کی چمک دمک اور ان کا حسین امتزاج دل و دماغ پر چھا گیا۔ اسے رنگوں کی نیرنگی کہیے یا آپ کی نظر بندی کہ پندرہ منٹ تک رسالہ کا ایک ورق بھی نہ الٹ سکا اور بے ساختہ زبان پر ایک مصرع موزوں ہو کر آگیا۔

ٹائیٹل خوب رہا، خوب رہا۔ خوب رہا

اب میں نے اپنے ارد گرد نظر ڈالی تو بچوں کو موجود پایا اور ان کی نظروں میں غالب کے ایک مصرع "تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں" کی گردان دیکھی تو فوراً رسالہ ان کے حوالے کر دیا۔ بچے رسالہ لے کر بھاگ گئے اور میں ٹائیٹل خوب رہا کی گردان کرتا رہا۔ نہ جانے کس کا ایک مصرع اور ذہن میں جھانکنے لگا "آ مصور ترے ہاتھوں کی بلائیں لے لوں"۔ اب دونوں مصرعے گڈمڈ ہو گئے۔ کبھی پہلا اور کبھی دوسرا زبان پر پھسلنے لگا اور میں آنکھیں بند کیے آپ کے متعلق سوچنے لگا۔

کوئی دو گھنٹے کے بعد چھوٹی بچی (رقیہ عمر ۵ سال) کے رونے کی آواز آئی میں اٹھ کر گیا۔ میں نے اس سے پوچھا کیا بات ہے کیوں رو رہی ہو۔ بڑا بچہ فوراً بول پڑا "ضد کیے جا رہی ہیں کہ ایک دن کیا ہوا سناؤ۔ ہم نے سنا دیا مگر پھر بھی کہتی ہیں آگے سناؤ۔ اب آگے ہم کہاں سے سنائیں آگے وہ مضمون ہے ہی نہیں۔ میں نے رسالہ لے لیا۔ ورق گردانی کی اور مضمون ملا کر ان کو سنا دیا (آپ اس میں حوالہ دینا بھول گئے ہیں) اب میں نے بچوں سے پوچھا سالنامہ کیسا ہے۔ سب نے ایک زبان ہو کر کہا بہت اچھا اب میں نے ٹائیٹل کے بارے میں سوال کیا کہ ٹائیٹل کیسا ہے سب نے کہا بہت ہی اچھا بہت ہی اچھا۔ مگر رقیہ بیگم منہ بنائے بیٹھی رہیں میں نے ان کو ٹائیٹل دکھا کر پوچھا۔ بیٹا تمھیں یہ ٹائیٹل اچھا لگا تو منہ بنا کر بولیں۔ اچھا تو بہت لگا "مگر اس میں تتلی تو ہے نہیں ہم اس میں ایک تتلی چپکائیں گے (خدا عمر دراز کرے بہت ذہین بچی ہے) اور پیام تعلیم میں اس کا پسندیدہ مضمون ہے "ایک دن کیا ہوا" خود تو پڑھ نہیں سکتیں۔ بڑے بہن بھائیوں اور اپنی ماں پر ان کا زور چلتا ہے اور انھیں سنانا ہی پڑتا ہے میرے خیال میں یہ اچھا سلسلہ ہے۔ اب میں بچوں سے رسالہ لے کر چلا اور ان سے یہ کہہ دیا کہ ایک گھنٹہ کے بعد پھر لے جانا پلنگ پر لیٹا پھر ایک نظر ٹائیٹل کو دیکھا۔ بچی کی تتلی والی تجویز نظر میں گھومی اور اس کے لیے جگہ تلاش کرتا رہا

کر کہاں موزوں ہوسکتی تھی۔ مگر کہیں بھی وہ جگہ نل سکی جہاں تتلی کو
ہونا چاہئے تھا۔ اب جو غور کرتا ہوں تو چند تبدیلیاں نظر آئیں معلوم
ہوا کہ سائز بڑھ گیا ہے۔ اندرونی ٹائیٹل دیکھا اس میں کچھ ترقی
نظر آئی اور کچھ جانے بوجھے آرٹ کا احساس ہوا۔ آپ کا
آرٹسٹ ہمیشہ ایک ہی ڈگر پر چلتا ہے یا تو اس کے پاس کام
بہت زیادہ ہے یا اسے کام کرنے کا شوق نہیں۔ ورنہ وہ
اپنے لئے کچھ اور راہیں بھی متعین کرتا اور کبھی نہ کبھی اپنی
منزل پر جا پہنچتا۔ ادھر پچھلے کچھ شماروں میں آپ نے آرٹ
کی طرف توجہ دی ہے اور اس میں آپ کہیں کہیں کامیاب بھی رہے
ہیں۔ ورنہ وہی پرانا ڈھرا اور وہی ایک اکتا دینے والا تھکا
ہوا آرٹ اور ہم اور ہمارے بچے۔ فہرست پر نظر ڈالی سب
سے پہلے جناب اخضر بریلوی کا نام نظر پڑا۔ اس سے پہلے بھی
آپ نے موصوف کی چند رباعیاں شائع کی مجھے بہت پسند آئیں
تھیں۔ اب جو صفحہ الٹ کر دیکھتا ہوں تو رباعیوں کی جگہ بچوں
سے باتیں ہیں پھر فہرست پر نظر ڈالی تو اپنی غلطی سمجھ میں
آئی کہ جوش میں آکر فہرست کے پہلے اندراج کو نظر انداز ہی
کر گیا۔ بچوں سے باتوں کے صرف دو کالم پڑھے۔ کتابت
میں بھی کچھ نیا پن نظر آیا۔ مگر یہ عمدگی صرف چند صفحوں تک
ہی محدود تھی۔ اس جملے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ بقیہ کتابت
ناقص ہے یا معیار سے گری ہوئی ہے۔ نہیں بہت عمدہ ہے
مگر شروع کے چند صفحے غیر معمولی طور پر بہت ہی عمدہ ہیں۔ ہاں
طباعت میں لال رنگ نظر میں کھٹکتا ہے اور اس نے کتابت
کو بھی بھاری کر دیا ہے۔ اگر یہ بھی سیاہ یا بلو ہوتا تو بہت
خوب ہوتا۔ (لال رنگ سے حتی الامکان پرہیز کیجئے) اب پھر
جناب اخضر بریلوی کی رباعیات "نیا سال" اور عید کا صفحہ
نکالا۔ نئے سال کی رباعیاں پڑھتا جاتا تھا اور
دل ہی دل میں موصوف کی قادر الکلامی،

بیباکی، سچائی اور خلوص کو سراہتا جاتا تھا۔ کرمی اس
دور پر آشوب میں (جب کہ بچے اپنی ماں کے پیٹ ہی سے
غیر مہذب پیدا ہو رہے ہیں۔) اور اس طوفان بدتمیزی میں
(جہاں چھوٹے بڑے کا امتیاز ہی باقی نہیں رہا ہے) اس
خلوص بھری کمزور آواز کی قدر کون کرے گا۔ لیکن اس
کی ضرورت ہے۔ آواز کمزور ضرور ہے۔ مگر آواز ہے اور اس
کے وجود سے ہم انکار نہیں کر سکتے۔ براہ کرم یہ سلسلہ
جاری رکھئے۔ اگر کچھ بچے بھی اس آواز سے متاثر ہوئے تو
آپ عند اللہ ماجور ہوں گے۔

عید رباعیاں پڑھیں۔ تیسری رباعی تک تو سمجھ ہی میں
نہیں آیا کہ شاعر کہنا کیا چاہتا ہے۔ مگر چوتھی رباعی پڑھتے ہی دل
پر ایک گھونسہ سا لگا۔ اور شاعر کا مفہوم سمجھ میں آگیا وہ عید سے
اپنی بیزاری اور بے تعلقی کا اظہار اس آغاز سے کرتا ہے "سنتے
ہیں کہ اس سال بھی عید آئی ہے" اور اختتام اس مصرعہ پر
"ان بچوں کی عیدوں پہ بھی کچھ غور کرو"۔ تو پوری بات سمجھ میں آگئی
کہ یہ عید عید نہیں بلکہ گریہ وماتم کی نشان دہی کرتی ہے۔

کرمی یقین فرمائیے کہ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔
اور عید کا دن میرے لئے اجنبی بن کر آیا اور اجنبی بن کر ہی چلا گیا
مجھے میری بیوی اور بچے اجنبی سے لگتے تھے اور وہ لوگ بھی میری اس
تبدیلی پر حیران تھے۔

عید پر اور عید کے بعد اور شاعروں نے بھی اس موضوع
کو اپنایا ہے۔ مگر اولیت کا سہرا ہمارے جناب اخضر بریلوی صاحب
کے سر ہے۔

عید کے گزرنے کے کئی روز بعد (غالباً
ایک ہفتہ) پھر پیام تعلیم کا "ٹائیٹل حسین نظر آنے لگا اور
میرے دماغ میں ٹائیٹل خوب رہا کا مصرعہ
کلبلانے لگا۔ نتیجہ

کے طور پر کچھ شعر موزوں ہو گئے ہیں جو ارسال خدمت ہیں۔

وحید الدین خاں

(نظم صفحہ پر ملاحظہ کیجیے)

"پیام تعلیم" کا سال نامہ ملا۔
دیکھتے ہی زبان سے نکلا "آ مصور ترے ہاتھوں کی بلائیں لے لوں"۔ ٹائیٹل پیج جتنا سادہ اتنا ہی حسین۔ دیر تک دیکھتا رہا۔ مضمون بھی ہر مذاق کے۔ بڑی خوشی ہوئی۔

باوجود کوشش اور خواہش کے ختم نہ کر سکا۔ شاید مہینہ بھر لگے گا۔ کیوں کہ امتحان دینے کے لئے نہیں اپنی تسکین کے لئے پڑھنا ہے۔ جتنا کچھ پڑھ سکا اس میں "نیشنل اسکول" اور "نئی پود کے بچے کے نام" (نظم) کا کیا کہنا۔!

اگر آپ کی نظر اسی طرح وسیع ہوتی گئی اور سلیقہ سنورتا گیا تو وہ دن دور نہیں جب "پیام تعلیم" بچوں کے دنیا بھر کے رسالوں میں ایک خاص حیثیت حاصل کرے گا۔ خدا آپ کو وہ کامیابی بخشنا نصیب کرے۔ دعاگو۔

محمد ٹونکی۔ علی گڑھ

ماہنامہ "پیام تعلیم" کا سال نامہ پڑھا۔ سلک اسکرین کا ٹائیٹل اور رام لعل، یوسف پاپا، آصفہ مجیب، فرحت قمر، خالد عرفان، خلیق انجم کی تخلیقات بہت پسند آئیں۔ ملک ملک کی لوک کہانیاں بھی خوب تھیں۔ دو باتیں جچی نہیں ایک تو بڑا سائز اور دوسرے قیمت بھی اتنی تھی کہ بچے اسے مشکل سے خرید سکتے تھے۔

انجم پرویز۔ (بمبئی)

سال نامہ تھوڑا سا پڑھا تھا بچے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگے۔ ان کی نذر کر دیا۔ جتنا پڑھا

اور باقی الٹ پلٹ کر دیکھا خوب تھا، ہر نمبر ایک دوسرے سے بہتر نکل رہا ہے۔ خدا کرے آپ کی محنت ملک میں مقبول ہو۔ کہنے کو سب کہتے ہیں بچوں کے لٹریچر کی طرف کسی کی توجہ نہیں ہے اور نہ بچوں کے لکھنے والوں کی قدر ہے۔ قدر تو شاعروں اور افسانہ نگاروں کی یا تھوڑا بہت زور محققین کا ہے۔ ان میں بھی جیسا کچھ حال ہے آپ سے پوشیدہ نہیں۔ کام کئے جائیے کبھی تو اچھا وقت آئے گا۔ ہمارے بعد ہی سہی۔ اس نامراد سیاست نے بڑی سطحیت اور آوارگی پیدا کر دی ہے دیکھیے یہ بادل کب چھٹتے ہیں۔

حفیظ الدین

سالنامہ ملا۔ چہرہ انسان کی باطنی کیفیات کا ترجمان ہوتا ہے۔ چنانچہ پیام تعلیم کے سرورق کو اس کا چہرہ تصور کیا جائے تو کہنا پڑتا ہے کہ اس کی خوش نمائی صحیح طور پر سالنامہ کے باطن کی ترجمان ہے۔ یہ آپ کے حسن ادارت کی کرشمہ کاری ہے۔ میری دعا ہے کہ پیام تعلیم اسی طرح روز بروز ترقی کی بلندیوں کی جانب پرواز کرتا جائے۔

سید حرمت الاکرام۔ مرزا پور

سالنامہ ملا۔
اللہ اگر توفیق نہ دے ہر شخص کے بس کا روگ نہیں۔ بچوں کے لئے مفید اور دلچسپ مضامین جمع کر لینا آپ ہی کا کام ہے۔ اپنی کامیاب کوشش پر مبارکباد قبول فرمائیے۔

وقار واثقی۔

پیام تعلیم کا سال نامہ دیکھا۔ بہت خوبصورت شمارہ ہے، ترتیب اور تدوین کے ساتھ معیار کا بھی آپ نے خیال رکھا ہے۔ مبارک ہو۔

احمد وصی (بمبئی)

دودھ بھارتی۔ آل انڈیا ریڈیو۔ بمبئی

پیامِ تعلیم کا خاص نمبر مل گیا تھا۔ کچھ اس قدر عدیم الفرصت رہا کہ آپ کو خود شکریہ کا خط بھی نہ لکھ سکا۔ سب ہی جانے پہچانے لکھنے والے اس میں شامل ہیں۔ تشید میاں اسے اپنے ساتھ ہی رکھتے ہیں۔ بستے میں بھی، مدرسے میں بھی، ان کے دوست احباب ان سے پڑھنے کے لئے بھی مانگ لے جاتے ہیں۔ اور وہ اس طرح اپنی اہمیت پر خوش ہیں۔ خدا کرے پیامِ تعلیم ان ننھے دلوں کو اردو کی محبت سے بھر دے۔ میری مبارک باد قبول کیجئے۔

اقبال نصیب

نئے سال اور عید کے تحفہ کے روپ میں سالنامہ ملا تو چونک پڑا۔ بے اختیار "مرحبا" اور "جزاک اللہ" کے کلمات زبان سے نکل پڑے۔

میں دعوی سے کہہ سکتا ہوں کہ اب تک بچوں کے کسی بھی اردو رسالے نے اتنا سادہ، پرکار اور انوکھا ٹائیٹل شایع نہیں کیا۔ اس جدّت کے لئے مبارک باد۔

آپ نے سائز بڑھا کر بھی خوب کیا۔ اس بار جس امر نے میرا دل موہ لیا ہے وہ اس کا گٹ اپ اور کچھ تصاویر ہیں۔ جاوید صاحب نے یقیناً بہت ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے۔ جانوروں اور مناظر کی تصاویر میں ان کے ہاں PROPORTION بھی ہے اور اپج بھی۔ انسانی اشکال بناتے ہوئے البتہ مزید احتیاط اور تجربہ کی ضرورت ہے۔

ابو تمیم صاحب حسب معمول بہت خوب ہیں۔ ان کا سا طرز کوئی اور کیسے لائے گا۔

ابھی تک میں رسالہ کو ٹائیٹل سے ٹائیٹل تک نہیں پڑھ سکا ہوں۔ لیکن جتنا کچھ پڑھا ہوں ان میں سائنسی مضامین "مد" بہت پسند آیا۔ معلوماتی مضامین میں "مجھے پہچانو" نہ صرف منفرد ہے، خوب سوچ سمجھ کر لکھا گیا ہے بلکہ ننھے ذہن کا ہماری پیاری زبان سے اٹوٹ رشتہ قائم کر دینے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ اس بار حصۂ نظم بھی بہتر ہے اور کہانیاں بھی جاندار ہیں خیر سے

اب آپ کو بڑے لکھنے والوں کا تعاون ملنے لگا ہے۔ لیکن اکثر دیکھا گیا ہے کہ بڑے نام کی خاطر اکثر پھیکی تحریریں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ آپ غیر معروف مصنف کی اچھی تحریر کو معروف ادیب کی بے کار تحریر پر قربان نہ کیا کیجئے۔

مجموعی حیثیت سے مجھے لگتا ہے، آپ نے ہر اعتبار سے ترقی کی بے شمار منزلیں ایک ہی جست میں طے کر لیں ہیں۔ خدا کرے آپ اپنے مقاصد میں اسی طرح کامیاب ہوتے رہیں۔

خالد عرفان۔ بنگلور

"پیامِ تعلیم" کا سالنامہ ملا۔ میں آپ کا حد سے زیادہ ممنون و مشکور ہوں کہ اس ناچیز گوشہ گیر کو اپنی یاد میں رکھتے ہیں۔ فجزاکم اللہ تعالیٰ عنا خیر الجزا۔ پرچہ زیرِ نظر میں بہت سے پُر از معلومات مضامین ہیں۔ جن سے بچے اور بوڑھے دونوں مستفید ہو سکتے ہیں۔ میں ہر مکتبۂ خیال کا لٹریچر پڑھا کرتا ہوں۔

معلومات حاصل کرنے کا اس ضعیفی و ناتوانی میں بھی نوجوان طالب العلموں کی طرح ذوق رکھتا ہوں۔ البتہ عملی میدان میں بالکل صفر ہی صفر ہوں۔ کسی کام کے لائق نہ رہا۔ اللہ آپ کو تندرست و توانا رکھے۔

غلام حسنین ندوی چشتی سلیمانی غفرلہٗ
پھلواری شریف

سالنامہ نظر سے گذرا۔ نیا سائز بے حد پسند آیا اور پھر اس پر دلکش و دیدہ زیب سرورق تو اور غضب ڈھا گیا۔ ذاکر نمبر کے بعد ایسا پیارا خوبصورت اور بھرپور سالنامہ پیش کرنے پر آپ کو مبارکباد نہ دینا یقیناً ناحق شناسی ہوگی۔ تمام مندرجات معلوماتی، دلچسپ، فکر انگیز اور سیر حاصل ہیں۔ کیونکہ ہونا بھی شمارہ کی خصوصیت ہی الگ نوعیت کی ہوتی ہے ہر مضمون ایک دوسرے پر سبقت لے جا رہا ہے۔ سہیل عظیم آبادی کا رام لعل اور اقبال متین صاحبان نے پیامِ تعلیم میں پہلی ہی بار اثر چھوڑا ہے۔

اطہر عزیز دکنگ ام

بڑوں کی کوششیں

وہ طالب علم جنھوں نے اُردو ابھی سیکھی ہے۔

ایک دن کی چھٹی:- جمعرات کی شام تھی امی کو خیال آیا کہ کل تو جمعہ ہے اور مجھ سے کہنے لگیں کہ کل تو تیری چھٹی ہے میں اپنی امی کے گھر چلی جاؤں؟ میں نے بنا سوچے سمجھے ہاں کر دی۔ امی شام کو تیار ہو گئیں اور تھوڑا سا سامان لے کر نانی کے گھر چلی گئیں اور جاتے جاتے کہہ گئیں کہ کل راشن لانے کا آخری دن ہے راشن کی چینی لے آنا۔ رات کو مجھے پڑھتے ہوئے دیر ہو گئی۔ اور میں قریب ۱۲ بجے سوئی۔ صبح میری آنکھ سات بجے کھلی تو گھر میں سب لوگ کہہ رہے تھے۔ چائے دو۔ میں نے جلدی سے چائے بنا کر دی۔ اور ناشتہ تیار کر کے سب کو کھلایا اس وقت ۹ بج گئے اور پھر میں نے بستر اٹھائے اور سارے گھر کو ساف کرنے میں لگ گئی ۱۱ بجے تک میں صفائی کر کے فارغ ہوئی پھر میں کھانا بنانے لگی اور کھانا بناتے بناتے ۱۲ بج گئے پھر سب کو کھانا کھلایا پھر میں نہانے گئی۔ اور نہانے کے بعد جیسے ہی کھانا کھانے کے لیے تیار ہوئی تو مجھے خیال آیا کہ راشن لانا ہے تو میں بنا کھائے ہی راشن کی دوکان پر چلی گئی۔ وہاں کی قطار دیکھ کر میرے ہوش و حواس ہی اڑ گئے۔ اپنی بھوک تو وہیں ختم ہو گئی۔ میں دو بجے تک لائن میں کھڑی رہی۔ جب میرا نمبر پاس ہی تھا تو دوکان دار نے کہا کہ اب تو کھانے کا وقت ہو گیا۔ جسے سن کر اتنا غصہ آیا کہ ایسا راشن لینے سے تو بھوکا رہنا اچھا ہے۔ اس ڈر سے کہ میرا نمبر چلا نہ جائے میں گھر نہ گئی اور لائن میں تین بجے تک کھڑی رہی اور ۳½ بجے میرا نمبر آیا۔ پر افسوس اس بات کا ہے کہ اس وقت دکان دار نے کہا کہ چینی تو ختم ہو گئی ہے۔ اس وقت مجھے صرف چینی ہی لینی تھی غصے سے بھری بھنی میں ملن میں سارے جہان کو گالیاں دیتی ہوئی گھر چلی گئی جاتے ہی چھوٹے بھائی آکر رونے لگے کہ چائے دو مجھے مجھے اتنا غصہ آیا کہ میں نے اسے ایک زور سے تھپڑ مارا اور اس نے رونا شروع کر دیا۔ میں نے ٹھنڈے دماغ سے سوچا کہ اس کا کیا قصور تھا۔ اور پھر میں نے اسے چائے بنا کر پلائی پھر شام کا کھانا بنانا (پکانا) شروع کر دیا۔ اور میں سات بجے سب کو کھانا کھلا کر فارغ ہو گئی۔ پر میرے لیے کھانا نہ بچا۔ کھانا بنانے کا آلکس کیا اور بھوکی ہی سونے کی تیاری کرنے لگی۔ پر نیند بھی نہ آئی اور ۸½ بجے امی نے آتے ہی سوال کیا کہ "چینی مل گئی۔" میں چپ رہی پر چھوٹے بھائی نے کہا دیدی نے مجھے مارا۔

تو صاحب! امی کی ایک دن کی چھٹی کے ساتھ اپنی تو ہر چیز کی چھٹی ہو گئی۔

سینہ لتا
ڈپلوما دوسرا سال جامعہ

روشنی:- ہر سال کی طرح اس بار بھی ۲۶ جنوری کو چھٹی تھی۔ ہم سب خوش تھے ہم نے اپنے پتاجی سے جلوس دیکھنے جانے کے لیے کہا۔ پر اماں جی نے انکار کر دیا۔ کیونکہ اس دن بہت ٹھنڈ تھی۔ انھوں نے ہمیں ٹیلی ویزن پر دکھانے کا وعدہ کیا۔ اس لیے ہم نے ٹیلی ویزن پر ہی جلوس دیکھا۔

شام کو ہماری گلی میں سے بہت سے لوگ رات کی روشنی دیکھنے گئے پھر تو ہم سب نے خوب شور مچایا پر جانے کا امکان نظر نہ آ رہا تھا۔ جب ہم نے زیادہ شور مچایا تو اماں جی نے جانے سے بالکل منع کر دیا۔ جسے سن کر ہم سب کو بڑا دکھ ہوا۔ پھر اسی وقت میرے چھوٹے بھائی کو مذاق سوجھا اسی وقت بجلی کے بٹن کو دبا دیا جس سے ساری جگہ روشن ہو گئی۔ بڑے مزے میں کہا۔

"تو دیکھ لو روشنی"

اس کی بات سن کر ایک بار سب کے چہروں پہ مسکراہٹ آ گئی۔

راج کماری
بیسک پہلا سال جامعہ

قلمی دوستی

نام :- محمد سلیمان خاں۔ عمر ۱۳ سال
پتہ :- معرفت محمد اسماعیل خاں اسٹاف کوارٹرس جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵
مشغلہ :- ٹکٹ جمع کرنا۔ قلمی دوستی کرنا۔ کرکٹ اور فٹ بال کھیلنا۔

نام :- عشرت بابو۔ عمر ۸ سال
پتہ :- لائن کشن گنج پورنیہ
شغل :- انگلش پڑھنا۔ کیرم کھیلنا۔ کہانیاں پڑھنا اور ٹکٹ جمع کرنا۔

نام :- اقبال احمد شمسی بریلوی۔ عمر ۱۴ سال
مشغلہ :- صبح کو فٹ بال کھیلنا۔ تعلیمی کتابیں پڑھنا۔ نظمیں لکھنا قلمی دوستی کرنا۔
پتہ :- حاجی ظہور احمد محلہ زکاتی بریلی

نام :- محمد جاوید احمد عمر ۱۴ سال
پتہ :- شاہ زبیر روڈ۔ دلاور پور۔ مونگر (بہار)
مشغلہ :- اردو پرچوں کا مطالعہ کرنا۔ اخبار پڑھنا پیام تعلیم سے انسیت رکھنا۔ آئے ہوئے خطوط کا جواب دینا۔

نام :- محمد نصرت اللہ عمر ۱۱ سال

پتہ :- شاہد منزل منڈی بازار ورنگل
مشغلہ :- قلمی دوستی۔ کرکٹ کھیلنا۔ ڈاک ٹکٹ جمع کرنا

نام :- جمیلہ بابو عمر ۱۵ سال
پتہ :- سلمہ منزل ۲۱ سلطان اسٹریٹ مدراس ۱
مشغلہ :- ادبی، اخلاقی اور مذہبی کتابوں کا مطالعہ کرنا۔ البم بنانا۔ ہر قسم کے انعامی مقابلوں میں حصہ لینا۔ تقریر کرنا۔ ڈرامے اور مباحثوں میں شریک ہونا۔

نام :- صفیہ زیدی۔ عمر ۱۳ سال
پتہ :- معرفت پرویز عالم۔ شری پور ۳ ڈاکخانہ شری پور۔ ضلع بردوان
مشغلہ :- درسی کتابیں پڑھنا۔ پیام تعلیم اور کھلونا پڑھنا۔ کیرم کھیلنا۔ قلمی دوستی

نام :- شہناز اختر عمر ۱۲ سال
پتہ :- معرفت چودھری عبدالرحیم صاحب لائن نمبر ۱ بلدوانی۔ نینی تال
شغل :- نماز پڑھنا۔ قلمی دوستی (صرف بہنوں سے) کیرم بورڈ بیڈمنٹن وغیرہ کھیلنا۔ پیام تعلیم پڑھنا۔

بچوں کی کوششیں

حسد کا انجام

بہت دنوں کی بات ہے کہ ایک جنگل میں ایک بکری اور شیر شیرنی رہتے تھے۔ بکری کے تو تین بچے تھے۔ شیرنی کا ایک ہی بچہ تھا۔ شیرنی بکری سے بہت جلتی تھی اور ہر وقت سوچتی رہتی کہ کس طرح بکری کے دو بچے مر جائیں اور اس کے بھی ہماری طرح ایک ہی بچہ رہ جائے سوچتے سوچتے ایک ترکیب سمجھ میں آئی۔ ایک روز وہ بکری کے پاس گئی اور بکری سے کہنے لگی۔

بہن تم تو ہمارے گھر آتی ہی نہیں۔ اتنا جی چاہتا ہے کہ تم آؤ اچھا خیر تم نہ آؤ تو اپنے بچوں کو ضرور بھیج دو۔ دیکھو آج ضرور بھیجنا ورنہ اچھا نہ ہوگا۔ ہم آج رات ان کو ٹھہرائیں گے ہمارے پاس بھی تو ذرا رہیں اتنا دل خوش ہوتا ہے جب دیکھتے ہیں۔

آخر کار بہت اصرار کرنے پر بکری نے اپنا ایک بچہ بھیج دیا۔ شیرنی اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی کہ اب ترکیب کامیاب ہوگئی۔ سارے دن بکری کا بچہ شیرنی کے پاس کھیلتا رہا جب رات ہوئی تو شیرنی نے اپنا بچہ شیر کے پاس لٹا دیا اور بکری کے بچے کو اپنے پاس لٹا لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد شیر کے بچے کی آنکھ کھلی تو اس کو بہت غصہ آیا۔ اس بات پر کہ ماں نے اپنے پاس کیوں نہ لٹایا۔ غصے میں وہ اٹھ کر شیرنی کے پاس لیٹ گیا اور بکری کے بچے کو بھگا دیا وہ اٹھ کر شیر کے پاس لیٹ گیا آدھی رات کو شیرنی چپکے سے اٹھی اور اپنے بچے کو کھانے لگی۔ کھاتے وقت یہ کہے جائے "خرمریہ بیٹا گرم گرم، خرمریہ بیٹا نرم نرم، خرمریہ بیٹا بڑے مزیدار" یہ کہہ کر وہ اپنے بچے کو پورا کھا گئی اور بڑے اطمینان سے کھا کر لیٹ گئی جب صبح ہوئی تو اس نے اٹھ کر دیکھا تو رونے اور چیخنے لگی اور بکری نے اپنے بچے کو سلامت پایا اور بہت خوش ہوئی مثل مشہور ہے جو آدمی دوسرے کے لئے کنواں کھودتا ہے۔ خود ہی اس کنوئیں میں گر جاتا ہے۔

سیدہ میمونہ حسنی

بتائیے میرا نام کیا ہے

میرے نام کا پہلا حرف ۔ ۔ ۔ ۔ پیام تعلیم میں ہے تعلیمی پیام میں نہیں
میرے نام کا دوسرا حرف ۔ ۔ ۔ ۔ یاد میں ہے آباد میں نہیں
میرے نام کا تیسرا حرف ۔ ۔ ۔ آباد میں ہے یاد میں نہیں
میرے نام کا چوتھا حرف ۔ ۔ ۔ محمد میں ہے اللہ میں نہیں
میرے نام کا پانچواں حرف ۔ ۔ ۔ تجارت میں ہے عبادت میں نہیں
میرے نام کا چھٹا حرف ۔ ۔ ۔ عبادت میں ہے تجارت میں نہیں
میرے نام کا ساتواں حرف ۔ ۔ ۔ لاری میں ہے موٹر میں نہیں
میرے نام کا آٹھواں حرف ۔ ۔ ۔ یوسف میں ہے حسان میں نہیں

میرے نام کا آخری حرف
موٹر میں ہے لاری میں نہیں

ذرا سوچئے پیامیو "میرا نام کیا ہے"؟ اگر نہیں بتا سکو تو پیام تعلیم کا ٹائٹل دیکھئے پھر بھی سمجھ میں نہ آئے تو اس جملہ ہی میں پوری عبارت میں تلاش کیجئے۔

محمد شعیب

یوسف:۔ تایا جان یوسف ناظم صاحب
حسان:۔ ایڈیٹر صاحب

بدترین شخص

حضرت موسیٰ علیہ السلام (اللہ کے پیغمبر) کے پاس ایک دن وحی آئی کہ اے موسیٰ! بنی اسرائیل کے لوگوں سے کہہ کر اپنے میں سے کسی بہترین شخص کو چنیں۔ حضرت موسیٰؑ نے اللہ کا یہ حکم بنی اسرائیل کے لوگوں کو سنایا۔ چنانچہ انھوں نے سَو آدمیوں کو اپنے میں سے بہترین جان کر چن لیا۔ دوبارہ ان کے پاس وحی آئی کہ ان سَو آدمیوں میں کسی بھی عمدہ شخص کو چن لیا جائے اس انھوں نے دس لوگوں کا انتخاب کیا تیسری بار وحی آئی کہ ان دس میں سے تین کو چن لو ایک مرتبہ پھر تین لوگوں کو چن لیا گیا۔ آخری وحی یہ تھی کہ ان تین آدمیوں میں سے کسی بھی ایک بہترین اور اچھے شخص کو چن لیا جائے۔ ایک بے حد ہی اچھا اور اللہ کے نیک بندے کو چن لیا گیا۔ اس دفعہ حضرت موسیٰ سے اللہ نے وحی میں فرمایا کہ اس بے مثل شخص سے کہو کہ یہ بنی اسرائیل کے بدترین شخص کو ہمارے پاس لائے۔ اس شخص نے چار روز کی مہلت چاہی۔ ان چار دنوں کے عرصہ میں وہ شہر در شہر پھرا اور چوتھے دن اس کا گزر ایک گلی میں سے ہوا اس کی نگاہ ایک آدمی پر پڑی جو جھگڑالو اور آوارہ تھا۔ اور قسم قسم کی بدکاریوں میں مصروف تھا۔ وہ اس حد تک برا تھا کہ لوگ اس پر انگشت نمائی کر رہے تھے۔ نیک اور بھلے آدمی کے دل میں آیا کہ اس شخص کو جو کہ ہر اعتبار سے برا ثابت ہو گیا ہے حضرت موسیٰ کے پاس لے جائے۔ پھر خیال آیا کہ کسی کا ظاہر دیکھ کر فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔ ممکن ہے اس بدترین شخص کو بھی کوئی مرتبہ یا درجہ حاصل ہو بقول شخصے "کسی کو ذلیل و حقیر سمجھنا ٹھیک نہیں ہے۔" لوگوں نے مجھے بہترین شخص مانا اس سے مجھے غرور نہیں کرنا چاہیے۔ اگر غور کیا جائے تو یہ بات خود مجھ پر عائد ہوتی ہے۔ اگر اس گمان کو میں اپنے بارے میں منسوب کر لوں تو یہ زیادہ بہتر بات ہوگی یہ سوچ کر اس کی پگڑی اس نے اپنے سر پر باندھ لی اور حضرت موسیٰ کے پاس آیا۔ اور حضرت موسیٰ سے کہا کہ میں نے جہاں بھی نگاہ کی کسی شخص کو اپنے سے بدتر نہیں پایا۔ حضرت موسیٰؑ کے پاس وحی آئی کہ یہ آدمی بنی اسرائیل میں بہترین ہے۔ نہ اس وجہ سے کہ اس کی فرمانبرداری قابلِ تعریف ہے بلکہ اس لئے کہ یہ اپنے آپ کو سب سے بدترین سمجھتا ہے:

(فارسی سے)

روشن آرا

نیک لڑکا

ایک مرتبہ میں کانپور سے لکھنؤ کے لیے چلا — ! اسٹیشن پر آیا تو جس پلیٹ فارم سے لکھنؤ کی گاڑی چھٹتی تھی، اس پر میں نے گاڑی کو کھڑی دیکھی گاڑی چھٹنے کے لئے سیٹی دے رہی تھی۔ میں دوڑتا ہوا گیا! قلی سے سامان رکھوایا اور جھٹ بیٹھ گیا۔ میرے بیٹھتے ہی گاڑی چھٹ گئی۔ گاڑی آناو پہنچ کر چھٹی تو میں نے دیکھا کہ گاڑی اب کسی دوسری لائن پر جا رہی ہے مجھے بڑا تعجب ہوا۔ میں نے ایک مسافر سے پوچھا "کیا یہ گاڑی لکھنؤ نہیں جا رہی ہے؟" اس نے بتایا "نہیں لکھنؤ والی گاڑی تو کانپور میں اس سے پانچ منٹ قبل چھٹ چکی تھی اور اسی پلیٹ فارم سے چھٹی تھی جس سے یہ گاڑی!

اب میں بہت پریشان ہوا۔ آناو کے بعد جو اسٹیشن پڑا میں اس پر اتر گیا! صبح کا وقت تھا۔ میرے پاس ایک بکس ایک بستر اور ایک بڑا تھیلا! سوچنے لگا کہ کیا کرنا چاہیے؟ اسٹیشن پر کچھ لوگوں سے پوچھا "کانپور سے لکھنؤ جانے والی سڑک کتنی دور ہے؟" معلوم ہوا کہ ایک میل ہے اور راستہ بڑا پیچ دار ہے اور مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس چھوٹے سے اسٹیشن پر قلی بھی نہیں ملتے!

اب میں بہت پریشان ہوا۔ اسٹیشن پر ایک لڑکا ٹہل رہا تھا۔ اس کی عمر کوئی اٹھارہ سال ہوگی۔

یہ ٹہلتا جاتا اور مجھے دیکھتا جاتا کچھ دیر بعد وہ میرے پاس آیا اور کہا "چلئے میں آپ کو سڑک تک پہنچا دوں! وہاں سے آپ بس پر لکھنؤ چلے جائیے گا۔"

یہ کہہ کر بکس کندھے پر اٹھا لیا۔ میں نے بہت "نہیں نہیں" کیا۔ لیکن وہ نہ مانا! مجھے یہ بھی خیال آتا کہ انجان جگہ انجان لوگ اور یہ لڑکا بھی انجان کہیں دھوکہ نہ دے پھر بھی اس کے ساتھ چل دیا۔ بستر اور تھیلا میں نے لے لیا۔

سچ مچ راستہ بہت پیچ دار تھا۔ میرا بکس بڑا بھاری تھا۔ نوجوان بوجھ سے پسینے پسینے ہو گیا۔ مگر شاباش اس لڑکے کو، اس نے سڑک پر جا کر ہی دم لیا۔ ایک کنارے پر بکس رکھ اور سلام کر کے چلا گیا۔ میں دیر تک اسے دعائیں دیتا رہا!!!

ظہیر فراق ردولوی

ننگ خدمت

جارج واشنگٹن پہلے صدر جمہوریہ امریکہ کے اخلاق و عادات کے متعلق بچپن سے لے کر آخر وقت تک کے بہت سے دلچسپ واقعات مشہور ہیں۔ ان میں سے ایک دلچسپ سبق آموز واقعہ سنئے۔

ایک دن جارج واشنگٹن ایک زیر مرمت سرکاری عمارت کے پاس سے گزر رہے تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ چند سپاہی ایک بڑے شہتیر کو عمارت کے بالائی حصے تک پہنچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ چونکہ شہتیر وزنی اور سپاہیوں کی تعداد کم تھی۔ اس لئے وہ اپنی اس کوشش میں ناکام نظر آتے تھے۔ اور انتہائی محنت کی وجہ سے پسینہ پسینہ ہو رہے تھے سپاہیوں کا افسر کھڑا سپاہیوں کو گالیاں دے رہا تھا۔ مگر خود امداد کے لیے پاس نہ آتا تھا۔

واشنگٹن چونکہ شہری لباس میں تھے اس لئے انھیں کوئی پہچان نہ سکا۔ انھوں نے آگے بڑھ کر افسر سے کہا "تم سپاہیوں کو طعن و تشنیع کرنے کی بجائے ان کی امداد کرتے تو زیادہ مناسب ہوتا۔" افسر نے تحقیر آمیز مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا "تم نہیں جانتے میں افسر ہوں اور ماتحت سپاہیوں کا سا کام نہیں کر سکتا۔"

واشنگٹن نے کہا "معاف کیجئے جناب مجھے معلوم نہ تھا" یہ کہہ کر وہ گھوڑے سے اترے اور سپاہیوں کے ساتھ شریک ہو کر شہتیر اٹھانے لگے ان کی مدد سے شہتیر اوپر اٹھ گیا۔

پسینے میں نہائے ہوئے واشنگٹن جب گھوڑے پر سوار ہوئے تو انہوں نے افسر سے کہا۔ افسر صاحب! اگر پھر کبھی ایسا موقع آئے اور آپ دیکھیں کہ آپ کے ماتحت سپاہی تنہا کام نہیں کر سکتے تو فوراً اپنے سپہ سالار کو اطلاع دیجئے گا۔ وہ خدمت کے لئے حاضر ہوگا۔"

افسر نے اب پہچانا کہ یہ باتیں کرنے والا کون ہے۔ شرم اور خوف سے وہ بے حس و حرکت کھڑا رہ گیا۔

سپاہیوں نے نہایت ہی محبت و احترام سے سلامی دی۔ اور واشنگٹن مسکراتا ہوا چل دیا۔

انجم پرویز

اسکولوں کی تعلیمی اور تفریحی سرگرمیاں

مدرسہ ثانوی جامعہ میں ایک دن کا مدرسہ

پچھلے مہینے

۵ر فروری کو مدرسہ ثانوی جامعہ میں ایک دن کا مدرسہ بہت اہتمام سے منایا گیا۔ یہ ہر سال منایا جاتا ہے اور مدرسہ ثانوی کے طالب علموں کی نظر میں اس کی اہمیت غیر معمولی ہے۔ اس دن وہی سارے مدرسے کے مالک ہوتے ہیں۔ استاد تو عموماً چھٹی بلکہ پکنک مناتے ہیں اور اپنے سارے کام اپنے عزیز شاگردوں کے سپرد کر جاتے ہیں۔ بس یوں سمجھیے کہ لڑکے ہی استاد۔ لڑکے ہی شاگرد۔ یہی نہیں چپراسی، بھنگی، بہشتی کا کام بھی یہی انجام دیتے ہیں۔ اپنے گھروں میں ہوسٹل کے کمروں کی صفائی ستھرائی کرتے ہیں۔ انھیں طرح طرح سے سجاتے ہیں۔ اور ان کی ایک دن کی بادشاہت کی شان و شوکت دیکھنے جامعہ کے تمام ادارے بلکہ باہر کے لوگ امنڈ پڑتے ہیں۔

اور آج کا یعنی ۵ر فروری کا دن خدا کے ترانے سے شروع ہوا۔ پھر اشاف کے "لوگوں" کو بیج بانٹے گئے ایک بیج بھنگی کا کام کرنے والے صاحبزادے کو بھی دیا گیا۔ سر پہ پگڑی ہاتھ میں جھاڑو منہ میں بیڑی بڑا مذاق رہا۔

اور پھر سب "ماسٹر لوگ" اپنے اپنے درجوں میں پہنچے۔ پوری ذمہ داری کے احساس کے ساتھ۔ آپ جانیے درجے میں سبھی لڑکے تو ایک سے نہیں ہوتے بعض شریر لڑکوں کو درجے سے نکالنا بھی پڑا۔ بعض "استادوں" کو تو ابھی خاصی پریشانی رہی۔

اسکول کے پرنسپل محمد اسحق صاحب تھے۔ ان بے چاروں کے لیے تو دہری تہری پریشانیاں تھیں۔ جو لڑکے شرارت کی وجہ سے درجوں سے باہر نکال دیے گئے تھے ان کا مسئلہ حل کرنا تھا۔ دفتر میں طرح طرح کے ٹیلیفون آ رہے تھے ان کے جواب دینے تھے۔ جامعہ کالج، ٹیچرس کالج کے استادوں اور لڑکوں نے ان پر سوالوں کی بوچھار کر دی تھی۔ مثلاً داخلے کے متعلق، فیس کے بارے میں تعلیمی اوقات کے علاوہ لڑکوں کے مشغلوں کے بارے میں ضمنی سوالات، لوگ معلوم کرنا چاہتے تھے کیا آیا پرنسپل صاحب کو ان سب باتوں کی خبر بھی ہے۔ پرنسپل صاحب ان سب سوالوں کے جواب بھی دے رہے تھے۔ معقول جواب۔ یہ ان کے لیے ایک ٹیسٹ بھی تھا۔ انھی لوگوں میں جج بھی تو تھے۔ جنھیں یہ فیصلہ کرنا تھا کہ اسٹاف میں کن کن صاحب نے انعام کے قابل کام کیا ہے۔

خدا خدا کر کے یہ دن بخیر و خوبی ختم ہوا۔ اسٹاف کے لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا اور محسوس کیا کہ پڑھانے کے کام سے پڑھنا کہیں آسان ہے۔

ہمارے بہت سے بھائیوں کو تو اب تک یہ سب باتیں انوکھی انوکھی لگتی ہوں گی۔ مگر ان کے کچھ فائدے تو بالکل ظاہر ہیں طالب علموں میں ذمہ داری کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ انھیں یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ہر شخص کی ہر خواہش کو پورا کرنا بہت مشکل ہے۔

اور ہاں آخر میں ججوں کا فیصلہ بھی سن لیجیے۔ پڑھانے والوں میں عبدالحق ثانوی پنجم اول، شفیق احمد دوم آئے۔ بڑے لڑکوں میں سعد منزل اول، شفیق الرحمن قدوائی منزل دوم آئی۔

"بزم ادب" اینگلو اردو ہائی اسکول دھولیہ کے زیر اہتمام
نظم خوانی کا شاندار مقابلہ

یکم دسمبر ۱۹۶۷ء، ۴ بجے شام کو بزم ادب اینگلو اردو ہائی اسکول دھولیہ کے زیر اہتمام "دوسرا نظم خوانی کا مقابلہ" ایس ایس۔ وی۔ پی ایس آرٹس اینڈ سائنس کالج دھولیہ کے ہیڈ آف دی ہندی ڈپارٹمنٹ سروشری ڈاکٹر دشرتھ راج اشانی، ایم۔ اے۔ پی ایچ ڈی کی صدارت میں ہوا۔ نظم خوانی کے اس مقابلے میں شہر کے میونسپل اسکول نمبر ۳، نمبر ۴، نمبر ۸ اور نمبر ۱۵ کے طلباء و طالبات کی کثیر تعداد کے علاوہ اسکول ہذا کی پانچویں جماعت سے لے کر یازدہم تک کے طلباء و طالبات بھی شریک مقابلہ ہوئے۔ اس مقابلے میں شریک ہونے والے طلباء و طالبات کی مجموعی تعداد باسٹھ تھی۔

صدر جلسہ کی اجازت سے صدر بزم ادب نے اسٹیج سکریٹری کے فرائض انجام دیے۔ اسکول کا میدان سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اے۔ ٹی۔ ٹی ہائی اسکول (مالی گاؤں) کے دو مدرسین جناب محمد اسحق انصاری صاحب اور جناب اسرار احمد صاحب نے بھی بطور جج شمولیت کی تھی۔ اس مقابلہ میں حسب ذیل طلباء و طالبات نے انعامات حاصل کیے۔ یاد رہے یہ مقابلہ چار حلقوں میں تقسیم کر دیا گیا۔

پہلا حلقہ (پہلی جماعت سے چوتھی جماعت تک)

(۱) محمد یاسر حفظ الرحمن متعلم جماعت دوم میونسپل اردو اسکول نمبر ۳ دھولیہ نے پہلا انعام اور (۲) مصباح بی محمد ایوب صدیقی متعلم جماعت دوم میونسپل اسکول نمبر ۱۵ نے دوسرا انعام حاصل کیا۔

دوسرا حلقہ (پانچویں جماعت سے ساتویں جماعت تک)

(۱) فرحت آرا مرزا محبوب بیگ متعلم جماعت ہفتم اینگلو اردو ہائی اسکول دھولیہ نے پہلا اور (۲) ہاجرہ بی عبدالرزاق متعلم جماعت ہفتم میونسپل اردو اسکول نمبر ۸ نے دوسرا انعام حاصل کیا

تیسرا حلقہ (آٹھویں جماعت سے نویں جماعت تک)

(۱) شکیل احمد شیخ ابراہیم متعلم جماعت ہشتم الف اینگلو اردو ہائی اسکول دھولیہ نے پہلا اور (۲) زہرہ بی خلیل احمد متعلم جماعت ہشتم ب اینگلو اردو ہائی اسکول نے دوسرا اور (۳) محمد حنیف دگو شاہ متعلم جماعت نہم ب اینگلو اردو ہائی اسکول نے تیسرا۔

چوتھا حلقہ (دسویں جماعت سے گیارہویں جماعت تک)

(۱) نجم خان ابراہیم خان متعلم جماعت یازدہم نے پہلا اور دوسرا انعام مہر النساء محمد بشیر متعلم جماعت دہم ب اینگلو اردو ہائی اسکول نے حاصل کیا۔

خورشید بی
ناظم نشر و اشاعت بزم ادب۔

مورخہ ۲۲ دسمبر ۱۹۶۷ء کو اسلامیہ ہائی اسکول، ناگپور کے استادوں کی ایک میٹنگ جناب محمد طیب احمد صدر مدرس کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ طے پایا کہ اسکول کا ایک میگزین سال میں ایک مرتبہ شائع ہوا کرے۔ جس میں اردو، ہندی اور انگریزی مضامین ہوں گے۔ اس رسالے کا نام "اسلامیہ اسکول گزٹ" ہوگا۔ ایڈیٹر عالی جناب حاجی عبدالوکیل پرویز صاحب ہوں گے۔

شعبۂ ہندی کے لیے جناب محمد نظیر رشیدی ایم اے ایس۔ ٹی۔ سی اور شعبۂ انگریزی کے لیے جناب محمود الحسن صوفی صاحب مقرر کیے گئے۔ شعبۂ اردو کے لیے اس گزٹ کے ایڈیٹر صاحب ہی کا نام انتخاب میں آیا۔

یہ گزٹ جنوری ۶۸ء میں منظر عام پر آ جائے گا۔

نظیر رشیدی۔ ایم۔ اے۔ ایس۔ ٹی۔ سی
اسلامیہ ہائی اسکول، ناگپور۔

شہر ایولہ میں اینگلو اردو ہائی اسکول

شہر ایولہ اپنی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے محتاج تعارف نہیں ہے اس شہر میں عرصہ دراز سے ایک اور اردو میڈیم ہائی اسکول کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی اور اردو دوستان قوم اپنے بچوں کی

مادری زبان میں ہائی اسکول تک تعلیم کے لیے بے تاب تھے متفکر تھے۔ اللہ کا کرم اور اس کی غیبی امداد سمجھیے کہ مناڈا ایجوکیشن اور سوسائٹی کے ممبروں نے وقت پر صحیح رہنمائی کی بالخصوص حاجی عبد الکریم ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر عالی جناب مظفر حسن شیخ صاحب جن کی مساعی جمیلہ اور عملی اقدام سے شہر ابولہ میں جون ۱۹۷۷ء سے ایک اینگلو اردو ہائی اسکول کا قیام عمل میں آیا۔ اور آج ہم خوشی کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ پرنسپل موصوف ہی کی کوششوں کے نتیجہ میں ڈائرکٹر آف ایجوکیشن بمبئی و یمین پونہ نمبر ۳ کے مکتوب گرامی نمبر ۲۳-۹-S مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۷۸ء کے مطابق اسکول ہذا کو سند منظوری در یکوگنیشن، عطا کی گئی، وقت کی ایک اہم ضرورت پوری ہوئی جس کے لیے ہم بارگاہِ خداوندی میں شکر گزار ہیں۔

مراسلہ

عبد العزیز فاروقی (ابولہ)

بقیہ صفحہ ۸ سے

آنکھیں شکر کے آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ بڑا بھائی شاد و خرم چھوٹے بھائی کو سہارا دیے آہستہ آہستہ لا رہا تھا۔ چھوٹے بھائی کے چہرے پر عزم و استقلال کا رنگ جھلک رہا تھا۔ آج وہ پھر زندگی کی دوڑ میں حصہ لینے کے لیے قدم اٹھا رہا ہے اپنے بھائی کے سہارے۔ دونوں کے دلوں میں۔ ایک دوسرے کے قوت بازو بنا رہنے کا مبارک عزم تھا۔

یہ لڑکا جو اپنی ٹانگ سے محروم ہونے سے بال بال بچا وہی سورہا ہے جسے پہلے دنیا نے جنرل کنزن کے نام سے پہچانا جو چند سال پہلے امریکہ کا صدر رہ چکا ہے اور دنیا کے چند سب سے بڑے انسانوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔

(ماخوذ)

اِدھر اُدھر سے

۲۶ جنوری کی دھوم دھام

۲۶ جنوری کو ہر سال دلی دلہن کی طرح سجائی جاتی ہے۔ اب کے تو دو دو مہمان ہمارے جشن میں شریک تھے۔ یوگوسلاویہ کے پریسیڈنٹ ٹیٹو اور روس کے وزیر اعظم کوسی گن۔ ان کی تشریف آوری کی وجہ سے اس بار یوم جمہوریہ کا جشن کچھ زیادہ ہی دھوم دھام سے منایا گیا۔ ۱۹۶۲ء کے بعد پہلی بار راشٹرپتی بھون اور دوسری سرکاری عمارتوں پر روشنی بھی کی گئی۔

فوجی پریڈ اور مختلف ریاستوں سے آئی ہوئی جھانکیاں تو بہار دے ہی رہی تھیں بچوں کی قواعد کا بھی جواب نہیں تھا اس بار فوجی سازوسامان میں راکٹ اور میزائل کی نمائش بھی کی گئی اور جہازوں کے کرتب تو اور سال کے مقابلے میں بہت ہی زیادہ دکھائے گئے۔

آپ کو معلوم ہوگا ۲۶ جنوری ۱۹۵۱ء سے ہمارے ملک میں جمہوری حکومت کا نیا دستور نافذ ہوا ہے۔ یہ دن ہمارے ملک میں ایک قومی تہوار کی شکل میں منایا جاتا ہے۔ دلی کے علاوہ ہندوستان کے کونے کونے میں اس سال ۲۶ جنوری بہت دھوم دھام سے منائی گئی۔ دلی کا تو کہنا ہی کیا، یہاں تو صدر جمہوریہ خود فوجوں کی سلامی لیتے ہیں۔

۱۵۵ سال کے کشمیری بزرگ کا انتقال

سری نگر ۸ فروری۔ اس ہفتے کشمیر میں سب سے معمر بزرگ مولانا مقبول شاہ اللہ کو پیارے ہوئے۔ انھوں نے زندگی کی ۱۵۵ بہاریں دیکھیں۔ کشمیر سے چالیس میل دور شمال کے ایک گاؤں (کوئل مقام KOIL MUKAM) میں یہ مسجد کے امام تھے۔ بہت متقی اور پرہیزگار تھے۔ موت سے ایک ہی دن پہلے بیمار پڑے تھے۔ مرحوم نے اٹھارہ اولادیں چھوڑی ہیں۔ ان میں پوتے پرپوتے سبھی شامل ہیں۔

ہندوستان کا بین الاقوامی راکٹ اسٹیشن

آندھرا پردیش میں تھمبا کے پاس راکٹ اڑانے کے ایک بین الاقوامی اسٹیشن کا فروری کے پہلے ہفتے میں وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے افتتاح فرمایا۔

یہ اسٹیشن ہندوستانی حکومت نے روس امریکہ اور فرانس کی مدد سے تیار کیا ہے۔

اس موقعے پر خلائی تحقیق کی ہندوستانی قومی کمیٹی کے صدر جناب وکرم سارا بھائی نے اعلان کیا کہ ہندوستان خلائی پرواز کے میدان میں اپنے طور پر تجربے کر رہا ہے اور ۱۹۷۰ء کے بعد دو ایک سال کے اندر ہی خلا میں

اپنا پہلا (خلائی) [illegible] سکے گا۔
تھمبا میں اسٹیشن کے افتتاح کے دن ہندوستان میں بنے "روہنی" راکٹ کے علاوہ فرانس اور امریکہ کے دو راکٹ بھی چھوڑے گئے۔

پودوں کے ذریعہ دھاتوں کی دریافت

زمین کے سینے میں مختلف دھاتوں کا خزانہ بھرا پڑا ہے۔ ان دھاتوں کا پتہ زمین کی کھدائی کے ذریعے لگتا ہے۔ یہ طریقہ بہت مہنگا ہے، بہت مشکل ہے۔ امریکہ کے کچھ سائنسداں پودوں کے مطالعے کے ذریعے دھات کا پتہ لگانے کے آسان طریقے پر ان دنوں تحقیق کر رہے ہیں۔

امریکہ کے سائنسداں ڈاکٹر آر۔ جے۔ تھامپسن نے بتایا کہ دھاتوں کے اثر سے پودوں میں مادّی تبدیلیاں آتی ہیں۔ مثلاً پتے پیلے پڑ جاتے ہیں، شگوفوں میں رنگ آجاتا ہے، قد چھوٹا ہو جاتا ہے یا غیر معمولی طور پر لمبے ہو جاتے ہیں اور کچھ پودوں کی جڑوں سے ۲۰ فٹ کی گہرائی تک دھات کے ذخیروں کا پتہ چلتا ہے۔

مسٹر تھامپسن نے بتایا کہ بعض پودوں میں دھات کی زیرِ زمین موجودگی کی علامتیں ملیں۔ چنانچہ یورینیم، جست اور سونے کی دریافتیں ہوئی ہیں۔ بعض پودوں کے پتوں، شاخوں اور شگوفوں میں یورینیم، تانبا اور جست پایا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ پودے اس زمین کے نمونے کا کام دیتے ہیں جس میں یہ اُگے ہوں۔ زمین کی کھدائی کر کے نیچے سے مٹی کے نمونے نکالنے کی نسبت پودوں کا معائنہ کرنا آسان بھی ہے اور سستا بھی۔

ہوا سے پانی حاصل کرنا

دنیا کے بہت سے جزیروں اور ساحلی علاقوں میں میٹھا پانی دستیاب نہیں ہے۔ امریکہ کے دو سائنسدانوں نے ایک ایسا طریقہ دریافت کیا ہے جس کے ذریعہ ان علاقوں میں ہوا کے ذریعہ پانی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہ طریقہ ہے بحری ہواؤں سے ہوا کی نمی کو منجمد کر کے میٹھا پانی حاصل کرنا۔

اس میں سمندر کا پانی پائپ کے ذریعہ منجمد کرنے والے پلانٹ میں پہنچایا جاتا ہے جو ہواؤں کو روکنے کے لیے ساحل پر نصب کیا جاتا ہے۔ اس طرح سے سرد ہونے والا پانی ہوا میں خنکی پیدا کر دے گا جس سے ہوا میں نمی کا عنصر منجمد ہو جائے گا اور اس سے میٹھا پانی حاصل کیا جا سکتا ہے۔

برفانی دیو امریکہ میں بھی

بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ ہمالیہ پہاڑ کی بلندیوں پر "بن مانس" سے ملتا جلتا "برفانی مانس" رہا کرتا ہے۔ اسے لوگ "برفانی دیو" بھی کہتے ہیں۔ اب ایسی خبریں ملی ہیں کہ اس طرح کا "برفانی مانس" شمالی امریکہ کے مغربی ساحلوں پر بھی موجود ہے۔

خیال کیا جاتا ہے کہ یہ آٹھ دس فٹ کا دیو قامت دیو ہے جس کا وزن چھ سو پونڈ سے کم نہیں ہوگا۔ اس کے جسم پر لمبے لمبے بال ہیں۔ اس طرح کی شہادتیں ملی ہیں کہ یہ دیو برٹش کولمبیا، کناڈا سے کیلی فورنیا تک کے برف سے منجمد علاقے میں گھوما کرتا ہے۔

مصالحوں سے تندرستی

جرمنی کے ایک مشہور سائنسداں پروفیسر ہانس [illegible]

نے پچھلے دنوں مغربی برلن میں ایک بہت پرانی غلط فہمی کو دور کر دیا ہے کہ مصالحہ دار چٹپٹی غذائیں انسانی صحت و تندرستی کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتی ہیں۔ پروفیسر موصوف نے جرمنی کے شہر فروڈنسٹڈ میں غذائی مصالحوں کے ان گوناگوں فوائد کا تذکرہ جرمن کیمیائی ماہرین کی انجمن کے ایک حالیہ بین الاقوامی اجتماع میں کیا تھا جس کے مطابق نئی غذائی تحقیقات سے مصالحوں کے انسانی روزمرہ خوراک کا ایک فطری اور ضروری جزو ہونے کے متعلق اب شک و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔

خلائی جہازوں کے روغن کا مکانوں میں استعمال

ایک امریکی فرم نے خلائی جہازوں پر چڑھائے جانے والے پینٹ (روغن) کو مکانوں کے اندر پختہ پینٹ کی صورت میں منتقل کیا ہے۔

شکاگو (ہلی نوائے) کی یونائیٹڈ کوٹنگس انکارپوریٹڈ کا کہنا ہے کہ یہ روغن منٹوں میں سوکھ جاتا ہے اور بہت پختہ ہے اور بار بار صاف کرنے یا ملنے پر بھی مدھم نہیں پڑتا۔

امریکی فضائی اور خلائی محکمے (ناسا) نے اصل میں یہ پینٹ خلائی جہازوں کے لیے بنایا ہے تاکہ ان پر تابکاری اور درجۂ حرارت کی شدت کا اثر نہ ہونے پائے۔

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس دریا گنج دہلی میں آفسٹ پر چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی سے شایع کیا۔

فارم IV حسب قاعدہ ۸ پیام تعلیم

۱ مقام اشاعت — جامعہ نگر نئی دہلی
۲ وقفہ اشاعت — ماہنامہ
۳ پرنٹر کا نام — سید احمد ولی — قومیت: ہندوستانی
۴ پبلشر کا نام — سید احمد ولی — قومیت: ہندوستانی
پتہ: جامعہ نگر نئی دہلی
۵ ایڈیٹر کا نام — محمد حسین حسان — قومیت: ہندوستانی
پتہ: جامعہ نگر نئی دہلی
۶ مالکان کے نام و پتے۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی چیرمین پروفیسر محمد مجیب
پتہ: جامعہ نگر نئی دہلی

ڈائرکٹرز
۱۔ سید مجتبیٰ حسین زیدی، جامعہ نگر نئی دہلی
۲ ڈاکٹر عبد العلیم ۲ یونیورسٹی روڈ۔ علی گڈھ
۳ مسٹر ایم آر جنائے مہر بلڈنگ چرپاٹی، بمبئی
۴ ہز ہائی نس نواب اقبال محمد خاں آف پالن پور، کف پریڈ، کولابہ، بمبئی
۵ کرنل بشیر حسین زیدی ایم پی ۱۲/۱۱ اجن پتھ لین نئی دہلی
۶ ضیاء الحسن فاروقی، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

کمپنی کے سرمایہ کے ۱ فی صدی سے زیادہ کے حصے دار
جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی
اسلام جیم خانہ کینڈی سی فیس، بمبئی

میں سید احمد ولی تصدیق کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا اطلاعات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

۲۶ر فروری ۱۹۶۸ء — دستخط احمد ولی
پبلشر

Regd. No. D-1457. March, 1968.

Payam -i- Taleem

New Delhi-25.

پیام تعلیم

ڈاکٹر محمد اقبال

پیام تعلیم
جلد ۵
اپریل ۱۹۶۶ء
شمارہ ۴
ایڈیٹر
محمد حسین حسان ندوی
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵
شاخ پرنس بلڈنگ بمبئی ۳
شاخ شمشاد مارکیٹ علی گڑھ
شاخ
اردو بازار
دہلی ۶
سالانہ چندہ
چھ روپے
فی پرچہ
۶۰ پیسے

نئے سال کی خوشی میں
خاص رعایت
بچوں کے لیے بلاک سے چھپی اور ہندوستان کے مشہور آرٹسٹ ڈی۔ بدری کی بنائی ہوئی رنگین تصویروں والی
کتابوں کی قیمت آدھی کر دی گئی
انوکھی ملاقات
مصنف: پروفیسر عبدالغفور۔ اصل قیمت ۶۲/۰: رعایتی قیمت ۳۰ پیسے
جی کتے اور جھاؤ چوہے کی دلچسپ ملاقات
اور نوک جھونک۔ کون جیتا؟ — ہم کیوں بتائیں
کتاب منگائیے اور پڑھیے
اپنے آپ معلوم ہو جائے گا
ایک ٹانگ کا بادشاہ
مصنف غلام عباس۔ اصل قیمت ۷۰: رعایتی قیمت صرف ۳۵ پیسے
بادشاہ کی ٹانگ شیر نے چبا ڈالی۔ بادشاہ نے
اعلان کیا کہ جو کوئی نئی ٹانگ لائے گا اس کی شادی شہزادی
سے کر دی جائے گی۔ کون ٹانگ لایا؟ کس سے شہزادی کی شادی
ہوئی یہ اس کتاب میں پڑھیے۔
پیارے رسولؐ
سلطانہ آصف فیضی کی لکھی ہوئی انوکھے انداز اور آسان زبان میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم
کی زندگی کے حالات
رعایتی قیمت صرف ۵۴ پیسے
گلابو چوہیا اور غبارے
مصنفہ: قدسیہ زیدی۔ اصل قیمت ۹ پیسے رعایتی قیمت ۴۵ پیسے صرف
اللہ بخشے گلابو چوہیا بڑی ہی رحم دل تھیں۔
ظالم کسان
مصنف محمد شفیع الدین نیر۔ اصل قیمت ۷ پیسے رعایتی قیمت ۳۵ پیسے
ایک کمزور بونے نے ایک ظالم کسان کو کس طرح سیدھے راستے
پر لگایا۔
جلّو مرغابی
مصنف قیصر حسین زیدی۔ اصل قیمت دو روپے رعایتی قیمت ایک روپیہ صرف
جلّو نام کی مرغابی، اس کے آٹھ چھوٹے چھوٹے بچوں کی نرالی داستان۔
برانچ
پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳ (بی آر)
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵
برانچ
اردو بازار دہلی ۶

سرورق کی تصویر: اُڑنے والا آملیٹ۔ بہ شکریہ اطلاعاتِ جرمنی

فہرست

سعید صاحب کے ساتھ دہلی تشریف لائے تھے۔ محترم جناب احمد اللہ فاروقی پیام تعلیم کے پرانے قدردان ہیں۔ [illegible] کے گرد بڑے پہلے رسالے کے لیے مضمون بھی لکھتے رہے ہیں۔ [illegible] میں پیام تعلیم نئے سرے سے نکلا تو پرانی یادیں پھر ابھر آئیں اور محبت اور خلوص کا رشتہ پھر مضبوط ہو گیا۔ ابھی تو دہلی پہنچتے ہی مکتبہ پیام تعلیم ایڈیٹر پیام تعلیم سے ملنے کی فکر ہو گئی۔ صبح نو بجے سعید صاحب کے ہمراہ مکتبہ جامعہ تشریف لائے۔ ایڈیٹر پیام تعلیم اور منیجر پیام تعلیم سے زیادہ تر پیام تعلیم کے بارے میں بات چیت ہوتی رہی۔ آپ نے اس کی ترقی کے سلسلے میں ہر طرح امداد کا یقین دلایا۔ حیدرآباد میں اسے زیادہ سے زیادہ مقبول بنانے کا وعدہ فرمایا

مگر اس سلسلے میں ہم اپنے پیامیوں کی مدد کے زیادہ منتظر ہیں۔ جو سچ پوچھیے تو یہ کام جو آپ کے بڑے کر رہے ہیں اصل میں آپ کا کام ہے۔ پیام تعلیم بڑوں کا نہیں آپ کا پرچہ ہے۔ اسے آپ پسند کرتے ہیں۔ اپنے لیے مفید اور کارآمد سمجھتے ہیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ آپ کا پرچہ قائم اور باقی رہے بلکہ دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرے تو آگے بڑھیے۔ اس کی مدد کیجیے۔ اس کے خریدار بڑھائیے۔ اپنے دوستوں کو اپنے پڑوس کے لکھے پڑھوں کو پیام تعلیم دکھائیے۔ ان سے اصرار کیجیے کہ اپنے گھر کے بچوں کے لیے اسے ضرور منگوائیں۔ اسکول کے ساتھیوں کو دکھائیے اور انھیں خریداری پر آمادہ کیجیے۔ انھیں اس بات پر آمادہ کیجیے کہ اس مبارک کام میں آپ کا ہاتھ بٹائیں۔

ابھی پچھلے سال ہماری حکومت نے ڈاکخانے کا محصول بڑھایا تھا۔ آپ کا پیام تعلیم دو پیسوں کی جگہ پانچ پیسوں میں جاتا تھا۔ ڈاک کا محصول اتنا بڑھ گیا تھا کہ آپ کے منیجر صاحب کو پیام تعلیم کی قیمت مجبوراً (برائے نام) بڑھانا پڑی تھی۔ پر اس مرتبہ پھر ہماری سرکار نے ازراہ ہمدردی اس طرف توجہ فرمائی ہے۔ اور محصول میں اضافہ کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ پیام تعلیم کا جو پرچہ پہلے پانچ پیسے میں جاتا تھا اب اس پر زیادہ ٹکٹ لگانا پڑیں گے۔ خدانخواستہ یہ تجویز سرے پڑھ گئی۔ ہماری پارلیمنٹ میں منظور ہو گئی تو ہمیں پھر سوچنا پڑے گا لیکن ابھی آپ کی توجہ اور مدد سے پیام تعلیم کے خریدار آمادہ ہو جائیں تو شاید سوچنے کا موقع نہ آئے۔ کوئی ایسا قدم اٹھانے کی ضرورت نہ پڑے۔

اس پرچے میں کسی دوسری جگہ آپ ایک ترانہ نما نظم پڑھیں گے۔ ابھی فروری کے آخری اور مارچ کے پہلے ہفتے میں۔ مدرسہ ابتدائی کے بچوں نے ہمایوں کے مقبرے کے پاس (اسکاوٹ گراؤنڈ میں) اپنا کیمپ لگایا تھا۔ جامعہ والے اسے کھلی ہوا کا مدرسہ کہتے ہیں۔ جناب رشید الوحیدی صاحب نے یہ نظم مدرسہ ابتدائی کے انھی بچوں کے لیے لکھی تھی۔ اس مدرسہ کی دس دن کی روداد بہت دلچسپ ہے۔ اگلے مہینے ہم اس کی رپورٹ اور غالباً کچھ تصویریں بھی شایع کر سکیں۔

سالنامہ پر رائے کے انعامی مقابلے میں ججوں نے۔ محمد امین صاحب (بمبئی) کو اول قرار دیا ہے۔

میکسم گورکی کا نام شاید آپ نے سنا ہو۔ روس کا بہت بڑا ادیب تھا۔ تمام دنیا میں اس کی شہرت ہے۔ ۲۸ مارچ ۶۸ کو اس کی سو سالہ سال گرہ منائی جا رہی ہے۔ روس ہی میں نہیں ہندوستان اور دوسرے ملکوں میں بھی۔ ہماری حکومت تو اس موقع پر ڈاک کے ٹکٹ بھی جاری کر رہی ہے۔ ہند سوویت کلچرل سوسائٹی نے یہ سو سالہ جشن گورکی ہندوستان بھر میں منانے کا پروگرام بنایا ہے۔ افسوس ہے کہ یہ اطلاع ہمیں دیر میں ملی۔ پرچہ تیار ہو چکا تھا۔ انشاء اللہ اگلے پرچے میں ہم اپنے پیامیوں کے لیے گورکی کے بارے میں مفید معلومات فراہم کر سکیں گے۔

جناب رشید الوحیدی

کھلی ہوا کا مدرسہ

مدرسہ ابتدائی کے بچے جامعہ سے باہر دس دن کے لیے کھلی ہوا میں جاتے ہیں۔ وہاں تعلیم کے ساتھ کھیل کود اور دوسری تفریح کا سامان ہوتا ہے اس بار بچے ہمایوں کے مقبرے گئے تھے۔ یہ نظم اس موقع پر لکھی گئی۔

رشید الوحیدی جامعہ ملیہ

کھلی ہوا میں آکے یوں بدل گئی ہے زندگی
نگاہ میں سرور ہے دلوں میں ایک تازگی

جدھر اٹھائیے نظر بہار ہی بہار ہے
ہر ایک سمت ہے چمن پہاڑ کوہسار ہے

ہماری ہمتیں جواں بڑھے ہمارا کارواں
نظر ہے سوئے آسمان وطن کے ہم ہیں پاسباں

سلیقہ زندگی کا جامعہ نے یوں سکھادیا
ہمیں ہر ایک نے خلوص کا سبق پڑھادیا

ابھی ہماری عمر کیا مگر بڑھے ہیں حوصلے
دلوں میں ہیں ابھی سے موجزن ہمارے ولولے

ہمیں تو ہیں جہاں میں دکھے دلوں کا آسرا
بنیں گے بڑھ کے شوق سے ہر ایک درد کی دوا

کھلی ہوا میں ہم بہت سی باتیں سیکھ جائیں گے
مزے کے ہوں گے رات دن جو ہم یہاں بتائیں گے

اساتذہ بھی ہیں کلاس بھی ہے ہاسٹل بھی ہے
یہاں پہ زندگی کی مشکلیں ہیں ان کا حل بھی ہے

قدم قدم نشہ نشہ سکون ہے سرور ہے
نہیں ہے فکر و غم دلوں میں روشنی ہے نور ہے

یہ بستی جنگلوں میں ہم نے اس لیے بسائی ہے
وجود میں یہ جامعہ اسی طرح سے آئی ہے

یہ زندگی ہے غم سے دور عشق سے قریب ہے
کھلی ہوا کے مدرسے کی شان بھی عجیب ہے

جناب شمیم حنفی

(ایک جادوئی کہانی)

المختصر

(انگریزی سے)

پریوں کے شہر سے آگے جنگل تھے۔ ہرے بھرے
... پہاڑیاں اور گنگناتے ہوئے جھرنے۔ اسی جنگل میں
... چھوٹا سا گھر تھا۔ اس گھر میں بس دو آدمی تھے، میاں اور
... دونوں کو اپنے اکیلے پن کا بڑا دکھ تھا۔ دھوپ میں نہائی
... صبح اور سنولائی شام کو جب کبھی وہ ساتھ بیٹھتے ان کے
... بس ایک بات آتی "کاش خدا نے ہمیں ایک بچہ دے
... پھر یہ گھر کتنا اچھا لگتا۔ کیسی چہل پہل رہتی۔"

ایک بوڑھے جادوگر کو ان کا حال معلوم ہوا۔ اسے
... افسوس ہوا کہ وہ اتنے اکیلے ہیں اور ان کا گھر اتنا سنسان
... جس گھر میں بچے نہ ہوں وہاں کتنی ویرانی ہوتی ہے! جادوگر
... سوچا۔

"یہ میاں بیوی بہت شریف ہیں، بہت نیک۔ اللہ
... ان کی مدد کرنی چاہیے۔"

یہ سوچ کر ایک دن جادوگر ان کے گھر گیا۔ اس
نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ آواز سنتے ہی ایک
... سادی عورت باہر آئی۔ اس نے بڑے نرم لہجے میں
کہا "آیئے اندر تشریف رکھیے! میرے شوہر باہر گئے
ہوئے ہیں۔ میں کھانا پکا رہی ہوں۔ آپ تھوڑی
دیر آرام کیجیے۔ جب تک کھانا تیار ہو جائے گا۔ ہم غریب
لوگ ہیں۔ روکھا سوکھا جو بھی ہوگا آپ کے سامنے رکھ دیں گے۔"

جادوگر نے اپنا چغہ اتار کر کھونٹی پر ٹانگ دیا۔
اس عورت کی محبت آمیز باتوں کا جادوگر کے دل پر بہت اثر
ہوا۔ اس نے کہا "آپ بہت مہذب اور نرم دل ہیں۔ میں
بوڑھا جادوگر ہوں۔ جادو کے زور سے بہت بڑے بڑے
کام کرسکتا ہوں۔ میری آرزو ہے کہ آپ کی خدمت کروں بتائیے!
آپ دونوں کیا چاہتے ہیں؟"

عورت ایک دو منٹ کے لیے چپ رہی۔ جادوگر
پھر بولا "آپ کی سب سے بڑی آرزو کیا ہے؟ مجھے
بلا جھجک بتا دیجیے۔ آپ کی خدمت کرکے مجھے خوشی ہوگی۔"

عورت نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا "خدا
نے ہمیں جو کچھ دیا ہے۔ وہ ہمارے لیے بہت ہے۔ ہمیں عیش و
آرام کا لالچ نہیں۔ بس ایک آرزو ہے جو دل میں کانٹے کی
طرح کھٹکتی ہے۔"

"وہ کیا؟" جادوگر نے جلدی سے پوچھا۔

عورت نے دھیرے سے جواب دیا "ایک بچہ!
بغیر بچے کے گھر کی دنیا کتنی اداس ہے۔ بچے

کی بھولی بھالی باتیں، اس کی مسکراہٹ، شرارتیں، یہ ساری
باتیں نہ ہوں تو دنیا کتنی بے رنگ ہو جائے "۔
جادوگر یہ سن کر مسکرانے لگا۔ اس نے بڑی نرمی سے
کہا "بہت اچھا! آپ کی یہ آرزو پوری ہوگی "۔ اور اتنا کہہ
کر وہ وہاں سے غائب ہوگیا۔

دھیرے دھیرے شام ہوئی۔ رات آئی۔ چاروں
طرف سناٹا پھیل گیا۔ میاں بیوی دونوں سو گئے۔ رات بھر وہ
گہری نیند میں ڈوبے رہے۔ صبح کو سورج کی کرنوں نے انھیں
گدگدایا۔ دونوں جاگے اور حیرت سے دیکھا بستر پر ایک چھوٹا سا
بچہ تھا، بہت خوبصورت لیکن بہت چھوٹا۔ ایک انگوٹھے کے برابر۔

تھوڑی دیر بعد وہاں پریوں کی رانی آئی۔ اس نے
دونوں سے ہنستے ہوئے کہا "آپ کو بچہ مل گیا۔ لیکن یہ ہمیشہ
اتنا ہی بڑا رہے گا، بس انگوٹھے کے برابر۔"

میاں بیوی نے اس پر بھی خدا کا شکر ادا کیا۔ یہی
خوشی کیا ان کے لیے کم تھی کہ ان کی آرزو پوری ہوئی۔ بچے
کا نام انھوں نے "المختصر" رکھ دیا۔

المختصر اتنا چھوٹا تھا کہ پریوں کی رانی کو بڑی محنت
سے اس کے کپڑے تیار کرنے پڑے۔ اس کے لیے دیودار کے
پتے کی ٹوپی بنی، چوہے کی کھال کی جوتیاں بنیں، شہد کی مکھی کے
پروں کا کوٹ بنا اور گلہری کی کھال کی قمیص۔ پھر پریوں کی رانی
نے المختصر کو ایک جادو کی تلوار دی اور اس سے کہا "اس
تلوار کو ہمیشہ اپنے پاس رکھنا "۔

المختصر بہت اچھا بچہ تھا، بہت فرماں بردار، تمیز دار
اور ذہین۔ بس اس میں ایک ہی عادت خراب تھی اسے ہمیشہ ہر بات
کو جاننے کی خواہش رہتی تھی۔ کیسی ہی بات ہو، کسی کی بھی بات
ہو، المختصر اسے سمجھنے اور جاننے کے لیے بے قرار رہتا تھا۔
ایک دن المختصر کی ماں باورچی خانے میں
کھیر پکا رہی تھی۔ اسی وقت کسی نے دروازے کی زنجیر ہلائی۔
ماں باورچی خانے سے اٹھ کر باہر گئی اور میاں المختصر چولھے
کے پاس پہنچے۔ انھوں نے چولھے پر چڑھی دیگچی میں جھانکنا
شروع کیا اور سوچنے لگے۔ " اس برتن میں آخر کیا پک
رہا ہے ؟"

اتنا چھوٹا ہونے کی وجہ سے اسے برتن کا جائزہ
لینے میں بڑی دشواری ہو رہی تھی۔ ادھر ادھر دیکھ کر المختصر
نے قریب ہی پڑا ہوا ایک کانٹا اٹھا لیا۔ اس کانٹے کو سیڑھی
کی طرح چولھے سے لگا دیا۔ پھر خوش ہو کر دل ہی دل میں کہا۔
"اب میں اس پر چڑھ کر اچھی طرح دیکھ سکتا ہوں "۔

برتن کے کنگوروں پر ہاتھ لگا کر المختصر اچکنے لگا۔
اچانک وہ اتنی زور سے اچھلا کہ سر کے بل اسی دیگچی میں پہنچ گیا۔

چند لمحوں بعد ماں باہر سے آئی، دیگچی میں اسے کوئی
چیز تیرتی ہوئی نظر آئی۔ اس نے سوچا " شاید چھپکلی ہے "
یہ سوچ کر اس نے دیگچی اٹھائی اور ساری کھیر کھڑکی سے باہر
پھینک دی۔

کھڑکی کے پاس ہی ایک ندی تھی۔ کھیر کے ساتھ
ہی المختصر بھی اس ندی میں پہنچ گیا۔ پانی کی لہروں کے ساتھ
اچھلتا کودتا وہ آگے بڑھ رہا تھا کہ ایک مچھلی آئی۔ مچھلی نے
ایک ہی سانس میں المختصر کو نگل لیا۔

وہ مچھلی ایک مچھیرے کے ہاتھ لگ گئی۔ مچھیرے نے
سوچا " اتنی شاندار مچھلی تو بادشاہ کے دسترخوان پر پہنچنی چاہیے"
یہ سوچ کر اس نے مچھلی محل کے باورچی کو دے دی۔

باورچی بہت خوش ہوا۔ اس نے چاقو سے مچھلی کا
پیٹ چاک کیا۔ اچانک اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔
مچھلی کے پیٹ میں ایک ننھا سا بچہ تھا۔ مسکراتا ہوا وہ
پیٹ سے نکل آیا۔ باورچی کو مارے ڈر کے پسینہ آگیا۔

سارے باورچی خانے میں شور مچ گیا۔ ہوتے ہوتے یہ بات بادشاہ کے کانوں تک پہنچی۔ المختصر کو بڑی حیرت تھی کہ آخر اتنا شور کیوں مچا ہوا ہے۔ ہیرے جیسی جگمگاتی آنکھوں سے وہ ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں وزیر آیا اور اسے ساتھ لے کر بادشاہ کے پاس گیا۔ المختصر نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ بس خاموشی سے بادشاہ کی طرف دیکھتا رہا۔

بادشاہ کچھ دیر تک حیران رہا۔ پھر سوال کیا۔ "تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ تمہارا نام کیا ہے؟"

المختصر نے اپنی پتلی سُریلی آواز میں پوری کہانی بادشاہ کو سنا ڈالی۔

بادشاہ اس کی کہانی سن کر بہت خوش ہوا۔ اسے المختصر پر بہت پیار آیا۔ رفتہ رفتہ وہ المختصر کو اتنا پسند کرنے لگا کہ ایک منٹ کے لیے بھی اسے الگ نہ ہونے دیتا۔ المختصر کا دل بھی محل میں لگ گیا۔ اب اس کی زندگی بڑے آرام کی تھی۔ ٹھاٹ باٹ، شان و شوکت، نوکر چاکر، سب کچھ اسے حاصل تھا۔

بادشاہ المختصر کو اپنے ساتھ سیر کے لیے لے جاتا تھا۔ وہ خود ایک عمدہ سے گھوڑے پر سوار رہتا۔ المختصر ایک ننھے سے چوہے پر۔ ایک دن المختصر اپنے چوہے پر سوار بادشاہ کے ساتھ جنگل میں گھوم رہا تھا۔ اتنے میں ایک بلی سامنے آگئی۔ بلی نے چوہے کو دیکھا، چوہے کی پیٹھ پر سوار المختصر کو دیکھا اور ایک چھلانگ لگا کر دونوں کو دبوچ لیا اور ایک درخت پر چڑھ گئی۔ اب المختصر نے جادو کی تلوار نکالی۔ ہاتھ گھما گھما کر وہ بلی پر وار کرنے لگا۔ فتح اسی کی ہوئی۔ جادو کی تلوار نے بلی کی گردن اڑا دی تھی۔

بلی کی چیخ سن کر بادشاہ درخت کی طرف دیکھنے لگا۔ المختصر دھیرے دھیرے نیچے اتر رہا تھا۔ اس کے پیر بہت چھوٹے تھے۔ درخت بہت لمبا تھا۔ وہ جلدی ہی تھک گیا اور اچانک اس کے پیر پھسل گئے۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ زمین پر گرتا بادشاہ نے لپک کر اسے اپنی گود میں سنبھال لیا۔

محل پہنچ کر المختصر بیمار پڑ گیا۔ اس کا سارا بدن دکھ رہا تھا۔ ساتھ ہی بخار اور کھانسی۔ اب اسے اپنی ماں کی یاد آنے لگی۔ وہ ہر وقت اداس رہنے لگا۔ روز بروز وہ دبلا اور کمزور ہوتا گیا۔

بادشاہ کو یہ دیکھ کر بے حد افسوس ہوا۔ اس نے شفقت سے چمکارتے ہوئے پوچھا "المختصر! تمھیں یہاں کوئی تکلیف ہے؟"

"میں یہاں بہت آرام سے ہوں جہاں پناہ! بس ماں کی یاد آتی ہے۔ مجھے گھر بھجوا دیجیے۔" المختصر نے سسکتے ہوئے جواب دیا۔

بادشاہ المختصر کو اتنا پیار کرتا تھا کہ اسے کہیں اور بھیجنے پر تیار نہیں ہوا۔ اس نے المختصر کو بہت بہلایا، پھُسلایا، دلاسہ دیا، لیکن المختصر کی حالت بگڑتی ہی گئی۔ وہ سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔

پریوں کی رانی نے جادوئی آئینے میں ایک دن المختصر کی حالت دیکھی، وہ پریشان ہو گئی۔ ہوا کے ساتھ اڑی، بادلوں کو چیرتی، وہ المختصر کے پاس جا پہنچی۔ المختصر اسے دیکھ کر اتنا خوش ہوا، اتنا خوش ہوا کہ اپنی ساری تکلیف بھول گیا۔ اسے یہ بھی نہ یاد رہا کہ وہ بیمار ہے۔ خوشی سے وہ اچھلنے کودنے لگا۔

اس جگہ المختصر تھا اور پریوں کی رانی۔ بادشاہ تھوڑی دیر کے لیے کسی کام میں لگ گیا تھا۔ محل کے نوکر چاکر بھی غائب تھے۔ پریوں کی رانی نے المختصر کو اپنے سینے سے لگا لیا اور ہوا میں اڑتی المختصر کے گھر جا پہنچی۔

المختصر کو اپنا گھر مل گیا۔ ماں باپ مل گئے۔ ان کی شفقت اور چاہت نے اس کی ساری بیماری اور تکلیف دور کر دی۔ وہ بڑے آرام سے ان کے ساتھ رہنے لگا۔ [illegible] گیا کہ اب ماں سے پوچھے بغیر کوئی کام نہیں کرے گا۔

جناب اطہر عزیز

کتاب

جہاں کی سیر کراتی ہے یہ کتاب تمھیں
فسانے گیت سناتی ہے یہ کتاب تمھیں

کتاب ہی سے ادب کا چراغ روشن ہے
جو یہ نہ ہو تو جہاں ظلمتوں کا مسکن ہے

سبھی گلوں سے سجا ہے کتاب کا دامن
پیام، کلیاں، مسرت، کھلونا اور بچپن

بہت ہیں یوں تو زمانے میں دوست اور اغیار
کوئی بھی اس سے نہیں بڑھ کے مونس و غم خوار

ہنسی ہنسی میں تمھیں خوب یہ رلائے گی
لگو گے رونے تو بڑھ کر یہ پھر ہنسائے گی

ہو کتنی دور کوئی کر لو اس سے تم باتیں
مزہ تو یہ ہے کہ گھر بیٹھے ہوں ملاقاتیں

کسی کو یہ جو سکھاتی ہے صنعت و حرفت
تو بخشتی ہے کسی کو یہ دولت و عزت

بھلی کتاب پڑھو گے تو تم بھلے ہو گے
بُری کتاب پڑھو گے اگر بُرے ہو گے

ہر ایک بات کا دل میں حساب کر کے پڑھو
پڑھو کتاب تو تم انتخاب کر کے پڑھو

کتاب ہی سے گھروں کا نکھار ہے بچو
اسی سے سارے جہاں میں بہار ہے بچو

منھ بولا بیٹا

آپ نے شاید سنا ہوگا کہ کچھ لوگ دوسرے کے بچوں کو متبنیٰ یا منھ بولا بیٹا بنالیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگ دوسرے کے بچوں کو اپنی اولاد کی جگہ دیتے ہیں۔ ہمارے دیش میں عام طور پر صرف ایسے لوگ متبنیٰ بناتے ہیں جن کی اپنی کوئی اولاد نہیں ہوتی۔

مگر یورپ اور امریکہ میں اپنی اولاد نہ ہونے پر تو متبنیٰ بناتے ہی ہیں کچھ لوگوں کو اولاد ہوتے ہوئے بھی دوسروں کے بچوں کو اپنانے، انھیں پالنے اور پروان چڑھانے کا شوق ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کے بچوں کو لے لیتے ہیں۔ بعض لوگ ایسے بچے لیتے ہیں جن کے ماں باپ کم سنی میں مرجاتے ہیں اور ان کا پالنے والا کوئی نہیں ہوتا۔

بعض حالتوں میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی بچے کے ماں باپ بہت مفلس ہوتے ہیں یا ان کی اولاد اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ وہ صحیح طور پر اس کی تعلیم و تربیت نہیں کرسکتے۔ ایسے بچوں کو بھی نیک لوگ متبنیٰ بنالیتے ہیں۔

مغربی ملکوں میں ایسے بچوں کو گھر گھر تلاش نہیں کرنا پڑتا۔ وہاں ایسی انجمنیں ہیں جو بچوں کی فہرستیں رکھتی ہیں اور ان کے پورے حالات سے باخبر ہوتی ہیں جو متبنیٰ بنائے جاسکتے ہیں۔ ضرورت مند لوگ ان انجمنوں سے رجوع کرتے ہیں اور اپنی خواہش کے مطابق بچے لیتے ہیں۔

آئیے اب ہم آپ کو ایک بچے کی سچی کہانی سنائیں جسے کوئی متبنیٰ بنانے پر تیار نہ تھا اور جب ایک نیک دل انسان نے اپنایا تو وہ بچہ بہت سعادت مند بچہ بن گیا۔ یہ کہانی بلکہ یوں کہیے کہ یہ واقعہ امریکہ کی ایک جج شریمتی شرمن نے یوں لکھا ہے۔

یہ ۱۹۲۹ء کی بات ہے شریمتی شرمن کے پاس ایک چالیس بیالیس سالہ خاتون شریمتی ویلاک آئیں اور ان سے درخواست کی کہ ان کو ایک بچہ متبنیٰ بنانے کے لیے دلا یا جائے شریمتی ویلاک نے بتایا کہ ان کی شادی کو بیس سال سے زیادہ ہوگئے ہیں۔ ان کے شوہر ایک کامیاب کسان

ہیں۔ وہ دونوں میاں بیوی بچوں سے بہت پیار کرتے ہیں۔ لیکن خدا نے ان کو اولاد کی نعمت سے محروم رکھا ہے شریمتی شرمن نے ان خاتون کو بتایا کہ اس وقت تک ان کی نظر میں کوئی بچہ نہیں ہے لیکن وہ خیال رکھیں گی۔ جیسے ہی کوئی صورت نکلی وہ اطلاع دیں گی۔

دو سال بعد ۱۹۶۳ء میں ایک لڑکا جس کا نام بل تھا۔ شریمتی شرمن کے پاس لایا گیا۔ اس لڑکے کے چہرے سے اس کی حالت زار صاف صاف ظاہر تھی۔ لڑکا غم والم کی تصویر تھا۔ اس کے سر پر کتنے جرائم کا بوجھ تھا جن میں دو قتل بھی شامل تھے لڑکے کی ماں بچپن میں مر گئی تھی۔ اس کا باپ انتہائی اوباش اور جواری تھا۔

یہ لڑکا ابھی پانچ سال کا تھا کہ کھیل کود میں اس نے اپنے سے ایک چھوٹی لڑکی کے کپڑوں میں دیاسلائی سے آگ لگا دی۔ وہ لڑکی جھلس کر مر گئی۔

ابھی یہ لڑکا مدرسے جانے ہی لگا تھا کہ ایک دن اس نے ایک دوست کے گھر میز پر ایک بھرا ہوا پستول دیکھا اور اسے اٹھا لیا۔ اس کے دوست نے جو وہاں کے ایک مشہور اخبار نویس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ پستول بل کے ہاتھ سے چھیننا چاہا۔ بل نے پستول چلا دیا۔ اور اس کا دوست وہیں ڈھیر ہو گیا۔

اس اخبار نویس نے بل کی تصویر اور اس کے اگلے پچھلے حالات بڑے مبالغہ کے ساتھ اپنے اخبار میں چھاپے نتیجہ یہ ہوا کہ لڑکا بدنام ہو گیا۔ ابھی زمانے میں اس کا باپ بھی کسی جرم میں دو سال کے لیے جیل میں بھیج دیا گیا۔ تب یہ لڑکا شریمتی شرمن کے پاس لایا گیا۔ اسے ایک ڈاکٹر کے پاس معائنہ کے لیے بھیجا گیا۔ ڈاکٹر نے اسے بالکل صحت مند اور عقل مند قرار دیا اور اپنی رپورٹ میں لکھا کہ اس لڑکے کو کسی ایک گھرانے میں بھجوایا جائے۔ جہاں اسے پیار محبت اور ہمدردی مل سکے۔ مگر لڑکے کو حالات کی اشاعت کے باعث اسے کوئی بھی لینے پر راضی نہ تھا۔

اچانک شریمتی شرمن کو شریمتی وبلاک کا خیال آیا۔ لڑکے کو ساتھ لے کر وہ کار میں سیدھی ان کے کھیت میں پہنچیں۔ کھیت کے بیچ میں ایک خوب صورت مکان تھا جس کے چاروں طرف باغیچہ تھا۔ شریمتی شرمن کو اس ماحول نے بہت متاثر کیا اور ان کے دل سے دعا نکلی کہ بل کو یہ گھر نصیب ہو۔

شریمتی وبلاک اور ان کے شوہر کھیت میں کام پر جٹے ہوئے تھے۔ وہ شریمتی شرمن کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور انھیں گھر میں لے گئے۔ ان کی خوب خاطر تواضع کی۔ لڑکا تو جیسے مدتوں کا بھوکا تھا۔ اس نے دل کھول کر کھایا۔ ادھر دونوں میاں بیوی بچے کو بغور دیکھتے رہے۔ شریمتی شرمن کے کہنے پر میاں بل کو کھیتوں میں اپنے مویشی دکھانے لے گئے۔ شریمتی وبلاک نے بتایا کہ وہ لڑکے کو اخبار میں چھپی تصویر سے پہچان گئی ہے اور کہا کہ یہ لڑکا تو بہت خطرناک لڑکا ہے۔

شریمتی شرمن کو یہ سن کر دھکا سا لگا۔ سمجھ گئیں یہ لوگ بھی اس بچے کو نہیں اپنائیں گے۔ انھوں نے جھٹ بات بدل دی۔ کہنے لگیں دراصل وہ اس لڑکے کو ایک اور گھرانے کے لیے لائی ہیں۔ مگر وہ لوگ کچھ مہینوں کے لیے باہر جا رہے ہیں۔ اس لیے صرف ان چند مہینوں کے لیے اس لڑکے کو کہیں ٹھکانے لگانا ہے۔ مگر میں آپ کے پاس اس خیال سے اسے نہیں لائی۔ میں تو ادھر سے گذر رہی تھی آپ کا خیال آیا تو ملنے کی خواہش بدل دی۔

ادھر شریمتی وبلاک کے میاں لڑکے کو گھما پھرا کر واپس آ گئے۔ دونوں میاں بیوی نے کچھ دیر تک لڑکے سے باتیں کیں اور چند مہینوں کے لیے اسے اپنے ہاں

شوہر نے بے آمادگی ظاہر کی۔ شریمتی شرمن لڑکے کو وہیں چھوڑ کر
خوش خوش واپس آئیں اور یہ لڑکا ہمیشہ کے لیے وہیں کا ہو رہا۔
اب جب شریمتی ویلاک کے پڑوس کے لوگوں کو
بل کی آمد کا پتہ چلا تو انھوں نے اپنے بچوں کو ان کے کھیتوں میں
جانے سے روک دیا اور خود بھی ان کے ہاں آنے جانے سے کترانے
لگے۔ مگر یہ میاں بیوی بل کو لے کر خود ان کے ہاں جانے لگے اور
تھوڑے ہی دنوں میں بل پڑوس کے سب بچوں کا دوست بن گیا
شریمتی شرمن بھی گاہے گاہے وہاں آ کر حالات معلوم کرتی رہیں۔
انھیں اس بات سے بڑی خوشی ہوئی کہ بل اور دونوں میاں بیوی
ایک دوسرے سے بے حد مانوس ہو گئے ہیں۔ اور یہ لوگ بل کو
باقاعدہ متبنیٰ بنانا چاہتے ہیں۔

ادھر بل کا باپ دو سال جیل کاٹ کر باہر آیا تو اس
کے خیالات نے پلٹا کھایا۔ اس نے تھوڑے سے سرمایہ کا بندوبست
کر کے چائے پانی کی ایک چھوٹی سی دوکان کر لی۔ دوکان اچھی
چل نکلی اور دو تین سال ہی میں وہ ایک باقاعدہ ہوٹل بن گئی۔

اگلے کچھ سالوں میں اس کے تین ہوٹل کامیابی سے
چل رہے تھے۔ اس نے ایک اچھا سا مکان بھی خرید لیا۔ اور
اب اسے اپنے لڑکے کو حاصل کرنے کی خواہش ہوئی۔

شریمتی شرمن کے ذریعے اسے بچے کا پتہ چلا اور وہ خود
اسے بل کے پاس لے گئیں۔ وہ ہر دوسرے تیسرے مہینے بل سے
ملنے جاتا۔ سال بھر یہی صورت رہی۔ اس بیچ میں شریمتی ویلاک
کے شوہر کا انتقال ہو گیا۔

لڑکا اب پورا جوان تھا اور اس نے کھیتوں، مویشیوں
اور گھر کا سارا بوجھ اپنے اوپر لے لیا تھا۔ وہ سب کام بخوبی انجام
دے رہا تھا۔ بل کا باپ اسے ساتھ لے جانا چاہتا تھا تاکہ اپنا
سارا کاروبار اس کے سپرد کر دے۔ شریمتی ویلاک کا دل
نہ مانتا تھا۔ مگر ان کے دل میں بل کے باپ کی
خواہش کا بھی احترام تھا۔ وہ ان کی خواہش کو رد نہیں کرنا چاہتی
تھیں۔ پہلے تو لڑکے کو سمجھاتی رہیں۔ مگر لڑکے نے ایک نہ مانی
آخر انھیں ایک تجویز سوجھی۔

ایک دن انھیں نے بل کو اپنے پاس بٹھا کر کہا کہ
اس کے شوہر کے مرنے کے بعد پتہ چلا کہ وہ بھاری قرض چھوڑ
گیا ہے۔ ساری جائداد بیچ دی جائے تب بھی قرض کی پوری
ادائیگی نہ ہو سکے گی۔ ایسی حالت میں اگر وہ اپنے باپ کے پاس
چلا جائے تو ایک تو وہ باپ کے کاروبار سنبھال کر خوش حال زندگی
بسر کرے گا۔ دوسرے وہ یہاں کے قرض داروں کے تقاضوں
سے بچ جائے گا۔ اس وقت بل کا باپ بھی پاس ہی بیٹھا تھا۔

اب بل کے دل میں دونوں طرف کی محبت کا تصادم
ہوا۔ ایک طرف اپنے باپ کی قدرتی محبت اور دوسری طرف
اس خاتون کی محبت جس نے اسے اپنے بچے کی طرح سینے سے
لگایا، پالا پوسا اور بدنامی سے نکال کر باعزت شہری بنایا
بل بہت دیر تک سوچنے کے بعد کس فیصلے پر پہنچا؟ آپ بھی سنیے۔

اس نے جواب دیا کہ اگر ویلاک صاحب قرض چھوڑ
گئے ہیں تو صرف میری وجہ سے۔ ان کے اندر کوئی بری عادت
نہیں تھی۔ وہ فضول خرچ نہ تھے۔ انھوں نے جو خرچ کیا اور اس
کے لیے قرض کا بوجھ اٹھایا وہ سب مجھے انسان بنانے کے لیے۔
اس لیے میں اب ان کھیتوں میں پہلے سے زیادہ محنت کروں
گا۔ اور زیادہ سے زیادہ پیداوار، پولٹری فارم اور مویشیوں
سے اتنا پیدا کروں گا کہ تھوڑے ہی عرصے میں سب قرض ادا ہو جائے

اس نے شریمتی ویلاک سے رو رو کر درخواست کی
کہ آپ مجھے یہاں سے نہ بھیجیے اب دنیا میں مجھے ماں کے پیار
سے محروم نہ کیجیے۔ میں باپ کی محبت اور کاروبار پر آپ کے پیار
کو ہزار بار ترجیح دیتا ہوں۔

جواب سن کر ایک طرف شریمتی ویلاک اور دوسری

بل کے باپ کے آنسو نکل آئے۔ شریمتی ویلاک اندر گئیں اور اپنے شوہر کی وصیت نکال لائیں۔ جس میں تمام جائداد بل کے نام کردی گئی تھی۔ انھوں نے بتایا کہ ان پر کوئی قرض نہیں ہے بلکہ بل نے جتنی مدت یہاں رہ کر کام کیا ہے۔ اس کی یہاں کے حساب سے جو ماہانہ اجرت بنتی تھی وہ بھی ویلاک صاحب باقاعدہ ایک الگ حساب میں بنک میں جمع کرتے رہے اب یہ رقم بیس سال میں ہزار ڈالر یا لگ بھگ ڈیڑھ لاکھ روپے، بن گئی ہے۔ یہ بھی بل کی ہے۔ ادھر بل کے باپ نے بھی ساری جائداد اس کے نام کردی۔

بل اب خاصا مالدار، ایک بڑا زمین دار کئی ہوٹلوں کا مالک ہے اب اس کا پورا نام بل برنڈن ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں وہ امریکی ہوائی فوج میں بھرتی ہوگیا وہ بمبار ہوائی جہاز چلاتا تھا۔ دو بار اس کا جہاز گولی مار کر گرایا گیا مگر وہ بچ گیا۔ چار بار اس کا نام جنگ کے ریکارڈ میں کارہائے نمایاں کے لیے درج کیا گیا۔ ۱۹۴۵ء میں ہوائی فوج سے رخصت ہوکر پھر اپنے کھیت پر آگیا اور جدید ترین آلات سے کھیتی باڑی کرنے لگا۔ اب اس کا شمار امریکہ کے بہت بڑے زراعت کاروں میں ہوتا ہے۔

امتحان

محترمہ تمنا شمیم حنفی

بچپن کے وہ دن آج بھی آنکھوں میں ناچتے رہتے ہیں جب پہلے پہل میں نے الف ۔ ب لکھنا سیکھا تھا ۔ پڑھائی میں تو ان دنوں بھی جی لگتا تھا لیکن امتحان کے خیال سے بھی کپکپی آجاتی تھی ۔ کہیں سال بھر کی پڑھائی بیکار نہ ہوجائے ؟ کلاس میں پوزیشن نہ ملی تو سب مذاق اڑائیں گے ! بس یہی خوف لگا رہتا تھا ۔

اب مارچ سے بچوں کے امتحان شروع ہو رہے ہیں تو جی چاہتا ہے کہ میں بھی انھی کی طرح دیر تک کتاب کاپی کھولے بیٹھی رہوں ۔ صبح جلدی جلدی تیار ہو کر اسکول پہنچوں ، کانپتے ہاتھوں سے امتحان کا پرچہ لوں اور اسے حل کروں ، اب امتحان کا خوف بھی مزیدار لگتا ہے ۔

بہت سے بچے امتحان سے ڈرتے ہیں ۔ امتحان کے دن قریب آتے ہی کھیل کود ، کھانا پینا ، شرارتیں سب کچھ بھول جاتے ہیں ۔ لیکن امتحان ختم ہونے کے بعد جب گرمیوں کی لمبی چھٹیاں آتی ہیں اور ایک صبح اسکول کے نوٹس بورڈ پر اپنا نتیجہ نظر آتا ہے تو کیسی خوشی ہوتی ہے ۔ سکون کا کتنا فرحت بخش احساس ہوتا ہے ۔ اس وقت خوشی ہوتی ہے اپنی محنت کا انعام پانے کی ۔ اونچے درجے میں پہنچنے کی ، نئی نئی ، رنگین اور صاف ستھری کتابیں

پڑھنے کی۔ اسکول، پھر کالج، پھر یونیورسٹی، پھر پڑھے لکھے لوگوں میں عزت اور احترام۔ اس مقام کا پہنچنے کے لیے امتحان کی کئی سیڑھیوں کو پار کرنا ہوتا ہے۔

آج سے تقریباً پانچ ہزار برس پہلے جب مصر میں پڑھائی لکھائی شروع ہوئی۔ اس وقت امتحان نہیں ہوتے تھے۔ مکتب میں بس اونچے گھرانوں کے بچے داخل کیے جاتے تھے۔ انھیں ورزش سکھائی جاتی تھی۔ اخلاق کی اچھی اچھی باتیں بتائی جاتی تھیں اور کچھ سبق پڑھائے جاتے تھے پھر چھٹی مل جاتی تھی۔ اسی طرح ہمارے ملک میں ہزاروں برس پہلے امتحان نہیں ہوتے تھے۔ ویدوں کے زمانے میں زبان، ادب، فلسفہ، فن اور ریاضی کی تعلیم دی جاتی تھی اور بس۔ نہ امتحان اور نہ فیل پاس کا چکر۔ چین میں تو انیسویں صدی تک بچوں کو کنفیوشیس کے اقوال یاد کرائے جاتے تھے۔ یونان میں اسپارٹا کے لوگ صرف فوجی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ہاں اتھینس کے لوگوں کو زبان، ادب، فن اور فلسفے میں بھی دلچسپی تھی۔

بچوں کے لیے سب سے اچھے اسکول پہلے پہل روم والوں نے بنوائے۔ ان اسکولوں کو لیوڈس کہا جاتا تھا۔ اور یہاں چھ، سات برس کے بچے داخل کیے جاتے تھے۔

اس طرح پڑھائی کا سلسلہ تو بہت پہلے شروع ہو گیا تھا۔ لیکن آج کی طرح نہ تو باقاعدہ درجے تھے اور نہ امتحان۔ پھر غریب اور معمولی گھرانوں کے بچے پڑھ ہی نہیں سکتے تھے۔

تین ہزار سال پہلے چین میں امتحان کا رواج شروع ہوا۔ سرکاری ملازمت کے لیے نوجوانوں کی لیاقت کا امتحان لیا جاتا تھا۔ اس لیاقت کا مطلب تھا موٹی موٹی کتابوں سے کئی کئی ورق رٹ لینا اور انھیں فر فر سنا دینا۔ مشرقی ممالک میں بہت دنوں تک اسی طرح امتحان ہوتے رہے۔

یورپ میں بارھویں اور تیرھویں صدی سے امتحان شروع ہوئے۔ یہاں کے امتحانات چین اور مشرقی ممالک کے امتحانات سے ذرا مشکل ہوتے تھے۔ طالب علم کو کاپی کی سند (سرٹیفکیٹ) پانے کے لیے استادوں سے بحث مباحثہ کرنا پڑتا تھا۔

امتحان کا یہ سارا کاروبار زبانی تھا۔ لکھ کر امتحان دینے کا طریقہ بہت دنوں بعد اختیار کیا گیا۔ انیسویں صدی میں انگریزوں نے زبانی یا بحث مباحثے کے ذریعہ امتحان لینے کے بجائے، لکھے ہوئے جوابوں کی شکل میں امتحان لینا شروع کیا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے آج ہم امتحان دیتے ہیں: پرچے میں سوال دیکھے اور کاپی پر جواب لکھ دیا۔

لیکن انگلینڈ میں ایک عجیب بات تھی۔ آج سوچ کر بھی ہنسی آتی ہے۔ ہوتا یہ تھا کہ استادوں کو تنخواہ لڑکوں کا نتیجہ دیکھنے کے بعد دی جاتی تھی۔ یہ دیکھا جاتا تھا کہ کتنے لڑکے امتحان میں شریک ہوئے اور ان میں سے کتنے کامیاب ہوئے جتنے طالب علم ناکامیاب ہوتے۔ ان کے حساب سے استاد کی تنخواہ کم کر دی جاتی۔ اب آپ ہی سوچیے! اگر آج وہی اصول اپنایا جائے تو ناکامیاب ہونے والے بچوں کی وجہ سے ان کے استادوں کا کتنا نقصان ہوگا!

یہ تمام باتیں معلوم ہونے کے بعد آپ سوچتے ہوں گے کہ آج کے امتحان کتنے مشکل ہوتے ہیں اور پہلے کتنے آسان ہوتے تھے۔ آج سارا علم بدل چکا ہے، تصورات بدل چکے ہیں، فضا اور ماحول بدل چکا ہے، اصول اور قدریں بدل چکی ہیں۔ اب انھیں کے مطابق ہمیں تعلیم دی جاتی ہے اور امتحان لیا جاتا ہے۔

اگر امتحان نہ ہوں تو ہمیں کیسے پتہ چلے گا کہ علم، عقل اور سوجھ بوجھ کی کتنی منزلیں ہم نے طے کر لی ہیں؟

اقبالؔ کی یادیں

ہندوستان کا شاید ہی کوئی ایسا پیامی ہو جس نے "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا۔ ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا" "ترانۂ ہندی" نہ سنا ہو یا اپنے اسکول و مکتب میں اسے جھوم جھوم کر نہ پڑھا ہو آیئے آج ہم پیامی بھائیوں کو اس کے بارے میں کچھ بتائیں جس نے ہم ہندوستانی بچوں کے لیے یہ اتنا اچھا قومی ترانہ لکھا ہے اتنا اچھا کہ اسے پڑھتے وقت ہمارا دل وطن کی محبت میں ڈوب جاتا ہے اور ہمارا سینہ فخر سے سوپ کی طرح پھول جاتا ہے۔

ہمارے پیارے ملک کے مغرب میں اور دہلی سے تھوڑی دور ملک اس سے متصل ایک صوبہ پنجاب ہے وہی پنجاب جہاں چناب، جہلم، ستلج راوی اور بیاس ندیاں بہتی ہیں انھیں پانچوں ندیوں کی وجہ سے تو اس صوبہ کا نام پنجاب پڑا ہے۔

اب سے بیس اکیس سال پہلے جب پنجاب دو حصوں میں تقسیم نہیں ہوا تھا اور پنجاب صرف ایک تھا جیسے دہلی صرف ایک ہی ہے۔ اسی غیر منقسم پنجاب کے ایک شہر سیالکوٹ میں (جو مغربی پاکستان میں ہے۔) ایک شریف مسلم

گھرانے میں آج سے کوئی پچانوے برس پہلے ۱۸۷۳ء میں ایک بچہ پیدا ہوا والدین نے پیار سے اس کا نام محمد اقبال رکھا۔ اللہ میاں کو بھی یہ نام بہت بھایا اور اس کو ایسا اقبال مند بنایا کہ وہ لڑکا بچپن ہی سے پڑھنے لکھنے میں تیز اور استادوں اور بزرگوں کی نظر میں جچنے لگا۔ ایم اے تک کونسا ایسا امتحان تھا کہ جس میں وہ اول نہ آیا ہو اور سونے چاندی کا تمغہ اور دوسرے بہت سے چھوٹے بڑے انعامات نہ پائے ہوں۔ یہ اس کا شوق تعلیم اور سعادت مندی ہی تو تھی جس نے اس کو بڑے بڑے درجے اور مرتبے دلائے جس کے لیے لوگ ترستے ہیں مثل مشہور ہے "بچے کے پاؤں پالنے میں نظر آتے ہیں" سو یہ مثل اس پر پوری طرح صادق آتی ہے بچپن ہی سے اس کی غیر معمولی ذہانت، سعادت مندی اور محنت دیکھ کر اس کے استادوں نے بھی اس کو خوب دل لگا کر پڑھایا لکھایا اور ہر طرح کی اچھی اچھی باتیں بتائیں اور محمد اقبال نے بھی ان باتوں کو غور سے سنا اور دل میں گرہ دے لی۔

بیچ باتوں باتوں میں یہ بتانا تو بھول ہی گیا پڑھنے ہی کے زمانہ میں محمد اقبال کو شعر و شاعری سے دلچسپی ہو گئی اور اس وقت اس نے وہ اچھے اچھے اشعار کہے کہ ہر طرف اس کی شاعری کی دھوم مچ گئی اور پھر تو لوگ اس کی قابلیت کا لوہا ماننے لگے اور جو شاعروں کا ایک طریقہ ہے کہ اصل نام کے علاوہ ایک چھوٹا سا ادبی نام رکھ لیتے ہیں جس کو تخلّص کہتے ہیں تو بھی محمد اقبال نے بھی اپنے اچھے سے نام کو تخلص بنا لیا اور لگتا بھی یہ تخلص کتنا پیارا تخلص کا تخلص اور نام کا نام تو اقبال نے بہت سی اچھی اچھی اور پیاری پیاری نظمیں لکھی ہیں انھیں میں سے ایک یہ بھی ہے۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

اس ترانہ اور دوسری سینکڑوں وطن اور قوم کی محبت بھری نظمیں لکھنے کی وجہ سے وہ بیس بائیس ہی برس کی عمر میں سارے ہندوستان میں ایسے مشہور ہو گئے کہ بچہ بچہ کی زبان پر ان کا نام آنے لگا۔

ڈاکٹر پڑھ لکھ کر خاموش نہیں بیٹھے تھے لاہور کے ایک کالج میں پڑھانے لگے وہاں بھی ان کے شوق تعلیم نے انھیں چین نہ لینے دیا تو اور بھی اونچی تعلیم حاصل کرنے کے لیے ہندوستان سے دور بہت دور سمندر پار کے ملک انگلستان گئے وہاں سے فلسفہ اور قانون کی تعلیم پا کر ڈاکٹر محمد اقبال کہلائے ان کی شاعری اور قابلیت سے متاثر ہو کر انگریزی سرکار نے انھیں "سر" کا خطاب دیا اور لوگوں نے "علامہ" کا تب تو وہ ایک ساتھ ہی "علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال" ہو گئے۔ آج وہ ایشیا کے سب سے بڑے شاعر اور ایک عظیم مفکّر اور فلسفی کے نام سے ساری دنیا میں مشہور رہیں۔ وہ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء میں ہم لوگوں کو چھوڑ کر اللہ میاں کے پاس چلے گئے۔ لیکن ان کے اشعار ہمیں ان کی یاد دلاتے رہیں گے۔

نیچے کے سرخ نشان کا مطلب یہ ہے کہ اس مہینے کے بعد آپ کی مدّت خریداری ختم ہو جاتی ہے۔

○

ہمیں امید ہے کہ آپ اپنے پیارے پیام تعلیم کی سرپرستی جاری رکھیں گے۔

براہ کرم مبلغ چھ روپے کا منی آرڈر اس مہینے کی ۲۵ تاریخ تک بھیج دیجیے تاکہ یہ سلسلہ قائم رہے۔ آپ کی طرف سے کوئی اطلاع نہ ملی تو ہم سمجھیں گے کہ آپ کو پرچہ پسند نہیں آیا اور افسوس کے ساتھ اسے بند کر دیں گے۔

منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر لکھنا نہ بھولیے۔ آپ کا خریداری نمبر ـــــــ ہے۔

منیجر:-

جناب سعادت صدیقی۔

کششِ ثقل

آیئے ذرا اس پارک میں چل کر دیکھیں وہ بہت سے ننھے منے بچے کیا کھیل رہے ہیں؟ ارے! یہ لوگ سیڑھی سے چڑھ کر اوپر جاتے ہیں اور پھر ٹین کی چکنی سطح (ڈھلان) پر پھسل پھسل کر نیچے آتے ہیں۔ آپ نے بھی یہ کھیل بہت دفعہ کھیلا ہوگا۔ کھیلا ہے نہ۔ تو آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ اوپر سے نیچے کی طرف پھسلنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی، وقت بھی کم لگتا ہے اور محنت بھی نہیں کرنا پڑتی لیکن جب آپ نیچے سے اوپر کی طرف چڑھنے کی کوشش کرتے ہیں تو محنت بھی زیادہ کرنا پڑتی ہے، وقت بھی زیادہ لگتا ہے اور دقت بھی محسوس ہوتی ہے۔ کیوں ہے نہ ایسی ہی بات؟ کبھی آپ نے یہ بھی سوچا ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟

بات یہ ہے کہ ہماری زمین ہر اس چیز کو جو اس کے اوپر یا قریب ہوتی ہے ہر وقت کھینچتی رہتی ہے۔ زمین کے اس عمل یا کشش کو ہم ثقل (GRAVITY) کہتے ہیں۔ جب آپ اوپر سے نیچے کی طرف پھسلتے ہیں تو ثقل کی طاقت تمھیں اپنی طرف کھینچتی ہے اور آپ کو نیچے آنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی۔ اس کے برخلاف اگر آپ نیچے سے اوپر کی چڑھنے کی کوشش کرتے ہیں تو بڑی مشکل پیش آتی ہے کیوں کہ ثقل کی طاقت آپ کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور آپ اس کی الٹی طرف جاتے ہیں۔

گیند کھیلتے کھیلتے آپ میں سے کوئی بچہ اسے آسمان کی طرف اچھال دیتا ہے تو گیند تھوڑی دور اوپر جانے کے بعد واپس آجاتی ہے۔ ٹھیک ہے نا؟ پر بھلا ایسا کیوں ہوتا ہے؟ گیند میں کوئی رسی یا ڈوری تو بندھی نہیں ہوتی جس سے گیند کھینچ لی جاتی ہو — یہاں بھی زمین اسے اپنی طرف کھینچ لیتی ہے اور گیند نیچے واپس آجاتی ہے۔ کیا آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ "نیچے" سے کیا مطلب ہے؟ بات یہ ہے کہ کششِ ثقل چیزوں کو مرکز کی طرف کھینچتی ہے۔ تو بس "نیچے" کا مطلب ہوا زمین کے مرکز کی طرف اور اوپر کے معنی ہوئے زمین کے مرکز سے دور۔ زمین کا مرکز (Centre of Gravity) اس کے پیٹ میں اس کی سطح سے بہت دور تقریباً ۴ ہزار میل دور ہے۔ سائنس والوں کے کہنے کے مطابق زمین کی شکل نارنگی کی طرح ہے۔ اگر آپ نارنگی کاٹ کر دیکھیں تو آپ کو اس کا مرکز آسانی سے مل جائے گا۔ زمین کا مرکز بھی نارنگی کے مرکز کی طرح بیچوں بیچ واقع ہے۔ اور یہی وہ مرکز ہے جس کی طرف ہر چیز کھینچتی ہے۔ لیکن ایک بات اور ہے یہ کہ ہر چیز اور زمین کے مرکز کے درمیان زمین کی سطح حائل رہتی ہے۔ اور یہ سطح وہی ہے جس پر ہم سب رہتے ہیں۔ اسی لئے ہر چیز زمین کی سطح پر آکر ٹک جاتی ہے۔ اگر زمین کی سطح سے اس کے مرکز تک ایک بڑا سوراخ کر

(بقیہ صفحہ پر)

محترمہ تقدیس بالا

دھرتی کے تارے

ماں کی آنکھ کے تارے ہیں
باپ کو دل سے پیارے ہیں
جگ کے راج دلارے ہیں

ہر گھر کے اجیارے ہیں
ہم دھرتی کے تارے ہیں

جگ مگ جگ مگ بستی بن
شہر، محلہ، گھر، آنگن
میٹھے گیتوں کا گلشن

شوخی کے نظارے ہیں
ہم دھرتی کے تارے ہیں

کلیوں کی اک ڈالی ہیں
کھیتوں کی ہریالی ہیں
پھلواری کے مالی ہیں

آشاؤں کے دھارے ہیں
ہم دھرتی کے تارے ہیں

پھول بھی ہم انگارہ بھی
ناؤ بھی ہم طیارہ بھی
ذرہ بھی سیارہ بھی

گنگ و جمن کے دھارے ہیں
ہم دھرتی کے تارے ہیں

راہی ہم ہیں رستہ ہم
علم و ہنر کا بستہ ہم
پھولوں کا گل دستہ ہم

خوش بو کے گہوارے ہیں
ہم دھرتی کے تارے ہیں

پھولوں کی اک ڈولی ہیں
بلبل کے ہم جولی ہیں
ظلم کے حق میں گولی ہیں

پھول نما انگارے ہیں
ہم دھرتی کے تارے ہیں

تحریر شمسہ اختر

بیمار شہزادی

(ایک عربی ڈرامے کا آزاد ترجمہ)

پہلا منظر

(سونے کے کمرے میں ایک عالی شان تخت پر بیمار شہزادی لیٹی ہے اس کے ایک طرف اس کے والد (بادشاہ) کرسی پر بیٹھے ہیں۔ کرسی کے پیچھے حکیم صاحب کھڑے ہیں)

حکیم صاحب ۔ بادشاہ سلامت! میں نے شہزادی کی بیماری کا پتہ لگا لیا ہے۔ دوا بھی تجویز کر دی ہے۔ اسے وہی دوا پلائیے جو پچھلے ہفتہ پلائی گئی تھی۔ اطمینان رکھیے اچھی ہو جائے گی انشاء اللہ ضرور اچھی ہو جائے گی۔

بادشاہ ۔ حکیم صاحب شہزادی کی بیماری کو ایک سال سے زیادہ ہونے کو آیا لیکن ابھی تک یہی پتہ نہ چل سکا کہ اسے کیا روگ لگ گیا ہے۔ آپ کو تو معلوم ہے یہ میری اکلوتی بیٹی ہے۔ میں نے اس کے لیے ہندوستان سے حکیم بلوایا ہے۔

(حکیم صاحب چلے جاتے ہیں اور تھوڑی دیر بعد ایک اور حکیم ہندوستانی لباس پہنے داخل ہوتے ہیں)

ہندوستانی حکیم ۔ جہاں پناہ! اس سلام علیکم

(السلام علیکم)

بادشاہ۔ وعلیکم السلام اے مکرم بزرگ۔ خدا کا شکر ہے کہ
آپ ہندوستان سے یہاں تک بخیریت آگئے لیکن
آپ نے آنے میں کافی دیر کر دی۔ میں نے آپ کو
ایک مہینے پہلے بلایا تھا۔

ہندوستانی حکیم۔ بجا فرمایا جہاں پناہ نے لیکن حضور کا خط
کچھ دیر سے ملا اور پھر دس دن تو جہاز کے سفر میں
لگ گئے۔ اچھا شہزادی صاحبہ کہاں ہیں۔

بادشاہ۔ (شہزادی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) یہ ہے میری
مریض بیٹی۔ حکیم صاحب خدا کے لیے اس کا علاج
کیجیے اس کو ٹھیک کر دیجیے۔

ہندوستانی حکیم۔ (اس کی نبض دیکھتا ہے آلہ سے اس کا
معائنہ کرتا ہے اور شہزادی سے منہ کھولنے کو کہتا
ہے اور پھر بادشاہ سے مخاطب ہوتا ہے) حضور
عالی میں نے شہزادی کا مرض سمجھ لیا۔ دوا بھی میری
سمجھ میں آگئی ہے۔

بادشاہ۔ (بے چینی سے) بتائیے بتائیے کیا ہے وہ دوا
کہاں ملے گی۔ جلدی بتائیے ہم اس کو فوراً منگاتے
ہیں۔

ہندوستانی حکیم۔ وہ دوا غزنوق کا جگر ہے اور یہ بڑی
کم یاب ہے۔

بادشاہ۔ دربان!

دربان۔ بادشاہ سلامت!

بادشاہ۔ دیکھو جی، ایک ڈھنڈورچی سے کہو کہ وہ اس بات
کا اعلان کر دے کہ جو شہزادی کو اس کی بیماری سے
نجات دلا دے گا۔ اس کی شادی شہزادی سے
کر دی جائے گی۔ اس کے مرض کی دوا غزنوق
کا جگر ہے۔ پس جو کوئی غزنوق کا جگر لے آئے
گا وہ شاہزادی سے شادی کا حق دار ہوگا۔

دربان۔ بہت اچھا عالی جاہ
(چلا جاتا ہے)

دوسرا منظر
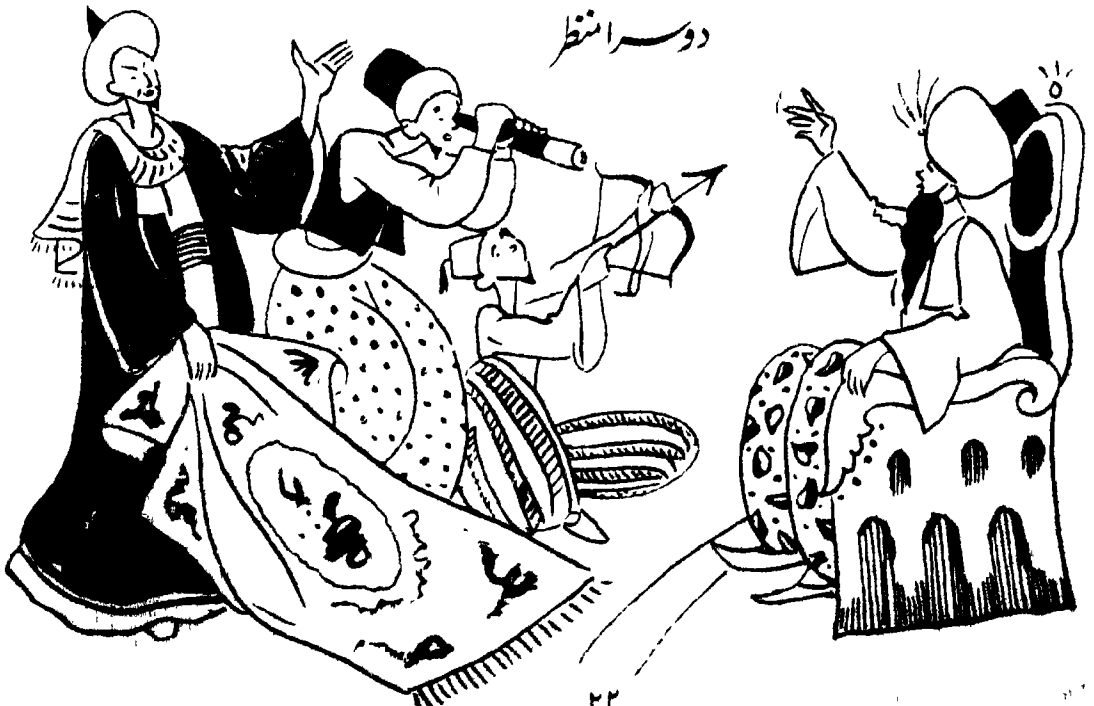
(محل کا دوسرا کمرہ بادشاہ بیٹھا ہے۔
حاجب اور دربان پیچھے کھڑے ہیں۔
پھر ایک آدمی کمرے میں داخل ہوتا ہے)

آدمی ۔ جہاں پناہ! یہی ہے وہ جادو کی دوربین جس سے میں نے دور بہت دور ایک جزیرے میں عزنوق کو دیکھا ہے۔ مجھے وہاں تک پہنچنے میں دس دن لگ جائیں گے۔

بادشاہ ۔ لیکن مجھے تو دوا ابھی چاہیے۔ میری بچی تو دو ہی دن میں مرجائے گی۔

دوسرا آدمی ۔ جہاں پناہ! میرے پاس ایک جادو کا فرش ہے اس کے ذریعہ میں اس جزیرے سے دو گھنٹے میں واپس آسکتا ہوں۔

(تیسرا آدمی داخل ہوتا ہے)

تیسرا آدمی ۔ جہاں پناہ اور میرے پاس یہ جادو کا تیرکمان ہے جس سے میں ہر قسم کے پرندے کا شکار آسانی سے کرسکتا ہوں۔ حکم ہو تو میں بھی عزنوق کے شکار کو جاؤں!

بادشاہ ۔ (سب سے) ہاں تم سب ابھی سفر کے لیے تیار ہوجاؤ۔

(تینوں چلے جاتے ہیں)

تیسرا منظر

(تینوں آدمی جو عزنوق کے شکار کو گئے تھے۔ بادشاہ کے دربار میں موجود ہیں۔ بادشاہ کے پاس شہزادی کھڑی ہے۔ اب وہ بالکل تندرست ہے اور بہت خوبصورت کپڑے پہنے ہوئے ہے)

بادشاہ ۔ (تینوں سے) ہمیں ہندوستانی حکیم کا انتظار کرنا چاہیے۔

دربان ۔ (بادشاہ سے) حضور ہندوستانی حکیم

تو دروازے میں کھڑے ہیں اور آپ کے حکم کے منتظر ہیں۔

بادشاہ ۔ بلاؤ انھیں۔

(ہندوستانی حکیم داخل ہوتا ہے سلام کرتا ہے بادشاہ بیٹھنے کا اشارہ کرتا ہے)

بادشاہ ۔ میں آپ سب کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آپ سب لوگوں کی بدولت میری لڑکی کو خدا کی طرف سے نئی زندگی ملی ہے۔ اب وہ خدا کے فضل سے بالکل تندرست ہے۔ اس کی صحت پہلے جیسی ہے۔ آپ مجھ سے اس خوشی میں کچھ مانگیں گے میں دوں گا۔

(شہزادی چلی جاتی ہے)

ہندوستانی حکیم ۔ جہاں پناہ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ جو شہزادی کا علاج کرے گا اور وہ اس کے علاج سے ٹھیک ہو جائے گی میں اس کی شادی شہزادی سے کر دوں گا۔ میں نے شہزادی کا علاج کیا ہے اور وہ میرے علاج سے ٹھیک ہوئی ہے۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔

بادشاہ ۔ (پہلے آدمی سے) تم کیا چاہتے ہو؟

پہلا آدمی ۔ جہاں پناہ! اگر میرے پاس جادو کی دوربین نہ ہوتی تو میں عزنوق کو کیسے دیکھ پاتا۔ لہٰذا شہزادی کی شفا کا سبب میں ہوں اور میں اس سے شادی کا حق دار ہوں

دوسرا آدمی ۔ جہاں پناہ! اگر میرے پاس یہ جادو کا فرش نہ ہوتا تو اتنی دور کا سفر ناممکن تھا اور شہزادی دوا آنے سے پہلے ہی اللہ کو پیاری ہو جاتی۔ اس کی شفا میری وجہ سے ہوئی۔ اس لیے میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔

تیسرا آدمی ۔ بادشاہ سلامت! اگر میرے پاس جادو کا تیر کمان نہ ہوتا تو عزنوق کا شکار محال تھا اور اس کے نہ ملنے سے شہزادی مرجاتی۔ اس کی شفا کا موجب میں ہوں۔ اس لیے میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔

بادشاہ ۔ (ان سب کی طرف دیکھتا ہے) آپ سب شہزادی سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ناممکن ہے ناممکن ــــــ نہیں معلوم آپ میں سے کس کی وجہ سے وہ ٹھیک ہوئی ہے۔

(تھوڑی دیر خاموشی رہتی ہے اور پھر بادشاہ کہتا ہے)

بادشاہ ۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں آپ میں سے کس کو اس کے لیے پسند کروں۔ اچھا ہم اسی سے حل کر دیتے ہیں وہ آپ میں سے جس کو بھی پسند کرے اس کو اختیار ہے۔

مجمع ۔ یہ صحیح ہے ہمارے آقا

(پردہ گرتا ہے)

مولانا مقبول احمد سیوہاروی

حضرت یونس کا شہر نینوا

نینوا کے مشہور کھنڈر جنھیں بڑے بڑے سیاح دیکھنے آتے ہیں یہی ہیں۔ نہ جانے کتنا بڑا شہر ہوگا جس میں شہر پناہ، مسجدوں، محلوں، سراؤں اور عمدہ عمدہ مکانوں کے نشان نظر آتے ہیں۔

ایک ٹیلے پر بڑی عمدہ عمارت ہے۔ جس میں سرائے اور چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں ہیں۔ بیچ سرائے میں ایک حجرہ (کوٹھری) ہے جس پر ریشمی پردہ پڑا رہتا ہے۔ اس کوٹھری کا دروازہ بہت خوبصورت اور مرصّع ہے۔ کہتے ہیں حضرت یونس علیہ السلام اسی جگہ رہتے تھے اور یہی مسجد ہے جس میں حضرت یونس علیہ السلام عبادت فرماتے تھے۔ موصل والے ہر جمعرات کو یہاں آتے ہیں اور عبادت کرتے ہیں۔

موصل کے لوگ بہت با اخلاق اور مہمان نواز ہیں۔ میرا قیام علاؤالدین علی کے مکان پر تھا۔ علاؤالدین کے باپ کا نام شمس الدین محمد ہے۔ جنید لقب ہے۔ جب تک میں ان کا مہمان رہا میرا پورا خرچ اٹھاتے رہے اور ہر بات کا خیال رکھا۔ سلطان ابوسعید علاؤالدین علی کی عزت کرتا ہے۔ موصل اور اس کے آس پاس کے علاقے علاؤالدین علی کے انتظام میں دے دیے ہیں۔

علاؤالدین کی سواری بڑی دھوم دھام سے نکلتی ہے۔ فوج کا اور غلاموں کا ایک ہجوم ہوتا ہے۔ موصل کے معززین صبح سے شام تک علاؤالدین کے پاس آتے جاتے رہتے ہیں اور یہ ہر ایک کی تواضع کرتا ہے۔

موصل سے چل کر ہم عین الرصد ہوتے ہوئے جزیرۂ ابن عمر پہنچے۔

جزیرہ ابن عمر

خوب صورت شہر ہے۔ وادیوں سے گھرا ہوا ہے۔ بازار اچھا ہے۔ پرانے پتھر کی جامع مسجد ہے، شہر پناہ بھی پتھر کی ہے۔ جودی پہاڑ جس کا ذکر قرآن پاک میں ہے۔ اور جہاں حضرت نوح کی کشتی ٹھہری تھی، اسی جگہ ہے، پہاڑ بہت اونچا ہے۔ ہم نے اس کی زیارت کی۔

نصیبین

یہاں سے دو منزل شہر نصیبین ہے۔ پرانا اور متوسط درجے کا شہر ہے۔ باغوں اور پھلوں کی کثرت ہے۔ یہاں کا عرق گلاب مشہور ہے۔ یہ شہر دریا سے اس طرح گھرا ہوا ہے جیسے کنگن کے بیچ میں کلائی۔ دریا قریب کے پہاڑ سے نکلتا ہے اور کئی حصّوں میں بٹ کر بہتا ہے۔

شہر میں دو مدرسے ہیں۔ نصیبین کے رہنے والے نیک، سچے، اور امانت دار ہیں۔

سنجار

نصیبین سے چل کر سنجار پہنچے، یہاں نہریں اور باغ کثرت سے ہیں۔ سنجار دیکھ کر دمشق یاد آجاتا ہے۔ جیسے

کی باغات نہریں پھل اور درختوں کے جھنڈ ہیں۔
سنجار پہاڑی پر آباد ہے مشہور ہے کہ جامع مسجد میں
دعا مانگی جائے تو قبول ہو جاتی ہے۔ سنجار کے بزرگوں میں عبداللہ الکرد
بڑے مرتبے کے بزرگ گذرے ہیں۔ کہتے ہیں کہ چالیس دن کا روزہ
رکھ کر جو کی آدھی روٹی سے افطار کرتے ہیں۔
یہ بزرگ پہاڑ کی چوٹی پر ایک گنبد کے قریب تشریف رکھتے
تھے۔ جب میری ملاقات ہوئی تو میرے لیے دعا فرمائی اور کچھ نقدی
دی جسے میں نے تبرکاً رکھ لیا اور تمام سفر میں خرچ نہ کیا ہندوستان
کے لیٹروں نے یہ نقدی مجھ سے چھین لی جس کا مجھے ہمیشہ رنج رہا۔
سنجار سے دارا پہنچے۔ دارا پرانا شہر ہے۔ ویران پڑا
ہے ایک قلعہ بھی ہے۔ شہر کے باہر ایک گاؤں میں ہم نے قیام کیا۔

ماردین

دارا سے ماردین چلے گئے۔ ماردین کا اونی کپڑا
مرعزی بہت مشہور ہے۔ ماردین کے قاضی برہان الدین الموصلی بڑے
بزرگ شخص ہیں۔ دیکھنے میں ایسے لگتے ہیں جیسے کوئی خدمت گار۔
موٹے جھوٹے کپڑے پہنتے ہیں اور بے حد عبادت کرتے ہیں۔
قافلوں کے کوچ کی خبریں آنے لگیں تو میں موصل ہوتا
ہوا دوبارہ بغداد پہنچ گیا۔ موصل سے بھی حاجیوں کا قافلہ جا رہا
تھا۔ اس میں ایک بڑی عمر رسیدہ خاتون سفر کر رہی تھیں۔ لوگ انہیں
زاہدہ کہتے تھے۔ خلفا کی اولاد میں تھیں۔ کتنی مرتبہ حج کر چکی ہیں۔ ہمیشہ
روزے رکھتی ہیں۔ قافلہ ابھی بغداد تک پہنچا بھی نہ تھا کہ بے چاری
زاہدہ نے رحلت کی۔ اللہ ان پر رحمت کرے۔
بغداد پہنچ کر دیکھا تو حاجی لوگ بڑی دھوم دھام سے
تیاریاں کر رہے تھے۔ میں بھی امیر معروف کے پاس گیا اور سلطان ابو سعید
کا فرمان یاد دلایا۔ امیر معروف نے آدھا اونٹ چار آدمیوں کا زاد
راہ اور پانی مقرر کر دیا۔ اور تحریر دے کر امیر الحج کا سامنا کرا دیا۔
اور تاکید کر دی کہ خاص طور پر میرا خیال رکھا جائے۔
امیر الحج محمد الحوجی ہیں۔ مجھے پہلے سے جانتے ہیں۔
اچھے آدمی ہیں۔ راستے بھر آرام پہنچایا اور جتنا امیر معروف نے کہا تھا
اس سے زیادہ خیال رکھا۔
قافلہ کوفے سے آگے بڑھا تو مجھے دست آنے لگے
لوگ بار بار محمل سے اتارتے اور چڑھاتے تھے۔ امیر الحج راستے بھر
تسلی دیتا رہا مزاج پرسی کرتا رہا۔ مکہ معظمہ پہنچ کر بھی میرا یہ حال تھا
کہ فرض نماز بیٹھ کر پڑھتا تھا۔ صفا و مروہ کی سعی گھوڑے پر سوار
ہو کر کرنا پڑی۔ منٰی پہنچ کر طبیعت سنبھل گئی۔
حج کرنے کے بعد بھی مکے ہی میں رہا۔ اس زمانے
میں امیر علاؤالدین بن شیبہ کے مضافات میں العطارین کے باہر
وضو خانہ بنوا رہا تھا۔
مکے میں مصر کے بڑے بڑے امیر ٹھہرے ہوئے ہیں۔
تاج الدین، قاضی نور الدین، زین الدین، ناصر الدین۔
میں نے مدرسہ مظفریہ میں قیام کیا مکے میں میرا قیام تین
سال تک رہا۔ ۱۳۳۸ء تک۔
مکے سے رخصت ہو کر یمن کے شہروں کا قصد کیا۔
پہلے حدہ ٹھہرا یہ مکے اور جدے کے درمیان ہے۔ پھر جدے
میں قیام کیا۔ کہتے ہیں یہ شہر فارس والوں نے آباد کیا ہے شہر
سے باہر پرانے تالاب ہیں۔ تالابوں کے قریب بے شمار پتھر
کے کنوئیں ہیں۔

ایک عجیب بات

ایک اندھا فقیر میرے دروازے
پر آیا۔ اس کے ساتھ ایک لڑکا تھا۔ اسی لڑکے کے سہارے
یہ اندھا چلتا تھا۔ السلام علیکم کیا، میرا نام لیا اور ہاتھ پکڑ لیا
مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ نہ یہ مجھے جانتا ہے نہ کبھی پہلے کی
ملاقات ہے۔ پھر اسے میرا نام کیسے معلوم ہو گیا۔
پھر اس نے میری انگلی پکڑ کر پوچھا۔ انگوٹھی کہاں

ہے؟ میں نے کہا۔ ایک فقیر کو دے دی۔

وہ بولا۔ جاؤ اور انگوٹھی ڈھونڈ کر لاؤ۔ اس پر جو نام لکھے ہیں۔ ان میں ایک راز ہے۔

جدے کی جامع مسجد کا نام جامع آبنوس ہے۔ لوگ کہتے ہیں بڑی بابرکت مسجد ہے۔ جو دعا اس مسجد میں مانگی جاتی ہے قبول ہو جاتی ہے۔ جدے کا امیر یعقوب ہے۔ قاضی کا نام عبداللہ ہے۔ دونوں شافعی ہیں۔ مکے کے رہنے والے ہیں۔

جمعے کا دن

جمعے کے دن موذن جدے کے رہنے والوں کو شمار کرتا ہے۔ چالیس یا چالیس سے زیادہ ہوتے ہیں تو جمعے کی نماز ہوتی ہے ورنہ ظہر پڑھائی جاتی ہے۔ باہر والے کتنے ہی ہوں شمار نہیں کیے جاتے۔

جدے سے دریائی (سمندری) سفر ہے۔ جس جہاز پر ہم سوار ہوے اس کا مالک رشید الدین یمنی ہے۔ حبش کا رہنے والا ہے۔ یہاں والے جہاز کو جلبہ کہتے ہیں۔

یہ میرا پہلا دریائی (سمندری) سفر ہے دو دن ہوا موافق چلی پھر بدل گئی۔ موجیں اٹھنے لگیں۔ جہاز ڈانوا ڈول ہو رہا ہے۔ جہاز کے اِدھر اُدھر جھکنے سے مسافروں کو بہت تکلیف ہوتی ہے۔

خدا خدا کر کے جہاز بندرگاہ "راس الدوائر" پر پہنچ گیا یہ ایذاب اور سواکن کے درمیان ہے۔ یہاں ایک بانس کا مکان ہے جس میں شتر مرغ کے انڈوں میں پانی بھر رکھا تھا مسافروں نے پانی پیا اور اسی سے کھانا پکایا۔

یہاں کے رہنے والے کالے کلوٹے زرد رنگ کا لباس پہنے ہمارے پاس آئے۔ سرخ رنگ کی ایک چوڑی پٹی باندھتے ہیں۔ تلواریں اور برچھے پاس رکھتے ہیں۔ بڑے بہادر ہیں۔ اونٹوں پر کاٹھی کس کر سوار ہوتے ہیں

ہم نے کرایہ کے اونٹ پر ان کے ساتھ سفر شروع کیا۔ جنگل میں ہرن بے ڈر کی کودتے پھرتے تھے۔ شاید یہ لوگ ہرن کا شکار نہیں کرتے چند دن بعد جزیرہ سواکن پہنچے سواکن میں کھیتی کا نام نہیں۔ نہ کہیں درخت نظر آتا ہے۔

لوگ کشتیوں میں بھر بھر کر پانی لاتے ہیں۔ تالابوں میں بارش کا پانی جمع ہو جاتا ہے شتر مرغ۔ ہرن۔ گورخر کا گوشت بکثرت ملتا ہے بکریاں بھی بہت ہیں۔ گھی بہت ملتا ہے۔

جزیرے والے مکے جا کر کاروبار کرتے ہیں۔ جوار کی پیداوار بہت ہے یہ بڑی جوار ہے۔ جسے ہندوستان والے مکا (یا مکئی) کہتے ہیں۔ مکا شاید اس لیے کہ اس کا کاروبار مکے میں ہوتا ہے۔ سواکن کے بادشاہ کا نام شریف زید یمنی ہے۔

ہم جزیرہ سواکن سے دریا کے راستے یمن روانہ ہوئے۔

اس دریا میں بڑے بڑے پتھر ہیں۔ اس لیے رات میں سفر نہیں ہوتا صبح سے شام تک سفر کرتے ہیں۔ اندھیرا ہوتے ہی لنگر ڈال دیتے ہیں۔ ان میں بھی جہاز کا کپتان جسے رُبان کہتے ہیں کشتی میں اوپر بیٹھتا ہے اور کشتی چلانے والوں کو پتھروں سے بچاتا ہے اور خبردار کرتا رہتا ہے۔

چھ دن بعد ہم حلی پہنچے۔ حلی کی آبادی بہت بڑی اور عمدہ ہے۔ یہ ابن یعقوب کے نام سے مشہور ہے یعنی ابن یعقوب کی حلی ابن یعقوب یمن کے بادشاہوں میں تھا۔

حلی میں عربوں کے دو خاندان بہت طاقت ور ہیں۔ بنو حرم اور بنو کنانہ۔ حلی کی جامع مسجد بھی بہت خوب صورت ہے اس میں درویشوں کی ایک جماعت رات دن عبادت میں مشغول رہتی ہے۔ ان میں ایک ہندی بھی ہیں۔ یہ بہت بزرگ اور زاہد و عابد ہیں۔ قبولۃ الہندی ان کا نام ہے سندھ کی ٹوپی پہنتے ہیں اور پیوند لگے کپڑے پہنتے ہیں۔ ان کے حجرے میں چٹائی تک نہیں ہے بس ایک لوٹا ہے وہ بھی مٹی کا۔

(باقی آئندہ)

کنڑ زبان کی ایک لوک کہانی

ترجمہ - جناب ضیا جعفر

جیسے کو تیسا

بہت دنوں پہلے کی بات ہے کسی گاؤں میں تین گھمنڈی پنڈت رہا کرتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو دنیا میں سب سے زیادہ عقل مند سمجھتے تھے۔ ان میں سے ایک اپنے کو "پڑھائی گرو" دوسرا "انصاف گرو" اور تیسرا "سنگیت گرو" کہتا تھا ـــــ سارے گاؤں میں ان کی دھاک تھی۔!!

ایک دن دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں شامت کے مارے ایک بھکاری نے "پڑھائی گرو" کے گھر میں صدا لگائی ـــــ "بھگوان کے نام پر کچھ دے دو بابا ـــ!" بھکاری کی آواز سن کر پڑھائی گرو باہر آیا اور فقیر سے بولا ـــــ "بے وقوف خوب من لگا کر پڑھائی کر، ساری بھوک خود بخود مٹ جائے گی"۔ یہ کہہ کر اندر چلا گیا۔

بھکاری نا امید ہو کر ان کے پڑوسی "انصاف گرو" کے گھر گیا۔ اور بڑی درد بھری آواز میں بولا ـــــ "بھگوان کے نام پر کچھ تھوڑا سا کھانا دے دو، بھگوان تمہیں سکھی رکھے گا!!" اس کی آواز سن کر انصاف گرو دوڑا چلا آیا اور بولا ـــــ "کیا واقعی تو بھوکا ہے۔ اس کا تیرے پاس کیا ثبوت ہے؟" بھکاری یہ ٹکا سا جواب پا کر بڑی انکساری سے بولا ـــــ "ان داتا! میرا پچکا ہوا پیٹ دیکھیے ـــــ بس یہی ایک سب سے بڑا ثبوت ہے!" یہ جواب سن کر انصاف گرو نے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا ـــــ "پیٹ تو سادھو کا بھی پچکا ہوا رہتا ہے، اسے بے وقوف، انصاف سے دیکھا جائے تو تیرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے بغیر امتحان لیے تیری بات کا کیسے یقین کر سکتے ہیں!!"

بھکاری نے وہاں سے بھی نا امید ہو کر تیسرے در پر آواز لگائی۔ تھوڑی دیر کے بعد اندر سے "سنگیت گرو" آموجود ہوئے اور بولے "سنگیت سے بھوک دور ہو جاتی ہے تو بھی سنگیت کا مزہ لے اور کھانے کی فکر چھوڑ دے ـــــ!!"

بھکاری کو ہر طرف مایوسی ہی مایوسی نظر آئی، بھوک کے مارے اس کا دم نکلا جا رہا تھا۔ وہ اپنی قسمت کو کوستا ہوا، لڑکھڑاتے قدموں سے ایک ٹھاکر کے دروازے پر پہنچا، آواز سنتے ہی ٹھاکر باہر آیا، فقیر نے اپنا سارا ماجرا ان سے کہہ سنایا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کو پیٹ بھر کر کھانا مل گیا اور وہ دعائیں دیتا ہوا لوٹ گیا ـــــ!

بھکاری کے جانے کے بعد ٹھاکر کے دل میں ایک بات آئی آج ان تین گھمنڈی پنڈتوں کو سبق سکھانا چاہیے

دوسرے ہی دن ٹھاکر نے ان تینوں پنڈتوں کو رات کے کھانے پر بلایا۔ دعوت نامہ پا کر یہ تینوں خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ ٹھیک وقت پر ٹھاکر کے گھر پہنچے۔ ٹھاکر ان تینوں پنڈتوں سے بڑے تپاک سے ملا۔ ان کو ایک اچھے سے صاف ستھرے کمرے میں بٹھایا اور کھانے پینے کا بندوبست کرنے کے لیے اندر چلا گیا۔

یہ تینوں پنڈت آج بڑی

(باقی صفحہ [illegible] پر)

جناب مختار بارہ بنکوی

شبنم

کچھ جھل مِل جھل مِل کرتے ہیں، کچھ قطرے کھوئے کھوئے ہیں
کیا سُندر سُندر موتی ہیں، جو صبح نے آکر بوئے ہیں
سبزے نے رکھا ہے چُن چُن کر کس ناز سے اپنے دامن میں
منظر یہ سہانا دیکھو تم بھی آکے کسی دن گلشن میں
چمکیلی کرنیں سورج کی آکر ان پر منڈلاتی ہیں
خاموش زبانوں میں اپنی کچھ گیت رسیلے گاتی ہیں
جب صبح کا سُندر نظارہ یوں جھُم جھُم جھُم جھُم ہوتا ہے
سبزے کی جبیں پر ہر قطرہ بس چُم چُم چُم چُم ہوتا ہے
جب کروٹ لے کر جوت سہانی جھِل مِل جھِل مِل ہوتی ہے
کیوں اوس کہے کوئی اس کو جو بوند ہے سچّا موتی ہے
کچھ بکھرے بکھرے موتی ہیں، کچھ پھیلے پھیلے دامن ہیں
یہ شبنم ہے، یہ سبزہ ہے، یہ مہکے مہکے گلشن ہیں
اب سورج پوری جوت کو لے کر اوپر چڑھتا آتا ہے
ہر ایک سجیلا قطرہ بھی اب اپنا حُسن دکھاتا ہے
لو کرنیں ان کو چُن چُن کر آغوش میں بھرتی جاتی ہیں
ہریالی کے سندر دامن کو اب خالی کرتی جاتی ہیں
اب خالی دامن سبزہ ہے اور پتے پیلے پیلے ہیں
بوندوں کے ٹپکنے سے لیکن کچھ ذرے گیلے گیلے ہیں

اقبال مند

جناب مسیح الدین صدیقی

ارے —— لیکن یہ کیا ؟ —— مجھے اب محسوس ہوا۔

اس نے مجھے اپنی پیٹھ پر بٹھاکر میرے دونوں ہاتھ پیر اپنے سینے کی طرف کرکے باندھ دیے تھے۔ اور بے تحاشہ بھاگا چلا جا رہا تھا۔ بالکل اس طرح، جیسے کوئی بڑا آدمی، اپنے ننھے سے بچے کو پیٹھ پر بٹھائے لیے جا رہا ہو !

میں نے کہا۔

"بھیا۔ مگر آپ نے میرے ہاتھ پیر باندھ کیوں دیے ہیں؟"

"ارے —— وہ تو یوں ہی باندھ دیے تھے کہ تم گر نہ جاؤ !"

"تم سو رہے تھے نا ؟" اسنے پوچھا۔

"ہاں۔ ہاں۔"

"بس اسی لیے باندھ دیے تھے۔ ورنہ تم نیند میں گر جاتے"

"ہاں ہاں ٹھیک ہے !" میں نے کہا۔ مگر آپ کی جنت ابھی کتنی دور ہے ؟"

"بس تھوڑی دور اور !"

مگر آپ میرے ہاتھ پیر تو کھول دیجیے۔ میں پیدل چلوں گا۔ آپ کیوں تکلیف اٹھاتے ہیں۔

"لڑکے ! ——" اس نے غراتے ہوئے کہا۔ تم بہت بکواسی ہو۔ اگر اب کی تم نے زبان کھولی تو تمھارا منھ بند کر دوں گا :

"اُف فوہ" میرے منھ سے نکلا، اور میں مایوسی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

دُور دُور تک اندھیرے کا راج تھا۔ کوئی آدم نہ آدم زاد تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہ انسانوں کی آبادی ہی نہیں، ایک ویران مقام ہو، جہاں آدمی کیا ؟ آدمی کی ہوا بھی نہیں پہنچ سکتی۔

مجھے اپنی نیند پر بڑا غصہ آ رہا تھا۔ بھلا ایسی بھی نیند کیا —— جو ہاتھ پیر باندھنے اور پیٹھ پر بٹھاکر اتنی دُور بھاگ لے جانے پر بھی ہوشیار نہ ہو۔ اب تو یہ شخص آبادی سے بہت دُور نکل چکا ہے۔ معلوم نہیں یہ کون سی جگہ ہے ؟ آبادی یہاں سے کتنی دُور ہے ؟ اور یہ ابھی کتنی دُور لے جانا چاہتا ہے ؟

میں نے کہا۔

"بھیا —— بھوک لگی ہے۔ آپ بھی تھک گئے ہوں گے۔ ذرا ٹھہریے۔ کچھ کھا پی لیں۔ میرے بیگ میں کھانے کا سامان موجود ہے۔

"ہاں ہاں۔ کیوں نہیں۔ یہ لے !" اور اس نے اپنی جیب سے ڈھیر ساری کپڑے کی دھجیاں نکال کر میرے منھ میں ٹھونس دیں۔"

میں منہ کرتا رہا۔ اور اپنا منھ اِدھر اُدھر گھماتا پھرا رہا۔ مگر سب بے کار ! اس نے پوری طاقت سے سارے کے سارے کپڑے میرے منھ میں ٹھونس دیے۔"

اُف اللہ —— اب کیا ہوگا ؟ —— اب تو میں

بات بھی نہیں کرسکتا۔
میں نے سوچا۔
امین صاحب نے سچ ہی کہا تھا۔ ان کے اقبال کو بھی کوئی اسی بے دردی کے ساتھ اٹھائے گیا ہے۔ اور میں ؟
ہاں! — اب مجھے بھی اغوا کرکے لے جایا جا رہا ہے۔
اب میں بھی ہمیشہ کے لیے کھو جاؤں گا۔ پھر کبھی واپس نہ آؤں گا۔
میں امین صاحب کے اقبال کو بھی کبھی نہ ڈھونڈھ سکوں گا! پھر —!
ابّا — امّی — بھائی — بہن — دوست احباب —
اور اپنا پیارا وطن !!
ان سب کو بھی پھر میں کبھی نہیں دیکھ سکوں گا۔ اور میں ڈیا۔
امین صاحب نے اپنے اقبال کے گم ہونے پر سینکڑوں روپیہ انعام دینے کا اعلان کیا۔ اخبارات، ریڈیو، اور فلموں تک کے ذریعے اپنے بچے کو ڈھونڈا۔ اور پولس کا تو ذکر ہی کیا۔ !
وہ تو گویا انھی کی تھی۔ مگر اقبال نہ ملنا تھا نہ ملا —
اور میں —— ؟
مجھے کون پوچھے گا۔ اخبارات، ریڈیو اور فلموں کی تو دور کی بات ہے۔ ایک پولس والا بھی میری تلاش نہ کرے گا۔
اُف اللہ۔ میرے منھ سے نکلا — منھ سے کہاں وہ تو بند کر دیا تھا۔ یوں کہیے دل سے نکلا۔ اور پھر میں بے اختیار رو دیا۔
اچانک ضمیر نے آواز دی۔
"اقبال — تمھیں کیا ہو گیا ہے۔ کیوں رو رہے ہو۔ اور باتیں کیوں سوچ رہے ہو۔ تمھارا ایمان اللہ پر ہے۔ وہ اللہ جو منٹوں میں قیامت برپا کرسکتا ہے۔ اور منٹوں میں ایسی بے شمار زمینوں کو وجود میں لا سکتا ہے۔
"ہمت، عزم و حوصلہ اور نیک نیتی سے کام کرو، تم کامیاب ہوگے !!"

اس آواز کے آتے ہی مجھے کچھ سکون ہوا۔ اور پھر ابا جان کی نصیحت یاد آگئی۔
"میں تمھیں اپنے وطن سے دور اس لیے بھیج رہا ہوں کہ تمھیں علم کے ساتھ ساتھ عمل کا بھی موقع ملے" اور یہ تو عمل کا بہترین موقع تھا۔
اور میں ایک انجانی خوشی سے ناچ اٹھا۔
مختلف کوچوں، جھاڑیوں، میدانوں اور ویرانوں سے گذر کر وہ ایک ایسی جگہ پہنچا۔ جہاں سے پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا۔
میں نے اپنی عمر میں کا ہے کو اتنے بڑے بڑے پہاڑ دیکھے ہوں گے۔
موٹے اور چوڑے اتنے کہ بستیوں کو گھیر لیں۔ اور لانبے اتنے کہ آسمانوں سے باتیں کرلیں۔ وہ شخص برابر دوڑے جا رہا تھا۔ بڑے بڑے ٹیلوں، پتھروں اور پہاڑوں کے ٹکڑوں پر سے پھلانگتا، اچکتا، کودتا۔ وہ بس بھاگے جا رہا تھا۔
پہاڑوں کا یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی رفتار بھی دھیمی پڑ گئی۔ یہاں تک کہ وہ ایک بڑی پہاڑی کے دامن میں جا کر رک گیا۔ مجھے پیٹھ سے اتارا۔ اور رسّیاں کھولیں اور منھ سے کپڑے نکالے۔ اور اس پہاڑی کے بڑے غار کے اندر لے چلا۔
سب سے پہلے وہ مجھے اپنے سردار کے پاس لے گیا۔ سردار نے مجھے دیکھ کر اسے بہت شاباشی دی۔ اور بولا۔
نسخو، پرانا۔
ٹھکانا، تیرہ۔
اس نے کہا بہت بہتر۔ اور مجھے پھر لے کر چلا۔
سردار نے اسے پکارا اور بولا۔
نذر داغ ؟

ہاں ہاں یہ دیکھیے اور اس نے میرا بیگ سردار
کے حوالے کر دیا۔ وہ میرا بیگ دیکھ کر اچھل پڑا اور خوش ہو کر
بولا۔ ہم مختانہ دے گا۔
یہ سن کر اس کی باچھیں کھل گئیں۔

اب بھی مانے گا یا نہیں ؟ اس نے کڑک کر پوچھا۔
اور اپنے ہاتھ کی چھڑی کو مجھ پر بے تحاشہ برسانا شروع کر دیا۔
وہ پوچھتا۔
تم کون ہو ؟
میں — اقبال مند ہوں۔
اور تمہارے ابا کا نام ؟
دانش مند۔
تم کہاں کے رہنے والے ہو ؟
حیدر آباد کا !
غلط — غلط۔ وہ چیخا اور پھر بے تحاشہ مجھے
پیٹنا شروع کر دیا۔
تمھارا نام۔ رگھبیر راؤ ہے۔ اور تمھارے ابا کا
سندیش۔
بولو — میرا نام رگھبیر راؤ۔ اور میرے ابا کا۔۔
نہیں۔ نہیں۔ میں برابر چیختا رہا۔ میرا نام رگھبیر نہیں۔۔۔
اقبال مند ہے۔ اقبال مند ہے۔
یا اللہ۔ کیا ہو گیا — کیا ہو رہا ہے۔ میں کہاں
پھنس گیا ہوں ؟ میری آنکھوں سے آنسو ابل پڑے۔ اور
میں دیوانہ وار چیخنے لگا۔
مجھے بچاؤ۔ مجھے بچاؤ۔
ہاہاہا — وہ زور سے ہنسا۔ شیطانی ہنسی۔ اور بولا۔
رگھبیر راؤ۔ مان جاؤ۔ ورنہ جان سے
مار ڈالے جاؤ گے۔ پھر اس نے مجھے اندر دھکیل دیا اور
دروازہ بند کر کے چلا گیا۔

مجھے اس قید خانہ میں بند ہوئے آج ساتواں دن
تھا۔ ان سات دنوں میں مجھے سوائے پانی کے کھانے کو کچھ نہ
ملا۔ البتہ ناشتہ میں ہر روز بے حساب چھڑیاں ضرور ملتیں۔ میرا
بدن سوج کر کپا ہو گیا تھا۔
ابا۔ امی اور وطن کی یاد شدت سے آ رہی تھی۔
اقبال کی تلاش اور اسے ڈھونڈ نکالنا بھی ابھی
باقی تھا۔ کیوں کہ میں نے ایمن صاحب وعدہ کر لیا تھا۔ میں
بہت اداس بیٹھا طرح طرح کی ترکیبیں سوچ رہا تھا کہ مجھے نیند آگئی
اور میں سو گیا۔
کیا دیکھتا ہوں کہ کوئی بزرگ مجھ سے کہہ رہے ہیں۔
بیٹا اقبال مند ! گھبراؤ نہیں۔ ان لوگوں کا پیشہ
یہی ہے۔ یہ تم جیسے معصوم بچوں کو اٹھا لاتے ہیں اور یہاں
لا کر اسی طرح تڑپاتے ہیں۔ ان کے نئے نئے نام رکھے جاتے
ہیں اور ان کے دماغوں سے پرانی زندگی اور ان کے اصلی
ماں باپوں کے نام بھلا کر نئے نام دیے جاتے ہیں۔
پھر جب وہ واقعی اپنی پرانی زندگی بھول جاتے
ہیں تب ان سے کام لیا جاتا ہے۔
ان کے کام لینے کے بے شمار طریقے ہیں۔ اور اس
کے لیے انھوں نے بے شمار شعبے بنا رکھے ہیں۔
بدصورت اور معذور بچوں سے بھیک منگوائی
جاتی ہے، بعضوں کو یتیم بنا کر ان سے چندے وصول کرائے
جاتے ہیں۔ اور بعض کو ناچنا۔ گانا سکھا کر، اور اسی طرح کی
مختلف تربیتیں دے کر طرح طرح کے کام نکالے جاتے ہیں۔
اور خوب روپیہ کماتے ہیں۔

تمھیں جو شعبہ دیا گیا ہے۔ وہ نمبر تیرہ ہے۔ جانتے ہو یہ
ٹھکانہ کیا ہے؟ سنو۔

جب تم کو یہاں سے نکالا جائے گا۔ تب تمھیں اس
ٹھکانہ میں پہنچایا جائے گا اس شعبہ کا کام ہے خوبصورت لڑکے
اور لڑکیوں کو فروخت کرنا۔ جو بچے خوب صورت ہوتے ہیں انھیں
بڑے بڑے آسامیوں کے ہاتھ بڑی بڑی رقموں میں فروخت کیا
جاتا ہے۔ پھر یا تو وہ اسے اپنی اولاد بنا لیتے ہیں یا اپنا غلام!

تمھارے اس شعبہ کے متصل ایک اور شعبہ ہے ٹھکانہ
چودہ — یہاں لڑکوں اور لڑکیوں کو طرح طرح کی تربیتیں دی جاتی
ہیں اور انھیں کام سکھائے جاتے ہیں۔ پھر انھیں مختلف شہروں
میں بھیج کر وہاں محنت مزدوری کرائی جاتی ہے۔

اقبال مند۔ تم خواہ مخواہ ضد مت کرو۔ اور ان کی بات
جھوٹ موٹ مان لو۔ اور ایسے کام کرو کہ وہ سمجھیں کہ تم ان میں
مل گئے ہو۔ بیٹا اگر تم ضد سے کام کروگے تو پھر چھٹکارا کیسے
پاؤگے۔۔

اٹھو۔ جلدی کرو —— اور بزرگ غائب ہوگئے۔

گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ سارا خوف کافور ہو چکا تھا چہرے
پر ایک ہلکی سی خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

تیرا نام؟ وہ کڑک کر بولا۔
رگھبیر راؤ۔ رگھبیر راؤ۔ میں بولا۔
اور تیرے باپ کا؟
سندیش۔
آگیا راستہ پر! اگر پہلے ہی مان لیتا تو کاہے کو اتنی
سزا بھگتنی پڑتی۔

پھر اس نے مجھے باہر نکالا اور گودام میں لے گیا
اور بولا۔ لے یہ سب تیرا ہے۔ اس میں سے جو جی
چاہے کھا۔ اور پی

پھر مجھے سردار کے پاس لایا گیا۔ اور بولا

سردار "نسخہ پرانا" کامیاب رہا۔ اور یہ ہم میں
مل گیا۔ اور خاص بات تو یہ ہے کہ یہ ہم سب کو بھیا۔ بھیا کہتا ہے
جیسے برسوں سے مانوس ہو!

ہاں ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ سردار بولا۔ اب
ٹھکانہ تیرہ میں لے جاؤ۔

اور وہ مجھے لے کر چلا۔

اس ٹھکانہ میں آئے ہوئے مجھے ہفتہ بھر ہو چکا ہے
میں نے بہت کوشش کی کہ اس ٹھکانہ سے باہر نکلوں۔ یہاں کے
لوگ مجھے ٹھکانہ سے باہر قدم بھی نکالنے نہیں دیتے تھے۔

وہ اپنا خاص سبق روز رٹاتے۔
رگھبیر۔ دنیا کی سیر کرے گا؟
ہاں ہاں میں کہتا۔

وہ بولتے۔ ہم ایک ایسے شخص کا انتظام کر رہے ہیں
جو تمھیں سمندر پار لے جائے گا۔ وہ تمھیں دنیا کی خوب سیر کرائے
گا۔ اور تمھیں اپنے بیٹے کی طرح رکھے گا۔ تم اس کے ساتھ ہنسی
خوشی رہنا۔

ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ ایسا ہی کروں گا۔ میں
بولتا۔ اور وہ خوش ہو جاتے۔ اور آپس میں بولتے۔ لڑکا بہت
بھولا ہے۔ بہت جلد "نمبر" پر آگیا۔

مجھے سخت وحشت تھی۔ میں ڈر رہا تھا۔ کہیں ایسا نہ
ہو کہ میرا نمبر آجائے اور میں چلا جاؤں۔ میں چاہتا تھا کہ جانے سے
پہلے ان لوگوں کا پورا غار چھان ماروں۔ ان کے پورے ٹھکانے
دیکھ لوں۔ اب میرے دل میں ایک اور بھی خواہش گدگدی
لے رہی تھی۔

کس طرح ان لوگوں کو پولیس کے حوالہ کیا جائے۔ اور ان سینکڑوں بچوں کو ان کے اصلی ماں باپ تک پہنچا دیا جائے۔

اس کے لیے مجھے سب سے پہلے اس غار سے قریبی آبادی تک کا پتہ لگانا تھا۔

مگر یہ کام بڑا مشکل تھا۔

میرا مقصد صرف بھاگ جانا اور ان لوگوں سے آزادی حاصل کر لینا ہی نہیں تھا۔ بلکہ میں اپنے ساتھ ان تمام بچوں کو بھی آزاد کرانا چاہتا تھا اور ان بدمعاشوں کو گرفتار کرانا تھا۔ میرا مقصد اور پلان تو بہت بڑا تھا۔ مگر جب بھی میں اس مقصد کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتا اور اپنے قدم بڑھاتا تو میرے قدم ٹھکانہ کے دروازے پر ہی آ کر رک جاتے۔ مجھے اس سے آگے بڑھنے نہیں دیا جاتا اور میں مایوس ہو جاتا کہیں ایسا نہ ہو میں صرف سوچتا ہی رہوں اور وہ میرے پروگرام پر ڈھیر دل مٹی ڈال کر مجھے کسی کے ہاتھ فروخت کر دیں۔

ہو سکتا ہے امین صاحب کا اقبال بھی یہیں ہو؟

میرے دماغ کے گوشوں سے ایک آواز ابھری۔

اور میں تڑپ کر رہ گیا۔

مجھے تو اقبال کا بھی پتہ لگانا ہے۔ مجھے اس کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔ خدا نے چاہا اور اقبال یہاں ہوا تو ایک ہاتھوں دونوں کام انجام پا جائیں۔

(باقی آئندہ)

جیسے کو تیسا بقیہ صفحہ ۲۸

بچ بچ سے آتے تھے تینوں اپنی اپنی تعلیم کی ڈینگیں مار رہے تھے۔ بہت دیر تک ایک دوسرے سے ڈینگیں مارنے میں سبقت لے جانے کی کوشش کرتے رہے۔ جب پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے تو سب کچھ بھول کر ٹھاکر سے کھانے کی بات چھیڑی۔ ٹھاکر مسکرا کر بولا "ذرا صبر کیجیے ابھی کھانا مل جائے گا"

تھوڑی دیر بعد کھانے کے لیے الگ کمرے میں بلوایا گیا۔ یہ تینوں دوڑے ہوئے اس کمرے میں گیے ——— لیکن انھوں نے دیکھا کہ دسترخوان پر لذیز قسم کے پکوان کے بجائے، کتابیں، قلم دوات اور سنگیت کا سامان رکھا تھا۔ یہ منظر دیکھتے ہی تینوں لال پیلے ہو گیے اور بگڑ اٹھے ——— "ٹھاکر جی بھوک کے وقت مذاق اچھا نہیں لگتا ——— کیا تمہارے یہاں یہی کھانے کو ہوتا ہے!!"

ٹھاکر نے مسکرا کر طنزیہ لہجے میں کہا ——— "آپ لوگوں کے گھروں میں بھی تو یہی کھانا ہوتا ہے۔ کل آپ نے ایک بھکاری سے یہی کہا تھا نا۔ اب آپ ان کو کھا کر اپنی بھوک مٹا لیجیے۔" اتنا کہہ کر وہ اپنے کمرے میں چلا گیا تینوں پنڈت بہت شرمندہ ہوئے اور ٹھاکر کے کمرے میں آ کر اپنی غلطی کی معافی مانگی۔

پھلواری لگائیے

جناب اظہار الحق استاد باغبانی مدرسہ ثانوی

ابھی تین چار دن کی بات ہے ہمارے نجو صاحب اچھلتے کودتے گھر میں داخل ہوئے ہاتھ میں امرود کے پیڑ کی ٹہنی تھی کہنے لگے بھائی جی بھائی جی کیاری میں املود (امرود) لگا دیجیے۔ میں نے کہا تم خود ہی کیوں نہ لگا لو کہنے لگے ہم سے کیاری میں سوراخ نہیں ہوتا آپ لگا دیجیے —— بھائی جی —— لگا دیجیے نا۔ دیکھیے املود آئیں گے تو ہم آپ کو بھی دیں گے۔ امی کو بھی دیں گے۔ بجیا کو بھی دیں گے خوب بڑے بڑے املود (امرود)

نجو میاں کو پھلواری لگانے کا شوق ہے جہاں کوئی خوب صورت پھول شاخ سمیت ان کے ہتے چڑھا انھوں نے کیاری میں ذرا سی مٹی کریدی اور پھول کی شاخ گاڑ دی۔

ان کے اس شوق کو دیکھ کر مجھے خیال آیا نجو میاں کی طرح اور کتنے نونہال ہوں گے جنھیں یہ شوق ہوگا اور پھر اپنے پیام تعلیم کا خیال آیا۔ اس میں اور تو سب کچھ ہوتا ہے۔ مگر باغبانی یا پھلواری پر کچھ نہیں ہوتا۔ یہ بات بہت دنوں سے دل میں کھٹک رہی تھی سوچ رہا تھا کہ ایڈیٹر صاحب کو اس طرف توجہ دلاؤں لیکن پھر اچانک ایک بات ذہن میں آئی پہلے میں خود ہی کیوں نہ اپنے شوقین بھائیوں کی مدد کر دوں اور جب یہ سلسلہ شروع ہو جائے گا تو یقین ہے اور دوسرے جانکار بھی آگے بڑھیں گے اس کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں گے۔

اصل میں زمین سے کوئی چیز پیدا کرنے کی بات اچھی خاصی لمبی چوڑی ہے اس میں پھلواری یا باغبانی ہی نہیں بہت سی باتیں آتی ہیں مثلاً

ایک پرانی مثل ہے بہت پرانی بہت مشہور "ہماری دھرتی سونا اگلتی ہے:" سچ جانو کہنے والے نے بڑی سچی بات کہی ہے یہ ایسی چیزیں اگلتی ہے جن کی بدولت ہم آپ زندہ ہیں یہ ہمارے لیے اناج اگلتی ہے طرح طرح کی دالیں، سبزیاں، ترکاریاں اگلتی ہے۔ انھی کو کھا کر تو ہم آپ زندہ رہتے ہیں۔ پھر پھل دار درخت ان کے پھلوں کو ہم مزے لے لے کر کھاتے ہیں ایسے پیڑ جنھیں ہم طرح طرح سے کام میں لاتے ہیں اور پھر قسم قسم کے خوب صورت پھول جنھیں دیکھ کر آپ کی آنکھوں میں طراوت آتی ہے اور سونگھ کر دماغ تر و تازہ ہوتا ہے۔

یہ سب چیزیں الگ الگ طریقوں سے اگائی جاتی ہیں اور زمانے نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ ان الگ الگ طریقوں نے مستقل علم کی شکل اختیار کر لی ہے یوں سمجھو کہ زمین سے کوئی چیز اگانا کاشت کاری یا کھیتی باڑی ہے۔ اور کھیتی باڑی کی بہت سی شاخیں ہیں آگے چارٹ میں آپ دیکھیں گے۔

دیکھا آپ نے ہماری کھیتی باڑی کا علم فن یا سائنس ترقی کی کس منزل پر ہے اور تو اور مویشی، شہد کی مکھیاں اور ریشم کے کیڑے پالنا بھی اسی کھیتی باڑی کا ایک حصہ بنا دیا گیا ہے۔ تمھیں تعجب تو ہوگا اور شاید یہ بات بھی

کی معلوم ہوگی۔ مگر اپنے سائنس کے ماسٹر صاحب یا کھیتی کے ماسٹر صاحب سے پوچھوگے تو بات تمھاری سمجھ میں آجائے گی۔

نیچے ہم نے ایک لمبی چوڑی فہرست اس لیے بنائی ہے کہ تم اس میں سے اپنی کوئی دلچسپی کی چیز چن لو اور ہمیں بتادو میرا خیال تو یہ ہے کہ ہمیں وہی چیز چننا چاہیے جو ہماری بساط میں ہے۔ اس سلسلے میں میرا دھیان تو بار بار پھلواری کی طرف جاتا ہے۔ یعنی اپنے گھر میں پھلواری لگائی جائے۔ گھر کا آنگن بڑا ہو تو کیا کہنے چھوٹا ہے یا پکا ہے تو گملے کام آسکتے ہیں۔ اب آنگن کی کیاری یا گملوں میں کیا بویا جائے۔ کس وقت بویا جائے۔ کس پودے کے لیے کونسی کھاد ڈالی جائے کب کب پانی دیا جائے۔ یہ سب اگلے پرچے میں۔

مگر ابھی میں تمھارے خط کا منتظر رہوں گا۔ ایڈیٹر پیام تعلیم کی معرفت بھیجنا۔

چارٹ

1. Agronomy	(۱) فصلوں کی کاشت
2. Arboriculture	(۲) درختوں کی کاشت
3. Pastoral Farming, Animal Husbandry and Dairy Farming	(۳) جانوروں کی پرورش
4. Apiculture	(۴) شہد کی مکھی پالنا
5. Pisciculture	(۵) مچھلی پالنا
6. Sericulture	(۶) ریشم کے کیڑے پالنا
7. Horticulture	(۷) باغبانی
(1) Floriculture	۱۔ پھولوں کی کاشت
(2) Pomology	(۲) پھلوں کی کاشت
(3) Olariculture	۳۔ سبزیوں کی کاشت
	(الف) کچن گارڈننگ (باورچی خانہ کے لیے باغیچہ)
Market garding	(ب) بازار کے لیے باغیچہ
Truck	(س) مقامی بازار سے باہر کے لئے باغیچہ
Vegetable forcing	(د) بغیر موسم کے سبزی پیدا کرنا
Caning and Presevation	(ی) پیداوار کو محفوظ کرنا

بچوں کا جسم تیزی سے بڑھے اور لباس تنگ ہو جائے تو دھوبی کا کیا قصور...

ب مسٹر شرنک دھوبی سے سازباز کر لیں تو سمجھ لیجئے کہ لباس کے سکڑ کر تنگ ہو جانے کی مصیبت کا سامنا ہے لہٰذا اب بھی آپ بچوں کے لباس کے لیے مضبوط اور دیرپا سوتی کپڑے یا سِلے ہوئے کپڑے خریدنا چاہتے ہوں تو ہمیشہ "سینفورائزڈ" کی مہر پر اصرار کیجئے

یہ مشہور ٹریڈ مارک جو دنیا بھر میں جانا پہچانا اور حاصل کردہ سند [illegible] کپڑوں کی فیکٹریوں میں [illegible] آپ کا لباس سکڑ کر تنگ نہ ہونے کی ضمانت ہے اس پر بھروسہ کیجئے "سینفورائزڈ" [illegible] کپڑوں کو سلوانے سے پہلے پانی میں بھگونے کی ضرورت نہیں ہوتی لہٰذا ہر کپڑا جو آپ خریدیں اس پر اصل مہر کو ضرور دیکھ لیجئے

[illegible] ٹریڈ مارک "سینفورائزڈ" [illegible] رجسٹرڈ استعمال کرنیوالوں کو [illegible] کپڑوں پر اس کے استعمال کی اجازت دیتے ہیں [illegible] طرح ان کے مقرر کردہ اعلیٰ معیار کو قائم رکھتے ہیں

پنچ تنتر کی کہانیاں

جناب رفیق شاستری

(مسلسل)

ٹیٹری نے تب ٹیٹرے کو چڑیا اور ہاتھی کی یہ کہانی سنائی۔

مینڈک کی ہوشیاری

جنگل کے ایک پیڑ کی ڈال پر ایک چڑیا اور چڑا رہا کرتے تھے۔ ایک دن ایک متوالا ہاتھی اس جنگل میں آیا اور اسی پیڑ کے سایے میں بیٹھ کر مزے سے آرام کرنے لگا۔ وہ اپنی سونڈ اٹھا اٹھا کر پیڑ کی ڈال بھی توڑتا جاتا تھا۔ ہاتھی کی سونڈ نے اس ڈال کو بھی لپیٹ لیا جس پر چڑیا کا گھونسلا تھا۔ ڈال کا گرنا تھا کہ گھونسلے میں رکھے سارے انڈے چور چور ہو گئے۔

انڈوں کے برباد ہونے کا چڑیا کو بہت دکھ ہوا۔ وہ رونے لگی۔ اس کی رونے کی آواز سن کر چڑیا کا دوست ہدہد بھی وہاں آ گیا۔ اس نے چڑیا کو سمجھایا کہ اب رونے سے کیا فائدہ، جو ہونا تھا ہو چکا۔ مگر ہدہد کی یہ نصیحت چڑیا کے دل کو نہ لگی۔ اس نے کہا: "اگر تو میرا سچا دوست ہے تو پھر اس متوالے ہاتھی سے بدلا لینے میں میری مدد کر۔ اس سے بدلا لیے بغیر مجھے چین نہ آئے گا۔"

ہدہد نے کہا: "مگر اس میں ہمیں اپنے اور دوستوں کی بھی مدد لینی ہوگی۔ ایک مکھی میری دوست ہے۔ چلو اس سے بھی صلاح کی جائے وہ بہت سریلی تان میں گاتی ہے۔ اسے بھی ساتھ لیے لیتے ہیں۔"

مکھی رانی نے جب ہدہد اور چڑیا کی بات سنی تو ان کا ساتھ دینے کو تیار ہو گئی۔ مگر اس نے کہا: "ہمیں اپنے اور دوستوں کو بھی ساتھ لینا چاہیے۔ چلو میرا دوست ایک مینڈک ہے، اسے بھی ساتھ لے لیں۔"

جب تینوں نے مینڈک کو اپنی درد بھری کہانی سنائی تو وہ خوشی سے اچھل پڑا۔ کہنے لگا متوالے ہاتھی سے ضرور بدلہ لیا جائے گا۔ وہ اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے۔ ہم چاروں اس کو مزا چکھا دیں گے۔ مینڈک میاں نے ہاتھی سے نبٹنے کا پورا نقشہ تیار کر کے بتایا: "دیکھو سب سے پہلے مکھی رانی ہاتھی کے کان کے قریب پہنچ کر ایسا نغمہ چھیڑیں گی کہ ہاتھی مست ہو کر جھومنے لگے گا۔ جیسے ہی ہاتھی کی آنکھ جھپکے گی یہ ہدہد میاں جا کر چونچ مار مار کر اس کی دونوں آنکھوں کو بیکار کر دیں گے۔ اب اندھا ہو کر ہاتھی ادھر ادھر بھاگے گا۔ جب اسے پیاس لگے گی تو وہ پانی کی کھوج میں ادھر ادھر مارا مارا پھرے گا۔ اس وقت میں ایک گہرے گڈھے کے پاس جا کر "ٹرّوں ٹرّوں" الاپنا شروع کر دوں گا۔ ہاتھی سمجھے گا کہ جدھر سے مینڈک

کو آ رہی ہے۔ ادھر ضرور تالاب ہوگا۔ وہ اس طرف آئے گا اور تالاب سمجھ کر گڑھے میں گر جائے گا۔ اب اس گڑھے سے میاں ہاتھی باہر نکلنے سے رہے۔ کچھ دن بھوکے پیاسے رہ کر ختم ہو جائیں گے۔

مینڈک کی یہ بات سن کر چڑیا، ہُدہُد اور مکھی سبھی خوش ہوئے اور اس ترکیب سے انھوں نے ہاتھی کو سچ مچ مار بھی ڈالا۔

چڑیا اور ہاتھی کی کہانی سنا کر ٹیٹری نے ٹیٹرے سے کہا کہ تمھی میں کہتی ہوں کہ چھوٹے اور کمزور بھی مل کر بڑے بڑوں کو مار سکتے ہیں۔

ٹیٹرا بولا "اچھی بات ہے۔ میں بھی دوسرے پرندوں کی مدد سے سمندر کو سکھانے کی کوشش کروں گا۔"

پھر اس نے سارس، بگلے، مور اور دوسری بہت ساری چڑیوں کو بلا کر اپنی دکھ بھری کہانی سنائی۔ جسے سن کر انھوں نے کہا کہ ہم تو بہت کمزور ہیں۔ مگر ہمارا دوست گروڑ ضرور اس میں ہماری مدد کر سکتا ہے۔

پھر ساری چڑیاں چل کر گروڑ کے پاس گئیں اور اپنا دکھڑا سنایا اور کہا کہ اگر ہم نے اس کا بدلہ نہ لیا تو آج سمندر نے ٹیٹری کے انڈے برباد کیے ہیں کل وہ دوسری چڑیوں کے انڈے برباد کرے گا۔

گروڑ نے ان کی بات سنی تو اس کا دل پگھل اٹھا اور پھر اس نے جنگل کے دیوتا کی مدد سے سمندر سے ٹیٹری کے انڈے دلا دیے۔

دمنک گیدڑ نے یہ کہانیاں سنانے کے بعد سنجیوک بیل سے کہا "بھئی اس لیے میں کہتا ہوں کہ لڑائی کی ٹھاننے سے پہلے دشمن کی طاقت کا اندازہ کر لینا چاہیے۔"

سنجیوک بولا۔ "مگر دمنک مجھے یہ کیسے معلوم ہوگا کہ پنگلک شیر کے دل میں کھوٹ ہے اور وہ مجھے مارنے پر تلا ہوا ہے۔ آج تک تو وہ مجھ سے محبت اور مہربانی سے پیش آتا رہا ہے۔ اس کی بدلی ہوئی نظر کا مجھے تو کوئی علم نہیں۔ میں آخر یہ کیسے سمجھوں۔ تم مجھے کچھ علامتیں بتاؤ جس سے میں یہ سمجھ سکوں کہ شیر کے دل میں میری طرف سے میل آگیا ہے اور میں اپنی حفاظت کے لیے تیار ہو جاؤں۔"

دمنک بولا "یہ بھی کیا مشکل ہے۔ اگر اس کے دل میں تمھیں مار ڈالنے کی بات آئے گی تو اس کی آنکھیں سرخ ہو جائیں گی۔ بھویں تن جائیں گی۔ وہ غصے بھری نظر سے تمھیں دیکھے گا۔ مگر یہ سب دیکھنے سے تمھیں کیا فائدہ ہوگا۔ اچھا تو یہ ہوگا کہ تم راتوں رات چپکے سے اس جنگل سے کہیں دور چلے جاؤ۔ مگر بھئی یہ سب تمھاری مرضی کی بات ہے۔"

سنجیوک سے اتنی باتیں کرنے کے بعد دمنک اپنے دوست کرکٹ گیدڑ کے پاس آیا۔ دمنک کو دیکھتے ہی کرکٹ بول پڑا "کہو دوست دمنک تمھیں اپنی اسکیم میں کوئی کامیابی ملی یا نہیں؟"

دمنک ذرا فخر سے بولا۔ "مجھے جو کچھ کرنا تھا میں کر چکا۔ کامیابی ناکامی میرے اختیار سے باہر ہے۔ میں تو اپنی طرف سے سب کچھ کر آیا ہوں، دیکھو کیا ہوتا ہے۔"

کرکٹ کہنے لگا۔ "مگر مجھے بھی تو کچھ بتاؤ۔"

دمنک بولا۔ "میں نے جھوٹ بول کر بیل اور شیر کو ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا ہے اب وہ ایک دوسرے پر بھروسا نہیں کریں گے۔" کرکٹ نے کہا "مگر تم نے یہ کچھ اچھا کام نہیں کیا۔ دو دوستوں میں دشمنی کا بیج

بونا کچھ اچھا کام نہیں ہے۔
کرکٹ بولا: "تم اچھا برا کیا جانو۔ حکمت عملی کسے کہتے ہیں تمھیں نہیں معلوم۔ منجوک نے ہماری وزارت ہتھیا لی تھی۔ وہ ہمارا دشمن تھا۔ دشمن کو شکست دینے کے لیے اچھے برے کا خیال نہیں کیا جاتا۔ کیا تم نے چترک گیدڑ کی کہانی نہیں سنی ہے۔"

دمنک بولا۔ نہیں تو۔
پھر دمنک نے چترک گیدڑ اور شیر کی کہانی سنائی۔

چڑھ جا بچا سولی پر!

کسی جنگل میں فولادی دانت نام کا ایک شیر رہا کرتا تھا۔ اس کے دو غلام تھے۔ ایک چترک گیدڑ اور دوسرا گوشت خور بھیڑیا۔ یہ گیدڑ اور بھیڑیا دونوں ہر وقت شیر کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ ایک دن شیر نے ایک اونٹنی کو مارا۔ اونٹنی کے پیٹ سے ایک چھوٹا سا اونٹ کا بچہ نکلا۔ شیر کو اس بچے پر ترس آیا۔ اس نے بچے سے کہا میں تجھے نہیں ماروں گا۔ تو آرام سے اس جنگل میں رہ اور چین کی بانسری بجا۔ اونٹ کا بچہ بھی ہر وقت شیر کے ساتھ رہنے لگا۔ جب وہ بڑا ہو گیا اس وقت بھی شیر کی ناک کا بال بنا رہا۔

ایک دن اُس جنگل میں ایک متوالا ہاتھی آگیا۔ اس سے شیر کی لڑائی ہوئی۔ شیر نے ہاتھی کو مار تو بھگایا مگر اس لڑائی میں خود اس کی اتنی مرمت ہو گئی کہ ایک قدم چلنا بھی دوبھر ہو گیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ تم کوئی ایسا شکار لے آؤ جسے میں یہاں بیٹھے بیٹھے مار دوں۔

تینوں ساتھی شیر کا حکم پاکر شکار کی تلاش میں نکلے۔ مگر بہت دوڑ دھوپ کے بعد جب کبھی کوئی شکار ہاتھ نہ آیا تو چترک نے ایک ترکیب سوچی۔

چترک نے سوچا کہ شیر اب بہت دن تک شکار نہیں کر سکے گا۔ میں تو بھوکا مر جاؤں گا۔ کسی طرح یہ اونٹ تلے چڑھ جائے تو بہت دنوں کے لیے چھٹی ہو جائے۔ مگر شیر جان کی امان کا قول دے چکا تھا۔ بھلا وہ اسے کیوں ہاتھ لگانے لگا۔ اب اس نے ایک اور جال بچھایا۔

اس نے اونٹ سے کہا: "دیکھو میں تمھارے فائدے کی ایک بات بتاتا ہوں جس میں تمھارا اور ہمارے آقا کا دونوں کا بھلا ہے۔ تم جانتے ہی ہو ہمارا آقا کئی دن سے بھوکا ہے۔ تم اسے اپنا جسم ادھار دے دو۔ کچھ دنوں بعد تمھیں یہ جسم دوگنا ہو کر مل جائے گا۔ شیر کی بھوک مٹ جائے گی اور تم کچھ ہی دن بعد نیا جسم پاکر خوب موٹے تگڑے ہو کر اس جنگل میں موج کرنے لگو گے۔"

اونٹ بولا۔ آقا کی خوشنودی کے لیے میں سب کچھ کرنے کو تیار مگر بھلا مجھے میرا جسم دوگنا ہو کر کیسے مل جائے گا یہ بات بھی تو بتاؤ۔

چترک گیدڑ بولا۔ جنگل کے دیوتا کی قسم کھا کر ہی شیر تمھارا جسم لے گا۔ جو تمھیں جلد ہی دوگنا ہو کر واپس مل جائے گا۔

اونٹ تیار ہو گیا اور چترک نے یہ بات شیر کو سنائی۔ بھوک کی وجہ سے شیر اس کی بات پوری طرح سمجھ نہیں سکا اور یہ دیکھ کر کہ اونٹ تیار ہے شیر بھی چترک کی بات مان گیا اور جنگل کے دیوتا کو گواہ بنا کر فوراً اونٹ کا کام تمام کر دیا۔

گیدڑ اور بھیڑیے کی نگرانی میں اونٹ کی لاش کو چھوڑ کر پاس ہی ندی میں منھ ہاتھ دھونے چلا گیا۔ شیر کے جانے کے بعد چترک نے سوچا کہ اب کوئی ایسی تدبیر ہونی چاہیے کہ وہ اکیلا ہی پورا کا پورا ہڑپ لے۔

چترک بھیڑیے سے بولا۔ دوست تم بہت دیر سے بھوکے ہو۔ شیر کے آنے میں ابھی دیر ہے۔ جب تک تم تھوڑا کھالو۔ شیر کے آنے پر میں اسے بھگا دوں گا۔

بھیڑیے میاں کی آنتیں تو کب سے قل ہو اللہ پڑھ رہی تھیں۔ گیدڑ کی بات سن کر فوراً تیار ہو گیا۔ مگر ابھی بس دانت گڑو ہی پایا تھا کہ گیدڑ چلا اٹھا" ارے دور ہٹ، مالک آ رہا ہے۔"

شیر نے آکر دیکھا کہ اونٹ پر بھیڑیے کے دانت لگے ہوئے ہیں۔ اس نے غصے میں آکر پوچھا۔ "یہ کس کی حرکت ہے؟ کس نے اونٹ پر اپنے دانت لگائے ہیں۔"

بھیڑیا سہما ہوا گیدڑ کی طرف دیکھنے لگا۔ چترک گیدڑ نے رخ بدلتے ہوئے کہا:" اب میری طرف کیا دیکھ رہا ہے۔ اب اپنے کیے کی سزا بھگت۔"

یہ سننا تھا کہ بھیڑیا وہاں سے دم دبا کر بھاگا۔

شیر اونٹ کو کھانے کے لیے بڑھا ہی تھا کہ کہیں دور سے گھنٹیوں کی آواز سنائی دی۔ شیر نے گیدڑ سے پوچھا یہ یہ کیا معاملہ ہے۔ یہ آواز کیسی ہے۔ گیدڑ نے دیکھا کہ اونٹوں کا ایک قافلہ گذر رہا ہے۔ جن کی گھنٹیوں کی آواز آ رہی ہے۔ پھر کیا تھا گیدڑ نے موقع غنیمت جانا کہنے لگا" آقا آپ دیر نہ کیجیے فوراً یہاں سے بھاگ جائیے۔"

شیر بولا۔ آخر کیوں کیا بات ہے؟"

گیدڑ بولا۔ آقا آپ نہیں جانتے۔ آپ نے جنگل کے دیوتا سے اجازت لیے بغیر ان کی قسم کھا کر اس اونٹ کو مارا ہے اب یہ اونٹ جنگل کے دیوتا کو لے کر آ رہے ہیں۔ مالک آپ فوراً چلے جائیے۔ کچھ دیر بھی رُکے تو بڑا غضب ہو جائے گا۔

گیدڑ کی یہ بات سن کر "فولادی دانت" نام کا شیر سر پر پیر رکھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ اب چترک شیر نے مزے لے لے کر اونٹ کو اکیلا ہی کھا ڈالا۔

شیر اور بیل کی لڑائی

دمنک نے یہ کہانی سنا کر کہا:" اسی لیے میں کہتا ہوں کہ اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کے لیے دھوکے سے بھی کام لیا جا سکتا ہے۔

اِدھر دمنک کے جانے کے بعد سنجیوک نے سوچا کہ میں نے یہ اچھا نہیں کیا جو سبزی خور ہونے پر ایک گوشت خور سے دوستی کی۔ مگر اب کیا کیا جائے؟ کیوں نہ اب پنگ لک شیر کی حضور میں جا کر اس سے اور دوستی بڑھاؤں دوسری جگہ اب میری پوچھ بھی کیا ہو گی۔

یہ سوچتا ہوا سنجیوک بیل دھیرے دھیرے پنگ لک شیر کے پاس چلا آیا۔ شیر غصے میں تو پہلے ہی تھا۔ سنجیوک نے

بقیہ صفحہ ۴۴ پر

محترمہ سلمیٰ جاوید

بے حد ضروری کام

"چھی چھی ــــــ مُنّی بیٹی۔"

"کیا ہوا امّی !" ؟

بھلا تم یہ ابلا ہوا انڈا کھانے جا رہی ہو۔

"امّی یہ انڈا تو آپ نے میرے لیے ہی ابالا ہے نا؟"

"ہاں ہاں بھئی اسے تلوایا بھی میں نے تمھارے ہی لیے اور ابالا بھی تمھارے ہی لیے۔"

"تو پھر آپ نے چھی چھی کر کے مجھے ڈرا کیوں دیا ؟"

"تم اس کو کھانے جا رہی ہو نا۔ اس وجہ سے !"

"تو کیا امّی یہ انڈا اب کھانے کے لائق نہیں رہا ؟"

"نہیں بھئی انڈا تو بالکل ٹھیک ہے اس میں کوئی خرابی نہیں ہے۔"

"تو پھر امّی آپ مجھے روک کیوں رہی ہیں ؟ مجھے کھانے دیجیے نا !"

"نہیں نہیں ! ابھی تم اس کو کیسے کھا سکتی ہو ؟"

"کیوں امّی اس وقت تو روز ہی انڈا کھانے کے لیے آپ دیتی ہیں نا ؟"

"وہ تو ٹھیک ہے۔"

"تو پھر آپ کیوں روک رہی ہیں ؟"

"مگر یہ بتاؤ کہ روز صبح بستر سے اٹھنے کے بعد تم کام کیا کیا کرتی ہو ؟"

"میں بستر سے اٹھتے ہی پہلے لوٹے میں پانی بھر کر پیشاب کرنے جاتی ہوں اور پھر منجن اور برش سے دانت مانجتی ہوں اور حلق میں انگلی سے منجن لگا کر خوب رال گراتی ہوں۔ ہلکے گرم پانی سے غرارے کرتی ہوں۔"

"تو منی بیٹی ! کیا آج تم نے یہ سب کام کر لیے ہیں ؟"

"ارے امّی ! آپ نے بیچ بیچ خوب یاد دلایا آج تو میں منجن اور برش سے اپنے دانت مانجنے اور پانی کے گھونٹ منہ میں بھر کر غرارہ کر کے حلق صاف کرنے والے سارے کام بھول گئی۔"

"ہاں بیٹی ــــــ جب ہی تو میں نے تم کو انڈا کھاتے وقت ٹوکا۔"

"اگر امّی میں ایک دن بغیر دانت مانجے ، اور حلق

صاف کے [illegible] سے کیا کوئی نقصان ہوجاتا ہے؟"

"یہی تو بات ہے منی بیٹی! جسے تم بھول رہی تھیں۔ تم نے رات کو جو کھانا کھایا ہے اور پھر رات بھر پلنگ پر لیٹی ہوئی سوتی رہی ہو تو کیا اس سے کچھ فرق تم کو اپنے منھ میں معلوم نہیں ہوتا؟"

"ہاں امی! منھ کا مزا عجیب عجیب سا لگتا ہے۔"

"تو پھر۔ اس کا صاف کرنا ضروری ہے نا پیٹ سے گندی اور خراب چیزیں سانس کے راستے چڑھ کر تمہارے دانتوں، جبڑوں، زبان، تالو اور حلق میں رات بھر چمٹی رہی ہیں۔ اب اگر تم اسی حالت میں کوئی چیز انھیں دانتوں سے چبا کر زبان سے چلا کر حلق کے راستے پیٹ میں اتاردو گی تو یہ سب کی سب گند گی تمہارے پیٹ میں لوٹ جائے گی۔ اور تمہارے پیٹ کو خراب کردے گی۔ انڈے کو بھی گندا کردے گی اور یہ سب چیزیں مل کر تم کو بیمار کردیں گی۔ جو کھاؤ گی وہ ہضم نہیں ہوگا پیٹ پھول کر ڈھب ڈھب کرے گا منھ میں برا برا سا مزا معلوم ہو کر متلی سی معلوم ہوگی۔ پتلا پتلا بدبو دار دست بھی آجائے گا پیٹ میں اینٹھن ہونے لگے گی سر میں عجیب عجیب سی دکھن ہوگی اور تم خدا نہ کرے بیمار بھی ہوجاؤ گی۔"

"ارے امی! ایک ذرا سا دانت نہ مانجھنے اور حلق صاف نہ کرنے سے اتنی ساری بیماریاں لگ جاتی ہیں؟"

"ہاں بیٹی! ابھی تم چھوٹی ہو جب بڑی ہوگی اور اسکول میں پڑھنے جاؤگی۔ تو تم کو یہ ساری باتیں خود بخود معلوم ہوجائیں گی۔"

"ارے اتنا نقصان ایک ذرا دانت نہ صاف کرنے سے میرے اللہ میں تو روز اپنے دانتوں کو منجن اور برش سے مانجا اور حلق میں پانی لے کر غرارہ کرنا کبھی نہ بھولوں گی۔"

ہاں منی بیٹی! یہ تو بہت ضروری کام ہے۔ بے حد ضروری۔

بقایا صفحہ ۲۱

نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر وہی ساری علامتیں موجود ہیں جن کا دمنک نے ابھی کچھ دیر پہلے ذکر کیا تھا۔ پنگ لک کو غصے میں بھرا دیکھ کر سنجیوک بغیر سلام کیے اس سے ذرا دور ہٹ کر بیٹھ گیا۔ پنگ لک شیر نے آج سنجیوک بیل کے انداز بدلے بدلے دیکھے اس نے دیکھا کہ سنجیوک کے چہرے پر وہی کچھ آثار موجود ہیں جن کا ابھی کچھ دیر پہلے دمنک اس سے ذکر کرکے گیا تھا۔ دمنک کی بتائی ہوئی باتوں کا خیال کرکے پنگ لک شیر بغیر کچھ پوچھے گچھے سنجیوک بیل کے اوپر ٹوٹ پڑا۔ سنجیوک اس اچانک حملے کے لیے تیار نہیں تھا۔ مگر جب اس نے دیکھا کہ شیر اس پر تلا ہوا ہے تو وہ بھی سینگوں کو تان کر اپنی حفاظت کے لیے تیار ہوگیا۔

ان دونوں کو اس طرح لڑائی کرتے دیکھ کر کرکٹ نے دمنک سے کہا۔ دمنک تونے دو دوستوں کو لڑوا کر اچھا نہیں کیا۔ اب اگر شیر مارا گیا تو ہم کیا کریں گے۔ سچ تو یہ ہے کہ تجھ جیسی ذلیل طبیعت کا وزیر کبھی اپنے آقا کی بھلائی نہیں کرسکتا۔ اب بھی کوئی تدبیر ہو تو کر۔ توڑ پھوڑ اور مارنے مرانے والی باتوں ہی میں بس تیرا دماغ چلتا ہے۔ جس ریاست کا تو وزیر ہوگا۔ وہاں بھلے مانسوں کی پوچھ نہیں ہوگی۔ مگر تجھے نصیحت کرنا بھی فضول ہے۔ اس لیے نصیحت تو اس کو کی جاتی ہے جو اس سے کچھ سیکھ سکے۔ تجھے نصیحت کرکے کہیں میری بھی وہ حالت نہ ہوجائے جو ہنس مکھ چڑیا کی ہوئی تھی۔

دمنک نے پوچھا۔ یہ ہنس مکھ چڑیا کون تھی۔ ذرا مجھے بھی تو سناؤ۔

کرکٹ نے تب ہنس مکھ چڑیا کی کہانی سنائی۔

ہنس مکھ چڑیا کی دلچسپ داستان کے لیے اگلے شمارے کا انتظار کیجیے۔

جناب ظفر ردولوی

اٹونجا اسٹیشن

خیرآباد سے رام نگر کے لیے بس تیار کھڑی تھی۔ تھوڑی دیر میں ہارن کی آواز اور تیز گھڑگھڑاہٹ کے ساتھ رینگنے لگی۔

"امی جان دیکھیے اٹونجا اسٹیشن پر..... یاد رکھیے گا"۔

"اچھا بیٹی" بڑی بی نے جواب دیا۔

یہ دونوں آوازیں بس کے شور میں اس طرح دب گئیں جیسے کوئی ننھی سی چیز بہتے ہوئے ندی کے دھارے میں گر جائے۔

بس اپنی پوری رفتار سے فراٹے بھرتی چلی جارہی تھی۔ جاڑے کا موسم تھا۔ ہر مسافر خاموشی کے ساتھ دبکا بیٹھا تھا کہ یکایک پیچھے سے ایک آواز خاموشی کو توڑتی ہوئی چھا گئی "بیٹا جب اٹونجا آجائے تو بتا دینا"۔

کنڈکٹر نے نرمی سے جواب دیا "اچھا بڑی بی میں بتا دوں گا" "آپ فکر نہ کریں اور بس میں پھر خاموشی طاری ہوگئی اور اندھیرا بڑھنے لگا۔ بجلی کے روشن قمقمے کہیں کہیں اس طرح جھلملا رہے تھے جیسے جگنو چمک رہے ہوں۔ تھوڑی دیر بعد پھر وہی کم زور اور ناتواں آواز فضا میں گونجنے لگی۔

"بیٹا جب اٹونجا آجائے تو بتا دینا"۔

کنڈکٹر نے ذرا ترشی سے جواب دیا۔ ہاں ہاں بڑی بی میں بہرہ نہیں ہوں۔ سارے مسافر کے ہیں۔ مگر میں بھولوں گا نہیں۔

اور بس تیزی سے اسٹیشنوں کو چھوڑتی ہوئی تیز رفتاری کے ساتھ پاگل اور دیوانوں کی طرح بھاگتی چلی جارہی تھی کہ پھر وہی آواز اچانک کانوں میں گونج اٹھی۔

"بیٹا دیکھو اٹونجا آجائے تو بھولنا نہیں"——

اور بس کملاپور - دھرم پور - رحیم گنج کو پار کرتی ہوئی تیزی سے فراٹے بھرتی ہوئی چلی جارہی تھی۔ اس بار بڑی بی کی پیہم تاکید سے سارے مسافر ہنسنے لگے اور ایک ایک کرکے بول اٹھے۔

ایک آواز —— ہاں بڑی بی گھبراتی کیوں ہو؟

دوسری آواز —— عجیب پاگل بڑھیا ہے۔

تیسری آواز —— سٹھیا گئی ہے۔

اور بڑی بی اپنی رضائی میں گٹھری بنی ہوئی پھر خاموش ہوگئیں۔ جیسے انھیں ان سب باتوں سے کوئی سروکار ہی نہ تھا۔

سدھولی اسٹیشن پر بس کی رفتار ذرا دھیمی ہوئی کہ —— بڑی بی پھر چیخ اٹھیں بیٹا اٹونجا"......

اور سب مسافر بڑی طرح ہنس پڑے۔ کنڈکٹر نے ایک زور کی ڈانٹ بتائی۔ کیا پاگل ہوگئی ہے بڑھیا خواہ مخواہ شور کیے جارہی ہے۔

اور پھر بس میں خوب چہ می گوئیاں ہونے لگیں۔ رات دھیرے دھیرے بڑھنے لگی۔ جیسے جیسے رات بڑھتی سردی میں

اضافہ ہوتا جاتا۔ تھوڑی دیر بعد ہر ایک مسافر اونگھنے لگا بسفر
میں تو لوگ دن کو سو جاتے ہیں۔ یہ تو رات میں اور وہ بھی جاڑے
کی رات۔ کنڈکٹر نے بھی دن کی تھکن کو دور کرنے کے لیے چند لمحوں
کو خوشگوار بنانے لگا۔ اور بس ہواؤں میں فراٹے بھرتی ہوئی تاریکی
کو چیرتی ہوئی تیز بھاگتی ہوئی ایک زور کے دھچکے کے ساتھ
رک گئی۔ سارے مسافر چونک پڑے۔

ایک مسافر کی آواز ——— ارے لو ڈالی گنج آگیا۔

دوسرے مسافر کی آواز ——— نہیں نہیں یہ ڈالی گنج نہیں ہے۔

تیسرے مسافر کی آواز ——— ہاں ہاں یہ ڈالی گنج کی چنگی ہے۔

ڈرائیور کی آواز ——— ارے کنڈکٹر سو رہا ہے۔

چوتھی آواز ——— کنڈکٹر صاحب! کنڈکٹر صاحب!
اٹھیے اٹھیے چنگی آگئی۔

کنڈکٹر کی آواز ——— اچھا! اچھا! اور جمائی لیتے ہوئے
اوہ کہتا ہوا اٹھ بیٹھا۔

پھر وہی چوتھی آواز ——— کیا بڑی بی اٹونجا پر اتر گئیں۔

کنڈکٹر ——— بوکھلائے لہجے میں۔ ارے اٹونجا
تو گذر گیا اب!

ایک عورت کی آواز ——— ہائے رام چہ۔ چہ۔ چہ یہ کیا ہوا!

سارے مسافر گھبرا کر کنڈکٹر پر ایک دم سے برس پڑے۔

کنڈکٹر صاحب ——— یہ آپ کا بہت بڑا جرم ہے۔

پھر ایک آواز ——— آپ کو اس کی سزا ملے گی۔

پھر کڑکتی ہوئی آواز ——— آپ اس نوکری کے قابل نہیں ہیں۔

اور بے چارا کنڈکٹر ایک ایک سے معافی مانگ رہا تھا۔
اس کا چہرہ مستقبل کے خطرہ کی گھبراہٹ سے پیلا پڑ گیا تھا۔

ایک مسافر کی آواز ——— آخر اس بڑھیا کا کیا حشر ہوگا

دوسرے مسافر نے گرجتے ہوئے کہا۔
واپس ہوگی۔

دو آوازیں ایک ساتھ ——— بس واپس کرو۔

ساری آوازیں ایک ساتھ ——— ہاں ہاں بس واپس کرو۔

اور بس واپس کرو کی بازگشت میں بس پھر واپس دوڑ
رہی تھی اور ہوا کی طرح تیز۔ بہت تیز اندھیرے میں گم ہوتی چلی جا رہی
تھی۔ اور سارے مسافر بول رہے تھے۔ بس کنڈکٹر مجرم کی طرح
خاموش کھڑا تھا۔ اور بڑی بی اپنی رضائی میں لپٹی ہوئی سو رہی
تھیں۔ انھیں کچھ پتہ بھی نہ تھا کہ باہر کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔

بس تیزی سے اپنا سفر واپس لیتے ہوئے پھر اٹونجا
اسٹیشن پر رک گئی۔ مگر بڑی بی اب بھی سو رہی تھیں۔

کنڈکٹر نے بڑی بی کو زور سے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔
و بڑی بی اترو اٹونجا آگیا۔ وہ چونک کر بڑے اطمینان سے بولیں
اچھا بیٹا! اللہ تم کو اچھا رکھے میں اتروں گی نہیں۔ میری بیٹی
نے کہا تھا کہ جب اٹونجا آجائے تو دوا پی لینا ۔۔۔۔۔ ہے
میرا جھولا کیا ہوا۔؟

بس میں پھر ایک بار زور سے قہقہہ گونج گیا۔
بڑی بی اپنی بیٹی کو جگا کر جھولا پوچھ رہی تھیں۔ اور
بس پھر اپنی اسی رفتار سے ——— پیچھے
کو لوٹ رہی تھی ——— لکھنؤ کی طرف ———

جناب اقبال مہدی

ایک دن کیا ہوا

اباجان کے پاس ان کے ایک دوست بیٹھے باتیں
رہے تھے۔ انھوں نے پانی مانگا۔ اباجان نے باہر سے پکار
کہا "سلیم ایک گلاس پانی لانا"۔
سلیم اور سلمہ کھیل میں مصروف تھے۔ سلیم نے
لمہ پر ٹالا "تم لے جاؤ" سلمہ کا جی بھی کھیل چھوڑنے کو
چاہا۔ اس نے کہا "آپ کو پکارا ہے، آپ جائیے" سلیم
راض ہو کر اسے گھورنے لگا۔ اتنے میں امی کی آواز آئی
ن نہیں رہے ہو۔ باہر پانی مانگ رہے ہیں"
سلیم فوراً بولا "امی میرے ہاتھ خراب ہیں۔ سلمہ سے
ہہ رہا ہوں یہ اٹھتی نہیں" امی نے بھی کہا سلمہ! یہ کیا حرکت ہے؟
نی پلانے میں آلکس کرتی ہو! بری بات ہے۔ جلدی جاؤ"
سلمہ پانو پٹختی اٹھی۔ کٹورے میں پانی انڈیل کر
ل دی۔ امی نے ٹوکا "گلاس میں کیوں نہیں لے جاتی ہو"
لمہ نے پانی پھینک کر کٹورا رکھ دیا۔ گلاس میں پانی لینے لگی امی
نے پھر ٹوکا "گلاس دھو تو لیا ہوتا۔ یہ کیا طریقہ ہے؟"
سلمہ اور چنچنائی۔ گلاس دھو کر پھر پانی لیا۔ دھیان
ب بھی کھیل میں تھا۔ دو قدم چلی تھی کہ ٹھوکر کھا کر گر پڑی۔
گلاس ٹوٹ گیا۔ امی دونوں کو ڈانٹنے لگیں۔ سلمہ رونے
لگی۔ اتنے میں پھر ابا کی آواز آئی "سلیم! پانی مانگا تھا بیٹے۔"
اب تو سلیم کو اٹھنا ہی پڑا۔ ہاتھ دھوئے
کٹورے میں پانی لیا اور چل دیئے۔ باہر پہنچ

کر کٹورا مہمان کی طرف بڑھا دیا۔
اباجان نے ٹوکا "اور سلام غائب!؟" سلیم
نے ہڑبڑا کر سلام کیا۔ کٹورا مہمان کو دیتے ہوئے ہاتھ
ہل گیا۔ کٹورا لبالب بھرا ہوا تھا۔ اس میں سے پانی چھلک
کر مہمان کے کپڑوں پر گر گیا۔
سلیم، ابا اور مہمان تینوں چونک گئے۔ کسی کو
پانی پیش کرنے کا یہ کون سا طریقہ تھا! آخر مہمان نے کہا "کوئی
بات نہیں" اور کٹورا سلیم کے ہاتھ سے لے لیا۔ اباجان
نے کہا "اتنا بھر کر پانی لاتے ہیں؟ کم ہوتا تو دوبارہ دیا جا سکتا تھا"
مہمان پانی پیتے ہوئے ٹھٹھکے۔ پانی صاف نہ
تھا۔ اس میں کچھ پڑا ہوا تھا۔ ابا نے دیکھا کٹورے کے باہر
بھی کچھ مٹی لگی تھی۔ انھیں بہت برا محسوس ہوا۔ مہمان
کے سامنے شرم بھی آئی۔ ان کا بیٹا اتنا بڑا ہو کر بھی مہمان کو
سلیقے سے پانی تک نہیں پیش کر سکتا"
مہمان کی موجودگی اور سلیم کی گھبراہٹ اور شرمندگی
دیکھ کر انھوں نے صرف اتنا ہی کہا "صاف برتن میں پانی
دیکھ کر لاتے ہیں۔ اور اتنا بھر کر نہیں لاتے۔ جاؤ۔ اسے
پھینک کر دوبارہ پانی لے آؤ۔۔۔ اور یہ حلیہ کیا بنا رکھا ہے؟
ہاتھ پاؤں، کپڑے، بال۔ سب خراب کیے ہوئے ہو۔"
سلیم شرمندہ سا ہو کر گھر میں آیا۔ امی سلمہ کی بدسلیقگی
پر پہلے ہی اسے کہہ سن رہی تھیں۔ اب وہ ناراض ہو گئیں۔

سالنامہ ملا

محب محترم

سالنامہ اور اس کے بعد فروری کا شمارہ بھی نظر نواز ہوا۔ شکریہ قبول فرمائیے۔ سالنامہ کا سرورق آشنا دیدہ زیب تھا کہ فوراً چھینا جھپٹی شروع ہو گئی۔ غنیمت کہ قومی ہم آہنگی کا تصور کام آگیا اور فیصلہ یہ ہوا کہ سرورق دیکھ کر رسالہ مجھے واپس دے دیا جائے اور میں اسے شروع سے بہ آواز بلند پڑھنا شروع کر دوں اس پر بھی میرے کاندھے میری گردن اور میری چندیا پر (بقول مخدوم) سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے۔ کوئی اس شانہ پر جھکا ہوا تھا۔ کوئی اس کندھے پر سے جھانکتا تھا۔ ہم نے بھی اس کا بدلہ نکال ہی لیا۔ جب میں تھک گیا تو اب دوسروں کی باری تھی کہ گرمیٔ تنفس بھگتیں۔ مبارکباد قبول ہو۔ مضامین، نظمیں، غزلیں، معلومات اور لطیفے سب کے سب اچھے ہی نہیں بہت اچھے تھے اور تین سال سے لے کر تیس بیاتیس سال تک سبھی کے ذوق کی چیزیں اس سالنامہ میں موجود ہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ ہر مہینے سالنامہ نکالا کریں!

رمزم، ارحم، انعم اور حشم سلمہم۔ بلکہ سلمہان! بھی عقیدت پیش کرتے ہیں۔ اگلے سال ... تک زندہ رہا تو اللہ نے چاہا ان کا ایک گروپ بھیجوں گا پیام تعلیم کو۔

کارکنان کو بھی مبارکباد دے دیجیے۔

حکیم یوسف حسین خاں حیدرآباد

اب کے آپ نے سالنامہ بڑی آب و تاب کا نکالا۔ دیکھ کر طبیعت خوش ہو گئی۔ سرورق پرکشش ہے اور مضامین اور نظمیں بہت سی ہیں۔ مختلف قسم کی ہیں اور سب اپنے رنگ میں خوب۔ ماشاء اللہ چشم بددور! یہ آپ نے بہت اچھا کیا کہ ہر قسم کے مضامین شامل کر دیے تاکہ گوناگوں فوائد حاصل ہو سکیں اور لطف و تفریح بھی بچوں کو حاصل ہو۔ رسالہ کا سائز بڑا کر دیا یہ بھی خوشگوار تبدیلی ہے۔ اگر آئندہ آپ نے صفحات نہ کم کیے تو رسالہ میں زیادہ مضامین شایع ہو سکیں گے ہر سال آپ بہتر سے بہتر سالنامہ نکال رہے ہیں یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوتی ہے۔

نورالحسن ہاشمی

(چیرمین شعبۂ اردو فارسی لکھنؤ یونیورسٹی)

"پیام تعلیم" کا سالنامہ ملا۔ آپ نے بہت اچھا کیا کہ پیام تعلیم کا پچھلا سائز بحال کر دیا۔ یہ "سلک اسکرین" پر چھپا ہوا ٹائٹل بھی خوب اور بہت خوب ہے۔ داد سے مستغنی

میں خود دے لوں گا اپنی داد میں بھی کیا قیامت ہوں!

نظمیں اچھی ہیں، کہانیاں اچھی ہیں، مضامین اچھے ہیں، کن کن کی تعریف کروں۔

آپ نے سالنامے کے ایک سو چوراسی صفحوں کے اندر بچوں کی دلچسپی کی ایک دنیا ہی آباد کر دی ہے۔

سالنامے کی لکھائی اچھی، چھپائی اچھی، گٹ اپ اچھا، تصویریں مضمون نگاروں کی، تصویریں مضامین سے تعلق رکھنے والی، پیارے پیارے معصوم بچوں کی سب اچھی،

ہمارے ملک میں بچوں کے اور بھی اردو رسالے نکلتے ہیں۔ آپ کی خوشامد اور چاپلوسی مقصود نہیں "پیام تعلیم" جیسا اچھا صالح صحت مند رسالہ ایک بھی نہیں نکلتا۔

"پیام تعلیم" کے ایسے شاندار، خوبصورت، صالح اور صحت مند ادب سے بھرے ہوئے سالنامے کی اشاعت پر

ی طرف سے اور اپنے تمام بچوں کی طرف سے آپ کی خدمت میں
ی مبارک پیش کرتا ہوں۔ سید مبارز الدین رفعت
ریڈر و صدر شعبۂ اردو۔ مہاراشٹر کالج

"پیام تعلیم" کا سالنامہ ملا۔ ۴۵-۴۴-۴۶ سے میں "پیام تعلیم"
پڑھ رہا ہوں اور اس کے لیے لکھ رہا ہوں، لیکن ایسا جوش و خروش
جیسا آج کل میں پا رہا ہوں ایسا کبھی نہیں تھا، کس قدر شاندار سالنامہ
نکالا ہے آپ نے۔

سائز آپ نے بڑا کر دیا یہ اچھا کیا، پہلے بھی یہی سائز
تھا۔ مضامین، کہانیاں، نظمیں سب کی سب لاجواب ہیں، ڈرامہ میرا
نہ ہوتا تو اس کی بھی تعریف کرتا۔

سب سے زیادہ خوبصورت ہے ٹائٹل پیج، بڑے بڑے
رسالوں کے آج کل ایسے پیارے ٹائٹل پیج نہیں ہوتے، رنگوں
کا خوب انتخاب ہے، خوب امپوزنگ ہے۔

اطہر افسر (آل انڈیا ریڈیو حیدر آباد)

سالنامہ آپ نے ایسا نکالا کہ بچے خوش ہوئے ہوں گے
اور مجھے افسوس ہوا، اس بات کا کہ میں اتنے اچھے شمارے میں شریک
نہیں ہو سکا۔ اس کی صورت بھی دلکش ہے اور کردار بھی قابلِ رشک،
مبارکباد قبول کیجیے۔ شمیم حنفی

اکتوبر ۱۹۶۶ء سے ہمارے مکتبہ شمع اردو مئوناتھ بھنجن میں
باقاعدگی سے "پیام تعلیم" کی دس کاپیاں ہر ماہ آتی ہیں۔ خریداری
کے اس مختصر سے وقفے میں اس کے دو خاص نمبر "ذاکر نمبر" اور "سالنامہ
۱۹۶۸ء" نظر نواز ہوئے۔ واللہ اس کی صوری اور معنوی خوبیاں دیکھ کر
دل باغ باغ ہو گیا۔ مضامین میں مناسب تنوع طباعت میں
رکھ رکھاؤ اور زبان تو ماشاء اللہ آپ کو شرمندہ کرتی ہے۔

میں تو اس کے مطالعہ کے وقت خود بچہ بن گیا اور اتنی دلچسپی اور
انہماک سے پڑھتا ہوں۔ جیسے پرانے پیامی اسے پڑھے بغیر کھانا
بھی نہیں کھاتے۔ انیس ادیب
(لکچرر دارالعلوم عربک کالج مئو)

سالنامہ ملا۔ اس کا سرورق بہت خوبصورت ہے
اردو میں تو یقینی اس طرز کی طباعت کی ابتدا "پیام تعلیم" ہی نے کی
ہے اور تو کہیں نظر نہیں آتی۔

مضامین میں جہاں تک موضوعات کا سوال ہے۔ ہر
موضوع پر اس بار معیاری مضمون موجود ہے۔ رام لعل اور سہیل عظیم
آبادی تو مانے ہوئے ادیب ہیں۔ باقی مضامین بھی بہت خوب ہیں
قیصر سرمست صاحب ایک اچھے مصور اور ادیب ہیں۔ ان کا مصور
مضمون دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ اس کے علاوہ مشغلات
HOBBIES پر بوتل میں چمن اور جناب خالد عرفان صاحب
کا مضمون چیونٹیوں کا شہر، لکڑی کے لٹھے سے ایٹمی ہماری تک
بچے شوق سے پڑھیں گے اور اس سے سیکھیں گے بھی آپ نے
شکاریات اور فلم کے موضوع کو بھی نہیں چھوڑا اور اس سلسلے میں
بھی دلچسپ اور معیاری مضامین بچوں کے لیے منتخب کیے۔

غرض سالنامہ بے مثال ہے آپ کو حالی خرلی مبارکباد
ہی نہیں ایک عدد خریدار بھی نذر کر رہا ہوں۔
حمید عثمانی الٰہ آباد

سالنامہ اور فروری کا شمارہ ایک ساتھ رجسٹری سے
ملے۔ اس نوازشِ خاص کا دلی شکریہ! درحقیقت یہ سالنامہ بے حد
شاندار ہے صوری و معنوی دونوں لحاظ سے۔ ٹائٹل، کتابت
طباعت بھی خوبصورت اور نظمیں، کہانیاں، ڈرامے اور مضامین بھی
(دو ایک کو چھوڑ کر) سب کے سب حسین۔ ترتیب و تدوین

بھی نہایت باسلیقہ ہے۔

میری طرف سے اس شاندار اور حسین سالنامہ کی اشاعت پر دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔

واحد پریمی

ماہنامہ "پیام تعلیم" کا سالنامہ ملا۔ شکریہ۔ مصروفیت کے باعث ابھی پورا پڑھ نہیں سکا ہوں۔ آپ نے بہت اچھا سالنامہ نکالا ہے اور یہ کوئی نئی بات نہیں یہ تو پیام تعلیم کی روایت ہے۔

رضوان احمد بارہ بنکوی چیف ایڈیٹر زیور، پٹنہ

آپ سالنامہ نکالیں اور میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے پرچے کا انتظار کروں؟ ناممکن۔ دوسروں کے پاس سے لے کر پڑھا۔ اور دل ہی دل میں آپ کو دعائیں دیں۔ ابھی بہت کچھ پڑھنا ہے۔ جو پڑھا اس میں اقبال متین صاحب کی تخلیق "مجھے پہچانو" بہت ہی زیادہ پسند آئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال متین نے اُردو زبان کو ذریعہ بنا کر اپنے جگر گوشوں کو اُردو پڑھنے کی طرف راغب کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں درد ہے، تڑپ ہے، محبت ہے اور وہ سب کچھ ہے جو ہونا چاہیے۔ کاش کے ہندوستان کے پیارے پیارے بچے اقبال متین کی آواز پر کان دھریں اور دوسری زبانوں کے ساتھ اُردو کو بھی اپنا اوڑھنا بچھونا بنائیں اور اپنے آباؤ اجداد کے اُردو ادب کی صورت میں چھوڑے ہوئے خزانے کے پاسبان بننے کے قابل بنیں۔ آمین ثم آمین۔

قیصر سرمست

"پیام تعلیم" کا سالنامہ دیکھا، آپ نے اس کا ٹائیٹل سلک اسکرین پراسس سے چھپوایا ہے بہت عمدہ معلوم ہوا۔ اس طریقے پر ٹائیٹل وغیرہ کافی چھپتے رہے ہیں۔ لیکن جو بات اس میں ہے، وہ بہت کم ٹائیٹلوں میں دیکھنے میں آتی ہے۔ اس قسم کی چھپائی ہندوستان ہی میں نہیں غیر ممالک میں بھی ہندوستانی فن طباعت کا سر بلند کر سکتی ہے۔ آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

مظہر۔ فائن پریس دہلی۔

اتنا شاندار سالنامہ نکالنے پر میری طرف سے مبارکباد قبول فرمائیے۔

خورشید شیدائی۔ کلکتہ

"پیام تعلیم" کا سالنامہ کئی روز پہلے ہی موصول ہو چکا تھا لیکن شرمندہ ہوں کہ رسید تک سے مطلع نہ کر سکا۔ وجہ گذشتہ ماہ کی مشین جیسی مصروف زندگی تھی برا مت مانیے گا۔

اب کی بار سالنامہ ایک نئے ڈھنگ سے سجا سنورا ہوا ہے۔ بیشتر کہانیاں، مضامین، نظمیں وغیرہ خوب ہیں۔ اس بار ملک کے چند چیدہ قلم کاروں کے نام پہلی بار پرچے میں شریک ہوئے ہیں۔ یہ بڑی اچھی بات ہے۔ یہ مبارک سلسلہ جاری رکھنا چاہیے۔

ڈاکٹر کیول دھیر

سالنامہ پیام تعلیم کا سرورق دیکھتا ہی رہ گیا۔ آپ نے جو جدید طرز کی چھپائی سے سرورق کو نکھارا ہے قابل صد ستائش ہے کاش دوسرے بڑے ادارے بھی بچوں کے رسائل کو خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش کرتے۔

محمد یوسف

(اُردو کوکنگ مالی گاؤں)

جیسے ہی سرورق پر نظر پڑی دل باغ باغ ہو گیا۔ سرورق بہت ہی عمدہ ہے۔ ٹائیٹل پر ہی کیا منحصر ہے۔ سالنامہ کا مواد بلکہ ہر ہر چیز ہی قابل تعریف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی کوششوں کو عظیم کامیابی عطا فرمائی۔ مبارکباد قبول فرمائیے۔

ایم۔ این۔ خاں (رامردہوی)

۴ر جنوری کو سالنامہ ملا۔ ٹائیٹل ہی دیکھ کر طبیعت خوش ہو گئی۔ مضامین کی لمبی چوڑی فہرست دیکھ کر یہ خوشی اور بڑھی اور پورا سالنامہ پڑھ کر تو مزہ آگیا۔ غالب نے آموں کی تعریف یہ کی ہے کہ بہت سے ہوں اور میٹھے ہوں۔ اسی بات کو میں ایک سالنامہ کی تعریف میں اس طرح استعمال کرتا ہوں کہ اس میں مضامین بہت سے ہوں اور اچھے ہوں۔ پیام تعلیم کے سالنامہ میں یہ دونوں خوبیاں ملیں۔ اور اس لیے میرے خیال میں اسے ایک اچھا سالنامہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ سالنامہ بلاشبہ یہ ظاہر کر رہا ہے کہ "پیام تعلیم" بڑی تیزی سے ترقی کی راہ پر بڑھ رہا ہے۔ پچھلے سالنامہ سے مقابلہ کیجیے تو زمین آسمان کا فرق نظر آئے گا۔

خلیق انجم اشرفی (دہلی)

"پیام تعلیم" کا دلکش و دل افروز تحفہ سالِ نو ۱۹۶۰ء موصول ہوا۔ سب سے پہلی خوشی تو پیام تعلیم کا ٹائیٹل دیکھ کر ہوئی۔ ٹائیٹل آرٹ کے حسن فن اور جدت پسندی کا بہترین نمونہ ہے۔ مبارک ہو تصاویر بھی اپنی جگہ خوب تر ہیں۔ اس دفعہ واقعی بہت سے نئے اور مقتدر بلند پایہ فن کاروں کو جلوہ گر دیکھ کر مسرت ہو رہی ہے بھارت کے یہ بلند فن کار بزمِ "پیام تعلیم" میں پورے وقار اور شان و شوکت کے ساتھ اپنی اپنی فکر تازہ کے ساتھ منظر عام پر آگئے ہیں۔

مہر ورولوی (تھانہ)

طبیعت خوش ہو گئی۔ سرورق کی پرکاری نے دل موہ لیا۔ پھر ایک سے ایک بڑھ کر مضامین نظر آرہے ہیں۔ دنیا بھر کے موضوعات پر آپ نے مضامین اکٹھا کیے ہیں۔ آپ کے عزم جواں کا ایک بار پھر قایل ہونا پڑا۔ کوئی نمبر نکالنے کا گر آپ سے سیکھے سہیل عظیم آبادی صاحب سے بھی آپ نے لکھوا لیا بڑی خوشی ہوئی۔

مناظر عاشق ہرگانوی۔

"ذاکر نمبر" اور سالنامہ نظر نواز ہوا۔ واللہ بے مثال تھا۔ "ذاکر نمبر" کو نکلے عرصہ ہوا۔ مگر سالنامہ کا خیال ابھی تازہ ہے سالنامہ کا سرورق بہت اچھا ہے۔ یوں تو سبھی مضامین اچھے ہیں۔ مگر "میں ایک بڑا بھائی ہوں" اس قلمکار نے میرے گھر کا نقشہ کھینچ دیا ہے۔ جس سے ہم سب گھر والوں کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ میرے دو چھوٹے بھائی ہیں، عبدالعزیز مقبول اور نظام محمد سعید دونوں طالب علم ہیں۔ دونوں نے سالنامے سے جاکر اپنے ساتھیوں کو دیے اور تاکید کی کہ خصوصاً "ہمارے گھر کا واقعہ" "میں ایک بڑا بھائی ہوں" ضرور پڑھیں۔

محمد صالح۔ امباجی درگ

سالِ نو کا حسین تحفہ موصول ہوا۔ شکریہ

بھئی! اب کے برس رسالے کی ضخامت میں اضافہ اور مختلف قسم کی تبدیلیوں کو دیکھتے ہوئے یہ سمجھنے لگا ہوں کہ خدا کے فضل و کرم سے "پیام تعلیم" کو اچھی خاصی ترقی نصیب ہوتی جا رہی ہے — میں تو یہ سمجھوں گا کہ اس سلسلے میں آپ کی انتھک کوششوں کی جس قدر بھی تعریفیں کی جائیں کم نہیں۔

محمد شفیع تمنا (کلکتہ)

"پیام تعلیم" کا سالنامہ ملا۔ سب سے پہلے تو ٹائیٹل پر نظر جم کر رہ گئی۔ کچھ دیر جی بھر کے ٹائیٹل کو دیکھنے کے بعد جب اندر دیکھا تو اس کی رنگینیوں میں کھو گیا۔ اس کا خوبصورت سائز تو "پیام تعلیم" کی روز بروز ترقی کا ضامن ہے۔ خدا اسے نظر بد سے بچائے۔

اعجاز اختر اندور

پیام تعلیم کا سالنامہ دیکھا اتنا بہترین اور دلکش ٹائیٹل میں نے اپنی زندگی میں آج تک دیکھا۔ ہیں سالم برہوشا۔ وجامعہ بائی سکنڈری

مجھے سالنامہ پا کے اتنی خوشی ہوئی جس کی حد نہیں۔ مجھ کو ٹائیٹل بھی بہت پسند آیا۔ محمد علیم اللہ خاں جشعلم ہفتم

بڑوں کی کوششیں

تعلیمی سیر

ایک دن تھا جب ہم ٹور پر جانے کی خوشی میں جھوم رہے تھے اور آج اس بیتے دن کا ذکر ہے۔

وہ دن بھی آیا اور ہیں اپنے دوستوں کے ساتھ سیر کو گئی رات کا وقت قریب دس بجے تھے۔ ہم سوار ہوئے اپنے اس چلتے پھرتے گھر میں جو صرف دس دن کے لیے ہمارا بنا تھا۔

سیر کی پہلی منزل آگرہ تھی۔ آگرے کے تاج محل کا ہر ایک پتھر پرانے ہندوستان کی کہانی کہہ رہا تھا۔ ممتاز کی یادگار میں کھڑی اس خوبصورت عمارت کے چاروں طرف کھڑے ہو کر فوٹو لے کر ہم نے بھی تعلیمی سیر کی یادگار بنالی۔

دوسرا دن نکلا گھر سے نکلے ہوئے راہی چل پڑے انجان راستوں پر۔ پوچھنے پر پتا چلا کہ ہم اجنتا کے غاروں میں گھوم رہے ہیں شام ہماری اورنگ آباد کے بازاروں میں گذری۔ کہنے کو تو وہ شام کا وقت تھا لیکن چاند کی روشنی سے سارا شہر ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے رات کی رانی کا انتظار کر رہا ہے۔

آئیے اب دیکھیے بمبئی ہماری سیر کی آخری منزل سہ پہر ہم بمبئی کی لمبی چوڑی سڑکوں پر ٹہل رہے تھے۔ ہندوستان کے اس بڑے شہر کی اونچی عمارتیں مکانات خوب صورت باغ و بازار شہر کے بڑے نام کو اور بڑھا رہے تھے جو ہوتٹ (سمندر کا کنارہ) کا نظارہ تو میں نہ زبان سے کہہ سکتی ہوں اور نہ ہی میرے قلم سے بیان ہو سکتا ہے۔ بمبئی کی ایک ایک گلی میں بولی بدل جاتی ہے بھاشا بدل جاتی ہے لباس بدل جاتا ہے۔ اسی کو کہتے ہیں انیکتا میں ایکتا۔ (کثرت میں وحدت)

دیا کوشک
بیسک دوسرا سال جامعہ

بس ایک کپ

ایک دن میں اردو پر مضمون لکھنے بیٹھی۔ کیا لکھوں کس پر لکھوں۔ اپنی کہانی۔ کسی کی کہانی۔ پھر کیا کیا جائے سوچا کسی رسالہ میں سے کیوں نہ اتار لیا جائے لیکن آتما نے گواہی نہ دی یہ مجھے اچھا نہیں لگا کہ میں اپنے خیال نہ لکھوں اچانک پیچھے سے آواز آئی فوراً دھر دیکھا تو ٹھنڈی تیز ہوا کی وجہ سے دروازہ سنسنا رہا تھا۔ سوچا آج کہانی نہیں لکھی جا سکتی۔ بات یہ تھی کہ ماسٹر صاحب کے کہنے پر ایک واقعہ (کہانی) لکھنی تھی۔ پر لکھنے کو من نہیں کر رہا تھا۔ اس لیے سوچا کہ ایک کپ چائے ہی پی لوں تو شاید لکھنے کا موڈ بنے یہ سوچ کر میں نے سٹو پر چائے چڑھا دی۔ چائے ابھی بن بھی نہ پائی تھی کہ سٹو فیل ہو گیا۔ دیر تک عقل دوڑائی لیکن اسے بھی آج ٹھیک نہیں ہونا تھا۔ پھر اٹھ کر سرلا دیدی کو جگایا تب جا کر سٹو ٹھیک ہوا ایک کپ چائے پی تب کہیں جا کر کہانی لکھنے کا موڈ بنا۔ پر واقعہ میری سمجھ میں نہ آیا۔ اتنے میں خیال آیا کہ بچوں کے لیے چائے کی کہانی لکھوں۔ تب میں نے چائے کی کہانی لکھ ڈالی۔

چلئے اتنا تو ہوا اور کوئی کہانی نہ سہی چائے کی کہانی ہی سہی۔

شاردا شرما
بیسک دوسرا سال جامعہ

قلمی دوستی

نام :- محمد یوسف تخلص وانی عمر ۱۵ سال
مشغلہ :- قلمی دوستی، ڈاک ٹکٹ جمع کرنا، کرکٹ کھیلنا
موٹر اور سائیکل چلانا، مذہبی کتابیں پڑھنا۔
پتہ :- محمد یوسف وانی، بسنت باغ کشمیر

نام :- سید آزاد عالم عمر ساڑھے چودہ سال
پتہ :- ۵ روشن گلزار لین بلیلیرا روڈ ہوڑا
مشغلے :- ڈاک کے ٹکٹ جمع کرنا، قلمی دوستی کرنا، بیڈ
منٹن کھیلنا، اردو کی ترقی کے لئے اردو کا ہر
رسالہ منگوانا۔

نام :- غزالہ غزل عمر ۱۴ سال
پتہ :- معرفت پروفیسر اظہر حسین
محلہ منڈی کشور خاں شہسرام (شاہ آباد)
مشغلہ :- قلمی دوستی، شعر و شاعری کرنا، افسانہ لکھنا
بھائی بہنوں کے خط کا پابندی سے جواب دینا

نام :- امتیاز احمد انصاری عمر ۱۲ سال
مشغلہ :- مضمون لکھنا، قلمی دوستی کرنا، پیارے بچوں
کے رسالے پڑھنا۔
پتہ :- قاسم پورہ، مئوناتھ بھنجن یوپی

نام :- شیخ حبیب اللہ عمر ۱۶ سال

پتہ :- آٹھویں جماعت، اردو مڈل اسکول پارسی
ناکلی، ضلع آکولہ (مہاراشٹر)
مشغلہ :- نئے رسالوں کو پڑھنا۔ قلمی دوستی کرنا، والی
بال کھیلنا، تعلیمی کاموں میں دلچسپی لینا۔

نام :- محمد یوسف عمر ۱۵ سال
مشغلہ :- پیام تعلیم اور دوسرے رسائل پڑھنا، ڈاک
ٹکٹ جمع کرنا، فٹ بال کھیلنا اور قلمی دوستی کرنا
تعلیم :- دسویں
پتہ :- گورنمنٹ بوئیس ہائی سیکنڈری اسکول
کلاس دسویں (بی) پورٹ بلیر - انڈمان

نام :- نفیس احمد نایاب عمر ۱۴ سال
مشغلہ :- پیام تعلیم پڑھنا، رسالے پڑھنا، کبڈی کھیلنا
نماز پڑھنا، قلمی دوستی کرنا
پتہ :- نفیس احمد نایاب کیر آف اے۔ ایس اختر
متصل لال مسجد لائن نمبر ۱۵ ہلدوانی ضلع نینی تال

نام :- عشرت اعظم خاں عمر ۱۲ سال
پتہ :- عشرت اعظم خاں معرفت ڈاکٹر ابو مظفر خاں
امپیریل میڈیکل ہال۔ اتہاس ضلع شاہ آباد
مشغلہ :- ٹکٹ جمع کرنا، خط و کتابت سے دلچسپی اور پیام تعلیم
کو پڑھنا۔

نام :- جاوید اختر انصاری عمر ۱۴ سال
مشغلے :- ادبی کتابیں پڑھنا، اسلامی کتابیں جمع کرنا۔
پتہ :- جاوید ولد عبد العزیز محلہ قاضی پورہ ٹانڈہ
فیض آباد یوپی۔

(مزاحیہ کہانی، بچوں کے لیے)

غلطی سے اپریل فول

ایک ہیں میاں مٹھو۔ آپ سوچتے ہوں گے یہ میاں طوطے کا نام ہے۔ جی نہیں یہ ایک صاحبزادے ہیں بہت نٹ کھٹ یہ نام ان کی امی اور ابا نے رکھا ہے۔ باتیں ایسی میٹھی کرتے ہیں کہ سننے والے حیران رہ جائیں۔ پر کام ایسے کہ گھر بھر کا دم ناک میں۔ پٹائی بھی خوب ہوتی ہے۔ پر یہ اپنی عادت نہیں چھوڑتے۔

ایک دن کیا ہوا۔ گھر کے سب لوگ پڑوس میں چلے گئے میاں مٹھو کو اسکول کا کام کرنا تھا وہ گھر میں رہ گئے۔ اب سارا گھر ان کے قبضہ میں تھا۔ بہت خوش ہوئے۔ سوچا پہلے ناشتہ کر لینا چاہیے پھر پڑھائی ذرا اطمینان سے ہوگی۔ باورچی خانہ کا رخ کیا۔

چولھے پر دودھ گرم ہو رہا تھا۔ میاں مٹھو نے دودھ پینے کی ٹھان لی۔ شکر کے لیے نگاہیں دوڑائیں اوپر کی الماری میں شکر کا ڈبہ نظر آگیا۔ مگر آپ جانیے تھے تو بہت چھوٹے۔ کیا کریں؟ فوراً ہی باہر بھاگے اور مرغی کا لکڑی والا ڈبہ اٹھا لائے۔ ڈبہ الماری کے نیچے رکھا اور اس پر چڑھ گئے۔ مگر ڈبہ تک ہاتھ نہیں پہنچ رہا تھا۔ شکر کے ڈبے کے اوپر ایک اور ڈبہ بھی تھا۔ ہاتھ دکھنے لگا۔

میاں مٹھو نے سوچا اس طرح کام نہیں چلے گا۔ ایک آخری کوشش کرنی چاہیے پنجوں کے بل کھڑے ہو گئے۔ اور شکر کا ڈبہ پر جھپٹا مارا۔ ڈبہ تو ہاتھ آگیا۔ مگر یہ گیا ——چر۔ چرر۔۔۔ چرررر کی آواز کے ساتھ ڈبہ پیچھے کی طرف گر گیا اور میاں مٹھو بھی گرے۔ سامنے کے دو دانت ہل گئے۔ مگر غلطی اپنی تھی رونا نہیں آیا۔ شکر کا ڈبا تو ہاتھ آگیا مگر اس کے اوپر جو ڈبا تھا اس کا منہ کھل گیا اور وہ دودھ میں گر گیا۔ ڈبے میں کونین کی گولیاں تھیں۔ وہ دودھ میں حل ہو گئیں۔

اب میاں مٹھو کا ماتھا ٹھنکا۔ دودھ پینا بھول گئے۔ جلدی سے مرغی کا ڈبا اپنی جگہ رکھا اور دودھ میں سے کونین کی گولیوں کا ڈبا نکالا مگر گولیوں پر کوئی توجہ نہ دی۔

تھوڑی دیر میں میاں مٹھو باہر آئے تو باورچی خانے کا سامان جوں کا توں تھا۔ دودھ بھی گرم ہو رہا تھا اور میاں مٹھو ہوم ورک کرتے میں سوچ رہے تھے "دیکھیں اب رات کا کھانا ملتا ہے یا نہیں" دودھ میں کونین کی گولیاں حل ہو گئیں تھیں۔ دودھ کیا پیتے امی جان کے ڈر سے شرارتیں بھی بھول گئے۔ بڑے انہماک سے ہوم ورک کرتے رہے۔ شام کے قریب سب لوگ واپس آگئے۔ سب نے دیکھا میاں مٹھو ہوم ورک کر رہے ہیں۔ امی جان بہت خوش ہوئیں۔ میاں مٹھو نے سوچا تھوڑی دیر میں ساری پول کھل جائے گی۔ امی کے غصہ سے کس طرح بچا جائے۔ اچانک ایک ترکیب ذہن میں آئی اعلان کر دیا کہ سر میں درد ہو رہا ہے اور جا کر بستر پر لیٹ گئے۔

شام کے کھانے پر چند مہمان آگئے۔ کھانے کے بعد چائے باہر بھیجی گئی۔ میاں مٹھو یہ سب دیکھ رہے تھے فوراً اچھل پڑے اور بے اختیار زبان سے نکل گیا "اب

مزہ آئے گا۔

"کیا مزہ آئے گا" امّی نے پوچھا۔

"کچھ نہیں امّی جان۔ میاں مٹھو ڈرے اور جھینپ مٹاتے ہوئے کہنے لگے۔

"آج پہلی اپریل ہے۔ آپ میرا جیب خرچ کب دیں گی۔

"تو مجھ سے کیوں مانگ رہے ہو۔ اپنے ابّا جان سے مانگو"

ابھی امّی جان یہ سب کہہ رہی تھیں کہ مہمان خانے سے عجیب وغریب آوازیں آنے لگیں۔ میاں مٹھو فوراً اس طرف بھاگے اور دروازے کی آڑ سے دیکھنے لگے۔ ان کی امّی حیران تھیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اندر تمام مہمان پیٹ پکڑے ہوئے تھے اور بری طرح کھانس رہے تھے۔ میاں مٹھو کے ابّا جان کہہ رہے تھے "آپ حضرات مجھے معاف کر دیں۔ آج نہ جانے چائے کس نے بنائی ہے۔ معلوم ہوتا ہے شکر کی جگہ کسی نے کونین کی گولیاں چائے میں ڈال دی ہیں"

"کونین کی گولیاں... ہائے اللہ" امّی جان اندر بھاگیں۔ ڈبّے میں گولیاں ندارد تھیں۔ انھوں نے پلٹ کر دیکھا تو میاں مٹھو دور کھڑے مسکرا رہے تھے۔

"نالائق۔ امّی جان نے چولھے کی جلتی ہوئی لکڑی اٹھائی۔

امّی جان آپ برا کیوں مانتی ہیں۔ آج یکم اپریل ہے نا۔ میں نے تھوڑا سا اپریل فول بنا لیا تو کیا ہوا۔ ویسے میرا ارادہ نہیں تھا۔ یوں سمجھ لیجیے کہ غلطی سے اپریل فول......

"ٹھہر تو سہی"

میاں مٹھو اب کہاں ٹھہرنے والے تھے۔ فوراً باہر بھاگ گئے۔ مگر میاں مٹھو کی امّی جان "غلطی سے اپریل فول" کا مطلب نہ سمجھ پائیں۔ محمد عبدالعلیم صدیقی

انصاف

بہت پرانے زمانے کی بات ہے ایک بادشاہ تھا جس کا نام شیر دل تھا۔

ایک بار اس کی ملکہ کو شہر کا وہ باغ دیکھنے کی تمنا ہوئی۔ جسے بادشاہ نے حال ہی میں تعمیر کرایا تھا۔ ملکہ وہاں گئی تو حوض کو دیکھا اور بادشاہ سے کہلوایا کہ میں یہاں نہاؤں گی۔ شیر دل نے اجازت دے دی۔

ملکہ نہانے لگیں تو ٹھنڈ لگی۔ ملکہ نے حکم دیا کہ مالی کی جھونپڑی جلاؤ تاکہ سردی دور ہو۔

کنیز نے کہا۔ ملکہ حضور بھلا ایک غریب کی جھونپڑی۔ یہ آپ کو زیب نہیں دیتا۔

ملکہ۔ مابدولت کا حکم ہے یہ گھاس پھوس کی جھونپڑی میرے سامنے کیا حقیقت رکھتی ہے؟ جلاؤ۔

کنیزوں نے مجبور ہو کر جھونپڑی میں آگ لگا کر ملکہ کی ضد پوری کی اور سردی دور کی۔

صبح کو مالی دربار میں روتا پیٹتا داخل ہوا اور ساری بات سنائی۔ شاہ کے جلال کی انتہا نہ رہی اور اس نے حکم دیا کہ ملکہ کو پکڑ کر یہاں لے آؤ۔

ملکہ کے آنے پر بادشاہ نے یہ حکم سنایا کہ ملکہ جس طرح تو نے غریب کی جھونپڑی جلائی۔ سال بھر بھیک مانگ کر اس کو بنا شاہ کے حکم سے ملکہ کے زیور اور کپڑے اتار کر بھکارن بنا دیا گیا۔ آخر کار جب سال بھر بعد ملکہ دوبارہ ملکہ بنی تو وہ جان چکی تھی کہ "گھاس پھوس کی ان جھونپڑیوں کی بھی کوئی قیمت ہے۔

سید حسن مرادآباد

نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی غریبانہ زندگی

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی کی ایک دلیل یہ بھی

ہے کہ آپ نے نہایت فراخی اور خوش حالی کے زمانہ میں بھی عیش و
آرام کی زندگی نہیں گزاری ۔حالت یہ تھی کہ کئی کئی دن چولھا نہیں
جلتا تھا ۔گھر میں پکنے کو کچھ بھی نہ ہوتا تھا ۔ایسے میں بھی کہیں سے
ہدیہ آگیا تو اسے دوسرے ضرورت مندوں کے گھر بھجوا دیتے اور
خود بغیر کھائے پیئے رہ جاتے ۔آپ کو تنگی اور فراخی دونوں دور
سے گذرنا پڑا لیکن دونوں صورت میں آپ کی زندگی کا انداز وہی
ایک سا رہا ۔اس میں ذرہ برابر بھی فرق نہ آیا ۔آپ اکثر یہی دعا کرتے
کہ یا اللہ مجھے غریب ہی زندہ رکھ اور غربت ہی میں موت دے ۔

محمد امین الدین (گیا)

ایک مرتبہ میں شام ہوتے ہی کپڑے وغیرہ پہن کر سیر
کے لیے اسٹیشن کی طرف چل پڑا ۔میرے ساتھ میرے چھوٹے بھائی
بھی تھے ۔اسٹیشن پر تو بہت اچھے اچھے کھلونوں کی دکانیں ہیں ۔
انھیں دیکھ کر میرے بھائی ضد کرنے لگے کہ آپ ہمیں کھلونے لے
دیجیے آخر سب بھائیوں کو ایک ایک کھلونا دلوا دیا اور پھر ہم
لوگ مسافر خانے میں آکر بیٹھ گئے ۔مسافر خانے میں بہت سے آدمی
بیٹھے تھے جن میں ایک آدمی سب سے الگ بیٹھا ہوا کوئی کتاب
پڑھ رہا تھا وہ ان میں سب سے زیادہ پڑھا لکھا اور مہذب معلوم
ہو رہا تھا ٹیریلین کی بش شرٹ اور ٹیریلین کی چست پتلون پہنے
ہوئے تھا اور گلے میں ہلکے نیلے رنگ کی ٹائی لٹک رہی تھی جو اور
زیادہ خوب صورت لگ رہی تھی ۔چوڑی پیشانی، بال سنوارے ہوئے
بیٹھا تھا ۔میں نے اپنے دل میں سوچا کہ ہوسکتا ہے کہ یہ کوئی بڑا
آدمی ہو ۔میں مسافر خانے میں بیٹھ کر اخبار پڑھنے لگا ۔تھوڑی دیر کے
بعد وہ آدمی وہاں سے اٹھ کر چلا گیا ۔پھر میں بھی وہاں سے اٹھ کر
باہر آگیا

ہم ادھر ادھر گھومنے پھرنے لگے ۔میری نظر اٹھی
تو دیکھا کہ وہ آدمی کھڑا ہے ٹھیک اسی وقت ایک
بوڑھی عورت آئی اس کے ہاتھ میں ایک پرچہ تھا ۔اس نے اس
جن ٹل مین کی طرف دیکھ کر کہا ۔بیٹا یہ کاغذ کیسا ہے آج دوپہر کو
ڈاکیہ دے کر گیا ہے ۔ذرا بتانا بیٹا اس کے اندر کیا لکھا ہے اور یہ
کہاں سے آیا ہے ؟

اس آدمی نے اس کاغذ پر ایک نظر ڈالی اور پھر
اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے ۔

بوڑھی عورت نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور
رو دینے والے انداز میں بولی ۔

کیوں بیٹا کیا بات ہے کیا اس کے اندر کوئی مرے
کی خبر ہے ۔یہ کہتے ہی اس کی آنکھوں میں سے بھی آنسو جاری ہوگئے ۔

اری بوا میں ان پڑھ ہوں ۔مجھے اس وقت بہت شرم آرہی
ہے ۔اسی لیے میری آنکھوں میں غیرت کے مارے آنسو آگئے ۔

بوڑھی عورت کا لہجہ ایک دم بگڑ گیا اور اس نے
چیخ کر کہا ۔بڑے آئے ہیں سوٹ بوٹ پہن کر ۔انگلس (انگلش) آتی
نہیں ٹائی لگا کر آئے ہیں گھومنے لے اللہ اس نے مجھے ڈرا دیا تھا ۔
کھدا (خدا) تجھے گارت (غارت) کرے ۔

پھر ہم لوگ گھر آئے اور یہ واقعہ سنایا ۔سب ہنستے
ہنستے لوٹ پوٹ ہوگئے ۔

کسی نے ٹھیک کہا ہے کہ انسان اچھے کپڑے پہننے
سے اچھا نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ پڑھا لکھا
ہو ۔اس کی عادت اچھی ہو ۔

بدر وفا سہسرامی

اسکولوں کی تعلیمی اور تفریحی سرگرمیاں

رتناگری ضلع کے مسلم طلبہ کو وظیفے

کوکن مسلم ایجوکیشن سوسائٹی رتناگری کی بمبئی سب کمیٹی نے ۶۰-۱۹۵۹ء کے لیے مندرجہ ذیل طلبہ کو حسب ذیل رقمیں یکشت وظیفہ دینا طے کیا ہے۔

چالیس روپے۔ مہرالنساء داؤد قاضی۔

فی کس پچاس روپے (۱) تاج بانو یوسف مہطوے (۲) اقبال قمر صبیح بوبے (۳) اکبر علی محمد قاسم چھوگلے (۴) نذیر ابراہیم (۵) آمنہ بی بی دریاخاں، طاہر خاں دلوائی۔

فی کس ساٹھ روپے (۱) ادریس عبدالقادر (۲) حسن عبدالکریم چھوگلے (۳) میر حسن عابدین مجاور (۴) نور محمد شفیع مقدم (۵) نظیر علی ہشام الدین ہسوارے۔

فی کس پچھتر روپے (۱) عبدالرشید عبدالرزاق، لارپولی ٹیکنک رتناگری (۲) عبدالغنی باپوشاہ پٹیل (۳) فیروز خاں عثمان گونکر۔ رتناگری پولی ٹیکنک۔

فی کس سو روپے (۱) مرزا ظہیر زین الدین معروف (۲) بشیر احمد اسمٰعیل علوی (۳) عبدالرحمٰن حسن پرکار (۴) عبداللطیف حسین نورے (۵) اختر علی اسمٰعیل ملّا (۶) جمال الدین عمر جیلے (۷) محمد علی عبدالکریم تانڈیل (۸) عبدالغفور حسین خاں دنوانی دانار کالج (۹) عبدالرشید ابراہیم نورے (۱۰) سعیدہ بیگم علی قاضی گوگٹے کالج رتناگری (۱۱) عبدالغنی محمد قاسم سروے گوگٹے کالج رتناگری (۱۲) عبدالعزیز داؤد چیکر گوگٹے کالج رتناگری۔ میزان کل رقم ۲۰۱۵ روپے

انٹراسکولس باسکٹ بال ٹورنامنٹ

صابو صدیق نے احمد سیلر کو شکست دیدی

بمبئی ۱۵ جنوری انٹرا ہائی اسکولس رتن ٹاٹا باسکٹ بال ٹورنامنٹ کے دو مقابلے آج شام مستان تالاب پلے گراؤنڈ پر کھیلے گئے جن میں پہلا مقابلہ احمد سیلر اور صابو صدیق ہائی اسکول کے درمیان کھیلا گیا۔ جو اول الذکر ٹیم کی ۶۰ کے مقابلے میں ۳۰ پوائنٹ سے شکست کے بعد اختتام پذیر ہوا۔

دوسرا میچ ہنس راج مرارجی پبلک ہائی اسکول اور پارلے تلک ہائی اسکول کے درمیان کھیلا گیا۔ جو اول الذکر ٹیم کی ۴۴ کے مقابلے ۴۶ پوائنٹ سے فتح کے بعد اپنے اختتام پر پہنچا۔

آج کا پہلا مقابلہ ابتدائی ہاف میں ذرا ہیجان انگیز رہا۔ لیکن اسی ہاف کے ۷ ویں منٹ میں (۱۷-۱۸) کے اسکور پر صابو صدیق نے لیڈ حاصل کرنے کے بعد اس ہاف کے اختتام پر مزید دو پوائنٹ بنالیے اور حریف کو اسکور کا موقع نہ دیا۔ دوسرے ہاف میں احمد سیلر کے کھلاڑی تھک سے گئے تھے اور انھوں نے غلط پاس سپلائی کرنا شروع کر دیا جس سے دوسرے ہاف میں حریف صابو صدیق کے زبیر اور دیگر کھلاڑیوں کو کافی فایدہ ہوا۔ آخر میں ۳۷ کے مقابلے میں ۶۰ پوائنٹ بنالیے ان میں زبیر کے ۲۴ اور نثار علی کے ۱۴ پوائنٹ شامل رہے۔

آج کے دوسرے مقابلے میں دونوں ٹیمیں اسال ہی وجود میں آئی ہیں اور اسی کی بدولت ان کا کھیل کوئی خاصا نہیں رہا۔ یہاں تک ان کو ڈربلنگ کرنا بھی ٹھیک سے نہیں آتا۔ پچھلے دنوں چونکہ ہنس راج مرارجی

ہائی اسکول کے کھلاڑیوں نے ایک مقابلے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ اس کی بدولت انھیں کچھ ہمت سی آگئی ہے اور اس بات میں کوئی شک نہیں کہ آگے چل کر اس اسکول کے کھلاڑی صحیح باسکٹ بال کی تربیت حاصل کرنے کے بعد اچھی ٹیم کو بنا سکیں گے۔ گذشتہ دنوں کے کھیل کے مقابلے میں آج انھوں نے اچھے کھیل کا مظاہرہ کیا اور پہلے ہاف میں حریف کو ۸ کے مقابلے میں ۱۴ پوائنٹ سے پیچھے چھوڑ دیا اور آخر میں ۲۲ کے مقابلے میں ۴۰ پوائنٹ سے جیت کر کوارٹر فائنل میں کھیلنے کا شرف حاصل کر لیا۔

* * *

بھائی بہن نے پہلا انعام حاصل کیا

نظم خوانی کے مقابلے میں عجیب اتفاق ہوا سینیر اور جونیر گروپ کے اول انعام پانے والے دونوں بچے بھائی بہن ہیں۔ سینیر گروپ کا پہلا انعام مسز فہیمہ چھوٹانی شیلڈ حاصل کرنے والے خورشید حسن معراج حسن صدیقی (ہاشمیہ ہائی اسکول) اور جونیر گروپ کا پہلا انعام حاصل کرنے والی صدیقی فاطمہ حسن معراج (کمو جعفر گرلز ہائی اسکول) سگے بھائی بہن ہیں۔

* * *

نثر ہائی اسکول نظم خوانی کے مقابلے کا نتیجہ

سینیر گروپ

پہلا انعام خورشید حسن معراج حسن صدیقی ہاشمیہ ہائی اسکول، مسز فہیمہ فاروق چھوٹانی شیلڈ۔ دوسرا انعام عائشہ گاندھی کمو جعفر سلیمان گرلس ہائی اسکول، انقلاب شیلڈ۔ تیسرا انعام ویرا آفندی محمدیہ ہائی اسکول، فاروق فردوس والا شیلڈ۔ چوتھا انعام ممتاز شفیع انجمن اسلام ماہم گرلس ہائی اسکول۔ عبدالرحیم مستری پرائز

جونیر گروپ

پہلا انعام فاطمہ معراج حسن صدیقی کمو جعفر سلیمان گرلس ہائی اسکول اسحاق قاسم ٹرافی۔ دوسرا انعام منور حسین کلیان نیشنل ہائی اسکول حسرت جے پوری شیلڈ تیسرا انعام علی محمود دوست محمد ہاشمیہ ہائی اسکول فرینڈ پبلشنگ فریم۔ چوتھا انعام شیخ فضل محمود انجمن اسلام جان محمد ہائی اسکول عبدالرحیم مستری پرائز۔

* * *

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں طلبہ اور اساتذہ کا شاندار اجتماع

۱۲ر جنوری بروز جمعہ انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں ایم۔ اے اردو فارسی اور عربی کے طلباء کی طرف سے اساتذہ کو عید ملن کے سلسلے میں مدعو کیا گیا۔ کافی تعداد میں طلباء اور اساتذہ نے شرکت کی پارٹی سے پہلے سب کی مشترکہ تصویریں لی گئیں۔ پارٹی کی صدارت اردو دنیا کے مشہور و معروف شخصیت پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی صاحب نے فرمائی، جن کے فیض محبت اور نیک مشوروں سے طلباء ہمیشہ مستفیض ہوتے رہے ہیں۔ ندوی صاحب نے عید ملن پر مسرت کا اظہار کیا اور طلباء کو ان کی زندگی میں کامیابی و کامرانی حاصل کرنے کی دعا دی۔

پروفیسر عالی جعفری ڈاکٹر آدم شیخ، پروفیسر اے۔ جی شیخ، ڈاکٹر عبدالحق رضا، پروفیسر مجاہد حسین حسینی، پروفیسر خورشید نعمانی پروفیسر احمد انصاری، عبدالرزاق قریشی صاحب اور جناب حامد اللہ ندوی صاحب نے اپنی شرکت سے اس اجتماع کو رونق بخشی پروفیسر مجاہد حسین حسینی اور بعض طلباء نے نظمیں اور غزلیں سنا کر حاضرین کو محظوظ کیا ۔ آخر میں محمد ایوب واقف نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور اس بات پر اظہار افسوس کیا کہ مدعو شدہ اساتذہ طلباء میں بہت سے اپنی مصروفیات کی وجہ سے شرکت نہ کر سکے۔

* * *

اسمٰعیل یوسف کالج میں اٹھارہواں تابانی تقریری مقابلہ

پہلا انعام نیشنل کالج اور ٹرافی سینٹ زیویر کالج نے حاصل کی

بمبئی ۱۵ جنوری سنیچر کی شام کو اسمٰعیل یوسف کالج کے مجمع الادب کے زیر اہتمام اٹھارہواں تابانی تقریری مقابلہ عمل میں آیا۔ جس میں پہلا انعام نیشنل کالج کے طالب علم ظہیر صدیقی نے حاصل کیا اور ٹرافی سینٹ زیویر کالج کو ملی۔ اس تقریب کی صدارت مشہور شاعر جناب صدیق محمد قادری (دہر مہسلالی) نے فرمائی جو اس کالج کے ایک سابق طالب علم ہیں۔ جج کے فرائض وزیر محمد شیخ صاحب، ڈاکٹر محی الدین موتن صاحب اور بیگم ڈاکٹر ترمذی نے انجام دیے۔ یہ تینوں جج بھی اسی کالج کے سابق طلبہ رہ چکے ہیں۔

پروگرام کے آغاز میں شعبہ اردو کے سربراہ پروفیسر ڈاکٹر عالی جعفری صاحب نے صدر محترم کا تعارف پیش کیا اور اس امر پر حیرت و تاسف کا اظہار کیا کہ اس مرتبہ اس مشہور اور یادگار تقریری مقابلے میں نہ صرف پانچ کالجوں نے حصہ لیا بلکہ انھوں نے توقع ظاہر کی کہ آئندہ تمام کالج اردو کے اس اہم سلسلے میں دلچسپی لیں گے۔ انعامات کے اعلان کے بعد ڈاکٹر موتن صاحب نے نہایت فصیح و بلیغ زبان اور من موہک انداز میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا اور خواہش ظاہر کی کہ اردو کے طلبہ و طالبات ایسی تقاریب میں ماضی جیسی گرمجوشی سے حصہ لیا کریں۔ مجمع الادب کے سکریٹری جناب جاوید شیخ صاحب کی فرمائش پر صدر محترم نے اپنی ایک غزل بھی پیش کی۔

نتائج حسب ذیل ہیں۔

پہلا انعام۔ ظہیر صدیقی (نیشنل کالج)

دوسرا انعام مس سلمیٰ عبد علی (سینٹ زیویر کالج)

تیسرا انعام۔ جاوید شیخ (اسمٰعیل یوسف)

ٹرافی۔ سینٹ زیویر کالج

انجمن خیر الاسلام آرٹس اینڈ سائنس کالج کا سنگِ بنیاد رکھا جائے گا

۱۲ جنوری کو صبح دس بجے ۶۴۲ بلاسس روڈ پر انجمن خیر الاسلام آرٹس اینڈ سائنس کا سنگِ بنیاد رکھنے کے سلسلے میں ایک جلسہ عالی جناب الحاج محمد علی زین العلی رضا صاحب کی صدارت میں منعقد ہوگا۔ سنگِ بنیاد رکھنے کی رسم عالی جناب ڈاکٹر رفیق زکریا صاحب وزیر صحت و اوقاف حکومت مہاراشٹر انجام دیں گے اور عالی جناب عبدالستار عمر صاحب مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت فرمائیں گے۔ جلسہ میں شہر کی ممتاز ہستیاں شرکت کریں گی۔

لقمانیہ ہائی اسکولز کھیل کود کے مقابلے

بمبئی ۱۵ جنوری کو بریج گراونڈ قلابہ پر لقمانیہ ہائی اسکولز کے کھیل کود کے مقابلوں میں لڑکیوں کے سیکشن میں بانو سیگڑی والا اور رشیدہ مرچنٹ نے ۱۵-۱۵ پوائنٹ حاصل کرکے مشترکہ اولیت حاصل کی۔

لڑکوں میں حاتم رامپوروالا ۱۵ پوائنٹس سے اول رہے۔ جسمانی تربیت کے مظاہرہ میں نسرین گلابی والا، ثریا نل والا اور نفیسہ ٹین والا کو بہترین قرار دیا گیا۔

مرتبہ جناب محمد اقبال نوساری والا

کتابوں کی باتیں

خیالی پلاؤ

وہ دونوں دوست تھے۔ مدرسے میں ساتھ ساتھ پڑھتے تھے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ساتھ ساتھ وقت گنواتے تھے۔ ان کے درجے کے ساتھیوں نے انھیں پڑھنے کا شوق دلایا مگر ان کی طبیعت اس طرف ذاتی آور وہ کام کرنے کی بجائے سوچ سوچ کر اپنا دل خوش کرنے لگے۔ گویا 'خیالی پلاؤ' پکانے لگے یا یوں کہیے کہ آدمی بننے کی بجائے 'شیخ چلی' ہو گئے۔

اب انھوں نے کیا کیا سوچا؟ کس کس ڈھنگ سے سوچا؟ یہ سب باتیں اس کتاب کو پڑھنے سے پتہ لگیں گی۔ یہ باتیں نہ صرف مزے دار ہیں بلکہ انھیں بڑے مزے کے ساتھ بیان بھی کیا گیا ہے۔ لیکن سوچتے سوچتے وہ دونوں کس نتیجے پر پہنچے؟ یہی ناکہ انسان ہی رہنا سب سے اچھا ہے اور ہر ایک کو انسان بننے کی کوشش کرنی چاہیے۔ کیوں ایسا ہوا؟ یہ آپ جانیں!

خبر رسانی کے طریقے

آج کی دنیا میں گھر بیٹھے جہان کی خیر خبر مل جاتی ہے بات کی تو بات ہی کیا صورت تک دیکھ لیتے ہیں۔ یہ سب ریڈیو ٹیلی ویژن، ٹیلی گراف، ٹیلی پرنٹر، ٹیلی فون کی برکت ہے۔ ان سب ایجادات نے انسان کو بے حساب فائدہ پہنچایا ہے۔ لیکن یہ سب چیزیں اپنے آپ اور یکایک نہیں بن گئیں۔ یہ تو بڑے بڑے سائنس دانوں کی انتھک اور لگاتار کوشش کا نتیجہ ہیں۔ اب یہ کب بنیں؟ کیسے بنیں؟ کس نے بنائیں ان سب کا جواب اس چھوٹی سی کتاب 'خبر رسانی کے طریقے' میں موجود ہے۔ لکھنے کا انداز سیدھا سادا ہے۔ اور بات سمجھنے میں دشواری نہیں ہوتی۔

(معلم)

چاند کے ٹکڑے

از جناب مولانا مقبول احمد سیوہاروی

سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ ضخامت ۹۶ صفحات لکھائی چھپائی روشن۔ کاغذ اوسط درجے کا ٹائٹل دو رنگا خوبصورت قیمت ایک روپیہ ملنے کا پتہ: ندیم بک ڈپو۔ سیوہارہ ضلع بجنور۔

اس خوب صورت کتاب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزوں کا ذکر ہے یہ معجزے مختلف مذہبی کتابوں میں بکھرے ہوئے تھے۔ مولانا مقبول احمد کا پہلا کارنامہ یہ ہے کہ ان کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ دوسرا اس سے بھی شاندار کارنامہ یہ ہے کہ ان معجزوں کو بچوں کے لئے بہت ہی آسان، دل چسپ اور پیاری زبان میں لکھا ہے جو ہم نے اس کتاب کو پڑھنا شروع کیا تو ختم ہی کر کے دم لیا۔ موجودہ زمانے میں تو یہ بچوں کے لئے ایک نعمت ہے اور اس قابل ہے کہ تحفے اور انعام میں دی جائے۔ بچوں کے لئے لکھنے والوں میں مولانا مقبول احمد کا مرتبہ بہت اونچا ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے اپنے کمال کے پورے جوہر دکھاتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ بچوں میں یہ کتاب بہت مقبول ہوگی۔

ماہنامہ مسرت کا چاچا نہرو نمبر

بچوں کا یہ رسالہ دو سال سے پٹنے سے نکل رہا ہے۔ اس کے ایڈیٹر جناب ضیاء الرحمٰن غوثی صاحب اس پرچے کو بہت محنت اور سلیقے سے ترتیب دیتے اور بچوں کے لئے بہت مفید اور کار آمد مواد فراہم کرتے ہیں۔

زیر نظر نمبر رسالے کا نہرو نمبر ہے یہ جناب غوثی صاحب کی کوششوں کا ایک کامیاب نمونہ ہے۔ شفیع الدین صالح عابد حسین ڈاکٹر اور نیوی سہیل عظیم آبادی آسی رام نگری

کی اور ، علقمہ شبلی ، ڈاکٹر کیول دھیر ، مناظر عاشق ، وقار خلیل اور دوسرے
اچھے اچھے لکھنے والوں کے نام رسالے میں نظر آتے ہیں۔
شروع میں راشٹرپتی اور وزیر اعظم ہند اندرا گاندھی کے
پیغامات بھی ہیں غرض پنڈت نہرو کے بارے میں ایڈیٹر صاحب نے بچوں
کے لیے بہت اچھا اور سارا مواد فراہم کر دیا ہے۔ ہاں ٹائٹل درد
رنگا ہے اور اس پر پنڈت جی کی بہت اچھی تصویر ہے ہم کامیاب
کوشش پر غوثی صاحب کو مبارک باد دیتے ہیں اس خاص نمبر کی
قیمت ایک روپیہ ہے۔ ضخامت اسّی صفحے۔ ملنے کا پتہ۔

دفتر ماہنامہ مسرت پٹنہ ۴

بقایا کشش ثقل صفحہ ۱۹

دیا جائے تو ہر چیز مرکز سے جا ٹکرائے گی۔
آپ جانتے ہیں اس بات کا سراغ کس نے لگایا تھا
؟ اچھا تو سنئے ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ نیوٹن نامی ایک
لڑکا پھل دار درخت کے نیچے لیٹا ہوا تھا۔ درخت غالباً سیب کا
تھا۔ لیٹے لیٹے اونگھنے لگا۔ یکایک ایک سیب اس کے اوپر گرا وہ ہڑبڑا
کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے سیب تو کھا لیا لیکن وہ یہ بات برابر
سوچتا رہا کہ سیب زمین کی طرف کیوں چلا آیا۔ آسمان کی طرف
کیوں نہیں چلا گیا۔ ؟ یہ سوال برسوں تک اس کے دماغ میں
چکر کاٹتا رہا۔ آخر جب وہ بڑا ہوا تو اس نے خوب محنت سے
پڑھا اور اپنے علم و تجربہ سے یہ سوال حل کر لیا۔ وہ لڑکا مشہور
سائنسداں سر آئزک نیوٹن تھا اور آج سب جانتے ہیں کہ
کشش ثقل کا پتہ سب سے پہلے نیوٹن ہی نے لگایا تھا۔

ادھر اُدھر سے

مصر کا ایک قدیم مندر اسپین بھیجا جا رہا ہے

مصر کا ایک ۲۲ سو سال پرانا مندر اسپین لے جایا جائے گا۔ مصر کی حکومت نے اسپین کو یہ مندر تحفہ کے طور پر دیا ہے۔ جہاں وہ نئے سرے سے نصب کیا جائے گا۔

مصر کے وزیر خارجہ پچھلے دنوں اسپین کے دو دن کے دورے پر گئے تھے۔ وہاں انھوں نے یہ اعلان کیا کہ اسپین کے فن تعمیر اور آثار قدیمہ کے ماہرین پچھلے آٹھ سال سے مصر میں آثار قدیمہ کی حفاظت اور نگرانی کا کام جس تن دہی سے انجام دے رہے ہیں وہ قابل تعریف ہے۔ ان ماہرین کی اسی خدمت کی یادگار کے طور پر حکومت مصر دریائے نیل کے کنارے واقع دیبود کا مندر اسپین والوں کو تحفے کے طور پر دے رہی ہے۔

یہ پورا مندر ریزہ ریزہ کر کے اکھاڑ کر اسپین لے جایا جائے گا۔ جہاں اسے مصر کی دوستی کے نشان کے طور پر پھر سے نصب کیا جائے گا۔

دیبود کا مندر چوتھی صدی قبل مسیح میں مصر کے فرعون (PHARAOH ADZEHRAMON) نے بنوانا شروع کیا جسے بعد میں روم کے شہنشاہوں نے مکمل کروایا۔

مصر کی تہذیب دنیا کی سب سے قدیم تہذیبوں میں شمار کی جاتی ہے۔ وہاں کے اہرام دنیا کا عجوبہ مانے جاتے ہیں۔

اندھوں کا باغ

اس سائنسی عہد میں ایسے طریقے ایجاد ہو گئے ہیں کہ اندھے آدمی بھی پڑھنا لکھنا سیکھتے ہیں۔ ان کی کتابیں ہماری آپ کی کتابوں کی طرح چھپی نہیں ہوتی ہیں جنھیں دیکھ کر پڑھا جا سکے نابینا لوگوں کی کتابوں کے حروف گڑے اور ابھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ جن کو ہاتھ سے چھو کر پڑھا جاتا ہے اس رسم الخط کا نام بریل رسم الخط ہے۔

مغربی جرمنی میں اندھوں کے لیے ایک باغ بنایا جا رہا ہے۔ اس میں پھولوں کے نام کی پلیٹ بریل رسم الخط میں لگائی جائے گی تاکہ یہاں آنے والے نابینا لوگ پھول کا نام سمجھ کر اس کی خوشبو کو پہچان سکیں۔

پستہ قد گھوڑے

بریمن (ڈاڈ) وفاقی جمہوریہ جرمنی کے شہر بریمن کے ایک مشہور دندان ساز ڈاکٹر یوہان لامپے کو پستہ قد جانوروں کی نسل کشی کا عجیب و غریب شوق ہے۔ پچھلے دنوں انھیں صرف ۵۲ سینٹی میٹر اونچی گھوڑی پیدا کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اپنی اس ننھی منی گھوڑی کا نام انھوں نے "بائیڈے روزے" یعنی جنگلی گلاب رکھا ہے۔ اب وہ بلّی کے برابر چیتے پیدا کرنے کا منصوبہ باندھ رہے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ چیتے گھریلو بلیوں کی مانند بالکل بے خطر ہوں گے اور انھیں بلا کسی دقت کے گھروں میں پالا جا سکے گا۔ وفاقی جمہوریہ جرمنی کے علاوہ بہت سے بیرونی ملکوں کے ماہرین حیوانات اور جانور پالے

ناظرین حضرات اس جرمن دندان ساز ڈاکٹر کے انوکھے جانوروں
ی بڑی گہری دلچسپی لے رہے ہیں۔

ستقبل کے ساتھی

فرانکفورٹ (ڈاڈ) وفاقی جمہوریہ کے شہر ہوخسٹ
ب سولہ سالہ لڑکی انیتا یوسٹ کی یہ تصویر "مستقبل کے ساتھی"
دنوں فوٹو اور فلم کے تیسرے نوجوان یورپی کے مقابلے میں
نوجوان نگاہوں میں --- ہم یورپی" کے عنوان سے ترتیب
رہا ہے۔ جرمن تصویروں کے مقابلے میں اول آئی ہے اصل
بلے میں جسے یورپی مشترکہ منڈی کے چھ شریک ملکوں کے علاوہ
ں اور ترکی سے بھی تیرہ سال سے لے کر سولہ سال تک کی عمر
شوقیہ فوٹوگرافر شرکت کر رہے ہیں۔ ابتدائی مقابلے میں وفاقی
یہ جرمنی کے چھ سو سے بھی زیادہ نوجوان لڑکے لڑکیوں نے
یا ساڑھے چار ہزار تصویریں بھیجی تھیں۔ جن میں سے یہاں
فورٹ (مائن) کی ایک جیوری نے دو سو منتخب تصویروں کا
اب کر کے جرمن حصے کے طور پر برسلز بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے۔
ں ۲۰ اپریل ۱۹۶۸ء کو یورپی مقابلے میں کامیاب ثابت ہونے
تصویروں کا اعلان کر دیا جائے گا۔

ڑتا ہوا آملیٹ"

اس سال ہمبورگ (ڈاڈ) وفاقی جمہوریہ جرمنی کی
رندرگاہ اور شہر عظیم ہمبورگ میں کشتیوں کی بین الاقوامی نمائش۔
یں سب سے دلچسپ چیز ہماری تصویر کی یہ دو نشستی گول
ن ثابت ہوئی ہے جو ہوا کے تکیے پر سفر کرتی ہے۔ اس
طرکشتی کے بنانے والوں نے اسے مزاحاً "اڑتا ہوا آملیٹ"
یا ہے۔ اس کا قطر تین میٹر کا ہے اور سات گھوڑوں کی
ت کے ایک انجن کی مدد سے یہ ۲۵ کیلو میٹر فی
گھنٹہ تک کا سفر کر سکتی ہے۔ اسے جنوب مغربی جرمنی کے ایک ممتاز
کارخانہ کشتی سازی نے ایجاد کیا ہے۔ اور یہ سطح سے بیس سینٹی میٹر کی
اونچائی پر اڑتے ہوئے بلا کسی دقت کے ہر قسم کے دلدلی اور کیچڑ والے
ریت والے علاقوں کو عبور کرتی چلی جاتی ہے۔ ان تمام بے مثال
خوبیوں کے باوجود اس کی قیمت صرف ۴۰۵۰ جرمن مارک رکھی گئی ہے۔
جلد ہی یہ مشہور کارخانہ کشتی سازی اسی قسم کی چار نشستی کشتیاں تیار
کر کے بازار میں لے آنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

دل بدلنے والے افریقی ڈاکٹر کی قیمت

دل بدلنے والے جنوبی افریقہ کے مشہور ڈاکٹر کرسچین
برنارڈ کی قیمت دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ دنیا کے کئی ملکوں
نے زیادہ سے زیادہ تنخواہ کی پیش کش کر کے انھیں اپنے یہاں بلانے
کی تجویز کی ہے۔ مگر ڈاکٹر برنارڈ کسی قیمت پر اپنا ملک چھوڑنے
کو تیار نہیں۔ اس وقت تک ۷۵ لاکھ روپیہ سالانہ تک کی پیش کش
ہو چکی ہے۔ یہ پیش کش امریکہ کی طرف سے کی گئی ہے۔
کینڈا نے سب سے پہلے انھیں تاحیات ساڑھے سات
لاکھ روپیہ سالانہ دینے کی تجویز کی تھی۔ برطانیہ نے یہ رقم بڑھا کر
۲۴ لاکھ روپیہ کر دی، فرانس نے ۳۰ لاکھ روپے کی پیش کش کی
اور اب امریکہ ۷۵ لاکھ روپیہ سالانہ کی بولی لگا چکا ہے۔
ڈاکٹر برنارڈ کا کہنا ہے کہ جس ملک کے دانے پانی
نے انھیں یہ شہرت دلائی ہے۔ میری ساری زندگی اسی ملک کی خدمت
کے لیے وقف ہے۔ میں کوئی بھیڑ بکری نہیں ہوں کہ میری اس
طرح بولی لگائی جائے۔

خط و کتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا
حوالہ ضرور دیں تاکہ تعمیل یا جواب میں آسانی ہو۔

پرنٹر پبلشر سید احمد علی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس دریا گنج دہلی میں آفسٹ پر چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے شایع کیا

پیام تعلیم کے ایجنٹ

آندھرا پردیش

بیدار ایجنسی - میر جملہ تالاب — حیدرآباد
نیو بک اسٹال - بس اسٹینڈ — کریم نگر
مکتبہ ہاشمی - نڈول
ایم ایم - مستان خاں - ہونا پیٹھ
اردو ٹرسٹ بک اسٹال - جواہر لال نہرو روڈ — حیدرآباد

مغربی بنگال

محمد الیاس - ۹۱ کولوٹولہ اسٹریٹ — کلکتہ
تجمل حسین خاں - نور حیت پور روڈ — کلکتہ
محب اللہ اینڈ سنز - فارسٹ روڈ — دارجلنگ
محمد اسمٰعیل (بک ڈپو) — ارار یا کوٹ

بہار

اُردو مرکز — مونگیر
سب ازک کمپٹی - مین روڈ — رانچی
بک ایمپوریم - سبزی باغ — پٹنہ
محمد کریم بخش - کمپنی باغ — مظفر پور

مدھیہ پردیش

رشید بک ڈپو - منڈی بازار — برہان پور
قاضی شہاب الدین - قاضی محلہ — وار ورہ
حافظ محمد خلیل الرحمٰن خاں غوری - لارڈ گنج — جبل پور
وجیہیہ پرائمری اسکول ۲ — اندور ۲
احمد حسین غلجی اینڈ سنز - — مہو

میسور

ایم - آئی میر اجمعدار - بیجاپور
عبدالرشید - ۳۹ منڈی محلہ میسور
سنٹرل اسٹور — بیلگام
موڈرن نیوز ایجنسی - نیو مارکیٹ روڈ — بنگلور
فردوس کتاب گھر - پھونس پاچوک — دھاروار
بنگلور بک ہاؤس - بس اسٹینڈ تلاصی پالم — بنگلور

اتر دیش

محمد اطہر - بازار — گورکھپور
قیصر نقوی دودھ پور — علی گڈھ
انوار بک ڈپو - یونیورسٹی مارکیٹ — علی گڈھ
نثار اعظمی - مکتبہ شمع ادب — مئوناتھ بھنجن

مہاراشٹر

مکتبہ اطفال - مانیگاؤں — ناسک
صبح ایشیا - پائپ روڈ — کرلا
سید ظہیر الدین - سٹی چوک — اورنگ آباد
ہما کو بک سروس - سچاپیر اسٹریٹ — پونا
محمد بدر الدین - انبیسر — بھیونڈی
ضیا بک اسٹال - ایولا — ناسک
رشید نیوز ایجنسی — جالنا
محمد اسمٰعیل شیخ ابراہیم — نواپور دھولیہ
سید شوکت علی - بیا بانی - — ایچل پور سٹی

راجستھان - عبدالنعم — جودھپور

اڑیسہ نور محمد اینڈ سنز — کٹک

حافظ سید عمر اردو بک بھنڈار — سنبل پور

کشمیر - عبدالسبحان — ٹیور

سکندر نیوز ایجنسی — سری نگر

گجرات - یوسف برادرس اسٹور

کام دار میدان — احمد آباد ۱

پیام تعلیم

جلد ۵ — جون ۱۹۶۸ء — شمارہ ۶

ایڈیٹر:- محمد حسین حسّان ندوی

صدر دفتر
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
اُردو بازار۔ دہلی ۶

شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳

شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
شمشاد مارکیٹ علیگڈھ

قیمت فی پرچہ ۶۰ پیسے —————— سالانہ چندہ چھ روپے

سرورق - فوٹو فضل الرحمٰن صاحب

فہرست

بچوں سے باتیں

یہ پرچہ جس وقت آپ کے ہاتھوں میں پہنچے گا ۔
بہت سی جگہوں پر آپ امتحان کی پریشانیوں سے نجات
پا چکے ہوں گے ۔ بہت سی جگہوں پر سال بھر کی محنت کے
نتیجے بھی سامنے آگئے ہوں گے ۔ کامیاب ہونے والے
پیامی ہماری طرف سے دلی مبارکباد قبول کریں ۔

اور بھی (خدا نخواستہ) ناکام ہونے والے پیامی بجائے
غمگین اور بددل ہونے کے ٹھنڈے دل سے اپنی ناکامی
کے اسباب پر غور کریں ۔ اور پھر نئی ہمت تازہ جوش اور
ولولے سے پڑھنے لکھنے میں لگ جائیں نتیجے کو خدا پر چھوڑ دیں ۔

کچھ بچے امتحان سے بس چند دن پہلے رات دن
ایک کر دیتے ہیں ۔ گرتے پڑتے کامیاب بھی ہو جاتے ہیں مگر
اچھے اور سچے طالب علم وہی ہیں جنھیں لکھنے پڑھنے کا شوق
پیدا ہو جائے ۔ علم حاصل کرنے کی لگن پیدا ہو جائے ۔ ایسے
اچھے طالب علم شروع سال سے پڑھنے کے وقت جی لگا کر
محنت کرتے ہیں کھیلتے وقت جی بھر کے کھیلتے ہیں اور
امتحان میں ہنستے کھیلتے کامیاب ہو جاتے ہیں ۔

جامعہ کے ابتدائی اور ثانوی مدرسوں میں بچوں
کو تعلیمی اور تفریحی کاموں میں مناسب طور پر مشغول رکھنے کی
شروع سال سے عادت ڈالی جاتی ہے ۔ یہی نہیں اُن کی
طرح طرح سے حوصلہ افزائی کی جاتی ہے ۔ ابھی اپریل کے
آخری ہفتے میں مدرسہ ثانوی کا جو سالانہ جلسہ ہوا ۔ اس میں
ہر مضمون میں اول آنے والوں کو تمغے دیے گئے ۔ کھیلوں
میں اول، دوم، سوم آنے والوں کو انعام دیے گئے ۔ اپنے اپنے
بورڈنگوں کو صاف ستھرا رکھنے والوں کو انعام دیے گئے ۔
سب سے زیادہ شائستگی اور تہذیب سے رہنے والے بچوں
کو انعام دیے گئے ۔

یہی حال مدرسہ ابتدائی کا ہے ۔ وہاں ایک
بات اور کی جاتی ہے ۔ کوشش کی جاتی ہے کہ زیادہ سے
زیادہ بچوں کی حوصلہ افزائی کی جائے ۔ زیادہ سے زیادہ بچوں
کو انعام دیے جائیں ۔ ابھی مئی کے پہلے ہفتے محترمہ بیگم
مجیب کی صدارت میں جو جلسہ ہوا اسے دیکھ کر یہی اندازہ
ہوا ۔ ان سب باتوں کا نتیجہ ظاہر ہے خوش گوار ہی ہونا چاہیے ۔

نئے دور کے "پیام تعلیم" کو نکلے لگ بھگ پونے چار
سال ہو گئے خدا کا شکر ہے کہ اس کی مقبولیت بڑھتی
ہی جاتی ہے ۔ اب تو آپ آپ کے بڑے بھی اسے بہت
پسند کر رہے ہیں ۔ پیام تعلیم بچوں کا جو ادب پیش کر رہا ہے
عام طور پر اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جا رہا ہے ۔

اس پرچے کے مستقل پڑھنے والوں کو یہ اندازہ
ہو گیا ہو گا ۔ ہر پرچے کا ایک خاص انداز ایک خاص
مزاج ہوتا ہے پیام تعلیم کا بھی ایک مزاج ہے ۔ ہمارے بہت
سے پیامی بہت سے بزرگ بہت سے سرپرست اپنی کہانیاں
مضمون، نظمیں بھیجتے وقت اس بات کو دھیان میں رکھیں تو
ہمیں بڑی سہولت ہو جائے ۔

ہمارے بہت سے شاعر اپنی اچھی اچھی شان دار
نظمیں از راہ نوازش ہمیں بھیج دیتے ہیں مگر ان کا مضمون یا

تخیل ان کی زبان پیامیوں کی سمجھ سے باہر ہوتی ہے۔ اور ہم بڑی مشکل میں پڑ جاتے ہیں۔ بعض بزرگ خالص مذہبی چیزیں بھیج دیتے ہیں۔ حالانکہ پیام تعلیم مذہبی پرچہ نہیں ہے۔ بعض حضرات تو اور بھی ستم ظریفی فرماتے ہیں چھپے ہوئے مضمون میں ذرا سا ادل بدل کر کے ارسال فرما دیتے ہیں۔ ہمیں چھپنے پر اطلاع ملتی ہے تو افسوس ہوتا ہے۔ بہت سے پیامی ایسی معلومات فراہم کرتے ہیں جو نہ جانے کتنی بار دوسرے رسالوں میں چھپ چکی ہوتی ہیں۔ اسی طرح کہانیاں بھی۔ یہ سب بزرگ اور بھائی اس طرح کا احسان ہم پر نہ کریں تو بڑا احسان ہو!

کچھ تو جگہ کی کمی کی وجہ سے اور کچھ اس وجہ سے کہ اسکولوں کی تعلیمی اور تفریحی سرگرمیوں کی رپورٹیں بہت پرانی ہو گئی ہیں۔ اس پرچے میں یہ سرگرمیاں شایع نہیں ہو رہی ہیں۔ ہماری درخواست ہے کہ رپورٹ بھیجنے والے حضرات جہاں تک بن پڑے اختصار کا خیال رکھیں تاکہ زیادہ سے زیادہ اسکولوں کے لیے گنجایش نکل سکے۔

"پیام تعلیم" کی خریداری بڑھانے کی مہم پورے جوش اور سرگرمی سے جاری ہے۔ مکتبہ کے ایک کارکن جناب شوکت علی صاحب نے گیارہ خریدار مرحمت فرمائے ہیں۔ جناب رئیس الحسن صاحب انجینیر (گنا) اس سے پہلے بہت سے خریدار دے چکے ہیں۔ اب انھوں نے چار خریداروں کا چندہ خود بھیجا ہے۔ جناب شکور صاحب زیدی (گوالیار) نے پانچ خریدار بنائے ہیں۔ اعلان کے مطابق ان کے نام ایک سال کے لیے پیام تعلیم (مفت) جاری کر دیا گیا جناب شاہد علی صاحب (منیجر شاخ مکتبہ بمبئی) نے حسب معمول دس بارہ نئے خریداروں کے چندے بھجوائے ہیں۔ آپ کا پیام تعلیم شاہد صاحب جیسے پرجوش ساتھیوں کی بدولت اتنی کامیابی سے چل رہا ہے۔

اور ہاں محترمہ انور جہاں صدیقی (بروده) نے نو خریدار کا وعدہ فرمایا ہے۔ پانچ چندے وصول ہو چکے ہیں۔ یہ بھی ایک سال کے لیے پیام تعلیم کی مستحق ہیں۔

محترم اخضر صاحب، برادرم محمد حسین صاحب حیدرآبادی قاضی رشید صاحب بھی برابر اپنی جد و جہد میں مصروف ہیں۔ اخضر صاحب اس عرصے میں کئی بار بیمار پڑ چکے ہیں۔ جونہی ذرا ٹھیک ہوتے ہیں کام میں لگ جاتے ہیں۔

اور اب تو آپ بھی اپنے پیام تعلیم کے لیے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ ان لمبی چھٹیوں میں تھوڑا سا وقت اپنے پرچے کو بھی دیجیے۔ اُسے اپنے ساتھیوں کو دکھائیے۔ اسے مقبول بنائیے۔ خریدار بڑھائیے۔

بمبئی میں اُردو کے شیدائیوں نے گلستان گوہر کے نام سے ایک بزم بنائی ہے "کھلتی کلیاں" بمبئی اور اُردو ٹائمس بمبئی کے بہترین مضمون لکھنے والے کو ہر مہینے انعام دیا جاتا ہے۔ انعام میں بچوں کا کوئی رسالہ سال بھر کے لیے جاری کر دیا جاتا ہے۔ اس مرتبہ اس انعام کے مستحق محمد اسلم نوگانوی قرار پائے ہیں اور "بزم گوہر" نے از راہِ نوازش ان کے نام سال بھر کے لیے پیام تعلیم جاری کر دیا ہے اور وعدہ کیا ہے کہ آئندہ کے لیے بھی پیام تعلیم ہی انعام کے طور پر دیا جائے گا۔ ہم اس نوازش کے لیے جنرل سکریٹری صاحب کے ممنون ہیں۔

جناب اطہر عزیز

معصوم تمنّا

میرے مالک مری تمنّا ہے
ایک ایسا چمن بنا دے تو
جس میں خوشیوں کے پھول ہی مہکیں
بخش پھر اُن کو اتنی رعنائی
ہر طرف بس مہک انھی کی ہو
جھوم اُٹھے کلی کلی ہنس کر
مسکرائے وطن کا ہر ذرّہ
دشمنی کا کہیں نشان نہ ہو
کہیں بغض و حسد کا نام نہ ہو
کوئی شعلہ نہ جنگ کا بھڑکے
سسکیاں لے نہ امن کی دیوی
لب پہ ہر ایک کے تبسّم ہو
دل میں ہر شخص کے محبّت ہو
ہو سکے تو مری ہنسی لے کر
ایک گلشن سجا دے ایسا ہی
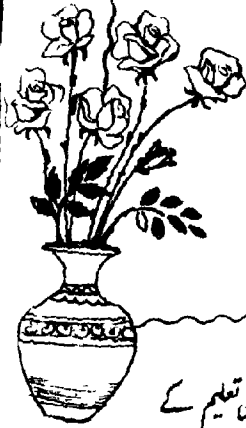
جناب عبدالرشید صاحب (ام۔ اے)، ایک عرصہ تک جامعہ میں بالغوں کی تعلیم کے سلسلے میں کام کر چکے ہیں۔ بہت دنوں تک آر، ٹی، بی (ریسرچ ٹریننگ اینڈ پروڈکشن سینٹر) کے انچارج رہے ہیں۔ آج کل یونسکو کی طرف سے ایران تشریف لے گئے ہیں۔ اصفہان میں قیام ہے۔ جامعہ میں اپنے عزیزوں کو خط لکھتے رہتے ہیں۔ یہ خط نجی ہوتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی ان میں ایران کے بارے میں بہت دلچسپ معلومات ہوتی ہیں۔ نیچے کے خط میں وہاں کے نوروز کا حال ہے۔ دیکھیے کتنا دلچسپ ہے۔ ہم محترم ارشادالحق صاحب کے ممنون ہیں۔ انھوں نے خط کے اس حصّے کو اشاعت کی اجازت مرحمت فرمائی ہے۔ پیامیوں نے یہ سلسلہ پسند کیا تو ہم ان کے اور بیگم عبدالرشید (عزیزہ حامدہ خاتون) کے اور بھی خط شایع کریں گے یہ بھی بہت دلچسپ ہیں۔

"ایڈیٹر"

آج کل یہاں پر ہر شخص نوروز کی تیاریاں کر رہا ہے۔ ۲۱ر مارچ کو پرانا سال ختم اور ۲۲ر مارچ کو نیا سال شروع ہو جائے گا۔ اور اسی کے ساتھ فصل زمستان (جاڑوں کا موسم) کا اختتام اور فصل بہار کا آغاز ہوگا۔ ایران میں چار فصلیں (موسم) ہوتی ہیں۔ اصفہان کی یہ خوبی ہے کہ ہر فصل اپنی جگہ مکمل فصل ہوتی ہے۔

چند دنوں سے موسم یکایک تبدیل ہوگیا۔ درختوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے فصل بہار کی آمد آمد ہے۔ یہاں سرو کو چھوڑ کر تمام درخت برہنہ (ننگے ہو جاتے ہیں یعنی پتے جھڑ جاتے ہیں) ہو جاتے ہیں۔ گھاس پھوس سب خشک ہو جاتی ہے۔ فصل بہار آتے ہی درختوں میں نئی کونپلیں پھوٹنے لگتی ہیں۔ کل میں بھی دس روپے کے گل لایا۔ مزدور پھیری کرتے رہتے ہیں۔ دو مزدوروں کو بلا کر زمین ٹھیک کروائی چار روپے مزدوری دی۔ میرے خیال میں آدھے گھنٹے میں ان لوگوں نے زمین ٹھیک کر دی۔ یہاں چار روپے

کی کوئی خاص حیثیت نہیں ہے۔ یومیہ (روزانہ) مزدوری
پندرہ سے بیس روپے تک ہے۔

زمین ہموار ہونے کے بعد مالک خانہ کے نانا
نے پودوں کو نصب کیا۔ مختصر یہ کہ ہر شخص مکان کی صفائی
کرتا ہے آرایش کا انتظام کرتا ہے۔ کیاریوں میں پھول لگاتا
ہے۔ ممکن ہوتا ہے تو پھول دار گملے بازار سے خرید کر
لاتا ہے۔ آج کل "شب بو" (غالباً رات کی رانی) گملوں
میں ملتے ہیں۔ سفید سرخ، گلابی، بیگنی لمبے لمبے پھول
ہوتے ہیں۔ رات میں خوشبو زیادہ دیتے ہیں۔ ایک گملہ
تین روپے میں ملتا ہے۔

ہر شخص اپنے لیے اور اپنے بال بچوں کے لیے
ایک جوڑا نیا کپڑا ضرور بنواتا ہے۔ یوں سمجھیے کہ ہر وہ چیز
جو عید کے موقع پر ہندوستان میں ہوتی ہے وہ یہاں عید
نوروز کے موقع پر ہوتی ہے۔ عید نوروز یہاں کی پرانی
رسم ہے۔ اسلام سے بھی پہلے کی۔

یہاں عید فطر اور عید قرباں کی اہمیت بہت
ہی کم ہے۔ لوگ نماز پڑھتے ہیں۔ قربانی کرتے ہیں اس
کے علاوہ اور زیادہ نہیں۔ حج اور قربانی کو شادی کے بعد
فرض سمجھا جاتا ہے۔ امسال بیس ہزار اشخاص حج کرنے
گئے ہیں۔

حج کو یہاں کے شیعہ حضرات فرض سمجھتے ہیں اور
کربلا کی زیارت کو سنّت رسولؐ کی اہمیت اسی طرح ہے
جس طرح ہندوستان میں سنیوں کے نزدیک رسول کے
بعد (بی بی) فاطمہ اور حضرت علیؓ کی اور درجہ بدرجہ امام
حسنؓ امام حسینؓ اور دوسرے نو اماموں کی۔۔۔۔۔۔۔

اوپر آپ ایران کے نوروز کا دلچسپ حال پڑھ چکے ہیں

ابھی ابھی ہمیں ایک اور خط ملا۔ یہ
بیگم رشید یعنی عزیزہ حامدہ خاتون
کا ہے۔ اس میں نوروز کے بارے
میں کچھ اور دلچسپ باتیں آپ پڑھیں
گے۔ نوروز کے علاوہ وہاں کی زندگی
کے کچھ اور حالات بھی ہیں۔ ان سے
آپ کو اس ملک کے رہن سہن، رسم
رواج کا اندازہ ہوگا۔ یہ خط بھی ہمیں
محترم جناب ارشاد الحق صاحب کی
نوازش سے ملا ہے۔

"ایڈیٹر"

بہت دن ہوئے آپ کا خط آیا تھا۔ مگر حسب معمول
جواب میں دیر ہوگئی۔ ہم لوگ اچھے ہیں۔ بٹیا کئی بار بیمار ہوئیں
اب اچھی ہیں اور عید نوروز منانے میں مصروف ہیں۔ یہاں عید و
بقرعید کا نام و نشان نہیں ہے۔ سنا ہے مومن لوگ مناتے
ہیں۔ مگر میری کسی سے ملاقات نہیں۔ اس لیے عید وغیرہ
کا پتہ ہی نہ چلا۔

البتہ نوروز کی دھوم تین مہینے پہلے سے تھی،
اور نوروز ختم ہوئے دو ہفتے گذر چکے ہیں مگر ابھی تک عید
کا سا سلسلہ جاری ہے۔ اور ہمارے یہاں تو بہت دن چلے
گا۔ بہت سے ملنے والے شیراز، مشہد، تہران وغیرہ
گھومنے چلے گئے ہیں۔ جب وہ واپس آئیں گے تو دیر سے گھر
آئیں گے اور مجھ کو بازدید کے لیے جانا لازم ہوگا۔

اس نوروز نے دیوالہ نکال دیا ہے۔ ہر بچے کو
عیدی دس دس روپے دینا پڑی۔ اس طرح پتہ نہیں کتنا
روپیہ خرچ ہوگیا اور پھر مہمانوں کی پذیرائی تو مصیبت

ہوگئی ہے۔ اپنے ہاں ذرا سی چیز میں کام چل جاتا ہے اور یہاں
بس کچھ نہ پوچھیے۔ پستے مونگ پھلی کی طرح کھاتے ہیں۔
عموماً پھل پستے انگریزی مٹھائیوں، حلوہ سوہن، نان خطائی
کی قسم کی کئی چیزوں۔ بھنے ہوئے گیہوں اور آجیل سے
تواضع کی جاتی ہے۔ آجیل میں کدو، خربوزے، تربوز کے
بیج، بھنے چنے، بادام، پستے ہوتے ہیں۔ پیسٹری ہوتی ہے۔
یہ سب سامان ہر بار سیروں کے حساب سے آتا ہے اور ضائع۔
یہاں مہمان جب تک بیٹھتا ہے کھانے کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔
کل میں نے چار مہمانوں کے لیے ایک کلو گوشت کے
کباب پکائے اور آپ کو تعجب ہوگا کہ ایک کباب بھی نہیں بچا۔
ایک کلو گوشت کا مطلب ہے بارہ روپیے۔ یہاں گائے کا گوشت
کھانا ویسا ہی برا سمجھا جاتا ہے جیسے کسی زمانے میں ہم لوگوں کے
ہاں سمجھا جاتا تھا۔ صرف غریب لوگ کھاتے ہیں۔ وہ آٹھ روپیہ
کلو ہے دس روپیہ کلو مرغ کا گوشت ہے۔

تین روز کے بعد ۱۳ تاریخ کو سب گھر سے باہر جائیں
گے، پکنک منانے۔ لہٰذا بٹیا صاحبہ نے ابھی سے تیاری شروع
کر دی ہے بہت خوش ہیں مگر ہندوستان کی یاد بھی آج کل بہت
زیادہ ہے۔ سردیاں کم ہو گئی تھیں مگر پھر برف باری شروع ہو گئی
اور سردی پلٹ آئی۔

اب یہاں بہار کا موسم شروع ہو رہا ہے۔ کیاریوں میں
نئے پودے لگائے گئے ہیں۔ سارے گھروں میں کیاریاں لازمی ہیں۔
اور نوروز سے پہلے ہر جگہ پھولوں کے پودے لگائے جاتے ہیں
بڑے خوبصورت برتنوں میں گیہوں جمائے جاتے ہیں اس حساب
سے جاتے ہیں کہ نوروز میں خوب بڑے اور سبز ہو جاتے ہیں۔ اس
میں سرخ ربن باندھ دیے جاتے ہیں۔ بہت ہی اچھے لگتے ہیں۔
ہر گھر میں اس کا ہونا لازمی ہے۔ بٹیا کے لیے ان کی نئی
معلم اور ماہین خانم نے تیار کیا تھا۔ آج کل بٹیا کو
کمرے کی بڑی شدت سے ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ اپنے گھر
کی تصویریں بھیجیں۔

پھول سجانا یہاں بہت ضروری ہے۔ یہاں پھولوں
کی اتنی بڑی دکانیں ہیں کہ کیا بتاؤں۔ جاڑوں میں پھول پتی کا نام و
نشان نہیں رہتا مگر ان دکانوں سے ہر قسم کے گملے اور پھولوں
کے گلدستے جب چاہے لے لیجیے۔

ایک شام کا لطیفہ سنیے! ایک وقت میں سولہ مرد اور
عورتیں آگئیں۔ ڈرائنگ روم میں ظاہر ہے اتنی کرسیاں کہاں سے
ہوتیں۔ کھانے کی کرسیوں سے اور اسٹولوں وغیرہ سے کام
چلایا گیا۔ برتن وغیرہ بہت کافی ہیں۔ کھانے کا سامان بھی بہت
تھا۔ مگر چائے کا پانی جونہی پکنے پر آیا تو گیس ختم ہو گئی۔ ہاتھ پاؤں
پھول گئے۔ جلدی سے بخاری پر پانی رکھا اس میں بھی تیل ختم
ہو چکا تھا۔ غرض کچے پانی کی چائے سب کو پلائی۔ اپنے گھر جا کر
"ہندی چائے" کی تعریف کریں گے!

یہاں کا دستور عجیب ہے کھانے کی چیزیں بار بار
مہمانوں کے سامنے پیش کی جاتی ہیں۔ ہر بار نئی تشتریاں بھی دی
جاتی ہیں اور چھری کانٹے بھی۔ کام بہت بڑھ جاتا ہے وہ تو
کہیے کہ برتن بہت ہیں وقت کے وقت دھونے کی ضرورت نہیں
ہوتی۔ بعض جگہ تو برتن دھلتے جاتے ہیں اور مہمانوں کے سامنے
آتے جاتے ہیں۔

محرم آج چاندنی رات ہے۔ محرم کا مہینہ شروع ہو گیا۔
ہندوستان میں ہر جگہ مجلسیں ہو رہی ہوں گی۔ مگر یہاں
لوگ حسب معمول گھوم پھر رہے ہیں۔ اس وقت ملکہ مکان پکچر دیکھنے
گئی ہیں۔ بٹیا بھی ان کے ساتھ گئی ہیں۔ یہاں گاؤں میں سنا ہے
تعزیہ داری ہوتی ہے۔ شہر میں نہیں ہوتی۔ مسجدوں میں مجلسیں ہوتی
ہیں جسے یہ لوگ روضہ خوانی کہتے ہیں۔ جس کو سننا ہوتا ہے وہ وہیں
جاتا ہے۔ گھر میں مجلس نہیں ہوتی۔ نہ ہمارے ہاں کی طرح

عورتیں ماتم کرتی ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ سینما وغیرہ کا کچھ وقت مقرر کردیا گیا ہے۔ دس روز تک شراب فروشی وغیرہ پر پابندی لگادی جاتی ہے۔ دس تاریخ کو سارے ہوٹل اور دکانیں بند ہوجاتی ہیں کاروبار مکمل طور پر بند ہوجاتے ہیں۔ زنجیری ماتم ہوتا ہے۔ مگر ہندوستان جیسی شیعیت کہیں نظر نہ آئی۔

مجھے یہاں کھانے کی بڑی تکلیف ہے۔ ارہر اور ماش کی دال یہاں نہیں ملتی۔ گوشت میں نے بالکل چھوڑ دیا ہے۔ یہاں گوسفند یا دُنبے کا گوشت ملتا ہے جس میں، پتہ نہیں کیسی بو یا (ہیک) آتی ہے طبیعت منغص (بدمزہ) ہوجاتی ہے۔ . . .

آج کل کوئی ترکاری نہیں ملتی۔ اتنی سخت سردی میں ہر چیز خشک ہوجاتی ہے۔ اس عرصہ میں اتنا کاہو (سلاد) کھایا کہ زندگی میں نہ کھایا ہوگا۔

یہاں چھ چھ سیر سلاد ایک ایک گھر میں آتا ہے اور یہ لوگ پتے توڑ توڑ کر سکنجبن میں ڈبو ڈبو کر کھاتے ہیں۔ اس طرح چند منٹ میں ساری سلاد ختم ہوجاتی ہے۔ ان لوگوں کے کھانے بالکل اسی زمانے کے ہیں۔ جب شاید انسان نے کھانا پکانا سیکھا ہوگا۔ کلیجی کو سیخ میں چبھو کر چند منٹ سینکا اور نمک چھڑک کر روٹی کے ساتھ کھالیا۔ گوشت کے ٹکڑے یا بوٹیاں بھی اسی طرح مصالحے وغیرہ کا کوئی سوال ہی نہیں، من بھر شلجم اُبالے نمک ڈال کر کھا گئے۔

میں نے طہران سے ڈبوں والی ترکاری منگائی جو پکا کر ڈبوں میں بند کردی جاتی ہے۔ بہت مزے کی تھی مگر مرچیں تھیں۔ لہٰذا وہ بھی بے کار۔ اب تو آلو، انڈے اور ڈبے کے مٹر میرا کھانا ہے۔ ڈبا دو روپے میں آتا ہے اور اس میں مشکل سے ایک چھٹانک مٹر ہوتی ہے۔

اس خط کو شروع ہوئے تین دن ہو چکے ہیں۔ بٹیا صاحبہ کی معلمہ بٹیا کو اصفہان سے باہر لے گئیں ہیں۔ شاید کل واپس آئیں۔ میں نے معلمہ صاحبہ کی مروت سے بٹیا کو ساتھ کردیا۔

مگر اب ہول آرہا ہے۔ آج برف باری کے آثار ہیں اور برف باری کی وجہ سے راستوں میں بڑے حادثے ہوجاتے ہیں۔ معلمہ خود اپنی موٹر سے گئی ہیں۔ اس لیے اور بھی وحشت ہے۔

یہاں شہر کے باہر کوئی باقاعدہ سڑک نہیں۔ ہر طرف پہاڑ ہی پہاڑ ہیں۔ اسی میں اونچے نیچے راستے ہیں برف باری ہوجاتی ہے تو موٹریں راستے میں پھنس جاتی ہیں۔ خیر اللہ مالک ہے۔

آپ لوگوں کو گیس مل گئی یا کوئلوں پر کھانا پکانا پڑتا ہے یہاں گیس تو اتنی سستی ہے کہ جی چاہتا ہے سب کے لیے یہاں سے بھیج دیا کروں۔ دس روپے کا ایک ڈرم جو ایک مہینہ کے لیے کافی ہوتا ہے۔ مٹی کا تیل بھی پانی کی طرح استعمال کیا جاتا ہے ہر گھر میں پانی گرم کیا جاتا اور بخاریاں جلتی ہیں میرے یہاں کل تین آدمی ہیں مگر مہینے میں دو سو روپے کا تیل خرچ ہوتا ہے۔

یہاں تیل کا ایک پیپا ساڑھے چار روپے میں آتا ہے۔

جس طرح آپ انگیٹھی میں آگ لے کر بیٹھتے ہیں اسی طرح یہاں ایک برتن میں کوئلے دہکاتے ہیں۔ پھر اسے راکھ سے ڈھانک دیتے ہیں۔ اُسے کمرے کے بیچ میں رکھتے ہیں۔ اس کے اوپر لکڑی کا ایک جالی دار صندوق رکھ دیتے ہیں۔ اس صندوق پر بہت بڑا سا لحاف ڈال دیتے ہیں اور اس کے چاروں طرف بیٹھ جاتے ہیں۔ رات کو اسی کے اندر سو جاتے ہیں۔ مگر ہم لوگ اس طرح نہیں سو سکتے...... یہاں سمنک ملتی ہے۔ گھر میں بھی بنائی جاتی ہے۔ نوروز کے زمانے میں سمنک کا پکانا ضروری ہے۔ بغیر شکر کے سمنک کا پکاتے ہیں۔ سمنک کی ہلکی مٹھاس ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ چھ دوسری چیزیں ہوتی ہیں جن کے نام سین سے شروع ہوتے ہیں۔ یہ ہفت سین کہلاتا ہے۔

جناب انور علی سوز

طلبائے رورل انسٹی ٹیوٹ سے

رورل انسٹی ٹیوٹ کے سالِ آخر کے طالب علموں کے
الوداعی جلسہ میں پڑھی گئی ۔ انور علی خاں سوز

ایک مدت سے جس کی خواہش تھی — دوستوں شبھ گھڑی وہ آپہنچی
یہ گھڑی گرچہ امتحان کی ہے — آگے بڑھنے کا یہ پیام بھی ہے
یہی وہ امتحان ہے جس کی — تم نے کی تین سال تیاری
سامنے اب ہے آخری منزل — کامیابی، بڑھو کرو حاصل
رات اور دن کی جاں فشانی کا — ملنے والا ہے شاندار صلہ

اپنے استادوں کی دعاؤں سے
تم کو اللہ کامیاب کرے

بھول جانا نہ تم مگر ہرگز — ختم ہوتا نہیں سفر ہرگز
نئی راہوں میں زندگانی کی — اب دکھانی ہے تم کو جولانی
قافلہ مستقل رواں ہوگا — ہر قدم پر اک امتحاں ہوگا
زندگی ابتدا سے آخر تک — مستقل امتحان ہے بے شک
اور اس کے سوا کہوں کیا میں — یاد رکھنا سدا کہ دنیا میں

امتحانوں سے جو نہ گھبرائے
بس وہی کامیاب کہلائے

طالب علم ہے وہی سچا — علم کا جو رہا سدا جویا
پیاس اس کی کبھی نہیں بجھتی — علم ہوتا ہے زندگی اس کی
اس نے جس جس سے علم سیکھا ہو — بھول سکتا نہیں کبھی ان کو
مجھ کو پورا یقین ہے تم بھی — جامعہ کو بھلاؤ گے نہ کبھی
اے عزیزانِ رورل انسٹی ٹیوٹ — تم سے سمبدھ ہے ہمارا اٹوٹ

ہم جہاں ہوں یہی دعا دیں گے
تم جہاں ہو رہو سعادت سے

جناب رضوان احمد، بارہ بنکوی

انوکھا انتقام

بھلا بیمار کے پڑوس میں ڈاکٹر ہو اور مریض دوا کے لیے تڑپتا رہے اس کے گھر والوں کی یہ آرزو دل ہی میں رہ جائے کہ ڈاکٹر صاحب مریض کو صرف ایک نظر دیکھ لیں۔ ہے نا تعجب کی بات مگر یہ سب دولت کے کرشمے ہیں۔ غریب کو کون پوچھتا ہے۔ کمار کے باپ بھی غریب تھے۔ کمار کے پاس پیسہ ہوتا تو وہ اپنے باپ کے لیے اچھی سے اچھی دوائیں لاتا انھیں پھل کھلاتا۔ طاقت پہنچانے والی غذائیں کھلاتا۔ پڑوس سے ڈاکٹر کو بلا کر لاتا اور ان کی ہتھیلی پر تیس روپیہ رکھ دیتا لیکن کمار کے لیے تیس روپیہ تو خواب تھے۔ اس کے باپ چارپائی پر تڑپ رہے تھے ان کا سارا جسم بخار میں بھٹی کی طرح دہک رہا تھا۔ کمار کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ غریبی نے اسے بے بس کر دیا تھا۔ بے چارہ پندرہ سولہ سال کا لڑکا کرتا بھی کیا۔ اس کے باپ کی چھوٹی سی پرچون کی دوکان تھی۔ دو چار روپے روز کی آمدنی ہو جاتی تھی اور اسی سے لشتم پشتم گذر بسر ہو رہی تھی۔ باپ کے بیمار ہونے سے دوکان بھی ٹھپ ہو گئی۔ کمار کا ننھا سا دماغ سوچتا تو بہت کچھ تھا۔ لیکن بے چارہ کر کچھ نہیں پاتا تھا۔

ایک بار اس کے والد نے اسے ایک وکیل نریش کمار کے پاس بھیجا۔ کمار نے دیکھا کہ لوگ ان کی کتنی عزت کرتے ہیں اس وقت کمار نے سوچا کہ وہ بھی بڑا ہو کر وکیل بنے گا۔

جب وہ روزانہ ڈاکٹر موہن داس کے مکان کے پاس سے گذرتا تو وہاں لوگوں کی ایک لمبی قطار نظر آتی اس وقت اس کا جی چاہتا کہ جلد سے جلد ڈاکٹر بن جائے لیکن غربت نے اس کا کوئی خواب پورا نہ ہونے دیا۔ اور وہ ایک جاہل اور گنوار بن کر رہ گیا۔

کل کمار ڈاکٹر موہن داس کے پاس گیا تھا۔ انھوں نے اسے عدیم الفرصتی کا بہانہ کر کے واپس کر دیا اس کے واپس ہونے پر وہ دیر تک بڑبڑاتے رہے تھے۔

اس نے سوچا وہ ڈاکٹر موہن داس کے پاس پھر جائے۔ اور ان سے التجا کرے کہ پل بھر کے لیے ہی میرے والد کو چل کر دیکھ لیجیے۔ کمار نے سوچا میں نے بھی تو ڈاکٹر موہن داس کے نہ جانے کتنے کام کیے ہیں جب ان کا نوکر چھٹی پر چلا جاتا ہے۔ تو بازار سے سودا لا دیتا ہوں۔ ان کے بچوں کو کھلاتا ہوں کیا عجب جو ان کو رحم آجائے۔ یہ سوچ کر وہ ڈاکٹر صاحب کے کلینک کی طرف چل دیا۔ وہ باہر بیٹھے ہوئے دھوپ کھا رہے تھے۔ کمار ان کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ تو انھوں نے گھور کر دیکھا

"کیا بات ہے؟" انھوں نے پوچھا۔

"ڈاکٹر صاحب میرے والد کی طبیعت . . . . ."

کمار کا دل بھر آیا اور وہ آگے کچھ نہ کہہ سکا دو گرم گرم آنسو آنکھوں سے ٹپک پڑے۔

"میں نے کہہ دیا تھا مجھے فرصت نہیں ہے کیوں بار بار

دماغ چاٹ رہے ہو۔"
"ڈاکٹر صاحب ۔ ۔ ۔ " اس نے بے بسی سے ان
کی طرف دیکھا لیکن کچھ کہہ نہ سکا ۔
بے کار وقت برباد کر رہے ہو۔"
وہ ذرا بھی نہ پگھلے کمار کے آنسوؤں سے ان پر کوئی
اثر نہ ہوا۔ کمار کا دل ڈاکٹر کے خلاف نفرت سے بھر گیا۔ وہ اپنے
باپ کو موت کے چنگل سے نہ بچا سکا۔ وہ اسے اس دنیا میں یکہ و
تنہا چھوڑ کر چل دیئے۔ ان کے علاوہ اس کا دنیا میں تھا ہی
کون؟ ڈاکٹر موہن داس کے دیکھنے سے اس کے باپ بچ تو نہ
جاتے کم از کم کمار کو کچھ تسلی ہو جاتی۔ ڈاکٹر کے خلاف اس کے
دل میں نفرت کا سمندر موجزن تھا۔ اس کا دل ڈاکٹر موہن داس
سے بدلہ لینے کے لیے بے قرار تھا۔

اس نے دوکان چھوڑ دی تھی۔ کرایہ ادا کرنا اس کے
بس سے باہر تھا اتنی آمدنی ہی نہیں ہوتی تھی۔ کمار نے سر پہ ٹوکری
رکھ کر گلی گلی پھل بیچنے شروع کر دیئے۔ جب وہ آوازیں لگاتا
تو اس کا جی چاہتا کہ وہ پکار پکار کر کہے کہ وہ وکیل، ڈاکٹر یا
انجینیر بن سکتا تھا۔ لیکن میرے مستقبل کو تباہ کرنے کی ذمہ داری
ڈاکٹر موہن داس پر ہے۔ شام کو جب وہ تھکا ہارا اپنی جھونپڑی
میں واپس آتا تو سامنے والے لان میں ڈاکٹر کا خوبصورت
بچہ اسے ہنستا کھیلتا ہوا نظر آتا اس وقت کمار کا جی چاہتا کہ وہ
اس کی گردن پر انگلیاں جما دے، انگلیوں کا دباؤ بڑھتا جائے
یہاں تک کہ اس کا دم گھٹ جائے اور جب ڈاکٹر اپنے بال نوچ
رہے ہوں گے آنسو بہا رہے ہوں گے تو ان کو دیکھ کر وہ کتنا خوش
ہوگا اس وقت ڈاکٹر کو معلوم ہو جائے گا کہ دکھ درد کیا ہے؟
مگر پھر اسے خیال آتا کہ اس بے چارے بھولے بھالے بچے نے کیا
کیا ہے اور اس کی سیدھی سادھی ماں نے اس کے ساتھ
کون سی برائی کی ہے۔ نفرت تو اسے صرف ڈاکٹر
موہن داس سے ہے بدلہ ان سے ہی لیا جا سکتا ہے مگر وہ ڈاکٹر
موہن داس سے بدلہ کیسے لے سکے گا۔

ایک رات وہ بے خبر سو رہا تھا کہ لوگوں کی چیخ
پکار سے اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ آنکھیں مل کر اٹھا اور
تیزی سے باہر نکل آیا۔ اس نے دیکھا کہ ڈاکٹر موہن داس کے
مکان سے آگ کی لپٹیں نکل رہی ہیں پورا گھر آگ سے گھر گیا ہے
چیخ پکار مچی ہوئی ہے۔ لوگ آگ پر قابو پانے کی کوشش کر رہے
لیکن شعلے بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔ ڈاکٹر اپنا سر پیٹ رہے
ہیں ان کی گھر کی بربادی ان کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں لیکن وہ
کچھ کر نہیں سکتے۔ سامنے ہی لوگ ان کی بیوی کو سنبھال رہے ہیں
لیکن نہ جانے کیوں وہ آگ میں کود جانا چاہتی ہیں۔ وہ چیخ
چیخ کر کہہ رہی ہیں۔

"کوئی میرے بچے کو بچا لے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں
مر جاؤں گی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کوئی میرے بچے کو بچا لے ۔ ۔ ۔
کوئی میرے بچے کو بچا لے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

ان کی دلخراش آواز سن کر کمار کا دل کانپ اٹھا
لوگ اس طرح خاموش کھڑے تھے جیسے کوئی کچھ سن ہی نہیں رہا ہو
ڈاکٹر موہن داس اپنا سر پیٹ رہے تھے۔

"میرا بچہ ۔ ۔ ۔ ۔ میرا بچہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کوئی
اسے بچا لے ۔ ۔ ۔ ۔"

اس وقت کمار کے کانوں میں اس کے باپ کی
نحیف آواز آئی۔

"وہ انسان نہیں جو دوسروں کی بربادی پر خوش
ہو، بلکہ انسان وہ ہے جو مصیبت میں دوسروں کے کام آئے۔"

وہ شعلوں میں گھستا چلا گیا۔ ڈاکٹر موہن داس
اور اس کی بیوی کی دلخراش چیخیں اس کے کانوں سے ٹکرا
رہی تھیں۔ لوگ یہ بھی نہ جان سکے کہ وہ ڈاکٹر کا

بقیہ ص ۳۹ پر

جناب خالد عرفان

ہوا کا کمال
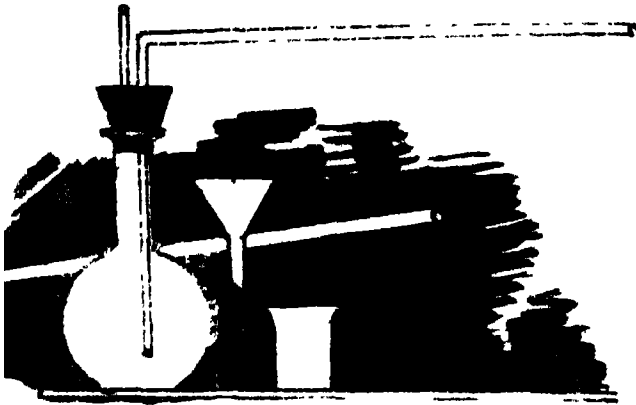
آپ نے امتحان سے فراغت پالی ہوگی، اب تو دن رات میں ہی چین ہوگا۔ سیر سپاٹے، کھیل کود اور دیر تک سوتے رہنے کے سارے ارمان پورے کرنے کے خواب دیکھ رہے ہوں گے۔

یہ کیا؟ ابا جی نے اجازت دے بھی دی، اپیا اور بھیا نے جان بوجھ کر نظریں چرا بھی لیں تو قدرت کے سپہ سالار آپ کو کب اجازت دیں گے؟ سورج چمکے گا تو اس قدر گرمی ہوگی کہ پسینہ چھوٹنے لگے گا۔ ہوا — اول تو چلے گی ہی نہیں، چلی بھی تو اس قدر گرم ہو کر کہ سانس تک کو جھلسا کر رکھ دے گی — یہ تو رہا دن کا حال، رات جو آئی تو اپنے ساتھ مچھر اور کیڑے مکوڑے لائی۔ ان کا حملہ اس قدر سخت ہوگا کہ بس آپ بستر چھوڑ کر کھڑے ہو جائیں گے اور پمپ لے کر جراثیم کش دوائی کا چھڑکاؤ کرنے لگیں گے کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔

پر ان کیڑے مکوڑوں کا بھی کیا قصور، زمین کے اوپر جب اتنی گرمی پڑ رہی ہو تو زمین کے اندر ان کے بلوں میں بھٹی ہی سلگ رہی ہوگی۔

خیر صاحب! چھڑکاؤ سے مچھر اور کیڑے مکوڑے مریں یا نہ مریں، آیئے اسی چھڑکاؤ سے متعلق ایک راز کی بات بتا دوں، پر ہنس نہ دینا! یہ جب آپ پمپ سے چھڑکاؤ کرتے ہیں یا نہیں جب آپ بال کٹوانے کے لیے حجام کی دوکان پر جاتے ہیں تو آپ نے دیکھا ہوگا حجام آپ کے بال بھگونے کے لیے بوتل سے لگے پمپ سے سر پہ

فوارے کی شکل میں پانی کی دھار ڈالتا ہے تو اس چھڑکاؤ کے پیچھے بھی وہی اصول کام کر رہا ہے جس کے بل پر ہوائی جہاز فضا میں اٹھا رہتا ہے اور اڑتا ہے — دیکھئے آپ نے ہنسی نکال ہی دی! میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں نہ یہ کوئی نئی بات ہے! اس راز کو تو اب سے دو سو سال پہلے سویڈن کے ایک ریاضی دان نے جان لیا تھا۔ اس کا نام تھا ڈینیل برنولی DANIAL BERNOULLI اسی اصول کو اپنا کر آج راکٹ تک چھوڑے جا رہے ہیں! اور جناب یہ اصول ہے بالکل معمولی۔ سنیں گے تو ضرور مسکرا دیں گے

ہوا اور پانی دونوں بہتے ہیں نا! اسی لیے ان کو "سیال" کہا جاتا ہے۔ ہاں تو جب بھی کسی "سیال" شئے کے بہاؤ کی رفتار بڑھ جاتی ہے۔ اس کا اندرونی دباؤ کم ہو جاتا ہے۔ آپ سوچتے ہوں گے کہ بالکل غلط! آپ کا تجربہ تو کچھ اور کہتا ہے۔ یہی نا کہ ساکن ہوا میں تو آسانی سے بائیسکل چلائی یا دوڑ لگالی لیکن تیزی سے بہتی ہوا کی مخالف سمت میں نہ بائیسکل ہی چلائی گئی نہ دوڑنا آسان رہا۔ اسی طرح تیز رفتار سے بہنے والے پانی کی الٹی سمت میں تیرنا یا کشتی چلانا بھی کونسا آسان ہے۔؟ ہاں بھئی آپ کا کہنا بجا، پر اصل میں یہ سارا جھگڑا ہماری آپ کی سمجھ کا ہے۔ ہم جب بھی دباؤ کی بات کرتے ہیں۔ اس کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں۔ اب اسی بہنے والی ہوا اور پانی کو لیجیے یہ بھی دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک تو ہوتا ہے بیرونی یا

متحرک اور دوسرا ہے اندرونی ساکن۔ سمجھے نہیں۔ فرض کیجیے آپ سمندر کے کنارے کھڑے ہیں کہ اونچی موج اٹھی، پانی کا ریلا آیا اور آپ سے ٹکرایا۔ ٹکر سے آپ گر پڑے، کیوں؟ پہلے پانی کا دباؤ زور دار تھا۔ یہ رہا متحرک دباؤ یا خارجی دباؤ لیکن اس کے علاوہ پانی کے ذرات کے درمیان ایک ذرے سے دوسرے پر جو اندرونی دباؤ پڑے گا۔ وہ ہوگا اندرونی دباؤ یا ساکن دباؤ۔ تو بھئی یہ جو خارجی دباؤ ہوتا ہے وہ بھلے ہی بہاؤ کی طرف بڑھے لیکن اندرونی دباؤ ہمیشہ اسی قدر گھٹتا جائے گا جس قدر کہ بیرونی رفتار تیز ہوتی ہے۔

اگر اب بھی بات سمجھ میں نہیں آئی ہے تو آپ خود ایک آسان سا تجربہ کر لیجیے راز معلوم ہو جائے گا۔ دو سیبوں کو (سیب نہ سہی چھوٹی گیندیں ہی سہی) ڈور کے بل اس طرح لٹکا دیجیے کہ ان کے درمیان کوئی ڈیڑھ انچ کا فاصلہ رہے۔
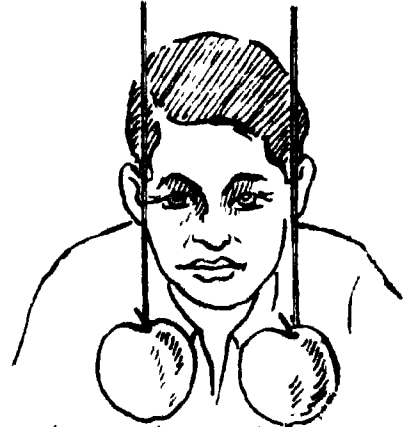
اب ان دونوں کے درمیان آہستہ سے پھونک ماریئے۔

بھلا بتائیے کیا ہوگا۔ آپ سوچتے ہوں گے وہ ایک دوسرے سے دور ہو جائیں گے۔ نہیں ہرگز نہیں! برنولی نے ٹھیک کہا تھا۔ وہ آپس میں ٹکرا جائیں گے! بھلا کیوں؟ — ہوتا یہ ہے سیبوں کے اطراف ہوا ساکن ہو رہی تھی۔ آپ نے درمیان میں جو پھونک ماری تو یہاں کی ہوا تیز رفتاری سے بہنے لگی اور یہاں کا دباؤ کم ہو گیا۔ لیکن باہر کی طرف ہوا ساکن ہی رہی اور اس کا دباؤ بڑھ گیا۔ اور اس نے سیبوں کو اندر کی طرف دھکیل دیا۔ ہے نا کمال!

آپ اس بات کو اور اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں اگر آپ کے ہاں بجلی کا پنکھا ہے وہی میز والا پنکھا چھت سے لٹکنے والا نہیں —

پنکھے کو میز پر رکھ دیجیے، اس طرح کہ اس کا رخ اوپر کی طرف ہو، اب پنکھے کو کھول دیجیے اور ہوا کے بہاؤ کے ساتھ ہی غبارہ چھوڑ دیجیے اگر آپ کا کہنا صحیح ہے تو تیز رفتار ہوا کے بہاؤ کے ساتھ ہی غبارہ چل نکلے گا۔ لیکن میری بات (میری نہیں، برنولی کی بات) صحیح ہے تو غبارہ وہیں کا وہیں جما رہے گا۔ ادھر ادھر بھی۔ غبارہ پنکھے سے نکلتی ہوا کے دائرہ میں ہی پھنسا رہے گا۔ نیچے اوپر ناچتا رہے گا لیکن نہ آگے بڑھے گا نہ پیچھے ہٹے گا اور نہ اس دائرے سے باہر نکل بھاگے گا۔

اس لیے کہ غبارے کے گرد کی ہوا تیز رفتار رہے گی اور اس طرح اس حصے میں دباؤ کم ہوگا۔ جب بھی غبارہ اس دائرے کے کنارے تک پہنچے گا۔ باہر کی کم رفتار ہوا کا دباؤ اس پڑے گا۔ اور وہ اندر کی طرف دھکیل دیا جائے گا۔

اور بھئی مزا تب آئے گا جب آپ پنکھے کو نیچے کی طرف کچھ ٹیڑھا کریں گے۔ غبارہ زمین کی کشش کی پروا کئے بغیر، پنکھے کی ہوا کے دائرے میں ہی کھنچا چلا آئے گا۔ یوں آپ نے پنکھے کو بہت ہی نیچا کر لیا تو ظاہر ہے زمین کی کشش ہوا کے دباؤ سے بڑی ہوگی۔ اور غبارہ نیچے آ رہے گا۔

جب بھی حمام فوارے سے آپ کے سر پر پانی کی پھوار برساتا ہے یا آپ جراثیم کش دوا کا چھڑکاؤ کرتے ہیں تو ہوتا یہ ہے کہ پمپ کے چلانے سے نلکے کی اوپری طرف سے ہوا تیز رفتاری سے نکل جاتی ہے۔ اس طرح یہاں کا اندرونی دباؤ کم ہو جاتا ہے۔ لیکن نچلی سطح پر دباؤ زیادہ ہوتا ہے اور اس طرح پانی یا دوا اوپر کی طرف چل نکلتی ہے۔ اور قوت سے باہر نکلتی ہے۔

بالکل اسی اصول پر طیارہ بھی فضا میں اوپر کی طرف اٹھتا ہے اور اسی قدر تیز رفتاری سے آگے کی طرف بڑھتا ہے۔ اچھا ایک بات بتائیے۔ یہ طیارہ جب اڑتا ہے تو آیا اس کے پنکھ کے اوپر بہنے والی ہوا اس کو سہارا دیتی ہے، اس کی اڑان میں مدد دیتی ہے۔ یا پنکھ کے نیچے کی؟ آپ فوراً کہہ دیں گے، پنکھ کے نیچے کی۔ نہیں بھئی، یہ غلط ہے۔ دراصل پنکھ کے اوپر جو ہوا خطرناک حد تک تیز رفتاری سے بہتی ہوتی ہے۔ وہی طیارہ کو نہ صرف فضا میں سہارا دیئے رہتی ہے بلکہ اس کو آگے بھی بڑھاتی ہے اس بات کو سمجھنے کے لیے ایک تجربہ کیا جا سکتا ہے۔

اس تجربے میں بھی بجلی کے اسی پنکھے کی ضرورت پڑے گی۔ اپنے بھیا سے کہہ کر موٹی جلد والی دو چار وزنی کتابیں لے آیئے۔ کھلے کاغذ کا ایک لمبا ورق لے لیجیے۔ کھلے ورق کے ایک سرے کو کتاب کے اندر اس طرح پھنسا دیجیے کہ بہت سا حصہ لٹکتا رہے۔ اب اس کتاب کو پنکھے سے کچھ فاصلے پر کھڑا کر دیجیے۔ کہ ورق والا حصہ پنکھے سے پرے رہے۔
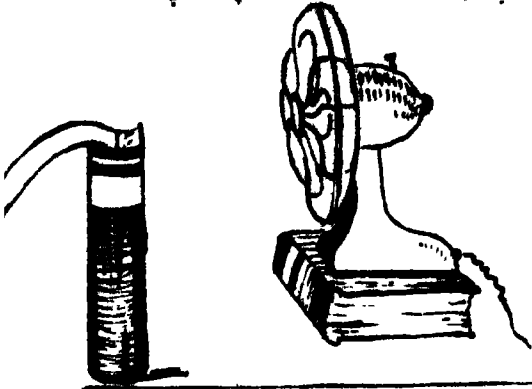
اگر آپ نے کاغذ میں اوپر کی طرف ہلکا سا خم دے لیا ہے۔ جیسا کہ طیارے کے پنکھ میں ہوتا ہے تو نتیجہ بہتر رہے گا۔

اب پنکھا چلا دیجیے اس طرح کہ ہوا کا رخ کتاب کی اوپری سطح کی جانب ہو۔ ہوا کے بہاؤ میں یوں کتاب رکاوٹ تو ثابت ہوگی لیکن اس کے اوپر سے وہ بڑی تیز رفتاری سے نکلنے لگے گی اس طرح کہ کتاب کے اوپر والی ہوا کا دباؤ کم ہو جائے گا۔ اب چونکہ پرلی طرف کتاب کے مقابل میں ہوا کا دباؤ درست ہے۔ اس کا دباؤ بڑھا ہوا ہوگا۔ اور وہ کاغذ کو اوپر کی طرف اچھال دے گا اس طرح کاغذ بالکل سیدھا ہو کر ہوا کے بہاؤ کے رخ پھڑپھڑانے لگے گا۔

پہلے پہل جب طیارے بنائے گئے اور اڑائے جانے لگے تو انجینئر سے لے کر پائلٹ اور سائنس داں تک حیران تھے کہ آخر وہ کون سی قوت ہے جس کی وجہ طیارہ فضا میں اٹھا رہتا ہے اور آگے بڑھتا ہے۔ آپ کی طرح وہ بھی یہی سمجھ بیٹھے تھے کہ ہو نہ ہو یہ پنکھ کے نیچے بہنے والی ہوا کا دباؤ ہے۔ جو طیارے کی رفتار کے ساتھ بڑھتا اور اس کو سہارا دیئے رہتا ہے کچھ اور لوگوں کا خیال تھا کہ پنکھ کے اوپر جو ہوا ہوتی ہے وہ کسی انجانی قوت کے ذریعہ پنکھ سے کٹ جاتی ہے اور اس طرح خلاء پیدا ہو جاتا ہے جس سے طیارے کو سہارا ملتا ہے۔ لیکن بعد کے تجربوں نے ان دونوں خیالوں کو غلط ثابت کر دیا۔ کئی ایسے تجربے کئے گئے جس سے ثابت ہو گیا کہ ہوا پنکھ سے علیحدہ نہیں ہوتی۔ بلکہ اس سے لگی رہتی ہے۔ بس اتنا ہوتا ہے کہ پنکھ میں جو درمیانی ابھار ہوتا ہے اس کی وجہ سے پنکھ کے اوپر کی ہوا بڑی تیز رفتاری سے بہنے لگتی ہے۔ اس طرح وہاں کا دباؤ گھٹ جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے طیارے کو فضا میں سہارا مل جاتا ہے اور وہ زمین کی کشش کے مقابل اوپر اٹھا رہتا ہے اور آگے بڑھتا ہے۔

آپ نے ایک پتہ کی بات جان لی، اگلی بار طیارے اور جٹ طیارے کی رفتار سے متعلق چند دلچسپ باتیں کریں گے

شمع ادب نہیں شمع اردو

اپریل کے پرچے میں پیام تعلیم کی ایجنسیوں کے پتے شایع ہوئے تھے۔ منوناتھ بھنجن کا پتہ مکتبہ شمع ادب غلط چھپ گیا ہے۔ صحیح پتہ "مکتبہ شمع اردو۔ منوناتھ بھنجن۔ یو۔پی" ہے۔

بوڑھا اور شیر

جناب مناظر عاشق ہرگانوی

[صوبہ بہار کے جنوبی حصے (چھوٹا ناگپور) میں بسنے والی اوراؤں، منڈا، برہوا وغیرہ ذاتوں میں یہ کہانی عام طور پر بڑوں اور بچوں کو سنائی جاتی ہے ـــــ مناظر عاشق]

ایک دن ایک بوڑھا آدمی جنگل کے کنارے ہل بنا رہا تھا۔ وہ اپنی ردکھانی ایک طرف رکھ کر بسولے سے ہل کی لکڑی چھیلنے کا کام لے رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اسے رکھانی کی ضرورت پڑی۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر کی تلاش کے بعد اسے رکھانی مل گئی۔ وہ اس کے بالکل نزدیک پڑی ہوئی تھی۔ مگر بوڑھے کو نظر نہ آئی تھی۔ بوڑھا اپنی بینائی اور بڑھاپے کو کوستے ہوئے بڑبڑایا۔

"میں بوڑھا ہوگیا ہوں، میری بینائی قریب قریب ختم ہوگئی ہے پھر بھی مجھے کوئی شیر نہیں کھاتا ہے۔"

اتنے میں جنگل سے ایک شیر نکلا۔ اس نے بوڑھے کی بڑبڑاہٹ سن لی تھی۔ بوڑھے کے بالکل نزدیک پہنچ کر شیر نے کہا۔ "میں تمھیں کھانے کے لیے آیا ہوں۔"

بوڑھے نے شیر کو اپنے سے بالکل نزدیک دیکھا اور اس کی آواز سنی تو مارے خوف کے اس کی آدھی جان نکل گئی۔ اس سے کچھ بولا نہ گیا۔ وہ اپنی جان بچانے کی فکر میں پڑ گیا۔ جان سب کو پیاری ہوتی ہے۔

تھوڑی دیر بعد شیر نے پھر کہا۔ "اچھا تو میں تمھیں کھانا شروع کرتا ہوں۔"

بوڑھے نے ذرا ہمت پیدا کرکے کہا۔ "نہیں بھائی تم آج مجھے نہ کھاؤ۔ مجھے اپنی بیوی سے صرف ایک بار ملاقات کرنے دو۔ تین دن بعد پھر اسی جگہ آجاؤں گا۔ اس وقت تم مجھے کھا لینا۔"

شیر راضی ہوگیا اور اس نے بوڑھے کو جانے دیا۔
گھر پہنچ کر بوڑھے نے اپنی بیوی سے بہت اداس
ہوکر سب حال کہہ سنایا اس کی بیوی نے بوڑھے کو اطمینان
دلایا اور بولی "کچھ فکر نہ کیجیے، میں آپ کو بچالوں گی۔"
تین دن گذر گئے تو عورت نے بوڑھے کو اسی مقام
پر، جہاں وہ ہل بناتا تھا۔ بھیج دیا۔ اور خود ایک شکاری کا
بھیس بدل کر ہاتھ میں تلوار لئے اس مقام سے کچھ دور پر
کھڑی ہوگئی اور شیر کا انتظار کرنے لگی۔
شیر جنگل سے ناک چاٹتا ہوا نکلا۔ بوڑھے کو دیکھ کر
بہت خوش ہوا اور اس کے نزدیک پہنچ گیا۔
شکاری کے بھیس میں عورت نے شیر کی طرف اشارہ
کرکے بوڑھے سے پوچھا۔ "کیا وہاں پر شیر ہے؟"
شیر نے آواز سن کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ کچھ دور
اسے شکاری نظر آیا اور وہ ڈر کر دبک گیا۔ اس نے بوڑھے
سے کہلوایا۔ "یہاں پر شیر نہیں ہے۔"
شکاری نے پھر پوچھا "مگر وہاں پر شیر کی شکل
کی کونسی چیز دکھائی دیتی ہے؟"
شیر کے کہنے پر بوڑھے نے کہا۔ "وہ ایک درخت
کا تنا ہے۔"
شکاری نے پھر پوچھا۔ "مگر اس کے اوپر کان کی
طرح کیا دکھائی دیتا ہے؟"
شیر کے سکھانے پر بوڑھے نے کہا۔ "وہ پتیاں ہیں۔"
شکاری نے پھر کہا۔ "اچھا اس تنے پر ذرا کلہاڑی
سے مار دو تو سہی، دیکھوں کیسی آواز نکلتی ہے۔؟"
شیر نے بوڑھے سے کہا "آہستہ سے میری پیٹھ
پر مارو۔"
بوڑھے نے آہستہ سے اس کی پیٹھ پر
مار دیا۔

شکاری نے پھر کہا۔ "کچھ سنائی نہ دیا۔ ایک بار پھر مارو۔"
شیر نے بوڑھے سے کچھ اور زور سے مارنے
کے لیے کہا۔ بوڑھے نے موقع پا کر شیر کی گردن پر کلہاڑی
اس زور سے ماری کہ شیر وہیں ڈھیر ہوگیا۔

جناب حطوت رسول

مچھر

آئی ہے گرمی ، نکلے ہیں مچھر
سونڈیں ہیں ان کے یا کوئی خنجر
بھن بھن کرتے بھاگ رہے ہیں
سب کے کارن جاگ رہے ہیں
کانوں پر ہیں شور مچاتے
اپنی اکڑ کا زور دکھاتے
ننھے منے کیڑے ہیں، یہ
کتنے مگر زہریلے ہیں، یہ
کاٹیں تو خارش ہوتی ہے
جسم میں اک لرزش ہوتی ہے
نام کو نیند نہیں آتی ہے
سارے جسم کو دہلاتی ہے
نیزے جسم میں بھونک رہے ہیں
نیند کو بڑھ کر روک رہے ہیں

پیسہ

میں گول ہوں، میں چوکور ہوں۔ میں آٹھ کونوں والا
بھی ہوں، میں ہلکا بھی ہوں بھاری بھی۔ ہوا میں اڑ بھی سکتا ہوں،
پانی میں ڈوب بھی سکتا ہوں۔ مگر میں چپٹا ضرور ہوں۔

لوگ میری گولائی کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ میں لڑک کر ہاتھوں
سے نکل جاتا ہوں، میرے چپٹے پن کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ مجھے جمع بھی
کیا جاسکتا ہے۔ کچھ لوگ مجھے بُرا بھلا بھی کہتے ہیں۔ بعض کا کہنا ہے کہ
میں کسی کے پاس ٹھہرتا نہیں۔

مگر یہ بات غلط ہے۔ میں لوگوں کے پاس رکتا ہوں مگر
انھی کے پاس جو مجھے رکھنا جانتے ہیں۔ چاہے لوگ مجھے کتنا ہی بُرا بھلا
کہیں مگر دنیا کا ہر شخص مجھے چاہتا ضرور ہے۔ مجھے حاصل کرنے کے
لیے پریشاں رہتا ہے۔ جس کے پاس میں پہنچ گیا لوگ اُسے امیر
کہتے ہیں۔ جس کے پاس سے چلا گیا اسے غریب کہتے ہیں — سمجھے
میں کیا ہوں — ؟ میں چمکتا کھنکتا، جگمگاتا پیسہ ہوں — اور؟
— اور روپیہ ہوں — !!

تم نے میری کتنی شکلیں دیکھی ہیں — ؟ بہت سی! خیر چلو
تم نے چھوٹا سا پیسہ کا سکّہ دیکھا ہوگا۔ دو، تین، پانچ پیسے وغیرہ
کے سکے دیکھے ہوں گے۔ ایک روپیہ، دو روپے، پانچ روپے،
وغیرہ کے نوٹ بھی دیکھے ہوں گے۔ اچھا سو روپے کا ہرا ہرا خوبصورت
سا نوٹ بھی دیکھا ہے۔ ؟ دیکھا ہے۔ ! مگر کیا ہزار روپیہ کا
بھی دیکھا ہے۔ ؟ اگر نہیں دیکھا تو سمجھ لو کہ آج کل میری
سب سے بڑی شکل بس یہی ہے۔ مگر یہ تو ایک ہی شکل
ہوئی میری، جسے تم پیسہ یا روپیہ کہہ لو۔

تمھیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ میرے ڈیڑھ سو
بہن بھائی ہیں۔ جو دنیا کے ملکوں میں الگ الگ ناموں سے لوگوں
کے ہاتھوں میں جاتے ہیں۔

دو ایک جگہوں پر میرے بھائی بہن بالکل انھی ناموں
سے پکارے جاتے ہیں۔ جن سے میں ہندوستان میں پکارا جاتا ہوں
جیسے برما اور پاکستان وغیرہ میں میرے بھائیوں کا یہی نام ہے
یعنی روپیہ۔

یہ دوسری بات ہے کہ میرے یہ ہم نام بھائی میرے
دیس میں اجنبی ہیں بے مصرف ہیں۔ تم کسی شخص کو میرا برمی بھائی
لاکر دے دو وہ فوراً واپس کر دے گا۔ "یہ ہمارا روپیہ نہیں ہے"!
ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔ میرے ڈیڑھ سو بھائی بہن ہیں۔ ان سے
کام لوگ ایک سا لیتے ہیں۔ مگر نام الگ الگ رکھ لیے ہیں۔ اور
دوسرے بھائی کی اتنی عزت بھی نہیں کرتے جتنی یہ بھائی کی کرتے
ہیں —

اور پھر ایک اور مزے کی بات یہ ہے کہ لوگ میرے
بزرگوں کو بھی میرا بھائی ہی سمجھتے ہیں۔ میں مثال دوں تو یہ بات تمھاری
سمجھ میں آجائے گی۔ ابھی چند سال پہلے تم نے دیکھا تھا کہ میری شکل
ذرا مختلف تھی۔ دراصل وہ میں یا میرا کوئی بھائی نہیں تھا، وہ میرے
بزرگ تھے۔ میرے بزرگوں کے نام تھے۔ روپیہ، اٹھنی، چونی
وغیرہ۔ کچھ دن پہلے لوگوں نے انھیں پرانا سمجھ کر

چھوڑ دیا، اور پہلے مجھے "نیا پیسہ" کہا، پھر جب لوگوں نے دیکھا کہ میں نیا نہیں رہا تو میرے نام سے "نیا" ہٹا دیا۔ اب میں صرف پیسہ ہوں۔

اب جب میں نے تمھیں اپنے بارے میں بتانا ہی شروع کیا ہے تو تمھیں اپنی ایک کمزوری بھی بتا دوں۔ یہ میری سب سے بڑی کمزوری ہے۔ مجھ سے دنیا کی ہر چیز خریدی جا سکتی ہے لیکن میں خود کسی کام کا نہیں۔

تم کہو گے کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں، اچھا تم اپنے ابا امی سے ضد کر کے پیسے لیتے ہو اور بازار جا کر ان پیسوں سے طرح طرح کی مٹھائیاں کھلونے، کتابیں اور ضرورت کی چیزیں خریدتے ہو تو میں نہیں تو اور کون تمھارے کام آتا ہے۔

لیکن میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ سچ پوچھو تو میں بالکل تمھارے لیے ضروری نہیں ہوں۔ ذرا یوں سوچو کہ اگر دوکاندار مٹھائی، چاٹ کاغذ قلم وغیرہ بغیر کچھ لیے دینے لگے تو بتاؤ تمھیں کیا ضرورت پڑی ہے اپنی جیب میں نوٹ اور چھوٹے موٹے سکے ڈالے رکھنے کی ——؟

یا فرض کرو تم کسی جنگل میں کھڑے ہو۔ جہاں نہ کوئی آدمی ہے نہ دکان۔ اور تمھیں بھوک لگی ہے۔ تمھاری جیب میں کتنے بھی پیسے ہوں، تم انھیں کھا تو سکتے نہیں ہو۔ جب تک کھانے کی چیز نہ دی جائے تمھارے پیسے بے کار پڑے رہیں گے۔

بس چونکہ تمھیں ضرورت کی چیزیں میرے بدلے میں ملتی ہیں۔ اس لیے تم میری ضرورت بھی سمجھتے ہو۔ میرا خیال ہے کہ اب تم مان گئے ہو گے کہ میری اصلیت کچھ نہیں ہے۔ اصلیت تو ان چیزوں کی ہے جن کی تمھیں ضرورت ہے۔

اس بات کو میں ایک اور طرح بھی کہہ سکتا ہوں۔ تم جانتے ہو کہ تمھاری دنیا میں رئیس اس آدمی کو کہتے ہیں جس کے پاس بہت سے روپیہ پیسے زیادہ ہوں۔ وہ خوب خرچ کرتا ہو۔ اب تم چاہو تو اسے رئیس کہہ لو۔ مگر میں نہیں کہوں گا۔ میں یہ بات خوب اچھی طرح جانتا ہوں کہ کسی کے پاس بہت سے روپے ہوں یا نہ ہوں اگر اس کے پاس ضرورت کا سارا سامان ہے بہت سا سامان ہے تو وہ رئیس ہے۔

یہی بات کسی ملک کے لیے بھی کہی جا سکتی ہے۔ کسی ملک میں لوگوں کے پاس چاہے کتنے بھی روپے پیسے ہوں اگر وہاں ضرورت کا سامان ہی نہیں ہے اور بازاروں میں بہت سی چیزیں ہی نہیں بکتیں تو لوگوں کا پیسہ بے کار ہے۔ نہ لوگ روپے پیسے کو کھا سکتے ہیں نہ ان کے کپڑے بنا کر پہن سکتے ہیں —— بس یہ سمجھو کہ اصلی چیزیں ہیں آٹا، کپڑا، سبزی، دال، کتابیں، قلم، ٹافیاں، مٹھائیاں —— یا وہ چیزیں جنھیں تم خریدنا چاہتے ہو۔

اب تم سوچو گے کہ جب میری کچھ اصلیت ہی نہیں ہے تو میں تمھاری دنیا میں آیا کہاں سے؟ یہ بڑی دلچسپ کہانی ہے۔ میں بہت پرانا ہوں، میرے باپ دادا بھی بہت پرانے ہیں۔ خیر اتنا پرانا تو نہیں جتنا خود انسان ہے، مگر اس سے بس ذرا سا ہی کم ہوں۔ خواہ میرے بزرگوں کی شکلیں میری آج کی شکلوں سے بالکل بھی نہ ملتی ہوں، مگر تھے وہ میرے ہی بزرگ یہ کہانی بڑے مزے کی ہے سنو گے —! اچھا ضرور سناؤں گا۔ مگر پہلے کچھ اور باتیں بتا دوں، تاکہ تم پہلے میری آج کی حالت کو اچھی طرح سمجھ لو

تم یہ سن کر پہلے ذرا حیران ہو گے کہ میری اپنی بھی ایک قیمت ہوتی ہے۔ تم کہو گے "واہ یہ کیا بات ہوئی، ہم تو مٹھائی، کاغذ، قلم، دوات اور کتاب وغیرہ کی قیمت پیسوں سے ناپتے ہیں اور میں کہتا ہوں کہ خود میری بھی ایک قیمت ہوتی ہے۔" بھائی یوں سمجھو کہ میرے بدلے میں تمھیں جتنی چیزیں مل جاتی ہیں بس وہی میری قیمت ہے۔

جناب انور بھانپوری

خوب انعام مِلا

کام کرنے والے

باجی

رضیہ : باجی کی چھوٹی بہن

اعجاز : باجی کا چھوٹا بھائی

محمود شاکر : اعجاز کے دوست

براتی : محلّہ کی کچھ لڑکیاں

پہلا منظر

[ایک کمرہ میں محلّہ کی کچھ لڑکیاں بیٹھی ہوئی ہیں۔ یہ باجی کی گڑیا اور رضیہ کے گڈے کی شادی میں آئی ہیں اور دولھا دلہن کے گن گا رہی ہیں۔]

جبیں : (شرارت سے) دولھا میاں کو تو دیکھو کیا اکڑے بیٹھے ہیں۔!

کوثر : اور دلہن کتنی پیاری بنائی ہے باجی نے۔ جی چاہتا ہے۔ چرا کرلے جاؤں۔!

نیلوفر : چل ہٹ پگلی۔ تیری نیت تو ہمیشہ خراب رہتی ہے۔ میرا تو جی چاہتا ہے اسے اپنی بہو بناؤں۔

وحیدہ ایسا لگتا ہے جیسے آسمان پر سے حور اتر آئی ہو۔

ناہید سچ مچ حور لگتی ہے۔ باجی کے ہاتھوں میں غضب کی صفائی ہے۔

جبیں : (بلائیں لیتے ہوئے) میری ننھی سی دلہنیا۔!
(اتنے میں باجی آتی ہیں)

باجی : بس بس بہت ہو چکا۔ اب کچھ کھاؤ پیو گی بھی یا نہیں۔؟

جبیں : ہاں۔ ہاں کیوں نہیں ـــــ کیوں نہیں!
(اور سب لڑکیاں دوسرے کمرے میں جاتی ہیں)

دوسرا منظر

[ایک گول میز کے چاروں طرف اعجاز، محمود اور شاکر بیٹھے ہوئے بڑے رازدارانہ انداز میں باتیں کر رہے ہیں۔]

شاکر : بھئی یہ تو بڑا غضب ہوا ـ باجی نے ہمیں پوچھا تک نہیں۔

اعجاز : یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں کہ بھلا باجی سے مٹھائی کس طرح حاصل کی جائے۔

محمود کوئی ترکیب سوچو سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

(تینوں سوچنے لگتے ہیں)

اعجاز: (تھوڑی دیر بعد میز پر مکہ مار کر) وہ مارا!

محمود: (خوش ہوتے ہوئے) سچ — !

شاکر: ذرا آہستہ — دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں!

(اور پھر اعجاز انھیں اپنی بنائی ہوئی ترکیب کان میں بتاتا ہے جسے سن کر ان کے چہرے خوشی سے کھل اٹھتے ہیں۔)

تیسرا منظر

(باجی اور دوسری تمام لڑکیاں دولہا دلہن کے کمرے میں واپس آتی ہیں۔)

باجی: (گھبرا کر) ارے یہ کیا — !! میری چاند سی دلہن کہاں گئی۔!!

(سب تعجب سے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگتی ہیں دولہا کے پاس ہی ایک پرچہ پڑا ہوا ہے۔ باجی جھپٹ کر اٹھا لیتی ہیں اور اونچی آواز سے پڑھتی ہیں)

اگر اپنی دلہن واپس چاہتی ہو تو اسی جگہ دو روپے رکھ دو دلہن صبح تمھیں مل جائے گی۔ اگر ہماری شرط منظور ہو تو اسی کاغذ کے پیچھے لکھ کر کھڑکی کے باہر پھینک دو کاغذ ہم تک پہنچ جائے گا۔

فقط گمنام "ڈاکو"

(باجی کا چہرہ غصہ سے لال ہو جاتا ہے)

باجی: (کاغذ دیتے ہوئے) لو رضیہ اس کی پشت پر لکھ دو "ہمیں شرط منظور ہے"

(رضیہ کاغذ کی پشت پر لکھ کر کھڑکی کے باہر ڈال دیتی ہے)

چوتھا منظر

(گرمی کے دن ہیں۔ گھر کے تمام لوگ آنگن میں سوئے ہوئے ہیں۔ رات کے تقریباً دو بجے اعجاز دلہن لے کر دولہا کے کمرہ میں داخل ہوتا ہے۔ لیکن یہ کیا — ؟ دو روپے کا نوٹ وہاں نہیں ہے۔ اور جیسے ہی وہ پلٹتا ہے اسے دروازہ پر باجی کھڑی نظر آتی ہیں۔)

اعجاز: (گھبرا کر) با... با... باجی آپ تو سوئی ہوئی تھیں نا — ؟

باجی: (نہایت غصہ سے) تم جو بھی سمجھو پر میں تو تمھارے انتظار میں آنکھیں بند کیے لیٹی تھی۔

اعجاز: تو... تو... کیا؟

باجی: بکواس بند کرو اور جلدی سے دلہن میرے حوالے کر دو۔ اسی میں تمھاری خیریت ہے۔!

(اعجاز اسی وقت دلہن باجی کو دے دیتا ہے اور بدلے میں ایک زوردار چانٹا منہ پر پڑتا ہے۔)

(پردہ گرتا ہے)

آئیے اردو پڑھیں

جناب خورشید شیدائی

ایک رات کو ملا جی کے گھر میں چور گھس آئے بے چارے ساری رات ڈھونڈتے کھکھوڑتے رہے۔ لیکن کچھ نہ مل سکا۔ ملا جی بستر میں لیٹے لیٹے یہ نظارہ دیکھ رہے تھے۔ آخر اٹھ کر کہنے لگے۔ "یہاں دن کی روشنی میں کچھ نہیں ملتا آپ رات کے اندھیرے میں تلاش کر کے خواہ مخواہ اپنا قیمتی وقت ضائع کر رہے ہیں۔"

ایک رات ملا کو نیند نہیں آ رہی تھی انھوں نے چاندنی میں چمکتی ہوئی ریت کی طرف دیکھا تو ایسا لگا کہ درختوں کے درمیان سے کوئی انھیں جھانک رہا ہے۔ ملا نے چور سمجھ کر فوراً تیر چلا دیا چور گر پڑا ملا اس کی طرف دوڑے قریب جانے پر معلوم ہوا کہ ان کی بیوی نے ان کی قبا دو بانسوں میں پھنسا کر سوکھنے کے لیے پھیلائی تھی جو بار بار ہوا سے ہلتی تھی۔ ملا نے گھبرا کر کہا "شکر ہے کہ میں قبا نہیں پہنے تھا۔"

ملا جی ایک گھر میں دودھ دینے گئے۔ انھوں نے برتن میں دودھ ڈالا تو گھر والے نے حیران ہو کر ملا سے پوچھا "بھئی یہ دودھ کہاں ہے، یہ تو پانی ہے۔" "اچھا!" ملا نے بغیر پریشانی کے کہا "آج میں جلدی میں تھا۔ اس لیے دودھ لانا بھول گیا۔"

ملا جی بھوکے پیاسے ایک گاؤں میں پہنچے ایک گھر میں غمی ہو گئی تھی۔ لوگ رو پیٹ رہے تھے۔ ملا نے ان سے کہا۔ اگر آپ لوگ مجھے کھانا کھلا دیں تو میں آپ کا مردہ زندہ کر دوں گا۔ ملا کو خوب پیٹ بھر کر کھانا کھلایا گیا۔ اس کے بعد ملا نے پوچھا۔

"مرنے والا کیا کام کرتا تھا۔؟"

لوگوں نے بتایا کہ:۔

"پٹواری تھا!"

ملا نے لوگوں کو بہت سخت سست کہا اور بولے:۔

تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ پٹواری تھا کوئی اور ہوتا تو میں اسے فوراً زندہ کر دیتا مگر پٹواری تو زندگی میں صرف ایک بار مرتا ہے۔ اسے میں تو کیا کوئی بھی زندہ نہیں کر سکتا۔"

ایک بار کسی رئیس نے اپنے لڑکے کی شادی پر ملا جی کو نہ بلایا۔ ابھی براتی کھانا کھانے کے لیے بیٹھے ہی تھے کہ ملا جی آ دھمکے۔ ایک من چلے نے کہا۔

"ملا جی آپ آ گئے!"

"جی ہاں۔"

"کیسے آئے؟"

"اجی پیدل!"

"سنا ہے آپ کو بلایا ہی نہیں گیا تھا۔ آپ بن بلائے کیسے آ گئے؟"

"اجی اگر بلانے والے نا سمجھ ہیں تو میں کیوں اپنے فرض میں کوتاہی کروں۔"

•••

جناب عادل جعفری

امتحان سے پہلے

دیکھو جسے وہ خوف کا مارا ہے دوستو
پھر امتحان سر پہ ہمارا ہے دوستو

ویراں پڑے ہیں کھیل کے میدان ان دنوں
تفریح گاہیں ہو گئیں سنسان ان دنوں

میدانِ امتحان کے غازی خدا کی شان،
مسجد میں بڑھ گئے ہیں نمازی خدا کی شان،

جو حق سے منحرف تھے وہ اب حق پہ آ لیے
کتنے ہی دہریوں نے مُصَلّے بچھا لیے

پہلی سی بھیڑ، پہلی سی کثرت نہیں رہی
اب سینما گھروں کی وہ زینت نہیں رہی

استادِ نیک نام کو عالی مقام کو
اٹھنے لگے ہیں ہاتھ ادب سے سلام کو

ماحول بے زبان ہے اور ہے فضا خموش
مصروف ہیں مطالعہ میں سارے اہلِ ہوش

"امپارٹنٹ" وقت کا نعرہ ہے دوستو
پھر امتحان سر پہ ہمارا ہے دوستو

جناب عادل جعفری

امتحان کے بعد

شکر خدا کہ ختم ہوا امتحان آج
پھر آگئی ہے جان میں کھوئی سی جان آج

رہ رہ کے اب لطیفے سنانے کا وقت ہے
یا یہ کہیں کہ جھوم کے گانے کا وقت ہے

پرچے بھلے برے ہوئے یہ بات اور ہے
کیا کیجے دو مہینوں میں یہ زیرِ غور ہے

جو مال دار ہیں وہ چلے سوئے نینی تال
غریب زدوں کے سامنے خرچہ کا ہے سوال

پھر بھی یہ سوچتے ہیں کہ بہر سفر چلیں
ممکن نہیں کہیں تو عزیزوں کے گھر چلیں

خالہ کے گھر، ممانی کے گھر یا پھوپھی کے گھر
اچھا کہیں نہیں تو چلیں ہم چچی کے گھر

گذریں گے دو مہینے ہنسی اور خوشی کے ساتھ
بے فکری، بے خیالی و آسودگی کے ساتھ

پوچھیں گے خاص خاص خبر کیوں اب اور سے
اخبار روز صبح کو دیکھیں گے غور سے

پھر وقت اپنا وقفِ مسرت کریں گے ہم
پھر ریڈیو پہ شغل سماعت کریں گے ہم

دو چار دن کے وقفہ سے دیکھیں گے فلم بھی
ممکن اگر ہوا تو بڑھائیں گے علم بھی،

گذریں گے جب ہنسی اور خوشی سے مئی و جون
دیکھو، تو کیسے جسم میں بڑھتا نہیں ہے خون

ہو جائیں گے پہننے کے کپڑے ہمارے چست
جو کم ہوا ہے وزن وہ ہو جائے گا درست

چہرہ پہ رنگ و نور کی چھا جائے گی بہار
نکلے گا امتحاں کا نتیجہ جو خوش گوار

جناب سردار عرفان

اورنگ سلیمانی

آج اتفاق سے بمبئی کے مشہور روزنامہ انقلاب میں یہ مضمون نظر سے گذرا۔ سردار عرفان صاحب کچھ دنوں پہلے اورنگ آباد گئے تھے۔ اس کے بعد سالنامہ ۱۹۶۸ء میں انھوں نے دو مضمون دیکھے۔ نیچے کا مضمون انھوں نے انھی دونوں مضمونوں سے متاثر ہو کر لکھا ہے۔ مضمون دلچسپ ہے لیکن بڑوں کے لیے لکھا گیا ہے کہیں کہیں مشکل لفظ آ درج کئے گئے ہیں ہم نے جگہ جگہ اس میں اصلاح و ترمیم کر دی ہے — امید ہے کہ آپ اسے دلچسپی سے پڑھیں گے۔

ایڈیٹر

شام کو بستر پر پڑا "پیام تعلیم" کا سالنامہ دیکھ رہا تھا۔ محمد اکبرالدین صدیقی کے مضمون "گنبد قلی قطب شاہ" میں یہ جملے "اگر ہم بے جاپور کے گنبدوں کو دیکھیں تو ان کی بھاری بھر کم ہیبت دل پر عجیب خوف کا احساس پیدا کرتی ہے۔ بہمنی سلاطین کے مقبروں کو دیکھیں تو دل پر رنج دلال اور افسردگی چھا جاتی ہے"۔ پڑھ کر وہ نظارہ آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ جو گولکنڈہ کے قلعہ کی چوٹی پر واقع بارہ دری سے نظر آتا ہے اور جس میں کئی بوسیدہ اور خستہ حال مقبرے زبان حال سے ایک عظیم قوم اور اس کے بادشاہوں کے عظیم ماضی اور افسوسناک حال کا زندہ ثبوت دے رہے ہیں۔ سو ایک مضمون کے بعد مولانا مقبول احمد سیوہاروی کا مضمون تھا کیا دیکھا یہ مضمون اتفاق سے اورنگ آباد کے متعلق تھا۔ مولانا نے لکھا ہے — "اورنگ آباد میں ایسی کوئی عمارت نہیں جو شاہ جہاں کی بنائی ہوئی عمارتوں کا نمونہ پیش کر سکے فقط رابعہ دورانی کا مقبرہ تاج محل کے نمونے پر بنا ہوا ہے"۔

"رابعہ دورانی اورنگ زیب کی بیگم تھیں ان کا اصل نام دل رس بانو تھا۔ یہ مقبرہ ان کے بیٹے شہزادہ محمد اعظم خاں نے تعمیر کرایا ہے اور پورے سات برس میں تیار ہوا ہے چھ لاکھ اڑسٹھ ہزار دو سو تین روپے سات آنے خرچ ہوئے ہیں پانچ سو گز لمبائی اور تین سو گز چوڑائی ہے"۔

پندرہ دن بھی نہیں ہوئے کہ اورنگ آباد سے ہو کر آیا ہوں۔ ابھی وہ نقوش اور تاثرات محو نہیں ہوئے جو بی بی کے مقبرے یا رابعہ دورانی کے مقبرے نے ذہن پر چھوڑے تھے۔

اس خوبصورت مقبرے میں پہنچ کر میں اندازہ نہیں کر پاتا تھا کہ اس پر کتنا خرچ آیا ہوگا۔ لیکن چھ لاکھ اڑسٹھ ہزار روپے تو بہت معمولی رقم معلوم ہوتی ہے۔ آج تو ایک ایر کنڈیشنڈ سنیما ہال پر اتنی رقم خرچ ہو جاتی ہے۔

لیکن شاید مولانا نے یہ اعداد و شمار تاریخی کتابوں سے نقل کئے ہیں۔ اگر کسی ماہر اقتصادیات سے پوچھا جائے تو اس مقبرے کی لاگت موجودہ کرنسی میں غالباً پچاس گنا ہو جائے۔

جب میں مقبرے کے احاطے میں داخل ہوا تو اپنے "گائیڈ" رکشا ڈرائیور سے دریافت کیا کہ "کیا مقبرے تک جانے والی روشوں پر لگے ہوئے یہ پودے آج کل موسم کی وجہ سے اجاڑ پڑے ہیں یا ہر دم ہی ایسے رہتے ہیں۔" اس نے بتایا "ہمیشہ ہی ایسے رہتے ہیں۔"

"مقبرے کی دیکھ بھال کون کرتا ہے۔؟" میں نے پوچھا۔

"ایک مالی ہے اور ایک مجاور۔ دونوں اونگھتے رہتے ہیں۔" میرا گائیڈ بھی کسی قدر روشن خیال معلوم ہوتا تھا۔

نوجوانوں کی ایک ٹولی اتر رہی تھی۔ ان کے جانے کے بعد میں مقبرے کے چبوترے پر پہنچا۔ میرا رہنما شاید پہلے رقصے پر جا رہا تھا۔ تہہ خانے کی سیڑھیوں پر اس نے مجھے جوتے اتارنے کی ہدایت کی۔ میں سٹپٹا گیا۔ دور، دور تک کوئی نظر نہیں آ رہا تھا کہیں جوتے غائب نہ ہو جائیں جیسا کہ اکثر مسجدوں میں ہوتا ہے۔ ننگے پیر اجنبی شہر میں کہاں پھروں گا۔

اتنے میں ایک موٹے تگڑے مجاور صاحب ایک اچھی خاصی "اسامی" کو دیکھ کر لپکتے ہوئے آئے اور ہمیں دھکیلتے ہوئے نیچے اتر گئے۔ میں نے ہمت کر کے جوتے اتارے اور تہہ خانے میں اتر گیا۔ وہی مقبروں کی پرسکون اور ویران خاموشی اور احساس بے ثباتی جو نیچے سے اونچے گنبد اور سنگ سفید کی منقش جالیوں سے بھی کم نہیں ہو پا رہا تھا۔

مجاور صاحب اندر پہنچ کر اپنے اڈے پر جم چکے تھے۔ اور چند خواتین سے ہلکے پھلکے نوٹ اپنی پلیٹ میں رکھوا چکے تھے۔ جو اب تک پلیٹ میں میرے وجدان کی خاطر رکھے ہوئے تھے مجھے دیکھ کر انھوں نے اندر آنے کا حکم دیا۔

لیکن مجھے ان کی دعاؤں اور چڑھاوے سے زیادہ روح کی گہرائیوں میں اس عظمت پارینہ، اس شوکت رفتہ اور اس محبت بے پایاں کی جھلک محسوس کرنے سے دلچسپی تھی جس نے دکن پر اس لازوال یادگار کو جنم دیا۔ مقبرہ دوسری جگہ کا نام ہی فیض آثار ہو یا تاج محل یا بی بی کا مقبرہ — اپنی عظمت، اپنے حسن اور دل کشی اور صورت و حجم کے اعتبار سے مختلف ہو سکتے ہیں۔ لیکن درحقیقت زندگی کے سب سے بڑی حقیقت موت کو اپنے سینے میں چھپائے ہوتے ہیں۔ یہیں آکر انسان کو اپنی بے بسی اور مجبوری کا احساس ہوتا ہے۔

اب میں اپنے ساتھی کی رہنمائی میں مینارے کی سیڑھیوں پر چڑھ رہا تھا۔ درمیان روشن دان نہ ہونے کی وجہ سے اتنا اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔ پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے پہلی منزل پر پہنچا تو مینارے کے گرد بالکنی پر ہوا کے تیز جھونکوں نے خیر مقدم کیا۔ اور اوپر پہنچے تو ہوا کی شدت اور بڑھ گئی۔ میں مینارے کے اندرونی حصے اور دیواروں پر لکھے ہوئے بے ہنگم ناموں کو دیکھ کر اس ملک کے لوگوں کی ذہنیت پر کڑھ رہا تھا۔ جو ان لافانی یادگاروں کی دیواریں کھرچ کھرچ کر امر بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ راندیر کی مسجدیں ہوں یا حیدر آباد کا چار مینار ہر جگہ اس شوخیٔ تحریر کی دل آویزیاں نظر آئیں گی۔

یکایک ایک دھماکہ سا ہوا۔ میں نے اپنا بریف کیس کھڑا کر رکھا تھا۔ ہوا کے شدید جھونکے نے اسے بڑے زور سے زمین پر دے پٹکا۔ ایک لمحہ کے لیے مجھے جھرجھری سی آگئی۔ میری نظروں میں وہ ان دیکھا منظر گھوم گیا۔ جو ان بلند و بالا میناروں کی تعمیر کے وقت دیکھا جاتا ہوگا۔ کتنے مزدوروں نے پتھر کی بھاری بھاری سلیں اوپر چڑھانے اور انھیں شکل و صورت عطا کرنے میں اپنی جانیں گنوائیں۔ کتنے ہی انسانوں کی جانوں کا سرخ پانی ان میناروں کی بنیادوں میں جذب

ہوگا — چھ لاکھ اُنسٹھ ہزار روپے۔

اسی وقت نیچے چبوترے پر مجھے ایک خوبصورت جوڑا نظر آیا۔ میں نے غور سے دیکھا تو وہ کمند اگروال تھا۔ میرے کالج کا ساتھی جس سے گذشتہ روز ٹرین میں ملاقات ہوئی تھی میں نیچے اتر آیا کمند اور اس کے ساتھی سے ملا۔ اس نے بتایا کہ وہ نٹ راج میں ٹھہرا ہے۔ "چلو ایک کپ چائے ہی پی جائے" میں نے کہا۔

"کھانے کا وقت ہو رہا ہے۔ خیر چلئے۔ پرانے دنوں کی یاد تازہ کریں۔"

ہم مقبرے سے باہر آئے ایک چھوٹا سا کیبن نما کینٹین ہے۔ درخت کے سائے میں ہم میز پر بیٹھ گئے۔ اور چائے کا آرڈر دے دیا۔ کمند کی حسین ہم سفر بی بی، بی بی کے مقبرے اور تاج محل کا موازنہ کرنے لگی اور کمند مجھے بتانے لگا کہ وہ ابھی ابھی سامنے نظر آنے والی پہاڑیوں میں واقع غار کو دیکھ کر آ رہے ہیں۔ وہاں انھیں ایک ماہر آثار قدیمہ ملا جس نے ایک نو دریافت شدہ غار کی سیر کرائی۔

یہ خوش نصیب جوڑا دوسرے دن ایلورا اور اجنتا جانے والا تھا۔ کمند نے مجھے بھی دعوت دی۔ میں نے بمبئی والوں کا رونا جھینکنا شروع کر دیا۔ "وقت کہاں ہے؟ مشینی زندگی، مصروفیات۔"

"پیارے کمند بمبئی میں فرصت سے ملوں گا۔ یہاں تو میں آج ہی لوٹ رہا ہوں۔ شام کو سوا پانچ بجے کے ہوائی جا رہے"

شام ہوئی۔ طیارے نے اورنگ آباد کی سرزمین کو پیچھے اور نیچے چھوڑ دیا۔ میں اپنے اس مختصر اور بے مقصد سفر پر کسی قدر مطمئن ننھے منے کھیتوں اور کھلونوں کی طرح بکھرے مکانوں پر نظریں جمائے منزل کی طرف بڑھتا رہا۔

آج مولانا مقبول احمد کا مضمون پڑھ کر ایک عجیب قسم کی محرومی کا احساس ہو رہا ہے۔

پن چکی، مزار حضرت نظام الدین، مسافر شاہ کی درگاہ، قلعہ ارک، خلد آباد اور حضرت اورنگ زیب عالمگیر کی قبر تصور کی نگاہوں میں بسی ہوئی ہے۔ اور اقبال کا ایک شعر ذہن میں گشت کر رہا ہے ؎

بادشاہوں کی بھی کشت عمر کا حاصل ہے گور
جادۂ عظمت کی گویا آخری منزل ہے گور

بھوجپوری کہانی
ترجمہ ——— جناب اے، اے منظر

لڈّوؤں کا چورا

ایک بادشاہ کے یہاں حساب کتاب کرنے کے لیے ایک دیوان رکھا گیا۔ وہ بڑی ایمانداری اور محنت سے اپنا فرض نبھا رہا تھا ——— تھوڑی سی مدت میں شہنشاہ کی سلطنت ترقی کرنے لگی اور اپنی عقل سے وہ دیوان بھی آرام و راحت کی زندگی بسر کرنے لگا ——— اُس نے پختہ مکان بنوایا! اسے دیکھ کر گاؤں اور شہر کے لوگ حسد کی آگ میں جلنے لگے اور کہنے لگے کہ شہنشاہ کی ساری دولت کھا کھا کر یہ دیوان دولت مند ہوتا جا رہا ہے۔ ایک دن جب وہ دیوان دولت مندوں کی صف میں کھڑا ہوا تو ——— شہنشاہ نے اسے بلا کر پوچھا ———،

"تم جب سے دیوان ہوئے ہو، میری حکومت بڑھی، میرا کوئی نقصان نہیں ہوا، پھر بھی تم اتنے دولت مند کیسے ہو گئے؟"

دیوان نے کہا: "شہنشاہِ اعظم، ایک طباق لڈّو اور دو طباق خالی منگائیں ——— میں ابھی بتاتا ہوں!"

فوراً ایک طباق لڈّو اور دو خالی طباق آگئے دیوان نے لڈّوؤں کے طباق کو چار پانچ مرتبہ ہلایا ——— پھر ایک ایک لڈّو کو دوسرے طباق میں رکھا اور جو چورا بچا، اسے

بٹور لیا ——— اسی طرح اس نے دو تین مرتبہ کیا۔ جب اس کے کھانے لائق چورا ہو چکا تو دیوان بولا ———

"میں نے اسی طرح آپ کی سلطنت کی حفاظت کی، اور اپنی عقل سے میں بھی خوش رہتا ہوں" ——— دیوان کی سمجھ داری کی بات سے شہنشاہ بہت خوش ہوا اور اسے خوب انعام دیا۔

مولانا مقبول احمد
سیوہاروی

سفرنامہ ابن بطوطہ

(مسلسل)

کوئی جہاز کنارے پر پہنچتا ہے تو شیخ (سلطان) کو خبر دی جاتی ہے کہ جہاز کہاں سے آیا ہے ؟ مالک کون ہے؟ کپتان کون ہے ؟ کیا مال لایا ہے ؟ مسافروں میں کتنے عالم اور درویش ہیں ؟ کتنے تاجر ہیں ؟ پھر جسے چاہتا ہے مہمان بنالیتا ہے۔

جس قاضی کے ساتھ میں سلطان کے پاس گیا اس کا نام قاضی ابن برہان ہے۔ مصر کا رہنے والا ہے۔ میں اور قاضی شاہی محل پہنچے تو ایک جوان نکل کر آیا۔ قاضی نے جوان سے کہا: "شیخ کو اطلاع دو کہ یہ صاحب حجاز سے تشریف لائے ہیں۔"

جوان اندر گیا اور پان لے کر آیا۔ دس پان اور چھالیا قاضی کو دس پان اور چھالیا مجھے دئے۔ باقی ہمارے ساتھیوں میں بانٹ دئے۔

جوان نے مجھ پر اور قاضی صاحب پر گلاب چھڑکا اور کہا مولانا کو دار الطلبہ (طالب علموں کے بورڈنگ) میں ٹھہرا دیجیے۔

دار الطلبہ سلطان کے محل کے پاس عمدہ مکان ہے۔ فرش فروش سے آراستہ اسی جگہ ہمارے لیے کھانا آیا۔ کھانے کے ساتھ سلطان کا وزیر بھی تھا۔ اس نے سلطان کی طرف سے ہمارا خیر مقدم کیا۔

کھانے میں بریانی، مرغ کا گوشت، بکرے کا گوشت، مچھلی اور سبزیاں تھیں۔ ایک پیالے میں جما ہوا دہی تھا۔ یہ سب چیزیں لکڑی کے برتنوں میں تھیں۔ آم کا مربا اور نورتن چٹنی بھی تھی جسے چاولوں کے ساتھ کھاتے ہیں۔

مقدشو کے رہنے والے خوب موٹے تازے ہیں۔ کھانا کافی مقدار میں کھاتے ہیں۔ دار الطلبہ میں ہم تین دن رہے۔ ہر روز تین مرتبہ کھانا آتا تھا۔

چوتھے دن جمعہ تھا۔ سلطان کا وزیر، قاضی جن کے ساتھ طالب علم بھی تھے۔ میرے لیے سلطانی خلعت لائے: ریشمی پھول دار مصری چادر ریشمی تہ بند، مصری عمامہ، بوٹے دار عبا۔ میرے ساتھیوں کے لیے بھی موزوں اور مناسب لباس تھا۔

دار الطلبہ سے جامع مسجد نماز کے لیے گئے۔ وہیں شیخ (سلطان) کے سلام کی عزت حاصل ہوئی۔ شیخ نے کہا: "ہمارے شہر میں آپ کا تشریف لانا مبارک ہے۔ اور ہم آپ کے شکر گزار ہیں۔"

نماز کے بعد شیخ نے اپنے دادا کی قبر پر فاتحہ پڑھی۔ وزیروں، امیروں اور افسروں کا سلام ہوا۔ ان کا ڈھنگ بھی یمن والوں کا سا ہے۔ زمین پر انگلی رکھ کر سر تک لے جانا اور پھر کہنا: "ہمیشہ عزت برقرار۔"

مسجد سے محل تک سلطان پیدل گیا۔ ساتھ کے سب آدمی ننگے پیر تھے قاضی کو اور مجھے جوتے پہننے کی اجازت تھی۔

سلطان کے سر پر دھوپ سے بچاؤ کے لیے

ریشم کی چار نگین چھتریاں لگی تھیں چاروں چھتریوں کی چوٹی پر سونے کی چڑیاں تھیں۔ قرنا اور نفیریاں بجتی جاتی تھیں پیچھے فوج کے افسر تھے۔

جامع مسجد سے چل کر یہ جلوس شاہی محل کے سامنے پہنچا، جہاں سائبان لگا ہوا تھا۔ عصر کی نماز تک یہاں سب لوگ بیٹھے رہے۔ نماز ختم ہوئی تو پھر باجے بجنے لگے۔ اور سب لوگ سلام کر کے رخصت ہو گئے۔

یہ مجلس ہر جمعے کو ہوتی ہے۔ سنیچر کے روز پھر سب لوگ سلطان کے دروازے پر جاتے ہیں اور شاہی محل کے سامنے بنچوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر باری باری سلطان کے سامنے جاتے اور سلام کرتے ہیں۔ ان میں کچھ تو کھڑے کھڑے سلام کر کے واپس آجاتے ہیں۔ کچھ بیٹھ جاتے ہیں۔

پھر کھانا آتا ہے۔ خاص خاص لوگ کھانے میں شریک رہتے ہیں۔ سلطان بھی سب کے ساتھ کھانا کھاتا ہے۔ پھر قاضی اجلاس کرتا ہے اور رعایا کی فریادیں سنی جاتی ہیں۔ اگر کسی مقدمے میں سلطان کے مشورے کی ضرورت ہوتی ہے تو مسل بھیج دی جاتی ہے اور سلطان مسل کی پشت پر حکم لکھ دیتا ہے۔

اب ہم زنجبار کے شہروں کی طرف جا رہے ہیں۔

منبسی یا ممباسا

ممباسا بڑا جزیرہ ہے۔ جزیرے کے رہنے والے نیک، دین دار شافعی ہیں۔ کیلا اور مچھلی زیادہ کھاتے ہیں۔ جگہ جگہ لکڑی کی مسجدیں ہیں۔ ہر مسجد کے دروازے پر کنواں ہے۔

مسجد میں میلے پاؤں لے کر کوئی نہیں جاتا۔ اوّل ڈونگے میں پانی لے کر پاؤں دھوتے ہیں۔ پھر پتھر کے ٹکڑے سے جو دروازے پر پڑا رہتا ہے رگڑ رگڑ کر صاف کرتے ہیں۔ جوتا پہننے کا رواج یہاں نہیں ہے۔ سب ننگے پاؤں پھرتے ہیں۔

کلوا:

ایک رات رہ کر یہاں سے ہم سمندر کے راستے سے کلوا چلے گئے۔ کلوا کے باشندے سیاہ فام حبشی دین دار شافعی مذہب والے ہیں۔ کلوا کی عمارتیں مضبوط لکڑی کی ہیں چھتیں گنبد نما ہیں۔ یہاں بارش بہت ہوتی ہے۔

کلوا کے بادشاہ کا نام ابوالمظفر حسن ہے۔ بڑا سخی اور نیک آدمی ہے۔ علما اور درویشوں کی بڑی قدر کرتا ہے دین داروں سے بہت عزّت کا برتاؤ کرتا ہے۔ میرے سامنے کی بات ہے: حسن جمعے کی نماز پڑھ کر گھر جا رہا تھا۔ سامنے سے ایک فقیر آکر بولا: "سخی داتا" حسن نے کہا "حاضر ہوں"۔

فقیر بولا: "یہ کپڑے جوتے جو تو پہنے ہے مجھے دے دے"۔

حسن نے کہا: "اچھا"۔

فقیر بولا: "اچھا کیا! ابھی دے"۔

حسن خطیب کے حجرے میں گیا۔ سب کپڑے اتار کر دوسرے کپڑے پہنے اور اپنا پورا لباس فقیر کو دے دیا۔

ولی عہد نے یہ سنا تو فقیر سے کپڑے لے لیے اور اسے دس غلام بخش دئے۔ پھر حسن ہاتھی دانت کے دو بوجھ اور دس غلام اور دے کر فقیر کو رخصت کر دیا۔

یہاں ہاتھی دانت بہت قیمتی چیز ہے۔ سونے چاندی کی جگہ یہی انعام میں دیا جاتا ہے۔

حسن کے مرنے کے بعد اس کا بھائی تخت پر بیٹھا مگر یہ بڑا کنجوس ہے

ظفار:

یہاں سے ہم ظفار پہنچے۔ ظفار یمن کا

آخری شہر ہے اور یہی ہندوستان جانے کا ساحل ہے ۔
یہاں کے گھوڑے بہت مشہور ہیں اور ہندوستان جاتے ہیں ۔
ہوا موافق ہو تو یہاں سے ہندوستان جانے کا راستہ ایک
مہینے کا ہے حضر موت سولہ دن کا ہے ۔

ظفار کا بازار بے حد گندہ ہے ۔ جگہ جگہ مچھر بھن
بھناتے ہیں ۔ پھلوں کے چھلکے اور سڑے ہوئے پھل جہاں
تہاں پڑے رہتے ہیں ۔

ظفار کی مچھلی بہت عمدہ ہوتی ہے ۔ ایک مچھلی جس
کا نام "سردین" ہے خوب موٹی تازی ہوتی ہے ۔ عجیب
بات یہ ہے کہ یہاں کے گھوڑوں اور بھیڑوں کو بھی "سردین"
کھلائی جاتی ہے ۔

جوار زیادہ ہوتی ہے ۔ گیہوں بھی ایک خاص قسم کا
ہوتا ہے ۔ اسے "علس" کہتے ہیں ۔ ایسا ہوتا ہے جیسا چھلکا
اترا ہوا جو ۔ ہندوستان سے آتا ہے ۔ سکہ تانبے کا چلتا ہے ۔

یہاں کے تمام رہنے والوں کی گذر بسر محض تجارت
پر ہے ۔ یہ لوگ کوئی اور کام نہیں کرتے ۔

ہندوستان کے جہاز یہاں آتے ہیں تو بڑی دھوم
دھام ہوتی ہے ۔ بادشاہ کے نوکر جہاز والوں کا استقبال
کرتے ہیں ۔ جہاز کے مالک، جہاز کے کپتان، جہاز کے منشی کو
سلطان کی طرف سے خلعت دیا جاتا ہے ۔ اور انھیں گھوڑوں
پر سوار کر کے جلوس بنا کر باجے بجاتے بادشاہ کے محل تک
لے جاتے ہیں ۔ پھر امیر لشکر تین دن تک دعوت کرتا ہے ۔
تین دن بعد سلطان دعوت کرتا ہے ۔

ظفار کے رہنے والے پاجامہ نہیں پہنتے ۔ تہ بند
باندھتے ہیں گرمی میں دوسرا سر تہ بند کر پر ڈال لیتے ہیں ۔
پردیسیوں سے بہت محبت کرتے ہیں ۔ کئی کئی بار
نہاتے ہیں ۔ ہر مسجد میں دو تین حمام ہوتے ہیں جن
میں پانی کا انتظام رہتا ہے ۔

ظفار میں ریشم، روئی اور السی کی چھال کے
نہایت عمدہ کپڑے تیار ہوتے ہیں اسی کی چھال کے کپڑے
کو کتان کہتے ہیں ۔

ظفار میں فیل پا اور فتق کا مرض زیادہ ہے ۔
جسے دیکھو موٹے موٹے ہاتھی جیسے پیر لیے پھرتا ہے ۔

ظفار کے سلطان صبح اور عصر کے بعد ایک دوسرے
سے مصافحہ کرتے ہیں ۔ جمعے کے بعد بھی مصافحے کا عام دستور
ہے ۔ اس شہر پر آج تک کسی نے حملہ نہیں کیا ۔ اگر کسی نے ہمت
کی تو قدرتی طور پر ایسا نقصان اٹھایا کہ پھر توبہ کر لی ۔

سنا ہے کہ ہرمز کے سلطان قطب الدین نے ایک
دفعہ خشکی اور سمندر کے راستوں سے حملہ کیا تھا مگر سارا
لشکر اور جہاز تباہ ہو گئے ۔ مجبوراً صلح کرنا پڑی ۔

ایک بار سلطان یمن نے چڑھائی کی تو اس کے
بڑے بڑے امیر ایک دیوار کے نیچے دب کر مر گئے اور بادشاہ
لوٹ کر چلا گیا ۔

میں یہاں بڑی مسجد کے خطیب کا مہمان تھا ۔ اس
کا نام عیسیٰ بن علی ہے ۔ عیسیٰ بن علی کے پاس کئی چھوکریاں ہیں
ان میں ایک کا نام زاد المال ہے ۔ عیسیٰ بن علی نہایت اعلیٰ مرتبہ
اور کریم النفس ہیں ۔

ظفار کے رہنے والے جوتا نہیں پہنتے ۔ ننگے سر
ننگے پاؤں پھرنے کا عام رواج ہے ۔ ہر گھر کی کوٹھری میں
کھجور کا مصلےٰ لٹکا رہتا ہے ۔ جوار زیادہ کھاتے ہیں ۔

شہر کے باہر ایک بزرگ کی خانقاہ ہے ۔ محمد بن ابی
بکر بن عیسیٰ ان کا نام ہے ۔ کوئی مجرم اس خانقاہ میں پہنچ جاتا ہے تو
سلطان اسے نہیں پکڑتا ۔ ایک مجرم خانقاہ میں کئی سال سے ٹھہرا ہوا
تھا ۔ میرے قیام کے زمانے میں بھی سلطان کا کاتب بھاگ کر

خدمتِ خلق کے لئے ... ہمہ وقت حاضر

پیٹ اور معدہ کی نئی و پرانی
شکایات اور وبائی امراض سے
تحفظ کے لئے بے حد مفید اور
زود اثر دوا

آنکھوں کو جملہ امراض سے
محفوظ رکھنے۔ انھیں دلکش
روشن اور جاذب نظر بنانے کیلئے
بہترین سُرمہ

اکسیر اعظم ڈراپ

سُرمہ نور نظر

سُندری سہاگ

پی لو ٹانک

بالوں کی آرائش۔ قدرتی
نشو ونما۔ اور دماغی تازگی
کے لئے طبی اصولوں پر تیار
کیا ہوا خوشبودار تیل

PEELO
TONIC

بچوں کیلئے ایک خوش ذائقہ
ٹانک جو انھیں تندرست
خوش و خرم اور چاق
چوبند رکھتا ہے۔

مزید کاروباری تفصیلات کیلئے پتہ ذیل پر خط وکتابت کیجئے

S.A.B. BAKHSHI & CO.
POST BOX 114
CALCUTTA - 1

ایس۔ اے۔ بی۔ بخشی کمپنی
پوسٹ بکس ۱۱۴ کلکتہ ۱

محترمہ حسنیٰ سرور

میسور

یہ میسور جو آج جنّت نشاں ہے
بہاروں کا مرکز حسیں اور جواں ہے

خدا داد تھا نام اس سلطنت کا
فرنگی بس اس نام سے کانپتا تھا

یہاں عظمتِ حیدری سایہ زن تھی
بہاروں سے معمور یہ انجمن تھی!

اسے شیرِ میسور ٹیپو نے سینچا
لہو اپنا دے کر نکھارا، سنوارا

وہی سارے میسور کا پاسباں تھا
زمیں کیا، دلوں پر بھی وہ حکمراں تھا

ہر اک قوم آباد تھی اس وطن میں
نئی روح پھونکی تھی مردہ بدن میں

سرنگا پٹن، عہدِ ماضی کی جنّت
یہ اونچے قلعے اور یہ دریا دولت

یہ دیوار و در محل اور مندروں کے
یہ محراب و ممبر حسیں مسجدوں کے

یہ میسور کی عظمتوں کے نشاں ہیں
نشاں کیا ہیں خود اپنی ہی داستاں ہیں

نظر جب لگی دشمنوں کی وطن کو
خزاں کھا گئی اس سہانے چمن کو

خود اپنوں نے دشمن کو رستہ دکھایا
خود اپنے ہی ہاتھوں نشیمن جلایا

نمک خوار لوگوں کی عیّاریاں تھیں — یہ اپنے ہی یاروں کی مکاریاں تھیں
انھی دشمنوں نے چمن بیچ ڈالا! — فرنگی کے ہاتھوں وطن بیچ ڈالا!
اندھیروں کی تاریخ کا نور ٹیپو! — امر کر گیا نامِ میسور ٹیپو!!
یہ کہہ کر بہادر نے جاں اپنی دیدی — "جو جینا ہو تو شیر کی زندگی جی"

یہ میسور اہلِ سخن کا وطن ہے! — سدا خوشنوا بلبلوں کا چمن ہے
یہیں برقؔ و علویؔ نے جادو جگائے — نسیمؔ اور غمؔ نے بھی نغمے سنائے
لطیفؔ اور جاودؔ کے گونجے ترانے — لے شادؔ کو فکرِ نو کے خزانے
نفیسؔ اور ذائقؔ سے اہلِ سخن تھے — کئی گوہر نکلے اسی سرزمیں سے

ہے میسور ہر راہ میں سب سے اوّل — یہیں لکشمی جھنجھناتی ہے پائل
یہ قدرت کے ہاتھوں کا رنگیں کھلونا — یہی ارض ہے جو اگلتی ہے سونا
گراں قدر ریشم کا مرکز یہی ہے! — جہاں میں کوئی اس کا ثانی نہیں ہے
"برنداونم" کی ذرا دیکھیے شان — کہ خود کو بھلا دے یہاں آکے انسان
یہاں دھڑکنیں ہیں دلوں کی غزل خواں — یہاں رقص فرما ہے فصلِ بہاراں
یہاں حسنِ قدرت کے جلوے ہیں ہر سو — بہاریں جگاتی ہیں ہر سمت جادو
یہاں رنگ و نکہت میں ہے حسن رقصاں — ہیں صبحیں بہاراں تو شامیں چراغاں

جواں آرزوؤں کا گہوارہ ہے یہ!
اسے دیکھو، قدرت کا "شہپارہ" ہے یہ!

مہر ودولوی تھانہ

ننھا ٹائیگر

انگلستان کے ہیووڈ نامی گاؤں کا "وکٹر" WIXTER ایک سالہ بچہ دنیا کے تمام بچوں میں زیادہ وزن رکھنے والا بچہ مانا جاتا ہے۔

گذشتہ فروری میں اس کی پہلی سالگرہ کے موقع پر اس کا وزن ۵۶ پونڈ تھا۔ پیدائش کے وقت اس کا وزن ۷ ½ پونڈ یعنی ایک عام بچے کے برابر تھا۔ لیکن چند ہفتوں بعد اس کی بھوک میں غیر معمولی اضافہ ہوا اور وزن بڑھنے لگا۔

ایک سال کے عام بچے کا وزن تقریباً بیس پونڈ تک نہیں پہنچ پاتا۔ ڈاکٹروں کا بیان ہے کہ زیادہ بھوک اور زیادہ کھانے کی وجہ سے اس کا — وزن بڑھ رہا ہے اس کی ماں کا کہنا ہے کہ اگر اسے کھلایا جائے تو وہ متواتر دن بھر کھا سکتا ہے وکٹر کے خاندان میں اس کے ماں باپ کے علاوہ چھ بھائی بہن ہیں۔

اس عمر میں وکٹر دودھ، پاؤ روٹی، پھل، انڈے گوشت اور مچھلی بھی کھا لیتا ہے۔ وہ دن بھر میں اپنے والد سے زیادہ غذا ہضم کر لیتا ہے۔ اس کے کھانے کا ہفتہ وار خرچ ۹ شلنگ یعنی لگ بھگ ۱۰ روپے ہے۔ اتنی ہی رقم میں خاندان کے دیگر افراد کے کھانے کا ہفتہ وار انتظام ہو جاتا ہے۔ وکٹر کے اخراجات کے لیے اس کے والد کو آج کل مقررہ اوقات سے زیادہ کام کرنا پڑتا ہے۔

وکٹر کے دانت بھی نکل آئے ہیں۔ وہ ان کا ٹھیک طور پر استعمال بھی کر لیتا ہے۔ اب وہ کھڑا بھی رہ سکتا ہے۔

پوچھنے پر وہ اپنا نام بھی بتا سکتا ہے۔ اسے پانچ سالہ بچے کے کپڑے پہنائے جاتے ہیں۔ بچوں کی خوراک تیار کرنے والی ایک کمپنی (بے بی مینوفیکچرنگ کمپنی) نے اس کی فلم تیار کرنے اور ٹیلی ویژن پر دکھانے کی اجازت مانگی تھی لیکن وکٹر کے والدین نے اپنے بچہ کی نمائش سے صاف انکار کر دیا۔ وکٹر کا وزن اس کی ماں کے وزن کے نصف ہے جس کی وجہ سے وہ اسے آسانی اٹھا کر گود میں نہیں لے سکتیں۔ وہ بھرپور نیند سوتا ہے یوں تو عادتاً وہ بڑا متین اور نرم مزاج ہے لیکن اپنے بھائی بہنوں کے چھیڑنے پر وہ بگڑ بھی جاتا ہے۔ اور بعض اوقات اس زور کا گھونسا مارتا ہے کہ وہ بلبلا جاتے ہیں۔ اس کے گھر والوں نے اس کا نام "ٹائیگر" رکھ دیا ہے۔

والدین کو امید ہے کہ وکٹر کے وزن میں اس طرح اضافہ ہوتا رہا تو وہ بڑا ہو کر مستقبل کا ایک بہترین دنگل باز یا کشتی لڑنے والا پہلوان یا گھونسے باز بنے گا۔

(مراٹھی ڈائجسٹ "امرت" رسالہ ماہ ستمبر ۱۹۶۶ء سے ترجمہ)

جناب مسیح الدین صدیقی

دو تین گھنٹوں کے اندر ہی ہم شہر کے ریلوے اسٹیشن پر تھے۔ اس ریلوے اسٹیشن کو دیکھ کر مجھے پرانی باتیں یاد آگئیں۔

یہیں پر میں نے ایک ضرورت مند کو اپنا ٹکٹ دیا تھا اور پکڑا گیا تھا۔ پھر جیل، کچہری، راحت امین صاحب، ان کا مکان، پھر اقبال کو ڈھونڈ لانے کا وعدہ، پہاڑی، غار اور ٹھکانے۔

ایک کے بعد ایک سبھی باتیں یاد آگئیں اور میں گھبرا کر تیزی سے قدم بڑھاتا آگے بڑھنے لگا۔

کدھر؟ ٹکٹ نکالو؟

اسی ٹکٹ ماسٹر نے ہمیں پھر روک لیا۔

کچھ دیر تک میں اسے اور وہ مجھے دیکھتے رہے۔ پھر اُسے جیسے کچھ یاد آگیا ہو۔ اس نے آواز دی۔

"نرسنگ ادھر آؤ۔ دیکھو آج پھر وہی چور لڑکا پکڑا گیا۔"

"کیا بکتے ہو؟" میں نے غصہ سے کہا۔

اور دونوں ٹکٹ اس کے منہ پر پھینک اقبال کا ہاتھ پکڑ اطمینان سے باہر نکل آیا۔ میں نے اقبال کو ایک مسجد میں ٹھہرایا اور خود رکشہ میں بیٹھ کر سیدھا امین صاحب کے گھر کی طرف چل پڑا۔ رکشہ میں بیٹھ کر میں نے سوچا۔

"میں نے غلطی کی کہ پولیس اسٹیشن پر امین صاحب کو نہیں دیکھ لیا۔ کیا عجب جو وہ وہیں ہوں۔"

"خیر"

جلد ہی رکشہ امین صاحب کے مکان پر رک گیا۔

میں نے دروازہ کھٹکھٹانا چاہا۔ وہاں کے ملازم نے مجھے روک دیا۔

"دروازہ کیوں کھٹ کھٹاتے ہو جی؟"

"میں راحت امین صاحب سے ملنا چاہتا ہوں!"

"تمھارا دماغ خراب ہے! بھاگ جاؤ یہاں سے"

وہ ڈانٹ کر بولا اور غصّہ سے میری صورت اور میلے کپڑے دیکھنے لگا۔

"دیکھیے جناب! میں ایک ضروری کام سے آیا ہوں اور میں امین صاحب سے ملنا ہے یا تو آپ انھیں اطلاع دیجیے یا میں پھر دروازہ کھٹ کھٹاتا ہوں"

"میں کہتا ہوں بھاگ جاؤ یہاں سے۔ ورنہ پٹ جاؤ گے۔" وہ غصّہ سے بولا۔

میں پریشان ہوگیا۔

"اچھا یہ تو بتایئے وہ ہیں کہاں۔ گھر پر یا کچہری میں؟"

"کچہری میں" وہ بے زاری سے بولا۔

اب یہاں ٹھہرنا بے کار تھا۔ میں پھر سیدھا اسٹیشن پہنچا اور بے کھٹکے اندر گھس گیا۔۔۔

"ارے لڑکے کہاں گھسا آتا ہے؟" ایک پولیس والے نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"میں راحت امین صاحب سے ملنے آیا ہوں۔"

"چل بھاگ یہاں سے بڑا آیا راحت امین صاحب سے ملنے والا۔" اور اس نے مجھے زبردستی باہر دھکیل دیا۔

"ملنے نرینش !" میں زور سے چلایا۔ "تم نے مجھے پہچانا نہیں"
وہ اپنا نام سن کر بوکھلا گیا۔
"تم . . . تم . . . کون ہو ؟" وہ حیرت سے بولا۔
"یہ میں بعد میں بتاؤں گا۔ فی الحال تو مجھے امین صاحب
سے ملنا ہے۔" میں نے جواب دیا۔
"مگر وہ تو اپنے گھر جا چکے ہیں ؟
"ارے !" میں نے تعجب سے کہا۔
"ہاں وہ جا چکے ہیں۔" اس نے مجھے اندر لے جا کر امین
صاحب کا کمرہ دکھایا۔ اب کیا کیا جائے میں نے سوچا۔ ؟
ایک ترکیب ذہن میں آئی
جلدی سے جیب سے راحت امین صاحب کا کارڈ
نکالا اور انھی کی میز پر رکھے ہوئے ٹیلی فون پر نمبر ملائے
"ہلو — میں پولس اسٹیشن سے بات کر رہا ہوں۔"
"جی — میں امین صاحب سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"
"ہلو میں راحت امین ہوں۔"
"اوہ۔ اسلام علیکم" میں بولا "جناب میں اقبال مند
بات کر رہا ہوں۔"
"اقبال مند۔" انھیں بڑی حیرت ہوئی۔
"جی ہاں ، جی ہاں۔ میں آپ کو خوش خبری سنانا چاہتا
ہوں۔"
"کیا کہا۔ ۔ ۔ کیا۔ کیا اقبال مل گیا؟" وہ حیرت
سے بولے۔" بولو بولو کیا بات ہے ؟"
"وہ یہاں بتانے کی نہیں۔ آپ اپنے ملازم سے کہہ
دیجیے میں آرہا ہوں۔"
"میں مکان پر آیا بھی تھا مگر ملازم نے مجھے ملنے کی اجازت
نہیں دی اور بولا کہ آپ پولس اسٹیشن پر ہیں۔ مگر یہاں
معلوم ہوا آپ جا چکے ہیں۔"
"ہاں ہاں جلدی سے آؤ میں تمھارا انتظار کر رہا ہوں۔"
"پھر رکشہ لے کر میں امین صاحب کے گھر پہنچا۔"
امین صاحب میرے انتظار میں باہر ٹہل رہے تھے
میرے پہنچتے ہی بولے۔ "ارے تم ؟"
"تم نے اپنی یہ کیا گت بنا رکھی ہے۔ ؟"
"امین صاحب !" میں بولا
"آپ اندر بھی چلیں گے یا نہیں۔ اندر بیٹھیے پوری
تفصیل سنیے۔"
اندر پہنچتے ہی بیگم صاحبہ اور فرزانہ بھی دوڑی آئیں
میں نے اپنی کہانی شروع کی۔
"آپ سے رخصت ہو کر میں اسٹیشن پہنچا۔ مگر معلوم
ہوا کہ آخری گاڑی بھی روانہ ہو چکی ہے میں رات گذارنے کے لیے
ایک مسجد میں گیا مگر وہاں سے نکال دیا گیا۔ مسجد میں سونے کی اجازت
نہیں۔ چار و ناچار ایک دوکان کے چبوترے پر رات بسر کرنی پڑی
"جب آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کوئی شخص مجھے رسیوں
سے جکڑے، اپنی پیٹھ پر لادے بھاگے لیے جا رہا ہے۔ میں چیخا چلایا
لیکن میری مدد کو کوئی نہ آیا۔ وہ آبادی سے بہت دور نکل چکا
تھا۔ پھر وہ مجھے اپنی پارٹی میں لے گیا۔"
"ان اغوا کرنے والوں کا ایک گروہ ہے اگر وہ ہے جو
آبادی سے دور پہاڑی کے دامن میں بستا ہے۔"
"پھر میں نے ان کے ٹھکانے اور اس کی تفصیل سنائی
اور دھان کے پودوں کی رہنمائی میں بھاگ آنے کی داستان سنائی"
یہ تمام داستان سن کر وہ بولے۔ "اقبال بیٹا۔ میں
پہلے ہی کہہ چکا تھا کہ تم سیدھے اپنے وطن جاؤ۔ مگر تم اپنی ضد پر
اڑے رہے، تمھیں خواہ مخواہ پریشانی اٹھانی پڑی۔"
میں بولا۔ "امین صاحب یہ بھی خدا کی مصلحت تھی
آپ کا اقبال بھی انھی لوگوں کے پاس ہے۔ اور انھوں

نے اس کا نام "چونی" رکھ دیا ہے۔
"کیا کہا اقبال وہاں ہے؟"
"مگر اب نہیں ـــ پہلے تھا۔ اب تو وہ حفاظت سے ہے"
"امین صاحب! خدا کا شکر ہے اس نے مجھے وعدہ پورا
کرنے کی توفیق دی۔ اور میں نے اقبال کو تلاش کر لیا۔"
"کہاں ہے میرا اقبال!" امین صاحب کی بیگم بے چینی
سے بولیں۔
میں نے امین صاحب سے کہا۔
"اپنی گاڑی منگوائیے۔ اور چلئے میرے ساتھ۔"
امین صاحب نے ڈرائیور کو حکم دیا۔ اور ہم مسجد کی
طرف چل پڑے۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم مسجد میں تھے۔
اقبال امین صاحب کو دیکھتے ہی اچھل پڑا اور ان
کے سینے سے چمٹ کر رونے لگا۔ میرے ابّا جان میں آپ کے
لیے کتنا بے چین تھا۔
اور امین صاحب بھی رو پڑے اور میں کھڑا یہ منظر
دیکھ رہا تھا۔ میرے بھی آنسو نہ جانے کیوں امنڈ آئے تھے۔
امین صاحب نے مجھے بھی سینے سے لگایا اور خوب
دعائیں دیں۔
ان کی ان دعاؤں سے مجھے دلی مسرت حاصل
ہوئی۔ دل کی گہرائیوں جو نکلی تھیں۔
پھر وہاں سے ہم تینوں مکان واپس آئے۔
امین صاحب کی بیگم بھی اقبال کو دیکھتے ہی رو
پڑیں اور بہت دیر تک مجھے دعائیں دیتی رہیں۔ فرزانہ بھی
اپنے بھائی سے لپٹ گئی۔
بیگم صاحبہ بولیں
"اقبال بیٹا ہم تمہارا یہ احسان عمر بھر نہیں
بھول سکتے۔"

"ارے ـــ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں جی۔ یہ تو اللہ تعالیٰ
کا فضل و کرم اور اس کی مرضی تھی کہ اس نے مجھ جیسے حقیر
سے یہ کام کرایا۔
پھر میں نے اور اقبال نے غسل کیا۔ اور نئے کپڑے پہنے۔
دسترخوان تیار تھا۔ ہم سب کھانے بیٹھ گئے۔
کھانے کے درمیان فرزانہ نے مجھ سے کہا۔
"اقبال بھیا! آپ تو کچھ بات بھی نہیں کرتے۔"
"کیا بات کروں؟" میں نے کہا۔
"میں آپ کو انعام دینا چاہتی ہوں"۔ اور اندر سے
مٹھائیوں کا ڈبہ اٹھا لائی۔ لیجیے میری طرف سے مٹھائیاں کھائیے"
لیکن میں کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ میرا دماغ
پہاڑی وادی میں تھا۔
میں کچھ نہ بولا اور خاموشی سے دسترخوان پر سے
اٹھ گیا۔

بقیہ انوکھا انتقام

کون سا ہمدرد ہے جس نے ان کے بچے
کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دی ہے۔
چند لمحوں بعد وہ باہر آیا ڈاکٹر موہن داس کا بچہ
اس کی بانہوں میں تھا۔ کپڑے بری طرح جل رہے تھے
سارا جسم جھلس گیا تھا۔ اس نے بچہ اس کی ماں کی گود میں
دے دیا۔ یک بارگی ڈاکٹر اسے دیکھ کر چونک پڑا۔
کمار بے ہوش ہو گیا۔
ڈاکٹر نے اس کے کپڑے الگ کئے اور زخموں
کی مرہم پٹی کرنے لگے۔ ان کا سر ندامت سے جھک گیا
کمار نے انتقام لے لیا تھا انوکھا انتقام۔

جناب اقبال بیگ (ٹیچرس کالج)

ایک دن کیا ہوا

سلیم اور سلمہ کچھ اور بچّوں کے ساتھ گھر کے باہر کھیل رہے تھے۔ گرمیوں کے دن تھے، دوپہر کا وقت ایک بچّے کو پیاس لگی۔ سب کو لگنے لگی۔ پانی پینے پاس کے کنویں پر آئے۔ کنویں پر کوئی نہ تھا۔ صرف ایک ڈول، رسّی میں بندھا، وہاں پڑا تھا۔

پریشان ہوتے کہ پانی کون پلائے۔ پھر طے ہوا کہ خود کھینچ کر پیا جائے۔ بچّوں میں سلیم اور سلمہ ہی کچھ بڑے تھے۔ دونوں لپک کر کنویں پر چڑھ گئے اور ڈول کنوئیں میں ڈال دیا۔ ڈول میں پانی لبالب بھر گیا۔ اب ڈول کھینچنا چاہتے ہیں تو کھینچ نہیں پاتے۔ بھاری جو ہو گیا تھا۔

پہلے دونوں نے مِل کر کھینچا۔ پھر اکیلی سلمہ نے کھینچنا چاہا۔ پھر خود سلیم نے تنہا زور لگایا۔ پر کچھ کام نہ بنا۔ زور لگانے پر ڈول کچھ اوپر آتا۔ جتنا اوپر آتا اتنا ہی بھاری محسوس ہوتا۔ ہاتھ دُکھنے لگتے۔ بازو تھک جاتے۔ ہاتھ ڈھیلے پڑتے ہی رسّی کھسکنے لگتی اور ڈول پھر نیچے پانی میں چلا جاتا۔ بڑی مصیبت میں پھنس گئے۔ نیچے بچّوں کی پوری فوج پیاسی کھڑی ہے۔ سب اس انتظار میں ہیں کہ کب یہ دونوں کمانڈر پانی کھینچیں اور کب انھیں پلائیں۔ یہاں حالت یہ ہے کہ رسّی پکڑے کھڑے ہیں اور پریشان ہیں۔ زور لگاتے لگاتے ہاتھ پاؤں بُری طرح دُکھنے لگے ہیں۔ ڈول کھینچ لینا بس سے باہر نظر آتا ہے۔ ہار ماننے میں شرمندگی ہوتی ہے۔

سلیم نے سوچا اگر سب بچّے مِل کر کھینچیں تو شاید کام بن جائے۔ اس ترکیب پر عمل کرنا چاہا تو ایک ہنگامہ مچ گیا۔ ڈول کھینچنا سب بھول گئے۔ شور اور ادھم مچ گیا کوئی رسّی پکڑے اِدھر بھاگ رہا ہے کوئی اُدھر کو کھینچ رہا ہے۔ کسی نے رسّی دوسرے کے گرد لپٹنا شروع کر دی کوئی اُلجھ کر گر پڑا۔ کوئی اسے اٹھانے جھکا تو تیسرے نے اُسے دھکا دے دیا۔ وہ منھ کے بل زمین پر گرا۔ عجب حال تھا۔ کچھ چیخ رہے ہیں۔ کچھ رو رہے ہیں۔

یہ دیکھ کر سلمہ بہت جھنجھلائی۔ سلیم کو بھی غصّہ آیا۔ وہیں کھڑے کھڑے اس نے ڈانٹ ڈپٹ شروع کی تب کچھ ہنگامہ کم ہوا۔ اور سب قاعدے سے رسّی پکڑ کر کھڑے ہو گئے۔ سلیم کے اشارہ کرنے پر سب نے زور لگا کر رسّی کو کھینچنا شروع کیا۔ ڈول اوپر آنے لگا۔ بچّے رسّی کھینچتے ہوئے کنویں سے دُور ہٹنے لگے۔ ڈول اوپر آ گیا۔ سلیم اور سلمہ نے خوشی کا نعرہ لگایا۔ بچّے رسّی کو لیے اور تیزی سے بڑھنے لگے۔ سلیم کی شاباشی سُن کر جوش میں آ گئے اور زور لگا کر دوڑ پڑے۔ سلیم اور سلمہ بہتیرا

چلائے، ٹھہرو ٹھہرو، کوئی نہ رکا۔ ڈول تیزی سے اوپر آکر گراری سے ٹکرایا۔ سارا پانی چھلک کر پھر کنوئیں میں چلا گیا۔

ڈول گراری سے ٹکرایا۔ رسّی کھینچنے والے جھٹکا کھا کر گرے۔ منہ اٹھا کر کنوئیں کی طرف دیکھا تو ڈول میں سے پانی الٹ کر گر رہا تھا۔ سب بچے رسّی کو چھوڑ کر کنوئیں کی طرف بھاگے۔ اتنے کسی کی سمجھ میں آئے کہ کیا ہوا، ڈول رسّی سمیت کنوئیں میں جا گرا۔

ابھی سوچ رہے تھے کہ کیا کریں۔ اتنے میں دور سے بھشتی آتا ہوا نظر آیا۔ سب بچے بھاگ کر اپنے اپنے گھروں میں چلے گئے سلیم اور سلمہ بھی۔

بھشتی کنوئیں پر پہنچا تو ڈول غائب تھا۔ بہت پریشان ہوا۔ اس نے شور مچا دیا: "ڈول کون لے گیا"۔ لوگ جمع ہو گئے۔ چور کو برا بھلا کہنے لگے۔

اچانک بھشتی کو بچوں کا خیال آیا جو اُسے دیکھتے ہی وہاں سے بھاگے تھے۔ ایک گھر میں جا کر اس نے بچوں سے پوچھ تاچھ کی۔ پتہ چلا ڈول سلیم نے کنوئیں میں گرا دیا ہے۔

سلیم کے گھر جا کر اس نے شکایت کی۔ اور بکتا جھکتا اپنے گھر چلا گیا۔ کانٹا لا کر اس نے کنوئیں سے اپنا ڈول نکالا۔

بھشتی بہت ناراض تھا۔ اُس کا وقت برباد ہوا تھا۔ اتنی دیر میں وہ چار گھروں کا پانی بھرتا۔ محلے والے بھی سلیم کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔ امّی اور ابّا جان بھی ناخوش ہوئے سلیم اور سلمہ چور بنے، خاموش اور شرمندہ تھے۔

امّی نے کہا "اگر تم میں سے کوئی کنوئیں میں گر جاتا تو؟

ابّا جان نے کہا "دوسروں کے کام آنا بہت اچھی بات ہے لیکن کرنے سے پہلے سوچ لینا چاہیے کہ یہ کام کیا بھی جا سکتا ہے یا نہیں کیا جا سکتا ہے تو کیسے کیا جا سکتا ہے۔ یہ بہت برا ہے کہ جو بات دل میں آئی بغیر سوچے سمجھے اسے کرنے کی ٹھان لی۔

جناب بزمی بھارتی

طالب علم کی عید

دیئے جلاؤ کہ ہم امتحاں میں پاس ہوئے
خوشی مناؤ کہ ہم امتحان میں پاس ہوئے

بہن کو، امّی کو، ابو کو، دولہا بھائی کو
خبر سناؤ کہ ہم امتحاں میں پاس ہوئے

ہمیں ملا ہے صلا آج اپنی محنت کا
ترانے گاؤ کہ ہم امتحاں میں پاس ہوئے

یہ بات ٹالنے والی نہیں ہے بھائی جان!
مٹھائی لاؤ کہ ہم امتحاں میں پاس ہوئے

کہاں ہے اب وہ گھڑی، اور سوٹ کا تحفہ
ہمیں سجاؤ کہ ہم امتحاں میں پاس ہوئے

یہی تو دن ہے ہمیں آج خوب پیار کرو
گلے لگاؤ کہ ہم امتحاں میں پاس ہوئے

محترمہ سلمیٰ جاوید

کام کی باتیں

"رشیدہ، او، رشیدہ"

"جی امی، ابھی آئی۔"

"رشیدہ یہ تم نے کمرے کی کیا گت بنا دی ہے؟"

"امی! میں نے کیا کیا؟"

"دیکھو اس کے فرش پر تم نے کتنی بہت سی کتابیں بکھیر رکھی ہیں۔ دیواروں پر روشنائی چھڑک چھڑک کر بدنما دھبے ڈال دیئے ہیں۔ اور اس کے پردوں سے معلوم ہوتا ہے گیلے ہاتھ پونچھے ہیں۔"

"امی! یہ کتابیں سب میری تو نہیں ہیں۔ کچھ باجی کی اور زیادہ بھائی جان کی ہیں۔"

"اور یہ دیواروں پر روشنائی کی لکیریں اور دھبے؟"

"وہ تو امی جب کبھی فونٹین پن میں روشنائی رک جاتی ہے تو اسے چھڑک کر قلم کو چلنے کے قابل بناتے وقت کچھ چھینٹیں دیوار پر پڑ گئی ہوں گی۔"

"اور یہ انگلی اور انگوٹھے کے نشانات جو دیوار پر بنے ہیں؟"

"وہ تو اکثر لکھتے وقت قلم کی روشنائی انگوٹھے اور انگلی میں لگ جاتی ہے اور اس ڈر سے کہ کاغذ پر اس کا دھبہ نہ آجائے جلدی اور بے خیالی میں دیوار پر انگلی چلی جاتی ہے۔"

اچھا ــــ یہ دیواروں پر پردے کوئی تولیہ تو نہیں ہیں۔ تم نے اس میں ہاتھ پونچھے ہیں۔"

کوئی میں ہی تھوڑا اس سے ہاتھ پونچھتی ہوں۔ باجی اور بھائی جان بھی تو ناشتہ کی میز سے واپس آکر اسی پردے سے ہاتھ مل کر صاف کر لیتے ہیں۔"

"مگر یہ تو بتاؤ کہ مکڑی کے جالے دیوار کے کناروں اور کھڑکیوں پر کب سے لگے ہوئے ہیں۔"

"امی یہ کام تو بوا کا ہے۔ وہ کبھی میرے کمرے میں صفائی کے لیے جھانکتی تک نہیں۔ اب بھلا بتایئے کہ مجھے اتنی فرصت کہاں کہ مکڑی کے جالے نکالوں، کاغذ کے پرزوں کو چنوں، گرد صاف کروں، کمرے میں جھاڑو لگاؤں۔"

"خالدہ، راشد یہیں آجاؤ۔ رشیدہ کے کمرے میں۔"

"دیکھو رشیدہ تم دونوں پر الزام رکھتی ہے کہ اس کے کمرے کو تم لوگوں نے کباڑ خانہ بنا رکھا ہے۔ تم سب ان کے یہاں اپنی کتابیں لاکر بھلا دیتے ہو پن سے روشنائی چھڑک چھڑک کر دیوار کو خراب کرتے ہو۔ کاغذ کے پرزے پھینکتے ہو اور دروازوں کے پردوں سے ہاتھ صاف کرتے ہو۔"

امی رشیدہ بالکل غلط کہتی ہے، یہ خود ہماری کتابیں اپنے کمرے میں اٹھا لاتی ہیں اور ہم دونوں اپنی کتابیں تلاش کرتے پھرتے ہیں اور بلا وجہ پریشان ہوتے ہیں۔ روشنائی چھڑکنے کی تو ان کی عادت ہے مشکل سے ایک آدھ سطر لکھتی ہیں اور تین چار دفعہ قلم کو جھٹکتی ہیں۔ دیوار پر انگوٹھے اور انگلی کے نشانات بھی سب انہی کے ہیں۔ اگر آپ کو شک ہو تو ان کے انگوٹھے کا نشان لے کر دیوار کے نشان سے ملا لیجیے۔ کھانے کی میز

سے اٹھنے کے بعد یہ کبھی اپنے ہاتھ نہیں دھوتیں ہمیشہ اپنے پردوں کو تولیہ کی طرح استعمال کرتی ہیں۔"

"ہاں رشیدہ یہی بات ہے؟"

"اب امّی جب سب لوگ مجھی پر الزام رکھ رہے ہیں تو مجھے کہ میری ہی ساری غلطی ہے۔"

"دیکھو رشیدہ بیٹی! صفائی ستھرائی کی عادت بہت ہی عمدہ بات ہے۔ تم نے گھر کے "پلّو" کو دیکھا ہے۔ وہ جہاں کہیں بھی بیٹھتا ہے اس جگہ کو پہلے اپنی دُم کو ہلا ہلا کر خوب صاف کر لیتا ہے۔ کتنی اچھی بات ہے یہ اس میں اسی وجہ سے اس کے بدن میں داغ دھبّہ نہیں لگتا۔ پھر وہ پاس کی نہر میں جا کر روز ہی تو نہاتا ہے۔ اسی وجہ سے تمھارے ابّاجی اور گھر کے سب لوگ اس سے کتنا خوش رہتے ہیں۔

اپنی کتابوں کو نہایت قرینے سے شیلف میں سجا کر رکھنا چاہیے۔ شیلف کے پاس ہی "روٹین" کو صاف صاف لکھ کر ایک گتے پر چپکا کر لٹکا دینا چاہیے اور اسی کے حساب سے روز کتابیں آسانی سے نکالتے رہنا چاہیے۔ اس سے کتابیں زیادہ پھیلیں گی نہیں۔ پھر مطالعہ ختم کر تو انھیں بدستور شیلف میں لگا دیا کرو۔ دوسرے کی کتاب جب دیکھنے کے لیے لاناہی ہو تو اسے شکریہ کے ساتھ واپس کر دینا چاہیے کیونکہ معلوم نہیں کب اسے خود اپنی کتاب کی ضرورت پڑ جائے اور وہ بلا وجہ پریشان ہو۔

قلم کو صاف کرنے کے لیے ہمیشہ ایک چھوٹا سا کپڑا رکھو اور آہستگی سے "نب" کو اس سے صاف کر دیا کرو۔ کبھی کبھی نب اور اس کے ربر کو ٹھنڈے پانی میں تھوڑی دیر ڈال کر دھو لیا کرو۔ اس سے قلم میں روشنائی جمنے نہ پائے گی۔ دیوار پر روشنائی چھڑکنے سے یہی نہیں کہ دیوار بدنما اور خراب لگنے لگتی ہے۔ گھر کے لوگوں کو بھی لوگ بے سلیقہ سمجھنے لگتے ہیں۔

جب انگوٹھے یا انگلی میں روشنائی لگنے لگے تو یہ سمجھنا چاہیے کہ قلم لیکج (رسنا) کر رہا ہے۔ ایسی حالت میں اس کو ٹھیک کرا لینا چاہیے یا پھر نب والے حصّہ کو اس کے باڈی سے نکال کر جہاں چوڑیاں بنی ہوتی ہیں ان چوڑیوں پر سولیوشن (ربڑ والا) دو تین بوند ٹپکا کر پھر باڈی میں لگا کر کس دینا چاہیے اور اوپر سے قلم کو صاف کر دینا چاہیے۔ اب چلنے میں روشنائی لیکیج نہیں کرے گی نہ ہاتھ خراب ہوگا۔

کاغذ کے پرزوں کے لیے ایک چھوٹی سی ٹوکری رکھ لو۔ سب ردّی اور خراب کاغذ اسی میں ڈال دیا کرو۔ اور شام کو اٹھا کر باہر کوڑے میں ڈال دیا کرو۔ کبھی کبھی لمبی جھاڑو لے کر کمرے کے جالے نکال دیا کرو۔ بے چاری "بوا" کام کرتے کرتے کتنی نڈھال ہو جاتی ہے۔ اب یہ بھی کوئی کام ہے۔ ذرا کی ذرا میں تم خود اپنے کمرے کو صاف کر کے آئینہ کی طرح چمکا سکتی ہو۔

بیٹی رشیدہ! تم تو بہت سمجھ دار لڑکی ہو، محنتی بھی ہو تم کو یہ سب کام اپنے ہاتھ سے کر لینے چاہئیں۔ ہاں ایک بات یہ ہمیشہ یاد رکھو کہ دوسروں پر جھوٹ بات کا الزام لگانا بے حد بری بات ہے۔

ناشتہ اور کھانے کے بعد ہمیشہ صابن سے ہاتھ دھو کر اپنے تولیہ میں ہاتھ پونچھنا چاہیے۔

جناب رفیق شاستری

پنچ تنتر کی کہانیاں

دوسرا حصّہ

جنوب میں مہیلا روپ نام کا ایک شہر تھا۔ وہاں ایک گھنے برگد کی شاخ پر لگھو پتنک نام کا ایک کوّا رہتا تھا۔ ایک دن کھانے کی تلاش میں وہ شہر کی طرف جارہا تھا، اچانک اُس کی نظر ایک شکاری پر پڑی۔ کالا کلوٹا بکھرے بالوں والا یہ آدمی اسے موت کے فرشتے کی طرح لگا۔ اسے پیڑ پر رہنے والے اپنے ساتھیوں کی فکر ہوئی۔ وہ الٹے پاوں واپس آیا اور پیڑ پر رہنے والے تمام پرندوں کو بتا دیا کہ شکاری ادھر آرہا ہے وہ جال بچھا کر دانے ڈالے گا جو ان دانوں کو کھائے گا وہ شکاری کے جال میں پھنس جائے گا۔ خبردار تم میں سے کوئی اس دانے کی طرف رخ نہ کرنا انھیں زہر کے دانے سمجھنا۔

اتنے میں شکاری بھی وہاں آپہنچا۔ اپنا جال پھیلاکر اور دانے بکھیر کر وہ ایک پیڑ کی آڑ میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ کوّا یہ دیکھ کر ہنس رہا تھا۔ پیڑ کے کسی پرندے نے ان دانوں کی طرف رخ نہ کیا۔

شکاری بہت دیر انتظار میں بیٹھا رہا۔ مگر کوئی چڑیا اس کے جال میں نہ پھنسی۔ وہ جال سمیٹنے ہی والا تھا کہ ادھر سے کبوتروں کا ایک گروہ اڑتا ہوا گزرا۔ چترگریو نام کا کبوتر اس کا سردار تھا۔ لگھو پتنک کوّے نے چترگریو کو بہت سمجھایا مگر سامنے بکھرے ہوئے دانے دیکھ کر اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ جب دل میں لالچ آجائے تو عقل بہت زیادہ کام نہیں کرتی۔ یہی حال ان کبوتروں کا ہوا۔ کوّے کے لاکھ سمجھانے کے بعد بھی وہ ان دانوں پر ٹوٹ پڑے اور شکاری کے جال میں پھنس گئے۔

جال میں پھنسنے کے بعد چترگریو کی عقل ٹھکانے پر آئی۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو خبردار کیا کہ جال میں پھنسنے کے بعد پروں کو پھڑپھڑانا بے فائدہ ہے اس سے ہم جال میں اور زیادہ پھنس جائیں گے۔ خطرے کے وقت صبر حوصلے اور عقل سے کام لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ چترگریو نے سوچا کہ اب ایسے وقت اور کیا کیا جاسکتا ہے۔ اس وقت ایک بات اُس کی سمجھ میں آئی اور اس نے تمام کبوتروں سے کہا کہ سب کبوتر ایک ساتھ جال لے کر اڑ چلیں۔ چترگریو کا اشارہ پاتے ہی سارے کبوتر جال لے کر اڑ گئے۔ اڑتے اڑتے بہت دور نکل گئے۔ لگھو پتنک کوّا بھی ان کے ساتھ اڑنے لگا۔ شکاری بہت دور تک پیچھا کرتا ہوا گیا مگر جب اس نے دیکھا کہ کبوتر جال سمیت ندی کے اوپر سے اڑ کر دور جنگل میں نکل گئے ہیں تو مایوس ہو کر اسے لوٹ جانا پڑا۔ بے چارہ آیا تھا شکار کرنے اور

اپنے جال سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔

شکاری کے لوٹ جانے پر چترگریو نے اپنے ساتھی کبوتروں سے کہا دوستو اب فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ شکاری لوٹ گیا ہے۔ اب اس جال سے نکلنے کی تدبیر کرنا ہے۔ یہاں سے اتر کی طرف میرا ایک دوست سُنہرا چوہا رہتا ہے۔ وہ ضرور ہماری مدد کرے گا۔ وہ ہمارے جال کو کاٹ کر ہم لوگوں کو آزاد کر دے گا۔ پھر ہم لوگ چین سے آسمان میں اڑتے پھریں گے۔

وہ سُنہرا چوہا اپنے بلوں کے مضبوط قلعے میں رہتا تھا۔ چترگریو نے اس کے دروازے پر دستک دی اور کہا "دوست میں بڑی مصیبت میں پھنسا ہوا ہوں تم جلدی نکل آؤ۔"

چترگریو کی آواز سن کر چوہا وہیں سے چھپا چھپا بولا۔ تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو اور کیا چاہتے ہو؟

چترگریو نے جواب دیا میں تمھارا دوست چترگریو ہوں۔ کبوتروں کا سردار۔ تم جلدی باہر نکل آؤ۔ مجھے تم سے خاص کام ہے۔

یہ سن کر سُنہرا چوہا باہر نکلا۔ اپنے دوست چترگریو کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوا۔ مگر اس طرح سب کو جال میں پھنسا دیکھ کر کچھ رنجیدہ بھی ہوا اور پوچھا دوست یہ کیا ماجرا ہے۔ تب کبوتر نے بتایا کہ کس طرح چند دانوں کے لالچ میں آکر اس جال میں پھنسے۔

چوہے نے جیسے ہی چترگریو کے پھندے کا دھاگا کاٹنے کے لیے جال پر دانت گڑھائے کہ چترگریو چلا اٹھا "نہیں دوست پہلے میرے ساتھی کبوتروں کے بندھن کاٹو۔ سب سے بعد میں میرا پھندا کاٹنا۔"

چوہا بولا۔ نہیں دوست تم سب کے سردار ہو سب سے پہلے تمھیں آزاد ہونا چاہیے۔

چترگریو نے کہا "نہیں میرا فرض ہے کہ میں پہلے اپنے ساتھیوں کا خیال رکھوں۔ یہ سب میرے ماتحت ہیں۔ ان کا خیال رکھنا میرا فرض ہے۔ جو لوگ اپنے ساتھیوں پر مہربان ہوتے ہیں انھیں اپنے ماتحتوں سے ڈر نہیں ہوتا اور مصیبت کی گھڑی آنے پر سب ان کی حفاظت کرتے ہیں۔"

چوہا یہ بات سن کر بہت خوش ہوا۔ اس نے جال کے سارے بندھن کاٹ کر سب کبوتر آزاد کر دیے۔ چترگریو اپنے غول کے ساتھ اڑتا ہوا اپنے گھر چلا گیا اور چوہے میاں اپنی بل میں واپس آ گئے۔

گھوپتنگ کوا یہ سارا تماشا دور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ چوہے کی ہوشیاری اور اس کے بات کرنے کے ڈھنگ سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے دل میں سوچا کہ میری عادت تو کسی پر اعتبار کرنے کی نہیں مگر اس چوہے کو دوست بنانے کو جی ضرور چاہتا ہے۔

کوا چوہے کے بل کے پاس آ گیا اور چترگریو کبوتر کی طرح اس نے بھی دروازے پر دستک دی اور چترگریو ہی کی طرح آواز بنا کر چوہے کو پکارنے لگا۔ کوے کی اس طرح کی آواز سن کر چوہے نے سوچا آخر یہ کیسا کبوتر ہے۔ کہیں کسی کبوتر کے بندھن کٹنے سے رہ تو نہیں گئے جو فریاد لے کر میرے دروازے تک آیا ہے۔

چوہے نے پوچھا "تم کون ہو بھئی؟"

کوا ۔ میں ایک کوا ہوں۔ میرا نام گھوپتنگ ہے۔

چوہا۔ معاف کرنا بھئی میں نے تمھیں پہچانا نہیں یہاں کیوں کھڑے ہو۔ اپنے گھر جا کر آرام کرو۔

کوا ۔ مگر مجھے تم سے بہت ضروری کام ہے۔

ایک ذرا ملاقات کا موقع تو دیجیے۔

چوہا: آخر کیوں۔ مجھے تو اس میں کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔

کوا: بھئی ابھی میں نے دیکھا کہ تم نے کس طرح کبوتروں کے بندھن کاٹ کر انہیں آزاد کر دیا تمہاری یہ بات مجھے بہت اچھی لگی۔ سوچتا ہوں تم سے دوستی کیوں نہ کر لی جائے کبھی مجھ پر برا وقت پڑے تو میں بھی تمہارے پاس آکر بندھن کٹوالوں۔

چوہا: بھئی کوے یہ کیوں بھولتے ہو کہ میں تمہاری غذا بھی بن سکتا ہوں۔ ہمارا تمہارا میل کیسا؟ ہم دونوں کی خصلت ایک دوسرے سے جدا ہے۔ دو جدا فطرت والوں سے دوستی ہو ہی نہیں سکتی۔

کوا: اے بھئی چوہے۔ میں تمہارے دروازے پر دوستی کی بھیک مانگنے آیا ہوں۔ تم اگر دوستی نہیں کروگے تو میں یہیں جان دے دوں گا۔

چوہا: تم اپنی فطرت سے ہمارے جانی دشمن ہو۔ ہم میں کبھی دوستی نہیں ہو سکتی۔

کوا: ہم نے تو تمہاری شکل بھی نہیں دیکھی ہم میں تم میں دشمنی کیسی؟

چوہا: بھئی دشمنی دو طرح کی ہوتی ہے ایک تو فطری دشمنی اور دوسری بناوٹی دشمنی۔

کوا: چوہے میاں ذرا ان باتوں کو اچھی طرح سمجھا دو۔

چوہا: اے تم اتنی سی بات نہیں سمجھے۔ دشمنی کا کوئی سبب ہو، وہ بناوٹی دشمنی ہوتی ہے یعنی سبب کے دور ہو جانے پر دشمنی بھی جاتی رہتی ہے۔ فطری دشمنی بغیر کسی سبب کے ہوتی ہے اور وہ کبھی کسی حالت میں ختم نہیں کی جا سکتی۔

کوے نے بہت منت سماجت کی مگر چوہے نے دوستی کی تجویز نہ مانی۔ تب کوے نے کہا: بھئی چوہے اگر تم مجھ پر بھروسا نہیں کر سکتے ہو تو مجھے اجازت دو کہ میں تم سے یہیں سے بیٹھا بیٹھا باتیں کیا کروں۔ تم مزے سے بل میں چھپے رہو۔

چوہے نے کوے کی یہ بات مان لی۔ مگر کوے کو ہوشیار کرتے ہوئے اس نے اتنا کہہ دیا کہ کبھی میرے بل میں داخل ہونے کی جرات نہ کرنا۔ کوے نے بھی قسم کھا لی کہ وہ کبھی ایسا نہیں کرے گا۔

اس وقت سے دونوں دوست بن گئے۔

وہ دونوں روزانہ بات چیت کرتے مزے مزے کی کہانیاں سنتے سناتے۔ دونوں کے دن چین سے کٹ رہے تھے کوا کبھی ایک آدھا دانہ دنکا لاکر چوہے کو دے بھی دیا کرتا تھا۔ دوستی میں چیزوں کی لین دین فطری بات ہے۔ رفتہ رفتہ دونوں میں بہت گاڑھی چھننے لگی۔

بہت دن بعد ایک دن کوے نے آنکھوں میں آنسو بھر کر چوہے سے کہا۔ دوست مجھے یہاں چین نہیں ملتا۔ اب میں کسی دوسرے دیس چلا جاؤں گا۔

چوہے نے جب وجہ دریافت کی تو کوے نے کہا: بارش نہ ہونے کی وجہ اس بار زبردست قحط پڑ گیا ہے۔ لوگ بھوکوں مر رہے ہیں۔ گھروں میں ایک دانہ بھی نہیں رہا۔ گھر میں چڑیوں کو پکڑنے کے لیے جال بچھائے گئے ہیں۔ میں تو بس قسمت سے بچ ہی گیا۔ ایسے دیس میں رہنا ٹھیک نہیں۔

چوہے نے پوچھا۔ مگر جاؤ گے کہاں؟

کوے نے کیا جواب دیا۔ یہ جاننے کے لیے جولائی کا شمارہ دیکھیے۔

جناب مختار بارہ بنکوی

بہت خوب ہے پیشۂ باغبانی
سکھاتا ہے بھوکوں کو روٹی کمانی

زراعت کا یہ ملک ہندوستان ہے
مناسب یہاں پیشۂ باغباں ہے

یہ فن ہے جو محنت کے سانچے میں ڈھلتا
ہر اک ذرّہ ہے مُنھ سے سونا اگلتا

نہیں اس سے مطلب بنیں ہم کباڑی
جو پیشہ میں اپنے ہیں بالکل اناڑی

جو اچھّی طرح سے کریں اس کو حاصل
تو کٹ جائے گی اپنی روزی کی مشکل

یہ فن اب ہے بامِ ترقی پہ پہنچا
کریں پہلے اس کی کتابیں مہیّا

زمیں دیکھ کر اس کی حالت کو جانچیں
جو راس آئے اس میں وہی کھاد ڈالیں

قلم باندھنے میں بڑھائیں مہارت
بہت ملک کو اس کی ہے اب ضرورت

کریں پھول پھل کے لیے تخم جاری
کسی طرح سے حل ہو مشکل ہماری

نئے آلہ ہائے زراعت منگائیں
مفید اور نئے قسم کے ہل چلائیں

کہیں تاک کی ٹٹیاں ہم سجائیں
کہیں بیل انگور کی ہم لگائیں

پھلوں کے درخت اور میوے رسیلے
یہ ہر رنگ کے پھول سرخ اور پیلے

کیاری کیاری بنائیں گلستاں
نظر آئیں ہر جا پہ جنّت کے ساماں

ہو معقول اگر کاشت ترکاریوں کی
جو ترتیب عمدہ رہے کیاریوں کی

فنِ باغبانی اگر ہو مکمّل
سوال اپنی روٹی کا ہو جائے گا حل

جو منظور ہے ملک کی کامرانی
تو حاصل کرو تم فنِ باغبانی

زمیں ہند کی فطرتاً گلستاں ہے
ہر اک فرد اس کے لیے باغباں ہے

جناب اظہار الحق

پھلواری لگائیے

ننھو اور شبن نے بڑے شوق بڑی دلچسپی سے چچا جان کی ہدایت پر کیاریاں بنانے کے لیے مٹی کھودی زمین ہموار کی۔ وہ اپنے کام میں لگے ہوئے تھے کہ امتحان کا زمانہ آگیا پھر تو دونوں پڑھائی میں ایسے مشغول ہوئے کہ تن بدن کا ہوش نہ رہا۔

لیکن جیسے ہی امتحانوں سے چھٹی پائی ایک جوش سے اپنے کام میں لگ گئے کھدائی وغیرہ کے سلسلے میں جو کسر رہ گئی تھی وہ پوری کی۔ اور اب اس فکر میں تھے کہ کسی طرح سے معلوم کریں کہ پھلواری میں کیا کیا لگانا چاہیے کس طرح لگانا چاہیے۔

آخر ایک دن انھوں نے چچا کو گھیر لیا انھوں نے بہت کہا۔ "بھئی مجھے ضروری کام ہے۔" مگر بچوں کو تو دھن لگی ہوئی تھی۔ کسی طرح نہ مانے آخر چچا کو اپنا کام ملتوی کرنا پڑا۔ کہنے لگے :

دیکھو بھئی پھلواری لگانے کا کوئی خاص طریقہ نہیں ہے صرف چند باتوں کو دھیان میں رکھو۔

۱۔ سہولت (Convenience)

۲۔ میل (HARMONY) یعنی مختلف پودے اس انداز سے لگائے جائیں کہ نظر کو نہ کھٹکیں بلکہ اچھے لگیں۔

۳۔ خصوصیت (INDIVIDUALITY)

۴۔ سادگی (SIMPLICITY)

۵۔ تنوع، رنگ برنگاپن (VARIETY)

چند اور باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

۱۔ پانی پھلواری کی ہر کیاری میں آسانی سے پہنچ سکے۔

۲۔ پھلواری لگاتے وقت آس پاس کے منظر کا خیال رکھا جائے۔ اور اندر کے ہر منظر کو اس طرح مرتب کرنا چاہیے کہ دیکھنے میں بھلا معلوم ہو۔

۳۔ کیاریاں سادہ ہوں تو زیادہ اچھا ہے۔ مختلف شکلوں کی کیاریاں بھی بنائی جا سکتی ہیں ——— دیکھو کچھ نمونے یہ ہیں۔

کیاریوں میں کئی رنگ کے اور مختلف اونچائی کے پودے لگائے جاتیں۔

پھلواری دو طریقوں سے لگ جا سکتی ہے۔

۱۔ بناوٹی طریقہ (FORMAL GARDENING) کئی طرح سے پھولوں کی کیاریاں بنائی جاتی ہیں۔ اور نقشے بنائے جاتے ہیں۔ پودوں کو سڈول بنانے اور کاٹ چھانٹ کرنے کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔

۲۔ قدرتی طریقہ INFORMAL یا LANDSCAPE GARDENING کیاری میں قدرتی یعنی پہاڑی اور جنگلی پودوں کو قدرتی طریقوں سے اگایا جاتا ہے، جیسے بدھا گارڈن نئی دہلی، ایڈن گارڈن کلکتہ، رام نواس پبلک گارڈن جے پور وغیرہ میں۔

پانی کی نکاسی کا مناسب انتظام کرنا بھی ضروری ہے۔ یعنی بارش کے زمانہ میں جب پانی زیادہ بھر جائے تو کیاریوں میں بھرا نہ رہے۔

ساتھ ہی ساتھ یہ بھی جان لو کر باغیچے کے لیے کون

لن اوزاروں کی ضرورت ہوتی ہے مثلاً :-

۱- کلہاڑی - موٹی ڈالیاں اور شاخیں چھانٹنے کے لیے۔

۲- ہاتھ گاڑی - مٹی، کھاد اور کوڑا ڈھونے کے لیے۔

۳- ڈبلر (DIBBLER) ایک نوکیلی لکڑی جس کے سرے پر لوہا لگا رہتا ہے۔ پودے لگاتے وقت زمین میں سوراخ کرنے کے کام آتی ہے۔

۴- کھرپی - کیاری اور گملوں کی نکائی اور پپڑی توڑنے اور خودرو پودوں کو نکالنے کے لیے۔

۵- پھاوڑا ، کدال وغیرہ - مٹی کھودنے کے لیے۔

۶- گھانس کاٹنے والی مشین

۷- ایک بانگی یا نچی - کیاریوں کو ٹھیک کرنے ، مٹی باریک کرنے اور گھانس اکٹھی کرنے کے لیے ۔

۸- ہنسیا - گھاس وغیرہ کاٹنے کے لیے ۔

۹- کتیا - (سکیٹر) پتلی شاخیں کاٹنے کے لیے ۔

۱۰- آری - شاخیں کاٹنے کے لیے ۔

۱۱- ایجنگ شیرس (EDGING SHARES) کنارے کی گھاس اور پودوں کو چھانٹنے کے لیے۔

۱۲- پروننگ شیرس (PRUNING SHARES) بیج وغیرہ چھانٹنے کے لیے

۱۳- قینچی - پھول چننے کے لیے ۔

۱۴- ہو - (HOE) نکائی کرنے کے لیے ۔

۱۵- ڈسٹر (DUSTER) پودوں پر پاؤڈر چھڑکنے کے لیے ۔

۱۶- اسپریئر (SPRAYER) دوا چھڑکنے کے لیے ۔ "
اور فلٹ (FLIT)

۱۷- پروننگ نائف - چھنٹائی کے لیے

۱۸- بڈنگ نائف - چشمہ لگانے کے لیے ۔

۱۹- گرافٹنگ لائف - قلم یا پیوند باندھنے کے لیے ۔

۲۰- گھاس کاٹنے کی تلوار - بڑی گھاس کاٹنے کے لیے

گرمی اور برسات کے موسمی پھول

انگریزی نام	دیسی نام	بونے کا وقت	پھولنے کا وقت	اونچائی	کیفیت
۱- باسم BALSAM	گل مہندی	جون سے اگست	برسات بھر	۱½' - ۲'	پتیاں بھی خوبصورت ہوتی ہیں۔
۲- سیلوسیا CELOSIA	×	جون سے اگست	برسات سے جاڑے تک	۹ - ۱'	پھول پیلے، لال، بیگنی۔ گچھوں میں چوٹی پر ہوتے ہیں۔
۳- کوکس کومب Cocks Comb	گل کلغی	"	"	۲ - ۱½'	پھول سفید، سنہری، پیلے، لال نارنگی، گلابی ۔
۴- کوسمس COSMOS	×	جون سے اکتوبر	گرمی اور برسات	۱½' - ۴'	پھول سفید، گلابی، لال، پیلے

۵. کوریوپسس COREOPSIS	×	جنوری سے جون	گرمی اور برسات	۱½ - ۳'	پھول پیلے، لال، بھورے۔
۶. گیلارڈیا GILARDIA	×	"	"	"	پھول کئی رنگ کے چھوٹے بڑے۔
۷. گمفرینا GOMPHRENA	گلِ مخمل	جون سے اگست	برسات اور کچھ جاڑے تک	۱' - ۲'	پھول سفید، لال، گلابی، نارنگی رنگ کے ہوتے ہیں۔
۸. میری گولڈ MERIGOLD	گیندا	"	"	۱½ - ۲½	پھول چھوٹے بڑے پیلے، نارنگی اور سنہری رنگ کے ہوتے ہیں
۹. پرٹولاکا PORTULACCA	لونیا	سال بھر	سال بھر	۶" - ۹"	پھول سفید، پیلے، لال
۱۰. سن فلاور SUN FLOWER	سورج مکھی	فروری اور جون	گرمی اور برسات	۳' - ۶'	پھول چھوٹے بڑے۔ پیلے، لال نارنگی رنگ کے۔
۱۱. زینیا ZENIA	×	مارچ سے اگست	گرمی، برسات اور جاڑے کے شروع تک	۲ - ۲½	پھول سفید، پیلے، نارنگی، لال اور نیلے رنگوں کے

پھلواری کے بیج پہلے علیحدہ کیاری میں بونے چاہییں۔ پودے تین چار انچ کے ہو جائیں تو انھیں اصل کیاریوں میں مناسب فاصلے پر لگایا جائے۔ کہیں تیار پود مل جائے تو وہاں سے لاکر کیاریوں میں لگا دو۔ پودے لگانے کے فوراً بعد پانی ضرور دینا چاہیے۔
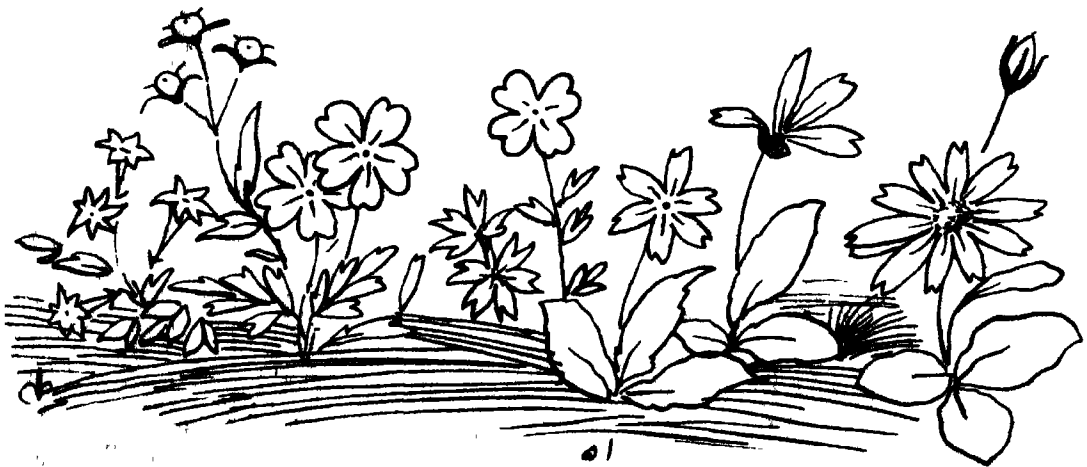
جناب عبدالمنان نسیم شولاپوری

پتنگ

میری پیاری شوخ پتنگ	نیلا پیلا اس کا رنگ
دور گگن میں اڑتی ہے	کیسی پیاری لگتی ہے
بل کھاتی لہراتی ہے	میرا دل بہلاتی ہے
کالے رنگ کے کاغذ کی	دُم چپکا دی لمبی سی
نیلی آنکھیں بنوا کر	پٹی اس پر چپکا کر
خوب پتنگ بنائی ہے	سب کے مَن کو بھائی ہے
ڈور ہے اس کی میرے ہات	کیوں نہ مانے میری بات
ڈوری کھینچ کے جب چاہوں	جیسا چاہوں نچواؤں !
اس ڈوری میں ہے وہ زور	کاٹ کے رکھ دے سب کی ڈور
جو بھی پتنگ لڑائے گا !	اپنی پتنگ گنوائے گا !
سَر سَر سَر جب ہوا چلے	فَر فَر فَر آواز کرے
ڈھیل اگر دوں پیچھے جائے	دوں جھٹکا تو نیچے آئے
چکّر پر چکّر کھائے !	شیر کی مانند اوپر جائے
یہ میرا غم دور کرے	شاد کرے مسرور کرے

اس کو ہر دم چاہوں گا
اپنا دل بہلاؤں گا
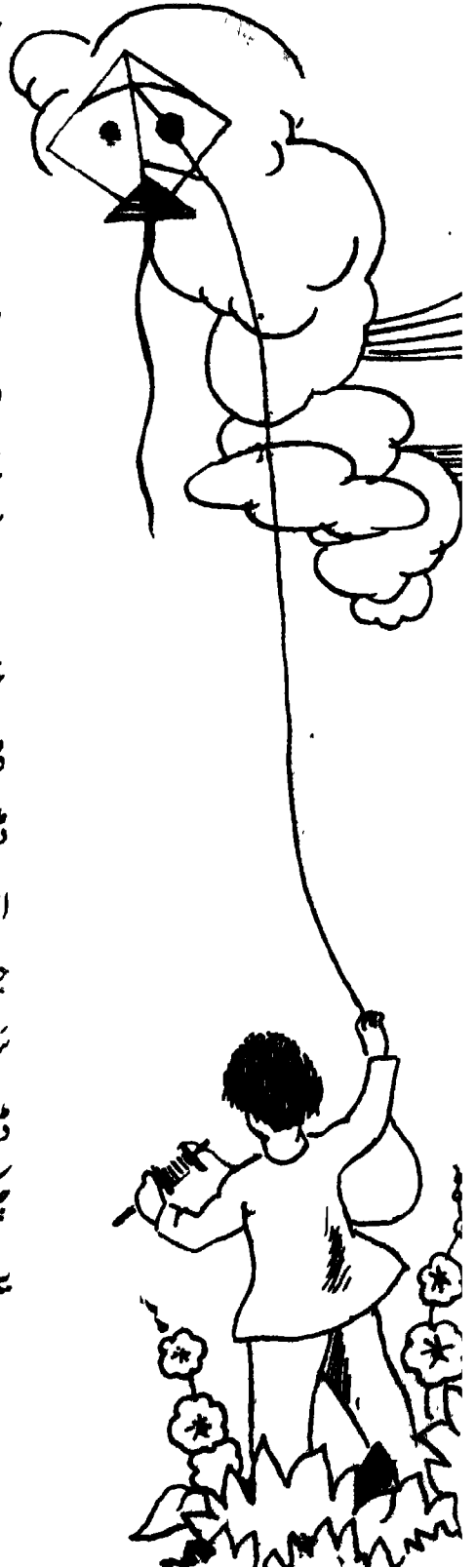
جناب ریاض عثمان

علم کا سورج

(یہ نظم عزیزی ریاض اے عثمان نے عبداللہ نرسری کے سالانہ جلسے میں پڑھ کر سنائی اور اول انعام حاصل کیا۔)

آؤ ساتھی مل کر گائیں
دھرتی کو آکاش بنائیں
دنیا کے ارمان ہمیں ہیں
اپنے وطن کی شان ہمیں ہیں
نیل گگن کے چاند ستارے
گرد ہیں اپنے پاؤں کی پیارے
پیار کے بادل بن کر چھائیں
رم جھم رم جھم مینھ برسائیں
علم کا سورج بن کر چمکیں
سارے جگ کو روشن کردیں

آؤ ساتھی مل کر گائیں
دھرتی کو آکاش بنائیں

نیچے کے دائرے میں سرخ نشان کا مطلب یہ ہے کہ اس مہینے کے بعد آپ کی مدت خریداری ختم ہوجاتی ہے۔
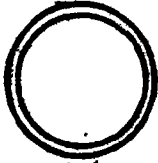
ہمیں امید ہے کہ آپ اپنے پیارے پیام تعلیم کی سرپرستی جاری رکھیں گے۔

براہ کرم مبلغ چھ روپے کا منی آرڈر اس مہینے کی ۲۵ تاریخ تک ہمیں بھیج دیجیے تاکہ یہ سلسلہ قایم رہے۔ آپ کی طرف سے کوئی اطلاع نہ ملی تو ہم سمجھیں گے کہ آپ کو پرچہ پسند نہیں آیا اور افسوس کے ساتھ اسے بند کردیں گے۔

منی آرڈر بھیجنے میں آپ کا فائدہ ہے۔ لگ بھگ ایک روپیہ دس پیسے کی بچت ہے۔

منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر لکھنا نہ بھولیے۔

آپ کا خریداری نمبر ہے۔

منیجر

پرنٹر پبلشر سید احمد علی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس دریا گنج دہلی میں آفسٹ پر چھپوا کر جامعہ نگر سے شایع کیا۔

نام : عزیزہ نسیم عمر ۱۲ سال
پتہ : معرفت اس۔ جی مصطفےٰ ولائی پاڑہ
پوس کلب لین۔ ضلع سمبل پور
مشغلہ: درسی کتابیں پڑھنا، پیام تعلیم اور ادب کی دوسری کتابیں پڑھنا۔ بہنوں سے قلمی دوستی کرنا۔

نام : محمد مقصود عالم راہی عمر ۱۴ سال
پتہ : معرفت نبگلہ بنگال ہوٹل
: ڈاک خانہ کالی پہاڑی، ضلع بردواں
مشغلہ: ادبی ، اخلاقی اور مذہبی کتابوں کا مطالعہ کرنا پیام تعلیم ، کھلونا اور مسرت کا مطالعہ کرنا نظمیں لکھنا ، اخبار پڑھنا ، تقریر کرنا ، ڈراموں اور مباحثوں میں شریک ہونا ، قلمی دوستی کرنا۔

نام : رشیدہ بی بی ایم شیخ عمر ۱۶ سال
تعلیم : دسویں جماعت
مشغلے : اردو انگریزی کتابیں پڑھنا ، سائنس ، حساب مصوری اور خوشخطی میں دلچسپی لینا۔ کہانیاں لکھنا نماز پڑھنا اور اسلامی عمارتوں کی سیر کرنا ۔ وغیرہ
پتہ : راج پور، گومتی پور احمد آباد نمبر ۲۱ (کامدار میدان)

نام : ابواللیث انصاری عمر ۱۵ سال
پتہ : معرفت سبط حسن ، بھیکاری پورہ ، متو ناتھ بھنجن اعظم گڈھ (یوپی)
مشغلہ : ادبی نشست قائم کرنا اس میں مضمون پیش کرنا ۔ فٹ بال کھیلنا ۔ امتحان میں اول نمبر پاس ہونا۔

نام : محمد نعیم الدین اشفاق عمر ۱۳ سال
تعلیم : ہائر سکنڈری (جاری)
مشغلہ : مضمون نویسی ، ادبی لطائف لکھنا اور کیرم کھیلنا وغیرہ وغیرہ
پتہ : معرفت جگر لائبریری، مسعدی محلہ ، آسنسول۔

نام : جاوید اختر عمر ۱۲ سال
مشغلہ: پیام تعلیم ، کھلونا پڑھنا ۔ ہر قسم کے کھیل کھیلنا۔
پتہ : رحمت اللہ ، سلک ملز ٹمٹن روڈ اورنگ آباد

نام : جمیل احمد عمر ۷ سال
مشغلہ : پیام تعلیم کی نظمیں پڑھنا ، شرارتیں کرنا
پتہ : الحاج حسن خاں سلک ملز ٹمٹن روڈ اورنگ آباد

توصیف احمد نعمانی

بچوں کی کوششیں

جیسے کو تیسا

جیسے کو تیسا

مکھی اور انسان

ہوا رخصت زمانہ سے اندھیرا
نرالی شان سے آیا سویرا
کھلی مکھی کی آنکھ ایک دم جھپک کر
اٹھی اور اٹھ کے بیٹھی کچھ سرک کر
تھا اس کا جسم سارا سویا سویا
ذرا پر پھڑ پھڑائے منہ کو دھویا
سڑی چیزیں کہیں وہ کھا کے بیٹھی
غلاظت پر کہیں وہ جا کے بیٹھی
کہیں بچوں کا چہرا اس نے چاٹا
کبھی انسان کبھی حیواں کے کاٹا

مکھی اور مکڑی

یہ باتیں دیکھتی تھی ایک مکڑی
طبیعت دیکھ کے للچائی اس کی
کہ اس موٹی سی مکھی کو میں کھاؤں
کسی صورت سے جالے میں پھنساؤں
بلایا اس کو یوں آواز دے کر
بہن آؤ کرم فرماؤ مجھ پر
پروں کی پھڑ پھڑاہٹ کچھ سناؤ
قریب آکر کبھی تو بھن بھناؤ
بڑی مکھی نے کھایا صاف دھوکا
وہ جالے میں پھنسی اور اس نے کھایا

مکڑی اور چھپکلی

کہیں اک چھپکلی یہ دیکھتی تھی
اور دل ہی دل میں اپنے کہہ رہی تھی
یہ مکڑی جس نے مکھی کو ہے کھایا
اگر میں نے اسے نزدیک پایا
تو کھاؤں اس کو میں اور پیٹ بھر لوں
ذرا دیوار سے نیچے اتر لوں
لگا کر تاک وہ نیچے کو اتری
اور اس مکڑی کے وہ نزدیک پہنچی

ابھی بیٹھی ہی تھی وہ پیٹ بھر کر
ابھی تھی چھپکلی کے منھ کے اندر

چھپکلی اور چوہا

مگن تھی چھپکلی مکڑی کو کھا کر
وہ بولی کٹ کٹا کر کٹ کٹا کر
وہیں پر پاس اک بیٹھا تھا چوہا
شرارت اس کو سوجھی اور بولا
اری او چھپکلی کیوں کان کھائے
تجھے سمجھوں اگر نزدیک آئے
برا کچھ چھپکلی نے اس کا مانا
وہ اتری اور کہا غصّہ دکھانا
ہوئی دونوں میں بے حد ہاتھا پائی
غرض یوں چھپکلی کی موت آئی

چوہا اور بلّی

یہ دیکھا اک بلّی نے تماشا
بہانہ اس کے بس یہ ہاتھ آیا
کہا اس نے یہ چوہے سے کہ بدذات
اسے کیا مار کر آیا تیرے ہاتھ
ذرا سی چھپکلی کو تو نے مارا
ہوا یہ کس طرح تجھ کو گوارا
تجھے کیوں کر نہ میں اس کی سزا دوں
نتیجہ ظلم کرنے کا دکھا دوں
یہ کہہ کر اس نے چوہے کو دبوچا
چبا ڈالا نہ کچھ سمجھا نہ سوچا

بلّی اور کتّا

چلی بلّی جو اس چوہے کو کھا کر
ہوئی مڈ بھیڑ اک کتّے سے جا کر
کہا کتّے نے بلّی سے کہ پوسو!
کہاں جاتی ہو اک پل بھر کو ٹھیرو
تمھارے منھ سے، ہاں کیوں ہو چھپاتی
چوہے کے خون کی خوش بو ہے آتی
یہ کہتے ہی وہ اُس پر غُرّایا
کہ کیوں چوہے کا خوں تو نے بہایا
یہ فرما کر اسے بے حد جھنجھوڑا
نہ جب تک مرگئی اس کو نہ چھوڑا

کتّا اور گیدڑ

چلا کتّا جو منھ کو خوں لگا کر
تو اپنے شہر سے پہنچا وہ باہر
وہاں گیدڑ ملا اک اس کو خوں خوار
ہوئی کتّے کی اس گیدڑ سے تکرار

وہ کہتا تھا کہ جنگل میں نہ آؤ
یہ کہتا تھا نہ کیوں آؤں بتاؤ
بڑھی تکرار کتا زد میں آیا
اور اس گیدڑ نے اس کو مار کھایا

گیدڑ اور بھیڑیا

ہوا گیدڑ خوش اس کا خون کر کے
چلا کتے سے اپنا پیٹ بھر کے
کہیں اک بھیڑیا جاتا تھا بھوکا
اسے گیدڑ نے خود جا کر بتایا
کہ میں نے ایک کتے کو تھا مارا
اگر یہ بات ہو تم کو گوارا
میرے مارے ہوئے کتے کو کھاؤ
تو کھا آؤ فلاں جنگل میں جاؤ
تو بولا بھیڑیا یہ تیری ہمت
ہمیں اور اپنے اس جھوٹے کی دعوت
یہ کہہ کر اس نے اس کو پھاڑ ڈالا
نہ جانے بیر یہ کب کا نکالا

بھیڑیا اور شیر

ابھی گیدڑ کو یہ کھا ہی رہا تھا
کہیں سے اس طرف ایک شیر آیا
جو دیکھا شیر نے یوں بھیڑیے کو
تو بولا ڈانٹ کر کیا کھا رہے ہو
یہ کس کے حکم سے مارا ہے گیدڑ
بہت ہونے لگی جنگل میں گڑبڑ
یہ کہہ کر شیر گرجا بھیڑیے پر
کہا یہ میں کروں برداشت کیونکر
نہ چھوڑوں گا تجھے ہرگز میں زندہ
یہ کہہ کر بھیڑیے کو اس نے پھاڑا

شیر اور انسان

ابھی تھا شیر اس کو پھاڑنے میں
اور اس کو پھاڑ کر چنگھاڑنے میں
وہاں انسان آیا ایک شکاری
لیے اک ہاتھ میں بندوق بھاری
دونالی بھر کے فوراً اس نے داغی
کہ ہو جائے نہ اس سے شیر باغی
نہ باغی ہو نہ ڈر کر بھاگ جائے
نہ بالکل اٹھ سکے کوئی جو کھائے
لگی دو گولیاں جب ٹھائیں ٹھائیں
بہت وہ شیر تڑپا دائیں بائیں
کہاں مکّھی کا انساں کو ستانا
کہاں اک شیر تک قصّہ کا جانا
ملا بدلا ہر اک ظالم کو کیسا
خدا دیتا ہے ہر جیسے کو تیسا

ہلال الرضوی

طالبِ علم کی دعا

تیرے ہیں تجھی سے دعا کر رہے ہیں — ترے نام سے ابتدا کر رہے ہیں
مری آرزو ہے مری التجا ہے — خداوندِ عالم تو سب سے بڑا ہے
مجھے شوق دے پڑھنے لکھنے کا یارب — سدا علم ہی سے رہے مجھ کو مطلب
کتابوں کی دنیا میں مجھ کو بسا دے — میں نادان ہوں مجھ کو دانا بنا دے
مری آنکھ کو روشنی دینے والے — شگفتہ لبوں کو ہنسی دینے والے
مرا علم سے تو ہی رشتہ ملا دے — میں ہوں خواب میں مجھ کو تو ہی جگا دے
مجھے رفتہ رفتہ تو زورِ قلم دے — مرے ہاتھ میں زندگی کا علم دے
مجھے دنیا والوں میں ممتاز کر دے
بڑائی سے مجھ کو سرافراز کر دے

ایک لوری

سو جا میری پیاری بٹیا — امی کی دلاری بٹیا
ممتا کی سنواری بٹیا — سارے گھر کی پیاری بٹیا
آ میں تیری بھوک مٹا دوں — اپنے سینے سے چپٹا لوں
لوری گا کر دل بہلا دوں — تھپکی دے کر تجھے سلا دوں
روپ نگر کی رانی ہے تو — شمع کی دیوانی ہے تو
جیون کی کہانی ہے تو — دادی ہے تو نانی ہے تو
اوہو کیوں روتی ہے تو؟ — موتی کیوں بوتی ہے تو؟
جان کو کیوں کھوتی ہے تو؟ — کیوں بے کل ہوتی ہے تو؟
چندا ماما آجا آجا — قصہ پریوں کا دہرا جا
مالا تاروں کی پہنا جا — میری گڑیا کو بہلا جا
ابا بانو کے آئیں گے — پھول کھلونے سب لائیں گے
گود میں لے کر ٹہلائیں گے — پیار کریں گے بہلائیں گے
سو کر اٹھے گی جب مائی — دوں گی تجھ کو دودھ ملائی
بھیا جب لائے گا کھوئی — تب دوں گی میں دودھ اور کھوئی
ضد نہ کر اب سو جا رانی — میٹھی نیند میں کھو جا رانی
چاند میں ہے اک بڑھیا نانی — کل کہہ دوں گی اس کی کہانی

اے۔ خزاں

تارے

ننھے منے پیارے تارے
جلدی آجا پاس ہمارے
سورج ڈوبا پھیلا اندھیرا
دنیا سوئی سوئے سارے
چھت پہ اب ہے چندا نکلا
جگ میں پھیلے ہیں اجیالے
تو لیکن ہے آنکھ سے اوجھل
تیرے لیے ہم مارے مارے
ننھے منے پیارے تارے
جلدی آجا پاس ہمارے
بادل سارے دور گگن سے
بھاگ گئے اب ڈر کے مارے
پھر ہم نے جو مڑ کے دیکھا
تم آ نکلے تھکے ہارے سے
آنکھیں مل کر تم کو دیکھا
ناچ اٹھا دل شوق کے مارے
ننھے منے پیارے تارے
جلدی آجا پاس ہمارے
تو ہے سارے جگ کا پیارا
ہم ہیں تیرے ہی متوارے
ننھے منے پیارے تارے
آجا آجا پاس ہمارے
ہم بھی ہوں گے تجھ سے پیارے
بھارت دیش کی آنکھ کے تارے
ننھے منے پیارے تارے
جلدی آجا پاس ہمارے

سبھاش چندر ایمر

آدھی ملاقات

پیام تعلیم کا تازہ شمارہ کل دستیاب ہوا۔ ہر پرچہ ماہ بہ ماہ نیا رنگ روپ اختیار کرتا جارہا ہے۔ اس مرتبہ گورکی پہ آپ کا مضمون جس توجہ اور محنت سے لکھا گیا ہے اسی توجہ اور شوق سے پڑھے جانے کی چیز ہے۔ اعجاز اختر کا "چاچا نہرو سے انٹرویو" بھی بہت خوب ہے۔ نظمیں سبھی اچھی ہیں۔ ایک بات خاص طور سے عرض کرتی ہے کہ آپ پیام تعلیم میں ہندی داں حضرات کو اُردو سکھانے کا ایک سلسلہ شروع کر دیجیے۔ اس سے اوّل تو یہ ہوگا کہ ہمارے اُن گھروں میں بھی پیام تعلیم کی رسائی ہو جائے گی جہاں بچے ہندی پڑھ رہے ہیں اور اُردو سے قطعًا نابلد ہیں دوسرے یہ کہ وہ حضرات جو بعض حالات کے پیش نظر اُردو سیکھنا چاہتے ہیں انھیں ہم خود تھوڑا سا وقت دینے کے بجائے پیام تعلیم کے وسیلہ سے اُردو سیکھنے کی ترغیب دے سکتے ہیں۔ اس طرح پیامیوں کا حلقہ بھی وسیع ہوگا اور وقت کی ایک بڑی ضرورت کی تکمیل بھی ہو گی ورنہ رفتہ رفتہ جب خدانخواستہ اردو جاننے والے بچے ہی نہ رہیں گے تو پرچہ کون پڑھے گا۔ یہ نہ کہہ دیجیے گا کہ پھر ہم ہندی میں پیام تعلیم نکالنے لگیں گے!

عادل جعفری "اندور"

کل ہی تازہ "پیام تعلیم" ملا۔ اور ایک ہی نشست میں پڑھ بھی لیا۔ پتہ نہیں "پیام تعلیم" کیوں دل موہ لیتا ہے۔

اس بار دو باتوں کی طرف آپ کا دھیان دلانا چاہتا ہوں پہلی بات تصویروں کی ہے۔ کچھ تصویریں جو بچوں کی ہیں۔ وہ تو ٹھیک ہیں (مثلاً دھرتی کے تارے نظم کے ساتھ) اور کچھ تو بہت ہی بھدی ہیں (مثلاً صفحہ ۵ کی)، اقبال کی تصویر بھی صحیح نہیں ہے۔ پتہ نہیں جاوید صاحب تصویریں بہت جلدی میں بناتے ہیں یا اور کوئی وجہ ہے۔ مناظر کی تصویریں البتہ کافی خوبصورت ہیں۔

دوسری بات یہ کہ پیام تعلیم میں کتابت کی غلطیاں نسبتاً کم ہوتی ہیں۔ مگر اس بار دو تین جگہ ایسی غلطیاں ہیں۔ مثلاً (صفحہ ۱) پر بجائے اپریل ۱۸۵۷ء کے مارچ ۱۸۵۷ء ہے اور ایس۔ ایم بدر وفا صاحب کے خط کا (صفحہ ۵) تو مطلب ہی "ایک نہیں" کی کمی کی وجہ سے الٹا ہو گیا ہے۔ (صفحہ ۲) کے دوسرے کالم میں پیداوار کی جگہ پیداور ہے۔ بہرحال مضامین اور نظمیں تمام ہی بہترین ہیں۔

اعجاز اختر "اندور"

بانسری باڈلا والی نظم بہت اچھی لگی۔ لکھنے والے کو مبارکباد دیتا ہوں ...... اقبال مند بھی اچھی کہانی ہے۔

ابو اللیث انصاری "مینو ناتھ بھنجن"

"پیام تعلیم" پچھلے چند ماہ سے نئی نئی خوبیوں سے پیش کیا جارہا ہے یہ محسوس کر کے ہمیں بہت خوشی ہوئی اور ہمیں پورا پورا یقین ہے کہ آپ دل وجان سے پیام تعلیم کو آگے بڑھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اللہ میاں سے ہماری یہی دعا ہے کہ وہ اسے دن دونی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے اور پیام تعلیم کی عمر دراز کرے۔ آمین۔

رشیدہ بی بی۔ احمد آباد

اپریل کا "پیام تعلیم" ملا۔ ماشاءاللہ بہت خوب ہے
جناب اظہار الحق صاحب سے عرض کر دیجیے کہ وہ ہر ماہ
باغبانی کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور تحریر فرما دیا کریں۔ بڑی
مہربانی ہوگی۔

آپ نے پیام تعلیم کے سائز کو پچھلے پیام تعلیم کے
برابر کر کے بہت اچھا کیا۔ ندرت حسین "سہارنپور"

اپریل کا "پیام تعلیم" خوب ہے۔ کہانی "المنتصر" پسند
آئی۔ قسط وار کہانی "اقبال مند" بھی روز بروز دلچسپ ہوتی
جارہی ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ماہ بہ ماہ اور ہر قسط کے
بعد بے چینی سے دوسری قسط کا انتظار رہتا ہے "سفرنامہ
ابن بطوطہ" اور "پنچ تنتر کی کہانیاں" کی قسطیں بھی بڑی دلچسپ ہیں۔

ایک بات کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں
وہ یہ کہ پیام تعلیم میں شروع ہی سے کچھ پیامی یہ حرکت کر رہے
ہیں کہ دوسروں کی شایع شدہ چیزیں اپنے نام سے بھیج دیتے
ہیں۔ میں اس ادبی بددیانتی کو جب پکڑتا ہوں آپ کو بھیج دیتا
ہوں اس سے پہلے ایک صاحب "ندرت کانپوری" نے بچوں
کے صفحات کے لیے "پیام تعلیم" کے عنوان سے ایک نظم بھیجی
تھی جو شایع ہوئی تھی۔ یہ نظم مقطع کو چھوڑ کر جسے انھوں
نے خفیف سے ردوبدل سے اپنا لیا تھا، ہو بہو وہی نظم تھی
جو ۱۹۳۳ء کے ایک پرانے پیام تعلیم میں محترمہ حمیرا کے نام سے
شایع ہو چکی تھی۔ میرے پاس "پیام تعلیم" کے اس شمارہ کا ماہ
اشاعت/صفحہ نمبر سب محفوظ ہیں

اس کے بعد ایک ادبی بددیانتی یہ نظر آئی کہ ایک
صاحب نے پیام تعلیم میں شایع شدہ مضمون کو کسی صاحب
کی ایک کہانی اپنے نام سے "کھلونا" میں چھپوائی۔
اب تازہ ترین مثال "پیام تعلیم" کے
اپریل کے شمارہ میں موجود ہے۔ یہ ہے جناب ظفر ردولوی
کی کہانی "اینٹونجا اسٹیشن" انھوں نے بڑی دیدہ دلیری
کا ثبوت دیتے ہوئے جولائی ۱۹۶۶ء کے "کھلونا" میں شایع شدہ
ننھی ننھی کہانیوں کے کالم کی پہلی کہانی "مغالطہ" مصنفہ سید
کلیم اشرف جیلانی کا "ترجمہ" اردو سے اردو ہی میں کر دیا اور
وہ اس طرح کہ اصل کہانی میں اسٹیشنوں کے نام جائس، سلطانپور
اور دھوراہیں۔ انھوں نے خیرآباد، رام نگر اور اینٹونجا کر دئے
بیٹے کی جگہ بیٹی کر دیا اور زرد کی جگہ پیلا وغیرہ وغیرہ۔ میری
سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگوں کو جب شایع ہونے کا اتنا شوق ہے
تو وہ خود محنت کیوں نہیں کرتے۔ انگریزی ادب کا وسیع ذخیرہ
ہمارے سامنے ہے۔ عمدہ سے عمدہ کہانیاں اور ڈرامے ہیں جنھیں
اردو میں منتقل کر کے اس کے ادب کو بھی فائدہ پہنچایا جاسکتا
ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ بقول حالی ع

مگر اس میں لگتی ہے محنت زیادہ۔ ترجمہ کیجیے۔

ہندوستانی ماحول میں ڈھالیے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اردو سے اردو
ترجمہ آسان ہے۔ مشکل لفظ کی جگہ اسکا متبادل آسان لفظ رکھ
دیا۔ لیجیے چھٹی ہوئی ......

مئی کا پیام تعلیم پڑھ چکا ہوں۔ ماشاءاللہ خوب
ہے۔ چوہوں پر دونوں چیزیں یعنی مضمون، "چوہا بڑا یا ہاتھی"
اور نظم "بانسر و باڈلا" بہت پسند آئیں، خاص کر نظم تو بہت ہی
اچھی لگی۔ حالانکہ نثر میں یہ کئی بار چھپ چکی ہے۔ مگر نظم میں اس
کا لطف ہی کچھ اور ہے۔ شاعر فرحت قمر صاحب کو مبارکباد۔

خلیق انجم اشرفی

یاد رکھیے۔

مضمون ہمیشہ ایڈیٹر کے نام
اور
منی آرڈر منیجر پیام تعلیم کے نام بھیجیے۔

صحافی

اِدھر اُدھر سے

عورتوں کی کوہ پیما مہم: ہماچل پردیش کی کچھ چوٹیوں کو سر کرنے کی مہم میں ہندوستانی اور جاپانی عورتوں کی ایک ٹیم ان دنوں سرگرم عمل ہے۔

پتہ چلا ہے کہ ٹیم نے پانچ مئی کو بنڈی کے جنگل میں بنیادی کیمپ نصب کر لیا ہے اس ٹیم میں ۶ ہندوستانی اور جاپانی لڑکیاں ہیں۔ پروگرام کے مطابق یہ ٹیم ۲۷ اپریل کو دھرم پورا پہنچ گئی تھی اور وہیں سے پہاڑوں پر چڑھائی شروع کر دی تھی۔ اس ٹیم کی رہنمائی گجرات کی کماری نندنی پٹیل کر رہی ہیں۔

ایورسٹ کی فتح پر فلم: حکومت ہند نے ایورسٹ کی فتح کرنے والی ہندوستانی ٹیم کی ایک فلم تیار کی ہے۔ جس میں روانگی سے لے کر ایورسٹ کی چڑھائی تک کے سارے مناظر دکھائے گئے ہیں۔ خوفناک چڑھائی میں کوہ پیما ہمت اور حوصلے کی ڈور تھامے کس طرح آگے بڑھتے ہیں۔ یہ بات فلم دیکھنے کے بعد ہی سمجھ میں آتی ہے۔

اس ٹیم کے ساتھ ایورسٹ سر کرنے والے سونم گیاتو کا ابھی حال میں دلّی کے ایک اسپتال میں انتقال ہوگیا۔

کس کے لیے لکھیں: جناب اطہر پرویز لکچرر شعبہ اردو مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ نے وزیر اعظم شری متی اندرا گاندھی کی خدمت میں ایک عرض داشت یا مسمورنڈم پیش کیا ہے۔ اس مسمورنڈم میں انھوں نے بچوں کے لیے اردو میں لکھنے والوں مسائل پر خاص توجہ دلائی ہے۔

انھوں نے بتایا ہے کہ دہلی میں اتر پردیش، بہار کے زیادہ تر اسکولوں میں اردو پڑھانے کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ اردو زبان اور رسم الخط دونوں چیزیں بچوں کے لیے اجنبی ہوتی جا رہی ہیں۔ آزادی کے بیس سال کے اندر اندر تعلیمی اداروں میں اردو کی اہمیت ختم ہوتی جا رہی ہے اور بچوں کے لیے لکھنے والوں کے سامنے ایک بڑا مسئلہ آتا ہے۔ "کس کے لیے لکھیں"!

اڑنے والی موٹر سائیکل: روس میں ہوا بازی کے ایک ٹیکنکل اسکول کے طلبا نے اڑنے والی موٹر سائیکل تیار کی ہے۔ یہ موٹر سائیکل پوری کی پوری کھلی ہوتی ہے۔ صرف موٹر چلانے والے کو ہوا کے تھپیڑوں سے بچانے کے لیے سیٹ کے اوپر ایک مضبوط سا شفاف خول چڑھا دیا گیا ہے۔ ۲۸ ہارس پاور کی موٹر سے چلنے والی یہ موٹر سائیکل فضا میں سو کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑ سکتی ہے۔ ۴ گز لمبی اس موٹر سائیکل کا وزن ۲۳۰ کلو ہے۔ دونوں طرف کے پنکھے پھیل جانے کے بعد اس کی چوڑائی قریب ۵ گز ہوتی ہے۔ فضا میں اڑنے والی یہ سب سے

چھوٹی گاڑی ہے۔

زمین کی چور کھدائی: شہروں میں بجلی یا ٹیلی فون کا تار بچھانا ایک دشوار طلب کام ہے۔ زمین کے جس حصّے کے نیچے تار وغیرہ بچھانا ہوتا ہے وہاں سڑک توڑنی پڑتی ہے اور سبزہ وغیرہ اکھاڑ پھینکنا ہوتا ہے اس دشواری کو حل کرنے کے لیے امریکہ میں زمین کھودنے کی ایک نئی قسم کی مشین ایجاد کی گئی ہے جو زمین کی سطح کے سبزے یا دوسری کسی چیز کو نقصان نہیں پہنچاتی۔ اور ٹیلی فون وغیرہ کے تار اندر ہی اندر بچھا دیتی ہے۔ اس زیر تجربہ مشین کی بدولت تاروں کی مرمت وغیرہ کی بھاری لاگت میں بھی کمی واقع ہوگی۔

یہ مشین ۱۸ سے ۲۴ انچ تک کی گہرائی میں کھدائی کرتی ہے۔ یہ مشین نیچے ہی نیچے تار بھی بچھاتی جاتی ہے۔ اور سرنگ بھی کھودتی جاتی ہے اوپر کی سطح جوں کی توں رہتی ہے۔ اس طرح پارک، لان یا مکان کے لیے خالی جگہ کے نیچے سے بھی تار بچھائے جاتے ہیں۔

خلا بازوں اور خلائی جہازوں کے بچاؤ کا بین الاقوامی معاہدہ: امریکہ سوویت یونین، برطانیہ، ایران، اسرائیل، لبنان، نیپال، جزائر، مالدیپ اور دوسرے ۷۳ ملکوں کے درمیان خلا بازوں کے بچاؤ کے سلسلے میں ایک بین الاقوامی معاہدہ ہو گیا ہے۔

معاہدے کے مطابق اگر کسی خلا باز اور کو ہنگامی صورت میں مقررہ مقام کے بدلے کسی دوسرے ملک میں اترنا پڑے تو اس ملک کا فرض ہوگا کہ خلا بازوں اور خلائی جہازوں کو اس ملک کو واپس کرے جس نے انھیں خلا میں بھیجا ہو۔

یہ معاہدہ خلائی کھوج سے متعلق بین الاقوامی معاہدے کے علاوہ ہے جو گذشتہ ۱۰ اکتوبر سے لاگو ہے۔ اس کے تحت خلاء اور دوسرے آسمانی کُروں کی کھوج پرامن مقاصد کے لیے ہوگی اور خلائی مدار یا کسی کرے میں کوئی تباہ کن ہتھیار رکھنے کی ممانعت بھی کی گئی ہے۔

مریخ پر ناگ پھنی: ناگ پھنی آپ نے ضرور دیکھی ہوگی۔ ایک ریگستان میں جہاں ذرا ٹھنڈک ملی کہ یہ ڈھیر کی ڈھیر نکل آئی۔ آپ جانتے ہیں یہ کس قدر نکیلی اور کٹیلی ہوتی ہے۔

خلائی سائنس کے گوارل تیوف کے شاگردوں کا کہنا ہے کہ یہ ناگ پھنی مریخ کی سطح پر بھی ضرور موجود ہوگی۔ روس کے کئی سائنس دان اپنے تجربوں کی بنیاد پر اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مریخ کے سیاہ حصّے میں ناگ پھنی سے ملتی جلتی نباتات پائی جاتی ہے ان کا کہنا ہے کہ وہاں کی آب و ہوا اس کے لیے بہت سازگار ہے۔

کیڑوں کے ذریعہ تیل کی دریافت: تیل کی تلاش بہت مہنگا سودا ہے۔ ہزاروں فٹ تک کھودنے کے بعد بھی اکثر تیل نہیں ملتا۔ ہزاروں جگہ کھدائی کرنے پر کہیں ایک دو جگہ تیل کے چشمہ کا پتہ چلتا

ہے۔ روس کے سائنس داں زمین کے اندر چھپے ہوئے
تیل کے ذخیروں کا پتہ لگانے کے لیے ایک سستے اور آسان
نسخے کی تلاش میں ہیں۔

ان کا خیال ہے کہ جہاں کہیں تیل موجود ہوتا ہے
وہاں ایک خاص طرح کے بیکٹیریا موجود ہوتے ہیں۔ ان
کا دعویٰ ہے کہ ہزاروں فٹ تک زمین کی کھدائی کے بجائے
بیکٹیریا کی کیمیاوی جانچ سے اس بات کا اندازہ لگایا
جا سکتا ہے کہ تیل اس جگہ موجود ہے یا نہیں

ہاتھی اور چوہے کی دوستی۔ پچھلے پرچے میں آپ چوہا
بڑا یا ہاتھی کے عنوان سے ایک دلچسپ مضمون پڑھ چکے ہیں
ایک اچھی سی نظم بھی۔ اس میں شک نہیں کہ ہاتھی چوہوں
سے بہت گھبراتے ہیں۔ ہاتھی کی سونڈ بہت نرم و نازک
ہوتی ہے۔ اسے یہ ڈر رہتا ہے کہ یہ ننھا سا جانور اس کی
سونڈ میں نہ گھس جائے۔ سونڈ کے اندر ذرا سی گڑبڑ سے
لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔ مگر ایک ہاتھی اور چوہے کی
دوستی کا ایک دلچسپ واقعہ بھی سننے میں آیا ہے۔ پنچ تنتر
کی کسی کہانی کا واقعہ نہیں بلکہ ایک سچی دوستی کی کہانی ہے۔

ہاتھی کی سونڈ پر بیٹھے ہوئے یہ چوہے کی تصویر
جرمنی میں ہیم برگ کے مشہور چڑیا گھر کی ہے۔ تین چھٹانک
کا یہ چوہا ہر روز چالیس من کی بھاری بھرکم ہتھنی سے ملنے
آتا ہے۔ چوہے کا نام "فلیکس" ہے اور ہتھنی کا نام "چمپا"
ہے۔ یہ ہندوستان سے جرمنی بھیجی گئی ہے۔ ہندوستانی ہتھنی
اور جرمنی چوہے کی اس عجیب و غریب دوستی کو
دیکھ کر لوگوں کو بڑا اچھا ہوتا ہے۔
(تصویر مقابل کے صفحے پر بشکریہ اطلاعات جرمنی)

کیلاش کی چوٹی سر ہو گئی

اے پیچھے ان لڑکیوں
نے تو کیلاش کی چوٹی سر بھی کر لی۔ اس چوٹی کی اونچائی
انیس ہزار فٹ ہے۔ یہ خوش خبری دیس کی وزیر اعظم محترمہ
اندرا گاندھی نے کوہ پیماؤں کے ایک جلسے میں خود سنائی۔
اور اب یہ کوہ پیما (ہندوستانی اور جاپانی) لڑکیاں
ہمالیہ کی تین اور چوٹیوں کو سر کرنے کی سوچ رہی ہیں۔ یہ تینوں
کی تینوں بھی لگ بھگ انیس ہزار فٹ اونچی ہیں اور
جس وقت پیام تعلیم آپ کے ہاتھوں میں پہنچے کیا عجب یہ
تینوں بھی سر ہو چکی ہوں۔

چند ضروری باتیں

۱۔ ہمیں خط لکھتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیے۔ آپ کی شکایت فوراً دور کی جائے گی۔

۲۔ جواب طلب باتوں کے لیے جوابی کارڈ یا ٹکٹ بھیجیے۔ ڈاک کا خرچ بہت بڑھ گیا ہے۔

۳۔ اپنا چندہ منی آرڈر سے بھیجیے۔ محصول ڈاک کی شرح بڑھ گئی ہے۔ وی۔پی منگائیے گا تو ایک روپے سے زیادہ کا نقصان ہو گا۔

منیجر پیام تعلیم

PAYAM-I-TALEEM
New Delhi-25.
قاعدہ
یسّرنا القرآن
یہ قاعدہ مکتبہ جامعہ نے تعلیمی اصولوں کے پیش نظر نئی ترتیب کے ساتھ نئے
سرے سے مرتب کیا ہے۔ غیر ضروری چیزیں کم کی گئی ہیں سبقوں اور مشقوں میں
مفید اضافے کیے گئے ہیں۔
ہر سبق کے شروع میں پڑھانے والوں کے لیے آسان اور مختصر ہدایتیں دی
گئی ہیں جن کی مدد سے معمولی اردو جاننے والے والدین بھی اپنے بچوں کو آسانی کے
ساتھ بہت کم مدت میں قرآن مجید پڑھا سکتے ہیں۔
ان خوبیوں کی وجہ سے اس قاعدے کی افادیت بازار میں ملنے والے عام
قاعدوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔
سفید گلیز کاغذ .... آفسٹ کی چھپائی
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
اردو بازار، دہلی ۶
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنسس بلڈنگ، بمبئی

ویسٹ انڈیز کرکٹ ٹیم کے کپتان گارفیلڈ سوبرس — صدرِ جمہوریہ اور وزیرِ اعظم ہند کے ساتھ

—— فوٹو بشکریہ سپورٹس میگزین ——

ماہ نامہ
پیامِ تعلیم
نئی دہلی
جلد ۵ شمارہ ۷
جولائی ۱۹۶۸ء
محمد حسین حسّان ندوی
صدر دفتر
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی
جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵
شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی
اردو بازار دہلی ۶
شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی
پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳
شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی
شمشاد مارکیٹ علی گڑھ
قیمت فی پرچہ ۶۰ پیسے
سالانہ چندہ ۶ روپے

بچوں کے لیے دلچسپ اور معلوماتی کتابیں

کتاب	مصنف	قیمت
انوکھی مشین	دیبداس گپتا	۱/۲۵
ایٹم کیا ہے؟	پ۔ گنا میکر	۰/۷۵
انمول رتن	اطہر پرویز	۱/۵۰
ایک اچھوت کی کہانی	سوامی مہلسے	۰/۹۰
اکبر اور بیربل کے لطیفے	اطہر پرویز	۰/۴۰

کتاب	مصنف	قیمت
بچوں کے حالی	اطہر پرویز	۰/۷۵
بچوں کے اقبال	اطہر پرویز	۰/۵۰
باپو کے قدموں میں	منو بہن گاندھی	۱/
بھارت دیس ہمارا دیس	جاوید اقبال	۱/۲۵
پنچ تنتر کی کہانیاں (اوّل)	شکنتلا دیوی	۰/۷۵
پنچ تنتر کی کہانیاں (دوم)	شکنتلا دیوی	۰/۷۵
بدن کی کہانی	اطہر پرویز	۱/۲۵
ٹیس مار خاں	شاہد علی خاں	۰/۷۵
توانائی کا راز	اطہر پرویز	۱/۲۵
چار درویش	یدو ناتھ تھتے	۱/۲۵
خلا کا سفر	اطہر پرویز	۱/۲۵
روشنی کے مینار	جے بھگو	۰/۷۵
سائنس کے کرشمے	وزارت حسین	۲/۰۰
سائنس کی دنیا	وزارت حسین	۲/۶۴
ستاروں کی دنیا بہت دور تک ہے	اطہر پرویز	۲/۰۰
سورج کا گھرانا	اے۔ وی۔ ایس راماراؤ	۰/۷۵

کتاب	مصنف	قیمت
شہر اور گاؤں	نرلیشور شرما	۰/۷۵
شرابی	اطہر پرویز	۰/۵۶
کاغذ کی کہانی	محمد آفاق	۱/۰۰
مصنوعی چاند	اطہر پرویز	۱/۵۰
مندر	وسنت نیل کنٹھ گدرے	۰/۷۵
نجومی آپا	اطہر پرویز	۰/۷۵
نیا تیرتھ	راجندر اوستھی ترشت	۱/۰۰
نہرو امر ہیں	فصاحت حسین خاں	۱/۰۰
ہولی اور چراغ	اطہر پرویز	۱/۶۲
ہماری کھیتی باڑی	سیما	۱/۰۰
ہماری آباد دنیا	فصاحت حسین	۱/۰۰
ہندوستان ترقی کی شاہراہ پر	ادھیرج موہن سیناپتی	۱/۰۰
ہمارے بن ہماری دولت	رام چندر تیواری	۰/۷۵
ہمارا ذہن	وریجا اڈوپا	۱/۰۰
ہماری سائنس	وزارت حسین	۲/۰۰

کتاب	مصنف	قیمت
انوکھا راجا	سفیر احمد قادری	۰/۲۲
پال کی سیر	سید فخر الحسن	۱/۲۵
تعلیم اخلاق	ابوالمحاسن محمد حسن خاں متین	۰/۲۱
چپ کا روزہ	حبیب احمد خاں شبنم قادری	۰/۲۲
خدا کی اونٹنی	مریم زمانی	۰/۲۲
سبا کی شہزادی	مریم زمانی	۰/۲۳

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ نزد جے جے ہسپتال۔ بمبئی بی آر ۳

بچوں کی دلچسپ معلوماتی اور دینی کتابیں

کتاب	مصنف	قیمت
اسلامی احکام	محمد مسلم احمد	-/۶۲
اندھیر نگری چوپٹ راج	محمد مسلم احمد	-/۱۹
انوکھی پہیلیاں	محمد مسلم احمد	-/۲۰
بی بی فاطمہؓ	محمد مسلم احمد	-/۲۵
بدھو سیٹھ	محمد مسلم احمد	-/۲۵
بوجھو تو جانیں	محمد مسلم احمد	-/۲۰
بے رحم لٹیرا	ثروت جہاں بنت مسلم احمد	-/۳۱
بچوں کی نماز	مسلم احمد	۱/۰۰
بتاؤ تو جانیں	مسلم احمد	-/۲۰
بارہ امامؒ	مسلم نظامی	-/۲۰
ٹیپو سلطان	مسلم نظامی	-/۲۵
جھٹ پٹ	مسلم احمد نظامی	-/۲۰
جادو کا سیب	سطوت جہاں بیگم	-/۳۱
جادو کی کہانی	مسلم احمد نظامی	/۳۱
جوابات پہیلیاں	مسلم احمد نظامی	-/۲۰
چوری پکڑی گئی	امان الرحمٰن سیّد	-/۲۰
چار نبیؑ	ڈپٹی نذیر احمد	-/۲۵
حضرت ابراہیمؑ	مسلم احمد نظامی	-/۲۰
حضرت امام حسینؓ	مسلم احمد نظامی	-/۲۵
حضرت ابوبکر صدیقؓ	مسلم احمد نظامی	-/۲۵
حضرت عثمان غنی	مسلم احمد نظامی	-/۲۵
دو نبیؑ	مسلم احمد نظامی	-/۲۰
رابعہ بصریؒ	مسلم احمد نظامی	-/۲۵
سیدھا راستہ	مسلم احمد نظامی	-/۲۵
سنہری کھچڑی	مسلم احمد نظامی	-/۲۵
سونے کا راجا	بیگم مسلم احمد نظامی	-/۲۵
سونے کا محل	امان الرحمٰن سیّد	-/۴۰
شہزادی شیریں	امان الرحمٰن سیّد	/۲۰
عشرہ مبشرہؓ (اوّل)	مسلم احمد نظامی	-/۲۰
عشرہ مبشرہؓ (دوم)	مسلم احمد نظامی	۲۰
عمر بن عبدالعزیزؒ	مسلم احمد نظامی	/۲۵
کھٹ پٹ	ڈپٹی مولوی نذیر احمد	-/۵۰
کایا پلٹ	مسلم احمد نظامی	-/۳۱
کہانی میں کہانی	مسلم احمد نظامی	-/۳۱
مغرور شہزادی	عظیم اختر مظفر نگری	-/۳۱
محبوب الٰہی	مسلم احمد نظامی	-/۲۵
نبی جی کی بیٹی	مسلم احمد نظامی	-/۱۹
نرالی پہیلیاں	مسلم احمد نظامی	-/۲۰
نٹ کھٹ	سطوت جہاں بیگم	-/۲۰
چچا کلو	عظیم اختر مظفر نگری	-/۱۶
بہادر جاوید	امان الرحمٰن سیّد	-/۲۰
طالوت اور جالوت	مریم زمانی	-/۲۲
لاٹھی کا سانپ	مریم زمانی	/۲۲
میرا نام کیا ہے؟	توقیر امروہوی	-/۳۰

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ، نزد جے جے ہسپتال، بمبئی ۳ (بی۔ آر)

فہرست

بچوں سے باتیں

پچھلے دنوں ایک پرانے ساتھی حاجی عبدالملک صاحب بی۔اے جامعہ سے ملاقات ہوئی عبدالملک صاحب نے جامعہ سے بی۔اے کرنے کے بعد بہت دنوں تک ادارہ تعلیم و ترقی میں تصنیف و تالیف کا کام کیا۔ بہت ہی آسان زبان اور دلچسپ انداز میں بالغوں کے لیے کتابچے لکھے۔

یہاں سے علیحدگی کے بعد نظام الدین کی تبلیغی تحریک میں شامل ہو گئے، گھومتے پھرتے انڈونیشیا تک ہو آئے۔ عرب خصوصاً حجاز کے دیہات دیہات گھومے پھرے۔ آج کل مدینہ شریف میں مستقل قیام ہے۔ عبدالملک صاحب نے باتوں باتوں میں عربوں کی مہمان نوازی، خوش اخلاقی، سیر چشمی کے حیرت انگیز قصے سنائے، سننے والوں کو حیرت بھی ہوئی خوشی بھی ہوئی۔ خوشی اس بات کی کہ اس گئے گذرے زمانے میں بھی عربوں کی پرانی شرافت اور اخلاق میں فرق نہیں آیا۔

ہماری دعوت پر عبدالملک صاحب نے وعدہ فرمایا ہے کہ عرب خصوصاً حجاز کے شہروں اور دیہاتوں میں جو انھوں نے چکر لگائے ہیں ان کا دلچسپ حال پیام تعلیم کے لیے لکھیں گے اس سلسلے میں جو غیر معمولی واقعات پیش آئے ہیں۔ ان کا ذکر بھی کریں گے۔

انھوں نے ہمیں ایک چھوٹا سا مضمون مرحمت فرمایا ہے یہ "مکے کے رمضان" پر ہے۔ بہت دلچسپ مضمون ہے۔ اگست کے پرچے میں پڑھیے گا۔

اگست میں ایک اور دلچسپ مضمون یا کہانی محترم غلام ربانی صاحب (حیدرآبادی) کی پڑھیے گا۔ غلام ربانی صاحب نے یہ کہانی بہت اچھوتے انداز میں لکھی ہے۔

محترمہ فرزانہ انصاری نے ایک دلچسپ اور معلوماتی مضمون سانپ پر بھیجا ہے۔ فرزانہ انصاری کے لکھنے کا انداز بہت دلچسپ ہے۔ پیامیوں کو ان کے مضامین کا انتظار رہتا ہے۔

ہمارا اپنا سلسلہ پھلواری یا باغبانی پیامیوں اور ان کے بزرگوں میں یکساں پسند کیا گیا ہے اس مرتبہ پپیتے پر مضمون پڑھیے۔ یہ ان صاحب نے لکھا ہے جو اس فن سے گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ ہاں پپیتے کے طبی فائدہ پر ہم نے آخر میں دو پیراگراف اور بڑھا دئے ہیں۔

محترمہ سلمیٰ جاوید صاحبہ پیام تعلیم پر مسلسل نوازش فرما رہی ہیں۔ اس مرتبہ پیامی بچیوں کے لیے انھوں نے گڈا بنانے پر بہت آسان اور دلچسپ انداز میں مضمون لکھا ہے۔ گڈے میاں پر ایک نظم بھی لکھی ہے۔ اس مضمون کو پڑھ کر گڈا بنایئے نہ بن پائے تو ہمیں بتایئے کہ آپ کیوں نہ بنا سکیں کیا مشکل پیش آئی۔ اس پرچے میں آپ آئس کریم کی کہانی پڑھیے۔ بڑے مزے کی ہے منھ میں پانی بھر آئے گا۔ جیب کترے کی انوکھی کہانی پڑھیے اور دوسری دلچسپ چیزیں پڑھیے ہاں پیسے کی کہانی! بہت سے پیامیوں نے اس کی تعریف کی ہے۔

قلمی دوستی کے سلسلے میں بہت سے پیامیوں نے اپنے نام اور پتے بھیجے ہیں۔ بہت سے پیامی اپنی عمر لکھنا بھول جاتے ہیں۔ یہ پیامی دوبارہ اپنا پتہ نام اور

عمر اور مشغلہ لکھ کر بھیج دیں۔ ہم بڑی خوشی سے شایع کریں گے۔ یاد رکھیے قلمی دوستی کے حلقے میں صرف سولہ سال تک کی عمر کے پیامی شامل ہو سکتے ہیں۔

شکر ہے کہ پیام تعلیم کے خریدار بڑھانے کی مہم کامیابی سے جاری ہے۔ ابھی ابھی ہمیں ایک خوش خبری ملی ہے بمبئی کارپوریشن ابھی تک سو پرچے خریدتی تھی اب اس نے اور ۱۰ پرچوں کی خریداری کی منظوری دے دی ہے۔ ہم اس سلسلے میں پرانے ساتھی شاہد علی خاں صاحب (انچارج شاخ مکتبہ بمبئی) کی کوششوں کو بڑا دخل ہے۔ اس کامیابی پر ہم ان کی خدمت میں دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

ان کے علاوہ گیارہ خریدار جناب اخضر بریلوی صا. نے مرحمت فرمائے ہیں اور انھی کی کوششوں سے جناب اختر حسین صاحب اختر سنبھلی نے گیارہ خریدار مرحمت فرمائے اور گیارہ کا وعدہ کیا ہے۔

جامعہ کے پرانے طالب علم جناب نعمان لطیف نے اس وقت ایک خریدار کا چندہ بھجوایا ہے اور دس خریداروں کا وعدہ کیا ہے۔ مکتبہ کے کارکن آفاق احمد صاحب نے ایک خریدار کا چندہ دیا اور بہت سے خریداروں کا وعدہ کیا ہے۔

محترمہ انور جہاں (بڑودہ) نے نو خریداروں کا وعدہ کیا تھا پانچ اس مہینے میں وصول ہو چکے تھے۔ چار خریداروں کے چندے اس مہینے آ گئے۔

ان کے علاوہ "پیام تعلیم" کے شاعر جناب سیف سہسرامی صاحب نے تین خریداروں کے چندے بھجوائے ہیں۔ جناب عادل جعفری صاحب نے دو خریداروں کے چندے بھجوائے ہیں۔ دو اطہر عزیز صاحب (کٹک) نے بھجوائے ہیں۔ یہ دونوں آپ کے پسندیدہ شاعر ہیں۔ عادل صاحب کی ایک نظم "جولائی" تو اس پرچے کے شروع میں پڑھیے۔

اور ہاں نسیم شاہ جہاں پوری صاحب نے ایک خریدار کا چندہ بھجوایا ہے۔ ایک خریدار ہمارے محترم مضمون نگار جناب یوسف ناظم صاحب نے دیا۔ ایک خریدار مسیح الدین صدیقی صاحب نے مرحمت فرمایا۔

عریک ہائر سکنڈری اسکول سے کچھ عرصے سے سال کے سال "اعتمادیہ" کے نام سے دو پرچے شایع ہوتے ہیں۔ ان میں ایک غالباً آٹھویں درجے تک کے بچوں کے لیے ہوتا ہے اور ایک نویں سے گیارھویں درجے کے لڑکوں کا۔ یہ دونوں پرچے کیا ظاہری نمود کیا مضامین ہر لحاظ سے معیاری ہوتے ہیں۔ بہت اچھی لکھائی چھپائی۔ بہت نفیس کاغذ بہت سے فوٹو بلاک۔

اس سال کے دونوں پرچے خصوصیت سے بہت شاندار ہیں۔ بڑوں کے رسالے میں مرزا محمود بیگ صاحب (سابق پرنسپل عریک کالج موجودہ پرو وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی) کا مضمون خاص طور پر پڑھنے کے قابل ہے۔ یہ انھوں نے اپنے والد صاحب پر لکھا ہے۔

ہم اس شان دار کامیابی پر اس اسکول کے بچوں لڑکوں، ان کے استادوں خصوصاً جناب محمد قاسم صدیقی صاحب کو دلی مبارک باد دیتے ہیں۔ قاسم صاحب کے خلوص اور لگن کا بھی ان پرچوں کی کامیاب اشاعت میں بہت کچھ دخل ہے۔

جناب عادل جعفری

گھٹا خوشی کی ہر اک سمت جھوم کر چھائی
مئی و جون ہوئے ختم ـــــ آئی جولائی
کریں پڑھائی کی ہم اپنی کائنات درست
کتابیں، کاپیاں، پنسل، قلم، دوات درست
جسے بھی دیکھیے اسکول میں ہے خرم و شاد
نیا ہے سال، نئے درجے ہیں، نئے استاد
ہر اک کے دل میں یہ رہ رہ کے آرہا ہے خیال
پڑھاتا کون ہمیں کیا ہے دیکھیے اس سال
حساب کون پڑھائے گا؟ ـــــ کون انگریزی
جسے بھی دیکھیے اس کو ہے یہی فکر لگی
وہ آئیں گے تو سر آنکھوں پہ ہم بٹھائیں گے
سنا ہے اردو نئے ماسٹر پڑھائیں گے
نہیں ہے فارسی ہندی کے باب میں یہ فکر
کہ ایک جعفری صاحب ہیں ایک پنڈت مصر

یہ دیکھنا ہے کہ تاریخ کون لیتا ہے
سبق سوکس کے ہر روز کون دیتا ہے
پڑھائے گا ہمیں سائنس کون محنت سے
عمل کرائے گا اچھی طرح! کہ عجلت سے
رہے گا کون مناسب بتایئے مسٹر
بنایا جائے گا اس سال کون مانیٹر
مباحثہ میں سوال و جواب پھر ہوں گے
اب انجمن کے نئے انتخاب پھر ہوں گے
منایا جائے گا پھر پندرہ اگست کا دن
ابوالکلام کا باپو سے حق پرست کا دن
ہر ایک چھوٹے بڑے کو بڑی خوشی ہوگی
پھر ایک بار جو چھبیس جنوری ہوگی
دو ایک ماہ میں پھر امتحان آئے گا
خوشی سے دامن امید بھر کے جائے گا

آئس کریم کی کہانی

جناب احسان الحق

ہمارے ایک دوست ہیں۔ ان کا ایک خوبصورت
سا پیارا پیارا، مُنّا مُنّا سا لڑکا ہے۔ بس یوں سمجھو کہ بالکل تمھارے
جیسا ہے۔ لیکن بھئی تم بھی خوب چیز ہو۔ لاکھ ڈانٹ پڑتی
رہے "ابکی تم نے ایسا کیا تو تمھاری پٹائی ہوگی اور تم ہو کہ
بڑی بڑی آنکھوں سے بس دیکھتے رہو گے کچھ بولو گے
نہیں۔ جیسے تمھیں معلوم ہو کہ ہم ماریں گے نہیں اور ہمیں معلوم
ہو کہ تم مانو گے نہیں۔
تو بھئی ہمارے راجو صاحب جو ہیں ان پر آج کل
بڑی کڑی نگرانی اس بات کی رکھی جارہی ہے کہ وہ سودے
والوں سے پھیری والوں سے کچھ لے کر کھانے نہ پائیں پر بھئی
تم کو تو روکا جاسکتا ہے لیکن ان سودے والوں کا آنا کیسے
بند کیا جائے!
کھڑی دوپہری ہے۔ گرمی ایسی کہ دریا سوکھ جائیں
اور ایسے میں راجو صاحب کو سُلانے کی کوشش کی جارہی ہے
دُور دُور تک سناٹا پھیلا ہوا ہے۔ لو چلنے کی آوازیں شائیں
شائیں آرہی ہیں۔ اتنے میں کہیں دُور سے ایک آواز آتی ہے
ہواؤں پر اڑتی ہوئی — "قلفی ملائیک"، "ملائیک برف"
آواز سنتے ہی راجو کی آنکھوں سے نیند نے چھلانگ لگائی
اور سڑک پر۔ اب ان کی آنکھیں پٹر پٹر ہونے لگیں موقع
دیکھ کر اٹھنے لگے کہ اتنے میں کمرے کے دوسرے
کونے سے آواز گونجی "خبردار واپس! واپس لوٹو!! لیٹ
جاؤ!" اور وہ بے چارہ روہانسا ہو کر دھڑام سے بستر پر
دوسرا دن آجاتا ہے۔ آج پھر دور سے آواز
آتی ہے لیکن آج کوئی دوسرا سودے والا ہے۔ ذرا غور
سے سنیے کیا بیچ رہا ہے؟ "آئس کریم! آئس کریم والا!!"
آئس کریم کا نام سن کر راجو صاحب چونک
پڑے۔ ایک جست میں دروازہ کھول کر باہر۔ زور زور سے
"آئس کریم والے جاؤ آج ہم آئس کریم نہیں کھائیں
گے، ممی نے منع کیا ہے۔" ہائے یہ سن کر کسے دکھ نہیں ہوگا
کیسے پیار نہیں آئے گا؟ ایک دفعہ تو جی چاہا کہ بھاگ کر
آئس کریم والے کو پکڑ لاؤں اور راجو کو اتنی کھلاؤں اتنی
کھلاؤں ... حلق تک پہنچ جائے لیکن پھر گرم گرم لو
اور شائیں شائیں کرتی ہوئی ہواؤں نے کہا "نہیں ابھی
نہیں، پھر کسی ٹھنڈے وقت میں۔"
ایک چھٹی کے دن صبح صبح میں نے اسکوٹر نکالا
راجو کھیل میں لگے ہوئے تھے۔ میں نے دُور سے پکار کے
کہا "راجو میں جارہا ہوں، چلتے ہو گھومنے۔" ان کی دُور
سے آواز آئی "انکل میں کھیل رہا ہوں۔" میں نے کہا "بھئی
ٹھیک ہے کوئی زبردستی تھوڑی ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ
آج چل کر خوب آئس کریم کھائیں گے!" اتنا سننا

تھا کہ راجو میاں لپک کر اسکوٹر پر بیٹھ گئے۔ میں لاکھ کہتا رہا "ارے نہیں بھائی پھر کسی دن چلیں گے۔ اب چھوڑو، آج ہمارا دن نہیں چاہتا ہے" لیکن صاحب وہ اسکوٹر سے نہیں اترے۔

میں نے سیدھا پہاڑ گنج کا رخ کیا۔ وہاں میرے دوست کرشن لال کی ایک چھوٹی سی آئس کریم فیکٹری ہے۔ وہاں پہنچے تو دیکھتے کیا ہیں کہ اُسی آئس کریم والے کی گاڑی کی طرح دس پندرہ گاڑیاں تیار کھڑی ہیں۔ اب یہ آئس کریم بھر کر پھیری پر نکلیں گی۔ گلیوں میں، سڑکوں پر، پارکوں میں بچے ان کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ ویسے خود ان کو بھی بچوں سے ملنے کا انتظار رہتا ہے۔

میں راجو کو لے کر اندر گیا۔ سارا کمرہ ٹھنڈا ہو رہا تھا دیواروں کا ہرا رنگ آنکھوں کو بڑا بھلا لگا۔ کرشن لال نے بڑے پیار سے راجو کو گود میں اٹھا لیا اور پھر ایک ونیلا کی لمبی سی آئس کریم اس کے ہاتھ میں دے دی۔ یہ لمبی سی آئس کریم چھوٹی ہوتی چلی گئی۔ تھوڑی دیر میں غائب بھی ہو گئی۔ اب کرشن لال نے چاکلیٹ کی آئس کریم منگائی۔ اس کو کھاتے کھاتے راجو پوچھنے لگا کہ "انکل یہ آپ کیسے بناتے ہیں؟" میں نے موقع غنیمت جانا اور لے کر سیدھا فیکٹری کے اندر۔

اندر بڑے بڑے سفید رنگ کے بکس رکھے تھے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ وہ کمرہ ہے جہاں آئس کریم تیار ہونے کے بعد رکھی جاتی ہے۔ اس کمرے کا ٹمپریچر اتنا کم ہوتا ہے کہ اس میں آئس کریم سخت ہو جاتی ہے۔

میں راجو کو لے کر آگے بڑھا۔ کرشن لال نے سمجھانا شروع کر دیا: بہت تھوڑی سی چیزیں ہوتی ہیں جو آئس کریم میں پڑتی ہیں۔ دودھ، کسٹرڈ پاؤڈر، شکر، رنگ اور وہ پھل اور میوے جن کی آئس کریم بنانا ہو۔

کرتے یہ ہیں کہ دودھ، کریم اور شکر کو ملا کر خوب پھینٹا جاتا ہے اور پھر ایک مشین میں ڈال کر جس کو 'پاس چورائزر' (PASTAURIZER) کہتے ہیں اسے گرم کیا جاتا ہے۔ گرم ہونے سے ان کے سارے جراثیم مر جاتے ہیں۔

گرم ہونے کے بعد یہ سب کا سب 'ہوموجنائزر' (HOMOGENIZER) میں انڈیل دیا جاتا ہے۔ دودھ میں جو پھٹکیاں پڑ جاتی ہیں، یہ مشین ان کو توڑ کر برابر کر دیتی ہے اسی مشین کی وجہ سے آئس کریم چکنی اور سفید سلک کی طرح ملائم ہوتی ہے۔ اس مشین کا کام ختم ہونے کے بعد یہ ادھوری بنی ہوئی آئس کریم بہت ٹھنڈے ٹھنڈے پائپ پر گرائی جاتی ہے جسے 'کولر' (COOLER) کہتے ہیں۔ اس پائپ سے جب آئس کریم نیچے گرتی ہے تو وہ آہستہ آہستہ گاڑھی ہونا شروع ہو جاتی ہے اور پھر پانی کی طرح بہتا ہوا دودھ شیرے کی طرح گاڑھا ہو کر نکلنے لگتا ہے۔ 'کولر' (COOLER) سے نکال کر سارا دودھ ایک اسٹین لس اسٹیل کے برتن میں گرا دیا جاتا ہے۔ اس برتن کے اندر شیشے کی تہہ چڑھی ہوتی ہے اور پھر یہ سارے کا سارا 'فریزر' (FREEZER) میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ جہاں میوے یا پھل وغیرہ ملانے کے بعد آئس کریم ڈبوں یا کاغذ کے گلاسوں میں الٹ دی جاتی ہے۔ اور پھر یہ ڈبے اس کمرے میں پہنچا دیے جاتے ہیں جس سے ہم سب سے پہلے گذرے تھے۔ اس کمرے میں آئس کریم سخت ہو جاتی ہے۔

راجو تمام چیزوں کو دیکھتا رہا۔ آئس کریم کھاتا رہا سوچتا رہا۔ آخر میں اپنی من بھائی آئس کریم کا چمچہ منھ میں رکھتے ہوئے پوچھنے لگا "انکل گھر دل میں جو آئس کریم

بنتی ہے اس میں اور مشین کی آئس کریم میں کیا فرق ہے؟
سوال اچھا تھا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ دونوں میں بس اتنا سا
فرق ہے کہ گھر کی مشین کا ہینڈل ہاتھ سے گھمانا پڑتا ہے۔
فیکٹری میں بس ایک بٹن دبانے سے سارے کام ہو جاتے ہیں۔

خوب ڈھیر ساری آئس کریم کھانے کے بعد ہم لوگ
گھر لوٹ آئے۔ رات کو سونے کے لیے لیٹے تو میں نے
دیکھا کہ راجو کسی فکر میں کھویا ہوا ہے۔ میں نے پوچھا "کیوں
بھئی کیا پریشانی ہے؟" کہنے لگے "انکل یہ آئس کریم کس
نے بنائی تھی؟"

بھئی بہت دنوں کی بات ہے، یوں سمجھو کہ کوئی
چارسو یا سوا چارسو سال کی بات ہے۔ اٹلی کے ایک آدمی
نے سب سے پہلی دفعہ آئس کریم بنائی تھی۔ اٹلی کے لوگوں
نے معلوم کر لیا تھا کہ برف اور نمک ملانے سے مختلف
چیزوں کو جمایا جا سکتا ہے۔ پھر جانے کیسے دودھ اور شکر
مل گئی۔ شاید کوئی صاحب برتن باہر رکھ کر بھول گئے۔ صبح
جو آنکھ کھلی تو ڈبے میں دودھ جما ہوا پایا گیا۔ لوگوں نے اس
جمے ہوئے میٹھے دودھ کا نام آئس کریم رکھ دیا۔

ہمارے یہاں کا راشٹرپتی بھون جو ہے اسی
طرح امریکہ میں بھی ایک ہے۔ وہاں سنہ ۱۸۰۹ء میں پہلی دفعہ
آئس کریم مہمانوں کو کھلائی گئی تھی۔ دعوت کے سارے
مہمانوں کی عقل دنگ ہو گئی تھی۔ لیکن باورچی صاحب نے
کسی کو کانوں کان خبر نہ لگنے دی کہ اس نے یہ ٹھنڈی، میٹھی
ملائم اور بالائی جیسی نرم چیز کیسے تیار کی تھی۔ لوگ پوچھتے
رہے، وہ مسکراتا رہا۔ وہ بس یہی کہتا تھا "آپ پھر تشریف
لائیے۔ اب کی میں اس سے زیادہ اچھی آئس کریم حاضر
کروں گا۔"

تو یہ تھی گھر کے اندر آئس کریم بنانے کی بات،
لیکن بازار والی آئس کریم کی پہلی فیکٹری بالٹی مور
(BALTIMORE) میں سنہ ۱۸۵۱ء میں لگائی گئی تھی۔" اس
کا مطلب کیا ہوا راجو؟"

"کیا ہوا اس کا مطلب؟" راجو نے پلٹ کر پوچھا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ آج سے ۱۱۷ سال پہلے
بالٹی مور کے ننھے منے بچے جب دوپہر میں آرام کرنے
کے لئے لیٹے ہوں گے تو کہیں دور سے آنے والی آواز
انھیں چونکا دیتی ہوگی۔ وہی آواز جو تمھیں دوپہر میں سونے
نہیں دیتی۔ وہی آواز جس میں شکر کی گھلاوٹ ہوتی ہے
وہی آواز جس میں گھنٹیاں سی بجتی سنائی دیتی ہیں:
"آئس کریم — آئس کریم والا!"

★

جناب جمشید اشرف

لطیفہ

ایک مرتبہ ایک مجلس میں سکندر نے کہا: میں
نے کبھی کسی شخص کو محروم نہیں کیا جس نے جو چیز مانگی میں نے دے دی۔
ایک شخص نے اسی وقت عرض کیا "اے بادشاہ مجھے اس وقت
ایک اشرفی کی ضرورت ہے ایک اشرفی بخش دے۔ سکندر بولا:
بادشاہوں سے کم مول کی چیز مانگنا بے ادبی ہے۔ اس شخص نے
کہا: بادشاہ کو ایک اشرفی دیتے ہوئے شرم آتی ہے تو مجھے ایک
ملک بخش دے۔ سکندر نے جواب دیا: پہلے جو تم نے سوال کیا وہ
میرے رتبے سے کم تھا۔ دوسرا سوال تمھارے اپنے رتبے سے زیادہ
تھا۔ تمھارے دونوں سوال بے جا ہیں۔

(فارسی سے)

جنابُ دیناناتھ گردھر

کھیل اور کھلاڑی

گارفیلڈ سوبرس

جب سے دنیا بنی ہے۔ انسان میں کھیل کود کا شوق رہا ہے وقت کے ساتھ ساتھ یہ کھیل بدلتا رہا ہے۔ شروع شروع میں جب انسان جنگلوں میں رہتا تھا اور اس کی گذر بسر جنگلی پھلوں اور جانوروں کے گوشت پر تھی اس کا شوق تیراندازی، ڈنڈے بازی جیسے کھیل تھے۔ جوں جوں وہ مہذب بنتا گیا اس کے کھیل کے شوق بھی سدھرتے گئے۔

ہمارے دیس ہندوستان میں بھی کھیلوں کا رواج ہمیشہ سے ہے اور اس میدان میں ہمارے کھلاڑیوں نے ہندوستان کا نام روشن کیا۔ پچھلی صدی کے دوسرے نصف حصّے میں انگریزوں کی دیکھا دیکھی ہمارے ملک کے نوجوانوں میں مشرقی کھیلوں مثلاً کشتی، رسہ کشی، گلی ڈنڈا وغیرہ کے ساتھ مغربی قسم کے کھیل مثلاً فٹ بال، جمناسٹک، ہاکی، والی بال اور کرکٹ بھی بہت مقبول ہوئے ہمارے ملک کی فٹ بال، ہاکی اور کرکٹ کی ٹیموں نے دنیا کے مختلف حصوں کے بین الاقوامی مقابلوں میں حصّہ لیا اور ناموری حاصل کی۔ ہاکی میں تو لگ بھگ تیس سال تک دنیا کا کوئی ملک ہمارے مقابلے میں نہ ٹھہر سکا۔ اور آج بھی ہندوستان کے کھلاڑی دنیا کے بہترین ہاکی کھیلنے والے سمجھے جاتے ہیں۔ اسی طرح کرکٹ کے میدان میں بھی ہمارے کھلاڑیوں نے بڑی شہرت حاصل کی۔ پرانے کھلاڑیوں میں رائے۔ لالہ امرناتھ۔ غلام محمد وجے ہزارے۔ منکڈ۔ پٹودی کے نواب صاحب (موجودہ نواب پٹودی کے والد) وغیرہ آج بھی کرکٹ کی دنیا میں عزت سے یاد کیے جاتے ہیں۔ آج کل کے کھلاڑیوں میں امریگر۔ کنٹرکٹر۔ جے سمہا نواب پٹودی روسی سورتی۔ پرسنا وغیرہ ایسے بہت سے کھلاڑی ہیں جنھوں نے اس میدان میں نام پیدا کیا ہے۔

اس وقت دنیا میں جن ملکوں میں کرکٹ کا رواج ہے وہ ہیں ویسٹ انڈیز، آسٹریلیا، انگلینڈ، ہندوستان، پاکستان جنوبی افریقہ، نیوزی لینڈ۔

ویسٹ انڈیز کی ٹیم دنیا میں سب سے زیادہ مضبوط مانی جاتی ہے اور اس کے ایک کھلاڑی گارفیلڈ سوبرس دنیا کے بہترین کھلاڑی شمار ہوتے ہیں اس وقت ان کی عمر اکتیس سال کے قریب ہے۔ لڑکپن ہی سے کرکٹ کا شوق تھا وہ ابھی اسکول ہی میں پڑھتے تھے کہ وہ ویسٹ انڈیز میں انھیں ایک اچھا باؤلر سمجھا جانے لگا۔ ۱۹۵۳ء میں جب ہندوستان کی کرکٹ ٹیم ویسٹ انڈیز کے دورے پر گئی تو صرف سولہ سال کی عمر میں انھیں ہندوستان کی ٹیم کے خلاف ایک مقامی مقابلے میں شامل کیا گیا اور انھوں نے اپنی بے مثال باؤلنگ سے ہندوستان کے سات کھلاڑی آؤٹ کیے۔ اس شاندار کھیل کی بدولت انھیں ملک گیر شہرت حاصل ہوئی۔

۱۹۵۴ء میں انگلستان کی کرکٹ ٹیم ویسٹ انڈیز کے دورے پر گئی ویسٹ انڈیز کی ٹیم میں سوبرس کو بھی شامل کیا گیا۔ ان کی عمر صرف سترہ سال تھی۔ اس لحاظ سے

وہ دنیا کے سب سے کم عمر کھلاڑی تھے جنھیں کسی دوسرے ملک کے خلاف کھیلنے کے لیے چنا گیا۔ جس ٹسٹ میچ میں سوبرس کو کھیلنے کا موقع دیا گیا اس میں ویسٹ انڈیز کی ہار ہوئی۔ لیکن سوبرس نے اپنا کمال دکھایا۔ اس ٹسٹ میچ میں انگلستان کی ٹیم نے ۴۱۴ رن بنائے مگر سوبرس نے صرف ۷۵ رن دے کر انگلستان کے چار کھلاڑی آوٹ کیے انھیں بلے بازی کا پورا موقع نہ ملا۔ وہ اب تک باؤلر ہی سمجھے جاتے تھے مگر وہ ٹسٹ میچ کی دونوں اننگوں میں نویں نمبر پر کھیلے اور ۱۴ اور ۱۲ رن بنا سکے مگر آؤٹ نہیں ہوئے۔

اب سوبرس کا کرکٹ کا شوق اور بڑھا انھوں نے خوب مشق کی۔ اور بلے بازی، بال دینے اور فیلڈ میں کھیلنے میں بھرپور مہارت حاصل کی۔ جب دو سال بعد ویسٹ انڈیز اور آسٹریلیا کے درمیان کرکٹ میچ ہوئے تو سوبرس کو بھی ٹیم میں شامل کیا گیا۔ اتفاق کی بات کہ عین وقت پر ویسٹ انڈیز کے نمبر ایک پر کھیلنے والے کھلاڑی سٹولیر نہ کھیل سکے اور ان کی جگہ سوبرس کو نمبر ایک پر کھیلنے کا موقع ملا۔ لنڈوال اور ملر آسٹریلیا کے بہترین باؤلر مانے گئے ہیں۔ یہ دونوں بال دینے پر مامور تھے مگر سوبرس نے ان کی بال کی وہ مٹی پلید کی کہ صرف پندرہ منٹ میں ۴۳ رن بنا ڈالے۔ اس سے ان کی باؤلر کے علاوہ بلے بازی یا بیٹنگ کی دھاک بیٹھ گئی۔

۱۹۵۷ء میں ویسٹ انڈیز کی ٹیم انگلستان گئی یہاں سوبرس نے باولنگ اور بلے بازی کے خوب جوہر دکھائے۔ انھوں نے کل ملا کر ساڑھے سولہ سو رن بنائے جو دوسرے سب کھلاڑیوں سے زیادہ تھے۔ انہیں میچوں میں انھوں نے اپنی باؤلنگ سے ۳۷ کھلاڑی آؤٹ کیے۔ اگلے سال پاکستان کی ٹیم ویسٹ انڈیز گئی۔ پاکستان کے خلاف کھیلتے ہوئے انھوں نے ایک دفعہ ۳۶۵ رن بنائے اور آؤٹ نہ ہوئے جو اب تک دنیا میں ریکارڈ ہے۔ ایک اور میچ میں دونوں اننگوں میں انھوں نے سو سو سے زیادہ رن بنائے اور اس طرح ایسے معدودے چند کھلاڑیوں میں شامل ہوئے جنھوں اینگر سیکڑے بنائے ہیں۔ پاکستان کے خلاف تمام ٹسٹ میچوں میں ان کا اوسط ۱۳۷ فی اننگس رہا۔

ایک سال بعد وہ اپنی ٹیم کے ساتھ ہندوستان اور پاکستان کے دورے پر آئے یہاں بھی انھوں نے تین مسلسل ٹسٹ میچوں میں ہر ایک میں سیکڑے بنائے۔ اپنی باؤلنگ کا بھی انھوں نے بہترین مظاہرہ کیا۔

۱۹۶۰ء میں جب انگلستان کی ٹیم دوبارہ ویسٹ انڈیز گئی تو انھوں نے ہر ٹسٹ میچ میں ایک سیکڑہ بنایا۔ برسبین میں تو انھوں نے دو گھنٹے ہی میں ۱۱۹ رن بنائے۔ سڈنی کے ٹسٹ میں انھوں نے ۱۶۸ رن بنائے جو اس سلسلے کے ایک کھلاڑی کے سب سے زیادہ رن تھے اس شاندار کھیل کا آسٹریلیا والوں نے اس طرح اعتراف کیا کہ انھوں نے سوبرس کو اپنے ملک میں آنے کی دعوت دی اور وہاں کے ایک بہت بڑے ٹورنامنٹ میں کھیلنے کو کہا۔ سوبرس نے وہاں دس میچ کھیلے جن میں انھوں نے ایک ہزار چھ رن بنائے اور پچاس کھلاڑی آؤٹ کیے۔ اب تک کوئی دوسرا کھلاڑی اسٹریلیا میں بیک وقت یہ دونوں ریکارڈ نہیں توڑ سکا جب ۱۹۶۲ء میں ہندوستانی ٹیم ویسٹ انڈیز گئی تو سوبرس نے اس کو شکست دینے میں نمایاں حصہ لیا۔ انھوں نے ہندوستان کے ۲۳ کھلاڑیوں آؤٹ کیے اور کل ملا کر لگ بھگ سات سو رن بنائے۔ اگلے سال وہ اپنی ٹیم کے ساتھ انگلستان گئے اور اپنے بالنگ دینے اور بلے بازی کے وہ مظاہرے کیے کہ تماشائی عش عش کر اٹھے۔ ایک میچ میں ان کی ایک انگلی ٹوٹ گئی۔ ڈاکٹر نے کھیلنے سے منع کر دیا۔ مگر وہ بضد رہے اور ۱۰۲ رن بھی بنا ڈالے۔

۱۹۶۵ء میں آسٹریلیا کی ٹیم ویسٹ انڈیز گئی۔ اس

ت سوبرس ہی ویسٹ انڈیز کے کپتان تھے۔ آسٹریلیا کی ٹیم نے
ں جوانمردی سے بلے بازی کی۔ جب ویسٹ انڈیز کی باری آئی
یہ ٹیم فیلڈنگ کر کے بے حد تھک چکی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صرف
رن بن پائے تھے کہ ویسٹ انڈیز کے چھ بہترین کھلاڑی آؤٹ
گئے۔ اب سوبرس کو شکست سامنے نظر آرہی تھی۔ ایسے حالات
گھبرانے کے بجائے وہ کمر ہمت باندھ کر میدان میں اترے اور
ے ایک ساتھی کے ساتھ ڈٹ کر کھیلے۔ دونوں نے مل کر ۲۷۴
ن بنائے ان میں ۱۶۳ رن سوبرس کے تھے اس طرح انھوں
ں اپنے ملک کو ہار سے بچالیا اور یہ میچ ہار جیت کا فیصلہ ہوئے
بر ختم ہوا۔

آج سوبرس دنیا کا بہترین کرکٹ کھلاڑی مانا گیا
ہے۔ اس کے اپنے ملک میں اسے ایک قومی سورما کہا جاتا ہے۔
ں کے نام پر سڑکوں کے نام رکھے گئے ہیں۔ لوگ بچوں کے نام
ں کے نام پر رکھتے ہوئے خوشی محسوس کرتے ہیں۔

سوبرس آج تک ۶۵ ٹسٹ میچ کھیل چکے ہیں۔ ان
میں ۸۵ ٹسٹ میچ تو مسلسل رہے ہیں انھوں نے اب تک چھ
ہزار سے زیادہ رن بنائے ہیں۔ ڈیڑھ سو سے زیادہ کھلاڑی
آؤٹ کئے ہیں۔ اور نوے بال دبوچے ہیں۔ اس کے علاوہ
آؤٹ ہوئے بغیر ۳۶۵ رن آج بھی دنیا کا ریکارڈ ہے

بقیہ انوکھا جیب کترا

صاحب کو اس الزام سے بری کرتا ہوں اب آپ لوگ
اپنے اپنے راستے جائیے۔" مجمع بکھرنے لگا۔ ارکادی گاتی
دار بھی جانے لگے تو تھیلے والی بڑھیا نے ان کا راستہ روکا
زمین کی طرف جھک کر اس نے اپنے تھیلے میں سے ایک
بڑا سا سرخ و سفید سیب نکالا اور گیتی دار کو دیتے ہوئے
بولی: "اے نیک انسان یہ لے لو۔ یہ سیب اتنا بڑا ہے
کہ میں چپکے سے تمہاری جیب میں نہیں ٹھونس سکتی۔ پھر
بھی دیکھو میں کوشش کرتی ہوں!

جناب عباس ازل

محترم حسان صاحب

آداب۔ آج آپ کو خط لکھتے ہوئے میں تقریباً تیس سال چھوٹا ہوگیا ہوں۔ مجھے اپنے مرحوم ماموں ابوطاہر صاحب یاد آرہے ہیں جنھوں نے میرے نام پیام تعلیم جاری کرایا تھا جس سے میری دلچسپی اتنی بڑھی کہ خود بھی اس میں کچھ نہ کچھ بھیجنے لگا کبھی سائنس کے ہلکے پھلکے تجربے کبھی انگریزی سے ترجمہ کی ہوئی کہانیاں اور مضمون۔ یہ سب صفحات مجھے ابھی کچھ دن ہوئے ان کے ایک پرانے فائل میں ملے۔ جب بھی پیام تعلیم میں میرا بھیجا ہوا کچھ مواد شائع ہوتا تو مرحوم سے داد لینے کے لیے میں پیام تعلیم کا وہ صفحہ کاٹ کر لکھنؤ سے پونا بھیج دیتا تھا۔

اس طویل عرصے میں کیا کیا انقلابات ہوئے کبھی سوچتا ہوں تو دل بہت اداس ہو جاتا ہے ——— بہرکیف ان صفحات نے میرا بچپن مجھے یاد دلا دیا اور میں پھر (شاید ماضی میں لوٹنے کی کوشش میں) ایک کہانی روسی زبان سے ترجمہ کرکے پیام تعلیم کے لیے بھیج رہا ہوں۔ شاید آپ کو اچھی لگے۔ آرکادی گیدار سویت یونین میں بچوں کے بہت مقبول ادیب تھے۔ ان کے ایک دوست یملیانف نے ان کی خوبصورت شخصیت کے متعلق کئی اچھی کہانیاں جو صحیح واقعات پر مبنی ہیں لکھی ہیں۔ ان ہی میں سے ایک کہانی یہ بھی ہے۔

روسی میں تو اس کہانی کا عنوان "شلوچائی" یعنی واقعہ ہے مگر میں نے "انوکھا جیب کترا" کر دیا ہے۔ امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔

مخلص ——— عباس ازل

مجھے ماسکو میں کچھ کام تھا۔ لوگوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی ٹرام ایک اسٹاپ پر پہنچی تو وہاں سے اور بھی کئی آدمی سوار ہوئے۔ ایک بوڑھی عورت اپنے کندھوں پر دھاری دار تھیلا لٹکائے داخل ہوئی اس کے پیچھے ایک دراز قد آدمی گھڑسوار پلٹن کی وردی کا لمبا کوٹ پہنے۔ پھر ایک اور شخص بھورے

ـک کی ٹوپی پہنے۔
ان سب کے بعد عزیناً مٹو کپڑوں میں ایک نوجوان
ـے ہاتھ میں کچھ کاپیاں لیے ہوئے اندر گھسا۔ اپنی سب
ـبوں میں پیسے ٹٹولتے ہوئے وہ پریشانی سے کنڈکٹر کی
ـف دیکھتا جاتا تھا۔ آخر اس کے چہرے پر خوشی کی جھلک منظر
ـئی اور اس نے ایک سکہ نکال کر کنڈکٹر کی طرف بڑھا دیا۔

کئی اسٹاپ گذر گئے بہت بھیڑ تھی پھر بھی بھوری
ـٹوپی والے آدمی نے دیکھ لیا کہ جو آدمی لمبا کوٹ پہنے اس سے
ـلے ٹرام میں چڑھا تھا وہ چپکے چپکے اپنا ہاتھ غریب نوجوان
ـی جیب میں ڈال رہا ہے۔ چور رنگے ہاتھ پکڑا گیا۔

ایک ہنگامہ شروع ہو گیا۔ سب چیخنے چلانے اور
ـمد کرنے لگے اور ٹرام سے سڑک پر اتر آئے۔ سڑک پر
ـر لوگ بھی جمع ہو گئے اور مجمع بڑھتا ہی گیا۔

پولیس کا آدمی لوگوں سے چپ رہنے کی درخواست
ـکر رہا تھا۔ لڑکیاں، بچے اور بھوری ٹوپی والا آدمی چیخ
ـچلا رہے تھے لیکن سب سے زیادہ غصہ تھیلے والی
ـبڑھیا کو آ رہا تھا۔ فوجی کوٹ والا اپنی صفائی پیش کر رہا تھا۔
ـمگر کوئی اس کی سن ہی نہیں رہا تھا۔ بھیڑ کا شور بڑھتا ہی جا رہا
تھا۔

پولیس والے نے سختی کے ساتھ ہاتھ ہلاتے ہوئے
ـجیب کترے سے اس کے کاغذات مانگے۔ چور نے اپنی جیب
ـمیں ہاتھ ڈال کے ایک بھورے رنگ کی چھوٹی سی نوٹ بک
نکالی اور پریشان ہو کر بولا "میرے پاس شناختی کارڈ نہیں
ہے۔ صرف سوویت ادیبوں کی انجمن کا ممبری کارڈ
ہے۔ میں خود بھی ادیب ہوں اور میرا نام
"ارکادی گیدار" ہے۔ خرانٹ بڑھیا کو اس بات کا یقین نہ
آیا اور وہ پھر چیخنے لگی اس کے ساتھ اور سب لوگ بھی چلانے
لگے۔

اس شور وغل میں صرف کاپیوں والا نوجوان
چپ چاپ کھڑا تھا۔

"آپ کون ہیں اور آپ کی کیا چیز چرائی گئی ہے؟"
پولیس والے نے اس سے پوچھا۔

"تعلیم کی غرض سے داخلہ لیا ہے۔ میرے پاس
پیسے نہیں ہیں جو تھے وہ خرچ ہو گئے اور وظیفہ ابھی تک
ملا نہیں ہے۔"

پولیس والے نے نوجوان سے اپنی جیبیں دیکھنے
کے لیے کہا کہ شاید اس کے کاغذات نہ چوری ہوئے ہوں
نوجوان نے اپنی جیبیں الٹ دیں۔ یکایک اس کی جیب سے
اسی جیب سے جس میں جیب کترے نے ہاتھ ڈالا تھا۔
ایک تڑا مڑا پچاس روبل کا نوٹ زمین پر گرا۔ طالب علم
نے اس نوٹ کو دیکھا اور بولا کہ یہ نوٹ میرا نہیں ہے۔
میرے پاس تو ایک پیسہ بھی نہیں تھا۔

سب خاموش ہو گئے اور ادیب کی طرف دیکھنے
لگے۔ وہ خود بھی گھبرایا ہوا چپ چاپ زمین کی طرف دیکھ
رہا تھا۔

پولیس والا حیران تھا۔ وہ کتنے دنوں سے پولیس
میں کام کر رہا تھا لیکن ایک مرتبہ بھی ایسا جیب کترا
دیکھنے کو نہیں ملا تھا۔ جو دوسروں کی جیب میں اپنے
پیسے ڈالے وہ ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولا۔

"کوئی جرم نہیں ہوا ہے اس لیے میں ادیب

بقیہ صفحہ ۲۹ پر

گرمی کا فسانہ

جناب اطہر عزیز

کیا سنائیں تمھیں گرمی کا فسانہ بچّو

ہرادا اس کی انوکھی ہر اک انداز نیا — اس کی چالوں سے کوئی آج تلک بھی نہ بچا
اور غصّے میں تو ہوتا ہے جدا حال اس کا — اتنی مغرور کہ دم بھر کو یہ بن جائے خدا

اس پہ چلتا نہیں کوئی بھی بہانہ بچّو
کیا سنائیں تمھیں گرمی کا فسانہ بچّو

ضد میں آئے تو جلادے خس و خاشاک و چمن — آنکھ دکھلائے تو تھرّانے لگیں گنگ و جمن
کہیں رک جائے گھڑی بھر کو تو چیخ اٹھے گگن — اس کی جنبش ہی سے جل جائیں ہزاروں گلشن

وصف اس کے نہیں آسان گنانا بچّو
کیا سنائیں تمھیں گرمی کا فسانہ بچّو

اس کی ہیبت سے تو چھت پر کوئی جاکر سوئے — کوئی کمرے ہی میں سب فین چلا کر سوئے
کوئی سبزے ہی میں سر اپنا چھپا کر سوئے — کوئی فٹ پاتھ کو غم اپنا سنا کر سوئے

یہ زمانہ بھی ہے کیا خوب زمانہ بچّو
کیا سنائیں تمھیں گرمی کا فسانہ بچّو

اتنی چالاک کہ ہنستوں کو رلا دے آکر — ایسی بے باک کہ بیٹھوں کو اٹھا دے آکر
اس قدر شوخ کہ سوتوں کو اٹھا دے آکر — ہوشیار اتنی کہ اوروں کو لڑا دے آکر

کون ہے جو نہیں گرمی سے دوانہ بچّو
کیا سنائیں تمھیں گرمی کا فسانہ بچّو

دو مزاحیہ کہانیاں

جناب عبداللہ فاکسی

کنجوس

ہمارے عظیم شہر تاشقند کا ہر شخص میرے پڑوسی میرکمال کو جانتا ہے جو ایک پھیری والا ہے۔ اس نے اور اس کی بیوی نے ساری زندگی چرواہوں سے کھانا اور بھکاریوں سے روٹی کے ٹکڑے مانگتے گزاری۔ ان کے اولاد نہ تھی۔ لیکن ان کے پاس ایک چیز ضرور تھی اور وہ تھا مفت کی کھانے کا چسکا۔

میرکمال ہفتے میں چھ دن بازاروں میں گھومتا رہتا، صرف ایک دن گھر آتا۔ ہر بدھ کو۔ باقی چھ دن اس کی بیوی خالی گھر میں تن تنہا بیٹھی رہتی۔

ایک بدھ کو ضمیرہ تاکائی نے روتے ہوئے اپنے شوہر سے کہا "آخر تم کیا ہو؟ میرے شوہر ہو یا بدلیسی مٹی کا تودہ؟ میں پاگلوں کی طرح اس دوزخ میں تنہا بیٹھی رہتی ہوں! میں چاہتی ہوں میرے ساتھ کوئی تو ہو۔ اگر تم مجھے ایک بچھڑا یا بھیڑ خرید دو گے تو آسمان تو نہ ٹوٹ پڑے گا؟ میں تمھاری جدائی کو برداشت کرسکوں گی۔"

میرکمال نے اس تجویز پر اچھی طرح غور کیا۔ اگلے بدھ کو اس نے ایک دبلی پتلی دو سال کی بھیڑ بیوی کے حوالے کی جسے اس نے سات تنگی میں خریدا تھا۔ ضمیرہ تاکائی کتنی خوش قسمت تھی! اس بھیڑ نے اب اس کو افسردہ رہنے کا موقع بالکل نہ دیا۔ وہ تمام دن چلایا کرتی۔ گھر میں جتنی بھی کھانے پینے کی چیزیں تھیں انھیں وہ جلد ہی کھا گئی اور پھر پڑوسیوں کے دسترخوانوں کے بچے کھچے ٹکڑے بھی اس نے ختم کر دیے۔ اس پر بھی وہ تمام دن میں میں کرتی رہتی۔

اگلے بدھ کو جب اس کا شوہر گھر پہنچا تو بجائے خوش ہونے کے ضمیرہ تاکائی نے رونا شروع کر دیا "ہاں ہاں، میں جانتی ہوں تم اس جانور کو کس لیے لائے تھے۔ تم چاہتے ہو کہ میں وقت سے پہلے مرجاؤں! اسے واپس لے جاؤ ورنہ میں اپنے میکے چلی جاؤں گی۔"

"ٹھہرو تو سہی" جانامت،" میرکمال نے کہا" میں کوئی تدبیر سوچوں گا۔" اسی دن شام کو وہ شگائی دین کے قبرستان گیا جہاں اس کے باپ کی قبر تھی۔ وہاں اس نے عمدہ قسم کی بہت سی گھاس دیکھی جس کا کوئی مصرف نہ تھا۔ اسے فوراً خیال آیا کہ بھیڑ کے لیے یہ جگہ جنت ثابت ہوسکتی ہے۔ دوڑتا ہوا گھر گیا، بھیڑ کو لیا اور اسے گورکن کے پاس لے آیا۔

"بھائی" اس نے کہا: "میں ایک بوڑھا آدمی ہوں میرے کوئی اولاد نہیں ہے۔ جب میں مرجاؤں تو مہربانی کرکے مجھے دفن کردینا۔ اس کا خرچہ تمھیں کوئی نہ دے گا۔ کیوں کہ میرا کوئی وارث نہیں۔ لیکن میں تمھیں اپنے دفن کے پیشگی اخراجات کے طور پر یہ بھیڑ دے سکتا ہوں۔" گورکن نے اس کی پیش کش منظور کرلی۔ دو مہینے بعد جب میرکمال قبرستان گیا تو وہ اپنی بھیڑ کو پہچان نہ سکا۔ خوب موٹی اور چکنی ہوگئی تھی۔ دم بھی بہت گھنی ہوگئی تھی۔" او ہو اس میں تو کم از کم ایک پوڈ (روسی وزن کا پیمانہ) چربی نکلے گی۔" میرکمال نے سوچا: "اب وقت

ایسا ہے کہ میں اسے واپس لے جاؤں۔ اتنی عمدہ بھیڑ کو کسی ایسے شخص کے کفن دفن کے اخراجات میں دینا جو ہو سکتا ہے کافی عرصے تک نہ مرے، انتہائی بیوقوفی ہے۔"

اس نے گورکن کا دروازہ کھٹکھٹایا "السلام علیکم"

"وعلیکم السلام! کیوں خیریت تو ہے؟" "آہ نہیں" کمال نے رنجیدہ ہو کر جواب دیا۔ "کپلان بیگ کے گاؤں میں ایک لڑکا چیچک سے بیمار پڑ گیا تھا۔ میں نے اسے پارے کا آدھا چمچہ پلا دیا اور وہ مر گیا۔ اب وہاں کے لوگوں نے فیصلہ کیا ہے کہ اس کی سزا کے طور پر مجھے جلا وطن کریں گے۔ اپنا سامان باندھو اور میرے ساتھ چلو۔" "کہاں؟" "کہاں سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ تمہیں بھی یقیناً میرے ساتھ جلا وطن ہونا پڑے گا۔ تم نے خود ہی قسم نہ کھائی تھی کہ مجھے دفن کرو گے؟ کیا تم نے اس کے معاوضے میں یہ بھیڑ نہ لی تھی؟ تمہیں اس جگہ چلنا پڑے گا جہاں میں مروں ورنہ مجھے کس طرح دفن کرو گے؟"

"لعنت ہے تم پر! تمہاری بھیڑ تمہیں مبارک ہو۔ یہاں سے چلے جاؤ۔"

میر کمال اپنی عقلمندی پر مسرور، خوشی خوشی بھیڑ کو لے کر اپنے گھر واپس آگیا۔

جناب خلیل چاخلول

دیگ اور چقندر

ایک مرتبہ ایک پہاڑی درّے پر اخان گاران کے رہنے والے ایک شخص سذن گل تانگا تانگن اور خلیل چاخلول کا سنا سامنا ہوا۔

"آپ کے اخان گاران کی کیا خبریں ہیں؟" خلیل چاخلول نے پوچھا۔

"ہمارے علاقے کے دھانوں کا کام کرنے والے مزدوروں نے ایک بڑی دیگ بنائی ہے جسے لٹکانے کے لیے تین سو دستے لگائے گئے ہیں۔ پہلے دستے کے پاس کھڑا ہونے والا شخص دیگ کے آہنی حصے پر صبح کے وقت ضرب لگائے تو اس کی آواز دوسرے دستے کے پاس کھڑے ہوئے آدمی کو دوپہر میں سنائی دے گی۔"

"واہ! کیا شاندار لوگ ہیں جنہوں نے ایسی دیگ بنائی ہے!"

خلیل چاخلول نے تعریف و تحسین کے لہجے میں کہا۔

"جی اور کیا، اچھا ہاں آپ بھی تو اپنے نامن گن کی تازہ خبریں سنائیے۔"

"دور دراز کے ایک کھیت میں اتنا بڑا چقندر پیدا ہوا ہے جس کے پتوں کے نیچے ایک ہزار گھوڑ سوار دھوپ سے بچنے کے لیے پناہ لے سکتے ہیں۔"

"ہونہہ، بالکل احمقانہ بات! انسان جھوٹ بھی اتنا ہی بولے جو کھپ جائے۔" سذن گل نے کہا۔ "بھلا کون اس بات پر یقین کرے گا کہ ایک چقندر اتنا بڑا بھی ہو سکتا ہے؟"

"پتہ نہیں احمق کون ہے، آپ یا میں۔" خلیل چاخلول نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن ہمارے نامن گن کا چقندر آپ کے اخان گاران کی دیگ میں نہ پک سکے تو آپ لوگوں کی دیگ کا مصرف کیا ہو گا؟"

بشکریہ 'افکار و جائزے'
سوویت دیس

جناب غلام حیدر

پیسہ کی کہانی

تو تم اب یہ جاننا چاہتے ہو کہ میں کہاں سے آیا اور کب آیا؟ تو لو سنو میری کہانی۔ تمھیں میری نئی نئی شکلیں نظر آئیں گی۔ نئے نئے لباس نظر آئیں گے، مگر استعمال بس وہی ایک یعنی میرے بدلے میں ضرورت کی چیزیں لینا۔ وقت بے وقت کے لیے جمع کر لینا تاکہ اس وقت ضرورت کی چیزیں میرے بدلے میں لی جا سکیں۔

مگر میری کہانی سننے سے پہلے تمھیں خود اپنی یعنی انسان کی کہانی تھوڑی سی سنی ہی پڑے گی۔

جانوروں کے بھیس میں

چلو اس وقت سے شروع کریں جب انسان جنگلوں میں رہتے تھے یہ اب سے ہزاروں ہزار سال پہلے کی بات ہے۔ انھیں اب جانوروں کا شکار کھیلنا آگیا ہے۔ پتھروں سے ہتھیار بنا لیتے ہیں۔

دن بھر شکار کھیلتے ہیں اور جہاں رات ہوتی ہے سو جاتے ہیں

تم سوچتے ہوگے کتنا اچھا زمانہ ہوگا نہ بچوں کو اسکول جانے کی فکر نہ صبح اٹھ کر اسکول کا کام کرنے کا دھڑکا۔ مگر نہیں بھائی انسان تو ترقی کرتا رہا ہے اور کرتا رہے گا۔

خیر چلو آگے بڑھیں —— ہزاروں ہزار سال یا اور بھی زیادہ دنوں بعد انسان نے یہ بھی سمجھ لیا ہوگا کہ کچھ جانور ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا صرف مار کر کھانا ہی فائدہ نہیں پہنچاتا، بلکہ ان کو زندہ رکھ کر ان سے دودھ بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔

اب انھوں نے زندہ جانور پکڑ کر پالنا شروع کر دیا۔ اب حالت یہ تھی کہ اگر سو آدمیوں کی ٹولی ساتھ رہتی ہے تو اس کے ساتھ چار یا پانچ سو پالتو جانور بھیڑیں بکریاں، گائیں وغیرہ بھی ہوتے ہیں۔

جہاں اچھا منظر دیکھا، پانی نظر آیا، جانوروں کے لیے ہری ہری گھاس ملی وہیں رک گئے۔ مرد شکار کو چلے گئے عورتیں جانوروں کی دیکھ

بھال میں لگ گئیں۔ اور بچے تمھاری طرح کھیل میں کھو گئے۔

اب تم مانو یا نہ مانو مگر میرا کہنا یہی ہے کہ میرے سب سے بڑے بزرگ ایک ایسی ہی ٹولی میں پیدا ہوئے تھے۔ ایک ٹولی میں ایک شخص بدلی نام کا تھا۔ اس کو پتھر کے ہتھیار بنانے میں بڑی مہارت تھی۔ بڑے خوب صورت بھالے بناتا۔

اس نے پتھروں کو اتنا نکیلا اتنا دھار دار بنا دیا تھا کہ ایک ہی وار میں بڑے سے بڑا جانور بھی زخمی ہو کر بھاگنے کے قابل نہ رہتا۔

کنٹو اسی ٹولی کا ایک اور جوان تھا۔ اس کو شکار میں بڑی مہارت تھی اور شوق ایسا کہ دن دن بھر جانوروں کا پیچھا کرتا رہتا اور اسے ہتھیار بنانے کی فرصت نہ ملتی۔

ایک دن جب اس کے پاس ہتھیار نہ رہے تو وہ بدلی کے پاس گیا۔ اور اس سے دو چار ہتھیار مانگ لیے مگر چند ہی دن بعد اسے پھر ضرورت پیش آئی وہ پھر گیا بدلی نے پھر ہتھیار دے دیئے مگر آخر کہاں تک۔ اسے بھی اپنا پیٹ بھرنے کے لیے شکار کی ضرورت پیش آتی تھی دو ایک بار کے بعد اس نے منع کر دیا

کنٹو واپس آگیا مگر سوچتا رہا کہ بدلی سے کیسے ہتھیار لے، پہلے سوچا کہ بدلی کو مار ڈالوں اور اس کے ہتھیار چھین لوں پھر خیال آیا کہ چھینے ہوئے ہتھیار تو کچھ دن چلیں گے۔ بدلی مر گیا تو ایسے ہتھیار

لوں بنائے گا۔

بہت سوچ بچار کے بعد وہ اس کے پاس گیا
ر اس سے کہا کہ " دیکھو بھائی بدّلی، اگر تم مجھے میری
ضرورت کے ہتھیار دے دو تو میں تمھیں بھیڑوں کی
ں سوکھی کھالیں دوں گا۔ بدّلی نے سوچا، نقصان تو
یں ہے میں ہتھیار اور بنالوں گا مگر میرے پاس دس
دکھی کھالیں آجائیں گی۔ اوڑھنے پہننے کے کام آئیں گی
ہ تیار ہوگیا۔ اس نے کنٹو کو ہتھیار دے دیئے اور
ھالیں لے لیں۔

دینے والا کیا میری دی ہوئی چیز کو لے بھی لے گا۔ کم تو
نہیں سمجھے گا؟ اگر وہ کم سمجھے گا تو فوراً منع کر دے گا
اور اپنی چیز مجھے نہیں دے گا۔

اب میں پھر اپنی کہانی شروع کروں۔ کنٹو اور
بدّلی کے اس سودے میں میرا نام تو کہیں نہیں آیا۔
مگر اگر تم غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ وہ کام شروع
ہوگیا جس میں میں کام آتا ہوں۔ آگے چلو گے تو دیکھو
گے کہ اسی کام میں میرا نام بھی آجائے گا۔

بدّلی اور کنٹو کا لین دین

تو بھائی یہاں سے ایک نئی بات انسان نے
روع کردی ایک چیز کے بدلے میں دوسری چیز لینا۔
چیز کنٹو کے پاس زیادہ تھی تو اس نے بدّلی کو دے
ں اور اس سے اپنی ضرورت کی چیز لے لی۔

مگر اب ایک اور بات انسان نے سوچنا شروع
کہ میں اپنی کتنی چیز کے بدلے میں دوسرے سے
نی چیز لوں۔ ؟ اور پھر ساتھ ہی یہ بھی کہ

مگر اب تم سوچو گے کہ کنٹو اور بدّلی میں یہ
لین دین کہاں اور کب ہوا تھا۔؟ تو بھائی اس کا جواب
یہ ہے کہ صحیح سال کیا صدی بھی نہیں بتائی جاسکتی۔ بس
یوں سمجھ لو ہوا ہوگا یہ لین دین، کچھ نہیں، کچھ نہیں تو دس
ہزار یا پندرہ ہزار سال پہلے۔

اور رہا کہاں کا سوال تو بھائی ایسی بات تو
ہر ملک میں ہوئی ہوگی۔ جہاں بھی انسان ہوگا وہاں ایسا
لین دین ضرور ہوا ہوگا۔ کہیں پہلے کہیں بعد میں۔

(باقی آئندہ)

جناب مقبول احمد سیوہاروی

سفرنامہ ابن بطوطہ

شیخ ابوبکر کے دو بیٹے خانقاہ کے سجادہ ہیں۔ ابوالعباس احمد اور ابو عبداللہ محمد، انھوں نے میری دعوت کی۔ کھانے کے بعد میں نے ہاتھ دھوئے تو دونوں بھائیوں نے میرے ہاتھ کا دھوون خود پیا اور گھر والوں کے پاس بھیج دیا کہ تھوڑا تھوڑا پئیں۔

جن لوگوں کو مقدس سمجھتے ہیں ان کا دھوون متبرک سمجھ کر پینا خیر و برکت کا باعث جانتے ہیں۔ یہ انتہائی ادب اور تکریم کا برتاؤ ہے۔

قاضی ابو ہاشم عبدالملک زبیدی نے دعوت کی تو آفتابہ (لوٹا) اپنے ہاتھ میں لے کر ہاتھ دھلائے کسی دوسرے کو نہ دھلانے دیئے۔

ملک المغیث یہاں کے پہلے بادشاہ کا مقبرہ بھی ابو محمد ابو بکر کے قریب ہے۔ کسی مہینے فوج کی تنخواہ نہیں ملتی تو فوجی ملک المغیث کے مقبرے پر پڑاؤ ڈال دیتے ہیں۔ اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ سب کی تنخواہیں اسی جگہ پہنچا دی جاتی ہیں۔

یہاں سے آدھے دن کی مسافت پر قوم عاد کے مکانات ہیں۔ سمندر کے کنارے ایک مسجد اور ایک خانقاہ ہے اور مچھلی پکڑنے والوں کا ایک گاؤں ہے۔

خانقاہ میں ایک قبر ہے اس پر لکھا ہے کہ "ہود علیہ السلام کی قبر ہے"

دمشق کی مسجد میں بھی ایک قبر پر لکھا ہے کہ "یہ ہود علیہ السلام کی قبر ہے۔" ان دونوں میں اصلی قبر کون سی ہے؟ قیاس چاہتا ہے کہ اصلی قبر یہی ہے ہود علیہ السلام انھی علاقوں میں تبلیغ کرتے تھے اور یہیں رہتے تھے۔

یہاں کیلے کے باغ زیادہ ہیں کیلے کی پھلی خوب بڑی اور موٹی ہوتی ہے۔ ایک بار میں نے تولا تو ایک پھلی کا وزن ڈیڑھ پاؤ تھا۔ ناریل بھی پیدا ہوتا ہے۔ پان کی بیل انگور کی بیل کی طرح لگائی جاتی ہے۔

ہندوستان میں پان کی بڑی قدر ہے کوئی کسی سے ملنے جاتا ہے تو تھالی میں رکھ کر پانچ پان پیش کئے جاتے ہیں۔ کسی امیر یا دولت مند کی طرف سے پان پیش کیا جاتا ہے تو چاندی سونے سے بڑھ کر سمجھا جاتا ہے۔

پان منہ کو خوشبودار کرتا ہے ہاضم ہے اور اس کے کھانے سے فرحت ہوتی ہے۔

ناریل

ناریل آدمی کے سر کے مشابہ ہوتا ہے دونوں

آنکھیں اور منہ کا نشان ہوتا ہے اوپر بڑے بڑے بال۔
توڑو تو گودا بھرا ہوا نکلتا ہے۔

ناریل کی کہانی

ناریل کی یہ کہانی مشہور ہے: ہندوستان کے کسی بادشاہ کے دربار میں ایک بڑا حکیم تھا۔ بادشاہ کے وزیر میں اور حکیم میں دشمنی تھی۔ حکیم اس تاک میں رہتا تھا کہ وزیر کسی طرح بادشاہ کی نظروں سے گر جائے اور بادشاہ اسے قتل کر دے۔

ایک دن حکیم نے بادشاہ سے کہا "جہاں پناہ آپ کا وزیر بہت دانا بڑا عقلمند ہے اس کا سر کاٹ کر دفن کر دیا جائے تو ایک ایسا درخت اُگے گا جس سے ساری دنیا فائدہ اٹھائے گی۔"

بادشاہ نے کہا "یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔"

حکیم بولا "آپ اس کا تجربہ کر لیں۔ میرا کہنا پورا نہ ہو اور درخت نہ اُگے تو فوراً میری گردن کاٹ دی جائے۔"

بادشاہ نے کہا "اگر یہ بات ہے تو میں تجھے وزیر کی جان کا اختیار دیتا ہوں۔"

اور حکیم کے اشارے پر وزیر کی گردن کاٹ دی گئی حکیم نے وزیر کا سر کھرچا اور بھیجے میں کھجور کی ایک گٹھلی دواؤں میں بھگو کر رکھ دی اور سر کو زمین میں گاڑ دیا۔ حکمران دواؤں میں پانی پہنچاتا رہا۔ کچھ دنوں بعد پودا اُگا اور بڑھتے بڑھتے اونچا ہو گیا۔ پھل آئے تو آدمی کے سر جیسے تھے۔ آنکھ اور منہ کا نشان اوپر بال اندر سفید بھیجا۔

یہ کہانی ان علاقوں میں مشہور ہے۔ مگر اس کوئی اصل نہیں ہے۔

ناریل کا پانی میٹھا اور لذیذ ہوتا ہے۔ ناریل سے شہد بھی بناتے ہیں۔ اسے چین اور یمن کے سوداگر خریدتے ہیں۔ ناریل کا دودھ بھی بنایا جاتا ہے اس سے روٹی کھاتے ہیں۔ ناریل کا تیل لگایا جاتا ہے اسے عورتیں سر میں ڈالتی ہیں روٹی سے بھی کھایا جاتا ہے۔

یہاں سے چل کر ہم ماسک پہنچے جہاں عرب لوگ ماہی گیری (مچھلیاں پکڑنے) کا پیشہ کرتے ہیں اور اسی پر ان کا گذارہ ہے۔ ماسک میں کندر کے درخت بکثرت ہیں۔ کندر کے پتے باریک ہوتے ہیں انھیں دبا دیا جائے تو دودھ ٹپک پڑتا ہے اور گوند بن جاتا ہے

ماسک کی مچھلیاں سمندری کتوں کی شکل کی ہوتی ہیں۔ ان کا پیٹ چیر کر سکھا لیتے ہیں یہ لوگ اسے کھاتے ہیں اور اس کی ہڈیوں کا گھر بناتے ہیں۔ ہڈیوں کو چن کر دیواریں بناتے ہیں اور چھتوں پر اونٹ کا چمڑا منڈھ دیتے ہیں۔ تاکہ دھوپ اور پانی سے بچا رہے۔

ماسک سے چلنے کے چار دن بعد بیچ سمندر میں لمعان کی پہاڑی ملی۔ لمعان کی پہاڑی پر مسافروں کے ٹھہرنے کے لیے ایک عمارت بنی ہوئی ہے اس کی چھت مچھلی کی ہڈیوں سے پٹی ہوئی ہے۔

اوپر چڑھ کر ہم عمارت میں پہنچے۔ یہاں ایک بزرگ سو رہے تھے۔ جوں ہی ہم نے سلام کیا بزرگ جاگ اٹھے اور اشارے سے سلام کا جواب

دیا۔ ان کے جسم پر ایک گدڑی تھی سر پر نمدے کی ٹوپی
تھی بات کا جواب اشارے سے دیتے تھے۔ جہاز والوں
نے کھانا پیش کیا تو اشارے سے انکار کر دیا۔ ان کے پاس
ضرورت کا کوئی سامان نہ تھا۔ لوٹا، کٹورا اور جوتا تک
نہ تھا نہ بچاؤ کے لیے ڈنڈا یا لکڑی تھی۔

عصر اور مغرب کی نماز ہم نے انھی کے ساتھ پڑھی
اذان ایسی خوش آوازی سے دی اور نماز ایسی قرأت
سے پڑھائی کہ ہم سب جھومنے لگے۔ عشاء کی نماز کے بعد
ہمیں چلے جانے کا اشارہ کیا۔ اور ہم رخصت ہو کر چلے آئے۔

جزیرہ

دو دن سفر کرنے کے بعد ہمیں جزیرہ طیر ملا۔

اس جزیرے میں کوئی عمارت نہیں ہے ہر جگہ پرندے اڑتے
نظر آتے ہیں شکل و صورت چڑیوں کی سی ہے مگر چڑیوں
سے بڑے ہیں۔

کچھ لوگوں نے ان کے انڈے اٹھائے اور انھیں
پکڑا یا انڈوں کو بھون اور بچے ذبح کیے پکا کر کھانے لگے۔
مجھے اس سے بڑی کراہت ہوئی۔ ایک سوداگر کو جس کا
نام مسلم تھا میں نے خوب جھڑکا۔

میرے پاس کھجوریں اور روغنی روٹیاں تھیں
یہ ختم ہو گئیں تو مچھلیوں پر گذر کی

ظفار کے بیان میں اس نے سلطان ظفار کا ذکر
نہیں کیا۔ یہ یہیں کے بادشاہ کا بھتیجا ہے۔ اس کا ایک وسیع
قلعہ ہے۔ جس کے سامنے جامع مسجد ہے۔ عصر کی نماز کے
بعد اس کے دروازہ پر نقارہ۔ قرنا اور نفیریاں
بجتی ہیں۔

دوشنبہ (پیر) اور جمعرات کو فوج کے جوان محل
کے سامنے جمع ہوتے ہیں۔ اور کچھ دیر ٹھہر کر چلے جاتے
ہیں ___

جمعہ کے سوا سلطان نہ کہیں نکلتا ہے نہ کوئی
اسے دیکھ سکتا ہے۔ صرف جمعہ کی نماز کے لیے باہر آتا ہے
اور نماز پڑھ کر واپس محل میں آجاتا ہے۔

کوئی شکایت ہو یا کوئی ضرورت مند کچھ کہنا
چاہے تو امیر لشکر کو بتا دیتا ہے اور وہ فوراً سلطان سے
جواب لے آتا ہے۔

کبھی کبھی جلوس نکلتا ہے تو سواریاں اور
غلام محل سے نکل کر شہر کے باہر پہنچ جاتے ہیں۔ پھر ایک
اونٹ پر محمل بناتے ہیں۔ اس کے پردے سفید ہوتے ہیں
اور ان پر زری کا کام ہوتا ہے۔ سلطان اور اس کے
مصاحب اسی اونٹ پر سوار ہو جاتے ہیں۔ مگر سب کے سب
پردے میں ہوتے ہیں۔ انھیں کوئی دیکھ نہیں سکتا۔

راستے میں کوئی انھیں دیکھنے کی کوشش کرتا
ہے یا بات کرتا ہے تو خوب پیٹا جاتا ہے۔ اسی لیے جب
بھی سواری نکلتی ہے لوگ ڈر کر بھاگ جاتے ہیں۔

اس کا وزیر فقیہ محمد العدنی ہے بادشاہ کو
اس نے قرأت اور کتابت سکھائی ہے۔ بادشاہ نے اس
سے وعدہ کیا تھا کہ میں اگر بادشاہ بنوں گا تو تجھے اپنا
وزیر بنا لوں گا۔ بادشاہ بن کر وعدہ تو پورا کیا مگر اختیارات
سے محروم رکھا ہے۔

ہمارے جہاز والے صبح و شام مچھلی کا شکار

کرتے ہیں۔ اس مچھلی کو عربی میں "زبدۃ السمک" اور فارسی میں "شیر ماہی" کہتے ہیں نہایت قوی ہوتی ہے۔

ہماری بقرعید جہاز ہی میں ہوتی۔ بقرعید کی صبح سے دن چڑھے تک اتنی تیز ہوا چلی کہ جہاز ڈوبنے کا ڈر ہوگیا۔ ہم سے آگے جانے والا سوداگروں کا جہاز ڈوب گیا صرف ایک آدمی بچا۔

یہاں کے سوداگروں نے عجیب قسم کا کھانا مجھے کھلایا۔ جوار کو پکایا پھر دودھ میں ڈال کر خوب گرم کیا اور کھیر جیسی چیز بنالی گھٹ کر سب چیزیں ایک ذات ہوگئیں تو کھجور کا شیرہ ڈال کر کھایا

قصیریہ

یہاں سے چل کر قصیریہ آگیا یہ جزیرہ ساحل سے دور تھا۔ اسی لیے میں اندر نہ گیا اور جہاز پر رہا۔ جزیرے کا مالک جہاز پر تھا۔ اتر کر چلا گیا اور ایک دن رہ کر جہاز پر واپس آگیا۔ ہم لوگ ساحل پر ٹھہرے رہے۔ جہاز ایک رات دن چلتا رہا پھر صور ہوتے ہوئے قلہات پہنچ گئے۔

قلہات

اچھی خاصی بستی ہے۔ پہاڑی پر آباد ہے۔ جہاز میں بیٹھے بیٹھے جی گھبرا گیا تھا۔ جہاز کے ایک آدمی کو اُجرت دی کہ ہمیں راستہ بتا کر بستی تک پہنچا دے۔

جس وقت جہاز کنارے پر لگا تھا۔ دن کا ایک بجا ہوگا۔ جہاز کے مسافروں نے کہا آپ کا عصر سے پہلے آنا مشکل ہے۔ میں نے کہا کچھ ہو میں بستی تک ضرور جاؤں گا۔

میرے ساتھ ایک ہندی تھے جنھیں ہم سب مولانا کہتے تھے۔ میں نے اپنا سب سامان راستہ بتانے والے کو دے دیا اور برچھا ٹیکتا ہوا ساتھ چل دیا۔

راستے میں ایک خلیج (کھاڑی) پر جہاں جوار بھاٹا تھا۔ راستہ بتانے والا رک گیا اور ہم سے کہا پانی سے اتریئے۔ یہ ہمیں دھوکہ دے کر ڈبو دینا چاہتا تھا۔ تاکہ ہمارا سامان لے کر بھاگ جائے ہم اس کی نیت بھانپ گئے۔ میں نے کہا سامان کنارے پر چھوڑ کر پہلے تو پار اتر جا۔ میں نے اس کے بدلے ہوئے تیور دیکھے تو برچھے کو حرکت دی اور وہ ڈر گیا۔ پھر ہم اوپر چڑھ گئے اور ہمیں راستہ مل گیا مگر جنگل میں دور تک پانی کا پتہ نہ تھا پیاس سے بُرا حال تھا۔ وہ تو خیر ہوگئی کہ ایک سوار آگیا۔ اس کے پاس پانی کی صراحی تھی میں نے اور مولانا نے پانی پیا تو جان میں جان آئی۔

آپ کا پیارا رسالہ "پیام تعلیم" ہر ماہ کی ۲۵ تاریخ کو چھپ کر تیار ہو جاتا ہے اور ہم بہت احتیاط سے ہر پیامی کے نام پرچہ جلد سے جلد بھیج دیتے ہیں۔ اگر رسالہ آپ کے پاس ۵۔ ۶ تاریخ تک نہیں پہنچتا تو سمجھ لیجیے کہ آپ کی ڈاک میں کچھ گڑبڑ ہے۔ اس لیے پہلے آپ اپنے ڈاک خانے سے شکایت کیجیے اور بعد میں ہم سے۔

منیجر

جناب نثار اعظمی

سہانا خواب

امّی جب میں رات کو سویا
تب میں نے یہ خواب میں دیکھا
مجھ کو ایک پری نے آکر
پھولوں کی مالا پہنا کر
لے کے اڑی تاروں کے چمن میں
مجھ کو اتارا نیل گگن میں
پاس وہیں اک باغ ہرا تھا
جس میں صرف گلاب اگا تھا
بیچ میں فوارہ جاری تھا
حوض میں کومل پھول کھلا تھا
آگے عالیشان محل تھا
جس میں کافی شور و غل تھا
میں بھی پہنچا اس کے اندر
دیکھا بچوں میں اک رہبر
رچی بسی تھی واں پہ خوشبو
کھڑے تھے وہ تو چاچا نہرو
پہلے ہم کو پیار وہ کرتے
پھر اک اک گلاب بھی دیتے
کہتے تھے اے پیارے بچو
تم ہو میرے دلارے بچو
ماں باپ اور استاد کی باتیں
تم سب کے ہیں کام کی باتیں
پڑھتے رہو تم جی کو لگا کر
تم ہو امن و اماں کے پیمبر
اپنے دیس کی خاطر جینا
اپنے دیس کی خاطر مرنا

قربانی

جناب اظہر افسر

کام کرنے والے :-

بابر
ہمایوں
طبیب
تیغ خاں
درباری امیر

[مغل طرز کے شاہی محل کا ایک حصہ، ہمایوں بستر پر پڑا کراہ رہا ہے ۔
بستر کے پائینتی سبز مخمل کی جائے نماز بچھی ہے ۔
پلنگ کے سرہانے بابر بیٹھا ہے، ایک طرف طبیب صاحب بیٹھے ہمایوں کی نبض دیکھ رہے ہیں ۔
بالکل سامنے ایک درباری امیر ہاتھ باندھے کھڑا ہے ۔
پردہ اٹھتا ہے تو کوئی حرکت نہیں ہوتی صرف آواز سنائی دیتی ہے ۔

آواز آج سے چارسو سینتیس ۴۳۷ برس پہلے کا زمانہ ہے، اور جس رات کی یہ بات ہے وہ ۲۶ دسمبر سنہ ۱۵۳ کی ایک بھیانک رات ہے، باہر موسلادھار بارش ہو رہی ہے۔ ہوائیں شائیں شائیں کر رہی ہیں۔ شہزادہ ہمایوں بستر پر پڑا کراہ رہا ہے ۔]

ہمایوں آہ — آہ — آہ ۔

بابر طبیب صاحب اب کیا حال ہے ہمارے شہزادے کا ۔

طبیب عالی جاہ شہزادہ کی حالت بیان سے باہر ہے، خود میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیسا سخت عارضہ ہے، میں صبح سے تین بار دوا بدل چکا ہوں اور مرض میں ذرا افاقہ نہیں ۔

بابر خدایا تو رحم کر۔ طبیب صاحب آپ تو جانتے ہیں۔ دنیا میں سب سے زیادہ عزیز کوئی چیز ہیں ہے

تو وہ ہمارا فرزند ہمایوں ہے ۔

طبیب بے شک عالی جاہ ۔

بابر بڑی دیر سے ہم دیکھ رہے ہیں کہ آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں اور اپنے دل کی بات بیان کرنے سے ہچکچا رہے ہیں ۔

طبیب عالی جاہ ۔

بابر آخر کیا بات ہے، ہم سے آپ کیا چھپا رہے ہیں، خدا گواہ ہے اس وقت ہم بڑی سے بڑی اور منحوس سے منحوس خبر سننے کو تیار ہیں، طبیب صاحب ۔

طبیب عالی جاہ، ابھی ابھی میں نے دوا پھر بدلی ہے، اگر دو گھنٹے کے اندر اندر شاہزادے نے آنکھیں کھول دیں تو وہ خطرہ سے باہر ہے ورنہ ۔

بابر نہیں نہیں طبیب صاحب ہم اس سے آگے کچھ اور نہیں سن سکتے ۔ شہزادے کو آنکھیں کھولنی ہوں گی، ہمارے ہمایوں کو ہوش میں آنا ہوگا ۔

طبیب دوا اپنا اثر تو ابھی شروع کردے گی لیکن دو گھنٹے بعد ہی شاہزادے کی حالت کا صحیح اندازہ کیا جاسکتا ہے ۔

بابر تو پھر ہم بھی دو گھنٹے تک اس مالک کے حضور میں رہیں گے جس کے ہاتھوں میں ہمارے شاہزادے کی اور دنیا کے سارے جانداروں کی زندگی ہے ۔ جو پل بھر میں بے جان کو جان دار بناتا اور آنکھ جھپکتے میں ساری دنیا کو تاراج کرسکتا ہے ۔ اے رب العالمین، اے خداوندا، اپنا رحم فرما ۔ رحم فرما ۔

(بابر پلنگ سے اٹھ کر جائے نماز پر پہلے دوزانو ہوتا اور پھر سجدہ میں چلا جاتا ہے ———)

(درباری امیر اور بابر کے درمیان ایک ریشمی پردہ حایل ہوجاتا ہے)

(بائیں جانب سے فوجی لباس میں سردار تیغ خاں داخل ہوتا ہے)

امیر عالی وقار سردار تیغ خاں دم بھر کے لیے رک جائیں ، تخلیہ ہے ۔

تیغ خاں مجھے فوراً شہنشاہ کے حضور میں پہنچنا ہے، کابل سے خبر آئی ہے کہ سعید خاں نے کابل پر قبضہ کرلیا ہے، بڑا اہم معاملہ ہے ۔

امیر اس وقت شہنشاہ اپنے پیدا کرنے والے کے حضور میں ہیں سردار، اور اُن کے آگے اس سے کہیں زیادہ اہم معاملہ درپیش ہے ۔

تیغ خاں کیا کہہ رہے ہیں آپ ؟

امیر اب شہنشاہ کے آگے سلطنت، دولت، حشمت، عزّ و جاہ سب ہیچ ہیں ۔

تیغ خاں (لمبا سانس لیتا ہے) اُف، کتنی دیر انتظار کرنا ہوگا ۔

امیر دو گھنٹے سے پہلے شہنشاہ کسی کو باریاب نہیں ہونے دیں گے، آپ اس طرف ایرانی قالین پر تشریف رکھیں، میں خود بھی دو گھنٹے سے پہلے اندر قدم نہیں رکھ سکتا ۔

تیغ خاں شہزادہ ہمایوں کی طبیعت کیسی ہے ۔

امیر بے حد خراب ہے، شہنشاہ اپنے نورِ نظر ہی کی خاطر اس قدر پریشان ہیں، طبیب صاحب نے کہا ہے کہ دو گھنٹے کے بعد شہزادہ نے آنکھیں نہ کھولیں تو پھر........

غ خاں پھر ؟

میر میرے منہ میں خاک، وہ پھر کبھی بیدار نہ ہوسکیں گے۔

غ خاں یا خُدا ۔

یر وہ شیرِ فرغانہ جس کی غراہٹ سے دشمن کے دل
دہل جاتے ہیں ۔ اُس بہادر سورما کا دل اس قدر
موم کی طرح نرم ہوسکتا ہے یہ میں نے خواب
میں بھی نہ سوچا تھا۔

غ خاں عالی جاہ چھٹی پشت میں تیمور صاحبقران کے پوتے
ہیں، اور ننھیال کی طرف سے آپ کا رشتہ کوئی
چودہ ۱۴ پشت پر چنگیز خاں سے ملتا ہے ۔

یر وہی تیمور صاحبقراں جس نے ۱۳۹۸ء میں ہندوستان
پر آندھی کی طرح حملہ کرکے ہر طرف افراتفری
پھیلادی تھی ۔

غ خاں ہاں ان دنوں شاہ تیمور کی سلطنت ہندوستان کی
سرحدوں سے شروع ہوکر عراق تک پھیلی ہوئی تھی۔
لیکن تیمور کے انتقال کے بعد اس سلطنت کا شیرازہ
بکھر گیا، بیٹوں نے سلطنت کے حصے بخرے کرکے
آپس میں بانٹ لیے ۔

یر صاحبقراں کے بیٹوں کے نام ؟

غ خاں عمر شیخ مرزا اور الغ بیگ، فرغانہ پر عمر شیخ مرزا
اور کابل پر الغ بیگ کا قبضہ ہوگیا ۔ حضرت عمر
شیخ مرزا کے بعد عالی جاہ سلطنت کے بادشاہ بن سکے۔

یر سنا ہے عالی جاہ کو بڑی کم سنی میں تخت وتاج
کا بوجھ سنبھالنا پڑا ۔

غ خاں ہاں والد کے انتقال کے وقت عالی جاہ کی عمر
صرف بارہ سال تھی، لیکن اپنی اس چھوٹی سی
عمر کے باوجود ان دنوں بھی وہ اپنے دادا
کی طرح نہایت دلیر اور جفاکش تھے سب سے
پہلے عالی جاہ نے اپنی اسی عمر میں کابل کو فتح کرکے
وہاں اپنی حکومت قایم کی اور پھر......

امیر اور پھر — ؟

تیغ خاں کابل کے بعد سیدھے عالی جاہ نے پنجاب کا رخ
کیا، یہاں پنجاب کے ایک حاکم دولت خاں لودی
اور میواڑ کے رانا سنگرام نے عالی جاہ کا استقبال
کیا، ہندوستان پر جب عالی جاہ نے حملہ کیا تو
ان کے ساتھ صرف بارہ ہزار سپاہی تھے مگر سب
کے سب ....

امیر صرف بارہ ہزار

تیغ خاں ہاں مگر سب کی سب جنگی ہتھیاروں
سے لیس اور لڑائی کے گُر سے واقف، جیوٹ اور
مرنے مارنے پر تیار ۔

امیر دلی پر ان دنوں ابراہیم لودھی کی حکومت تھی جب
ابراہیم لودھی نے بابر کے آنے کا حال سُنا تو
ایک لاکھ سپاہیوں کی فوج لے کر وہ بابر کے مقابلے
کے لیے شمال کی جانب چلا ۔

تیغ خاں اس لڑائی میں بندہ کو بھی سر سے کفن باندھ لینے کا
فخر حاصل ہے، ۲۱ اپریل ۱۵۲۶ء کو دونوں فوجوں
کا مقابلہ پانی پت کے یادگار میدان میں ہوا تھا ۔
بڑی گھمسان کی لڑائی چھڑی تھی ۔ عالی جاہ کی
فوج نہایت مختصر تھی پھر بھی ان فوجوں نے کچھ
اس طرح ڈٹ کر لودھی فوجوں کا مقابلہ کیا کہ
لودھی فوج کے قدم اکھڑ گئے اور

امیر اور حاکمِ وقت ابراہیم لودھی مارا گیا۔

تیغ خاں اس پانی پت کی لڑائی نے ہندوستان کی

قسمت کا فیصلہ کر دیا اور ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کی بنیاد پڑ گئی ۔

امیر دلی اور آگرہ کے علاقوں پر فوری قبضہ کے بعد عالی جاہ نے شہزادہ ہمایوں کو اطراف واکناف کے علاقوں کی جانب فوج دے کر روانہ کیا تاکہ سارا ہندوستان مغل سلطنت کے حدود میں آجائے ۔

تیغ خاں میواڑ کے رانا سنگرام سنگھ جو رانا سانگا کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آسکا کہ کیوں انھوں نے عالی جاہ کو ہندوستان آنے کی دعوت دی ۔

امیر یہ راز میں جانتا ہوں کہ کیوں رانا سانگا نے عالی جاہ کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی، رانا سانگا دلی کے حکراں بادشاہ ابراہیم لودھی میں بڑے زمانے سے سخت دشمنی چلی آتی تھی۔ ابراہیم لودھی کے خاتمہ ہی کے لیے رانا سانگا نے عالی جاہ کو ہندوستان آنے کا پیام بھیجا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ

تیغ خاں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ؟

امیر رانا سانگا کا یہ مقصد بھی نہیں تھا کہ عالی جاہ ابراہیم لودھی کو شکست دے کر خود دلی کے بادشاہ بن بیٹھیں، اسی لیے رانا سانگا نے عالی جاہ کے خلاف تلوار اٹھائی، رانا سانگا جیسا بہادر بھی ہندوستان نے شاید ہی پیدا کیا ہو۔

تیغ خاں عالی جاہ کے مقابلے کے لیے رانا سانگا نے ایک ایسی فوج تیار کی جس میں پانچ سو ہاتھی اسّی ہزار گھوڑے سوار اور بے شمار پیدل سپاہی تھے۔

امیر ادھر عالی جاہ شہنشاہ بابر کو ہندوستان کے نجومیوں نے طرح طرح سے ڈرایا کہ اگر بابری فوج رانا سانگا کا مقابلہ کرے گی تو بری طرح ہار جائے گی اور عالی جاہ کی فوجوں میں طرح طرح کی پیشن گوئیوں کے ذریعہ پریشانی پھیلانے کی کوشش کی

تیغ خاں لیکن اس وقت بھی ہمارے شہنشاہ نے صرف اپنے پیدا کرنے والے پر بھروسا کیا، اور اُسی سے ہر طرح کی مدد مانگی عالی جاہ کو فتح نصیب ہوئی ۔

امیر اس عقلمندی کی دُور دُور تک تعریف ہو رہی ہے۔ کہ عالی جاہ نے اپنے جیتے ہوئے سارے علاقوں میں امن و سکون قایم رکھنے کے لیے انھیں کئی حصّوں میں تقسیم کر کے ایک ایک جاگیر کے طور پر مقامی افسروں کے سپرد کر دیا ۔

تیغ خاں عالی جاہ نے شہزادے کو توازبکوں کی سرکوبی کے لیے بدخشاں روانہ کیا تھا ۔

امیر عالی جاہ کے حکم کے مطابق شہزادے نے ایک بہت بڑی فوج کے ساتھ سمرقند پر چڑھائی کی لیکن جب....

تیغ خاں جب ؟

امیر یہ بڑی راز کی بات ہے، کہتے ہیں شہزادہ کی والدہ ملکہ ہما خانم نے شہزادہ کو ایک ایسی خبر پہنچائی کہ وہ جلد سے جلد ہندوستان لوٹ آئے ورنہ ہندوستان کا تخت و تاج کسی اور کے قبضہ میں چلا جائے گا ۔

تیغ خاں کسی اور کے قبضے میں، کس کے قبضے میں ۔

امیر کچھ دنوں سے یہاں یہ افواہ گرم تھی کہ عالی جاہ اپنے داماد خواجہ محمد مہدی کو اپنا جانشین بنانے والے ہیں ۔

تیغ خاں — شاید اسی لیے شہزادہ والا جاہ بغیر عالی جاہ کا حکم لیے سمرقند سے واپس لوٹ آئے

امیر — ہاں اور جب شہزادہ کی واپسی کی اطلاع عالی جاہ کو ملی تو عالی جاہ نے آگرے سے قریب سنبھل میں شہزادہ کو قید کروانے کا حکم جاری کر دیا۔ اور اسی قید میں جانے شہزادے کے دل پر کیا گزری کہ وہ سخت بیمار ہو گئے اب تو سارے طبیبوں نے جواب دے دیا ہے، اللہ اپنا رحم کرے۔

(درمیان کا ریشمی پردہ ہٹ جاتا ہے)

بابر جائے نماز سے اٹھ کر پلنگ کے سرہانے بیٹھ جاتا ہے۔

بابر — یا الٰہی تو رحم فرما۔ لوگ ہمیں طعنہ دیتے ہیں کہ ہمیں اپنی ذات کے سوا کسی سے محبت نہیں۔ مگر تو ہمارے دل کا حال جانتا ہے خدایا رحم کر، طبیب صاحب —— کیا حال ہے ہمارے شاہ زادے کا

طبیب — عالی جاہ۔

بابر — خدا کے لیے اس طرح سر نہ ہلائیے، نہیں نہیں نہیں ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔

اے رب العزت آج تیرے حضور میں تیرا ایک ادنیٰ غلام ایک حقیر ناچیز ہستی تجھ سے رحم کی بھیک مانگ رہی ہے۔

طبیب — صبر کیجیے عالی جاہ صبر کیجیے۔

بابر — خداوندہ اس وقت تیرے حضور میں وہ انسان گڑگڑا رہا ہے جو دو بڑے بڑے پہلوانوں کو اپنی اپنی بغلوں میں دبائے قلعہ کی دیواریں پھاندا کرتا تھا، گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر بھوکا پیاسا سو سو میل کا سفر ایک دن میں طے کیا کرتا تھا، جس نے بڑی سے بڑی مصیبت کا ہنستے ہوئے مقابلہ کیا۔ آج مجبور و لاچار تیرے حضور میں اپنے بیٹے کی زندگی کی بھیک مانگ رہا ہے۔

(بابر اٹھ کر پلنگ کے اطراف چکر لگانے لگتا ہے)

طبیب — عالی جاہ پلنگ کے گرد گھومنا صدقے ہونا ہے۔

بابر — ہم اپنے شاہ زادے پر سے صدقے ہی ہو جانا چاہتے ہیں۔ طبیب صاحب قربان ہو جانا چاہتے ہیں۔ ہمیں سلطنت، دولت، عزت و حشمت کچھ نہیں چاہیے۔ اگر اس کی زندگی کے بدلے ہمیں اپنی جان کی قربانی بھی دینی پڑے تو خدا گواہ ہے ہم اس کے لیے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ خدایا تو میری باقی زندگی نذرانے کے طور پر قبول کر اور میری زندگی میرے ہمایوں کو بخش دے، اس کی جان کے بدلے میری جان قبول کر لے۔ مجھے ختم کر دے۔ میرے ہمایوں کے مردہ جسم میں جان ڈال دے۔ خدایا —— خدایا —— خدایا......

ہمایوں — (کراہتا ہے) آہ — آہ — آہ۔

طبیب — عالی جاہ۔ عالی جاہ شہزادے نے آنکھیں کھولدیں، شہزادہ عالم ہوش میں آگئے۔

بابر — میرا ہمایوں، میرا شہزادہ۔ ہمایوں۔

طبیب — عالی جاہ۔

بابر — طبیب صاحب مغل سلطنت کو اس کا

وارث مبارک ہو، مبارک ہو۔

طبیب عالی جاہ یہ آپ کو کیا ہوگیا، آپ کا چہرہ اترتا جارہا ہے، رنگ پیلا پڑ رہا ہے۔

بابر طبیب صاحب آپ بالکل نہ گھبرائیے۔ خدا نے ہماری دعائیں سن لیں، خدا نے ہماری قربانی قبول کرلی۔ ہم نے اپنے پیارے بیٹے ہمایوں پر اپنی جان قربان کردی،

(اسی پلنگ پر گر پڑتا ہے)

طبیب عالی جاہ۔

بابر اللہ — آہ — اللہ۔

(کراہتا ہوا دم توڑ دیتا ہے)

(پردہ گرتا ہے)

لطیفہ

خاتون۔ میں نے سنا ہے کہ آپ معمولی سے سوالات کرکے لوگوں کی ذہانت کا پتہ لگا لیتے ہیں؟

حکیم۔ جی ہاں، مثلاً کپتان کوک نے تین مرتبہ دنیا کا سفر کیا اور ایک سفر کے دوران اس کا انتقال ہوگیا۔ بتائیے وہ کون سے سفر میں مرا

خاتون۔ افسوس کہ مجھے تاریخ سے لگاؤ نہیں ہے۔

جناب شاہد قمر افریدی

لطیفے

(امتحان کے کمرے میں)

نگہبان یا نگران: بار بار تم پیچھے مڑ کے کیا دیکھتے ہو؟
طالب علم: میرے پرچے میں لکھا ہے "براہ کرم پیچھے دیکھیے۔"

ماسٹر: چاند تم بتاؤ "ہمارا ملک کب آزاد ہوا؟"
چاند: ...جی... میں تو ان دنوں پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔"

بزدل سپاہی: (بڑے غرور سے) کرنل صاحب میں نے لڑائی میں ایک چینی دشمن کے پیر کاٹ ڈالے...
کرنل: (غصہ سے)...ہوں... ! پیر کاٹنے سے کیا فائدہ اس کا سر کیوں نہیں کاٹا؟
سپاہی: صاحب اگر سر سلامت ہوتا تو وہ مجھے اپنے پاؤں کیوں کاٹنے دیتا.....!

ماسٹر صاحب: موہن بتاؤ اس نقشے میں گنگا جمنا ندی کہاں ہیں
"سر... دونوں آمنے سامنے ہیں۔"

دو دوست ساتھ ساتھ جا رہے تھے۔ ایک دوست نے اپنے سامنے سے گزرتے ہوئے ایک شخص سے کہا۔۔
"سلام... منشی جی"
منشی جی بھویں سکیڑتے ہوئے سلام کا جواب دیے بغیر آگے بڑھ گئے تو دوسرے ساتھی نے پوچھا
"یہ کون ہیں، سلام کا جواب تک نہیں دیتے؟"
"میرے پڑوسی ہیں، کبھی کوئی چیز نہیں دیتے۔"

ایک صاحب بارش میں بھاگتے ہوئے جا رہے تھے۔ خاں صاحب جو کسی دکان کے چھپر کے نیچے کھڑے تھے، دیکھ کر بولے۔۔
"ولے... تم اللہ کی رحمت سے ڈر کر بھاگتا؟"
ان صاحب نے برجستہ جواب دیتے ہوئے کہا... "ہم اسی لیے بھاگتا کہ اللہ کا رحمت پاؤں کے نیچے آتا۔"

جناب جمشید اشرف

لطیفہ

موسیٰ نام کا ایک عربی شخص تھا جو فجر کی نماز ادا کرنے کے لیے وضو کر رہا تھا۔ وضو کرتے وقت اس کو اشرفیوں سے بھری ہوئی تھیلی ملی۔ اسی وقت جماعت کھڑی ہو گئی۔ اس نے جلدی سے وضو کیا اور تھیلی اپنی سیدھی بغل میں دبالی اور نیت باندھ لی۔ مولوی صاحب نے الحمد شریف کے بعد یہ آیت پڑھی وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يَا مُوسَىٰ (اور اے موسیٰ تیرے سیدھے ہاتھ میں کیا ہے) موسیٰ نے اسی وقت تھیلی مولوی صاحب کے سامنے ڈال دی اور بولا خدا کی قسم آپ تو جادوگر ہیں۔

(عربی سے)

بچوں کا جسم تیزی سے بڑھے اور لباس تنگ ہو جائے تو دھوبی کا کیا قصور...

جب مسز ترنک دھوبی سے ساز باز کرلیں تو سمجھ لیجئے کہ لباس کے سکڑ کر تنگ ہو جانے کی مصیبت کا سامنا ہے۔ لہٰذا جب بھی آپ بچوں کے لباس کے لئے مضبوط اور دیرپا سوتی کپڑے یا سوت ملے ہوئے کپڑے خریدنا چاہتے ہوں تو ہمیشہ 'سینفورائزڈ' کی مہر پر اصرار کیجئے

یہ مشہور ٹریڈ مارک جو دنیا بھر میں جانا پہچانا اور خاص کر ہندوستانی کپڑوں کی غیر ملکوں میں برآمد کو بڑھا رہا ہے، آپ کا لباس سکڑ کر تنگ ہونے کی ضمانت ہے۔ اس پر بھروسہ کیجئے 'سینفورائزڈ' چھاپ والے کپڑوں کو سلوانے سے پہلے پانی میں بھگونے کی ضرورت نہیں ہوتی لہٰذا ہر کپڑا جو آپ خریدیں اس پر اس مہر کو ضرور دیکھ لیجئے۔

کلوئٹ، پی باڈی اینڈ کمپنی انکارپوریٹڈ (محدود ذمہ داری کے ساتھ یو ایس اے میں تشکیل شدہ) کا مالکانہ رجسٹرڈ ٹریڈ مارک 'سینفورائزڈ'۔ اس ٹریڈ مارک کو یہ مالکان استعمال کرتے ہیں یا ان رجسٹرڈ استعمال کرنے والوں کو [illegible] لگے ہوئے کپڑوں پر اس کے استعمال کی اجازت دے رہے ہیں جو ان کے مقرر کردہ اصل معیار کو قائم رکھتے ہیں

محترمہ سلمیٰ جاوید

گڈا بنائیں
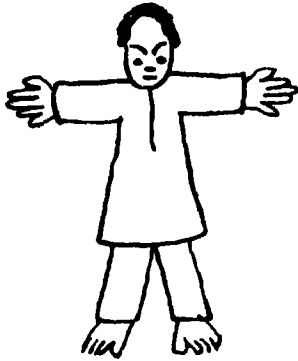
"اوں، اوں۔ اوں۔"
"ننھی او، ننھی اے بیٹی خیر تو ہے۔ کیوں رو رہی ہو؟"
"امی، اوں، اوں، اوں۔ مجھ سے بے بی نے اپنی گڑیا چھین لی۔"
"گڑیا کس کی تھی؟"
"اوں، اوں، اوں۔ وہ تو امی۔ بے بی اپنی نانی جان سے بنوا کر لائی ہیں۔"
"تو تم کیوں رو رہی ہو اس کی گڑیا کے لیے؟"
"امی، ہم دونوں تو روز اس گڑیا سے کھیلتے تھے۔"
"پھر آج کیا بات ہوئی؟"
"امی، آج بے بی نے کھیلتے کھیلتے اپنی گڑیا اٹھائی اور کہا "ہم جا رہے ہیں۔"
"بھئی کھیل تو جبھی تک اچھا لگتا ہے جب تک دوسرا بھی خوشی سے کھیلے۔"
ہم تو بے بی کی خوشامد کر رہے تھے امی کہ وہ تھوڑی دیر اور ہمارے ساتھ گڑیا کا کھیل کھیلے مگر وہ نہ مانی۔"
تو بے بی کو کوئی کام رہا ہوگا کسی کو مجبور کر کے کھیل تھوڑے کھیلا جاتا ہے۔"
(بے بی واپس آکر ننھی کی امی سے فریاد کرتی ہے)
خالہ جان، خالہ جان۔ دیکھیے ننھی نے میری گڑیا کی ٹانگ نوچ ڈالی اور اس کا دوپٹہ مسل کر خراب کر دیا۔"
"ننھی تو ابھی کہہ رہی تھیں کہ بے بی نے اپنی گڑیا اٹھالی۔"
"امی جب بے بی نے گڑیا اٹھالی اور میں نے ان سے کہا کہ آؤ بہن ابھی تھوڑی دیر اور کھیلیں تو یہ نہ مانیں۔ گڑیا لے کر چلنے لگیں تو میں نے ان کو بٹھانے کے لیے گڑیا کی ٹانگ پکڑ کر کھینچی۔ انھوں نے بھی زور لگایا۔ گڑیا میرے ہاتھ میں چلی آئی۔ مگر اس کی ٹانگ نچ گئی اور دوپٹہ ان کے ہاتھ میں رہ گیا۔ اور مسل گیا۔"
"ننھی بیٹی! دوسرے کی چیز خراب نہیں کرتے اور پھر کھیلنے والی چیز کو تو اور بھی سنبھال کر رکھتے ہیں"
"بیٹی بے بی! تم غم نہ کرو۔ ابھی ہم تمھاری

گڑیا کی ٹانگ ٹھیک کیے دیتے ہیں اور اس کا دوپٹہ
بھی سنوارے دیتے ہیں۔"
"ننھی میری قینچی لے آؤ۔"
پہلے بے بی کی گڑیا کی ٹانگ درست کر دوں۔
پھر ننھی کے لیے ایک گڈا بنا دوں بس تم دونوں مل کر اس
کا بیاہ رچانا۔"
"ہاں ہاں میری اچھی امی آپ میرے لیے اچھا
سا گڈا بنا دیجیے۔"
"لو ـــــ سوئی تاگے سے پہلے میں نے گڑیا کی
ٹانگ ٹھیک کر دی اب ذرا آیرن (استری) لے آؤ
اس کا دوپٹہ چمکا دوں۔"
"دیکھو تمھاری گڑیا پہلے کی طرح سج گئی نا۔"
"ہاں خالہ جان۔ یہ تو سچ مچ پہلے کی طرح ہو گئی۔"
"اور امی میرا گڈا؟"
"تمھارا گڈا ابھی کیسے بنے گا۔ ابھی تو گھر کا کام پڑا ہے!"
اُوں، اُوں امی مجھے اچھا سا گڈا بنا دیجیے۔
میری اچھی امی۔"
"دیکھو پھر تم نے رونے اور ضد کرنے والی
بات شروع کی میں تم کو گڈا آج ہی بنا دوں گی۔"
"نہیں امی ابھی بنا دیجیے۔"
"اچھی بات ہے مگر اس کے لیے کپڑا ڈھونڈھنا
پڑے گا۔"
"امی میں کپڑا آپ کی الماری میں سے تلاش کیے
لاتی ہوں۔"
"نہیں۔ نہیں نہیں تم نہ جاؤ۔
سارے کپڑے الٹ پلٹ کر رکھ دو گی اور پھر مجھے
گھنٹوں انھیں ٹھیک سے رکھنے میں لگ جائیں گے۔
اور پھر تمھارا گڈا بھی آج نہ بن سکے گا۔"
"نہیں امی ـــ اچھی امی آج ہی گڈا بنا دیجیے۔"
"ہاں ہاں کہہ تو رہی ہوں کہ آج ہی گڈا بنا
دوں گی اور تم کو بھی بنانا سکھا دوں گی۔"
"خالہ جان مجھے بھی سکھا دیجیے۔"؟
"ہاں بے بی تم بھی آجانا۔ شام کو چار بجے پھر
تم دونوں کو گڈا بنانا بتا دوں گی۔"

"یہ دیکھو ایک فٹ لمبا اور چھ انچ چوڑا کپڑا
ہے۔"
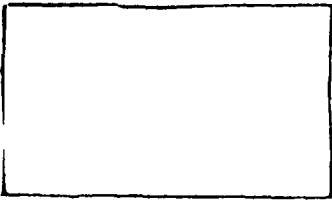
"مگر امی یہ تو بہت پرانا کپڑا ہے جگہ جگہ سے
کٹا ہوا ہے۔"
"کیا حرج ہے ابھی تو تمھارے گڈے کا
صرف دھڑ بنانا ہے نا۔ اس کے لیے کیا نیا کیا پرانا۔"
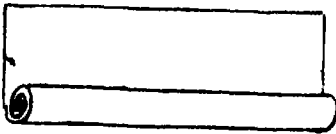
اس کو چوڑائی میں رول کر کے خوب
کس کر لپیٹ دو۔ دیکھو اس طرح میز پر رکھ کر
ہاتھوں سے دبا کر دور تک رگڑ دو تاکہ خوب

سخت بتی سی بن جائے۔"

"دیکھو یہ ہوگئی نا بتی۔ اب سوئی اور دھاگے سے کنارے کے کپڑے کو اس طرح سے سلائی کرکے مضبوط کر دو۔"
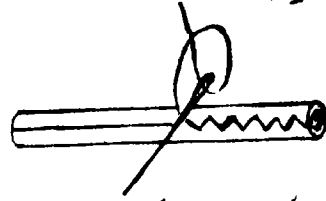
اب اس کو بیچ سے موڑ کر دونوں سرے ملا دو۔ دیکھو ایسے مل گئے یہ۔"

اب اس کے نیچے کے دونوں سرے پیر دل کا کام دیں گے۔ اور اوپر سے ہم بنانا شروع کریں گے۔ ڈیڑھ انچ میں اس کا سر اور گردن اور ڈیڑھ انچ میں اس کا پیٹ اور کمر۔ باقی تین انچ میں اس کی ٹانگیں۔"

"اور خالہ جان اس کے دونوں ہاتھ۔"

"ہاں بھئی ہاتھ بھی بنیں گے۔"

"اب ایک کپڑا یہ لو۔ یہ پانچ انچ لمبا اور تین انچ چوڑا ہے۔ اس کو بھی پہلے کی طرح گول کر کے لپیٹ لو۔ مگر خوب کس کر۔ اور یوں اس کی سلائی کرو۔"

"ہاں تو کیسا گڈا چاہیئے تم کو بالوں والا یا منڈا؟"

"نہیں امّی بالوں والا گڈا لیں گے۔ منڈا (گنجا) کس کام کا۔ اگر منڈا رہا تو سب لوگ اس کے سر پر چپتیں ماریں گے۔"

ہاں بھئی یہ بات تو ہے۔ اچھا دیکھو اوپر کے حصّہ پر سر سے گلے تک ایک دوسرا کپڑا لپیٹ کر سارے بدن سے کچھ موٹا کر دو۔ اس طرح سے۔ اور سلائی کرو۔ ہوگیا نا!"

"اب اس کے سر والے حصّہ کو دو اور حصّوں میں بانٹ دو۔ اگلا حصہ منھ والا۔ دوسرا حصّہ بالوں والا۔ پہلے کالے دھاگے سے اس کے بال ہی بنا دیں۔"

"امّی خوب لمبے اور گھونگھریالے بال بنائیے میرے گڈے کے۔"

"ہاں بھئی خوب گھونگرالے لو۔۔۔ دیکھو بن گئے نا۔"

"لے ہے خالہ جان یہ تو بڑے اچھے بال اس کے اُگ آئے ہیں۔"

"اب اسی دھاگے سے اس کا چہرہ بھی تو بنا دیں

پہلے اس کی بھویں بنائیں۔"
"اس طرح سے خوب ترچھی ترچھی جیسے کمان۔"
"اب آنکھیں اس طرح سے بالکل بادام جیسی بن گئیں۔"
"امی اس کی آنکھوں کے دیدوں کی جگہ یہ نیلے موتی جڑ دیجیے۔"
"واہ بھئی ننھی تم تو خوب ہوشیار ہو گئی ہو۔ نیلے موتیوں کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں چمک آجائے گی۔"
"اچھا اب منھ بنا دیں — ہے نا!"
"دیکھا اس کا چہرہ تیار ہو گیا۔ کیسا شاندار ہے۔"
"اب گردن کے پاس سے ہاتھوں والی بتی لگائے دیتے ہیں۔
"لو بھئی۔ گڈے میاں تیار ہیں۔"
"مگر امی۔ گڈے میاں کا پیٹ کہاں ہے؟
"ہاں ہاں پیٹ تو ضروری ہے ننھی ورنہ یہ یہ اپنی شادی کی دعوت کھا کر ہضم کہاں کرے گا۔"
گردن سے نیچے ڈیڑھ انچ تک پیٹ کے حصہ میں اوپر سے تھوڑا سا کپڑا لپیٹ کر سی دیں۔"
دیکھئے امی توند نہ نکلنے پائے ورنہ میرا گڈا بھدا ہو جائے گا۔ اور سب لوگ اس کا نام "توندو" رکھ دیں گے۔

یہ ایسے "توندو" تھوڑا ہو جائے گا۔ جب بہت زیادہ کھائے گا اور اس کو ہضم نہ کر پائے گا تو توندو ہو جائے گا۔ یا کام چور ہو گا۔ اور خالی پڑا رہے گا تو ضرور اس کے توند نکل آئے گی۔"
"ہاں تو اس کا پیٹ بھی ٹھیک ہو گیا نا!"
"خالہ جان اس کے دونوں ہاتھوں میں پنجہ اور انگلیاں اور پیروں میں ایڑیاں اور انگلیاں بھی تو لگائیے۔"
"نہیں بے بی کیا کرو گی بہت سا کام بڑھا کر۔"
"نہیں امی، میری اچھی امی پنجے اور انگلیاں ضرور لگا دیجیے۔"

"اچھا لو دوسرے کپڑے کی اس طرح سے
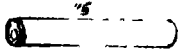
کئی تہیں بنا کر دونوں کے پنجے اور پانچوں انگلیاں قینچی سے کاٹ لیں اب انھیں سوئی اور دھاگے سے سی بھی لیں۔ یہ دونوں پیر اور انگلیاں ہو گئیں۔ اب انھیں لگائے دیتے ہیں۔

لو — ذرا ان کو موٹے ڈورے مضبوطی سے سینا ہے۔ گڈے میاں کو پہلوانی کرنی پڑی تو کہیں ان کا پنجہ نہ مڑ جائے پر بھی خوب

کس دیتے ہیں کہ اسے دوڑنے بھاگنے میں سہولت ہو۔"
"یہ دیکھو سب ٹھیک ہوگیا۔"
"مگر خالہ جان کیا گڈا ایسے ہی ننگا رہے گا۔"
"نہیں بھئی۔ ننگا کیسے رہے گا گڈا۔ یہ کوئی غاروں میں رہنے کا زمانہ تو ہے نہیں کہ ننگا رہے اب دیکھو اس کے لیے کرتا بناتے ہیں۔"
"امّی گرمی کا موسم ہے اس کے لیے تنزیب کا کرتا سی دیجیے۔"
"ہاں لو بھئی اس کا یہ کرتا بالکل تیار ہوگیا۔"
"اور پاجامہ خالہ جان۔"
"یہ لو پاجامہ بھی سل کر تیار ہے۔ اب اس کو پہنائے دیتے ہیں۔ اور سر پر رنگین پگڑی بھی اس کے باندھے دیتے ہیں۔"

بقیہ اسکولوں کی تعلیمی سرگرمیاں

جو ہمیں بہت پسند آئے لیکن چونکہ یہ بچوں کے معیار سے بہت بلند تھے اس لیے ججوں نے انھیں شریک مقابلہ نہ کیا۔ جن کی فہرست یہ ہے:۔

۱۔شہناز فاطمہ۔ چنچل گوڑہ۔ حیدرآباد — ۲۴
۲۔نسیمہ بیگم۔ درگا بازار۔ کٹک۔ اڑیسہ۔
۳۔ بدیع الدین انصاری۔ یاقوت پورہ حیدرآباد
۴۔ محمد رفعت شوکت منزل۔ علی گڑھ

ادارہ کی جانب سے ایک ایک کتاب بطور انعام انھیں بھیجی جا رہی ہے۔

محترمہ سلمیٰ جاوید

گڈّا

آہا میرا پیارا سا گڈّا آج بنا ہے کیسا سجیلا
دیکھو ہوا تیّار
سر پر ہے پگڑی، بر میں ہے کرتا دیکھو بنا ہے کیسا کٹیلا
ہے یہ بڑا ہشیار
آنکھوں میں سُرمہ، دانتوں میں منجن، پان دبائے مُنھ میں رنگیلا
ہونٹھ کیے گل نار
بالوں میں تیل اور گالوں پہ اسنو، چہرہ ہوا ہے کیسا رسیلا
اور ہے گلے میں ہار
سودا سلف سب لاتا ہے گھر کا بنتا نہیں ہے بالکل ہٹیلا
جاتا ہے خود بازار
سر کو اٹھا کر چلتا ہے رستہ جیسے کہ کوئی چھیل چھبیلا
یا ہے کوئی سردار

جناب مسیح الدین صدیقی

اقبال مند

دوسرے دن ناشتہ کے بعد میں نے امین صاحب سے کہا۔
"امین صاحب! — ابھی ایک اور مرحلہ باقی ہے"
"کیا —؟" وہ تعجب سے بولے۔
"ان ٹھگوں کی گرفتاری کا!"
"ارے بھئی ہاں یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔ اچھا یہ بتاؤ تم کو اس پہاڑی کا راستہ معلوم ہے؟" امین صاحب بولے۔
"پیٹر بیلا میں پہاڑی تک جانے کا راستہ تو میں جانتا نہیں مگر اس سڑک کی نشاندہی ضرور کروں گا جہاں سے دھان کے پودے شروع ہوتے ہیں۔"
"پھر ہماری رہنمائی تو یہ پودے ہی کریں گے۔" میں بولا
امین صاحب بولے "ایک اور بات سنو، حکومت نے ان بدمعاشوں کو گرفتار کرانے اور ان کا پتہ لگانے والوں کو پانچ ہزار روپیہ انعام دینے کا اعلان کیا ہے۔"
اس اعلان کے ہوتے ہی سینکڑوں جوانوں، سپاہیوں اور بہادروں نے اپنی بہادری دکھائی مگر وہ ناکام رہے آج تک گروہ کا پتہ نہ لگ سکا۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ کام خدا تمھارے ہاتھوں کروانا چاہتا ہے۔"
میں بولا "امین صاحب میں نے تو تہیہ کرلیا ہے کہ وہاں کے اور بھی سینکڑوں بچوں کو ان ظالموں کے پنجے سے چھٹکارا دلاؤں۔ انھیں ان کے ماں باپ تک پہنچاؤں اس گروہ کو اس کے ظلموں کا مزہ چکھاؤں، بس آپ میرا ساتھ دیں۔"
"ہاں ہاں، ان بدمعاشوں کو ٹھکانے لگانا بہت بڑی خدمت ہے اور اس کے لیے میں ہر طرح سے تمھارے ساتھ ہوں۔"
دوسرے دن ہم نے چلنے کی تیاری کی۔ راحت صاحب نے صدر امین کا لباس پہنا اور ڈرائیور کو جیپ نکالنے کا حکم دیا۔
اچانک اقبال نے ضد شروع کردی۔ "میں بھی ساتھ چلوں گا۔"
میں نے اور امین صاحب نے بہت سمجھایا مگر وہ نہ مانا۔ مجبوراً اسے ساتھ لینا پڑا۔ اب ہم تینوں گاڑی میں بیٹھ کر پولیس اسٹیشن

روانہ ہوئے۔

امین صاحب نے اسٹیشن پہنچ کر چند خاص سپاہیوں کو اپنے ساتھ لیا اور انھیں ساز و سامان سے لیس رہنے کی تاکید کی پھر "سٹی پولس کنٹرول روم" کا نمبر ملا کر بات چیت کی۔

"ہلو۔ میں راحت امین، ریلوے پولس اسٹیشن سے بات کر رہا ہوں"

"فرمائیے کیا بات ہے؟"

"ٹھگوں کے گروہ کا پتہ لگ گیا ہے فوراً تین سو کی مسلح پولس کا دستہ لے کر پہنچیے۔

"ابھی آتے ہیں"

پھر امین صاحب نے مجھ سے پوچھا "حملہ کے لیے کونسا وقت مناسب رہے گا"

میں بولا "سویرے تڑکے موزوں رہیگا۔ اس وقت تک مختلف وادیوں سے تمام ٹھگ واپس آجاتے ہیں اور پڑے سوتے رہتے ہیں"

مناسب ہے۔ صبح تڑکے روانہ ہوتے ہیں۔

(۳۰)

دوسرے دن صبح ہی صبح ہماری گاڑی پاپڑ بیلا کے لیے روانہ ہوگئی اس گاڑی میں میں، امین صاحب، اقبال اور چند خاص ریلوے سپاہی تھے۔ ہمارے پیچھے مسلح فوج کی پانچ گاڑیاں تھیں۔

دو گھنٹوں میں ہم پاپڑ بیلا پہنچ گئے۔

میں نے کہا۔ امین صاحب! آگے راستہ کدھب ہے گاڑیاں نہ جاسکیں گی۔

اس لیے انھیں یہیں چھوڑ کر ہم آگے بڑھیں گے"۔

"اور پہلے میں آپ اور چند خاص سپاہی چل کر مقام کا اچھی طرح جائزہ لے لیں۔

"ٹھیک ہے!" امین صاحب بولے

اور پھر ہم گاڑی میں سے کود پڑے۔

آگے آگے میں پھر اقبال اور ان کے پیچھے امین صاحب اور امین صاحب کے پیچھے ان چند خاص سپاہی۔

میں نے یہ دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا کہ ہمارے دھان کے پودے جوں کے توں تھے اور انھیں کسی نے اکھاڑا نہیں تھا۔ اور وہ تو اب کچھ اور بھی بڑے ہوگئے تھے۔

تین سو مسلح سپاہیوں کے ہمراہ تین مشہور انسپکٹر بھی تھے۔

عقری، سلیمان اور رتن۔ یہ تینوں انسپکٹر اپنی اپنی موٹر سائیکلوں پر سوار تھے۔

عقری نے کہا "امین صاحب! آپ لوگوں کے ساتھ میں بھی آجاتا ہوں۔ تاکہ وائرلیس کا انتظام رہے اور کسی ناگہانی خطرے سے ان سپاہیوں کو فوراً مطلع کر دیا جائے"

"ہاں ہاں یہ آپ نے بہت بہتر مشورہ دیا" امین صاحب بولے "آپ ضرور چلیں"

اور پھر ہمارے پیچھے انسپکٹر عقری بھی اپنی لال موٹر سائیکل پر سوار ساتھ تھے چلے ان کی موٹر سائیکل پر وائرلیس نصب کر دیا

گیا تھا۔

چلتے چلتے تھوڑی دیر میں بخیر و عافیت ہم پہاڑی تک پہنچ گئے۔

میں نے جلدی سے پیچھے مڑ کر کہا۔

"ٹھہر جایئے ٹھہر جایئے۔ آگے کچھ خطرہ ہے۔"

سب ٹھہر گئے۔

میں نے دیکھا۔ پہاڑی کے اطراف بستیوں ٹھگ بھالے برچھی لیے تیار کھڑے تھے۔ ہم دونوں کے بھاگ جانے سے شاید انھیں خطرے کا احساس ہوگیا تھا۔ اور انھوں نے اپنے بس بھر انتظامات پہلے سے کر رکھے تھے۔

میں نے کہا۔

"دیکھئے امین صاحب! وہ سب پہاڑی کے اطراف کھڑے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ ہم سب کے سب بیٹھ جائیں یا لیٹ جائیں تاکہ وہ ہمیں دیکھ نہ سکیں۔

چنانچہ ہم سب ایک پہاڑی کے پیچھے چھپ گئے۔

امین صاحب نے اپنے خاص سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ چھپے چھپے پہاڑی کے چاروں طرف پھیل جائیں اور اس کا محاصرہ کرلیں۔ کوئی بھاگنے نہ پائے۔

تمام سپاہی اپنی اپنی بندوقیں سنبھالے کھسکتے کھسکتے آگے بڑھے۔

لیکن ہم پہاڑی سے اتنے قریب ہو چکے تھے کہ باوجود کوشش کے ہم خود کو چھپا نہ سکے اور انھوں نے ہمیں دیکھ لیا اور لگاتار سیٹیاں بجانا شروع کر دیں۔

سیٹیوں کی آواز پر ان لوگوں میں بھگ دوڑ مچ گئی۔ اور ادھر انسپکٹر عقری نے بھی وائر لیس اپنے منہ سے لگالیا اور تمام سپاہیوں کو فوراً آنے کا حکم دیا۔

یہ بہت اچھا ہوا کہ انسپکٹر عقری ہمارے ساتھ آگئے تھے۔ ورنہ بڑی پریشانی ہوتی۔

"مگر سپاہی کیسے آئیں گے؟ انھیں تو راستہ معلوم نہیں ہم نے کسی کو دھان کے پودوں کا راز نہیں بتایا تھا۔"

میں نے جلدی سے اقبال کو اشارہ کیا۔

اور وہ انسپکٹر عقری کو ساتھ لے کر موٹر سائیکل پر سرپٹ واپس دوڑے۔

قبل اس کے کہ مسلح فوج کا دستہ ہماری مدد کو پہنچتا۔ ٹھگ ہم پر ٹوٹ پڑے۔

اور ہمیں سنبھلنے کا موقع نہ ملا۔

امین صاحب نے فوراً اپنی سیٹی منہ سے لگائی اور کاندھے سے لٹکی ہوئی بندوق تان لی۔

دنادن گولیاں برسنے لگیں۔

اُدھر سے ہمارے سپاہی بھی سیٹی کی آواز سنتے ہی ان پر ٹوٹ پڑے۔

وہ چیخنے لگے بھاگو۔ بھاگو . . . . . .

ایک عجیب عالم تھا۔ ہمارے سپاہی صرف دس بارہ تھے۔ اور وہ سینکڑوں!

ہم پوری کوشش کر رہے تھے کہ وہ

بھاگنے نہ پائیں مگر ہماری یہ کوشش کامیاب ہوتی نظر
نہیں آرہی تھی اگر ہم ایک کو گولی کا نشانہ بناتے تو
تو چار پانچ مل کر ہم پر ٹوٹ پڑتے تھے۔

ہمارے تین سپاہیوں کو انھوں نے ڈھیر کردیا
اور ہماری طرف بڑھے۔ ہم بہت سٹپٹائے۔ لیکن قبل
اس کے کہ وہ ہمارا خاتمہ کردیں۔ پولیس کا دستہ آگیا۔

مسلح پولیس کو دیکھ کر وہ بہت گھبرائے۔ وہ
سمجھ رہے تھے کہ ہم صرف دس بارہ ہیں۔ مگر یہاں
تو سینکڑوں ابل پڑے تھے۔

وہ الٹے پیروں بھاگے۔

مگر جونہی وہ پیچھے پلٹے انھیں ہمارے سپاہیوں
نے گھیرلیا اور ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈالدیں

پھر پوری فوج پہاڑی کی طرف بڑھی۔

مگر ہمیں سخت حیرت ہوئی کہ پہاڑی کے
دامن سے جیسے آدمی ابل رہے ہوں۔ وہ ہم پر
پوری طرح حملہ آور ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔

مسلسل دو گھنٹوں تک زبردست لڑائی
جاری رہی آخر کار بہت سے پکڑے گئے بہت سے ملبے
بھی گئے۔

جب ہم اندر داخل ہوئے تو یہ دیکھ کر بہت
دکھ ہوا کہ انھوں نے تمام بچوں کو ان کے ٹھکانوں میں
بند کرکے باہر سے قفل لگا دیتے تھے اور ان پر پیٹرول
چھڑک کر آگ لگادی تھی۔ اندر بچے چیخ رہے تھے
ہائے۔۔ ہم مرے۔۔ بچاؤ۔۔ بچاؤ۔۔ آگ۔

اور ہم سب کی آنکھوں سے آنسو نکل آتے۔

انسپکٹر عقری کا وائرلیس ایسے موقع پر
بہت کام آیا۔

انھوں نے جلدی سے پولس کنٹرول روم
کو وائرلیس کیا اور پولس کنٹرول روم نے فائر بریگیڈ
والوں کو اس آگ کی اطلاع دی۔ اور فوراً مدد
کے لیے پہنچنے کو کہا۔

انسپکٹر عقری نے پہاڑیلا پر چند سپاہیوں کو
متعین کر دیا۔ تاکہ جیسے ہی فائر بریگیڈ کا عملہ وہاں
پہنچے انھیں مقام واردات پر لایا جاتے۔

ادھر ہم نے بھی اپنے بس بھر اس خطرناک
آگ کو بجھانے کی کوشش کی۔ آگ تو خیر کیا بجھتی مگر
اتنا ضرور ہوا کہ زیادہ بڑھنے نہ پائی۔

تھوڑی ہی دیر میں آگ بجھانے والوں کا
عملہ بھی آن پہنچا اور بڑی محنت کے بعد اس پر قابو پالیا
گیا۔

جب بچوں کو اندر سے باہر نکالا گیا تو ان
کی حالت قابل رحم تھی۔

وہ جلنے کی وجہ سے تڑپ رہے تھے۔

بہت سارے بے ہوش ہوگئے تھے۔ اور بعض تو مر
بھی چکے تھے۔ سب سے پہلے ہم نے انھیں باہر نکالا
اور پولس کی ویگنوں میں بٹھا کر انھیں شہر کے سرکاری
اسپتال پہنچا دیا۔

ان تمام بچوں کی تعداد دو سو سے زیادہ
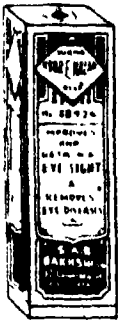
چوہا کوّے کی پیٹھ پر
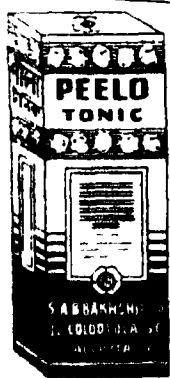
کوّے نے بتایا کہ جنوب کی طرف ایک تالاب ہے۔ وہاں میرا ایک دوست منتھرک نام کا کچھوا رہتا ہے وہاں چلتے ہیں۔ اس کی مدد سے ہم لوگوں کے کھانے پہننے کا انتظام ہو جائے گا۔

ہرنیک چوہا بولا "اگر ایسا ہے تو چلو ہم بھی تمہارے ساتھ چلتے ہیں مجھے بھی یہاں بہت تکلیف ہے۔"

لگھو پتنگ کوّا بولا "مگر بھئی تمہیں کس بات کا غم ہے؟"

ہرنیک: "یہ تو میں وہیں چل کر بتاؤں گا۔"

کوّا بولا "مگر دوست تم میرے ساتھ چلوگے کیسے؟ میں آسمان میں اڑان بھرنے والا اور تم زمین پر پھدکنے والے۔ ہمارا تمھارا ساتھ کیسے ہوگا؟"

چوہا بولا "تو کیا ہوا، تم مجھے اپنی پیٹھ پر بٹھا کر وہاں لے چلو...."

لگھو پتنگ یہ بات سن کر بہت خوش ہوا۔ اس نے کہا "دوست میں اڑان میں ماہر ہوں ہر طرح کی اڑان بھرنا میرے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ میں تمھیں حفاظت سے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

یہ سن کر چوہا کوّے کی پیٹھ پر بیٹھ گیا۔ دونوں آسمان میں اڑتے ہوئے اس تالاب کے کنارے پہنچ گئے

کچھوا ڈر گیا

منتھرک کچھوے نے جب یہ عجیب و غریب تماشا دیکھا کہ کوئی کوّا چوہے کو اپنی پیٹھ پر بٹھا کر لا رہا ہے تو وہ ڈر کر پانی میں چھپ گیا۔ ڈر کے مارے اس نے لگھو پتنگ کو پہچانا بھی نہیں کہ وہ تو اس کا لنگوٹیا یار ہے۔

اب لگھو پتنگ نے چوہے کو تالاب سے تھوڑی دور پر چھوڑ دیا اور خود اڑتا ہوا تالاب کے کنارے والے پیڑ پر بیٹھ کر منتھرک کو آواز دینے لگا۔ لگھو پتنگ کی جانی پہچانی آواز سن کر منتھرک کچھوا خوشی سے ناچتا ہوا باہر نکلا دونوں ایک دوسرے سے بغل گیر ہوئے۔ تھوڑی دیر میں چوہا بھی پھدکتا ہوا وہاں آگیا اور آداب بجا کر ایک طرف بیٹھ گیا۔

منتھرک نے تب لگھو پتنگ سے پوچھا "بھئی یہ کیا ماجرا ہے۔ چوہا تو تیرا من بھاتا کھاجا ہے پھر تو اسے اپنی پیٹھ پر بٹھا کر کیسے لایا؟"

کوّا بولا: "یہ چوہا میرا پکا دوست ہے۔ اس کا نام ہرنیک ہے۔ بہت ہوشیار اور گن والا ہے۔ اسے بھی کوئی غم لگا ہوا ہے۔ اپنے وطن سے بیزار تھا۔ میرے ساتھ یہاں چلا آیا۔"

منتھرک کچھوے نے پوچھا "مگر اس اداسی

اور بیزاری کا کیا سبب ؟
لگھو پتنگ کوا بولا: یہ بات میں نے بھی دریافت کی تھی مگر اس نے کہا تھا کہ وہیں چل کر بتاؤں گا تو میرے دوست ہرنیک آپ ذرا اپنی اس اداسی اور دنیا سے بیزاری کا ماجرا ہمیں بھی تو سناؤ!"

تب ہرنیک نے اپنی آپ بیتی سنائی:

اچھلنے والا چوہا

ہرنیک چوہے نے اپنی اداسی کی وجہ بتاتے ہوئے یہ کہانی سنائی:

"ہیلاروپ شہر سے تھوڑی دور مہادیوجی کا ایک مندر تھا وہاں تامچور نام کا ایک سادھو رہتا تھا شہر سے بھیک مانگ کر لانا اور کھانا۔ بس یہی اس کا کام تھا۔ جو کچھ بچ رہتا وہ اسے اپنی کمنڈل میں رکھ کر کھونٹی پر ٹانگ دیتا تھا۔ سویرے وہ اپنے کمنڈل میں سے تھوڑا بہت اناج مندر کی صفائی کرنے والوں میں بانٹ دیا کرتا۔

ہرنیک چوہے نے اپنی کہانی جاری رکھتے ہوئے کہا کہ ایک دن میرے کئی سگے رشتے کے چوہے میرے پاس آئے اور دیوار پر ٹنگے اس کمنڈل کی طرف اشارے کرنے لگے۔ میں نے کہا: "بھئی وہ تو بہت اونچی دیوار پر ٹنگا ہے وہاں تک پہنچنا تم لوگوں کے بس کی بات نہیں۔" اس پر سب چوہوں نے بہت عاجزی سے کہا: "آپ تو کافی اوپر تک اچھل سکتے ہیں، ذرا اپنا کرتب دکھائیے اور ہم لوگوں کا بھی بھلا کیجیے۔"

چوہوں کے بہت کہنے سننے پر میں نے (ہرنیک چوہے نے) ان کی بات مان لی اور اسی رات سب کو لے کر وہاں پہنچا۔ خدا کی شان، میں ایک ہی جست (چھلانگ) میں کھونٹی پر ٹنگے کمنڈل تک پہنچ گیا۔ خوب پیٹ بھر کر دانا کھایا اور اپنے دوستوں کو بھی خوب دعوت اڑانے کا موقع دیا۔ بس پھر کیا تھا، یہ ہمارا روز کا معمول بن گیا۔

جب کئی دن گزر گئے تو "تامچور" سادھو کو اس چوری کا شبہ ہوا۔ اب وہ کہیں سے ایک بانس لے آیا۔ اس سے رات بھر کمنڈل کو کھٹکھٹاتا رہا۔ بھلا ایسے میں میری کیا ہمت پڑتی۔ بانس سے پٹنے کے ڈر سے بس دور ہی سے کمنڈل کو تکا کرتا۔

کچھ دن بعد اس مندر میں ایک اور سادھو آیا۔ اس کا نام چترداس تھا۔ تامچور نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی۔ رات کو دونوں سادھو بڑی دیر تک گیان دھیان کی باتیں کرتے رہے مگر تامچور کا دھیان کمنڈل کی طرف لگا ہوا تھا۔ وہ بیچ بیچ میں بانس سے اُسے کھٹکھٹاتا رہتا تھا۔

آنے والے سادھو کو یہ بات بہت بُری لگی۔ وہ سمجھا کہ تامچور اس کی باتوں کی طرف دھیان نہیں دے رہا ہے اور خواہ مخواہ کمنڈل کو کھڑکا رہا ہے۔ اس نے غصے میں آکر دھمکی دی کہ وہ ابھی یہاں سے کہیں اور چلا جائے گا۔

تامچور اس بات سے بہت گھبرایا۔ اس نے چوہے کا سارا ماجرا کہہ سنایا اور بتایا کہ اچھلنے میں اس چوہے نے تو بلی اور بندر کو بھی مات دے دی ہے۔

چترداس سادھو نے پوچھا کہ کیا اُسے اس کے بل کا پتہ ہے؟ ہو نہ ہو اس چوہے کا بل زمین میں کسی خزانے کے اوپر ہے۔ تبھی تو اس کی گرمی سے یہ اس قدر تیز اچھلتا ہے۔ کوئی کام بغیر سبب کے نہیں

ہوتا۔ چوہے کے اس اچھلنے کے پیچھے بھی کچھ نہ کچھ سبب ضرور ہوگا۔ کوٹے ہوئے تلوں کو کوئی بنا کُٹے تلوں کے دام بیچنے لگے تب بھی اس کا کوئی سبب ہوتا ہے۔

تامچور نے کہا "یہ کُٹے ہوئے تل کی مثال میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

تب چترداس سادھو نے کٹے ہوئے تلوں کے بکنے کی یہ کہانی سنائی۔

کوئی کام بغیر سبب کے نہیں ہوتا۔

چترداس نے کہا: ایک بار ایک تقریب کے سلسلے میں میں ایک برہمن کے گھر گیا۔ ایک دن میں نے وہاں اس برہمن اور اس کی بیوی کی یہ بات چیت سُنی:

برہمن: "کل سویرے میں دوسرے گاؤں جاؤں گا وہاں ایک برہمن کچھ دان کرنا چاہتا ہے۔"

یہ سننا تھا کہ اس برہمن کی بیوی غصے سے لال ہوگئی کہنے لگی، تمھاری بیوی ہو کر میں نے کبھی آرام نہیں اٹھایا۔ نہ اچھا پہنا نہ اچھا کھایا۔ زیوروں کی تو بات دور رہی۔"

برہمن بولا: "تمھیں ایسا نہیں کہنا چاہیے۔ اپنی خواہش کے مطابق کسی کو بھی دولت نہیں ملی ہے۔ پیٹ بھرنے کے لیے اناج تو میں بھی لے آتا ہوں۔ اس سے زیادہ کی خواہش چھوڑ دینی چاہیے۔ زیادہ لالچ کے چکر میں آدمی کے ماتھے پر سینگ بھی نکل آتا ہے۔"

برہمن کی بیوی نے پوچھا: "وہ کیسے؟"

تب برہمن نے سؤر، شکاری اور گیدڑ کی یہ کہانی سنائی۔

لالچی کے سر میں سینگ

ایک دن ایک شکاری شکار کی تلاش میں جنگل گیا۔ اسے وہاں ایک بہت بڑا سؤر دکھائی دیا۔ شکاری نے کمان تانی اور تیر ٹھیک نشانے پر پڑا۔ مگر چوٹ کھا کر وہ سور بہت غضبناک ہوگیا۔ وہ شکاری کی طرف پورا زور لگا کر دوڑا۔ شکاری بھی تیکھے دانتوں والے اس سور کے حملے کی تاب نہ لا سکا اور وہیں ڈھیر ہوگیا۔ پاس ہی سور بھی گر کر مر گیا۔

اتنے میں بھوک سے تڑپتا ہوا ایک گیدڑ اُدھر آنکلا۔ سور اور شکاری کو ایک جگہ مرا دیکھ کر بہت خوش ہوا کہ خدا نے آج اس کے کھانے کے لیے کیسی نعمت بھیجی ہے۔ کبھی کبھی بغیر محنت کے بھی اچھا کھانے کو مل جاتا ہے۔ وہ سوچنے لگا یہ سب تقدیر کا پھیر ہے۔

یہ سوچتا ہوا وہ دونوں لاشوں کے قریب آگیا۔ اسے یاد آیا کہ اپنی دولت کو دھیرے دھیرے خرچ کرنا ہی عقل مندی کی علامت ہے۔ اس طرح تھوڑی سی دولت بھی بہت دنوں تک کام آسکتی ہے۔ اب میں اتنی ساری غذا کا استعمال اس طرح کروں گا کہ بہت دن تک میں اس کے سہارے زندہ رہ سکوں۔

یہ سوچ کر اس نے فیصلہ کیا کہ سب سے پہلے وہ کمان میں لگی ہوئی تانت کی ڈوری کھائے گا اور ایک دن اسی پر گزارا کرے گا۔ گیدڑ نے ڈوری کو مُنہ میں لے کر زور سے چبایا۔ ڈوری کو چبانا تھا کہ ڈور ٹوٹ گئی اور کمان کا ایک سرا بہت زور کے ساتھ گیدڑ کے سر پر لگا اور اس کے ماتھے میں گڑ گیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے گیدڑ کے سینگ نکل آیا ہے۔ گیدڑ تڑپ کر ڈھیر ہوگیا۔

(کٹے تلوں کی کہانی اگلے شمارے میں پڑھیے

جناب سید محمد شفیع تمنا کلکتوی

دوست کی پہچان

(۱)

یہ اک عبرت افزا کہانی ہے سنیے
کہ دو دوست مل کر کہیں جا رہے تھے
تھا پُر خوف ایسا مگر وہ علاق
کہ تھا ہر قدم پر انھیں جاں کا خطرہ
مگر دونوں عزمِ جواں ساتھ لے کر
بڑھے جا رہے تھے جو منزل کی دُھن پر
ذرا دیکھیے اب مُقدّر کا لکھا!
کہ اک ریچھ کو جب انھوں نے جو دیکھا
ہوئے پھر تو دونوں پریشاں و مضطر
کہ شاید قضا کھینچ لائی یہاں پر
مگر حال تو سنیے اک کا برادر
گیا جھٹ وہ چڑھ سامنے کے شجر[1] پر
جو دیکھی اس حالت کو پھر دوسرے نے
کہ ساتھی تو یوں پیڑ پر جا بسد جارے
نہیں اب تو اس کے سوا کوئی چارہ
زمیں پر پڑا میں رہوں بن کے مُردہ

(۲)

بالآخر یہی سوچ کر وہ طریقہ
زمیں پر گیا لیٹ جھٹ ہو کے مُردہ
اسے ریچھ نے سونگھ کر خوب دیکھا
بالآخر اسے اس نے مردہ ہی سمجھا
جو کچھ ریچھ نے حس و حرکت نہ پائی
تو پھر اس سے یوں اس نے پائی رہائی
گیا ریچھ جب اس کو مردہ سمجھ کر
تو اترا وہ ساتھی جو بیٹھا تھا اوپر
لگا پھر وہ یوں اس کی تعریف کرنے
کہ ہم سے بھی تم خوب چالاک نکلے
مگر کچھ مجھے بھی بتاؤ تو پیارے
کہا ریچھ نے کان میں کیا تمھارے
دیا دوست نے پھر جواب اس کو ایسا
کہا ریچھ نے مجھ سے بس صرف اتنا
کہ جو دوست مشکل میں منھ کو چھپائے
ہے بہتر کہ ایسوں سے دامن بچائے

[1] درخت

جناب اقبال مہدی

ایک دن کیا ہوا

دھوبن کپڑے لائی۔ امّی نے ان کو گنا۔ گن کر ہر
ایک کے کپڑے الگ الگ کئے پھر سلیم اور سلمہ سے کہا۔
"جاؤ انھیں بکسوں میں رکھ دو۔ دیکھو تمیز سے رکھنا۔"
سلیم اور سلمہ کو کام کرنے کا موقع ملا۔ انھیں
اور کیا چاہیے تھا۔؟ دونوں بہت خوش ہوئے۔

سلیم نے لپک کر اپنے اور ابا جان کے کپڑے
اٹھائے جلدی سے کمرے کی طرف بھاگا۔ سلمہ نے اپنے اور
امّی کے کپڑے سنبھالے اور انھیں لے کر تیزی سے چلی ان میں
کچھ کپڑے ریشمی تھے۔ وہ پھسلے اور گر پڑے۔ ان کی تہیں
کھل گئیں۔ سلمہ سلیم سے پیچھے رہ گئی۔ جیسے تیسے کپڑے سنبھال
کر کمرے میں پہنچی۔ اتنی دیر میں سلیم اپنے بکس میں اپنے
کپڑے اور ابا جان کے بکس میں ان کے کپڑے رکھ چکا تھا۔ بہن
کی مدد کو وہ بھی آپہنچا۔

دونوں نے مل کر امّی اور سلمہ کے کپڑے پھر الگ
الگ کیے۔ سلمہ کے کپڑے اس کے بکس میں رکھے اور پھر
امّی کے بکس کی طرف بڑھے۔ وہ پہلے ہی کچھ بھرا ہوا تھا۔
اس کی کنڈی کھولنے کے لیے ڈھکن کو زور لگا کر
دبانا پڑا۔ کپڑے رکھنے کے بعد بکس بند
کرنا اور بھی مشکل ہوگیا۔ دونوں نے ڈھکن کو نیچے دبانا
چاہا لیکن ڈھکن کی کنڈی، بکس کے کنڈے سے بہت
دور ہوا میں لٹکتی رہی۔

زور لگاتے لگاتے سلمہ بکس کے ڈھکن پر چڑھ
بیٹھی۔ ڈھکن کچھ دبا لیکن بند نہ ہوسکا۔ آخر سلیم بھی
ڈھکن پر سوار ہوگیا۔ ڈھکن کچھ اور دبا۔ لیکن بند نہ
ہوسکا۔ دونوں نے بیٹھے بیٹھے بہت زور لگایا۔ سلمہ
نے کود کر اس کو جھٹکا دیا۔ پھر سلیم نے کود کر جھٹکا دیا۔
پھر دونوں نے ایک ساتھ کود کر جھٹکا دیا۔ کنڈی تو نہ
لگی لیکن اس طرح کودنے میں دونوں کو بہت مزا آیا۔
پھر کودے، پھر کودے۔

بکس بند کرنے کی طرف سے دھیان ہٹ
گیا۔ دونوں اس پر کودنے کا لطف اٹھانے لگے کودتے
اور جھٹکا کھا کر ہنستے پر ایک مرتبہ جو کودے تو سلمہ سے
ٹکرا کر سلیم بکس سے نیچے گر پڑا۔ سر دیوار میں لگا۔
آنکھوں میں آنسو آگئے۔ سلمہ کو بہت ہنسی آئی۔ سلیم
بھی کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا۔ مگر یہ کھیل جاری رکھنے پر
آمادہ نہ ہوا۔ سلمہ بھی بکس سے اتر آئی۔

دونوں کے اُترتے ہی بکس کا ڈھکن پھر اُبھر کر اپنی جگہ پر آگیا۔ بکس میں رکھے ہوئے کپڑے دکھائی دینے لگے۔ ایسا لگتا تھا جیسے بکس منہ کھولے ہنس رہا تھا۔ ان دونوں کا مذاق اڑا رہا تھا کہ "بس؟ کر نہ لیا مجھ کو بند۔؟"

سلمہ نے کہا۔" یہ بہت بھرا ہوا ہے۔"

سلیم نے کہا۔" اس کو ایسے ہی رہنے دیں۔"

سلمہ بولی "اگر کپڑوں کو ٹھیک طرح سے رکھ دیں تو یہ بند ہو جائے گا۔"

سلیم کو یہ تجویز دلچسپ معلوم ہوئی۔ ایک نیا شغل ملا۔ بکس کھول کر دونوں نے اُسے خالی کرنا شروع کیا۔ کپڑے نکالتے اور پلنگ پر ڈال دیتے۔ پورا بکس خالی کر دیا۔ اُدھر پورا پلنگ کپڑوں سے بھر گیا۔ دونوں کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا بھلا اتنے بہت سے کپڑے اس بکس میں کیسے سماتے ہوتے تھے

دونوں نے کپڑوں کو دوبارہ بکس میں رکھنا شروع کیا۔ ریشمی کپڑے بہت پریشان کرتے تھے۔ ذرا سے اشارے میں کھل جاتے اور بہت کوشش کرنے کے بعد بھی ٹھیک طرح تہہ نہ ہوتے۔ ایسے کپڑوں پر دونوں کو بہت غصہ آنے لگا۔ وہ اِن کو مَل کر اُٹھاتے اور مَل کر بکس میں ٹھونس دیتے۔ ایسے سب کپڑوں کی استری اور تہیں خراب ہو گئیں۔

ابھی آدھے ہی کپڑے رکھے گئے تھے کہ بکس پھر بھر گیا۔ دونوں بہت پریشان ہوئے انھوں نے چاہا کہ کسی نہ کسی طرح کپڑوں کو بکس میں رکھ دیں تاکہ امی ان کو پلنگ پر پھیلا نہ دیکھیں۔ دونوں نے ہر کپڑے کو خوب موڑ موڑ کر بکس کے کونوں اور کناروں میں ٹھونسنا شروع کیا۔ کچھ کپڑے اس طرح کم ہوئے پھر بھی بہت سے کپڑے پلنگ پر پھیلے ہوئے باقی رہ گئے۔ ان کو بکس میں اور کپڑوں کے اوپر لگانا شروع کیا۔ کپڑے بکس سے بہت اوپر نکل آئے اور پلنگ پر اب بھی بہت سے کپڑے باقی رہ گئے۔

دیر ہوتی جا رہی تھی دونوں گھبرا رہے تھے کہ امی کمرے میں نہ آجائیں۔ پلنگ پر جو کپڑے بچ رہے تھے۔ اُن کو جلدی جلدی ابا جان کے اور اپنے بکسوں میں ڈالا۔ پلنگ خالی ہوا تو کچھ اطمینان ہوا۔ لیکن امی کے بکس کا ڈھکن اب پہلے سے بھی زیادہ کھلا ہوا تھا۔ اس کو اب بند کرنا دونوں کو بس سے باہر معلوم ہوا۔ اُسے کھلا ہوا چھوڑ کر دونوں چپکے سے باہر کھسک گئے ——

دروازے پر امی سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ دونوں کے اتنی دیر تک کمرے میں خاموش رہنے پر انھیں کچھ شبہ ہوا تھا۔ اور وہ یہ دیکھنے کمرے میں آئی تھیں کہ یہ دونوں کر کیا رہے ہیں۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی ان کی نظر اپنے بکس پر پڑی جو منہ کھولے ان دونوں کی زیادتیوں کی شکایت کر رہا تھا۔ امی نے پلٹ کر ان دونوں کو دیکھا۔ دونوں کے چہرے کہہ رہے تھے کہ پکڑے گئے۔

امی نے پوچھا۔" کیا کر رہے تھے تم لوگ۔؟"

دونوں چپ رہے اب ان کے چہرے کہہ رہے تھے۔" امی ہم نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔"

امی خاموشی سے اپنے بکس کی طرف بڑھیں۔
کپڑوں کو دیکھتے ہی بولیں "یہ کیا حال کر دیا میرے کپڑوں کا؟ میں نے تم لوگوں سے کپڑے رکھنے کے لیے کہا تھا یا رکھے ہوئے کپڑوں کو بھی گڑبڑ کرنے کے لیے کہا تھا۔"
سلمہ ڈرتے ڈرتے بولی "امی ڈھکن بند نہیں ہو رہا تھا۔
"اب کونسا بند ہو گیا۔" امی نے جواب دیا اور اپنے بکس کے کپڑوں کو ٹٹولنا شروع کیا۔ کپڑوں کو دیکھتی جاتیں اور دونوں پر ناراض ہوتی جاتیں۔ "بکس میں ٹھونسنے کے لیے کس نے کہا تھا۔ سارے کپڑوں کا ناس کر کے رکھ دیا۔ کس دن تم لوگوں کو عقل آئے گی۔ ذرا سا کام نہیں کر سکتے۔ ایک کام کرنے کو کہو تو دس کام بڑھا دیتے ہو۔"
سلیم اور سلمہ کچھ دیر تو خاموش کھڑے ڈانٹ کھاتے رہے۔ پھر دھیرے سے باہر کھسک گئے۔

جناب محمد یوسف خاں

پپیتے کی کاشت

پپیتے کا وطن جنوبی امریکہ ہے لیکن اس کی کاشت بڑے پیمانے پر ملایا، برما، سیلون اور ہمارے ملک کے تقریباً ہر صوبے میں کی جاتی ہے۔ یہ ہر طرح کی مٹی میں پیدا کیا جا سکتا ہے لیکن باغ میں پانی کا نکاس ہونا ضروری ہے۔ نمی کی زیادتی سے پودوں میں بیماری لگ جاتی ہے، مُرجھا جاتے ہیں۔ پپیتے کا پودا جلد بڑھتا ہے اور سال بھر میں پھل دینے لگتا ہے۔

پودے بیج سے تیار کیے جاتے ہیں۔ اپریل یا مئی کے مہینے میں بیج کیاریوں میں لگائے جاتے ہیں۔ پودے چھ انچ لمبے ہو جاتے ہیں اور ان میں چار یا پانچ پتیاں آ جاتی ہیں تو جولائی کے مہینے میں انھیں اکھاڑ کر الگ الگ لگاتے ہیں۔

پپیتے کے پودے قلم کے ذریعہ بھی تیار کیے جاتے ہیں۔ اس کے لیے پتلی شاخیں چُنی جاتی ہیں جو پپیتے کے پودوں سے نکلتی ہیں

کس طرح بوتے ہیں:

دس فٹ کے فاصلے پر ڈیڑھ فٹ قطر کے ڈیڑھ فٹ گہرے گڈھے کھود کر ان میں تین ٹوکری گوبر یا کمپوسٹ کا کھاد، ڈیڑھ سیر ارنڈی کی کھلی، ایک ٹوکری راکھ اور آدھ چھٹانک چونا ایک ساتھ ملا کر گڈھے میں بھر دیا جاتا ہے۔

پپیتے میں نر اور مادہ پودے الگ الگ ہوتے ہیں اس لیے ایک گڈھے میں تین پودے الگ الگ لگانا ضروری ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ چھوٹے پودوں میں نر اور مادہ پودوں کی شناخت کرنا مشکل ہے۔ بڑے ہونے پر شناخت کر، ایک پھلنے والا پودا چھوڑ کر باقی ڈو پودوں کو اکھاڑ دیا جاتا ہے۔ لیکن باغ میں ہر بارہ مادہ پودوں پر ایک نر پودا ہونا ضروری ہے۔

اونچائی کے لحاظ سے اس کی دو قسمیں ہیں (۱) لمبی (۲) پستہ قد۔ لمبی قسموں میں گجراتی پپیتے آتے ہیں اور پستہ قد میں واشنگٹن، ہنی ڈیو، سیلون اور رانچی۔ ان میں رانچی اور سیلون قسموں کے پپیتے بڑے اور نہایت لذیذ ہوتے ہیں۔

اس کی جڑیں زیادہ گہرائی تک نہیں جاتی ہیں اور اوپر کی مٹی جلد ہی خشک ہو جاتی ہے اس لیے خشک موسم میں سنچائی ضروری ہے۔

نکائی اور گڑائی کرنے سے پودے جلد بڑھتے ہیں اور تنہ مضبوط ہوتا ہے۔ ان پر کیڑوں کا حملہ بہت ہی کم ہوتا ہے البتہ چند قسم کی بیماریاں پودوں کو ختم کر دیتی ہیں مثلاً:-

(۱) پتیوں کا مُڑ جانا (LEAF CURL)

نازک پتیاں اینٹھ کر مڑ جاتی ہیں۔ ایسے پودوں کو اکھاڑ کر
جلا دینا چاہیے۔

(۲) تنے کا سڑنا (STEM ROT)

پودوں کے تنے نیچے سے سڑنا شروع ہوتے ہیں اور
آخیر میں ان کا اوپری حصہ سڑ جاتا جس سے پودے
رجھا جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں سڑے ہوئے پودوں
کو ہٹا دینا چاہیے۔ یہ بیماری کھیت میں نمی کی زیادتی سے
ہوتی ہے۔ اس لیے کھیت سے پانی نکال دینا چاہیے
ساتھ ہی دوسرے پودوں پر کاربولک ایسڈ کا ۱٪ فیصدی
محلول پودوں پر چھڑک دینا چاہیے۔

پپیتا بونے اور پیدا کرنے کا طریقہ تو آپ کو
معلوم ہوگیا۔ اب یہ بھی دیکھیے کہ قدرت نے اتنی آسانی
سے پیدا ہونے والی چیز میں کتنے فائدے رکھے ہیں۔ یہ
کچا اور پکا دونوں حالتوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ کچے
پپیتے کا مزاج گرم وخشک ہے، پکا پپیتا گرم وتر ہے۔ پکا
پپیتا کھائیے تو معدہ خوب قوی ہوجاتا ہے۔ بھوک خوب
لگتی ہے، پیشاب خوب لاتا ہے۔ گردوں یا مثانے میں
پتھری ہو تو اس کو خارج کردیتا ہے۔ پیٹ میں چھوٹے
چھوٹے کیڑے ہوں یا کینچوے یا کدو دانے ہوں تو اس
کو مار کر خارج کردیتا ہے۔

اب ایک اور کام کی بات سنیے، بدن کے کسی
حصے میں داد ہو (ایک جلدی بیماری جس میں کھجلی بہت
زیادہ ہوتی ہے۔) تو کچے پپیتے کا دودھ لگانے سے
صاف ہوجائے گا۔ ان کے علاوہ اور بہت سی بیماریوں
میں کام آتا ہے۔

تو بھئی آپ پپیتا بوئیے، کھائیے اور خوب
تندرست ہوجائیے لیکن ایک بات یاد رکھیے گا۔ اس کی
خوراک کمزوروں کے لیے صرف چھ تولے ہے۔ ہاں اگر آپ
خوب تندرست ہیں تو زیادہ بھی کھا سکتے ہیں۔ ہاں ایک
بات اور لوگ اسے گوشت گلانے کے کام میں بھی لاتے
ہیں۔

اسکولوں کی تعلیمی اور تفریحی سرگرمیاں

مرسلہ
جناب بدرالدین

مدرسہ ابتدائی جامعہ میں سالانہ دعوت

پچھلے سالوں کی طرح اس سال بھی حالی منزل مدرسہ ابتدائی کے طلباء کی طرف سے ۹ مئی ۶۸ء کو سالانہ دعوت کی گئی۔ مدرسہ کے تمام استادوں اور کارکنوں نے اس دعوت میں شرکت کی کھانے کے بعد بورڈنگ کے ۲۴ طالب علموں نے مہمانوں کے سامنے اشعار میں اپنا تعارف کرایا، اور سال بھر کے کاموں کی رپورٹ سنائی۔

تعارفی شعروں کے چند نمونے آپ بھی پڑھیے اور لطف اٹھایئے۔

بدرالدین استاد دینیات مدرسہ ابتدائی

۱۔ چاہیے سب کو ملیں اخلاق سے
ایک لڑکا ہے بنارس شہر کا

۲۔ شہر بستی سے میں آیا اٹھا کر ہاتھ میں بستہ
بسا پھر جامعہ آکر لگایا میز پر بستہ
نسیم احمد ہوں میں کھاتا ہوں باقر خانیاں خستہ
پسند ہے مجھکو آملی گھی وہ مہنگا ہو یا ہو سستا

۳۔ وطن سے میں نکل آیا وطن ہوا سونا

کلی کلی مرے غم میں اداس رہتی ہے
زمانیہ کی صدائیں ہر اک سے کہتی ہیں
کوئی بتاؤ کہاں ہے غلام ربانی

۴۔ سونا مری عادت ہے بستر سے محبت ہے
شاکر مجھے کہتے ہیں دہلی میں مرا گھر ہے

۵۔ شیر شاہ کا مقبرہ ہے سہسرام
میرے رہنے کی جگہ ہے سہسرام
نام ہے شبیر ہنسنا کام ہے
گھومنا پھرنا مرا آرام ہے

۶۔ شہر کلکتہ کی بہاروں میں
دیکھ لو مجھ کو افتخاروں میں

۷۔ میں ہوں محمود کلکتہ کا باسی
کبھی لاتا نہیں منہ پر اداسی

۸۔ کون کہتا ہے جہاں سے اولیاء غائب ہوئے

ادارۂ بیدار کے انعامی مقابلے کا نتیجہ

ادارۂ بیدار کی جانب سے بچوں کے مضمون نگاری کے مقابلے میں ملک کے بے شمار بچوں نے کافی ذوق و شوق سے حصہ لیا۔

ادارہ کے مقرر کردہ پانچ بچوں کے مشہور حیدرآبادی ادیبوں نے جن میں جناب قیصر سرمست صاحب اور مسیح الدین صدیقی صاحب وغیرہ شامل ہیں، جج کے فرائض انجام دیے اور متفقہ طور پر حسب ذیل مضامین کو کامیاب قرار دیا۔

اول:- سید وقار احمد۔ محلہ سائیر پورہ۔ بسدی پیٹھ۔

دوم:- محمد رفعت اللہ۔ منڈی بازار۔ ورنگل۔

سوم:- نظام الدین۔ سلطان شاہی۔ حیدرآباد۔

چہارم:- محمد عاقل احمد۔ اُمرآباد۔ مدراس۔

انھیں علی الترتیب ۴۰۔ ۲۵۔ ۱۵ اور ۱۰ روپے کے نقد انعامات روانہ کیے گئے۔ ان کے علاوہ ججوں نے حسب ذیل مضامین کو ترغیبی انعامات کا مستحق قرار دیا۔

۱۔ محمد حسن نعمانی۔ مولانا آزاد روڈ ۱۱
۲۔ ساجدہ نیر سلطانہ۔ چک منگلور میسور اسٹیٹ
۳۔ شوکت حیات۔ پٹنہ ۶ بہار
۴۔ صفیہ سلطانہ۔ دبیر پورہ حیدرآباد
۵۔ شہناز انجم جامعہ نگر۔ نئی دہلی

اول، دوم، سوم اور چہارم آنے والے مضامین کو کتابی صورت میں شائع کرنے کا اہتمام کیا جا رہا ہے اور باقی ترغیبی انعامات پانے والے مضامین بچوں کے مشہور رسالوں میں شایع کیے جا رہے ہیں۔

ان کے علاوہ بعض ایسے مضامین بھی وصول ہوئے

بقیہ صفحہ ۳۹ پر

مجھ کو دیکھو میں ابھی سید ولی موجود ہوں
ہے لکھنؤ ہی میرا گھر میرے بزرگوں کا وطن
ناز ہے جس پر مجھے وہ میری خوشبو کا چمن

۹۔ قائم گنج کا رہنے والا میں ہوں ایک پٹھان
میری طاقت دیکھ کے ڈرتا ہے ہر اک بلوان
میرے نام کو سب جانیں کیا افسر کیا دربان
بچہ بچہ مجھ کو کہتا ہے مسٹر عثمان

-۱۰-

میں دہلی کا باشندہ ہوں یہ میرا وطن ہے میرا وطن
میں اس پر واروں تن، من، دھن یہ میرا وطن ہے میرا وطن
یہ شاہجہاں کی بستی ہے شاہوں کی آنکھ کا تارا
یہ نیارا وطن ہے انتخاب کو دل اور جان سے پیارا

۱۱۔ دیوبند کا رہنے والا میں ہوں بابو بھیا
میں ہوں بابو بھیا لوگوں میں پیارا بابو بھیا
سنو کھول کر کان کہتا ہے تم سے فرقان
دنیا کے بازار میں چلتی نیا جس کے پاس روپیا

بڑے دربار والے ہیں معین الدین اجمیری
میں اک ننھا سا انسان ہوں کلیم الدین اجمیری
بڑی نسبت ہے میری اور کلیمی شان ہے میری
خدا کر دے میری سیرت کو مثل خواجہ اجمیری

بچوں کی کوششیں

میاں افیمچی نے سانپ مارا:-

ایک گاؤں میں دو بھائی رہا کرتے تھے۔ وہ دونوں اپنے ماں باپ کے بہت پیارے تھے۔ جب ان کے باپ کا آخری وقت آیا تو انھوں نے اپنے دونوں بیٹوں کو بلایا۔ اور انھیں نصیحتیں کرنے لگے" پیارے بیٹو اگر تم عزت اور مرتبہ چاہتے ہو تو ہمیشہ سچ بولو۔ مل جل کر رہو، کسی سے دشمنی نہ رکھو، بری عادتیں نہ ڈالو" اتنا کہہ کر انھوں نے دم توڑ دیا۔ اور یہ دونوں اکیلے رہ گئے۔

باپ کے مرنے کے بعد دونوں نے باپ کی چھوڑی ہوئی دولت کو آدھا آدھا بانٹ لیا۔ ان کے باپ بہت امیر تھے اس لیے دونوں کے حصّے میں بہت سی دولت آئی۔ بڑے بھائی کی تو شادی ہو چکی تھی۔ بڑے بھائی نے سوچا کہ اب چھوٹے بھائی کی بھی شادی کر دینی چاہیے کیونکہ وہ اب جوان ہو گیا تھا۔ خیر چھوٹے بھائی کی شادی ایک امیر گھر کی عورت سے کر دی۔ دونوں بھائیوں کو ہر وقت اپنے باپ کی نصیحتیں یاد رہتی تھیں۔ وہ جب بھی کوئی غلط کام کرنے کو ہوتے تو ان کے کانوں میں باپ کے الفاظ گونج جاتے۔ اور وہ فوراً اس کام سے باز آ جاتے۔ وقت گزرتا رہا۔

آہستہ آہستہ چھوٹا بھائی برے دوستوں کی صحبت میں پڑ گیا۔ بڑے بھائی کے لاکھ سمجھانے کے باوجود وہ نہ مانا۔ گھر کے تمام لوگ اس سے نالاں رہتے، ہر شخص اس سے نفرت کرتا۔ بری صحبت نے اسے افیمچی بھی بنا دیا تھا۔

ایک دن وہ افیم کھا کر سو رہے تھے۔ آدھی رات کے وقت اچانک آنکھ کھل گئی۔ دیکھا ایک سانپ کھونٹی پر جھول رہا ہے۔ بیوی اور بچے کھونٹی کے نیچے پڑی چارپائی پر سو رہے تھے۔ خیال آیا کہ یہ سانپ میری بیوی بچوں کو نہ کاٹ لے۔ کہیں نیچے اتر کر مجھے نہ ڈس لے اس خیال کا آنا تھا کہ لاٹھی لے کر اس زور سے سانپ پر وار کیا کہ وہ پٹ سے نیچے گرا اور بے حس د حرکت ہو گیا۔ میاں افیمچی نے ایک بڑے برتن سے اسے ڈھک کر رکھ دیا اور سوچا کہ اب صبح کو اپنی بہادری کے کارنامے سنائیں گے۔

جب صبح ہوئی تو افیمچی نے اپنی بیوی سے کہا کہ میں نے آج رات ایک بہت بہادری کا کام کیا ہے۔ تم لوگوں کی جان بچائی ہے۔ بیوی بولی کیا کام کیا ہے" افیمچی نے کہا" پہلے سب گھر والوں کو بلاؤ اور ان سب پر سے صدقہ اتارو تو بتاؤں گا" چنانچہ ایسا ہی

کیا گیا گھر والوں پر سے صدقہ اتارا گیا تو افیمچی سب کو لے کر برتن تک پہنچے اور کونڈے کو اٹھاتے ہوئے بولے:۔ "میں نے سیاہ ناگ مارا ہے۔ کونڈے کے نیچے بیوی کی کالی چوٹی پڑی تھی۔ سب ہنس پڑے۔

میاں افیمچی کو اپنے اوپر بہت غصہ آیا اور شرمندگی سے ان کی گردن جھک گئی آج انھیں پھر اپنے باپ کی وہ نصیحت یاد آگئی "اگر دنیا میں عزت اور مرتبہ حاصل کرنا چاہتے ہو تو بری عادتوں سے بچو . . . . . ٹھیک ہی تو کہا تھا پ نے۔ ان کی نصیحت کو بھلا کر ہی اس نے افیم کھانے کی لت لگائی تھی۔ اور آج یہ شرمندگی اٹھانی پڑی تھی . . . . اور لوگوں کی نظروں میں حقیر ہونا پڑا۔

اور انھوں نے اسی وقت قسم کھائی کہ اب افیم کبھی نہیں کھاؤں گا۔ جب سے اب تک افیمچی نے افیم کو چھوا تک نہیں وہ برے کاموں سے دور رہتے ہیں۔ اب کوئی ان کا مذاق نہیں اڑاتا سب عزت کرتے ہیں۔ یہ بھی سب کے ساتھ اچھی طرح پیش آتے ہیں ★

عالیجاہ اتبی خان امروہوی

غلط مشورہ:۔

ایک گاؤں میں ایک جلاہا رہتا تھا۔ ایک دن وہ لکڑی کاٹنے کے لیے جنگل گیا پیڑ کاٹنا جونہی شروع کیا اس پیڑ سے ایک دیو نکلا اور اس نے کہا اس پیڑ کو مت کاٹو جو چاہو مجھ سے مانگو۔ جلاہے نے کہا میں اپنی عورت سے پوچھ کر بتاؤں گا۔ وہ گھر آیا اور اپنے دوست نائی سے کہا اس نے مشورہ دیا "اپنے کو بادشاہ بنوالو" اب اس نے اپنی بیوی سے پوچھا اس نے کہا "تم حکومت سنبھال نہ سکو گے۔ اس لیے تم اس دیو سے اپنے پیچھے کی طرف دو ہاتھ اور سر مانگو جس سے دونا کپڑا بن سکو گے۔" عورت کی بات مان کر اس نے یہ وردان مانگ لیا۔ دیو نے اسے وہ وردان دے دیا۔ خوش ہو کر جب دوسرا سر اور دو ہاتھ لے کر واپس آیا۔ لوگوں نے اسے بھوت سمجھ کر مار ڈالا۔

ابواللیث انصاری

لطیفہ: ——— جناب جمشید اشرف

ایک شاعر ایک امیر آدمی کے پاس گیا۔ اس کی بہت تعریف کی امیر آدمی بہت خوش ہوا۔ اس نے کہا۔ "نقد روپیہ تو میرے پاس ہے نہیں ہاں غلہ بہت ہے۔ اگر کل آؤ تو میں تم کو غلہ دے دوں گا۔"

دوسرے دن صبح ہی صبح شاعر امیر آدمی کے گھر پہنچ گیا۔ امیر آدمی نے پوچھا کیوں آئے ہو؟ اس نے کہا آپ نے کل غلہ دینے کا وعدہ کیا تھا اس لیے آیا ہوں۔" امیر آدمی نے کہا عجیب احمق آدمی ہو۔ کل تم نے اپنی باتوں سے مجھے خوش کیا میں نے بھی تمھیں خوش کر دیا۔ اب غلہ کیسا؟؟

ہمیں خط لکھتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیے آپ کی شکایت فوراً دور کی جائے گی۔

جواب طلب باتوں کے لیے جوابی کارڈ یا ٹکٹ بھیجیے ڈاک خرچ بہت بڑھ گیا ہے۔

منیجر

نام :- کوثر علی خاں تخلص آزاد عمر ۱۲ سال
مشغلے :- پیام تعلیم، کتاب نما، لائبریری کی کتابوں کا مطالعہ کرنا، نماز پڑھنا، کہانی لکھنا۔
پتہ :- محلہ دکھنواری مقام اکبر پور رھتاس ضلع شاہ آباد۔

نام :- رضوانہ خاتون جنت عرف منّی عمر ۱۲ سال۔ تعلیم ہفتم
مشغلہ :- کہانی لکھنا، پیام تعلیم، کلیاں، نور کا مطالعہ کرنا، نماز پڑھنا، قلمی دوستی کرنا۔
پتہ :- معرفت کوثر علی خاں آزاد محلہ رکھنواری مقام اکبر پور پوسٹ رھتاس ضلع شاہ آباد۔ بہار

نام :- اقبال احمد شیخ مصطفےٰ آبادی عمر ۱۳ سال
تعلیم :- درجۂ پنجم
مشغلے :- اردو کی خدمت کے لیے اخبار و رسائل خریدنا اور دوسروں کو خریدار بنانا، لطیفے لکھنا، قلمی دوستوں کے خطوط کا یقینی جواب دینا
پتہ :- معرفت وزیر مصطفےٰ آبادی اردو ٹیچر

پوسٹ آفس کاسوہ

پوسٹ آفس کاسودہ
تعلقہ ارنڈول ضلع جلگاؤں
مہاراشٹر اسٹیٹ

نام :- ابو قاسم انجم دھچھوی۔ عمر ۱۲ سال
پتہ :- کیرآف شرف الدین پان فروش محلہ لائن۔ کشن گنج۔ ضلع پورنیہ (بہار)
مشغلے :- قلمی دوستی، ٹکٹ اور فوٹو جمع کرنا، قصہ اور کہانی لکھنا اور سفر وغیرہ وغیرہ

نام :- شکیل احمد ابوجی عمر ۱۶ سال
پتہ :- ۲، نظامپور، بھیونڈی
مشغلہ :- پیام تعلیم پڑھنا، قلمی دوستی کرنا۔

نام :- ابوالقاسم انجم۔ عمر چودہ سال
پتہ :- ولد عبدالقادر مقام و پوسٹ دھچھا بارسوئی گھاٹ، ضلع پورنیہ (بہار)
مشغلہ :- مذہبی باتیں سننا، گھر میں کتب خانہ قائم کرنا، مختلف کھیل کھیلنا، قلمی دوستی کرنا وغیرہ

آدھی ملاقات

محترم حسین صاحب

چپراسی نے اور چیزوں کے ساتھ ایک بادامی رنگ
کا پیکٹ ذرا کثیف سا بھی دیا تھا۔ پیکٹ دیتے وقت یہ بھی کہا
تھا کہ سفارشی ہے۔ میں نے کچھ زیادہ توجہ نہیں کی تھی۔ اس
وقت ایک صاحب باہر کے تشریف فرما تھے۔ ان سے تبادلۂ
خیال کر رہا تھا۔ ۲/۱۱ بجے گھر جانے سے قبل اپنی میز کو مرتب
کرتے وقت نظر اس پیکٹ پر بھی پڑ گئی "پیام تعلیم" کے دو نئے
پرچے کچھ دیر ہاتھ میں لیے رہ گیا۔ کس نے بھیجے؟ کیوں بھیجے؟
یہی سوچتا ہوا گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ہمارے ساتھیوں نے
پرچوں کو لے لیا۔ وہ پیام تعلیم (ٹائیٹل) پڑھ سکتے تھے۔ سمجھے
کوئی نیا فارسی کا مجلہ ہے۔ گھر پہنچ کر حامدہ کو دئے۔ قریب
۲ بج چکے تھے۔ ناہار (غالباً دوپہر کا کھانا) کھانے بیٹھ گیا۔
"پیام تعلیم" کو بھی الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ کچھ دیر دونوں میرے
ہاتھ میں رہتے تو کچھ دیر حامدہ کے ہاتھ میں۔ آخیر میں حامدہ
کو دے دئے "پہلے تم دیکھ لو پھر میں دیکھوں گا۔" احسان
صاحب کا مضمون حامدہ کی زبانی سنا۔ کیا چیز انھوں نے لکھی
ہے۔ مضمون، کہانی، نصیحت۔ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن جو کچھ بھی
انھوں نے لکھا خوب لکھا۔ بات ذرا سی ہے لیکن اہم بہت
ہی خوبصورت پیرائے میں انھوں نے پیش کی ہے "پیام تعلیم" جب
میرے ہاتھ میں آئے تو سب سے پہلے، تعلیمی میلے کی رپورٹ
پڑھی۔ اسی کے ساتھ بہت سی یادیں تازہ ہوگئیں
یوں بھی آپ سب لوگ یاد آتے رہتے ہیں۔ لیکن اس
روز ایک عجیب کیفیت کے ساتھ۔ عبدالرشید۔

اصفہان (ایران)

مئی کا "پیام تعلیم" تو ٹھیک وقت پر آگیا لیکن
اس دفعہ عجیب تماشہ ہوگیا۔ پہلے اسے بڑوں نے ہی لوٹ
لیا۔ میرے ہاتھ دوسرے دن لگا۔ ہمیں سب سے بڑی خوشی
یہ ہوئی کہ پیام تعلیم کے خریدار بہت تیزی سے بڑھ رہے
ہیں خدا اس مہم کو کامیاب کرے آمین۔

معلوماتی مضمون "میکسم گورکی" بہت پسند آیا۔
"بانسری والا" بھی مزے دار ہے۔ کہانی میں سبق آموز کہانی
"فن کی قیمت" اور "مچھر" بہت دلچسپ ہے "گلاب" بھی
قابل تعریف ہے۔ میری طرف سے سب کو مبارکباد کہہ دیجیے۔

پیامی ایم۔ اسلم (گیا)

"پیام تعلیم" کا سالنامہ اور مئی کا شمارہ ایک ساتھ
رجسٹری سے ملا۔ اس نوازش کا دلی شکریہ۔ سالنامے کے
جیسے ہی سرورق پر نظر پڑی دل باغ باغ ہوگیا۔ آپ نے
حقیقت میں سالنامہ بے حد شاندار نکالا ہے۔ اس کا ٹائٹل
اور مضامین۔ نظمیں۔ کہانیاں۔ ڈرامے سبھی اچھے ہیں اور مئی
کا شمارہ بہت اچھا ہے۔

آپ نے پیام تعلیم میں باغبانی پر جو مضامین کا
اضافہ کیا ہے بہت پسند آیا۔ آپ نے رسالے کی ضخامت
اور سائز میں اضافہ کیا ہے۔ ہدایت کے متعلق میں بھی
خریدار بڑھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔

سید محمد واحد
شبیر گھاٹی

پیام تعلیم اتنی تیزی وسرعت کے ساتھ ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے حیرت ہوتی ہے۔ مضامین تمام شستہ اور سبق آموز ہوتے ہیں۔ تصاویر بے حد جاذب نظر ہوگئی ہیں۔ نظم کا حصہ بھی قابلِ تعریف ہوتا ہے۔

مئی کا شمارہ بھی اپنی مثال آپ ہے "میکسیم گورکی" اور "چوہا بڑا یا ہاتھی" جیسے معلوماتی مضامین بہت اچھے ہیں۔ میرا خیال ہے پیام تعلیم کی ترقی کا ایک بڑا سبب ایسے مضامین ہیں۔ "پھلواری" بہت اچھا جا رہا ہے۔ "گلاب" بھی بہترین ہے۔ کہانیاں بھی دلچسپ اور قابلِ ستائش ہیں۔ ایک پرانی لوک کہانی کو فرحت قمر صاحب نے "بانسری والا" کے نام سے بڑے اچھے انداز میں منظوم کیا ہے۔

واقعی پیام تعلیم کا ہر شمارہ معلومات اور دلچسپیوں کا ذخیرہ ہوتا ہے۔ بلاشبہ اسے ہند و پاک کے کسی بھی رسالے کے سامنے فخر سے رکھا جا سکتا ہے۔

فیاض احمد فیضی (بمبئی نمبر ۳)

نئے شمارے کا شدت سے انتظار تھا! آخر وہ ۴ رجون کو میرے ہاتھوں میں آ ہی گیا۔ میں نے بڑی دلچسپی سے اس کا مطالعہ کیا اس بار مجھے "جیسے کو تیسا" والی نظم بہت اچھی لگی۔ اس کے لکھنے والے کو مبارکباد دیتا ہوں "سفرنامہ ابن بطوطہ" اور "پنچ تنتر کی کہانیاں" کی قسطیں بھی بڑی دلچسپ ہیں۔

ایم پرویز (شری پور)

اس ماہ کا پرچہ بہت اچھا اور دلچسپ ہے سرورق کافی عمدہ اور دیدہ زیب ہے۔ یقین جانئے پیام تعلیم ہر اعتبار سے بہترین اور کامیاب ہے۔ پیام تعلیم کی سب ہی تخلیقات پسند آئیں "پھلواری لگائے" کا سلسلہ بہت اچھا اور معلومات والا ہے۔ مجھے یہ سلسلہ خاص طور پر پسند آیا۔ جناب سیفی غازی ایوبی کا مضمون گلاب انتہائی معلومات والا ہے۔ یہ سب دیکھ کر دل کو از حد سرور حاصل ہوا۔ اتنا اچھا اور پیارا پرچہ نکالنے پر آپ سب لوگ مبارکباد قبول فرمائیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ پیام تعلیم کو لمحہ بہ لمحہ ترقی نصیب کرے۔ آمین

سانڈر دیوکر۔
کاسودہ جلگاؤں۔

ذرا نیچے دیکھیے:

ایک گول دائرہ سا بنا ہے۔ اس گول دائرے میں ایک سرخ نشان ہے۔ اس سرخ نشان کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی خریداری کی مدت اس مہینے ختم ہو رہی ہے۔

کچھ دنوں سے ہم نے پیام تعلیم کی خریداری کی مہم چلا رکھی ہے۔ یہ مہم خدا کا شکر ہے کہ کامیابی سے چل رہی ہے پچھلے مہینے تو ہم نے آپ کی مدد اور سرپرستی کی بدولت ذرا زیادہ تیزی سے قدم بڑھایا۔ لگ بھگ دو ڈھائی سو پیامی آپ کی پیام تعلیم کی برادری میں شامل ہو گئے۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ بھی نہ صرف اپنی سرپرستی جاری رکھیں گے بلکہ اس برادری کو اور زیادہ آگے بڑھانے کی کوشش کریں گے۔ پیام تعلیم کے زیادہ سے زیادہ خریدار بنانے کی کوشش کریں گے۔

اس مہینے کی ۲۵ تاریخ تک مبلغ چھ روپے کا منی آرڈر بھیج دیجیے۔ اور ہاں منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیے۔ آپ کا خریداری نمبر ـــــ ہے۔

"منیجر"

صحافی

اِدھر اُدھر سے

میز پوش ہمارے کس کام کا۔

چڑیا گھر والوں نے میاں چمپانزی کے لیے ایک میز پوش کا انتظام کیا تھا کہ یہ سلیقے سے کھانا کھائیں۔ مگر میاں چمپانزی کو یہ کچھ پسند نہ آیا۔ دسترخوان پر چنے ہوئے کھانے کو الٹ وہ پیڑ کی شاخ پر جا بیٹھے اور میز پوش کو ایک ڈال میں رسی کی طرح پھنسا کر اپنے کٹ گھرے نکلنے کی ناکام کوشش کرنے لگے۔

چڑیا گھر کی سیر

بندروں کی دھما چوکڑی اور جنوبی اور شمالی ہندوستان کے بندروں میں جنگ

دلی کے چڑیا گھر میں بڑے مزے کی بات ہوئی آپ بھی سنیے ؛ یہاں اب تک بندروں کو علیحدہ علیحدہ جالی دار کمروں میں رکھا جاتا تھا۔ ابھی کچھ دن پہلے انھیں ایک بڑے سے میدان میں کھلی ہوا میں منتقل کیا گیا ہے، جس کے چاروں طرف جھیل اور باڑھ میں لگی ہوئی ہیں۔ مختلف قسم کے بندروں کو الگ الگ حصّوں میں رکھا گیا ہے۔

ایک دن ایک بندر نے ایک کھمبے کے سہارے باہر نکلنے کا راستہ دریافت کرلیا اور چپکے سے نکل کر سارے چڑیا گھر کی سیر کر آیا اور کھانے کے وقت پھر اُسی کھمبے کے سہارے میدان میں آدھمکا۔ اس کی دیکھا دیکھی اور بھی بندروں کے دل میں سیر و تفریح کی سمائی اس کے ساتھ مٹرگشت کے لیے نکلنے لگے اور اب یہ لوگ چڑیا گھر کے علاوہ پاس کی بستی کی سیر کرنے لگے۔ مگر کھانے کے وقت یہ سب کے سب اپنی اپنی جگہ واپس آجاتے جس سے چڑیا گھر والوں کو ان کے اس سیر سپاٹے کا بہت دنوں تک پتہ نہیں چل سکا۔ بعد میں جب پتہ چلا تو وہ کھمبا وہاں سے ہٹا دیا گیا۔

مگر ان بندروں کو تو کوئی نہ کوئی مشغلہ چاہیے تھا۔ ادھر سے راستہ بند ہوا تو انھوں نے دوسرے غول کے بندروں کی طرف رُخ کیا۔ جھیل کے اس پار جنوبی ہند کے بندروں کا باڑا تھا۔ ایک دن یہ بندر جھیل تیر کر اُس پار چلے گئے اور ان بندروں کے کھانے پر ہاتھ صاف کرنا شروع کیا اور پھر گویا یہ ان کا معمول بن گیا جنوبی ہند والے بندروں نے کچھ دنوں تو صبر کیا۔ مگر کب تک آخر دونوں میں باقاعدہ جھڑپ ہونے لگی۔ اب چڑیا گھر والوں کے کان کھڑے ہوئے اور ایسا انتظام کیا گیا کہ یہ بندر ایک دوسرے کے باڑے میں نہ جانے پائیں۔

نہرو ایوارڈ

گذشتہ سال سے حکومتِ ہند پنڈت نہرو کی یاد میں ہر سال ایک لاکھ روپیے کا ایک انعام دیتی ہے یہ انعام دنیا میں باہمی میل محبت اور امن قایم کرنے کے لیے نمایاں کام کرنے والوں کو دیا جاتا ہے۔ گذشتہ سال یہ انجمن اقوام متحدہ یا یو۔ان۔او کے سکریٹری جنرل یو تھانٹ کو دیا گیا تھا۔ اس سال امریکہ کے نیگرو لیڈر آنجہانی مارٹن لوتھر کنگ کو دیا گیا ہے اعلان ان کے قتل کے بعد کیا گیا۔

مارٹن لوتھر کنگ کو کسی سر پھرے نے ابھی دو مہینے پہلے گولی کا نشانہ بنا دیا تھا۔ ان کے قتل کے بعد امریکہ کے صدارتی عہدے کے امیدوار سینیٹر رابرٹ کنیڈی بھی گولی کا نشانہ بنا دیئے گئے ہیں۔

جنگ کا ایک دن کا خرچ اقوام متحدہ کے ایک سال کے خرچ کے برابر

بچوں کی بہبود کے بین الاقوامی ادارے کی مجلس عاملہ کے سامنے تقریر کرتے ہوئے گذشتہ دلوں

سکریٹری جنرل شری یو تھانٹ نے کہا کہ ویت نام کی
لڑائی میں ایک دن کا خرچ انجمن اقوام متحدہ یا یو۔ان
او کے ایک سال کے خرچ کے برابر ہوتا ہے۔ انھوں
نے امید ظاہر کی ایک نہ ایک دن دنیا سے جنگ کا
خاتمہ ضرور ہوگا اور دنیا کی تباہی کے لیے خرچ کی جانے
والی یہ رقم دنیا کے بچوں کی بھلائی کے لیے خرچ کی
جا سکے گی۔

بچوں کا دن

روس اور دنیا کے کچھ دوسرے
ملکوں میں ہر سال یکم جون کو بچوں کا دن منایا جاتا
ہے۔ روس میں یہ دن ۱۹۴۹ء سے منایا جا رہا ہے۔
اس سال بھی یہ دن بہت دھوم دھام سے منایا گیا۔
ہمارے یہاں ۱۴ر نومبر کو بچوں کا دن
منایا جاتا ہے۔ بچوں کے پیارے چاچا نہرو کا جنم
اسی دن ہوا تھا۔

نوجوان جو سائیکل پر دنیا کی سیاحت کر رہا ہے

ایک بنگالی نوجوان بمل کانتی ڈے عنقریب
سائیکل پر دنیا کی سیاحت کرنے کے لیے ہندوستان
سے روانہ ہوگا ڈے کی عمر ۲۶ سال ہے وہ ۲۰ دسمبر ۶۷ء
کو کلکتہ سے روانہ ہوا۔ اب تک وہ نئی دہلی، رشی کیش،
کابل اور تاشقند جا چکا ہے وہ بمبئی کے کشتی کے ذریعے ایران
روانہ ہوگا اور وہاں سے براستہ ترکی بلغاریہ پہنچے گا۔ بلغاریہ
میں وہ ان تین نوجوانوں سے مل جائے گا جو دنیا کا پیدل
سفر کر رہے ہیں اس کے بعد وہ رومانیہ اور پھر وہاں سے
روس پہنچے گا۔ ڈے ایک دن میں سائیکل پر ۱۵۰ میل
سفر کرتا ہے۔ اسے توقع ہے کہ وہ ۸۴ ہزار کلومیٹر سفر
کرے گا۔ وہ راستہ میں اپنی گذر بسر کے لیے مختلف کام کرتا
ہے۔ وہ سفر کے حالات اپنی ایک ڈائری پر لکھ رہا ہے
جب وہ چھ سال کے بعد واپس آئے گا تو ڈائری کو چھپوائے
گا۔ وہ ایم۔ ایس سی پاس ہے وہ تیراک بھی ہے اس کے
علاوہ اس کے پاس کوہ پیمائی کا ڈپلومہ ہے جو اس نے
دارجلنگ کے تربیتی انسٹی ٹیوٹ سے حاصل کیا ہے۔
مختلف ممالک کے کھیلوں کے کلبوں سے اسے اب
تک ۱۲ تمغے مل چکے ہیں۔ تین سال قبل اس نے نیپال
بھوٹان، افغانستان اور جاپان کی سیاحت کی تھی۔

مغربی جرمنی میں دس ہزار جادوگر

جادوگروں کی ایک تنظیم کی طرف سے یہ بتایا گیا
ہے کہ مغربی جرمنی میں جادوگروں کی تعداد دس ہزار ہے جو
"کالے جادو" سے کام لیتے ہیں، مغربی جرمنی کے لوگ انتہائی
توہم پرست ہیں اس لیے ان میں سے لاکھوں ایسے ہیں جو ان
جادوگروں کے معتقد ہیں اور ان سے اپنے جسمانی اور دماغی
عوارض کا علاج کراتے ہیں۔ دور افتادہ دیہات میں بہت سی
بوڑھی عورتوں کو اس بنیاد پر پیٹا جاتا ہے کہ ان کے ہمسائے
انھیں جادوگرنیاں خیال کرتے ہیں، مغربی جرمنی کی دوا ساز
فرمیں خفیہ طور پر ایسی ادویات تیار کرتی ہیں جن کے نام کچھ اس
طرح کے ہوتے ہیں "شیطان کی مٹی" "جادو کا پاؤڈر" اور
"اژدہا کا خون" جرمنی کی کتابیں چھاپنے والی فرمیں جادو کے
بارے میں کتابیں چھاپ رہی ہیں۔ جن میں جادو کے اسباق
ہوتے ہیں، کالے جادو کے مقابلہ میں کچھ سفید جادو کے
ماہرین منظر عام پر آگئے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ وہ کالے

جادو کے اثرات کو دور کر سکتے ہیں۔

سگریٹ پینے والے بندر

حکومت کی طرف سے ہدایت کی گئی کہ برطانیہ کے دکانداروں کو وہ سگریٹ پینے والے بندر کا کھلونا بچوں کے ہاتھ فروخت نہ کریں۔ یہ کھلونا جاپان کا بنا ہوا ہے اور اس کے کھیلنے والے بہت سے بچے جل کر زخمی ہو چکے ہیں۔

یہ سگریٹ ایک خاص قسم کی گھاس سے تیار کیے جاتے ہیں۔ جب انہیں جلایا جاتا ہے تو اس سے دھوئیں کے چھلے نکلتے ہیں اس مقصد سے ان سگریٹوں کو تیل میں تر کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح اکثر اوقات شعلے اٹھنے لگتے ہیں اور بچوں کو نقصان پہنچتا ہے۔

سونے کا کھوج لگانے والے پودے

سوویت وسطی ایشیا کے جنگلی پودے معدنیات کا کھوج لگانے والے کا رول زیادہ سے زیادہ کامیابی کے ساتھ ادا کر رہے ہیں۔ سوویت سائنس والوں نے معدنیات کے کھوج کے جو حیاتی کیمیاوی طریقے معلوم کیے ہیں وہ اس انوکھی حقیقت پر مبنی ہیں کہ پودے زیر زمین پانی کی مدد سے اپنے اندر ایسے معدنیاتی مادے جذب کر لیتے ہیں اور ان کا ذخیرہ کرتے ہیں جو عام طور پر انسانی نظروں سے پوشیدہ ہوتے ہیں۔ پودے خاص طور پر کمیاب دھاتوں اور بالخصوص سونے کے بڑے بھوکے ہوتے ہیں۔ پودوں کے دھاتوں اور بالخصوص سونے کو جذب کر لینے اور ان کا ذخیرہ کرنے کے انتہائی پیچیدہ مظہر کی میکانیت کا ابھی کم مطالعہ نہیں کیا جا سکا ہے۔ (تاس)

ہیلن کیلر کا انتقال

اندھی گونگی اور بہری عورت جس کا شمار دنیا کے بڑے عالموں میں ہوتا ہے۔

محترمہ ہیلن کیلر کا یکم جون کو ویسٹ پورٹ میں انتقال ہو گیا۔ وہ ۸۷ برس کی تھیں۔ بے چاری ڈیڑھ سال کی عمر میں اندھی ہو گئی تھیں، گونگی اور بہری تو پیدا ہی ہوئی تھیں۔ مگر ایک معلمہ کی مدد سے انھوں نے پڑھنا لکھنا سیکھا اور دنیا کی بڑی ہستیوں میں ان کا شمار ہونے لگا۔

ان کی زندگی انسانی عزم، حوصلے اور محنت کی کہانی ہے۔ دنیا کی ساری رکاوٹیں اس عزم اور حوصلے کے آگے ہیچ ہیں۔ اور محترمہ ہیلن کیلر اس کا زندہ ثبوت ہیں۔ ہیلن کیلر نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں ان کی جس کتاب کو سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی وہ خود ان کی "آپ بیتی" ہے۔ انھوں نے لیکچر بھی دئے ہیں اور دنیا کے مختلف ملکوں کا دورہ بھی کیا ہے۔ ہندوستان بھی آئی ہیں۔ ان ملکوں میں ان کی زندگی پر ایک فلم بھی بنائی گئی ہے۔

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس دریا گنج دہلی میں آفسٹ پر چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی سے شائع کیا

Regd. No. D. 1457. JULY 1968.

PAYAM-I-TALEEM

New Delhi-25.

پیامِ تعلیم
فی پرچہ ۶۰ پیسے
چندہ سالانہ ۶ روپے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنسس بلڈنگ بمبئی ۲

ماہنامہ
پیام تعلیم
نئی دہلی
جلد ۵
شمارہ ۷
اگست ۱۹۶۸ء
ایڈیٹر: محمد حسین حسان ندوی
صدر دفتر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵
شاخ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اردو بازار دہلی ۶
شاخ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳
شاخ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ شمشاد مارکیٹ علی گڑھ
فی پرچہ ۶۰ پیسے
چندہ سالانہ ۶ روپے

سرورق کی تصویر

یہ بھی میری پیاری سہیلی ہے۔جی ہاں !!

فوٹو۔شاہد علی خاں

فہرست

بچوں سے باتیں

ایڈیٹر

لیجیے جناب چھٹیاں تو ختم ہوگئیں۔ خود ہماری جامعہ میں کچھ دن پہلے کیسا سناٹا تھا۔ پر اب تو خوب چہل پہل ہے۔ مدرسہ ابتدائی، ثانوی، کالج رورل انسٹی ٹیوٹ، ٹیچرس کالج غرض سبھی ادارے کھل گئے ہیں۔ جدھر دیکھیے بچوں کے بڑے لڑکوں کے اور کالج کے نوجوانوں کے غول کے غول نظر آرہے ہیں۔ ہنستے بولتے، چہلیں کرتے، جیسے زندگی نے دوبارہ جنم لیا ہے۔

یہ چہل پہل آپ کے ہاں بھی ہوگی۔ پرانے ساتھی گلے مل رہے ہوں گے۔ کچھ ساتھی آخری امتحان دے کر رخصت ہوگئے ہیں، ان کی اچھی اچھی باتیں یاد آرہی ہوں گی۔ نئے ساتھیوں سے جان پہچان دوستی میں بدل گئی ہوگی۔

دو مہینے کی لمبی چھٹیوں کے بعد آپ تازہ دم ہو کر [مدرسہ]ل کے احاطے میں داخل ہوئے ہیں۔ پڑھنے لکھنے کے ایک [نئے] جوش اور ولولے کے ساتھ آگے بڑھنے کی ترقی کرنے کی [ارما]نوں کے ساتھ۔ خدا آپ کی امنگوں کو پورا کرے اور آپ [قدم] بہ قدم ترقی کے زینوں پر چڑھتے چلے جائیں۔ آمین

آپ میں سے بہت سے پرجوش پیامیوں نے اور [پیا]م تعلیم کے قدردان استادوں نے ہم سے ایک وعدہ کیا تھا۔ چھٹیوں کے بعد مدرسے کھلنے پر پیام تعلیم کے زیادہ سے زیادہ خریدار بنانے کی کوشش کریں گے۔ یہ وعدہ ہم یاد دلاتے ہیں

پیام تعلیم برسہا برس سے آپ کی خدمت میں لگا ہوا ہے۔ یوں سمجھیے کہ ۲۶ء سے نکل رہا ہے۔ یہ بات تو کئی بار آپ کے کانوں میں پڑ چکی ہے۔ یہ بھی ہم بتا چکے ہیں کہ پیام تعلیم کا شروع سے ایک مقصد رہا ہے۔ بچوں کے لیے صاف ستھرا اور صالح ادب پیدا کرنا۔ ایسا ادب جو پیامیوں میں ذہنی بیداری اور تعمیری ذہنیت پیدا کرے ہم اپنے مقدور بھر برابر اسی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ اور آپ کے اور آپ کے بزرگوں کے جو خط وقتاً فوقتاً ہمیں ملتے رہتے ہیں۔ ان سے ایک بات کا اندازہ تو ضرور ہوتا ہے۔ یہ کہ ہم اپنی راہ سے بھٹکے نہیں ہیں اور آپ ہماری ان کوششوں کو پسند فرماتے ہیں۔

بقول محترمی ذاکر صاحب (صدر جمہوریہ) "مجھے ہندوستان کے تقریباً ہر گوشے میں ایسے لوگ ملے ہیں جو اب اچھا لکھنے والے سمجھے جاتے ہیں اور جنھوں نے پہلے پہل کچھ پیام تعلیم کے لیے لکھا تھا۔" ان کے علاوہ پیام تعلیم کے پہلے دور کے پڑھنے والے خیر سے سیانے بلکہ آل اولاد والے ہو چکے ہیں ان سے اور پیامیوں کی نئی پود سے ہمیں امید ہے کہ نیا

اپنے پیام تعلیم کی زیادہ سے زیادہ سرپرستی کریں گے اور اسے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے میں پورے جوش و خروش سے مدد دیں گے۔ یہ امید کچھ بے جا تو نہیں!

ـــــــــــــ

وقت بہت تیزی سے گذر رہا ہے۔ اگلے سالنامے کی فکر سوار ہے۔ ہمارا پچھلا سالنامہ آپ نے غیر معمولی طور پر پسند کیا اور اس نے ایک یادگار کی شکل اختیار کر لی۔ ظاہر ہے ہماری آپ کی یہ متفقہ خواہش ہے کہ ۱۹۶۹ء کا سالنامہ پہلے سے بہتر نکلے، بہت بہتر نکلے۔ پچھلے سال محترم تاباں صاحب کی ہمت افزائی اور فراخ دلی آڑے آئی، انھوں نے دل کھول کر روپیہ خرچ کیا، مگر اب ہم چاہتے ہیں کہ مکتبے پر بوجھ نہ ڈالیں خود پیام تعلیم یہ بار برداشت کرے۔ اگر آپ توجہ کریں تو ہماری یہ مشکل حل ہو سکتی ہے اپنے حلقے میں زیادہ سے زیادہ خریدار بنایئے اور شہروں میں اخبارات کے ایجنٹوں سے کہیے کہ پیام تعلیم منگائیں۔

ـــــــــــــ

اس سلسلے میں ہمارے بہت سے مخلص ساتھی لگاتار کوشش میں لگے ہوئے ہیں ہمارے دو خاص شاعروں اور سرپرستوں جناب عادل جعفری اور سیف سہسرامی نے دو دو خریدار اور مرحمت فرمائے ہیں، ایک خریدار حمید عثمانی صاحب (الٰہ آباد) نے اور دیا ہے۔ پانچ خریدار ہمارے سب سے پرانے سرپرست محمد حسین صاحب حیدرآبادی نے مرحمت فرمائے ہیں چھٹیوں میں حیدرآباد تشریف لے گئے تھے۔ مگر اپنے پیام تعلیم کو نہیں بھولے۔

ـــــــــــــ

ان کے علاوہ محترم اختر صاحب، قاضی رشید صاحب (ہمدرد دواخانہ دہلی) اور ان کے معزز ساتھی محترم شمس ادیب صاحب، محترم حفیظ الدین صاحب (علی گڈھ) جناب بزمی بھارتی (علی گڈھ) بڑے خلوص اور دلی لگن سے طرح ہماری مدد کی کوشش فرما رہے ہیں۔ محترم فضل الرحمن صاحب نے ہمیں گیارہ خریدار مرحمت فرمائے ہیں۔ رہے اختر صاحب تو ان کی بدولت ہر تیسرے چوتھے دن ہمیں ایک خریدار مل جاتا ہے۔

ـــــــــــــ

پچھلا پیام تعلیم بچوں نے بہت پسند کیا قریب قریب سبھی مضمون انھیں اچھے لگے۔ مگر جناب دینا ناتھ گرد کے مضمون میں ایک دل چسپ غلطی ہو گئی۔ اس غلطی کا پتہ عزیزی ندرت حسین (سہارنپور) کے ایک خط سے لگا۔ اس طرح کی غلطیاں اخباروں اور رسالوں میں اکثر ہو جاتی ہیں کاتب صاحب لکھنے کی دھن میں کچھ کا کچھ لکھ جاتے ہیں اور پروف پڑھنے والے صاحب بھی چوک جاتے ہیں۔ ہوا یہ کہ جولائی کے پرچے میں گیارویں صفحے پر دوسرے کالم کے دوسرے پیراگراف کی چھٹی سطر میں (پیام تعلیم جولائی ۱۸ ۱۹۵۳ء کی جگہ ۱۹۳۵ء چھپ گیا ہے۔ اس ذرا سی غلطی کی وجہ سے پڑھنے والا بہت الجھن میں پڑ جاتا ہے۔ پیامی اپنے رسالے میں اسے ٹھیک کر لیں۔

ـــــــــــــ

اس پرچے میں "گُمّے کا رمضان" آدمی، سانپ، مجاہدین آزادی کہانیں گے، آپ کو غیر معمولی طور پر پسند آئیں گے۔ دینا ناتھ جی اپنی نواسی کا بالکل سچا واقعہ لکھا ہے بلا کم و کاست لکھا ہے مگر کہانی کا سا لطف آتا ہے۔ اگلے پرچے میں اسی طرح کی ایک اور کہانی پڑھیے گا۔ یہ بھی سچی کہانی ہے۔ بہت دلچسپ اگلے پرچے میں اور بھی اچھے اچھے مضمون ہوں گے۔

جناب عادل جعفری

مل جل کے خوب جھوم کے گانے کا دن ہے آج
آزادیٔ وطن کے منانے کا دن ہے آج

بچے بھی خوش ضعیف بھی خوش نوجوان بھی خوش
ہم سب کے ساتھ آج ہے سارا جہان خوش

ہے آج اپنے ملک پہ خود اپنا راج ہی
پائی تھی ہم نے منزلِ مقصود آج ہی

یہ بات یاد رکھیے کہ یہ دن ہے یادگار
ایّامِ سعد و نیک میں اس دن کا ہے شمار

گردن جھکا کے رہتے تھے ہندوستاں میں ہم
اس روز سربلند ہوئے تھے جہاں میں ہم

مدت کے بعد پائی تھی آزاد زندگی
توڑی تھی ہم نے آج ہی زنجیرِ بندگی

پایا تھا وہ جو چاہتے تھے شاد ہو گئے
للکار کے کہا تھا "ہم آزاد ہو گئے!"

اب ہم پہ فرض ہے کہ رکھیں اس کا ہم وقار
کھوئیں نہ پا چکے ہیں جو آزادی ایک بار
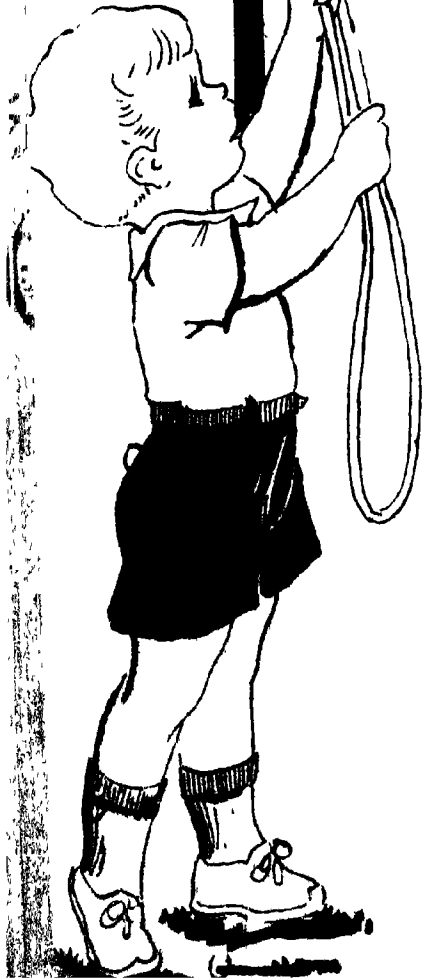
مکّے کے رمضان

جناب عبدالملک
بی۔اے جامعہ مہاجر مدینہ منورہ

مکّے کے رمضان کا کچھ تھوڑا سا حال آپ پچھلے سال پڑھ چکے ہیں۔ شاید آپ کو یاد نہ رہا ہو۔ جون ۶۷ء کے پرچے میں صفحہ ۵ نکالیے ابن بطوطہ نے مکّے کے سفر کے سلسلے میں مکّے کے رمضان کا بھی مختصر سا ذکر کیا ہے یہ اب سے لگ بھگ چھ سات سو برس پہلے کی بات ہے۔ اسے پڑھنے کے بعد آپ اس مضمون کو پڑھیں گے تو ایک خاص بات محسوس کریں گے۔ اتنی مدت گزرنے پر بھی مذہبی جوش و خروش عبادت کا شوق و ذوق وہی ہے۔ اور یہ بڑی خوشی بڑے اطمینان کی بات ہے۔

ایڈیٹر

جدہ سے مکہ شریف آنے والی سڑک اس مقدس شہر کی سب سے بڑی سڑک ہے۔ جو دن رات چلتی رہتی ہے۔ دنیا کے سارے حاجی اسی راہ سے مکہ میں داخل ہوتے اور واپس ہوتے ہیں۔ اور دنیا کے گوشہ گوشہ سے تجارت کا مال جس سے مکہ کے بازار پٹے پڑے ہیں۔ اسی راستہ سے آتا ہے۔ ہمارا گھر (مسافر خانہ) اسی سڑک پر واقع ہے۔

کل رمضان شریف کا پہلا روزہ تھا۔ دل تو یہ چاہتا تھا کہ حرم شریف میں افطار کروں۔ وہاں کا سا لطف گھر میں کہاں مگر گھر میں چھوٹے بچوں کا روزہ تھا ان کی خاطرداری منظور تھی۔ گھر ہی میں کھولا۔

نماز کے لیے باہر (محلہ کی مسجد) کی طرف آیا تو اس سب سے پر شور سڑک پر سناٹا ہے بس ایک ہُو کا عالم، بالکل سنسان۔ کوئی آدم نہ آدم زاد۔ دکانیں اکثر بند اور جو کھلی تھیں ان کے دکاندار غائب

اس سڑک کو اتنا سنسان کبھی رات کے پچھلے پہر میں بھی نہیں دیکھا گیا۔ آخر یہ ساری مخلوق اس وقت کہاں گئی۔ بے شمار موٹریں، گاڑیاں اور لاریاں بھی تو اسی سڑک پر دوڑتی رہتی ہیں۔ اس وقت یہ سب کہاں ہیں۔ جواب اس کے سوا کیا ہوسکتا ہے کہ افطار میں اور نماز میں

اصل شہر تو سارا حرم شریف کے اندر ہی پہنچا ہوا ہے۔ باقی مسجدوں میں نماز پڑھ رہے ہیں یا گھروں میں افطار کر رہے ہیں۔ دل نے کہا کہ بس یہ ہے اسلامی شہر۔ میں نماز پڑھ کر مسجد سے نکلا تو۔ اکا دکا آدمی نظر آئے اور تیزی کے ساتھ پاس سے ایک موٹر بھی گذر گئی۔

مکہ شریف میں گرمی بھی پڑتی ہے۔ لو بھی چلتی ہے۔ روزہ سخت ہوتا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ میں نے گرمی کے اعتبار سے لاہور، دلی اور مکہ شریف میں کوئی خاص فرق نہیں پایا۔ البتہ ہمارے ہاں کی گرمی کی ایک خاص قسم سڑی ہوئی گرمی

میں نے یہاں نہیں دیکھی۔

شہر کے گرداگرد پہاڑیاں ہونے کی وجہ سے اکثر پہلی تاریخوں کا چاند یہاں نظر نہیں آتا۔ جنتری کے حساب سے نیسویں تاریخ تھی کہ حکومت کی طرف سے مغرب کے وقت توپیں چھوٹنا شروع ہوئیں۔ جن سے سارے شہر میں اعلان ہوگیا کہ رمضان شریف آگئے۔

توپیں دغتے ہی شہر میں چاروں طرف ایک ہاہی اور چہل پہل شروع ہوگئی۔ لوگوں نے ایک دوسرے کو رمضان کی آمد پر مبارکباد دینا شروع کی۔ راستہ میں جو ملتا وہ سلام کرتا اور مبارکباد دیتا۔ ساری رات مبارک سلامت ہوتی رہی۔ گھر میں داخل ہوا تو ساتھ کے پڑوسی تشریف لائے اور رمضان کی مبارکباد پیش کی۔

رات ہی میں میں نے دیکھا کہ بچے اور جوان لڑکے صاف ستھرے کپڑے اور نئے رومال (جو یہاں زینت کا ایک نشان ہیں) کندھوں پر ڈالے ہنستے کھیلتے اس طرح حرم شریف کی طرف (تراویح کے لیے) جا رہے ہیں جیسے ہمارے ہاں عید کو جاتے ہیں

میں بھی تھوڑی سی تیاری کے بعد حرم شریف آگیا۔ عشار، فجر اور نماز مغرب کے نمازیوں کی کثرت کے اعتبار سے دنیا میں اس مسجد کا کوئی مقابل نہیں۔ بلکہ یہی حال عصر اور ظہر کا ہے۔ اور یہی حال تراویح کا۔ اور جمعہ تو یہاں بس عید ہوتا ہے۔

صفوں کا یہاں شمار نہیں کیا جاسکتا۔ نمازی دس ہزار ہوتے ہیں، پندرہ ہزار یا بیس ہزار اندازہ ہوتا ہے۔ ایام حج میں یقیناً نماز مغرب میں ایک لاکھ سے اوپر ہوتے ہیں۔

نماز مغرب یہاں ٹھیک بارہ بجے ہوتی ہے اور اسی وقت یہاں گھڑیوں کو درست کیا جاتا ہے۔ اور خود اس گھڑی کو بھی جو اس ام القریٰ میں ام الساعات (گھنٹہ گھر) ہے۔ سارے شہر میں گھڑیاں اسی سے ملائی جاتی ہیں۔

نماز مغرب کی طرح عشار کا بھی ایک وقت معین ہے یعنی وہ ہمیشہ ڈیڑھ بجے ہوتی ہے۔ مغرب کے ڈیڑھ گھنٹے بعد۔ فجر، ظہر، عصر کے وقت موسم کے ساتھ گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں۔ مگر رمضان میں عشار کی اذان ڈیڑھ کی بجائے دو بجے ہوتی ہے۔

تراویح ساڑھے تین کے قریب ختم ہوتی ہے۔ امام صاحب قرأت کے ساتھ قرآن مجید پڑھتے ہیں۔ مگر تراویح پر (یعنی ہر چار رکعت کے بعد) بیٹھتے نہیں۔ سلام پھیرا اور کھڑے ہوئے، حتیٰ کہ بیس رکعت کے بعد بھی نہیں بیٹھتے فوراً وتر کو کھڑے ہوجاتے ہیں

امام صاحب کا مسلک حنبلی ہے۔ ان کے ہاں وتر کی تین رکعتیں ایک ساتھ نہیں پڑھی جاتیں۔ دو رکعت نماز پڑھ کر سلام پھیر دیتے ہیں اور تیسری رکعت کو الگ پڑھ کر پھر سلام پھیرتے ہیں۔ تیسری رکعت میں رکوع کے بعد دعائے قنوت پڑھتے ہیں یہ ان کے ہاں رکوع کے بعد ہی پڑھی جاتی ہے۔ اور بلند آواز کے ساتھ۔

امام صاحب کی آواز اس موقع پر خاص طور پر بلند ہوتی ہے۔ اور بہت دل سے دعا مانگتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دعائیں آسمان چیر کر آگے نکل جائیں گی۔

حنفی مسلک والے وتروں کی اس جماعت کے بعد اپنی جماعت الگ کرتے ہیں۔ کسی کو

امام بنا لیتے ہیں اور جماعت کر لیتے ہیں ۔

ان جماعتوں کے بعد پھر حرم شریف میں چاروں طرف تراویح شروع ہو جاتی ہے ۔ یعنی شہر کے حافظ اور بعض حاجی اپنا قرآن سناتے ہیں ۔ دوست احباب اور ملنے جلنے والے ان کا ساتھ دیتے ہیں ۔ اس طرح حرم شریف میں چاروں طرف ساری رات قرآن مجید ہوتے رہتے ہیں ۔

لیکن جن پر شوق کا زیادہ غلبہ ہوتا ہے وہ بخاری (بچے، بوڑھے اور نوجوان) ہیں ۔ ان کی آواز قدرتاً بلند اور موثر ہوتی ہے ۔ اور ان کے دل کا شوق لوگوں کا دل موہ لیتا ہے ۔ مدینہ شریف کا حرم شاید اس لیے کہ چھوٹا ہے ۔ قرآن مجید سے زیادہ معمور نظر آتا ہے ۔ لیکن اس کی رونق اور آبادی کے امام بھی یہی بخاری ہوتے ہیں ۔

چائے کا رواج یہاں بہت ہے ۔ وہ بھی سادہ بلا دودھ کی، اور بخاریوں کے ہاں تو اس سے بھی سادہ ۔ شکر بھی نہیں ڈالتے یوں ہی پیتے ہیں اور بہت پیتے ہیں ۔ اس کے پینے ہی سے جیتے ہیں ۔ حرم شریف میں آپ کسی حافظ کے پاس چائے نہیں دیکھیں گے مگر ان کی صفوں میں چار اور فنجان لازم ہیں ۔ درمیان میں گاہے گاہے پیتے ہیں اور پلاتے ہیں ۔ ایک فائدہ اس کا یہ بھی ہے کہ آدمی نیند سے محفوظ رہے ۔ مگر ان کی تو گھٹی میں پڑی ہے ۔ بلکہ مشہور ہے کہ پانی کی جگہ چائے پیتے ہیں ۔

رات کو پونے سات پر توپ چلتی ہے ۔ دنیا یہاں پہلے سے جاگی ہوتی ہے اس لیے کہ رمضان میں لوگ دن کو سوتے اور رات کو جاگتے ہیں ۔ مگر پھر بھی سونے والے سوتے ضرور ہیں ۔ اس توپ کے بعد دکاندار دکانیں بند کر دیتے ہیں ۔ دفتر جو عشاء سے اب تک کھلے ہوئے تھے بند ہو جاتے ہیں ۔ ڈاک خانہ اور موٹر خانہ (یہاں کی ریل ہے) کے کاروبار بھی تمام ہو جاتے ہیں اور سحری کا کاروبار شروع ہوتا ہے ۔

پونے نو پر ختم سحر کی دو توپیں چلتی ہیں جن کے بعد دس منٹ تک پانی پینے اور دو چار لقمے کھانے کا وقت رہتا ہے ۔ اذان سحری ختم ہونے کے دس منٹ بعد ہوتی ہے ۔ رمضان کی فجر بڑی عظیم الشان ہوتی ہے ۔ سوا نو بجے اذان ہوئی اور ساڑھے نو پر نماز ۔ مگر اذان حرم شریف کی طویل ہوتی ہے ۔ کوئی دس منٹ لیتی ہے ۔ لیکن چھوٹی مسجدوں میں اتنی مختصر ہوتی ہے ۔ جیسے ہمارے ہاں کی تکبیر ۔

فجر کے بعد طواف کا ایک زوردار دور شروع ہوتا ہے ۔ اس کے بعد بعض لوگ اشراق تک بیٹھتے اور تلاوت کرتے ہیں ۔ مگر فجر کے بعد ہی سو جاتے ہیں ۔ حاجیوں کا مستعد طبقہ اس وقت عمرہ کو جاتا ہے موٹریں باب ابراہیم پر تیار کھڑی ہوتی ہیں ۔ ایک گھنٹے میں آنا جانا ہو جاتا ہے ۔ وہاں سے آ کر طواف کرتے ہیں ۔ پھر سعی اور سعی کے بعد حجامت ۔ عمرہ ہو گیا ۔ زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے لگتے ہیں ۔ مگر حج کا ثواب مل جاتا ہے ۔ بلکہ ایک حدیث میں یہاں تک آیا ہے کہ جس نے رمضان میں عمرہ کیا وہ ایسا ہے جیسے میرے ساتھ حج کیا ۔ علیہ الصلوٰۃ والسلام ۔ فجر کے بعد سونے کا سلسلہ چار بجے تک چلتا ہے ۔ جو اٹھتا جاتا ہے وہ قرآن سے لگتا جاتا ہے ۔ اس لیے کہ یہ مہینہ قرآن کے لیے خاص ہے ۔

جناب غلام ربانی

آدمی

بہت دنوں کی بات ہے، کسی جنگل میں ایک شیر رہتا تھا۔ وہ بہت بوڑھا ہوگیا تھا۔ ایک دن اس نے اپنے بیٹے کو پاس بلا کر کہا "بیٹا! تجھ کو معلوم ہے میں بہت بوڑھا ہوگیا ہوں۔ مجھ میں دوڑنے اور چھلانگ مارنے کی طاقت نہیں رہی ہے۔ اور کمزوری اتنی بڑھ گئی ہے کہ کسی چھوٹے سے جانور کو بھی نہیں پکڑ سکتا۔ دو دو، تین تین دن تک بھوکا رہتا ہوں۔ اپنی جوانی کے دنوں میں جب میں دہاڑ مارتا تھا تو سارا جنگل گونج اٹھتا تھا۔ اور بڑے سے بڑے جانور سب گھبرا جاتے تھے۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ میرے سامنے ٹھیر سکے۔ مگر اب یہ حال ہوگیا ہے کہ چھوٹے چھوٹے جانور بھی میرے سامنے سے چلے جاتے ہیں اور میں دیکھتا رہ جاتا ہوں۔ میں اس ذلت کی حالت میں یہاں نہیں رہ سکتا۔ میں نے ارادہ کرلیا ہے کہ آج ہی بلکہ ابھی اس جنگل کو چھوڑ دوں۔ میرے بعد تو اس جنگل کا بادشاہ ہوگا۔ یہاں کے تمام جانور تجھ سے ڈریں گے۔ ان میں سے کوئی تیرا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ مگر یاد رکھو ایک جانور سے کبھی مقابلہ نہ کرنا اور جہاں تک ہو سکے اس سے دور ہی رہنا۔" شیر کے بیٹے نے پوچھا "بابا! وہ کونسا جانور ہے جو مجھ سے بھی طاقت ور ہے؟" شیر نے کہا "اس جانور کو آدمی کہتے ہیں۔ تو کبھی آدمی سے نہ لڑنا۔" یہ کہہ کر وہ کہیں چلا گیا اور پھر کبھی اس جنگل میں نہیں آیا۔

شیر کے چلے جانے کے بعد اس کا بیٹا جنگل میں اچھلتا کودتا پھرتا تھا۔ جو جانور اس کے سامنے آتا اس پر حملہ کرتا اور اس کو مار ڈالتا تھا۔ جوانی کی ترنگ میں اکڑتا پھرتا تھا۔ جنگل کے تمام جانور اسے دور ہی سے دیکھ کر بھاگ جاتے تھے۔ ایک دن وہ سوچنے لگا کہ اس جنگل میں دور دور تک میری دھاک بیٹھ گئی ہے۔ کوئی جانور ایسا نہیں جو میرے ایک تھپڑ کی تاب لا سکے۔

آخر وہ آدمی کیسا جانور ہے جس سے بچنے کے لیے باپ نے کہا تھا۔ میں ضرور آدمی سے لڑوں گا۔ یہ ٹھان کر ایک طرف کو چل دیا۔ چلتے چلتے وہ ایک میدان میں پہنچا۔ جہاں ایک بیل گھاس چر رہا تھا۔ اس نے اب تک بیل نہیں دیکھا تھا۔ سمجھا کہ یہی جانور آدمی ہے۔ سوچنے لگا کہ بہت اونچا اور موٹا تازہ ہے سر پر بڑے بڑے نکیلے سینگ ہیں اس سے لڑنا آسان نہیں ہے مگر ہمت کرکے اس نے کہا: "او آدمی! تیار ہو جا، میں تجھ سے لڑنے آیا ہوں۔"

بیل نے کہا "بھیا شیر! یہاں تو کوئی آدمی نہیں ہے، تم کس سے لڑنے آئے ہو؟"

شیر نے کہا "تجھ سے لڑوں گا۔ کیا تو آدمی نہیں ہے؟"

بیل نے کہا "بھائی میں تو بیل ہوں آدمی نہیں۔"

شیر نے کہا "اچھا یہ بتا کیا آدمی تجھ سے بھی طاقتور ہوتا ہے؟"

بیل نے کہا "بھیا! آدمی کی نہ پوچھو، وہ بہت طاقتور ہوتا ہے۔ مجھ کو گاڑی میں جوتتا ہے، مجھ سے ہل چلواتا ہے۔ کنواں چلواتا ہے اور اگر میں ذرا سستی کروں تو بری طرح مارتا ہے، یہ دیکھو میری گردن، جوئے کے بوجھ سے زخمی ہوگئی ہے۔ میری رائے تو یہ ہے کہ آدمی سے لڑنے کا خیال چھوڑ دو اور واپس چلے جاؤ۔"

شیر نے کہا "میں اس سے ضرور ضرور لڑوں گا۔ اچھا یہ بتا کہ یہ آدمی کس جنگل میں رہتا ہے۔"

بیل نے سر کے اشارے سے کہا "اس طرف چلے جاؤ۔"

شیر وہاں سے چل دیا۔ چلتے چلتے وہ ایک جنگل میں پہنچا، دیکھا کہ ایک بہت بڑا جانور ایک ببول کے پیڑ کے نیچے کھڑا ہے، اس کی گردن اتنی لمبی تھی کہ پیڑ کی ٹہنیوں تک پہنچ گئی تھی اور وہ ببول کے پتے اور کانٹے اناپ شناپ کھا رہا تھا۔ شیر نے اتنا بڑا جانور نہیں دیکھا تھا، سمجھا کہ شاید یہی جانور آدمی ہے۔ اس نے للکار کر کہا "او آدمی! سنبھل جا۔ میں تجھ سے لڑنے آیا ہوں۔"

اس نے کہا "بھیا شیر اگر تو لڑنا ہی چاہتا ہے تو لڑ سکتا ہے۔ مگر میں آدمی نہیں ہوں۔ اونٹ ہوں۔" شیر نے کہا "کیا آدمی تجھ سے بھی طاقتور ہوتا ہے؟"

اونٹ بولا۔ بھائی کیا بتاؤں، آدمی کی طاقت کا کچھ ٹھکانا نہیں۔ یہ بڑا ظالم ہوتا ہے۔ اناج کی بھاری بھاری بوریاں مجھ پر لادتا ہے۔ مجھ سے کنواں چلواتا ہے۔ گاڑی کھچواتا ہے اور میری پیٹھ پر بیٹھ کر سواری کرتا ہے اور اگر میں اس کام میں ذرا سستی کردوں تو بری طرح مارتا ہے۔"

شیر نے کہا "کچھ بھی ہو۔ مگر میں اس سے ضرور لڑوں گا۔ بتاؤ وہ کہاں ملے گا؟" اونٹ نے اشارہ سے کہا۔ اس طرف چلے جاؤ۔

شیر وہاں سے آگے بڑھا۔ چلتے چلتے وہ ایک جھیل کے کنارے پہنچا۔ وہاں ایک ہاتھی نظر آیا شیر نے اس سے پہلے ہاتھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے قد اور ڈیل ڈول کو دیکھ کر سوچ میں پڑ گیا اور سمجھا یہی جانور آدمی ہے۔

ہاتھی نے شیر کو دیکھ کر ایک چنگھاڑ ماری۔

اور سونڈ اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

شیر نے کہا "میں جانتا ہوں، تو آدمی ہے۔ تجھ سے یہاں کے سب جانور ڈرتے ہیں، مگر میں تجھ سے ضرور لڑوں گا!"

ہاتھی نے کہا "میں بھی تجھ سے لڑنے کو تیار ہوں۔ مگر تو بڑا بے وقوف ہے، گدھا ہے۔ اتنا بھی نہیں سمجھتا کہ میں آدمی نہیں ہوں۔ ہاتھی ہوں۔"

شیر نے کہا "تو پھر میں تجھ سے نہیں لڑوں گا۔ میں آج آدمی سے لڑنے نکلا ہوں۔ ہاتھی بھیا! یہ بتاؤ۔ کیا آدمی تم سے بھی طاقتور ہوتا ہے؟"

ہاتھی نے ہنستے ہوئے کہا "ارے بھائی! آدمی کی کچھ نہ پوچھو، مجھ کو دیکھو۔ کتنا طاقتور ہوں مگر اس میں بہت زور ہوتا ہے۔ مجھ سے طرح طرح کے کام لیتا ہے۔ جنگل کے درخت اکھڑواتا ہے۔ میری پیٹھ پر اماری رکھ کر اس میں بیٹھتا ہے۔ کبھی وہ میری گردن پر بھی بیٹھتا ہے اور میں اس کا کچھ نہیں کر سکتا۔"

شیر نے کہا "بڑے بھیا۔ آخر یہ تو بتاؤ کہ وہ کتنا بڑا جانور ہے؟"

ہاتھی نے کہا "یہی تو رونا ہے۔ وہ مجھ سے بڑا نہیں ہے۔ چھوٹا سا دو پاؤں کا جانور ہے۔ مگر اس میں اتنا زور ہے کہ میں اس کے سامنے کچھ نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ بتا۔ آخر تجھے اس سے لڑنے کی کیا سوجھی ہے؟ یاد رکھ۔ اگر تو اس سے لڑا تو بہت برا ہوگا۔ تجھے جوانی کا نشہ ہوگیا ہے۔ مگر گھمنڈ اچھا نہیں ہوتا۔"

شیر نے کہا "بھائی جان! کچھ بھی کہو۔ مگر میں اس سے لڑوں گا ضرور، بتاؤ وہ کہاں ملے گا؟"

ہاتھی نے سونڈ کے اشارے سے کہا۔ "اس طرف چلا جا۔"

شیر اس طرف چل دیا۔

وہ چلا جا رہا تھا کہ ایک کھیت پر پہنچا۔

وہاں ایک کسان ہل جوت رہا تھا۔ اور بیلوں کو مار رہا تھا۔ شیر سمجھ گیا کہ یہ تو ایک چھوٹا سا جانور ہے۔ لڑنے کے لیے اس کے سر پر سینگ بھی نہیں ہیں۔ یہ تو میرے ایک تھپڑ کا بھی نہیں۔ بھلا یہ مجھ سے کیا لڑے گا۔ اس نے للکار کر کہا۔ او آدمی! تیار ہو جا۔ میں تجھ سے لڑنا چاہتا ہوں!

کسان شیر کو دیکھ کر سہم گیا۔ مگر آدمی تھا سمجھ دار اور ہمت والا۔ اس نے کہا "اگر تو بہادر ہے تو ایسی حالت میں مجھ سے نہیں لڑے گا۔"

اس نے کہا "میں شیر کا بیٹا ہوں۔ بتا تو کس طرح لڑے گا؟"

کسان نے کہا "کیا کروں۔ اس وقت میرے پاس میرا زور نہیں ہے، میں آج یہاں کام کرنے آیا تھا۔ اپنا زور گھر چھوڑ آیا تھا۔"

شیر نے کہا "اچھا جا اور اپنا زور لے آ۔"

کسان بولا "اگر میں اپنا زور لے آیا تو دور سے دیکھتے ہی تو بھاگ جائے گا۔"

شیر نے جھلا کر کہا "کیا تو مجھے ڈرپوک سمجھتا ہے۔ میں ہرگز نہ بھاگوں گا۔ جلدی جا۔ اور اپنا زور لے آ۔"

کسان نے کہا "مجھے یقین نہیں کہ تو میرے زور کے سامنے ٹھیر سکے گا۔ اچھا ایک ترکیب بتاتا ہوں جس سے تو بھاگ نہیں سکے گا۔ اگر تو کہے تو میں تیرے پاؤں باندھ دوں تاکہ بھاگ نہ سکے۔"

شیر نے کہا "ہاں یہ ترکیب ٹھیک ہے۔ تو میرے پاؤں باندھ دے۔ پھر میں نہیں بھاگ سکوں گا۔"

کسان اپنی جھونپڑی میں گیا اور دو موٹی رسیاں لایا۔ ایک سے اس کے اگلے پاؤں باندھ دیے اور دوسری سے پچھلے دونوں پاؤں کس دیے۔ اس طرح جب وہ جکڑ گیا تو اس کے ایک لات ماری جس سے وہ گر پڑا۔ شیر نے جھنجلا کر کہا "یہ کیا کرتا ہے۔ اب جلدی جا اور اپنا زور لے آ۔"

کسان نے کہا "بے وقوف تجھے بہت گھمنڈ ہو گیا تھا۔" یہ کہہ کر ایک لٹھ لایا اور اس کے سر پر مارنا شروع کر دیا۔

شیر چیختا چلاتا رہا۔ اور بے ہوش ہو گیا۔ اور تھوڑی دیر میں دم توڑ کر رہ گیا۔

برسات

جناب سیف سرامی

بچو! خوشی مناؤ کہ برسات آگئی ساون کے گیت گاؤ کہ برسات آگئی

جھولے خوشی کے ڈال دو آموں کے پیڑ میں پینگیں ذرا بڑھاؤ کہ برسات آگئی

آواز دے رہی ہیں وہ سرسبز وادیاں پکنک منانے جاؤ کہ برسات آگئی

ساون کی نرم نرم پھواروں کی جھیل میں جی بھر کے تم نہاؤ کہ برسات آگئی

جھرنے سنا رہے ہیں ترانہ بہار کا اب تم بھی گنگناؤ کہ برسات آگئی

علم و ہنر کی نہر میں بے خوف ہو کے تم غوطے ذرا لگاؤ کہ برسات آگئی

رم جھم کے ساز پہ ذرا ننھے پپیہیو
نغمات سیف گاؤ کہ برسات آگئی

محترمہ فرزانہ انصاری

سانپ

ہمارا محلہ حلقے یا دائرے کی شکل میں آباد ہے. گھر کچھ اس انداز سے بنائے گئے ہیں کہ درمیان میں گول میدان بن گیا ہے۔ اس میدان کے چاروں طرف سڑک ہے۔ اس میدان میں ہم کھیلا کرتے ہیں۔ سڑک پر محلے کے لوگ چلتے پھرتے ہیں۔ اس طرح سے ہمارے کھیلنے سے کسی کو کوئی تکلیف نہیں پہنچتی۔

ایک بات اور! یہاں سرکاری بجلی کے کھمبے نہیں ہیں۔ البتہ ہر گھر کے سامنے چھوٹا سا ورانڈہ ہے اور بلب لگا ہے۔ باری باری گھروں کے بلب روشن رکھے جاتے ہیں تاکہ رات کے وقت محلہ میں اندھیرا نہ ہو اور چلنے پھرنے میں سہولت ہو۔ جب ہم سب بچے رات میں آنکھ مچولی کھیلنا چاہتے ہیں تو یہ بلب بھی بند کر دیا دیتے ہیں۔

ایک دن میں اور نغمی اور دوسرے دوست انور، اختر، ناز، رمضان، روبی، زرینہ، نورجہاں آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ چاندنی کی وجہ سے گھپ اندھیرا تو نہ تھا۔ پھر بھی بے حد مزہ آرہا تھا۔ چاندنی میں ہم سب سایوں کی طرح نظر آرہے تھے۔

میں اور نغمی چھپنے کے لیے ساتھ ساتھ جگہ تلاش کرنے لگے۔ نغمی چلتے چلتے رک گئی اور ڈر کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ میں بھی رک گئی اور دیکھنے لگی۔ نغمی ڈر کے مارے تھر تھر کانپ رہی تھی ہم سے تھوڑے فاصلے پر ایک کالی لانبی چیز بل کھائے پڑی تھی۔ ڈر کے مارے میری چیخ نکل گئی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے کانپ رہے تھے۔ نہ تو اتنی ہمت تھی کہ چیخ کر اپنے دوسرے ساتھیوں کو پکارتے یا خود ہی دور بھاگ جاتے۔ کچھ دیر اسی طرح گذر گئی اور ہم انتظار کرتے رہے کہ وہ کالی چیز اب ہم پر حملہ کرتی ہے، اب حملہ کرتی ہے۔ لیکن جب حملہ وغیرہ کچھ نہیں ہوا اور وہ کالی چیز اسی طرح بے حس و حرکت پڑی رہی تو میں نے نغمی سے کہا: "یہ تو حرکت ہی نہیں کرتی۔"

نغمی کا ڈر بھی کچھ کم ہو گیا تھا۔ پر اب بھی ہم ایک دوسرے کے ساتھ لگے کھڑے تھے اب کچھ اور ہمت ہوئی۔ ایک دو قدم ذرا آگے بڑھ کر اسے غور سے دیکھنے لگے۔ میں نے نغمی سے کہا۔

"اتنے [illegible] سے ٹھوکا دے کر دیکھیں؟"

"اور اگر زندہ سانپ ہوا تو ؟" نغمی ابھی تک ڈر رہی تھی۔

"تو بانس پھینک کر بھاگ جائیں گے۔" میں نے نغمی کی ہمت بندھائی۔ وہ بڑی مشکل سے راضی ہوئی۔ دل تو میرا بھی دھڑک رہا تھا لیکن بغیر پوری طرح علوم کیے رہا بھی نہ جاتا تھا۔ میں دوڑ کر ایک لانبا بانس لے آئی۔ اب سوال تھا کہ بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے۔ ٹھوکا کون دے۔ آخر میں نے ہی ہمت کی بانس کو سرے سے پکڑا اور جتنا دور ہو سکا کھڑے ہو کر آہستہ سے اُس کالی چیز کو ہلایا اور فوراً ہی بانس چھوڑ کر دونوں بھاگے۔ کچھ دور جا کر پلٹ کر دیکھا میدان صاف تھا۔ اس چیز نے ہمارا اچھا نہیں کیا۔ کچھ اور ہمت ندھی واپس آئے۔ پھر سے بانس اٹھایا اب کے اسے انس پر اٹھا لیا اور گھسیٹ کر کسی قدر روشنی میں لے آئے۔

"ہائے رے !" میں اور نغمی دونوں پیٹ پکڑ کر ین پر بیٹھ گئے اور کیا کرتے وہ تو رسّی تھی جس سے ہم س قدر ڈر رہے تھے۔ اور اب ہماری ہنسی تھمی کر رکتی نہ تھی۔ ہونہہ کس قدر ڈر ڈر کر بانس سے ٹھوکا دیتے اور دونوں ڈر کر کانپتے رہے اور نجانے کیا کیا سمجھتے رہے کھودا پہاڑ نکلی چوہیا یعنی پرانی ناکارہ رسی! میرے تو ہنستے ہنستے آنسو نکل آئے۔ پیٹ میں الگ درد ہو رہا تھا۔ نغمی کی حالت بھی یہی تھی اور دونوں تھے کہ زمین پر لوٹ رہے تھے۔ آخر میں نے نغمی سے کہا۔

"بھائی جان گھر ہیں اور وہ کمار بھائی بھی گھر آئے ہوئے ہیں جو ہمیشہ اپنی بہادری کے کارنامے ہم دونوں کو سنایا کرتے ہیں"

"ہاں - ہیں تو۔ ؟" نغمی بے وقوفوں کی طرح بولی۔ بڑی بدھو ہے۔ جب تک ہر بات کھول کر نہ سمجھا دی جائے کچھ سمجھتی ہی نہیں۔

"ایسے ہم انھیں ڈرائیں گے۔ کہیں گے یہاں سانپ ہے اور کیا ؟" میں نے کہا۔

"اور اگر وہ نہ ڈرے تو ؟" نغمی بولی "تو کیا کچھ نہیں۔" میں نے کہا۔

نغمی کچھ دیر تو بحث کرتی رہی پھر راضی ہوگئی۔ اور ہم دونوں دوڑتے ہوئے گھر پہنچے باہر رک کر چہرے پر پریشانی کے آثار پیدا کیے اور اندر پہنچے "بھائی جان سانپ ہے .... سانپ....!" میں نے چیخ کر کہا "کہاں ہے ؟" بھائی جان گھبرا کر کھڑے ہو گئے اور کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔

"یہاں نہیں .... وہاں میدان میں ..." میں نے ہکلانے کی کوشش کی

"کہاں دکھاؤ" بھائی جان نے اپنی ہاکی اسٹک سنبھالی اور ایک ڈنڈا کمار بھائی کے ہاتھ میں تھمایا ہم نے دور سے انھیں وہ جگہ دکھائی اور بھاگ آئے۔ آپا پلنگ پر لیٹے پڑھ رہے تھے اور پڑھنے میں کچھ ایسے منہمک تھے کہ ہمارے کمرے کے اندر آنے کی بھی انھیں خبر نہ ہوئی۔ میں نے نغمی سے اشاروں میں کہا "پلنگ کے نیچے چھپ جائیں اور ہم دونوں چپکے سے پلنگ کے نیچے گھس گئے۔ کیوں کہ اب کچھ ہی دیر میں بھائی جان کو ہماری ضرورت پیش آنے والی تھی۔ آپا کو تو خبر بھی نہ ہوئی۔ ہمیں چھپے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ بھائی جان کی آواز سنائی دی۔ وہ امی سے ہمارے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ پلنگ کے نیچے میں نے نغمی کو اور نغمی نے

مجھے دیکھا ہمیں ہنسی بھی آرہی تھی " کہیں ہوں گے "
امّی نے جواب دیا۔ بھائی جان ڈھونڈتے ہوئے ابّا کے
کمرے میں آپہنچے اور ہمارے دل اچھل کر حلق میں آ
اٹکے "کیا بات ہے ؟" ابّا نے پوچھا اور ہم ڈر گئے اگر
ابّا نے دیکھا ہو تو — ؟

"وہ نغمی اور غزالہ ..." بھائی جان نے رکتے
ہوئے کہا۔

"یہاں نہیں آئے" ابّا بولے اور ہماری جان
میں جان آئی۔ جب ہمیں یقین ہوگیا کہ بھائی جان اپنے
کمرے میں جاچکے ہوں گے اور پڑھنے میں مشغول ہوں
گے تو ہم دونوں آہستہ سے اپنی پناہ گاہ سے نکلے اور
چوروں کی طرح بستر پر پہنچے۔ اب جو ہماری ہنسی شروع
ہوئی ہے تو بس کچھ نہ پوچھیے ۔ دو تین دن اسی طرح
گزر گئے اور ہم بھائی جان سے چھپتے رہے۔ صبح بڑے
ہی فرماں بردار بچّوں کی طرح کھاپی کر اسکول روانہ ہوجاتے
اور شام کو لوٹ کر امّی کے کمرے میں کھیلتے اس طرح
بھائی جان کو ہم پر دستِ شفقت پھیرنے کا موقع نہ مل
سکا۔ ایک دن بھائی جان کالج سے لوٹے تو ان کے
ہاتھ میں کتابوں کے ساتھ گلابی ربن بندھا ایک بہت
ہی خوبصورت ڈبّا بھی تھا۔ بھائی جان جب بھی ایسی
کوئی چیز لاتے ہیں تو دروازے ہی میں سے ہم دونوں
کو پکارتے ہیں اور دے دیتے ہیں۔ لیکن اس بار
انھوں نے ہماری طرف کوئی توجہ نہ دی۔ حالاں کہ ہم
سامنے ہی موجود تھے۔ وہ سیدھے اپنے کمرے میں گئے۔

"نہ جانے ڈبّے میں کیا ہے ؟" نغمی بولی۔

"پتہ نہیں۔ ڈبہ تو بڑا خوبصورت ہے"
میں نے کہا۔ میرے بھی دل میں کھلبلی مچی تھی۔

"ڈبّہ تو میں لوں گی" نغمی نے کہا۔

"بھائی جان دیں تب نا !" میں نے کہا۔

"اس کے اندر کیا ہے کیسے دیکھا جائے ؟" نغمی خاموش
ہوگئی۔ واقعی یہ ایک سوال تھا۔ ریاضی کے سوالوں کی
طرح اس کا حل ڈھونڈھنا تھا۔ کچھ دیر ہم دونوں خاموش
رہے۔ پھر میں نے کہا "بھائی جان باہر چلے جائیں تو
ہم چپکے سے دیکھ آئیں" نغمی مان گئی اور ہم دونوں
اِدھر اُدھر ٹل گئے۔ تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹے کے بعد میں
نے نوکر سے بھائی جان کے متعلق پوچھا تو معلوم ہوا کہ
باہر گئے ہوئے ہیں۔ میں نے نغمی کو اشارہ کیا اور ہم
بڑی بے تعلقی کے انداز میں ادھر اُدھر گشت
کرتے موقع پاکر بھائی جان کے کمرے میں گھس گئے۔
ڈبہ میز پر رکھا تھا کمرے میں کوئی نہ تھا نہ کمرے کے
آس پاس ہم میز کے قریب جا پہنچے۔ نغمی نے ربن
کھولا اور جیسے ہی ڈبے کا ڈھکن اٹھایا ایک تیز
"ہس" کی آواز ہوئی اور ڈبّے میں سے ایک کالے
ناگ نے پھن نکالا۔ نغمی اچھل کر پلنگ پر چڑھ گئی اور
میں کرسی پر۔ ڈر کے مارے منہ سے آواز بھی نہ نکل رہی
تھی۔

بھائی جان نے پلنگ کے نیچے سے سر
نکالا اور ہمارا منہ چڑا کر بولے "سانپ ہے ...
سانپ ....."

بھائی جان کو دیکھ کر ہماری جان میں
جان آئی۔ بھائی جان بڑے اطمینان سے پلنگ کے
نیچے سے نکلے ڈبّا ہاتھ میں اٹھایا اور مزے میں کرسی
پر بیٹھ کر سانپ کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگے اور
مسکرا کر ہم کو دیکھا۔ اب تو ہماری بھی ہمت

بند تھا اور ہم اپنے ٹھکانے سے نکل کر بھائی جان کے قریب جا کھڑے ہوئے اور آہستہ سے انگلی سے سانپ کے سر کو چھوا۔ اوہ .... خدایا ! بنانے والے نے کاری گری کا کمال دکھایا تھا۔ وہ تو ربر کا سانپ تھا۔ بھائی جان نے کس طرح بدلا لیا۔ اپنی بے وقوفی پر ہمیں ہنسی آگئی اور بھائی جان بھی ہنسنے لگے اور بولے "کیوں ---؟ تم سمجھتی ہو کہ تم دونوں ہی شرارت کر سکتی ہو"

"نہیں بھائی جان بھلا ہم آپ کی شان میں ایسی گستاخی کر سکتے ہیں" میں نے کہا۔

بھائی جان نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور نغمی کے سر پر ہلکی سی چپت لگا کر بولے۔

"آخر تم دونوں اسقدر ڈر کیوں رہے تھے؟"

"اگر یہ ہمیں کاٹ لیتا تو .... ؟" ہم دونوں نے ساتھ کہا۔

"وہ تو بات بعد کی بات تھی۔ پہلے یہ ضروری ہے کہ انسان خطرے کے وقت اپنے ہوش قایم رکھے اور یہ جبھی ہو سکتا ہے جب کہ وہ جانور کے بارے میں جانتا ہو۔ پہلی طبی امداد کے بارے میں جانتا ہو۔ ہر سانپ کے کاٹنے سے انسان نہیں مرتا" بھائی جان نے کہا۔

"گویا بعض سانپوں میں زہر نہیں ہوتا ؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں ایسا ہی سمجھو" بھائی جان نے کہا۔

"پھر تو سانپ دو قسم کے ہوئے۔ زہر والے اور بغیر زہر والے" نغمی نے کہا۔

"ہاں" بھائی جان نے کہا "یوں کہو زہریلے اور غیر زہریلے سانپ"

"مان لیا کہ ہر سانپ زہریلا نہیں ہوتا۔ لیکن ہم یہ کیسے بتا سکتے ہیں کہ کونسا سانپ زہریلا ہوتا ہے اور کونسا غیر زہریلا" میں نے پوچھا۔ بھائی جان نے کہا "بھئی زہریلے سانپ بہت کم ہوتے ہیں اگر ہم ان کو پہچان لیں تو ڈر کی بھی کوئی وجہ نہیں رہتی اور اگر وہ کسی کو کاٹ لیں تو علاج میں آسانی ہوگی"

"زہریلے سانپ بہت کم ہوتے ہیں" میں نے اور نغمی نے ایک ساتھ کہا

"ہاں بھئی .... ہندوستان میں تین قسم کے زہریلے سانپ پائے جاتے ہیں لیکن سمندر میں پائے جانے والے تمام سانپ زہریلے ہوتے ہیں" بھائی جان نے کہا۔

"سمندر میں بھی سانپ ہوتے ہیں ....؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"بھائی جان تب تو یہ سانپ بے چاری مچھلیوں کو کاٹ کھاتے ہوں گے نا۔" نغمی کو بڑا ترس آرہا تھا۔

"تم کیا سمجھتی ہو۔ سمندر کوئی چھوٹا سا تالاب ہے۔ ! نہیں بھئی سمندر کی دنیا بھی ایسی ہی وسیع ہے جیسے یہ ہماری دنیا ......" بھائی جان ہنس پڑے۔

"تو کیا اس میں بھی ایسے ہی مختلف جانور ہوتے ہیں ؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"اور کیا .... ؟" بھائی جان مسکرائے مختلف جانور ہوتے۔ چھوٹی مچھلیاں، بڑی مچھلیاں، شارک وہیل، سانپ دریائی

گھوڑے، مگرمچھ وغیرہ۔ اور بہت سے ایسے بھی جن
کے بارے میں ہم ابھی کچھ نہیں جانتے"۔ میں اور نغمی منھ
کھولے بھائی جان کی باتیں سن رہے تھے۔ بھلا سوچیے
تو کتنا بڑا ہوگا سمندر اور یہ سارے جانور اس میں تیرتے
ہوئے کیسے لگتے ہوں گے۔

"ہاں تو سمندری سانپ کی سب سے بڑی
پہچان یہ ہے کہ اس کی دم چپٹی اور پتوار نما ہوتی ہے۔
میٹھے پانی کے تمام سانپ غیر زہریلے ہوتے ہیں"۔
بھائی جان نے اپنی بات جاری رکھی "بھائی جان وہ
سمندر!" میں نے پوچھا۔ "سمندر کے بارے میں پھر کبھی
بتاؤں گا"۔ بھائی جان مسکرائے "سانپ اور سمندر
ایک ساتھ کیسے چلیں گے اور ہم سانپ کو بیچ راستہ
میں نہیں چھوڑ سکتے"۔

"وعدہ کیجیے"، میں اور نغمی جلدی سے بولے۔

"اچھا وعدہ رہا" بھائی جان ہنس دیئے۔

"بھائی جان پتوار کیا ہوتا ہے؟" نغمی نے پوچھا۔

"جنھیں ہاتھوں سے گھما کر کشتی کو پانی میں
آگے بڑھایا جاتا ہے چپو یا پتوار کہلاتے ہیں"۔ بھائی
جان نے کہا "ہندوستان کا ایک زہریلا سانپ
رسل وائپر کہلاتا ہے۔ یہ بڑا ہی کمینہ اور
بزدل سانپ ہے۔ چھپ کر حملہ کرتا ہے عام طور
پر پہاڑوں اور چٹانوں میں پایا جاتا ہے۔

"اس کو ہم کیسے پہچانیں گے"؟ میں اور نغمی
بول پڑے ایک ساتھ۔

"اس کا سر تکونا اور جسم کا رنگ بھورا ہوتا
ہے۔ جس پر سیاہ گول حلقوں کی تین قطاریں ہوتی
ہیں۔ یہ اس کی سب سے بڑی پہچان ہے۔ بھائی
جان نے کہا۔

"شہر میں بھی ہوتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"آبادی میں سانپ بہت کم ملتے ہیں۔
بھائی جان نے جواب دیا"۔ اس کی ایک اور قسم
بھی ہوتی ہے جو "فرسا" کہلاتی ہے۔ اس کے علاوہ
دوسرا زہریلا سانپ افعی ہے۔

افعی ..... ! میں نے حیرت سے دہرایا
ہم نے یہ نام تو کبھی سنا ہی نہ تھا۔

"ہاں..." بھائی جان نے کہا۔ یہ چار
پانچ فٹ لانبا سیاہ رنگ کا سانپ ہوتا ہے اور
عام طور پر ویرانوں میں پایا جاتا ہے۔ تیسرا زہریلا
سانپ کریٹ ہے"۔

"کریٹ ... !" نغمی نے دہرایا "اور اس
کی پہچان؟"

"اس کی پیٹھ پر درمیان میں ایک
چھ پہلو والے چھلکوں کی

قطار ہوتی ہے ۔ اس کے علاوہ سب سے عام زہریلا
سانپ ناگ ہے ۔" بھائی جان نے کہا۔

"اچھا وہ جو مداریوں کے پاس ہوتا ہے۔"
نغمی بولی ۔

"اور جو بین کی دھن پر پھن پھیلا کر جھومتا
ہے ۔" میں نے کہا ۔

"ہاں ۔۔۔!" بھائی جان مسکرائے "پھن ہی
اس کی سب سے بڑی پہچان ہے ۔ اگر کسی کو سانپ
کاٹ لے تو فوراً پہلی طبی امداد پہنچانا چاہیے۔"

"پہلی طبی امداد کسے کہتے ہیں بھائی جان ؟"
میں نے پوچھا۔

"ڈاکٹر کے آنے سے پہلے مریض کو جو کچھ آرام
پہنچایا جاتا ہے اسے پہلی طبی امداد کہتے ہیں اور اس
کی وجہ سے مریض کی حالت بگڑنے نہیں پاتی ۔" بھائی
جان نے کہا۔

"اچھا تو کیا کیا جائے ؟" میں نے پوچھا۔

"سب سے پہلے تو زخم سے دل کی جانب کسی
دوڑی سے باندھ دیا جائے تاکہ دوران خون کے ذریعہ
زہر جسم میں نہ پھیلنے پائے ۔ پھر ایک صاف چاقو سے
زخم کو (+) کی علامت میں بڑا کیا جائے اور خون بہنے
دیا جائے پھر زخم میں پوٹاشیم پرمینگنیٹ بھر دیں اور
ہاں سانپ کے زہریلے یا غیر زہریلے ہونے کے بارے
معلوم کرنا ضروری ہے ۔" بھائی جان نے کہا۔

"بھائی جان وہ پوٹاشیم پرمینگنیٹ ۔۔۔۔" میں
نے کہا نغمی بیچ سے بات کاٹ کر بولی "سانپ زہریلا
ہے یا غیر زہریلا کیسے معلوم ہو ؟"

"اوہ ۔۔۔" بھائی جان نے کہا۔

"تم کو خدا نے نہ جانے کس وقت بنایا تھا ۔ سوال پر
سوال کیے جاتی ہو۔"

ہم دونوں ہنسنے لگے "غیر زہریلے سانپوں
کی پیٹھ اور پیٹ پر پائے جانے والے چھلکے چھوٹے
اور یکساں ہوتے ہیں ۔" بھائی جان نے کہا "پوٹاشیم
دراصل ایک نمک ہے جو بازار میں ملتا ہے یہ پانی
کو جراثیم سے پاک کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔"

"بھائی جان سانپ کا زہر کہاں ہوتا ہے ؟"
نغمی نے اچانک پوچھا ۔

"سانپ کے منھ کے اندر اوپر کے حصے
میں ایک دانت ہوتا ہے جو کھوکھلا ہوتا ہے اور
اس کا تعلق ایک زہر کی تھیلی سے ہوتا ہے ۔ زہر کی
تھیلی منھ کے اوپری حصہ میں چپکی ہوئی ہوتی ہے ۔
جب سانپ کاٹتا ہے تو تھیلی دبتی ہے اور اس کا
زہر دانت میں داخل ہوتا ہے پھر دانت سے زخم میں۔"
بھائی جان نے کہا ۔

"سانپ کو اس زہر سے کوئی تکلیف نہیں ہوتی ۔"
میں نے پوچھا۔

"نہیں بھئی ۔" بھائی جان مسکرائے "وہ تو
تھیلی میں محفوظ ہوتا ہے ۔"

"سانپ کے پیر کیوں نہیں ہوتے ؟ بے چارہ
اپنے جسم کو گھسیٹے گھسیٹے پھرتا ہے ۔" نغمی کو ترس آگیا
اور بھائی جان کو ہنسی آگئی ۔ "بھئی دراصل سانپ
چھپکلی کے خاندان سے ہے ۔۔۔۔"

"چھپکلی کے تو پیر ہوتے ہیں ۔" میں نے بھائی
جان کی بات کاٹی ۔

"ہاں بھئی" بھائی جان مسکرائے

دراصل کسی زمانے میں سانپ کے بھی پیر ہوا کرتے تھے۔ لیکن اس نے بلوں میں رہنا اور رینگ کر چلنا شروع کردیا۔ اس لیے پیر گھستے گھستے غائب ہو گئے۔"

غلط ..... ! میں اور نغمی ایک ساتھ بولے۔
ہمیں بھائی جان کی بات پر یقین نہیں آیا۔ آپ تو اس طرح کہہ رہے ہیں جیسے وہ بھی جوتے ہوں جو چلتے چلتے گھس گئے " میں نے کہا۔

بھائی جان ہنس پڑے۔ اس کا ثبوت ملتا ہے۔ ایک قسم کے سانپ میں اب بھی بالکل ناکارہ اور چھوٹی پیر کی ہڈیاں موجود ہوتی ہیں۔" لیکن ہمیں اب بھی یقین نہ آیا کیسی عجب بات ہے۔

"اور ہاں" بھائی جان کچھ یاد کرکے بولے۔
"سانپ کی دیکھنے کی قوت سننے کی قوت سے زیادہ تیز ہوتی ہے۔ یہ تقریباً بہرا ہوتا ہے۔ سونگھنے کی قوت اس میں نہیں ہوتی۔"

"بھائی جان یہ کھاتا کیا ہے؟ میں نے پوچھا۔
چھوٹے سانپ اور چوہے مینڈک وغیرہ۔
بھائی جان نے جواب دیا۔

— "بھائی جان وہ اژدہا اور دھامن ...؟" زہریلے نہیں ہوتے؟ نغمی نے پوچھا۔
"نہیں بھائی لیکن جسامت میں بڑے ہوتے ہیں۔ ان میں زہر نہیں ہوتا اس لیے یہ جانور کو پہلے تو لپیٹ کر ہڈیاں توڑ ڈالتے ہیں اور پھر نگل جاتے ہیں" بھائی جان نے کہا۔

" زندہ ہی .....! ہم دونوں ایک ساتھ بولے۔ خوف سے ہماری آنکھیں بند ہوگئیں۔
"ڈرتے کیوں ہو؟" بھائی جان مسکرائے"
اب دنیا کے بہت کم حصوں میں اژدہے رہ گئے ہیں۔ کیوں کہ انسان ان سے زیادہ عقلمند ہوتا ہے۔
آپ دونوں جاؤ اور یہ ڈبہ اپنی سہیلیوں کو دکھاؤ بھائی جان نے شرارت سے کہا
کمرے سے نکلتے ہوئے میں نے نغمی سے کہا۔
نغمی یہ ڈبہ چچا جان کو تحفہ دے دیں؟
لیکن بھائی جان نے سن لیا اور آنکھیں نکال کر بولے
بڑوں سے مذاق نہیں کرتے۔"

جناب دینا ناتھ گردھر

جسے خدا رکھے

اگر آپ دیہات میں چھوٹے قصبوں میں
ہیں یا کبھی آپ کو ایسی جگہوں پر جانے کا اتفاق ہوا
تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہاں عام طور پر گھروں میں
کنوئیں کھود لیتے ہیں۔ ان کنوؤں کا پانی وہ اپنے گھر
ضرورتوں کے لیے کام میں لاتے ہیں۔

اتر پردیش کا شہر بریلی بڑا شہر ہے۔ مگر
قسم کا وہاں بھی اکثر گھروں میں کنوئیں ہیں۔ یہ
عام طور پر پندرہ فٹ سے لے کر چالیس فٹ
گہرے ہوتے ہیں۔

بریلی میں اب سرکاری نل لگ گئے ہیں اور
اکثر گھروں میں نلوں کا پانی استعمال ہونے لگا ہے۔
لیے بہت سے کنوئیں یا تو ملبے سے بھر دیے گئے
یا انھیں اوپر سے ڈھانپ دیا گیا ہے۔

ایسے ہی ایک کنوئیں پر ابھی حال ہی میں
۳۰ رجون کو ایک حادثہ پیش آیا جو اس کہاوت کو
رتا ہے "جسے خدا رکھے اسے کون چکھے"۔

یہ واقعہ میری لڑکی نے (جو بریلی میں مقیم ہیں)
یکم جولائی کے خط میں بیان کیا ہے چونکہ اس کا
ان کی اپنی تین سالہ لڑکی سنگیتا سے ہے اس
س واقعہ کو ان کے اپنے لفظوں میں
بیان کرنا زیادہ مناسب ہے۔

"محترم پاپا جی۔ کل سویرے نو بجے ناشتہ
کر چکنے کے بعد جب پاپا جی (میری لڑکی کے خسر صاحب)
اور بھائی صاحب (یعنی ان کے دیور) اپنے کام پر
چلے گئے تو سنگیتا کھیلتے کھیلتے صحن میں کنوئیں پر پڑے
ہوئے تختوں پر سوکھے ہوئے پھول اٹھانے چلی گئی۔
کنوئیں کو ان تختوں سے آٹھ دس سال سے ڈھانپ
دیا گیا ہے۔ دھوپ، بارش اور موسمی تبدیلی سے یہ
تختے گل سڑ گئے ہیں۔

جیسے ہی سنگیتا نے ایک تختے پر قدم رکھا۔
یہ تختہ ٹوٹ گیا اور لڑکی دھڑام سے کنوئیں کے اندر
گری۔ گرتے ہوئے وہ ہائے پاپا، ہائے پاپا کر کے
چلاتی گئی۔ اتفاق سے سنگیتا کے پاپا (والد) نے سب
سے پہلے اس کا چیخنا سنا اور کنوئیں کی طرف بھاگے
اور شور مچانا شروع کر دیا۔ میں اس وقت کچن میں
(رسوئی) میں کام کر رہی تھی اور میں نے لڑکی کا
چیخنا نہیں سنا تھا۔

سنگیتا گرنے کے بعد ایک دم خاموش ہو گئی
گھر میں جتنے لوگ تھے، سب یہ سمجھ کر کہ سنگیتا
اب اللہ کو پیاری ہو گئی، رونے پیٹنے لگے

میں چار منٹ بعد پھر اس کے رونے کی آواز سنائی دی۔ تو کچھ جان میں جان آئی کہ بچی ابھی زندہ ہے۔ مگر کریں کیا کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ جگنو (سنگیتا کا بڑا بھائی عمر آٹھ سال) روتا پیٹتا گلی میں بھاگا۔ گویا بھگوان نے سب سے پہلے اسے عقل دی۔ وہ پڑوس کے مکان میں گیا اور صورتِ حال بیان کی۔ اس گھر کے لوگوں نے اپنے گھر سے فائر بریگیڈ کو فون کیا اور اپنے تین نوجوان صاحب زادوں کے ساتھ فوراً دوڑے آئے اتنے میں میری ساس صاحبہ اور نند بھی مندر سے پوجا کرکے واپس آگئیں۔ اِدھر محلے بھر میں ہنگامہ مچ گیا بہت سے لوگ ہمارے گھر جمع ہو گئے۔ لیکن کسی کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ سنگیتا کے پاپا نے کنوئیں کی منڈیر پر کے سب تختے ایک طرف ہٹا دیئے۔ اب کنوئیں کے اندر کون جائے۔ فائر بریگیڈ اب تک نہیں پہنچا تھا۔ بڑے بوڑھے خدا سے دعائیں مانگ رہے تھے۔ عورتیں رو رہی تھیں۔ نوجوان ان کو تسلی تشفی دے رہے تھے۔

آخر ہمارے پڑوسی کے صاحب زادے نے جو شکاری بھی ہیں اپنے گھر سے ایک لمبا سا مضبوط رسہ اور ٹارچ منگائی۔ کچھ لوگوں نے رسے کو مضبوطی سے تھاما اور یہ صاحب زادے ٹارچ لے کر نیچے کنوئیں میں اس کے سہارے سے اتر گئے۔ اسی رسے کے دوسرے سرے سے باندھ کر ایک بالٹی بھی کنوئیں میں اتار دی گئی۔

صاحب زادے جب نیچے پہنچے اور ٹارچ روشن کرکے دیکھا تو گھبرا گئے۔ سنگیتا کے پاس چار زندہ سانپ بھی پڑے تھے۔ مگر انھوں نے اپنے حواس نہیں کھوئے۔ اپنا ایک پیر بالٹی میں رکھ دیا دوسرا دیوار پہ لٹکا دیا۔ چستی سے جھک کر انھوں نے سنگیتا کا بازو پکڑا اسے اوپر کھینچ کر بالٹی میں ڈال دیا اور چیخ کر رسہ اوپر کھینچنے کو کہا۔ آٹھ دس آدمیوں نے رسہ کھینچ لیا اور یہ صاحب زادے اور سنگیتا دونوں بخیریت باہر نکل آئے۔ ان صاحبزادے نے باہر آکر بتایا کہ چار زندہ سانپوں نے بچی کو گھیر رکھا تھا۔

لڑکی کے کنوئیں میں گرنے اور اس کے پھر زندہ سلامت باہر نکل آنے میں جو دو تین گھنٹے لگے۔ اس عرصے میں ہم لوگوں پر کیا بیتی اور گھر کیسا ماتم کدہ بنا رہا۔ یہ اب نہ پوچھیے۔

باہر آکر سنگیتا ایک دم بے ہوش ہو گئی۔ پندرہ بیس منٹ بعد ہوش آیا تو زبان بالکل بند۔ نہ رو سکتی تھی نہ کوئی بات کرتی تھی۔ گھنٹہ بھر دیکھنے کے بعد اسے ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ خدا کی شان کہ ڈاکٹر کے دیکھنے سے پہلے ہی وہ اپنے آپ اچھا خاصا بولنے لگی۔ اس سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ اس کے پورے جسم پر کہیں بھی ذرا سی خراش تک نہ آئی تھی۔ گرمی تو جیسے کنواں سوکھ گیا۔ بالکل خشک باہر نکلی۔ ذرا سی کیچڑ لگ رہی تھی۔ دوپہر کو جب کنوئیں کو بھروانے کا فیصلہ کیا گیا اور اس میں اینٹیں پھینکی گئیں تو ان کے گرنے سے پانی کی آواز سنائی دیتی تھی۔

" بھگوان نے اس بچی کی جان بچائی اس کے لیے اس کا جتنا شکر ادا کیا جائے کم ہے۔ آپ سب کو بچی کی نئی زندگی مبارک ہو "

یہ خط پڑھ کر آپ سے آپ دل سے یہ آواز نکلی "جسے خدا رکھے اسے کون چکھے!"

جناب غلام حیدر

خیر صاحب۔ چیزوں سے چیزیں بدل کر کام تو چل جاتا تھا۔ لیکن کبھی کبھی مشکل بھی پیش آتی تھی۔ ایک آدمی کے پاس شکار کیے ہوئے جانور کا بہت سا گوشت تھا۔ اسے اناج کی ضرورت تھی۔ لیکن جس کے پاس اناج تھا اسے اس وقت گوشت کی ضرورت نہیں تھی۔ اُسے تو مٹی کے برتن چاہیے تھے۔ اب کیا ہو؟

ایک غریب جانوروں کی دو سوکھی صاف کھالیں لیے پھرتا تھا۔ اسے اناج لینا تھا۔ کچھ ہتھیاروں کی ضرورت تھی۔ تھوڑی سی چربی بھی رات کو جلانے کے لیے چاہئے تھی اور بھی ضرورت کا چھوٹا موٹا سامان اسے لینا تھا۔ اب وہ بے چارہ پریشان کہ اتنا سامان لینے کے لیے دو کھالوں کو کیسے بانٹے؟ یہ سارا سامان ایک آدمی کے پاس تو تھا نہیں کہ سیدھا جائے اور کھالیں دے کر ضرورت کا سب سامان لے آئے۔

ایسی ہی مشکلوں کی وجہ سے انسان نے سوچنا شروع کیا کہ کیوں نہ دو چیزوں کے بیچ میں ایک اور چیز ڈال کر لین دین کو آسان کر لیا جائے۔ شروع میں ممکن ہے کہ یہ بات تم کو عجیب سی لگے، مگر میں تمہیں اس کی مثال دوں تو تم فوراً سمجھ جاؤ گے۔

فرض کرو تمھیں ایک کتاب خریدنی ہے ایک دوسرے شخص کو آٹا خریدنا ہے۔ تم نے اپنے ابا سے پیسے لیے اور کتاب بیچنے والے پیسوں کے بدلے میں کتاب لے آئے۔ اِدھر دُکان دار نے تم سے پیسے لیے اور آٹے کی دُکان سے آٹا لے آیا۔ آٹا بیچنے والے کو کپڑا خریدنا تھا۔ وہ پیسے لے کر کپڑے کی دُکان پر گیا، کپڑا لیا، اور پیسے دے دیے۔

دیکھا تم نے! لوگوں کی اصلی ضرورتیں کیا تھیں؟ کتاب، آٹا، کپڑا، مگر دو چیزوں کے بیچ میں پیسے ڈالتے چلے جاؤ لین دین آسان ہوتا چلا جائے گا۔ مگر تم بہت خوش نصیب ہو کہ ایسے زمانے میں پیدا ہوئے جب یہ سب کچھ طے ہو چکا تھا۔ لیکن جس وقت کا میں ذکر کر رہا ہوں، اس وقت نہ پیسہ تھا، نہ روپیہ، بس سامان تھا، اور اس کو بدلنے میں جو مشکلیں تھیں وہ تم نے دیکھ ہی لیں۔

اب لوگوں نے سوچنا شروع کیا کہ دو چیزوں کے لین دین کے بیچ میں کوئی ایسی چیز ڈال دیں جس کی یا تو سب کو ضرورت ہو یا کم سے کم اس کی قدر سب ہی کرتے ہوں۔ وہ ایک چیز بھلا کیا ہو سکتی ہے۔ پالتو جانور ہی ہوں گے۔ اس لیے کہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ انسان نے پہلے جانور پالنا شروع کیے تھے۔ کھیتی باڑی بعد میں شروع کی تھی۔

جانور تو خیر سب ہی پالتے تھے۔ دودھ پینے
کے لیے کچھ نہیں کچھ نہیں تو دس بیس، بھیڑ، بکریاں،
گائیں، بھینسیں، سبھی کے پاس ہوتی تھیں۔ بس اب
ان کے بدلے میں چیزیں بھی آسانی سے ملنے
لگیں۔ اب بات یوں بنی کہ کھالوں والے نے کھالیں
کچھ بھیڑوں بکریوں سے بدلیں۔ اور کچھ

وقت بے وقت اپنی ضرورت کا سامان ان کے بدلے میں لے آتا۔

تو بھائی آسانی تو بہت ہوئی اس میں۔ اب اسے ہر چیز کے لیے مختلف لوگوں کے پاس نہ جانا پڑتا اس کے گھر میں بھیڑیں تھیں، وہ جب چاہتا اپنی ضرورت کا سامان لے لیتا۔ سامان دینے والا بھیڑیں رکھ لیتا ایسا بھی ہوتا کہ کبھی لوگ خود اس کے پاس آتے، بھیڑیں، بکریاں دیتے اور کھالیں لے جاتے۔ لو، بھائی! اب یہ ایک نیا چکر چل پڑا۔

اناج کے بھیس میں

اب تک آدمی کے یہ پالتو جانور ہی اس کی دولت تھے۔ ہر چیز ان کے بدلے میں خریدی یا بیچی جا سکتی تھی نقد ادھار سب کچھ ان بھیڑ، بکریوں کے ذریعہ سے چلتا تھا۔ اس میں بھی بہت سی پریشانیاں تھیں۔

ایک بار ایک دلچسپ واقعہ ہوا۔ ایک گاؤں میں بارش کی وجہ سے ایک آدمی کا گھر گر گیا۔ اس پر چھپر ڈلوانے کے لیے اور مزدوروں کو دینے کے لیے اس کے پاس اس وقت کی دولت: بھیڑیں، بکریاں کافی نہ تھیں۔ وہ اپنے ایک دوست کے پاس گیا اور اس سے سو بھیڑیں ادھار لے لیں۔ اس سال بارش ہوئی تھی، خوب ہریالی تھی، بھیڑیں خوب موٹی تازی ہو رہی تھیں۔

سال دو سال بعد جب اس نے قرض واپس کیا تو اس سال بارش نہیں ہوئی تھی، جانور بھوک سے دبلے ہو رہے تھے، مگر اس نے تو گن کر سو لی تھیں۔ وہ اپنی ویسی ہی سوکھی، ادھ مری بھیڑیں دوست کے پاس لے گیا۔ دونوں میں بہت جھگڑا ہوا۔

یوں بھی اگر کسی وبا میں جانور مر جاتے تو جتنے امیر تھے وہ غریب ہو جاتے۔ پھر جیسے جیسے دولت یعنی بھیڑ، بکریوں کا گلہ پاس بڑھتا ہوگا۔ ویسے ویسے اس دولت کو رکھنے کے لیے بڑے بڑے باڑوں کی ضرورت پڑتی ہوگی۔ بڑی بڑی چراگاہوں کی ضرورت پڑتی ہوگی اور اس آدمی کو جسے بازار سے بہت سا سامان لانا ہوتا ہوگا۔ پہلے بازار میں بہت سی بھیڑیں، بکریاں ہانک کر لے جانی پڑتی ہوں گی۔ کھلے جنگلوں میں سے، آسانی سے لوگ اس دولت کو ہانک کر بھی لے جاتے ہوں گے۔ اور مالک صاحب ہاتھ ملتے ہی رہ جاتے ہوں گے۔

تو اب انسان نے سوچا ہوگا کہ کوئی اور ایسی چیز کام میں لاؤ جو بوجھ میں ہلکی ہو، تھوڑی جگہ گھیرے کسی وبا میں ختم نہ ہو۔ ٹکڑوں میں بانٹی جا سکے۔ اور ظاہر ہے کہ سب کے استعمال کی چیز ہو۔ جبھی تو لوگ اس کی قدر بھی کریں گے۔

اب انسان سب سے زیادہ کیا چیز استعمال کرتا تھا؟ اناج۔ ہر شخص روٹی کھاتا۔ اس کے بغیر ایک دن بھی کتنا مشکل تھا۔

اور لوگ آہستہ آہستہ جانوروں کی جگہ اناج کو استعمال کرنے لگے۔ بڑی آسانی سے چھوٹے سے چھوٹا سامان خریدیے

اگر اناج بہت سا لے جانا ہے تو گھر کی بیل گاڑی میں منوں اناج بھر لیا۔ اب سو سو اور دو دو سو بھیڑیں اور بکریاں، گائیں، بھینسیں ہانک کر لے جانے کی ضرورت نہیں تھی۔

جناب رؤف خیر

صدر دروازہ

اک یہودی نے کھول رکھی تھی اچھی خاصی دوکان کپڑوں کی
کر رہا تھا مزے سے وہ بیوپار خوب چمکا ہوا تھا کاروبار
اس کی سیدھی طرف تھا اک موچی اس کو مارے حسد کے کیا سوجھی
کھول بیٹھا دوکان کپڑوں کی جن کی قیمت تھی اس سے کچھ سستی
بورڈ اس کی دوکان پر یوں تھا کپڑا ملتا ہے اس جگہ سستا!

اب یہودی کو فایدہ کم تھا
فایدہ کم تھا رات دن غم تھا

تھا اسی غم میں وہ تو بے چارا بائیں بازو جو تھا چنے والا
اس نے دیکھا جو ان دوکانوں کو خود بھی سوچا کہ کیوں نہ ایسا ہو
میں بھی کھولوں دوکان کپڑے کی فایدہ جب ہے بڑھ کے اس میں ہی
اس نے پایا جو فایدہ کا راز "بھاڑ بھونجا" بھی بن گیا بزاز
اور لگایا دکاں پہ یہ لکھ کر کپڑا بکتا ہے آدھی قیمت پر

اب یہودی کا پوچھتے کیا ہو
غم سے بے حد نڈھال تھا بچو!

لیکن اس کو بھی چال اک سوجھی بورڈ اتارا دکان کا اپنا
پھر نیا اس طرح سے لکھوایا اور اپنی دکان پہ لگوایا!

آیئے آیئے یہی تو رہا
ان دکانوں کا "صدر دروازہ"

الکزانڈر راسلن (روس)
ترجمہ
جناب محمد اظہر

کیا بنیں گے؟

جب ابا جان چھوٹے تھے تو ان سے اکثر پوچھا جاتا تھا، "تم کیا بننا چاہتے ہو؟" ابا جان کے پاس جواب تیار رہا کرتا لیکن ہر بار سوال کا جواب مختلف ہوا کرتا تھا۔ پہلے پہل ابا جان رات کے چوکیدار بننا چاہتے تھے۔ وہ سوچا کرتے جب سارا شہر سو جاتا ہے تو چوکیدار جاگا کرتا ہے۔ وہ یہ بھی سوچا کرتے جب سب سوتے ہوں گے تو شور مچانے کا خوب موقع ملے گا۔ ابا جان کو یقین ہو چکا تھا کہ بڑے ہو کر وہ چوکیدار بنیں گے۔
انھیں جب آئس کریم بیچنے والا دکھائی دیا جو اپنی سبز رنگ کی گاڑی ڈھکیلتا آیا کرتا تھا تو وہ سوچنے لگے کہ کیوں نہ وہ بھی ایسی گاڑی ڈھکیلیں اور جتنی آئس کریم چاہیں کھائیں۔
"جب میں ایک آئس کریم بیچوں گا تو ایک آئس کریم خود بھی کھایا کروں گا۔" ابا جان اپنے دل میں سوچا کرتے ——"اور میں بچوں کو مفت آئس کریم بانٹا کروں گا۔"
ابا جان کے والدین کو بہت تعجب ہوا جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ ان کے صاحبزادے آئس کریم وینڈر کا پیشہ اختیار کرنے والے ہیں لیکن ابا جان کا اپنا خیال تھا کہ بڑے ہونے کا یہ بہت مزیدار طریقہ ہے۔
ایک دن ابا جان نے اسٹیشن پر ایک عجیب سا آدمی دیکھا جو ریل کے ڈبوں اور انجنوں سے کھیل رہا تھا۔ یہ کھلونے نہ تھے بلکہ اصل ڈبے اور انجن تھے وہ کبھی پلیٹ فارم پر کود جاتا اور کبھی ڈبوں کے نیچے جا کر نہایت انوکھے ڈھنگ سے حیرت انگیز چیزوں سے کھیلتا۔
"وہ کون آدمی ہے؟" ابا جان نے پوچھا۔
"وہ شنٹر ہے۔" لوگوں نے بتایا۔
اب ابا جان نے طے کر لیا کہ بڑے ہو کر وہ کیا کریں گے۔ جوان ہو کر وہ ریل کے ڈبوں کو ادھر ادھر کیا کریں گے۔ ساری دنیا میں اس سے زیادہ دل چسپ کام اور کیا ہو سکتا ہے۔ جب ابا جان نے یہ خیال ظاہر کیا کہ وہ شنٹر ہونا چاہتے ہیں تو کسی نے ان سے سوال کیا "آئس کریم کا کیا ہوگا؟" اور یہ سچ مچ ایک پیچیدہ مسئلہ تھا۔ ابا جان

شنٹر تو بنا چاہتے تھے لیکن ساتھ ساتھ سبز رنگ کی گاڑی بھی اپنے ہاتھ سے کھونا نہیں چاہتے تھے۔ آخر کار ان کو ایک عمدہ راستہ نظر آیا۔

"میں شنٹر بھی بنوں گا اور آئس کریم بیچنے والا بھی۔"

ہر آدمی کو تعجب ہوتا لیکن چھوٹے سے ابا جان اس کی وضاحت یوں کرتے: "یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ میں سویرے آئس کریم بیچوں گا اور تھوڑی دیر بیچنے کے بعد اسٹیشن چلا جایا کروں گا۔ وہاں چند ڈبوں کو ہٹانے کے بعد پھر لوٹ کر کچھ آئس کریم بیچوں گا اس میں کوئی دقت نہ ہوگی۔ میں اپنی آئس کریم کی گاڑی اسٹیشن کے پاس کھڑی کر دیا کروں گا۔ ٹرین کے لیے بھی زیادہ دور نہ جانا ہوگا۔"

سب لوگ ہنسنے لگتے تب چھوٹے ابا جان خفا ہو جاتے اور کہتے:۔

"اگر تم لوگ ہنسو گے تو میں اس کے ساتھ چوکیداری بھی کروں گا آخر رات بے کار ہی تو جایا کرے گی۔"

بہرحال معاملہ طے ہو گیا لیکن ابا جان ہوائی جہاز کے پائلٹ بھی بننے کے خواہاں تھے۔ پھر وہ ایکٹر بھی بننا چاہتے تھے۔ جب دادا جان انکو ایک فکٹری گھمانے لے گئے تو وہ خراد چلانے والا بننا چاہتے تھے ان سب کے باوجود وہ بحری سپاہی بھی بننا چاہتے تھے۔ اگر کچھ نہیں تو وہ ایک گلہ بان بننا چاہتے تھے۔ اس طرح وہ اپنا سارا دن گھومنے، گایوں کو چرانے اور [illegible] کو لہرانے میں صرف کرنا چاہتے تھے۔

آخر کار انھوں نے طے کیا کہ وہ کتا بنیں گے۔ چنانچہ اس روز سارے دن وہ چوپایوں کی طرح گھومتے رہے۔ اجنبیوں پر بھونکتے رہے یہاں تک کہ انھوں نے ایک معمر عورت کے کاٹ بھی لیا وہ بے چاری شفقت میں ان کے سر کو تھپتھپا رہی تھی۔ چھوٹے ابا جان نے بھونکنا تو سیکھ لیا لیکن وہ پیروں سے کان کھجانا نہ سیکھ پائے گو انھوں نے بار بار کوشش کی۔ بعد کو انھوں نے یہ سوچا کہ اگر وہ باہر جا کر کتوں کے ساتھ بیٹھیں گے تو ہر کرتب جلد سیکھ جائیں گے۔

اسی وقت ایک افسر سڑک سے گذر رہا تھا۔ وہ رکا، اس نے ابا جان کو غور سے دیکھا اور تھوڑی دیر بعد پوچھا۔

"تم کیا کر رہے ہو؟"

"میں کتا بننا چاہتا ہوں" ابا جان نے جواب دیا

"کیا تم آدمی بننا نہیں چاہتے"

"میں ایک عرصہ تک آدمی بنا رہا۔" ابا جان نے کہا۔"

"تم عجب آدمی ہو کہ کتا بھی بن سکتے ہو؟ کیا آدمی ایسے ہی ہوتے ہیں؟"

"تو پھر وہ کیسے ہوتے ہیں؟"

تم اپنے سے پوچھو" یہ کہہ کر افسر اپنے راستہ پر چل دیا۔

وہ نہ ہنس رہا تھا نہ مسکرا رہا تھا لیکن چھوٹے ابا جان کو بہت شرم آئی اور انھوں نے سوچنا شروع کیا، وہ سوچتے رہے۔ جتنا سوچتے اتنا ہی ان کو اپنے کیے پر ندامت ہوئی۔ افسر نے ان سے کچھ نہیں کہا تھا لیکن وہ اتنا سمجھ گئے کہ وہ ہر روز اپنا خیال نہ بدل سکتے تھے۔ سب

باقی صفحہ ۳۲ ابن بطوطہ پر

مولانا مقبول احمد سیوہاروی

سفرنامہ ابن بطوطہ

مسلسل

شام ہونے آئی تو راستہ بتانے والے نے ہمیں پھر بھٹکانا چاہا ۔ کہنے لگا شہر قریب ہے جلدی چلو ۔ اندھیرا بڑھتا دیکھ کر ہم نے اس کا کہنا نہ مانا اور ایک صاف جگہ میں درختوں کے نیچے ٹھہر گئے ۔

مولانا بیمار ہوگئے تھے ۔ میں بھی تھک گیا تھا اس لیے جنگل میں گذاری ۔ مولانا کو بیچ میں لٹایا ان کی برابر میں ۔ اور سامان میں نے اپنے پاس رکھ لیا اور ہوشیار رہا ۔ راستہ بتانے والا یا راہبر ذرا بھی جنبش کرتا تو میں کھنکار دیتا کہ وہ جان جائے کہ میں غافل نہیں ہوں ۔

صبح اٹھ کر شہر پہنچے ۔ میرے پاؤں زخمی تھے ۔ اور تھکن سے چور چور ہو رہا تھا ۔ شہر کے دروازے پر پہنچ کر ایک نئی مصیبت کا سامنا ہوا ۔ دروازے کے سپاہی نے کہا ۔ بغیر شہر کے امیر کے ملے آپ اندر نہیں جا سکتے آخر امیر کے پاس گئے ۔ امیر بہت معقول اور شریف آدمی نکلا ۔ میرا حال پوچھتا رہا ۔ مجھے اپنا مہمان بنایا ۔ اس وقت میں اتنا تھکا ہوا تھا کہ کھڑے ہونے کی سکت نہ تھی ۔ چھ دن تک میں امیر کا مہمان رہا ۔

قلہات :- قلہات ساحلی شہروں میں عمدہ شہر ہے ۔ بازار بارونق دار اور مسجدیں آباد ہیں ایک مسجد اتنی اونچی ہے کہ سمندر کے کنارے سے نظر آتی ہے ۔ یہ مسجد ایک خاتون نے بنائی ہے! اس کا نام بی بی مریم تھا ۔

میں نے یہاں ایک ایسی مچھلی کھائی کہ دنیا کے کسی حصے میں ایسی مچھلی نہ کھائی تھی ۔ مزے میں گوشت اس کے مقابلے میں نہیں لایا جا سکتا ۔ چاولوں میں ملا کر کھائی جاتی ہے ۔

چاول یہاں ہندوستان سے آتا ہے ۔

قلہات والے اگرچہ خارجی ہیں مگر سلطان ہرمز کی رعایا ہیں اس لیے کھلم کھلا اپنے عقیدے ظاہر نہیں کرتے یہ لوگ تجارت پیشہ ہیں ۔ تجارت ہی پر گذر بسر ہے ۔

طیبی :- قلہات کے قریب ایک گاؤں ہے ۔ اس کا نام طیبی ہے ۔ ایسا پاک صاف اور خوبصورت گاؤں ہے کہ میں کیا بتاؤں ۔

درخت لہلہاتے ہیں ۔ نہریں بہتی ہیں ، پھلوں اور پھولوں کے ڈھیر ہیں ۔ یہاں کا کیلا بہت عمدہ ہوتا ہے ۔ اس کا نام مروارید ہے ۔ ہرمز وغیرہ جاتا ہے ۔ پان بھی ہوتا ہے ۔ مگر پتے بڑے نہیں ہوتے ۔ کھجوریں عمان سے آتی ہیں ۔ سات دن کی

مسافت پر عمان ہے ۔

عمان کے شہر سرسبز ہیں ۔ باغوں کی کثرت ہے کھجوریں زیادہ پیدا ہوتی ہیں ۔ عمان کے شہروں میں ایک شہر کا نام ترور ہے ۔ پہاڑی پر آباد ہے ۔ باغوں سے گھرا ہوا ہے ۔ یہاں کا دستور ہے کہ ہر آدمی اپنا کھانا لے کر مسجد کے صحن میں جا بیٹھتا ہے ۔ پھر سب مل کر کھاتے ہیں ۔ کوئی پردیسی آجاتا ہے تو اسے بھی کھلاتے ہیں یہ لوگ بہت لڑاکا ہیں ۔ دنگا فساد کرتے رہتے ہیں ۔

جمعے میں چار رکعت ظہر کی نماز پڑھتے ہیں ۔

نماز کے بعد امام صاحب کلام پاک کی دو آیتیں پڑھ کر تقریر کرتے ہیں ۔ حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ کے ساتھ راضی اللہ عنہ کہتے ہیں ۔ حضرت عثمان و علی کا نام آتا ہے تو بغیر دعا کے آگے بڑھ جاتے ہیں ۔

یہ لوگ ابن ملجم شقی کے ساتھ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں ۔ ان کی عورتیں بے شرمی کو بُرا نہیں سمجھتیں ۔ بادشاہ کا نام ابو محمد ہے ۔ اپنے دروازے کے باہر بیٹھک میں بیٹھتا ہے ۔ جس کا جی چاہے بے تکلف ملاقات کرسکتا ہے ۔ کوئی روک ٹوک نہیں ہے ۔ جو کوئی ملنے جاتا ہے اس کی خاطر مدارات کرتا ہے ۔

لوگ پالتو گدھے کا گوشت کھاتے ہیں اور بازاروں میں بیچتے ہیں ۔ شاہی دسترخوان پر بھی گدھے کا گوشت آتا ہے ۔ مگر مہمانوں کے سامنے نہیں رکھا جاتا ۔

ہرمز سے بحرین کی طرف

ہرمز کے شہروں میں جرون خوبصورت شہر ہے ۔ بازار بارونق اور عمدہ ہیں ۔ سامان سے بھرے رہتے ہیں ۔ ہندوستان اور سندھ کے جہازوں کا یہ بڑا اسٹیشن ہے ۔

ہندوستان کا تجارتی سامان جرون سے عراق، خراسان اور فارس جاتا ہے ۔ سلطان بھی اسی شہر میں رہتا ہے ۔ یہاں سے ایک دن کی راہ پر وہ جزیرہ ہے جہاں نمک کے پہاڑ ہیں ۔ اس نمک سے برتن بنتے ہیں جس سے جہازوں میں چراغ دانوں کا کام لیا جاتا ہے ۔

جزیرے کے لوگ مچھلی اور کھجور پر گذارہ کرتے ہیں ۔ ان کی کہاوت ہے خُرما و ماہی نعمتِ بادشاہی ۔ یہاں پانی قیمت سے ملتا ہے ۔ جزیرے والے تالابوں اور چشموں سے مشکیں بھر بھر کے لاتے ہیں ۔ یہ چشمے دور ہیں اور پانی کشتی سے آتا ہے ۔

جرون میں ایک مچھلی کا سر بازار اور جامع مسجد میں رکھا ہے ۔ مچھلی کی آنکھیں اتنی بڑی ہیں کہ لوگ ان کے بیچ سے ہو کر آتے جاتے ہیں ۔ جرون میں میری ملاقات شیخ ابوالحسن انصاری سے ہوئی ۔ شیخ نے میری دعوت کی اور ایک جوڑا کپڑوں کا مرحمت فرمایا ۔

شہر سے چھ میل پر ایک جگہ حضرت خضر اور حضرت الیاس کی عبادت گاہ مشہور ہے ۔ ایک خانقاہ بھی ہے ۔

جزیرے کے آخری سرے پر غار میں ایک بزرگ رہتے ہیں ۔ چھوٹا سا مکان ہے ۔ خانقاہ ہے ۔ گائیں بھینسیں پال رکھی ہیں ۔ پہلے بہت بڑے تاجر تھے ۔ تمام مال و دولت بھائی کو دے کر گوشہ نشین ہیں ۔ اچھے بزرگ ہیں ۔

ہرمز کے بادشاہ کا نام قطب الدین تہمتن ہے ۔ بہت سادہ مزاج ہے ۔ علما کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے اور بڑی عزت سے

پیش آتا ہے۔ جس زمانے میں ہم پہنچے قطب الدین
اپنے بھتیجوں سے مصروفِ جنگ تھا۔ لڑائی کے سبب
جزیرے میں ہر چیز مہنگی تھی۔

اس کا وزیر شمس الدین محمد اور عماد الدین
شونکاری قاضی چند علماء کی ہم راہی میں میرے پاس
آئے اور معذرت کی کہ لڑائی کے سبب بادشاہ آپ کی
خدمت میں نہیں آ سکے ہیں۔

چلتے وقت ہم نے وزیر سے کہا کہ بادشاہ سے
ملاقات کیے بغیر ہم رخصت ہونا نہیں چاہتے۔ وزیر
نے کہا ابھی چلیے اور ملاقات کر لیجیے۔

بادشاہ کا محل دریا کے کنارے ہے۔ بہت سی کشتیاں
کنارے پر پڑی تھیں۔ ایک کشتی پر بادشاہ میلے کپڑے
پہنے بیٹھا تھا۔ سر پر عمامہ اور کمر میں پٹکا تھا۔ وزیر نے
سلام کیا مگر میں نہ سمجھا کہ یہ بادشاہ ہے۔ اس کے برابر
اس کا بھائی علی شاہ بن جلال الدین بیٹھا تھا۔ میری اس
سے پہلے کی جان پہچان تھی۔ اس سے بات چیت کرنے لگا۔
جب وزیر نے بتایا کہ بادشاہ یہ ہیں تو مجھے بڑی ندامت
ہوئی اور معافی مانگی۔

ذرا سی دیر میں بادشاہ اٹھا اور گھر میں چلا گیا
پیچھے پیچھے وزیر اعظم اور امیر گئے۔ میں بھی وزیر اعظم کے
ساتھ اندر گیا۔ بادشاہ انھی میلے کپڑوں کو پہنے تخت پر بیٹھ
گیا ـــــ بادشاہ کے ہاتھ میں موتیوں کی ایسی قیمتی تسبیح
تھی کہ اس سے میں نے ایسے موتی نہ دیکھے تھے۔ موتی
اس علاقے میں پیدا ہوتے ہیں۔

بادشاہ نے مجھ سے باتیں کیں۔ حالات
پوچھے۔ اس کے بعد کھانا آیا۔ تمام حاضرین نے
کھایا۔ مگر بادشاہ اس کھانے میں شریک
نہ ہوا۔ پھر وہ کھڑا ہو گیا اور میں رخصت ہو کر چلا آیا۔

بادشاہ کی اس کے بھائی سے مدت سے
لڑائی چلی آتی ہے۔ نظام الدین اس کے بھائی کا نام
ہے بہت لڑاکا ہے۔ بیٹھے بٹھائے لڑائی مول لی ہے
اور اپنے بھائی کی راج دھانی پر قبضہ جمائے بیٹھا ہے
کئی مرتبہ قطب الدین نے مقابلہ کیا جب کچھ نہ چلی تو
بھائی کی عورتوں سے میل کر کے نظام الدین کو زہر دلوادیا۔

نظام الدین کے لڑکے فوج اور خزانہ لے کر
جزیرہ قیس میں بھاگ گئے اور ڈاکے ڈالنے لگے۔ جو کوئی سندھ
یا ہندوستان جاتا لوٹ لیتے۔ جزیرہ قیس سے موتی بھی
نکالے جاتے ہیں۔

جرون سے ہم نے ترکمانوں کی سواری کرایے
پر لی اور جرجستان چلے گئے۔ بغیر ترکمانوں کی جان پہچان
کے اور بغیر انھیں ساتھ لیے ان راستوں پر سفر نہیں کیا
جا سکتا۔ چار دن مسلسل جنگل میں سفر کرنا پڑتا ہے۔ یہاں
ڈاکو مال اسباب لوٹ لیتے ہیں۔

گرمیوں میں اتنی لو چلتی ہے کہ جسے لگ
جاتی ہے۔ بچتا نہیں ہے جگہ جگہ اس لو سے مرنے والوں
کی قبریں اس جنگل میں نظر آتی ہیں۔

لو سے مرنے والے ایک آدمی کا واقعہ لوگوں
نے مجھے ایسا سنایا کہ میں سن کر لرز گیا جب وہ مر گیا۔
اور اسے غسل دیا گیا تو جوڑ جوڑ الگ ہو گیا تھا۔ خدا
کی پناہ!

ہمارا سفر رات میں ہوتا تھا۔ اور جونھی
سورج اونچا ہوتا تھا۔ درختوں کی چھاؤں میں ٹھہر جاتے
تھے اور جب تک سورج ڈھل نہ جاتا اپنی جگہ
سے حرکت نہ کرتے تھے۔

اس جنگل میں ایک بہت مشہور ڈاکو رہتا تھا۔اس کا نام جمال الملک تھا۔کسی لڑائی میں اس کا ایک ہاتھ کٹ گیا تھا۔اس نے کچھ ساتھی جمع کرلیے تھے۔ان کی مدد سے لوٹ مار کرتا تھا اور لوٹے ہوئے مال سے خانقاہیں بناتا تھا اور مسافروں کو کھانا کھلاتا تھا۔وہ کہا کرتا تھا کہ میں اسے لوٹتا ہوں جو اپنے مال کی زکواۃ نہیں دیتا۔

یہ سب ڈاکو جنگل کے چپے چپے سے خبردار تھے شاہی فوج پکڑنے آتی تو جنگلوں میں چھپ جاتے فوج کے آدمی پیچھا کرتے تو جنگل میں پیاسے مرجاتے شاہ عراق نے ہرچند گرفتار کرنا چاہا مگر کامیابی نہ ہوئی۔

کچھ دن بعد جمال عبدالملک نے توبہ کرلی اور ہرگھڑی عبادت کرنے لگا۔اب وہ مرگیا ہے اور اس کی قبر پر آس پاس کے لوگوں کا میلہ لگا رہتا ہے۔

جنگل سے نکل کر ہم ایک شہر میں پہنچے جس کا نام لار ہے۔لار میں باغ، نہریں اور اچھے بازار ہیں۔ہمارا قیام ابو یوسف محمد کی خانقاہ میں ہے اب ان کے بیٹے ابو زید عبدالرحمن خانقاہ میں رہتے ہیں۔ ان کے ساتھ درویشوں کی ایک جماعت ہے روزانہ عصر کے بعد خانقاہ میں جمع ہوتے ہیں۔پھر شہر کے ہر گھر میں جاتے ہیں اور روٹیاں مانگ کر لاتے ہیں۔ہر گھر والا دو روٹیاں دے دیتا ہے۔روٹیاں جمع ہو جاتی ہیں تو مل جل کر کھاتے ہیں اور جو کوئی مسافر خانقاہ میں آجاتا ہے۔اسے کھلاتے ہیں۔

شہر والے بڑی خوشی سے انھیں روٹیاں دیتے ہیں۔ان کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔جمعرات کے دن شہر کے تمام فقیر اور معزز شہری خانقاہ میں جمع ہوتے ہیں۔ہر ایک کچھ نہ کچھ نقدی لاتا ہے۔پھر سب مل کر کھانا کھاتے ہیں۔

رات میں نمازیں پڑھتے ہیں۔قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہیں اللہ کا ذکر کرتے ہیں۔صبح کی نماز پڑھ کر اپنے اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔

شہر کے امیر کا نام جلال الدین ہے۔اچھا آدمی ہے ہماری دعوت کی اور بڑی عزت سے پیش آیا۔

باقی آئندہ

کیا بنیں گے کا بقیہ

سے بڑی بات جو انھیں معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ اپنے مستقبل کی بابت وہ کوئی بات طے نہیں کرسکتے اس وجہ سے کہ وہ عمر میں بہت چھوٹے تھے۔

پھر جب کسی نے ان سے پوچھا تو ابا جان نے جواب دیا "میں آدمی بننا چاہتا ہوں" کوئی نہیں ہنسا تب ابا جان کو محسوس ہوا کہ یہ بہترین جواب ہے۔چنانچہ اب بھی ان کا یہی خیال ہے سب سے پہلے تمھیں اک اچھا آدمی بننا چاہیے۔اک پائلٹ کے لیے بھی یہ اتنا ہی ضروری ہے جتنا ایک گلہ بان اور ایک آئس کریم بیچنے والے کے لیے۔

مختصراً ایک انسان کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنے بیروں سے کان کھجائے۔

اردو پڑھیے اردو لکھیے اور اردو بولیے

اقبال مند

(مسلسل)

جناب مسیح الدین صدیقی

پھر ہم نے ان کے گودام کی خبر لی۔ انھوں نے گودام کو بھی آگ لگادی تھی۔ تاکہ ان کے اصل خزانہ کا کسی کو صحیح صحیح پتہ نہ چل سکے۔

ہم نے جب ان کا گودام دیکھا تو حیرت سے آنکھیں پھیل گئیں۔ باوجود سینکڑوں کا مال جل چکنے کے۔ ابھی ہزاروں روپیہ نقد اور ہزاروں کا سامان اناج اور دوسری چیزیں محفوظ تھیں۔

ان کے لے جانے کا مسئلہ بھی اہم تھا۔

عقری صاحب نے فوراً وائرلیس کیا اور پولس کنٹرول روم سے پولس کی بڑی ویگنیں منگوائیں۔

پھر ان گاڑیوں میں لاد کر ان کا خزانہ "پہاڑی کی دامن" سے "سرکاری گودام" میں پہنچا دیا گیا۔ ان میں میرا بیگ بھی تھا۔ امین صاحب نے میرا بیگ مجھے دلوادیا۔

ان تمام کاموں سے فارغ ہوکر ہم نے پچاس ساٹھ مسلح سپاہیوں کا دستہ پہاڑی پر متعین کر دیا تاکہ کچھ اور لوگ باقی رہ گئے ہوں تو انھیں بھی گرفتار کر لیا جائے۔

اس کے بعد ہم لوگ واپس ہوئے۔ شہر پہنچ کر ہم نے سب سے پہلے ان ٹھگوں کو جیل میں بند کروایا۔ پھر اسپتال پہنچے۔ اس کے بعد ریلوے اسٹیشن پہنچے اور آخر میں پولس کنٹرول روم۔

بہت دیر تک کچھ لکھائی پڑھائی ہوتی رہی۔ بیانات لیے اور قلمبند کیے گئے۔ پھر اس سے بھی فارغ ہوکر میں، اقبال اور امین صاحب گھر پہنچے۔

اب تک پورے شہر میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل چکی تھی کہ ایک لڑکے کی ہوشیاری اور سوجھ بوجھ کی بدولت ٹھگوں کا بہت بڑا گروہ پکڑا گیا ہے۔

باوجود میرے انکار کے میری بے شمار تصویریں لی گئیں۔ میرے بیانات لیے گئے

اخبار بیچنے والے بچے اخباروں کے پلندے بغل میں دبائے گلیوں میں بازاروں میں ادھر سے ادھر دوڑ رہے اور زور زور سے یہ آوازیں لگا رہے تھے۔

"اقبال مند" نے ملک کے خطرناک ترین ٹھگوں کے گروہ کا پتہ لگایا اور انھیں پولس کے حوالے کر دیا۔ بچے کچھے ٹھگوں کی تلاش جاری ہے۔

اخبارات نے یہ بھی شائع کیا کہ راحت امین صاحب کا لڑکا اقبال جو گذشتہ تین برسوں سے لاپتہ تھا۔ اقبال مند اسے واپس لایا۔

دوسرے دن میں نے ایک بیان اخبارات کے حوالہ کیا۔

جن والدین کے لڑکے اغوا کر لیے گئے تھے وہ سرکاری اسپتال پہنچ کر اپنے اپنے بچوں کو شناخت کریں اور انھیں لے جائیں۔

اخبارات میں جیسے ہی یہ خبر چھپی دواخانہ میں والدین کا تانتا بندھ گیا ۔ وہ آتے اور اپنے اپنے بچوں کو پہچان کر لے جاتے ۔ جن والدین کو ان کے بچے مل گئے وہ خوشی میں پھولے نہ سماتے اور مٹھائیاں، پھولوں کے ہار اور خدا جانے کیا کیا چیزیں لیے میرے پاس آجاتے۔ پھر مجھے ہار پہنائے جاتے گلے سے لگایا جاتا، دعائیں دی جاتیں ۔

جو والدین مالدار ہوتے وہ کچھ رقم بھی پیش کرتے لیکن میں نے کسی سے ایک پیسہ بھی نہیں لیا ۔ اور ان سے کہا ۔

"میرا معاوضہ تو آپ کی خوشی ہے ۔ اور یہ آپ کی بے شمار دعائیں ، اس سے بڑھ کر بھی اور کیا معاوضہ لے سکتا ہوں ۔"

والدین میرے اس جواب سے خوش ہو جاتے اور مجھے اپنے سینوں سے چمٹاتے بہت دیر تک دعائیں دیتے اور کہتے "بیٹے ۔ تم واقعی اسم بامسمّٰی ہو ۔ خدا ہر ماں باپ کو ایسی ہی اقبال مند اولاد دے ۔"

اور میں ان کے یہ الفاظ سن کر سجدے میں گر پڑتا ۔

"خدایا ۔ یہ تیرا ہی فضل و کرم ہے کہ لوگ میرے متعلق نیک خیالات کا اظہار کر رہے ہیں ۔ ورنہ میں کس شمار میں تھا ۔"

دوسرے دن حکومت کی طرف سے مجھے بلایا گیا ۔ تاکہ اعلان کے مطابق مجھے پانچ ہزار کی رقم انعام میں دی جائے ۔

امین صاحب بولے ۔ بیٹے چلو حکومت اپنا وعدہ پورا کرنے بلاتی ہے ۔

میں بولا ۔ مگر امین صاحب ! میں نے تو یہ کام انعام کے [illegible] ۔ میں انعام نہیں لوں گا ۔

[illegible] صاحب بولے ۔ بیٹے ۔ ناسمجھی کی بات نہیں کرتے حکومت تو تمہیں اپنی خوشی سے انعام دے رہی ہے ۔ پھر اس کے لینے میں تمہیں کیا عذر ہو سکتا ہے ۔ اور یہ لالچ کیسے ہوا ؟

"امین صاحب ! مجھے اپنا انعام مل چکا ہے ۔ یہ سینکڑوں والدین کی دعائیں اور ان کی خوشیاں ۔ بتائیے کیا میرا انعام نہیں ؟"

"وہ تو ہے بیٹا ۔ مگر میں کہتا ہوں تم حکومت کا انعام بھی لے لو ۔"

میرے کانوں میں آواز آئی ۔ خبردار ۔

"پیسے یا دنیا کی کسی اور چیز کو لالچ میں آکر اپنی نیکی برباد مت کرو ۔ جو کچھ کرو ۔ خلوص نیت سے کرو ۔ اور اپنے رب کی رضا کے لیے کرو ۔ اپنی نیکیوں کا انعام اپنے رب سے لو ۔ اور دنیا کے کسی حقیر انعام کی لالچ میں پروردگار کے عظیم انعام کو ضائع مت کرو ۔"

"نہیں امین صاحب ! مجھ سے یہ نہ ہو گا ۔" میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا ۔

"میں اپنا انعام اپنے اللہ سے لوں گا ۔ دنیا کے کسی انعام کے لیے مجھے مجبور نہ کیجیے ۔"

دو دن یوں ہی گذر گئے ۔ اب امین صاحب کو کچھ تشویش ہوئی ۔

حکومت پہلے ہی کونسی ایمان دار اور وعدہ پورا کرنے والی ہے ۔ وہ تو بہانوں کی تلاش میں رہتی ہے ۔ ایسا نہ ہو کہ وہ میری اس بات کو بھی بہانا بنا کر انعام کی رقم ٹال جائے ۔

انھوں نے ایک ترکیب سوچی ۔ اور اپنی بیگم صاحبہ فرزانہ اور اقبال کو میرے پیچھے لگا دیا کہ وہ کسی بھی طرح مجھے انعام لینے پر راضی کرلیں ۔

چنانچہ ان کی بیگم صاحبہ نے مجھے الگ اپنے

کمرے میں بلایا اور ایک گھنٹے تک خوب سمجھاتی رہیں کہ
کسی طرح میں حکومت کا انعام لے لوں۔

میں ان کی باتیں سنتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ
خود خاموش ہوگئیں۔ اور میں اٹھ گیا۔

دوسرے دن اقبال نے مجھے اپنے کمرے میں
بلایا۔ اور بولا۔ اقبال بھیا۔ تم یہ کیسی بڑی نادانی کر رہے ہو
کہ اتنی بڑی رقم سے انکار کر رہے ہو۔ مجھے بتاؤ۔ آخر تمھیں
اعتراض کیا ہے؟

"دیکھیے میں بولا —— مجھے زیادہ مجبور
نہ کیجیے۔ میں نے انعام کے لالچ میں یہ کام نہیں کیا ہے"
میں نے سخت لہجہ میں کہا۔

مگر وہ بولا۔ اقبال بھیا۔ مگر یہ تو سوچو جو
حکومت اپنی خوشی سے تمھیں انعام دے رہی ہے۔ اس
میں لالچ کا کیا سوال ہے؟

غرض بہت دیر تک وہ مجھے سمجھاتا رہا۔ پھر
فرزانہ نے مجھے الگ بلایا۔ وہ بولی۔

"بھیا میری ایک بات مانوگے؟"

"ضرور!" میں بولا۔

نہیں پہلے وعدہ کرو۔

تم بولو تو سہی۔ اگر ماننے کی ہوگی تو ضرور مانوں گا۔

"نہیں پہلے وعدہ!"

مجبوراً مجھے ماننا پڑا۔ میں بولا "اچھا بھئی وعدہ رہا۔"

فرزانہ بولی۔ حکومت کا انعام قبول کرلو۔

میں نے سر پکڑ لیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا
کہ وہ مجھ سے اس قسم کا وعدہ لے گی۔

دوسرے دن پھر محفل جمی۔ راحت امین
صاحب [illegible] کی بیگم، اقبال اور فرزانہ جمع تھے۔

اور مجھے بلا کر بٹھایا۔

امین صاحب بولے۔ اقبال بیٹا تم حکومت
کی رقم اس لیے نہیں لے رہے ہو نا کہ تم نے لالچ کی
نیت سے یہ کام نہیں کیا؟"

"جی ہاں!"

اور یہ کہ تمھاری نیت بالکل صاف اور خالص
تھی۔ "جی ہاں"۔

وہ بولے "تو سنو"۔

"اگر تم حکومت کی رقم لے لوگے تو یہ لالچ ہرگز نہ ہوگا"۔

"وہ کیسے" میں بولا۔

"یہ رقم تم اپنے لیے نہیں، غریبوں کے لیے
لے لو۔ ابھی تو تمھیں دنیا کے اور بہت سارے رنگ
ڈھنگ دیکھنا ہیں۔ تمھیں ہزاروں غریب، ضرورت مند
اور محتاج ملیں گے اور لاکھوں بے سہارا، یتیم و بیسہارا افراد۔
تم اس سے ان کی مدد کر سکتے ہو۔ تمھاری یہ رقم ان کے
کام آسکتی ہے"۔

تم خود سوچو۔ تم اس رقم کے ذریعہ اور بھی
کتنی نیکیاں حاصل کر سکتے ہو۔ تم صرف یہ سوچ رہے
ہو کہ یہ لالچ ہے۔ مگر یقین جانو یہ لالچ نہیں۔ کیوں کہ
تمھاری نیت تو خالص تھی اور تم نے یہ کام خلوصِ دل
سے کیا تھا اور اللہ تعالیٰ تو تمھارے دلوں اور نیت
کو دیکھتا ہے۔ تمھاری نیت پاک صاف ہے۔ وہ یقیناً
تمھیں اس کا اجر دے گا۔ تم انعام کی رقم لوگے جب
بھی اور نہ لوگے تب بھی۔ مگر یہ تو سوچو۔ تم انعام
کی رقم لے کر اور بھی بے شمار نیکیاں اور ثواب کما سکتے
ہو۔ اور اگر نہ لوگے تو ان نیکیوں سے محروم
رہوگے۔

امین صاحب کی یہ باتیں میرے دل میں اترتی چلی گئیں ۔ مگر جھٹ خیال آیا ۔ امین صاحب تو بس رقم کے پیچھے پڑے ہیں ۔ وہ مجھے رقم دلوا کر خدا کے یہاں محروم کرنا چاہتے ہیں ۔ لالچ ۔ لالچ ۔

مگر جھٹ ایک اور آواز نے مجھے للکارا ۔

خبردار ۔ تیری نیت خالص ہو تو خدا کے اجر کو کوئی نہیں روک سکتا ۔ لالچ کا نام دے کر شیطان تجھے اور بہت ساری نیکیوں سے محروم رکھنا چاہتا ہے ۔

خبردار ۔ شیطان کے دھوکے میں نہ آنا ۔

یہ ضمیر کی آواز تھی ۔ اس آواز سے میں مانوس تھا ۔ اس نے مجھے قدم قدم پر برائیوں سے بچایا اور میری رہنمائی کی تھی ۔

میں نے کہا ۔ پہلا خیال یقیناً شیطانی وسوسہ تھا ۔

یہ سوچ کر میں مارے خوشی کے اچھل پڑا ۔

امین صاحب ! خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے شیطان کے دھوکے سے بچا لیا ۔

میں حکومت کی رقم لینے کو تیار ہوں ۔

امین صاحب یہ سن کر خوشی سے ناچ اٹھے ۔

دوسرے دن میں اور امین صاحب نے جا کر حکومت سے پانچ ہزار کا انعام حاصل کر لیا اور گھر آ گئے ۔

انعام پا کر میں سب سے گلے ملا ۔ اور ان کی دعائیں لیں ۔

پھر میں بولا " امین صاحب ۔ اب مجھے اجازت دیں تو بہتر ہے ۔ بہت دن ہو گئے ہیں ۔ میں چاہتا ہوں اپنے والدین سے ایک مرتبہ ضرور مل لوں اور پھر ابھی مجھے ان پانچ ہزار کو بھی تو ٹھکانے لگانا ہے ۔"

— امین صاحب فوراً تیار ہو گئے اور بولے ۔
ہاں بیٹا ضرور جاؤ ۔ واقعی بہت دن ہو گئے ۔ اپنے والدین سے ضرور مل لو ۔

ان کی بیگم صاحبہ نے بھی کسی طرح اجازت دے ہی دی ۔

مگر اقبال اور فرزانہ نے رونا شروع کر دیا
" نہیں ۔ بھیا ابھی نہیں جائیں گے ۔ نہیں جائیں گے ۔"

فرزانہ کو تو میں نے کسی نہ کسی طرح راضی کر لیا ۔ مگر اقبال نے دوسری راہ نکالی ۔ یا تو جاؤ ہی مت ' یا پھر مجھے بھی ساتھ لے چلو میں بھی چلوں گا ۔

ہم نے لاکھ منع کیا ۔ مگر وہ نہ مانا ۔ بس اس کی ایک ہی ضد تھی ۔

میں بھی ساتھ چلوں گا ۔ یا پھر اقبال مند بھی نہ جائیں ۔

میرے نہ جانے کی بات تو خیر ممکن نہ تھی ۔
میرا جانا بے حد ضرور تھا ۔ اس لیے مجبوراً امین صاحب نے اقبال کو بھی ساتھ چلنے کی اجازت دے دی ۔
اقبال بہت خوش ہوا ۔

وہ بولا ۔

ابا جان میں صرف ایک مقصد اور ایک غرض سے جا رہا ہوں ۔ !

وہ کیا ؟ امین صاحب نے پوچھا ۔

میں چاہتا ہوں کہ میرے نام کے ساتھ بھی " مند " کا اضافہ ہو جائے ۔ بس اسے حاصل کرنے کے لیے ہی میں جا رہا ہوں ۔

ر انشاء اللہ بہت جلد اسے حاصل کرکے آؤں گا۔

بیگم صاحبہ یہ سن کر چیخ پڑیں۔

”پاگل ہوا ہے کیا؟۔ اپنے ارادہ سے باز آ۔
رضد نہ کر۔“

اماں جان۔ اقبال بولا۔

”اب یہ میری ضد یا ارادہ نہیں رہا۔ جسے
، بدل دوں یا اس سے باز آجاؤں۔ اب یہ تو میری
رگی کا ”مقصد“ ہے اور اس مقصد کو حاصل کیے
ربس نہیں رہ سکتا۔“

امین صاحب بھی حیرت سے اقبال کا منھ
ھنے لگے۔ مگر بولے۔

”بیٹا جا۔ تیری خوشی۔ میری خوشی، خدا تیرے
مد کو پورا کرے۔“

اب امین صاحب کی رضامندی کے بعد
کس کی ہمت تھی کہ اقبال کو روک لے۔ سفر کی
تیاریاں ہونے لگیں۔ میرے بیگ کو بھی مختلف
کھانے کے لوازمات سے بھر دیا گیا۔

فرزانہ نے اپنے ہاتھ سے خاص طور پر پراٹھے
اور میٹھے کباب تیار کیے۔

اور پھر ہم سب کو الوداع کہہ کر انھیں
روتا چھوڑ چل پڑے۔

اسٹیشن پہنچ کر ہم نے جلدی جلدی ٹکٹ
لیا۔ اور حیدرآباد جانے والی گاڑی میں سوار ہو گئے۔
گاڑی بالکل تیار کھڑی تھی۔ ہمارے چڑھتے ہی سیٹی
دے دی اور رینگنے لگی۔

جناب مناظر عاشق ہرگانوی

لدافا

صوبہ بہار کے جنوبی حصے (چھوٹا ناگپور) کی لوک کہانی

ایک بیوہ رانی کی ایک خوبصورت لڑکی
راجکماری بہت نیک، کم گو اور رحم دل تھی۔ ایک
بڑی ریاست کے راجکمار سے اس کی شادی طے ہوئی۔
جب شادی کر کے وہ اسے لے جانے لگا
تو رانی نے اپنی چھوٹی انگلی کاٹ کر ایک سفید کپڑے
پر تین قطرے خون ٹپکایا اور یہ کپڑا راجکماری کو دے کر
بولی: "اسے حفاظت سے رکھنا، یہ تمہاری مصیبت کے
وقت کام آئے گا۔"
راجکماری نے ماں کی بات کا پاس کر کے
اسے اپنے پاس رکھ لیا۔ اس کی ماں نے رخصتی کے
وقت اسے ہاتھی، گھوڑا، پالکی اور سونے چاندی کا
دوسرا سامان بھی دیا اور ایک خاص داسی (دھاما)
بھی اس کی خدمت کے لیے ساتھ کر دی۔
راجکماری نے اپنا پالا ہوا طوطا، مینا [illegible]
اور گھوڑا بھی ساتھ لے لیا۔ اس گھوڑے کا نام لداؤ
تھا۔ یہ آدمی کی طرح باتیں کر سکتا تھا۔
راستے میں ایک جگہ راجکماری کو پیاس
لگی۔ اس نے داسی (دھاما) سے پانی مانگا۔ داسی (دھاما)
نے کہا: "جاؤ دیکھو، وہ سامنے ندی ہے۔ جا کر پانی
پی لو۔ تمہارے بھی دو پاؤں، دو ہاتھ اور دو آنکھیں
ہیں۔ میں تمہاری داسی (دھاما) نہیں ہوں۔"
بے چاری راجکماری [illegible] رہ گئی۔ اسے
غصہ نہیں آتا تھا۔ اس لیے مجبوراً خود ہی ندی کے
کنارے گئی اور پانی پی کر پھر [illegible] داسی (دھاما) کے ساتھ
آگے بڑھ گئی۔
کچھ دور [illegible] پیاس لگی۔
[illegible] نے خود بھی [illegible]

سے باتیں کیں ۔لاچار ہو کر راجکماری کو خود ہی ایک ندی کے کنارے جا کر اپنی پیاس بجھانی پڑی ۔ وہیں خون والا سفید کپڑے کا ٹکڑا جو اس کی ماں نے دیا تھا ۔ پانی میں گر گیا ۔ راجکماری نے اس کا خیال نہیں کیا ۔ مگر دائی (ماما) نے رومال کو گرتے دیکھ لیا ۔وہ بہت خوش ہوئی ۔کیوں ؟ راجکماری کی اب کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا ۔ پھر وہ اس سے کمزور بھی تھی ۔ اس لیے اس نے ڈپٹ کر راجکماری سے کہا ۔ تم اپنے کپڑے اتار دو انھیں میں پہنوں گی اور تم میرے کپڑے پہنو اور ساتھ ساتھ چلو ۔ اب تم میری دائی (ماما) ہو۔" راجکماری کو مجبور ہو کر اس کی بات ماننی پڑی ۔

راجکمار ایک دن پہلے ہی اپنے گھر پہنچ گیا تھا اور راجکماری کے استقبال کے لیے پوری تیاری کر چکا تھا ۔ وہ دائی (ماما) کو جو راجکماری کے لباس میں تھی ۔ بہت عزت سے اپنے محل میں لے گیا ۔ بے چاری اصلی راجکماری دائی (ماما) بن کر چلی ۔ راجکمار کے باپ بڈھے راجا کو اس نازک اور خوبصورت بدن والی دائی (ماما) کو دیکھ کر بڑا رحم آیا ۔ اس نے نقلی راجکماری سے پوچھا "یہ کون ہے ؟"

اس نے جواب دیا" یہ میری دائی (ماما) ہے اسے کچھ اور کام دے دیجیے ۔ مجھے اس کی خدمت کی ضرورت نہیں ہے ۔"

راجا کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ، وہ اس نازک اور حسین دائی (ماما) کو کون سا کام دے ۔ بہت دیر سوچنے کے بعد اس نے کہا " اچھا ، ایک لڑکا میری گائیں چراتا ہے یہ اس کی مدد کرے گی ۔"

اور راجکماری یہ کام کرنے لگی ۔

نقلی راجکماری نے ایک دن راجکمار سے کہا " لدافا گھوڑے کو مروا ڈالیے " لدافا ساری باتیں جانتا تھا ۔ اس لیے نقلی راجکماری کو ڈر تھا کہ لدافا راجکمار سے سب باتیں کہہ دے گا ۔

آخر نقلی راجکماری کے کہنے پر لدافا مار ڈالا گیا ۔

جب راجکماری کو لدافا کے مرنے کی خبر ملی تو وہ دوڑتی ہوئی جلاد کے پاس گئی اور سونے کا ایک گہنا دے کر بولی " گھوڑے کا سر شہر سے باہر ہی پھاٹک پر لٹکا دو ۔ بڑی مہربانی ہوگی ۔"

جلاد نے گہنے کے لالچ میں ویسا ہی کیا ۔

راجکماری جب گائیں اور بھیڑ بکریاں لے کر جاتی تو پھاٹک پر اس سر سے دو چار باتیں کر لیتی ۔ پھر میدان میں پہنچ کر فرصت کے وقت اپنے بال کھول کر سنوارتی رہتی ۔ اس کے بال ایک دم سنہرے تھے ۔ چرواہے لڑکے نے اس کے دو چار بال لینے کی کئی بار کوشش کی مگر وہ جلدی سے لپیٹ کر چھپا لیتی تھی ۔

ایک دن شام کے وقت چرواہے لڑکے نے بوڑھے راجا کے پاس جا کر سب باتیں کہیں ۔

راجا نے کہا " اچھا میں کل دیکھوں گا ۔"

دوسرے دن راجا شہر کے باہر ہی پھاٹک کے پاس چھپ گیا اور گھوڑے کے سر سے راجکماری کو باتیں کرتے دیکھتا رہا ۔ پھر میدان میں ایک جھاڑی کی اوٹ میں ہو کر اس نے راجکماری کے بال اور اس کے سنوارنے کے انداز کو دیکھا ۔

شام کے وقت جب وہ واپس لوٹی تو راجا نے اسے اکیلے میں بلا کر پوچھا: "تم دائی (ماما) تو معلوم نہیں ہوتی ہو پھر کون ہو؟ سچ سچ بتا دو۔ اسی میں تمھاری بھلائی ہے۔"

اس نے کہا "میں نے اپنی کہانی کسی سے نہ کہنے کی قسم کھائی ہے۔ اس لیے مجھے مجبور نہ کیجیے!"

اب راجا گھوڑے کے سر کے پاس گیا اور اس سے لڑکی کے بارے میں حقیقت دریافت کی۔ اس نے بھی باتیں بوڑھے راجا سے کہہ دیں۔

راجا گھر لوٹ آیا اور اس نے راجکمار کو ساری کہانی سنا دی۔ راجکمار کو بہت غصہ آیا اور اس نے نقلی راجکماری کو مار ڈالنے کا حکم دیا — پھر اصلی راجکماری، راجکماری بنی۔

اور راجکماری کے جاہ و اقبال سے فالاڈا گھوڑا پھر زندہ ہوگیا۔

جناب مسلم

چاند

دیکھو! یہ چاند کتنا روشن ہے خوش نما ہے
سانچے میں نور کے یہ سرتاپا ڈھلا ہے
ایک پیکر حسیں ہے جلوہ دکھا رہا ہے

ہیرا چمک رہا ہے دوری پہ اس جہاں کی
کندن دمک رہا ہے چوٹی پہ آسماں کی
یہ چاند کیا ہے گویا آکاش کا دیا ہے

اوپر نظر اٹھاؤ روشن نگاہ کر لو
دامن میں آنکھ والو تم اپنے نور بھر لو
سیماب کا سمندر تیزی سے بہہ رہا ہے

تھا سات روز پہلے ننھی کمان جیسے
آتے ہی چودھویں کے دگنا ہوا ہے بڑھ کے
اک نور کا یہ پورا [illegible] بنا ہوا ہے

جناب رفیق شاستری

پنچ تنتر کی کہانیاں

یہ کہانی سنانے کے بعد برہمن نے اپنی بیوی کو آگاہ کیا کہ زیادہ لالچ بڑی بلا ہے۔ اس کی وجہ سے ماتھے پر سینگ نکل آتا ہے۔

برہمن کی بیوی نے کہا "اچھا تو ایسا کرو کہ تم جاؤ۔ گھر میں کچھ تل پڑے ہوئے ہیں۔ ان کو چھانٹ بنا کر میں مہمان کی خاطر تواضع کر دوں گی"

برہمن کو اس کی اس بات سے اطمینان ہوگیا۔ برہمن کی بیوی نے بھی تلوں کو چھانٹ بنا کر دھوپ میں سوکھنے کے لیے پھیلا دیا۔

اتنے میں ادھر ایک کتا آنکلا اور اس نے تلوں پر پیشاب کر دیا۔ برہمن کی بیوی کو بہت فکر ہوئی کہ اب مہمان کی تواضع کیسے کی جائے۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ ان کوٹے ہوئے تلوں کو بنا کٹے تلوں کے بھاؤ بیچ دے کوئی بھی اسے خرید لے گا۔ اور یہ سوچنا تھا کہ وہ ایک برتن میں یہ تل لے کر گھر گھر گھومنے لگی کہ کوئی اُن کٹے بنے تلوں کے بدلے بغیر کٹے تل دے دے۔

ہوا یہ کہ جب گھومتا گھومتا چتر داس سادھو، بھیک مانگنے گیا تھا۔ اس گھر میں برہمن کی بیوی بھی تلوں کو بیچنے پہنچ گئی۔ سودا ہو ہی گیا تھا کہ اس گھر کے لڑکے نے جو کافی پڑھا لکھا اور عقل مند تھا۔ اپنی ماں سے کہا۔ ماں آپ ان تلوں کو نہ لیجیے۔ کون پاگل ہوگا جو کٹے بنے تلوں کو بغیر کٹے بنے تل کے دام بیچے گا۔ اس میں ضرور کوئی کھوٹ ہوگا۔

لڑکے کے کہنے سے ماں نے سودا نہیں کیا۔

یہ کہانی سنانے کے بعد چتر داس سادھو نے تام چور سادھو سے پوچھا تمھیں اس چوہے کے آنے جانے کا راستہ معلوم ہے۔

"تام چور نے کہا۔ میں نے اس پر غور نہیں کیا۔ البتہ وہ اکیلا نہیں آتا بہت سے چوہوں کے ساتھ آتا ہے اور ساتھ ہی جاتا بھی ہے"

اس کے بعد ہرنیک چوہے نے دنیا سے اپنی بیزاری کا قصہ جاری رکھتے ہوئے بتایا کہ دونوں سادھوؤں نے دوسرے دن پھاوڑا لے کر چوہوں کے پیروں کے نشان کے سہارے بل تک پہنچنے کا فیصلہ کیا۔ میں ان کی باتوں کو سن کر فکر مند ہوا۔ میں سمجھ گیا کہ اب

اپنے مجھے میرے محفوظ قلعہ تک پہنچ کر اسے برباد کریں گے ۔ اس لیے میں اپنے بل کی طرف نہ گیا کسی اور طرف اپنا رخ موڑ دیا۔

اس طرح سیدھا راستہ چھوڑ کر جب ہم سب چوہے دوسرے راستے سے جا رہے تھے تو میں نے دیکھا کہ ادھر ایک موٹا بلا آ رہا ہے۔ وہ بلا ہم چوہوں کے گروہ پر ٹوٹ پڑا۔ بہت سے چوہے مارے گئے۔ کئی ایک گھائل ہوئے۔

سب چوہوں نے اس مصیبت کا سبب مجھے ہی سمجھا۔ میں نے ہی ان سب کو اصلی راستے کو چھوڑ کر دوسرے راستے سے چلنے کا مشورہ دیا تھا۔ بعد میں انھوں نے میرا ساتھ چھوڑ دیا اور پرانے قلعہ میں چلے گئے۔

اس طرح چتر داس اور تام چور سادھو پھاوڑا لے کر اس قلعہ تک پہنچ چکے تھے۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے کھودنا شروع کیا۔ کھودتے کھودتے ان کے ہاتھ خزانہ لگ گیا جس کی گرمی سے میں بلی اور بندر سے بھی زیادہ تیز اچھل سکتا تھا۔

خزانہ لے کر دونوں سادھو مندر کو لوٹ آئے۔ میں جب اپنے قلعہ پر واپس پہنچا اسے اجاڑ دیکھ کر بہت دکھ ہوا۔ سوچنے لگا کہاں جاؤں کیا کروں۔ میرے دل کو کہاں چین نصیب ہوگا۔

دولت کا بل

بہت سوچنے کے بعد میں پھر مایوسی میں ڈوبا ہوا اسی مندر میں چلا گیا جہاں تام چور رہا کرتا تھا۔ میرے پاؤں کی آہٹ سن کر تام چور نے پھر پھٹے بانس کو کنڈل پیٹنا شروع کر دیا۔ چتر داس نے پوچھا۔ دوست اب بھی تو اطمینان سے نہیں سوتا کیا بات ہے۔

تام چور بولا۔ دوست وہ چوہا پھر یہاں آگیا ہے۔ اس پر چتر داس بولا۔ مگر دوست فکر مت کرو۔ دولت چھننے کے بعد اس کے اچھلنے کی طاقت بھی ختم ہو گئی ہے۔ وہ تمھارے کنڈل تک اب نہیں اچھل سکتا ہے۔ چوہا ہی کیا۔ سبھی لوگوں کے ساتھ ایسا ہوتا ہے۔ دولت کی طاقت سے انسان میں ہمت اور حوصلہ پیدا ہوتا ہے اور وہ دوسروں کو شکست دے سکتا ہے۔

یہ سن کر میں نے پوری طاقت سے چھلانگ ماری۔ مگر کنڈل تک نہ پہنچ سکا اور منھ کے بل زمین پر آ رہا۔ میرے گرنے کی آواز سن کر چتر دس تام چور ہنس کر بولا۔ دیکھا تم نے دولت چھن جانے کے بعد یہ معمولی چوہا رہ گیا ہے۔ اس کی چھلانگ میں اب وہ بات کہاں۔ دولت میں بڑی طاقت ہے۔ دولت ہی آدمی کو طاقتور بناتی ہے اسی کے رہنے سے آدمی عقل مند کہلاتا ہے۔ دولت کے بغیر تو آدمی کو بس بے دانت کا سانپ سمجھو۔
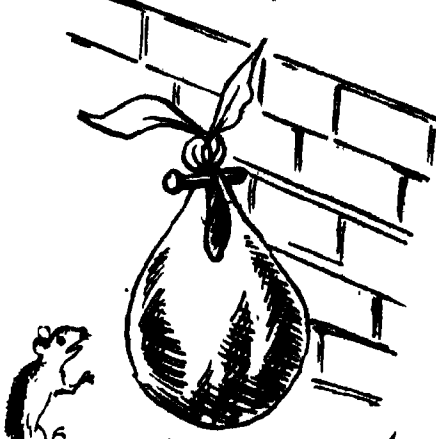
چھپا اداس کیوں؟ ہر نیک چوہے

نے اپنی آپ بیتی جاری رکھتے ہوئے کہا۔ دولت کے لٹ جانے پر میرا بہت برا حشر ہوا۔ میرے ہی نوکر چاکر مجھے برا بھلا کہنے لگے کہ یہ چوہا اب ہمارا پیٹ پالنے کے قابل نہیں رہا بس یہ تو اب ہمیں بلی ہی کو نوالہ بنوایا کرے گا۔ اور بھی ایک ایک کرکے میرے سبھی ساتھیوں نے میرا ساتھ چھوڑ دیا اور دشمنوں سے جا ملے۔

اب میں نے سوچا کہ چاہے جو ہو کھویا ہوا خزانہ مجھے ہر قیمت پر حاصل کرنا ہے۔ چاہے اس کوشش میں مجھے جان کی بازی ہی کیوں نہ لگانی پڑے۔ یہ سوچ کر میں پھر مندر میں آگیا۔

مندر میں میں نے دیکھا کہ وہ سادھو خزانے کو اپنے سر کے نیچے رکھے سو رہا ہے۔ میں نے اپنے تیز دانتوں سے پیٹی کے اندر سوراخ کر دیا اور جیسے ہی میں پیٹی میں گھس کر خزانے پر ہاتھ صاف کرنے والا تھا کہ وہ دونوں جاگ گئے۔ لاٹھی لے کر میرے پیچھے دوڑے اور ایک لاٹھی میرے سر پہ لگی۔ میرا تو کام ہی تمام ہو جاتا وہ تو کہو ابھی کچھ عمر باقی تھی جو میں بچ رہا۔ کافی چوٹ آئی۔ جو دولت قسمت میں لکھی ہوتی ہے وہ مل ہی جاتی کوئی اس کے راستے میں رکاوٹ نہیں ڈال سکتا۔ اس لیے مجھے دولت نہ ملنے کا کوئی غم نہیں ہوا۔

اپنی کہانی سنانے کے بعد ہرنیک چوہے نے منتھرک کچھوے سے کہا۔ [illegible] میری حالت ہوگیا ہے۔ اس کا یہی سبب ہے اور اسی لیے میں گھونگھ کوے کی پیٹھ پر بیٹھ کر یہاں تمہارے پاس آگیا ہوں۔

منتھرک کچھوے نے پوری کہانی سننے کے بعد اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔ دوست کھوئی ہوئی دولت کا غم کبھی نہیں کرنا چاہئے۔ دولت کو سنبھال کر حفاظت سے رکھنا بھی کچھ کم مشکل اور وقت طلب کام نہیں۔ انسان دولت کمانے کے لیے جتنی تکلیفیں اٹھاتا ہے اس کی سواں حصہ تکلیف اگر وہ نیک کام کرنے اور خدا کی عبادت کے لیے اٹھائے تو اس پر نجات کے دروازے کھل جائیں۔
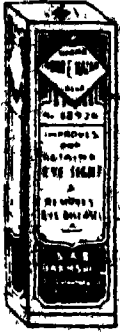
کوئی ملک پرایا نہیں :-

پھر دوست دیس چھوڑ کر پرائے دیس آنے کا بھی غم مت کرو۔ پیشہ وروں کے لیے کوئی جگہ دور نہیں ہوتی اور عالموں کے لیے کوئی ملک پرایا نہیں ہوتا۔ اسی طرح محبت اور میل جول سے رہنے والوں کے لیے کوئی آدمی پرایا نہیں ہوتا۔

اس کے علاوہ دولت کمانا تو قسمت کی بات ہے۔ قسمت میں نہ ہو تو جمع کیا ہوا خزانہ بھی ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ بدقسمت آدمی اپنی جمع کی ہوئی پونجی سے فایدہ نہیں اٹھا پاتا۔ جیسا کہ سوملک نام کے بے وقوف جولاہے کے ساتھ ہوا۔

ہرنیک چوہے نے سوملک جولاہے کی کہانی سنانے کے لیے اصرار کیا۔

منتھرک کچھوے نے تب سوملک جولاہے کی یہ کہانی سنائی۔

یہ دلچسپ کہانی ستمبر کے پیام تعلیم میں پڑھیے۔

مولانا مقبول احمد سیوہاروی

مجاہدینِ آزادی

ٹیپو سلطان

تم نے کسی کتاب یا کسی رسالہ میں میسور کا نام کبھی نہ کبھی ضرور پڑھا ہوگا۔ اسی میسور میں اب سے دو سو چودہ برس پہلے ایک لڑکا پیدا ہوا تھا۔ یہ کوئی غریب لڑکا نہ تھا اس کے ماں باپ بھی غریب نہ تھے۔ خدا نے انھیں امیر بنایا تھا دولت دی تھی حکومت بخشی تھی اور سب سے بڑی نعمت یہ بخشی تھی کہ اس لڑکے کے دل میں انسانوں کی محبت تھی اپنے ملک اور اپنے شہر سے محبت تھی۔

یہ لڑکا ہر ایک کے کام آیا اس نے ہر ایک مظلوم کے ساتھ انصاف کیا۔ اس لڑکے نے ہر اچھے کام میں مدد دی اور بڑے کاموں کو روکا۔ کسی راہ چلتے کو مارا نہیں کسی پر ظلم نہیں ہونے دیا۔ چوروں اور ڈاکوؤں کو اور جو لوگ کسی کو بے قصور مارتے ہیں انھیں معاف نہیں کیا اور بغیر سزا کے چھوڑا نہیں۔

یہ مسلمان تھا۔ اس کا باپ بھی مسلمان تھا۔ ماں بھی مسلمان تھی مگر اس کا انصاف سب کے ساتھ برابر رہا۔ ہندو کے ساتھ مسلمان کے ساتھ [illegible] اور [illegible]

ترازو جیسا انصاف، دھرم کانٹا جیسا نیاؤ، جو نہ ادھر جھکے نہ اُدھر جھکے۔ یہ خدا سے ڈرتا تھا۔ ایشور سے خوف کھاتا تھا جو سب کا پالن ہار ہے۔ چھوٹے کا بھی اور بڑے کا بھی، امیر کا بھی اور بھیک مانگنے والے فقیر کا بھی۔

یہ لڑکا ۲۱ر دسمبر ۱۷۵۰ء میں پیدا ہوا تھا اور اب ۱۹۶۴ء ہے اس حساب سے اس کی پیدائش کو دو سو چودہ برس گذر گئے ہیں۔ عام طور سے کتابیں اور رسالے پڑھنے والے اسے ٹیپو سلطان کے نام سے جانتے ہیں مگر اس کا پورا نام ابوالفتح فتح علی ٹیپو سلطان ہے۔ باپ کا نام حیدر علی ماں کا نام فاطمہ بی بی عرف فخرالنسا۔ اب ذرا دیر ٹھہر کر سوچو یہ کیسی خوش نصیبی کی بات ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بیٹی کا نام بھی بی بی فاطمہ تھا، بی بی فاطمہ کے شوہر بھی حیدر اور علی تھے (اللہ ان سے راضی ہوا) ان کے بھی دو لال تھے، حسن اور حسین۔ یہ دونوں بھی شہید ہوئے اور فتح علی ٹیپو بھی شہید ہوا۔ جب امام حسین بھی میدانِ جنگ میں

آخر دم تک ڈٹے رہے اور پیچھے نہ ہٹے اور ٹیپو بھی جس کا ذکر تم پڑھ رہے ہو لڑائی کے میدان میں ڈٹا رہا اور لڑتے لڑتے شہید ہوگیا۔

ٹیپو کسی کا دشمن نہ تھا وہ فقط انگریزوں کا دشمن تھا، اسے انگریزوں کی ذات سے دشمنی نہ تھی ان کی دغا بازی اور چالبازی سے دشمنی تھی اسے معلوم تھا کہ انگریز ہندوستان پر تاک لگا رہا ہے، ہندوستان کی دولت کو اس کے مضبوط اور اونچے پہاڑوں کو لہلہاتی کھیتی کو سونے چاندی اور جگمگاتے ہیروں کی کانوں پر للچائی نظریں ڈال رہا ہے۔ وہ انگریز کا دشمن بن گیا۔ اپنے ملک کا دوست اور بدیشی کا دشمن جسے نہ ہندوستانیوں سے محبت تھی نہ ہندوستان سے محبت تھی۔

ٹیپو نے مرہٹوں کو، راجاؤں کو، نیپال والوں کو، نظام دکن کو، سمجھایا کہ ہوشیار ہو جاؤ اور سب مل جل کر انگریز کو نکال دو اسے ہندوستان میں نہ گھسنے دو، انگریز فقط بنگلور اور میسور نہ لے گا حیدرآباد اور پونا نہ لے گا۔ بلکہ ہندوستان کے پورے ملک کو جیب میں ڈالے گا اور یہاں کی دولت پیداوار، نایاب ذخیرے اپنے ملک کو بھیج دے گا، ہندوستان کی تجارت کو مٹائے گا۔ اپنے ملک کی تجارت کو سنوارے گا۔ مگر کسی نے اس کی بات نہ سنی انگریز نے کہا ٹیپو! ہم میسور لے کر رہیں گے، ٹیپو نے کہا جب تک میرے جسم میں خون کا آخری قطرہ ہے یہ آرزو پوری نہ ہوگی ہندوستان غلام بن جائے میسور غلام بن جائے، پونا اور حیدرآباد غلام بن جائے

ٹیپو اسے برداشت نہیں کر سکتا۔

دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ٹیپو نے اپنا قول پورا کیا یا نہیں؟

آزادی کے اس جان باز سپاہی نے اپنی بات پر جان دی یا نہیں؟

سنو!!

یہ جب کی بات ہے کہ ٹیپو کی عمر سولہ یا سترہ برس کی تھی جب کھیلنے کھانے کے دن تھے۔ مگر ٹیپو نے اس عمر میں کیا کام کیا؟ ٹیپو کے باپ حیدر علی کو جب یہ اطلاع ملی کہ انگریزوں نے بنگلور پر قبضہ کر لیا ہے تو بیٹے کو بلایا اور کہا بیٹا!! انگریزوں نے بنگلور پر قبضہ کر لیا ہے۔ انگریزی فوجوں نے بنگلور کے ہندو مسلمانوں کو لوٹا ہے، انھیں ستا رکھا ہے تم جاؤ اور انگریزوں کو بتا دو کہ ہمارے خون میں حرارت ہے ہم بزدل نہیں ہیں مرنے سے نہیں ڈرتے مرنا تو کبھی نہ کبھی ضروری ہے پھر کیوں نہ عزت سے ملک کی خاطر جان دی جائے۔

ٹیپو فوج لے کر بڑھا اور ایسا لڑا کہ انگریزوں کے دانت کھٹے کر دے۔ یا تو بنگلور پر انگریزوں کا قبضہ تھا یا پھر انھیں بنگلور چھوڑنا پڑا اور صلح کرتے بنی، پھر بھی لڑائی رکی نہیں۔

اور [illegible] میں انگریزوں نے پھر ٹیپو کو جنگ پر مجبور کیا۔

اس وقت انگریزوں کے چار بڑے بڑے کرنل فوجیں بڑھا رہے تھے اور اپنے جی میں سمجھتے تھے کہ ٹیپو کو دھکیل دیں

گے۔ مگر ٹیپو نے جس انداز پر اور جس تدبیر سے لڑائی لڑی اس کا انجام یہ ہوا کہ چاروں کرنیل ہار گئے۔ اس شکست سے انگریزوں کے دم خم تو ٹوٹ گئے۔ مگر دشمنی بڑھ گئی۔

بنگلور کی لڑائی کو دو برس گذرے تھے کہ ٹیپو کے سرپرست اور بہادر باپ دنیا سے رخصت ہوگئے۔ اور اب ٹیپو پر پورا بوجھ حکومت کے انتظام کا اور لڑائی کا آپڑا مگر یہ ذرا نہ گھبرایا اور خدا کے سہارے ہر ایک کام کو ایسا انجام دیا کہ آج تک دنیا اس کی تعریف کرتی ہے۔

اب انگریز نے مرہٹوں اور نظام حیدرآباد کو اکسایا اور یہ سبق پڑھایا کہ اگر تم ٹیپو سے نہ لڑو گے تو تمھارے تمام علاقے چھن جائیں گے اور تم ٹیپو کے غلام بن جاؤ گے۔

ٹیپو نے جب یہ سنا کہ انگریز مرہٹوں کو اور نظام حیدرآباد کو ورغلا رہے ہیں تو انھیں سمجھایا کہ تم انگریز کی چال میں نہ آؤ۔ تم ہار و گے تب بھی اس کی جیت ہے اور اگر میں ہار جاؤں تب بھی انگریزوں کی جیت ہے۔ ہماری کمزوری انگریز کی طاقت بڑھا دے گی اور پھر پچھتائے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اور یہ دیس جسے ہمارے باپ دادا نے سنوارا اور سجایا ہے انگریز کے پنجہ میں چلا جائے گا اور ہماری آزادی خاک میں مل جائے گی مگر ان پر انگریز کا جادو تھا یہ بھلا کیسے مانتے، ان میں ٹیپو کے سوا کوئی بھی انگریز کی طینت نہ جانتا تھا۔

یہ لڑائی دو برس تک رہی۔

سلطان ٹیپو ان سب کو جواب دیتا رہا اور مقابلہ پر ڈٹا رہا اور آخری لڑائی جو شاہ پور کی لڑائی تھی ایسی ہوئی کہ نظام اور اس کے ساتھیوں کی ہمت ٹوٹ گئی۔

دو برس کی لڑائی !! ذرا سوچو تو کتنے آدمی مرے ہوں گے کتنا روپیہ خرچ ہوا ہوگا۔ ملک کے کاروبار میں کتنی ابتری آئی ہوگی۔ دونوں ہی کمزور ہوگئے۔

انگریز تاک میں تھا۔ پھر دیکھو کہ اس لڑائی کو تین برس بھی نہ گذرے تھے کہ دسمبر ۱۷۸۹ء میں انگریزوں نے پھر لڑائی چھیڑ دی، اور تین طرف سے حملہ کر دیا۔ مگر واہ رے سلطان ٹیپو !! ایسا لڑا کہ انگریز بھی لوہا مان گئے۔

(باقی اگلے پرچے میں)

تالاب کا بھوت

جناب سلام بن رزاق

(مراٹھی سے ترجمہ)

اپریل کا مہینہ، دوپہر کی چلچلاتی دھوپ، نارائن راؤ پسینے سے تربتر، موضع رام گڑھ میں داخل ہوئے۔ رام گڑھ کے سرپنچ سے انھیں اپنے کھیتوں کے کاغذات کی نقل درکار تھی۔

گاؤں میں قدم رکھتے ہی انھیں عجیب وحشت کا احساس ہوا۔ پرانے اور بے ترتیب مکان، گلیوں میں گندگی کے ڈھیر۔ ان پر بھنبھناتی ہوئی بے شمار مکھیاں نالیوں سے اٹھتے ہوئے بدبو کے بھبکے، سوکھے مریل مویشی ہڈیوں کے ڈھانچے، دبلے پتلے مگر تیز آواز میں بھونکتے کتے۔

نارائن راؤ گاؤں میں داخل ہوتے ہی ایک دم گھبرا گئے۔ جیسے بھوتوں کے مسکن میں آ گئے ہوں —

وہ ہانپتے کانپتے اور گاؤں کی حالت پر حیرت سے زیادہ افسوس کرتے سرپنچ کے مکان پر پہنچے۔ سرپنچ برامدے میں بیٹھا جماہیاں لے رہا تھا۔ پہلے ذرا تو چھو کر کے انھوں نے تھوڑی دیر میں اپنا کام نٹا لیا۔ پھر بولے: "سرپنچ صاحب، تھوڑا سا ٹھنڈا پانی پلا دیجیے۔ بڑی پیاس لگی ہے۔" سرپنچ نے لوٹا اور گلاس آگے بڑھاتے ہوئے کہا "جناب! پانی حاضر ہے مگر ایک گلاس سے زائد نہ پیجیے۔ بڑی مشکل سے صبح شام ایک ایک مٹکا ملتا ہے۔ وہ بھی دو میل دور سے لانا پڑتا ہے۔

پانی کی وجہ سے اب تو ہماری جان پر بن آئی ہے۔ بہت سے لوگ گاؤں چھوڑ کر چلے گئے۔ گاؤں ویران ہوتا جا رہا ہے۔ ہفتہ واری بازار بھی بند ہو گیا، سارا کام دھندا، تمام بیوپار ٹھپ ہو گیا ایسا لگتا ہے جیسے گاؤں میں کوئی بہت بڑی بلا گھس آئی ہے۔"

سرپنچ نے آخری جملہ بڑے پراسرار انداز میں بہت آہستہ سے کہا۔

"بلا؟ کیسی بلا؟" نارائن راؤ نے حیرت سے پوچھا۔

"یہی تو سمجھ میں نہیں آتا۔ پچھلے مہینے گاؤں میں میلا لگا تھا۔ جیسے ہی میلا ختم ہوا دوسرے دن سے ہیضہ شروع ہو گیا۔ کتنے ہی لوگ مر گئے۔ پھر تو بیماریوں نے جیسے گھر دیکھ لیا، نارو، چیچک اور خارش میں گاؤں کے تقریباً سبھی لوگ مبتلا ہیں۔ ہمارے مویشی تک بیماریوں سے مرنے لگے ہیں۔ ہم نے ہر طرح کا علاج کیا، منتیں مانیں، مندر اور مسجد میں دعائیں مانگیں، سادھو فقیروں کو کھانا کھلایا مگر گاؤں کی ویرانی دن بدن بڑھتی ہی گئی۔ اب تو گاؤں والے مایوس ہو کر بیٹھ گئے ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے۔"

"یہ تو بڑی عجیب باتیں بتائیں آج آپ نے۔ مگر یہ پانی آپ گاؤں کا تالاب چھوڑ کر اتنی دور

سے کیوں لاتے ہیں ؟

"جی جناب ! یہ تالاب ہی تو مصیبت کی جڑ ہے، جہاں کسی نے تالاب کا ایک گھونٹ پانی پیا بس سمجھ لیجیے بیماری نے اُسے آدبوچا ۔ گاؤں کے بڑے بوڑھوں کا کہنا ہے کہ تالاب میں کوئی بہت بڑا بھوت گھس آیا ہے ۔ پچھلے ہفتہ بڑے بڑے عامل اور دھن منتری آکر چلے گئے مگر بھوت کا بال بھی بیکا نہ کر سکے وہ اب بھی تالاب میں گھسا بیٹھا ہے ۔ یہ سن کر نارائن راؤ گاؤں والوں کی جہالت اور لاعلمی پر دل ہی دل میں پیچ وتاب کھانے لگے ۔ پھر سرپنچ کا لحاظ کرکے سنجیدہ لہجے میں بولے ۔

" دیکھیے سرپنچ صاحب، آپ تو جانتے ہیں کہ میں گرام سدھار کمیٹی کا ممبر ہوں ۔ ہمارے پاس ایسے ایسے نسخے ہیں کہ آپ کا یہ بھوت دو روز میں گاؤں چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوگا ۔ مگر شرط یہ ہے کہ گاؤں والے بھی ہمارا ہاتھ بٹائیں ۔"

" دیکھیے جناب ! آپ جو کچھ بھی کریں سوچ سمجھ کر کریں ۔ بھوت بڑا تگڑا ہے ۔"

نارائن راؤ جب واپس اپنے شہر جانے لگے تب انہوں نے اُس تالاب کا غور سے معائنہ کیا ۔ تالاب کی مینڈ جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی ۔ کناروں پر جنگلی جھاڑیاں اور پودے کثرت سے اُگے ہوئے تھے ۔ پانی کی سطح گندی اور نیلی کائی سے ڈھکی ہوئی تھی ۔ کائی پر درختوں کے سوکھے پتوں کی چادر سی بچھی ہوئی تھی ۔

پہلے لوگ اس تالاب میں نہاتے، کپڑے دھوتے اور مویشیوں کو نہلاتے، پھر اسی کا پانی بھی پیتے ۔

نارائن راؤ گاؤں والوں کی جہالت پر افسوس کرتے ہوئے شہر پہنچے ۔ انہوں نے سب سے پہلے گرام سدھار کمیٹی کے سکریٹری کو تمام واقعہ سنایا ۔ پھر جیسے ہی گرمیوں کی تعطیلات شروع ہوئیں ۔ مختلف مدرسوں سے سَو بچّے منتخب ہوئے اور ماسٹر صاحب کی سرکردگی میں رام گڑھ روانہ ہو گئے ۔ نارائن راؤ بھی ساتھ تھے ۔

نارائن راؤ نے گاؤں کے سرپنچ کو اطلاع دی ۔ سرپنچ گاؤں والوں کو لے کر تالاب کے کنارے پہنچ گئے ۔ ماسٹر صاحب نے کھڑے ہوکر کہا ۔

"پیارے بھائیو ! اور عزیز بچو ! آج ہمیں اس تالاب کے بھوت کو بھگانا ہے ۔ اس کی ترکیب یہ ہے کہ تالاب کی گندگی صاف کر دی جائے ۔ جب گندگی صاف ہوجائے گی ۔ اندر سے صاف شفاف پانی کے چشمے پھوٹتے نظر آئیں گے ۔ ان چشموں کا نرمل پانی دیکھتے ہی بھوت بھاگ کھڑا ہوگا ۔"

اتنا کہہ کر ماسٹر صاحب نے کدال اٹھا کر پہلی ضرب لگائی ۔ پھر کیا تھا بیک وقت دو سو ہاتھ مشین کی طرح چل پڑے ۔ گاؤں والے دور کھڑے خوف بھری نظروں سے انھیں کام کرتا دیکھتے رہے ۔ وہ منتظر تھے کہ ابھی بھوت نکل کر ماسٹر صاحب کا گلا دبا دے گا ۔ مگر دوپہر تک وہ لوگ برابر کام میں جٹے رہے ۔ ہنستے گاتے سب بچے اتنے خوش خوش کام کر رہے تھے گویا تالاب میں سے خزانہ برآمد ہونے والا ہو ۔

سہ پہر کے قریب شہر سے ایک لاری آئی جس میں خیموں کا مختلف سامان اور بچوں کا راشن تھا دیکھتے ہی دیکھتے تالاب کے قریب میدان میں خیمے گاڑ دیئے گئے ۔ گاؤں والے انھیں منع کرتے

رہ گئے۔ کہ رات کو یہاں نہ ٹھہر یے" آپ لوگوں نے بھوت کو ناراض کردیا ہے کہیں رات میں آپ لوگوں کو پریشان نہ کرے۔ مگر ماسٹر صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہم بھوت کو پیاری پیاری کہانیاں سنا کر اُس کا غصّہ ٹھنڈا کرلیں گے"۔

پہلی رات کو گاؤں والے بڑے گھبرائے ہوئے تھے۔ انھیں یقین تھا کہ رات میں بھوت ایک آدھ بچّے کو کھا جائے گا اور صبح تک سب شہر بھاگ جائیں گے۔ مگر جب صبح انھوں نے دیکھا کہ تمام بچے ویسے ہی خوش خوش کدال، پھاوڑا سنبھالے کام پر جا رہے ہیں تو حیرت سے اُن کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

رفتہ رفتہ گاؤں والوں کے ذہن میں بات آ گئی۔ اُن کا خوف دور ہوگیا اور بچوں کے ساتھ خود بھی کام میں جُٹ گئے۔ پھر کیا تھا ایک ہفتہ کے اندر ہی تالاب کے باہر کیچڑ اور گندگی کا ڈھیر لگا دیا گیا۔ تالاب آئینہ کی طرح صاف ہوگیا اور زمین سے پھوٹتے پانی کے قدرتی چشمے نظر آنے لگے۔ پھر ماسٹر صاحب نے پوٹاشیم پرمنگیٹ کی تھوڑی سی مقدار پانی میں گھول کر تالاب میں ڈال دی۔ دوسرے دن شہر سے کانچ کے دو بڑے بڑے مرتبان پہنچ گئے۔ جن میں مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ ماسٹر صاحب نے گاؤں والوں سے کہا۔

"بھائیو! دیکھیے یہ آپ کے تالاب کی صفائی کرنے والے خدمت گار ہیں۔ اب آپ لوگ یہ کیجیے کہ تالاب کے اردگرد ایک پختہ مینڈ باندھیے۔ اطراف میں اُگی ہوئی جنگلی جھاڑیوں اور جھاڑ جھنکاڑ کو اکھاڑ پھینکیے تاکہ سورج کی کرنوں کے لیے کوئی روک نہ ہو اور تالاب کی سطح پر تیرنے والے جراثیم ہلاک ہوسکیں۔ یہاں نہ کپڑے دھوئیے، نہ نہائیے۔ مویشی بھی نہ لائیے پھر دیکھیے آپ لوگ کیسے تندرست اور خوش رہتے ہیں۔ اصل میں بھوت پریت کوئی چیز نہیں، انسان کی جہالت اور کاہلی ہی سب سے بڑے بھوت ہیں۔

ذرا نیچے دیکھیے۔
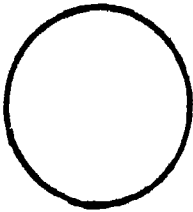
ایک گول دائرہ سا بنا ہے۔ اس گول دائرہ میں سرخ نشان ہے۔ اس سرخ نشان کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی خریداری کی مدت اس مہینے ختم ہو رہی ہے۔

کچھ دنوں سے ہم نے پیامِ تعلیم کی خریداری کی مہم چلا رکھی ہے۔ یہ مہم خدا کا شکر ہے کہ کامیابی سے چل رہی ہے پچھلے مہینے تو ہم نے آپ کی مدد اور سرپرستی کی بدولت ذرا تیزی سے قدم بڑھایا۔ لگ بھگ دو ڈھائی سو پیامی آپ کی پیامِ تعلیم کی برادری میں شامل ہوگئے۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ بھی نہ صرف اپنی سرپرستی جاری رکھیں گے بلکہ اس برادری کو اور زیادہ آگے بڑھانے کی کوشش کریں گے۔ پیامِ تعلیم کے زیادہ سے زیادہ خریدار بنانے کی کوشش کریں گے۔

اس مہینے کی ۲۵ تاریخ تک مبلغ چھ روپے کا منی آڈر بھیج دیجیے۔ اور ہاں منی آڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیے گا۔ آپ کا خریداری نمبر ہے۔

"منیجر"

جناب اقبال مہدی

ایک دن کیا ہوا

ابا کام پر گئے تھے۔ امی کمرے میں بیٹھی کچھ سی رہی تھیں۔ سلیم اور سلمہ برآمدے میں ایک رسالہ لیے بیٹھے تھے۔ رسالے میں بہت اچھی اچھی تصویریں تھیں۔

"کیسی خوبصورت تصویر ہے" سلیم نے کہا۔

"یہ بچہ کتنا پیارا ہے۔ اور کیسے کھا رہا ہے" سلمہ بولی۔

"اور یہ موٹر تو دیکھو۔ کتنی شاندار ہے۔ لاؤ ان تصویروں کو کاٹ لیں۔ اپنی کاپی پر چپکائیں گے" سلیم نے تجویز رکھی "ہاں" سلمہ نے تائید کی۔ "پھر سب کو دکھائیں گے۔ کیسی اچھی تصویریں ہیں ہمارے پاس"

"لیکن کسی کو دیں گے نہیں" سلمہ بولی۔

"جاؤ۔ قینچی لے آؤ" سلیم نے کہا۔

سلمہ کمرے میں گئی اور چپکے سے قینچی لے کر آ گئی۔ سلیم رسالے میں سے تصویریں کاٹنے لگا۔ سلمہ کا جی چاہا کہ وہ خود بھی قینچی سے تصویریں کاٹے۔ اس نے سلیم سے کہا "ایک تصویر آپ کاٹیے ایک میں کاٹوں۔ دونوں باری باری تصویریں کاٹیں" لیکن سلیم کا جی قینچی چھوڑنے کو نہیں چاہتا تھا۔ اس نے کبھی سلمہ کو بہلا دیا۔ کبھی ڈانٹ دیا۔ کبھی وعدہ کر لیا کہ ایک "اور تصویر اور کاٹ لوں پھر دے دوں گا" غرض اچھی اچھی سب تصویریں کاٹ کر قینچی چھوڑی۔

سلمہ پہلے ہی جل بھن رہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ رسالہ میں اب کوئی اچھی تصویر رہ ہی نہیں گئی تو وہ رہانسی ہو گئی۔ اس نے سلیم سے آدھی تصویریں مانگیں۔ سلیم نے کہا "دونوں کی ہیں۔ ایک جگہ رکھیں گے" لیکن سلمہ نہ مانی۔

دونوں ایک دوسرے سے تصویریں چھیننے لگے۔ تصویریں پھٹنے لگیں۔ دونوں کا غصہ بڑھنے لگا۔

اتنے میں امی کی آواز آئی "ارے تم لوگ قینچی لے گئے ہو؟"

"یہ سلمہ لائی تھی"

"بھائی جان نے منگوائی تھی"

"قینچی سے کیا کر رہے ہو تم لوگ۔ لاکھ بار سمجھایا قینچی سے نہیں کھیلا کرتے" امی کی آواز آئی۔

"بھائی جان نے تصویریں کاٹی ہیں۔"
سلمہ نے شکایت کی۔
"اسی نے تو کہا تھا کہ تصویریں کاٹ دو"
قینچی لینے اور یہ دیکھنے کہ یہ لوگ کر کیا رہے ہیں۔ امی باہر نکلیں۔ دیکھا تو ہر طرف پھٹے ہوئے کاغذوں کے پرزے بکھرے پڑے ہیں۔ اور رسالہ الگ کٹا پھٹا پڑا ہے۔ وہ بہت ناراض ہوئیں۔
"یہ کیا طریقہ ہے؟ تصویریں تم لوگوں کو پسند آئی تھیں یا بری لگ رہی تھیں جو ان کا یہ انجام کیا؟ تصویریں رسالے میں اچھی لگ رہی تھیں یا اب لگ رہی ہیں؟" اچھی چیزوں کی یہ ہی گت بناتے ہیں؟
شام کو ابا آئے۔ انھوں نے رسالہ اٹھایا تو اور بھی ناراض ہوئے۔ یہ رسالہ وہ لائبریری سے پڑھنے کے لیے لائے تھے۔ اب کیا واپس کریں گے؟
سلیم اور سلمہ دونوں بہت شرمندہ ہوئے۔

پندرہ اگست

جناب مفتوں کوٹی

سب مل کے مسکراؤ کہ ہے پندرہ اگست

خوشیوں کے گیت گاؤ کہ ہے پندرہ اگست
سب مل کے مسکراؤ کہ ہے پندرہ اگست

ہر سمت قہقہے ہیں، چراغاں ہے ہر طرف
تم خود بھی جگمگاؤ کہ ہے پندرہ اگست

ہر گوشۂ وطن کو نکھارو، سنوار دو
مہکاؤ، لہلہاؤ کہ ہے پندرہ اگست

رکھو نہ صرف خندۂ گل ہی نگاہ میں
کانٹوں کو بھی ہنساؤ کہ ہے پندرہ اگست

روحیں امان و امن کی پیاسی ہیں آج بھی
پیاس ان کی اب بجھاؤ کہ ہے پندرہ اگست

شمع خلوص و انس کی مدہم ہے روشنی
لَو اور کچھ بڑھاؤ کہ ہے پندرہ اگست

یہ عہد تم کرو کہ فسادات پھر نہ ہوں
ہاں آگ یہ بجھاؤ کہ ہے پندرہ اگست

اونچا رہے شرافت و اخلاق کا علم
پرچم بلند اٹھاؤ کہ ہے پندرہ اگست

اہل وطن کے دل میں بھرو رنگ پیار کا
مفتوں قلم اٹھاؤ کہ ہے پندرہ اگست

جناب ایم۔ این خان امروہوی

باغبانی

گیندے کے پیلے پیلے خوبصورت پھول تو آپ نے اکثر دیکھے ہوں گے۔ یہ دیکھنے میں بڑے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں یہ پھول بہت پرانے زمانے سے بویا جاتا ہے۔ امریکہ میں اس کی نئی نئی قسمیں نکالی گئی ہیں۔ وہاں پر لال، بھورے، نارنگی، گہرے بھورے اور طرح طرح کے دوسرے رنگوں کے پھول کھلتے ہیں۔ افریقہ، برازیل اور کناڈا میں اس کی بہت سی خود رو قسمیں بھی پائی جاتی ہیں۔

ایران والے تو اسے بہت ہی پسند کرتے ہیں۔ امیر تو امیر غریب لوگ بھی اپنے گھروں کی سجاوٹ کے لیے گیندے کی مدد لیتے ہیں۔ اپنے دیس میں بھی شادی بیاہ کے موقعوں پر ہار بنانے، دروازے سجانے اور طرح طرح کی سجاوٹوں میں اسے استعمال کیا جاتا ہے۔

گیندے کے پھول کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ بڑی قسم کے بھرے ہوئے پھول اوسطاً بارہ سینٹی میٹر بڑی قسم کے اکہرے پھول تقریباً دس سینٹی میٹر کٹ دار پھول نو سینٹی میٹر اور چھوٹی قسم کے پھول پانچ سینٹی میٹر چوڑے ہوتے ہیں کچھ پھول ڈیڑھ یا دو سینٹی میٹر چوڑے ہوتے ہیں انھیں عام طور سے چھوٹے گملوں میں بو کر کمروں میں سجاوٹ کے لیے رکھا جاتا ہے۔

گیندے کو آپ بھی بڑی آسانی سے اپنے گھر کے صحن کی کیاریوں میں یا باغیچے میں بو سکتے ہیں۔ یہ دو طرح سے بویا جاتا ہے۔

۱۔ بیجوں کے ذریعے ۔ ۲۔ شاخیں کاٹ کر

اچھی نم مٹی اور کھلی ہوا، کھلی دھوپ اسے بہت پسند ہے۔ اس کی کچھ قسموں کے بیج جولائی میں (بارش کے موسم میں) اور کچھ ستمبر میں (برسات کے بعد) بوئے جاتے ہیں۔ ان کو بونے کے لیے پہلے ایک چھوٹی سی کیاری منتخب کی جاتی ہے پھر اس کی ہلکی گیلی مٹی کو ہلکا ہلکا کھود کر بیج بکھیر دیتے ہیں پھر ایک لکڑی کے تختے سے کیاری کی سطح

برابر کر دی جاتی ہے۔ تین چار دن کے اندر پودے پھوٹ آتے ہیں۔ یہ پودے بڑی تیزی سے بڑھتے ہیں دس بارہ دن میں کافی بڑے ہو جاتے ہیں۔ اب انھیں اس کیاری سے اکھاڑ کر آپ جہاں بھی لگانا چاہیں لگا سکتے ہیں۔

جہاں پر پودے لگانے ہوں۔ وہاں کی زمین پہلے اچھی طرح کھود کر بھر بھری کر لیجیے پھر اس میں ہلکا ہلکا پانی لگا دیجیے۔ جتنی بڑی کیاریاں چاہیے بنا لیجئے ۔ کیاریوں میں گوبر کا کھاد بھی ڈال دیا جائے تو اچھا ہے۔ جب کیاریاں بالکل تیار ہو جائیں تو پہلی والی کیاری سے پودے اکھاڑ کر انھیں قطار میں ڈیڑھ ڈیڑھ یا دو دو فٹ کے فاصلے پر لگا دیجیے۔ اگر پودے چھوٹی قسم کے ہوں تو نو انچ کا فاصلہ بھی کافی ہو گا۔ لگانے کے بعد پودوں کو ہلکا ہلکا پانی دے دینا چاہیے۔ اس کے بعد روزانہ صبح شام تھوڑا تھوڑا پانی دینا چاہیے۔

اچھی قسم کا گیندا شاخیں کاٹ کر بھی بویا جاتا ہے۔ اس کے لیے پودے کے اوپری حصے سے نو انچ کے درمیان تنا کاٹ کر کیاریوں میں ڈیڑھ سے تین انچ گہرائی والے گڈھے بنا کر لگا دیا جاتا ہے۔ اس طرح سے لگائے گئے پودے اچھے پھول دیتے ہیں۔

گیندے کے پودے کی شکل آپ اپنی پسند کے مطابق بدل سکتے ہیں۔ اگر پودے کو جھونپڑی نما یا جھاڑی نما بنانا ہو تو اوپر سے ایک انچ پھننگی کاٹ دیجیے۔ اس سے پودے میں بہت سی شاخیں نکلیں گی۔ یہ شاخیں مل کر جھونپڑی سی بنا لیتی ہیں۔ اگر پودا لمبا کرنا چاہیں تو پودے کی پھننگی کو چھوڑ کر باقی تمام شاخیں کاٹ دیجیے اور گوبر کا کھاد زیادہ مقدار میں ڈال کر پانی دیجیے اگر پیڑ زیادہ لمبا ہو جائے تو اسے لکڑی کا سہارا دینا چاہیے۔ کیوں کہ بنا سہارے کے پودا جھک جائے گا۔ جھکنے پر اس کے تنے میں سے جڑیں نکل آتی ہیں جو دیکھنے میں بری معلوم ہوتی ہیں اور پھول بھی خراب لگتے ہیں۔

گیندے کا پھول تقریباً ۲۸ دن تر و تازہ رہتا ہے۔ پودے کی ہفتہ وار اوسط بڑھت تقریباً ۳ء۹ سینٹی میٹر ہوتی ہے۔ جب سے پھول کھلنا شروع ہوتے ہیں اس کے تقریباً دو مہینے بعد پودا سوکھنے لگتا ہے۔ ویسے کچھ پودے ۱۹۰ دن تک بھی زندہ رہتے ہیں۔ بڑے پودے کی اوسط اونچائی ۱۹۲ سینٹی میٹر اور چھوٹی قسم کے پودے کی اوسط اونچائی عام طور سے تیس سینٹی میٹر ہوتی ہے۔

گیندے کے پودے ستمبر سے فروری یا مارچ تک پھول دیتے ہیں۔ اس کے بعد بیج بننے لگتا ہے۔ اور پودے سوکھنے لگتے ہیں۔ سوکھے پودوں کو کیاری سے اکھاڑ دینا چاہیے۔ اگر بیج اگلے سال کے لیے جمع کرنا ہوں تو گچھے (یا پھول) کے کنارے والے بیج جمع کرنے چاہئیں۔

کنارے والے بیج جلدی اُگ آتے ہیں اور اس طرح پودوں میں بڑے بڑے اور بھرے بھرے پھول آتے ہیں۔ شروع سے ہی پودے کو گوبر کی کھاد اور پانی دینے سے بھی پھول بڑے بڑے اور زیادہ تعداد میں آتے ہیں۔

بچوں کی کوششیں

ہندوستان میں

- پہلی ریل ۱۶ر اپریل ۱۸۵۳ء بمبئی اور تھانے کے درمیان چلی تھی اور اس لائن کی لمبائی صرف ۳۴ میل یا ۲۲ کلومیٹر تھی - یہ لمبائی بڑھتے بڑھتے اب اٹھاون ہزار کلومیٹر ہے اور پورے ایشیا میں ریلوے لائن کی یہ لمبائی سب سے زیادہ ہے ۔

۱- پہلی الکٹرک ٹرین بمبئی اور کورلا کے درمیان ۱۹۲۵ء میں چلائی گئی ۔

۲- ایرکنڈیشنڈ ریل کا ڈبہ پہلی بار ۱۹۳۶ء میں استعمال ہوا تھا ۔

۴- سب سے لمبا ریلوے پلیٹ فارم سون پور اسٹیشن کا ہے جس کی لمبائی ۲۴۱۵ فٹ ہے

۵ - ریلوے اسٹیشنوں کی تعداد سات ہزار کے قریب ہے ۔

۶- روزانہ ۶۰ لاکھ مسافر سفر کرتے ہیں اور روزانہ دس ہزار ریل گاڑیاں مال اور مسافر اِدھر سے اُدھر لاتے لے جاتی ہیں - یہ گاڑیاں روزانہ دس لاکھ کلومیٹر کی مسافت کرتی ہیں - یہ چاند اور زمین کے فاصلے کا تین گنا ہے ۔ اور دنیا کے اردگرد سات چکروں کے برابر ہے سالانہ آمدنی سات ارب پچاس کروڑ ہے ۔

ریل کے انجن کا سب سے پہلا کارخانہ ۲۶ر جنوری ۱۹۵۰ء کو قایم ہوا جس کا نام چترنجن لوکوموٹیو ورکس ہے ۔

۸- پہلی ٹیلی گرافی لائن نومبر ۱۸۵۳ء میں کلکتہ اور آگرہ کے درمیان کھولی گئی ۔

۹- پہلا ڈاک ٹکٹ اکتوبر ۱۸۵۲ء میں جاری کیا گیا ۔

۱۰- پہلا پانچ سالہ منصوبہ اپریل ۱۹۵۱ء میں بنایا گیا ۔

۱۱- پہلی بولتی فلم عالم آرا، بمبئی میں ۱۹۳۱ء میں بنی تھی ۔

۱۲- قصر فلک نما حیدرآباد کا سنگِ بنیاد ۱۵ر مارچ ۱۸۸۴ء یوم دوشنبہ کو رکھا گیا جس کی تعمیر پر (۴۰) لاکھ روپیہ صرف ہوا ۔

۳۲- سب سے بڑی جھیل "وولر" ہے جو کشمیر میں واقع ہے ۔

۳۳- زیادہ تر زعفران پام پور کشمیر میں ہوتا ہے ۔

محمد عناد اللہ شریف متعلم دہم
حیدرآباد

عقل مند دیہاتی

ایک دن ایک دیہاتی سیر و تفریح کی خاطر کسی شہر میں چلا گیا - شہر کی چہل پہل اور خوش نما فضائیں جیسے کھو گیا - اپنی دھن میں شہر کی چہل پہل دیکھتا چلا جا رہا تھا کہ پیشاب لگا بے چارے دیہاتی کو کیا معلوم کہ بڑے بڑے شہروں میں راستوں

پر جگہ جگہ پیشاب خانے بنے ہوتے ہیں وہ اپنے دیہاتی
دستور کے مطابق سڑک کے کنارے پیشاب کرنے بیٹھ گیا اچانک
ایک پولیس والے نے دیکھا اور اسے پکڑنے کے لیے اس
کی طرف آنے لگا۔ دیہاتی بڑا چالاک تھا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا
اور دوسری جگہ بیٹھ کر پیشاب کرنے لگا۔ پیشاب کر چکا تو
پولیس والے نے اسے پکڑ لیا۔ دیہاتی نے نہایت عاجزی سے
کہا حولدار صاحب میں ایک دیہاتی ہوں مجھے کیا معلوم کہ
بڑے بڑے شہروں میں راستوں پر پیشاب کرنا قانوناً منع ہے
مجھے معاف کر دو چھوڑ دو، مگر پولس والا نہ مانا اور اسے
پولس چوکی پر لے گیا اور سارا قصہ اپنے افسر کے سامنے بیان
کیا۔ دیہاتی نے کہا حضور میں ایک گنوار دیہاتی مجھے کیا
معلوم کہ شہروں میں راستوں پر پیشاب کرنا قانوناً منع ہے
مگر حضور یہ حولدار صاحب خود راستے کے ایک طرف
بیٹھ کر پیشاب کر رہے تھے میں نے انھیں دیکھا اور میں نے
بھی اس طرح کی حرکت کی۔ پولس انسپکٹر نے دیہاتی کی زبانی
سن کر اس بات کی جانچ پڑتال کی۔ واقعی دو جگہ پر پیشاب
کیا ہوا نظر آیا یہ دیکھ کر اسے بہت غصہ آگیا اور اس نے
پولس والے کو بہت ڈانٹا پھٹکارا۔ اور دیہاتی کو سچ بولنے
پر معاف کر دیا۔

شمس النساء مہاپرولی
متعلم اردو اسکول مہاپرول۔ رتناگری

~~~~

ڈاکا

کھٹ۔ کھٹ۔ کھٹ۔ کسی نے دروازے کی
کنڈی کھٹکھٹائی

امجد دیکھنا دروازے پر کون ہے ـــــ رشید
صاحب نے امجد سے کہا۔

جب امجد نے دروازہ کھول کر دیکھا
ڈاکیہ کھڑا تھا۔

رشید صاحب کی چٹھی ہے۔ ڈاکیہ نے کہا

کیا وہ گھر پر نہیں ـــــ؟

لاؤ مجھے دے دو۔ امجد نے کہا میں اُن
کا لڑکا ہوں

تمھیں نہیں دے سکتا کیونکہ اکسپریس خط ہے۔

ابا جان آپ کا اکسپریس خط آیا ہے امجد نے
اندر جاکر رشید صاحب سے کہا۔

رشید صاحب خط کا نام سنتے ہی اپنے کمرے
سے باہر نکل آئے اور ڈاکیہ سے خط لے لیا۔ اپنے
کمرے میں اطمینان سے بیٹھ کر انھوں نے خط پڑھا۔ خط
کی تحریر پڑھ کر ان کا چہرہ زرد ہوگیا کیونکہ خط میں لکھا تھا
"میں بتاریخ ۳ جولائی بروز سوموار بوقت ایک بجے دن
ڈاکہ ڈالنے آ رہا ہوں۔ آپ اپنے جان مال سے
ہوشیار ہو جائیں"

خط رشید صاحب کے ہاتھ میں کانپنے لگا۔

ابا جان کیا بات ہے۔ کس کا خط ہے؟ آپ اتنے پریشان
کیوں ہو گئے امجد نے رشید صاحب کو پریشان دیکھ کر
پوچھا ـــــ؟

ڈاکوؤں کا خط ہے۔ وہ ۳ جولائی کو ہمارے
گھر ڈاکہ ڈالنے آ رہے ہیں۔ رشید صاحب نے سر تھام لیا۔

تو اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے پولس کو
خبر کر دی جائے۔ امجد نے مشورہ دیا۔

ہاں یہ تو ٹھیک ہے لیکن نا جانے وہ کس
طرح اور کس شکل میں آئیں۔

انھیں پہچاننا پولس والوں کا کام ہے وہ
پہچان جائیں گے۔
~~~~

رشید صاحب خط کو سنبھالے ہوئے تھانے پر پہنچے اور داروغہ صاحب کو خط دکھا کر اپنی حفاظت کی درخواست کی ۔

آپ اتنا پریشان کیوں ہوتے ہیں ہم پولس بھیج رہے ہیں وہ آپ کے گھر کی حفاظت کرے گی ۔

داروغہ جی نے رشید صاحب کو اطمینان دلایا ۔

گاؤں میں سبھی کو معلوم ہوگیا تھا کہ آج رشید صاحب کے یہاں ڈاکہ پڑنے والا ہے ۔ گاؤں کے سبھی بوڑھے، جوان، درخت اور چھتوں پر تماشہ دیکھنے کے لیے چڑھ گئے تھے ۔ گاؤں کے چاروں طرف پولس والوں کا پہرہ تھا ۔ وقت قریب ہوتا گیا ۔ رشید صاحب اپنی تجوری کے پاس بے چینی کے عالم میں ٹہل رہے تھے ۔

اتنے میں ایک خوبصورت کار گاؤں میں داخل ہوئی ۔ کار میں سے کلکٹر صاحب باہر نکلے ۔

سپاہیوں نے سلامی دی ۔

ٹھیک ہے اپنی اپنی جگہ پر رہو ۔ کلکٹر صاحب نے سپاہیوں سے کہا ، اور داروغہ کی طرف بڑھے داروغہ نے بھی انھیں سلامی دی اور اٹینشن کی پوزیشن میں کھڑا ہوگیا ۔ معائنہ کرنے نکلا ہوں کلکٹر نے سلامی کا جواب دیتے ہوئے کہا ۔ مجھے اطلاع ملی کہ یہاں ڈاکہ پڑنے والا ہے ۔ اس لیے میں دیکھنے آیا ہوں کہ انتظام کیسا ہے اور رشید صاحب کہاں ہیں ۔ ؟

اندر کمرے میں ۔ داروغہ نے جواب دیا ۔

اچھا میں ان سے مل کر انھیں تسلی دے دوں کلکٹر نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا ۔

رشید صاحب اپنی تجوری کے پاس ٹہل رہے تھے ۔

تمھارے پاس جتنا نقد سامان ہے وہ میرے حوالے کردو ۔ کلکٹر نے پستول دکھاتے ہوئے کہا ۔!

رشید صاحب خوف سے کانپنے لگے ۔ انھوں نے تجوری کی کنجی اس کے حوالے کردی ۔

کلکٹر نے پہلے رشید صاحب کو کرسی میں باندھ دیا ۔ پھر تجوری کا سب سامان لے کر باہر نکل آیا اور جب وہ دوبارہ اپنی کار میں بیٹھا تو داروغہ نے قریب آکر پوچھا ۔؟ آپ جا رہے ہیں سر ۔

ہاں لو یہ پڑھ لینا ۔ کلکٹر نے ایک کاغذ اس کی طرف بڑھایا اور کار اسٹارٹ کر کے چلا گیا ۔

داروغہ نے کاغذ پر لکھی تحریر پڑھی ۔ لکھا تھا ۔

" میں نے ہمیشہ اسی طرح پولس کی آنکھ میں دھول جھونکی ہے ۔ جاؤ رشید صاحب کو کرسی سے آزاد کردو ۔"

شوکت علی خاں سہسرامی

ایجاد کی تاریخ	ایجاد	موجد یا ایجاد کرنے والا
۱۶۶۳	بھانپ کا انجن	تھامک نیوک مین
۱۷۳۶	چرخہ	ہیرس
۱۷۹۲	گیس کی لالٹین	مرڈوک
۱۸۳۱	دیا سلائی	سوریا
۱۸۳۵	ٹیلی گراف	مورس
۱۸۳۵	موٹر کار	کوگنٹ
۱۸۳۹	ربڑ کا سامان	گڈ ایر
۱۸۵۶	رنگ	پارکن
۱۸۶۱	بجلی کی انگیٹھی	اسمرسن
۱۸۶۱	ٹیلی فون	فرینکفورٹ
۱۸۷۷	خردبین	برلائنز
۱۸۸۷	لینوٹائپ	اسوان
۱۸۹۶	ریڈیو	مارکونی

شمس رحمانی (مراد آباد)

اسکولوں کی تعلیمی و تفریحی سرگرمیاں

سیفی ہائر سکنڈری اسکول کی طالبات کا قابلِ قدر اقدام

ان طالبات نے سیفی ہائر سکنڈری اسکول کے آخری امتحان سے فارغ ہونے کے بعد —— آپس میں چندہ کرکے ایک معقول رقم جمع کی ہے۔ یہ رقم آئندہ سال گیارہویں درجے کی کسی مستحق اور ذہین طالب علم کو ماہ بہ ماہ دی جائے گی۔

کل مہاراشٹرا اردو تقریری مقابلہ

بمبئی ۱۵/جنوری:۔ دن کے ۳ بجے باندرہ اردو ہائی اسکول کے وسیع کمپاؤنڈ میں باندرہ اردو ہائی اسکول کے اہتمام میں کل مہاراشٹرا اردو تقریری مقابلہ ہوا۔ صدارت حامد انصاری غازی نے کی جبکہ الخطیب مولانا ضیاء الدین بخاری مہمان خصوصی کے حیثیت سے شریک ہوئے مقابلہ کا آغاز تلاوتِ قرآن پاک سے ہوا باندرہ اردو ہائی اسکول کے پرنسپل جناب حسین بیگ کی استقبالیہ تقریر کے بعد مقابلے کے اناؤنسر جناب اختر راہی نے جونیر گروپ کے مقابلے کا اعلان کیا۔ جس میں بمبئی اور بمبئی سے باہر کے کئی اسکولوں نے حصہ لیا خصوصاً اورنگ آباد۔ مالیگاؤں ناسک۔ بھیونڈی۔ تھانہ وغیرہ کے اسکول شریک تھے۔

جونیر گروپ کے عنوان یہ تھے۔

(۱) "تو شاہین ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں"

(۲) ہمارے بعد اندھیرا نہیں اجالا ہے"

اس گروپ کے جج صاحبان مہندر ناتھ، خلش جعفری اور شہریار عابد تھے۔ فاضل ججوں کے فیصلے کے مطابق جونیر گروپ کا پہلا انعام انجمن کرلا ہائی اسکول کے طالب علم محمد اظہر شرالے نے حاصل کیا۔ دوسرا اور تیسرا انعام باندرہ اردو ہائی اسکول کے طالب علم محبوب خانی اور تنویر یوسف نے حاصل کیا اس طرح جونیر گروپ کی ٹرافی باندرہ اردو ہائی اسکول نے حاصل کی۔

پھر شام کو چھ بجے سینئر گروپ کا مقابلہ شروع ہوا۔ ان عنوانوں پر بچوں نے بہت جوش و خروش کے ساتھ تقریر کی "(۱) اردو کے قاتل خود اہل اردو (۲) زندگی ڈھونڈنے نکلی ہے...... آکر پکارو تو صحیح۔ اس گروپ کے جج ادبی کمیٹی کے سکریٹری سید محمد زیدی صاحب حامد عبدالجبار اور مسٹر اے حفیظ صاحب تھے۔ چیف جج ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی تھے

جناب زیدی صاحب نے سینئر گروپ کے نتائج کا اعلان کیا۔ پہلا انعام گوجفر نگر گرلز ہائی اسکول کی طالبہ نجمہ صدیقی صاحبہ

نے حاصل کیا۔ دوسرا انعام انجمن خیر الاسلام ہائی اسکول تھانہ کے طالب علم ہریا رعنوانی کو اور تیسرا انعام بھیونڈی رئیس اسکول کی طالبہ رفیعہ محمد حسن اور ٹرافی کو جعفر گرلز ہائی اسکول نے حاصل کی۔

یہ مقابلہ رات کے بارہ بجے تک رہا اس کے بعد پرنسپل حسن بیگ نے سب مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

ناگوری محمد ابراہیم حاجی غلام محمد
باندرہ اُردو ہائی اسکول

ہمارا اسکول

داپولی، کوکن کی ایک تحصیل کا صدر مقام ہے۔ یہ سطح سمندر سے تقریباً نو سو (۹۰۰) فٹ کی اونچائی پر ہے۔ اگر یہ آب و ہوا کے لحاظ سے ضلع رتناگیری کا مہابلیشور ہے تو قدرتی خوبصورتی کے اعتبار سے بھی مہابلیشور سے کسی طرح کم نہیں۔ اس کے چاروں طرف پھیلے ہوئے سہادری کے سلسلے نہایت دل کش نظر آتے ہیں۔ سرسبز و شاداب امرائیوں اور ہرے بھرے میدانوں کی اسی نگری میں ہمارا اسکول کوکن کے تعلیمی حلقوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔

ہمارے نیشنل ہائی اسکول کی عمارت بے حد خوبصورت، عالی شان ہے۔ جو عمارت کے کمروں کے علاوہ آفس روم، اسٹاف روم، کرافٹ روم، لائبریری ہال، ڈرائنگ ہال، ڈل ہال، سائنس ہال اور اسمبلی ہال پر مشتمل ہے۔ اسکول کے سامنے ایک وسیع و عریض میدان ہے۔ جس کے اطراف مسکراتے ہوئے پیڑ پودے ہمارے اسکول کے حسن میں اضافہ کرتے ہیں۔

ہمارے اسکول کا ذریعہ تعلیم اُردو ہے۔ اب کوکن میں جگہ جگہ اُردو کے ثانوی مدارس کھل چکے ہیں۔ اس کے باوجود ہمارے اسکول میں تعلیم پانے والے طلباء و طالبات کی موجودہ تعداد ڈھائی سو ہے، جسے داپولی اور اس کے مضافات کی آبادی کے لحاظ سے کم نہیں کہا جاسکتا۔ ہمارے اسکول کے طلبا میں اکثریت ان طلباء کی رہتی ہے جو علم کی طلب میں بیرونی مقامات سے یہاں آتے ہیں۔ ایسے طلباء کی سہولت کے لیے اسکول سے قریب ہی ایک بورڈنگ یا اقامت گاہ بھی ہے۔ جہاں کم سے کم خرچ میں ان کے رہنے اور کھانے پینے کا بندوبست کیا جاتا ہے۔ ہمارے استادوں میں سے کسی کو اقامت گاہ کا نگران بنادیا جاتا ہے جس کی وجہ سے بورڈنگ کے طلباء پڑھائی کی طرف سے غافل نہیں ہونے پاتے۔

ہمارے موجودہ پرنسپل محترم بہاؤالدین صاحب پرکار بڑے مہربان بزرگ ہیں۔ اسکول کی ترقی اور اس کے نظم و نسق کے سلسلے میں ان کی کوششیں مثالی حیثیت رکھتی ہیں۔ کوکن کے ماہرین تعلیم میں ان کا شمار ہوتا ہے ان کی بدولت ہمارے اسکول کا تعلیمی معیار قابل رشک حد تک بلند ہوا ہے۔ ہمارے دوسرے اساتذہ بھی قابل اور تجربہ کار ہیں۔ ہماری تعلیم و تربیت کے کاموں میں گہری دلچسپی لیتے ہیں۔

ہمارے اسکول میں درس و تدریس کے ساتھ ساتھ دوسرے تربیتی امور کی طرف بھی ضروری توجہ دی جاتی ہے۔

جمال الدین مقدم

قلمی دوستی

نام :- شکیل احمد ابوجی
عمر :- چودہ سال
پتہ :- ۲، نظام پور بھیونڈی
مشغلہ :- پیام تعلیم پڑھنا، قلمی دوستی

نام :- محمد ارمغان ساحل سہسرامی
عمر :- چودہ سال
پتہ :- معرفت پروفیسر اظہر حسین
محلہ منڈی کشور خان پوسٹ سہسرام
ضلع شاہ آباد
مشغلہ :- شعروشاعری کرنا، پیام تعلیم پڑھنا، بچوں کو رلانا اور پھر پیار کرنا۔ بھائی بہنوں کے خط کا جواب دینا۔

نام :- سائرہ بانو۔ عمر تیرہ سال
پتہ :- معرفت حیدر علی
محلہ منڈی کشور خان سہسرام
ضلع شاہ آباد بہار
مشغلہ :- کشیدہ کاری۔ پیام تعلیم پڑھنا
بھائی بہنوں کے خط کا جواب پابندی سے دینا

نام :- انیس۔ کیو۔ ظفر الدین
عمر :- سولہ سال
مشغلہ :- خط کتابت کرنا، کورس کی کتابیں پڑھنا۔
معرفت۔ ریڈیو انجینئر۔ سہسرام (بہار)

نام :- منی باجی :- عمر تیرہ سال
مشغلہ :- نماز پڑھنا۔ پیام تعلیم اور دیگر رسالے پڑھنا، کہانیاں لکھنا، ٹکٹ جمع کرنا اور قلمی دوستی کرنا، فوٹو جمع کرنا۔
پتہ :- منی باجی معرفت ڈاکٹر محمد سلیمان ڈی۔لٹ شعبہ اردو فارسی ال ایس کالج مظفر پور (بہار)

نام :- محمد شکیل اختر۔ عمر سولہ سال
پتہ :- معرفت پروفیسر محمد سلیمان۔ اردو فارسی شعبہ۔ لنگٹ سنگھ کالج مظفر پور
مشغلہ :- خدا کے بندوں سے قلمی دوستی کرنا اور ان کے بھیجے ہوئے خطوط کا واپسی ڈاک سے جواب دینا۔ ڈاک ٹکٹ جمع کرنا۔ پیام تعلیم پڑھنا، فٹ بال اور کرکٹ کھیلنا مضمون لکھنا، تقریر کرنا۔

نام :- فیاض احمد فیضی :- عمر چودہ سال
مشغلہ :- بچوں کے اچھے رسالے پڑھنا، خطوں کا جواب دینا۔ کیرم کھیلنا۔ قلمی دوستی اور کہانیاں لکھنا۔
پتہ :- ۹۹/۲، نیا قاضی محلہ، تیسری منزل (دہلی)

نام :- غضنفر حسین - عمر چودہ سال
پتہ :- معرفت سب پوسٹ ماسٹر ہیسٹنگز ڈاک خانہ کلکتہ ۲۲
مشغلہ :- اردو رسالے پڑھنا، مصوری کرنا، لطیفے لکھنا اور ڈاک ٹکٹ جمع کرنا۔

نام :- اقبال احمد مصطفےٰ آبادی
عمر :- تیرہ سال
تعلیم :- درجہ پنجم
مشغلہ :- اردو کی خدمت کے لیے اخبار و رسائل خریدنا اور دوسروں کو خریدار بنانا۔ لطیفے لکھنا، قلمی دوستوں کے خطوط کا یقینی جواب دینا۔
پتہ :- معرفت وزیر مصطفےٰ آبادی اردو ٹیچر۔ دار اردو اسکول۔ [illegible] کاسورہ۔ تعلقہ ارنڈول۔ ضلع جلگاؤں۔ مہاراشٹر اسٹیٹ۔

نام :- کوثر علی خان آزاد۔ عمر :- تیرہ سال۔ تعلیم میٹرک
مشغلہ :- "پیام تعلیم" "نور" "کلیاں" "اردو کامک" کا مطالعہ کرنا۔ افسانہ کہانی لکھنا۔
پتہ :- کوثر علی خاں آزاد۔ محلہ رکھنواری مقام اکبر پور۔ ڈاک گھر رہتاس، ضلع شاہ آباد (بہار)

آدھی ملاقات

جون کا "پیام تعلیم" اپنے وقت پر موصول ہوا۔ جس سے طبیعت خوش ہو گئی۔ مئی کے ماہ کا رسالہ ابھی کو ملا حالاں کہ اسے ماہ کے شروع ہفتہ میں ملنا چاہیے تھا انتظار بہت شدید رہا۔ لیکن جب ڈاکیہ نے پیام تعلیم لا کر دیا انتظار کی مصیبت کو بھول کر رسالہ کی رنگینیوں میں کھو گئی۔ واقعی آپ تعریف کے مستحق ہیں۔ ہم لوگوں کے لیے ہر ماہ اتنا دل چسپ پرچہ مہیا کر دیتے ہیں خدا ہمارے پرچے کو کسی کی نظر نہ لگے آمین۔ "پھلواری لگائیے" کا یہ سلسلہ بہت پسند آیا۔ مئی کے ماہ خاص طور سے "مچھر" "میکسم گورکی" "فن کی قیمت" "اقبال مند" "گلاب" "بانسر وباڈلا" پسند آیا۔ پہلے انگلش میں ہماری آپا نے پڑھ کر سنایا تھا اب میں نے خود اردو میں پڑھ لیا۔ اب میں انگلش میں بھی پڑھ لوں گی انشاء اللہ۔ اور بھی سارے مضامین اپنی جگہ اچھے ہیں۔

جون کا ٹائٹل بھی خوب بہتر ہے مضامین سبھی دلچسپ ہیں۔ خاص طور سے "ایران میں جشن نوروز" "انوکھا انتقام" "سوا کا کمال" "پیسہ" "خوب انعام ملا" "اقبال مند" "باغبانی" "کام کی باتیں" "ایک لوری" پسند آیا۔ سبھی مضامین اور نظمیں اپنی مثال آپ ہیں۔ محترمہ فرزانہ انصاری کو ہماری طرف سے مبارکباد دے دیں۔ وہ ہم لوگوں کے لیے اتنے دلچسپ معلوماتی مضامین لکھتی ہیں۔ کاش نصابی مضامین بھی اتنے ہی دلچسپ ہوتے۔

خالدہ خاتون (دربھنگہ)

ارسال کردہ "پیام تعلیم" اور نوازش نامہ ملا شکریہ! ٹائٹل دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ تمام مضامین قابل تعریف تھے۔ جناب اظہار الحق صاحب کا مضمون "پھلواری لگائیے" بہت ہی خوبصورت تھا۔ "نظم میسور" کافی پسند آئی۔ میری طرف سے محترمہ حسنیٰ سرور صاحبہ کو مبارکباد۔ "پیام تعلیم" روز بہ روز ترقی کی جانب قدم اٹھا رہا ہے۔ وہ دن دور نہیں جب "پیام تعلیم" بچوں کے ادب میں ایک درخشاں ستارے کے مانند ساری دنیا میں چمکے گا۔ فی الحال "پیام تعلیم" کی ترقی دیکھ کر دلی خوشی ہوئی۔ دو تین ماہ کے اندر اندر میں چار خریدار پورے کر لوں گا انشاء اللہ۔

ایم امان اللہ خاں (درانی گنج)

جون کا "پیام تعلیم" موصول ہوا۔ شکریہ قبول فرمائیے۔ پہلی ہی نشست میں پورا پرچہ دیکھ چکا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ پیام تعلیم روز بروز نکھرتا جا رہا ہے۔ اس بار سرورق کی تصویر بہت خوب ہے، کافی پسند آئی۔ مضامین بھی اچھے ہیں۔ دو مضمون بہت پسند آئے ایک تو "ایران میں جشن نوروز" اور دوسرے سردار عرفان صاحب کا "اورنگ سلیمانی"۔ اگر ہر شمارے میں ایسے دلچسپ مضمون دیئے جائیں تو اس سے پیامیوں کی دلچسپی بھی بڑھے اور ان کے معلومات میں بھی اضافہ ہو۔

مولانا مقبول احمد کا ابن بطوط والا سلسلہ بھی کافی دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔ مولانا نے پیام تعلیم میں یہ سلسلہ شروع کر کے واقعہ یہ ہے کہ پیامیوں کو بہت کچھ دے دیا ہے۔ ایسے مضامین پیام تعلیم کی زینت ہیں۔ امید کہ مزاج بخیر ہوں گے۔

محمد مسیح الدین صدیقی حیدرآباد

ایران کے بارے میں آپ نے خطوط شایع کرنے کا سلسلہ شروع کیا ہے ۔ ہمارے خیال میں یہ سلسلہ پیامیوں کی معلومات بڑھانے میں بہت مدد کریگا ۔ ایران کے متعلق اتنی ساری معلومات صرف پیام تعلیم ہی میں دیکھی گئی ہے ۔ پھل، پھول، موسم، وہاں کی زندگی، وہاں کے حالات، ملک کے رہن سہن رسم و رواج، تہوار اور اسلام کے متعلق ایک ہی خط میں بہت سی معلومات حاصل ہوئیں ہیں خوشی ہوگی اگر پیام تعلیم اسی طرح معلومات کا بھی باعث بنے اس طرح ہمیں آسانی اور کم مدت میں بہت کچھ حاصل ہوگا ۔ چھوٹی تصویروں کی البم کا سلسلہ جاری رکھا جائے ۔

پیامی ۔ رشیدہ بی بی مصطفےٰ بھائی شیخ

پیام تعلیم مسلسل کئی مہینوں سے پڑھتا چلا آ رہا ہوں ۔ پرچہ بے حد پسند آیا ہے خاص کر سائز کی نئی تبدیلی نے پیام تعلیم میں جان ڈال دی ہے ۔ پیام تعلیم کے "ذاکر نمبر" اور "سالنامہ" بھی نظروں سے گذر چکے ہیں ۔ اتنے قلیل عرصہ میں اتنے اچھے نمبر نکال کر آپ نے یہ ثابت کردیا کہ آپ کو پیامی بھائی بہنوں کے ذوق و معیار کا پورا پورا خیال ہے ۔ لیجیے اپنے ایک عزیز کے لیے پیام تعلیم کا سالانہ چندہ مبلغ چھ روپے بھجوا رہا ہوں ۔

شاد مونگیری

مئی کا "پیام تعلیم" پڑھا، پڑھ کر دل خوش ہوگیا ۔ "پتنگ" اور "میسور" نام کی نظمیں مجھے بے حد پسند آئیں ۔ "اقبال مند" نام کی کہانی ختم ہوگئی ۔ مگر اسی طرح کی اچھی سی قسط وار کہانی اگلے ہی پرچہ سے شروع کر دیں تو بہت اچھا ہوگا ۔ آمین ۔

منی باجی

ماہ جون کا "پیام تعلیم" ٹھیک وقت پر مل گیا ۔ واللہ دیکھ کر طبیعت باغ باغ ہوگئی ۔ ہر شمارہ اپنے پچھلے شمارے سے خوب تر ہوتا ہے ۔ اس پرچے میں نئی نئی چیزیں مجھے دیکھنے کو ملیں ۔ جناب رضوان احمد بارہ بنکوی کا لکھا "انوکھا انتقام" مجھے بہت پسند آیا ۔ "پیسے کی کہانی" کو غلام حیدر صاحب نے بہت اچھے ڈھنگ سے پیش کیا ہے ۔ جناب انور صاحب نے ایک ڈرامہ بھی خوب لکھا ۔ "خوب انعام ملا" اچھا لگا ۔

بھائی جان مجھے صرف ایک چیز بالکل نہیں بھاتی وہ ہے جناب اقبال مہدی صاحب کا مضمون "ایک دن کیا ہوا" ان سے کہیے کہ ذرا اچھی چیزیں ہم پیامیوں کے لیے پیش کریں ۔

ایم ۔ اسلم دسکریٹری انجمن ترقی اردو
رفیع گنج دگیا)

"پیام تعلیم" کا مئی کے مہینے کا تازہ شمارہ ملا ۔ اس میں بہت ہی اچھے اچھے مضامین اور نظمیں چھپی ہیں ۔ مجھے تمام مضامین پسند آئے ۔ ان میں خاص طور سے فرحت قمر کی لکھی ہوئی نظم "بانسر وباڈلا" اور شکیل جاوید کی لکھی کہانی "فن کی قیمت" میں نے بڑی دلچسپی سے پڑھی ۔

لطیف اللہ چورنگھے (بمبئی)

پیام تعلیم مسلسل مل رہا ہے ۔ شکریہ ۔ واقعہ یہ ہے کہ پیام تعلیم نے دو سال کی قلیل مدت میں جو سماں باندھا ہے وہ بڑے بڑے جریدوں سے دس سال میں بھی ممکن نہ ہوا ۔ آپ کی ہمت کی داد دینی پڑتی ہے ۔

یوسف ناظم ۔ بمبئی

ادھر اُدھر سے

تاج محل میں کوئی درار نہیں پڑی ہے

ادھر کچھ دن پہلے کئی اخباروں میں یہ خبر شایع ہوئی تھی کہ تاج محل میں کچھ نئی دراریں پڑ گئی ہیں آثار قدیمہ کے محکمے نے ان خبروں کی تردید کر دی ہے۔

محکمہ آثار قدیمہ کے ایک بیان میں بتایا گیا ہے۔ کہ تاج محل کے تہہ خانہ کی دیوار اور چھت کی دراریں کافی پرانی ہیں، ان کا ذکر خود اورنگ زیب نے اپنے ایک خط میں کیا ہے، جو انھوں نے تاج محل کی تعمیر کے چار سال بعد ۱۶۵۲ء میں شاہ جہاں کے پاس بھیجا تھا۔ محکمہ کی طرف سے ایک بیان جاری کیا گیا ہے۔ اس بیان میں بتایا گیا ہے کہ دس سال پہلے تاج محل کی مرمت بہت اچھی طرح ہو چکی ہے اور اس میں جگہ جگہ ایسے شیشے لگا دیے گئے ہیں کہ اس کے کسی حصے میں ہلکی سی درار کا پتہ خود بخود لگ جاتا ہے۔

تاج محل کی دیکھ بھال پر ہر سال ایک لاکھ ہزار روپیہ خرچ کیا جاتا ہے۔ یہ رقم اس کے علاوہ ہے جو کہ کسی بڑے پیمانے پر خاص طرح کی مرمتوں پر خرچ کی جاتی ہے اتنی بڑی رقم کسی اور عمارت کی مرمت اور دیکھ بھال پر خرچ نہیں کی جاتی۔

پڑھنے والی خودکار مشین

سوویت یونین میں پڑھنے والی مشین تیار کی گئی ہے اس خودکار مشین کے پہلے صنعتی ماڈل کی لتھوانیا کے اعداد و شمار بورڈ میں جانچ کی گئی ہے۔ اس مشین کا نام "ایوتا۔اے" ہے۔ یہ مشین ایک سکنڈ میں ۲۰۰ مطبوعہ یا ہاتھ سے لکھے ہوئے اشارے پڑھ لیتی ہے۔ یہ مشین لاطینی حروف پڑھتی ہے۔ وہ ایسی ۱۴ علامتوں کی شناخت کرتی ہے جو مختلف قسموں کے عمل کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔

جانوروں کے بھی کچھ حقوق ہیں۔

جانور ہمارے بہت کام آتے ہیں۔ کھیت میں ہل چلانا، کنوئیں سے کھیتوں کی سنچائی کرنا، یکہ، تانگے اور بیل گاڑیوں کو کھینچنے کا کام جانور ہی تو کرتے ہیں۔ خچر اور گدھے بھی سامان کی ڈھلائی کے کاموں میں رات دن لگے رہتے ہیں۔ کولھو کے بیلوں اور رہٹ کھینچنے والے اونٹوں کو بھی نہ بھولیے۔ ایسے ہی سنکڑوں کام ہیں جن میں انسان جانوروں کے ہاتھ پیروں کی طاقت سے فائدہ اٹھاتا ہے، آج ترقی یافتہ ملکوں میں ملوں اور فیکٹریوں میں کھیتوں میں کام کرنے والے مزدوروں کے کام کے اوقات مقرر ہو چکے ہیں۔ مگر جانوروں سے لوگ دن رات کام لیتے ہیں۔ کوئی یہ نہیں سوچتا کہ آخر وہ بھی تو محنت کرتے کرتے اسی طرح تھک جاتے ہوں گے جس طرح ہم آپ۔ انھیں بھی ہماری طرح آرام کی ضرورت ہے۔

جانوروں کو بے رحمی کا شکار ہونے سے بچانے کے لیے ہر ملک میں سوسائٹیاں قایم

ہیں۔ ایسی ہی ایک سوسائٹی برازیل کے ایک شہر فورٹالیزا میں قائم ہے۔ اس سوسائٹی نے مزدوروں کی طرح جانوروں کے کام کے اوقات مقرر کیے جانے اور اس کے لیے مزدوروں ہی کی طرح چھٹی وغیرہ کا حق دلانے کے لیے ادھر کچھ دنوں سے ایک تحریک چلا رکھی تھی، جس میں اسے کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اب اس مہینے سے وہاں پانی اور گاڑی کھینچنے والے اور اپنی پیٹھ پر بوجھ لاد کر ڈھونے والے گھوڑوں، خچروں اور گدھوں کو بھی ہفتے میں ایک دن کی چھٹی ملا کرے گی۔ کوئی مالک ان جانوروں سے دن میں آٹھ گھنٹے سے زائد کام نہ لے سکے گا اور تمام سرکاری چھٹیوں کے دن جانوروں کو بھی چھٹی ملا کرے گی۔

ہمارے ملک میں تو ابھی مزدوروں کے ساتھ بھی وہ سلوک نہیں کیا جاتا جو فورٹالیزا میں جانوروں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

عالم حیوانات کا ایک حیرت انگیز واقعہ

ہنوور (ڈاڈ) ہماری یہ تصویر ہرنوں کی ایک نایاب نسل کے ایک نوزائیدہ بچے کو پیش کرتی ہے۔ یہ بے حد خوبصورت و دل کش ترین اور چاق و چوبند ہرن بچہ اس حقیقت سے قطعی ناواقف ہے کہ اس کی پیدائش سے عالم حیوانات کے ایک نئے دور کا آغاز ہو گیا ہے۔ جس کی وجہ سے اس ہرن بچہ کو تاریخ حیوانات میں بڑی غیر معمولی اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ جو اب تک کسی اور جانور کو حاصل نہ ہو سکی تھی۔

چتکبرے رنگوں والے صحرائی ہرنوں کا یہ بچہ اپنی نایاب نسل کا پہلا ہرن بچہ ہے۔ جو اب تک دنیا کے کسی چڑیا گھر میں پیدا ہوا ہے۔ اس بے مثال و خوش نما ہرن بچہ کے ماں باپ کوئی ڈھائی برس گذرے براعظم افریقہ سے دور دراز کا سفر کر کے جمہوریہ جرمنی پہنچے تھے۔ کسی کو بھی خیال نہ آیا تھا کہ انھیں شمالی جرمنی کی سرد اور برفانی آب و ہوا راس آئے گی۔ اور وہ بغیر کسی خاص دقت کے یہاں رہ سکیں گے۔ جہاں وہ پہلے صرف اپنے نامانوس مگر بڑے دل کش رنگ روپ کی بنا پر چڑیا گھر کے چند مقبول ترین جانوروں میں گنے جایا کرتے تھے۔ وہاں اب انھیں اپنے اس نازنین پیکر بچے کی بدولت اس چڑیا گھر کے سب سے زیادہ ہر دل عزیز جانور ہونے کا فخر بھی حاصل ہو گیا ہے اور اس کی بدولت ان کی شہرت راتوں رات کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے۔ (اطلاعات جرمنی)

ایک نایاب جانور

ڈوئس برگ (ڈاڈ) وفاقی جمہوریہ جرمنی کے مشہور شہر ڈوئس برگ کے چڑیا گھر کو ایک ایسے نادر حیوان کی ملکیت کا فخر حاصل ہو گیا جو اس وقت یوروپ کے شاید ہی کسی دوسرے چڑیا گھر میں پایا جاتا ہو۔ پچھلے دنوں چڑیا گھر کو کمبوڈیا کے بیانگ نامی ایک دھاری دار اود بلاؤ کی قسم کا ایک نمونہ دستیاب ہوا ہے جو [illegible] نایاب ہے کہ علم حیوانات کی مستند کتابوں میں [illegible] کی تصویریں نہیں ملتیں، چونکہ کتے جیسا منہ رکھنے [illegible] کو چھوٹے جانوروں اور پرندوں [illegible] کرنا بہت پسند ہے۔ اس لیے بہت سے [illegible] لوگ اسے شیروں کی ایک قسم سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ اسے گوشت کے علاوہ کیلے بھی بہت بھاتے ہیں۔

(اطلاعات جرمنی)

Regd. No. D. 1457. August 1968.

PAYAM-I-TALEEM
New Delhi-25.

پیام تعلیم

فوٹو: اطلاعات جرمنی

آگ بجھانے والے ننھے رضا کار — فوٹو: اطلاعات جرمنی

سرورق کی تصویر
عمل۔ جاوید اشرف ۴

فہرست

بچوں سے باتیں

تم اس پرچے میں آپ ایک پیاری سی نظم پڑھیں گے۔ "ستمبر آگیا"۔ ستمبر میں آپ اپنے اپنے اسکولوں میں اپنی انجمنوں کے نئے عہدے دار چنیں گے۔ اس بات کو عادل صاحب نے بہت اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کی توقع کے مطابق ہمیں امید ہے کہ آپ اپنی انجمن کے لیے ایسے عہدے داروں کا انتخاب کریں گے جو ہر طرح کام کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں۔

اور اسکولوں میں تو عموماً یہ انتخاب یا چناؤ ستمبر کے مہینے میں ہوتے ہیں مگر ہماری جامعہ کے ابتدائی اور ثانوی اسکول میں یہ مہم اگست ہی میں سر کی جاتی ہے۔ اس سال مدرسہ ثانوی میں یہ انتخاب ۲۰ اگست کو تھا۔ تین چار دن پہلے سے خوب ہما ہمی خوب چہل پہل رہی۔ جلسے ہوئے جلوس نکلے، امیدواروں کے لیے کنونسنگ ہوئی۔ اور ہاں پوسٹر بھی تو نکلے طرح طرح کے پوسٹر ان پر گرما گرم فقرے مزے مزے کے کارٹون دیکھیے تو بس دیکھتے رہ جائیے۔

آخری یعنی انتخاب کے دن ایک بڑا جلسہ ہوا اس میں امیدواروں نے خوب جوشیلی تقریریں کیں۔ تھوڑی دیر بعد انتخاب ہوئے۔ اسی دن شام کو نتیجہ بھی سنا دیا گیا۔ آپ بھی سن لیجیے۔ عزام احمد شاذی نائب صدر۔ لائبریرین چودھری عبداللطیف سکریٹری عبداللہ طارق۔ مربی انگ شمیم مجیب مدیر الصمد عبدالجبار قاضی، ناظم کھیل نسیم الدین

ایک خبر یہ ایک نئی اور دلچسپ بات ہے ... اسکول

کی لڑکیوں نے اپنی الگ کیبنٹ بنائی۔ تمام امیدوار لڑکیاں ہی تھیں۔ ناہید تاباں اس جماعت کی لیڈر تھیں۔ کامیابی کی توقع خود انھیں امید نہیں تھی پھر بھی انھیں بہت سے ووٹ مل گئے۔ اور بھی ایک دلچسپ روایت قایم ہو گئی۔

پچھلے ہفتے کی ڈاک سے کراچی سے ہمیں ایک رسالہ ملا۔ "ستارہ" یہ جامعہ ملی یرسٹی کراچی کے مکتبۂ جامعہ سے شایع ہوا ہے۔ کچھ دنوں پہلے بھی نکلا تھا مگر کسی وجہ سے بند ہو گیا تھا۔ اب اس کے ایڈیٹر عبدالواحد سندھی ہیں۔ بچوں کے جانے پہچانے ادیب ہیں۔ ان کی بہت سی کتابیں مکتبہ جامعہ دہلی سے شایع ہوئی ہیں اور بچوں میں بہت مقبول تھیں۔ ان کی ایڈیٹری میں یہ پرچہ انشاءاللہ خوب پھلے پھولے گا۔ عبدالواحد صاحب نے میلادالنبی سے اس کی بسم اللہ کی ہے۔ بڑا نیک شگون ہے۔ بہت سادہ اور سلیس زبان میں آنحضرتؐ کی زندگی کے قریب قریب سبھی پہلو آ گئے ہیں۔ نظمیں بھی شفیع الدین صاحب نیرؔ ماہر القادری حسرت لکھنوی جیسے اچھے شاعروں کی شامل ہیں۔ دوسرا پرچہ اگست کا ہے۔ اس میں بھی مذہبی رنگ گہرا ہے۔ باقی تمام مضامین زیادہ تر معلوماتی ہیں۔ رسالہ کی لکھائی بھی ہے چھپائی بھی ہے کاغذ اچھا ہے۔ رنگین ٹائٹل ہے میلاد النبی نمبر میں گنبد خضرا بیت الحرم وغیرہ کی تصویریں ہیں۔ دوسرے نمبر میں خود ادارے کی ذریعہ ہیں اور ایٹم بم وغیرہ کی تصویریں ہیں۔

اور بھی اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ کہ خود صدر جس تعلیم ... ڈاکٹر ذاکر حسین خاں اس کے ... ہیں ...

عبدالحی اس کے مہتم ہیں۔ گویا یہ جامع ملی کا اپنا پرچہ ہے اور اس ادارے میں پڑھنے والے بچوں کی امنگوں حوصلوں اور ولولوں کا ترجمان ہے۔ آٹھ روپیہ سالانہ چندہ ہے۔

پیامیوں کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ پیام تعلیم کے سابق ایڈیٹر اطہر پرویز صاحب (لکچرر اردو مسلم یونیورسٹی) ایجوکیشن آفیسر کی حیثیت سے تین سال کے لیے ماریشس جارہے ہیں۔ ہم اپنی اور آپ کی طرف سے ان کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ پرویز صاحب نے وعدہ کیا ہے کہ وہاں سے پیام تعلیم کے لیے ماریشش کے حالات لکھ کر بھیجیں گے۔

ہمارے دینا ناتھ گردھر صاحب نے اب کے ایک اور بہی کہانی لکھی ہے۔ بڑی دلچسپ ہے آپ اسے اسی پرچے میں پڑھیے۔ خالد عرفان صاحب نے سائنسی مضمون کی جگہ اس مرتبہ ایک کہانی لکھی ہے: "ممتا" اسے پڑھ کر آپ کو اندازہ ہوگا کہ جانوروں کو بھی اپنے بچوں سے کیسی والہانہ محبت ہوتی ہے اور وہ ان کی خاطر کیا کچھ کر گذرتے ہیں۔ پھر ٹونکی صاحب کی کہانی "پیارے بچے" پڑھیے۔ ایک روسی کہانی پڑھیے۔ نظموں میں "ستمبر آگیا" پڑھیے حضرت ساحر بھوپالی کی "قوالی" پڑھیے۔ "زندگی اور ریل" پڑھیے۔ فطرت کا دوست پڑھیے۔

ہمارے امین صاحب کو آپ بھولے تو نہ ہوں گے ایک عرصہ تک پیام تعلیم کے لیے مضمون لکھتے رہے پھر اتھوپیا چلے گئے۔ اب انھوں نے اتھوپیا دحبشہ) کے حالات پر مضامین کا ایک سلسلہ بھیجا ہے۔ بڑے دلچسپ مضمون ہیں۔ اکتوبر کے پرچے سے یہ سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ ایک مضمون مرزا سلمان بیگ نے بھیجا ہے یہ انجینئر ہیں انجینئرنگ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں لکچرر ہیں۔ بچوں کے لیے بہت اچھے ڈھنگ سے لکھتے ہیں۔ یہ مضمون بھاکڑا ننگل کے سلسلے میں لکھا ہے خوب لکھا ہے۔ اکتوبر میں پڑھیے گا۔ ایک مضمون اپنے پڑوسی ملک نیپال پر ہے یہ بھی بہت دلچسپ اور معلوماتی ہے۔

اقبال مند کی کہانی تو آپ نے پسند کی۔ اس کا ایک حصہ ابھی باقی ہے۔ یہ آپ اس وقت پڑھ سکیں گے جب کتابی شکل میں شایع ہوگی۔ گنجایش کی کمی کے سبب یہ سلسلہ ہم ختم کررہے ہیں۔ کچھ پیامیوں نے اسے کتابی شکل میں شایع کرنے کی خواہش کی ہے۔ مگر یہ جرأت ہم جبھی کریں گے جب بہت سے پیامیوں کی فرمائشیں ہمارے پاس آجائیں۔

پیام تعلیم کے خریدار بڑھانے کی مہم جاری ہے۔ محترم ملازم جعفری صاحب نے چار خریدار اور مرحمت فرمائے ہیں۔ دو خریدار محترم ضیاء الحسن صاحب فاروقی پرنسپل جامعہ کالج نے مرحمت فرمائے ہیں۔ اور بہت سے ساتھی اور مخلص اپنی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔ نتیجے کا انتظار ہے مگر ہمارے لیے سب سے اچھا دن تو وہ ہوگا جب ہم آپ کی کوششوں کے نتیجے ان صفحوں میں شایع کریں گے۔ کہیں آپ ہمیں شرمندہ تو نہیں کریں گے!

ہم عصر "ثانی (رڈائجسٹ) لکھنو نے ہمارے پاس ایک ننھی منی کتاب بھیجی ہے: "ننھے جاسوس" احمد شکور صاحب نے لکھی ہے۔ قصے کا خلاصہ یہ ہے کہ دو چھوٹے بہن بھائیوں نے اپنی ذہانت سے اپنے ہی درجے کے ایک لڑکے کے جرم کا پتہ نشان لگا لیا۔ اور اس پتہ لگانے کے سلسلے میں بالکل جاسوسوں کا انداز اختیار کیا۔ دلچسپ کہانی ہے۔ چھوٹے سائز کے ۳۲ صفحوں میں آئی ہے۔ لکھائی چھپائی اچھی خاصی کاغذ سفید ٹائٹل کے چوتھے صفحے پر جناب مصنف اور محترم پبلشر کی تصویریں ہیں۔ پبلشر کی تصویر شایع کرکے ثانی نے جدت کا ثبوت دیا ہے۔ کیا عجب جو دوسرے پبلشر بھی اس جدت کو اپنالیں۔ کتاب کی قیمت ۵۰ پیسے ہے۔ ثانی پبلشنگ ہاوس گوتم بدھ مارگ لکھنو سے ملے گی۔

جناب عادل جعفری

ستمبر آگیا

رخصت ہوا اگست، ستمبر پھر آگیا | اسکول کی فضاؤں پہ اک نور چھا گیا
کیا کام اب اگست کا ہے بولیے تو آپ | اب ڈائری کا اگلا ورق کھولیے تو آپ
آیا بھی ہے یہ شان سے جائے گا شان سے | یہ تیس دن رہے گا بڑی آن بان سے
یہ ماہ وہ ہے جس میں بہت شد و مد کے ساتھ | ہم انجمن بنائیں گے جد و جہد کے ساتھ
پھر صدر ہو گا اس طرح یاروں کے درمیاں | روشن ہو چاند جیسے ستاروں کے درمیاں
ہاں دیکھیے گا ایک نیا دور ہو گا اب | ناظم بھی انجمن کا کوئی اور ہو گا اب
موزوں ہو انتخاب یہ ہم سب کو ہے خیال | خازن ہو بے نظیر، محاسب ہو بے مثال
ہر عہدہ دار کیوں نہ خود اپنا جواب ہو | اچھی طرح سے سوچ کے جب انتخاب ہو
کیا دخل اس میں دوست کا کیا رشتہ دار کا | ہم تجزیہ کریں گے ہر امیدوار کا
پڑھنے میں وہ ہو تیز تو مغرور بھی نہ ہو | تقریر اچھی کرنے سے معذور بھی نہ ہو
رفتار وہ کہ فرق نہ آئے ثبات میں | گفتار وہ کہ پھول جھڑیں بات بات میں
اخلاق میں نہ کوئی مقابل ہو دوستو | کردار اس کا رشک کے قابل ہو دوستو
یہ انتخاب باعث صد ناز ہو گا اب | ہو گا جو منتخب وہی ممتاز ہو گا اب

اچھی سی جبکہ انجمن اچھی طرح بنے
اسکول میں ہر ایک کا پھر کیوں نہ دل لگے

جناب سید محمد ذکی

پیارے بچے

اب سے بہت دن پہلے کوئی پچاس برس پہلے ہمارے دیس میں بجلی نہیں تھی۔ غریبوں کے گھروں میں دیے جلائے جاتے تھے اور ذرا بڑے آدمیوں کے گھروں میں لالٹین یا لیمپ سے اُجالا کیا جاتا تھا۔ بورڈنگوں میں بھی لالٹینوں سے کمرے روشن کیے جاتے تھے۔

آج تو آپ نے بٹن دبایا اور اُجالا ہوگیا۔ تیز روشنی کی ضرورت ہوئی تو زیادہ واٹ کا بلب لگایا مدھم روشنی چاہیے تو کم واٹ کے بلب سے کام نکالا۔ کتنی آسانی! کیسی اچھی روشنی۔ ہلدی لگی نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا! لیکن اُس زمانے میں تیل ڈالو۔ بتی کاٹو۔ چمنی صاف کرو۔ پھر دیا سلائی جلا کر بتی کو جلاؤ۔ تو روشنی ہو۔ کم روشنی چاہیے۔ تو بتی کو نیچا کرو۔ زیادہ چاہیے تو بتی کو اونچا کرو۔

اس جوکھم میں آتا تھا مزہ۔ شام کو دن چھپنے سے پہلے بورڈنگ میں لائن لگی ہوتی۔ ہر بورڈر کے پاس لالٹین رکھی۔ پاس ہی لوٹا۔ گھٹنے پر کپڑا یا تولیہ اور مارا مار چمنی صاف ہو رہی ہے۔ پھر بتی کاٹی اور ٹھیک کی جا رہی ہے اور رات کا انتظار ہے کہ کب اندھیرا ہو اور مقابلہ کیا جائے کہ کس کی چمنی زیادہ صاف ہے اور زیادہ روشنی دے رہی ہے۔

اس زمانے میں بلجیم کے لیمپ اور چمنیاں بہت مشہور کیونکہ چلتے بہت تھے اور روشنی بھی بہت اچھی اور صاف ہوتی تھی۔ ہم لوگ بہت اکڑ کے کہتے جناب ایسا ویسا نہیں۔ بلجیم کا لیمپ ہے۔ بلجیم کی چمنی۔ روشنی اس کی نہ ہوگی تو کیا ٹھیکرے کی ہوگی۔

اس دور میں یہ وہم و گمان بھی نہ تھا کہ برسوں بعد بلجیم سے دو لیمپ۔ صاف شفاف لیمپ روشن ہوں گے۔ ایسے لیمپ جو کمروں کو نہیں دلوں کو روشن کریں اور گرمائیں گے۔ روشنی بھی دلوں کی۔ انسانی ایکتا کی ہوگی اور ایسی ہوگی جو بجھے گی نہیں روشن رہے گی۔ سدا روشن رہے گی۔

یہ دو لیمپ دو بچے تھے جن میں سے ایک کا نام الین پٹی ٹر تھا اور دوسرے کا ہارٹ بوٹیری جن کا دیس بلجیم یورپ میں ایک ملک ہے اس دیس کے لوگ عیسائی مذہب کو مانتے ہیں اور رنگ کے بہت گورے چٹے۔ گورے چٹے لوگوں کو اپنے رنگ کا گھمنڈ بھی ہوتا ہے اور وہ کالے لوگوں کو اچھا نہیں سمجھتے۔

یہ دونوں بچے بیمار تھے اور سخت بیمار۔ بیماری بھی موذی اور جان لیوا۔ کینسر۔ دسمبر ۶۴ء کے تیسرے ہفتے میں ڈاکٹروں نے جواب دے دیا کہ اب بچ نہیں سکتے۔ چھوٹے بچے۔ ڈاکٹروں کا صاف جواب کہ بچ نہیں سکتے مرنے کا وقت قریب ہے۔

سوچیے ان پر کیا گزری ہوگی! اِن سے پوچھا گیا کیا چاہتے ہو؟ انہوں نے بہت سی اور اچھی اچھی مٹھائیاں مانگیں؟ قسم قسم کے رسیلے پھل؟ مزے مزے کے کھانے؟ رنگ برنگے مہکتے پھول؟ خوب صورت تصویریں؟

ان میں سے ایک چیز بھی نہیں۔ پھر کیا؟
"دنیا کے تمام ملکوں کے لوگ ہمیں خط لکھیں"۔ چھوٹے ننّھے بھولے بچّے اور یہ مانگ۔ کتنی پیاری مانگ! دنیا بھر کے لوگ ہمیں خط لکھیں!"

ان بچّوں نے صرف اپنے ہم مذہب عیسائیوں سے خط نہیں مانگے۔ انھوں نے یہ نہیں کہا کہ گورے رنگ والے ہی خط لکھیں۔ بلکہ سب لکھیں۔ گورے رنگ والے بھی اور کالے اور سرخ و بھورے رنگ کے بھی عیسائی مسلمان، بدھ، ہندو، سکھ غرض ہر مذہب والے۔
کینسر کے موذی مرض میں بھیانک موت کے منھ میں جاتے وقت ان بچّوں کو اس سے سکون ملا کہ سب ہم کو خط لکھیں۔ اور اس خوشی میں یہ دونو بچّے سو گئے ہمیشہ کی نیند سو گئے

ذرا سوچیے اِن بھولے معصوم بچّوں نے کیا بات کہی جب انھوں نے دنیا بھر کے بسنے والوں سے خط مانگے تو بتایا کہ گورے۔ کالے۔ بھورے۔ لال کا فرق عیسائی بدھ، مسلم، ہندو، سکھ کا اختلاف ہے ہوا کرے۔ انسان تو سب ایک ہی ہیں ان سب کا ایک ہی کنبہ ہے۔ ان سب کا ایک دوسرے سے رشتہ ہے۔ محبت کا رشتہ۔ پیار کا ناتا۔ برادری کا تعلق اور جب معصوم پیٹرا اور بھولے بیٹری نے اس طرح پوری انسانیت کو ایک ہار میں پرو دیا تو وہ آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔

آنکھوں سے اوجھل تو ہو گئے مگر دلوں میں گھر کر گئے۔ انسانیت کی شمع جلا گئے۔ لو لگا گئے۔ بلجیم کے لیمپ اور کتنے روشن! پیارے بچّے اور کتنے پیارے!
جب ۲۷ر دسمبر ۱۹۶۷ء کو اخبار میں یہ خبر پڑھی تو میری آنکھیں بند ہوگئیں ایسا معلوم ہوا کہ ہندوستان سے ہزاروں میل دور بلجیم کے اسپتال میں ان بچّوں کی پیشانی کو چوم رہا ہوں۔ خبر پڑھ کر تو یہ حال ہوا۔ آپ میں یا اور کوئی اگر اُن کے منھ سے یہ پیارے بول سنتا تو کیا کیفیت ہوتی!
بھولے بچے جو باتیں کرتے ہیں وہ بھلائی نہیں جاتیں۔ عمر بھر یاد رہتی اور بڑے پیار سے یاد دلائی جاتی ہیں۔ جو بزرگ بچپن میں اپنے بچّوں کے پیار کے نام رکھ دیتے ہیں ان کو وہی نام بھلے لگتے ہیں۔ پھر یہ تو اس سے بھی پیاری بات تھی جس میں بھولا پن تھا۔ پاک بے لوث محبت تھی۔
یہ تو ہم سب کے لیے سبق تھا جو دنیا بھر کے لوگوں کو بتاتا تھا کہ تم سب ایک ہو۔ اس لیے دنیا بھر کے انسانوں کو پیار کرو تو بڑی سے بڑی مصیبت راحت ہوگی سخت سے سخت وقت آسان ہو جائے گا۔ کیا کوئی ایسے بچّوں کو بھول سکتا ہے! کیا یہ بچّے پیارے نہیں تھے!

• بچّوں کی کوششیں کا بقایا۔

سا باط:۔ (پاؤں پر گرکر) حضرت مجھ کو معاف کر دیجیے آہ ..... میں نے کتنے گناہ کیے ہیں۔ میں نے رات کو آپ کے ٹھوکر ماری کاش ..... میں آپ کو اسی وقت پہچان لیتا آہ .... (روتا ہے) (حضرت جنید بغدادیؒ محبت سے اس کا سر اٹھاتے اور کہتے ہیں)

حضرتؒ:۔ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگو۔ وہی سارے جہان کا مالک ہے۔ حضرتؒ اس کو سمجھاتے ہیں پھر تھوڑی دیر میں ساباط گناہوں سے پاک صاف ہو کر جاتا ہے۔

جادو کے تھیلے

محمد حسین حسّان

(روس کی ایک لوک کہانی کا آزاد ترجمہ)

روس کے ایک گاؤں میں ایک کسان اور اس کی بیوی رہتی تھی۔ بیوی بڑی لڑاکا تھی۔ شوہر ذرا بھی کوئی بات اس کی مرضی کے خلاف کہتا۔ فوراً بھڑک اٹھتی جھاڑو کے ڈنڈے سے اتنا مارتی اتنا مارتی کہ بے چارے کو بھاگتے ہی بن پڑتی۔ آنگن میں جلانے کی لکڑیوں کے ڈھیر میں پناہ لیتا اور ٹھنڈی راتوں میں کھلے میدان میں بسیرا کرتا۔

دن کے وقت جنگل میں چلا جاتا۔ جال سے پرندوں کا شکار کرتا۔ شام کو یہ شکار پکانے کے لیے اپنی بیوی کے حوالے کر دیتا۔

اتفاق کی بات، ایک دن ایک کُلنگ جال میں پھنس گیا۔ کسان بہت ہی خوش ہوا۔ کہنے لگا ا! بھئی آج تو مزے ہیں، اس پرندے کا خوب بھنا ہوا گوشت کھایا جائے گا۔ اسے کھا کر تو میری بیوی بھی خوش ہو جائے گی، خوب ہنسے بولے گی۔

یہ سن کر کُلنگ بولا "خدا کے لیے مجھے نہ مارو۔

اگر تم نے میری جان بخش دی تو کل میں اسی جگہ تمھیں ایک تحفہ دوں گا۔ ایسا تحفہ کہ کبھی تم بھوکے نہ رہو گے۔"

کسان نے کلنگ کو باتیں کرتے دیکھا تو بھونچکا سا ہو گیا۔ فوراً اسے آزاد کر دیا۔ گھر پہنچا تو یہ دلچسپ واقعہ بیوی کو سنایا، مگر بیوی نے جھاڑو کے ڈنڈے سے بیچارے کی ایسی مرمت کی کہ اسے لکڑیوں کے ڈھیر میں پناہ لینے میں خیریت نظر آئی۔

دوسرے دن صبح کے وقت وہ اسی جگہ پہنچا جہاں کل اس نے کلنگ کو جال سے آزاد کیا تھا۔

جادو کا تھیلا

اے لیجیے کلنگ صاحب تو پہلے سے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کی چونچ میں کرمچ کا تھیلا تھا۔ کسان سے بولے "کل تم نے مجھے زندہ سلامت چھوڑ دیا آج میں یہ تھیلا دیتا ہوں۔ دیکھو یہ کیا کرشمہ دکھاتا ہے۔

یہ کہہ کر کلنگ نے تھیلا زمین پر ڈال دیا۔ اور بولا "دونوں تھیلے سے باہر" اچانک جیسے بجلی کوند جاتی ہے۔ دو نوں جوان تھیلے سے باہر کودے میز کرسی باہر نکالی۔ مزے مزے کے کھانے نکالے انھیں میز پر چن دیا۔ کیسی مزے دار دعوت تھی۔ کسان جی بھر کے کھا پی چکا تو کلنگ نے پھر آواز لگائی۔ "دونوں تھیلے کے اندر" اور پلک جھپکتے میں میز کرسی وغیرہ سب نظروں سے اوجھل۔

کلنگ کسان سے بولا "اس تھیلے کو گھر لے جاؤ کیا عجب اس کی بدولت تمھاری بیوی خوش و خرم رہے۔"

کسان نے کلنگ کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور تھیلا لے کر گھر کی طرف چل دیا۔ مگر راستے میں اسے منہ بولی ماں سے ملنے کا خیال آیا۔ جی چاہا اسے بھی یہ تھیلا دکھائے۔ یہ عورت [illegible] اور بدذات تھی مگر بہت کینہ خصلت تھی۔ کسان پر کوئی مصیبت پڑی ہے کسی پریشانی میں پھنس گیا ہے تو اس نے کبھی اس کی مدد نہیں کی اسے منہ نہیں لگایا۔

کسان اس تھیلے کو بغل میں دبائے اپنی منہ بولی ماں کے شان دار گھر میں پہنچا اور اس سے کچھ کھانے کو مانگا منہ بولی ماں نے تیوری چڑھا کر بڑے جی سے ایک جلی ہوئی کالی روٹی اور پانی کا ایک گلاس سامنے رکھ دیا۔

کسان میاں نے منہ بنایا اور ذرا اونچی آواز سے بولے "یہ تو بہت گھٹیا کھانا ہے۔ اچھا اب آپ مجھے اجازت دیجیے۔ دیکھیے میں کیسا کھانا آپ کو کھلاتا ہوں۔"

کسان نے اپنا تھیلا نیچے زمین پر ڈالا اور چلایا "دونوں تھیلے سے باہر۔" اور بس دیکھتے دیکھتے منہ بولی ماں اس کی بیٹی اور کسان دعوت کی ایک شان دار میز پر بیٹھے تھے۔ بڑھیا اور اس کی بیٹی نے ایسی دعوت کبھی کاہے کو کھائی ہوگی۔

اب تو بڑی بی کا رویہ بالکل بدل گیا۔ اپنی بیٹی سے بولیں "بیٹی جاؤ جلدی اپنے مہمان کے نہانے کے لیے پانی گرم کرو۔"

پھر ہوا کیا۔ ادھر کسان میاں غسل خانے میں گئے ادھر بڑی بی کی ان کی بیٹی کی اور دوسرے گھر والوں کی نیت بدلی، جادو والا تھیلا اپنے قبضے میں کیا اور اسی جیسا کرمچ کا ایک اور تھیلا جادو والے تھیلے کی جگہ رکھ دیا۔

کسان نے گھر پہنچتے ہی اپنی بیوی کو خوش خبری سنائی کہ ہماری قسمت اچانک کیسے پلٹ گئی اور پھر تھیلا فرش پر ڈال، زور سے چلایا "دونوں تھیلے سے باہر" مگر ـــــ مگر تھیلے میں سے تو کوئی بھی نہ نکلا۔ کسان نے بار بار آواز لگائی مگر [illegible]

تھیلے میں سے دونوں نہیں نکلے۔

کسان کی بیوی چڑھ گئی چیخ کر بولی "ایسا لگتا ہے شراب کے نشے میں دھت ہے" اور پھر غصّے میں آکر وہی جھاڑو اٹھائی۔ میاں کی خوب مرمت کی آخر کسان میاں کو لکڑیوں کے ڈھیر میں پناہ لینا پڑی۔

دوسرے دن کُلنگ ایک دوسرا تھیلا لیے کسان کے انتظار میں کھڑا تھا۔ کسان کو دیکھتے ہی بولا "یہ تھیلا بھی تمھارے لیے اتنا ہی مفید ہوگا جتنا پہلا تھیلا"

یہ کہا اور ایک طرف کو اڑ گیا۔ کسان میاں کو کہاں تاب تھی فوراً چلائے "دونوں تھیلے سے باہر"

اور ان کے یہ کہتے ہی دو مسٹنڈے ہاتھ میں لمبے لمبے ڈنڈے لیے تھیلے میں سے کود کر باہر نکلے اور انھیں بڑی طرح پیٹنا شروع کیا۔ مگر کسان نے اپنے حواس نہیں کھوئے جلدی سے بولا "دونوں تھیلے کے اندر" اور دونوں تھیلے کے اندر چلے گئے۔

کسان نے اپنے جی میں کہا۔ کیوں نہ اپنی ماں کو موقع دیا جائے کہ وہ اس تھیلے کو بھی چرا لے۔ تھیلے کے جوانوں سے پٹنے کے بعد اب وہ اپنے آپے میں آگیا تھا

ظاہر ہے منھ بولی ماں نے اس مرتبہ اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور بولی "تمھارے لیے غسل خانے میں گرم پانی تیار ہے جاؤ نہا لو" اور جونہی کسان غسل خانے میں گیا۔ بڑی بی نے تھیلا بڑے اطمینان سے فرش پر رکھا اور بولیں "دونوں تھیلے سے باہر"

اور جناب وہ دونوں پلک جھپکتے میں تھیلے سے باہر آگئے۔ موٹے موٹے لمبے لمبے ڈنڈے ہاتھوں لیے دونوں نے بڑھیا اور اس کی ماں کو بے تحاشا پیٹنا شروع کیا۔ پیٹتے جاتے اور کہتے جاتے اس کا تھیلا

جناب ساحر بھوپالی

قوّالی

بھلا ہو سب کا تمنا ہے بس یہی اپنی
ہر ایک خوش ہو، اسی میں ہے اب خوشی اپنی
نہیں اب اس کے سوا آرزو کوئی اپنی
کہ دشمنوں سے بھی ہو جائے دوستی اپنی

نہ قول ہاریں گے جب تک ہے دم میں دم اے دوست
نہیں ہمارے لیے فخر یہ بھی کم اے دوست
فدائے قوم، نثارِ وطن ہیں ہم اے دوست
نہ موت اپنی ہے اب تو نہ زندگی اپنی

بڑے سلیقے سے ہم دوستی نبھائیں گے
نہ خود لڑیں گے نہ اوروں کو اب لڑائیں گے
ہم ایکتا کے لیے دُکھ پہ دُکھ اٹھائیں گے
مگر جہاں میں نہ اڑوائیں گے ہنسی اپنی
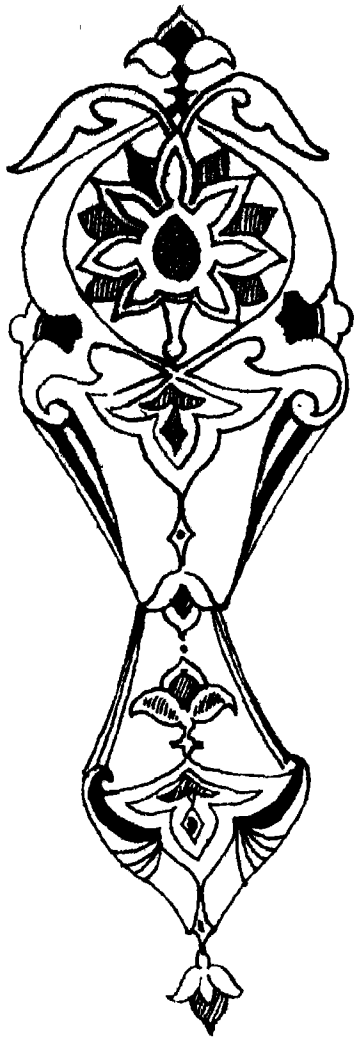
دلوں میں پیدا کرو جذبۂ فدا کاری
اسی کے دم سے ہے انساں کی ہر ادا پیاری
خدا کے واسطے چھوڑو نہ خوئے دلداری
وگرنہ زندگی کھو دے گی دلکشی اپنی

جو ہم سے روٹھیں گے ہم پھر انھیں منائیں گے
یہ عہد ہے نہ کسی کو کبھی ستائیں گے
جہاں کو روشنی بخشیں گے دل جلائیں گے
مثال شمع گزاریں گے زندگی اپنی

اگر ہو دشمنوں کے نرغے میں وطن اپنا
تو سر سے باندھ کے نکلیں گے ہم کفن اپنا
اجاڑ سکتا نہیں کوئی اب چمن اپنا
ہر ایک پھول ہے اپنا ہر اک کلی اپنی

ہے میرے نغموں سے ساحرؔ ہر ایک دل سرشار
بڑے بھی شیدا ہیں بچوں کو بھی ہے ان سے پیار
سدا بہار ہیں تاثیر میں مرے اشعار
کبھی یہ پھول نہ کھوئیں گے تازگی اپنی

جناب غلام حیدر

پیسہ

(مسلسل)

اب ذرا غور کیجیے اسی سواری میں دولت (اناج) بھری ہے۔ اسی میں دو ایک آدمی بھی اپنا مزے سے بیٹھے ہیں اور جناب واپسی میں اسی میں خریدا ہوا سامان رکھا ہے۔ کتنی سہولت ہو گئی !!

دولت کی شکل میں اناج شاید سب سے زیادہ دن استعمال ہوا۔ بعض بعض جگہ تو آج بھی استعمال ہوتا ہے۔ کہیں کہیں بہت چھوٹے گاؤوں میں تو لوگ آج بھی چیزیں اناج کے بدلے میں لیتے دیتے ہیں۔ تو لو بھائی! تمھیں میرے ایک اور بزرگ اناج صاحب۔ نظر آ گئے۔

سونا چاندی تانبا

اچھا بھائی چلو آگے چلیں۔ اب ہم ایک نئے زمانہ میں آتے ہیں۔ اب انسان کے کام بدل گئے ہیں۔ کام کرنے کے اوزار بدل گئے ہیں۔ رہن سہن بدل گیا ہے، غرض سب کچھ بدل چکا ہے۔ جانتے ہو یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ صرف ایک نئی چیز کی دریافت کی بدولت اور وہ تھی دھات! جی ہاں یہی دھات؟ تانبا، چاندی سونا، پیتل وغیرہ۔ یہ دھات کانوں سے کھود کر نکالی جاتی ہے۔ اب اس نے دھات کو پہلے کوٹ کوٹ کر اور پھر بعد میں اس کو پگھلا کر اس سے سامان بنانا سیکھ لیا۔

اس سے اس کو کتنا فائدہ پہنچا؟ تم نہیں سمجھ سکتے۔ اس لیے کہ تم نے دھات کے استعمال کو پہلے سے دیکھا ہے۔ اگر تم اسے استعمال نہ کرتے ہوتے اور تمھیں کوئی بتاتا تو تمھیں اندازہ ہوتا۔ بس یہ سمجھ لو کہ انسان کی دنیا ہی بدل گئی۔ اوزاروں ہتھیاروں میں پتھر کے بجائے دھات کے پھلکے لگنے لگے، گھر میں مٹی کے برتنوں کی جگہ دھات کے برتن آ گئے۔

سچ پوچھو تو بس ایک دھات کے مل جانے سے انسان نے ترقی بھی بہت کی۔ اب اس کو نئے تیز اوزار مل گئے تھے۔ سوچو چڑا سینے کی کرنی، کپڑا سینے کے لیے موٹی ہی سہی مگر سوئی بن سکتی تھی اور نا جانے کیا کیا کچھ ——— بس اب ہماری دنیا تیزی سے دوڑنے لگی۔

اب ممکن ہے تم سوال کر بیٹھو کہ دھات سب سے پہلے کب اور کہاں ملی، اور کون سی دھات سب سے پہلے ملی؟ تو کہاں کا جواب تو یہ ہے کہ جتنی بھی پرانی تہذیبوں کا دنیا والوں کو پتہ چل سکا ہے، یا جن کی تاریخ معلوم ہو سکی ہے۔ وہاں کوئی نہ کوئی دھات

ضرور ملی ہے۔ جیسے مصر، سیریا (شام)، بابل وغیرہ کے
شہروں میں اور اس کے بعد اٹلی اور چین وغیرہ کی پرانی
آبادیوں میں جو آج سے لگ بھگ چھ ہزار سال پہلے آباد
تھیں۔ ہندوستان میں بھی سندھ اور پنجاب کے علاقوں
میں اب سے تقریباً چار یا پانچ ہزار برس پہلے تہذیب نے
بہت ترقی کر لی تھی۔ ان جگہوں پر بھی دھاتیں استعمال
ہوتی تھیں۔

اور جہاں تک اِس کا سوال ہے کہ کون سی
دھات سب سے پہلے انسان نے استعمال کی، تو بھائی،
پتہ تو یہی چلتا ہے کہ شاید تانبا وہ دھات ہے جو سب
سے پہلے انسان کے استعمال میں آئی۔ ویسے جب
ایک دھات مل گئی ہوگی اور انسان نے اسے استعمال
میں لانا شروع کر دیا ہوگا تو دوسری دھاتوں کے
استعمال میں بھی زیادہ وقت نہ لگا ہوگا۔

بہرحال یہ بات تمہیں ضرور اچنبھے کی معلوم
ہوگی کہ شاید وہ دھات جو آج کل سب سے زیادہ انسان
کے کام میں آتی ہے۔ یعنی لوہا۔ وہی سب سے بعد میں
معلوم ہوئی۔ تم شکایت کروگے کہ میں اپنی کہانی سنانے
کے بجائے دھاتوں اور پتھروں کی کہانی سنانے بیٹھ گیا۔
نہیں یہ بات نہیں ہے۔ اصل میں دھات کی معلومات
نے انسان پہ اتنا گہرا اثر ڈالا کہ خود وہ چیزیں جو انسان کے
ساتھ رہتی تھیں وہ تک بدل گئیں۔

اور بھئی سچی بات یہ ہے کہ دھات ہی ایک ایسی
چیز تھی کہ جس نے میری صورت ہی بالکل بدل کر رکھ دی
اور میری وہی صورت آج تک تقریباً ویسی ہی چل رہی
ہے اور بھائی میں تو کسی کا احسان بھولتا نہیں دھات
سے زیادہ میرے اوپر کسی کا احسان نہیں ہے
میں اگر اُس کا حال نہ بیان کروں تو کس کا حال بیان کروں

اچھا بس اپنی کہانی آگے سنانے سے پہلے
تھوڑا سا دھاتوں کے بارے میں تمہیں اور بتاتا چلوں، وہ
دو دھاتیں اس وجہ سے بھی میرے لیے زیادہ اہم ہیں کہ
میری زندگی میں وہی شاید سب سے زیادہ کام آئی ہیں
اور تمہارے لیے اس وجہ سے خاص ہیں کہ عام طور پر انسان
انہی کو سب سے زیادہ قیمتی سمجھتے ہیں۔

انسان کی ساری باتیں تو میری سمجھ میں آتی ہیں
مگر جو بات سمجھ میں نہیں آتی وہ یہ ہے کہ وہ سب سے زیادہ
قیمتی دھات سونے کو کیوں سمجھتا ہے سونے کا استعمال بلکہ
یوں کہو کہ سونے کا فائدہ اور دھاتوں کے مقابلہ میں انسان
کو سب سے کم ہے۔

تم خود دیکھ لو، لوہا تمہارے کتنے کام آتا ہے۔
ریل گاڑیاں، موٹریں، بڑی بڑی مشینیں، سب لوہے سے
بنتی ہیں۔ باورچی خانے میں چمٹا، توا، پھکنی سب لوہے کا ہوتا
ہے۔ ایسے ہی تانبا لو، گھر کی پتیلیاں تک تو تانبے کی ہیں۔

مگر انسان کا یہ عجیب دستور ہے کہ لوہا تو کوڑیوں
کے مول بکے اور سونا۔ جو مشین بنانے کے کام آئے نہ برتن
بنانے کے نہ اُس کی کیل ٹھوکی جا سکے۔ نہ ریل کی پٹری بن
سکے۔ پھر بھی انسان اُسے ہی سب سے زیادہ عزیز
رکھتا ہے۔ اُس کے زیور بنا کر عورتیں گلے میں پہنتی ہیں،
اُس کے ورق کوٹ کوٹ اچھے کھانوں پر لگائے جاتے
ہیں۔ ایک زمانہ میں اس کے دانت بنائے جاتے تھے
یا اب اچھے قلموں کی نبیں بنائی جاتی ہیں۔ لیکن عزیز اسے
سب ہی رکھتے ہیں۔

خیر بھائی انسانوں کی باتیں تو انسان ہی جانیں
مجھے کیا۔؟ مگر ایک بات ضرور سچی کہوں گا کہ سونے

ہیں خاص طور پر کچھ ایسی خصوصیات ہیں جو کسی اور دھات
میں نہیں اور شاید یہی خصوصیات دنیا کے انسانوں کو
بھا گئیں۔

اب دیکھو، پہلی بات تو یہی ہے کہ سونا بہت
چمک دار اور خوبصورت ہوتا ہے، دیکھتے ہی دل کو بھاتا
ہے۔ اور پھر اس سے زیادہ اچھی بات یہ کہ گھستا بہت کم
ہے۔ سالہا سال تک اس کا زیور پہنے رہئے کیا مجال ہو
اس کے رنگ روپ یا اس کے وزن میں فرق آئے۔
اس کے مقابلے میں لوہا اور تانبا سب ہی بہت جلدی
گھس جاتے ہیں۔

ایک طرف تو سونے میں یہ سختی ہے کہ گھسنا
جانتا ہی نہیں اور دوسری طرف وہ نرمی وہ لچک کہ دھات
تو دھات شاید دنیا کی کسی اور چیز میں بھی نہ ہو۔ اس کو
جس طرح چاہیے موڑیے۔ جتنا باریک چاہیے بنائیے۔
زیور بنانے میں کتنی باریک پھول پتیوں کی
ضرورت پڑتی ہے۔ اور یہ اتنا نرم مزاج ہے کہ سب بخوشی
سہہ لیتا ہے اور شاید باریک ہونے میں تو اس کا جواب
ہی نہ مل سکے۔ سونے کا ورق بھی چاندی کے ورق جیسا
ہوتا ہے۔ سونے کے ورق کی باریکی کی حد یہ ہے کہ اگر
باریک باریک ایک لاکھ پچاس ہزار ورقوں کو اوپر نیچے
رکھ دو تو وہ صرف ایک انچ موٹائی میں آجائیں گے۔

ایک اور عجیب بات بتاؤں اس کے متعلق
اس پر موسم کی گرمی، خشکی، تری کچھ اثر نہیں کرتی۔ حد
ہے کہ کوئی تیزاب اسے گھلا نہیں سکتا۔ ذرا لوہے یا
تانبے کو ایک سال پانی میں ڈالے رکھو، دیکھو زنگ بن
کر گھل جائے گا ـــــ مگر سونے پر صدیوں میں پڑے
رہنے کے بعد بھی اثر نہیں ہوتا۔

اور پھر سب سے آخر میں یہ کہ اتنی آسانی
سے نہیں ملتا جتنی آسانی سے اور دھاتیں مل جاتی ہیں۔
اور انسان کو تو بس وہی چیز پسند آتی ہے جو کمیاب ہو۔

رہا چاندی کا سوال تو ویسے تو یہ ساری
ہی باتیں اس میں بھی موجود ہیں۔ بس صرف دو معاملوں
میں یہ سونے سے کچھ کم ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ سونا
چاندی سے بازی لے گیا ہے۔ ایک تو چاندی بہت سے
تیزابوں میں گھل جاتی ہے۔ اور دوسرے وہ اتنی کمیاب نہیں
جتنا سونا ہے۔

مگر یہ نہ سمجھ لینا کہ چاندی ہمیشہ اور ہر جگہ
سونے سے نیچی رہی ہے۔ نہیں بلکہ بعض بعض جگہ چاندی
کو سونے سے زیادہ قیمتی سمجھا گیا ہے۔ کچھ تو ایسی جگہوں پر
جہاں پیلے یا سنہرے رنگ کو کسی وجہ سے اچھا نہیں سمجھا
گیا اور بعض ان جگہوں پر جہاں سونے کے مقابلے میں
چاندی بہت کم تھی وہاں سونا سستا اور چاندی مہنگی
بکتی تھی۔ جیسے مصر کی بہت پرانی تاریخ سے پتہ
چلتا ہے کہ ایک عرصہ تک چاندی سونے سے مہنگی رہی
ہے اور پرانے پن میں بھی یہ دھاتیں کسی سے کم
نہیں۔ خیال یہی ہے کہ یہ بھی لگ بھگ اسی وقت سے
انسان کے ساتھ ہیں جب سے تانبا ہے۔

(باقی آئندہ)

جناب خالد رحیم

ببلو
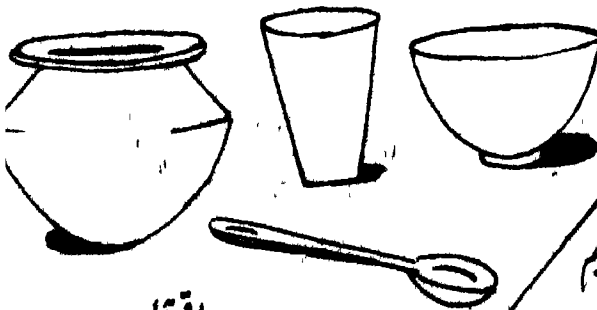
(اپنے ننھے منے بھتیجے کے نام)

بھولی بھالی صورت ہے — پیاری پیاری مورت ہے
سب کے دل کو بھائے — سب کی گود میں آ جائے

ببلو بیٹا پیارا ہے
سب کی آنکھ کا تارا ہے

بھی نہ سمجھے اپنا غیر — دل میں نہیں ہے اسکے بیر
ب سے ہنس کر ملتا ہے — مل کر سب سے کھلتا ہے
ٹھی میٹھی باتوں سے — پیاری پیاری گھاتوں سے
ل کو موہ لیتا ہے وہ — ہر دم یہ کہتا ہے وہ
فتر سے جب گھر آنا — چاچا اتا[1] لے آنا

ہر ڈھنگ اس کا نیارا ہے
ببلو بیٹا پیارا ہے
سب کی آنکھ کا تارا ہے

ن ایسا آئے گا — جب وہ مکتب جائے گا!
م و ادب کی منزل پر — چمکے گا اختر بن کر
ب سے اوّل آئے گا — سب کے من کو بھائے گا
ش ہوں گے استاد سبھی — دیں گے دعائے شاد سبھی
ب تک چاند اور تارے ہیں — رنگ و بو کے دھارے ہیں
رج جب تک چمکے گا — ببلو تب تک چمکے گا!

جب تک یہ نظارہ ہے
ببلو بیٹا پیارا ہے
سب کی آنکھ کا تارا ہے

ہے اس کی اک بہنا بھی — چھوٹی سی ہے گڑیا بھی
نام شگوفہ ہے جس کا — چاند سا مکھڑا ہے جس کا
بھائی بہن میں یوں ہے پیار — کرتے نہیں ہیں وہ تکرار
کھیلتے ہیں دونوں یکجا — خوب کھلونا ہے ان کا
میرا چھوٹا سا آنگن — ان کے دم سے ہے روشن
ان دونوں کی الفت سے — ان دونوں کی قربت سے

میرا جگ اجیارا ہے
ببلو بیٹا پیارا ہے
سب کی آنکھ کا تارا ہے

[1] انار کو وہ اتا کہتا ہے

جناب خالد عرفان

(انگریزی سے اپنایا گیا)

مامتا

رات دم توڑ رہی تھی۔ افق پر اُجالے کی ہلکی سی کرن دوڑتی نظر آ رہی تھی۔ چاروں طرف خاموشی کا دور دورہ تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں نے فضا میں تازگی پیدا کر دی تھی۔ وہ دبے پاؤں دھیرے دھیرے قدم اٹھائے پچھلی پہر کے اس دھندلکے میں آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ کبھی کبھار وہ ایک لمحے کے لیے رک جاتی اور ایک شانِ دلربائی سے اپنی گردن کو دو چار جھکولے دے کر ادھر اُدھر نظر دوڑا لیتی۔ شاید وہ اطمینان کر لینا چاہتی تھی کہ کہیں کوئی اُس کے خلاف سازش تو نہیں کر رہا ہے یا شاید اس کو ایک ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں دن کا بقیہ حصہ تنہا آرام و اطمینان سے گذارا جا سکے۔

راستہ جانا پہچانا تھا۔ اس کو احساس تھا کہ آبادی سے بہت دور ان پہاڑیوں سے پرے بانس کے جنگل میں راستے سے ہٹ کر جھاڑیوں کے درمیان اس کے ننھے ننھے بچے آرام سے لیٹے خراٹے لے رہے ہیں۔ اپنے ساتھیوں کی طرح وہ ان کی خبر کبھی کبھار ہی لیا کرتی تھی۔ وہ جب کبھی اپنے جگر کے ٹکڑوں سے ملنے جایا کرتی اس کا سر فرطِ مسرت سے اونچا ہو جاتا، اس کی گردن فخر سے تن جاتی، وہ ایک عجیب شان سے اپنے خوبصورت لیکن ظالم سر کو ہلکے سے جنبش دے لیا کرتی۔ اسی لمحہ چاند اپنے پورے جوبن پر ہوتا اور سارے جنگل پر ایک مقدس سا نور چھا جاتا۔ اس کی جھپکتی ہوئی آنکھیں اور ہلتے ہوئے کان اتنے تیز تھے کہ غیر مرئی[1] اشیا کا احساس بہت جلد ہو جاتا۔ لیکن اس لمحہ اس کی قوتِ شامہ[2] ساتھ نہیں دے رہی تھی نہ اُسے اس بات کا احساس تھا کہ اس کے گھر پہ کتنا بڑا حادثہ گذر چکا ہے۔ اس نے ابھی ابھی ایک موٹے تازے ہرن کے گرم گرم گوشت سے اپنی بھوک مٹائی تھی۔ بقیہ گوشت اس نے ایک اونچے خاردار درخت کی ٹہنی پر لٹکا دیا تھا۔ وہ مطمئن تھی کہ راہ چلتی ہوئی

[1] نظر نہ آنے والی چیز [2] سونگھنے کی قوت۔

بھیڑیا اس کو نہیں اڑائے گا اور نہ چیلوں کی تیز
نظر اس پر پڑے گی۔ البتہ کوئی جنگلی بلی ایک آدھ لوتھڑا غایب
کر دے تو کر دے۔ ویسے اس کے لیے اب دو دن تک
مزید شکار کی ضرورت نہیں تھی۔ ہرن اس قدر موٹا تازہ اور مزیدار
تھا کہ رہ رہ کر اس کے منھ میں پانی چھوٹ رہا تھا۔ اور ہونٹوں پر
ابھی تک تازہ اور گرم گرم خون لگا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

* * *

ان جنگلوں میں چیتے بکثرت پائے جاتے تھے۔ انھیں
غذا کے لیے دور جنگلوں کی خاک چھاننے کی ضرورت نہیں تھی
اس لیے کہ قریب کے گاؤں میں مویشی بکثرت تھے اور ان کا
شکار بآسانی رات میں کیا جا سکتا تھا۔ آمد و رفت کے لیے بھی
کسی طرح کی رکاوٹ نہیں ہوتی تھی ان کسی بنائی پگڈنڈیاں موجود
تھیں۔ وہ گاؤں سے قریب چراگاہوں میں گھاس اور
جھاڑیوں کے درمیان چھپ جاتے اور کوئی موٹی تازی بکری
صاف کر دیتے۔ جب چراگاہوں کو صاف کر دیا جاتا تو قریب
کے میدانوں میں جلد ہی گھاس اُگ آتی اور ہرنوں کے غول جن
میں کبھی کبھار چیتل بھی ہوتے اِس مرغزار میں بھاگ آتے اور
چیتے جو صرف نو انچ لمبی گھاس میں بآسانی چھپ سکتے تھے ہمیشہ
عید منایا کرتے۔

* * *

وہ بغیر خوف بنا جھجک کے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ اس
کے پاؤں کے نچلے نرم نرم گدے اتنے حساس تھے کہ وہ سوکھے
پتوں کے بجائے پگڈنڈی پر چل رہی تھی۔ ندی کی طرف جاتے
ہوئے دھندلکے میں وہ دبلی پتلی خوبصورت کمر والی حسینہ معلوم
ہو رہی تھی۔ یہ پگڈنڈی آبادی سے شروع ہو کر ہرے بھرے
میدانوں، چراگاہوں اور ہمالیہ کی ترائی کے گھنے جنگلوں سے
ہوتے ہوئے راہ میں حایل ندی تک آ کر رک
جاتی تھی۔ ندی کو پار کرنے کے لیے رسی کا ایک پل بنایا گیا تھا
شبنم میں ڈوبے ہوئے اس طرح کے کئی پل راہ داری کے لیے
اس علاقے میں استعمال کیے جاتے تھے۔ گو وہ ایک اچھی تیراک
تھی اور بآسانی اس ندی کو پار کر سکتی تھی لیکن اکثر تیرنے کے
بجائے وہ پل پار کر کے ندی کی دوسری طرف جایا کرتی تھی۔ اس
کو اچھی طرح معلوم تھا کہ مٹی سے لت پت یہ بھورا پل خاصا مضبوط
اور محفوظ ہے۔ وہ دوسری طرف ایک چٹان پر کود گئی۔

اور ـــــ ارے یہ کیا۔ بانس کے پتوں پر خون!
وہ ٹھٹھک کر رہ گئی ـــ ابھی سونگھ ہی پائی تھی کہ اس کے جسم میں بجلی
سی دوڑ گئی۔ دوسرے ہی لمحہ وہ تیر کی طرح پہاڑیوں اور خار دار جھاڑیوں
کو پھلانگتے ہوئے اپنی رہایش گاہ تک پہنچ گئی۔ سوکھے پتے ہر
طرف بکھرے پڑے تھے اور اس کے ننھے غایب تھے۔ وہ بے
چینی سے اِدھر اُدھر انھیں دیوانہ وار تلاش کرنے لگی "ـــ ارے
یہ کیا، نہیں، اوہ، ہاں یہ تو اپنا ہی بچہ ہے "ـــ وہ غراتی
ہوئی اس کی طرف دوڑی اور اپنے مامتا بھرے سر کو اس پر جھکا
دیا۔ ننھا سا بچہ جس کی چھوٹی سی دم بڑی بھلی لگ رہی تھی۔ زرد بال
اور اس پر کالے کالے نقش و نگار خون سے لت پت دھندلے پڑ گئے
تھے۔ ابھی وہ اس کو دیکھ رہی تھی کہ چند قدم پر ایک اور دکھائی دیا۔
پھر ایک اور سب کے سب بے حس، ان کے بستر بکھرے ہوئے۔
اس نے ان سبھوں کو اکٹھا کیا اور پھر جب اپنی مامتا بھری زبان
سے چاٹنا چاہا تو ٹھٹھک کر رہ گئی "یہ کیا ـــ یہ ٹھنڈا اور گیلا جسم،
کیوں؟ وہ گرمی کہاں گئی؟ وہ دوڑتا ہوا خون کیوں رک گیا؟" ـــ
وہ جانتی تھی کہ یہ سب کیا ہے، اس نے خود ہر دن اپنے ارد گرد موت
دیکھی تھی۔ اس نے جلد ہی محسوس کیا کہ حقیقت کیا ہے؟ وہ سمجھ گئی،
اس کا دل بیٹھ گیا، وہ ایک دم رنجیدہ ہو گئی رنج و غم کے احساس
نے اس کو نڈھال کر دیا۔ ساتھ ہی سارے جسم میں غصہ کی لہریں
دوڑنے لگیں۔ وہ کانپ گئی۔ فوراً ہی درندگی اور وحشت

لوٹ آئی۔ وہ سب چالیں اور چالاکیاں جو وہ خود شکار کے لیے استعمال کیا کرتی تھی اس کی نظروں کے سامنے پھرنے لگیں۔ اسی کے ساتھ جنگلی ماتا کے جذبہ نے اس کو دیوانہ سا کر دیا۔

اس نے فوراً محسوس کیا کہ یہ ننھا بھی مرگیا، دوسرا بھی اور تیسرا بھی۔ لیکن وہ کہاں ہے؟ وہی جس کا رنگ ان سب سے مختلف تھا۔ وہی اس کا پیارا شریر سا چیتا بیٹا، وہی جس کی سبز وردی پر سیاہ مخملیں دھبے تھے جنھیں وہ اپنی زبان سے ہر لمحہ صاف کیا کرتی تھی تاکہ اس کے ننھے کی وردی خوب نکھری ہوئی اور چمک دار رہے! ——— ہاں وہ تو نہیں دکھائی دیتا۔ ضرور یہیں کہیں ہوگا۔ اس نے اپنی ماند کے کئی چکر لگائے۔ قریب کی ساری جھاڑیاں چھان ماریں، سارے غار کھنگال ڈالے لیکن کہیں پتہ نہ تھا۔ ہوا جو ان لمحوں میں کئی جنگلی جانوروں کی مدد کیا کرتی، اس کے لیے کچھ نہ کر سکی۔ آخر تھک ہار کر وہ پل کی طرف چلی جہاں اس نے خون کے دھبے دیکھے تھے۔

رات کا دھندلکا چھٹ چکا تھا۔ مشرق کی طرف مطلع صاف نظر آ رہا تھا۔ دن کی آوازیں شروع ہو رہی تھیں۔ دور کسی بڑ کے پیڑ کی اونچی شاخ سے جنگلی مرغ کی ککڑوں کوں سنائی دے رہی تھی۔ ہوا میں خنکی کے بجائے ہلکی سی لطیف گرمی پائی جا رہی تھی جس سے شبنم ختم ہو سکتی تھی۔ پتوں پر خون پرانا ہو چلا تھا اور ان سرخ دھبوں پر بھی بھورا پن چھا رہا تھا۔ کچے راستہ پر کہیں کہیں ایک آدھ کتے اور پا پیادہ آدمی کے پاؤں کے نشان صاف دکھائی دے رہے تھے۔ وہ سب کچھ سمجھ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ آدمیوں کو کہاں ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ اس نے ایک ہی پل میں پل پار کر لیا اور خاردار جھاڑیوں اور گھاس کے جھنڈوں کو پھلانگتی ہوئی آبادی کی طرف دوڑنے لگی۔ عادت کے مطابق وہ ہوا کی مخالف سمت بڑھ رہی تھی۔ وہ ہمیشہ شکار کی تلاش بھی اسی اصول پر کیا کرتی تاکہ شکار کو پتہ نہ چلے کہ کوئی اس کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ ویسے شکار میں بو سے کہیں زیادہ آواز اور آنکھوں سے مدد لی جاتی تھی۔ وہ اچانک رک گئی اور بغور سننے لگی ہوا کے اس پار تقریباً دو میل پرے اس کا ننھا اس کو پکار رہا تھا شاید وہ بھوکا تھا ——— وہ یک دم آواز کی طرف تیزی سے دوڑنے لگی اس طرح کہ تیز نظروں والا مور بھی اس کو دیکھ نہ سکا۔ لیکن اس اچانک گڑبڑ سے وہ بوکھلا گیا اور اپنے پر کھولے ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ اسی کے ساتھ مورنیوں کا ایک جھنڈ بھی اڑنے لگا۔ صبح کی بڑھتی روشنی میں اس کے پر ہیروں کے مانند چمک رہے تھے، فوراً ہی ایک جبتیل نے ہانک لگائی۔ وہ جنگل کی ملکہ کو اس طرح بے تحاشہ بھاگتے دیکھ کر گھبرا گیا۔ اس کی آواز کے ساتھ درختوں کی شاخوں پر اونگھتے ہوئے بندر اور لنگور جاگ پڑے اور ادھر سے اُدھر چھلانگیں مارنے لگے۔ اس اودھم اور دھاچوکڑی نے اس کے غصہ کے پارہ کو اور بڑھا دیا۔ وہ رکی۔ ان پر ایک چبھتی ہوئی نگاہ ڈالی پھر دوڑنے لگی۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ سارا جنگل بوکھلا کر اسی کے پیچھے دوڑ رہا ہے۔ وہ اور تیز دوڑنے لگی۔

چراگاہیں شروع ہو گئی تھیں جنگل ختم ہو چلا تھا اور ساتھ ہی سارا شور و غل صبح کی ملگجی روشنی میں آدمیوں کی چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔ ان سرسبز میدانوں میں کہیں کہیں فاصلے پر دیہاتیوں کے محل بنے ہوئے تھے۔ وہ ایک محل کی آڑ میں لیٹ گئی اور سوچنے لگی "جاؤں تو کدھر" اس کے زرد جسم پر کالے کالے دھبے جو بڑے خوش نما معلوم ہو رہے تھے۔ زمین کے خاکی رنگ میں گھل مل سے گئے۔ میدان کے پرے اس نے ایک نظر دوڑائی، پھونس کی چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں کے چھپروں پر اپلے سوکھ رہے تھے۔ لوگ آ جا رہے تھے۔ اس سے تھوڑے فاصلہ پر چند ایک چھوٹے لڑکے اپنی بھینسوں کو ہنکائے جا رہے تھے۔ دو چار کتے راستے میں دھول اڑا رہے

تھے۔ مویشیوں کی گھنٹیوں کی آواز اور عورتوں کی چیخ و پکار میں کبھی
کبھی دور سے اس کے ننھے کی میاؤں میاؤں سنائی دینے لگتی۔ وہ
ضرور اس گاؤں میں موجود تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں کو سکیڑ لیا۔
اجالے کی ایک باریک سی شریر کرن اس کی آنکھوں میں گھس
آئی اور وہ چندھیا سی گئیں۔ پلکیں خود بخود مند گئیں کہ صبح کی بڑھتی
ہوئی روشنی میں اس کو اپنی آنکھیں کھلی رکھنا بہت تکلیف دہ لگ
رہا تھا۔ لیکن وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔ آدھے گھنٹے کے
بعد وہ گاؤں کے بالکل قریب جوار کی خشک باڑ میں چھپ گئی
عورتیں قریب گھاٹ پر اپنے کپڑے دھو رہی تھیں۔ چھوا چھو کی
آواز بڑی بھلی لگ رہی تھی۔ چند ایک اپنے سروں پر
گاگر اٹھائے چلی آرہی تھیں۔ ساتھ ہی وہ اپنے ننھے ننھے بچوں
کو گالیاں دے رہی تھیں اور تھپڑ مار رہی تھیں۔ ابھی تھوڑا ہی
وقت گذرا تھا کہ وہ کھیتوں میں اپنے مرد ساتھیوں کے ساتھ محنت و
مشقت کرنے لگیں۔

* * *

گاؤں کے سارے لوگ پیپل کے درخت تلے جمع
تھے۔ وہ آپس میں صلاح و مشورہ کر رہے تھے کہ اس ننھے سے کالے
بچے کا کیا کیا جائے؟ —— چند ایک کا خیال تھا کہ اس کو
ہلاک کر دیا جائے، انھیں خدشہ تھا کہ ماتا کی ماری ضرور ان
پر حملہ کرے گی۔ لیکن دوسروں کا خیال تھا کہ اس کو پڑوسی ریاست
کے راجہ کے دربار میں پیش کر کے منھ مانگا انعام حاصل کیا جائے
لچھمن سنگھ کے کتے نے ان کا ٹھکانا ڈھونڈ نکالا تھا۔ یہ واقعی
افسوس ناک بات تھی لیکن اس کو چاہیے تھا کہ انھیں تلاش
کرنے کے بعد ختم بھی کر دیتا۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ ان سے
کافی روپیہ بھی حاصل کیا جا سکتا تھا! —— لوگ باتیں کرتے
ہوئے اس کے قریب سے گذر رہے تھے لیکن وہ اس طرح
چھپی ہوئی تھی کہ کسی کو اس کی موجودگی کا احساس نہیں

ہو رہا تھا۔

یکایک جھونپڑی کی چھت سے آہستہ آہستہ ایک
گلہری اتری اور آم کے پیڑ کی جانب بڑھنے لگی۔ ابھی آگے بڑھ ہی
پائی تھی کہ اس کے قدم رک گئے۔ اس سے صرف دو گز کے فاصلے
پر جنگل کی رانی آرام کر رہی تھی۔ ننھی گلہری کی صاف شفاف اور بلوریں
آنکھوں میں اتنا بڑا آم کا درخت اور آسمان دہرا دکھائی دے رہا
تھا۔ وہ چند لمحے آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتی رہی اور پھر فوراً
ہی چلاتے ہوئے قریب کے درخت پر چڑھ گئی اور لگی وہاں سے
پکارنے، داد و فریاد کرنے۔ چیں چیں کی لگاتار گھبراتی ہوئی آواز
نے دو کتوں کو چونکا دیا۔ وہ اپنا سر نیچے کیے دم ہلاتے ہوئے چلا
چلا کر خطرے کی گھنٹی بجا رہی تھی۔ کتے درخت کی طرف بڑھ آئے؟
اور اوہ! —— وہ فوراً رک گئے اور لگاتار بھونکنے لگے۔ ان
کے اس طرح غل مچانے پر ایک آدمی کو غصہ آگیا اور اس نے جھاڑی
کی جانب پتھر کھینچ مارا۔ وہ یکدم اچھل پڑی اور جنگل کی طرف تیزی
سے بھاگنے لگی۔ سارا گاؤں چوکنا ہو گیا۔ ہر طرف ادھم مچ گیا لاٹھیاں
لیے لوگ اس کے پیچھے دوڑنے لگے۔ چند ایک نے پتھر بازی شروع
کر دی۔ لیکن وہ جنگل کی گھنی جھاڑیوں میں پناہ لے چکی تھی اور کس
میں اتنی ہمت تھی کہ اس کے قریب آتا!! —— لوگ دور ہی کھڑے
چلانے لگے۔ وہ ان سب سے بے نیاز اندھیرے کا انتظار
کرنے لگی۔ اس نے دیکھا کہ بڑی تندہی سے خار دار جھاڑیاں کاٹی
جا رہی ہیں اور ان کا ڈھیر لگایا جا رہا ہے! اس کا اندازہ صحیح
نکلا۔ ان جھاڑیوں سے گاؤں کے اطراف باڑ بنائی جانے لگی۔
انھیں یقین تھا کہ وہ ضرور ان پر حملہ کرے گی۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ
گاؤں کے ننھے ننھے بچے اور عورتیں ادھر ادھر سے سوکھی
شاخیں، تنکے اور پتے اکٹھا کر رہے ہیں تاکہ ان سے آگ جلائی
جا سکے۔ پاس ہی اوپلوں کا ایک ڈھیر بھی لگا تھا —— پھر
جلد ہی سورج دیوتا نے دنیا والوں کا یہ رنگ دیکھ کر

منہ موڑ لیا۔ اور دھرتی پر آہستہ آہستہ اندھیرا چھانے لگا۔ لوگ باڑ کے اندر جمع ہو گئے تھے۔ انھوں نے آگ جلالی تھی۔

سورج داتا چھپ گئے اور ان کی جگہ چندرماں نے لے لی۔ ان کی ٹھنڈی ٹھنڈی دودھیالی روشنی میں میدان جگمگا رہا تھا۔ سائے لمبے ہو گئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا وہ بھی چاند کی ٹھنڈی روشنی میں نہائے آرام کر رہے ہیں۔ سارے جنگل پر چاندنی کی وجہ سے عجیب خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ وہ آہستہ سے اپنی پناہ گاہ سے نکلی اور خاموشی کے ساتھ چاروں طرف چکر لگانے لگی۔ اس نے دیکھا کہ خاردار جھاڑیوں سے گاؤں کو محفوظ بنالیا گیا۔ باڑ اتنی سخت اور موٹی تھی اور اتنی مضبوطی سے باندھی گئی تھی کہ اس کو پھلانگنا یا اس میں گھس پڑنا مشکل دکھائی دے رہا تھا۔ دھوئیں کے بادل اس طرح اٹھ رہے تھے کہ بار بار آنکھیں بند ہو جاتی تھیں۔ وہ پھر چکر لگانے لگی۔ اس نے کوشش کی کہ اسے اپنے ننھے کا پتہ معلوم ہو جائے۔ وہ باڑھ سے چھنتی ہوئی روشنی سے اندازہ لگانا چاہتی تھی کہ وہ کہاں آرام کر رہا ہے؟ —— یکایک اس کا ننھا غلط غذا اور بھوک کی وجہ سے چیخنے لگا۔ وہ باڑ کے باہر پنجرہ میں مقید جانور کی طرح چکر لگانے لگی۔ بے قراری کے ساتھ۔ غصّہ میں بھری ہوئی۔ تیز اور تیز۔ یہاں تک کہ بے صبری اور غصّہ نے اس کو جھنجلا دیا۔ لیکن اس کا غصّہ جلد ہی ٹھنڈا پڑ گیا۔ اپنے ننھے کے قریب پہنچنے کی تدبیریں سوچنے کی بجائے غصّہ کرنے سے فایدہ؟! —— وہ آگے بڑھی ایک عزم کے ساتھ۔ اور جلد ہی اس نے جگہ ڈھونڈ نکالی۔ گاڑی کے پہیوں نے راستہ پر اپنے نقش چھوڑے تھے جس کو کاٹ کر باڑھ باندھی گئی تھی اس جگہ ایک چھوٹا سا سوراخ نظر آرہا تھا۔ وہ زمین پر لیٹ گئی اور آہستہ آہستہ سانپ کی طرح آگے رینگنے لگی۔ باڑ کے نیچے اسے ایسا لگا گویا کوئی اس کے بالوں پر تیز دندانوں والا کنگھا کر رہا ہے۔ اس کی ملائم جلد کئی جگہ سے زخمی ہو گئی اور خون بہنے لگا۔ لیکن وہ اس تکلیف سے بے پروا آگے بڑھتی گئی۔ اس چرپر نے ایک کتے کو چوکنا کر دیا۔ وہ بھونکنے لگا۔ ساری گڑبڑ اور بات چیت یکدم ختم ہو گئی۔ سارے ماحول پر سناٹا چھا گیا۔ وہ یکدم جھاڑی میں دبک گئی۔ پھر کسی نے کتے کو ایک موٹی سی گالی دی۔ کتا گالی کھا کر خاموش ہو گیا۔ گالی کس کو بُری نہیں لگتی! —— پھر وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔ اب کے کتے کو خاموش نہ رکھا جا سکا۔ وہ زور زور سے بھونکنے لگا اور پھر دونوں کا سامنا ہو ہی گیا۔ آخر تنگ آکر ایک آدمی نے جلتی ہوئی لکڑی اٹھائی اور یہ دیکھنے کو کہ آخر ماجرا کیا ہے اپنے ساتھیوں سے دور آگیا۔ پھر وہ یکدم چلانے لگا "وہ دیکھو، وہ دیکھو، وہ آہی گئی"۔ سب لوگ چونک اٹھے۔ عجیب افراتفری کا عالم تھا۔ لوگ دور سے کھڑے چلا رہے تھے۔ زمین پر بے تماشہ اپنی لاٹھیاں پیٹ رہے تھے گویا اس کو کچا ہی چبا جائیں گے! لیکن بس چلے تو نا!! وہ پھر مٹی کے تیل کے خالی ٹن بجانے لگے۔ چاہتے تھے کہ یہ بلا اس شور و غل سے تنگ آکر ٹل جائے۔ لیکن وہ بھی جنگل کی ملکہ تھی۔ وہ ان گیدڑ بھبکیوں میں کیوں آنے لگی! اس نے بھی وہیں لیٹے لیٹے ایک زوردار ہانک لگائی۔ گویا کہہ رہی ہو "جانتی ہوں ان گیدڑ بھبکیوں کو، ہے ہمت تو آگے آؤ۔ ورنہ خاموشی سے میرے لختِ جگر کو میرے حوالے کر دو"۔ انھیں ایسا لگا گویا آتش فشاں پھٹ پڑا ہو۔ وہ خود بھی چکرا سی گئی اس کے گرد ہر چیز گردش کرتی معلوم پڑی۔ لیکن اس نے ہمت نہ ہاری اور ایک ہی جست میں باڑ کے اندر کود گئی۔ وہ ٹھان چکی تھی "چاہے جان جائے پر ٹلوں گی اپنا منا لے کر"۔—— جلتی ہوئی آگ سے اس پر خوف طاری ہوا۔ وہ مڑی اور اندھیرے کی طرف بڑھ، چھلانگ لگا ایک آم کے پیڑ کی اونچی شاخ پر دبک کر بیٹھ گئی۔ وہاں سے وہ کیمپ کا نظارہ کر سکتی تھی۔ کیمپ میں خطرے کا احساس تھا تو ضرور لیکن لوگوں میں ایک طرح کی ہمت سی عود کر آئی تھی۔

تمت

جلتی ہوئی آگ کی جھلملاتی روشنی میں کئی سائے اِدھر سے اُدھر بھاگ رہے [illegible] چیخ رہے تھے۔ آپس میں صلاح مشورہ کر رہے تھے۔ کیمپ میں اس طرح گھس آنے پر گھبرا گئے تھے۔ پھر اس نے دیکھا کہ اس کے کالے سے ننھے کو ایک آدمی اپنی جھونپڑی سے لیے آرہا تھا اس خطرہ کو حوالہ کر ہی رہا تھا کہ یکایک ایسا لگا گویا آسمان سے تارہ ٹوٹ پڑا ہو۔ درخت سے ایک ہی جست لگا کر وہ کود پڑی تھی۔ ایک ہی ثانیہ میں ایسا لگا کہ بجلی سی کوند گئی ہو اور اس کا ننھا بچہ ہاتھوں سے چھوٹ کر زمین پر آرہا۔ سلاا گاؤں یکدم چیخ پڑا۔ سارے کیمپ میں بھگدڑ مچ گئی۔ سب اپنی جھونپڑیوں کی طرف دوڑنے لگے۔ وہ آگے بڑھی اور اپنے ننھے کو منہ میں لیے باڑ کی طرف لوٹ پڑی۔ لیکن یہاں سے باہر نکلنا اتنا ہی مشکل تھا جتنا کہ اندر آنا۔ وہ اِدھر اُدھر بے تحاشا دوڑنے لگی کبھی پھلانگنے کی کوشش کرتی۔ کبھی نیچے سے گھس نکلنے کی لیکن ہر جگہ اس کو منہ کی کھانی پڑی۔ انسانی عقل اور محنت کے آگے جنگل کی ملکہ کی ساری پھرتی، تیزی اور غصّہ سرنگوں تھا۔ وہ بے چین تھی!

اس کو اس طرح مڑتے اور باہر جانے کی کوشش کرتے دیکھ کر لوگوں میں ہمت عود کر آئی۔ وہ لاٹھیوں کو لیے ہاتھ میں جلتی ہوئی شعلیں پکڑے، دبے پیئے، احتیاط سے آگے بڑھنے لگے۔ ہر ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہر ایک چاہتا تھا کہ اپنی بہادری کا سکّہ دوسرے پر جما دے۔ اور اس کو ہلاک کرنے کا سہرا اپنے سر رہے!

لیکن اس نے سوچا "کیا میں ہار مان لوں، میں جوان جھبروں والے جانوروں کے موشیوں اور کتوں کو پھاڑ کر اپنے پیٹ کی آگ بجھاتی ہوں، میں جو اپنے بڑھاپے کے دن انھی دو ایوں پر گزارتی ہوں، میں جو نیولے کی طرح چالاک اور چست ہوں کیا میں ہار مان جاؤں، خصوصاً اب جب کہ انھی

کی وجہ سے میرے گھر پر تباہی آئی ہے ـــــ اس نے جان کی بازی لگانے کی ٹھان لی۔ اور اپنے ننھے کو ایک طرف رکھ کر بڑھتے ہوئے مجمع کی طرف غراتی ہوئی بڑھنے لگی۔ بجتے ہوئے ٹنوں کی گونج سے اس کے دماغ پر ہتھوڑے سے پڑنے لگے۔ شعلوں کی چمک نے اس کی آنکھوں کو چندھیا دیا۔ وہ باڑ کے ایک کونے کی طرف بڑھنے لگی۔ لوگ اس کو گھیرنے لگے۔ چمکتے ہوئے شعلے، دھڑ دھڑ کی آواز اور لاٹھیوں کے ساتھ آدمیوں کی ہنکار نے اس کو دیوانہ کر دیا۔ کونہ کی طرف بڑھتے دیکھ کر ایک آدمی کو جوش سا آگیا اس نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر لاٹھی کا بھرپور ہاتھ ایسا جمایا کہ سر بھنا گیا۔ وہ غصّہ سے پاگل ہو گئی اور دھاڑتی ہوئی اس شخص پر پلٹ پڑی۔ اس کے تیز تیز دانت اور نوکدار پنجوں نے گردن کو اپنی گرفت میں لے لیا اور گردن جسم سے علیحدہ ہو کر اس کے منہ میں آگئی۔ شریانوں سے گرم گرم اور تازہ خون اڑ کر اس کے منہ اور جسم کو سرخ کر گیا اس نے حقارت سے اپنے شکار کو ٹھوکر لگا دی اور گردن کو پرے پھینک دیا۔ پھر اس نے ایک نگاہِ غلط انداز مجمع پر ڈالی اور آگے بڑھا ہی چاہتی تھی کہ لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی خوف و ہراس کے مارے لوگ گھگیانے لگے۔ ایک دوسرے پر گرتے پڑتے وہ پلٹ پڑے۔ آگے بڑھنے کی ہمت ہی کس میں رہ گئی تھی!

وہ ٹھہر گئی۔ اس طرح دشمن کو پسپا ہوتے دیکھ کر اس کی غیرت نے یہ گوارہ نہ کیا کہ ان پر پیچھے سے حملہ کرے ـــــ یکایک اس کی ممتا عود کر آئی۔ وہ اپنے ننھے کی طرف پلٹ پڑی اسی اثنا میں لوگوں نے اپنی بے وقوفی محسوس کر لی۔ وہ کسی طرح اس خطرے سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے جسے خود انھوں نے مول لے لیا تھا۔ وہ فوراً باڑ کو ایک طرف سے گرانے لگے اور اس طرح اس کو آزاد چھوڑ دیا۔ اس نے جب دیکھا کہ رہائی کا راستہ بنایا جا رہا ہے تو قہر آلود نظر مجمع پر ڈالی۔ پھر اس کی نظر اس بڑے سوراخ

پر پڑی جو اس سے نجات کے لیے بنایا گیا تھا تو کامیابی کے جذبے نے اس کو مطمئن کر دیا۔ وہ ننھے کو اٹھائے غرّاتی ہوئی باڑ کو پھلانگ رات کے اندھیرے میں غائب ہو گئی۔

آگ خاموش ہو گئی۔ آوازیں بند ہو گئیں۔ وہ خاموش تھی کہ اس نے بالآخر اپنے ننھے کو بچا لیا! ——— وہ سرپٹ چاندنی میں نہائے میدانوں میں دوڑنے لگی۔ چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں اتنی آسانی سے پھلانگ گئی گویا چھوٹے سے ٹیلے ہوں۔ راہ چلتے بھیڑیے تک اس کی راہ سے الگ ہو رہے تھے۔ اور پھر وہ دریا کے کنارے پہنچ گئی۔ اس مرتبہ اس نے پل پر جانے کے بجائے تیرنا مناسب سمجھا۔ دریا پار کر کے اس نے محسوس کیا اب وہ بالکل محفوظ ہے۔ اب اس کا کوئی بال بیکا نہیں کر سکتا۔ اس نے اپنے جسم سے پانی جھٹک دیا۔ اور اپنے جگر کے ٹکڑے کو چومنے چاٹنے لگی۔ ننھا بھوک سے نڈھال ہو رہا تھا۔ آج کے حادثہ نے بھی اس کو بوکھلا دیا تھا۔ مامتا کی گرمی سے وہ یکدم کھڑا ہو گیا اور بے صبری کے ساتھ غٹا غٹ دودھ پینے لگا۔ وہ پھر سے موٹا تازہ ہونے لگا۔ زندگی کی لہر اس کے جسم میں دوڑنے لگی۔ مامتا کی ساری گرمی اس کے ننھے سے جسم میں حلول کرنے لگی۔ وہ پھر آگے بڑھنے لگی۔ اب کے وہ بڑی ہوشیاری سے قدم اٹھا رہی تھی۔ ایک دفعہ دھوکا کھا کر اس کو اندازہ ہو چلا تھا کہ خطرے کا احساس نہ کرنا بے وقوفی ہے۔ پھر جلد ہی جنگل آ گیا۔ وہی جنگل جس میں اتنی اونچی گھاس تھی کہ ہاتھی بھی چھپ سکتا تھا جس میں خطرے کے ہوتے ہوئے بھی خطرہ نہیں تھا۔ اس لیے کہ وہ جنگل کی ملکہ تھی! ——— اس نے اپنے لختِ جگر کو بہت ہی گھنی جھاڑی میں محفوظ جگہ رکھا۔ چند لمحے ادھر ادھر دیکھتی رہی گویا جاننا چاہتی تھی کہ اب کے تو کوئی اس کے ننھے کو اڑا نہ لے جائے گا پھر وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی اور رات کے اندھیرے میں غائب ہو گئی۔ شاید اس شاندار مہم کے بعد اسے بھوک لگ رہی تھی۔

واپس کرو۔ اس کا تھیلا واپس کرو۔"

اب انھیں یہ تو معلوم نہیں تھا کہ ان مسٹنڈوں کو تھیلے میں واپس کرنے لیے کون سا جادو کا فقرہ استعمال کیا جائے۔ اس لیے پٹتی رہیں اور کسان میاں اپنا اطمینان سے نہاتے رہے۔ آخر نہا کر نکلے تو بولے "دونوں تھیلے کے اندر" اتنی دیر میں بے چاریوں کا کچومر نکل چکا تھا۔

بیوی انتظار کر رہی تھیں:۔

اب کسان میاں دونوں تھیلے لیے گھر کی طرف چلے۔ بیوی تو انتظار کر رہی تھی۔ وہی ڈنڈے والی جھاڑو ہاتھ میں تھی۔ کسان نے جونہی تھیلا اس کے سامنے فرش پر رکھا منہ چڑھا کر بولی "اچھا آج بھی کل والی حماقت فرمائیں گے آپ" "دونوں تھیلے سے باہر"

اور جونہی یہ لفظ اس کے منھ سے نکلے دونوں نوجوان کود کر تھیلے سے باہر آئے اور اسے پیٹنا شروع کیا۔ پیٹتے جاتے اور چیخ چیخ کر کہتے جاتے "اب تو تم اپنے میاں کو کبھی نہ مارو گی"

کسان کو جب اطمینان ہو گیا کہ بیگم صاحبہ کی پٹائی اچھی خاصی ہو گئی ہے تو بولا "دونوں تھیلے کے اندر" اس نے پھر یہ تھیلا ایک طرف رکھ دیا۔ اس کی جگہ دوسرا تھیلا فرش پر ڈال دیا اور بولا "دونوں تھیلے سے باہر"

اے لیجیے دیکھتے دیکھتے میز بچھ گئی اس پر عمدہ سے عمدہ کھانے چن گئے۔ دونوں نے خوب جی بھر کے کھایا پیا مگن ہو گئے

اور بھئی اس کے بعد پھر کبھی میاں بیوی میں کوئی چپقلش نہیں ہوئی نہ مار پیٹ کی نوبت آئی۔ ہنسی خوشی دن گذرنے لگے

(فاؤنڈنگ آوٹ کے شکریہ کے ساتھ)

جناب دینا ناتھ گردھر

انوکھا فریادی

(ایک سچا واقعہ)

آپ جانتے ہیں کہ بڑے قصبوں اور شہروں میں سرکار کی طرف سے کچہریاں ہوتی ہیں جہاں طرح طرح کے مقدموں کا فیصلہ ہوتا ہے۔ کچہریاں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ دیوانی اور فوجداری۔

دیوانی کچہری میں روپے پیسے، مال جائداد اور لین دین کے جھگڑے طے ہوتے ہیں۔ فوجداری کچہری میں لڑائی جھگڑے، چوری چکاری، قتل وغیرہ قسم کے جرائم کا فیصلہ ہوتا ہے۔

اب تک تو ہم یہ دیکھتے اور سنتے آئے ہیں کہ ایسے مقدمے چاہے دیوانی عدالت میں ہوں یا فوجداری عدالت میں، ان میں صرف انسان ہی ماخوذ ہوتے ہیں مقدمہ کرنے والے بھی اور جن پر مقدمہ کیا جاتا ہے وہ بھی سب انسان ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسا تو ہوتا ہے کہ کسی مقدمے میں جانور کا ذکر بھی آئے، جیسے ایک شخص نے دوسرے کا بیل چوری کر لیا یا کسی نے پڑوسی کی مرغی یا بکری ذبح کر لی۔ مگر ایسے مقدمات میں فریق انسان ہی ہوتے ہیں وہ جانور نہیں۔ نہ کوئی جانور عدالت میں داد فریاد لے کر جاتا دیکھا گیا ہے۔

مگر بھئی ہم نے نہیں دیکھا تو کیا ہوا۔ ہمارے ہندوستان میں ہی ایک بندر ایک بار کچہری میں اپنی فریاد لے کر جا پہنچا اور زبان سے نہیں تو اپنے درد بھرے دل اور آنسو بھری آنکھوں سے مجسٹریٹ صاحب سے انصاف کی درخواست کی۔ یہ ایک سچا واقعہ ہے جو ان مجسٹریٹ صاحب نے خود بیان کیا ہے۔ ان مجسٹریٹ صاحب کا اسم گرامی جناب ایف۔ ایچ بخشی ہے۔ یہ ۱۹۵۸ء کی گرمیوں کی بات ہے جب وہ مہاراشٹر کے ضلع یوتمال کے ایک قصبہ ڈیگرس میں اول درجہ کے سب ڈویژنل مجسٹریٹ تھے۔ تو لیجیے یہ واقعہ آپ انھی کی زبانی سنیے۔

یہ سچا واقعہ ۱۹۵۸ء کی گرمیوں کا ہے۔ میں ان دنوں مہاراشٹر کے ضلع یوتمال کے قصبہ ڈیگرس میں تعینات تھا۔ میرا کام فوجداری مقدمات سننا اور ان میں انصاف کرنا تھا۔ میری عدالت قصبہ کے ڈاک بنگلے میں تھی۔

ایک دن شام کو جب میں دن بھر کے مقدمات نپٹانے کے بعد گھر جانے کی تیاری کر رہا تھا تو عین اس وقت ایک بندر عدالت کے کمرے میں داخل ہوا۔ بندر کے جسم پر کئی زخموں کے نشان تھے اور ان سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کی شکل سے صاف ظاہر تھا کہ بے چارہ شدید درد میں مبتلا ہے۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہہ رہے تھے۔ مگر جانور تھا، بول تو نہیں سکتا تھا، ہاں درد سے کراہ رہا تھا، اور بے چین تھا۔ میں اپنا

دن بھر کا کام ختم کر کے گھر جانے ہی والا تھا، لیکن بندر کی اچانک اور غیر متوقع آمد سے میں اپنی کرسی پر پھر بیٹھ گیا۔

ایک نظر میں میں نے صورت حال کا جائزہ لیا اور بندر کو پوری توجہ سے دیکھا۔ وہ بار بار اپنے زخم مجھے دکھانے کے لیے ادھر سے ادھر ہوتا۔ میں نے سوچا کہ انسان کمرۂ عدالت میں انصاف کا متلاشی ہوتا ہے تو کیوں ایک جانور کو اس بات کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ بھی عدالت سے انصاف مانگے۔ میں نے اس کو رحم بھری نگاہ سے دیکھا لیکن کمرے کے پچھلے دروازے سے باہر نکل گیا۔ بندر بھی پلٹ کر باہر آگیا اور پچھلے برآمدے میں میرے سامنے آکھڑا ہوا اور وہ پھر بار بار اپنے زخموں کی طرف میری توجہ مبذول کراتا رہا۔

بندر سے چند قدم کا فاصلہ رکھ کر میں نے چپراسوں کو آواز دی اور ان سے دریافت کیا کہ بندر کو مارنے والا کون شخص ہے۔ پتہ چلا کہ یہ شخص ساتھ والے بنگلے کا مالی ہے۔ یہ بندر ہر وقت اس بنگلے کے باغ میں گھس کر پھولوں اور پھلوں کے پودوں کو خراب کرتا ہے۔ اور باغ کو نقصان پہنچاتا ہے۔ ڈرانے بھگانے پر باز نہیں آتا۔ آج اتفاق سے مالی نے اس پر قابو پالیا اور ڈنڈے سے خوب مارا۔ اب تک تو یہ چپراسی بندر کی پٹائی کی بات بتا کر مسرت محسوس کر رہے تھے۔ لیکن ان کی ساری خوشی ایک دم [illegible] ہو گئی جب میں نے حکم دیا کہ پولیس [illegible] بلایا جائے۔

[illegible] قانون اس سلسلے میں [illegible]

احتیاط کی بہت ضرورت تھی۔ میں تو بندر کا جائزہ لے رہا تھا مگر اس سے زیادہ زخمی بندر ہی میرا جائزہ لے رہا تھا اور اپنے درد کی شدت اور بے چینی سے میرے دل پر گہرا اثر ڈال رہا تھا۔ اتفاق سے اس وقت تک پولیس اور ان کا عملہ جا چکا تھا۔ میرے خیال میں یہ بہتر ہوا اور اس سے فوجداری عدالت کے سامنے اس پیش ہونے والے مقدمے کا تماشہ کرنے میں آزادی محسوس ہونے لگی۔ میں نے چپراسی کے ذریعے مالی کو طلب کیا۔ وہ حاضر ہوا اور ایک مجرم کی طرح میرے سامنے کھڑا تھا۔ بندر بے چارہ بار بار زخم مجھے دکھاتا اور ان سے بہنے والے خون کو چاٹ لیتا۔

میں نے مالی پر یہ بات اچھی طرح واضح کی کہ جس طرح ہر انسان کو عدالت سے انصاف مانگنے کا حق ہے اسی طرح ہر جانور کو ہے اور پھر بندر تو انسان کا جد [illegible] کہلاتا ہے جہاں سے پہلے پہل انسانی نسل شروع ہوئی۔ سرکار نے جانوروں کی حفاظت کے لیے اور ان پر ظلم و تشدد کو روکنے کے لیے کئی قانون بنا رکھے ہیں۔ میں نے ان کے نام اور حوالے مالی کو سنائے اور حکم دیا کہ وہ وجہ بیان کرے کہ کیوں نہ ان قوانین کے تحت اس کے خلاف چارہ جوئی کی جائے۔ مگر میں دل ہی دل میں [illegible] ہو رہا تھا کہ آخر میں یہ کیا تماشہ رچا رہا ہوں۔

ادھر مالی میری باتیں اور حکم سن کر سخت گھبرا گیا اور ایک دم میرے پاؤں پر گر پڑا۔ [illegible] بندر یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا [illegible] اقبال کیا [illegible] بندر [illegible]

ا۔ گویا وہ یہ بتانا چاہتا تھا کہ مالی کی یہ حرکت بالکل
جائز تھی اور اسے بندر کو اس طرح پیٹنے کا کوئی حق نہ
ما۔ یہ نظارہ واقعی دردناک تھا۔ مالی نے جرم کا اقبال
رنے کے باوجود اپنے جرم کے لیے جواز پیدا کرنا چاہا تھا۔
لیکن صورتِ حال کا تقاضہ تھا کہ انصاف کیا جائے اور
ہ بھی قانونی سمجھ بوجھ کے ساتھ۔

میں نے مالی کا بیان نامنظور کر دیا اور حکم
یا کہ اس نے بندر کو پیٹ کر اپنے حقوق سے تجاوز کیا
ہے اور سخت وحشیانہ حرکت کا مرتکب ہوا ہے اس لیے
سے جیل کی ہوا کھانی پڑے گی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ
بندر میرا ایک ایک لفظ سمجھ رہا ہے اور میرے فیصلے
سے اسے خوشی محسوس ہو رہی ہے۔ مالی نے میرے پاؤں
پکڑ لیے اور گڑگڑا کر معافی مانگنے لگا۔ اس نے وعدہ کیا
کہ آئندہ وہ ہرگز ایسی حرکت نہیں کرے گا اور ضرورت
ہوئی تو بندر اور دوسرے جانوروں کو دور سے ڈرا کر
بھگا دے گا۔ اس پر اسے سخت تنبیہ کر کے چھوڑ دیا گیا۔
بندر بھی خوش خوش واپس چلا گیا۔

میں نے بھی محسوس کیا کہ واقعی آج کا دن
میں نے صحیح اور انصاف کیا ہے میرے دل کو بڑا اطمینان
نصیب ہوا۔

جناب بصیر مرست

جانور کس طرح پانی پیتے ہیں

انسان ہو یا حیوان یا نباتات ان سب کے لیے پانی جو اہمیت رکھتا ہے اس سے کون انکار کرسکتا ہے ؟

جانداروں کو اپنی زندگی میں ہر ہر قدم پر پانی کی ضرورت پڑتی ہے۔ انسانوں کی طرح جانور بھی پانی پیتے ہیں اور اسے نہانے کے استعمال میں لاتے ہیں. ان میں سے شکاری جانور شکار تو کرتے ہیں غذا حاصل کرنے کے لیے مگر پانی استعمال کرتے ہیں زندہ رہنے کے لیے. کیونکہ اس کے بغیر کسی جاندار کا زندہ رہنا ممکن نہیں۔

جو سچ پوچھو تو تمام جانداروں کے جسم کا زیادہ تر حصہ پانی کا احسان مند ہے ، جانور پانی سے اپنی پیاس ہی نہیں بجھاتے ہیں. اسے غذا ہضم کرنے ، فاسد مادے خارج کرنے اور جسم کو پاک کرنے کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔

روزمرہ زندگی میں بارہا آپ کو اس بات کا تجربہ ہوا ہوگا کہ بھینسیں ، گائیں اور گھوڑے وغیرہ گرمیوں میں ٹھنڈے پانی میں غوطہ لگاتے ہیں. آپ کا پسندیدہ ٹائیگر کتا بھی اپنے آپ کو گرمی سے محفوظ رکھنے کے لیے کسی نم جگہ یا پانی میں پڑا رہتا ہے۔ بہت سے جانوروں کی تھوڑے سے پانی سے تشفی نہیں ہوتی اور بعض تو کبھی کبھی پینے پر ہی اکتفا کر لیتے ہیں۔

زراف کے لانبے اور پتلے پیر اور حد سے زیادہ لانبی گردن اونچے درختوں کی پتیاں کھانے میں اس کے لیے مددگار ثابت ہوتی ہے لیکن جھک کر پانی پینے میں اسے اتنی ہی دشواری کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے وہ اپنے اگلے پیر بازوؤں کی طرف پھیلا کر اور گردن جھکا کر پانی پیتا ہے. زراف جیسا خوشنما جانور جب ایسا کرتا ہے تو بڑا ہی بدوضع اور بے ڈھنگا لگتا ہے ویسے زراف کو پانی کی ضرورت کم ہی پیش آتی ہے۔ اس لیے کہ وہ جس درخت کی پتیاں شوق سے کھاتا ہے وہ رسیلی ہوتی ہیں۔

اسی کا بھلا بھائی "اونٹ" ہے اس کی زندگی کا زیادہ حصہ صحرا (ریگستان) میں بسر ہوتا ہے۔ ریگستان میں میلوں پانی نصیب نہیں ہوتا۔ اگر پروردگار پانی ذخیرہ کرنے کی اونٹ میں صلاحیت نہ رکھتا تو اونٹ دنیا سے کبھی کے نیست و نابود ہو جاتے۔ اونٹ کے معدے کے استر LINING میں تھیلیاں ہوتی ہیں ان تھیلیوں میں وہ پانی جمع کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب پانی نہیں ملتا تو اسے کوئی فکر نہیں ہوتی، اونٹ چشمہ وغیرہ کے کنارے پر اپنے دونوں اگلے پیر ٹیک کر پہلے پیاس بجھا لیتا ہے پھر اپنی تھیلیوں کو بھر لیتا ہے۔

جنگل کا وہ منظر کوئی شکاری اور فطرت کا شیدائی نہیں بھول سکتا۔ جب ہاتھی اپنی پیاس بجھانے دریا کے کنارے آتے ہیں، ہاتھیوں کا سردار نگہبانی اور پاسبانی کے لیے غول سے تھوڑی دور کھڑا رہتا ہے تاکہ تمام ہاتھی اطمینان سے پیاس بجھا لیں۔ ہاتھی پہلے تو کھیل کود اور کلیلیں کرتے ہیں، نہاتے ہیں اس کے بعد اپنی سونڈ میں پانی بھر کر منہ میں پہنچاتے ہیں۔

آپ نے اپنے ہی گھر میں بلی اور کتے کو پانی پیتے دیکھا ہوگا کہ وہ کس طرح جھک کر اپنی کھردری زبان سے چھینٹے اڑاتے ایک عجیب سی ناگوار آواز نکالتے ہوئے دودھ یا پانی پیتے ہیں۔

عام طور پر جنگل میں ہر جانور ایک دوسرے کا دشمن ہوتا ہے مگر یہ ساری دشمنی اس وقت بے تعلقی میں بدل جاتی ہے جب وہ پیاس بجھانے دریا کے کنارے آتے ہیں۔ آپ کو یہ دیکھ کر یقیناً حیرت ہوگی کہ جنگل کے سب سے بزدل جانور "ہرنوں" کی ڈاریں گینڈے جیسے بدمزاج اور لڑاکو جانور سے دریا کے کنارے چند گز کے فاصلے پر کھڑی اس بات کی منتظر رہتی ہیں کہ کب گینڈا پانی پی کر ہٹے اور ہم پانی پر ٹوٹ پڑیں۔

زراف کی طرح ہرن بھی کبھی کبھی پانی پیتے ہیں۔ ورنہ رسیلے پتوں پر ان کی زندگی گزر جاتی ہے۔

دریائی گھوڑا (ہپوپوٹامس) خشکی پر رہتا ہے۔ کیونکہ اس کی غذا وہی گھانس پات ہے جو خشکی پر اُگتی ہے۔ وہ اپنا زیادہ وقت پانی میں گذارتا ہے۔ سانس لینے کے لیے یہ اپنے نتھنے پانی سے اوپر رکھ کر پانی میں پڑا رہتا ہے۔ (تصویر دیکھئے) حالانکہ یہ پانی میں رہ کر اور پانی کے

اوپر آکر بھی پانی پی سکتا ہے۔

شام کے وقت درختوں کے سائے لمبے ہونے لگتے ہیں اور فضا پر ہلکی سی سیاہی کی چادر تن جاتی ہے اس وقت جنگل کا شہنشاہ شیر اور اس کے باج گزار بور بچہ اور چیتا وغیرہ انگڑائی لے کر نیند سے بیدار ہوتے ہیں۔ اور اپنی ماندسے نکل کر چپکے چپکے دریا کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔ اس وقت شیر کسی جانور کو چھیڑتا ہے نہ کسی کی طرف توجہ کرتا ہے۔ اسے صرف پیاس بجھانے کا خیال رہتا ہے۔ پانی پی کر وہ ایک طرف انگڑائی لیتا ہے اور ایک زور دار دھاڑ سے اپنی بیداری کا اعلان کرتا ہے اس دھاڑ کو سن کر بڑے بڑے شکاریوں کا پتہ پانی ہو جاتا ہے اور دل یکخت اچھل کر حلق میں آجاتا ہے۔

اس اعلان شاہی کے ساتھ ہی جنگل کے چھوٹے بڑے سبھی جانور اپنی اپنی جگہ دم روک کر دبک جاتے ہیں۔ حتی الامکان شیر سے دور رہتے ہیں ورنہ فضا میں کالی کالی دھاریاں لہراتی ہیں اور دوسرے ہی لمحہ کوئی جانور خون میں لتھڑا خاک پر لوٹتا نظر آتا ہے۔

جناب فرحت قمر

زندگی اور ریل

دھڑدھڑاتی، سنسناتی، دندناتی شان سے — جا رہی ہے ریل گاڑی کوہ[1] پر میدان سے
ریل کی پٹڑی بھی ہے یوں تو تا حدِ نظر[2] — دور جا کے ہو گئی ہے تنگ لیکن کس قدر
کس طرح اس تنگ سی پٹڑی پہ گاڑی جائیگی — کیا وہاں جا کر پھسل کر ڈگمگا ہی جائے گی
سر اٹھائے اک پہاڑی سینۂ میدان پر — کس طرح ہوگا سفر اس آہنی دیوار پر

راستہ اونچی پہاڑی سے نکلتا ہی گیا — ریل کا انجن چھکا چھک چھک چھکا، چلتا رہا
دور جا کر تنگ پٹڑی اور چوڑی ہو گئی — ریل گاڑی ڈگمگائی اور نہ پھسلی، نہ گری
ڈھال آئے موڑ آئے ریل بڑھتی ہی رہی — کچھ سرنگوں سے نکل کر اس کی منزل آگئی

زندگی بھی اک سفر ہے راستہ دشوار ہے — اک طرف کوہِ گراں[3] تو ایک جانب غار ہے
ریل کی پٹڑی کے جیسا راستہ کچھ دور پر — بے طرح مسدود[4] ہے، آتا نہیں کچھ بھی نظر
سامنے بے شبہ چٹانیں ہیں تا حدِ نظر — دور مستقبل[5] میں کیا ہے کون جانے کیا خبر
اک کرن امید کی تو سینکڑوں مایوسیاں — غربت و افلاس کا غم جہل کی تاریکیاں

پھر بھی منزل تک پہنچنے کے لیے کوشاں رہو
ریل گاڑی کی طرح بڑھتے چلو بڑھتے چلو!

۱۔ پہاڑ
۲۔ یعنی جہاں تک نظر جا سکتی ہے۔
۳۔ کوہ، پہاڑ۔ گراں، بھاری یعنی بہت بڑا پہاڑ
۴۔ یعنی بند ہے
۵۔ یعنی آنے والے زمانے میں

خدمتِ خلق کے لئے ... ہمہ وقت حاضر
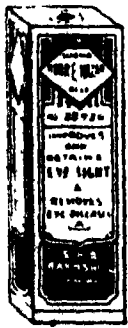
پیٹ اور معدہ کی نئی و پرانی
شکایات اور وبائی امراض سے
تحفظ کے لئے بے حد مفید اور
زود اثر دوا

آنکھوں کو جملہ امراض سے
محفوظ رکھنے۔ انھیں دلکش
روشن اور جاذب نظر بنانے کیلئے
بہترین سرمہ ہے

بالوں کی آرائش۔ قدرتی
نشوونما۔ اور دماغی تازگی
کے لئے طبی اصولوں پر تیار
کیا ہوا خوشبودار تیل

بچوں کیلئے ایک خوش ذائقہ
ٹانک جو انھیں تندرست
خوش و خرم۔ اور چاق
چوبند رکھتا ہے۔

مزید کاروباری تفصیلات کیلئے پتہ ذیل پر خط وکتابت کیجئے

S A B BAKHSHI & CO
POST BOX 114
CALCUTTA 1

بخشی کمپنی

مولانا مقبول احمد سیوہاروی

سفرنامہ ابن بطوطہ

(مسلسل)

خنج پال
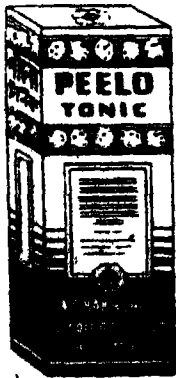
خنج پال میں شیخ ابی ولف رہتے ہیں جن کی زیارت کے ہم مشتاق تھے۔ خانقاہ میں گئے۔ حضرت شیخ ایک معمولی صاحب بچھے زمین پر بیٹھے تھے۔ سر پر سیاہ اونی عمامہ تھا۔ سلام کیا تو بڑی خندہ پیشانی سے جواب دیا۔ اور حال پوچھا۔

جب تک میں خانقاہ میں رہا عمدہ عمدہ پھل اپنے لڑکے کے ہاتھ بھیجتے تھے اور حال احوال پوچھتے تھے۔

شیخ صاحب کے حالات عجیب ہیں۔ مسافروں کو بہت کچھ دیتے ہیں۔ کپڑوں کے جوڑے اور گھوڑے دے کر رخصت کرتے ہیں۔ آس پاس کے کسی شہر میں ان جیسا درویش میں نے نہیں دیکھا لوگ کہتے ہیں کہ انھیں دستِ غیب ہے۔

اس خانقاہ میں قطب دانیال کا مزار بھی ہے اس کی بڑی شہرت ہے۔ مزار کا گنبد قطب الدین شاہ ہرمز نے بنوایا ہے۔

خنج پال میں ایک خانقاہ اور بھی ہے۔ اس میں بڑے بابرکت بزرگ رہتے ہیں۔

یہاں سے ہم شہر قیس گئے۔ اس شہر کا دوسرا نام سیراف ہے۔ سیراف فارس کا ضلع ہے۔ زیادہ تر ایرانی شرفا رہتے ہیں۔ عرب کا ایک قبیلہ بنی سفان بھی رہتا ہے۔ اس کا پیشہ موتی نکالنا ہے۔

سیراف اور بحرین کے درمیان ایک ندی بہتی ہے۔ یہاں ہر وقت پانی بھرا رہتا ہے۔ اپریل اور مئی میں غوطہ لگانے والے اس ندی میں غوطہ لگاتے ہیں رسّی کا ایک سرا غوطہ لگانے والا کمر سے باندھ لیتا ہے اور ایک سرا کنارے کا آدمی پکڑے رہتا ہے۔ ناک پر قینچی جیسی ہڈی باندھ لیتا ہے۔ یہ کچھوے کی ہڈی ہوتی ہے۔ گردن میں چمڑے کا تھیلا باندھ لیتا ہے اور لوہے کا اوزار لے لیتا ہے۔ جس سے سیپیوں میں سے موتی اکھاڑنے کا کام لیا جاتا ہے۔

ان لوگوں کو سانس روکنے میں بڑا کمال ہے۔ ایک گھنٹہ سانس روک لینا تو کوئی بات ہی نہیں۔ کچھ غوطہ خور ایسے بھی ہیں جو دو دو گھنٹے تک سانس روکے رہتے ہیں اور کچھ دو دو گھنٹے سے بھی زیادہ

یہ غوطہ خور جب پانی کی تہہ میں پہنچتے ہیں تو چھوٹے چھوٹے پتھروں میں سے سیپیاں اٹھا کر چمڑے کے تھیلے میں (جسے گردن میں لٹکائے رکھتے ہیں) بھر لیتے ہیں۔ سانس پھولنے لگتا ہے تو کمر کی رسّی کو جنبش یا حرکت دیتے ہیں۔ کنارے والا آدمی رسّی کھینچ لیتا ہے اور یہ لوگ کنارے پر آ جاتے ہیں۔

سیپیاں توڑی جاتی ہیں تو ان میں سے گوشت کے ٹکڑے نکلتے ہیں۔ انھیں لوہے کے اوزار سے کاٹ لیا جاتا ہے۔ یہ ٹکڑے ہوا لگتے ہی جم کر چھوٹے بڑے موتی بن جاتے ہیں۔

موتیوں کا پانچواں حصہ بادشاہ کا ہوتا ہے۔
قی سوداگر خرید لیتے ہیں۔ یہ سوداگر غوطہ لگانے والوں کو پیشگی
وپیہ بھی دیتے ہیں اور غوطہ خوری کے بعد حساب کتاب
رتے وقت مجرا کر لیتے ہیں۔ یعنی اتنی رقم کاٹ لیتے ہیں۔
سیراف سے ہم بحرین گئے۔

بحرین

بحرین میں گرمی بہت ہے۔ کھجور انار وغیرہ کے
اغ ہیں۔ روئی بھی پیدا ہوتی ہے۔ بحرین کے ریگستانی راستے
بعض دفعہ ریت سے بند ہو جاتے ہیں۔ اس لیے سمندری
استے سے سفر کرنا چاہئے۔
بحرین کے قریب دو پہاڑ ہیں۔ ایک کا نام
کُسیر ہے۔ ایک کا نام عُویر ہے۔ کُسیر مغرب میں ہے۔ عویر
مشرق میں ان کے بیچ میں پانی کا ایک بھنور ہے۔ جس میں
جہازوں کے ڈوبنے کا ہر وقت خطرہ رہتا ہے۔ یہاں والے
کہتے ہیں۔ کسیر اور عویر کے سوا سب جگہ خیر ہے۔
یہاں سے قطیف اور حسا ہوتے ہوئے یمامہ
پہنچے۔ یہاں عرب شیعہ زیادہ ہیں۔ کھُلم کھُلا اپنے عقیدے کا
اظہار کرتے ہیں۔ ڈرتے نہیں ہیں۔
حسا میں کھجوروں کی کثرت ہے۔ جانور بھی کھجوریں
کھاتے ہیں۔ ان میں بعض کھجوریں نہایت عمدہ ہیں
یمامہ میں ایک امیر ہے اس کا نام طفیل ابن غانم
ہے ۷۳۲ء میں طفیل بن غانم کے ساتھ میں نے حج کا سفر
بھی کیا ہے۔
حج کے بعد جدہ پہنچ کر میں نے چاہا تھا کہ یمن
اور یمن سے ہندوستان جاؤں مگر کوئی ساتھی نہ ملا چالیس
دن جدہ ٹھہرنا پڑا۔ ایک جہاز ملا جس کا مالک عبداللہ
تونسی تھا۔ مگر وہ جہاز اتنا بڑا تھا کہ سوار ہونے کو
جی نہ چاہا۔ خدا نے بڑی خیر کی کیونکہ وہ جہاز جونہی
سمندر کے بیچ میں پہنچا تو مقام راس ابو محمد پر غرق ہو گیا۔
عبداللہ اور دوسرے سوداگر ایک چھوٹی سی کشتی میں بیٹھ
کر بڑی مشکل سے بچے۔ بہت سے آدمی ڈوب گئے۔ اس
جہاز میں ستر حاجی تھے۔
اس کے بعد عیذاب جانے کے لیے سفر کیا مگر
ہوا کے زور نے راس الدوائر کی لنگر گاہ پر پہنچا دیا اور ہم
خشکی کا سفر کرنے پر مجبور ہو گئے۔
راستے میں ایک جنگل میں سے گذرے، جہاں
مرغ اور ہرن کثرت سے تھے۔ ان جنگلوں میں عرب رہتے
ہیں۔ کھانے پینے کا سامان ختم ہو گیا تو ان عربوں سے بھیڑیں
خرید کر راستے کے لیے گوشت کا ناشتہ تیار کیا۔ یہاں ایک
لڑکا ملا۔ اس لڑکے نے کہا۔ مجھے ان لوگوں نے پکڑ لیا ہے
اور مدت سے اونٹنی کے دودھ کے سوا مجھے کھانا نہیں ملا۔
یہ گوشت ختم ہو گیا تو میں نے وہ کھجوریں جو اپنے
دوستوں کے لیے خریدی تھیں ساتھیوں میں بانٹ دیں۔
نو دن چل کر ہم عیذاب پہنچے۔ ہمارے کچھ ساتھی
پہلے پہنچ گئے تھے۔ عیذاب والوں نے روٹی اور کھجوروں
سے ہماری تواضع کی۔
یہاں سے اونٹ کرائے پر لے کر پھر سفر شروع کیا۔
اور حضرت ابوالحسن شاذلیؒ کے مزار پر پہنچے۔ حضرت کے
مرقد کی میں نے دو بار زیارت کی ہے۔ یہاں سے مصر تک
ہمارے راستے میں جو مقامات آئے ان کے نام یہ ہیں۔ علواقی،
صعید، رزمیت (قفط)، قوص، قنا، ہوا، حمم، اسیوط، منفلوط،
اشمہ اور دوسرے چند مقامات۔
مصر سے شام گئے۔ شہر خلیل، بیت المقدس،
کہ، عکہ، طرابلس ہوتے ہوئے حضرت ابراہیم ادہم

ی قبر کی زیارت کی اور لاذقیہ سے ایک بڑی کشتی پر بحری
فر پر روانہ ہو گئے۔ یہ سب وہ مقامات ہیں جن کا ذکر ہم
طے کر چکے ہیں۔

یشیائے کوچک

جس کشتی پر ہمارا سفر ہے جنیوا کے باشندوں کی
ہے کشتی کا مالک مرتلین ہے۔ یہ عیسائی ہے۔ راستے بھر
یات کرتا رہا۔ ہمارا سفر سرزمین ترکی کی سیاحت کے لیے
تھا۔ چلتے ہم علایا پہنچ گئے۔

اس دیس کے رہنے والے بڑے خوبصورت
یا خوش پوشاک ہیں۔ اعلیٰ قسم کا کھانا کھاتے ہیں۔ ہر ایک
سے محبت کا برتاؤ کرتے ہیں۔ عربی کی ایک کہاوت ہے۔
"اَلْبَرَکَۃُ فِی الشَّامِ وَالشَّفْقَۃُ فِی الرُّوْمِ" یعنی
برکت شام میں ہے اور محبت روم میں ہے۔

جس شہر میں بھی ہم گئے کسی خانقاہ میں ٹھہرے
یا کسی کے گھر میں۔ ہمارے پڑوسی بھی ہماری ذرا ذرا سی
ضرورت کا خیال رکھتے تھے۔ ہر بات کی خبرگیری کرتے
تھے۔ ان کی عورتیں اور مرد ہمیں اپنا عزیز سمجھتے تھے اور
جب ہم رخصت ہوتے تھے تو عورتیں ہماری جدائی پر پھوٹ
پھوٹ کر روتی تھیں اور مرد اس طرح رخصت کرتے تھے جیسے
کسی حقیقی بھائی کو رخصت کر رہے ہوں۔

ان کی عورتیں ہمارے لیے گرم گرم روٹی بھیجتی
تھیں اور ہم سے دعائیں چاہتی تھیں۔ یہ سب لوگ حنفی مذہب
کے پیرو ہیں۔

علایا بڑی بندرگاہ ہے۔ قصیر، اسکندریہ اور
شام کے سوداگر یہاں اترتے ہیں اور علایا کی عمارتی
لکڑی اسکندریہ اور دمیاط لے جاتے ہیں۔

علاءالدین کیقباد سلجوقی نے یہاں ایک قلعہ
بھی بنوایا ہے۔

میری ملاقات یہاں کے قاضی سے ہوئی۔ ان کا
نام قاضی جلال الدین ارزنجانی ہے جمعہ کے دن ہم نے اور قاضی
صاحب نے جمعہ کی نماز قلعے میں پڑھی۔

قاضی صاحب مجھے بادشاہ کی ملاقات کے لیے
لے گئے۔ بادشاہ کا نام یوسف بک ہے۔ اس کے محلات شہر
سے دس میل دور ہیں۔

یوسف بک بہت اچھا آدمی ہے۔ ہم جب ملنے
گئے تو دریا کے کنارے ایک چبوترے پر بیٹھا تھا۔ امیر وزیر
نیچے بیٹھے تھے۔ فوجی افسر دائیں بائیں بیٹھے تھے۔ مجھ سے
سیر و سفر اور سیاحت کے حالات پوچھتا رہا اور جب میں
واپس آگیا تو ایک رقم سفر خرچ کے لیے بھیجی۔

انطالیہ:- یہاں سے چل کر انطالیہ پہنچے۔ انطالیہ خوبصورت
شہر ہے۔ کھلا کھلا آباد ہے۔ عمارتیں عمدہ اور قرینے سے بنی
ہوئی ہیں۔ اسی نام کا ایک شہر شام میں ہے مگر یہ لام سے انطالیہ
ہے اور وہ کاف سے انطاکیہ ہے۔

انطالیہ میں ہر فرقے کے لوگ رہتے ہیں۔ ہر فرقے
کی آبادی الگ الگ ہے۔ عیسائیوں کا محلہ الگ، یہودیوں
کا الگ، رومیوں کا الگ یہاں تک کہ شاہی محلات الگ ہیں۔
اور نوکروں کا محلہ الگ ہے۔ ہر محلے کی شہر پناہ بھی الگ الگ
بنی ہوئی ہے۔

جمعے کی نماز کے وقت اور رات میں شہر پناہ کا دروازہ
بند کر دیا جاتا ہے۔

(باقی آئندہ)

عقلمند مچھیرا

(ایک ایکٹ کا ڈرامہ)

کردار :- بادشاہ سلامت، وزیر اعظم، داروغہ، مچھیرا، دربان، اور سپاہی

(پردہ اٹھتا ہے)

(بادشاہ کا محل - بادشاہ کرسی پر بیٹھا ہے - وزیر اعظم داخل ہوتا ہے۔ کورنش بجا لاتا ہے)

بادشاہ سلامت :- وزیر اعظم! دعوت کا سارا انتظام ٹھیک ہے نا؟

وزیر اعظم :- جہاں پناہ! تقریباً سب ٹھیک ہے۔ بس دعوت کے لیے مچھلی نہیں مل سکی - دو دن سے سمندر میں سخت طوفان آیا ہوا ہے، ایک بھی مچھلی نہیں پکڑی جا سکی۔"

بادشاہ سلامت :- (افسوس کے لہجے میں) یعنی شاہی دعوت اور بغیر مچھلی کے، لوگ کیا کہیں گے؟ ذرا سوچئے تو سہی جس دعوت میں مچھلی نہ ہو وہ بھلا کوئی دعوت ہے وزیر اعظم، کہیں سے مچھلی ضرور منگوا لیجیے۔"

وزیر اعظم :- "عالم پناہ! میں نے چاروں طرف سپاہیوں کو بھیجا ہے۔ اور اعلان بھی کرا دیا ہے کہ جو بھی شاہی دعوت کے لیے عمدہ اور تازہ مچھلی لائے گا، منہ مانگا انعام پائے گا۔ مگر اب تک کوئی نہیں آیا ہے۔"

بادشاہ سلامت :- کیا ساری مچھلیاں سمندر کی تہہ میں چھپ گئی ہیں؟ کیا مچھلیوں کو خبر ہو گئی ہے کہ بادشاہ کے یہاں دعوت ہونے والی ہے۔ اور ان کا قورمہ بنایا جائے گا؟

وزیر اعظم :- ہو سکتا ہے جہاں پناہ کا خیال درست ہو۔ انسان بعض باتوں میں مچھلیوں سے

پیچھے ہے۔ مثلاً مچھلیاں، انسانوں سے بہتر
تیرنا جانتی ہیں۔"

بادشاہ سلامت: "افسوس۔ بادشاہ ہوکر بھی مچھلیاں حاصل نہیں کرسکتا۔ بغیر مچھلیوں کے دعوت بھی کوئی دعوت ہوتی ہے۔"

(داروغہ داخل ہوتا ہے۔ کورنش بجالاتا ہے)

داروغہ: "عالم پناہ۔ ابھی ابھی ایک مچھیرا تازی اور سنہری مچھلی لے کر حاضر ہوا ہے۔ کیا اسے آپ کی خدمت میں حاضر کیا جائے؟"

بادشاہ سلامت: (خوش ہوکر) ضرور۔ ضرور فوراً حاضر کرو۔ اگر یہ مچھیرے نہ ہوتے تو بادشاہوں کے دسترخوان تک مچھلیاں کیسے پہنچ پاتیں؟"

وزیراعظم: "عالم پناہ درست فرماتے ہیں۔ مچھیرے بہت محنتی ہوتے ہیں۔ سمندر کے اندر سے مچھلیاں پکڑ کر لاتے ہیں۔ اگر یہ نہ ہوں تو شاہی دسترخوان پھیکا رہے۔"

(مچھیرا سر پر ایک ٹوکری رکھے داخل ہوتا ہے۔ ساتھ میں داروغہ ہے۔ مچھیرا ٹوکری اتار کر بادشاہ کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ زمین چومتا ہے اور پھر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوجاتا ہے)

بادشاہ سلامت: (سنہری مچھلی کو دیکھ بہت خوش ہوتا ہے) واہ، میاں مچھیرے، خوب موٹی تازی اور عمدہ مچھلی لائے ہو۔ ہم بدولت بہت خوش ہوئے۔ بولو اس کی کیا قیمت مانگتے ہو؟"

مچھیرا: "ان داتا، جان کی امان پاؤں۔

بادشاہ سلامت: "تم ذرا بھی مت گھبراؤ... جو بھی قیمت مانگوگے ملے گی۔۔۔ بادشاہ جو کچھ زبان سے کہتے ہیں۔ اس کو ضرور پورا کرتے ہیں.... بولو کیا مانگتے ہو۔؟"

مچھیرا: "ان داتا...... اس مچھلی کی قیمت صرف سو کوڑے۔"

(بادشاہ، وزیر اور داروغہ حیرت سے ایک دوسرے کا منھ تکنے لگتے ہیں)

بادشاہ سلامت: "میاں مچھیرے تمھارا دماغ تو ٹھیک ہے؟"

وزیراعظم: "عالم پناہ، معلوم ہوتا ہے۔ آپ کے رعب اور خوف کے مارے بے چارے کی عقل ماری گئی ہے۔"

مچھیرا: خطا معاف، میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میں سو کوڑوں سے ایک بھی کم نہ کروں گا۔ ابھی ابھی آپ نے فرمایا تھا کہ بادشاہ جو کچھ کہتا ہے وہ پورا کرتا ہے۔ بس ان داتا میری پیٹھ پر سو کوڑے لگانے کا حکم دے دیجیے۔

بادشاہ سلامت: (وزیراعظم کے کان میں کہتے ہیں) یہ تو عجیب آدمی ہے۔ بہرحال ہم کو اپنا وعدہ پورا کرنا ہے۔ جلاد کو حاضر کیا جائے۔ مگر کوڑے بہت دھیرے دھیرے لگائے جائیں تاکہ مچھیرے کے چوٹ نہ لگے۔"

وزیراعظم: (داروغہ سے) جلاد کو حاضر کیا جائے۔

(داروغہ چلا جاتا ہے اور جلد ہی جلاد کے ساتھ واپس آتا ہے۔ جلاد کے ہاتھ میں چمڑے کا کوڑا ہے)

بادشاہ سلامت: "اس مچھیرے کی پیٹھ پر سو کوڑے لگائے جائیں۔"

(جلاد دھیرے دھیرے کوڑے، مچھیرے کی پیٹھ پر مارتا ہے اور گنتا جاتا ہے۔ ایک ۔۔ دو۔ دس۔ بیس۔۔۔تیس، چالیس ۔۔ پچاس)
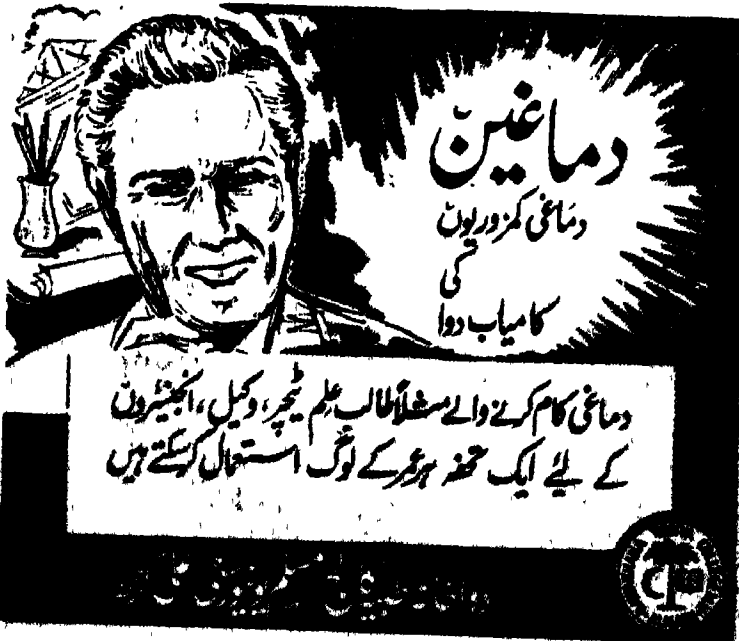
مچھیرا:۔ "بھائی جلاد ذرا ٹھہرو۔ میرا ایک ساتھی اور ہے باقی کے کوڑے اس کے حصے کے ہیں۔"

بادشاہ سلامت:۔ (مسکراتے ہوئے) "اچھا! کیا اس دنیا میں تم جیسا کوئی دوسرا بے وقوف بھی موجود ہے۔ کون ہے وہ؟ کہاں ہے؟ حاضر کرو تاکہ اس کا حصہ جلد دیا جائے۔"

مچھیرا:۔ ان داتا وہ کوئی دوسرا نہیں ہے۔ وہ آپ کے محل کا دربان ہے۔"

بادشاہ سلامت:۔ (حیرت سے) میرے محل کا دربان ہائیں۔۔۔ وہ کیسے؟"

مچھیرا:۔ عالی جاہ بات یہ تھی کہ دربان مجھ کو اندر آنے ہی نہیں دیتا تھا جب تک کہ اس نے مجھ سے وعدہ نہ لے لیا کہ جو بھی اس مچھلی کی قیمت مجھ کو ملے گی اس میں سے آدھا اس کا حصہ ہوگا۔"

بادشاہ سلامت:۔ دربان کو ہمارے حضور فوراً حاضر کیا جائے۔"

(دربان کو چند سپاہی پکڑ کر لاتے ہیں۔ دربان خوف کے مارے تھر تھر کانپ رہا ہے)

بادشاہ سلامت:۔ اس بے ایمان اور رشوت خور دربان کی پیٹھ پر پچاس کوڑے کس کر لگائے جائیں اور اس کو ہماری نوکری سے نکال دیا جائے۔

(مچھیرے سے مخاطب ہو کر) مابدولت تمھاری عقل مندی سے بہت خوش ہوئے۔۔ وزیر اعظم! میاں مچھیرے کو اشرفیوں کی تھیلی انعام میں دی جائے۔

(مچھیرا زمین چومتا ہے)

(پردہ گرتا ہے)

سب کا دوست

میں ہر اک چیز سے کرتا ہوں محبت جتنی
اتنا ہی مجھ سے ہر اک پیار کیا کرتا ہے

میں نے بے کار کبھی پھول نہیں توڑے ہیں
اس لیے مجھ سے ہر اک شہد کی مکھی خوش ہے
کھیت کی چھوٹی سی چڑیا بھی مرے پاس آ کر
کھیلتی رہتی ہے کب مجھ سے ڈرا کرتی ہے
اور ہر چڑیا بھی یہ اچھی طرح جانتی ہے
گھونسلا میں نے کبھی ان کا نہیں "لوٹا" ہے
جب کبھی گھونسلے میں جھانک لیا کرتا ہوں
تب نڈر ہو کے وہ آرام کیا کرتی ہے
میری آواز پہ ہر گائے چلی آتی ہے
میرے ہاتھوں میں نہیں ہوتا ہے کوئی چابک
اس لیے گھوڑے مرے پاس چلے آتے ہیں
میرے کانوں میں کئی باتیں کیا کرتے ہیں

میں ہر اک چیز سے کرتا ہوں محبت جتنی
اتنا ہی مجھ سے ہر اک پیار کیا کرتا ہے!

میں بھی ہاتھ پیر ہلاؤں گا، پردیس جاکر دولت جمع کرنے کے جتن کروں گا۔"

پھر سوملک جولاہا وردھمان پور چلا گیا۔ تین سال محنت سے کام کیا اور تین سو اشرفیاں جمع کرلیں جنھیں لے کر وہ گھر کی طرف روانہ ہوا۔ راستہ لمبا تھا۔ ادھر راستے میں رات پڑگئی۔ آس پاس کوئی بستی نہ تھی وہ ایک بڑ کی شاخ پر چڑھ گیا اور وہیں رات گزار دی۔ سوتے میں اس نے خواب دیکھا کہ دو آدمی آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ ایک کا نام تھا قسمت اور دوسرے کا محنت۔ قسمت نے محنت سے کہا "کیا یہ تمھیں معلوم نہیں ہے کہ سوملک کے پاس کھانے اور کپڑے سے زیادہ دولت نہیں رہ سکتی۔ پھر تم نے اسے تین سو اشرفیاں کیوں دیں"؟

محنت نے جواب دیا: "میں ہمت سے کام کرنے والے ہر شخص کو ایک بار اس کی محنت کا پھل ضرور دوں گا۔ اسے اس کے پاس رہنے دینا یا نہ رہنے دینا اے قسمت، تمھارے اختیار کی بات ہے۔"

خواب ختم ہوتے ہی سوملک کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے دیکھا کہ اشرفیوں کا برتن خالی تھا۔ اتنی تکلیف اٹھاکر جمع کی ہوئی دولت اس طرح ہاتھ سے نکل جانے کا سوملک کو بہت رنج ہوا۔ وہ سوچنے لگا کہ اب کونسا منہ لے کر گھر جاؤں۔ یہ سوچتا تھا کہ وہ الٹے پاؤں وردھمان پور لوٹ گیا۔ وہاں دن رات محنت کرکے اس نے سال بھر کے اندر ۵۰۰ اشرفیاں جمع کیں۔ یہ اشرفیاں لے کر گھر آرہا تھا کہ پہلے کی طرح پھر راستے میں رات پڑگئی۔ اس بار وہ سونے کے لیے ٹھہرا نہیں بلکہ چلتا ہی گیا۔ لیکن چلتے چلتے پھر اس نے انھی دو آدمیوں کو آپس میں بات کرتے سنا۔ قسمت پھر اپنی بات دہرا رہا تھا کہ "اے محنت کیا تجھے معلوم نہیں کہ سوملک کے پاس کھانے کپڑے سے زیادہ کی رقم رہ نہیں سکتی ہے۔ پھر تو نے اُسے ۵۰۰ اشرفیاں کیوں دیں؟"

محنت نے پھر وہی پہلے والا جواب دہرایا کہ "میں ہر محنت کرنے والے کو ایک بار اس کا پھل ضرور دوں گا۔ اس کے بعد تمھارے اختیار کی بات ہے۔"

اس بات چیت کے بعد سوملک نے اپنی اشرفیوں والی کٹھری دیکھی تو وہ بالکل خالی تھی وہ بہت رنجیدہ ہوا سوچنے لگا بغیر دولت کے زندگی بالکل بے کار ہے۔ اس سے تو موت اچھی اس نے وہیں ڈال میں رسی کا پھندا ڈال کر خودکشی کی ٹھانی۔

گلے میں پھندا ڈال کر جیسے ہی وہ لٹکنے والا تھا کہ غیب سے ایک آواز آئی۔ وہ آواز برابر تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اے سوملک تو اپنی اس حرکت سے باز آ۔ میں نے تیری دولت چرائی ہے۔ روٹی کپڑے سے زیادہ کی دولت تیری قسمت میں نہیں ہے۔ دولت جمع کرنے کے تو بے کار کی محنت مت کر۔ دولت کا سکھ اٹھانا تیری قسمت میں نہیں ہے۔ تیری کوشش اور ہمت سے تو میں خوش ہوں۔ تو کوئی ایک چیز مانگ میں تیری خواہش پوری کروں گا۔

سوملک نے کہا "مجھے دولت دے دو" غیب سے آواز آئی۔ "دولت کا کیا کام تیری قسمت میں دولت کا سکھ نہیں لکھا ہے۔ بھلا بتاؤ ایسی دولت لے کر تم کیا کروگے جس سے تم تو خود کوئی فائدہ نہ اٹھا سکوگے۔"

سوملک تو دولت کا بھوکا تھا کہنے لگا "چاہے اس دولت سے میں سکھ نہ اٹھا سکوں مگر مجھے تو دولت ہی چاہیے۔ اس دنیا میں دولت کی بڑی عظمت ہے لوگ اسی کی پوجا کرتے ہیں جس کے پاس دولت ہوتی ہے۔ اگر دولت پاس ہو تو کنجوس اور چھوٹی

ذات والا بھی سماج میں عزت پاتا ہے ساری دنیا اس کی طرف امید لگائے بیٹھی رہتی ہے جس طرح وہ گیدڑ بیل سے امید لگائے پندرہ سال تک اس کے پیچھے پیچھے گھومتا رہا۔

قسمت نے پوچھا۔ "وہ کیسے؟"

تب سوملک جوہے نے بیل اور گیدڑ کی کہانی سنائی

آس لگائے گیدڑ گھوما:۔

ایک جگہ تیز سنگھا نام کا ایک بیل رہتا تھا بہت تیز طرار ہونے کی وجہ سے کسان نے اسے چھوڑ دیا تھا۔ اپنے ساتھی بیلوں سے چھوٹ کر وہ جنگل میں متوالے ہاتھی کی طرح بے روک ٹوک گھوما کرتا تھا۔

اسی جنگل میں "لالچ خور" نام کا ایک گیدڑ بھی رہا کرتا تھا۔ ایک دن وہ اپنی لالچ خورلی گیدڑی کے ساتھ ندی کے کنارے بیٹھا تھا۔ ادھر سے وہ بیل وہاں پانی پینے آنکلا۔ بیل کافی ہٹا کٹا تھا۔ گوشت سے بھرے ہوئے کاندھے پر سے لٹکتے ہوئے گوشت کو دیکھ کر لالچ خورنی کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اس نے لالچ خور سے کہا۔ "دیکھو اس بیل کے لٹکتے ہوئے گوشت کو دیکھو! نہ جانے یہ کس دن زمین پر گر جائے۔ تم اس کے پیچھے پیچھے لگے رہو۔ جب یہ گوشت زمین پر گرے لے آنا۔"

لالچ خور نے کہا۔ "نہ جانے کندھے سے لٹکتا ہوا بیل کا یہ گوشت کب گرے۔ آخر میں کب تک اس کا پیچھا کرتا رہوں گا۔ اس بے کار کام میں مجھے مت لگاؤ۔ ہم یہاں آرام سے بیٹھے ہیں۔ جو چوہے اس راستے سے گذریں گے انھیں مار کر ہی ہم پیٹ بھر لیں گے۔ تجھے یہاں اکیلا چھوڑ کر جاؤں تو کہیں دوسرا گیدڑ نہ یہاں آجائے اور مجھے اس گھر سے نکال کر خود اپنا قبضہ کر بیٹھے

نا بابا نہ یہ مجھ سے نہ ہو سکے گا۔ غیر یقینی چیز کی امید میں یقینی چیز کو چھوڑنا کبھی اچھا نہیں ہوتا۔"

گیدڑی کو گیدڑ کی یہ بات اچھی نہیں لگی۔ وہ گیدڑ سے الجھ گئی کہنے لگی۔ "تو بہت بزدل اور کاہل ہے۔ جو تھوڑی سی دولت پر قناعت کر لیتا ہے وہ اس دولت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ اس کے علاوہ میں روز روز چوہے کا گوشت کھاتے کھاتے عاجز آچکی ہوں۔ بیل کا یہ گوشت بھرا لوتھڑا اب گرنے ہی والا ہے۔ اس کا پیچھا کرنا چاہیے۔"

چار و ناچار گیدڑ کو بیل کے پیچھے لگنا پڑا۔ سچ ہے عورت کی ضد مرد سے سب کچھ کرا دیتی ہے۔

تب سے گیدڑ گیدڑنی دونوں بیل کے پیچھے پیچھے گھومنے لگے۔ ان کی آنکھیں بیل کے بھرے بھرے جسم سے لٹکتے ہوئے گوشت کے لوتھڑے پر لگی ہوئی تھیں۔ مگر وہ لوتھڑا گرتا کاہے کو

پندرہ سال تک بیل کا پیچھا کرتے کرتے جب دونوں بوڑھے ہو گئے تو ایک دن گیدڑ نے کہا۔ "ارے بھئی یہ ضد چھوڑ دو۔ نہ معلوم یہ گوشت گرے نہ گرے۔ اب اس کی امید چھوڑ کر ہمیں اپنی راہ لینی چاہیے۔

باقی آئندہ

جناب بزمی بھارتی

جامعہ کے چار سال
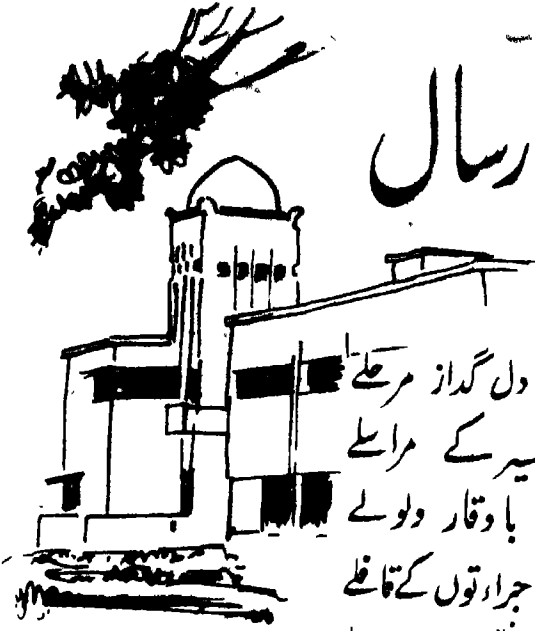
وطن کی سرزمین سے
ضرورتاً قدم اٹھے
کرن امید کی لیے
یقین کی روشنی لیے
عمل کی پختگی لیے
نشانِ زندگی لیے

گل مراد یوں کھلے
دماغ و دل مہک اٹھے
وہ لال لال راستے
پہاڑیوں کے سلسلے
گلاب کے وہ باغیچے
مرا نصیب بن گئے

وہ دل گداز مرحلے
ضمیر کے مراسلے
وہ باوقار ولولے
وہ جرأتوں کے قافلے
وہ فتح مند حوصلے

رہ فریب کار کے
ہر ایک امتحان سے
ہنسی خوشی گزر گئے
فریب میں نہ آسکے

شکست خوردہ وقت نے
فریب تو بہت دیے
مگر مری حیات کے
چہار سالہ فاصلے
جہاد ہی جہاد تھے
وہ ذمہ دار مسئلے

شریف والدین کے
بجھی بجھی دیے ہوئے
سبق مجھے جو یاد تھے
انیس و رہنما رہے
چراغ رہ گزر بنے

قدم اسی طرف بڑھے
صحیح تھے جو راستے

محترمہ سلمیٰ جاوید

گڈّے کی منگنی

"اے ہے ننھی! آج تو تم بہت مصروف نظر آرہی ہو۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ کمرے کو اتنا سجا رکھا ہے۔ اور اتنے سارے گاؤ تکیے بھی لاکر رکھ دیئے ہیں تم نے۔ خیریت تو ہے!"

"امی آپ کو یاد نہیں کیا؟ میں نے برسوں آپ سے کہا تھا ناکہ۔ بے بی اور ان کی کچھ سہیلیاں میرے گڈے کے ساتھ اپنی گڑیا کا رشتہ کرنے کے لیے آرہی ہیں"۔

"مگر گڈے میاں تو کہیں دکھائی نہیں دیتے۔ ان کو آخر بے بی اور اس کی سہیلیاں دیکھیں گی نا"

"امی میرے گڈے میں کیا کوئی خرابی ہے جو وہ اسے دیکھیں گی۔ اسے تو وہ سب نہ جانے کتنی بار دیکھ ہی چکی ہیں!"

"وہ تو ٹھیک ہے بھئی مگر روز کا دیکھنا تو دوسری طرح کا تھا۔ آج تو وہ اس نیت سے دیکھنے آرہی ہیں کہ تمھارے یہاں اپنا سمدھیانہ کریں۔ ایسی حالت میں تو تمھیں گڈے میاں کو خوب بنا سنوار کر آج یہیں رکھنا چاہیے"۔

"نہیں امی۔ پہلے بات چیت ہو جائے اور سب باتیں طے ہو جائیں تب گڈے میاں کو ان کے سامنے کروں گی"۔

"کیوں۔؟ کون سی باتیں آخر طے کرنی ہیں بھئی بے بی سے؟"

"یہی امی۔ کتنی ہی باتیں طے کرنی ہیں لین دین اور جہیز (تلک) کی باتیں"۔

"اے! تم تلک لوگی بے بی سے اپنے گڈے میاں کا؟"

"امی اس کا رواج تو عام ہے۔ پھر میرا گڈا کوئی ایسا گرا پڑا تو ہے نہیں کہ اسے کوئی گڑیا نہ ملے بیاہ کے لیے"۔

"بھئی یہ کون کہتا ہے کہ تمھارے گڈے میاں کو کوئی گڑیا بیاہ کے لیے نہ ملے گی!"

"تو امی جب دوسری سہیلیاں میرے گڈے کو تلک (چڑھاوا) دینے کے لیے خوشی سے تیار ہیں تو میں کیوں تلک نہ لوں آخر۔ اور پھر اس میں برائی کیا ہے؟"

"برائی تو خیر اس بات میں بہت ہے۔ لو دیکھو بے بی اور اس کی سہیلیاں بھی آگئیں اب تم لوگ آپس میں بات چیت کرو میں تم سب کے لیے چائے اور ناشتہ کا انتظام کروں"۔

"خالہ جان آداب!"

"جیتی رہوں بچیو!"

"آداب عرض ہے ننھی بہن"۔

"تسلیم عرض ہے بے بی بہن"۔

"یہ ہماری سہیلیاں ہیں۔ عذرا، ناہید، تبسم خورشید"۔

"تسلیمات عرض ہے بہن" (سب سہیلیوں کی ملی جلی آوازیں۔)

"تسلیمات عرض ہے بہنوں!"

"آئیے آپ سب لوگ اندر آجائیے۔ آخر یوں باہر کھڑے رہنے کا کیا مطلب ہے!"

"نھنی بہن ہم سب لوگ اس وقت اندر نہ آئیں گے جب تک آپ ہم سب سے وعدہ نہ کیجیے کہ ہماری بات مانیں گی!!"

"بھئی بے بی۔ دیکھیے یہ آپ بڑی کڑی شرط لگا رہی ہیں۔"

"ہاں شرط تو ضرور ہے" (سب سہیلیاں)

"اچھا میں وعدہ کرتی ہوں کہ آپ کی جو باتیں ماننے کی ہوں گی ان کو میں مان لوں گی۔"

"بھئی یہ جو، سو کی شرط نہیں۔"

"بھئی شرط کے ساتھ شرط تو ضرور ہوگی مگر کھڑے رہنے سے تو کوئی فایدہ نہیں۔ پھر بھی آپ کو یہی اچھا لگتا ہے کہ سب لوگ کھڑے کھڑے باتیں کریں تو لیجیے میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔"

"بہن نھنی ہم سب اپنی گڑیا کے لیے آپ سے گڈا مانگنے آئے ہیں۔"

تو بہنوں مجھے اس سے انکار کب ہے۔ آپ سب لوگ اب تو کمرے میں آجائیے۔"

(بے بی اور اس کی سہیلیاں کمرے جاکر سلیقے سے بیٹھ جاتی ہیں)

"بہن ہم نے باجی کو رائے دی کہ ان کی گڑیا سیانی ہوگئی ہے اور اللہ رکھے بڑے سلیقے کی ہے۔ بہت سگھڑ ہے، اور ماشاء اللہ تمہارا گڈا بھی بہت اچھا اور خوب صورت ہے دونوں کی جوڑی بہت اچھی رہے گی۔" عذرا اور ناہید نے کہا۔

"یہی بات تو میں بھی بے بی سے کتنے دنوں سے کہہ رہی ہوں کہ اتنا اچھا گڈا نہیں ملے گا جب کہ گڑیا اس قدر اچھی اور نیک ہے۔" تبسم مسکرا کر بولی۔

"اور بھئی میرا بھی یہی خیال ہے کہ نھنی کا جیسا گڈا اور بے بی کی جیسی گڑیا دونوں ڈھونڈھے نہ ملیں گی کتنے خوب صورت ہیں دونوں۔" خورشید نے لقمہ دیا۔

"ہاں بہن صرف یہی تو نہیں کہ نھنی کے پاس اتنا اچھا گڈا ہے اور میرے پاس اتنی سگھڑ گڑیا بلکہ میں اور نھنی ہر وقت کی ساتھ کھیلنے والی بہت اچھی سہیلی بھی تو ہیں۔"

"ہاں بہنوں مجھے اس بات سے انکار کہاں ہے۔ بے بی تو ہماری دل ملی بہن ہیں نا۔"

"تب پھر کیا بات ہے گڈے میاں کے لیے ہم سب کو زبان دو نا۔"

"بے بی بہن بات یہ ہے کہ ابھی تو ہمارے گڈا میاں پڑھ ہی رہے ہیں اور ان کی بھی خواہش ہے کہ جب خوب پڑھ لکھ کر کمانے کے لایق ہوجائیں تو گھر بسائیں۔"

"اللہ رکھے گڈا میاں کیا پڑھ رہے ہیں؟" ناہید نے پوچھا۔

"ہمارے گڈا میاں خیر سے بغدادی قاعدہ پڑھ رہے ہیں۔ الف مدآ، نون زبر نا، کاف دو پیش کم آنکم پڑھ رہے ہیں۔"

"تو بوا تمہارے گڈے میاں تو ماشاء اللہ کافی پڑھ چکے ہیں۔ ابھی ہمارے محلے میں چھوٹی کے گڈے کی شادی ہوئی ہے وہ تو الف زبر آ

بے زبر باہی پڑھ رہے ہیں۔" خورشید نے کہا۔

"اے تو اس میں ہرج ہی کیا ہے، شادی کے بعد بھی گڈا میاں پڑھتے رہیں کوئی ان کو منع تھوڑے کرے گا۔" ناہید نے چمک کر کہا۔

"چلو گڈے میاں کی پڑھائی کا آدھا خرچ ہماری بہن بے بی برداشت کریں گی۔" عذرا نے بات آگے بڑھائی۔

"خالی پڑھائی کا خرچ ہی نہیں ہماری بے بی تو گڈے میاں کو بہت کچھ دینے کو تیار ہیں۔" خورشید نے کہا۔

"آخر بی ننھی تمھاری بھی تو کچھ مانگ ہوگی۔ کچھ تو منہ کھولو!" عذرا نے کہا۔

"ہیں۔ بہن کیا کہوں۔ گڈے میاں کی تو بڑی بڑی فرمائشیں ہیں۔" ننھی بولیں۔

"کچھ ہم لوگ بھی تو سنیں کہ گڈا میاں کیا کیا چاہتے ہیں؟" سب نے پوچھا۔

"اب مثلاً یہی کہ وہ ٹرائی سکل چاہتے ہیں بے بی سکوٹر چاہتے ہیں۔ تاریخ بتانے گھڑی چاہتے ہیں۔ ٹرانسسٹر چاہتے ہیں۔ قلم، انگوٹھی اور سوٹ بوٹ تو خیر سب خود ہی دے دیتے ہیں۔" ننھی نے کہا۔

"تو یہ کہ تمھارے گڈا میاں، گڑیا سے نہیں بلکہ سامان سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔" ناہید بولیں۔

"اسی لیے تو بہن میں ابھی گڈے میاں کی شادی کی باتوں سے کتراتی ہوں نہ معلوم کیا کیا وہ مانگ بیٹھیں!" ننھی نے کہا۔

"اوئی بوا۔ کچھ ابھی باقی بھی رہ گیا ہے مانگنے کو!" عذرا نے کہا۔

"ویسے ان کی مانگ سلامی میں ایک ہزار روپوں اور موٹر کی بھی تو ہے جسے ننھی بہن بتا نہیں رہی ہیں!" خورشید نے چٹکی لی۔

"بہن آج کل کے گڈوں کو کون سمجھائے، بیٹھے بیٹھے گڑیا والوں سے نہ معلوم کیا کیا مانگ بیٹھتے ہیں۔ ابھی ہمارے محلہ میں ایک گڈے کی شادی ہوئی ہے۔ گڈے میاں کی مانگ بجلی سے چلنے والی ریل گاڑی کی تھی جسے گڑیا والوں نے منظور کر لیا۔" ننھی نے بات پھیلائی۔

"بہن کیا وہ گڈے میاں ڈرائیوری کرتے ہیں کیا؟" ناہید نے مسکراتے ہوئے پوچھ ہی لیا۔

"یہی بات تو میں خود ہی کہہ رہی ہوں کہ آج کل گڈے نہ معلوم کیا کیا مانگنے لگتے ہیں!" ننھی نے کہا۔

"بہن تم خود بھی تو بتاؤ کہ اور کیا کیا چیزیں تمھارے گڈے میاں کی فرمائشوں میں باقی رہ گئی ہیں۔" خورشید نے پوچھا۔

"اری بہن کوئی ڈھنگ سے بات کرے تو آدمی ساری باتوں کو سامنے رکھے بھی۔ آپ لوگ تو جیسے خالی مذاق اڑانے کی بات سوچ کر گھر سے آئی ہیں تو کوئی کیا سلیقے سے بات کرے۔" ننھی نے عجیب طریقے سے کہا۔

"واہ بہن آپ نے بھی کیا بات کہی۔ خدا نہ کرے ہم آپ کا مذاق اڑانے آئے ہوں۔ ہم لوگ تو گڑیا والے ہیں۔ آپ ہم کو دو بات بھی سنا لیں تو جواب نہ دیں۔" عذرا نے کہا۔

"تو ہاں بہن یہ آپ کے گڈے میاں ٹرائی سکل اور بے بی اسکوٹر دو چیزیں لے کر کیا کریں گے؟" خورشید نے پوچھا۔

"ہمارے گڈے میاں کا کہنا ہے کہ کمرے میں ہی ایک سرے سے دوسرے سرے تک

جانا ہے تو ٹرائی سکل سے چلے جائیں گے۔ اگر باہر لان تک جانا ہوا تو ٹرائی سکل سے مشکل پیش آئے گی۔ ایسے میں بے بی اسکوٹر کام دے گا۔ اب ان کی ضد ہے۔ اس کو میں کیا کروں!" ننھی نے بھولے پن سے کہا۔

"اور بہن آپ کے یہاں نکاح کا مہرانہ (مہر) کتنے کا ہوتا ؟" عذرا نے پوچھا۔

"ویسے ہمارے پورے محلے میں گڈوں کا مہرانہ تو ڈھائی آنے ہی ہوتا ہے مگر بے بی بہن اگر چاہیں تو پانچ آنے کر لیں کیا فرق پڑتا ہے۔" ننھی نے جواب دیا۔

"بہن ہمارے محلے میں تو گرے پڑے گڈوں کا مہرانہ بھی ہزار پیسوں سے کم بندھتا ہی نہیں۔" خورشید بولیں۔

"یہ تو اپنے اپنے محلہ کا رواج ہے بہن! ہمارے محلہ میں تو اسی قدر بندھتا آیا ہے۔" ننھی نے کہا۔

"اور بی گڑیا کو بڑی شادی کے لیے برات کے ساتھ یا اس سے پہلے جو زیور اور کپڑے گڈے والے گڑیا کے یہاں لے جاتے ہیں، ہیں کیا کیا دیتے ہیں اس محلہ میں؟" ناہید نے پوچھا۔

"بہن اپنے گھر آنے والی گڑیا کو دینے میں کوئی کنجوسی تھوڑے کرتا ہے جس کو جتنا میسر ہوتا ہے اتنا دیتا ہے۔ ہمارے محلہ میں گڑیا کو گلے، ہاتھ اور پیر کے زیور دیتے ہیں کیونکہ باقی سارے زیور تو وہ خود ہی اپنے ساتھ لے کر آتی ہے۔ دو تین جوڑے ذرا اچھے قسم کے کپڑوں کے بھی ہوتے ہیں۔" ننھی نے تفصیل بتائی۔

"ویسے ہمت تو نہیں پڑتی ننھی بہن کہنے لگیں گی کہ ہمارا سب مذاق اڑاتے ہیں ورنہ اس وقت تو یہی جی کہنے کو چاہتا ہے کہ میٹھا میٹھا ہپ ہپ، کڑوا کڑوا تھو۔" عذرا نے کہا۔

"بہن رواج سے الگ تو کوئی نہیں چلتا خواہ میٹھا ہو یا کڑوا۔" ننھی نے بات بنائی۔

"تو بہن ننھی گویا ہم سب لوگ مایوس ہو کر آپ کے دروازے سے لوٹ جائیں۔ یہی خواہش ہے نا!" بے بی جیسے روہانسی ہوگئی۔

"بہن آپ کا یہ گھر ہے آیئے جایئے ہمارے میل محبت میں کوئی فرق تھوڑی پڑتا ہے۔ اب رہا شادی بیاہ کے معاملہ میں مانگیں اور فرمائشیں تو ہوتی ہیں۔" ننھی بی کچھ نرم پڑ گئیں۔

"اچھا تو بہن ہم اب چلیں ؟" سب نے ایک آواز ہو کر کہا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ لوگ بغیر ناشتہ اور چائے کے چلی جائیں" ننھی نے کہا۔

"نا بہن ہم سب بے بی کے یہاں سے ناشتہ کر کے چلے ہیں۔ کوئی تکلف کی بات تو ہے نہیں۔" عذرا بولیں۔

"پھر بھی یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ لوگ اسی طرح سے چلی جائیں اور پھر ناشتہ او چائے میں رکھا ہی کیا ہے۔ یہ بھی کیا کوئی کھانا ہے۔" ننھی نے کہا۔

"ارے بچیو! تم سب اتنی جلدی چل دیں۔ یہ کیا۔ دیکھو ناشتہ اور چائے خوشبو لا رہی ہے۔ تم سب ناشتہ کر کے جاؤ نا۔"

"خالہ جان! یہ تو ہمارا گھر ہے ہمیں کوئی تکلف تھوڑے ہے۔ ویسے ہم سب بے بی کے یہاں سے ناشتہ کر کے آئی ہیں۔" سب نے کہا۔

"پھر بھی ناشتے اور چائے میں کیا رکھا ہے۔ کہو تم لوگوں میں کیا کیا باتیں ہوئیں۔"

"خالہ جان! ننھی بہن کے گڈے میاں کی اتنی لمبی لمبی مانگیں ہیں کہ وہ ہم سب سے کہاں پوری ہو سکتی ہیں۔" عذرا نے کہا۔

"مانگیں! ——— کیا مطلب!"

"خالہ جان! وہی تلک والا معاملہ" ناہید نے کہا۔

"یعنی ننھی اور بے بی آپس میں تلک کی بات کریں گی! میں تم لوگوں سے کیا سن رہی ہوں!"

"خالہ جان آپ ہی بہن ننھی سے پوچھ لیں!" خورشید نے مسکرا کر کہا۔

"کیوں ننھی کیا بات ہے آخر۔"

"امی اب گڈے میاں کو کیا کیا جائے۔ شادی تو ان کی کرنی ہے اس لیے ان کی مانگوں کو تو پورا کرنا ہی پڑے گا۔" ننھی نے بات بنائی۔

"خالہ جان! گڈا میاں ٹرائی سکل، بے بی اسکوٹر، قلم، انگوٹھی ٹرانسسٹر ہر قسم کے جوڑے اور نہ معلوم کیا کیا مانگتے ہیں۔" ناہید نے کہا۔

"ارے تم سب آپس میں اس طرح سے لین دین کی باتیں کرو گی۔ یہ باتیں تو اب سماج میں بھی بہت بری نظر سے دیکھی جاتی ہیں۔"

"مگر امی اس کو کیا کیا جائے کہ برا کہنے کے بعد بھی تو گڈے کی شادی میں وہی سب کچھ کرتے ہیں۔" ننھی نے کہا۔

"کرتے ہیں تو برا کرتے ہیں۔ بری بات کو کہیں نہ کہیں تو ختم کرنا ہی ہوگا اور یہ بری بات اور خراب رسم پہلے پہل تمہارے ہی گھر سے کیوں نہ ختم ہو۔"

"امی مگر محلے کی سبھی سہیلیاں تو مجھی کو 'نکو' بنائیں گی" ننھی نے رندھے ہوئے گلے سے کہا۔

"بھئی برائی کو ختم جو بھی کرے گا اس کو پہلی بار ضرور نکو بننا پڑے گا۔ مگر وہ وقت اب زیادہ دور نہیں کہ نکو بنانے والے خود ہی سیدھے راستے پر آجائیں گے۔ تم ہی پہلے اپنے گڈے کی شادی بغیر تلک کے کرو۔"

"جو حکم ہو آپ کا امی جان۔"

"شکریہ خالہ جان! ہم سب بھی انشاءاللہ بے بی کی مانگوں سے کہیں زیادہ اپنی گڑیا کو دیں گے۔ ——— ننھی بہن منگنی مبارک۔"

"اور بہنوں آپ سب کو بھی مبارک۔"

"لو بچو! اب سب ہنسی خوشی ناشتہ اور پیو۔" چائے پیو۔"

ـــ ـــ ـــ ـــ ـــ

محترمہ معروفہ تسنیم

ننھی منی کہانیاں

(ننھے پیامیوں کے لیے)

دو دوست

ندی کے کنارے امرود کا ایک پیڑ تھا۔ یہ پیڑ بہت پُرانا تھا۔ اس پیڑ پر ایک چڑیا رہتی تھی اور ایک کوّا رہتا تھا۔ کوّا اپنے گھونسلے میں اکیلا رہتا تھا چڑیا کے دو ننھے منے خوبصورت بچے تھے۔

کوّے میں اور چڑیا میں بڑی دوستی تھی۔ ایک دن کوّا بیمار ہوگیا اور اپنی خوراک کی تلاش میں باہر نہ جاسکا اس نے چڑیا سے کہا "پیاری چڑیا! جب تم اپنے بچوں کے لیے خوراک کی تلاش میں ہر جاؤگی نا تو کچھ کھانے کی چیزیں میرے لیے بھی لیتی آنا۔"

چڑیا نے کہا بہت اچھا۔ وہ بچوں کو سوتا چھوڑ خوراک کی تلاش میں نکل گئی۔

چڑیا کو گئے ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی۔ اتنے میں درخت پر کچھ آہٹ ہوئی۔ کوّے نے گھونسلے سے باہر سر نکالا۔ ایک بھوکی بلی چڑیا کے بچوں کو کھانے کی تاک میں بیٹھی تھی۔ ڈر اور غم سے کوّے کی سانس رُک گئی۔ وہ بچوں کو بچانے کی ترکیب سوچنے لگا۔

اچانک اسے ایک خیال آیا۔ وہ

اڑ کر بلی کے اوپر والی شاخ پر جا بیٹھا۔ اتنے میں بچے جاگ گئے۔ بلی کو دیکھ کر خوف سے چلانے لگے۔

کوا سوچ رہا تھا اگر وہ بچوں کو نہ بچا سکا تو چڑیا اسے شک کی نگاہ سے دیکھے گی۔ یہ سوچ کر وہ اپنی چونچ سے درخت پر لگے ہوئے بڑے بڑے امرود شاخ سے کاٹنے لگا اور کاٹ کاٹ کر نیچے پھینکنے لگا۔ اس کام میں اس کی چونچ بھی زخمی ہو گئی۔ اوپر سے کئی سخت امرود لگاتار بلی پر گرے۔ بلی بہت گھبرائی اور دوسری شاخ پر کودی۔ اتنے میں چار پانچ امرود ایک ساتھ بلی کے سر پر گرے۔ بلی کا سر پھٹ گیا۔ خون بہنے لگا۔ وہ میاؤں میاؤں کرتی بھاگ گئی۔

تھوڑی دیر میں چڑیا بھی لوٹ آئی۔ بچوں نے اُسے سارا قصہ سنایا وہ بہت خوش ہوئی۔ اس کے دوست نے دوستی کا پورا حق ادا کیا تھا۔ اس نے کھانے کا حصہ آدھا آدھا کیا اور کوے کو کھانے کے لیے اپنے گھر بلالائی اس کی تیمار داری بھی کی۔

غرور کا نتیجہ

گرمی کی شام تھی۔ سورج ڈوبنے والا تھا۔ ایک بارہ سنگھا اپنی پیاس بجھانے ایک تالاب پر پہنچا۔ اچانک اس کی نظر پانی میں اپنے عکس پر پڑی۔ وہ اپنے اتنے خوبصورت سینگوں اور سڈول جسم کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ بھلا قدرت نے اسے کتنے خوبصورت لمبے لمبے سینگ دیئے ہیں۔ خوشی اور فخر سے اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ پھر اچانک اس کی نظر اپنی ٹانگوں پر پڑی اور وہ اداس ہو گیا۔ سوچنے لگا کتنی عجیب بات ہے۔ اللہ میاں نے اتنے خوبصورت سینگ دیئے ہیں ایسا سڈول جسم دیا ہے۔ مگر ٹانگیں کتنی بدنما ہیں۔ اتنے میں ایک شکاری آن پہنچا۔ بارہ سنگھے کو اپنی جان کی پڑ گئی ایک طرف کو تیزی سے بھاگا۔ اپنی پتلی پتلی ٹانگوں سے وہ بہت تیز دوڑ رہا تھا۔

اچانک جنگل کی جھاڑیوں میں اس کے سینگ پھنس گئے۔ ہزار کوشش کی پر پھنسے ہوئے سینگ جھاڑی میں سے نہ نکل سکے۔ شکاری نے آکر اسے پکڑ لیا۔

بارہ سنگھا اپنے جی میں کہنے لگا۔ "میں کتنا کم عقل تھا۔ سینگوں پر مجھے گھمنڈ تھا وہی آج میری موت کا سبب بنے۔

مجاہدین آزادی

جناب مقبول احمد سیوہاروی

ٹیپو سلطان

(۲)

جنرل کارنوالس انگریزوں کا سب سے بڑا جنرل تھا اور بڑا ہوشیار اور مکار تھا، اس نے اپنی فوجوں کا حال سنا تو گھبرا گیا اور مکاری کے میدان میں فوجیں ڈٹادیں۔

تم کہو گے مکاری اور فریب میں میدان کہاں ہوتا ہے۔ مکار تو چھپ کر وار کرتا ہے، جی ہاں! تمھاری بات ٹھیک ہے۔ انگریزوں نے یہی کیا۔

مرہٹوں کو نظام حیدرآباد کو، اور خود سلطان ٹیپو کے امیروں کو پھانسا کسی کو ملک کا لالچ دیا کسی کو مذہب کا واسطہ دیا، کسی کو سونا چاندی اور عہدوں کا سبز باغ دکھایا اور اس طرح محاذ بنایا کہ سب طرف سے سلطان گھر جائے۔

غور کرو اس دنیا میں جو کوئی کسی سے فریب کرتا ہے۔ دھوکا دے کر مارتا ہے اور اس کی دولت لوٹتا ہے۔ خدا تعالے ایسا سبب پیدا کرتا ہے کہ دیر سویر یہ بھی برباد ہو جاتا ہے اور اسے وہ سب کچھ چھوڑ کر بھاگنا پڑتا ہے جسے مکر و فریب سے حاصل کیا تھا۔ اب آگے بڑھو۔

ٹیپو ایک مجاہد تھا اور مجاہد کی یہی شان ہوتی ہے کہ خدا کے سوا کسی سے نہ ڈرے بس یہی شان ٹیپو کی تھی۔

اس وقت پانچ جرنیلوں کا مقابلہ تھا پھر بھی انگریزوں نے اتنا نقصان اٹھایا کہ ہوش جاتے رہے مگر جب گھر والوں نے جن کے باپ دادا نے ٹیپو اور اس کے باپ حیدر علی سے جاگیریں پائی تھیں اور جنھیں ٹیپو نے بڑے بڑے عہدوں پر مقرر کر رکھا تھا۔ دھوکا دیا اور دشمنی کی جنھوں نے انگریزی فوجوں کی نقل و حرکت سے اپنے آقا کو بے خبر رکھا تو اکیلا ٹیپو کیا کرتا۔ یہ سب مسلمان تھے مسلمان! جنھوں نے ایک مسلمان مجاہد کو ایک محسن کو، ایک رعایا پرور بادشاہ کو۔ آزادی پسند بہادر سپاہی کو جو فقط ملک کی آزادی کے لیے لڑ رہا تھا۔ فقط عہدوں کی خاطر چاندی اور سونے کے سکوں کی خاطر دشمنوں سے گھروا دیا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے ماتھے پر کلنک کا ٹیکا لگا لیا!

ان میں میر صادق سب کا سرغنہ تھا میر قمرالدین سپہ سالار تھا بدرالزماں تھا معین الدین اور پورنیا تھا۔

ان کی نمک حرامی سے سلطانی فوج نہتی ہو گئی اور ان سب نمک حراموں نے اپنی نمک حرامی اس درجہ تک پہنچا دی کہ سلطان اپنی راج دھانی میں

لڑتے لڑتے شہید ہو گیا اور پھر وہی ہوا جس سے سلطان نے ہندوستان کے راجاؤں کو، مرہٹوں کو، اور دلی کو ڈرایا تھا کہ ہندوستان غلام بن گیا۔

حیدرآباد کی آزادی ختم ہوئی۔ ۱۸۰۰ء میں

مرہٹوں کا خاتمہ ہوا۔ ۱۸۰۲ء میں

دہلی پر قبضہ ہوا۔ ۱۸۰۳ء میں

یہ سب کتنے دن میں ہوا، فقط چودہ سال کے ہیر پھیر میں اور وہ مجاہد آزادی جس کا نام ٹیپو تھا۔ جو سودیشی تحریک کا بانی تھا۔ جو چوروں، رشوت لینے والوں کا دشمن تھا۔ جو سرکاری مال غبن کرنے والوں کی کھال اڑا دیتا تھا۔ اب بھی خدا کے سامنے سرخرو ہے کیونکہ اس نے انگریزوں کے سامنے سر نہیں جھکایا تھا۔

ٹیپو اب بھی زندہ ہے

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ

جو اللہ کی خوشنودی کے لیے مرتے ہیں وہ مرتے نہیں ہیں۔

سلطان ٹیپو کے چند واقعات

ظالمانہ کارروائی فوراً بند کرو۔

محی الدین علی خاں کو لکھا،

جو لوگ سالہا سال سے مکانوں میں رہتے ہیں اور جنھوں نے روپیہ لگایا ہے معلوم ہوا ہے کہ تم نے ان کے مکانوں کو مسمار کرا دیا ہے۔

یہ ظالمانہ کارروائی فوراً بند ہونی چاہیے، خبردار کسی کو اس کے گھر سے نہ نکالا جائے یہ ہماری مرضی کے خلاف ہے۔

دسہرہ کا تہوار

دسہرہ کے تہوار پر اپنے ماتحت ہندوؤں کو ہر دس آدمیوں پر ایک بکرا دیا جائے۔ اور مسلمانوں کو بقرعید پر اس حساب سے ایک بکرا دیا جائے۔ غیاث الدین و نور محمد خاں کے نام

فوج میں بھرتی

احسان اللہ خاں کے نام

اگر ہندو اپنی مرضی سے فوج میں بھرتی ہونا چاہیں تو انھیں بھرتی کر لیا جائے اور ان سب کے نام ہمیں لکھ کر بھیجے جائیں تاکہ ان کی تنخواہ بڑھا دی جائے۔

وطن پرستی اسے کہتے ہیں۔

سلطان ٹیپو نے عمر بھر اپنے دیس کے بنے ہوئے کپڑوں کے سوا دوسرا کپڑا نہیں پہنا۔

سلطان کی وطن پرستی اس درجہ تک تھی کہ بنگلور کے تاجروں نے مدراس سے نمک منگایا تو حکم دے کر فروخت بند کر دی۔ سلطان کا ایک خط ہے۔ یہ خط فراست کے نام ہے۔

تم نے اپنی فہرست میں ایسے عطریات کے نام لکھے ہیں جو یوروپین ملکوں کی پیداوار ہیں اب تم حکیم محمد سنگ سے مشورہ کر کے ان کی جگہ یونانی دوائیں تجویز کرو۔

سردار کنسا راج جو کسی زمانہ میں میسور کے دیوان تھے میتھک سوسائٹی جرنل میں لکھتے ہیں کہ جس تحریک کو آج سودیشی تحریک کہا جاتا ہے۔ اس کی بنیاد سلطان ٹیپو نے ڈالی تھی، تاکہ اپنے ملک کو غیروں کی محتاجی سے بچائے۔

(صحیفہ ٹیپو سلطان)

۷۷۷

رشوت لینے والوں کو حراست میں لے لیا جائے

سلطان کو اطلاع پہنچی کہ [illegible]

رشوت لی ہے۔ ایک کا نام پیر علی سنگ تھا، ایک کا سید قید اور ایک کا ابراہیم۔ حکم پہنچا کہ رشوت کی تحقیقات کی جائے صحیح ثابت ہو جائے تو ان تینوں سے رسالداری کی کمان چھین لی جائے اور انھیں حراست میں لے لیا جائے

سرکاری غبن پر کیا سزا ہے

سلطان کو خبر دی گئی کہ توپ خانے کے ایک افسر نے سرکاری رقم خرد برد کر لی ہے۔ حکم دیا کہ اس کی جائداد اور ملکیت کی تحقیقات کی جائے اور جہاں بھی مال اور رقم ملے اسے لے لیا جائے۔

یونانی اور ویدک

ایک دفعہ سلطان کے قریب والوں میں میر قمرالدین بیمار ہوئے۔ سلطان نے حکم دیا کشن پنڈت سے مشورہ کرو اور حاکم شاہ نور کے ذریعہ یونانی طبیب کو بلا کر دونوں کی رائے سے علاج کرو۔

غلط افواہیں

سلطان کے پاس اطلاع پہنچی کہ ایک ہرکارا غلط افواہیں پھیلاتا پھرتا ہے۔ حکم دیا کہ اس ہرکارے کو قید میں ڈال دو۔

چوروں کو پناہ نہ دو

راجہ رام چندر دیوان بنگلور کو ہدایت کی کہ ہمارے کسی علاقہ میں چوروں کو پناہ نہ دی جائے اگر کوئی چور مل جائے تو اسے سزائے موت دی جائے تاکہ دوسروں کو عبرت ہو۔

آج آزاد ہندوستان میں آزادی کے ان گنت سورماؤں کی شان دار یادگاریں منائی جاتی ہیں۔

مگر ٹیپو سلطان !!!

جناب عبدالمنان نسیم شولاپوری

اٹھو نیند سے اب سحر ہوگئی ہے

سفیدی سحر کی بکھرتی چلی ہے ★ اندھیرے کی چادر سمٹتی چلی ہے
ہوئی گم سیاہی ہوئے گم ستارے ★ لگے دل کو بہلانے رنگیں نظارے
پرندے اُڑے شور کرتے ہوا میں ★ لگے نیک بندے ہیں یادِ خدا میں
مچلتے ہیں سبزے پہ شبنم کے موتی ★ گلوں نے بکھیری ہنسی میٹھی میٹھی
ہوائیں چلیں صاف خوشبو، سمیٹے ★ لگے پھوٹنے بہتے چشموں سے نغمے
افق سے جو خورشید نے سر نکالا ★ منور ہوا گوشہ گوشہ جہاں کا
کرن جھلملائی فلک کی جبیں پر ★ کھلا بابِ جنت کا ساری زمیں پر
ہوا گرم بازار سارے جہاں کا ★ دھڑکنے لگا دل زمین آسماں کا
ہٹاؤ نگاہوں سے غفلت کا پردہ ★ خدا نے دیا ہے تمہیں دن سنہرا
نہ پژمردگی ہے، نہ افسردگی ہے ★ نئے ولولے ہیں، نئی زندگی ہے
جو کل تک نظر آرہے تھے ادھورے ★ وہی کام ہوجائیں گے آج پورے
اٹھو جلد اللہ کا نام لے کر ★ اسی کی حکومت ہے سارے جہاں پر
کرو تم سدا کام دنیا میں بہتر ★ رہے گا سدا رب مہرباں تم پر

وہی ہم کو دنیا میں شاداں رکھے گا
نہ ہم کو کبھی وہ پریشاں رکھے گا

جناب اقبال مہدی

ایک دن کیا ہوا

دوپہر کے کھانے کے بعد سب لوگ کمرے میں آرام کر رہے تھے۔ سلمہ اٹھی اور چپکے سے باہر نکلی۔ تھوڑی دیر بعد سلیم بھی آہستہ سے اُٹھ کر باہر نکل آیا۔ دیکھا سلمہ گھڑونچی کے پاس ہاتھ میں کٹورا لیے کھڑی ہے اور بہت غور سے زمین کو تک رہی ہے۔

سلیم بھی وہاں پہنچ کر دیکھنے لگا کہ سلمہ کیا دیکھ رہی ہے۔ زمین پر بہت سی چیونٹیاں اِدھر اُدھر آجا رہی تھیں لیکن اُن کی رفتار اور چلنے کے انداز سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ خالی چہل قدمی نہیں کر رہی ہیں بلکہ کسی کام میں مصروف ہیں —— دونوں وہیں بیٹھ گئے اور یہ پتہ لگانے کی کوشش کرنے لگے کہ یہ چیونٹیاں ہیں کس فکر میں۔

"شکر" سلمہ چلائی۔ اور اُس نے اُنگلی سے ایک چیونٹی کی طرف اشارہ کیا جو شکر کا ایک دانہ اٹھائے چلی جا رہی تھی۔

"اچھا۔ یہ کھانا جمع کر رہی ہیں" سلیم کی سمجھ میں آیا۔ دونوں پھر غور سے ہر ایک چیونٹی کو دیکھنے لگے۔ اور کسی چیونٹی کے پاس کچھ نہ تھا۔

کچھ دیر بعد سلیم نے دیکھا کہ وہ اکیلا ہے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی سلمہ نظر نہ آئی۔ اُس کا جی شکر کھانے کو چاہ رہا تھا۔ اکثر چاہتا تھا۔ امی منع کرتی تھیں۔ اب چیونٹی کے منھ میں شکر کا دانہ دیکھ کر اس کا جی پھر للچایا۔ منھ میں شکر گھلنے لگی۔ اُٹھ کر چپکے سے باورچی خانے کی طرف چل دیا۔ دیکھا سلمہ وہاں پہلے سے موجود ہے۔ اُس نے نعمت خانے سے شکر کا ڈبا نکال رکھا ہے۔ اور ڈبے کا ڈھکن کھول رہی ہے۔

سلیم کو دیکھ کر چونک پڑی اور اس انداز سے سلیم کو دیکھنے لگی۔ گویا چوری کرتے پکڑی گئی ہو۔

سلیم نے تیوری پر بل ڈال کر کہا "شکر چُرا رہی ہے؟ چور کہیں کی" اور پھر تھوڑی دیر رک کر کہا "لاؤ۔ میں بھی کھاؤں گا۔"

سلمہ ہنس پڑی۔ سلیم بھی ہنس پڑا۔ دونوں نے شکر کا ایک ایک پھنکا لگایا۔ دانے دار شکر منھ میں گھل کر مزہ دینے لگی۔ ایک ایک پھنکا اور لگانا چاہا۔ ڈبا سلمہ کے ہاتھ میں تھا۔ سلیم نے شکر نکالنے کے لیے ڈبا اُس سے لینا چاہا۔ سلمہ نے چھوڑا نہیں۔ دونوں نے ایک ہاتھ سے ڈبے کو اپنی اپنی طرف کھینچا۔ دونوں نے اپنا دوسرا ہاتھ شکر نکالنے کے لیے ڈبے کے اندر ڈالا۔ دونوں کے منھ میں شکر تھی۔ منھ بند تھے، بول نہ سکتے تھے۔ بولنا ویسے بھی مصلحت کے خلاف تھا۔ بس ایک دوسرے کو گھور رہے تھے اور "ہوں ہوں" کی آوازیں نکال رہے تھے

مارا زور ہاتھوں میں آگیا تھا کسی نے ڈبے کو نہ چھوڑا
اپنی اپنی طرف کھینچے اور دوسرے سے چھیننے کی کوشش
کرتے رہے۔
اس کھینچا تانی میں ڈبہ اُلٹ گیا۔ شکر فرش پر
بکھر گئی۔ ڈبا سلیم کے ہاتھ میں آگیا۔ سلیم نے ڈبے میں سے
اور سلمہ نے فرش پر سے تھوڑی تھوڑی شکر اٹھا کر منہ
میں ڈالی۔
اب اس چوری کو چھپانے کی فکر سوار ہوئی۔
فرش سے شکر اٹھا کر ڈبے میں ڈالی۔ شکر کے ساتھ مٹی بھی
اٹھ آئی۔ کچھ شکر فرش سے اٹھائی نہ جا سکی۔ اسے ہاتھ سے
ادھر ادھر پھیلا دیا۔ ڈبے کو نعمت خانے میں رکھا اور جلدی
سے باہر نکل گئے۔ جلدی میں نعمت خانہ بند کرنا بھول گئے۔
شام کو جب امی باورچی خانے میں آئیں تو نعمت
خانہ کھلا ہوا دیکھا۔ فرش پر شکر بکھری دیکھی۔ شکر کا ڈبا اٹھا کر
کھولا تو اس میں مٹی ملی ہوئی پائی۔ سمجھ گئیں۔ سلیم اور سلمہ
کو پکارا۔ دونوں دوپہر کا واقعہ بھول چکے تھے۔ دوڑکر
باورچی خانے میں آئے۔ جب امی نے شکر کے بارے میں
پوچھا تو بہت سٹ پٹائے۔ جی چاہتا تھا کسی طرح امی کی نظروں
سے غائب ہو جائیں۔
امی نے خوب ڈانٹا۔ دونوں گردن جھکائے۔
چور بنے کھڑے رہے۔

ـــــــــــــــــــــ

امرت نون

معدہ، جگر، نظام ہضم کی اصلاح کرکے تندرستی بخشنے
تندرستی کی حفاظت کرنے میں نامور دواخانہ کے اس عجیب الاثر
نمک کے خواص حیرت انگیز ثابت ہوئے ہیں۔ اس کے استعمال
سے ہضم کی تمام خرابیاں دور ہو جاتی ہیں۔ بھوک کی کمی، کھٹی
ڈکاریں، متلی، ریاح کی کثرت، کھانے کے بعد کی بے چینی،
درد معدہ، اور درد پیٹ کے لیے یہ اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔
قیمت بڑی شیشی 1/25 قیمت چھوٹی شیشی 62/۔
پتہ
محمد ذہین نامور دواخانہ اوکھلا۔ جامعہ نگر نئی دہلی

ذرا نیچے دیکھیے

ایک گول دائرہ سا بنا ہے۔ اس گول دائرے میں سرخ
نشان ہے۔ اس سرخ نشان کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی خریداری
کی مدت اس مہینے ختم ہو رہی ہے
ہمیں یقین ہے کہ پیام تعلیم آپ کو پسند آیا ہوگا اور آپ
اس کی سرپرستی جاری رکھیں گے۔
اس مہینے کی ۲۵ تاریخ تک مبلغ چھ روپے کا
منی آرڈر بھیج دیجیے اور ہاں منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر
ضرور لکھیے گا۔ آپ کا خریداری نمبر ہے۔
'منیجر'

شفیق احمد رودولوی - تھانہ

بچوں کی کوششیں

جھونپڑی کی قیمت

ایک شہزادہ شکار کرنے جنگل گیا۔ جنگل سے لوٹتے لوٹتے کافی رات ہو گئی۔ جاڑے کے دن تھے سردی زوروں پر تھی۔ شہزادہ اور سپاہی مارے سردی کے کانپ رہے تھے۔

چلتے چلتے انھیں ایک جھونپڑی نظر آئی۔ جھونپڑی بالکل ٹوٹی پھوٹی تھی۔ شہزادے نے سوچا اس جھونپڑی کو جلا کر آگ تاپنا چاہیے۔ اس نے اپنے ایک سپاہی کو حکم دیا "جا اگر کوئی اندر ہو تو اسے باہر نکال دے۔"

سپاہی نے اندر سے ایک بوڑھے شخص کو باہر نکالا۔ بوڑھا سردی کے مارے کانپ رہا تھا۔ شہزادے نے غصّے کی آواز بنا کر کہا۔ "چل بڈھے یہاں سے چلتا بن ہمیں تیری جھونپڑی جلا کر آگ تاپنا ہے"

بوڑھا بالکل گھبرا گیا وہ شہزادے کے پاؤں پڑنے لگا لیکن شہزادہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ پانچ دس روپے کی جھونپڑی کے لیے اتنا رونا پیٹنا ارے کل دوسری بنا لینا۔ سپاہی نے فوراً جھونپڑی کو آگ لگا دی بوڑھے شخص نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اس سے اپنے گھر کو برباد ہوتے نہ دیکھا گیا۔ سپاہی اور شہزادہ جلتی جھونپڑی کے ارد گرد بیٹھ کر آگ تاپتے رہے اور کچھ دیر بعد اپنے گھر کو روانہ ہو گئے۔

دوسرے دن بڈھا بانپتا کانپتا بادشاہ کے پاس گیا اور رو رو کر ساری داستان بادشاہ کو سنائی۔ بادشاہ نے شہزادے کو بلا کر اس بات کی تحقیق کی۔

شہزادے نے جواب دیا "دو پیسے کی جھونپڑی اس کے لیے اتنا جھگڑا کیوں، میں خود بھی ایسی جھونپڑی بنا سکتا ہوں"

راجہ بولا "تب ٹھیک ہے کوئی بات نہیں پھر اب دیر کس بات کی ہے، جاؤ اس بوڑھے شخص کے ساتھ اور اس کی جھونپڑی تیار کر کے دکھا دو۔ یاد رہے میری طرف سے تم کو نہ تو ایک پائی ملے گی جھونپڑی تیار کیے بغیر محل میں آنے کی اجازت ہے!"

شہزادہ غصّے میں بوڑھے کے ساتھ چلا گیا اور ایک ہفتے تک جھونپڑی تیار کرتا رہا جنگل میں جا کر اسے لکڑی توڑ کر لانا پڑی۔ دھوپ میں ادھر اُدھر بھٹکنا پڑا۔ پسینہ میں نہا کر بھی اسے محنت کرنا پڑی پیٹ بھرنے کے لیے مزدوری کرنا پڑی۔ بے مصیبت میں پڑ گیا۔

آخر جھونپڑی جیسے تیسے بنا کر وہ دوبارہ محل واپس آیا راجہ نے شہزادے کو اس حالت میں دیکھا تو کہنے لگا "اب تم کو معلوم ہوا ہوگا کہ ایک جھونپڑی کی قیمت کیا ہے، اور اس کے بنانے میں کتنی دشواریاں ہوتی ہیں"

شہزادے نے شرم کے مارے گردن نیچے جھکا لی۔

آگے قدم بڑھاؤ

اقبال احمد جامعی

پڑھنے میں جی لگاؤ | آگے قدم بڑھاؤ
اسکول روز جاؤ | ہرگز نہ جی چراؤ

جو دوسروں کے لیے کنواں کھودتا ہے۔

عزیز الـ

آپ نے یہ کہاوت تو اکثر سنی ہوگی "جو دوسروں کے لیے

کنواں کھودتا ہے۔ وہ خود اسی میں گرتا ہے۔"

اس کے پیچھے بھی ایک کہانی ہے۔ ایک یمن کا بادشاہ تھا اس کا نام تھا معتصم۔ اس بادشاہ کا ایک وزیر بھی تھا۔ ایک دن اس بادشاہ کے پاس ایک دیہاتی آیا۔ بادشاہ نے اس کے اوپر ترس کھا کر اس کو اپنے مصاحبوں میں شامل کر لیا۔ وہ اپنی محنت اور دیانت داری کی وجہ سے بادشاہ کی نظروں میں مقبول ہو گیا۔ بادشاہ کا وزیر اس سے جلنے لگا۔

ایک دن وزیر اس دیہاتی کو چپکے سے اپنے گھر لے گیا۔

اور وہاں اس نے دیہاتی کو لہسن کا سالن کھلایا۔ اور دیہاتی سے کہہ دیا کہ تم بادشاہ کے پاس مت جانا۔ کیونکہ ان کو لہسن کی بو بہت بری لگتی ہے۔ وہ تم کو محل سے نکال دیں گے۔ تمہارے منہ سے لہسن کی بو آتی ہے۔

ادھر وزیر نے بادشاہ سے کہا۔ جناب عالی آپ کا دوست دیہاتی لوگوں سے کہتا پھر رہا ہے کہ ہمارا بادشاہ بہت گندا ہے کیونکہ اس کے پاس سے بہت بری بدبو آتی ہے۔ بادشاہ کو یہ سن کر بہت غصہ آیا اور فوراً اس دیہاتی کو طلب کیا۔ جب دیہاتی بادشاہ کے پاس پہنچا تو اس نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا تاکہ بادشاہ لہسن کی بو نہ سونگھ لے اور بادشاہ یہ سمجھا کہ واقعی وزیر نے سچ کہا ہے۔ بادشاہ نے اپنے خاص جلاد کو ایک خط لکھا کہ وہ اس کو قتل کر دیں وہ خط بادشاہ نے اس دیہاتی کو دیا اور کہا کہ اس کو ہمارے فلاں آدمی کے پاس لے جاؤ۔ دیہاتی اس خط کو لے کر باہر نکلا تھا کہ وزیر مل گیا اور دیہاتی سے پوچھا۔ کہاں جا رہے ہو۔ دیہاتی نے کہا فلاں آدمی کے پاس

وزیر سمجھا کہ بادشاہ نے انعام وغیرہ کے لیے لکھا ہے۔ وزیر نے کہا کہ یہ خط مجھے دے دو اور اس کے عوض مجھ سے تین ہزار روپے لے لو۔ دیہاتی نے خط وزیر کو دے دیا اور روپے لے کر بادشاہ کے محل کی طرف لوٹا۔ جب وزیر اس آدمی کے پاس پہنچا تو اس نے اس کو قتل کر دیا۔ ادھر جب دیہاتی بادشاہ کے پاس پہنچا تو بادشاہ اس کو زندہ دیکھ کر حیرت میں پڑ گیا اور اس سے ماجرا پوچھا۔ دیہاتی نے تمام واقعہ بتا دیا۔ بادشاہ نے یہ سن کر کہا۔ "سچ ہے جو دوسروں کے لیے کنواں کھودتا ہے وہ خود اسی میں گرتا ہے۔"

(صرف خیال عربی سے لیا گیا)

نمک کے برابر

ام۔ اسلم

کسی ملک میں ایک بادشاہ رہتا تھا۔ اس کے تین بیٹیاں تھیں۔ بادشاہ سبھی بیٹیوں کو پیار کرتا تھا لیکن سب سے چھوٹی بیٹی کو بہت زیادہ چاہتا تھا

ایک دن بادشاہ کے دماغ میں ایک نئی بات سوجھی، اس نے سب سے بڑی لڑکی کو بلا کر پوچھا "تم مجھے کتنا چاہتی ہو؟" جواب ملا "پیارے ابا جان! میں آپ کو بادشاہت کے سونے اور چاندی سے بھی زیادہ چاہتی ہوں۔" باپ بڑا خوش ہوا۔ اس نے دوسری شہزادی کو بلا کر یہی سوال پوچھا۔ اس نے کہا "میں دنیا کے تمام ہیرے جواہرات سے بھی زیادہ چاہتی ہوں۔" بادشاہ خوشی کے مارے اچھل پڑا اور اس نے دل ہی دل میں سوچا جب بڑی مجھلی سے بھی زیادہ چاہتی ہے تو چھوٹی کا کیا پوچھنا اسے تو میں خود بھی بہت پیار کرتا ہوں۔ مگر اس کے جواب پر بادشاہ ہکا بکا رہ گیا۔ اس کے دل کو دھکا سا لگا۔

لڑکی کا جواب یہ تھا "پیارے ابا جان! میرے دل میں آپ کی محبت ایسی ہے جیسے نمک" باپ نے کہا "کیا میں تمہاری نظر میں اتنا گرا ہوا انسان ہوں۔ تمہاری بڑی بہنیں، سونا چاندی، ہیرے جواہرات سے تول رہی ہیں۔ اور تم معمولی نمک سے میرا وزن کر رہی ہو؟" وہ غصہ میں لال پیلا ہو رہا تھا۔

دوسرے دن دوپہر کو بادشاہ کھانے پر بیٹھا تو ایک ہی دو لقمہ کھانے کے بعد چلایا "باورچی کو بلاؤ کھانے میں نمک کیوں نہیں ڈالا گیا؟"

مگر باورچی کی جگہ خود چھوٹی شہزادی وہاں حاضر تھی۔ اس نے کہا "باورچی کا قصور نہیں ہے۔ میں نے اسے نمک ڈالنے کے لیے منع کر دیا تھا۔ اگر سارے مصالحے مہیا ہوں مگر

نمک نہ ڈالا جائے تو ساری غذا بدمزہ ہو جاتی ہے یہ کم قیمت اور حقیر بھی گو ہیرے جواہرات، سونا چاندی کے بغیر آپ زندگی گذار سکتے ہیں لیکن ! نمک کے بغیر ایک وقت بھی کھانا مشکل ہو جائے گا۔

چھوٹی بیٹی کی یہ بات سن کر بادشاہ بالکل خاموش ہو گیا اس نے اپنی غلطی محسوس کی۔ (انگریزی سے)

نیکی کا صلہ بدی سے توبہ

سیدہ میمونہ حسنی

کردار:۔ ابن ساباط (ڈاکو) اجنبی (حضرت جنید بغدادیؒ) حلوائی

شام کا وقت:۔ ۷ بج کر ۲۵ منٹ

منظر:۔ ایک چھوٹے سے مکان کے کمرے میں ایک چراغ جل رہا ہے ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی ہے۔

ڈاکو:۔ ابن ساباط :۔ کمرے میں بیٹھا جلدی جلدی تمام کپڑے سمیٹ رہا ہے مگر اس کا ایک ہاتھ کٹا ہوا ہے۔ اس لیے کپڑے نہیں باندھ پاتا ایک ہاتھ سے باندھتا ہے مگر کھل جاتا ہے۔ ڈاکو پریشان ہے کیا کرے کیا نہ کرے (دفعتہً ایک آدمی کمرے میں داخل ہوتا ہے۔)

اجنبی:۔ (حیرت سے) یہاں کون ہے؟

ابن ساباط: (چونک کر) تم کون ہو؟

اجنبی:۔ میں اس مکان کا مالک ہوں۔

ساباط:۔ (حیرت سے) تم اس مکان کے مالک ہو؟

اجنبی:۔ (نرمی اور شفقت سے) ہاں مگر تم ہو کون؟

ساباط:۔ میں ڈاکو ہوں۔

اجنبی:۔ (چاروں طرف دیکھتا ہے) اوہ..... میرے دوست تم یہ کپڑے اٹھا رہے ہو اور تم سے نہیں اٹھ رہے ہیں میرے دوست جب تم کو اس کی ضرورت تھی تو مجھ سے کہہ دیتے یوں چوری چھپے لے جانے کی کیا ضرورت تھی۔

ساباط:۔ مگر میں تھک گیا ہوں۔

اجنبی:۔ (جلدی سے) ہاں..... ہاں ذرا آرام کر لو جب تک میں دودھ لاتا ہوں۔ (چلا جاتا ہے)

(ابن ساباط بیٹھا سوچ رہا ہے کہ یہ اس مکان کا مالک تو نہیں معلوم ہوتا اس لیے کہ یہ اتنی خاطر تواضع کر رہا ہے اور کوئی ہوتا تو پولس کو خبر کر دیتا۔۔۔ ہرگز نہیں یہ مکان کا مالک نہیں ہے اتنے میں اجنبی آجاتا ہے اور دودھ دیتا ہے)

ساباط:۔ بہت تھکا ہوا ہے اس لیے ایک ہی سانس میں پی جاتا ہے۔

اجنبی:۔ اب چلو تمھارے کپڑے بندھوا دیں (دونوں گٹھ باندھ لیتے ہیں) دیکھو بھئی تم لے لو بڑی میں لے لوں (دونوں ایک ایک گٹھری لے کر چلتے ہیں۔ اتنے میں ڈھال آجاتی ہے اور اجنبی ڈاکو پہ گرتا ہے۔ ساباط بوڑھے کو ڈانٹتا ہے۔ اے اندھے جب چل نہیں پاتا تو آیا کیوں تھا بیوقوف کہیں کا۔۔ (اجنبی جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہوتا ہے تھوڑی دیر میں ساباط کا گھر آجاتا ہے)

ساباط:۔ اس جگہ اتار دے (دونوں ایک پتھر پر سامان رکھ دیتے اور خود ایک جگہ بیٹھ کر ستاتے ہیں۔ تھوڑی دیر ستانے کے بعد بوڑھا کھڑا ہوتا ہے۔)

اجنبی:۔ اب میں جاتا ہوں۔ یہ لو میرا پتہ جب بھی تم کو کسی چیز کی ضرورت ہو۔ دوست میرے یہاں آجانا میں تمھاری ضرورت پوری کر دوں گا۔

(چلا جاتا ہے) صبح کی آمد ہو رہی ہے اذان کی آواز آرہی ہے۔ لوگ جوق در جوق مسجد کی طرف بھاگے جا رہے ہیں۔ ساباط اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اجنبی کے گھر جاتا ہے اجنبی کے گھر کے سامنے ایک حلوائی ہے ساباط اس سے پوچھتا ہے)

ساباط:۔ اس مکان میں جو آدمی رہتے ہیں وہ کون ہیں۔

حلوائی:۔ ان کو کون نہیں جانتا وہ حضرت جنید بغدادیؒ ہیں

ساباط:۔ اچھا..... (اجنبی گھر کے اندر چلا جاتا ہے اور جاتے ہی ان کے پاؤں پر گر پڑتا ہے کہتا ہے)

بقیہ صفحہ پر

نام :- سید علی جعفر جعفری۔
عمر :- ۱۳ سال۔
مشغلے :- کورس کی کتابوں کے علاوہ بچوں کے سب رسالے چچا جان سے پہلے پڑھ ڈالنا۔ دوستوں کے خط کا جواب پابندی سے لکھنا۔
پتہ :- معرفت پروفیسر عادل جعفری صاحب
۷۰، راوشا گنج
اندور - ۱ (ایم۔ پی)

نام :- انصار احمد رہتاسوی - عمر ۱۲ سال۔ تعلیم ہفتم
مشغلے :- پیام تعلیم اور نئے نئے پرچوں کا مطالعہ کرنا غریبوں کی مدد کرنا۔
پتہ :- معرفت ظفر بکڈپو۔ اکبر پور۔ ڈاکخانہ رہتاس۔
ضلع شاہ آباد (بہار)

نام :- حدیث النساء فردوس۔ عرف منّی
عمر :- ۱۲ سال۔
مشغلے :- پیام تعلیم و کلیاں کا مطالعہ کرنا۔ لڑکیوں سے قلمی دوستی۔
پتہ معرفت محمد امین خاں محلہ دکھنواری۔ مقام اکبر پور
رہتاس۔ شاہ آباد (بہار)

نام :- محمد ارمغان ساحل سہسرامی۔ عمر ۱۵ سال

پتہ :- معرفت پروفیسر اظہر حسین۔ محلہ منڈی
پوسٹ سہسرام (ضلع شاہ آباد)
مشغلے :- شعر و شاعری کرنا۔ کہانیاں لکھنا۔ کرکٹ کھیلنا اپنے کلاس میں اول آنا۔ پیام تعلیم پڑھنا اور سبھی بھائی بہنوں کے خطوں کا جواب دینا۔

نام :- محمد ایوب عثمانی - عمر ۱۴ سال
پتہ :- محمد ارمغان ساحل سہسرامی۔ محلہ منڈی کشور خاں
سہسرام (ضلع شاہ آباد)
مشغلے :- کہانی لکھنا۔ کورس کی کتاب پڑھنا۔ فٹ بال کھیلنا بچوں سے پیار کرنا۔ پیام تعلیم پڑھنا۔ بھائی بہنوں کے خطوط کا جواب پابندی سے دینا۔

نام :- علیم الحق - عمر ۱۶ سال
پتہ :- معرفت محمد ارمغان ساحل سہسرامی۔ محلہ منڈی کشور خان سہسرام ضلع (شاہ آباد) بہار
مشغلے :- پیام تعلیم پڑھنا، فٹ بال کھیلنا، بھائی بہنوں کے خط کا جواب پابندی سے دینا۔

نام :- شمع جہاں تنہا۔ عمر ۱۶ سال
مشغلے :- بھائی بہنوں سے دوستی، پیام تعلیم کا مطالعہ
پتہ :- معرفت چوبے جی ڈاکیہ
موضع سرپیور نمبر ۲ کولیری
پوسٹ کالی پہاڑی - ضلع بردوان

جون سے پیام تعلیم میں آدھی ملاقات کے کالم میں تخلیق انجم اشرفی صاحب کا خط نظر سے گزرا۔ کہانی "آیٹو بجا اسٹیشن" کے بارے اگر میں یہ لکھوں تو غلط نہ ہوگا کہ بھائی کلیم اشرف جیلانی صاحب نے میری ہی اصل کہانی کو دوسرے پیراہن میں لاکھڑا کیا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ یہ کہانی میں نے ۱۹۶۵ء میں گورنمنٹ انٹر کالج رائے بریلی کے میگزین کے لیے لکھی تھی۔ اس کے بعد اسی کہانی کو ۱۹۶۶ء میں ایم۔ ایس۔ وی انٹر کالج سلطان پور کے میگزین میں بغرض اشاعت دیا تھا۔ افسوس کہ دونوں ہی میں یہ شایع نہ ہو سکی اور کالج ہی سے کسی طرح کلیم صاحب کو دستیاب ہو گئی۔ بس انھوں نے موقع سے فایدہ اٹھایا اور کہانی میں نمایاں رد و بدل کر کے جولائی ۱۹۶۸ء کے "کھلونا" میں اسے شایع کر دیا۔ میرا کلیم صاحب کو نیک اور دوستانہ مشورہ ہے کہ اب وہ کسی کی تخلیق کا چربہ اس طرح اتارنے کی کوشش نہ کریں اور اگر ضرورت ہو تو براہِ راست مجھے لکھیں میں ان کی ہر ادبی اور ممکن مدد کو تیار رہوں۔ اس طریقہ سے وہ بدنامی سے بچیں گے اور چربا اتارنے کی زحمت سے بھی۔

خدا پیام تعلیم کے نکھار اور بانکپن کو ہمیشہ قائم رکھے۔ اسے دن دونی رات چوگنی ترقی دے اور ادبی دنیا میں یہ ایک درخشندہ ستارہ بن جائے (آمین)، میں پیام تعلیم کے خریدار بنانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ انشاء اللہ جلد ہی چندے بھی بھجواؤں گا۔

ظفر ردولوی
جنرل سکریٹری بزم حسینیہ ردولی

★

"پیام تعلیم" کا مطالعہ برابر جاری ہے۔ پرچہ نکھرتا جا رہا ہے۔ پتہ نہیں آپ لوگ اس کا معیار کتنا بلند کریں گے۔ خدا کرے "پیام تعلیم" کے ذریعہ بچوں کے اندر صالح ادب کا ذوق پیدا ہو اور بہترین معلومات کا ذخیرہ۔ تازہ شمارہ بھی سابقہ شماروں سے کم نہیں اس کے بلند پایہ مضامین سے بڑے بھی فایدہ اٹھا سکتے ہیں۔

مقیم شاد (مونگیری)

★

نیا شمارہ نظر نواز ہوا۔ ہمیشہ کی طرح دیکھتے ہی طبیعت خوش ہو گئی۔ کیونکہ ٹائیٹل ہی کچھ ایسا تھا۔ اسی طرح مضامین میں آئس کریم کی کہانی، کھیل اور کھلاڑی، انوکھا جیب کترا، گری کا فسانہ، پیسہ کی کہانی، سہانا خواب، گڑیا بنائیں، وغیرہ وغیرہ بہت اچھے ہیں۔

یہ جان کر از حد مسرت ہوئی کہ پیامی، پیام تعلیم کے لیے نئے نئے خریدار بنا رہے ہیں ان کی یہ محنت قابل ستائش ہے۔ خدا انھیں اور توفیق دے۔ آمین

پیام تعلیم کے ذاکر نمبر اور سالنامہ کی یاد اب تک دل پر نقش ہے۔

خیال انصاری۔ (مالیگاؤں)

★

جولائی کے شمارہ کے لیے مجھے بالکل انتظار نہ کرنا پڑا یعنی ٹھیک وقت پر مل گیا اور بہت خوشی ہوئی۔

بھائی جان! میں آپ کی خدمت میں ایک حقیر سی رائے دینا چاہتا ہوں۔ وہ رائے پیام تعلیم کے سلسلے میں ہے۔ اگر آپ پیام تعلیم میں کوئی انعامی مقابلہ شروع کر دیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔

ایم پرویز (شری ایوان)

★ ★

آپ کے پیام تعلیم کا ہر مضمون ایسا پیارا ہوتا ہے کہ چند بار پڑھ کر طبیعت بھی چاہتی ہے کہ پڑھتا رہوں۔ اور سائز آپ نے بڑا کر دیا مضمون بھی زیادہ ہو گئے۔ اور ٹائٹل بھی بہت خوبصورت ہوتے ہیں۔ خدا سے دعا ہے کہ جلد ترقی کا سامان کرے کیونکہ یہ پیام تعلیم سب اردو جاننے والوں کا اپنا رسالہ ہے۔ دیگر اگر آپ صاحبان کو یہ بات بھی سمجھائی جائے تو کوئی حرج نہیں (کیونکہ اپنا رسالہ ہے) اگر جلد ۵ کے بعد میں اگر جیسے سنہ عیسوی ہے اگر اس کے ساتھ سن ہجری بھی ہو تو بہت ہی اچھا ہو اس واسطے کہ یہ اپنا رسالہ ہے اور ہر اردو شیدائی کا رسالہ ہے۔ ہر اردو اخبار میں دونوں ہی سنہ ہوتے ہیں۔ دلی دعا ہے کہ خدا ترقی فرمائے۔

چھٹو میاں مرادآباد محلہ طیلہ

عین عالم انتظار میں پیام تعلیم کا تازہ شمارہ ملا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ ہمارے اس تحفے کو سجانے سنوارنے میں بہت محنت سے کام لے رہے ہیں۔ اس بار کا پیام تعلیم بھی بہت خوب ہے۔ "سہانا خواب" "جولائی" "دو دوست کی پہچان" نظمیں بھی بہت اچھی ہیں۔
کہانیوں میں "انوکھا جیب کترا" "قربانی" "بچوں کی کوششیں" کہانیاں بھی قابلِ ستائش ہیں۔ باغبانی اور بیسہ کی کہانی جیسی معلوماتی مضامین پیام تعلیم کے حسن میں چار چاند لگا رہے ہیں۔

مختار احمد (ذمانیہ)

عرصے سے "پیام تعلیم" کا مطالعہ کر رہی ہوں مجھے بے حد پسند ہے اور دن بدن حسین ہوتا جا رہا ہے۔ اس میں ہر چیز اچھی ہوتی ہے خدا آپ کو ہمت دے کہ آپ اسے اور بھی خوبصورت بنائیں۔ اگر اسی آب و تاب سے نکلتا رہا تو مجھے یقین ہے کہ ضرور ایک دن بلندیوں پر پہنچ جائے گا۔ بیشک یہ آپ ہی حضرات کی محنت و جرأت کا نتیجہ ہے۔

قمر سلطانہ لکھنو

پیام تعلیم دیکھا، دنیا کا حال پایا۔ نفسیات، سائنس، تاریخ، ادبیات، حیوانیات و نباتیات ہر فن میں پیام تعلیم یکتا ہے۔ جس نگاہ سے دیکھا پھلا پھولا پایا۔ اس لیے یہ ایک معیاری پرچہ ہے۔ اس کی مٹھاس بہت مزے دار ہے بہت دیرپا ہے۔ ایک بار پڑھنے سے دوبارہ پڑھنے کی خواہش ہوتی ہے۔ پھر بھی تشنگی رہ جاتی ہے۔ "بچوں سے باتیں" میں آئندہ شمارہ کی جھلک دیکھ کر تشنگی اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ آئندہ شمارہ کا انتظار بے قرار کیے رہتا ہے۔ یہ صرف بچوں کا ساتھی نہیں بلکہ ہر سن کے لوگوں کا بہترین دوست ہے اپنا پیام بے شک پورا کر رہا ہے۔

اقبال نعمی
اٹکی رانچی (بہار)

پیام تعلیم کا تازہ ترین شمارہ موصول ہوا۔ شکریہ قبول فرمائیں۔ اس شمارہ کا سرورق بہت ہی حسین ہے۔ "بچوں سے باتیں" کے تحت جو آپ کی تحریر ہوتی ہے اس سے میں بہت متاثر ہوتا ہوں۔ سچ کہتا ہوں مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے میں خود آپ کے سامنے محوِ گفتگو ہوں۔ جناب عبدالملک صاحب کا "مکے کے رمضان" بہت پسند آیا۔ واقعی اتنی مدت گذر جانے پر بھی وہاں کے لوگوں کا مذہبی جوش و خروش اور عبادت کا شوق وہی ہے۔ عادل جعفری صاحب کی نظم بہت پسند آئی۔ میرے خیال میں پیام تعلیم کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

ایم اسلم۔ سکریٹری انجمن ترقی اردو

چوہے موٹر کھا گئے

اب تک تو ہم آپ یہی جانتے تھے ناکہ لوہے یا تانبے پیتل پر چوہوں کا بس نہیں چلتا یا دانت نہیں چلتے۔ اچھا اب ایک خبر سنیے۔ آپ کو یقین آئے نہ آئے پر خبر تو چھپی ہے۔ ابھی تھوڑے دنوں پہلے کی ہے۔

ہوا یہ کہ اٹلی کے کسی شہر میں ایک صاحب کو کہیں باہر جانا تھا۔ اپنی موٹر گیراج میں بند کر کے چلے گئے۔ تھوڑے دنوں بعد واپس آئے۔ موٹر کی ضرورت ہوئی۔ موٹر گیراج کھولا۔ مگر یہ کیا!! جونہی انھوں نے گیراج کا دروازہ کھولا ان گنت چوہے گیراج میں سے جیسے ابل پڑے۔ اور جب یہ صاحب اور اندر گھسے پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ یوں سمجھیے کہ موٹر غائب تھی۔ چوہے موٹر کا انجن یا مشین تک کھا گئے تھے۔ کہیں کہیں نیچے فرش پر اک ذرا تھوڑا سا لوہے کا برادہ ضرور بکھرا پڑا تھا۔

پلاسٹک کے مرد

آسٹریلیا میں پلاسٹک کے بنے ہوئے مصنوعی مرد تیار کیے گئے ہیں۔ یہ انسانی قدو قامت کے ہوتے ہیں۔

ان مصنوعی مردوں میں ہوا بھر کر انھیں کار کی اگلی نشست پر عورتوں کے ساتھ بٹھا دیا جاتا ہے جو رات کے وقت کہیں آتی جاتی ہیں۔ جب ان کے سروں پر ٹوپی رکھ دی جاتی ہے تو وہ بالکل مرد دکھائی دیتے ہیں۔

اسی طرح جو عورتیں رات کے وقت گھروں میں اکیلی رہتی ہیں وہ ایک روشن کمرے میں ان مردوں کو بٹھا دیتی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گھر میں مرد موجود ہے۔ یہ مرد انتہائی خوب صورت ہوتے ہیں۔ ان کے بال کالے ہوتے ہیں اور بھورے رنگ کے سوٹ میں ملبوس ہوتے ہیں۔ قمیص سفید اور نکٹائی نیلی ہوتی ہے۔

اگر آپ اس قسم کے کسی نقلی مرد سے اکتا جائیں تو اس میں سوئی چبھو دیجیے اس کی ہوا نکل جائے گی اور وہ غائب ہو جائے گا۔

حجری دور یا پتھر کے زمانے کا نیکلیس

دریا والگا کے کنارے ایک گاؤں ہے پولیا کا اس کے قریب ایک جزیرہ ہے۔ اس گاؤں میں جو پتھر پائے جاتے ہیں وہ عام قسم کے ہوتے ہیں۔ البتہ نارنجی رنگ کے چھوٹے چھوٹے پتھر بھی کبھی کبھی دستیاب ہو جاتے ہیں۔ یہ پتھر خود اختیار جمہوریہ تاتار کے ماہرینِ آثارِ قدیمہ کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ اور پی۔ استاروستین کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ کھدائی کے دوران انھیں ہلکے بادامی رنگ کا ایک تودہ دکھائی دیا۔ جب مٹی ہٹائی گئی تو ایک زنانہ قبر نمودار ہوئی۔ اس قبر کو کھودنے پر ایک حیرت انگیز نیکلیس دستیاب ہوا۔ اس کے سارے آویزے خوش رنگ سلیٹ کے بنے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ پرانے زمانے

(حجری دور) کی کسی فیشن پرست خاتون کا نیکلیس ہے۔ اس نیکلیس کے علاوہ پتھر کے بنے ہوئے آلات بھی دستیاب ہوئے تحقیقات پر پتہ چلا کہ یہ ساری چیزیں حجری دور کی ہیں اور مشرقی یورپ میں ایسی چیزیں بہت ہی نایاب ہیں۔

بات چیت کرنے والی مشین

ایسی سیبرنٹیک مشین جو انسان سے گفتگو کر سکتی ہو اور اس کے سوالات کا جواب دیتی ہو کوئی سائنسی فسانہ یا خوش خیالی نہیں رہی بلکہ ایک ایسا ٹھوس کام بن چکی ہے جسے انجینیری انجام دے سکتی ہے۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کے طریقوں پر اور مشین کو انسان کی بات چیت سمجھنے کی تعلیم دینے میں حاصل شدہ ابتدائی کامیابیوں پر ایک کانفرنس میں بحث کی گئی ہے یہ کانفرنس حال ہی میں تاشقند میں منعقد ہوئی تھی۔ اس کانفرنس میں سوویت سائنس دانوں نے بتایا کہ انھوں نے ایک برقی کمپیوٹر کو ۵۰ الفاظ کی جن میں دس ہندسے بھی شامل ہیں شناخت کرنا سکھایا ہے۔ ان الفاظ کو ترتیب دینے سے ایسے جملے بنتے ہیں جنھیں یہ مشین سمجھ لیتی ہے۔

کیا اس مشین کو گفتگو کرنا سکھایا جا سکتا ہے؟ اس سوال کا جواب اثبات میں ہے۔ سوویت سائنس دانوں کا خیال ہے کہ آئندہ جو برقی کمپیوٹر تیار کیے جائیں گے اور جو ایک سکنڈ کے اندر ہی کروڑ ہا کام انجام دے سکیں گے ان کے مصنوعی کان ہوں گے اور گفتگو کرنے کے لیے "برقی زبان"

ی۔ (اے پی این)

...ی دریافت

سوویت یونین میں وخش کی وادی ...ں ایک پرانی عمارت کا پتہ چلا ہے۔ ماہرِ آثارِ قدیمہ ...ہونسکی نے خبر دی ہے اس عمارت کی دیواریں اور محرابیں تصویروں سے آراستہ تھیں، چبوتروں پر مٹی کے چھوٹے بڑے بت تھے، ایک لمبے دالان میں لیٹے ہوئے مہاتما بدھ کا لیٹا ہوا مجسمہ تھا یہ مجسمہ ۱۲ میٹر سے بھی زیادہ لمبا تھا مجسمہ لباس میں تھا۔ ہاتھ سفید تھے، پیروں میں پیلی کھڑاویں تھیں، بالکل زندہ معلوم ہوتا تھا۔ اس مجسمے کو ٹھیک ٹھاک کیا جا رہا ہے۔

ہوائی کرینیں

لینن گراد کے انجینیر بڑے بڑے غبارے بنا رہے ہیں ان کی مدد سے عمارت بنانے کا ۵۰ ٹن تک کا وزن بلندی پر اٹھایا جا سکے گا۔ ان غباروں کی کرینوں پر انجن لگے ہوں گے اور انھیں رسوں سے لگایا جائے گا۔ ان ہوائی کرینوں کی خوبی یہ ہے کہ ہوا کی رفتار ۲۰۔۲۵ میٹر فی سکنڈ ہو۔ تب بھی یہ کام کر سکتی ہیں۔ اتنی تیز ہوا میں ہیلی کوپٹر اور زمینی کرینیں کام نہیں کر سکتیں۔

انٹارکٹک میں بارش

ایک عجیب بات سنیے۔ انارکٹک میں بھی بارش ہوتی ہے، سوویت سائنسدان ۱۲ سال سے اس برفانی براعظم پر کام کر رہے ہیں۔ یہ عجیب منظر انھی نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ انارکٹک کے جزیرے (واٹرلو ذکنگ جارج) پر موسلا دھار بارش ہوئی اس وقت ہوا کا ٹمپریچر ۵ درجہ سینٹی گریڈ تھا۔ ایک اور دلچسپ بات ہے ٹھیک اسی وقت "دنیا کے سردی کے قطب" یعنی "ووستوک" اسٹیشن پر تھرمامیٹر مائنس ۴۵ ڈگری بتا رہا تھا۔

پیٹ کے کیڑے مارنے کی نئی دوائی

وفاقی جمہوریہ جرمنی کے ایک ممتاز کیمیائی

کارخانے نے سالہا سال کی انتھک کوششوں کے بعد آنوٹ نیٹ (onito) نامی ایک دوا ایجاد کی ہے یہ پیٹ کے اندر داخل ہوجانے والے طفیلی کیڑوں کو مار ڈالتی ہے۔ اس دوا کا کئی ملکوں میں کامیابی سے تجربہ کیا جارہا ہے۔

ڈاکٹروں کے اندازوں کے مطابق گرم اور نیم گرم علاقوں (سرد معتدل علاقوں میں کسی قدر کم) اس کرم شکم کی بدولت کروڑوں انسان کئی خون کا شکار پائے جاتے ہیں۔ پچھلے زمانے میں اس موذی بیماری سے مرنے والوں کی تعداد دس لاکھ سالانہ تک پہنچی ہے۔

آگ بجھانے والے نوعمر رضاکار

آگ بجھانا بھی اب ایک فن بن گیا ہے آگ بجھانے کی طرح طرح کی مشینیں ایجاد ہوگئی ہیں۔ یورپ تو یورپ خود اپنے دیس کے قریب قریب سبھی بڑے شہروں میں آگ بجھانے کے محکمے بن گئے ہیں۔ یہ محکمے شہر کی میونسپل کمیٹیوں یا کارپوریشنوں کے ماتحت ہوتے ہیں۔ آگ بجھانے کے لیے ایک طرح کی تربیت دی جاتی ہے اور وہی لوگ اس کام کے لیے چنے جاتے ہیں جن کے پاس تربیت کی سند ہوتی ہے۔

مغربی جرمنی کے مشہور شہر ہم بورگ کی ایک نواحی بستی میں ان دنوں بارہ لڑکے آگ بجھانے والے نوجوان دستے میں داخلے کے لیے ایک سال کی عملی تربیت حاصل کررہے ہیں ان سب کی عمریں ۱۲ اور ۱۶ سال کے درمیان ہیں۔

حفاظت کے خیال سے انھیں آگ بجھانے والی ٹیم میں سب سے پیچھے رکھا جاتا ہے۔ لیکن آگ بجھانے کی مشقوں میں یہ بالغوں کے دوش بدوش حصہ لیتے ہیں۔

اپنے بالغ ساتھیوں یا نوجوانوں کی طرح یہ لڑکے یا نوعمر رضاکار ہفتے میں دو بار عملی مشقوں میں حصہ لیتے ہیں۔ اس وقت یہ تمام ساز و سامان سے لیس ہوتے ہیں۔ ٹکنیکل تعلیم، دستکاری، موسیقی اور ورزش بھی ان کے نصاب تعلیم کا حصہ ہیں۔ چھٹیوں میں انھیں کیمپنگ اور آگ بجھانے والے دوستوں کے ساتھ بین الاقوامی مقابلوں میں بھی شرکت کا موقع ملتا ہے۔ اپنی خوش وضع وردی، مضبوط بوٹوں، پن روک لبادوں، حفاظتی خود، چوڑی پیٹیوں اور آنکڑے دار پیٹیوں پر انھیں بڑا ناز ہے۔ آگ بجھانے والا محکمہ ان نوعمر رضاکاروں کی ہر طرح ہمت بڑھاتا ہے (تصویر سامنے کے صفحے پر)

(اطلاعات جرمنی)

کھانا پکانے کا انعامی مقابلہ

کھانا پکانا بھی ایک فن ہے۔ ہمارے گھروں میں بچیاں پہلے ہنڈکلیاں پکاتی ہیں، گڑیا گڈے کی شادی رچاتی ہیں۔ اس شادی کی تقریب کے سلسلے میں بچیاں ننھے ننھے ہاتھوں سے بہت سی سہیلیوں کے ساتھ مل کر کھانا پکاتی ہیں۔ بڑے ان کی ہمت بڑھاتے ہیں ضرورت ہو تو مشورے بھی دیتے ہیں۔ اس طرح ہوتے ہوتے بڑی عمر میں اچھا خاصا پکا لیتی ہیں۔ پر اب تو بھئی زمانہ بدل گیا ہے۔ اب بچے بھی اس کام میں حصہ لینے لگے ہیں۔ مغربی جرمنی کے ایک محلے میں چار پرائمری اسکولوں میں چوتھی، پانچویں اور چھٹی جماعت کے بچوں کے لیے کھانا پکانے کی تربیت کو بھی اپنے کورس میں شامل کرلیا ہے۔ ان مدرسوں کا انتظام کرنے والوں کی فرمائش پر گیس کمپنی والوں نے کھانا پکانا سکھانے کے سلسلے میں تربیتی کورس تیار کیے ہیں۔ بچے گیس کمپنی کے تربیتی باورچی خانوں میں ان کورسوں کے مطابق ایک مہینے تک نئے پرانے کھانا پکانے کی ترکیبوں کے نت نئے تجربے کرتے رہیں گے۔ کورس ختم کرنے کے بعد ان چاروں اسکولوں کے بچوں کا انعامی مقابلہ ہوگا۔ اول آنے والے بچے یا بچی کو چٹ پٹے کھانے کا استاد مانا جائے گا۔ ذرا اس تصویر کو غور سے دیکھیے جرمنی بچے ایک صاف ستھرے باورچی خانے میں کس انہماک اور سنجیدگی کے ساتھ کھا

ننھّا لیڈر —— آصف　　　　فوٹو: یوسف لکھنوی

Regd. No D. 1457. September 1968.

PAYAM-I-TALEEM

New Delhi-25.

یہ تصویریں مغربی جرمنی کے دستکار رولو تھوماس نے اپنے شوق سے بنائی ہیں۔ یہ رنگین شیشوں کو جوڑ کر بنائی گئی ہیں۔ پہلی تصویر باپو کی ہے۔ یہ ہم گاندھی جینتی کی تقریب میں شایع کر رہے ہیں۔ دوسری تصویر وفاقی جمہوریہ جرمنی کے پہلے چانسلر آنجہانی آڈیناور کی ہے۔ دونوں تصویریں مغربی جرمنی کے اس ہنرمند دستکار کی دستکاری کا کمال ہیں۔

فہرست

بچوں سے باتیں

یہ اکتوبر کا پرچہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ ستمبر کا پیام تعلیم آپ کو بہت پسند آیا۔ بے شمار خط ہمارے پاس آئے ہیں۔ ان میں سے دو ایک ہم شائع بھی کر رہے ہیں۔ خدا کرے یہ پرچہ بھی آپ کو اچھا لگے۔ اسے بھی دلچسپ بنانے کے لیے ہم نے اپنی سی کوشش کی ہے۔

اس مرتبہ ہمارے عادل جعفری صاحب نے اپنی نظم "۲ اکتوبر" میں باپو اور شاستری جی کی خدمت میں عقیدت کے پھول پیش کیے ہیں۔ بہت پیاری نظم ہے۔ انشاء اللہ آپ کو بھی اچھی لگے گی۔ زینا ناتھو جی نے ایک آزاد ملک (جاپان)، کی سچی کہانی لکھی ہے۔ اتفاق کی بات اس بار ابن بطوطہ والے مضمون میں بھائی چارہ کمیٹی یا اخیۃ الغنیان کا ابن بطوطہ نے خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ اب سے لگ بھگ سات سو برس پہلے کے مسلمان باہر سے آنے والے مسافروں کو کس طرح ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے، کس قدر عزت اور احترام سے پیش آتے تھے۔

پھر سیف صاحب نے صبح کا پیغام دیا ہے۔ آپ کے پرانے مضمون نگار امین صاحب علاء الدین کا چراغ لے کر آئے ہیں شکیل صاحب نے "بڑے بھائی صاحب" میں بہت اچھے انداز میں چھوٹے بھائی دیپالپوں کا تعارف کرایا ہے۔ محترمہ آصفہ مجیب آپ کی خدمت میں ایک خوبصورت "تحفہ" لے کر آئی ہیں، مرزا سلمان بیگ نے بھاکڑہ ننگل کے بجلی گھر کی، مقیم شاد نے "نیپال" کی سیر کرائی ہے۔ اور پرانے ساتھی اسماعیل خاں صاحب نے اولمپک ہاکی ٹیم کے کھلاڑیوں کی آپ سے ملاقات کرائی ہے۔ پھر اچھی اچھی نظمیں پڑھیے مزیدار کہانیاں پڑھیے۔

اور ہاں اب سالنامہ کی بات کیجیے۔ ایسا لگتا ہے جیسے اگلی جنوری تیزی سے ہماری طرف قدم بڑھا رہی ہے یا ہم بھاگم بھاگ اس کی طرف بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ سالنامے کی تیاری شروع ہو گئی ہے۔ مضمون بھی آنے لگے ہیں پچھلا (۶۸ کا) سالنامہ ایک تاریخی یادگار کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ ہم اپنی سی کوشش کر رہے ہیں کہ یہ سالنامہ پچھلے سالنامہ سے بڑھ جائے، سبقت لے جائے۔ آپ بھی کامیابی کی دعا کیجیے۔

مگر بھائی خالی دعاؤں سے کام نہیں چلے گا۔ کچھ اس کی مدد کیجیے۔ اس کے خریدار بنایئے۔ مکتبہ جامعہ اور اس کے جنرل منیجر تاباں صاحب دل سے چاہتے ہیں کہ پیام تعلیم بچوں کا مثالی پرچہ ہو۔ اسی لیے مکتبہ بے دریغ روپیہ خرچ کر رہا ہے۔ مگر آپ جانتے ہیں اردو اداروں کا حال اس زمانے میں کچھ زیادہ تسلی بخش نہیں ہے۔ خود مکتبہ بھی اسی پریشانی کا شکار ہے۔ اسی لیے ہمارا آپ کا فرض ہو جاتا ہے کہ اس کے بوجھ کو ہلکا کر دیں۔ یہی نہیں مکتبہ کی کتابیں خرید کر اس پچاس برس پرانے فارم کو اطمینان سے کام کرنے کا موقع دیں۔

بہت سے با احساس لوگ اس سلسلے میں ہماری بہت ہی خلوص سے مدد کر رہے ہیں۔ ہمارے عادل جعفری صاحب نے چار خریدار اور مرحمت فرمائے ہیں۔ دو خریدار رشید صاحب نے اور دیے ہیں تین خریدار سیف سہرامی صاحب نے مرحمت فرمائے ہیں۔ ۱۶ اسنئے خریداروں کا چندہ مدرسہ ابتدائی جامعہ کے نگراں صاحب اور استادوں نے بھیجنے کا وعدہ کیا ہے۔ ایک خریدار کا چندہ عزیزی شعیب شمسی (بریلی) سلمہ نے بھجوایا ہے۔ ہم ان سب بزرگوں کے احسان مند

ہیں۔ ذرا آپ بھی اپنی کوششوں کو تیز کر دیجیے۔ خریدار جتنے بڑھیں گے۔ ہماری ہمت بڑھے گی۔ آپ کے پیام تعلیم کی ظاہری شکل و صورت میں چار چاند لگیں گے، آب و تاب بڑھے گی۔

پچھلے پرچے میں آپ مدرسہ ثانوی جامعہ کی انجمن کے انتخاب کا دلچسپ حال پڑھ چکے ہیں۔ مدرسہ ابتدائی جامعہ کے انتخاب اگست کے آخری ہفتے میں ہوئے۔ اس انتخاب سے پہلے جناب شیخ الجامعہ (وائس چانسلر) پروفیسر محمد مجیب صاحب کی صدارت میں ایک تعارفی یا "جان پہچان" کا جلسہ بھی ہوا تھا۔ جلسے سے پہلے شیخ الجامعہ صاحب نے نئے طالب علموں سے ملاقات کی۔ پھر کلام پاک کی تلاوت کے بعد جلسہ شروع ہوا۔ آفاق محمود ابتدائی ششم نے ایک مضمون پڑھا اور دلچسپ انداز میں سال بھر کی سرگرمیوں ارادوں اور حوصلوں کا ذکر کیا۔ مضمون کے آخر میں آفاق محمود نے کہا کہ آج سے نئے پرانے کا فرق ختم ہوا۔ ہم سب مل جل کر رہیں گے اور بچوں کی خدمت کی ذمہ داریاں مل کر اٹھائیں گے۔ آخر میں صدر جناب شیخ الجامعہ نے نئے طالب علموں کا خیر مقدم کیا اور اچھی اچھی باتیں بتائیں۔

اب نئے بچوں کی انجمن یا حکومت کے الکشن کی دلچسپ روداد سنئے۔ تو جناب سب سے پہلے تو الکشن کمشنر کا انتخاب ہوا۔ ...شن کے سارے انتظام کی ذمے داری اسی پر ہوتی ہے۔ الکشن کمشنر ...کے اعلان کے مطابق ۲۴۔ اگست الکشن کا دن مقرر ہوا۔ اس بار صدارت ...پانچ امیدوار تھے۔ بڑا زبردست مقابلہ تھا۔ کئی دن پہلے سے ...ٹر اور پرچیاں بننی شروع ہوگئیں۔ ہر امیدوار کی طرف سے اپیلیں شایع ...ہوئیں۔

خاص الیکشن کے دن ایک شاندار جلسہ ہوا۔ پانچوں ...میدواروں اور اُن کے مددگاروں نے خوب جوشیلی تقریریں کیں ...ے کے بعد جلوس نکلا۔ طرح طرح کے سوانگ بھر کر کے فلک شگاف نعرے لگا رہے تھے۔ گیارہ بجے پولنگ شروع ہوئی اور ایک بجے تک باقاعدہ ووٹ پڑتے رہے۔ سب سے زیادہ ووٹ اظہار عالم صاحب کو ملے۔ ظاہر ہے وہی صدر ہوئے۔ پھر پوری پارلیمنٹ بنائی گئی۔ پارٹی لیڈر کا چناؤ ہوا۔ سید انتخاب حسن صاحب وزیر اعظم چنے گئے۔ وزیر اعظم نے اپنی کابینہ بنائی۔ نور الاسلام صاحب وزیر داخلہ، احمد رضا صاحب وزیر تعلیم، جمیل احمد فاروقی وزیر اطلاعات، محمد فرقان صاحب وزیر کھیل، محمد عیسیٰ وزیر صحت و صفائی، بشریٰ جبین صاحبہ وزیر آرائش، عبدالرحمن صاحب وزیر خوراک، عدنان فضل الرب صاحب، وزیر مالیات بنائے گئے۔ ہم جناب صدر، جناب وزیر اعظم اور ان کی پوری کابینہ کی خدمت میں مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

افسوس ہے پچھلے مہینے اُردو ادب کا ایک مجاہد چل بسا۔ ۶ ستمبر کو پروفیسر نجیب اشرف ندوی اللہ کو پیارے ہوئے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ اردو زبان کی خوش نصیبی ہے کہ سرسید، محمد حسین آزاد، حالی، شبلی، ذکاء اللہ، ڈپٹی نذیر احمد اور دوسری بہت سی بھاری بھرکم شخصیتوں نے اسے آنکھوں سے لگایا اور اسے آگے بڑھانے ترقی دینے میں اپنی عمریں صرف کردیں۔ پروفیسر نجیب اشرف ندوی کا وطن بہار تھا مگر انھوں نے ان پرانے بزرگوں کی طرح مہاراشٹر میں اردو کو پھیلانے اسے ترقی دینے میں اپنی عمر کا بڑا حصہ صرف کر دیا۔ پوری لگن، پر خلوص جذبے اور خاموشی کے ساتھ وہ اپنے کام میں لگے رہے۔ مہاراشٹر میں اردو کو جو اتنی ترقی اتنی مقبولیت نصیب ہوئی اس میں ندوی صاحب کی پر خلوص کوششوں کو بڑا دخل ہے۔ خدا مرحوم کی مغفرت فرمائے ان کے عزیزوں کو صبر کی توفیق ہو اور ان کے ہزاروں عزیز شاگردوں کو ان کے چھوڑے ہوئے کاموں کو مکمل کرنے کی سعادت نصیب ہو۔ آمین!

دوسری اکتوبر

ساری فضا پہ علم و عمل بن کے چھا گئی — اک بار اور دوسری اکتوبر آ گئی

یہ بھی ہمارے ملک کی تاریخ ہے اہم — کیا ہے سبب یہ اچھی طرح جانتے ہیں ہم

اس دن ہمارے ملک نے پائی تھی برتری — پیدا ہوئے تھے آج ہی گاندھی و شاستری

انصاف کے وہ دوست تھے حق کے ندیم تھے — دونوں ہمارے ملک کے رہبر عظیم تھے

آزادیٔ وطن پہ دل و جاں سے تھے نثار — خدمت ہمارے ملک کی دونوں کا تھا شعار

سب کو ہے آج عظمتِ گاندھی کا اعتراف — دن بھی شاستری کے نہیں ہے کہیں خلاف

ہنس کر حلق میں تلخیاں ساری انڈیل لیں — جو بھی مصیبتیں پڑیں خوش ہو کے جھیل لیں

جب تک جیے جو ہو سکا ان سے وہ کر گئے — کرتے بہت کچھ اور مگر جلد مر گئے

اچھوں کو جلد پاس بلا لیتا ہے خدا — یہ تو سدا سے ہوتا ہے، ہوگا یہی سدا

نیت درست دونوں کی تھی نیک ارادے تھے — دونوں بہت شریف بہت سیدھے سادے تھے

دونوں ہی ان میں حامل عزمِ جوان تھے — دونوں زمینِ سادگی کے آسمان تھے

ان دونوں ہی کی فکر نہایت بلند تھی — ان دونوں ہی کی راہِ عمل سودمند تھی

باطن میں دونوں ایک تھے ظاہر میں گو تھے دو — دونوں اہنسا وادی تھے دونوں تھے راست گو

دونوں کا ایک راگ تھا دونوں کا ایک ساز — دونوں پہ ہم کو فخر ہے دونوں پہ ہم کو ناز

دونوں نے اپنی اپنی جگہ وہ کیے ہیں کام
عادل زمانہ یاد رکھے گا جنھیں مدام

جناب عادل جعفری

جناب دینا ناتھ گردھر

یہ ہیں اچھے شہری

اپنے دیس میں آپ کو کم ہی لوگ ایسے ملیں گے جو بھولے بھٹکے مسافر کو ٹھیک راستہ بتا دیں۔ اسی طرح بہت کم لوگ ملیں گے جو اپنے پڑوسی یا ضرورت مند ساتھی کو مدد دینے میں خوشی محسوس کرتے ہوں۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ یہ چیز شہروں میں زیادہ سے زیادہ ہے۔ دیہاتوں میں کم سے کم۔ دوسرے ملکوں میں ایسا نہیں ہے۔ وہاں جب کوئی آدمی کسی سے راستہ پوچھتا ہے تو وہ نہ صرف راستہ بتاتا ہے بلکہ کوشش کرتا ہے کہ راہ پوچھنے والے کو اس کی منزل پر پہنچا دے۔ اسی طرح وہ لوگ اپنے پڑوسیوں اور ضرورت مندوں کی مدد کے لیے سدا تیار رہتے ہیں اور اس مقصد کے لیے سوسائیٹیاں بنا لیتے ہیں تاکہ بھائی چارے کے ذریعے یہ کام ہوتا رہے۔ ہمدردی اور ضرورت مندوں کی مدد کا یہ شریفانہ جذبہ کیا شہری کیا دیہاتی سب میں عام ہے۔

اب سنئے چند سال پہلے کی بات ہے۔ ایک ہندستانی اپنی بیوی کے ساتھ کسی سلسلے میں جاپان گئے۔ وہاں وہ ایک شام کو سینما دیکھنے چلے گئے۔ اتفاق سے جب وہ رات کو سینما سے نکلے تو ایک غلط راستے پر چل پڑے۔ چلتے چلتے شہر سے کافی دور نکل گئے۔ رات اندھیری تھی۔ بہت پریشان ہوئے بہت دیر تک ایک غیر آباد مقام پر رُکے رہے۔

اتنے میں دوسری طرف سے ایک جاپانی نوجوان سائیکل پر سوار آیا۔ اس نے اتنی رات گئے ان دونوں کو کھڑا تو سائیکل سے اتر گیا اور ان کے قریب آکر پوچھا کہ کیسے کھڑے ہیں۔

جب اس نوجوان کو معلوم ہوا کہ یہ دونوں سینما سے نکلنے کے بعد راستہ بھول کر اِدھر آگئے ہیں تو اسے بہت دکھ ہوا۔ اس نے بتایا کہ ان کو سینما سے نکل کر بائیں سڑک پر جانا چاہیے تھا۔ مگر وہ دائیں سڑک پر چل پڑے اور شہر سے بہت دور غیر آباد جگہ پر آگئے۔

مگر اب انھیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس نے کہا کہ یہاں سے صرف ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ایک ٹیکسی سٹینڈ ہے۔ میں وہاں جاکر آپ کے لیے ایک ٹیکسی لے آتا ہوں یہ آپ کو آپ کے ہوٹل پہنچا دے گی۔

یہ کہہ کر وہ نوجوان واپس پیچھے کی طرف ٹیکسی لینے چلا گیا۔ کچھ دیر بعد اتفاق سے ایک اور ٹیکسی اِدھر سے گزری اور ان لوگوں نے اسے روک لیا۔ ابھی وہ اس ٹیکسی میں بیٹھ ہی رہے تھے کہ وہ نوجوان بھی ٹیکسی لے کر آگیا۔ اب دونوں ٹیکسی ڈرائیوروں میں بحث شروع ہوگئی

کہ کون ان کو لے جائے۔

آپ سوچتے ہوں گے کہ دونوں ٹیکسی والے یہی چاہتے ہوں گے کہ وہی ان مسافروں کو منزل پر لے جائیں اور پیسے کمائیں۔ ہاں بھئی! ہمارے ملک کے ٹیکسی والے ہوتے تو وہ آپس میں اس کے لیے لڑ پڑتے۔ مگر وہاں حالت اس سے بالکل مختلف تھی۔ پہلا ٹیکسی والا کہہ رہا تھا کہ آپ لوگ دوسری ٹیکسی میں تشریف لے جائیے۔ کیوں کہ وہ ٹیکسی اپنے سٹینڈ سے اپنا نمبر چھوڑ کر آئی ہے۔ اگر وہ واپس جائے گی تو اسے نہ جانے کب باری ملے۔ میں تو ویسے ہی ادھر سے خالی جا رہا تھا، اب بھی خالی چلا جاؤں گا۔ مگر دوسری ٹیکسی والے کی ضد تھی کہ ان لوگوں کو پہلی ٹیکسی ہی میں جانا چاہیے کیونکہ یہ لوگ ٹیکسی میں بیٹھ چکے ہیں۔ انھیں اتر کر میری ٹیکسی میں آنے سے تکلیف ہوگی۔

ان دونوں ٹیکسی والوں کی باتیں سن کر دونوں میاں بیوی بہت متاثر ہوئے اور کہا کہ ہم دونوں ٹیکسیوں کو کرایہ ادا کر دیں گے۔ مگر دونوں ٹیکسی والے اس کے لیے بھی تیار نہ ہوئے۔ اور آخر مسافروں کو دوسری ٹیکسی میں ہی جانا پڑا۔

ٹیکسی روانہ ہونے سے پہلے انھوں نے اس نوجوان کا شکریہ ادا کیا جو ٹیکسی لے آیا تھا۔ تو اس نے کہا کہ آپ ہمارے ملک کے مہمان ہیں اور آپ کی خدمت کرنا ہمارا فرض ہے۔ میں اپنا فرض بجا لایا ہوں اس کا شکریہ کیسا!

اور جب ٹیکسی ہوٹل پر پہنچی تو ان لوگوں نے ٹیکسی والے کو مقررہ کرایہ کے علاوہ کچھ انعام دینا چاہا۔ لیکن اس نے یہ انعام لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ ہم لوگ اپنی محنت اور کام کا مقررہ معاوضہ لے کر ہی خوش ہوتے ہیں آپ غالباً پیسے دے کر ہمارا ایمان خراب کریں گے۔

کاش ابھی شہرت کے یہ آداب ہم آپ میں بھی پرچ بس جائیں اور ہم ان اچھی عادتوں کی بدولت دیس کی عزت بڑھائیں۔

جناب آفتاب شمسی

دھوپ

کھڑکی کی جالی سے چھن کر
کمرے میں آجاتی ہے
میز کی تصویروں کو اپنے
ہاتھوں سے چمکاتی ہے
ساری کتابوں کے چہروں کو
جیسے دھوتی جاتی ہے
پھر میرے بستر سے مجھ کو
اُٹھنے پر اُکساتی ہے
میں روز اپنے خواب ادھورے
چھوڑ، مدرسے جاتا ہوں

ہتّے بوُ

زنجبار کی لوک کہانی

محمد حسین حسّان

زنجبار کا نام شاید آپ کے کانوں میں پڑا ہو۔ افریقہ میں ہے سنتے ہیں یہاں لونگ بہت پیدا ہوتی ہے۔ ہمارے دیس میں بھی آتی ہے۔ سنتے ہیں بڑا گرم علاقہ ہے۔

خیر اس وقت تو وہاں کی ایک لوک کہانی سنئے

زنجبار میں ایک لڑکا رہتا تھا۔ ہتّے بوُ اس کا نام تھا۔ ہتّے بو بڑا سُست بہت کاہل اور نکما لڑکا تھا۔ کوئی کام زیادہ دنوں تک جم کر نہیں کرتا تھا۔ اس کی ماں اُسے سُنار بنانا چاہتی تھی۔ مگر یہ کام اسے بہت سخت معلوم ہوا۔ کچھ دنوں بعد چھوڑ چھاڑ گھر چلا آیا۔ پھر درزی بننے کا خیال آیا۔ مگر یہ بھی اُسے بہت سخت لگا۔ اُسے بھی چھوڑ کر پھر گھر آگیا۔

اس کی ماں نے کہا "خیر بیٹا تم گھر ہی پہ رہو، کوئی کام نہ کرو"۔ اور ہتّے بوُ صاحب کو یہ بات سب سے اچھی لگی۔ یہی تو وہ دل سے چاہتے تھے۔

مگر ایک دن کی بات سُنئے ہتّے بوُ صاحب اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ گاؤں کے باہر جنگل میں لکڑیاں بیننے چلے گئے۔ نہ جانے کیسے اس کام میں ان کا جی لگ گیا۔ بڑی مستعدی سے لکڑیاں بینتے رہے۔ بارش بھی آگئی دوسرے ساتھیوں نے بھاگ کے گھنیرے پیڑوں کے سایے میں پناہ لی مگر یہ تھے کہ ڈٹے رہے۔

انوکھی دریافت!

ہتّے بوُ صاحب اپنے کام میں لگے ہوئے تھے۔ اتفاق سے انھوں نے ایک جگہ اپنا پیر جو زمین پر رکھا تو یہ انھیں کچھ کھوکھلی کھوکھلی سی لگی۔ تھوڑی دیر میں بارش تھم گئی۔ سب ساتھی درختوں کے نیچے سے کھلی ہوئی جگہ میں آگئے تو ہتّے بوُ نے انھیں وہ جگہ دکھائی۔ سب نے

مل کر اس جگہ کو کھودنے میں ان کی مدد کی۔ کھودتے کھودتے نیچے ایک سپاٹ پتھر نکلا اس پتھر کے نیچے ایک گہرا گڑھا تھا۔ گڑھا کیا اچھا خاصا کنواں کہیے۔ اور بھئی اس کنویں میں بھلا کیا چیز تھی؟ شہد تھا شہد، پورا کنواں شہد سے لبالب بھرا تھا۔

اب تو ان سب کی خوب بن آئی ہتے بو کے ساتھی کہنے لگے "ارے میاں دور پھینکو ان لکڑیوں وکڑیوں کو۔ اور جناب ہتے بو صاحب آپ ہی نے اس انمول خزانے کا پتہ لگایا ہے۔ آپ ہی اس میں گھس کر شہد نکالیے۔ اب ہم اسے راج دھانی میں لے جاکر بیچیں گے۔ وہیں جہاں بادشاہ سلامت رہتے ہیں۔"

تو جناب اب یہ سب روزانہ اس انوکھے کنویں پر آتے۔ ہتے بو اس کنویں سے شہد نکال کر دیتا مہینوں تک یہ سلسلہ رہا۔ ہوتے ہوتے شہد کا یہ خزانہ خالی ہونے لگا۔ ایک دن نوبت یہ آئی کہ ہتے بو کو ان سب نے رسیوں سے نیچے اتارا۔ ہتے بو نے کھرچ کھرچ کر شہد نکالا۔ جب وہ کام ختم کر چکا تو چلایا "رسی نیچے پھینکو مجھے اوپر نکالو۔"

پر اب ان سب کی نیتوں میں کھوٹ آیا آپس میں کانا پھوسی ہونے لگی:" ہتے بو صاحب کو اب اسی غار میں آرام کرنے دو اوپر سے پتھر ڈھک دو۔ اس کی ماں سے کہہ دیں گے ہتے بو کو شیر کھا گیا" اس طرح ہتے بو کے حصے کا شہد بھی ہمیں مل جائے گا۔ اسے بازار میں لے جاکر بیچ دیں گے۔"

اور انھوں نے یہی کیا ہتے بو کی ماں کو اس حادثہ کی خبر ہوئی تو سکتہ سا ہو گیا معلوم ہوتا تھا کہ مارے غم کے ابھی مر جائے گی۔

ہتے بو گھبرایا نہیں:۔

مگر ہتے بو ذرا نہ گھبرایا نہ زندگی سے نا امید ہوا۔ کنویں میں جو شہد ذرا ذرا رہ گیا تھا کئی دن تک اسے زندہ رکھنے کے لیے کافی تھا۔

پھر گڑھے میں سے اندر ہی اندر بہت ہی گہرائی میں بہت سے راستے نکلتے تھے۔ ہتے بو تلاش اور جستجو کے شوق میں ان راستوں پر بڑھ لیا۔ چلتے چلتے اچانک ایک بڑے غار تک پہنچ گیا اس غار میں بہت سے لیمپ روشن تھے۔ ایک کوچ یا مسہری پڑی تھی اس پر خوب نرم نرم گدے تھے ہتے بو تھکا ہوا تو تھا ہی مسہری پر لیٹ گیا۔ لیٹتے ہی آنکھیں بند ہو گئیں غفلت کی نیند سو گیا۔

آنکھ کھلی تو غار میں چاروں طرف سانپ ہی سانپ ان میں ایک سب سے بڑا بہت ہی بڑا ناگ سر پر تاج، اسی مسہری پر ان کے پہلو میں!!

"میں سانپوں کا بادشاہ ہوں" ناگ بولا: "تم میری مسہری پر کیوں سو رہے ہو؟"

ہتے بو نے اپنا بیتا سنائی تو ناگ بادشاہ نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ہتے بو نے کئی دنوں تک ناگ بادشاہ کے محل میں آرام کیا۔

مگر رات دن رہتے رہتے اس کی طبیعت اکتا گئی غمگین رہنے لگا۔ ناگ بادشاہ سے عاجزی سے بولا۔ "عالی جاہ کیا میں اپنی ماں کے پاس گھر جا سکتا

ہوں ؟ میری ماں نے تو مجھے مردہ ہی سمجھ لیا ہوگا، رو پیٹ کر بیٹھ رہی ہوگی۔"

ناگ بادشاہ نے جواب میں بس اتنا کہا: "تمہارا جانا میری موت کا بہانہ ہو جائے گا۔"

لیکن آخر کار وہ راضی ہو گیا، بولا: "میں تمھیں یہاں سے نکلنے، گھر جانے کا راستہ بتا دوں گا۔ مگر ایک بات کا وعدہ کرو۔ ایسی تنہائی کی جگہ نہا و جہاں نہاتے میں تمھیں کوئی دیکھ نہ پائے۔ انسانی آنکھ تم پر نہ پڑے۔"

ہتے بو نے وعدہ کر لیا اور ناگ بادشاہ نے اسے گھر کا راستہ بتا دیا۔ ہتے بو خیریت کے ساتھ اپنے گھر پہنچ گیا

کچھ دن تو بڑے چین آرام سے گذرے پر ایک دن گرم لو کے جھکڑ چل رہے تھے۔ آسمان سے جیسے آگ برس رہی تھی۔ ہے بو اس گرمی سے اتنا بے چین اتنا بے قرار ہوا کہ اپنا وعدہ بھول گیا بادشاہ کے محل کے پاس ہی ایک ندی بہتی تھی۔ اس میں چھلانگ لگا دی۔

ادھر بادشاہ کا بڑا وزیر جیسے تاک میں تھا۔ فوراً آکر اسے بوچ لیا۔ بولا: "تمھاری پیٹھ پر جو نشان ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ تمھیں ناگ بادشاہ کا پتہ نشان، اس کے رہنے کی جگہ معلوم ہے۔ ناگ بادشاہ کو یہاں لے آؤ۔ ہمارا بادشاہ بہت بیمار ہے۔ صرف ناگ بادشاہ اسے موت کے جنگل سے نکال سکتا ہے۔"

ہتے بو نے انکار کیا۔ وزیر نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا۔ انھوں نے ہتے کو بڑی طرح مارا پیٹا بہت تکلیفیں پہنچائیں۔ آخر مجبور ہو کر ہتے بو وزیر اور اس کے ساتھیوں کو اس پوشیدہ (چھپے ہوئے) غار تک لے گیا۔ بے چارہ بہت اداس، بے حد غمگین تھا۔

مگر ناگ بادشاہ نے تسلی دی: "مجھے پہلے سے معلوم تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ تمھیں رنج و غم کی ضرورت نہیں

گمر ہاں میری باتیں، پورے دھیان سے سُنو۔

ناگ، بادشاہ بیٹے لوٗ سے باتیں کر چکا تو وزیر کے پاس آیا۔ وزیر نے اسے مار کر آگ پر پکایا اور دوا کے طور پر بادشاہ کے پاس لایا۔ مگر بادشاہ کو اس دوا سے رائی برابر فائدہ نہ ہوا۔

یہ دیکھ کر بیٹے لوٗ نے کیا کیا کہ جس پانی میں ناگ بادشاہ کا گوشت، کھولایا گیا تھا اسے تین پیالوں میں بھرا اور بادشاہ سلامت کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: "عالی جاہ جیسے میں کہوں اس طرح کیجیے۔ آپ بالکل تن درست ہو جائیں گے۔ وزیر کو حکم دیجیے کہ جیسا میں کہوں، اسی طرح کریں"۔ بادشاہ راضی ہو گیا۔ بیٹے لوٗ نے پہلا پیالہ بادشاہ کو دیا اور اسے پیتے ہی بادشاہ بھلا چنگا ہو گیا۔ نئی زندگی پائی۔ دوسرا پیالہ وزیر کی خدمت میں پیش کیا اور بھئی وزیر صاحب پیتے ہی اللہ کو پیارے ہوئے ان کی لاش دھڑام سے زمین پر آ رہی۔

اور صاحب تیسرا پیالہ خود بیٹے لوٗ نے پی لیا اور پیتے ہی وہ ڈاکٹر بن گیا۔ بہت بڑا ڈاکٹر۔ زنجبار میں شاید ہی ایسا اچھا ڈاکٹر کبھی ہوا ہو۔ (فاؤنڈنگ آوٹ)

پیغامِ صبح

جناب سیف سہسرامی

بکھری بکھری کرن جگمگاتی ہوئی
ہر کلی باغ میں مسکراتی ہوئی

دوب پر اوس کے موتیوں کی لڑی
جیسے مخمل پہ ہو کامدانی پڑی

صبح کا وقت ہے اور سہانا سماں
ہر طرف جلوۂ حق کی رعنائیاں

چہچہاتے پرندوں کی آواز ہے
نغمۂ حمد کا دلنشیں ساز ہے

اب تو بیدار ہو نونہالو ذرا
وقت اسکول کا بھی قریب آگیا

اٹھ کے بستر سے اب ہاتھ منہ دھو چکو
ناشتہ کرلو، بستہ لو، مکتب چلو

علاء الدین کے چراغ کی کہانی

سچ ہو گئی

مجی حسین صاحب تسلیم

دیر آید درست آید"۔ لیجیے تو میں نے لکھنا شروع کر دیا۔
آپ کا بہت اصرار تھا بلکہ شاید آپ کا موڈ کچھ برہمی کی حد تک
پہنچ گیا تھا۔ لکھنے میں کچھ دیر ہوئی معاف کیجیے گا لیکن یقین مانیے
اب جو سلسلہ میں نے شروع کیا ہے تو اس کا ختم ہونا آسان نہیں۔
انشاءاللہ ہر دوسرے ہفتے آپ کو قسطیں ملتی رہیں گی پہلی قسط بھیج
رہا ہوں۔ دوسری قسط جس میں عدیس ابابا کی سیر کا حال ہوگا دو
ہفتے کے بعد ملے گی۔

یقین جانیے جامعہ کی برادری اور سارے پیامی (پیام تعلیم
کے پڑھنے والے) مجھے عزیز ہیں۔ جامعہ کی سرزمین کو' جہاں میں نے
۱۷ سال گزارے ہیں۔ بھلا میں کیسے بھول سکتا ہوں۔ ایک ایک
لمحہ یاد آتا ہے اور آپ لوگوں کی یاد کے ساتھ دل کو تڑپاتا ہے۔

جامعہ میں رہ کر اور اب جامعہ سے باہر آ کر میرا یہی اصول رہا ہے کہ جامعہ برادری کو اپنے تاثرات سناؤں
کوئی نیا پروگرام یا نیا تجربہ ہو تو اس میں جامعہ کے بھائیوں اور بہنوں کو شریک کروں۔ ایتھوپیا میں ۱۸ مہینے رہنے
کے بعد میں نے اب تک یہاں جو کچھ دیکھا، پڑھا اور تجربہ حاصل کیا ہے اس کو آپ تک پہنچانے کے لیے پیام تعلیم سے
بہتر کوئی ذریعہ نہیں۔

آپ کا مخلص! محمد امین مکاسے (ایتھوپیا)

۲۴ر نومبر ۱۹۶۶ء کو رات کے ایک بجے ہم لوگ
م کے ہوائی اڈے پہنچے۔ جامعہ نگر میں عزیزوں اور دوستوں
تعداد کافی تھی۔ اس لیے جامعہ کی لاری میں بیٹھ کر سب لوگ
داع کہنے آئے۔

ہوائی اڈے پر ہم نے دیکھا کہ ایک جم غفیر ہے۔
و پیا کے لیے ہندوستان سے ۹۶ استاد جا رہے تھے اور
ا الوداع کہنے کے لیے سیکڑوں عزیز و اقارب موجود تھے
س تل رکھنے کو جگہ نہ تھی۔ سیفی، شاہد، ندیم اور دوسرے
ب ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ سیدہ، رعنا، افسر اور
، میرے قریب۔ دوسرے استادوں کی طرح میں نے بھی پاسپورٹ
لیا اور کچھ غیر ملکی سکہ (فارن ایکسچینج) سفر کے لیے ایک لاکھ
ہ کا بیمہ بھی کرایا۔

ایتھوپین ایرلائنس کے افسران ہوائی اڈے پر
د تھے۔ ابتدائی مراحل طے ہونے کے بعد دوسرے احباب
ح میں بھی اپنی بیوی بچوں اور دوستوں سے جدا ہوا۔ وقت
ھا اس لیے جلدی جلدی سب سے مل کر اندر آگیا۔ پاسپورٹ
ن اور روپے پیسوں کی کسٹم میں جانچ (چیکنگ) کی گئی پھر
ن وسکون کے ساتھ لاؤنج میں بیٹھ کر قہوہ پیا۔

سامنے جو نظر اٹھائی تو کیا دیکھتا ہوں کہ جامعہ کالج
شاگرد فریڈرک اور اس کی بیگم چلے آرہے ہیں۔ وہ گرم جوشی
ا اور دونوں نے سلام و دعا کے بعد بتایا کہ وہ بھی ایتھوپیا
ہے ہیں۔ پھر کلیش اور ان کی دو دوست بھی آگئیں۔ خواجہ
مد (سابق استاد جامعہ) اور میں دونوں ساتھ ساتھ تھے۔

ہمیں الوداع کہنے والے سب لوگ اوپر ہوائی
کی گیلری میں آگئے تھے۔ اور وہاں سے ہاتھ اور رومال
شارے کر رہے تھے۔ اعلان ہوا کہ جہاز تیار ہے
ڑنے میں زیادہ دیر نہیں اس لیے سب مسافر
چل کر جہاز میں بیٹھ جائیں۔ میں نے نگاہِ بازگشت ڈالی۔ سب
کو خدا حافظ کہا اور جہاز کی طرف چل پڑا۔

اس وقت میں ملے جلے جذبات سے دوچار تھا۔
ایک طرف ہندوستان سے باہر جانے کی خوشی، نئے ملک، نئے
ماحول کو دیکھنے اور سمجھنے کی خواہش، دوسری طرف بیوی اور
بچوں سے جدا ہونے کا غم اور اپنے بڑے لڑکے پرویز سے ملاقات
نہ ہونے کا ملال۔ دوستوں سے بچھڑ جانے کا افسوس۔ غرض بڑی
عجیب کیفیت تھی۔

جہاز میں آکر درمیانی حصے میں اپنی سیٹ لی۔
قصداً میں کھڑکی کے پاس بیٹھا تاکہ باہر کی دنیا کا جائزہ لینے میں
آسانی ہو۔ میرے آگے کی سیٹ پر خواجہ صفی احمد اور پشت پر
کلیش اور ان کی دوست۔ میری بغل کی سیٹ پر ایک خاتون
مع دو بچوں کے تنہا سفر کر رہی تھیں اور عدیس ابابا میں اپنے
شوہر سے ملنے جا رہی تھیں۔

صبح ۲ بج کر ۵۵ منٹ پر جہاز نے رن وے
پر دوڑنا شروع کر دیا اور منٹوں میں اپنے پر پھیلا کر اڑ گیا۔ دہلی
میں اب صبح ہو چلی تھی لیکن چاروں طرف روشنیاں جگمگا
رہی تھیں۔ جہاز کا رخ سیدھے کراچی کی طرف تھا۔ مسافروں سے
کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور ایتھوپین ایرلائنس کے کریو یعنی اسٹاف
ہمیں اڑان کی ساری احتیاطی تدبیریں بتا رہے تھے۔ ایئر ہوسٹسز
(AIR HOSTESSES) نے اپنی ڈیوٹی سنبھال لی تھی
اور ٹافیاں اور ڈرنک یا شربت پیش کر رہی تھیں۔ اب ہم
تیس ہزار سے زیادہ کی بلندی پر اڑ رہے تھے۔

۵ بجے صبح جہاز کراچی کے ہوائی اڈے پر
اترا۔ ہم سب لوگ گاڑیوں میں بیٹھ کر لاؤنج گئے۔ وہاں
قہوہ پیا اور ہوائی اڈے کے اندر پاکستان شو ونڈو
(SHOW WINDOW) دیکھا۔ لاؤنج کی

پشت پر کئی دکانیں تھیں۔ ان میں پاکستان میں بنے ہوئے سامان
اور دستکاری کے نمونے رکھے تھے۔ جی چاہا کہ ان میں سے
تحفے کے لیے ایک دو چیزیں خرید لوں۔ ظاہر ہے یہ چیزیں سستی
یعنی بغیر ٹیکس کے ہیں لیکن ہم نے محض دیکھنے پر اکتفا کیا۔ اس لحاظ
سے کراچی کا ہوائی اڈہ ہمارے پالم سے اچھا تھا اور اسی وقت
میں نے اپنی ڈائری میں نوٹ کیا کہ بعد میں ایر انڈیا انٹرنیشنل
کے منیجر مسٹر ٹاٹا کو لکھوں گا کہ وہ بھی شو ونڈو (SHOW
WINDOW) کی طرف توجہ دیں۔ آخر ہمارے ملک میں
دستکاری کے نمونے کیا کم ہیں۔ پھر جہاں بین الاقوامی مسافر چوبیس
گھنٹے آتے جاتے ہوں۔ وہاں ہمیں اپنی چیزوں کا اشتہار تو دینا
چاہیے۔

کراچی کے ہوائی اڈے پر خواجہ صفی کے عزیزان
سے ملنے کے لیے آنے والے تھے۔ لاؤنج میں بیٹھ کر ہم نے ان
کا انتظار کیا لیکن کوئی آتا نظر نہ آیا۔ آخر چالیس منٹ کے بعد ہم
لوگ ہوائی اڈے کی گاڑی میں بیٹھ کر رن وے پر آ گئے سیٹیں
سنبھالتے ہی جہاز کے چاروں پنکھے حرکت میں آ گئے اور منٹوں
میں یہ پھر ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ نیچے ہم نے جو نظر کی تو کراچی
کا ساڑھے بیس لاکھ آبادی کا شہر ابھی جگمگا رہا تھا۔

اب کی بار اڑان لمبی تھی اور کراچی سے اسمارا
تک کہیں اور جہاز اترنے کا سوال نہیں تھا۔ ہم سب اطمینان
سے اپنی اپنی سیٹوں میں بیٹھ گئے بلکہ آرام کرنے کے لیے
دراز ہو گئے۔ جہاز کو مسلسل ساڑھے پانچ گھنٹے تک اڑنا
تھا۔ اس کی بلندی اب ۲۵، ہزار فٹ سے زیادہ تھی بادلوں
اور ہوا کی لپیٹ سے بچنے کے لیے وہ اتنی بلندی سے اڑ رہا
تھا۔ اب اجالا ہو چکا تھا۔

ٹھیک ۷ بجے ہمیں ناشتہ دیا گیا اور
قہوہ پیتے ہوئے ہم سورج نکلنے کا سماں دیکھ رہے
تھے میری کھڑکی کے پاس آ کر خواجہ صاحب، کملیش اور ہم سب
نے بار بار مشاہدہ کیا۔

۷ بجے کے بعد ہم نے خلیج فارس اور بحیرۂ
عرب کی جھلک دیکھی۔ عرض البلد اور طول البلد کے لحاظ سے
اپنے محل وقوع کو سمجھنے کی کوشش کی۔ ہم دہلی اور کراچی سے
مغرب کی طرف جا رہے تھے۔ اس لیے ایک ڈگری طول البلد
پر ۴ منٹ کے لحاظ سے وقت گھٹ رہا تھا۔

۸ بجے کے بعد ہم عرب کے جزیرہ نما سے گزر
رہے تھے۔ نیچے اس کی پہاڑیاں اور چٹانیں نظر آ رہی تھیں۔
نباتات یا پیڑ پودے۔ ایک سرے سے ناپید تھے۔ ننگی چٹانیں
موسمی عناصر کے تھپیڑے برداشت کرنے سے جگہ جگہ کٹی اور
اونچی نیچی دکھائی دے رہی تھیں۔

جب ہم یمن سے ہو کر گزرے تو جامعہ کے سارے
شاگرد مجھے یاد آئے۔ کاش ان کو لا کر یہ پہاڑیاں، ان کی
کاٹ چھانٹ، موسمی عناصر کی بے پناہ کارستانی اور ریگستان
کی قسمیں یہ سب دکھا سکتا۔

اس وقت اپنی کم مائیگی کا بھی احساس ہوا اور
یہ بات دل میں بہت کھٹکی کہ انگلستان کے طلباء جغرافیہ کو
عملی طور سے پڑھنے جاپان جاتے ہیں لیکن ہم اپنے طلباء اور
استادوں کو یہ آسانیاں فراہم نہیں کر سکتے۔ بہرحال آپس
میں ان مسائل پر بحث کرتے ہم لوگ ۹ بجے بحر قلزم کے ساحل
پر پہنچ گئے۔ ہم نے دیکھا کہ اس کے پانی کی جھلک سرخ نظر آئی
(اس کی وجہ اور تفصیل بعد میں دوسری قسطوں میں ملے گی)

اب ہم براعظم ایشیا کو پار کرنے کے بعد افریقہ
کی سرزمین میں داخل ہو چکے تھے۔ ہمیں مشرقی افریقہ کا ملیشو
نظر آیا۔ ہم بادلوں کا مذاق اڑا رہے تھے۔ وہ ہم سے نیچے
پہاڑوں کی چوٹیوں پر چپکے نظر آتے تھے۔ اور

کچھ روئی کے گالوں کی طرح ادھر ادھر اڑ رہے تھے پہاڑوں کے نشیب وفراز، وادیوں کے موڑ توڑ، جنگل اور چراگاہوں کی شادابی بھی دکھائی دی۔ چٹانوں کی بناوٹ اوران کے نمونے سمجھنے کی کوشش کی۔

۱۰ ½ بجے ٹھیک، جہاز اسمارا کے ہوائی اڈے پر اترا۔ ٹھنڈک کافی تھی۔ سب نے گرم کپڑے نکال لیے۔ اتر کر ہم لوگ جولاؤنج میں پہنچے تو وہاں دیکھا کہ محمود ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ ایک دوسرے سے بغلگیر ہوئے اور بڑی خوشیاں منائیں۔ سب نے ایک ساتھ بیٹھ کر قہوہ پیا اور محمود سے صفی احمد، کملیش اور میں نے اسمارا اور ایتھوپیا کے حالات دریافت کیے۔ وہ بہت خوش تھے اور شاید ان کو یہ خیال تھا کہ دوستوں کا حلقہ یہاں بھی بڑھ رہا ہے۔ اس لیے اب کسی کا جی نہیں گھبرائے گا۔ پھر چھٹیوں میں ہم لوگ ایک دوسرے کے پاس آتے جاتے رہیں گے اور جامعہ کی یاد اور ماحول کو زندہ رکھیں گے۔

اسمارا میں اترتے وقت جہاز ہوا کی ایک بھنور یعنی سائیکلون میں پھنس گیا تھا۔ اس سے باہر نکلنے کے لیے اسے کافی زور لگانا پڑا اور چیف پائلٹ نے بڑی ہوشیاری سے باہر نکالا۔ ایک موقع پر تو وہ پہاڑ کی چوٹی سے بالکل بال بال بچا۔ غرض جہاز کا اترنا لوگوں کو بہت کھلا اور بچوں اور خواتین کو الٹیاں ہوگئیں۔ جہاز کا سارا فرش اور قالین لت پت ہوگیا میں نے بھی معمولی سا جھٹکا محسوس کیا اور پھر سنبھل گیا۔

۱۱ ½ بجے جہاز نے پھر اڑان کی۔ اب وہ مسلسل ایتھوپیا کے شمالی پلیٹو سے ہو کر اڑ رہا تھا۔ نیچے افٹ ویلی، اس کے دونوں کناروں کے اسکارپمنٹ (پلیٹو) صاف دکھائی دیتے رہے تھے۔ پہاڑ کی ڈھلانوں پر سبزہ زار اور کھیت بھی نظر آئے۔ ۱۲ بجے ہمیں لنچ دیا گیا اور میں نے چند نئے کھانوں کا مزا لیا۔ کملیش نے ٹوکا یہ سب کیا کھا رہے ہو۔ میں نے کہا ایمان عزیز ہے اگرچہ غالب کی طرح اس کشمکش میں ہوں کہ

"کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے"

۵۵ منٹ کے بعد ٹھیک ساڑھے بارہ بجے جہاز عدیس ابابا پہنچ گیا۔

۸ گھنٹے پہلے ہم دہلی اور جامعہ نگر میں تھے اور اب تین ہزار میل دور (۵ ہزار کلومیٹر) عدیس ابابا آگئے تھے۔ اتنی لمبی مسافت اتنی جلدی طے کرلیں گے یقین نہیں آتا تھا۔

ہوٹل میں پہنچ کر ہم سب نے ایک زبان ہو کر کہا "علاؤالدین کے چراغ کی کہانی آج سچ ہوگئی۔"

(باقی آئندہ)

تحفہ کا بقیہ صفحہ ۲

ہوئے۔ بادشاہ بہت خوش بیٹھے تھے پوچھا۔

"میاں سوداگر کیا جواب لائے؟" انھوں نے جو بہو نے بتایا تھا وہی دہرا دیا۔ بادشاہ سن کر حیران رہ گئے۔ امیدوں پر پانی پھر گیا۔ آدھی سلطنت سوداگر کے نام لکھ دی۔

میاں سوداگر اور چھوٹی بہو بہت خوش تھیں۔ کہاوت ہے کہ "مانگے نہ ملے بھیک بن مانگے ملیں موتی"۔

سب خوب امن چین سے رہنے لگے۔

دوست ہمارے

جناب علقمہ شبلی

ہاتھ میں لے کر جھاڑو، بچّو!
آتے ہیں یہ شام سویرے
کوڑا کرکٹ کے ہیں دشمن
گرد سے ان کو نفرت جیسے
گلیاں ان کی صاف اور ستھری
آئینہ ہیں سڑکیں ان سے
ہر جا ان کا سکّہ جاری
ہر گھر گلشن دم سے ان کے

دیکھو تو ہیں سیدھے سادے
کام کے لیکن پکّے ہیں یہ
سخت ہو جاڑا یا ہو بارش
گھر کی صفائی کرتے ہیں یہ
ان سے ہے ہر شہر کی رونق
پھر بھی دکھ کے پالے ہیں یہ

یہ ہیں بچّو! دوست ہمارے
فرض ہے اپنا ان کی خدمت
نیچی نظر سے ان کو نہ دیکھیں
ان کی عزت اپنی عزت

مذہب کا پیغام یہی ہے
انسانوں کا کام یہی ہے

جناب شکیل جاوید

بڑے بھائی صاحب

تمھاری ہی طرح ایک لڑکا تھا۔ لیکن تھا بڑا شریر ـــــ اپنے ماں باپ کی باتوں کا اس پر ذرا بھی اثر نہ ہوتا تھا۔ لکھنے پڑھنے میں بھی کمزور تھا۔ ہاں کھیل کود میں وہ اپنی جماعت کے سبھی لڑکوں میں اوّل تھا۔ ہر طرح کے کھیل کود میں وہ بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتا تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں میں "سردار" مانا جاتا تھا۔ اُسے اپنے گھر والوں کو جھانسا دینے میں زیادہ مزہ آتا تھا۔ گھر سے کتابیں اٹھائیں اور شریر لڑکوں کے ساتھ کھیل کود میں لگ گئے ـــــ شام ہوئی اور کتابیں اٹھائیں گھر آگئے جیسے کھیل کود سے نہیں سیدھے اسکول سے آرہے ہیں۔ ماں باپ اسی خیال میں مگن رہے کہ ہمارا بچہ بڑا محنتی اور ہونہار ہے پڑھائی لکھائی کا شوقین ہے۔

ایک دن وہ لڑکا اسکول سے گھر آرہا تھا۔ راستے میں اس نے دیکھا ایک آم کے درخت پر کچھ پکے ہوئے آم لگے ہیں۔ اور درخت کے نیچے کچھ بچے آم گرانے کے لیے درخت پر پتھر برسا رہے ہیں۔ آم دیکھ کر اس کے منھ میں بھی پانی بھر آیا اور اس سے نہ رہا گیا۔ اس نے اپنی کتابوں کا جھولا وہیں ایک طرف ڈالا اور وہ دوسرے لڑکوں کی طرح آم توڑنے کے لیے پتھر پھینکنے لگا۔ پھر لڑکا تاک تاک کر آموں پر پتھر پھینکتا اور مایوس ہو جاتا۔ کئی بار اس کا نشانہ بھی خطا ہو گیا

آخر اُس کے دیکھتے دیکھتے ایک لڑکے نے اپنے نشانے سے ایک آم گرا لیا بڑے فخر اور بڑی خوشی سے اُس لڑکے نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا جیسے کوئی بڑا کارنامہ انجام دیا ہو۔ اب تو اس کو بھی اس میں اپنی توہین نظر آئی۔ اسے اس بات کا احساس ہوا کہ اس طرح پتھر مارنے سے آم گر بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔ کیوں نہ درخت پر چڑھ کر آم توڑے جائیں اور وہ درخت پر چڑھنے لگا۔

اس کو درخت پر چڑھتے دیکھ کر نیچے آم توڑنے والے لڑکوں نے تیزی سے پتھر برسانے شروع کر دیئے۔ مگر یہ لڑکے اس کا کچھ بگاڑ نہ سکے۔ اس نے اپنی محنت اور ہوشیاری سے درخت پر لگے ہوئے تین آم توڑ لیے اور نیچے والے لڑکے اس کا منھ تکتے رہ گئے۔ ابھی وہ لڑکا درخت سے نیچے اترنے بھی نہیں پایا تھا کہ اتفاق سے ادھر سے اس کے بڑے بھائی صاحب کا گذر ہوا۔ انھوں نے اس کو درخت سے نیچے اترتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ بس پھر کیا تھا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ غصّہ میں بھلا کر اُس کے کان پکڑ، دو زور دار طمانچے رسید کیے۔ لڑکا بے چارا اس اچانک حملے کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔ روتا روتا گھر پہنچا، ماں کا دل سہم گیا گلے سے لگا کر پچکارا اور رونے کا سبب دریافت کیا۔

لڑکے نے روتے ہوئے جواب دیا۔
"بڑے بھائی صاحب نے مارا ہے۔۔!"
ماں بیٹے کی بات سن کر مسکرا دی، اس کا غصہ کافور ہوگیا تھا کیوں کہ اس کے بیٹے کو مارنے والا بھی اُسی کی آنکھ کا تارا تھا۔ ماں نے روتے ہوئے لختِ جگر کو سمجھایا۔!
"بیٹا اگر تیرے بھائی صاحب نے تجھے مارا ہے تو تو بھی اُن کو جاکر مار اور اپنا بدلہ لے کر کلیجہ ٹھنڈا کرلے!"
یہ بات سن کر لڑکا اچنبھے میں پڑ گیا۔ ماں کا منھ تکنے لگا۔
"ماں! وہ ہمارے بڑے بھائی صاحب ہیں کیا آپ بھائی صاحب کو مارنے کی صلاح دیتی ہیں؟ کیا یہ میرے واسطے مناسب ہوگا؟"
ماں نے جواب دیا "تو کیا ہوا۔ کیا بھائی بھائی آپس میں مارپیٹ اور لڑائی جھگڑا نہیں کرتے؟"
لڑکا ایک بار پھر حیرت میں ڈوب گیا۔
"ماں! یہ بات تو ٹھیک ہے، لیکن میں اپنے بڑے بھائی صاحب کو اپنے ہاتھوں سے سپنے میں بھی نہیں مار سکتا ہاں یہ دوسری بات ہے کہ آپ مارنے والے کو صلاح دے سکتی ہیں اسے روک سکتی ہیں مگر میں ایسا بڑا گناہ ہرگز ہرگز نہیں کرسکتا اور مارپیٹ کی صلاح دینا آپ کے لیے ٹھیک نہیں۔"
ماں بیٹے کی باتیں سن کر بہت خوش ہوئی اور محبت سے اسے اپنی گود میں اٹھالیا اور اس کے گالوں کو چومنے لگی "شاباش بیٹے! تو تو اس چھوٹی سی عمر میں بوڑھوں کی سی باتیں کرتا ہے!"
ماں کا کنول کھل اٹھا! — اس کی آنکھوں کا تارا اس کے دل کو روشنی بخش رہا تھا۔

تمھیں معلوم ہے یہ لڑکا کون تھا؟
— یہ لڑکا موہن داس کرم چند گاندھی تھا۔ جسے آج بھارت کا ہر چھوٹا بڑا "مہاتما گاندھی" اور "باپو" کے نام سے یاد کرتا ہے اور رہتی دنیا تک اسی طرح یاد کرتا رہے گا۔

ذرا نیچے دیکھیے۔
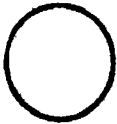
○

ایک گول دائرہ سا بنا ہے۔ اس گول دائرے میں ایک سرخ نشان ہے۔ اس سرخ نشان کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی خریداری کی مدت اس مہینے سے ختم ہو رہی ہے۔
کچھ دنوں سے ہم نے پیامِ تعلیم کی خریداری کی مہم چلا رکھی ہے۔ یہ ہم خدا کا شکر ہے کہ کامیابی سے چل رہی ہے۔ پچھلے مہینے تو ہم نے آپ کی مدد اور سرپرستی کی بدولت ذرا زیادہ تیزی سے قدم بڑھایا۔ لگ بھگ دو ڈھائی سو پیامی آپ کی پیامِ تعلیم کی برادری میں شامل ہوگئے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ بھی نہ صرف اپنی سرپرستی جاری رکھیں گے بلکہ اس برادری کو اور زیادہ آگے بڑھانے کی کوشش کریں گے۔ پیامِ تعلیم کے زیادہ سے زیادہ خریدار بنانے کی کوشش کریں گے۔
اس مہینے کی ۲۵ر تاریخ تک مبلغ چھ روپے کا منی آرڈر بھیج دیجیے اور ہاں منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیے۔ آپ کا خریداری نمبر ہے۔
مدیر

ایک سوداگر میاں تھے۔ بڑے عقلمند تھے۔ بادشاہ سلامت اکثر ان سے صلاح مشورہ کرتے تھے۔ سوداگر کے سات بیٹے تھے سات بہویں تھیں چھوٹی بہو بڑی سمجھ دار تھی بہت خوبصورت تھی۔

سوداگر جب اپنے کاروبار کے سلسلے میں باہر جاتے، سب بہوؤں سے پوچھتے کیا لائیں؟ ایک دن وہ جانے لگے تو کسی نے ساری لانے کی فرمایش کی کسی نے شال، کسی نے سنگاردان کسی نے آئینہ۔

چھوٹی بہو سے پوچھا تو اس نے کہا "آپ جس شہر میں جا رہے ہیں ایک جنگل ہے وہاں ایک کنواں ہے۔ قریب جا کر کہیے گا۔ بھئی تمھیں اپنی سہیلی کو جو کچھ دینا ہو دے دو۔ بس اب آپ کو وہ جو دیں لے لیجیے گا وہی میرا تحفہ ہوگا۔"

سوداگر میاں چلے گئے۔ سب سامان خرید کر جنگل میں پہنچے۔ کنویں کے پاس آکر وہی کہا جو بہو نے کہا تھا۔ کنویں سے ایک پری نکلی اور جگت پر ایک ڈبیا رکھ کر چلی گئی۔ سوداگر نے ڈبیا اٹھالی اور چلے گئے۔

گھر آکر سب کو سب کی چیزیں دیں چھوٹی بہو کو وہی ڈبیا دے دی۔

سب اپنے اپنے تحفے پاکر بڑی خوش تھیں۔ چھوٹی بہو نے ڈبیا کھول کر اپنے جھالے پہن لیے یہ جھالے اتنے خوبصورت اتنے چمک دار تھے کہ اندھیرے میں روشنی پھیل جاتی۔

بہوؤں کو پہلے ہی سے فکر تھی کہ اب چھوٹی بی

کے لے گیا آیا۔ اب جو اتنے اچھے جھالے دیکھے تو جل گئیں۔ سب مل کر سوچنے لگیں کہ کسی طرح یہ جھالے غائب کریں۔ آخر ایک ترکیب سمجھ میں آئی اور بہت خوش ہوئیں کہنے لگیں "چلو آج سب شاہی جھیل میں نہانے چلیں۔" چھوٹی بہو کو بھی لے گئیں۔ کوئی اس کا ہاتھ ملنے لگی کوئی پیر۔ کوئی گردن کوئی سر دھونے لگی اور کان سے جھالا نکال کر پانی میں پھینک دیا۔

اتفاق کی بات وہ جھالا مچھلی نگل گئی۔ مچھیروں نے جال ڈالا اور وہ مچھلی اور مچھلیوں کے ساتھ شاہی باورچی خانہ میں پہنچی۔ باورچی نے صاف کیا تو پیٹ سے جھالا نکلا۔ بادشاہ کو پیش کیا گیا۔ بادشاہ سلامت اتنا خوبصورت جھالا دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ اسی دن کئی کٹنیاں چھڑوائیں کہ پتہ چلائیں ایسا دوسرا جھالا کس کا ہے اور اس کو پہننے والی کیسی ہے۔

ایک کٹنی تلاش کرتے کرتے سوداگر کے گھر پہنچی اور بہوؤں سے کچھ پتہ نہ چلا پھر چھوٹی بہو کے پاس آئی۔ اسے دیکھ کر تاڑ گئی کہ ہو نہ ہو یہی ہے۔ ایک تو ایسی حسین اور کچھ غمگین بھی ہے۔ باتوں باتوں میں کھوج لگا لیا کہ ایک جھالا کھو گیا۔ بہتیرا ڈھونڈھا کہیں نہ ملا۔ جانے زمین کھا گئی کہ آسمان۔

کٹنی نے بادشاہ سے آکر سب بتایا اور کہا صورت تو اس کی ایسی ہے کہ چاند بھی دیکھ کر شرما جائے۔ یہ سن کر بادشاہ کو فکر ہوئی کہ اب کیا کیا جائے۔ کٹنی سے کہا "ان سے جاکر کہو کہ اپنا جھالا لینا ہے تو ہم سے آکر لیجائیں۔" کٹنی نے یہ پیام پہنچایا تو چھوٹی بہو نے جواب دیا۔ "کہہ دو بادشاہ سلامت سے کہو کہ بھیتری بھیتر سرنگ کھدوائیں۔ طاق ہی طاق لعل رکھیں کھجے کھجے دیے جلائیں۔ تب لے جائیں گے۔"

بادشاہ نے فوراً محل سے لے کر سوداگر کے گھر تک سرنگ کھدوائی۔ طاق طاق لعل رکھے۔ کھجے کھجے دیے جلائے۔ اور پلنگ بچھوا کر جھالا سینہ پر رکھ کر لیٹ گئے۔ چھوٹی بہو نے بال بال موتی پروئے اور سج بن کر وہاں پہنچی۔ بادشاہ اس کی خوبصورتی دیکھ کر بہوت رہ گئے۔ اس نے جھٹ جھالا اٹھایا اور بالوں کے موتی توڑتی بکھیرتی سرنگ سے واپس آئی۔ بادشاہ بہت مایوس ہوئے ان کو جب ہوش آیا تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ موتی چنتے صبح کر دی۔

اس دن بادشاہ نے سوداگر کو بلا بھیجا اور کہا "ایک کہانی بجھواتا ہوں۔ بوجھ لو تو آدھی سلطنت دے دوں گا۔ نہ بوجھ پائے تو ساتویں دن تمہارے بال بچے گھر بار سب نیلام کرا دوں گا۔"

سوداگر میاں بڑے پریشان ہوئے کہا "فرمایئے جہاں پناہ۔"

بادشاہ بولے "تمہارے گھر والی کی ہم نے گھر بیٹھے چکھی"

سوداگر کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ بہت پریشان تھے۔ عقل حیران تھی۔ کھانا پینا سب حرام ہو گیا۔ سب سے مشورہ کیا چھے بہوؤں سے پوچھا۔ مگر کسی کی سمجھ میں کوئی بات نہ آئی۔ چھے دن ہو گئے تھے۔ جب چھوٹی بہو کو خبر ہوئی اس نے کہا "ابا جان آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ کھانا کھائیں پانی پیئیں آرام سے سوئیں کل میں اس کا جواب بتا دوں گی اور آپ بادشاہ سلامت سے عرض کر دیجئے گا" صبح ہوئی سوداگر جانے لگے تو بہو سے پوچھا "بیٹی بتاؤ کیا کہوں" اس نے کہا "کہئے گا کہ بھیتر ہی بھیتر سرنگ کھدوائی۔ طاق ہی طاق لعل رکھے کھجے کھجے دیے جلائے موتی چنتے رین گنوائی دال چکھنے کب پائے۔"

سوداگر خوش خوش بادشاہ کے پاس حاضر

(بقیہ صفحہ ۱۵ پر)

ب مرزا سلمان

بھاکڑہ ننگل

گڈو اور چُنّی کے بھائی جان اب کے کوئی چھ مہینے بعد گھر آئے تھے۔ بے چارے بجلی کے انجینیر ہیں۔ آج کل یہاں اُن کا تبادلہ ہوتا رہتا ہے، سال دو سال ایک جگہ جم کے رہنے نہیں پائے کہ کہیں اور بھیج دیئے جاتے ہیں۔ کہیں چھٹے چھ ماہے دس پندرہ روز کے لیے چھٹی منانے گھر آجاتے ہیں۔

اس نوکری سے اور کچھ ہو نہ ہو انھوں نے نہ جانے کتنی بڑی بڑی جگہیں دیکھ ڈالی ہیں۔ بجلی گھروں کا تو پوچھنا ہی کیا۔ یہ تو گویا ان کے اپنے گھر ہیں۔ ہندوستان کے بڑے بڑے بجلی گھروں کے متعلق بتانے بیٹھ جاتے ہیں تو گھنٹوں لگ جاتے ہیں۔

خیر تو اب کی بھائی جان گھر آئے۔ ابھی گھر میں داخل ہو کر دم بھی نہ لینے پائے تھے کہ گڈو میاں نے آل انڈیا ریڈیو کی طرح خبریں ان کے گوش گزار کرنا شروع کر دیں "میں پاس ہو گیا ہوں، چھمو بھی پاس ہو گیا ہے لیکن ہمارا دوست کریم بے چارہ فیل ہو گیا، عمران کے ابا انگلستان سے لوٹ آئے ہیں۔ ساجد چھٹیوں میں بمبئی جا رہے ہیں، بجیا کی گڑیا کی شادی فرزانہ کے گڈے سے ہو گئی ہے، حامد وغیرہ اپنے نئے گھر میں چلے گئے ہیں"۔

یوں سمجھیے کہ تمام اہم اہم واقعات جو اس مختصر عرصے میں رونما ہوئے تھے وہ تقریباً سب ایک سانس میں سُنا گئے۔ سب سے آخری اور دلچسپ خبر انھوں نے یہ سنائی کہ "ارے ہاں بھائی جان! ایک بہت عجیب غریب بات۔ حکومت بہت سے قطب مینار بنوا رہی ہے"

بھائی جان کی تو کچھ سمجھ میں آیا نہیں لیکن باقی گھر والے غریب گڈو کا مذاق اُڑانے لگے۔

نہا دھو کر اور کھا پی کر جب بھائی جان بیٹھے اور ان کے گرد سب بھائی بہن اکٹھا ہوئے تو انھوں نے گڈو سے پوچھا "ہاں میاں! کیسے قطب مینار بن رہے ہیں؟"

"لوہے کے بہت اونچے اونچے!" جواب حاضر تھا۔

ایک دفعہ پھر سب لوگ خوب ہنسے اور پھر بی چھتی نے بھائی جان کو سمجھایا "یہ بدھو اصل میں بجلی کے ان اونچے اونچے میناروں کا ذکر کر رہا ہے جن پر سے سنا ہے بہت طاقت کی بجلی گزاری جائے گی"۔

اب بھائی جان کی سمجھ میں آیا کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ بولے "اچھا اچھا۔ تو یہ لائن بننا شروع ہو گئی بہت دنوں سے اس کا منصوبہ بن رہا تھا"۔

"تو کیا آپ کو اس کے متعلق معلوم ہے؟"

گڈو نے پوچھا۔

بھائی جان نے کہا "ہاں بھئی تھوڑا بہت تو معلوم ہے۔"

اتنا سننا تھا کہ گڈو چنّی کا تو ذکر ہی کیا روحی شمسی تک پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ گئیں۔ سوالات کی بوچھار کر دی۔ یہ بجلی کہاں سے آ رہی ہے؟ کہاں لے جائی جا رہی ہے؟ اس کے لیے اتنے بڑے بڑے میناروں کی کیا ضرورت ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

بھائی جان پہلے تو بہلا پھسلا کر ٹالتے رہے۔ لیکن یہ سب بھی تو ان ہی کے بھائی بہن تھے۔ اس قدر آسانی سے جان بخشنے والے کہاں تھے۔ آخر بھائی جان کو اقرار کرتے ہی بنا "اچھا بھئی سنو، سب بتاتا ہوں۔" اور پھر انھوں نے کہنا شروع کیا۔

"یہ بجلی پنجاب کے بھاکڑہ بجلی گھر سے آئی ہے اور اتر پردیش کی طرف لے جائی جا رہی ہے۔ اسے بہت زیادہ مقدار میں اور بہت دور تک لے جانا ہے اس لیے ایسے چھوٹے چھوٹے کھمبوں اور دبلے پتلے تاروں سے کام نہیں چل سکتا تھا۔ جیسے ہمارے محلے میں بجلی لانے کے لیے لگے ہوئے ہیں۔ بلکہ اسے بہت طاقت کے ساتھ لے جایا جائے گا۔ اتنی طاقت کے ساتھ کہ اگر کوئی اس کے تاروں کے پاس ڈیڑھ دو گز کے اندر بھی چلا جائے تو یہ ایسے کھینچ لے گی جیسے مقناطیس لوہے کے ٹکڑوں کو کھینچ لیتا ہے اور اگر کہیں اس کے دو تار پاس پاس آ جائیں تب تو ایسا شعلہ اٹھے گا کہ رات کو دن بنا دے گا۔ اس لیے اسے اتنے بڑے بڑے میناروں پر لے جا رہے ہیں۔ تاکہ اس کے تار زمین سے بھی بہت دور رہیں اور آپس میں بھی دور دور رہیں۔"

بھائی جان نے تو اپنے خیال میں نہایت اطمینان بخش جواب دے دیا لیکن اس نے تو ان سب کے ذہنوں میں اور نہ جانے کتنے سوال پیدا کر دیے۔ چنّی بولے۔ "ارے جب یہ اتنی خطرناک ہے تو اسے ہمارے شہر کے پاس سے لے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ اتر پردیش والے خود ہی کیوں نہیں بنا لیتے؟"

لیکن اس کے جواب کے لیے بھائی جان کو زحمت نہیں کرنا پڑی۔ اتنی بات تو گڈو میاں کو بھی معلوم تھی۔ انھوں نے جھٹ بتا دیا کہ "اصل میں بھاکڑہ میں ایک بہت بڑا بند اور پانی سے چلنے والا بجلی گھر ہے۔ یہ بجلی وہیں سے لائی جا رہی ہے۔"

پھر خود ہی کچھ سوچ کر بولے "بھائی جان! بجلی پیدا کرنے کے لیے اونچائی سے گرتا ہوا پانی ہی تو چاہیے۔ تاکہ اس کی طاقت سے بجلی بنانے کی مشین چلائی جا سکے اور یہ اونچائی سے گرتا ہوا پانی بند بنا کر حاصل کیا جاتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس کے لیے بھاکڑہ جانے کی کیا ضرورت ہے۔ ہمارے گھر کے پاس اتنی بڑی گنگا بہہ رہی ہے اس پر کیوں نہیں بند باندھ لیتے؟"

بھائی جان نے کہا "ہاں بھئی بنانے کو بند تم یہاں بنا سکتے ہو۔ لیکن اس سے بہت اونچائی تک پانی نہیں جمع کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ جوں ہی پانی گنگا کے کناروں سے اونچا ہوگا۔ ادھر ادھر بہنا شروع ہو جائے گا۔ آس پاس کے سب گاؤں شہر ڈوب جائیں گے اور بجلی تم پھر بھی نہ بنا سکو گے۔ اسی لیے ایسا نہیں ہے کہ کہیں بھی اور کسی دریا پر بند بنا دیا جائے۔ بند بنانے سے پہلے مناسب جگہ کی تلاش کرتے ہیں۔ مثال کے طور بھاکڑہ ہی کو لے لو یہ دریائے ستلج پر باندھا گیا ہے۔ یہ دریا ہماچل پردیش

کے پہاڑوں سے نکلتا ہے۔" چنی نے ایک دم ٹوکا: "یہ بھلا پہاڑوں سے دریا کیسے نکلتے ہیں؟ وہاں بھلا اتنا پانی کہاں سے آجاتا ہے؟"

بھائی جان نے سمجھایا "دیکھو بھئی ہوتا یہ ہے کہ جیسے یہ گنگا ہے۔ سال بھر جیسے تیسے بہتی ہی رہتی ہے۔ برسات کے موسم میں تو خیر بارش کا پانی ہوتا ہے لیکن گرمیوں میں اس میں پانی کہاں سے آتا ہے؟ گرمیوں میں پانی کم ضرور ہو جاتا ہے لیکن بہتا ہی رہتا ہے۔ ایسا ہی سب بڑے دریاؤں کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ ایسی جگہ سے بہنا شروع ہوتے ہیں جہاں بہت سا پانی جمع ہو۔ ہمارے دیس کے تقریباً سب دریا پہاڑوں سے نکلتے ہیں۔ قدرت سردی کے موسم میں ان اونچے اونچے پہاڑوں پر برف گرا کر خوب جمع کر دیتی ہے۔ اب جوں جوں گرمی پڑتی ہے یہ برف پگھلنا اور نیچے کی طرف بہنا شروع کر دیتی ہے۔ بہت سے چھوٹے چھوٹے پہاڑی نالے ملتے جاتے ہیں اور نیچے آتے آتے یہ دریا بن جاتے ہیں۔

روحی جھلا کر بولیں "بھئی یہ چنی بیچ میں ناحق بور کرنے لگتے ہیں۔ آپ بھائی جان یہ بتائیے بند کیسی جگہ بنایا جاتا ہے؟"

بھائی جان نے سمجھایا "ارے بھئی وہ چھوٹا بھی تو ہے۔" اور پھر کہنا شروع کیا "ہاں بھئی تو یہ ستلج ہماچل پردیش سے نکل کر پہاڑوں میں راستہ ڈھونڈتا، بل کھاتا، لڑھکتا یہاں تک پہنچتا ہے جہاں اب بند بنا دیا گیا ہے۔ یہاں بہت اونچے اونچے برفیلے ہمالیہ ایسے پہاڑ تو نہیں ہیں لیکن ہاں ان سے کم اونچے پہاڑ بلکہ پہاڑیاں ضرور ہیں جہاں اب بند بنایا گیا ہے۔ یہاں بھاکڑہ نام کا ایک گاؤں تھا۔ اس گاؤں کے پاس ستلج نے دو پہاڑیوں کے بیچ سے نکلنے کا راستہ ڈھونڈھ لیا تھا۔ بند بنانے والوں نے دیکھا کہ اگر یہ راستہ بند کر دیا جائے تو دور دور تک دریا کو نکلنے کے لیے کوئی راستہ نہیں ملے گا۔ ہر طرف سے اونچی اونچی پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے۔

پہلے اس جگہ کی زمین کی جانچ کی گئی کہ بہت بوجھ پڑنے سے وہاں کی مٹی کھسکنے تو نہیں لگے گی۔ بند بنایا جائے تو مضبوط رہے گا یا نہیں۔ ان سب باتوں کا اطمینان کر لینے کے بعد جگہ پسند کر لی گئی اور بند بنا دیا گیا۔

اس بند کے پیچھے ستلج کا پانی آ آ کر اکٹھا ہوتا جاتا ہے۔ پانی کا ایک سمندر ان پہاڑیوں کی گود میں بند کے پیچھے بن گیا ہے۔ اسے کہتے بھی گوبند ساگر ہیں۔ اس کی گہرائی کہیں کہیں تو پانچ سو فٹ تک پہنچ گئی ہے۔ اور اس میں اتنا پانی جمع ہے کہ یوں سمجھ لو کہ اگر اس ساگر کی ایک نہر بنائیں تو وہ لگ بھگ ۴۵ فٹ چوڑی بیس فٹ گہری اور ½ ۸ ہزار میل لمبی ہو گی۔ گویا پورے ہندوستان کے گرد ایسی ایک نہر بن جائے گی اور پانی بھی تو کتنا ہوتا ہے ۲۲ ہزار مربع میل کے رقبے میں جتنا پانی برستا ہے سب بہہ بہہ کر اس میں جمع ہوتا ہے۔

جس جگہ اب یہ پانی جمع ہو گیا ہے پہلے ۳۶۶ گاؤں آباد تھے۔ بند بناتے وقت ان سب کو خالی کرایا گیا ان کے ۳۰ ہزار باشندوں کو دوسری جگہ بسایا گیا۔

بھائی جان نے ابھی بات ختم ہی کی تھی کہ ایک سوال اور حاضر تھا "آخر یہ بند ہوتا کیا ہے؟"

بھائی جان بولے "ارے بھئی یوں سمجھ لو ایک بہت اونچی سی دیوار ہوتی ہے۔ خوب مضبوط۔ نیچے سے بہت چوڑی تاکہ پانی کے زور سے بہہ نہ جائے۔" چنی میاں کی سمجھ میں بات کچھ آئی

نہیں یہ دیکھ کر بھائی جان نے پنسل سے کاغذ پر تصویر بنا کر بتایا کر "دیکھو اگر اس دیوار کو ایک سرے سے کھڑے ہو کر دیکھا جائے تو ایسی نظر آئے گی۔

چونکہ پہاڑیوں کے بیچ میں اوپر کی طرف زیادہ اور نیچے سے کم ہوتی ہے اس لیے بند کی لمبائی اوپر تو زیادہ اور نیچے سے کم ہوتی ہے۔ یعنی سامنے کھڑے ہو کر دیکھو تو بند ایسا نظر آتا ہے" اور بھائی جان نے پنسل سے ایک اور شکل بنا کر بتائی۔

پھر انھوں نے کہا "اب جیسے بھاکڑہ کا بند ہی لے لو۔ اس کی اونچائی ۷۴۰ فٹ ہے۔ یعنی اگر تین قطب مینار اوپر نیچے رکھ دیئے جائیں تب بھی یہ بند ایک دو منزلہ مکان کے برابر ان سے اونچا رہے گا۔ اب خود ہی سوچو جب کوئی دیوار اتنی اونچی ہو تو وہ چوڑی کتنی ہو گی۔ چنانچہ یہ بند بھی نیچے سے ۲۳۰ فٹ یعنی دو فرلانگ اور اوپر سے ۳۰ فٹ چوڑا ہے۔ اس کی لمبائی نیچے تو ۳۲۵ فٹ ہے اور اوپر ۱۷۰۰ فٹ ہے۔

اوپر چڑھو تو بس ایسا لگتا ہے کہ ۷۴۰ فٹ کی اونچائی پر کوئی ایک تہائی میل لمبی ایک سڑک بنی ہے جس پر چار موٹریں ایک ساتھ چل سکتی ہیں۔

سب کے سب حیرت سے بت بنے ہوئے بھائی جان کی باتیں سن رہے تھے۔ ان کی دلچسپی دیکھ کر وہ بھی کہتے رہے۔ "یہ دنیا کا سب سے اونچا بند ہے۔ اس کے بنانے کا اصل مقصد تو سنچائی کے لیے پانی جمع کرنا ہے۔ چنانچہ اس سے پنجاب اور راجستھان کی لگ بھگ ایک کروڑ ایکڑ زمین کو سیراب کیا جائے گا دنیا کے کسی اور بند سے اتنی زمین سیراب نہیں کی جاتی۔ اس کے علاوہ اس سے بجلی تو گھاتے مین پیدا کی جاتی ہے۔ بند کے دونوں طرف پانی سے چلنے والے دو بجلی گھر بنائے گئے ہیں۔ پورے ایشیا میں اس سے زیادہ بجلی کسی بند پر نہیں بنتی اور یہ اتنی ہے کہ آزادی سے پہلے تو پورے ہندوستان میں ملا کر اتنی بجلی پیدا کی جاتی تھی بند کی دیوار میں آٹھ فٹ چوڑے آٹھ فٹ لمبے سولہ روزن تو صرف آب پاشی کے لیے پانی نکالنے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ پندرہ فٹ قطر کے دس پائپ بند کے دائیں اور بائیں بنے ہوئے بجلی گھروں میں پانی پہنچاتے ہیں۔ بجلی پیدا کرنے والی مشین چلانے کے بعد یہ پانی بھی سنچائی ہی کے کام میں آجاتا ہے"

(آگے کا دلچسپ حال اگلے پرچے میں)

تتلی

جناب مختار بارہ بنکوی

ننھی منی ، میری تتلی
نازک نازک پر چمکیلے
جھوم جھوم تیرا لہرانا
ہلکی پھلکی پیاری پیاری
لے رنگ و بو کی متوالی
اٹھ کر نیند سے صبح سویرے
دیکھ کے تیری پیاری صورت
باغ کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں
نور کے تڑکے تیرا آنا
ہر سو جھل مل جھل مل کرنا
پھول تجھے ہیں جس دم پاتے
سبزہ تیرے پاؤں کو چومے

پھولوں کی آنکھوں کی پتلی
رنگ برنگے اور چمکیلے
گھوم گھوم ہر دم بل کھانا
پھولوں کی ہے تو راج دلاری
تو پھرتی ہے ڈالی ڈالی
تو باغوں کے کرتی ہے پھیرے
بڑھ جاتی ہے پھولوں کی رنگت
لیتی ہیں تیری آ کے بلائیں
پہروں باغوں میں لہرانا
رنگ سے گل کا دامن بھرنا
ناز سے آنکھوں پر ہیں بٹھاتے
پھول تری صورت پر جھومے

بچے جب تجھ کو پاتے ہیں
پھول کی صورت کھل جاتے ہیں

دادی ماں

جناب مرزا شکور بیگ حیدرآباد
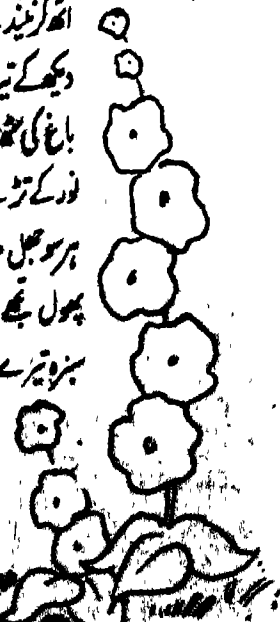
جب ہم نے ہوش سنبھالا تو ہمارے گھر میں ایک دادی ماں موجود تھیں۔ دبلی پتلی، چہرہ پر جھرّیاں۔ گال پچکے ہوئے۔ سر کے بال سفید بگلے کے سے ایک چھوٹی سی چوٹی پیچھے پڑی رہتی تھی۔ کبھی کچھ پڑھتیں تو اپنی پرانی عینک لگا لیتیں جس کے ایک طرف ڈوری بندھی تھی جو کان سے لپیٹ لی جاتی تھی۔

بڑی تیز مزاج اور "جھٹ خفا" تھیں۔ پورا گھر، چھوٹے بڑے، سب انھیں "دادی ماں" کہتے تھے۔ ہم بھی انھیں "دادی ماں" کہتے۔ ہمارے ابا بھی ان کو دادی ماں کہتے تھے۔

گھر کے داہنی جانب، کمرے کے سامنے ان کا چھوٹا سا پلنگ بچھا رہتا تھا، اسی پر دادی ماں بیٹھی رہتی تھیں۔ نیند آجاتی تو اسی پر سو جاتیں۔ اس پلنگ کے قریب ہی ایک چھوٹا تخت پڑا تھا۔ اس پر آنے جانے والا ٹِک جاتا تھا۔

دادی ماں کے منہ میں ایک دانت نہ تھا مگر پان کھانے کا شوق باقی و قایم تھا۔ پن کٹی میں اپنے ہاتھ سے پان کوٹ لیا کرتی تھیں اور پھر اسے ایک چھوٹے چمچے سے یا کبھی کبھار اپنے کلمے کی انگلی سے چاٹ لیا کرتی تھیں۔ ان کے منہ کے دونوں کناروں سے پان کی پیک بہتی تو اسے ایک چھوٹے سے کپڑے سے پوچھ لیا کرتی تھیں۔ اس کپڑے کا اصلی رنگ کیا تھا یہ تو خدا جانے، مگر اب تو جو پیک کا رنگ تھا وہی کپڑے کا رنگ تھا۔ اس کپڑے کو نہ خود دھوتیں نہ کسی کو دھونے دیتیں۔

دادی ماں مہینے میں دو دفعہ ضرور نہایا کرتی تھیں جب وہ غسل خانے میں جاتیں تو اتنی دیر اندر رہتیں کہ خدا کی پناہ۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اندر سو گئی ہیں۔ نہا دھو کر جب نکلتیں تو ان کا چہرہ اور بھی نورانی ہو جاتا تھا۔ کبھی پانی کے بہت گرم ہونے کی شکایت کرتیں۔ کبھی کہتیں کہ پانی ٹھنڈا تھا۔

دادی ماں کے پلنگ کے پاس ایک لکڑی تھی۔ جسے وہ ٹیک کر چلا کرتی تھیں۔ اُسی سے کبھی قریب آنے والی مرغیوں کو بھگایا کرتی تھیں۔ کسی سے بگڑ جاتیں تو اسے مارنے کے لیے وہی لکڑی اٹھائی جاتی تھی۔

دادی ماں کی ایک ادا ہمیں بہت پسند تھی۔ مثلاً جب انھیں پان منگوانا ہوتا۔ یا پان کی صافی بھگوانا ہوتی۔ یا کسی سے کوئی چٹھی لکھوانی ہوتی تو اس وقت ان کا لہجہ بڑی محبت کا ہوتا تھا۔ کسی نوکر سے کہتیں "بھیّا ذرا ہمیں پان لا دینا"۔ کبھی کہتیں بیٹا "یہ صافی بھگو لانا"۔ کبھی بھائی جان سے چٹھی لکھوانی ہوتی تو فرماتیں "بیٹا تیرے صدقے ذرا اس پر دو قلم تو چلا دے" اور اگر کوئی ان کی نہیں سنتا تو پھر اس کی یوں لے دے شروع ہو جاتی "ارے کیا زمانہ ہے بڑوں کی خدمت کرنا تو کوئی جانتا ہی نہیں"۔

کبھی کبھی آپا کی سہیلیاں دادی ماں کی طرف سے بغیر سلام کیے گزر جاتیں تو دادی ماں فرماتیں "کیا لڑکیاں ہیں۔ توبہ توبہ۔ نہ ادب نہ سلام یہ لڑکیاں

"نہیں یہ تو گھوڑیاں ہیں گھوڑیاں"۔
مگر جب دادی ماں موڈ میں ہوتیں تو ایسی باتیں کرتیں کہ جی چاہتا کہ کبھی ختم نہ ہوں۔ ایسی میٹھی اور پیاری زبان استعمال کرتیں کہ بیان سے باہر ایک دن ہم نے دادی ماں سے پوچھا "آپ کو کہانی بھی آتی ہے؟"
کہنے لگیں: "دنیا میں کون ایسا آدمی ہے جسے کہانی نہیں آتی" یہ سنتے ہی ہم بولے: "دادی ماں ہمارا مالی کہتا ہے کہ اسے کہانی نہیں آتی"۔ فرمایا: "بس چپ رہو۔ وہ آدمی نہیں ہے وہ تو مالی ہے"۔
کبھی کبھی ہم دور کھڑے یہ تماشا دیکھا کرتے تھے کہ دادی ماں باتیں کر رہی ہیں۔ ہاتھوں سے اشارے بھی ہو رہے ہیں۔ مگر وہاں کوئی آدمی نظر نہ آتا تھا۔ ہم دادی ماں کے قریب تک پہنچ جاتے تھے مگر انہیں ہمارے آنے کی خبر نہ ہوتی تھی۔ ان کی باتیں برابر جاری رہتی تھیں۔ جب انھیں دادی ماں کہہ کر آواز دیتے تو وہ چونک پڑتیں اور کہتیں آؤ بیٹا آؤ۔ ہم پوچھتے آپ کس سے باتیں کر رہی تھیں۔ تو فرماتیں "چند باتیں نہیں۔ ہم تو سوچ رہے تھے"۔
چند دنوں بعد دادی ماں کو ایک جھک لگ گئی۔ ان کے پلنگ کے سامنے چار پانچ گز کے فاصلے پر ایک دیوار تھی۔ دادی ماں ہر آنے جانے والے سے کہتیں: "بیٹا ذرا اس دیوار کو سرکا دینا یہ تو میری چھاتی پر آئی جاتی ہے"۔ اگر کوئی کہہ دیتا کہ دادی ماں دیوار بھی کہیں چلا کرتی ہے تو اس پر برس پڑتیں اور فرماتیں "تو مجھے عقل سکھاتا ہے ذرا نزدیک تو آ۔ تیری چمڑی ادھیڑ دوں گی"۔ اس دیوار کی جھک انھیں ایسی لگی کہ دادی ماں نے کہنا سننا سب چھوڑ دیا۔ ہر وقت یہی وظیفہ کہ خدا کے لیے اس دیوار کو ہٹا دے تو مجھے دبوچ لے گی۔ جھک آکر امی نے ابا سے اس کا ذکر کیا۔ ابا نے کہا تم لوگ ان سے بحث مت کیا کرو۔ یہ ان کی عمر کا آخری زمانہ ہے۔ دیکھو ہم انھیں ابھی خوش کیے دیتے ہیں۔ یہ کہہ ابا اٹھے اور دادی ماں کے پاس جاکر کہا: "دادی ماں خیریت تو ہے۔ کوئی تکلیف تو نہیں۔ دادی ماں نے کہا: "بیٹا ذرا اس دیوار کو دیکھنا یہ تو مجھ پر سوار ہونا چاہتی ہے"۔ ابا جان بولے: "سچ ہے یہ بہت گستاخ ہو گئی ہے میں ابھی اسے پیچھے ڈھکیل دیتا ہوں"۔ یہ کہہ کر ابا نے اپنے دونوں ہاتھ دیوار پر رکھ دیے اور اسے ڈھکیلنے لگے پھر دادی ماں سے کہا "آپ دیکھیے ٹھیک ہے نا"۔ دادی ماں نے خوش ہو کر کہا: "بیٹا تیرے صدقے اب بالکل ٹھیک ہے۔ اب مجھے چین پڑا"۔ ابا بولے: "کہیے تو اور سرکا دوں"۔ وہ بولیں: "بس اب اور نہ تھکو اللہ تمھیں سو برس قایم رکھے"۔ ہم سب مسکراتے ہوئے وہاں سے واپس آگئے۔ دو چار دن تو دادی ماں یہی کہتی رہتیں کہ چھوٹے میاں کو اللہ سلامت رکھے وہ نہ آتے تو یہ موئی دیوار مجھے دبوچ لیتی اس کے بعد پھر وہی سلسلہ شروع ہو گیا کہ ذرا اس دیوار کو سرکا دینا مجھے یہ مار ڈالے گی۔ کبھی فرماتیں "کوئی اللہ کا بندہ مجھ نگوڑی پر رحم کھائے اس دیوار کو سرکائے میرا تو دم گھٹا جاتا ہے۔ امی نے نوکروں کو ابا والی ترکیب سکھا دی تھی۔ جب دادی کے تقاضے میں شدت ہو جاتی تو نوکر دیوار کو ڈھکیلتے اور دادی ماں خوش ہو کر دعائیں دینے لگتیں۔
ایک دن ہم نے سنا کہ دادی ماں نے بات کرنا چھوڑ دی ہے بے ہوش ہیں۔ بچوں کو ادھر سے گزرنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ امی نے جلدی جلدی ہمارے کپڑے بدلے اور سب کو باغ میں بھیج دیا۔ بہت دیر بعد جب ہم گھر لوٹے تو دادی ماں کا ٹھکانا خالی تھا۔ ہم نے دادی ماں کو پوچھا تو جواب ملا۔ وہ دواخانہ گئی ہیں۔ کبھی کبھی یہ جملہ سنائی دیتا تھا کہ دادی ماں کے دم سے بڑی برکت تھی۔ سالہا سال گزر گئے مگر دادی ماں ابھی تک دواخانہ میں ہیں۔

جناب مقیم شاد مونگیری

ہمارا پڑوسی ملک

نیپال

نیپال ہمارا پڑوسی ملک ہے۔ اس کی سرحدیں یو۔پی، بہار اور بنگال سے ملتی ہیں۔ کہتے ہیں کبھی پہلے یہ ملک ہمارے دیس کا ایک حصہ تھا۔ بعد میں یہ آزاد کر دیا گیا اور اب یہ ایک آزاد ملک ہے۔ اس کی راج دھانی کاٹھمنڈو ہے۔

کاٹھمنڈو کے علاوہ تین بڑے شہر اور ہیں۔ بیراٹ نگر، بیر گنج اور دھران۔ ان چاروں میں سب سے زیادہ خوبصورت کاٹھمنڈو ہے پھر بیراٹ نگر۔

نیپال کی آب وہوا، پیداوار، رہن سہن یا تہذیب و تمدن ہمارے ملک جیسا ہے ہاں صرف زبان میں کچھ فرق ہے۔ یہاں بہت سے ہندوستانی تاجر آباد ہیں اور اردو، بنگالی اور مارواڑی وغیرہ زبانیں یہاں بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ اُردو سب سے زیادہ۔

اس کے دو شہر بہار کی سرحدوں کے بالکل قریب ہیں۔ ایک بیراٹ نگر یہ شمال مشرق سرحد کے قریب ہے، دوسرا بیر گنج یہ شمال مغرب سرحد کے قریب ہے۔ بیراٹ نگر کی سڑکیں کھلی کھلی ہیں۔ بازار خوبصورت ہیں۔ صاف ستھرے پارک ہیں۔ شاندار ہوٹل ہیں۔ حال ہی میں ایک خوبصورت سڑک بنائی گئی ہے جس کا نام "ملایا روڈ" ہے۔

ویسے یہ سڑک ملایا تک نہیں جاتی صرف بیراٹ نگر سے دھران تک تقریباً چالیس میل لمبی ہے لیکن ہے بہت خوبصورت۔

"نیپال کا پورا علاقہ اونچی نیچی پہاڑیوں پر پورب سے پچھم تقریباً پانچ سو میل چوڑا ہے۔ اس کی اونچائی سطح زمین سے کم سے کم پانچ سو فٹ ہے۔ قریب قریب پورا علاقہ پہاڑی ہے اور قیمتی اور کارآمد جنگلوں سے مالا مال ہے۔

یہاں دکانیں بھی نئے طرز کی ہیں۔ ہر دکان میں آپ کو ضرورت کی تمام چیزیں مل جائیں گی۔ مثلاً سائیکل کی دکان پر گھڑی، ریڈیو، کپڑا، سگریٹ، بیڑی اور سوئی تک مل جائے گی۔ قریب قریب سب ہی دکانوں

حالت ہے۔

یہاں چینی، جاپانی، ہندوستانی اور پاکستانی سامان
ے ملتا ہے۔

سامان بیچنے کے لیے تمام دکان داروں کا کوٹہ
۔ ہر دکاندار صرف اتنا ہی سامان رکھ سکتا ہے جتنا
یں فروخت کر پاتا ہے۔ ہر دکان دار کے پاس ایک
وتا ہے اس پر فروخت ہونے والی چیزوں کی مقدار یا
ی ہوتی ہے۔ وہ اس کارڈ کو لے کر ہوائی اڈے
۔ جہاں ہوائی جہاز سے چین، جاپان، ہندوستان اور
، یا اور دوسرے ملکوں کا سامان آتا ہے۔ ہر دکاندار
یلر" یا آڑھتی کو اپنا اپنا کارڈ دکھاتا ہے اور سامان
ہے۔

نیپالی سکے "مورو" اور "بھارد" کہلاتے ہیں۔
سی یا نوٹ ہوتا ہے اور بھارو دھات کے بنے ہوئے
ہاں کے سکوں کی قیمت اپنے یہاں کے روپوں سے
صد کم ہے۔ یعنی یہاں کا ایک روپیہ اور وہاں کا
پیہ تینتیس پیسہ یا وہاں کا ایک مورو اور اپنے یہاں
ٹھ پیسے برابر ہوتے ہیں۔

نیپال میں آمد و رفت کی زیادہ سہولتیں نہیں ہیں۔
یاں نہیں چلتیں۔ لوگ بسوں، کاروں، اور ٹیکسیوں میں
، ہیں۔ شہروں میں ٹیکسیوں، کاروں، بسوں، ٹیمپو اور
سواریوں کا عام رواج ہے۔

ہندوستان سے راج دھانی یعنی کاٹھمنڈو تک
یے دو راستے ہیں۔ ایک ہوائی بیرات نگر اور
راستے سے اور دوسرا بس کا راستہ جو صرف بیر گنج
ہے۔

تعلیم کا [illegible]

پورے نیپال میں صرف ایک یونیورسٹی اور تین کالج ہیں۔ یونیورسٹی
اور دو کالج کاٹھمنڈو میں اور ایک کالج بیرات نگر میں۔

نیپال میں شاہی حکومت ہے مگر حکومت کا سارا
نظم و نسق وہاں کے وزیر اعظم کے ہاتھ میں ہے اپنے ملک کی
طرح وہاں بھی ہر محکموں کے وزیر ہیں۔ راجہ رانی کے اختیارات
بھی کچھ کم نہیں۔ تمام اہم معاملوں میں ان کا مشورہ ضروری ہے۔

نیپالی لوگ اپنے راجہ رانی کی بے حد عزت کرتے
ہیں۔ نیپال میں کوئی ایسی دکان یا کوئی ایسا گھر نہ ہوگا جس میں
نیپالی، اپنے راجہ رانی کی تصویر نہ رکھتے ہوں۔ وہ روز صبح اٹھ
کر ان کی تصویروں کے آگے اگربتی وغیرہ جلاتے ہیں اور ہاتھ
جوڑ کر سلام کرتے ہیں۔

وہاں کے سنیما گھروں میں بھی فلم شروع ہونے
سے پہلے راجہ رانی کی تصویریں پردے پر دکھائی جاتی ہیں۔
اس وقت ہال میں بیٹھے سبھی لوگ احتراماً کھڑے ہو جاتے ہیں۔

موجودہ راجہ کا نام شاہ مہندر ہے یہ اعلیٰ تعلیم یافتہ
اور بہت روشن خیال ہیں۔ ان کی بدولت نیپال تیزی سے ترقی
کی طرف قدم بڑھا رہا ہے۔

نیپال میں زیادہ تر بدھ مذہب کے ماننے والے
ہیں۔ جو خاص نیپالی ہیں وہ تو بدھ [illegible]
ماننے والے) ہیں۔ مگر ہندوستانی بھی کثرت سے ہیں یہ زیادہ تر
تجارت پیشہ ہیں۔ ان میں مسلمان، ہندو وغیرہ سبھی ہیں۔
ہندوؤں میں زیادہ تر مارواڑی اور مسلمانوں میں بہاری
اور یو۔پی والے ہیں۔

نیپال کی خاص آمدنی وہاں کے جنگل ہیں۔ وہاں
بڑے گھنے گھنے جنگل سینکڑوں میل تک پھیلے ہوئے ہیں۔
ان جنگلوں میں ساکھو، شیشم، دیودار اور چندن کے بے
شمار درخت ہیں۔ نیپال کو ان درختوں سے بہت

زیادہ آمدنی ہے۔ وہ ان درختوں کی لکڑیاں باہر ملکوں میں بھیج کر کافی [illegible] ہے۔ یہ لکڑیاں وہ ہندوستان کو بھی دیتا ہے اور بدلے میں روئی۔ کپڑا، کل پرزے، لوہے کا سامان تمباکو۔ ریشم کا سامان وغیرہ منگاتا ہے۔

نیپال سے ہمارا رشتہ اور تعلق بہت پرانا ہے۔ ہمارے ملک کے صوبہ بہار کے مشہور شہر گیا میں مہاتما بدھ کا مندر ہے۔

پشوپتی ناتھ کا مندر

جس کی وجہ سے ہر سال سینکڑوں نیپالی ہندوستان آتے ہیں۔ اور نیپال کی راج دھانی کاٹھمنڈو میں پشوپتی ناتھ کا مندر ہے۔ جہاں ہر سال سینکڑوں ہندوستانی ہندو تیرتھ کے لیے جاتے ہیں۔

نیپال میں یہاں سے آنے جانے کی کوئی پابندی نہیں۔ ہر شخص نیپال جا سکتا ہے اور گھوم پھر سکتا ہے۔

آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ ابھی تھوڑے دنوں پہلے نیپال کی روشن خیال حکومت نے اُردو کو بھی اپنے نصاب میں شامل کر لیا ہے۔

ہمارے آپ کے لیے یہ بڑی خوش خبری ہے۔ کاش ہمارے دیس کے لوگ بھی اسے محبت اور پیار کی نظر سے دیکھیں!

(باقی اگلے پرچے میں)

مولانا مقبول احمد سیوہاروی ۔ حامد

سفرنامہ ابن بطوطہ

(مسلسل)

انطالیہ میں بڑے بڑے بازار ہیں۔ پھلوں کی کثرت ہے۔ ہر طرف باغ ہی باغ نظر آتے ہیں ٹھنڈے اور میٹھے پانی کے چشمے رواں ہیں۔

پھلوں میں خوبانی بہت عجیب ہے۔ گٹھلی توڑیئے تو بادام جیسا مغز نکلتا ہے میٹھا اور خوش ذائقہ۔ لوگ اسے قمر الدین کہتے ہیں۔ خوبانی سکھا کر مصر بھیجی جاتی ہے اور وہاں بہت پسند کی جاتی ہے۔

ہم یہاں ایک مدرسے میں ٹھہرے جس کے مہتمم شیخ شہاب الدین حموی ہیں

نوجوان بھائی چارہ کمیٹی

ترکوں کے تمام ملکوں میں اور اگر یہ کہا جائے کہ دنیا کے کسی حصے میں ایسی جماعت نہیں دیکھی تو صحیح ہوگا۔ اس جماعت کو اخیۃ الفتیان کہتے ہیں۔ حد درجہ مسافر نواز، ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرنے والے، ظالم سے بدلہ لینے میں دلیر، مظلوم کے لیے سراپا خیر۔ یہ سب نوجوان لوگ ہیں۔ ان کی بڑی جماعت ہے اور ہر شہر میں ایک ہی نام ہے۔ یہ لوگ مخلوق کی خدمت میں مصروف ہیں۔ مخلوق خدا کی یہ خدمت ان کی زندگی کا مقصد ہے۔ مظلوم کی حمایت کرنا ان کا نصب العین ہے۔

ان کے چھوٹے چھوٹے جتھے ہیں۔ ہر ایک جتھا اپنا ایک سردار چن لیتا ہے اور اسی کے حکم پر چلتا ہے۔ یہ لوگ دن بھر مختلف قسم کے کام کرتے ہیں۔ شام کو اپنی کمائی سردار کے پاس جمع کر دیتے ہیں۔ ان کی خانقاہیں ہیں۔ جن میں یہ لوگ جمع ہوتے ہیں سب مل کر کھانا کھاتے ہیں۔ کھا پی کر حال و قال کی محفل سجاتے ہیں اور خوش رہتے ہیں۔ اپنے سردار کو اخی (بھائی) کہتے ہیں۔

شہر میں کوئی مسافر آجاتا ہے تو اس کی خوش خلقی اور تواضع خوب مدارات کرتے ہیں۔ مہمان جب تک رہتا ہے۔ اتنی عزت اور محبت سے پیش آتے ہیں کہ بیان میں نہیں آسکتا۔

جیسا کہ ذکر کر چکا ہوں شیخ شہاب الدین حموی کے ہاں میرا قیام تھا دوسرے دن ایک شخص آیا جس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ سر پہ نمدے کی ٹوپی تھی۔ شیخ سے ترکی میں باتیں کرتا رہا جنھیں میں نہیں سمجھا۔

شیخ نے مجھ سے کہا۔ "یہ آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو (کھانے کی) دعوت دینے آیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "بے چارہ کہاں تکلیف اٹھائے گا۔ غریب آدمی ہے۔"

شیخ ہنس کر بولے: "آپ جانتے بھی ہیں یہ کون ہے؟" موچیوں کی جماعت کا صدر ہے۔ بے حد سخی اور بھلا آدمی ہے۔ اس کی جماعت بھائی چارہ کمیٹی (اخیۃ الفتیان) کی شاخ ہے۔ جماعت کے دو سو ممبر ہیں۔ مہمانوں کی دعوت اور مدارات کے لیے ان کی ایک خانقاہ ہے۔ دن بھر کی کمائی کھانے پینے، مہمانوں کی مدارات، ضرورت مندوں کی مدد اور دستگیری میں خرچ کرتے ہیں۔

موچی کا بھیجا ہوا شخص مجھے لینے آیا۔ خانقاہ میں جاکر

بھی بھائی چارہ کمیٹی ۔ مترجم

دیکھا تو رومی قالین بچھے تھے ۔ عراقی بلور کے جھاڑ فانوس روشنی سے جگمگا رہے تھے ۔ بیچ میں اونچا شمع دان بہار دکھا رہا تھا ۔ چراغچی کے ہاتھ میں قینچی جس سے گل کترتا پھر رہا تھا ۔ نوجوان لوگ قبائیں پہنے برابر برابر بیٹھے تھے ۔ ہر ایک کے پاؤں میں موزے اور کمر میں پیٹی تھی ۔ بیچ میں رکابیاں اور پیالے ترتیب سے رکھے تھے ۔

ہم لوگ بیٹھ گئے تو کھانا، حلوا، اور پھل لائے گئے ۔
کھا پی کر قوالی اور حال وقال میں وقت گزرا ۔ آدھی رات سے زیادہ تک ہماری بے انتہا مدارات کی ۔ بہت زیادہ تواضع اور انکساری سے پیش آئے ۔ ان کے انکسار اور تواضع کے طور طریقوں کو دیکھ کر ہم پر رقت طاری ہو گئی ۔

انطالیہ کا بادشاہ خضر بک بیمار تھا ۔ ہم اس کی بیمار پرسی اور ملاقات کے لیے گئے ۔ بادشاہ نے بڑی عزت اور محبت سے پرسش احوال (پوچھ گچھ) کی اور زاد راہ کے لیے رقم بھیجی ۔

انطالیہ سے مردور گئے ۔ یہاں ہم خطیب کے مکان پر ٹھہرے ۔ بھائی چارہ کمیٹی (اخیتہ الفتیان) والوں نے اصرار کیا کہ ہم ان کے یہاں ٹھہریں ۔ خطیب نے انھیں بہ مشکل ٹالا ۔ پھر بھی انھوں نے باغ میں ہماری دعوت (گارڈن پارٹی) کی یہ باغ بھائی چارہ کمیٹی کے ایک ممبر کا تھا ۔

یہ لوگ ہماری زبان نہ سمجھتے تھے ۔ نہ ہم ان کی زبان سے واقف تھے ۔ نہ کوئی ترجمان تھا کہ ایک کو دوسرے کے احساسات سے باخبر کرے ۔ مگر ان کی خاطر مدارات کا یہ حال تھا کہ بچھے جاتے تھے ۔ ان کا محبت سے بھرا برتاؤ ان کے ایک ایک انداز سے ظاہر ہوتا تھا ۔ اس کا ہم پر بڑا اثر ہوا ۔

پھر ہم سیرتا گئے ۔ سیرتا کا بازار اور آبادی اچھی ہے ۔ ہم شام کے وقت پہنچے اور قاضی کے ہاں ٹھہر گئے ۔ سیرتا سے چل کر آمی، وز اور پھر افشہر بقشہر گئے ۔ افشہر بقشہر میں ایک بڑے عالم ہیں ۔ مصر اور شام میں مدتوں علم حاصل کیا ہے اور نہایت عمدہ تقریر کرتے ہیں ۔ انھوں نے ہماری بڑی مدارات کی ۔ مہمان نوازی کا حق ادا کر دیا ۔ الحاج مصلح الدین ان کا نام ہے ۔

اکریدور کا بادشاہ سلطان ابو اسحق بڑا نیک بادشاہ ہے ۔ روزانہ جامع مسجد میں آکر نماز عصر پڑھتا ہے اور دیوار سے تکیہ لگا کر بیٹھ جاتا ہے ۔ سامنے اونچی چوکی پر قاری صاحب سورۂ فتح سورۃ الملک اور عم تیساءلون خوش الحانی سے پڑھتے ہیں ۔

بادشاہ ایسے ذوق وشوق سے سنتا ہے کہ دیکھنے والے متاثر ہو جاتے ہیں ۔ پھر محل سرائے چلا جاتا ہے ۔

رمضان المبارک میں اس کے پاس رہنے کا اتفاق ہوا ۔ افطار کے وقت فرش پر بیٹھ جاتا تھا ۔ ایک طرف مصلح الدین صاحب بیٹھتے یہ اپنے برابر مجھے بٹھاتے ۔ ہمارے برابر امرا بیٹھتے ۔

افطار میں سب سے پہلی چیز ثرید پر گھی اور شکر میں مسور ہوتی تھی یہ لوگ ثرید سے افطار کرنے کو برکت سمجھتے ہیں ثرید چوری ہوئی روٹی کو کہتے ہیں، ثرید کو رسول اللہ نے تمام کھانوں سے بڑھ کر بتایا ہے ۔ ثرید کے بعد دوسرے کھانے آئے ۔ رمضان بھر یہی طریقہ رہا ۔

انھی دنوں سلطان کے لڑکے نے انتقال کیا تھا ۔ لڑکے کے دفن کے بعد تین دن تک سلطان اور طالب علم قبر پر جاتے رہے ۔

دوسرے دن میں بھی ان کے ساتھ گیا ۔ سلطان نے مجھے پیدل چلتے دیکھا تو سواری کے لیے گھوڑا بھیجا ۔ جائے قیام پر پہنچ کر میں نے گھوڑا واپس کیا تو سلطان نے یہ کہہ کر پھیر دیا کہ یہ میری طرف سے عطیہ ہے قبول کر لیجیے ۔ اتنا ہی نہیں لباس اور سفر خرچ کی رقم بھی بھیجی ۔

یہاں سے قل حصار پہنچے چھوٹا سا شہر ہے ۔ چاروں طرف پانی سے گھرا ہوا ہے ۔ جانے کا ایک

ہی راستہ ہے۔ پانی اور جنگل کے بیچ میں ہو کر جاتا ہے۔ راستے کی چوڑائی بس اتنی ہی ہے کہ صرف ایک سوار چل سکتا ہے۔

یہ شہر پانی کے بیچ میں ایک اونچے ٹیلے پر بسا ہوا ہے۔ ہم یہاں ایک خانقاہ میں ٹھہرے۔ یہ بھائی چارہ کمیٹی (اخیتہ الفتیان) کے کسی ممبر کی تھی۔ یہاں کا امیر سلطان محمد جلبی ہے۔ ہم پہنچے تو سلطان جلبی موجود نہ تھا۔ چند دن بعد آیا اور جب اسے ہمارے آنے کی خبر ہوئی تو بڑی خاطر مدارات کی اور سفر خرچ سے ہماری مدد کی۔

سلطان نے سواروں کا دستہ ہمارے ساتھ کر دیا تھا کہ لاذق تک حفاظت سے پہنچا دیں۔ راستہ اچھا نہیں ہے۔ اور لیٹرے مسافروں کو لوٹ لیتے ہیں۔

ہم قرا آغاج، طائفہ، دمیان کو، ہیا سے گذرتے ہوئے بخرو عافیت لاذق پہنچ گئے۔

لاذق بڑا شہر ہے۔ سات جامع مسجدیں ہیں۔ عمدہ عمدہ باغ ہیں۔ بارونق بازار ہیں۔ یہاں ایک قسم کا کپڑا تیار کیا جاتا ہے جس پر سنہری گل کاری ہوتی ہے۔ شہر کے نام پر اس کا نام لاذق ہے۔ اسے رومی عورتیں تیار کرتی ہیں۔ رومی سلطان کو ٹیکس دیتے ہیں اور آرام سے اچھے شہریوں کی طرح رہتے ہیں۔ یہ لوگ لمبی لمبی سرخ و سفید ٹوپیاں اوڑھتے ہیں۔ عورتیں سر پر بڑے بڑے عمامے باندھتی ہیں۔ یہاں کے لوگوں کا چال چلن اچھا نہیں ہے۔ یہاں کا قاضی بھی بدنام ہے۔

جب لاذق کے بازار سے گذر رہے تھے تو کچھ لوگوں نے ہمارے گھوڑوں کی لگام پکڑ لی۔ پھر دوسرے لوگ آگئے اور لگام پکڑنے والوں سے جھگڑنے لگے۔ ان کی بولی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ خیال ہوا کہ شاید وہی لیٹرے ہوں جن کا ذکر ہم سن چکے تھے۔

اتنے میں ایک حاجی آگیا۔ اس سے ہم نے ان کے جھگڑنے کی وجہ پوچھی۔ حاجی نے بتایا کہ یہ نوجوان بھائی چارہ کمیٹی والے (اخیتہ الفتیان) ہیں۔ یہاں کمیٹی کی دو پارٹیاں ہیں۔ دونوں اس بات پر جھگڑ رہی ہیں کہ آپ کی جماعت ان کے ہاں مہمان ہو۔ ان کی مہمان نوازی کے اس جذبے سے ہمیں بڑا لطف آیا۔

آخر دونوں پارٹیوں نے قرعہ ڈالا۔ ان میں ایک پارٹی کا نام اخی طومان تھا۔ ایک کا اخی سنان۔ آج کے دن کی مہمانی کا قرعہ اخی سنان کے نام نکلا۔

جونہی اخی سنان والوں کو یہ معلوم ہوا ان کے گروہ کے لوگ ہمارے پاس آگئے۔ سب نے ہمیں سلام کیا۔ اپنے مہمان خانے میں لے گئے۔ عمدہ عمدہ کھانے لائے اور ہمیں حمام میں لے گئے۔ بالکل خادموں کی طرح ہماری خدمت میں لگے رہے۔ ان کی محبت اور خدمت کا یہ حال تھا کہ ایک ایک آدمی کو چار چار آدمی لپٹ کر مل رہے تھے۔

حمام سے نکلے تو ہمارے لیے اعلیٰ قسم کے کھانے اور حلوے موجود تھے۔ کھانے کے بعد قرآن کی تلاوت کی اور پھر سماع اور رقص میں مصروف ہوگئے۔ ان لوگوں نے ہماری اطلاع سلطان کو کر دی۔

دوسرے دن اخی طومان والی پارٹی ہمیں لینے آگئی۔ انھوں نے خاطر مدارات کا اخی سنان سے بڑھ کر انتظام کر رکھا تھا۔ حمام سے نکلنے کے بعد ہم پر گلاب چھڑکا۔ قرآن کی تلاوت اور حال و قال کی مجلس بھی پہلی پارٹی سے بڑھ کر کی۔

باقی دلچسپ حال نومبر کے شمارے میں پڑھیے۔

جناب رؤف خیر
انسان
یا خدا میں جو کوئی گیہوں کا دانہ ہوتا
کچھ دنوں بعد میں گیہوں کا خزانہ ہوتا
اور بھوکوں کی غذا ہو جاتا
مگر ایسا نہ ہوا
یا خدا تو جو بنا دیتا مجھے نرم کپاس
پھر میں ہو جاتا ٹھٹھرتے ہوئے جسموں کا لباس
ان کے عیبوں کی ردا ہو جاتا
مگر ایسا نہ ہوا
یا خدا مجھ کو کوئی پیڑ بنایا ہوتا
اور جلتے ہوئے صحرا میں اگایا ہوتا
راہیوں کی میں دعا ہو جاتا
مگر ایسا نہ ہوا
اُف یہ کیا سوچ رہا تھا دلِ نادان مرا
تو نے "انسان" بنایا بڑا احسان ترا
ورنہ میں اپنی سزا ہو جاتا
چلو ایسا نہ ہوا
میں جو چاہوں تو نہ ننگا ہو نہ بھوکا ہو کوئی
میں جو چاہوں تو نہ باقی رہے صحرا کوئی
میں نہ ہوتا تو بُرا ہو جاتا
چلو ایسا نہ ہوا

محمود تسلیم بیگ

منی منی کہانیاں

غلامی کی زنجیر

کسی جنگل میں ایک دبلا پتلا بھیڑیا رہتا تھا۔ ایک دن گھومتے پھرتے اسے ایک کتا ملا۔ یہ کتا خوب موٹا تازہ تھا اور طاقت ور تھا۔ بھیڑیا کتے سے بولا: "بھیا! معلوم ہوتا ہے کہ تم بہت عیش و آرام سے اپنی زندگی بسر کر رہے ہو جبھی تو اتنے موٹے اتنے تندرست دکھائی دیتے ہو۔"

کتا بولا: "ہاں بھائی ہے تو یہی بات میں اپنے مالک کے گھر کی چوکیداری کرتا ہوں۔ میرا مالک مجھ سے بہت زیادہ خوش رہتا ہے اور دن میں تین چار بار کھانے کو دیتا ہے۔"

بھیڑیے نے کہا: "بھائی مجھے تمہاری قسمت پر رشک آتا ہے۔ بھلا مجھے بھی کوئی ایسی ہی ترکیب بتاؤ کہ دن میں کم سے کم ایک ہی بار بھر پیٹ کھانا مل جائے۔"

کتا بولا: "اچھا تو میرے ساتھ چلو تم بھی چین سے اپنی زندگی گذاروگے۔"

دونوں آپس میں باتیں کرتے چلے جا رہے تھے۔ اتفاقاً بھیڑیے کی نظر کتے کے گلے میں پڑے ہوئے پٹے پر پڑی۔ بولا: "اچھے بھائی۔ یہ تمہارے گلے میں پٹہ کیوں پڑا ہے؟"

کتا بولا: "میرا مالک رات کو اسی میں زنجیر لگا کر دروازے میں باندھ دیتا ہے۔"

بھیڑیا ٹھہر گیا اور بولا: "معاف کرو بھائی میں غلامی کی زندگی سے تو مر جانا ہی پسند کروں گا۔" یہ کہہ کر وہ اپنے غار کی طرف لوٹ گیا۔ سچ ہے آزادی کی خشک روٹی بھی ملے تو وہ بہتر ہے۔

یہ انصاف کہاں سے سیکھا!

ایک گھنے جنگل میں تین دوست رہتے تھے شیر، لومڑی اور گدھا۔ ایک دن تینوں میں یہ بات طے ہوئی کہ آج وہ سب مل کر شکار کو جائیں گے جو شکار ہاتھ لگے گا اسے تین برابر حصوں میں تقسیم کریں گے۔

کافی دیر کے بعد سب کی کوششوں سے ایک ہرن ہاتھ لگا۔ شیر نے گدھے سے کہا کہ وہ حصے بانٹے۔ گدھے نے انصاف اور ایمانداری سے تین برابر برابر حصے کیے۔

شیر نے حصوں کو دیکھا اور غصہ سے بولا: "اے بے ایمان! تو نے یہ کیسے چھوٹے بڑے حصے لگائے ہیں۔ چھوٹا حصہ لوں تو اپنا نقصان کر دوں۔ بڑا حصہ لوں تو دوسروں کا حق ماروں۔ تو بہت چالاک ہے اور تجھے مار ڈالنا چاہئے۔" یہ کہہ کر شیر نے گدھے کو چیر پھاڑ ڈالا۔

پھر لومڑی سے کہا: "بی لومڑی تمہاری عقلمندی اور انصاف کی ہم نے بہت شہرت سنی ہے اب تم اس کے برابر برابر حصے کرو کوئی چھوٹا بڑا نہ ہو۔"

لومڑی نے تمام گوشت تو ایک حصے میں رکھا اور باقی کھال سینگ اور ہڈیاں ایک حصے میں پھر گوشت والا حصہ شیر کی طرف بڑھا دیا۔ شیر بہت خوش ہوا اور بولا واقعی تو بڑی عقلمند ہے۔ تو نے ٹھیک برابر دو حصے کیے بھلا یہ تو بتا یہ انصاف اور سلیقہ تو نے کب اور کہاں سیکھا؟ لومڑی نے جواب دیا۔

"حضور یہیں ابھی اسی وقت گدھے کی موت سے۔" یہ کہہ کر وہ دم دبا کر بھاگی اور جنگل میں غائب ہو گئی۔

جناب غلام [illegible] جامعی ام۔ اے

پیسہ

تو بھائی، پھر میری کہانی کہاں تک پہنچی تھی ؟

شاید یہاں تک کہ لوگوں نے اناج کو بھی دولت کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اس سے پہلے کہ میں اپنی دھات والی شکل تمھیں پہلی بار دکھاؤں یہ اور بتا دوں کہ میں نے اناج اور دھات کے علاوہ بھی بہت سی شکلیں بدلی ہیں۔ مجھے سمندر ایک جانور کا ذکر کر دوں! کوڑی کو تو تم ضرور جانتے ہوگے۔ یہ جانور بحر ہند کے یا ہند ساگر کے اتھلے پانی میں پایا جاتا ہے۔ اسے پانی سے نکال لیا جائے تو اس کے خول کے اندر چھپا ہوا جانور مر کر اور سوکھ کر خود بخود جھڑ جاتا ہے اور خوبصورت بے جان خول رہ جاتا ہے۔

ایک زمانہ میں اپنے دیس ہندوستان میں اس کی افراط تھی۔ زیادہ سے زیادہ پچاس ساٹھ سال پہلے تک ایک پیسے میں چونسٹھ کوڑیاں بھنائی جا سکتی تھیں۔ اور یہ کوڑیاں انسان کو بہت پسند آئیں یہاں تک کہ چیزوں کے لین دین کے درمیان میں ان کو غالباً دنیا کے ہر ملک میں استعمال کیا گیا۔ حد یہ ہے کہ افریقہ کے بعض علاقوں میں آج بھی لوگ اسے میری جگہ استعمال کرتے ہیں۔

لوگوں نے کوڑی کو میری جگہ کیوں استعمال کرنا شروع کیا۔ اس کی کوئی خاص وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ کوڑی انسان کی عام زندگی میں تو کسی کام آتی نہیں ہے۔ اور شروع میں سکے کی جگہ عام طور پر اسی چیز کو انسان نے استعمال کیا ہے جس کی کوئی قدر اس کے دل میں جیسے تم نے خود ہی دیکھا کہ انسان نے پہلے جانور کو لین دین میں استعمال کیا، پھر اناج کو۔ اور یہ دونوں چیزیں انسان کے کام کی تھیں۔ مگر کوڑی اور اس قسم کی بہت سی چیزوں کو انسان نے ایک عرصہ تک استعمال کیا ہے۔ کوڑی کی مقبولیت کی حد تو یہ تھی کہ خود ہندوستان کے گجرات صوبے پر حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے کوئی پانچ سو سال بعد تانبے کے ایک سکے کا نام ہی "کوڑی" رکھ دیا گیا تھا۔

کوڑی کے علاوہ کبھی میں نے ہاتھی دانت کو اپنایا ہے، کبھی سیپ کے پیچھے بھی چھپا ہوں۔ غرض میرے بہت سے روپ تو ایسے بھی رہے ہوں گے کہ جن کا ابھی تک پتہ ہی نہیں چل سکا ہے۔ جب تم لوگ پڑھ لکھ جاؤ گے اور تمھارے پاس اور بہت سی معلومات ہو جائے گی تو ممکن ہے میرے کچھ اور بزرگوں کا بھی پتہ چلے۔

ایک بات اور ذہن میں رکھنا۔ ایسا نہیں ہے کہ اناج کی دولت کی طرح استعمال کے بعد میں فوراً ہی کوڑی یا سیپ کے روپ میں آگیا اور ایک دم

اناج جمع ہو گیا۔ بلکہ مختلف وقتوں میں الگ الگ جگہوں پر
انسان نے جس چیز میں آسانی دیکھی اسے اس نے دو چیزوں
کے لین دین کے بیچ میں ڈالنا شروع کر دیا۔ کبھی کبھی تو دو دو
اور تین تین بلکہ اس سے بھی زیادہ چیزیں کام میں آتی ہیں۔

اب ایک بار پھر ہم وہیں سے چلتے ہیں کہ انسان
نے دھات کا استعمال سیکھ لیا ہے۔ اور تم جانو دھات کی
ہی چیزوں کو مسلسل استعمال کرتے کرتے انسان اس کا اتنا
عادی بھی ہو گیا ہو گا کہ اس کے بغیر کام ہی نہ چلتا ہو گا۔
آج بھی تو یہی صورت ہے۔

اچھا، تو اس عادت سے ایک اور خاص بات
پیدا ہوئی ہو گی۔ ہر دھات کے استعمال کے ساتھ ساتھ اور
اس کی کمی یا زیادتی کے ساتھ اس کی ایک خاص قدر انسان
کے دماغ میں جم گئی ہو گی۔ مثال کے طور پر وہ دس سیر غلّہ
کے بدلے میں ایک سیر تانبا لینے کے لیے تیار ہو جاتا ہو گا۔
یا ایک چھٹانک چاندی یا پانچ من غلہ کے بدلے میں وہ ایک
تولہ سونا لے لیتا ہو گا۔ اس طرح ہر دھات کی الگ الگ
ایک قیمت اس کے ذہن میں بن گئی ہو گی۔ اگر یہ بات نہ پیدا
ہوتی تو دھات کو کبھی بھی انسان اپنی چیز کے بدلے میں نہ لیتا۔

اور بھائی خود اس شکل پر آنے کے لیے جس میں
میں آج تمہیں نظر آ رہا ہوں، میں نے جتنے روپ دھارے
ہیں۔ وہ ایک الگ کہانی ہے۔ میں تھوڑا بہت ان روپوں
کو بھی تمہیں ضرور دکھاؤں گا تاکہ تم کہیں غلطی سے یہ نہ
سمجھ بیٹھو کہ جس دن دھات کا استعمال شروع ہوا۔ دھات
کو بہت خوبصورت کاٹ کر اس پر اچھی اچھی مہریں چھاپ
کر لوگوں نے اس کا نام "سکہ" رکھ دیا اور بس صاحب ختم
ہوئی میری کہانی! ایسا نہیں ہے۔

نہ معلوم کیوں انسان نے مجھ پر بہت
دن بعد اعتبار کیا ہے۔ آہستہ آہستہ پھونک پھونک کر قدم
بڑھائے ہیں۔ یہ دولت کا معاملہ تھا، انسان کو ڈر رہتا تھا
کہ میں کسی دن اسے دھوکا نہ دے جاؤں۔ حالانکہ میں نے
انسان کو بہت کم دھوکا دیا ہے۔ مگر چھوڑو یہ دھوکوں کی بُری
باتیں۔ میں تو تمہیں یہ بتا رہا تھا کہ میں یوں ہی ایک دم اس
شکل میں نہیں آ گیا۔ جس میں تم مجھے آج دیکھ رہے ہو۔

انسان نے دھات سے شاید سب سے پہلے
ہتھیار کھیتی باڑی کے اوزار بنائے ہوں گے۔ کھرپا، پھاوڑا
ہل میں لگانے والا پھلکا اور کلہاڑی، چاقو، تیر کی انیاں، بھالے
وغیرہ اور پھر شاید گھر میں استعمال کرنے والے برتن بنے ہوں
گے۔

تو انسان نے کیا یہ کہ اناج کی بجائے ان کھرپوں
پھاوڑوں اور دوسرے زراعتی اوزاروں کو دو چیزوں کے
لین دین کے بیچ میں ڈال لیا۔ یعنی اب صورت یہ ہوئی کہ
جب کوئی شخص بازار گیا تو اپنے کندھے پر دو پھاوڑے
تھیلی میں دو ایک چاقو، دو کھرپے اور اسی قسم کی چیزیں اپنے
ساتھ لیتا گیا اور جس جس قیمت کی چیز خریدنی ہوئی ویسے ویسے
ہی اوزار اس کو دے دیے جس سے چیز لی ہے۔ چیز بیچنے
والا اس لیے انھیں لیتا کہ کل کوئی دوسرا شخص آئے گا اور
وہ کچھ دوسرا سامان دے کر کھرپے پھاوڑے لے جائے گا۔
اسی طرح بعد میں گھریلو استعمال کے برتن۔ تانبے کے کٹورے
بھی کچھ عرصہ دولت کی جگہ استعمال ہوئے۔

اب تم کہو گے کہ ان سب باتوں کا پتہ کیسے چلا؟
جب کہ یہ کچھ نہیں تو سات آٹھ ہزار سال پہلے کی باتیں ہیں۔
کہیں میں گپ تو نہیں ہانکنے لگا۔ نہیں بھائی ایسا نہیں
ہے۔ اس میں تو خیر شک نہیں ہے کہ میرے متعلق بہت
سی باتیں صرف اندازہ لگا کر ہی کہی گئی ہیں۔

مگر وہ آثار ایسے بھی کچھ پکے ثبوتوں پر ہی لگائے گئے ہیں۔

پتہ یہ چلتا ہے کہ پہلے تو اصلی اوزار یعنی ہتھیار ہی لین دین میں کام آتے تھے۔ بعد میں ان کی شکل تو رہ گئی لیکن ان کی اصلیت جاتی رہی۔ کھرپے چاندی کے ہوگئے۔ اور بہت چھوٹے، جو یقیناً کسی طرح بھی گھاس کھودنے کے کام میں نہ آسکتے تھے۔

بہت سے چھوٹے چھوٹے پھاوڑے، کدال، بسولے، بعض بعض جگہ ہزاروں سال پرانی آبادیوں کے نشانوں میں اتنی ہی احتیاط سے رکھے ہوئے ملے ہیں جس طرح آج ہم تجوریوں میں الگ الگ، بڑے نوٹ، چھوٹے نوٹ اور سکّے رکھتے ہیں اور ان چیزوں کے استعمال کے بعد جب اصلی سکّے آئے تب بھی چونکہ انسان کے دماغ پر یہ بات جمی ہوئی تھی کہ زراعتی اوزار اور دوسرے ہتھیار بہت کام کی چیزیں ہیں۔ لہذا ان سکّوں پر بھی انہی کی تصویریں کھودی جاتی رہیں۔ تو بھائی میں تو ان اندازوں کو کافی صحیح مان لیتا ہوں۔ اگر تمھیں کوئی اعتراض ہو تو بڑے ہوکر نئی نئی معلومات حاصل کرکے کوئی اور اس سے اچھی بات کہنا اور ان سے بھی زیادہ پکّے ثبوت ڈھونڈھ لینا۔

اچھا اب اگر تم یہ پوچھو کہ صاحب انسان کو اناج کے استعمال میں ہی آخر ایسی کون سی پریشانی تھی تو میں تو یہی کہوں گا کہ انسان مستقل اسی کوشش میں لگا رہتا ہے کہ اپنے لیے زیادہ سے زیادہ آسانیاں ڈھونڈھ لے۔ اُسے محسوس ہوا ہوگا کہ ایک من اناج اٹھانے کی بجائے دس سیر کے اوزار ہتھیار اٹھا کر بازار لے جانا زیادہ آسان ہے۔ تو اس نے وہی کام شروع کردیا۔

اور بھائی پھر غلہ ہی کا کیا اعتبار؟ جس سال بارش اچھی ہوئی اناج بہت ہوگیا، اگلے سال کم ہوئی، پیچھے صاحب غلہ بھی خراب ہوگیا۔ پھر آج کی طرح اچھے گودام نہیں تھے۔ لوگوں کی اس دولت کو چڑیاں، کوّے، اور چوہے کھاجاتے تھے۔ رکھے رکھے گھن لگ جاتا تھا، اور بھئی انسان کی خواہش تو ہمیشہ یہی رہی ہے کہ دولت اگر بڑھے نہیں تو کم سے کم گھٹ تو نہ جائے۔

لوگ اوزار ہتھیار اور گھر کے برتنوں کو ایک عرصہ تک چیزوں کے لین دین میں استعمال کرتے رہے۔ لیکن کچھ عرصہ کے استعمال کے بعد ان کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ جب دھات ہی کو استعمال میں لانا ہے تو اس کو کسی خاص شکل کا بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ دھات اپنی اصلی شکل میں بھی کام آسکتی ہے۔ کیا ضروری ہے کہ چاندی کو کوٹ پیس کر اس کا چھوٹا سا پھاوڑا یا کھرپا ہی بنایا جائے۔ صرف چاندی کا تولا ہوا ٹکڑا بھی اس کام میں آسکتا ہے۔ چنانچہ لوگوں نے مختلف دھاتوں کی لمبی لمبی پٹیاں سی بنالیں۔ اب جب بازار جاتے تو اُن کی تھیلی میں ایک آدھ چھوٹی موٹی سونے کی دو ایک چاندی کی اور پانچ سات تانبے وغیرہ کی پٹیاں پڑی ہوتیں۔ جہاں کچھ سامان لیا۔ تھیلی میں سے ضرورت کے مطابق دھات کا ٹکڑا نکال کر کاٹا اور دے دیا۔

جب کوئی بڑا تاجر کہیں باہر جاتا تو اس کے سامان میں جہاں اور ضرورت کی چیزیں ہوتیں۔ وہاں سونے چاندی وغیرہ کی یہ لمبی لمبی پٹیاں بھی ہوتیں۔ دیکھا۔

اب تمھیں میری کچھ ایسی شکل نظر آنے لگی میری آج کی شکل سے بہت قریب ہے۔ ہاں اتنی صاف اور اتنی خوبصورت نہیں ہے۔ جیسی آج تم دیکھتے ہو۔ رہا نام کا سوال تو نام کا کیا ہے۔ نام تو ہر ملک اور ہر زمانہ میں بدلتا رہا ہے۔

(باقی آئندہ)

جناب خضر برنی

محنت کا پھل

درجہ اوّل کا مانیٹر، نام مرا انعام
لکھنا پڑھنا شام سویرے یہی ہے میرا کام

پیار میں ڈیڈی کہہ دیتے ہیں بدھو او کھلاڑی
حالانکہ اب کھیل سے بالکل نہیں ہے میری یاری

سال[۱] گزشتہ فیل ہوا تھا، پکڑ لیے ہیں کان
فرسٹ ڈویژن لانے کا اب دل میں ہے ارمان

کام نہ آئے کھیل تماشے کشتی اور کبڈی
کھیل کا یہ انعام ملا ہے ہم ہیں آج پھسڈی

کرتے ہیں جو کام لگن سے ہو جاتے ہیں پورے
کاہل پن سے رہ جاتے ہیں آخر کام ادھورے

ملتی ہے محنت سے راحت ہمیں سبق سکھلایا
ہم نے بھی استاد کا کہنا از خود ہی اپنایا

کوشش کو انجام سمجھنا اصل میں ہے اک راز[۲]
کام یقیناً بن جاتا ہے بہتر ہو آغاز[۳]
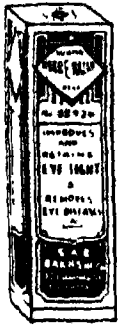
۱ پچھلے سال ۲ بھید ۳ ابتدا، شروعات

خدمتِ خلق کے لئے ... ہمہ وقت حاضر

پیٹ اور معدہ کی نئی و پرانی
شکایات اور وبائی امراض سے
تحفظ کے لئے بے حد مفید اور
زود اثر دوا

آنکھوں کو جملہ امراض سے
محفوظ رکھنے۔ انھیں دلکش
روشن اور جاذب نظر بنانے کیلئے
بہترین سرمہ ہے

اکسیر اعظم ڈراپ

سرمہ نور نظر

سندری سہاگ

پی لو ٹانک

بالوں کی آرائش۔ قدرتی
نشو ونما۔ اور دماغی تازگی
کے لئے طبی اصولوں پر تیار
کیا ہوا خوشبودار تیل

بچوں کیلئے ایک خوش ذائقہ
ٹانک جو انھیں تندرست
خوش و خرم اور چاق
چوبند رکھتا ہے۔

مزید کاروباری تفصیلات کیلئے ... پتہ ذیل پر خط وکتابت کیجئے

S.A.B. BAKHSHI & CO.
POST BOX 114
CALCUTTA - 1

ایس۔ اے۔ بی۔ بخشی کمپنی
پوسٹ بکس ۱۱۴ کلکتہ ۱

جناب رفیق شاستری

پنچ تنتر کی کہانیاں
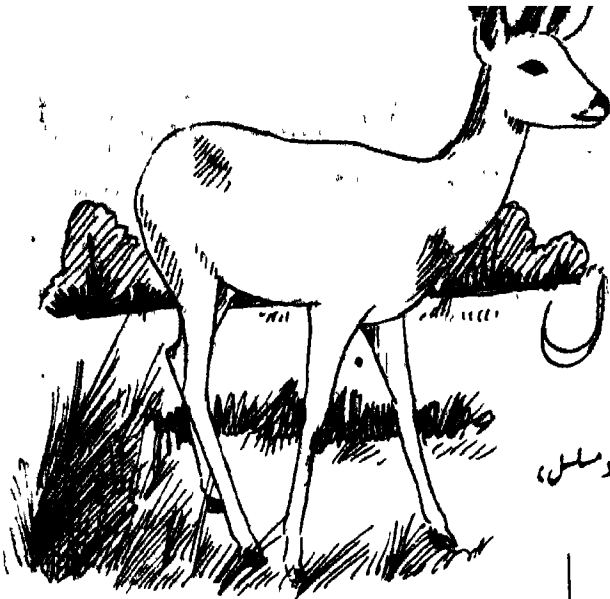
(مسلسل)

کنجوس اور شاہ خرچ کی دولت

یہ کہانی سننے کے بعد محنت نے سوملک سے کہا۔

"اگر دولت کی تجھے اتنی ہی چاہ ہے تو پھر وردھمان پور لوٹ جا۔ وہاں دو بنیوں کے بیٹوں کی حالت دیکھ آ۔ ایک شاہ خرچ ہے اور دوسرا کنجوس۔ شاہ خرچ کا ہاتھ کھلا ہوا ہے۔ وہ دولت کو جوڑنے کے لیے حاصل نہیں کرتا۔ دوسرا کنجوس ہے۔ وہ دولت کو جوڑنے کی چیز سمجھتا ہے۔ ان میں سے تم جس طرح کی دولت اپنے لیے پسند کروگے وہ تم کو دی جائے گی"۔ اتنی بات کہہ کر محنت کا دیوتا غائب ہوگیا۔

سوملک اس کی ہدایت کے مطابق وردھمان پور پہنچا۔ شام ہوگئی تھی۔ پوچھتا پاچھتا کسی طرح وہ کنجوس دولت مند کے گھر پہنچ گیا۔ وہاں کسی نے اس کی خاطر مدارات نہیں کی۔ اُسے اس بنیے اور اس کی بیوی کی جلی کٹی باتیں سننی پڑیں۔ دونوں اسے بالکل رکھائی سے جواب دے رہے تھے۔

مگر سوملک بھی اپنے ارادے کا پکا تھا۔ وہ بے غیرتی سے وہیں ڈٹا رہا اور مزے سے گھر کے اندر جاکر بیٹھ گیا۔ جب کھانے کا وقت آیا تو بنیے نے اس کے پاس روکھی سوکھی روٹی بھجوادی جسے کھاکر وہ سوگیا۔

خواب میں اس نے دونوں دیوتاؤں کو دیکھا۔ وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ قسمت کا دیوتا محنت کے دیوتا سے پوچھ رہا تھا کہ تونے اس بنیے کے بچے کو اس کی قسمت سے اتنا زیادہ کیوں دیا کہ اس میں سوملک کا بھی دو روٹیوں کا حصہ لگ گیا۔ محنت کے دیوتا نے کہا "اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ میرا کام تو آدمی سے اس کے فرائض کی ادائگی کرانا ٹھہرا۔ مگر اس کا پھل دینا اے قسمت تیرے اختیار کی بات ہے!"

دوسرے دن کنجوس ہیضہ میں مبتلا ہوگیا اور اسے ایک وقت کا فاقہ کرنا پڑا اور اس طرح قسمت نے سوملک کو دو روٹیاں کھلانے کا حساب برابر کرادیا۔

سوملک اگلی صبح شاہ خرچ بنیے کے گھر پہنچا وہاں اس کی خوب خاطر تواضع کی گئی۔ عمدہ اور لذیذ کھانے سونے کے لیے بہترین بستر۔

ادھر سوملک کی آنکھ لگی ادھر خواب میں پھر وہی دونوں دیوتا حاضر ہوگئے۔ اس نے دونوں کو بات چیت کرتے پھر سنا۔ قسمت کا دیوتا محنت کے دیوتا سے کہہ رہا تھا کہ سوملک کی خاطر مدارات پر اس نے اتنی دولت خرچ کر دی۔ اب یہ

کی کیسے پوری ہوگی۔ محنت نے کہا "اے قسمت خاطر مدارات کے لیے پیسہ خرچ کرانا میرا فرض تھا۔ سو میں نے کیا۔ اب اس کا پھل دینا اے قسمت تیرے اختیار میں ہے"۔

صبح ہونے پر سوملک نے دیکھا کہ بادشاہ کے دربار سے جواہرات سے بھرا ہوا ایک تھال چلا آرہا ہے۔ شاہ خرچ بنیے کی شہرت سن کر یہ تھال بادشاہ نے اس کے پاس تحفہ کے طور پر بھیجا تھا۔

یہ دیکھ کر سوملک نے سوچا کہ صرف جمع کیا ہوا خزانہ کسی کام کا نہیں ہے جو دولت اچھے کام پر خرچ کی جائے یا خیرات کر دی جائے وہ دولت خزانے میں جمع کی ہوئی دولت سے کہیں بہتر ہے۔

دوستی میں بڑی طاقت ہے!

منتھرک کچھوے نے یہ ساری کہانیاں سنا کر ہرنیک چوہے سے کہا "دوست تمھیں بھی کھوئی ہوئی دولت کا غم نہیں کرنا چاہیے۔ تمھارا زمین کے اندر گڑا ہوا خزانہ ہاتھ سے نکل گیا تو جانے دو۔ ایسی دولت کا جسے تم خرچ نہیں کر سکتے تھے فایدہ بھی کیا تھا۔ گاڑھے پسینے کی کمائی ہوئی دولت کا سب سے اچھا مصرف یہی ہے کہ اس کا دان کر دیا جائے۔ شہد کی مکھیاں کتنا شہد جمع کرتی ہیں۔ مگر اس سے فائدہ دوسرے اٹھاتے ہیں۔ اس شہد کا انھیں کیا فایدہ۔

منتھرک کچھوا لگھوپتنک کوا اور ہرنیک چوہا وہاں بیٹھے یہی سب باتیں کر رہے تھے کہ وہاں ایک ہرن آگیا۔ ایک شکاری اس ہرن کا پیچھا کر رہا تھا اس کی آہٹ سنتے ہی کوا اڑ کر پیڑ کی ڈال پر بیٹھ گیا۔ ہرنیک چوہا بل میں گھس گیا اور کچھوا تالاب میں جا چھپا۔

ایک نیا دوست:-

کوے نے ہرن کو اچھی طرح دیکھنے کے بعد منتھرک کچھوے سے کہا "دوست ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ تو ایک ہرن ہے۔ پانی پینے ندی کی طرف بھاگا بھاگا آیا ہے۔

منتھرک کچھوے نے جواب دیا "نہیں دوست تم نے دیکھا نہیں کہ یہ ہرن بار بار پیچھے کی طرف مڑ مڑ کر دیکھ رہا تھا۔ اس لیے یہ پیاسا ہرن نہیں ہے جو پانی پینے کے لیے دوڑا آیا ہو۔ یہ شکاری سے ڈر کر بھاگا ہوا ہرن معلوم ہوتا ہے جبھی تو بار بار پیچھے مڑ مڑ کر دیکھ رہا ہے کہ وہ شکاری پیچھے پیچھے آرہا ہے یا نہیں"۔

دونوں کی بات سن کر وہ ہرن بولا۔ "اے منتھرک کچھوے تم میرے خوف کی اصلیت سمجھ چکے ہو۔ میں شکاری کے تیروں سے بچ کر بہت مشکل سے یہاں تک پہنچا ہوں۔ تم میری حفاظت کرو۔ مجھے کوئی ایسی جگہ بتاؤ جہاں شکاری نہ پہنچ سکے"۔

منتھرک نے ہرن کو گھنے جنگلوں میں بھاگ جانے کی صلاح دی لیکن لگھوپتنک کوے نے اوپر سے دور تک نظر دوڑاتے ہوئے کہا کہ شکاری دوسری طرف کو چلے گئے ہیں۔ اس لیے اب ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اس کے بعد چاروں دوست تالاب کے کنارے پیڑ کے سائے میں بیٹھ کر دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اور یہ ان چاروں دوستوں کا روز کا معمول بن گیا۔

ہرن جال میں پھنس گیا

کچھ دن

گذرنے کے بعد ایک دن کچھوا کوّا اور چوہا تینوں
بیٹھے باتیں کر رہے تھے ۔شام ہو گئی تھی مگر ابھی
تک ہرن واپس نہیں آیا تھا۔ تینوں دوستوں کو
ہرن کی فکر ہونے لگی ۔ انھوں نے سوچا کہ کہیں شکاری
کے جال میں نہ پھنس گیا ہو۔ یا کہیں شیر چیتے وغیرہ کا
شکار نہ بن گیا ہو۔ بہت وقت گذرنے کے بعد بھی
ہرن واپس نہ آیا تو منتھرک کچھوے نے لکھو پتنک کوّے
کو اس کا پتہ لگانے کے لیے کہا ۔کوّے نے کچھ دور
جاکر دیکھا کہ ہرن جال میں پھنسا ہوا ہے ۔لکھو پتنک
اُس کے پاس گیا۔ کوّے کو دیکھ کر ہرن کی آنکھوں
میں آنسو آگئے ۔ کہنے لگا: "دوست اب میرا آخری وقت
آگیا ۔اس گھڑی تمھارا منھ دیکھنا مجھے نصیب ہوگیا
زندگی کی آخری گھڑی میں دوستوں کے دیدار سے
دل کو بہت اطمینان نصیب ہوتا ہے ۔تم میرا قصور
معاف کر دینا۔"

لکھو پتنک نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔
"دوست گھبراؤ مت، میں ابھی ہرنیک چوہے کو بلاتا
ہوں۔ وہ تمھارا جال کاٹ دے گا۔"

یہ کہہ کر وہ ہرنیک چوہے کے پاس آگیا۔
اور فوراً اسے اپنی پیٹھ پر بٹھا کر لے آیا۔ چوہا ابھی
جال کاٹ ہی رہا تھا کہ لکھو پتنک کوّے نے پیڑ کے اوپر
بیٹھے بیٹھے کسی کے اس طرف آنے کی آہٹ سنی
اور اس کی زبان سے خود بخود یہ الفاظ نکل گئے۔
"ارے یہ تو بڑا غضب ہوا!"

کوّے کی یہ بات سن کر چوہا چونک پڑا۔
اور کوّے سے پوچھا "کیوں کیا بات ہے ۔کیا
شکاری اس طرف آرہا ہے۔"

کوّے نے جواب دیا۔" نہیں بھائی شکاری
نہیں منتھرک میاں (کچھوا) چلے آرہے ہیں۔"

چوہے نے کہا۔" تو اس میں بُرائی کی کیا
بات ہے ۔یہ تو خوشی کی بات ہے تم نے تو مجھے ڈرا
ہی دیا تھا۔"

کوا بولا۔" خاک خوشی کی بات ہے ۔کہیں
اگر اِدھر شکاری آنکلا تو تم تو بل میں گھس جاؤگے
اور میں پیڑ پر آکر بیٹھ جاؤں گا ۔ یہ ہرن چوکڑی بھر
کر آناً فاناً میں غائب ہو جائے گا ۔ پھنسیں گے یہی
میاں کچھوے ۔تم اتنا بھی نہیں سمجھتے۔"

منتھرک کے وہاں آجانے پر چوہے
نے اس سے کہا۔" دوست تم نے یہاں آکر اچھا
نہیں کیا ۔ اب بھی وقت ہے تم واپس لوٹ جاؤ۔
کہیں خدانخواستہ کوئی شکاری آگیا تو غضب ہو جائے
گا ۔ تم بھاگ بھی نہ پاؤ گے۔"

منتھرک کچھوے نے جواب دیا "اپنے
دوست کو مصیبت میں پھنسا دیکھ کر مجھ سے نہ رہا
گیا ۔ سوچا کہ اس مصیبت میں شاید کسی کام آسکوں
اس لیے آگیا۔"

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ انھوں
نے شکاری کو اس طرف آتے دیکھا۔ چوہے نے
اس وقت ہرن کے بندھن کاٹ دیے ۔ ہرن اُٹھ
کر بھاگ کھڑا ہوا۔ چوہا بل میں گھس گیا اور کوّا
پیڑ پر جا بیٹھا۔

شکاری جال کو خالی پاکر اداس ہوگیا
وہ واپس جانے کے لیے مڑا ہی تھا کہ اس
کی نظر آہستہ آہستہ رینگتے ہوئے کچھوے

پر پڑی۔ اس نے سوچا ہرن تو ہاتھ آیا نہیں لاؤ اسی کچھوے کو لے چلوں۔ بس کیا تھا اس نے کچھوے کو کندھے پر ڈال لیا اور چلتا بنا۔ لگھو پتنک کوّا یہ سب پیڑ پر بیٹھا دیکھ رہا تھا۔ بعد میں چوہا بھی بل میں سے نکل آیا۔ دونوں دوستوں کو کچھوے کی حالت پر ترس آیا۔ ن بھی شکاری کے چلے جانے پر واپس لوٹ آیا۔ اب تینوں دوست کچھوے کو شکاری کے چنگل سے آزاد کرانے کی تدبیر سوچنے لگے۔

کچھوے کو جال سے چھڑانے کی تیاری

کوّے کو ایک ترکیب سوجھی اس نے کہا کہ ہرن شکاری کے راستے میں تالاب کے کنارے جاکر لیٹ جائے۔ میں ہرن کے اوپر بیٹھ کر اسے چونچ مارنے لگوں گا۔ شکاری یہ ماجرا دیکھ کر سمجھے گا کہ کوّا مرے ہوئے ہرن کو چونچ مار رہا ہے۔ وہ کچھوے کو زمین پر رکھ کر ہرن کے پاس جائے گا۔ چوہا اسی وقت کچھوے کے بندھن کاٹ کر بل میں گھس جائے اور شکاری کے پاس آتے ہی ہرن چوکڑیاں بھرتا گھنے جنگلوں میں چھپ جائے۔ اس بیچ کچھوے کو تالاب تک پہنچ جانے کا موقع مل جائے گا میرا کیا ہے، میں تو پیڑ پر بیٹھا سب تماشا دیکھتا ہی رہوں گا۔ اس طرح کچھوا شکاری کے چنگل سے آزاد ہو جائے گا۔

تینوں دوستوں نے یہی کیا ہرن تالاب کے کنارے مردے کی طرح لیٹ گیا۔ کوّا اس کی گردن پر سوار ہو کر چونچیں مارنے لگا۔ شکاری بھاگ کر ہرن جال سے چھوٹ کر تیزی سے بھاگا، ٹھوکر کھا کر یہاں گر کر مر گیا ہے ہرن کو لینے کے لیے وہ کچھوے کو زمین پر رکھ کر اس طرف بڑھا تو ہرنیک چوہے نے کچھوے کا جال کتر کر اسے آزاد کر دیا۔ کچھوا پانی میں گھس گیا اور ہرن بھی شکاری کے قریب آنے سے پہلے اٹھ کر چوکڑیاں بھرنے لگا اور آن کی آن میں گھنے جنگل میں چھپ گیا۔

شکاری منھ دیکھتا رہ گیا

شکاری بنے مرے ہوئے ہرن کو اس طرح چوکڑیاں بھرتے دیکھا تو اس کی حیرت کا ٹھکانا نہ رہا۔ واپس لوٹ کر دیکھا تو کچھوا بھی ندارد وہ وہیں ایک پتھر پر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

دوسری طرف چاروں دوست خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے۔ میل محبت، بھائی چارے اور دوستی کی طاقت سے چاروں نے شکاری سے نجات حاصل کی تھی۔

دوستی میں بڑی طاقت ہے۔ اچھے اور سچے دوستوں کا حلقہ بڑھانا کامیابی کی بہت بڑی ضمانت ہے۔

سمجھ دار آدمیوں کو ہمیشہ دوستوں کا حلقہ بڑھانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

(دوسرا پنچ تنتر ختم ہوا)

(آئندہ شمارے سے پنچ تنتر کی کہانیوں کا تیسرا باب شروع ہوگا)

(۱)

ہمک ہمک کر دور سے کیوں بس یونہی نظارا کرتے ہو
آنکھ سے آنکھ ملا کر اک انجانا اشارا کرتے ہو
اتنی دور بسے کیوں جاکر
گود میں آؤ بھیا چاند

(۲)

رات کو اتنا لمبا سفر تم تنہا تنہا کرتے ہو
کتنے نڈر ہو تم بھی بھیا نہیں ذرا بھی ڈرتے ہو
بھولے بھالے میرے پیارے
گود میں آؤ بھیا چاند

(۳)

رات کی کالی جھیل کا پانی کتنا ٹھنڈا رہتا ہے
غوطے پہ غوطے ہو لگاتے مجھ کو دھڑکا ہوتا ہے
اب بھی نہیں تم مانو گے
گود میں آؤ بھیا چاند

(۴)

منّا تم کو للچاتا ہے، کہتا ہے یہ تم سے بات
دودھ کٹوری میں ہے دیکھو اور رکابی میں ہے بھات
آؤ ساتھ میں مل کر کھاؤ
گود میں آؤ بھیا چاند

(۵)

میرے جھولے میں آجاؤ دونوں مل کر جھولیں گے
لمبی لمبی پینگ بڑھا کر گھر کو تمہارے چھو لیں گے
ہم بھی تو بھائی ہیں تمہارے
گود میں آؤ بھیا چاند

(۶)

دیکھو کتنے چاؤ سے تم کو منّا آج بلاتا ہے
اتنی دور بسے ہو جاکر دل نہیں کیا گھبراتا ہے
چاندنی ساتھ میں لے کر آنا
گود میں آؤ بھیا چاند

جناب محمد اسماعیل خاں استاد ٹیچرس کالج جامعہ

میکسکو اولمپک کھیلوں میں بھارت کی ہاکی ٹیم

آپ نے اخباروں میں پڑھا ہوگا کہ اس سال اکتوبر ۱۹۶۸ء میں اولمپک کھیلوں کے مقابلے میکسکو شہر میں ہونے والے ہیں میکسکو شہر میکسکو ملک میں واقع ہے۔ یہ ملک شمالی امریکہ کے جنوب مغرب میں ہے۔

آپ یہ تو ضرور جانتے ہوں گے کہ اولمپک کھیل ہر چار سال بعد ہوتے ہیں۔ دنیا کے بہت سے ملک ان اولمپک کھیلوں میں حصہ لیتے ہیں۔ ہر ملک اپنے یہاں کا بہترین کھلاڑی اس میں حصہ لینے کے لیے بھیجتا ہے۔ بھارت بھی ان کھیلوں میں شریک ہوتا ہے۔

ہمارا بھارت یوں تو بہت سے کھیلوں میں ابھی ابتدائی منزل میں ہے لیکن ہاکی کے کھیل میں دوسرے ملکوں کے مقابلے میں سب سے آگے ہے۔ اور ۱۹۲۸ء سے برابر گولڈ میڈل حاصل کرنے کا فخر رکھتا ہے۔ صرف ایک بار یعنی ۱۹۶۰ء میں پاکستان سے ہماری ٹیم ہار گئی تھی۔ لیکن ۱۹۶۴ء میں گولڈ میڈل واپس حاصل کر کے انھوں نے دوبارہ اپنی برتری کا ثبوت دیا

ان کھیلوں میں شرکت کے لیے ہماری ہاکی ٹیم بہت اہتمام سے چنی گئی ہے اور اگست کے آخری ہفتے میں ہندوستان سے روانہ ہوگئی ہے۔ اب اس میدان میں دوسرے ملکوں نے بھی بہت ترقی کرلی ہے۔ اس لیے مقابلہ بہت سخت ہوگا مثلاً ہالینڈ، جرمنی، انگلینڈ، اسپین، کینیا وغیرہ ملکوں کے ہاکی کھیل کا معیار بہت اچھا ہوگیا ہے۔

اس اولمپک ٹیم کے لیے کل ۱۸ کھلاڑی منتخب ہوئے ہیں چند کھلاڑی تو آپ کے جانے پہچانے ہوں گے

آئیے پوری ٹیم کا آپ سے تعارف کرادیں اور ان کھلاڑیوں کی چند خوبیاں بھی بیان کردیں تاکہ آپ کی دلچسپی بڑھے اور اخباروں میں اپنی ہاکی ٹیم کا حال برابر پڑھتے رہیں۔

اس ٹیم کے کھلاڑیوں کی اوسط عمر ۲۵ سال ہے اور ان میں سے دس کھلاڑی نئے ہیں جو پہلی بار اولمپک میں حصہ لیں گے۔

راجندرم ابسولم کرسٹی (RAJENDRAM ABSOLAM CHRISTY)

آپ کرسٹی کے نام سے مشہور گولی (یا گول کیپر) ہیں۔ عمر ۲۸ برس ہے۔ میسور کے رہنے والے ہیں۔ بہت ہی مضبوط گولی ہیں۔ ۱۹۶۴ء میں ٹوکیو اولمپک میں دوسرے نمبر کے گولی کی حیثیت سے ٹیم کے ساتھ گئے تھے۔ آج کل آپ ہندوستان کے سب سے اچھے گولی شمار کیے جاتے ہیں۔ آپ ۱۹۶۳ء میں ہاکی ٹورنامنٹ لیون (فرانس) میں ہندوستان کی ہاکی ٹیم کے گولی تھے اور بنگال اور میسور کی نمائندگی بھی نیشنل ہاکی ٹورنامنٹ میں کرچکے ہیں۔

منیر سیٹ (MUNIR SAIT) عمر ۲۶ سال۔ مدراس

کے رہنے والے ہیں۔ اسٹیٹ بینک میں آفیسر ہیں۔ عرصے سے اس اسٹیٹ کی ٹیم کے گول کیپر ہیں۔ آپ ہندوستان کی ٹیم کے ساتھ اسپین، سیلون اور جاپان جا چکے ہیں۔ کافی تجربہ کار اور اچھے گولی ہیں۔

پرتھی پال سنگھ PIRTHIPAL SINGH (عمر ۳۵ سال)

آپ کا کیا کہنا۔ بڑے بڑے کھلاڑی ہیں پنلٹی کارنر (شورٹ کارنر) ملنے پر ایسی ہٹ مارتے ہیں کہ مخالف کھلاڑیوں کو گیند نظر نہیں آتی۔ صرف گول ہونے پر گول کے تختوں پر لگنے کی آواز آتی ہے۔ اس آرٹ میں دنیا میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ اسی لیے آپ کو دنیا کا بہترین پنلٹی کارنر اسپیشلسٹ کہا گیا ہے۔

("World's best Penalty Corner specialist")

آپ ہماری ٹیم کے مضبوط فل بیک ہیں۔ آپ کے تجربہ اور اچھے کھیل کی وجہ سے ٹیم کے کپتان کی ذمہ داری کا بوجھ آپ ہی کے کاندھوں پر رکھا گیا ہے۔ آپ پنجاب کے رہنے والے ہیں اور آج کل ایگری کلچرل یونیورسٹی لدھیانہ میں ڈپٹی ڈائریکٹر ہیں۔ آپ نے بین الاقوامی ہاکی کے کئی مقابلوں میں حصہ لیا ہے۔ بیونک کے کے کھیلوں کے میلے میں میڈرڈ (۱۹۶۴ء) (اسپین) جکارتا انڈونیشیا (۱۹۶۲ء) روم اولمپک (۱۹۶۰ء) اور ٹوکیو اولمپک (۱۹۶۴ء) میں حصہ لیا۔ ٹوکیو اولمپک میں ۲۲ گولوں میں سے ۱۱ گول آپ نے کیے۔ آپ نے ارجن ایوارڈ اور پدما شری کا خطاب

حاصل کیا ہے۔

گوربخش سنگھ (GUR BUX SINGH) بنگال عمر ۳۲ سال

آپ نے فوج کی ایک رجمنٹ کی ٹیم میں ہاکی کھیلنا شروع کی۔ اور اتنا اچھا کھیلنے لگے کہ ہر اچھی ٹیم میں ان کا ہونا لازمی ہے۔ ہاف لائن میں کھیلتے ہیں لیکن اصل جگہ فل بیک کی ہے۔ پرتھی پال سنگھ اور آپ دونوں مل کر پیچھے بیک لائن میں لوہے کی دیوار کا کام کرتے ہیں۔ تجربہ کار کھلاڑی ہیں۔ نیوزی لینڈ جا چکے ہیں اور لیون (فرانس) ٹوکیو اولمپک اور ہیمبرگ (جرمنی) کے ٹورنامنٹ میں کھیل چکے ہیں۔ کئی ٹیموں کے کپتان بھی رہ چکے ہیں۔ آپ کو بھی ارجن اوارڈ مل چکا ہے۔

دھرم سنگھ DHARAM SINGH پنجاب عمر ۳۰ سال

اپ پولیس میں کام کرتے ہیں۔ ہماری ٹیم میں تیسرے فل بیک ہیں۔ آپ پنجاب کی طرف سے ہاکی کے نیشنل ٹورنامنٹ میں عرصے سے کھیل رہے ہیں اور ہندوستان کی ٹیم کے ساتھ لیون (فرانس) ٹوکیو اولمپک ہیمبرگ (جرمنی) وغیرہ جا چکے ہیں۔

جگجیت سنگھ (JAGJIT SINGH) پنجاب عمر ۲۵ سال۔ آپ ہماری ہاکی ٹیم میں سب سے مشکل اور اہم جگہ پر کھیلیں گے یعنی سینٹر ہاف۔ اس سے قبل ہماری ٹیم میں چرن جیت سنگھ صاحب (کپتان ۱۹۶۴ء) اس جگہ پر کھیلتے تھے۔ آپ ہندوستان کی ٹیم میں ٹوکیو اولمپک، ہیمبرگ (جرمنی) میڈرڈ (اسپین) وغیرہ ٹورنامنٹ میں کھیل چکے ہیں۔

بلبیر سنگھ (BALBIR SINGH) عمر ۲۴ سال۔

آپ فوج میں افسر بننے والے ہیں۔ آپ بہت ہی اچھے رائٹ ہاف کھلاڑی ہیں۔ لیفٹ ہاف بھی بہت اچھا کھیلتے ہیں۔ آپ کا کھیل بنکاک (تھائی لینڈ) کے ایشیائی کھیلوں کے مقابلے میں بہت چمکا۔ ہندوستان ایشیا میں آپ کے بہترین کھیل کی وجہ سے جیتا۔ آپ عمرگ

(جرمن) اور میڈرڈ (اسپین) کے ٹورنامنٹ میں ہندوستان کی ٹیم میں کھیل چکے ہیں۔

اجیت پال سنگھ (Ajit Pal Singh) پنجاب عمر ۲۰ سال۔ آپ کا کھیل بہت پیارا ہے۔ آپ بہت عمدہ سینٹر ہاف ہیں۔ آپ جب ہندوستان کی یونیورسٹیوں کی ملی جلی ٹیم کی طرف سے نہرو ٹورنامنٹ میں کھیلے تھے۔ دہلی والوں کو ان کا کھیل بہت پسند آیا تھا۔ فارورڈ کھلاڑیوں کے ساتھ ساتھ دوڑتے ہیں اور سبھی فارورڈ کھلاڑیوں کو برابر اچھے پاس دیتے ہیں۔ ابھی آپ طالب علم ہیں۔ جاپان اور پری اولمپک لندن ٹورنامنٹ میں ہندوستان کی ٹیم کے ساتھ جا چکے ہیں۔

ہرمیک سنگھ (HARMIK SINGH) پنجاب عمر ۲۱ سال۔ لیفٹ ہاف ہیں۔ آپ کا کھیل بنکاک ایشیائی ٹورنامنٹ میں پہلی بار چمکا۔ میڈرڈ اور لندن ٹورنامنٹ میں کھیل چکے ہیں۔

کرشنا مورتھی P. KRISHNAMURTHY.

عمر ۲۴ سال۔ بہت ہی کامیاب رائٹ ہاف ہیں۔ ریلوے کی ٹیم سے اور مدراس اسٹیٹ کی ٹیم سے کھیل چکے ہیں۔ سینٹر ہاف بھی کھیل سکتے ہیں۔

لندن پری اولمپک ٹورنامنٹ میں کھیل چکے ہیں اور مدراس کی ٹیم کے ساتھ جاپان، ہانگ کانگ، ملیشیا اور سنگاپور کا سفر کر چکے ہیں

بلبیر سنگھ (ریلوے) عمر ۲۲ سال

آپ رائٹ آوٹ کھیلتے ہیں۔ آپ نے بنکاک ایشین کھیلوں میں گول کیا اور ہندوستان کی ٹیم کی جیت ہوئی۔ آپ ریلوے میں ملازم ہیں۔ آپ پری اولمپک ٹورنامنٹ لندن اور سیلون میں رائٹ آوٹ کھیل چکے ہیں۔ اس وقت ہندوستان میں سب سے اچھے رائٹ آوٹ ہیں۔ سینٹر فارورڈ بھی کھیل سکتے ہیں۔

انعام الرحمٰن (انڈین ایرلائنز) عمر ۲۴ سال

علی گڑھ یونیورسٹی کے معتبر کھلاڑی تھے۔ بھوپال کے رہنے والے ہیں۔ بھوپال کے بارے میں مشہور ہے کہ گلی گلی میں ہاکی کا کھیل کھیلا جاتا ہے۔ پڑھائی غالباً چھوڑ دی ہے۔ اب انڈین ایرلائن میں ملازم ہیں۔ آپ کا کھیل اتنا اچھا تھا کہ آپ کا انتخاب ٹوکیو اولمپک میں ہو گیا تھا لیکن کہتے

ہیں کہ چند اسباب کی بنا پر بس چھوٹ گئی۔

بال کو نچانے اور اپنے بس میں رکھنے میں کمال رکھتے ہیں۔ بہت تیزی کے ساتھ کھلاڑیوں کو نچا کر ڈی میں گیند لے گھستے ہیں اور گول کر دیتے ہیں۔ آپ کا کھیل لوگوں کو بہت پسند آتا ہے۔ ہیمبرگ گئے تھے اور جاپان و سیلون میں ہندوستان کی ٹیم کی نمائندگی کر چکے ہیں

وکٹر جون پیٹرس (V.J. PETERS) فوج، عمر ۳۲ سال۔ فوج میں صرف ایک سپاہی ہیں۔ ٹوکیو اولمپک کھیلوں میں جا چکے ہیں۔ رائٹ ان کھیلتے ہیں۔ بہت ہی عمدہ طریقے سے گیند

اپنے قابو میں رکھتے ہیں بہت اچھے پاس بناتے ہیں۔ آپ ایسٹ افریقہ، روم اولمپک اور ٹوکیو اولمپک میں کھیل چکے ہیں اور لیون (فرانس)، ہیمبرگ، میڈرڈ، لندن اور بنکاک ایشین گیمس میں شریک ہو چکے ہیں۔ اس سال آپ کو ارجن ایوارڈ ملا ہے۔

ہربندر سنگھ (HARBINDER SINGH) ریلوے
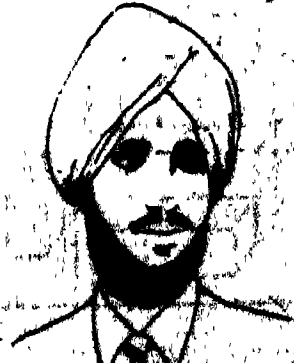
عمر ۲۵ سال۔ شمالی ریلوے میں ملازم ہیں سینٹر فارورڈ کھیلتے ہیں۔ ان کے مقابلے کا کوئی سینٹر فارورڈ نہیں ہے۔ آپ کی رفتار بہت تیز ہے۔ گیند کو اس تیزی کے ساتھ لے جاتے ہیں کہ مخالف ٹیموں کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں۔ مخالف ٹیم انھیں سب سے خطرناک کھلاڑی سمجھتی ہے۔ اب رفتار کی تیزی میں کچھ کمی آگئی ہے پھر بھی مخالف ٹیموں کے لیے بہت خطرناک کھلاڑی ہیں۔ ٹوکیو اولمپک بنکاک ایشین کھیل، لیون، ہیمبرگ اور [illegible] لندن، نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا جا چکے ہیں۔

بلبیر سنگھ (پنجاب پولیس) عمر [illegible] سال

پولیس میں ملازم ہیں فارورڈ لائن میں کسی جگہ بھی کھیل سکتے ہیں۔ ٹوکیو اولمپک کی ٹیم میں تھے اور باہر کے ملکوں کا کافی دورہ کر چکے ہیں

ترسیم سنگھ (TARSEM SINGH) پنجاب عمر ۲۱ سال

پنجاب پولیس کے کھلاڑی ہیں اور لیفٹ آؤٹ کھیلتے ہیں۔ باکی میں یہ جگہ سب سے مشکل ہوتی ہے۔ آپ بنکاک ایشین کھیل جاپان وغیرہ کا سفر کر چکے ہیں۔

اندر سنگھ (INDER SINGH) عمر ۲۳ سال

لیفٹ ان کھیلتے ہیں، ہیمبرگ (جرمنی) بنکاک (ایشین کھیل) میڈرڈ اور جاپان ٹیم کے ساتھ جا چکے ہیں۔

گربخش سنگھ (GUR BUX SINGH) ریلوے

عمر ۲۴ سال [illegible] میں انڈین ریلوے سے کھیل چکے ہیں۔ اس کے بعد چوٹ لگنے سے کھیل چھوڑ دیا تھا۔ رائٹ ان بہت اچھے ہیں اور سینٹر فارورڈ بھی۔ آپ پہلی بار ہندوستان کی ٹیم میں شریک ہو رہے ہیں۔
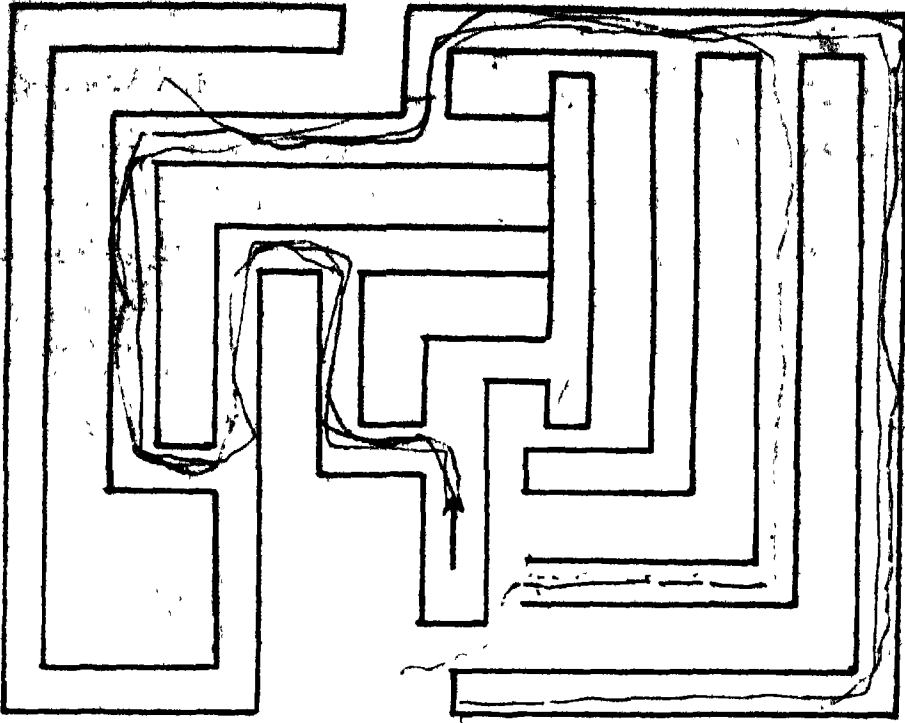
نظر کی ورزش (۱) اوپر کچھ بھول بھلیاں سی بنی ہے۔ اس میں راستہ تلاش کرنا ہے۔ کیا آپ تیر کے نشان پر پنسل لگا کر بغیر کہیں اٹکے باہر نکل سکتے ہیں؟ اس کام کے لیے آپ کو صرف دو منٹ مل سکیں گے۔ خیر کوشش تو کیجیے۔

(۲) ذرا یہ تو بتایئے کہ ہر خانے میں کل کتنے ڈبے ہیں؟ بتا سکیں گے؟

جناب عشرت گیاوی
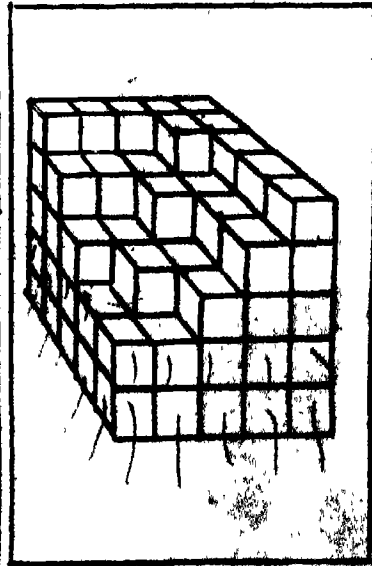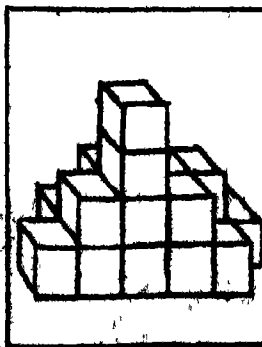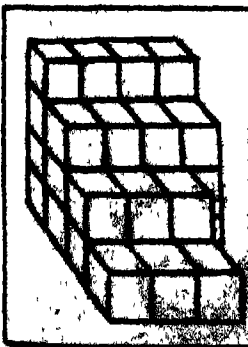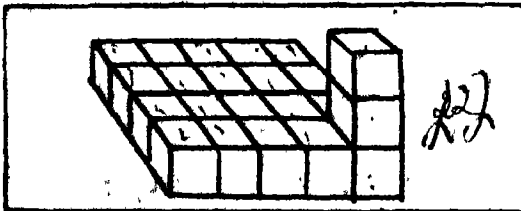
بادشاہ نیک بن گیا

اگلے وقتوں کی بات ہے۔ ایک بادشاہ تھا۔ بڑا بے رحم اور ظالم۔ رعایا پر ظلم و ستم کرنا اس کی عادت تھی۔ رعایا بھی دل سے دعا کرتی کہ خدا ایسے ظالم سے پناہ دے، اور انتظار کرتی کہ کب ظلم و ستم کا سورج ڈوبتا ہے۔

ایک دن بادشاہ شکار کھیلنے گیا اور کھیل کر لوٹا تو پورے ملک میں منادی کرادی "آج تک جو ظلم میں نے اپنی رعایا پر کیے ہیں، اُس کی تلافی تو ممکن نہیں لیکن آیندہ میری طرف سے سب لوگ اطمینان رکھیں، ان کی کوئی حق تلفی نہ ہوگی نہ اُن پر کسی قسم کا ستم ہوگا۔ رعایا کے دکھ درد کا اب میں خیال رکھوں گا، اپنے کاموں سے اُن کے دلوں کو اپنانے کی کوشش کروں گا۔"

بادشاہ کے اس غیر معمولی اعلان سے لوگ حیرت میں رہ گئے۔ بادشاہ کی عادتوں کو اچھی طرح جانتے تھے۔ انہیں یقین نہ آیا کہ بادشاہ کی زندگی میں اتنا بڑا انقلاب آسکتا ہے۔ جو صرف گناہ کرنا جانتا ہے وہ اچانک نیکیوں کی طرف جھک جائے بھلا یہ کیونکر ممکن ہے۔

بادشاہ کے اس اعلان سے طرح طرح کی افواہیں بھی پھیلیں۔ بہت سے لوگ سمجھ رہے تھے کہ کوئی پڑوسی ملک حملہ کرنے والا ہے۔ بادشاہ کو اپنی حکومت چھنتی نظر آرہی ہے اس لیے وہ رعایا کی ہمدردی حاصل کرنا چاہتا ہے اس لیے کہ بادشاہ کے ظلم نے ایسا ماحول پیدا کر دیا تھا کہ کوئی سپاہی سے اس کا ساتھ دینے کو تیار نہ تھا۔

لیکن رعایا کو کچھ دنوں میں پتہ چل گیا کہ بادشاہ سچ مچ اب ہم لوگوں کے آرام کا بہت خیال کر رہا ہے اور اس دن سے رعایا امن و آرام کی زندگی بسر کرنے لگی۔ اور پھر تو ایسا امن قایم ہوا کہ عوام بادشاہ کے درازیٔ عمر اور سلطنت کے قیام کے لیے دعائیں مانگنے لگے۔

ایک دن وزیر نے بادشاہ سے کہا "عالم پناہ! جان بخشی ہو تو ایک سوال کروں"۔ بادشاہ نے خوشی سے اجازت دے دی۔

وزیر نے بڑے ادب و احترام کے ساتھ پوچھا۔ "عالی جاہ ہم سب حیران ہیں کہ منادی کے دن سے آپ کیوں کر ہر برائی کو چھوڑ کر اس طرح بھلائی کی طرف جھک گئے۔ یہ بات ہم سبھوں کے لیے معما ہے۔"

بادشاہ نے کہا "اے وزیر جس دن کا تم ذکر کر رہے ہو اس دن میں شکار کھیلنے جنگل گیا ہوا تھا۔ وہاں ایک عبرت انگیز اور سبق آموز واقعہ میری نظر سے گذرا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ایک کتا لومڑی کے پیچھے دوڑا چلا جا رہا ہے۔ آخر کتے نے لومڑی کی ٹانگ پکڑی اور اسے کاٹ کھایا۔ یہ تماشا دیکھ کر میں چند ہی قدم بڑھا تھا کہ ایک شخص نے دل لگی میں ایک پتھر گھما کر پھینکا جس سے کتے کا سر پھٹ گیا۔ یکایک ایک گھوڑا بے تحاشہ دوڑتا ہوا آیا اور اس کی پیٹ میں آکر پتھر پھینکنے والا آدمی گرا، اور اپنی ٹانگ گنوا بیٹھا۔ گھوڑا ابھی تھوڑے ہی دور گیا تھا کہ خود اس کی ٹانگ ایک سوراخ میں پھنس کر ٹوٹ گئی۔ بس پھر کیا تھا۔ میرے آنکھوں کے سامنے برائیوں اور ظلموں کا بھیانک نقشہ کھنچ گیا۔ میں نے سمجھ لیا کہ اس دنیا میں برے کام کا نتیجہ جلد ہی مل جاتا ہے۔ برائی کا انجام بڑا بھیانک ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دن سے میں نے ہر طرح برائیوں اور جور و ستم سے توبہ کرلی۔ اور نیک کاموں میں اپنا وقت گذارنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

ایک دن کیا ہوا

جناب اقبال مہدی

ابا جان کے پاس ان کے کچھ ملنے والے بیٹھے ہوئے تھے۔ کسی کام سے ابا جان گھر میں آئے اور باہر واپس جاتے ہوئے امّی سے پان بھجوانے کے لیے کہہ گئے۔

امّی کسی کام میں مصروف تھیں انھوں نے سلمہ سے کہا "بیٹی! پان لگا کر باہر دے آؤ"

سلمہ اور سلیم کو گھر کے کام میں ہاتھ بٹانے کا موقع ملا۔ دونوں بہت خوش ہوئے۔ دوڑتے ہوئے کمرے میں پہنچے۔ پان دان سنبھالا۔ ہر ایک کی خواہش تھی کہ زیادہ کام وہ خود کرے۔ دوسرا نہ کرے۔ اس کوشش میں نہ پان کے پتوں کو صاف کیا، نہ اُن کی نوک توڑی بس جلدی جلدی کچھ پانوں پر کتھا چونا رگڑ دیا۔ گلوری بنانا آتی نہ تھی۔ اِس کی کوشش کی تو پانوں کا کچومر کر دیا۔ ہاتھ الگ خراب کیے مجبور ہو کر پانوں کو جیسے تیسے موڑ دیا۔

تھالی اٹھا کر اس میں پان رکھے۔ ڈلی رکھی تمباکو رکھا۔ تھالی لے کر سلیم نے بھاگنے کا ارادہ کیا تو سلمہ نے ٹوکا "ہائے ہے، تھالی کتنی گندی ہے۔ ابا جان ناراض ہوں گے"

سلیم نے دیکھا واقعی تھالی گندی ہے۔ مارے جلدی کے تھالی صاف کرنا بھول ہی گئے تھے۔ سلمہ نے تھالی میں سے پان اٹھا لیے۔ باقی سامان سلیم نے جلدی سے ڈھکن میں الٹ دیا۔ ڈلی اور تمباکو دونوں مل گئے۔ سلمہ پھر چیخی اور دونوں کو الگ الگ کرنے لگی۔ سلیم بھاگ کر تھالی کو دھو لایا۔ مگر پونچھنا بھول گیا۔ گیلی تھالی میں ہی پان رکھے گئے۔ ڈلی اور تمباکو کو بھی الگ الگ رکھنے کی کوشش کی مگر ڈلی میں تمباکو اور تمباکو میں ڈلی پھر بھی ملی رہی۔

غرض پانوں کی تھالی لے کر دونوں باہر چلے اب اس پر پھر جھگڑا ہوا کہ تھالی کس کے ہاتھ میں رہے سلیم نے اسے دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا سلمہ نے بھی ایک ہاتھ سے اُسے پکڑے رکھا۔ ابا جان کو ہر ایک یہ دکھانا چاہتا تھا کہ پان [illegible] وہ بھی

شریک ہے۔

اس طرح جھٹکے کھاتی ہوئی تھالی باہر پہنچی اور مہمانوں کے سامنے رکھ دی گئی۔ شاباشی ملنے کے انتظار میں دونوں کھڑے رہے۔ ابا جان سمجھ گئے۔ انھوں نے کہا: "پان تم دونوں لگا کر لائے ہو؟ شاباش" مہمانوں نے بھی تعریف کی۔ دونوں ہنسی خوشی گھر میں آ گئے۔

باہر جس نے پان کھایا اسی کا منہ کٹا۔ جو تمباکو نہیں کھاتے تھے۔ انھیں چکر آنے لگے۔ جلدی جلدی پان تھوکے گئے۔ ابا جان بکتے ہوئے گھر میں آئے خود ایک جگ میں پانی لیا اور کتھا مانگا۔

بولے "کیا پان لگائے ہیں بھئی۔"

اب تو امی انھیں۔ امی اور ابا دونوں کمرے میں پہنچے۔ سلیم اور سلمیٰ بھی پیچھے پیچھے کمرے میں آ گئے۔ انھیں محسوس نہ ہوا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ دونوں کو خیال تھا کہ انھیں کچھ اور کام کرنے کو ملے گا۔

کمرے میں پہنچ کر امی اور ابا نے دیکھا کہ پاندان کھلا پڑا ہے۔ کتھا چونا ایک ہو رہا ہے۔ کتھے کی ڈبی چونے میں پڑی ہے اور چونے کی کتھے میں۔ جگہ جگہ کتھے چونے کے نشان لگے ہیں۔ دونوں کو سخت کوفت ہوئی۔ دونوں نے گھور کر سلیم اور سلمیٰ کو دیکھا۔ اب تو سلیم اور سلمیٰ سٹپٹائے۔ سوچنے لگے کہ کیا گڑبڑ ہوئی ہے؟ ابا جان تو ایک سادہ پان پر کتھا رکھ کر یہ کہتے ہوئے باہر چلے گئے "بہت ہی نالائق بچے ہیں۔ کوئی کام ڈھنگ سے نہیں کرتے۔" امی نے کس کر ڈانٹا: "یہی پان لگانے کا طریقہ ہے؟ آخر کب تم لوگوں کو عقل آئے گی۔ آپس میں لڑنے سے ہی فرصت نہیں جو کسی بات کی طرف دھیان دے سکو۔"

تعریف کے بجائے ڈانٹ ملنے پر سلیم اور سلمیٰ بہت افسردہ ہوئے۔

جناب محمد اظہار الحق استاد مدرسۂ ثانوی (جامعہ)

باغبانی
گلاب

گلاب پھولوں کا راجا کہلاتا ہے۔ سب لوگ اپنے ہاں گلاب لگانا پسند کرتے ہیں۔ آپ بھی ضرور کرتے ہوں گے۔ تو آئیے اس کو لگانے یا اس کی کاشت سے متعلق جو ضروری اور ابتدائی باتیں ہیں وہ آپ کو بتا دیں۔

گلاب کے لیے کیاریوں کی جگہ کا انتخاب

یوں تو گلاب ہر جگہ ہو جاتا ہے لیکن کامیابی کے ساتھ اگانے کے لیے کھلی ہوئی اور ہوادار جگہ ہونی چاہیے جو درختوں کے گھنے سایہ اور ان کی جڑوں سے دور ہو۔ جہاں عمارتیں ہوں، وہاں عمارت سے جنوب کی جگہ بہترین ہوتی ہے۔ اس کے بعد بہتر سمت مشرق کی ہے اور پھر مغرب کی لیکن شمال کی سمت میں گلاب لگانا پودوں کو اور محنت کو ضائع کرنا ہے۔

گلاب کے پودے کچھ تو کافی بڑھ جاتے ہیں کچھ چھوٹے رہ جاتے ہیں۔ اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ پودوں میں کوئی خرابی ہے۔ بلکہ اصل بات یہ ہے کہ کچھ قسمیں زیادہ بڑھنے والی ہوتی ہیں اور کچھ کم یعنی چھوٹی قسمیں ہوتی ہیں۔ گلاب کے لیے صبح کی دھوپ بہت فائدہ مند بلکہ ایک حد تک ضروری ہے۔ اس لیے اسے ایسی جگہ لگانا چاہیے جہاں صبح کی دھوپ پہنچتی ہو۔ یہ کہنا غلط ہے کہ جہاں کچھ دیر بھی سایہ ہو وہاں گلاب ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر تھوڑا بہت سایہ ہو تو گلاب کو اچھی طرح اگایا جا سکتا ہے۔

جہاں یہ ضروری ہے کہ جگہ کھلی ہوئی اور ہوادار ہو۔ وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ اسے تیز ہوا سے بچایا جائے۔ تیز ہوا کے جھونکوں سے ٹہنیاں زیادہ ہلتی ہیں تو وہ ایک دوسرے سے الجھ جاتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شاخیں، کلیاں اور پھول کانٹوں سے الجھ کر پھٹ جاتے ہیں۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ یا تو اک ذرا اونچی دیوار بنوا دی جائے یا چاروں طرف جھاڑیاں (ہیج) ہوں۔ لیکن ایسا نہ ہو کہ ہوا کا بالکل گذر ہی نہ ہو جائے۔ اس کا بھی خیال رکھیے کہ گلاب کے پودوں تک دھواں بالکل نہ

جگہ کے انتخاب کے سلسلہ میں دوسری اہم بات اور یاد رکھیے اس جگہ مستقل نمی نہ پہنچتی ہو، نہ پانی بھرا رہتا ہو۔ یعنی پانی کے نکاس کا اچھا انتظام ہو۔

گلاب کے لیے جگہ کے انتخاب کے سلسلہ میں جو باتیں ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) جگہ سایہ سے دور ہو (۲) بہت تیز ہوائیں نہ لگتی ہوں (۳) جگہ دھوئیں سے پاک ہو۔ (۴) ہوادار ہو (۵) پانی کا نکاس ٹھیک ہو۔ (۶) جنوب مشرق یا جنوب مغرب میں ہو۔

کیاریاں کس طرح تیار کی جائیں

جہاں تک کیاریوں کا تعلق ہے۔ لمبائی حسب منشاء رکھی جاسکتی ہے لیکن چوڑائی اتنی ہونی چاہیے کہ بغیر کیاری میں گھسے ہوئے کام کیا جاسکے۔ اس لیے کیاری کی چوڑائی پانچ فٹ مناسب رہتی ہے۔ جہاں تک ہوسکے کیاریاں سادہ بنانی چاہئیں۔

کیاریاں بنانے کے بعد ان کو دو تین فٹ گہرا کھودنا چاہیے۔ گہری کھدائی سے اچھا نتیجہ حاصل ہوتا ہے پودے لگانے سے ایک یا دو ماہ پیشتر کیاری کی کھدائی اس طرح ہو کہ مٹی چاروں طرف ڈالی جائے اور کیاری کو نالی کی طرح بنا کر کھلا چھوڑ دیا جائے تاکہ دھوپ اور ہوا کے مفید اثرات حاصل ہوجائیں۔

کھدی ہوئی کیاریاں تقریباً ایک ماہ ایسے ہی پڑی رہیں اور پھر ان کو اس طرح بھرا جائے کہ مٹی میں کھاد ملا لیا جائے۔ ایک گاڑی گوبر کی اچھی گلی سڑی کھاد ۱۰ فٹ لمبی اور ۵ فٹ چوڑی کیاری کے لیے کافی ہوگی کھاد کی زیادہ تر مقدار نیچے کی مٹی میں ہو اور اوپر کی سطح پر کم ہونی چاہیے۔ تاکہ پودے کی جڑیں نیچے کی طرف زیادہ جائیں۔ زمین کی نیچے کی تہہ میں ہڈی کا چورا (پاوڈر نہیں) ملانا بہت فائدہ مند ہوگا۔ ایک ہنڈریڈ ویٹ ہڈی کا چورا پانچ کیاریوں کے لیے جن کی لمبائی ۱۰ فٹ اور چوڑائی ۵ فٹ ہے کافی ہوگا۔ کیاریوں کو زمین کی سطح سے دو یا تین انچ اوپر تک بھر دینا چاہیے۔ کیونکہ پولی مٹی بیٹھنے کے بعد سطح سے نیچی ہوجاتی ہے۔ بھرنے کے بعد پودے لگانے تک ایک ماہ کا وقفہ دیا جائے۔ تو مٹی دب کر کیاریاں ٹھیک ہوجائیں گی۔

گلاب کے لیے مناسب مٹی زرخیز بلوئی دومٹ ہے۔ اگر بالو [illegible] زیادہ ہو تو کچھ چکنی مٹی ملا کر ٹھیک کر لیا جائے اور اگر چکناہٹ زیادہ ہو تو بالو ملا کر درست کر لینا چاہیے اگر مٹی کنکریلی ہے تو دو فٹ سے زیادہ گہرا نہ کھودا جائے۔

کیاریوں میں کچھ راکھ یا کوئلہ کا چورا یا جلی ہوئی مٹی ڈالی جائے جو بہت فائدہ مند ہے۔

کیاریاں بنانے کے بعد اور پودے لگانے سے پہلے کیاریوں کو دو تین مرتبہ پانی دے کر کھودنا چاہیے۔ کھودنے کے وقت اس بات کا خیال رکھا جائے کہ مٹی نہ تو گیلی ہو اور نہ بالکل خشک ہو۔ یعنی کھودنے پر ڈھیلے نہ بنتے ہوں۔

پودے منگانے کے بعد ان کی دیکھ بھال

اب کسی اچھی نرسری سے پودے منگائیے اور ان کو سایہ میں رکھیے انھیں تیز ہوا سے بچائیے۔ پھر بہت احتیاط سے پیکنگ کھول کر علحدہ علحدہ رکھیے۔ کوئی شاخ ٹوٹ گئی ہے تو اس کو تیز چاقو سے احتیاط سے اس طرح کاٹیے کہ چھلکا دور تک نہ اکھڑ جائے بہتر یہ ہے کہ پودوں کو تقریباً ایک دن پانی چھڑک کر رکھا جائے۔ تاکہ یہ معلوم ہوجائے کہ کوئی پودا مرنے والا تو نہیں ہے۔

اگر پودوں کی جڑوں کی مٹی ٹوٹ گئی یا بکھر گئی ہے۔ تب پودوں کو ایک نالی کھود کر اس میں رکھا جائے اور مٹی بھر کر پانی دے دیا جائے کہیں ایسا ہوتا ہے کہ اپنی زمین میں یا ان پودوں کی مٹی میں جو باہر سے آئے ہیں دیمک ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں لگاتے وقت تھوڑی سا فنائل پانی میں ملا کر اس سولوشن کو چھوک دینا چاہیے۔

(باقی آئندہ)

بچوں کی کوششیں

ہلواہا اور بیل

چل چل میرے جیون پیارے ٭ سارے جگ کے ایک سہارے
دنیا خوش ہے تیرے کارن ٭ ہے جگ کا تو ہی تن، من، دھن
دھرتی تجھ سے پھول رہی ہے ٭ سکھ کا جھولا جھول رہی ہے
تیری محنت اور پسینا ٭ جگ کا کھانا، جگ کا پینا
اونچے اونچے محلوں والے ٭ بانکی ٹیڑھی پگڑی والے
سب جانوں کے ایک سہارے ٭ داتا ہے تو میرے پیارے
چل چل میرے جیون پیارے ٭ جگ کی سیوا کرنے والے
دھوپ اور گرمی کی حالت ٭ دن بھر کی یہ تیری محنت
ساری سختی جھیل رہا ہے
جی پر اپنے کھیل رہا ہے

(ہندی سے ترجمہ) قرار احمد آزاد

گڑیا رانی

سب سے انوکھی ٭ سب سے نرالی
سب سے اچھی ٭ ہے گڑیا سی
اس کو کہیے گڑیا رانی ٭ ہے وہ سب گڑیوں کی رانی
پاس اس کے رہتی ہے گڑیا ٭ کرتی رہتی ہے وہ ٹیں ٹیں
سب سے انوکھی سب سے نرالی
ہے یہ میری گڑیا رانی

رضوانہ پروین (چہارم ب)

پھلجھڑیاں

گھنٹہ گھر سے نو بجنے کی آواز آئی تو ایک آدمی نے دوسرے سے پوچھا:
"آپ کی گھڑی میں کیا بجا ہے؟"
"ساڑھے نو"
"آپ کی گھڑی ریڈیو سے ملی ہے یا ریلوے سے؟"
"نہ ریڈیو سے نہ ریلوے سے سسرال سے ملی ہے۔"

۲۔ بچہ نعمت خانے سے حلوا نکال رہا تھا۔
ماں (دیکھ کر) ہم دیکھ رہے ہیں مار کھانے کا ارادہ ہے!
بچہ نہیں تو امی، حلوا کھانے کا۔

توصیف احمد نعمانی

خدمت کا پھل

کسی گاؤں میں رام نام کا ایک غریب کسان رہتا تھا۔ محنت مزدوری کرکے زندگی بسر کرتا تھا۔ اس گاؤں سے ایک کچی سڑک نکلتی تھی۔ اس سڑک کے بیچوں بیچ ایک بڑی چٹان تھی جس سے اس سڑک پر چلنے والوں کو اچھی خاصی تکلیف تھی مگر کوئی شخص بھی اس پتھر کو راستے سے ہٹانے کی کوشش نہ کرتا تھا
ایک مرتبہ ایک مسافر اس کچی سڑک پر سے گزر رہا تھا اندھیری رات تھی، وہ چٹان نظر نہ آئی۔ تانگہ پتھر سے ٹکرایا اور تانگے کا پہیا ٹوٹ گیا۔ وہ خود بھی زخمی

ہوگیا۔ گاؤں والوں کو تو گالیاں دیتا چلا گیا مگر اس پتھر کو ہٹانے کی توفیق نہ ہوئی۔ اس طرح کے حادثے آئے دن ہوتے رہتے تھے۔

ایک دن رامو اسی سڑک سے گزر رہا تھا۔ اس نے سوچا اگر میں چٹان کو اس راستے سے ہٹا دوں تو مسافروں کو بہت آسانی ہوگی اور یہ ایک بھلائی کا کام ہوگا۔

الغرض رامو نے اپنی طاقت کو پوری طرح استعمال کرکے اس پتھر کو ہٹا دیا۔ جب پتھر ہٹ گیا تو رامو کو بہت خوشی ہوئی۔ اتنے میں اس کی نظر ایک ڈبے پر پڑی جو پتھر کے اندر گڑا پڑا تھا۔ وہ دیکھ کر چونک پڑا۔ اس نے ڈبے کو کھول کر دیکھا تو اشرفیوں سے بھرا ہوا تھا اور ڈبے پر لکھا تھا: "جو شخص اس چٹان کو راستے سے ہٹائے گا وہی ان اشرفیوں کا مالک ہوگا۔"

(ہندی سے ترجمہ) کے۔ اقبال احمد

مسکراہٹیں

احمد: (ایک لڑکے سے) دہلی دور ہے یا چاند؟
لڑکا: دہلی!
احمد: وہ کیسے؟
لڑکا: کیوں کہ چاند تو نظر آتا ہے مگر دہلی نظر نہیں آتی۔

استاد: (شاگرد سے) دھان کہاں پیدا ہوتا ہے؟
شاگرد: کھیت میں!

باپ: (بیٹے سے) اگر میں روزانہ تمہیں ایک چاکلیٹ دوں تو ہفتہ میں تمہارے پاس کتنے چاکلیٹ جمع ہو جائیں گے؟
بیٹا: ایک بھی نہیں!
باپ: کیوں؟
بیٹا: [illegible] دن بھر میں ایک چاکلیٹ بھی

نہیں کھا سکتا؟ کے۔ اقبال احمد گرگیوری

لطیفے

مہمان: (نوکر سے) کیوں بھائی تمہارے مالک گھر پر ہیں؟
نوکر: جی نہیں۔
مہمان: اور وہ کھڑکی میں کس کی جھلک دکھائی دے رہی ہے؟
نوکر: جی وہ ان کا سایہ ہے۔

مریض: آپ نے جس شفقت اور محبت سے میرا علاج کیا ہے اس کا بدلہ کیسے اتاروں؟
ڈاکٹر: چیک یا نقد روپے سے!

سید اختر حسن عابدی

عاصم نے اک کیاری بنائی کیاری بنائی خوب سجائی
خوب سجائی
خوب سجائی
کیاری میں سے کتنے پھوٹے کتنے پھوٹے چھوٹے موٹے
کتنے پھوٹے
کتنے پھوٹے
کتنے دیکھ کے عاصم آیا عاصم نے پھر شور مچایا
شور مچایا
شور مچایا
شور مچایا بچے آئے بچے گانا گاتے آئے
گانا گاتے آئے
گانا گاتے آئے

محمد اعجاز انصاری

اسکولوں کی تعلیمی اور تفریحی سرگرمیاں

باشیبان ہائی اسکول میں شاندار جشنِ آزادی

باشیبان ہائی اسکول شہر بلگام میں ہر سال کی طرح امسال بھی یوم آزادی بہت ہی شاندار طریقے پر منایا گیا۔ صبح ۸ بجے اجتماع ہوا۔ پرچم کشائی کی رسم ہیڈ ماسٹر محمد اسماعیل ملّا کے دست مبارک سے ادا کی گئی۔

قومی ترانے کے بعد طلباء و طالبات نے پرجوش تقریریں کیں۔ اساتذہ میں سے عالیجناب محمد علی کلتے دار نے ایک بہت ہی موثر و معلوماتی تقریر سے سامعین کو محظوظ فرمایا۔

آخر میں طلبار و طالبات نے مل کر "ترانہ باشیبان" بہت ہی خوش الحانی سے گایا۔

فاروق ہائی اسکول (جوگیشوری) میں جشن آزادی کا پروگرام

بتاریخ ۱۵ اگست ۱۹۶۸ء بروز ... ۱۰ بجے یوم آزادی کے موقع پر فاروق ہائی اسکول (جوگیشوری) میں فاروق کابینہ کی جانب سے شاندار پروگرام پیش کیا گیا۔ صدر محترم عالیجناب زکریا اگاڑی صاحب کے دستِ مبارک سے پرچم کشائی کی گئی۔ اس کے بعد طلبار نے حلف اٹھایا اور قومی ترانے کے بعد ... احمد خان صوبے خان کی تلاوتِ قرآن مجید سے جشن آزادی کا آغاز ہوا۔

فاروق کابینہ کے وزیر اعظم انیس الدین نے صدر محترم عالیجناب زکریا اگاڑی کا تعارف کرایا۔

تعارف کے بعد ہماری ننھی منی شبانہ نے صدر محترم کی خدمت میں گلہائے عقیدت پیش کیے۔ اس کے بعد پرنسپل ابراہیم خاں طالب نے اسکول کی مختصر سی رپورٹ پیش کی۔

انسپکٹر عالیجناب صدیقی صاحب نے اسٹاف میٹنگ میں پرنسپل صاحب، کارکنانِ اسکول اور طلباء کی کوششوں کو سراہتے ہوئے کہا کہ ہمیں امید ہے کہ آپ نے جو معیار قائم کیا ہے وہ دوسروں کے لیے مشعلِ راہ ہوگا

پرنسپل صاحب کی تقریر کے بعد قریشی نورجہاں اکرم نے اپنی نظم پڑھی۔ نظم کے اختتام پر کے بعد دیگرے طلباء و طالبات نے اردو ہندی اور انگریزی میں عظمتِ پارینہ ہند کے عنوان پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ دیگر طلبا و طالبات نے نظمیں اور ڈرامے پیش کیے۔ ان آئٹمس کے اختتام پر محترم پرنسپل صاحب اساتذہ کرام اور طلباء کو دلی مبارکباد پیش کی گئی۔

عالیجناب عبدالستار مل والا صاحب نے ہمارے پروگرام میں حصہ لینے والے طلباء و طالبات کو تین سو دس روپے کا گرانقدر انعام پیش کیا۔ اس کے علاوہ اور بہت سے حضرات نے کل چار سو ستر (۴۷۰) روپے کے نقد انعامات سے ہمارے طلبار کی ہمت افزائی کی۔ اس کے بعد فاروق کابینہ کے وزیر فنکس نثار احمد نے کابینہ کے تمام وزرار اور نائب وزرار کی طرف سے جناب صدر محترم، مہمانان خصوصی، پرنسپل صاحب، اساتذہ کرام، پروگرام میں حصہ لینے والے طلبار و طالبات اور دیگر تمام حضرات کا شکریہ ادا کیا۔

یوم غالب بچوں نے منایا

بمبئی۔ مورخہ ... فروری ۱۹۶۸ء کو [illegible]

میونسپل اردو اسکول کے طلبا نے صبح ۸ ½ بجے سے ۱۲-۴۰ تک اسکول کا کام خود سنبھالا۔

پیریڈ سسٹم سے ہر طالب علم ٹیچر نے اپنے اپنے ذمّہ کے مضامین کلاسوں میں جاکر پڑھائے۔ اسی دن بچوں نے یوم غالب منایا۔

تلاوتِ قرآن کے بعد ممتاز بانو، جلیل خان نے اناؤنسنگ کے فرائض انجام دیے۔ صدارت سعیدہ بیگم نے فرمائی محمد قاسم معیارِ ہفتم نے یوم طلبا، کی رپورٹ پیش کی۔ ہفتم کے طالب علم معین الدین نے ایک غزل سنائی۔

پنجم کی طالبہ انیس بانو نے مرزا غالب کا منظوم تعارف فرمایا۔ ششم کی جہاں آرا نے غالب کی سوانح حیات پر تقریر کی۔ طالب علم شیخ خلیل نے غالب کے بچپن کے واقعات اور کلام کی خصوصیات پر کامیاب بحث کی۔

بانو بی اور شمس الضحیٰ متعلم معیار پنجم نے غالب کے لطیفے بیان کیے۔ بیت بازی کے مقابلے میں لڑکوں کے گروپ کو فوقیت حاصل ہوئی۔ مشاعرے کی صدارت آمنہ بی نے کی۔

ممتاز بانو، رحمت اللہ، عبدالرحیم، نور جہاں اور نظام الدین نے غالب کی غزلیں پیش کیں۔

یوم غالب کے سلسلے میں ایک ہال میں نمائش بھی کی گئی جس میں غالب کی یادگار تصویریں اور کلام اور دیگر اہم معلوماتی چھوٹے اور بہترین چارٹ آویزاں کیے گئے۔

حسین کمال اشرفی، صدر مدرس بکھاڑی میونسپل اردو اسکول۔

اسکول ڈے

گرلس ہائی اسکول میں آج اسکول ڈے منایا گیا جس میں طالبات نے ایک دن کے لیے صدارت اور مدرسین کے فرائض انجام دیے۔ اس موقع پر ضلع پریشد کے عہدہ دار، مقامی عہدہ دار، کلکٹر و معززین شہر کو معائنہ مدرسے کے لیے دعوت منجانب صدر معلمہ صاحبہ ہائی اسکول دی گئی۔ کلکٹر صاحب ضلع تعلیمات کے عہدہ دار اور مقامی معززین نے مدرسہ کا معائنہ فرمایا جس میں عبدالستار شبھانی صدر نشین ضلع وقف کمیٹی نے مدرسے کا معائنہ کرنے پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے مجموعی حالت کو اطمینان بخش بتلاتے ہوئے، مدرسہ کی عمارت ناکافی ہونے سے مختلف دو مقامات پر ایریگیشن آفس کی جگہ اردو جماعتوں میں تبدیل کرنے پر زور دیا تاکہ مدرسین کو تکلیف نہ ہو۔ مدرسہ کو پانی سنڈاس کی شدید ضرورت ہے اور ساتھ ہی گیمس اور سائنس کے لیے عمدہ روم ہوں اور سب سے اہم چیز مدرسے کے اطراف والی کمپاونڈ کی دیوار نہایت ضروری ہے۔

ایم۔ اے۔ ستار سبحانی

نیو پل میں 'یعقوب بیگ ہائی اسکول نیوپل' کے سابق طلبا نے OLD STUDENT'S ASSOCIATION کی بنیاد ڈالی

اس ایسوسی ایشن کی پہلی میٹنگ مورخہ ۱۸ اگست بروز اتوار دوپہر تین بجے یعقوب ہائی اسکول میں ہوئی جس میں چند قوانین اور چند مقاصد پاس کیے گئے بعد میں چائے کا دور چلا اور آخر میں ورکنگ کمیٹی کا چناؤ ہوا۔

تقریباً سبھی اسکولوں میں اس قسم کی ایسوسی ایشن ہے صرف OLD BOYS ASSOCIATION ہوا کرتی ہے مگر ہم نے یہ قدم اٹھایا کہ اس میں لڑکیوں کو بھی شامل کیا یہی نہیں بلکہ ورکنگ کمیٹی میں بھی انھیں شامل کیا گیا ہے۔

انتخاب کا نتیجہ مندرجہ ذیل ہے:۔ صدر مسٹر پٹیل امیر الدین محمد ابراہیم۔ نائب صدر ماسٹر پٹیل عبدالرشید محمد حسین جنرل سیکریٹری: پٹھے سراج الدین معین الدین۔ جوائنٹ سیکریٹری: (۱) سید میر سید حسن مومن (۲) پٹیل مشتاق احمد دادا جی ویلفیر سیکریٹری، مسٹر محمد غوث شرف الدین ماسٹر۔ جوائنٹ سیکریٹریز (۱) مس شمس النسا دادامیاں دیوان (۲) مسٹر فاروق غلام صاحب پٹھے۔ فائننس سیکریٹری، مسٹر کرنل مختار احمد حسن میاں جوائنٹ سیکریٹری: (۱) مشتاق احمد ذبیح (۲) دولارے شہر بانو حسن۔

حاضرین نے تقریباً ۵۴ شیئے طلبا ولین مدد کے دیے جنرل سیکریٹری سراج الدین معین الدین

آدھی ملاقات

آپ کا محبت نامہ ملا اور ساتھ ہی سالنامہ اور ستمبر ۶۸ء
کا شمارہ بھی، پڑھ کر بے حد مسرت ہوئی اور ہمارے لکھنے والوں کی لگن
کا بھی پتہ چلا جس طرح سے وہ ہماری زبان کی خدمت کر رہے ہیں۔ خدا
ایسی خدمت کا جوش سب کو بخشے بچوں کی اس طرح خدمت سے اردو
کا دایرہ وسیع تر ہوتا جائے گا۔ نیز اسے دیکھ کر اب یقین ہو گیا ہے کہ
ان بزرگوں نے جو اردو کے مستقبل سے مایوسی کی باتیں کرتے ہیں "پیام
تعلیم" کا مطالعہ نہیں کیا ورنہ وہ کبھی ایسی باتیں نہ کرتے۔

منوہر پرشاد ماتھر ایڈوکیٹ (حیدرآباد ۲۷)

کل شام کی ڈاک سے پیام تعلیم کا تازہ شمارہ ملا۔ آپ نے
اس کی صوری و معنوی دونوں طرح کی آب و تاب میں مزید رنگ و نور کی آمیزش
فرما دی ہے۔ اس دفعہ کافی نکھر گیا ہے۔ نظم و نثر (اپنی نظم ستمبر آگیا با ذوق
پیامیوں کی رائے کے لیے الگ کرکے) دونوں حصے وقیع تر ہو گئے ہیں۔

عادل جعفری اندور

آپ میں ہمت بے پایاں کا جذبہ دیکھ کر رشک ہوتا ہے۔
پیام تعلیم کی ترقی میں جو آپ اتنی محنت کرتے ہیں تو کیا آپ تھکتے نہیں
ہیں۔

اصغر امام قیصر حانی آرہ

پیام تعلیم برابر آرہا ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر از حد مسرت
ہوئی کہ پرچہ ماشاءاللہ دن بدن ترقی کے راستے پر
گامزن ہے۔ یہ سب آپ حضرت کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔

خالد حسین خاں شاہجہاں پور

اس بار بہت دنوں بعد محترم فوجی صاحب کا ایک
پیارا سا مضمون دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ آپ کی کہانی بھی بڑی دلچسپ
ہے۔ چھوٹے پیامی پڑھ کر بہت خوش ہوں گے۔ خالد عرفان صاحب
کی کہانی "ممتا" بڑی پر اثر کہانی ہے لیکن ذرا بڑے پیامی ہی اسے
اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ محترمہ سلمیٰ جاوید نے بہت پیاری اور آسان
زبان میں اپنی کہانی یا مضمون (جو کہہ لیجیے) میں ایک سماجی مسئلہ کی
(جو بہت دنوں سے سماج کے لیے ایک لعنت بنا ہوا ہے) برائی باتوں
ہی باتوں میں بیان کر دی۔ ساحر بھوپالی صاحب کی قوالی بھی خوب
ہے اور عادل صاحب کی نظم بھی۔

اس بار ٹائیٹل بھی بہت پسند آیا۔ تصویر میں جس
لڑکی کے بال جھاڑے جا رہے ہیں۔ اس کے چہرہ کے تاثرات
اتنے حقیقی ہیں کہ بے اختیار آرٹسٹ کو داد دینا پڑتی ہے معلوم
ہوتا ہے کہ اس منظر کو آرٹسٹ صاحب نے کئی بار بغور دیکھ کر یہ
تصویر تیار کی ہے، دونوں لڑکیوں کا انداز بڑا فطری ہے۔ مجھے
پتہ نہیں کیوں ابن بطوطہ کی قسط پڑھنے میں سب سے زیادہ لطف
ملتا ہے۔

م۔ نسیم صاحب اچھے لکھنے والوں میں ہیں ان کی
کہانیاں مجھے پسند ہیں۔ لیکن افسوس انھوں نے جو افسانہ لکھا
ہے۔ اس کی کہانی بھی بہت مشہور ہے اور بہت بار شایع ہو چکی ہے۔
ڈراما ضرور ان کی اپنی کوشش ہے لیکن اگر وہ کسی نئی اور غیر
مطبوعہ کہانی کو ڈراما کی شکل دیں زیادہ بہتر رہے گا۔ محترمہ معروفہ
تسنیم کی دوسری کہانی "غرور کا نتیجہ" بھی اسی قسم کی بہت مشہور
کہانی ہے اور اتنی عام ہے کہ انگریزی کی اردو ٹرانسلیشن کی
کی زیادہ تر کتابوں میں اردو یا انگریزی میں لکھی گئی ہے۔

تازہ شمارہ نظر نواز ہوا اور ہر لحاظ سے پسند آیا ۔
ورت کتابت، دلکش طباعت، بچوں کے لیے ان کی طبیعت،
ہنچ اور دلچسپیوں کے مطابق نظم و نثر کا انتہائی پر توازن
اور دلچسپ و جاذب نظر تصاویر کے علاوہ معلوماتی
ن، ان ساری چیزوں نے جو بڑی سخت کاوشوں کے بعد
رسالہ میں جمع ہوتی ہیں۔ "پیام تعلیم" کو ایک مکمل رسالہ بنا
۔ جو ہر لحاظ سے بچوں کے ذہن و پسند کا عکاس ہی نہیں ان
مشعل راہ بھی ہے۔ کلیم راہی بردوان

میں "پیام تعلیم" کافی عرصہ سے مطالعہ کر رہا ہوں
رچے میں نئی نئی تبدیلیاں پاتا آرہا ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ جامعہ
ایسا ادارہ ہے جو اُردو ادب کی تحریک کو بڑی حسن خوبی
فروغ دیتے ہوئے اپنی منزل کو بڑی تیزی سے طے کر رہی
"پیام تعلیم" اس کا ایک جزو ہے۔ اللہ تبارک تعالیٰ سے یہ
کہ اس پرچے میں وہ نکھار پیدا کر دے جو مطالعہ کرنے والوں کے
جادو کی طرح چھا جائے۔ محمد انور حسین سرپور

ستمبر ۹۰ء کا شمارہ زیر نظر ہے۔ "پیارے بچے" میں انسانی
خلوص کی طرف مایل کیا گیا ہے۔ جادو کے تھیلے کا جواب نہیں،
پ اور پرلطف کہانی ہے۔ بے شک "ماتا" کا پیار پھر ماتا کا
"انوکھا فریادی" پڑھ کر تعجب ہوا۔ لڑکیوں کا دلچسپ کھیل
کے منگنے کی منگنی" میں سماج کی غلط رسم و رواج اور ان
ح کا بہترین نمونہ پیش کیا گیا ہے۔
ہم پیام تعلیم سے پیاری پیاری نظمیں، کہانیاں اور
مین کا انتخاب کرکے بچوں کو سناتے ہیں۔ اور بعض تخلیقات
مال اسکولوں کے تفریحی پروگرام میں بھی پیش کرتے ہیں۔
مچھر(۱) "کہانی بعض رسایل میں آچکی ہے۔ مگر

م ندیم صاحب نے ڈرامے کی صورت میں پیش کرکے تفریحی پروگرام
میں ایک ڈرامے کا اضافہ کر دیا ہے۔ زیر نظر شمارہ کے تقریباً سبھی
کہانیاں، مضامین و نظمیں اچھی ہیں۔ خصوصاً نظم میں "ستمبر آگیا" "قوالی"
"بلو" "سحر ہو گئی" بہت خوب ہیں۔
وزیر مصطفےٰ آبادی کاسودہ (جلیگاؤں)

"پیام تعلیم" سے آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو جو
دلی لگاؤ ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ پیام تعلیم پڑھنے والے
اور اس سے دلچسپی رکھنے والے سب اس بات کو اچھی طرح جانتے
ہیں کہ آپ حضرات اس کی ترقی اور بہتری کے لیے کس کس طرح
کوشاں رہتے ہیں۔ غالباً اسی لگن کا نتیجہ ہے کہ "پیام تعلیم" کے
قارئین بھی اسے عزیز رکھتے ہیں اور اس کی ترقی اور بہتری کے
لیے اپنے بس بھر کوشش کرتے رہتے ہیں۔
میری خواہش ہے کہ "پیام تعلیم" میں لکھنے والوں اور
اس کے پڑھنے والوں میں باہمی رابطے کی زیادہ سے زیادہ آسانیاں
فراہم کی جائیں۔ تاکہ لکھنے والوں کو پڑھنے والوں کے تاثرات
کا اور پڑھنے والوں کو، ذاتی رابطے کے ذریعہ، لکھنے والوں
کے رجحان کا بہتر اندازہ ہو سکے۔ اس ذاتی رابطے کا جو مفید اثر
لکھنے والوں کی تصانیف پر، پڑھنے والوں کے ذوق و شوق پر
اور خود رسالے کی مقبولیت پر پڑے گا وہ ظاہر ہے۔
فی الحال یہ کام آپ کے رسالے کے کالم "آدھی
ملاقات" کے ذریعہ انجام پا رہا ہے۔ لیکن صفحات کی محدود گنجایش
طویل اور تفصیلی مراسلت کو رسالے میں شایع کرنے کی اجازت
نہیں دے سکتی۔ اس لیے میری تجویز ہے کہ "پیام تعلیم" میں جن
لوگوں کے مضامین، کہانیاں، نظمیں یا خطوط وغیرہ شایع ہوں ان کے
نام کے ساتھ ساتھ ان کا ڈاک کا مکمل پتہ ضرور شایع کر دیا جائے تاکہ
پڑھنے والوں کو لکھنے والوں سے تبادلۂ خیالات کرنے میں

قلمی دوستی

نام - حمیدہ خاتون عمر ۱۰ سال
مشغلہ - کشیدہ کاری کرنا۔ مختلف رسالوں کا مطالعہ کرنا۔ گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹانا، قلمی دوستی کا جواب دینا۔ "پیام تعلیم" کا شوق سے مطالعہ کرنا۔
پتہ - معرفت سانڈو دیگاؤں محلہ پینڈار پورہ (نزد مینار مسجد) پوسٹ آفس کاسودہ (ضلع جلگاؤں)

نام - ظفر عالم عمر ۱۵ سال
مشغلہ کورس کی کتابیں پڑھنا۔ رسالے پڑھنا اور اچھے دوستوں کی تلاش (جامعہ اور علی گڑھ کی طلباء سے دوستی کرنے کی خواہش)
پتہ - معرفت حافظ محمد حسن صاحب۔ شری پور نمبر ۳ پوسٹ شری پور۔ کالی پہاڑی۔ (ضلع بردوان)

نام - سید محمد اسماعیل فکری عمر ۱۴ سال
پتہ - سید محمد اسماعیل فکری، معرفت محمد ابراہیم فکری ظفر منزل، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی ۲۵
مشغلہ - کرکٹ کھیلنا۔ ٹکٹ جمع کرنا۔ پیام تعلیم پڑھنا۔ شکار کرنا۔ باہر کے ملکوں کے لڑکوں سے خط و کتابت کرنا۔

نام - فراست اللہ خاں۔ عمر ۱۱ سال
مشغلہ - پیام تعلیم پڑھنا۔ نیز اچھی اچھی کہانیاں سننا سچے قصے پڑھنا۔ گیند کھیلنا وغیرہ۔
پتہ فراست اللہ خاں۔ معرفت حافظ خالد حسین خاں محلہ مہند جلال نگر۔ ضلع شاہجہان پور۔ یو۔ پی۔

نام - محمد شوکت علی خاں اکبر عمر ۱۴ سال
مشغلہ - پیام تعلیم پڑھنا۔ قرآن شریف پابندی سے تلاوت کرنا۔ قلمی دوستی کرکے دوستوں کے خطوں کا جواب پابندی سے دینا
پتہ - معرفت محمد امین خاں - محلہ دکھنواری مقام اکبر پور - پوسٹ روہتاس (ضلع شاہ آباد) (بہار)

نام - قرار احمد آزاد عمر ۱۵ سال
مشغلہ - کہانی لکھنا۔ نظمیں لکھنا۔ قلمی دوستی کرنا۔
پتہ - محلہ دکھنواری۔ اکبرپور۔ روہتاس۔ شاہ آباد (بہار)

نام - خورشید عالم بیکل عمر ۱۲ سال
مشغلہ - چٹکلے لکھنا۔ نئے نئے پروگرام میں حصہ لینا۔ گیند کھیلنا۔
پتہ - معرفت قرار احمد خاں آزاد۔ دکھنواری مقام اکبرپور ڈاکخانہ۔ روہتاس۔ ضلع شاہ آباد (بہار)

نام - سید ہلال حسین نقوی - عمر ۱۴ سال
مشغلہ - مضمون لکھنا، ادبی مطالعہ کرنا۔ "پیام تعلیم" پڑھنا اردو کی ترقی کے لیے کتابیں خریدنا، لائبریری قائم کرنا، قلمی دوستوں کے خطوں کا جواب دینا۔
پتہ - معرفت سید اظہار حسین نقوی۔ میڈیکل کالج کوارٹرس نمبر ۱۲ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ یو۔ پی

اِدھر اُدھر سے

کرکٹ کی دنیا میں دو نئے ریکارڈ

پیام تعلیم کے ماہ جولائی کے پرچے میں آپ نے کھیل اور کھلاڑی مضمون میں دنیا کے بہترین کرکٹ کھلاڑی گارفیلڈ سوبرس کے حالات پڑھے ہوں گے۔ اس کھلاڑی نے حال ہی میں کرکٹ کی دنیا میں دو نئے ریکارڈ قائم کیے ہیں۔ اگست کے آخری ہفتے میں انگلستان میں ایک میچ میں کھیلتے ہوئے سوبرس نے ایک ہی اوور میں چھ کے چھ بالوں پر چھکے لگائے۔ آج تک کوئی کھلاڑی ایسا کمال نہیں دکھا سکا۔ اسی میچ میں انھوں نے ۴۵ منٹ کے قلیل وقفے میں ۷۶ رن بنا ڈالے۔ یہ بھی ایک ریکارڈ ہے۔ (دینا ناتھ گردھر)

چھ ماہ کی چلتی پھرتی بچّی

ایران میں چھ ماہ کی ایک بچّی ڈاکٹروں کے لیے ایک معمّا بنی ہوئی ہے۔ یہ بچّی باتیں کرتی ہے، چلتی پھرتی ہے۔ اس عجوبہ روزگار بچّی ہما کی ماں نے اخباری نمائندوں کو بتایا کہ میری بچّی وہ تمام کام کرتی ہے جو ہمارے گاؤں میں عموماً دو تین سال کی عمر کے بچّے کرتے ہیں۔ اخباری نمائندے اسے گاؤں سے طبّی معائنہ کے لیے شیراز کے اسپتال لے آئے۔ ڈاکٹر رضا نے اس بچّی کا طبّی معائنہ کرنے کے بعد حیرت ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ علم طب کے لیے یہ بچّی ایک عجوبہ ہے۔

سفید گھڑیال مغربی جرمنی کا ایک

چڑیا گھر اسٹوٹگارٹ کا "ولہیلما" نامی چڑیا گھر ایک سفید گھڑیال کا مالک ہے۔ اس سے پہلے ایک دفعہ ایک سفید رنگ ایلگیٹر بھی کسی چڑیا خانے کی ملکیت رہ چکا ہے مگر سفید مگرمچھ اس سے پہلے کبھی دیکھنے سننے میں نہیں آیا۔ یہاں کے چڑیا گھر کو یہ نایاب جانور کسی ولندیزی تاجر حیوانات کے ذریعہ ۱۰ ہزار جرمن مارک میں ملا ہے۔ مگر ماہرینِ حیوانات اس کی اصل قدر و قیمت کا اندازہ اس سے ۵ گنا زیادہ لگاتے ہیں۔ اپنی نایابی کے علاوہ ایسے سفید رنگ کے جانور اپنے چندرے پن کی وجہ سے زیادہ عرصہ تک زندہ نہیں رہنے پاتے ہیں۔ اس بے نظیر مگرمچھ کو اسٹوٹگارٹ میں آنے سے پہلے اپنے اصلی وطن سیام میں چار پانچ سال کی عمر تک پہنچنے کا موقع ملا ہے تو اس کی وجہ غالباً اس سفید رنگی مگرمچھ کی غیر معمولی چستی، خونخواری اور تند مزاجی بھی جا سکتی ہے۔ (اطلاعات جرمنی)

اندھی اور بہری استانی

اٹلی کی ایک ۲۸ سالہ اندھی اور بہری عورت نے حال ہی میں اسکول کی استانی بننے کا امتحان پاس کیا ہے۔ اس کا نام پنوشیا مانتی ہے۔ وہ ابھی اٹھارہ مہینے کی تھی کہ گردن توڑ بخار کا حملہ ہوا، بے چاری کے تمام حواس خمسہ یعنی دیکھنے، سننے، چھونے، سونگھنے اور چکھنے کی حس جاتی رہی۔ علاج معالجہ دوا دارو کے بعد بس ایک چھونے کی حس دوبارہ لوٹ آئی۔

آٹھ سال کی عمر میں اسے ایک استانی سے ملنے کا موقع ملا۔ یہ اب ریٹائر ہو چکی تھی۔ اس استانی نے دو سال کی مشق کے بعد لڑکی کو بولنا سکھا دیا۔ یہ لڑکی بے حد ذہین نکلی اور اس نے انگریزی اور فرانسیسی زبانیں سیکھ لیں۔ ان زبانوں کے اونچے درجے کے امتحان پاس کرنے کے بعد اب اس نے استانی بننے کا امتحان پاس کیا ہے۔ اس کا ارادہ انگریزی اور فرانسیسی زبان کی کئی کتابیں اپنی زبان (اطالوی)

مہ تجربہ کرنے کا ہے۔ (دینا ناتھ گردھر)

خوشی غم میں بدل گئی

ابھی تھوڑے دنوں پہلے کی بات ہے ہندوستان کے مختلف علاقوں کے زیر تعلیم لڑکوں اور لڑکیوں کی دوڑ کا مقابلہ ہوا تھا۔ دہلی کی لڑکیوں کی ٹیم بھی شامل ہوئی تھی۔ یہ ٹیم مقابلے میں اول آئی۔ اس ٹیم کی ایک ممبر کماری راج وڈھیرا نے دوڑ میں ایک تمغہ بھی حاصل کیا۔ جب ٹیم کلکتے سے خوش خوش واپس آ رہی تھی تو دہلی اسٹیشن سے صرف چند میل کے فاصلے پر چلتی گاڑی سے یہ لڑکی اچانک نیچے گر گئی اور سخت زخمی ہوئی۔ اسے فوراً اسپتال لے جایا گیا جہاں اس کی موت واقع ہو گئی۔ اس طرح فتح کی خوشی ایک دم غم میں بدل گئی۔ ایک راج وڈھیرا کا گھر ہی ماتم کدہ نہیں بنا دہلی اسپورٹس کی دنیا میں غم و الم کی فضا چھا گئی۔ ۵ ستمبر کو دلی کے نیشنل اسٹیڈیم میں اسپورٹس کی مختلف شاخوں کے نمائندے جمع ہوئے اور ایک تعزیتی تجویز منظور کی۔ تجویز میں ایک خاص بات یہ تھی کہ ٹیم کے جن ممبروں نے چیمپین شپ میں حصّہ لیا تھا یہ فیصلہ کیا کہ ایک معقول رقم فراہم کی جائے اور اس سے مس وڈھیرا کی یاد میں ایک رننگ ٹرافی کا انتظام کیا جائے۔"

دہلی اولمپک ایسوسی ایشن کے ممبروں نے بھی ۱۲ ایلورڈ دی مارک میں جمع ہو کر اس جانباز کے غم میں ایک منٹ خاموش کھڑے ہو کر سوگ منایا۔ (دینا ناتھ گردھر)

عقاب شاہی کا نادر مظاہرہ

پچھلے دنوں "ووٹان" نامی اس عقاب شاہی نے میونخ کے ڈانٹے اسٹیڈیم میں ہزاروں تماشائیوں کے سامنے اپنے سوا دو گز لمبے پروں کے بل اڑ کر انھیں حیرت زدہ کر دیا تھا۔ جب وہ اپنے مالک اور استاد

دو دینک کو لنگر کے ہاتھ پر اتر آیا تو دوسرے باز اور شاہین اپنی خداداد صلاحیتوں کے جوہر دکھلانے لگے۔ وفاقی جمہوریہ جرمنی کے ان نایاب شکاری پرندوں کو بالکل معدوم ہو جانے سے بچانے کی خاطر ہر سال یہ مظاہرے منعقد کیے جاتے ہیں کیونکہ ان کا تحفظ اور پرورش کرنے والی انجمنوں کو مسلسل مالی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ چونکہ ایسے نایاب جانوروں کی قیمت دو ہزار جرمن مارک تک پہنچتی ہے اس لیے انھیں شاذ و نادر ہی باہر فروخت کرنے کا موقع ملتا ہے۔

تصویر سرورق پر دیکھیے۔ بشکریہ اطلاعات جرمنی)

دنیا کی سب سے اونچی کرین۔

ولہلمسہافن (ڈاڈ) خراب موسم میں اس کا ڈرائیور بادلوں سے باتیں کرتا ہے مگر اچھے موسم میں بھی اسکی کے لبغیر اپنے فرائض انجام نہیں دے سکتا۔ دنیا کی اس سب سے اونچی کرین کی بلندی ساٹھ میٹر سے کم نہیں یعنی اونچائی میں کسی ۲۰ منزلہ عمارت کے مساوی ہے۔ اسے وفاقی جمہوریہ جرمنی کے ایک ممتاز کارخانہ مشین سازی نے سویڈن کی بندرگاہ مالمو کے ایک جہاز ساز کارخانے کے لیے بنایا ہے۔ چونکہ اس کی پہنچ ۱۰۸ میٹر تک محیط ہے اس لیے یہ دیوہیکل کرین کارخانے کے ہال میں تیار ہونے والے ہر حصّۂ جہاز کو خواہ وہ کتنا ہی بھاری کیوں نہ ہو، یک مشت اٹھا کر گودی میں اتار سکتا ہے۔

(تصویر مقابل کے صفحہ پر دیکھیے۔ بشکریہ اطلاعات جرمنی)

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس دریا گنج دہلی میں باہتمام چھپوا کر جامعہ نگر دہلی سے شائع کیا۔

دنیا کی سب سے اونچی کرین (فوٹو اطلاعات جرمنی)

Regd. No. D. 1457. October, 1968.

PAYAM-I-TALEEM

New Delhi-25.

ذرا ان صاحب نے ہاتھی میاں کو دیکھنا! کل سوا دو فٹ کا قد ہے
[illegible] اکڑ کر [illegible] رہے ہیں! ٭ ——— بشکریہ اطلاعات چین

ہاتھوں میں کیمرہ منہ پہ تبسم (بلکہ قہقہہ) کیا کہیے ——— !

★ ——— فوٹو فضل الرحمن

جلد ۵
شمارہ ۱۱
پیامِ تعلیم
نومبر ۱۹۶۸ء
ایڈیٹر: محمد حسین حسّان ندوی
صدر دفتر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ـــــ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵
شاخ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ـــــ اردو بازار دہلی ۶
شاخ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ـــــ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳
شاخ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ـــــ شمشاد مارکیٹ علی گڑھ
قیمت فی پرچہ ۵۰ پیسے
سالانہ چندہ ۶ روپے

فہرست

ابھی ابھی دہلی شہر کے دو مڈل اسکولوں کے استادوں نے ہمیں ایک خوش خبری سنائی "آپ کے ستمبر اور اکتوبر کے پرچے بچوں میں غیر معمولی طور پر پسند کیے گئے"۔ ہمارے لیے یہ سچ مچ خوش خبری ہے جن کے لیے ہم اتنی محنت سے یہ گلدستہ سجاتے ہیں۔ انھیں یہ پسند آجائے تو جانیے محنت وصول ہو گئی۔ دلی سے باہر کے پیامیوں نے بھی اس سلسلے میں ہمیں بہت سے خط بھیجے ہیں۔

اس پرچے کو بھی دلچسپ بنانے کی ہم نے اپنی سی کوشش کی ہے۔ پہلے تو باپو پر محترمہ سیدہ فرحت کی شان دار نظم پڑھیے۔ پھر ایک تاریخی کہانی دو بہادر بھائی بہن۔ عادل جعفری صاحب نے زبیر پر پیاری سی نظم لکھ کر بھیجی ہے۔ اس میں ہمارے آپ کے بہت ہی محبوب رہنما چاچا نہرو کا ذکر ہے۔ دینا ناتھ گردھر نے اس مرتبہ سوئزرلینڈ کی ایک لوک کہانی کا ترجمہ مرحمت فرمایا ہے۔

اور پھر امین صاحب کے مضمون کی دوسری قسط راتھو پیا کی سرزمین سے، پڑھیے بہت دلچسپ ہے۔ ایک مزاحیہ نظم جانوروں کے آداب پڑھیے۔ اعجاز اختر صاحب نے جانوروں کی دُموں پر مزے دار مضمون لکھا ہے۔ مرزا سلمان کے مضمون کی دوسری قسط بھی پہلے کی طرح بہت دلچسپ اور معلوماتی ہے اسی طرح نیپال کا دوسرا حصہ بھی۔ کہانیوں میں عزیزہ شمسہ خضر کی کہانی بہت مزے کی ہے۔ کئی اور چھوٹی چھوٹی کہانیاں ہیں۔ سورج مکھی کا پھول، ایک ٹانگ کی بطخ وغیرہ۔

ڈاک کی گڑبڑ کی وجہ سے مجاہدین آزادی والا مضمون بالکل آخری وقت میں ملا۔ اب یہ دسمبر میں چھپے گا۔ عجیب و غریب چیز ہے۔ غور سے پڑھیے گا۔

پچھلے پرچے میں ہم نے سالنامے کی تیاری کا ذکر کیا تھا۔ اس سلسلے میں پیامیوں کے ان گنت خط ہمارے پاس آئے ہیں۔ ان خطوں سے اشتیاق بھی جھلکتا ہے اور طرح طرح کے سوالات بھی ہیں۔ ہم اپنے پیامیوں کو اپنے ہمدردوں اور ساتھیوں کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم پرچے کو دلچسپ اور مفید بنانے کی پوری کوشش کریں گے۔ اس میں مزے مزے کی کہانیاں بھی ہوں گی۔ تاریخی، جغرافیائی، سائنسی مضمون بھی ہوں گے۔ پیاری پیاری نظمیں ہوں گی اور دوسری دلچسپ چیزیں ہوں گی۔ بہت ہی دلچسپ۔

مگر ایک بات پھر دہرانا پڑتی ہے۔ ہم آپ کے سالنامے کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے دن رات ایک کر رہے ہیں آپ بھی ہمارا ہاتھ بٹائیے، ہماری مدد کیجیے۔ یہ مدد کیا ہے۔ نئے خریداروں کی فراہمی، پرانی کہاوت ہے "جتنا گڑ ڈالو گے اتنا ہی میٹھا ہو گا" تو بھی پرچے کے قدر دان یا خریدار جتنے زیادہ ہوں گے اتنا ہی یہ شان دار نکلے گا۔

یوں تو اس پورے سال میں خریداروں کے بڑھنے کا اوسط پچھلے سالوں سے اچھا رہا ہے۔ لیکن اپنے بازوؤں پر پر کھڑے ہونے کے لیے ابھی کافی جدوجہد کافی تگ و دو کرنی پڑے گی۔ ہم اپنے مخلص اور محترم ساتھی عادل جعفری صاحب کے بہت احسان مند ہیں بہت سے خریدار مرحمت فرما چکے ہیں، اور دو خریدار اس مہینے مرحمت فرمائے ہیں۔ تین خریدار جناب نعمان لطیف صاحب نے مرحمت فرمائے ہیں۔ نعمان صاحب اس سے پہلے بھی پیام تعلیم کے بہت سے خریدار بنا چکے ہیں۔

اس مہینے میں قلمی دوستی کے سلسلے میں ہمارے پاس بہت سے نام آئے ہیں۔ افسوس ہے کہ گنجائش کی کمی کی وجہ سے ہم اس کے لیے بس ایک ہی صفحہ دے سکتے ہیں۔ اب ہم نے طے کیا ہے کہ انھی پیامیوں کے نام شائع کیے جائیں جو کوپن بھر کر بھیجیں یا اپنا خریداری نمبر لکھ کر بھیجیں۔ کوپن اسی صفحے پر دیکھیے۔ یہ بات بھی ہم کئی بار بتا چکے ہیں کہ صرف ۱۶ سال تک کی عمر کے پیامی قلمی دوستی کے ممبر بن سکتے ہیں۔

اکتوبر کی آخری تاریخوں میں ہماری جامعہ میں تین دن تعلیمی میلا منایا جائے گا۔ یہ میلا ہر سال منایا جاتا ہے۔ یہ اپنے رنگ کا انوکھا ہوتا ہے۔ جامعہ کے تعلیمی ادارے پورے سال تک جو تعلیمی کام کرتے ہیں۔ ان کی نمائش کی جاتی ہے۔ ابتدائی اور ثانوی مدرسوں کی طرف سے نہرو ٹرافی اور گاندھی کے مقابلے ہوتے ہیں۔ سمپوزیم ہوتا ہے۔ بیت بازی ہوتی ہے۔ مباحثے ہوتے ہیں۔ عورتوں کے لیے بھی خاص پروگرام ہوتا ہے۔ رات کو ڈرامے ہوتے ہیں۔ غرض تین چار دن تک بڑی دلچسپی رہتی ہے۔ جامعہ کے بچے تو اس میلے کا بڑی بے چینی سے انتظار کرتے ہیں۔ بالکل عید کی طرح تفصیلی حال سالنامے میں پڑھیے گا۔

ذرا نیچے دیکھیے:-

ایک گول دائرہ سا بنا ہے۔ اس گول دائرے میں ایک سرخ نشان ہے۔ اس سرخ نشان کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی خریداری کی مدت اس مہینے ختم ہو رہی ہے۔

کچھ دنوں سے ہم نے پیام تعلیم کی خریداری کی مہم چلا رکھی ہے یہ مہم خدا کا شکر ہے کہ کامیابی سے چل رہی ہے پچھلے مہینے تو ہم نے آپ کی مدد اور سرپرستی کی بدولت ذرا زیادہ تیزی سے قدم بڑھایا۔ لگ بھگ دو ڈھائی سو پیامی آپ کی پیام تعلیم کی برادری میں شامل ہو گئے۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ بھی نہ صرف اپنی سرپرستی جاری رکھیں گے بلکہ اس برادری کو اور زیادہ آگے بڑھانے کی کوشش کریں گے۔ پیام تعلیم کے زیادہ سے زیادہ خریدار بنانے کی کوشش کریں گے۔

اس مہینے کی ۲۵ تاریخ تک مبلغ چھ روپے کا منی آرڈر بھیجیے اور ہاں منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیے
آپ کا خریداری نمبر .... ہے

"منیجر"

کوپن

نام۔ عمر۔ نمبر خریداری
مشغلہ ....
....
پورا پتہ ....
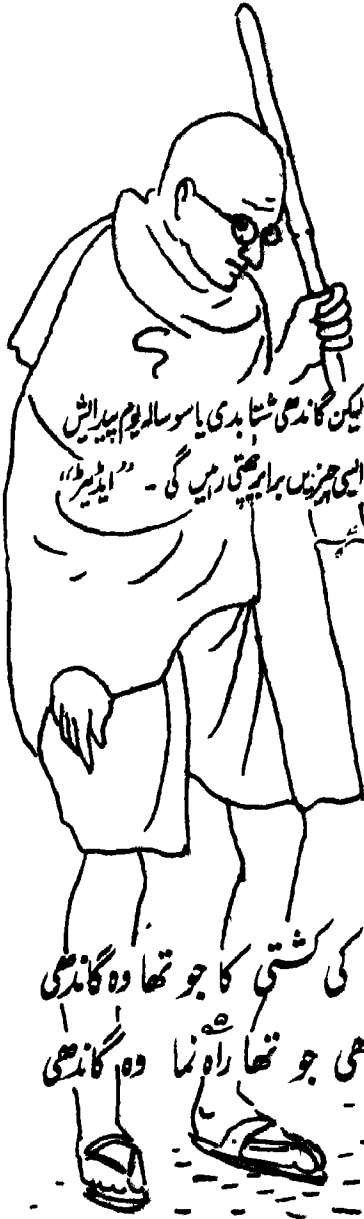
یہ نظم دیر میں ملی ۔ اکتوبر کا پرچہ پریس جا چکا تھا۔ لیکن گاندھی شتابدی یا سو سالہ یوم پیدائش کی تقریبوں کا سلسلہ تو پورے سال چلے گا۔ اور باپو کے بارے میں ایسی چیزیں برابر چھپتی رہیں گی ۔ "ایڈیٹر"

اس کو ہندو نہ کوئی اور مسلماں سمجھے
اس کی عظمت[1] کا تقاضا ہے کہ انسان سمجھے
کیوں نہ دے دل میں جگہ اپنی زمانہ اس کو
جو محبت کو سدا[2] حاصلِ[3] ایمان سمجھے

ناخدا دیش کی کشتی کا جو تھا وہ گاندھی
رہبروں کا بھی جو تھا راہ نما[4] وہ گاندھی

جو نہتا ہی لڑا علم کے ہتھیاروں سے
ہار مانی نہ کبھی جس نے ستم گاروں[5] سے
وہ اہنسا کا پیمبر وہ جیالا رہبر
کبھی طوفانوں سے کھیلا کبھی انگاروں سے

۱؎ برتری، بزرگی ۲؎ ہمیشہ ۳؎ ایمان کی بنیاد، اصل ایمان ۴؎ ٹھیک راستے پر جانے والا، راستہ دکھانے والا ۵؎ ظالموں سے

دیش کی کشتی کا جو تھا وہ گاندھی

رہبروں کا بھی جو تھا راہ نما وہ گاندھی

جس نے دکھ جھیلے سدا قوم و وطن کی خاطر

جان گنوائی ہے محبت کے چلن کی خاطر

چین سے بیٹھا نہ جو دل کی لگن کی خاطر

نا خدا دیش کی کشتی کا جو تھا وہ گاندھی

رہبروں کا بھی جو تھا راہ نما وہ گاندھی

ہر جگہ جس نے حقیقت کا پتہ پایا ہے

جلوۂ حق[1] جسے ہر شے میں نظر آیا ہے

عشق کا رازِ جنوں جس نے کہ سمجھایا ہے

جس سے بھارت نے عجب عز و شرف[2] پایا ہے

نا خدا دیش کی کشتی کا جو تھا وہ گاندھی

رہبروں کا بھی جو تھا راہ نما وہ گاندھی

شانتی دیس کا جیون نہ کبھی پائے گا

مسلک[3] امن و مساوات نہ اپنائے گا

چھوڑ کے نقشِ قدم راہ نما کا راہی

راہ[4] منزل کا کہیں کھوج نہیں پائے گا

نا خدا دیش کی کشتی کا جو تھا وہ گاندھی

رہبروں کا بھی جو تھا راہ نما وہ گاندھی

[1] حق کا دیا خدا کا جلوہ [2] عزت و سرفرازی

[3] امن اور انسان انسان میں برابری کا راستہ یا اصول [4] منزل کا راستہ

جناب مصطفےٰ رشید سیوہاروی

بہادر بھائی کی بہادر بہن

عرب کے مسلمان جب دشمنوں سے لڑنے جاتے تھے تو اپنی عورتوں کو بھی ساتھ لے جاتے تھے۔

عرب کی عورتیں بڑی بہادر، مضبوط اور نڈر ہوتی تھیں، مردوں کو لڑائی کے لیے آمادہ کرتیں اور ابھارتیں، اگر کوئی زخمی ہوجاتا تو مرہم پٹی کرتیں، پانی پلاتیں اور تسلی دیتیں، اور ضرورت کے وقت تلوار لے کر لڑائی میں حصہ لیتیں۔

لڑنے والے دن بھر لڑ کر رات کو اپنے خیموں میں آتے تو ان کی بیویاں، بہنیں بیٹیاں لڑنے والوں کی خوب تعریفیں کرتیں اور ان کا دل بڑھاتیں۔ عرب کی ان عورتوں میں خولہ بھی تھیں، خولہ بڑی بہادر عورت تھیں۔ ان کے بھائی بھی جن کا نام ضرار تھا، گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر سوار ہو کر برچھا چلانے اور تلوار کی لڑائی میں بڑے مشہور تھے۔

ایک دفعہ بہت سے رومیوں نے مل کر اور گھیر کر ضرار کو پکڑ لیا اور اپنے بادشاہ کے پاس لے گئے۔

مسلمانوں کو جب خبر لگی کہ ضرار کو رومیوں نے پکڑ لیا ہے تو تمام فوج میں جوش پیدا ہوگیا اور انھیں چھڑانے کے لیے بے قرار ہوگئے۔

حضرت خالد ابن ولید نے فوج کا یہ جوش دیکھا تو سب کو تسلی دی اور اپنے ساتھ بڑے بڑے بہادر جوانوں کو ساتھ لے کر ضرار کو چھڑانے چل دیئے۔

یہ نوجوان گھوڑے اڑائے جا رہے تھے کہ انھوں نے دیکھا ایک سوار ان سب سے آگے ہوا کی طرح گھوڑا اڑائے جا رہا ہے۔ یہ پورا کا پورا سیاہ چادر میں لپٹا ہوا تھا اور برچھا اس کے ہاتھ میں چمک رہا تھا۔ اس کا گھوڑا ایسا جھپٹا جا رہا تھا جیسے باز شکار پر جھپٹتا ہے۔ ان سب نے جو بڑے بڑے شہ سوار تھے ہر چند چاہا کہ اس کی برابر پہنچ جائیں مگر کوئی نہ پہنچ سکا اور مجبور ہو کر سوار کو قسم دی کہ وہ رک جائے۔

سوار رک کر کھڑا ہوگیا تو فوج والوں نے

پوچھا۔ اے بہادر تو کون ہے۔ مگر وہ بولا نہیں نہ اپنا
نقاب سرکایا کہ صورت دیکھ کر کوئی پہچان لیتا۔ اس کا چہرہ
چھپا ہوا تھا اور فقط آنکھیں چمک رہی تھیں۔ مسلمان فوج
میں کوئی اسے نہ پہچانتا تھا۔

سردار خالد ابن ولید نے کہا "اے بہادر میں
تجھے خدا کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کہ اپنا نام بتا دے
اور یہ بھی بتا دے کہ تو کس رجمنٹ کا سپاہی ہے۔"

سوار نے کہا "میں پردے کی بیٹھنے والی کیسے
بات کروں۔"

"اے سردار!! میں خولہ ہوں ضرار کی بہن۔
جب میں نے سنا کہ میرا پیارا بھائی دشمنوں کی قید میں ہے
تو میں نے قسم کھائی کہ اپنے بہادر بھائی کو چھڑا کر لاؤں
گی۔" حضرت خالد نے خولہ کو آفریں کہی اور کہا کہ
بیشک تم بہادر ہو۔ مگر تم فوج کے ساتھ چلو اور تنہا نہ جاؤ
ہم سب بھی بھائی ضرار کو قید سے چھڑانے جا رہے
ہیں۔ یہ میرا حکم ہے۔

خولہ نے سردار کے حکم کے سامنے گردن جھکا دی۔
مسلمانوں کی فوج آگے بڑھی تو کچھ ہی دور پر
رومیوں کا وہ لشکر مل گیا جو ضرار کو قید کئے لے جا رہا تھا۔
یہ لوگ گاتے بجاتے اور خوشی مناتے جا رہے
تھے۔ کیونکہ ضرار جیسا بہادر عرب ان کا قیدی تھا جس نے
سینکڑوں رومیوں کو لڑائیوں میں کاٹ کر رکھ دیا تھا۔
اس وقت ضرار عربی زبان میں یہ اشعار پڑھتے
چلے جا رہے تھے۔

کوئی میری ماں جائی بہن کو خبر کر دو
تیرا بھائی گرفتار ہو گیا ہے، دشمنوں کے
ہاتھ میں۔
جنھیں تیرے بھائی نے لڑائی میں شکار کیا تھا۔
میری ماں جائی بہن شیر کی طرح جھپٹ کر آئے گی۔
جب اسے اپنے بھائی کے قید کی خبر معلوم ہوگی۔
اَزْوَرْ کی بیٹی سے کہہ دو کہ تیرا بہادر بھائی
دشمنوں میں گھرا ہوا ہے۔
جس طرح پانی پر جمی ہوئی کائی ذرا سے اشارہ پر
پھٹ جاتی ہے۔ اے میری بہن!!
تیری آب دار تلوار دشمنوں کو کاٹ کر رکھ دے گی۔
کیونکہ تو بہادر بھائی کی بہادر بہن ہے۔
موت نہ تجھے ڈرا سکتی ہے نہ تیرے بھائی کو۔

مسلمانوں نے شیروں کی طرح حملہ کیا مگر خولہ ان
سب سے پہلے تلوار چمکاتی اپنے بھائی کے قریب پہنچ گئی۔
اور ان ہی نے اپنے بھائی ضرار کو چھڑایا اور جب سردار
خالد ابن ولید نے ان کا یہ کارنامہ دیکھا تو ان کی بڑی تحسین
کی اور مبارک باد دی۔

نومبر آگیا

مہینہ آگیا اک بار پھر نومبر کا
ہوا تھا جنم اسی ماہ میں جواہر کا
وہ جو کہ بس گیا ہر دل میں سب دماغوں میں
بڑھا گیا ہے نئی شمع اک چراغوں میں
خوشی سے مانتا ہے جس کو آج سارا جہاں
کہ اپنے وقت کا وہ تھا بڑا سیاست داں
ہمیں تھی اس سے محبت اسے بھی ہم سے تھی
ہمارے ملک کی عزت اسی کے دم سے تھی
ہمیشہ امن و اماں کا نعیم بن کے رہا
سدا وہ جنگ و جدل کا غنیم بن کے رہا
خدا کی شان' وہ سارے جہاں کا تھا رہبر
کہا گیا اسے امن و اماں کا پیغمبر
ہر ایک دل میں اترتی ہر ایک بات اس کی
بڑی عزیز بہت محترم تھی ذات اس کی
کشش کچھ ایسی کہ ہر اک کو رام کرتا تھا
اسے ادب سے زمانہ سلام کرتا تھا
خوشی سے بچوں پہ سب کچھ نثار کرتا تھا
وہ جان و دل سے انھیں خوب پیار کرتا تھا
دل و دماغ کے اعلیٰ صفات کا حامل
وہ اپنی ذات میں اک انجمن تھا لے عادل

جناب عادل جعفری

جناب دینا ناتھ گردھر

ضدی اور ہٹی آدمی

سوئزرلینڈ کی ایک لوک کہانی

آپ نے جغرافیہ کی کتابوں میں سوئزرلینڈ کا حال تو پڑھا ہوگا۔ یورپ کے براعظم میں چھوٹا سا مگر بڑا خوب صورت ملک ہے۔ یہاں اسی سوئزرلینڈ کی ایک لوک کہانی سنیئے:۔

اب سے بہت دنوں پہلے کی بات ہے کہ یہاں کے ایک پہاڑ پر ایک نوجوان اور خوبصورت چرواہا رہتا تھا۔ فرانکو نام تھا۔

ایک دن وہ گرمی کے سہانے موسم میں پہاڑ کے دامن میں اپنی گائیں چرا رہا تھا۔ اچانک اس کی ملاقات ایک خوب صورت پری سے ہوئی۔ پری کو دیکھتے ہی اس چرواہے کو اس سے محبت ہو گئی۔ اس نے پری سے شادی کی درخواست کی۔

پہلے تو پری نے اسے ٹالا بولی:۔ "میں بھلا تم سے شادی کیسے کر سکتی ہوں ہم پریوں کو انسان سے شادی کرنے کی اجازت نہیں ہے"

ایک تو فرانکو بہت خوب صورت تھا دوسرے اس نے کچھ اس انداز سے گڑگڑا گڑگڑا کر درخواست کی کہ آخر پری پسیج گئی۔ اس سے نرمی سے بولی۔

"خیر میں تم سے شادی کر سکتی ہوں۔ مگر ایک شرط ہے وعدہ کرو کہ تم مجھ سے کبھی خفا نہ ہوگے اور کبھی بھی مجھے گندی پری وغیرہ نہ کہو گے۔"

فرانکو نے خوشی خوشی یہ شرط مان لی۔ دونوں کا بیاہ ہو گیا۔ کئی سال تک دونوں ہنسی خوشی زندگی بسر کرتے رہے۔ تین بچے بھی ہوتے۔ پری سچ مچ بڑی اچھی بیوی ثابت ہوئی تھی۔ وہ اچھے اچھے مزے کے کھانے پکاتی اپنے لکڑی کے گھر کو خوب صاف ستھرا رکھتی۔ بچوں کی دیکھ بھال اچھی طرح کرتی۔

فرانکو دل ہی دل میں خوش تھا اور سمجھتا تھا کہ سوئزرلینڈ کا سب سے زیادہ خوش قسمت انسان اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہ میں ہوں۔

پر ایک دن کی بات سنیے :۔ شام کو فرانکو اپنے گھر سے دور پہاڑ پر کسی کام سے گیا ہوا تھا۔ بڑے زور کی آندھی آئی۔ فرانکو بھاگا بھاگا اپنے گھر آیا۔ اس کی بیوی تو آپ جانیے پری تھی پری۔ اسے پہلے ہی پتہ چل گیا کہ آندھی آنے والی ہے۔ اس نے دوسری سب پریوں کو بلایا اور ان کی مدد سے فرانکو کے کھیت کا سارا گیہوں کاٹ ڈالا اور پولے بنا کر ایک بہت بڑے درخت کے نیچے قرینے سے قطاروں میں لگا دیے۔ کھیت ابھی ہرا تھا اور گیہوں کچے تھے۔

جیسے ہی یہ کام ختم ہوا تھا کہ بڑے زور کی آندھی چلی سیب سیب جیسے اولے برسے اور کچھ ہی لمحوں میں سارے کا سارا علاقہ اجاڑ ہو گیا۔ ساری فصل تباہ ہو گئی

اتنے میں فرانکو بھی گھر آپہنچا۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کی بیوی نے سارا کچا کھیت کاٹ کر ایک طرف رکھ دیا ہے تو آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے غصے سے کہا۔

"گندی پری ! یہ تو نے کیا کیا ؟ کسی نے بن پکی اور ہری فصل بھی کاٹی ہے۔ آندھی اور اولوں سے کچھ فصل تو بچ جاتی۔ مگر تو نے کاٹ کر ساری کی ساری تباہ کر دی۔ تو واقعی گندی پری ہے"

جیسے ہی فرانکو نے یہ لفظ کہے ہوا میں ایک لمبی آہ اور درد بھری آواز سنائی دی اور دیکھتے دیکھتے اس کی بیوی غائب ہو گئی۔ لیکن اس کا غصہ کم نہ ہوا۔ اور وہ کہتے ہوئے پولوں کی طرف مڑا۔ "ارے" اس کی آنکھیں چندھیا گئیں اور پھر وہ یہ

دیکھ کر بے حد حیران ہوا کہ گیہوں کی ساری کی ساری بالیں پوری طرح پکی ہوئی اور پیلے سنہرے دانوں سے بھرپور تھیں جیسے انہیں سورج کی گرمی میں قدرتی طور پر پکایا گیا ہو۔

آپ سوچتے ہوں گے کہ اب فرانکو کو اپنی حرکت پر افسوس ہوا ہوگا اور بیوی سے اپنی بدسلوکی پر پچھتایا ہوگا نہیں بھئی وہ تو بڑا ہٹیلا اور ضدی تھا۔ اس نے بس اتنا کہا کہ سب ٹھیک، پھر بھی پری کو ایسا نہ کرنا چاہیے تھا کبھی کسی نے کچی فصل بھی کاٹی ہے۔"

وہ گھر واپس آیا۔ دیکھا کہ اس کے بچے اچھا اچھا کھانا کھا رہے ہیں مگر پری کا کہیں پتہ نہیں ہے۔ بچوں نے بتایا کہ ابھی ابھی ماں آئی تھیں یہ کھانا پکا کر پھر غائب ہوگئی ہیں اور جاتے جاتے یہ کہہ گئی ہیں کہ اگر آپ اپنے بُرے لفظوں کے لیے معافی مانگ لیں تو اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ "معافی! میں نے اپنی زندگی میں کسی سے معافی نہیں مانگی۔ نہ آئندہ ایسی حماقت کروں گا۔"

اگلے دن چکی پر اناج پسانے کے لیے گیا۔ تو چکی والے نے فخر سے بولا "اس سارے علاقہ میں صرف میرے پاس اناج ہے اور سب کی فصل تباہ ہوگئی ہے" چکی والے نے کہا "فرانکو! تم ڈبل بے وقوف ہو ایک تو تم نے ایسی اچھی بیوی پر غلط غصّہ کیا دوسرے اس سے معافی مانگنے سے انکار کرتے ہو۔ تم ایسی اچھی بیوی کے لائق نہیں ہو۔ جاؤ فوراً جاؤ اور اس کا نام لے کر کہو کہ مجھے اپنے رویّے پر بڑی ندامت ہے۔"

آٹا پسا کر فرانکو گھر لوٹا تو سارا گھر منی ہو گرد سے اٹا ہوا تھا۔ سب چیزیں اِدھر اُدھر بکھری پڑی تھیں۔ گھر بہت بُرا لگ رہا تھا۔ اس نے پری کا نام لے کر کہا کہ میں اپنے کیے پر نادم ہوں اور اس کے لیے معافی چاہتا ہوں۔"

— ہواؤں سے پری کی آواز آئی کہ "دروازے کے پیچھے سب سے پہلے جو چیز تم کو نظر آئے اسے تم چوم لو میں واپس آجاؤں گی۔"

فرانکو سوئی میں گیا تو کیا دیکھتا ہے کہ دروازے کے پیچھے ایک بہت بڑا سانپ پھنکار رہا ہے۔ چومنا تو ایک طرف فرانکو نے ایک لاٹھی بڑے زور سے سانپ پر ماری۔ مگر لاٹھی پڑنے سے پیشتر ہی سانپ غائب ہوگیا اب پھر ہواؤں سے پری کی آواز آئی۔

"اگر تمھارا پیار ایسا کچا ہے تو تم معافی کے بالکل قابل نہیں ہو۔ گھمنڈی اور ضدی انسان! اب میں تمھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ رہی ہوں" وہ ایک آہ بھر کر آسمان پر اپنی دوسری پریوں کے پاس چلی گئی۔ اور پھر کبھی فرانکو اور اس کے بچوں سے ملنے نہیں آئی

اِدھر اس کے ضدی خاوند فرانکو پر مصیبت کے بادل منڈلانے لگے۔ دن پر دن غریب اور کمزور ہوتا گیا۔ اور پھر کچھ دنوں بعد وہ اور اس کے بچے گھر گھر بھیک مانگ کر پیٹ پالتے۔

(فائنڈنگ آوٹ)

بدحواسی

ہمارے یہاں کچھ مہمان آگئے۔ سب لوگ کھا پی چکے تھے۔ امی نے کہا "بیٹا دوڑ کر منڈی سے سبزی لے آؤ جلائی کی دکان سے دودھ بھی لیتے آنا۔" میں نے سبزی خریدی اور گلاس آگے بڑھا دیا۔ اور کہا۔ اس جھولے میں ڈال دو۔ سبزی فروش حیران ہو کر بولا "یہ کیسا جھولا؟" اب جو میں نے نظر کی کھسیا کر رہ گیا۔ وہ تو میں گلاس آگے بڑھا رہا تھا۔ سبزی فروش ہنسنے لگا۔

(اقبال احمد کاکوروی)

جناب محمد امین ایم۔ اے

اتھوپیا کی سرزمین سے

عدیس ابابا میں

۲۴ نومبر ۱۹۶۰ء کا دن بھی کیا دن تھا۔ ہم ۸ بجے سے گھنٹے پہلے دہلی میں تھے اور اب عدیس ابابا یعنی ایتھوپیا کی راج دھانی میں براج رہے تھے۔ یہ علاؤالدین کے چراغ کا جادو نہیں تو کیا تھا۔

بولے (BOLE) کے ہوائی اڈے پر ہم نہایت اطمینان سے اترے۔ جہاز نے کوئی پینترا نہیں بدلا خاموشی سے لینڈنگ کی اور ہم لوگ منٹوں میں اتر کر لاونج میں آگئے۔

ہندوستانی استادوں کو خوش آمدید کہنے کے لیے وزارت تعلیم کے چند خاص افسر ہوائی اڈے پر آئے ہوئے تھے۔ ہمارے لیے گاڑیوں کا بھی انتظام تھا اور شاید وزارت تعلیم کے افسروں نے ٹھہرنے کے لیے ہوٹلوں کا بھی انتظام کر رکھا تھا۔ کسٹم کے دفتر میں پاسپورٹ، ویزا، میڈیکل سرٹیفکٹ اور سامان کی چیکنگ ہوئی۔

مجھ سے کہا گیا کہ اپنا سوٹ کیس کھول کر دکھاؤں اس میں ساڑیاں تو نہیں؟ ساڑیوں پر یہاں کچھ پابندی ہے یعنی اگر بیگم ساتھ سفر نہ کر رہی ہوں تو آپ ساڑیاں نہیں لا سکتے۔ ہاں اگر وہ ہوں تو کوئی مضایقہ نہیں دو، چار تک لا سکتے ہیں۔

میں تنہا تھا لیکن صاف ظاہر تھا کہ میں غیر شادی شدہ نہیں ہوں اس لیے کسٹم والے دیکھنا چاہتے تھے کہ میرے بکس میں کیا سامان ہے۔ میرے سوٹ کیس میں تالا لگا ہوا تھا۔ میں نے اسے کھولنے کی کوشش کی لیکن جو کنجی اس میں ڈالتا ہوں تو وہ جاتی ہی نہیں۔ پھر دوسری کنجی سے کھولنے کی کوشش لیکن اس سے بھی تالا نہ کھلا۔

اب مجھے بھی جھنجھلاہٹ کہ آخر یہ کنجی کام کیوں نہیں کرتی ہزار جتن کیے مگر تالا کھلنا تھا نہ کھلا۔

آخر کسٹم کا افسر بھی تنگ آگیا اور بغیر سامان دکھائے اس نے مجھے باہر جانے کی اجازت دے دی۔ باہر نکلتے وقت مجھے یہ خیال برابر رہا کہ کسٹم والے کہیں یہ نہ سوچتے ہوں کہ سوٹ کیس کا تالا نہ کھلنے میں کوئی میری چال تو نہیں۔

ایتھوپین ایرلائنس کی بس میں بیٹھ کر ہم لوگ شہر کی طرف چلے۔ میں نے چاروں طرف کے مناظر پر نظر ڈالی اندازہ ہوا کہ عدیس ابابا کے چاروں طرف پہاڑ ہیں اور یہ ایک گھاٹی یا وادی میں بسا ہوا ہے۔ یوکلپٹس کے ذخیروں کی افراط ہے اور سوانا لینڈ کی لمبی لمبی گھاس اگی ہوئی ہے۔ یہ ہرا بھرا ماحول دیکھ کر جی خوش ہوا اور پہلا اثر یہ پڑا کہ براعظم افریقہ کی زمین زرخیز

اور ماحول خوش گوار ہے۔

ایک کھلی ہوئی شاہراہ سے گزر کر ہم شہر میں داخل ہوئے۔ پیاسا (عدیس ابابا کا کناٹ پلیس) اور تھوک بازار کے درمیان کئی ہوٹل تھے۔ ان میں سے "بزابے" نام کے ہوٹل میں ہم لوگوں کے ٹھہرنے کا انتظام تھا۔ اس کی چار منزلیں تھیں اور گراؤنڈ فلور (نچلی منزل) پر بڑا سا ایک ریستوران تھا۔ جسے یہاں لوگ بار کہتے ہیں یا بنابیت (یعنی قہوہ گھر)

ہمارا کمرہ تیسری منزل پر تھا۔

میں اور خواجہ صفی احمد دہلی کے چند دوسرے دوستوں کے ساتھ سیڑھیوں سے اوپر چڑھنے لگے۔ ایک منزل، دو منزل اور پھر تیسری منزل پر پہنچ گئے۔

تیسری منزل پر جب میں اس کی گیلری میں سے ہوکر گزرا تو میرے جسم میں کچھ سنسنی سی محسوس ہوئی۔ میں ٹھیک سے سنبھل بھی نہیں پایا تھا کہ آنکھوں کے تلے اندھیرا چھانے لگا۔ خواجہ صاحب کچھ آگے بڑھ گئے تھے اور ٹھیک میرے پیچھے امرجیت سنگھ تھا۔ میں چاہتا تھا کہ کمرے میں پہنچ جاؤں لیکن آناً فاناً میری حالت ایسی دگرگوں ہوئی کہ دھڑام سے گیلری میں گر گیا آنکھوں کے سامنے بالکل اندھیرا اور ہوش گم

امرجیت سنگھ نے بڑھ کر سہارا دیا اور اٹھا کر مجھے کمرے میں لاکر مسہری پر لٹا دیا۔ پھر اس نے خواجہ صاحب کو خبر کی جو چوتھی منزل پر پہنچ چکے تھے۔

غرض چند منٹ غفلت میں پڑا رہا اور میرے دوست محو حیرت بنے دیکھتے رہے کہ آخر ایک دم یہ مجھ کو کیا ہو گیا۔ خدا کا شکر ہے کہ کوئی ایسی سنگین بات نہیں تھی بلکہ شاید بلندی کی وجہ سے یہاں آکسیجن کی کمی تھی اور میں ابھی نئے ماحول میں اپنے آپ کو ابھی ڈھال نہیں سکا تھا جغرافیے کی زبان میں اسے یوں سمجھیے کہ میں ابھی موسم اور یہاں کی آب و ہوا کا عادی نہیں ہوا تھا۔

سطح سمندر سے عدیس ابابا کی بلندی ۲۴۰۰ میٹر ہے یعنی ۸،۰۰۰ فٹ سے زیادہ۔ لیکن بلندی ہر جگہ یکساں نہیں کہیں ۹ ہزار فٹ اور کہیں ۶۶۰۰ فٹ۔ بہرحال ہمارے ملک میں جو پہاڑی مقامات ہیں جیسے شملہ، نینی تال، مسوری اور دارجلنگ وغیرہ اسی طرح عدیس ابابا بھی پہاڑی مقام ہے (اگرچہ وہ ۳۱ ڈگری شمالی عرض البلد سے ۲۷ ڈگری شمالی عرض البلد پر واقع ہیں اور عدیس ابابا ۹ ڈگری شمالی عرض البلد پر ہے اس لیے نومبر، دسمبر، جنوری اور فروری میں وہ زیادہ سرد ہیں اور وہاں خوب برف باری ہوتی ہے لیکن عدیس ابابا میں برف نہیں گرتی، بلکہ یہ اوٹی (اوٹاکمنڈ جو مدراس میں ایک پہاڑی مقام) سے زیادہ ملتا جلتا ہے اس لیے یہاں ہوا کی تہہ پتلی ہے اور آکسیجن کی کمی ہے۔ لیکن ایک فائدہ یہ ہے کہ آب و ہوا ٹھنڈی اور خوش گوار ہے۔ درجۂ حرارت میں زیادہ اتار چڑھاؤ نہیں۔ دھوپ خوب نکلتی ہے۔

ٹورسٹ (سیاح) کی کشش کے لیے اشتہار ہوتا ہے کہ یہاں تیرہ مہینے (ایتھوپین کلنڈر میں بارہ مہینے کے بجائے تیرہ مہینے ہوتے ہیں اگرچہ ایک مہینہ صرف پانچ یا چھ دن کا ہوتا ہے)، دھوپ نکلی رہتی ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ عدیس ابابا کے قرب و جوار میں جو دوسرے مقامات ہیں جیسے جھیل لنگانون، جھیل اواسا، سوڈرے اور آمبو یہاں جھیلوں اور گرم چشموں کے تیراکی کے تالابوں میں دھوپ اور پانی دونوں میں نہانے کا مزا آپ لے سکتے ہیں (تفصیل سے ان مقامات کا ذکر بعد کی قسطوں میں آئے گا)

عدیس ابابا کا محل وقوع دیکھ کر ایسا

لگتا ہے کہ یہ جنگل کے بیچ میں بسا ہوا ہے۔ چاروں طرف
یوکلپٹس کے درختوں کے جھنڈ ہیں اور جولائی، اگست اور
ستمبر میں چاروں طرف دور دور تک زمرد کے فرش کی ہریالی
چھائی رہتی ہے۔

عرض البلد اور طول البلد کے لحاظ سے عدیس ابابا
۹ ڈگری شمالی عرض البلد اور ۳۸ ڈگری مشرقی طول البلد
پر واقع ہے۔ اس طرح یہ بالکل منطقہ حارہ کے اندر ہے لیکن
بلندی کی وجہ سے درجہ حرارت ۲۳ ڈگری سینٹی گریڈ سے
آگے نہیں بڑھتا۔ دسمبر میں ۱۱ ڈگری تک گر جاتا ہے لیکن
اوسط درجہ حرارت ۱۶ ڈگری سینٹی گریڈ سے زیادہ نہیں۔
راتیں سرد ہوتی ہیں اور گرم کپڑے ضروری ہیں۔ دن میں دھوپ
نکلتی ہے اور سورج کی کرنیں تیز پڑتی ہیں۔ اس لیے دھوپ
والا چشمہ استعمال کرنا اچھا ہوتا ہے۔

یہ شہر بیسویں صدی کا شہر ہے۔ زیادہ سے زیادہ
۸۰ سال پرانا ہے اور اسے ان ٹوٹو کی پہاڑیوں کے
دامن میں شہنشاہ مینلک دوم نے بسایا تھا۔ عدیس ابابا کے
معنی ہیں "نیا پھول" اور سچ مچ یہ ہے بھی پھول ہی کی طرح
خوشنما۔ اس کی آبادی چھ لاکھ ہے۔ دہلی کے مقابلے میں ½
لیکن اس کی سطح کے نشیب و فراز، اس کے مناظر، اس کی
پہاڑیاں، اور سانپ کی طرح بل کھاتی سڑکیں نہایت عمدہ ہیں
ہوٹل ریستوران، سینما ہال، رات کو چلنے والے کلب، بازار
کی چہل پہل اور شور و غل کے درمیان پھیلے ہوئے ہیں۔ شہر
کی زینت ہیں اور مشرقی افریقہ کے سب سے بڑے شہر کی
رونق، زندگی اور جھلک کو پیش کرتے ہیں۔

ٹورسٹ (سیاح) کے یا سفارتی کے لیے عدیس
ابابا ایک دل کش جگہ ہے۔ اس کے علاوہ افریقہ
کے اتحاد کے ادارہ کا یہ مرکز اور افریقہ کے
بین الاقوامی اقتصادی کمیشن کا دفتر رواں ہے۔ بین الاقوامی
ہوائی اڈہ بھی ہے۔

ان سب باتوں کی وجہ سے یہاں ہوٹلوں کی بھرمار
ہے۔ اعلیٰ درجہ کے اور اوسط درجے کے ہر طرح کے ہوٹل موجود
ہیں۔ گیان ہوٹل، ایتھوپیا ہوٹل، راس ہوٹل، گیونت ہوٹل
اتیگے ہوٹل اور ریبی شبیلی ہوٹل معیاری ہوٹل ہیں۔ بڑا بے
ہوٹل، شوا ہوٹل، عمر خیام ہوٹل اور آلمہ ۶ ار ہوٹل اوسط
درجے کے ہیں۔ ریستوران بھی ایک سے ایک اچھے ہیں جیسے
چینی بار اور ریستوران، ہانگ کانگ ریستوراں، گولڈ ویگن
ریستوراں، عمر خیام ریستوراں، عدیس ابابا ریستوراں وغیرہ وغیرہ۔

شروع میں ایک دو دن ہم لوگوں کا جی گھبرایا لیکن جوں
جوں ہم شہر کے ماحول سے مانوس ہوتے گئے۔ ہمیں کئی جان
پہچان کے دوست ملتے گئے۔ یہ گھبراہٹ دھیرے دھیرے کم
ہوتی گئی۔ یہاں ہمیں علی گڑھ، لکھنؤ، دہلی اور پٹنہ کے احباب
ملے۔ ان لوگوں نے دعوتیں کھلائیں اور شہر کی زندگی کی تفصیلات
بتائیں۔ زیادہ تر لوگوں کی اپنی اپنی کاریں تھیں۔ وہ بڑے اطمینان
سے چلاتے تھے اور ہمیں بھی ہر وقت لفٹ دینے کو تیار
رہتے تھے۔

اس طرح دوستوں سے مل کر یہ اندازہ ہوا کہ غیر ملک
میں پہنچ کر اپنے (ملک) وطن اور اپنی جان پہچان کے لوگوں
کی قدر بڑھ جاتی ہے۔ مہمان نوازی، خاطر تواضع مروت
اور محبت ہر چیز میں ایک نیا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ انسان
میں حب الوطنی کا بالکل نیا تصور اور نیا جوش پیدا ہو جاتا ہے۔

ہوٹل میں گر جانے کی وجہ سے میرے منہ میں اور
دانت میں کچھ چوٹ آگئی تھی اس لیے تیسرے دن ہم لوگ
یونی ورسٹی کے قریب ہائیلے سلاسی اول نام کے بڑے
اسپتال میں گئے۔ وہاں میں نے دانت کے

ماہر ڈاکٹر کو اپنا دانت دکھایا اور اس کو اپنا تلخ تجربہ سنایا،
انھوں نے کہا "ہاں جو لوگ میدان میں رہتے ہیں وہ جب یک بیک
بلندی پر آتے ہیں تو ان کے اعضا نئے ماحول کے عادی
نہیں ہوتے اور آکسیجن کی کمی کی وجہ سے ان کے پھیپھڑوں
پر زور زیادہ پڑتا ہے۔ تمھارے ساتھ بھی اسی لیے یہ حادثہ
پیش آیا۔ جیسے مچھلی کو پانی سے باہر نکال کر پھینک دیا
گیا ہو لیکن اسی مچھلی کو دوبارہ کچھ پانی مل جائے تو وہ
زندہ بھی ہو جائے گی۔ تم ہوا کی جتنی موٹی تہہ، آکسیجن کی
جتنی بہتات کے عادی تھے عدیس ابابا میں وہ ماحول تم
کو نہیں ملا۔ اس لیے تمھارے پھیپھڑوں پر اور خون کی
روانی پر اثر پڑا۔ غرض دوا اور علاج کے متعلق کم باتیں
ہوئیں۔ زیادہ تر ماحول کی باتیں ہوتی رہیں۔

اس کے بعد ڈاکٹر نے کیپسولس دیئے جو کسی قدر
مہنگے تھے لیکن اصلی اور بہت ہی موثر۔ مجھے محسوس ہوا کہ
ہمارے ملک کے مقابلے میں دوائیں یہاں مہنگی ہیں اگرچہ
ان کے اثر میں بیّن فرق ہے۔

ہمارے یہاں ہر چیز میں یہاں تک کہ لوگ کہتے ہیں
کہ زہر میں بھی ملاوٹ ہے۔ لیکن عدیس ابابا میں ہر چیز خالص
اصلی اور نہایت اعلیٰ درجہ کی۔ چنانچہ تین چار کیپسول استعمال
کرتے ہی مجھے آرام ہو گیا۔

احتیاطاً میں نے ڈاکٹر سے ملاقات جاری رکھی اور
پھر اس سے اچھی خاصی دوستی ہو گئی۔ جب کبھی نرس ہم
سے پیسے مانگتی۔ ڈاکٹر اس سے کہتا نہیں یہ لوگ استماری
(استاد) ہیں اور یہاں ہمارے ملک میں ہمارے بچے اور
بچیوں کو پڑھانے کے لیے آئے ہیں۔ ہمیں ان کو خوش
آمدید کہنا چاہیے اور ان کا لحاظ رکھنا چاہیے۔
یہ الفاظ سن کر مجھے خوشی ہوئی اور

پھر بازار میں، پیاسا پر، بینک میں، وزارت تعلیم کے دفتر میں
جہاں بھی ہم جاتے ہر ایک کی زبان سے یہ سنتے "خوش آمدید
خوش آمدید" تو ڈاکٹر کی بات یاد آجاتی۔ یہاں عدیس ابابا
میں بلکہ سارے ایتھوپیا میں ہندوستانی استادوں کی قدر و
منزلت ہے اور سبھی لوگ بڑی [illegible]ت کرتے ہیں۔ بڑے
سے بڑے افسر بھی کہتے ہیں "سر تو ار دکم (خوش آمدید)"

عدیس ابابا میں ایک سب سے بڑی آسانی یہ ہے
کہ ٹیکسیاں بمبئی کی طرح افراط سے ہیں۔ بڑا بے ہوٹل سے جہاں
بھی جانا چاہو، کرایہ صرف ۲۵ سینٹ (ہمارے ملک کے
لحاظ سے ۷۵ پیسے) بسوں کا انتظام بھی نہایت اچھا اور
سلیقے کا ہے۔ اپنی آسانی اور پسند کے لحاظ سے جیسے چاہیے
سفر کیجیے اور جتنی دور بھی چاہیے جائیے۔ البتہ شام کو بھیڑ
بڑھ جاتی ہے اور ٹیکسی والے بھی موقع محل دیکھ کر کچھ کرایہ
زیادہ مانگتے ہیں۔

ایک دن ہم نے طے کیا کہ ای۔ ٹی۔ او (ایتھوپیا کا
ٹورسٹ کا ادارہ) چلیں گے۔ میں نے اور خواجہ صاحب نے
ایک پوری ٹیکسی بک کر لی۔ ڈرائیور صاف ستھرا، پڑھا لکھا اور
ہوشیار تھا۔ اس کی گاڑی بھی نئی تھی۔ چنانچہ ہم نے اسے
بتایا کہ ہم چند چیزیں دیکھنا چاہتے ہیں اور ہمیں عدیس ابابا سے
بڑی انسیت ہے۔ اس نے اپنی خدمات پیش کیں اور رہنمائی
کے لیے بھی تیار ہو گیا۔ ہم نے اس کی گاڑی میں بیٹھ کر ہاٹ
اسپرنگ دیکھا، میوزیم دیکھا، ہائیلے سلاسی تھیٹر دیکھا، افریقہ
ہال دیکھا، آرٹ اسکول دیکھا اور جغرافیہ کا اور نقشے بنانے
کا انسٹی ٹیوٹ دیکھا۔ غرض دن بھر ٹیکسی میں بیٹھے گھومتے
رہے اور کرایہ اس نے صرف پانچ ڈالر لیا۔

چوتھے دن مسٹر کنہیا لال ہتا ہندوستانی سفیر نے دس
بجے سفارت خانے میں چائے پر سب استادوں

کو مدعو کیا۔ انھوں نے اور سفارت خانے کے سارے اسٹاف نے ہمارا خیر مقدم کیا۔ مہتا صاحب نے مختصر سی تقریر کی اور ہندوستان اور ایتھوپیا کے درمیان دوستانہ تعلقات بڑھنے پر زور دیا۔

۲۹ر نومبر کو علی گڑھ کے ایک ڈاکٹر احسن سے ملاقات ہوئی۔ ان کی معرفت ولایت آغا صاحب اور سرکار عالم صاحب سے بھی ملے۔ ولایت آغا صاحب نے مزیدار دعوت کی اور کھانے کی میز پر کم و بیش سب سے خصوصاً ڈاکٹر احسن سے گھنٹوں باتیں ہوتی رہیں۔ ان کی عمر بمشکل تیس سال تھی لیکن ان کا تجربہ، ان کی معلومات، ان کا پڑھنے اور گھومنے کا شوق دیکھ کر جی خوش ہوا۔ میں اور خواجہ صاحب ان سے بہت متاثر ہوئے۔ انھوں نے اتنی کم عمر میں یورپ، امریکہ، ویسٹ انڈیز، اور جنوبی امریکہ کے کئی ملکوں کو چھان ڈالا ہے۔

۳۰ر نومبر کو ان سے ملنے کے لیے یونی ورسٹی گئے جہاں وہ شعبہ جغرافیہ میں لکچرار تھے۔ اتفاق سے ان سے ملاقات نہ ہو سکی لیکن ہم نے یونی ورسٹی کے ہر شعبے کو دیکھا۔

یونی ورسٹی سے باہر نکلے تو بیدیس کو دیکھا، پھر چڑیا خانہ دیکھا۔ اس کے بعد یونی ورسٹی کی سڑک پر ایک ریستوران میں جا کر چائے پی۔ اس بار بھی قہوہ گھر کی مالک ایک لڑکی تھی۔ جو ذہین، چالاک اور تجارت کے فن میں کمال رکھتی تھی۔ اس کا انگریزی کا تلفظ اور لب و لہجہ آئرش انداز کا تھا۔ وہ رہنے والی حرار (ایتھوپیا کا ایک مشرقی صوبہ) کی تھی۔ اس لیے اس کا ناک نقشہ اچھا خاصا تھا۔

(آگے کا دلچسپ حال آیندہ پرچے میں)

جناب طاہر فرحی

"جانوروں کے آداب"

پنچ لندن کا بہت پرانا اور مشہور مزاحیہ اخبار ہے نیچے اسی میں چھپی ہوئی نظم کا آزاد ترجمہ نظم کی شکل میں پڑھیے

کیا اونٹ اگر آجائے نظر تو مرغ پہلے آداب کرے ؟
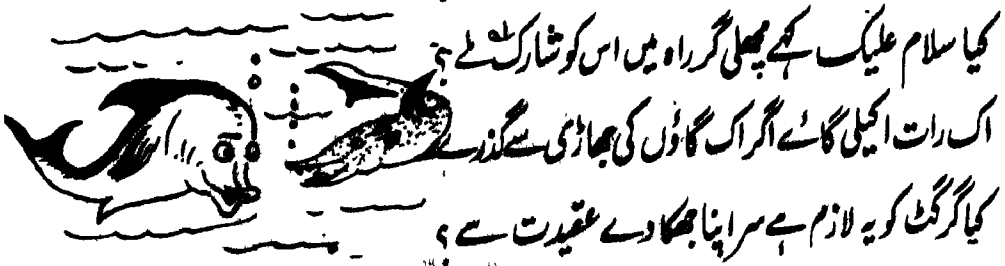
کیا سلام علیک کہے مچھلی گر راہ میں اس کو شارک[1] ملے ؟

اک رات اکیلی گائے اگر اک گاؤں کی جھاڑی سے گزرے

کیا گرگٹ کو یہ لازم ہے سر اپنا جھکا دے عقیدت سے ؟

کیا چاہیے ہر بط کے سر پر اک ہیٹ[2] ہو اچھا پیارا سا ؟

ہر کنکھجورا[3] دعوت میں گم بوٹ[4] پہن کر آئے کیا ؟

اور کیکڑا اک مدعو ہو کہیں اور مرض ہو اس کو سردی کا

کیا اس کو اجازت ہے پہنے اس دعوت میں مفلر اپنا ؟

---

[1] ایک قسم کی بڑی اور خونخوار مچھلی [2] انگریزی ٹوپی [3] کنکھجورا ، ایک کیڑا جس کا سارا جسم بالوں سے چھپا ہوتا ہے ۔
[4] برساتی جوتا جو گھٹنوں تک آتا ہے ۔

کیا گینڈے کو پروانگی؎ ہے پبلک باتھوں؎ میں نہانے کی ؟
کیا سپاہی کو بھی اجازت ہے پارٹی میں جلیبی کھانے کی ؟
گھوڑا کوئی دستک دے در پر اور منہ بھی نہ دھویا ہو اس نے
کیا بھول ہے یہ گھر والوں کی گر کوئی نہ دروازہ کھولے ؟

کیا جل پری کو یہ لایق ہے ہر مچھلی سے اپنا کھیل کرے ؟
باتیں کرے ریشم کا کیڑا جب چاہے پانی کے کیڑے سے ؟
خرگوش اور اک گلہری میں خوش گپیوں کا جب عالم ہو
تب چھیڑ دے بات اپنی دم کی کیا جائز ہے یہ گلہری کو ؟
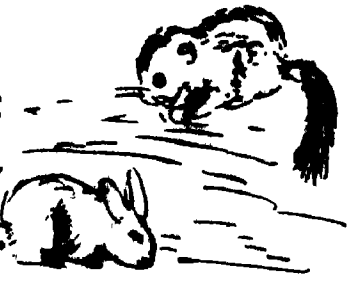
کیا بلبل چھوڑ کے گیت اپنے کوے کی ہجو میں شعر کہے ؟
کچھوے کو ستائے کیا چیتا دل اپنا بہلانے کے لیے ؟
کیا چرخ کو اچھا لگتا ہے قدرت کی ہر اک شے بٹ جائے ؟
اور چھوڑ کے ننھی ہرنی کو کیا بارہ سنگھا بھاگ چلے ؟
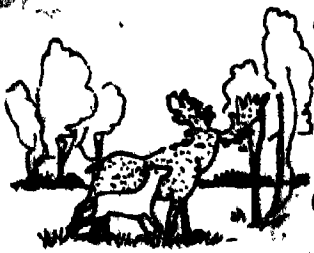
؎ اجازت ؎ وہ غسل خانے جو عام لوگوں کے نہانے کے لیے سرکار کی طرف سے بنوائے جاتے ہیں۔ ؎ بٹ جانا: ٹکڑے ہونا یا بانٹنا۔

اپنی دُموں کا کیا کریں؟

جناب اعجاز اختر

یہ بہت دنوں کی بات ہے۔ ایک بار تمام دم دار جانور ایک جگہ اکٹھا ہوئے۔ بھلا ان کی اس کانفرنس کا مقصد کیا تھا؟ اس بات پر بحث کرنا اور طے کرنا کہ تمام جانور اپنی دموں سے کیا کام کریں، انھیں کس طرح استعمال کریں!

سب سے پہلے گائے نے تقریر کی۔

"کبھی کبھی میری پیٹھ پر مکھیاں بیٹھتی ہیں تو مجھے بہت بُرا لگتا ہے۔ میرا فیصلہ ہے کہ میں اپنی دُم کو مکھیاں اُڑانے کے کام لاؤں گی۔"

"بالکل ٹھیک!" گھوڑے نے ہنہناتے ہوئے تائید کی "میں بھی ایسا ہی کروں گا۔ مجھے بھی مکھیاں ستاتی ہیں۔"

"میں اپنی دم ہلا کر یہ ظاہر کروں گا کہ میں
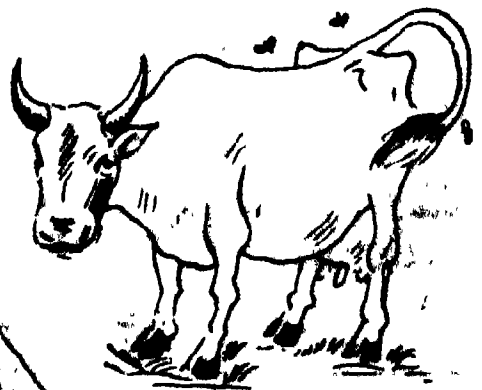
ں؟" کتے نے بھونکتے ہوئے اپنا خیال ظاہر کیا

ر یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ بلی اور کتا دونوں
ے کے دشمن ہیں پھر بھلا بلی کتے کی تائید میں اپنی
رح کیوں استعمال کرتی؟ میاؤں کرنے کے بعد
، اپنی دُم اس وقت ہلاؤں گی جب مجھے غصہ
ر پھر وہ غرّانے لگی۔

ر میں۔" بندر نے سوچتے ہوئے کہا "اپنی دُم
لٹک کر ایک شاخ سے دوسری شاخ تک کودوں
خوش تھا کیوں کہ اسے کودنے میں بڑا مزا آتا تھا

اب مور کی باری تھی۔ اس نے اپنی گردن موڑ کر
اپنی رنگ برنگی دُم کو دیکھا اور پھر فخر کے ساتھ بولا ——
"میں تو اپنی دم کے خوبصورت رنگوں کی نمائش
کے لیے اپنی دُم پھیلا دیا کروں گا۔"

"اور میں —— اپنی دُم کو چھوٹے سے سفید
جھنڈے کی طرح اس وقت لہرایا کروں گا جب مجھے کسی قسم کا
خطرہ نہ ہو ——" یہ خرگوش کا فیصلہ تھا۔

"میں اپنی دُم کو پانچویں ٹانگ کی طرح استعمال کروں
گا۔" ایک کونے سے کنگارو چیخ کر بولا۔ "یہ مجھے کودنے میں
مدد دے گی، اور کرسی بنا کر اس پر بیٹھا بھی کروں گا۔"

گلہری کو سردی بہت لگتی تھی اس لیے اس نے کہا —
"میں اپنی دُم کو اپنی پیٹھ گرم رکھنے کے لیے استعمال کروں گی،
بس دُم موڑ کر پیٹھ پر پھیلا دی اور بن گیا قدرتی کوٹ —"

"اور میں — مچھلی نے کہا" اپنی دم کو پتوار کی طرح
استعمال کروں گی۔ دُم ہلا ہلا کر پانی میں تیروں گی۔"

لیکن چھوٹا سا مینڈک کا بچہ — بے چارہ — اس کی
سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ دُم کو کس طرح استعمال کرے۔ اس لیے اس
نے اعلان کیا —

"میری نظر میں دُم کا مصرف کچھ نہیں ہے اس لیے جب
میں بڑا ہو کر مینڈک بنوں گا تو دُم سے چھٹکارا پالوں گا۔"
اور بس اس وقت سے تمام جانور اپنی دُم کانفرنس کے
فیصلے کے مطابق استعمال کرتے ہیں اور مینڈک کا بچہ بڑا ہو کر
دُم سے نجات حاصل کرلیتا ہے۔

(خیال انگریزی کا ہے)

لانا ضیاء النبی العباسی

انوکھا مزدور

اب سے سینکڑوں برس پہلے کی بات ہے۔
لیفہ ہارون رشید کے زمانے میں حضرت ابو عامر ایک مشہور
رگ گزرے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ ایک دفعہ میرے مکان
ل دیوار گر گئی۔ میں مزدور کی تلاش میں نکلا۔ اتفاق سے مزدور
ب جا چکے تھے۔

ایک نوجوان لڑکے کو دیکھا کہ اس کے ایک ہاتھ میں
را ہے، دوسرے ہاتھ میں پھاوڑا۔ میں نے پوچھا کہ کیا تم
ا گارے کا کام کر سکو گے؟

اس نے کہا جی ہاں! لیکن میری تین شرطیں
ہا۔ اول تو یہ کہ میری مزدوری میں کمی نہ کی جائے، دوسرے
ری طاقت سے زیادہ کام نہ لیا جائے۔ تیسرے نماز پڑھنے
لیے چھٹی دی جائے۔

میں نے اس کی تینوں شرطیں قبول کر لیں اور اس
اپنے ہمراہ لایا، کام بتا کر میں اپنی ضرورت سے چلا گیا۔
ت کو جب میں گھر واپس آیا تو دیکھا دوسروں کی بہ نسبت
گنا کام زیادہ کر رکھا ہے۔ میں نے اس کی مزدوری
ے دی، وہ اپنے گھر چلا گیا۔

اگلے روز میں پھر اس کی تلاش میں نکلا، دریافت
نے پر معلوم ہوا کہ وہ ہفتہ میں صرف ایک دن کام کرتا ہے۔
نے لوگوں سے معلوم کیا، کوئی آدمی اس کا گھر جانتا ہے؟
شخص نے پتہ دیا۔ میں ڈھونڈتا ہوا اس کے گھر پہنچا ملاقات
ہو گئی لیکن وہ بیمار تھا اور مٹی پر پڑا ہوا تھا۔

میں نے کہا: بھائی! تم تنہا ہو،
پردیس میں ہو۔ بیمار بھی، اگر ہمارے گھر چلو تو اچھا ہے۔
اس نے انکار کیا، میں اصرار کرتا رہا۔ لیکن وہ کسی طرح راضی
نہ ہو رہا تھا۔

آخر کار میرے انتہائی اصرار پر اس نے کہا
کہ میں ایک شرط پر چل سکتا ہوں، اور وہ یہ کہ تم مجھ کو کھانے
کے لیے کوئی چیز نہ دو گے۔ میں نے شرط مان لی اور اسے
اپنے گھر لے آیا۔

میرے گھر وہ تین روز رہا، اس درمیان میں
اس نے کچھ نہ کھایا اور نہ کچھ مانگا۔ جب چوتھا دن ہوا تو
مرض بڑھ گیا اور مجھ کو آواز دی اور کہا کہ بھائی اب میرا
وقت آگیا ہے۔ جب میرا کام تمام ہو جائے تو میری وصیت
کے موافق کرنا، اور وہ وصیت یہ ہے کہ میری گردن میں ایک
رسی باندھنا اور گھر کے چاروں طرف میری لاش کو کھینچے کھینچے
پھرنا اور کہنا کہ یہ سزا ہے اس کی جو اپنے پروردگار کی نافرمانی
کرتا ہے، شاید اللہ تعالیٰ کو رحم آجائے اور مجھ کو بخش دیں۔
اور جب غسل دے چکو تو مجھ کو فقط میرے اسی کپڑے کا کفن
دینا اور دفن کر دینا، پھر امیر المومنین ہارون الرشید کے پاس
بغداد جانا اور ان کو میری یہ انگوٹھی اور قرآن شریف دے
دینا اور کہہ دینا کہ اس انگوٹھی اور قرآن شریف کا دینے والا
انتقال کر چکا ہے اور آپ کو سلام کہہ گیا ہے اور یہ بھی کہہ
گیا ہے کہ آپ اللہ سے ڈرتے رہیے، ایسا نہ ہو کہ اسی
غفلت اور نشے میں موت آجائے، پھر موت کے بعد
شرمندگی سے فائدہ نہ ہوگا۔

ابو عامرؒ فرماتے ہیں کہ اس وصیت کے بعد اس
کا انتقال ہوگیا۔ کچھ دیر تو میں روتا رہا۔ اور افسوس کرتا رہا
پھر میں رسی لایا اور اس کی گردن میں باندھی تاکہ اس کی وصیت
پوری کروں کہ یکایک گھر کے ایک کونے سے آواز آئی ایسا
نہ کرو، ہمارے دوستوں کے ساتھ ایسا نہیں کیا جاتا۔ یہ سنتے
ہی میں کانپ گیا اور اس کے پیروں کو بوسہ دیا، اس کے بعد
تجہیز و تکفین کرکے دفن کردیا۔

پھر اس کی وصیت کے مطابق انگوٹھی اور قرآن
مجید لے کر میں امیر المومنین کے یہاں پہنچا لیکن وہ خود موجود
نہ تھے، میں نے پورا قصہ لکھا اور درباریوں کو دیا کہ وہ ان
تک پہنچا دیں۔ لیکن کسی نے بھی میری نہ سنی اور مجھے الگ
کردیا۔

اتنے میں بادشاہ ہارون الرشید کی سواری آتی
نظر آئی، میں لپک کر پاس پہنچ گیا، امیر المومنین نے کہا جو
شکایت تم کو تھی راستہ ہی میں مجھ سے کہہ دینا تھا۔ میں نے
عرض کیا کہ امیر المومنین مجھ کو کوئی شکایت نہیں ہے، میں آپ
کے پاس ایک پیام لے کر آیا ہوں۔ فرمایا کیا بات ہے؟
میں نے قرآن شریف اور انگوٹھی نکالی اور سامنے رکھ دی
پوچھا یہ تم کو کس نے دی ہے؟ میں نے کہا ایک مزدور نے۔
بادشاہ نے حیرت سے پوچھا، مزدور نے؟ اور رو پڑا، پھر
کہا وہ مزدور کہاں ہے؟ میں نے کہا اللہ تعالیٰ امیر المومنین
کو اچھا رکھے، مزدور کا تو انتقال ہوچکا ہے، بادشاہ یہ سنتے
ہی بے ہوش ہوگیا اور ایک عرصہ تک بے ہوش رہا۔ میں
حیران تھا اور سوچ میں تھا کہ یہ قصہ کیا ہے؟ جب ہوش آیا
تو اس نے پوچھا، تم اس کے انتقال کے وقت کیا موجود
تھے؟ میں نے عرض کیا جی ہاں۔ فرمایا اس نے کیا
وصیت کی؟ میں نے اس کی وصیت بادشاہ
سے کہہ دی۔ وہ سن کر بے قرار ہو ہو کر روتا جاتا تھا جب کچھ
سکون ہوا تو مجھ سے کہا کہ آج رات کو چلو اس کی قبر دیکھ آئیں
رات کے وقت میں آگے آگے چلا اور وہ پیچھے پیچھے۔ قبرستان
پہنچ کر جب میں نے قبر بتائی تو وہ بے قرار ہوکر قبر سے لپٹ گیا
اور دیر تک روتا رہا، پھر اٹھا اور کہا کہ یہ میرا لخت جگر میرا
بیٹا تھا۔ ایک دن یہ شراب کی مجلس گرم کیے ہوئے تھا، چاروں
طرف گانے بجانے والیاں جمع تھیں، دوست احباب ہنسی مذاق
میں مصروف تھے کہ یکایک مکتب میں سے ایک بچے کے پڑھنے کی
آواز آئی۔

أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا
أَنْ تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ
لِذِكْرِ اللَّهِ۔

(کیا مسلمانوں کے لیے وہ وقت نہیں آیا کہ
ان کے دل اللہ کی یاد کے لیے جھک جائیں)

اس نے سنا تو اللہ تعالیٰ کی ہیبت اور جلال سے
کانپ اٹھا، آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، اور یہ کہتا ہوا اٹھ
کھڑا ہوا۔ ہاں ہاں آگیا۔ بے شک وہ وقت آگیا اور محل
سے نکل گیا۔ پھر مجھے آج تک اس کی کوئی خبر نہ ملی تھی۔

(ہفتہ روزہ الجمعۃ کے
شکریے کے ساتھ)

جناب مرزا سلمان

بھاکڑہ ننگل

جگنو کے دماغ میں اتنا سب سن لینے کے بعد کچھ اور سوال کُلبلانے لگے، بولے "بھائی جان! یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ دریا تو ہر دم بہتا رہتا ہوگا۔ پھر آخر اس پر اتنا بڑا بند کیسے بنا کر کھڑا کر دیا گیا۔ بنانے میں سب بہہ نہیں جاتا ہوگا؟"

"ہاں بھئی یہ مشکل تو ہوتی ہے اور یہی کیا۔ ایسے نہ جانے کتنے مسئلے اتنا بڑا کام کرنے میں پیدا ہوتے ہیں"! بھائی جان نے کہا۔ "لیکن انسان کی عقل ہی کیا جو ان کو حل کرنے کی ترکیب نہ نکال لے؟"
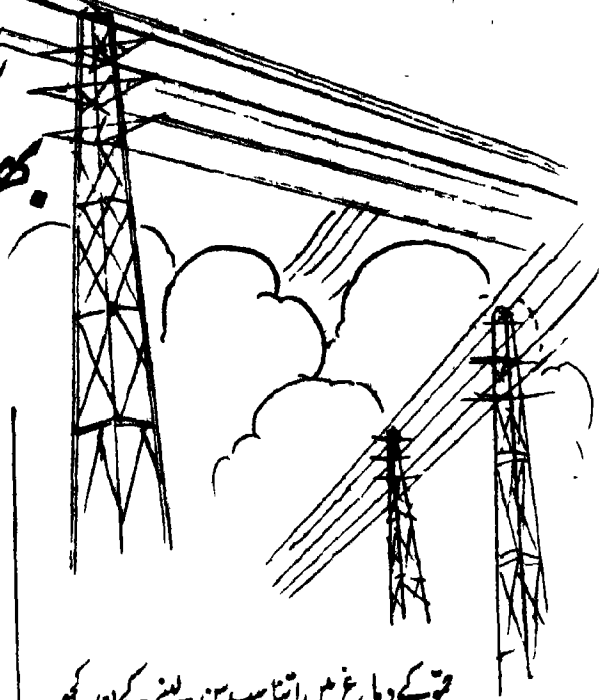
"اب جیسے یہی بھاکڑہ کا بند ہے۔ جب اسے بنانا ہوا تو سب سے پہلے جس جگہ بند بنانا تھا۔ اس کے دونوں طرف سے پہاڑوں کو کھود کر دو بڑے بڑے نالے بنائے گئے۔ یوں سمجھو کہ پچاس پچاس فٹ قطر کی دو سرنگیں تھیں جو دائیں اور بائیں تھے کے پہاڑ کو کاٹ کر بنائی گئیں۔ دریا کا پانی تمام کا تمام ان سرنگوں پر سے بہاکر پہاڑیوں کے اس طرف سے اُس طرف لے جایا گیا اور اس طرح جس جگہ بند بنانا تھا وہاں سے پانی بہنا بند ہوگیا

"ان سرنگوں میں خوب مضبوط اور موٹی پلاسٹر کی تہہ لگا دی گئی تاکہ پانی رس کر ادھر اُدھر نہ چلا جائے۔ کہیں کہیں تو یہ پلاسٹر چھ چھ فٹ موٹا تھا۔ یہ سرنگیں جہاں بند بنا تھا اس سے کچھ پہلے سے شروع ہو کر اس کے دوسری طرف تک چلی گئی تھیں اور اس طرح تقریباً آدھے میل لمبی تھیں

"اس کے علاوہ اصل بند کی جگہ سے ذرا پہلے ایک عارضی سا بند باندھ دیا کہ وہ جگہ اور محفوظ ہو جائے ۴۸ء سے ۵۳ء تک تو یہ عارضی بند اور سرنگیں ہی بنتی رہیں اور کوئی چار کروڑ روپیہ ان ہی پر خرچ ہوگیا تھا"

"پھر جب جگہ سوکھی مل گئی تو بند کی دیوار کی بنیاد کھدنی شروع ہوئی۔ تم جانو اتنی لمبی چوڑی موٹی اور اونچی دیوار اس کی بنیاد بھی کیسی زبردست ہوگی۔ بارود سے اُڑا اُڑا کر پتھریلی زمین کھودی جاتی تھی، بڑے بڑے بجلی کے اور مشینی بیلچے ملبہ کو اٹھا کر گاڑیوں میں بھرتے تھے جو اسے میل ڈیڑھ میل دور مناسب جگہ پھینک آتی تھیں"

"یہ بنیاد ۲۲۰ فٹ گہری ہے یعنی اس کے

اگر قطب مینار کو کھڑا کر دیا جاتا تو بس ۱۰ فٹ زمین سے اوپر نکلا رہتا۔ لگ بھگ ڈھائی سال اس بنیاد کی کھدائی میں لگ گئے۔ اس کے بعد سیمنٹ، روڑی اور لوہے کا یہ پہاڑ جیسا بند بننا شروع ہوا۔ بڑے بڑے کام مشینوں ہی کے ذریعہ ہوتے تھے۔ پھر بھی بارہ ہزار سے زیادہ آدمی کام میں لگے رہتے تھے۔ ۱۹۶۳ء میں جاکر اس کا کام ختم ہوا۔"

"کتنا زبردست کام تھا اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ جتنا سیمنٹ اور روڑی اس میں لگا۔ اس سے پوری دنیا کے گرد ایک آٹھ فٹ چوڑی سڑک بن سکتی ہے۔ یا تم لوگوں نے دنیا کے عجائبات میں مصر کے اہرام کا نام سنا ہوگا۔ اگر ان آٹھوں اہراموں کو ملا لیا جائے تب بھی وہ اس بند کے صرف ایک تہائی کے برابر ہوں گے۔"

جب بند بن کر تیار ہوگیا تو بازو کی جو سرنگیں پانی کی نکاسی کے لیے بنی تھیں ان کو بند کر دیا گیا۔ پانی پھر اپنے پرانے راستے پر چھوڑ دیا گیا جس پر یہ دیو پیکر بند اپنا سینہ تانے کھڑا تھا...... انجینیروں کے اشارے پر صرف جتنے پانی کی ضرورت ہوتی ہے جانے دیتا ہے باقی کو گوبند ساگر میں جمع کرتا جاتا ہے۔

پر اتنا سب کچھ کر لینے پر بھی انجینروں کی ذمہ داری ختم نہیں ہوجاتی۔ آٹھ لاکھ ٹن سیمنٹ اور ایک لاکھ ٹن لوہے اور ۶۹ کروڑ روپے کی لاگت سے بنے ہوئے اس بند اور ۵۴ کروڑ کے بجلی گھروں کی دیکھ ریکھ کا بھی بڑا خیال رکھنا پڑتا ہے۔

خدانخواستہ اگر یہ بند ٹوٹ جائے تو لاگت کے نقصان کے علاوہ پنجاب اور راجستھان میں وہ قیامت خیز سیلاب آجائے گا کہ لاکھوں انسانوں کی جان پر بن آئے گی اور پانی کا تو یہ ہے کہ اسے ایک ذرا سا سوراخ پہاڑوں میں بھی مل جائے تو اسے بڑھا کر درہ بنا دے۔ انسانوں کے بنائے ہوئے اس بند کی تو حیثیت ہی کیا ہے۔ سینکڑوں فٹ گہرے پانی کے دباؤ تلے اگر بند کی دیوار ذرا سی ٹوٹ جائے تو اس کا پتہ کیسے چلے گا؟

"پہلے یہ ذرا سا گڑھا ہوگا۔ پھر دھیرے دھیرے بڑھتے بڑھتے بند کی دیوار میں آر پار ایک سوراخ ہوجائے گا اور اس سے پانی رسنے لگے گا۔ تب کہیں جاکر پتہ لگے گا کہ ارے بند میں شگاف ہو رہا ہے اور پھر تو آن کی آن میں یہ ذرا سا سوراخ بڑھ کر اتنا بڑا ہوجائے گا کہ روکے نہیں رکے گا۔"

"اور اگر بالفرض وقت کے وقت کچھ کرنا چاہیں تو اتنے اونچے بند پر چڑھ کر بہتے پانی کے خلاف کچھ کرنا آسان ہوگا؟ اور پھر تو یہ روزن بڑھتے بڑھتے پورے بند کو ڈھا کر ہی دم لے گا۔"

"اسی لیے ایسے بند کی دیوار کبھی بالکل ٹھوس نہیں بناتے ہیں۔ بلکہ اس کے اندر اوپر نیچے بہت سی سرنگیں بنا دیتے ہیں جن کو معائنہ کی گلیاں کہتے ہیں۔ یوں سمجھو بند کی دیوار کے اندر گھس کر ٹوٹ پھوٹ کی دیکھ بھال ہوتی رہتی ہے۔"

پانی جب کبھی رسنا شروع ہوتا ہے تو پہلے ان گلیوں میں سے کسی میں آتا ہے اور ان گلیوں میں ہر دم پہرہ لگا رہتا ہے۔ اور ٹوٹ پھوٹ کی مرمت کا فوری انتظام ہوتا ہے۔ مشینیں ہوتی ہیں جو سیمنٹ کے مسالے کو نہایت طاقت سے پھینکتی ہیں بالکل ایسے جیسے پچکاری سے پانی نکلتا ہے۔ بس جہاں ذرا سا پانی رستا دیکھا مسالے کی زوردار پچکاری ماری اور درز وہیں کی وہیں بند ہوگئی۔"

شکو میاں کی شاید کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ دیوار کے اندر گلیاں کیسی ہوتی ہیں۔ بھائی جان نے ان کی سوالیہ نگاہوں کی طرف دیکھا اور پنسل سے کاغذ پر یہ

تصویر بناوی۔
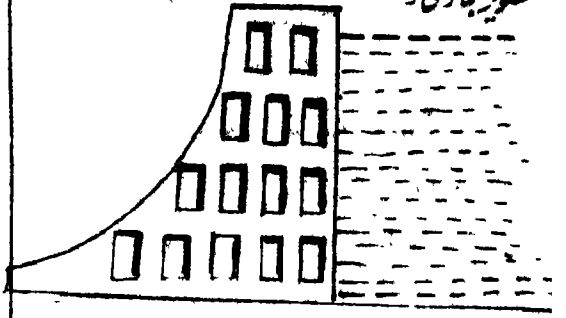
اور کہا "ہم نے بتایا نا کہ ایک سرے سے کھڑے ہو کر بند کی دیوار کو دیکھیں تو کیسی لگتی ہے۔ اب اگر اس میں گلیاں بھی بنی ہوں تو ایسی لگے گی۔ ان گلیوں میں گھومو تو اتنا سہانا لگتا ہے کہ کیا بتایا جائے۔ روشن جگمگاتی زمین دوز سرنگیں ٹھنڈی اتنی رہتی ہیں گویا برف خانے میں آگئے ہیں۔"

سلمیٰ نے کہا "ہے کتنا اچھا لگتا ہوگا!"

اور جمو بولے "بھائی جان! اتنی انوکھی باتیں لوگوں کی عقل میں آ کہاں سے جاتی ہیں؟"

بھائی جان مسکرائے اور بولے "میاں اللہ نے انسان کو عقل دی ہے، اسے استعمال کرے، پڑھے لکھے، جانکاری حاصل کرے تو سب کچھ آسان ہو جاتا ہے۔"

جمو کا شاید باتیں سنتے سنتے ابھی جی نہیں بھرا تھا اور ابھی کچھ اور سوال ان کے ذہن میں کلبلا رہے تھے۔ پوچھنے لگے۔ "اچھا یہ تو بتائیے کیا بھاکڑہ سے سنچائی کے لیے پھر نہریں بنائی گئی ہیں؟"

بھائی جان نے کہا "نہیں بھئی بھاکڑہ کا بند تو صرف گوبند ساگر میں پانی جمع کرنے کے لیے ہے۔ سنچائی کے لیے تو ننگل کا بند ۱۹۶۳ء میں ہی بن کر تیار ہو گیا تھا اور اس سے نہر بھی نکال لی گئی تھی۔ ستلج دریا کے ساتھ ساتھ چلتے رہیے تو بھاکڑہ سے کوئی آٹھ میل دور آ کر یہ ایک ہزار فٹ لمبا اور ۹۵ فٹ اونچا بند بنا ہوا ہے۔ اس کا کام ہے کہ پانی کو روک کر اس کا رخ سنچائی کی نہر کی طرف موڑ دے۔"

"اس کے بائیں طرف سے ایک ۴۰ میل لمبی پکی نہر نکالی گئی ہے۔ آگے جا کر اس سے بہت سی شاخیں پھوٹی ہیں۔ جو پنجاب اور راجستھان میں جال کی طرح پھیلی ہوئی ہیں۔ ان سب نہروں کی لمبائی ملا کر تقریباً تین ہزار میل ہو جاتی ہے۔ دنیا میں سنچائی کے لیے اتنا لمبا نہروں کا جال کسی اور ملک میں نہیں ہے۔"

"ننگل سے نکالی ہوئی اس نہر پر بھی دو چھوٹے چھوٹے بجلی گھر گنگول اور کوٹلہ کے مقام پر بنے ہوئے ہیں اور یہ بھاکڑہ کی تعمیر کے وقت بھی کام کرتے تھے۔ بھاکڑہ بنتے وقت اس کی بجلی کی ضرورت یہی بجلی گھر پوری کرتے تھے۔"

بھائی جان رکے اور پھر جیسے کچھ اور یاد آ گیا ہو بولے۔ "ہاں بھئی ایک بہت مزے کی بات تو بتانا بھول ہی گیا۔ یہ جو مضبوط قسم کی لکڑیاں جو عمارتوں وغیرہ میں استعمال ہوتی ہیں۔ زیادہ تر پہاڑوں پر پیدا ہوتی ہیں۔ وہاں کے جنگل کاٹ کر ان کی لکڑی نیچے میدانوں تک پہنچانے کے لیے ان کو بہتے ہوئے دریاؤں میں ڈال دیتے ہیں۔ نیچے پہنچ کر ان کو دریاؤں سے نکال لیتے ہیں۔ ستلج سے بھی یہ کام لیا جاتا ہے۔ چنانچہ گوبند ساگر پر لکڑی کے لٹھوں کو روکنے کے لیے ایک روک بنا دی گئی ہے اور پھر پانی کے اوپر رسیوں کا لٹکتا ہوا ایک سوا پانچ میل لمبا راستہ بنایا گیا ہے۔ روک پر سے لکڑیاں اٹھا اٹھا کر اس راستے کے ذریعہ کنارے تک پہنچا دیتے ہیں۔ رسیوں کا اتنا لمبا راستہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔" اور دونوں بھائی شاید اسی کے منتظر بیٹھے تھے۔ پیچھے پڑ گئے کہ آپ ہم کو بھاکڑہ لے چلیں گے۔" اور آخر کار بھائی جان کو وعدہ کرتے ہی بن

- بڑی -

جناب شفق سہسرامی
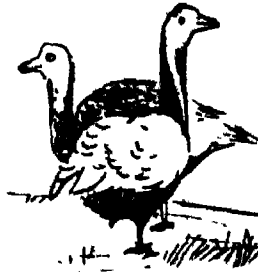
ایک ٹانگ کی بطخ

اچانک شہر سے آنے والی بس رکی اس میں سے بائیس برس کا ایک نوجوان اترا۔ پہلے تو گاؤں کے لوگوں نے اس کی طرف دھیان نہیں دیا۔ جب وہ اپنے گھر کے دروازے پر رکا تو لوگوں کی نظریں ٹھہر گئیں۔

یہ ہنگی رام ہے ۔۔۔۔۔؟ ماں نے دیکھا تو اس سے لپٹ کر بے اختیار رونے لگی۔ گاؤں میں شور مچ گیا۔

"ہنگی رام آگیا" "ہنگی رام آگیا"

اب سے کوئی دس برس پہلے یہ اسی طرح اچانک غائب ہو گیا تھا۔ بہت نٹ کھٹ تھا، پڑھنے لکھنے سے ذرا دلچسپی نہ تھی۔ ہر وقت شرارت میں دھیان رہتا تھا۔ پورا گاؤں اس کی شرارتوں سے تنگ آگیا تھا۔ ماں باپ الگ پریشان تھے۔ ایک دن اپنے استاد سے گستاخی کر بیٹھا۔ باپ کو خبر ہوئی تو اتنی سخت سزا دی کہ گھر سے بھاگ نکلا۔ اس وقت گاؤں والوں نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔ بس ایک ماں تھی جسے بیٹے کی جدائی کا غم تھا۔ پر اب لوگ ہنگی رام کی شرارتیں بھول چکے تھے۔ سب اس کے باپ کو مبارک باد دینے آئے۔ ہنگی کے باپ کو بھی بہت خوشی ہوئی۔ وہ اب بہت بوڑھا ہو گیا تھا۔ اب اس سے کام نہیں ہوتا تھا۔ ہنگی رام جیسے اس کے لیے بڑھاپے کا سہارا بن کے آیا تھا۔

گاؤں کے زمیں دار کو ہنگی کے آنے کی خبر ملی تو اس نے حویلی پر بلوایا اور حال پوچھا۔

ہنگی نے اسے بتایا کہ گاؤں سے شہر چلا گیا تھا۔ ایک راجہ کے یہاں نوکری کر لی۔ دھیرے دھیرے اسے کھانا پکانا آگیا۔ اب وہ ایک ماہر باورچی ہے۔ راجہ کا کھانا خود وہی پکاتا تھا۔ لیکن راجہ مر گیا اور اس کا گھر اجڑ گیا۔ اس لیے وہ گاؤں آگیا۔

زمیندار نے جب سنا کہ راجہ کا باورچی تھا تو اسے اپنے یہاں کا باورچی خانہ سونپ دیا ۔۔۔۔۔۔۔ واقعی ہنگی رام ایک اچھا باورچی بن گیا تھا۔ اتنا اچھا کھانا پکاتا کہ زمیندار کی خوراک بڑھ گئی۔ ایک باورچی یا رسوئیا سکھوا پہلے سے تھا۔ سکھوا دیکھ کر بہت کڑھتا تھا کہ ہنگی رام زمیندار کی نظروں میں سما گیا ہے اور وہ ہر وقت موقع کی تلاش میں رہتا تھا۔ وہ ہنگی رام کو کسی نہ کسی طرح اسے گھر سے نکلوانے پر تلا ہوا تھا۔

ہنگی رام بچپن سے کھانے پینے کا شوقین تھا راجہ کا باورچی بھی اس لالچ سے بنا تھا اور زمیندار کی ملازمت بھی اس لیے قبول کی تھی جو کچھ زمیندار کے لیے پکاتا۔ پہلے خود کھا لیتا پھر زمیندار کو کھلاتا۔ سکھوا یہ دیکھتا اور زمیندار سے شکایت کرتا

"دیکھ بے سکھوا کہے دیتا ہوں تو نے میری شکایت مالک سے کی تو تجھے نکلوا دوں گا" ایک دن ہنگی رام نے سکھوا کو ڈانٹا۔ ایک تو تو بوڑھا ہو گیا ہے پھر مجھ سے زیادہ چالاک نہیں۔ میں نے تو شہر میں راجہ صاحب کو ایسی پٹی پڑھائی تھی۔ پرانے باورچی کو نکلوا کر چھوڑا۔

زرا ہم بھی سنیں ہنگی بھیا کیسے نکلوایا تھا تم نے۔

—— ایک دوسرے نوکر نے پوچھا۔

"وہ بھی سکھوا کی طرح روز میری شکایت مالک سے کرتا تھا۔ اور خود کو بڑا قابل سمجھتا تھا۔ ہنگی

مالک نے ہم دونوں کا امتحان لینا چاہا، ایک بار میں نے مرغا
رجب مالک کو کھلا رہا تھا، انھوں نے پوچھا "ہنگی رام اپنے کو
ھا باورچی سمجھتے ہو تو یہ بتاؤ کہ مرغے کا گوشت اچھا ہوتا ہے یا پوست"
میں نے تڑسے جواب دیا "پوست اچھا ہوتا ہے سرکار" مالک
ں ہوا اور مجھے بہت سا انعام دیا، دوسرا باورچی یہ سن رہا تھا۔
دن اس کی باری تھی۔ اس نے اپنی پوری صلاحیت سے ایک
در مالک نے کھاتے وقت پوچھا "یہ بتاؤ کہ بکرے کا گوشت اچھا
یا پوست" ـــــ وہ کل میرا جواب سن چکا تھا اس لیے جلدی
پوست حضور"۔۔۔۔۔۔ پھر جانتے ہو کیا ہوا، مالک
ہمیشہ کے لیے چھٹی دے دی۔ تو بھی تو مجھ سے زیادہ نہیں جانتا
ن کرنا چھوڑے گا، تو تیرا بھی یہی حال کر دوں گا۔
سکھوا اس واقعے کو سن کر بہت ڈر گیا لیکن اُس سے یہ
کہ ہنگی کی عزت بھی ہو رہی ہے اور وہ بے ایمانی سے کھاتا
ہے، اسے جب بھی موقع ملتا وہ مالک کے کان بھرنے کی کوشش
۔۔۔ اب مالک کو بھی کچھ کچھ شک ہونے لگا تھا۔ کئی بار اُس
کے بارے میں ہنگی رام سے پوچھا۔ کیونکہ اکثر مرغ کا گوشت کم رہتا۔
سکھوا بھی اس کے پیچھے پڑ گیا تھا اور موقع دیکھ کر وہ بھی کھانا
ر دیتا تاکہ الزام ہنگی پر آئے اور کسی دن خفا ہو کر مالک نکال
لیکن ہر بار ہنگی اپنی عقلمندی اور حاضر جوابی سے بچ جاتا۔
آخر ایک دن سکھوا نے ایک گہری چال چلی۔ ہنگی نے
فرمائش پر بطخ پکائی تھی جب وہ مالک کے سامنے لے گیا
مک سے رہ گیا۔ بطخ کی صرف ایک ہی ٹانگ تھی۔
مالک نے پوچھا "صرف ایک ٹانگ ہے اور دوسری کہاں گئی؟
ہنگی سمجھ گیا کہ یہ حرکت ضرور سکھوا کی ہے اور یہ ایسی بات تھی
آسانی سے دینا مشکل تھا اب تو چوری کا الزام اس پر آتا
ت اس کی ذہانت کام آگئی۔ کچھ دیر تو چپ رہا لیکن
اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا "بطخ ایک ہی ٹانگ کی تھی

"یہ کیسے ہو سکتا ہے" زمیندار نے بگڑ کر کہا "تم مجھے
بے وقوف بنا رہے ہو"
"نہیں سرکار یقین کیجیے"
"یقین کیا کروں آج تک کہیں ایک ٹانگ کی بطخ بھی ہوتی ہے،
تم ضرور کھا گئے ہو اب بہانا کر رہے ہو"
"جی ہاں سرکار میں نے منع کیا لیکن یہ ٹانگ کھا گیا ہے" سکھوا
نے کہا "یہ سب کھاتا ہے سرکار، آپ کے کھانے سے پہلے ہی اور مجھ کو
ڈراتا ہے کہ اگر میں نے شکایت کی تو نوکری سے نکلوا دے گا"
ہوں ـ زمیندار نے سر ہلایا۔ اس کا چہرہ غصہ سے سرخ
ہو گیا "میرے منع کرنے کے بعد بھی تم نے حرکت نہ چھوڑی اور مجھے جوٹھا
کھانا کھلاتے رہے ہو تمھیں اس کی سزا ملے گی"
میں سزا سے نہیں ڈرتا سرکار، اگر میں آپ کو ایک ٹانگ کی
بطخ نہ دکھا دوں تو آپ مجھے موت کی سزا دے سکتے ہیں لیکن اگر میں
نے اپنی بے گناہی ثابت کر دی تو آپ کو میری ایک بات ماننی ہو گی"
"کیا" ـــــ "سکھوا کو نکالنا ہوگا۔ ساری شرارت اس کی
ہے۔ چلیے میں آپ کو ایک ٹانگ کی بطخ دکھاؤں"
زمیندار نے کھانا چھوڑ دیا اور ہنگی کے ساتھ روانہ ہو گیا۔
سکھوا بھی پیچھے پیچھے جا رہا تھا ـ تالاب کے کنارے بہت سی بطخیں
نہانے کے بعد دھوپ میں اپنے پر سکھا رہی تھیں۔ پر سکھاتے وقت
بطخ ہمیشہ اپنی ایک ٹانگ پروں میں چھپائے رہتی ہے۔ اس وقت بھی سب
بطخیں اسی طرح کھڑی تھیں۔ "دیکھیے سرکار سب کی سب بطخیں ایک
ہی ٹانگ کی ہیں۔۔۔" زمیندار نے دیکھا واقعی سب ایک ٹانگ
کی تھیں۔ اس نے کہا "ہنگی رام تم ٹھیک کہتے ہو"
سکھوا نے دیکھا کہ ہنگی رام پھر بچا جا رہا ہے تو اس نے قریب
جا کر اور بطخوں کی طرف ہاتھ اٹھا کر زور سے ہش کر دیا۔ ساری بطخیں
ہوشیار ہو کر دونوں پیروں پر کھڑی ہو گئیں۔ اور زمیندار غصہ میں
ہنگی رام سے بولا "کیوں بے کم بخت یہ کیا ہے؟"
"حضور میں نے ہش کر کے ذبح نہیں کیا تھا"

جناب منوہر پرشاد ماتھر۔ بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی ایڈوکیٹ۔ حیدرآباد
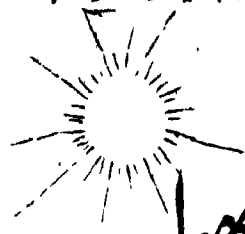
سورج مکھی کا پھول

بہت پُرانی بات ہے۔ اتنی پرانی کہ تم اور ہم حساب بھی نہیں لگا سکتے۔ اس وقت سمندر کی تہہ میں پریاں رہا کرتی تھیں۔ بس سمندر کے اندر ہی ان کی دنیا آباد تھی بہترین محل تھے۔ ہیرے، لال، مونگے وغیرہ۔ جیسے قیمتی پتھروں اور جواہرات کے بنے تھے۔ کہیں سنکھ جڑے تھے تو کہیں سیپیاں۔ ایسے ہی شاندار اور قیمتی محلوں میں پریاں لنا بھر رہتی تھیں۔ ان پریوں میں ایک سبز پری بھی تھی۔ سبز پری ہرے کپڑے پہنتی' اس کے بال لمبے لمبے اور خوب گھنے تھے۔ اس کے ہاتھ سنہرے سنہرے تھے۔

دوسری پریوں کی طرح سبز پری کے پاس بھی ایک رتھ تھا یہ سنکھ اور سیپیوں سے بنا تھا اور اسے سمندری گھوڑے کھینچتے تھے۔ شام ہوتے ہی گاڑی میں سمندری گھوڑے جوڑ دیئے جاتے۔ یہ گھوڑا گاڑی آکر سبز پری کے محل پر کھڑی ہوجاتی' سبز پری اپنے محل سے نکلتی اور گاڑی میں سوار ہوجاتی۔ اس کے ساتھ ساتھ دوسری پریوں کی گاڑیاں بھی چل پڑتیں، اور پھر رات ہوتے ہوتے یہ سمندر کے کنارے آکر رکتیں۔ رات بھر ناچتی، گاتی، کھیلتی کودتی رہتیں صبح ہونے سے پہلے اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ اپنے محلوں کو واپس ہوجاتیں۔

ایک بار کیا ہوا کہ کھیلتے کھیلتے سبز پری تھک گ
سمندر کے کنارے سے دور ایک بڑا سا پتھر تھا۔ سبز پ
نے سوچا چلو اس پتھر پر آرام کریں۔ وہ تھک تو گئی
لیٹی تو سو گئی۔ دوسری پریوں نے اسے بہت کھوجا بہ
تلاش کیا۔ سمندر کے کنارے دور تک گھومیں پھریں کہ
اس کا پتہ نہ چلا، سب ناامید ہوگئیں۔ اپنے اپنے رتھوں
بیٹھ سمندر واپس آگئیں۔

سبز پری کی نیند ٹوٹی تو اس نے دیکھا دور سم
سے ایک عجیب غریب روشنی آرہی ہے۔ وہ س
کچھ بھول کر اسے دیکھنے لگی۔ کیا دیکھتی ہے

...نے کا رتھ نکل رہا ہے اور سونے کے اس رتھ کو خوبصورت
...اقتور سفید گھوڑے کھینچ رہے ہیں۔ ذرا غور سے دیکھا تو اسے
...ب راجا بھی نظر آیا۔ وہ حقیقت میں سورج تھا مگر سبز پری
...ذا سے نہیں جانتی تھی۔

رتھ کی خوبصورتی دیکھ کر سبز پری نے ارادہ کر لیا
...ر وہ اس میں ضرور بیٹھے گی۔ وہ رتھ کی طرف نگاہیں جما
...ے بیٹھ گئی۔ اسے یقین تھا کہ رتھ کا راجا اسے ضرور دیکھے
...ا دیکھتے ہی رتھ روک لے گا اور وہ رتھ میں بیٹھ جائے گی۔

وہ رتھ کو تکتی رہی تکتی رہی۔ سورج کا رتھ مشرق
...ے نکل کر چلتا رہا۔ چلتا رہا۔ دوپہر ہو گئی مگر رتھ کے راجا
...نے اُسے نہیں دیکھا۔ ہوتے ہوتے شام بھی ہو گئی اور پھر
...تھ سمندر میں ڈوب گیا۔

مگر سبز پری نے ہمت نہ ہاری۔ وہ سورج کی طرف
...یکھتی رہی بنا پلک جھپکائے دیکھتی رہی۔ دوسرے دن سورج
...پھر وہی رتھ نکلا۔ اب بھی سبز پری اس کی طرف ٹکٹکی باندھے
...یکھتی رہی۔ دوپہر ہوئی پھر رات ہو گئی مگر اس سنہرے
...تھ میں بیٹھے ہوئے راجا نے اس کی طرف نگاہ نہیں اٹھائی۔

اس طرح نہ جانے کتنے دن اور راتیں بیت گئیں
...ر اس طاقتور راجا نے کبھی بھی اسے نہ دیکھا نہ کبھی سورج کا
...رتھ کہیں ٹھہرا۔ اب سبز پری جھنجلا گئی وہ دن رات اس کا
...نتظار کرتے کرتے تھک گئی تھی۔

اس نے سوچا کہ شاید اس جگہ اس کی نگاہیں نہیں
...ئیں کسی دوسری جگہ سے اس رتھ کو روکا جائے اور
...وہ اٹھنے لگی مگر اس نے دیکھا کہ لاکھ کوشش کے باوجود
...اٹھ نہیں سکتی ہے۔ کھڑی نہیں ہو سکتی ہے اس نے
...نے پیروں کی طرف نظر ڈالی ارے! اس کے
...روں نے تو زمین میں اپنی جڑ جما لی ہے۔

بے چاری بہت پریشان ہوئی۔ پھر اس نے اپنے جسم کی طرف نظر
کی۔ ارے یہ بھی وہ بھی بدل چکا تھا۔ ہلکا پھلکا ملایم اور ریشمی
سبز لباس جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا اور وہ پھٹے ہوئے کپڑے ہرے
ہرے پتے بن گئے تھے۔

اس نے گھبرا کر سر پر ہاتھ رکھا کوئی چیز ہاتھ میں آگئی۔
دیکھا تو سونے جیسے سنہری بال بھی سنہری پنکھڑیوں میں
بدل گئے ہیں۔ وہ گھبرا گئی چیخ مارنا چاہتی تھی مگر اس کا تو
منہ بھی بند ہو گیا تھا، ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا تھا۔ وہ ایک
خوب صورت سنہرے پودے میں تبدیل ہو گئی تھی۔

آج ہم اسے سورج مکھی کا پھول کہتے ہیں اور
آج بھی یہ پھول سورج کی طرف ہی اپنی نگاہیں جمائے
ہوئے ہے۔ شاید اب بھی اسے امید ہے کہ سورج
اس کی طرف دیکھے گا۔ اور اسے اپنے رتھ میں بٹھائے گا۔

میری کتابیں

میری ہمدم، میری مونس، میری جان ہے، ساتھی ہے
میری میز پہ، الماری میں، سجی ہوئی، ہر ایک کتاب
ان میں کا ہر ایک ورق میری تقدیر کا نقشہ ہے
ہر اک جلد میں سوئے ہوئے ہیں میرے مستقبل کے خواب
ان میں کی ہر ایک سطر اک رستہ ہے اک منزل ہے
ہر اک حرف چراغ ہے میری اونچی نیچی راہوں کا
ان کی عبادت وہ آئینہ ہے کہ جس کو دیکھ کے میں
پا لیتا ہوں عکس، بدلتی اس دنیا کی نگاہوں کا

جناب احمد وصی

جناب غلام حیدر ام۔اے

کچھ دن لوگوں نے اسی طرح کام چلایا ہوگا مگر بھائی وہ دھات کی پٹیاں کتنے دن چلتیں ۔ وہ تو سودا خریدتے وقت کاٹ دی جاتی تھیں ۔ کچھ دن بعد تو ان کے ٹکڑے ہی باقی رہ جاتے ہوں گے ۔ اور پھر ٹکڑوں اور پیٹوں میں فرق ہی کیا ۔ ؟

جب دھات وہی ہے تو پھر چاہے وہ ایک اینٹ کی شکل میں ہو یا اس کی پٹی بنی ہوئی ہو، یا اس کے گول، چوکور، تکونے ٹکڑے ہوں، سب برابر ہیں ۔ لہٰذا کچھ عرصہ بعد جب ٹکڑے آسانی سے چلنے لگے ہوں گے تو بڑے بڑے تاجروں نے خود ہی اپنی پیٹوں کو کاٹ کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں رکھ لیا ہوگا ۔ اور شاید یادداشت کے لیے ان ٹکڑوں پر کسی نکیلی سی چیز سے ان کا وزن ان پر ضرور کھود دیا ہوگا ۔ یا کوئی نشان ڈال دیا ہوگا تاکہ انھیں آسانی سے پہچانا جا سکے ۔

اب وہ دکان پر پہنچے اور انھوں نے تلے ہوئے ٹکڑے گن کر دئے اگر دکان دار نے ضرورت سمجھی تو ان میں سے دو چار ٹکڑے تول بھی لیے قیمتی دھاتوں کے ٹکڑوں کو ضرور تولا جاتا ہوگا ۔ اس لیے کہ ان کے وزن میں تھوڑی سی کمی یا زیادتی بھی اہمیت رکھتی ہے ۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان پرانے دھات کے ٹکڑوں کی شکل ایک سی نہیں ہے ۔ تولنے میں اگر کوئی ٹکڑا زیادہ ہے تو اس کا ایک کونا کاٹ دیا ۔

اب جو بڑے بڑے تاجر ہوتے ہوں گے انھوں نے اپنے کچھ نشان مقرر کر لیے ہوں گے جیسے پھول (✾) یا کانٹے کا نشان (×) یا کوئی اور نشان ۔ اور وہ اپنے ٹکڑوں پر ٹھپّہ لگا دیتے ہوں گے ۔ شروع شروع میں تو یہ نشان بھی بے معنی سے ہی تھے مگر بعد میں کچھ ایسی شکلیں بھی نظر آنے لگیں جن کو آسانی سے پہچانا جا سکتا ہے ۔ جیسے ہاتھی، گھوڑا، شیر وغیرہ

(چاندی کے ٹکڑے جن پر بہت سے نشان بنے ہیں)

اب تم ایک بات خاص طور پر دیکھو گے کہ اس شکل میں آکر مجھ میں بہت ہی آہستہ آہستہ مگر ایک بہت بڑی تبدیلی نظر آنے لگی۔ اور وہ یہ تھی کہ میں تول کے چکر سے آزاد ہو کر گنا جانے لگا۔ میں کبھی کبھی تولا بھی جاتا تھا مگر عام طور پر مجھے گن کر ہی لوگ مطمئن ہو جاتے۔

یہ بہت بڑی تبدیلی تھی۔ اس سے پہلے میں اپنے آپ کو "سکّہ" کا نام نہیں دے سکتا تھا۔ میں صرف "دھات" تھا۔ لیکن اب تو میری بھی ایک الگ صورت ہو گئی۔

میں بار بار تمھیں یاد دلا رہا ہوں کہ تم کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ یہ باتیں کسی خاص جگہ ہوئی تھیں۔ یہ تو دنیا کی ہر آبادی میں تھوڑے تھوڑے وقفے سے چلتی رہیں۔ مگر پھر بھی سب سے پہلے شاید روم میں حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے کوئی آٹھ نو سو سال پہلے لوگوں نے دھات کے ایک سے وزن کے ٹکڑوں کو کاٹ کاٹ کر رکھنا شروع کیا تھا۔

اور اس کے ساتھ ہی تمھیں اپنے ذہن میں ایک بات اور صاف کر لینی چاہیے۔ جس زمانہ کی بات کر رہا ہوں اس وقت تک میں کسی بادشاہ کے دربار میں نہیں پہنچا تھا۔ بس بڑے بڑے تاجر سنار، اور خرید و فروخت کرنے والے لوگ ہی مجھے بناتے اور دوسروں کے دیے سکوں کو لے لیتے۔

بڑے بڑے تاجر صرف اپنے ہی ملک میں نہیں بلکہ دوسرے ملکوں میں جاتے تو مجھے اپنے ساتھ لے جاتے اور لوگ، باوجود بدیسی ہونے کے مجھے پیار سے لے لیتے اس لیے کہ میں اصلی دھات کا ہوتا، اور مجھے لینے میں انھیں کوئی نقصان نہ ہوتا۔

دربار کی رونق

اور صاحب اس کے بعد سے میری ترقی کی ایسی کہانی شروع ہوئی جس پر میں پھولا نہیں سماتا۔ جس دن سے بادشاہوں کی نظر مجھ پر پڑی ہے اس دن سے تو میری دنیا ہی بدل گئی۔ میری کتنی عزت ہوئی ہے۔ دربار میں پہنچ کر تم اندازہ نہیں کر سکتے۔ بس اس محاورے سے سمجھ لو کہ لوگ کہتے تھے کہ "فلاں ملک میں تو فلاں بادشاہ کا سکّہ چلتا ہے" اور سچ پوچھو تو کسی بادشاہ کی حکومت اور سرحد کی پہچان ہی یہ تھی کہ کہاں تک اس کا سکّہ چلتا ہے۔ کوئی شخص اگر بادشاہی سکّہ لینے سے انکار کر دیتا تھا تو اسے باغی مانا جاتا تھا، اور سزا ملتی تھی۔ اور یہ بات تو آج بھی ایسی ہی ہے۔ بادشاہت تو ختم ہو گئی مگر سرکاری سکہ کو لینے سے انکار کرنا آج بھی قانونی جرم ہے۔

سب سے پہلے مجھے جس حکومت نے اپنایا اور پیار سے اپنے دربار میں رکھا وہ ایشیائے کوچک کے اس علاقہ میں تھی جہاں آج کل ترکستان وغیرہ کا علاقہ ہے۔ یہ حکومت حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے کوئی آٹھ سو سال پہلے سے لگ بھگ ساڑھے پانچ سو سال پہلے تک رہی ہے۔ اس ملک کو لیڈیا کہتے تھے اور اس کا دارالخلافہ سارڈیس نام کا شہر تھا۔

تو بھائی میں تو تاریخ میں سب سے پہلے یہی حکومت
ایسی ملتی ہے جس نے مجھے پیار کیا۔ ویسے ملنے کو تو لیڈیا
کے سکے آٹھویں صدی قبل مسیح کے بھی ملتے ہیں مگر بڑے
بڑے تاریخ کے ماہر لوگ اسی بات کو مانتے ہیں کہ باقاعدہ
بادشاہی سکہ کروسس یعنی آخری بادشاہ نے چلایا تھا جو ۵۶۰
۵۴۶ قبل مسیح میں لیڈیا پر حکومت کرتا تھا۔ اس کے سکے
سونے چاندی کی ایک پتری ہوتے تھے، جس کے ایک
طرف ایک شیر کا چہرہ ہوتا تھا اور اس کے بالکل سامنے
ایک بیل کا۔

اس طرح میں یا میرے باپ دادا آج سے کوئی ڈھائی
ہزار سال پہلے ایک دربار سے نکل کر لوگوں کے ہاتھوں
میں پہنچ گئے۔ اور پھر میرا ایک جگہ سے نکلنا تھا کہ دنیا کے
ہر بادشاہ نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا، آنکھوں پر بٹھایا۔ سونے
چاندی کے علاوہ نئی نئی دھاتوں کا استعمال سکوں میں کیا۔
دو دو تین تین دھاتوں کو ملاکر نئی نئی دھاتیں بنائیں مثال
کے طور پر شروع میں یونان اور روم کے بادشاہوں نے برونز
(جس کا آج کل پیسہ کا گول سکہ تمھارے ہاتھ میں آتا ہے) اور
تانبے کے سکے بنائے۔ اٹلی اور چین میں بھی کم وبیش اسی
زمانے کے انھی دھاتوں کے سکے ملتے ہیں۔

اور پھر انھی ملکوں پر کیا ہے۔ آہستہ آہستہ ساری
دنیا ان دھاتوں کو اپناتی گئی۔ سیسہ کو میرے لیے بہت کم
بادشاہوں نے پسند کیا، مگر پھر بھی جنوبی ہندوستان میں
آندھرا خاندان کی حکومت نے اس دھات کو بھی نہ چھوڑا
اور کافی دھات کے پردے میں بھی ایک عرصہ تک تمھارے
ہاتھ میں آیا۔

ان کی دیکھا دیکھی ملایا کی کچھ ریاستوں نے
بھی سیسہ کے سکے چلائے۔ نکل دھات کو سب سے پہلے
ایران کے ایک خاندان نے عزت بخشی۔ اس خاندان کی
حکومت جس حصہ میں تھی اس کا دارالخلافہ اس جگہ آباد تھا۔
جہاں آج بلخ کا شہر ہے۔ اور اس کو باختر کہتے تھے بختری
بادشاہوں نے حضرت عیسیٰ سے تقریباً تین سو سال پہلے نکل
کے سکے چلائے اور یہ چمکدار چاندی جیسی دھات انسان کو
کچھ ایسی بھلی لگی کہ اس نے آج تک اس کا استعمال نہ چھوڑا
آج ہمارے پاس جو روپیہ ہے وہ بس اسی دھات کا ہے۔

تم اگر میری اس زمانہ کی شکلوں کو غور سے دیکھو تو
تمھیں ان میں تقریباً ساری ہی باتیں ایسی ملیں گی جیسی آج
کے سکوں میں ملتی ہیں۔ شروع کے سکوں میں جانوروں کی شکلیں
بہت نظر آتی ہیں۔ اُن میں سے کچھ کے مطلب تو ہم سمجھ سکتے
ہیں۔ اور کچھ کے مطلب ابھی تک نہیں سمجھے جا سکے۔ شاید
دنیا میں انسان نے ہر جگہ کچھ جانوروں کو مذہبی اہمیت دی
ہے اس لیے سکوں پر بھی ان کی شکلیں نظر آتی ہیں۔ جیسے
گائے، بیل وغیرہ۔ ان کے علاوہ شیر اور گھوڑے کی
تصویریں نظر آتی ہیں۔ یہ شاید بہادری کا اظہار کرتی
ہوں گی۔ آج بھی ہمارے ہندوستانی سکوں میں اور
نوٹوں میں شیر کی شکل موجود ہے۔

(باقی آئندہ)

پیامِ تعلیم

میرا محبوب رسالہ ہے پیامِ تعلیم
شمع الفت کا اجالا ہے پیامِ تعلیم
انتظار اس کا ہر اک خورد وکلاں کرتے ہیں
آبِ تعلیم کا پیالا ہے پیامِ تعلیم

جناب سید محسن نظامی سہسرامی

ذرا دیکھو گھڑی میں کیا بجا ہے
چلو اسکول کا وقت آگیا ہے

ظفر اپنی کتابیں ٹھیک کرلو
مجاہد اپنے پین میں انک بھرلو
بنا کر پنسل بستے میں دھرلو
وہ دیکھو طاق میں چاقو رکھا ہے
چلو اسکول کا وقت آگیا ہے

کہیں ہم دیر سے پہنچیں نہ مکتب
سمجھ پائیں سبق کا بھی نہ مطلب
خفا ہوں مولوی مقصود صاحب
وہ دیکھو سامنے رکشا کھڑا ہے
چلو اسکول کا وقت آگیا ہے

چراغِ علم ہی کی روشنی سے
مقدر لاکھ انسانوں کے چمکے
ہزاروں جاہلوں کے ذہن بدلے
جہالت کا اندھیرا مٹ رہا ہے
چلو اسکول کا وقت آگیا ہے

پڑھیں گے تو ملے گی ہم کو عزت
زمانے بھر میں ہوگی اپنی شہرت
بڑھائیں گے وقارِ ملک و ملت
زمانہ علم سے آگے بڑھا ہے
چلو اسکول کا وقت آگیا ہے

سبھی کھیلوں سے دامن چھوڑ کر ہم
ہر اک بدکام سے منھ موڑ کر ہم
پڑھیں گے شام تک جی توڑ کر ہم
وہی انسان ہے جس نے پڑھا ہے
چلو اسکول کا وقت آگیا ہے

ہنسی ہنسی میں

کہانی اتنی مزے دار، اتنی دلچسپ تھی کہ ارشد مطالعہ میں غرق تھا۔ ہلکی سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی تھی اور پھر کہانی کے ایک موڑ پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا لیکن اچانک اس کی ہنسی میں جیسے بریک لگ گیا۔ اپنے کمرے میں کھسر پھسر کی آواز سن کر وہ چونک پڑا۔ اس نے گھبرا کر کمرے کے چاروں طرف نظر دوڑائی، کوئی نظر نہ آیا۔ اسے خیال ہوا کہ کانوں کو دھوکا ہوا ہے اور پھر کتاب میں کھو گیا۔ مشکل سے آدھا صفحہ پڑھا ہوگا کہ پھر ویسی ہی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی اور اب پہلے سے زیادہ صاف اور بلند تھی کوئی بچی کہہ رہی تھی۔

"ابا جان یہ آپ کہاں آگئے ؟"

"بیٹی ۔ میں اس لڑکے کو اپنے محل میں لے جاؤں گا" جواب میں ایک بارعب مردانی آواز گونجی۔

"آپ ۔۔ ان کو ۔ لے جائیں گے ؟" لڑکی کے لہجہ میں حیرت تھی۔

"ہاں ۔! میں اس کو لے جاؤں گا' یہ بہت ذہین اور نڈر ہے مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ —— مگر ابا جان ۔! آپ کو تو گندے لڑکوں گندی لڑکیوں سے سخت نفرت تھی ؟" لڑکی حیران ہو کر بولی۔

"وہ تھی بھی اور اب بھی ہے ! پھر بھی یہ لڑکا مجھے بہت بھلا لگتا ہے۔"

"مگر ابا جان ان کا کمرہ تو دیکھیے کتنا گندہ ہے کوئی چیز بھی سلیقے سے نہیں رکھی ہے' دیواروں پر مکڑی نے جالے ہیں۔ کتابیں اور کاپیاں ادھر ادھر بکھری پڑی ہیں کمرہ کیا ہے کباڑ خانہ معلوم ہوتا ہے میرا تو دم گھٹا جا رہا ہے۔ آپ نہ جانے کیسے کھڑے ہیں۔ جلدی چلیے۔"

"ذرا ٹھہرو ۔! ایک بار ہم ان کو موقع دیتے ہیں سنبھل گئے تو ٹھیک ہے' ورنہ پھر مجبوری ہے۔ ویسے امید ہے کہ یہ اپنے آپ کو سدھارنے کی کوشش کریں۔"

ارشد باوجود سخت سردی کے پسینے پسینے ہو گیا۔ پھٹی پھٹی نظروں سے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ مگر کوئی نظر نہ آیا۔ گھبرا کر بھاگنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ پھر وہی بارعب آواز کانوں سے ٹکرائی۔

"میاں صاحبزادے گھبراؤ نہیں بھاگنے کی کوشش نہ کرو تمھیں کوئی نقصان نہ پہنچائیں گے۔"

"آپ ہیں کہاں ؟" ارشد سہمی ہوئی آواز میں بولا۔

"ہم تم سے زیادہ دور نہیں صرف دو فٹ کے فاصلے پر ہیں۔ مگر تم ہمیں دیکھ نہیں سکتے۔ ہم صرف انھی کو نظر آتے ہیں جو اپنے آپ کو، اپنے گھر کو صاف ستھرا رکھتے ہیں۔ گندگی اور گندے بچوں سے ہمیں سخت نفرت ہے۔ اگر ہمیں دیکھنے کی خواہش ہو تو خود صاف رہنے کی کوشش کرو، اپنے گھر کو، اپنے کمرے کو، اپنے آنگن کو صاف رکھو، تم نے ہماری بات پر عمل کیا تو تمھیں اپنے گھر لے جائیں گے اور تمھاری ہر خواہش پوری کر دیں گے۔"

"م ۔ میں ۔ کوشش کروں گا !" ارشد بڑی مشکل سے ہکلا ہکلا کر بولا۔

"شاباش ! ہمیں تم سے ایسی ہی امید تھی۔"

"کیا میں آپ کو ابھی نہیں دیکھ سکتا" ؟

"نا میاں ۔ گندے بچے تو ہمیں دیکھ ہی نہیں سکتے ۔ ہم تو صرف صاف اور اچھے بچوں کو نظر آتے ہیں اور اس وقت تم گندے کپڑوں اور گندے کمرے میں بیٹھے ہوئے ہو، ہمیں نہیں دیکھ سکتے۔ کل اگر تم صاف کپڑوں اور سجے سجائے کمرے میں بیٹھے ہوئے ملے تو تم ہمیں ضرور دیکھ سکو گے۔"

"آپ کل بھی آئیں گے ؟" ارشد نے حیرت سے پوچھا۔ اس کے اوسان کچھ کچھ ٹھیک ہو گئے تھے۔

"ہو سکتا ہے کل بھی ہمارا اس طرف سے گذر ہو۔ ویسے ہم کسی دن بھی آ سکتے ہیں۔ اچھا اب چلتے ہیں ۔ شب بخیر۔ آؤ بیٹی فرزانہ چلیں۔"

راس کے بعد کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی، ارشد کافی دیر
پتا رہا ۔ اور پھر؟ ۔ پھر اٹھ کر جلدی جلدی صفائی کرنے
ے گھنٹہ کی سخت محنت کے بعد بھی کمرے میں کوئی خاص تبدیلی
ائی کرنے کا ڈھنگ تو اسے آتا نہ تھا ۔ ایک جگہ صاف کرتا تو
ل گندی ہوجاتی ۔ آخر تھک ہار کر پلنگ پر گر پڑا اور نہ معلوم
۔۔۔ صبح اٹھا تو رات کی باتیں ایک ایک کرکے دماغ
لگیں ۔ پہلے تو خواب سمجھ کر یقین ہی نہ آیا، مگر جب کمرے میں
ت تبدیلی نظر آئی تو یقین کرنا ہی پڑا ۔ جلدی سے ضروریات
اور منھ ہاتھ دھو کر ناشتہ کی میز پر پہنچ گیا ۔ ناشتہ کرکے اٹھا
ر شبانہ پر پڑی ۔ وہ تیزی سے اس کی طرف لپکا ۔
۔ شبانہ ۔ شبانہ ۔ میری بہنو ۔ میرا ذرا سا کام کردو؟ "وہ

۔ "شبانہ اسے دیکھ کر اک ذرا سا مسکرائی ۔
، کی صفائی کرنا ہے ۔ ذرا میری مدد کردو ۔"
" آخر آج آپ کو صفائی کا خیال کیسے آگیا؟" شبانہ نے
پوچھا ۔
میرے کچھ دوست آرہے ہیں ۔" ارشد نے بات بنائی ۔
ت تو بھائی جان آپ کے روز ہی آتے ہیں ۔ آج کون سی
ہے" شبانہ کے لہجہ میں شوخی تھی ۔
ایک خاص دوست آرہا ہے!" ارشد نے گھبرا کر جواب دیا ۔
" شبانہ نے معنی خیز مسکراہٹ سے جواب دیا اور صفائی
رجب دونوں کمرہ کی صفائی سے فارغ ہوئے تو بارہ بج
، عرصہ میں سب لوگ انھیں صفائی کرتے دیکھ گئے تھے
تھا، مگر کوئی کچھ بولا نہیں ۔
اہ ۔ کتنا سنبھل گیا کمرہ ۔" ارشد بڑی فرحت بڑی تازگی
تھا
ہوجائیں گے آپ کے دوست دیکھ کر ۔" شبانہ

مسکرا کر بولی ۔
" خدا کرے ایسا ہی ہو ۔" ارشد بے خیالی میں کہہ گیا اور جب اسے احساس
ہوا تو گھبرا کر شبانہ کو دیکھا جو منھ پھیرے دوسری طرف دیکھ رہی تھی ۔ اس نے
جلدی سے کہا ۔" اچھا چلو اب پہلے نہا لیں پھر کھانا کھائیں گے ۔"
ارشد سے دن گذارنا مشکل ہوگیا ۔ شام ہی سے اپنے کمرے میں
جا کر بیٹھ گیا ۔ اسے ان پراسرار لوگوں کا بڑی بے چینی سے انتظار تھا ۔
وقت گذارنے کے لیے اس نے کمرہ کا پھر جائزہ لینا شروع کیا جو چیز
بے قاعدہ نظر آتی اسے جھاڑ پونچھ کر قرینے سے رکھ دیتا ۔
اسے لیجیے نو بج گئے ۔ اس نے انتظار کی زحمت سے بچنے کے
لیے ایک کہانی کی کتاب اٹھالی مگر ایک لفظ سمجھ میں نہ آیا ۔ ذہن تو
کہیں اور تھا، کان کسی آہٹ کے منتظر تھے ۔ اچانک وہ چونک پڑا ۔ ڈھرکتے
ہوئے دل سے دروازہ کی طرف دیکھا، مگر شبانہ کو آتے دیکھ کر پھر اداس
ہوگیا ۔۔۔ "بھائی جان ابھی تک آپ کے دوست نہیں آئے؟"
شبانہ اطمینان سے بیٹھتی ہوئی بولی ۔
" پتہ نہیں کیا بات ہے ۔ میں بھی انھی کا انتظار کر رہا ہوں ۔" ارشد
نے اداسی سے جواب دیا ۔
" ہوسکتا ہے کل آئیں ۔" شبانہ نے تسلی دی ۔
" ہوں!" ارشد نے ہنکارا بھرا اور کتاب پر نظریں گاڑ دیں ۔
" او، اب میں سمجھ گئی ۔" شبانہ نے پھر اسے اپنی طرف متوجہ کیا ۔
" کیا سمجھ گئیں؟"
" آپ کی اداسی کی وجہ اگر وہ لوگ آج نہیں آئے تو کل پھر آپ
کو صفائی کرنی پڑے گی ۔" شبانہ شرارت سے مسکرا کر بولی ۔
ارشد کھسیا گیا وہ اس وقت شبانہ سے زیادہ الجھنا نہیں چاہتا
تھا ۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں وہ پراسرار لوگ اس کی موجودگی میں نہ آجائیں
اور وہ سارا بھانڈا پھوڑ دے ۔ مگر وہ تو اس وقت اسے ستانے
کے موڈ میں تھی ۔ آخر ارشد کو جھوٹ بولنا پڑا ۔
" دیکھو شبانہ شاید تمہیں ہنکل بلا رہے ہیں ۔"

"مجھے"۔ "واقعی آپ نے سنا ہے؟" شبانہ نے حیرت سے پوچھا۔
"تو نہیں تو کیا جھوٹ بول رہا ہوں!" ارشد جھنجھلا گیا۔
"اچھا۔ اچھا میں جاتی ہوں"۔ شبانہ اٹھ بیٹھی۔ مگر کمرے سے نکلتے ہی پھر پلٹی۔ "بھائی جان جانے سے پہلے ایک بات آپ کو اور بتا دوں، آپ کو اگر مجھے بھیجنا ہی تھا تو ویسے ہی کہہ دیتے بہانہ بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ آپ کو شاید اس کا علم نہیں کہ ڈیڈی شام سے کہیں گئے ہوئے ہیں۔" وہ مسکرا کر بولی۔ اور ارشد کی کھسیانی شکل دیکھ کر ہنستی ہوئی بھاگ گئی۔

ارشد انتظار کرتا رہا لیکن وہ پراسرار لوگ نہ آئے آخر تنگ آ کر وہ سو گیا۔ دوسرے دن بھی وہ ان کا بے چینی سے منتظر رہا لیکن پہلے دن کی طرح مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ اور اسی طرح دن بیتتے رہے اور ہوتے ہوتے ایک مہینہ گذر گیا۔ ارشد بھی اب ان کو بھول چکا تھا۔ مگر اب اس میں ایک بہت بڑی تبدیلی آ گئی تھی سب نے اس تبدیلی کو شدت سے محسوس کیا۔ اب اس میں خود صاف رہنے اور اپنے کمرے کو صاف رکھنے کی باقاعدہ عادت پڑ چکی تھی۔ اور وہ پہلے اپنے کمرے کی صفائی کرتا بعد کو دوسرے کام۔ پہلے دن اس کو صاف کپڑوں اور صاف ستھرے کمرے میں ایک عجیب سی فرحت اور تازگی محسوس ہوئی تھی۔ اس وقت اس نے صاف ستھرا رہنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ اپنے اس ارادہ پر بڑی مستقل مزاجی سے عمل بھی کر رہا تھا۔

شبانہ اس کے دور کے رشتہ کی بہن تھی۔ بہت شریر بے حد نٹ کھٹ ہمیشہ نئی نئی شرارتیں اس کے دماغ میں کلبلاتی رہتیں پہلی بار وہ اپنے والد کے ساتھ ارشد کے گھر چھٹیاں گذارنے آئی تھی۔ شبانہ کے باپ پولیس میں کسی بڑے عہدے پر تھے۔

ارشد کی اس تبدیلی پر شبانہ کو سب سے زیادہ حیرت تھی۔ وہ اسے چھیڑنے کے لیے اس کی وجہ پوچھتی تو وہ کھسیا جاتا۔ آج ارشد کو چھیڑنے کا ایک سنہرا موقع ہاتھ آ گیا تھا۔ اس وقت ارشد نہا کر نکلا تھا کہ شبانہ کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی

"بھائی جان کہیں جا رہے ہیں؟"
"نہیں تو۔ کیوں کیا بات ہے؟" ارشد نے پوچھا۔
"کچھ نہیں۔ یونہی پوچھا تھا۔ میں سمجھی اتنا بن ٹھن کر آپ کسی تقریب میں جا رہے ہیں۔" شبانہ نے نہایت سنجیدگی سے کہا مگر اس کی آنکھیں شرارت کی چغلی کھا رہی تھیں۔

ارشد کھسیا گیا "آخر تم مجھے اتنا پریشان کیوں کرتی ہو۔ سبھی صاف کپڑے پہنتے ہیں۔ میں نے پہن لیے تو ایسا کون سا انوکھا کام کیا"
"برا نہ مانیے بھائی جان آپ کو صاف کپڑے پہنے دیکھتی ہوں تو سچ مچ بڑی خوشی ہوتی ہے۔ خیر اب خوش ہو جائیے اب میں آپ کو پریشان کرنے نہیں آؤں گی۔ آج رات کی گاڑی سے ہم لوگ جا رہے ہیں"
"میری بلا سے تم اسی وقت چلی جاؤ!" ارشد منہ بنا کر بولا۔
"اچھا بھائی جان آخری بار میرے ایک سوال کا جواب اور دیجیے۔ اس کے بعد میں آپ سے کچھ نہیں بولوں گی۔"
"کیا ——؟" ارشد بے دلی سے بولا۔
"بس یہ بتا دیجیے کہ آپ کو اس قدر صاف ستھرے کیوں رہنے لگے ہیں۔" شبانہ نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

ارشد اس کے آخری جملے پر جھینپی ہوئی ہنسی ہنس دیا اور اٹھتا ہوا بولا "آؤ بتاؤں۔" مگر وہ اس کے اٹھنے سے پہلے بھاگ چکی تھی۔ وہ پھر پلنگ پر لیٹ گیا اور جب سو کر اٹھا تو کافی رات ہو چکی تھی۔ اس نے لیٹے ہی لیٹے ٹیبل لیمپ جلایا۔ لیکن روشنی کے پھیلتے ہی اچھل پڑا دو اجنبی لوگوں کو اپنے کمرے میں دیکھ کر گھبرا گیا۔ جلدی جلدی اپنی آنکھیں ملیں مگر اپنے کو بیدار پا کر اور بھی پریشان ہو اٹھا۔ ایک مرد بڑے ہی شاہانہ انداز میں آرام کرسی پر دراز تھا اور ایک خوبصورت بچی بڑی بے تکلفی سے کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ارشد نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے مگر آواز حلق میں ہی اٹک گئی۔ لڑکی ارشد کے اس اضطراب پر ہنس پڑی۔
"ارشد تم نے ہمیں پہچانا؟" وہی جانی پہچانی بار عب

آواز کمرے میں گونجی "جی ۔ جی ۔ جی ہاں" ارشد ہکلایا۔
"ارشد بھیا ہم آپ کو لینے آئے ہیں۔ چلیں گے نا آپ ہمارے ساتھ؟"
بچی نے بڑی بے تکلفی سے ارشد سے پوچھا۔
"مجھے ۔۔ ؟" ارشد حیرت سے بولا۔
"ہاں تمھیں یاد ہے۔ ہم نے تم سے وعدہ کیا تھا نا۔ کیا تم ہمارے ساتھ چلنا نہیں چاہتے؟" بچی کے بجائے اجنبی مرد نے جواب دیا۔
"جی چاہتا تو ہوں۔ مگر ڈیڈی بھی تو اجازت دیں"۔ ارشد نے رک رک کر جواب دیا۔ وہ اپنے اوپر کافی قابو پا چکا تھا۔
"تم اس کی فکر نہ کرو ہم تمھارے ابا سے اجازت لے چکے ہیں۔ باقی چھٹیاں اب تم ہمارے ساتھ گذارنا۔ اگر چلنے کا ارادہ ہے تو فوراً اپنا سوٹ کیس اٹھا لو اور چلو ہمارے ساتھ"۔ اجنبی نے گھڑی پر نظر ڈالی اور کھڑا ہو گیا اور ارشد کسی مقناطیسی کشش سے بے سوچے سمجھے ان کے پیچھے باہر نکل آیا۔ دروازہ پر اسے کار کھڑی نظر آئی جب وہ دونوں بیٹھ گئے تو خود بھی چڑھ گیا۔
اگلے دن اس نے اپنے آپ کو ایک خوبصورت بنگلہ میں پایا اتنا خوبصورت کہ حیرت سے تکتا ہی رہ گیا اور اس کے دل میں ایک خواہش نے جنم لیا۔ کاش وہ ہمیشہ یہیں رہتا۔ مگر شام تک اس کی اس خواہش نے دم توڑ دیا۔ رات کے آتے ہی اس کو اپنا گھر امی ابا اور چھوٹا بھیا سب یاد آنے لگے۔ گھر پہنچنے کے لیے وہ بے قرار ہو گیا جی پھوٹ پھوٹ کر رونے کو چاہنے لگا۔ مگر وہ خاموشی سے پلنگ پر گر پڑا اب یہ خوبصورت مکان اسے قید خانہ معلوم ہو رہا تھا۔
"کیوں بھیا کیا ہوا۔ ؟" فرزانہ نے اسے اداس دیکھ کر پوچھا۔
"فرزانہ مجھے میرے گھر پہنچا دو۔ میرا دل گھبرا رہا ہے"۔ ارشد رو ہنسا ہو کر بولا۔ "کیوں ممی یاد آ رہی ہیں؟"
"ہاں ۔۔۔۔" "اچھا ٹھہرو۔ میں ابا جان سے جا کر کہتی ہوں"۔
فرزانہ کو اس پر ترس آ گیا۔
ارشد آنکھیں بند کیے اس کا انتظار کرنے لگا۔ اسے واپس آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ آہٹ پر آنکھیں کھولیں تو ایک بار پھر اچھل پڑا۔ اس کے سامنے شبانہ اور اس کے ڈیڈی کھڑے مسکرا رہے تھے۔ وہ بمشکل کہہ سکا۔
"انکل آپ ؟"
"ہاں کیوں۔ دل گھبرا رہا ہے؟" انھوں نے ارشد کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔ جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔
"انکل آپ یہاں کیسے آ گئے؟" ارشد نے حیرت سے پوچھا۔ شاید اس نے ان کی بات سنی ہی نہیں تھی۔
"تمھارے ہی ساتھ تو آئے تھے"۔ انھوں نے مسکرا کر جواب دیا۔
"میرے ساتھ۔ نہیں تو ۔ بس تو"۔ اور وہ آگے کہتے کہتے رک گیا۔
"نہیں جناب عالی۔ آپ ہمارے ہی ساتھ آئے ہیں"۔ شبانہ نے شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا۔ "کہیے تو پھر میک اپ کرا دیں"۔
"انکل۔ واقعی وہ آپ ہی تھے؟" ارشد کی حیرت بدستور قایم تھی۔
"ہاں ہاں بھائی وہ ہم ہی تھے"۔ انھوں نے جواب دیا۔
"اور اس دن رات کو ؟"
"اس دن رات کو بھی ہم دونوں ہی تھے"۔
"پھر آپ مجھے دکھائی کیوں نہیں دیے تھے؟" ارشد کے لہجہ میں اب بھی استعجاب تھا۔
"اس لیے کہ ہم تمھارے کمرے میں نہیں تھے۔ اصل میں یہ ساری شرارت شبانہ کی تھی۔ اس نے تمھارے کمرے میں میرا خود کار ٹرانس میٹر چھپا دیا تھا۔ اور یہ پلان بھی اس نے ہی بنایا تھا اور جب اس نے مجھے اس میں شرکت کی دعوت دی تو تمھاری اصلاح اور تھوڑی سی تفریح کی خاطر میں نے بات مان لی۔ مگر اب سوچتا ہوں یہ تفریح تمھارے حق میں بہت مفید ثابت ہوئی۔ کیونکہ اب تم میں صفائی کے جراثیم پیدا ہو گئے ہیں اور تم ایک اچھے بچے کی طرح صاف ستھرے رہنے لگے ہو۔ ہنسی ہنسی میں یہ سب کچھ ہو گیا۔ ارشد جھینپ کر شبانہ کی طرف دیکھنے لگا۔ شبانہ کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔ ارشد میاں اور کھسیا گئے۔

مولانا مقبول احمد سیوہاروی

سفرنامہ ابن بطوطہ

(مسلسل)

سلطان لاذق

لاذق کا بادشاہ بڑے بادشاہوں میں سے ہے۔ اسے جب ہماری خبر ملی تو مولانا علاؤالدین قسطمونی کو ہمیں لینے کے لیے بھیجا۔ ہمارے سب ساتھیوں کے لیے الگ گھوڑے بھیجے۔ ملاقات ہوئی تو بڑی خوش کلامی سے پیش آیا۔

ان تمام بادشاہوں کی عادت ہے کہ جب کسی کو بلاتے ہیں تو خالی نہیں جانے دیتے کچھ نہ کچھ عطیہ دیتے ہیں۔

مغرب کی نماز ہم نے سلطان کے ساتھ پڑھی۔ روزہ بھی اسی کے ساتھ افطار کیا۔ اس کے بعد ہمیں رقم بھیجی۔ اس کا بڑا بیٹا مراد بک شہر کے باہر باغ میں رہتا ہے۔ اس نے بھی ہمیں بلایا اور جیسا برتاؤ اس کے باپ نے کیا تھا وہی برتاؤ اس کا رہا۔ مراد بک کے عالموں میں سے ایک صاحب نے ہماری ترجمانی کی۔ ہماری میٹھی عید (عید الفطر) لاذق میں ہوئی۔

عیدگاہ میں سلطان کا جلوس، مسلح سواروں اور بھائی چارہ کمیٹی والوں کے ساتھ جاتا ہے۔ کمیٹی والے بھی مسلح جاتے ہیں۔ ہر ایک جماعت کے ساتھ باجے، نقارے اور نفیریاں ہوتی ہیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک کا لباس ہوتا ہے۔

ہر پارٹی کے ساتھ گائیں، بھیڑیں ہوتی پہلے قبرستان گئے۔ بھیڑیں اور گائیں ذبح کیں روٹیاں اور گوشت تقسیم کیا اور پھر عیدگاہ گئے۔

دوگانہ پڑھ کر ہم سلطان کے شاہی محل میں چلے گئے۔ عید کے دن جو بھی کوئی سلطان کے دروازے پر آتا ہے خالی نہیں جاتا، امیر ہو یا فقیر، اپنے درجے کے مطابق کچھ نہ کچھ لے کر جاتا ہے۔

عید کا کھانا ہم نے سلطان کے دسترخوان پر کھایا۔ ایک طرف علما، قاضی بھائی چارہ کمیٹی کے ممبر بٹھائے گئے۔ دوسرے دسترخوان پر مساکین اور فقیر۔

حصن طورس :-

لاذق سے چل کر ہم حصن طورس پہنچے۔ مشہور ہے کہ صہیب (رومی) اسی طورس کے رہنے والے تھے۔ رات ہم ہمیں قلعہ کے باہر رہنا پڑا۔ صبح کو قلعہ والوں نے ہمیں دیکھا اور ہمارا حال پوچھا تو اندر بلالیا۔

یہاں ہم ایک فقیر کی خانقاہ میں ٹھہرے۔ قلعہ کے ا الیاس بک نے ہماری دعوت کی اور سفر خرچ کے لیے ر بھیجی۔ طورس سے سغلہ اور سغلہ سے میلاس گئے

میلاس :- میلاس میں بھائی چارہ کیٹی کے ایک
ممبر کی خانقاہ میں ٹھہرے۔ جس نے ہماری بے حد عزت کی اور
اعلیٰ سے اعلیٰ کھانے کھلائے یہ جماعت عجیب جماعت ہے۔
میلاس میں ہماری ملاقات ایک بزرگ سے ہوئی۔ ان کا نام
بابا شتری ہے۔ ڈیڑھ سو سال کی عمر ہے۔ چلتے پھرتے ہیں۔
حافظہ نہایت عمدہ ہے۔

میلاس کا بادشاہ شجاع الدین زرغانی نیک خصلت
بادشاہ ہے۔ میلاس سے دو میل دور برجین میں رہتا ہے۔

برجین نئی آبادی ہے۔ یہاں شاہی محل ہیں۔ جامع
مسجد ہے اور خوب صورت عمارتیں ہیں۔ بھائی چارہ کیٹی کی خانقاہ
برجین میں بھی ہے۔ اس کے مالک علی بھائی ہیں۔

قونیہ :- یہاں سے چل کر ہم قونیہ پہنچے۔ بڑا شہر
ہے۔ مشمش جسے قمر الدین اور خوبانی کہتے ہیں۔ کثرت سے پیدا
ہوتی ہے۔ مصر و شام جاتی ہے۔

کہتے ہیں قونیہ سکندر رومی کا بنایا ہوا شہر ہے۔ آج
کل یہاں کا حکمران سلطان بدر الدین قرمان ہے۔ یہاں کے
قاضی ابن علم شاہ بھائی چارہ کیٹی کے ممبر ہیں۔ ان کی خانقاہ
تمام خانقاہوں میں بڑی ہے۔ شاگرد بھی بہت ہیں۔ قاضی صاحب
نے ہماری بڑی خاطر کی اور اپنے بیٹے کے ساتھ حمام بھیجا۔

قونیہ بڑا بابرکت شہر ہے جس کی خاک میں مولانا
جلال الدین رومی آرام فرماتے ہیں۔ ان کے ماننے والوں
کو جلالیہ کہتے ہیں۔ عراق کے احمدیہ خراسان کے احمدیہ قونیہ کے
جلالیہ ان شہروں میں کثرت سے ہیں۔

کہتے ہیں مولانا جلال الدین رومی طالب علموں
کو پڑھاتے تھے۔ ایک دن حلوہ بیچنے والا
آواز لگاتا ہوا گذرا۔ مولانا نے اس سے حلوا لیا۔ حلوا کھاتے ہی
ہوش و حواس کھو بیٹھے، حلوائی کے پیچھے ہو لیے۔ بہت دنوں
تک طالب علموں نے انتظار کیا۔ پھر ڈھونڈنے نکلے تو پتہ نہ لگا۔
کئی برس بعد لوٹ کر آئے تو عشق الٰہی میں مستغرق تھے
اور اشعار زبان پر جاری تھے۔ انھی اشعار کو طالب علموں نے
لکھ کر جمع کیا ہے۔ اور اب یہ مشہور مثنوی ہے۔ یہاں والے
اس کتاب کا بہت احترام کرتے ہیں۔ جمعرات کے دن بڑے
ذوق و شوق سے مثنوی کی مجلسیں منعقد کرتے ہیں۔

قونیہ میں مولانا رومی کے استاد فقیہ احمد کا مزار بھی ہے۔
قونیہ سے الاندہ ہوتے ہوئے ہم اقصرا گئے۔ الاندہ میں سلطان
بدر الدین سے ملا تو بڑی خاطر کی۔ شاہی مہمان خانہ میں ٹھہرایا۔
کھانا، میوہ چاندی کی تشتریوں میں اور حلوا بھیجا اور خلعت بھی

میری اس کی ملاقات شہر کے باہر ہوئی تھی۔ سلطان
شکار کھیل کر آ رہا تھا۔ گھوڑے پر وہ بھی سوار تھا اور میں بھی
سوار تھا۔ میں اسے دیکھتے ہی سواری سے اتر پڑا اور سلام
کیا۔ وہ بھی سواری سے اتر پڑا اور میرا حال پوچھا۔ بادشاہوں
کو دیکھ کر سواری پر بیٹھا رہنا آدابِ شاہی کے خلاف ہے۔

اقصرا :- روم کے شہروں میں اقصرا اچھا شہر ہے۔
شہر میں تین نہریں ہیں جن کا پانی گھروں میں پہنچتا ہے۔ اقصرا
میں بھیڑ کی اون کا فرش بناتے ہیں جسے اقصرائی کہتے ہیں۔
شام، مصر، عراق، ہندوستان، چین اور ترکوں کے تمام شہروں
میں جاتا ہے۔

اقصرا میں شاہ عراق کی حکومت ہے۔ ہم نے یہاں شریف
حسین کی خانقاہ میں قیام کیا ہے۔ یہ بھی نوجوان پارٹی کے ممبر
ہیں اللہ بڑے اچھے بندے ہیں۔

نکدہ :- اقصرا سے چل کر ہم نکدہ پہنچے۔

یہ بھی شاہ عراق کا شہر ہے۔ شہر کے اندر سے ایک نہر نکل گئی ہے۔ جو باغوں اور چمنوں کو سیراب کرتی ہے۔ اس کا نام نہر اسؤ ہے۔ نہر کے تین پل ہیں۔ یہاں بھائی چارہ کمیٹی کے ممبر اخی جارڈ نے ہمیں اپنے ہاں ٹھہرایا۔ اور دوسرے ممبروں کی طرح خاطر مدارات کی۔ تین دن ٹھہر کر قیساریہ کو کوچ کیا۔

قیساریہ:- یہاں فوجی چھاونی ہے۔ شاہ عراق کی بیگموں میں سے ایک بیگم رہتی ہے۔ اسے بڑی بیگم کہتے ہیں طغی خاتون اس کا نام ہے۔ میں جب اس سے ملنے گیا تو میری بڑی عزت کی۔ کھڑی ہو گئی۔ سلام کیا اور رخصت کے وقت خلعت، گھوڑا اور رقم عنایت کی۔ گھوڑوں کے ساتھ ان کا سازوسامان بھی دیا۔

ہمارا قیام بھائی چارہ کمیٹی کے ممبر اخی امیر علی کی خانقاہ میں ہے۔ امیر علی کی خانقاہ حد درجہ شان دار ہے۔ اب تک جہاں جہاں ہمارا قیام رہا ان سب سے ہر بات میں اعلیٰ ہے۔

اخی امیر علی بہت دولت مند آدمی ہیں۔ مہمانوں کی بڑی مدارات کرتے ہیں۔ روم کے شہروں میں جہاں بادشاہ نہیں ہے، اخی جماعت کے امیر حکومت کرتے ہیں۔ اور مہمانوں کو گھوڑے زادراہ، نقدی اور لباس دیتے ہیں۔ ان کے جلوس نکلتے ہیں تو بادشاہوں جیسے ہوتے ہیں۔ عام لوگ ان کا احترام بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ جیسا حاکم کا ہونا چاہیے۔

قیساریہ سے چل کر ہم سیواس پہنچے۔ شہر کی آبادی اچھی ہے سڑکیں کشادہ ہیں۔ بازاروں میں چہل پہل بھی خوب ہے۔ یہ بھی شاہ عراق کی حکومت میں ہے۔ سیواس میں معزز مہمانوں کے لیے ایک الگ مکان بنا ہوا ہے۔ اسے دارالسیادہ کہتے ہیں۔ فرش اور قالینوں سے آراستہ ہے۔ کھانے وغیرہ کا اور آرام کرنے کا پورا بندوبست ہے۔ رخصت کے وقت مہمانوں کو زادراہ بھی دیا جاتا ہے۔

— ہم شہر میں پہنچے تو اخی احمد ہمارے پاس آئے اور ہم سے ملاقات کی۔ پھر اخی جلبی نے آکر ملاقات کی۔ اخی جلبی کی پارٹی زیادہ معزز اور قوی ہے۔ مگر ہم نے اخی احمد سے وعدہ کر لیا تھا۔ اس لیے عذر کر دیا۔

اخی احمد کی جماعت ہمیں لے کر چلی تو خوشی سے اکڑ اکڑ کر چل رہی تھی جیسے انھوں نے کوئی قلعہ جیت لیا ہے۔ خاطر مدارات کا برتاؤ ان کا بھی ویسا ہی تھا جیسا بھائی چارہ کمیٹی کے ممبروں نے جگہ جگہ ہمارے ساتھ کیا تھا۔

پھر ہمارے پاس قاضی صاحب آئے۔ انھیں امیر علاؤالدین سلطان عراق کے نائب نے بھیجا تھا۔ ان کے ساتھ کوتل گھوڑے تھے اور ہمیں لینے آئے تھے۔ ہم لوگ نائب کے محل کے قریب پہنچے تو نائب نے محل سے باہر نکل کر ہمارا استقبال کیا۔ دیر تک باتیں کرتا رہا اور پوچھتا رہا کہ دوسری جگہ کے بادشاہوں نے آپ کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا۔

میں نے شیراز، اصفہان، کرمان، عراق، شام، مصر اور ترک بادشاہوں کا ذکر کیا اور ہر ایک کی تعریف کی جس سے امیر بہت خوش ہوا۔ پھر کھانا لایا گیا۔ کھانے کے بعد امیر نے کہا جب تک آپ یہاں رہیں میرے مہمان ہیں۔ اخی جلبی موجود تھے بولے "اب تو یہ میری خانقاہ میں رہیں گے۔ ہاں کھانا آپ بھیجنا چاہیں تو بھیج دیں"۔ امیر رضامند ہو گیا اور ہم چھ دن اخی جلبی کی خانقاہ میں امیر کے مہمان رہے۔ اور جب یہاں سے رخصت ہوئے تو امیر نے اپنے نائبوں کے نام فرمان جاری کر دیا کہ ہم جہاں کہیں پہنچیں ہماری اچھی طرح نگہداشت اور خاطر مدارات کی جائے۔ کھانے پینے کا انتظام کیا جائے اور سفر خرچ دیا جائے۔

(باقی آئندہ)

جناب زین العابدین راہی دھولیوی
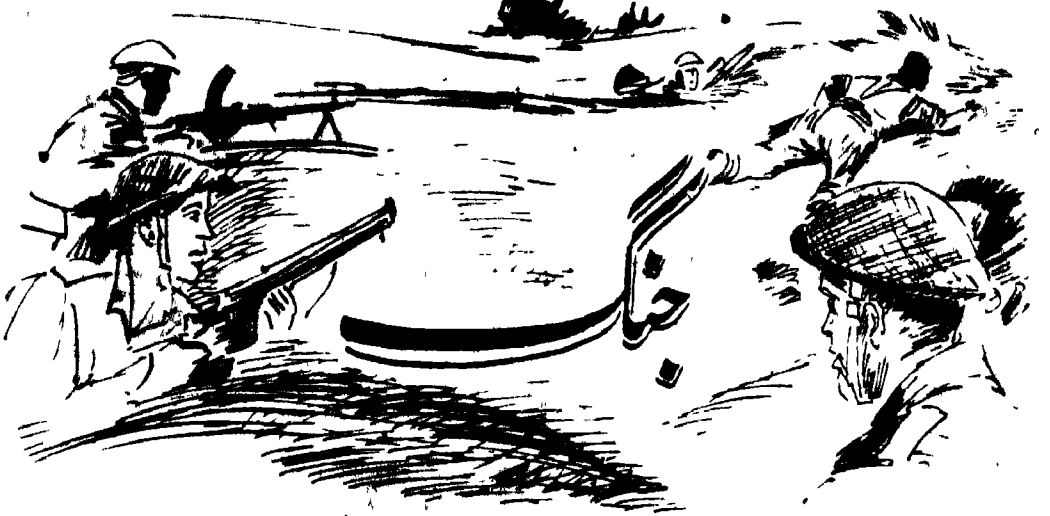
خون کی پیاس جب انساں کو لگا کرتی ہے ۔۔۔ جب بھی دنیا میں کہیں جنگ ہوا کرتی ہے

رقص کرتا ہے بگولا وہاں بربادی کا ۔۔۔ جنگ دیتی نہیں کچھ اور تباہی کے سوا

جب بھی "بارود" محاذوں پہ گرج اٹھتی ہے ۔۔۔ آن کی آن میں ہر چیز مٹا دیتی ہے

اس میں ہوتا نہیں نقصان فقط جانوں کا ۔۔۔ بستیاں روپ بدل لیتی ہیں ویرانوں کا

کتنے اڑ جاتے ہیں بارود کی زد میں آکر ۔۔۔ درد سے کتنے تڑپتے ہیں اپاہج بن کر

نو عروسوں کے سہاگ اس میں اجڑ جاتے ہیں ۔۔۔ کتنے بیٹے بھی تو ماؤں سے بچھڑ جاتے ہیں

جنگ ہے دیش کی قسمت کو پریشاں کرنا ۔۔۔ یعنی خود اپنے لیے موت کا ساماں کرنا

کیا وہ انسان ہیں جو جنگ کیا کرتے ہیں ۔۔۔ ملک کو بھوک اور افلاس دیا کرتے ہیں

تم جواں ہو کے سدا امن سے رہنا بچو
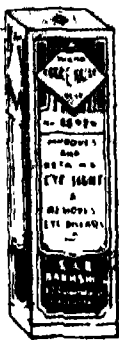
جنگ ہے چیز بری، جنگ نہ کرنا بچو

اُلّو اور کوّے کی دشمنی :-

شہر کے پاس ایک گھنے پیپل کے پیڑ پر بہت سے پرندے گھونسلے بنا کر رہا کرتے تھے ۔ کوّوں کا بھی اسی پیڑ پر ٹھکانا تھا۔ ان کوّوں کا ایک راجہ بھی تھا۔ اسے اس کی رعایا کوّے شاہ کہتی تھی ۔

وہاں سے کچھ دور پہاڑوں کے غار میں الوؤں کا ٹھکانا تھا۔ ان کے راجہ کا نام الو شاہ تھا ۔

دونوں میں بڑی سخت دشمنی تھی۔ الو شاہ ہر رات پیپل کے چاروں طرف چکر لگاتا کوئی اکا دکا کوا مل جاتا تو اسے مار ڈالتا۔ اس طرح ایک ایک کرکے اس نے سینکڑوں کوّوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

دشمن کا مقابلہ

پنچایت بلا کر الو شاہ کے حملوں سے بچنے کے لیے کوّوں کی رائے جاننی چاہی۔ اپنے وزیروں سے کہا "سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ ہم رات کو دیکھ نہیں سکتے اور دن کو الو کا کہیں پتہ نہیں لگتا۔ ہمیں ان کے ٹھکانے کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ دشمن کو نیچا دکھانے کے لیے کیا تدبیر کی جائے۔"

لڑائی سے پہلے سمجھوتا !

کوّے شاہ نے سب سے پہلے اپنے "مصلحت اندیش" نام کے وزیر سے مشورہ کیا۔ اس نے جواب دیا۔ "مہاراج اگر دشمن طاقتور ہو تو اُس سے مقابلہ نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ اس سے سمجھوتا کرنا ہی مناسب رہتا ہے۔ لڑائی سے نقصان ہی نقصان ہے۔ دشمن برابر کا ہو تو پہلے اُس سے مصالحت کرکے اپنی طاقت بڑھا کر پھر لڑائی کرنی چاہیے۔"

اس کے بعد اس نے "اکرغان" نام کے وزیر

سے مشورہ کیا۔

دشمن سے لڑنا ہی ٹھیک ہے۔

اکڑ خاں نے کہا "مہاراج! دشمن کے ساتھ سمجھوتا نہیں کرنا چاہیے۔ دشمن سمجھوتا کر لینے کے بعد بھی بربادی پر تلا رہتا ہے۔ پانی اور آگ کا بھلا کیا میل۔ آگ پر اگر پانی ڈالا جائے تو پانی گرم ہو کر بھی آگ کو بجھا ہی دیتا ہے۔ دشمن کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے سے اس کی دشمنی کی آگ اور بھی بھڑک اٹھتی ہے۔ اگر کسی دشمن کے ساتھ آمنے سامنے کی لڑائی نہ لڑی جا سکتی ہو تو پھر دھوکے دھڑی سے اسے زیر کرنے کی کوشش کرنی چاہیے مگر دشمن سے سمجھوتا کبھی نہ کرنا چاہیے۔

دشمن سے پیچھا چھڑانا چاہیے

کوّے شاہ نے اس کے بعد اپنے "رحم دل خاں" نام کے وزیر کی رائے پوچھی۔

رحم دل خان نے کہا "حضور ہمارا دشمن بہت موذی ہے۔ طاقت میں ہم سے کہیں زیادہ ہے، اس لیے اس سے سمجھوتا کرنے میں یا لڑائی مول لینے میں دونوں ہی میں خطرہ ہے اس لیے حکمت عملی اس میں ہے کہ ہم یہاں سے کہیں دور چلے جائیں۔ ہمارے بزرگوں کی کتابوں میں بھی یہی لکھا ہے۔ اس حالت میں پیچھے ہٹنا بزدلی نہیں ہے شیر بھی تو حملہ کرنے سے پہلے کچھ پیچھے ہٹتا ہے۔ بہادری دکھانے کے گھمنڈ میں جو بغیر سوچے سمجھے مرنے مارنے پر تل جاتا ہے۔ وہ اپنے دشمن کی مراد پوری کرتا ہے۔ اس طرح وہ خود بھی برباد ہوتا ہے۔ اور اپنی تمام نسل کا خاتمہ کر دیتا ہے۔

اپنا قلعہ مضبوط بناؤ۔

اب کوّے شاہ کی نظر "اطمینان خاں" نام کے وزیر پر پڑی۔ وہ تو جیسے اپنی باری کا انتظار ہی کر رہے تھے۔ بادشاہ کی نظر پڑتے ہی بول اٹھے "حضور مجھے ان تینوں میں سے کوئی بھی ترکیب پسند نہیں آئی۔ نہ تو ہمیں سمجھوتا کرنے کی ضرورت ہے نہ بڑھ کر حملہ کرنے کی۔ اپنی جگہ چھوڑ کر کہیں اور چلے جانے کی بات کو تو میں بالکل ہی غلط سمجھتا ہوں۔ ہمیں تو اپنی ہی جگہ پر مضبوطی سے ڈٹے رہنا چاہیے۔ اپنے قلعے کو اور مضبوط بنانا چاہیے۔ اپنی جگہ پر مضبوطی سے جما رہنا سب سے اچھی تدبیر ہے۔ پانی میں بیٹھا ہوا مگرمچھ ایک ذرا سے اشارے میں شیر کو بھی مات کر سکتا ہے۔ ہاتھی کو بھی پانی میں کھینچ کر لا سکتا ہے مگر اپنی جگہ چھوڑ دے تو خشکی پر ایک چوہا بھی اس کی ایسی تیسی کر کے رکھ دے۔ اپنے قلعہ میں بیٹھ کر ہم بڑے سے بڑے دشمن کا سامنا کر سکتے ہیں۔ اپنے قلعہ میں بیٹھا ہمارا ایک سپاہی، دشمن کے سو سو سپاہیوں پر بھاری ہو سکتا ہے اگر میری مانیے تو ہمیں کسی چکر میں نہ پڑنا چاہیے۔ اپنے قلعہ کو مضبوط بنانے پر لگ جانا چاہیے۔ آپ نے دیکھا نہیں ہے کہ اپنی جگہ پر مضبوطی سے کھڑے ہو کر چھوٹے چھوٹے پیڑ پودے کس طرح آندھی اور طوفان کا مقابلہ کر لیتے ہیں۔

دوسروں کو اپنی طرف ملا کر لڑو۔

اب کوّے شاہ نے "دور اندیش" نام کے وزیر کو اشارہ کیا۔ دور اندیش میاں نے کہا "جب دشمن طاقت ور ہو تو پھر کسی طاقت ور کو اپنا دوست بنا کر اور اسے ساتھ لے کر ہی مقابلہ کرنا چاہیے۔ کوئی ایک طاقت ور ساتھی اس موقع پر نہ مل سکے تو پھر چھوٹے

چھوٹے کئی دوستوں کو اپنی حمایت پر لے آنا چاہیے۔ ننھے
ننھے ریشوں سے بٹی ہوئی رسی بھی اتنی مضبوط ہو جاتی ہے
کہ وہ ہاتھی کو جکڑ کر باندھ لیتی ہے۔

پانچوں وزیروں سے مشورہ کرنے کے بعد کوّے
شاہ نے اپنے خاص وزیر کو بلوایا اور کہا "میرے پانچوں
وزیروں نے الگ الگ طرح کی رائے دی ہے۔ آپ ذرا ان
سب کی صلاح کو سن کر کوئی مناسب مشورہ دیجیے۔"

خاص وزیر نے کہا "حضور! سبھی وزیروں نے اپنی اپنی
جگہ ٹھیک مشورہ دیا ہے۔ سبھی تدبیریں اپنے اپنے وقت کے لیے
مناسب ہیں۔ اس وقت اچھا یہی ہوگا کہ پہلے ہم دشمن سے
سمجھوتا کر کے اس کے دل میں اعتماد پیدا کریں۔ مگر خود دشمن
پر بھروسا نہ رکھیں۔ سمجھوتا کر کے لڑائی کی تیاری کی جائے
اور تمام تیاری مکمل ہو جائے تو لڑائی چھیڑ دیں۔ تیاری
کے زمانے میں ہمیں دشمن کے کمزور ٹھکانوں کا برابر پتہ لگاتے
رہنا چاہیے اور جب ان کے کمزور مورچوں کا پتہ لگ جائے
تو وہیں حملہ کرنا چاہیے۔"

کوّے شاہ نے کہا "ہاں یہ مشورہ تو مجھے بھی ٹھیک
لگا۔ مگر دشمن کے کمزور ٹھکانوں کا پتہ کیسے لگایا جائے؟"

خاص وزیر نے کہا "یہ کام جاسوسوں کے کرنے
کا ہے۔ جاسوس ہی شاہ کی آنکھ ہوتے ہیں۔"

خاص وزیر کی بات سننے کے بعد کوّے شاہ نے
پوچھا "مگر بھائی ذرا یہ تو بتائیے کہ کوّوں اور الوؤں میں سدا
سے بیر کیوں چلا آتا ہے۔ آخر اس کی بھی تو کوئی وجہ ہوگی۔"

خاص وزیر نے تب الوؤں اور کوّوں کے بیر کی کہانی
سنائی۔

الو کی تاج پوشی

ایک بار ہنس، توتا، مور، کوئل، کبوتر، چکور اور
الو وغیرہ سب پرندے آپس میں مشورہ کر رہے تھے کہ
ان کا راجہ گروڑ ان کی جان مال کی حفاظت کے لیے کچھ
نہیں کرتا اور ہر وقت بس بھگوان کی پوجا میں لگا رہتا ہے
اس لیے چڑیوں کو اپنا کوئی دوسرا راجہ چن لینا چاہیے۔ کئی
دن تک یہ مشورہ چلتا رہا اور بعد میں سبھی پرندوں نے
اتفاق رائے سے الو کو اپنا راجہ چن لیا۔

تاج پوشی کی رسم کی تیاری ہونے لگی۔ ہیرے
جواہرات سے جڑا ہوا تخت تیار کیا گیا اور سونے کا
تاج بنا۔ چڑیوں نے ناچنا گانا شروع کیا۔ اور الو مہاراج
تخت پر بیٹھنے ہی والے تھے کہ ادھر سے کہیں کوّے میاں
آ گئے۔

کوّے نے آؤ دیکھا نہ تاؤ بھری محفل
میں پوچھ بیٹھے کہ یہ سب دھوم دھام کس بات کی ہے۔
چڑیوں نے اس بن بلائے کوّے کو اپنی محفل میں دیکھا تو
انھیں بڑی حیرت ہوئی۔ مگر انھوں نے سوچا کہ کوا تمام
پرندوں میں سب سے زیادہ چالاک ہوتا ہے لاؤ اسے بھی اپنی
رائے میں شریک کر لیا جائے اور تمام پرندے کوّے کو گھیر کر بیٹھ
گئے۔ الو کو راجہ بنانے کی بات سن کر کوا ہنس پڑا اور کہنے
لگا "یہ بھی کیا انتخاب ہوا؟"

مور، ہنس، سارس، کوئل اور چکور جیسے خوب صورت
پرندوں کو چھوڑ کر ٹیڑھی چونچ والے دن کے اندھے الو
کا چناؤ کیا جائے۔ یہ بات ہماری سمجھ میں تو نہیں آتی اور
پھر یہ بات بھی کہ الو بد مزاج ہوتا ہے اور زبان کا بھی کڑوا
بھلا اسے راجہ بنا کر کیا کرنا ہے اور یہ بھی تو سوچو گروڑ
راج کا سایہ ابھی ہمارے سر پر موجود ہے۔ ایک راجہ کے
رہتے دوسرے کو راجہ بنانا اپنی بربادی مول لینے
کے برابر ہے جس طرح دھرتی پر ایک سورج

ہوتا ہے جو اپنی چمک سے دنیا کو روشن رکھتا ہے اگر زمین پہ ایک سے زیادہ سورج ہو جائیں تو کیا ہماری زمین جل نہیں اٹھے گی۔ اگر ایک ملک میں ایک سے زیادہ راجہ ہو جائیں تو وہ ملک برباد ہو جاتا ہے۔

راجہ ایک ہی ہوتا ہے۔ اس کے نام کی مالا جپنے سے ہی سارے بگڑے کام بن جاتے ہیں جس طرح خرگوش نے اپنے راجہ چاند کا نام لے کر ہی ہاتھیوں کے جھنڈ سے چھٹکارا حاصل کیا تھا۔

پرندوں نے پوچھا وہ کیسے۔

تب کوّے نے ہاتھی اور خرگوش کی یہ کہانی سنائی۔

(یہ کہانی اگلے پرچے میں پڑھیے گا۔)

گل پارے

زندگی کی شان بن کر مسکرانا چاہیے
چودھویں کا چاند بن کر جگمگانا چاہیے
راز پوشیدہ ہے اس میں کامیابی کا عقاب
قوتِ بازو کو ہر دم آزمانا چاہیے

*

ہر گھڑی امداد کرنا چاہیے مظلوم کی
لازمی ہے قدر اے ناداں دلِ مظلوم کی
اس عمل میں عظمتِ آدم کے پنہاں راز ہیں
یہ حقیقت تجربے کی راہ سے معلوم کی

جناب سعید عقاب

فرق

(دنیا بھر کے بڑوں کے نام چھوٹے بچوں کی طرف سے میمورنڈم)

ہم بچے بھی لڑتے ہیں
خون خرابہ کرتے ہیں
لیکن پھر مل جاتے ہیں
جنگ کرو ــــ لیکن یہ کیا
ختم نہ ہو جو برسوں تک
آدمیت بھی زخمی ہو
زیست بھی روتی پھرتی ہو
قدم قدم ہوں موت کے جال
جیون رین اندھیری ہو
مانوتا کے رکھوالو ــــ!
جنگوں سے باز آ جاؤ
اندھیاروں کو دور کرو
دنیا کو پُر نور کرو!
امن کی دولت لٹنے دو
ہم بچوں کو بھی دیکھو
ہم بچے بھی لڑتے ہیں
خون خرابہ کرتے ہیں
لیکن پھر مل جاتے ہیں

جناب عبدالرحیم نشتر

جناب سطوت رسول جامعہ رورل انسٹی ٹیوٹ جامعہ نگر نئی دہلی

لوری

میری آنکھ کے تارے سو جا، میرے راج دلارے سو جا
کرتی ہوں آنچل کی چھاؤں

یہ بکھرے بکھرے سے سپنے، آنکھوں میں کھو جائیں
کتنی کومل خوشیاں بن کر آشائیں مسکائیں
میری آنکھ کے تارے سو جا، اے میرے پیارے سو جا
کرتی ہوں آنچل کی چھاؤں

چندا ماموں دیکھ رہا ہے، تیرے ہنس مکھ جیون کو
اپنی کرنیں بھیج رہا ہے، پھیلے پھیلے آنگن کو
میری آنکھ کے تارے سو جا، اے میرے من پیارے سو جا
کرتی ہوں آنچل کی چھاؤں

میٹھی نیند سے آنکھیں بوجھل ہوتی ہیں جب تیری
اور روپہلی ہو جاتی ہے آس کی چھاؤں گھنیری
میری آنکھ کے تارے سو جا، میرے جگ اجیارے سو جا
کرتی ہوں آنچل کی چھاؤں

ماں کو نیند نہیں آئے گی، تو ہی نہ جب تک سو جائے
دیکھ یہ کھوٹے کھوٹے سے ہیں، بکھرے سائے
میری آنکھ کے تارے سو جا، ننھے منے پیارے سو جا
کرتی ہوں آنچل کی چھاؤں

جناب شاہ مقیم مونگیری

ہمارا پڑوسی دیس

نیپال

(۲)

پچھلے مضمون میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ نیپال کوئی ایسا بڑا دیس نہیں۔ مگر اس دیس میں کچھ چیزیں ہیں جن کی بدولت ساری دنیا میں اس کا نام اونچا ہے۔ ماونٹ ایورسٹ اسی نیپال میں تو ہے۔ اس کی چوٹی ۲۹ ہزار دو سو فٹ ہے۔ دنیا میں سب سے اونچی چوٹی۔ سالہا سال سے ملکوں ملکوں کے جیالوں نے اسے سر کرنے کی کوشش کی۔ بہت سے بہادروں نے اس کوشش میں اپنی جانیں قربان کیں۔ آخر ہندوستان آزاد ہونے کے بعد تینزنگ اور اڈمنڈ ہلاری نے اسے سر کیا۔

نیپال کے علاقے میں ایک ہی نہیں اور بھی کئی اونچی اونچی چوٹیاں ہیں۔ کنچن چنگا ۲۸ ہزار ایک سو چھیالیس فٹ اونچا ہے۔ مکالو ۲۷ ہزار سات سو نوے فٹ اونچی ہے۔ دھولاگیری ۲۶ ہزار ۸۲۶ فٹ، گوسائین تھان ۲۶۲۹۱ فٹ اور نندا دیوی ۲۵۶۰۰ فٹ اونچی ہے۔

غرض نیپال بہت سے لدے ہوئے پہاڑوں کا دیس ہے۔ یہاں کی آب و ہوا کا کیا کہنا۔ صحت کے لیے اکسیر ہے۔ ہاں برسات کے بعد سطح سمندر سے چار ہزار اونچی گھاٹیوں یا پہاڑ کی اور ترائی کے علاقے کی آب و ہوا برسات میں اور برسات کے بعد خراب ہو جاتی ہے۔ ملیریا بڑے زوروں سے پھیلتا ہے۔

نیپال کا رہن سہن :-

شہروں کے پڑھے لکھے اور اونچے طبقے پر نیا رنگ چڑھ گیا ہے۔ انھیں آپ عموماً سوٹ بوٹ میں دیکھیں گے۔ ان کا رنگ گورا ہوتا ہے۔ ناک نقشہ بھی قاعدے کا۔ اپنے رہن سہن اور لباس وغیرہ سے بالکل انگریزوں جیسے لگتے ہیں۔

دیہات میں مختلف ذاتیں بستی ہیں۔ گورکھا قوم کے لوگ لباس اور رہن سہن میں دوسری ذاتوں میں اونچے ہیں یوں تو تمام نیپالی بہت بہادر اور نڈر ہوتے ہیں مگر گورکھوں کی بہادری تمام دنیا میں مشہور ہے۔ اسی بہادری کی وجہ سے انگریز سرکار اور ہمارے دیس ہندوستان کی سرکار انھیں بڑی چاہت سے اپنی فوج میں بھرتی کرتی ہے۔

ویسے نیپال کے دیہاتوں کے لوگ عموماً معمولی طریقے سے رہتے سہتے ہیں۔ ان کا لباس مکان روزانہ کے استعمال کی چیزیں بھی سادہ اور معمولی ہوتی ہیں غذا بھی سادہ ہوتی ہے۔ سردی بہت پڑتی ہے۔ نہانے

ی ہمت نہیں پڑتی ۔ چھ چھ مہینے نہانے کی نوبت نہیں آتی
ہت سے ایسے غریب لوگ ہیں جنھیں زیادہ کپڑے نصیب نہیں
یں ان کے کپڑوں سے بو آنے لگتی ہے ۔

بچے بوڑھے جوان سب چست پاجامہ، گھٹنوں تک لمبا
رتا پہنتے ہیں ۔ کرتے پر جیکٹ سر پر گول ٹوپی ۔ گرمیوں میں عموماً
یلے یا کپاسی رنگ کا کرتا پاجامہ پہنتے ہیں ۔ کئی ہاتھ لمبا کمر بند
بھی کمر میں رہتا ہے ۔ کھوکھری یا بھجالی اسی کمر بند میں
ڑسی ہوئی ہوتی ہے ۔ جاڑوں میں جاکٹ یا بنڈی میں روئی
ھروا لیتے ہیں ۔ مال دار لوگ روئی کی جگہ اون بھروا لیتے ہیں ۔

نیپال میں ننگے سر رہنا برا سمجھتے ہیں طرح طرح کے ڈزائنوں
ی گول ٹوپی پہنتے ہیں ۔ کھاتے پیتے لوگ ٹوپی کی جگہ پگڑی
ندھتے ہیں ۔ دولہا کی پگڑی قیمتی کپڑوں کے فیتے لگے ہوئے

نواری ذات کے لوگ کرتک کپڑے پہنتے ہیں گرمی
جاڑے کی کمی یا زیادتی میں سوتی یا اونی کپڑے کا موٹا پاجامہ
ہنتے ہیں ۔

سدمی نامی مقام پر نوار ذات کی عورتیں گھاگھرے
سا لمبا کرتا پہنتی ہیں یہ ٹخنوں سے نیچے تک ہوتا ہے ماتھے
کالی ٹوپی ۔ شاہی گھرانے اور دولتمند خاندانوں کی عورتیں
ں کپڑے کو پہنتی ہیں ۔ اس کی لمبائی ساڑھے اسی گز تک
رتی ہے ۔ بہت باریک اور نرم و نازک کپڑا ہوتا ہے ۔ مگر
باس پہن کر باہر نہیں نکلتیں ۔ شاہی گھرانے کے لوگ سر پر
م قسم کے پروں اور موتی الماس اور ہیرے جڑے تاج
نتے ہیں گھٹنوں تک لمبا ریشمی کرتا اور پاجامہ پہنتے ہیں ۔

نیپال میں زیورات کا رواج اب بھی ہے ۔ سر پر
نے کا جڑاؤ پھول، گلے میں سونے موتی کی مالا،
نہ میں انگوٹھی، کان میں بالے اور کرن پھول،
ل میں نتھ وغیرہ ۔ یہ زیور عام طور پر سونے
کا ہوتا ہے ۔ غریب لوگ سونے کی جگہ چاندی، استعمال کرتے
ہیں ۔ نیپالی عورتیں خوشبودار پھولوں کو بہت پسند کرتی ہیں ۔
تہوار کے دنوں میں اپنے بال پھولوں سے خوب سجاتی ہیں ۔

کھانا پینا :-
مال دار لوگ بہت اچھی غذا کھاتے ہیں ۔
غریب لوگ پیسے کی کمی کی وجہ سے گوشت نہیں کھا سکتے سبزی
ترکاری سے پیٹ بھر لیتے ہیں ۔ کچی ترکاریاں، اُبلا ہوا لہسن
یا پیاز اور مولی وغیرہ کھاتے ہیں ۔ کھانا ہضم کرنے کے لیے
مولی کی چٹنی بناتے ہیں اور کھانے کے ساتھ استعمال کرتے
ہیں ۔ اسے سنکی کہتے ہیں ۔ ہم آپ اس سنکی کی بو سے ناک بھوں
چڑھائیں مگر یہ خوب مزے سے کھاتے ہیں ۔ شراب سے عموماً
پرہیز کیا جاتا ہے ۔ کہیں کہیں نیچے طبقے کے لوگوں میں اس کا
رواج ہے ۔ ہاں چائے کا بہت رواج ہے ۔ غریب لوگ
دعا گھر چائے پیتے ہیں ۔ یہ ایک قسم کی گھاس کی پتی ہوتی ہے ۔

نیپال کے گاؤں :-
نیپال کے گاؤں عموماً چھوٹے
چھوٹے ہوتے ہیں ۔ پچیس یا زیادہ سے زیادہ ۳۰ گھروں کے
ان گاؤں کے مکان ہمارے گاؤں کے مکانوں سے مختلف
ہوتے ہیں ۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ گاؤں جنگلوں سے
گھرے ہوتے ہیں ۔

مکان کس طرح بناتے ہیں ؟
سا کھو پیڑ کے بڑے بڑے تنوں کو بیچ سے چیر کر دو
حصے کر لیتے ہیں ۔ جس طرح ہم لوگ بانس وغیرہ کی ٹٹیاں بناتے
ہیں اسی طرح ان چرے ہوئے تنوں کو جوڑ کر کھڑا کر
دیتے ہیں ۔ انھیں بڑی بڑی میخوں سے جوڑ کر مضبوط
کر دیتے ہیں ۔ یہ مکان بہت مضبوط ہوتے ہیں ۔

بڑے سے بڑا طوفان انھیں ہلا نہیں سکتا ۔

مکان کی یہ دیواریں ہی نہیں ۔ گھر کی ہر چیز لکڑی کی ہوتی ہے ۔ ستون لکڑی کے دروازے، دروازوں کے کوا کڑی کے چھت لکڑی کی کھڑکیاں لکڑی کی ۔

گھنے جنگلوں میں بنے ہوئے مکان زمین سے دس فٹ اونچے ہوتے ہیں ۔ ساکھو کے پیڑ کے موٹے موٹے تنے زمین میں گاڑ دیتے ہیں ۔ دس فٹ کی اونچائی سے مکان بنانا شروع کرتے ہیں ۔ ان مکانوں پر چڑھنے کے لیے سیڑھیاں ہوتی ہیں چڑھ جاتے ہیں تو سیڑھیاں اوپر اٹھا لیتے ہیں ۔

یہ احتیاط جنگلی جانوروں کی وجہ سے کی جاتی ہے ۔
نیپال کے جنگلوں میں ہر قسم کے جانور پائے جاتے ہیں ۔ شیر تو ایسے گھومتے پھرتے ہیں جیسے ہمارے گھروں میں بلیاں ۔ ان شیروں کے ڈر سے رات کو آگ بھی روشن رکھتے ہیں ۔ شیر آگ کو دیکھ کر دور ہی دور رہتے ہیں ۔

ہاٹ بازار :-

ہمارے دیس کی طرح نیپال کے دیہات میں بھی ہاٹ یا ہفتہ واری بازار لگتے ہیں ۔ ان بازاروں میں روزمرہ کے استعمال کی چیزوں کی خرید و فروخت ہوتی ہے ۔ ان بازاروں کی چھوٹی چھوٹی دکانوں پر عموماً عورتیں ہی بیٹھتی ہیں ۔ مرد کھوکھری یا بھالی لٹکائے ادھر اُدھر گشت میں مصروف رہتے ہیں ۔

جادو ٹونے :-

نیپال میں جادو ٹونوں پر بہت اعتقاد ہے ۔ نیپال کا جادو یوں بھی مشہور ہے ۔ کسی کو کسی سے دشمنی ہو تو طرح طرح کے جادو ٹونے کرکے دشمن کو نیچا دکھانا چاہتا ہے ۔ ماں، دادی اور بڑی بوڑھیاں اپنے بچوں کو جادو ضرور سکھاتی ہیں ۔

غرض نیپال دیس خوبصورت منظروں کا دیس ہے ۔
برف سے ڈھکے اونچے اونچے پہاڑوں کا دیس ہے ۔ ہرے بھرے جنگلوں کا دیس ہے ۔ خوبصورت پھول پودوں کا دیس ہے ۔ قدرتی چشموں اور جھرنوں کا دیس ہے ۔ یہی جھرنے اور چشمے آپس میں مل کر بڑی بڑی ندیوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں ۔ گنگا، جمنا، گومتی وغیرہ اسی طرح بنی ہیں ۔

جیسا یہ دیس خوبصورت ہے ۔ ویسے ہی اس دیس کے باسی ہنس مکھ ہیں، زندہ دل ہیں، خوش اخلاق ہیں، مہمان نواز ہیں ۔ کیا مجال جو کوئی مہمان ان کے گھر سے کچھ کھائے بغیر چلا جائے ۔ پھر ایمان دار ہیں ۔ دیانت دار ہیں اسی لیے ہمارے ہاں لوگ چوکی پہرے پر زیادہ تر انھی کو رکھتے ہیں ۔

بہت محنتی اور جفاکش ہیں ۔ نیپال میں جہاں سڑکیں نہیں ہیں ۔ وہاں خود یہ نیپالی بوجھ ڈھونے کا اور "سواری ڈھونے" کا کام کرتے ہیں ۔ اپنی پیٹھوں پر ایک گدی دار جھولا بنائے رکھتے ہیں ۔ اس جھولے میں آدمی کو بٹھا کر بے تکان اوپر چڑھ جاتے ہیں ۔ تازہ طور پر جمی برف میں کہیں ٹخنوں تک اور کہیں کہیں گھٹنوں تک دھنس جاتے ہیں ۔ مگر یہ ذرا پرواہ نہیں کرتے بے خوف و خطر ان برفیلے پہاڑوں پر سواریاں اور سامان لادے چلتے پھرتے ہیں ۔

...اب اقبال مہدی ام۔ اے
...یچرس کالج جامعہ

ایک دن کیا ہوا

کھانا پکانے سے فارغ ہو کر امی نے دودھ
... آگ پر رکھی۔ سلیم اور سلمہ کو بلا کر کہا۔ "تم دونوں
...کو دیکھتے رہنا۔ تین اُبال آجائیں تو اتار لینا۔
...ذرا نماز پڑھ لوں۔ دیکھو کھیل میں نہ لگ جانا۔"
یہ کہہ کر امی چلی گئیں۔ سلیم اور سلمہ دونوں
خوشی باورچی خانے میں بیٹھ گئے۔ دونوں خوش
امی نے ہمیں کام سونپا۔ دونوں کی خواہش تھی
... کام سے امی کو خوش کریں۔

اُبال آنے میں ابھی دیر تھی۔ دودھ دھیرے
...ے گرم ہو رہا تھا۔ ابھی ملائی کی جھلی بھی نہیں
... سلیم اور سلمہ کچھ دیر تک چپ چاپ بیٹھے دودھ کو
...ہے۔ آخر طبیعت اکتانے لگی۔ کب تک خاموش بیٹھے
...نے پرنچ تیز کرنی چاہی۔ تاکہ جلدی ابال آجائے۔
...نے اسے منع کیا کہ نہیں یہ ہو جائے گا وہ ہو جائے
... طرح دونوں میں باتیں ہونے لگیں۔ بات چیت
...ا کھوئے کہ دودھ کی طرف دھیان نہ رہا۔

اچانک سلمہ کی نظر دودھ پر پڑی۔ دیکھا
...ا شروع ہو گیا ہے۔ دودھ آہستہ آہستہ
اونچا اٹھتا جا رہا ہے۔ اور بس پتیلی کے کناروں تک آنے
ہی والا ہے وہ ایک دم چلائی۔ "بھائی جان دودھ"۔

سلمہ کے چلانے سے سلیم بھی گھبرا گیا۔ دونوں
ہی گھبرا گئے تھے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کریں۔ بس
دونوں گھبرائی ہوئی نظروں سے دودھ کو تکے جا رہے
تھے۔ اتنے میں سلمہ نے ہاتھ بڑھا کر پتیلی کو آگ پر سے اتارنا
چاہا۔ پتیلی کو چھوا ہی تھا کہ انگلیاں جل گئیں۔ سی کر کے اس
نے جلی ہوئی انگلیوں سے اپنے دونوں کانوں کی لویں
پکڑ لیں۔ پھر نظر اوپر اٹھتے ہوئے دودھ پر پڑی تو گھبرا
کر پتیلی اتارنے کے لیے پھر ہاتھ بڑھا دیے۔ جل جانے کا
خیال آیا تو پھر رک گئی اور دودھ پر جلدی جلدی پھونکیں
مارنے لگی۔ "سی۔ پھو۔ سی۔ پھو۔ سی۔ پھو۔"

اس وقت تک سلیم کے ہوش و حواس بھی بجا
ہو چکے تھے۔ سلمہ کو ناکام دیکھ کر وہ آگے بڑھا۔ "پانی
لاؤ۔" اس نے سلمہ سے کہا اور خود دودھ میں پھونکیں
مارنے لگا۔

سلمہ نے ادھر ادھر دیکھا۔ وہاں کسی برتن
میں پانی نہ تھا۔ وہ پانی لانے غسل خانے کی

طرف بھاگی۔ یہاں دودھ کا اُبال سلیم کی پھونکوں سے نہیں رک رہا تھا۔ گھبرا کر اس نے بھی ہاتھوں سے پکڑ کر پتیلی اتارنے کی کوشش کی۔ اس کی انگلیاں بھی جل گئیں۔ اب اس نے قمیص کے دامن سے پکڑ کر پتیلی اتارنی چاہی۔ اتنے میں دودھ پتیلی سے اُبل کر گرنے لگا۔ سلیم نے ہاتھ ہٹا لیے۔ دودھ آگ پر گرنے لگا۔ اوپر کی ساری ملائی بھی نکل گئی۔ تیز بُو کے ساتھ آگ میں سے دھواں اٹھنے لگا۔

اتنے میں سلمہ پانی لے کر بھاگتی ہوئی آئی اور جلدی سے سارا پانی پتیلی میں الٹ دیا۔ دودھ کا اُبال تو خیر بیٹھ گیا مگر پتیلی بھر گئی۔ غرض اس طرف سے اطمینان ہوا تو دونوں کی جان میں جان آئی۔ اب اپنی تکلیف کا احساس ہوا۔ دونوں اپنی اپنی انگلیاں سہلانے لگے اور ایک دوسرے کو دکھانے لگے۔ ابھی اس کام سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ دودھ میں پھر اُبال آنا شروع ہوا۔ اب دونوں پر پھر گھبراہٹ طاری ہوئی۔

سوچ رہے تھے کہ کیا کریں۔ پانی ڈالنے کا خیال آیا تو دیکھا کہ برتن پھر خالی ہے۔ سلمہ پھر پانی لینے بھاگی۔ دودھ جلنے کی بو امی کو نماز پڑھتے ہی میں آگئی تھی۔ سلمہ کی بھاگ دوڑ سے بھی انھیں اندازہ ہوگیا تھا۔ سلام پھیر کر نکلیں۔ باورچی خانے میں پہنچیں تو دیکھا کہ دودھ اُبل اُبل کر زمین پر گر رہا ہے اور سلیم پھونکیں مار مار کر اُبال روکنے کی کوشش کر رہا ہے۔ جلدی سے پتیلی اتار کر انھوں نے نیچے رکھی۔ ان کی انگلیاں بھی جلیں۔ اتنے میں سلمہ بھی پانی لے کر آگئی۔ امی نے ڈانٹا۔ "پہلے سے پانی لے کر نہیں بیٹھ سکتی تھیں۔ جب اُبال آگیا تب دوڑتی پھر رہی ہیں۔"

امی دونوں پر بہت ناراض ہوئیں۔ "ذرا عقل نہیں ہے ان لوگوں کو۔ کوئی کام ڈھنگ سے نہیں کر سکتے۔"

سلیم اور سلمہ منہ لٹکائے۔ انگلیاں سہلاتے چپ چاپ امی کے ساتھ باورچی خانے سے نکل آئے۔

بڑوں کی کوششیں

پانچ منٹ

اتوار کا دن تھا۔ کالج کی چھٹی تھی۔ صبح تھوڑا سا کام تھا وہ کر لیا اور بہت جلدی ہی خالی ہوگئی۔ اب مشکل یہ تھی کہ وقت کو کیسے گزارا جائے۔ کچھ سوچا تو میں اپنی کتابوں کے پاس جا کر بیٹھ گئی اور لگی ان کو الٹنے پلٹنے لیکن وہاں میرا دل نہ لگا تو اٹھ گئی۔ دو تین ناول پڑے تھے ان کو الٹا پلٹا لیکن ان میں بھی دل نہ لگا کیوں کہ وہ بھی پڑھے ہوئے تھے۔ اب کیا کروں؟ یہ سوال دل میں اپنا جواب مانگنے کے لیے بے چین تھا۔ خالی بیٹھا جاتا نہ تھا لیکن کام بھی کوئی نہیں تھا۔ پھر ایک دم سے خیال آیا کہ کیوں نہ گیتا ہی پڑھ لی جائے اور یہ خیال آتے ہی میں گیتا لے آئی اور لگی اسے پڑھنے۔ ابھی آدھا گھنٹا ہی ہوا تھا کہ میری ایک سہیلی آگئی۔ میں نے اسے دیکھا تو جھٹ پٹ گیتا رکھ دی اور اس کے ساتھ باتیں کرنے لگی۔ باتوں باتوں میں میں نے کہا کہ بھئی آج تو وقت کاٹنا بھی بڑا ہی مشکل ہوگیا ہے تم ہی کوئی ترکیب بتاؤ کہ اس کے لیے کیا کیا جائے۔ ابھی میں اتنا کہہ پائی تھی کہ میری چھوٹی بہن جو پاس ہی بیٹھی تھی بول پڑی۔ "دیدی آپ بھی کیا بات کرتی ہیں۔ صبح سے لے کر اب تک میرا تو وقت پانچ ہی منٹ میں گزر گیا۔ ہمارا تو اتنا وقت جلدی گزر جاتا ہے اور آپ کا وقت نہیں گزرتا کمال ہے۔" اس کی اتنی بات سن کر ہم سب ہنس پڑے۔

سلوچنا — [illegible] جامعہ دوسرا سال

جناب اظہار الحق صاحب استاد مدرسہ ثانویہ جامعہ

باغبانی
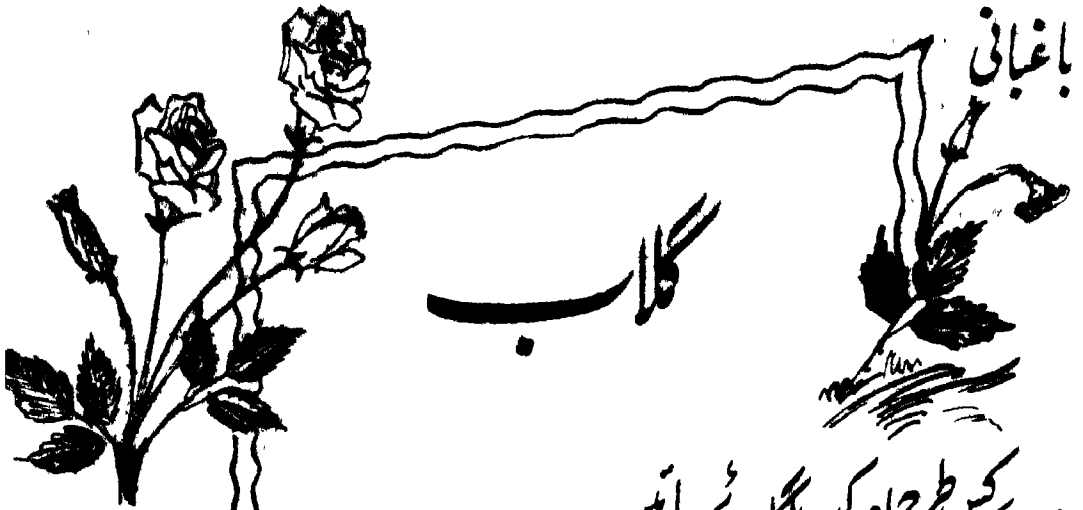
گلاب

پودے کس طرح اور کب لگائے جائیں :-

جہاں تک ہو سکے پودے زیادہ گہرے نہ لگائے جائیں کم سے کم ایک انچ زیادہ سے زیادہ دو انچ گہرائی جوڑ پر سے ہونی چاہیے۔ یعنی چشمہ چڑھے ہوئے گلاب کے پودے کو چشمہ کی جگہ سے ایک یا دو انچ چھوڑ کر لگا دینا چاہیے۔

گلاب کے پودوں اور لائنوں میں فاصلہ کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔ اگر پودے خوب بڑھنے والے ہوں تو فاصلہ ۳ فٹ، درمیانی بڑھوار والے پودوں کا فاصلہ ۲ فٹ اور چھوٹی قسموں کا فاصلہ ۱½ فٹ ہونا چاہیے۔ ہر کیاری میں علیحدہ علیحدہ قسم کے پودے لگانا اچھا رہتا ہے۔

پودے لگاتے وقت اس بات کا خیال رکھیے کہ پودے دوپہر کے بعد شام کے وقت لگائے جائیں۔ دو یا تین دن تک پودے کی ضرورت کے مطابق دوپہر کی دھوپ سے بچائیے۔

ہندوستان کے میدانی علاقوں میں جہاں کی آب ہوا گرمیوں میں زیادہ گرم اور سردیوں میں زیادہ سرد ہوتی ہے پودے سردیوں کے شروع میں اور آخر میں لگانے چاہئیں [illegible] موسم تقریباً ہر جگہ مناسب رہتا ہے۔ پہاڑی علاقوں کے لیے بہترین موسم اکتوبر، نومبر اور مارچ اپریل ہے۔ پنجاب، [illegible] اور بہار کے لیے گلاب کا موسم اکتوبر سے فروری تک ہے۔

گلاب کو کھاد کب اور کیسے دی جائے ؟

عام طور سے [illegible] کی کھاد استعمال کی جاتی ہے۔ یعنی

قدرتی کھاد (ORGANIC MANNURE)

اور کیمیائی کھاد (INORGANIC MANNURE)

ان دونوں کھادوں کے استعمال کے طریقے اور وقت مختلف ہیں۔ گلاب کے لیے کھاد کا استعمال بہت احتیاط سے کرنا چاہیے

قدرتی کھاد

پہلے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق جو کیاریاں تیار کی گئی ہیں ان کو تقریباً ایک سال تک کھاد کی ضرورت نہیں ہے۔ دیکھا گیا ہے

کر کھاد کی زیادتی کی وجہ سے اکثر اور بیشتر گلاب کے پودے پہلے ہی موسم میں ختم ہو جاتے ہیں۔ یاد رکھیے کہ کھاد پودے کی بڑھوار میں مدد دینے کے لیے ہے۔ اگر پودے کو کھاد ہی میں لگا دیا جائے تو وہ مر جائے گا۔

قدرتی کھاد کا استعمال عام طور سے پودوں کی چھنٹائی کے وقت یا اس کے بعد کرتے ہیں۔ چھنٹائی اور کھاد دینے کے بعد فوراً پانی نہیں دینا چاہیے، جب تک ضرورت نہ محسوس ہو۔ ہاں زمین کو ہفتہ میں کئی مرتبہ ضرور گوڑا جائے اس سے زمین بھربھری ہو جائے گی اور پھر کیاریوں میں صرف اتنا پانی دیا جائے کہ کونپلیں نکلنی شروع ہو جائیں۔ جوں جوں کونپلیں بڑھنی شروع ہوں پانی کی مقدار تھوڑی تھوڑی بڑھاتے رہیے۔ اور جب شاخ پوری بڑھ جائے تو کیاری کو لبالب بھر کر پانی دیا جائے۔

ایک مبتدی (پہلے پہل کام شروع کرنے والا) کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ کون سی کھاد استعمال کی جائے۔ اس کا خیال فوراً ہی کیمیائی کھاد کی طرف جاتا ہے اس کا استعمال آسان تو ہے لیکن کیمیائی کھاد کی تھوڑی سی زیادتی بھی پودوں کو بہت تھوڑی مدت میں جلا دیتی ہے۔ اس کے مقابلے میں قدرتی کھاد کی زیادتی کے برے اثرات کو دور کیا جا سکتا ہے۔ تاہم کیمیائی کھادوں کے استعمال سے فایدہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ مگر اس میں تجربے کی ضرورت ہے۔

جانوروں کا گوبر، لید یا مینگنی کی کھاد

چکنی مٹی والی زمینوں کے لیے گوبر کی کھاد سے بہتر کوئی کھاد نہیں۔ دو حصہ گھوڑے کی لید کی کھاد اور ایک حصہ گوبر کی کھاد ملا کر بہترین کھاد بنتی ہے۔ گوبر کی کھاد کم از کم ایک سال پرانی اور لید کی کھاد دو سال پرانی ہونی چاہیے۔ گوبر یا لید کی کیسی ہی کھاد ہو، اس وقت تک استعمال نہ کی جائے جب تک صحیح معنی میں گلی سڑی نہ ہو۔ عام طور سے لوگ کھاد کو کیاری میں ڈھیر کر کے چھوڑ دیتے ہیں۔ دھوپ اور بارش کی وجہ سے اس میں سے بہت سے قیمتی اجزا ضایع ہو جاتے ہیں۔ اس لیے کھاد ڈال کر اس کو مٹی میں نیچے تک اچھی طرح ملا دینا چاہیے۔ چھوٹے پودوں کو کم اور بڑے پودوں کو زیادہ کھاد دی جائے۔

پتّی کی کھاد

پتّی کی کھاد بھی بہت مفید ہوتی ہے۔ اس کے استعمال سے چکنی مٹی میں بھربھرا پن آجاتا ہے اور بلوی مٹی میں بندھا پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کھاد میں پودے کی ضرورت کی تمام چیزیں اسی تناسب سے ہوتی ہیں جس کی پودے کو ضرورت ہوتی ہے۔

گھر اور مویشی خانے کی سکیرن کوڑا کرکٹ، پاخانہ اور گوبر وغیرہ سب چیزوں کی ملی جلی کھاد جو گڑھوں میں تیار کی جاتی ہے اور جس کو کمپوسٹ بھی کہہ دیتے ہیں بہت اچھی ہوتی ہے۔ اس کو کیاریوں میں گلاب کی چھنٹائی کے وقت مٹی میں آزادی سے ملا دیتے ہیں۔ اس کھاد کو ملانے سے پہلے چھلنی میں چھان کر کنکر پتھر نکال دینا چاہیے۔

پرندوں کی بیٹ

پرندوں کی بیٹ بہت طاقت ور کھاد ہے۔ یہ بہت گرم ہوتی ہے۔ اس لیے سردیوں میں پانی میں پتلا گھول بنا کر کیاریوں میں ہلکا ہلکا چھڑک دیا جائے۔

ہڈی کا چورا پھولوں کی بڑھوار اور خوش نمائی کے لیے بہت کار آمد ہے۔ موسم بہار سے ایک مہینہ پہلے پودے کے چاروں طرف ڈالیے میں

ایک مٹھی بھر چھڑک کر نیچے تک مٹی میں ملا دینا چاہیے۔

کھلی:- کھلی اچھے پھول لانے کے لیے بہت مفید ثابت ہوتی ہے۔ اس کو بہت تھوڑی مقدار میں استعمال کرنا چاہیے جس موسم میں پودے کی بڑھوار ہوتی ہے اس وقت ایک پودے کے لیے آدھی مٹھی بھر کھلی کا پاؤڈر کافی ہوتا ہے۔ ارنڈی کی کھلی بہترین ہوتی ہے۔ کھلی کا استعمال برسات کے بعد کیا جانا چاہیے۔

بجھا ہوا چونا بھی چکنی اور سخت زمینوں کے لیے ضروری ہے۔ یہ زمین کی تیزابیت کو دور کر دیتا ہے اور اس سے پودے کے غذائی اجزا بھی اس قابل ہو جاتے ہیں کہ پودا ان کو اپنی نازک جڑوں کے ذریعہ آسانی سے حاصل کر سکے۔ اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ چونے کا استعمال صرف برسات میں بہت تھوڑی مقدار میں کیا جائے یعنی سال میں زیادہ سے زیادہ ایک مرتبہ۔

پانی کے گھول کی شکل میں یعنی مکسچر بنا کر جو کھاد استعمال کی جاتی ہے۔ وہ بہت جلد اثر کرنے والی ہوتی ہے۔ جانوروں کی مینگنیاں اور تازہ گوبر اور لید کو پانی میں گھول دیا جاتا ہے۔ تین یا چار دن کے بعد یہ پانی نتھار لیتے ہیں۔ اس کا رنگ استعمال کے وقت ہلکی چائے کے رنگ سے زیادہ گہرا نہیں ہونا چاہیے۔ پرندوں کی بیٹ کا گھول بنانے کے لیے آدھا مٹھی بیٹ کی کھاد دو گیلن پانی میں کافی ہوتی ہے اور ایک مٹھی مچھلی کا خشک چورا دو گیلن پانی میں ملانا چاہیے۔ گھول کے استعمال کا راز یہ ہے کہ اس کو ہلکا اور گاہے گاہے استعمال کیا جائے۔

ہمیشہ یاد رکھیے کہ کھاد کی زیادتی بہت بہت سی بیماریاں اور پودے میں کمزوریاں کھاد کی زیادتی کا نتیجہ ہیں۔ کھاد کا گھول خشک مٹی میں قطعی نہ ڈالا جائے گرم اور خشک موسم میں بھی اس کا استعمال روک دینا چاہیے۔

تقریباً تین چار مٹھی لکڑی کی راکھ (جس میں کوئلہ بھی ہو) اگر پودے کو دی جائے تو بہت فایدہ مند ہوگی۔

رہی کیمیائی کھاد تو اس کے استعمال کا طریقہ اگلے پرچے میں پڑھیے گا۔

تبصرہ

پیغمبروں کی کہانیاں

مصنف: حبیب احمد خاں شبنم قادری

صفحات: ۱۷۶

قیمت: ۲/۵۰

ناشر: سیرت پبلشرز امرد

بچوں کی مذہبی تصنیفات میں ہمیشہ میری نظریں ایسی کتابوں کو تلاش کرتی ہیں جو بچوں کے لیے نہ صرف معلومات کا ذخیرہ ہوں بلکہ الفاظ اور مفہوم کے لحاظ سے ان کی سمجھ بوجھ کے مطابق ہوں لحمداللہ زیر تبصرہ کتاب "پیغمبروں کی کہانیاں" اپنے الفاظ اور مفہوم کے لحاظ سے اس معیار پر پوری اترتی ہے۔ نیز اس کتاب میں پیغمبروں کی زندگی کے ایسے واقعات کو شامل نہیں کیا گیا ہے جو بچوں کی سمجھ سے بالاتر ہوں۔ تمام واقعات بڑے سلیس اور شگفتہ انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ فاضل مصنف قابل مبارک باد ہیں۔

بدرالدین استاد دینیات

مدرسہ ابتدائی جامعہ

بچوں کی کوششیں

لطیفے

پہلا کرایہ دار :- ارے آپ اس گھر میں نہ رہیے اس میں تو بس گدھے رہ سکتے ہیں۔

دوسرا :- یہ آپ کیسے کہتے ہیں ؟

پہلا :- میں اس گھر میں چار سال رہ چکا ہوں۔

ٹیچر :- (منے سے بگڑتے ہوئے) تم حساب میں بالکل کورے ہو۔ ہر سوال کو کم سے کم دس بار حل کرو گے تو کام چلے گا۔ لو ایک سوال۔

منا :- (تھوڑی دیر بعد) حل کر لیا سر۔

ٹیچر :- دس بار ؟

منا :- جی ہاں دیکھیے دس جواب آئے ہیں۔

روی :- ڈیڈی ہوائی جہاز کیسے اڑتے ہیں ؟

ڈیڈی :- مجھے نہیں معلوم۔

روی :- موٹر کیسے چلتی ہے ؟

ڈیڈی :- مجھے نہیں معلوم۔

روی :- اور ڈیڈی یہ پین پہلے پہل کس نے بنایا تھا ؟

ڈیڈی :- معلوم نہیں۔

روی :- اور ڈیڈی ---- اچھا جانے دیجیے۔

ڈیڈی :- بدھو کہیں کا، پوچھتا کیوں نہیں ؟ پوچھے گا

پپو کا جھولا
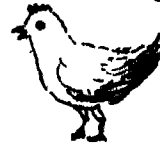
...کا جھولا
...نے جو کھولا
...بھرے تھے
...رے کھلونے
...کی ڈبیا
...کی چڑیا
...سی مرغی
...سی بکری
...سی موٹر
...سا شوفر
...سا بندر
...سا گیدڑ
...کا مینڈک
...کا چوہا
ربڑ کی
...کا کچھوا
...کا ہاتھی
...کا گھوڑا
...سا توتا
...سا بلا
...جھولا

ایک آدمی :- (دروازے سے) کیوں؟ تمہارے پتاجی گھر پر ہیں؟
لڑکا :- نہیں جی! باہر گئے ہیں۔
آدمی :- کب تک آئیں گے؟
لڑکا :- جب آپ چلے جائیں گے۔

لطیفہ :-

سلّو : (ابا سے) آج سنڈے اسٹیٹس میں کیوں نہیں منگوایا؟
ابا :- بیٹے آج کون سا دن ہے؟
سلّو :- سیٹر ڈے (سنیچر)
ابا :- تو سیٹر ڈے (سنیچر) کو سنڈے اسٹیٹس میں کیسے آئے گا۔

سلمان۔ درجہ دوم

خوب سوجھی :-

بہت دنوں کی بات ہے۔ ایک کسان اپنی بیوی کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کے پاس ایک بھینس اور ایک بیل تھا۔ ایک دفعہ اس نے بیوی سے کہا ہم سب اب اپنے نئے نام رکھ لیں۔ اس نے اپنا نام "گھی" رکھا۔ بیوی کا نام "بریانی" اور بیل کا نام "ڈنڈا" اور بھینس کا نام "مہمان" (اب آپ ان ناموں کو اچھی طرح خیال میں رکھ کر آگے پڑھیے تو کچھ مزا آئے گا) کسان کھیت میں کام کر رہا ہے۔ اس کے کوئی رشتہ دار آتے ہیں اور اس سے کھیت میں آکر ملتے ہیں۔ یہ لوگ بہت تھکے ماندے ہوتے ہیں۔ کسان ان سے کہتا ہے۔ یہاں کیا رکھا ہے۔ وہ گھر پر جائیں وہاں بریانی (بیوی) ہے اس سے باتیں کریں۔ وہ بھی وہیں آئے گا۔

رشتہ دار بریانی کا نام سن کر بہت خوش ہو جاتے ہیں۔ وہ تو بھوکے ہی تھے۔ جب وہ گھر پہنچے تو کسان کی بیوی ان سے ملتی ہے اور کہتی ہے گھی (کسان) کے آنے پر وہ کھانا کھائیں گے۔ مہمان سوچتے ہیں کہ چلو بریانی کے ساتھ گھی رہے تو اور بھی اچھا ہے۔ وہ اور خوش ہوتے ہیں۔ کچھ دیر بعد کسان بھینس کو لے کر گھر میں آتا ہے اور بیوی سے کہتا ہے کہ مہمان کو باندھو میں ابھی ڈنڈا (بیل) لے کر آتا ہوں۔ اس کے رشتہ دار یہ سن کر بہت پریشان ہوتے ہیں اور جب تک کسان کی بیوی بھینس کو باندھ کر آئے سب فرار ہو جاتے ہیں۔

ع۔ معزالدین حیدرآباد

چٹکی بھر نمک :-

ایران کے مشہور شہنشاہ نوشیرواں انصاف کے لیے مشہور تھے۔

نوشیرواں نے ایک دن ایک جنگل میں شکار کے لیے پڑاؤ ڈالا اور کھانا پکانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ کھانا پکانے والوں نے کہا "نمک نہیں ہے۔"

نوشیرواں نے کہا "نزدیک کے گاؤں میں سے لے آؤ ——" "لیکن قیمت دیے بغیر نہ لانا نہیں تو پورا گاؤں اجڑ جائے گا۔"

پکانے والے نے پوچھا "سرکار چٹکی بھر نمک لانے سے پورا گاؤں کس طرح تباہ ہو سکتا ہے!"

شہنشاہ نے کہا "اگر بادشاہ رعایا کے گھر سے چٹکی بھر نمک مفت لے گا تو دوسرے دن بادشاہ کے نوکر چاکر پورا گاؤں چٹ کر جائیں گے۔"

رشیدہ بی بی

آدھی ملاقات

میں ہمیشہ ابی، امی، بھائی جان، بھابی جان اور آپا کے لیے ہی لکھتا ہوں۔ مجھ سے قریب رہنے والے بچے مجھ سے ہمہ وقت شاکی رہتے ہیں۔ بچوں کی یہ شکایت بجا ہے۔ میں اپنا قصور مانتا ہوں، ان کو برابر کسی نہ کسی بہانے سے ٹالتا رہا لیکن آج یہ بچے فیصلہ کرکے آئے ہیں کہ یا تو "اپنے لیے کچھ لکھوائیں گے یا ان سے بول چال بند کر دیں گے"۔ ان کی یونین بہت تگڑی ہے۔ اس لیے مجھے ان کی مانگ بلا پس و پیش پوری کرنی پڑی۔

ایک نظم پہلے کی لکھی ہوئی ہے اسے ڈھونڈھ نکلا اور دوسری بس ابھی ابھی پوری ٹیم کے سامنے لکھنی پڑی۔ ان کا حکم ہے کہ میں اسے اسی وقت ان کے پیارے رسالے پیام تعلیم کو بھیج دوں۔ یہ بھی مجھے ماننا پڑا۔

عشرت جو ان کی لیڈر ہیں انھوں نے تو میرے لیے چائے ناشتہ تک بند کرنے کی دھمکی دی ہے۔ منّے، ننھے، سہیل، ارشد، شرف، آصف، نصرت، نیّر، رفعت، مسرت بیک وقت مجھ پر برس پڑے ہیں، شاہدہ آپا سمجھا رہی ہیں کہ مان جاؤ بھائی! سہولت سے کام کرو، آج تو بھائی جان لکھ ہی رہے ہیں۔ مسرت کہتی ہے کہ آج ہی یہ وعدہ بھی کرالو۔ (تحریری شکل میں)، کہ آئندہ بھی کوتاہی نہ کریں گے۔ ورنہ میں کبھی سر نہ دباؤں گی۔ ننھے بولے ہاں ہاں میں بھی ان سے روٹھ جاؤں گا۔ پھر ان کا ٹیبل کون سجائے گا؟

نصرت کو یہ بھی شکایت ہے کہ "آپ پیام تعلیم کو جب سے پٹنہ میں ہیں بھول بیٹھے ہیں کبھی ایک خط سے بھی یاد نہیں کرتے"۔ اس نے تو سب سے زبردست غلطی پکڑی۔ آج ان لوگ سے صلح کر رہا ہوں۔ ان کی یونین جیت گئی۔ امی جاگ گئیں بگڑی ہوئی اسی طرف چلی آ رہی ہیں، کیا ہنگامہ ہے جی؟

ہماری یونین زندہ باد! بھائی جان زندہ باد!!
پیام تعلیم پاینده باد تابنده باد۔

شمیم ہاشمی رہتاسی

واہ واہ..... منھ سے بےساختہ نکل ہی پڑا۔ پیام تعلیم کا تازہ شمارہ کل دستیاب ہوا۔ ٹائٹیل دیکھتے ہی دل باغ باغ ہو گیا۔ کہانیاں بڑی میٹھی تھیں۔ خاص کر "انوکھا فریادی" اور نظم میں "ستمبر آگیا"، بہت اچھا ہے۔ خدائے تعالیٰ "پیام تعلیم" کو دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی عطا فرمائے "آمین" ایسا پرچہ نکالنے پر دل سے مبارکباد قبول کیجیے۔

آزاد نیازی رہتاسوی

یقین کیجیے ہم ماہنامہ پیام تعلیم سے اس وقت سے متاثر ہیں جب ہم خود بھی طالب علم تھے اور اب بھی جب کہ ہم مدرسے میں بچوں کے استاد ہیں۔ بچوں کو خریداری پر آمادہ کرتے ہیں۔

ہم پیام تعلیم کی اچھی اچھی نظموں کا تفریحی پروگرام میں استعمال کرتے ہیں۔ جو موزوں ہوتی ہیں۔

ہمیں شدت کی کمی استقبالیہ نظموں کی محسوس ہوتی ہے۔ از راہ کرم آپ استقبالیہ نظمیں بھی پیام تعلیم میں شایع کیا کیجیے۔ بڑا کرم ہوگا اگر آپ کچھ اس قسم کی نظمیں تحریر کرکے روانہ کر سکیں۔

یہ بھی دریافت کرنا ہے کہ

"آج کل ہی کی طرح کسی اور ریاست سے بھی سرکاری پرچے نکلتے ہیں؟ ان کے پتے اور سالانہ قیمت کیا ہے؟ ہمیں کشمیر اور پنجاب سے نکلنے والے سرکاری پرچوں کا پتہ چاہیے جن سے یہ فایدہ ہوتا ہے کہ نئے نئے قوانین اور محکموں

...یات صحیح اعداد و شمار ان سے ملتے ہیں جو جنرل نالج
...اقفیت عامہ میں اضافہ کرتے ہیں۔

ڈاکٹر اقبال کا صحیح سنہ پیدائش کیا ہے؟

شیخ وزیر شیخ حسین اردو مدرس۔ اردو اسکول
ڈاک خانہ کاسودہ تعلقہ ارنڈول ضلع جلگاؤں

اکتوبر کا پیام تعلیم مل گیا ہے۔ محترم اقبال مہدی صاحب نے
...لئے دی ہے اس سے میں سو فی صدی متفق ہوں اور اس سے
...ں نتائج حاصل ہوں گے جو میرے محترم استاد نے تحریر فرمائے ہیں
یہ شمارہ بہت خوبصورت ہے۔ مضامین کی دلچسپی، کہانیوں کی
...ں اور تنوع نے اسے بڑا حسین بنا دیا ہے۔ آپ کی کہانی کی زبان
...ی میٹھی ہے اگر خوشامد پر محمول نہ کریں تو یہ عرض کروں کہ بچوں کے
...میٹھی اور پیاری زبان لکھنا کوئی آپ سے سیکھے۔

خلیق انجم اشرفی ۱۳۵۰ پہاڑی املی۔ مٹیا محل دہلی

میں آپ کے رسالہ پیام تعلیم کا تقریباً ایک سال سے مطالعہ
...رہا ہوں۔ اس میں ہر ماہ کوئی نہ کوئی نئی چیز پڑھنے کو ضرور ملتی
۔ اس ماہ بھی ایک نئی چیز پڑھنے کو ملی۔ یعنی پپیتے کی کاشت
...مضمون بے حد پسند آیا مجھے۔ یہ مضمون نہایت مفید اور معلومات
...ہے۔ جناب محمد یوسف خاں صاحب تک مبارک باد پہنچا دیجیے۔
یقین جانئے پیام تعلیم میں تمام شایع شدہ مضامین
...ہاں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوتے ہیں۔
گر پھر بھی اس پرچہ میں ایک بات کی کمی ہے: وہ ہے
...یفہ گوئی اور سوال و جواب کا سلسلہ۔ اگر آپ یہ سلسلہ جاری
...یں تو بہتر ہوگا۔ کیوں کہ اس سے بچوں کا دماغی امتحان
...سکتا ہے۔

عبدالمنان دیوگاؤں کر
کاسودہ

میں ایک عرصہ سے پیام تعلیم کا خریدار ہوں باقاعدگی
کے ساتھ اس کا مطالعہ کرتا ہوں۔ اس کے پڑھنے سے ہماری
معلومات میں کافی اضافہ ہوتا ہے۔ آپ جس خلوص اور لگن کے
ساتھ اس پرچے کی خدمت کر رہے ہیں، وہ قابل داد ہے۔
بہت سی تبدیلیوں کی وجہ سے پیام تعلیم میں ایک نئی اور اچھوتی
دل کشش پیدا ہو گئی ہے۔
مگر پھر بھی اس میں ایک بات کی کمی رہ گئی ہے۔ وہ
لطیفہ گوئی کا سلسلہ۔ اگر آپ یہ سلسلہ شروع کر دیں تو بہتر ہوگا۔

شیخ سانڈو۔ دیوگاؤں کر

ستمبر کے پیام تعلیم کا سرورق سادگی اور دیدہ زیبی
میں منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ سرورق کے دوسرے صفحے
پر جرمنی تصویریں اور کہانیاں "ماتا" "الوکھا فریادی" "جادو
کے تھیلے" بہت پسند آئیں۔ مضامین میں "مجاہدین آزادی"
"پیسہ" اور "جانور کس طرح پانی پیتے ہیں" بہت خوب ہے۔
مستقل کالم جیسے بچوں کی کوششیں اور ادھر ادھر سے مجموعی
طور پر دل چسپ ہیں۔ بچوں کے لیے صالح اور دل چسپ ادب
اور ان کے ذہنوں کو سنوارنے کی اس نیک کوشش میں یقیناً
آپ لوگوں کو کامیابی حاصل ہوگی۔

محمد ابراہیم صدیقی الہ آباد ۳

یوں تو میری لائبریری میں کئی رسالے آتے ہیں۔ لیکن پیام تعلیم
سے مجھے جو دلی لگاؤ ہے۔ اس کا اظہار میں نہیں کر سکتا۔ اس کی کہانیاں
اور نظمیں مجھے دل سے پسند ہیں۔ اکتوبر کے پرچے میں مجھے "دو اکتوبر"
بہت اچھی لگی۔ اس کے علاوہ بڑے بھائی صاحب "ابن بطوطہ"
"پیسہ" بھی بڑے دلچسپ مضمون ہیں۔ ہماری طرف سے
تمام لکھنے والوں کو مبارکباد۔

نام:- ابو الغیث خاں عمر ۱۲ سال
مشغلہ:- "پیام تعلیم" کا مطالعہ کرنا۔ نئے نئے پرچوں کا خریدار بنانا اور خود بننا۔
پتہ:- کوثر علی خاں آزاد دکھنوار محلہ، مقام اکبر پور پوسٹ رہتاس، ضلع شاہ آباد (بہار)

نام:- وحدت علی خاں عمر ۱۲ سال
مشغلہ:- نئے پرچوں کا مطالعہ کرنا۔ قلمی دوستی کرنا۔
پتہ:- کوثر خاں آزاد محلہ دکھنواری، مقام اکبر پور ڈاک گھر رہتاس ضلع شاہ آباد (بہار)

نام:- سیف اللہ شاہ بندری عمر ۱۴ سال
مشغلہ:- اشعار نوٹ کرنا۔ قلمی دوستی کرنا۔ شاعروں کے فوٹو جمع کرنا۔ ادبی کتابوں کا مطالعہ کرنا۔ کبڈی کھیلنا۔
پتہ:- سیف اللہ شاہ بندری
۵/۴۰۷ شاہدلی اسٹریٹ بھٹکل (ین۔کے)

نام:- افضل امام عمر ۱۴ سال

مشغلہ:- اردو کی ترقی کے لیے اُردو رسالوں کا مطالعہ کرنا۔ انگریزی اور ہندی کہانیوں کا اُردو میں ترجمہ کرنا۔ قلمی دوستی کرنا۔
پتہ:- ۲/۱ پمپٹی شمس الہدیٰ اُردو کلکتہ ۲

نام:- علیم الحق سہرامی عمر ۱۵ سال
مشغلہ:- "پیام تعلیم" پڑھنا۔ ریڈیو بجانا۔ فٹ بال کھیلنا اور قلمی دوستی
پتہ:- معرفت محمد ارمغان ساحل سہرام۔ محلہ منڈی کشورخاں پوسٹ سہرام (ضلع شاہ آباد) بہار

نام:- اخلاق احمد کوثر سہرامی عمر ۱۴ سال
مشغلہ:- کہانیاں پڑھنا۔ ماہنامہ پیام تعلیم پڑھنا۔ چاکلیٹ کھانا اور قلمی دوستی۔
پتہ:- معرفت محمد ارمغان ساحل سہرامی۔ محلہ منڈی کشورخاں پوسٹ سہرام (ضلع شاہ آباد) بہار۔

نام:- محمد جاوید۔ نہال سہرامی عمر ۱۵ سال
مشغلہ:- "پیام تعلیم" پڑھنا، ریڈیو سننا، ڈرامہ میں حصہ لینا، اسکول کے اسٹیج پر لکچر دینا۔ صرف لڑکوں سے قلمی دوستی کرنا۔
پتہ:- معرفت محمد ارمغان ساحل سہرامی۔ محلہ منڈی کشورخاں پوسٹ سہرامی (ضلع شاہ آباد) بہار

نام:- محمد ایوب سہرامی عمر ۱۵ سال
مشغلہ:- "پیام تعلیم" پڑھنا۔ کورس کی کتابیں پڑھنا۔ فٹ بال کھیلنا۔ گانا گانا۔ ایکٹنگ کرنا اور قلمی دوستی کرنا۔
پتہ:- معرفت محمد ارمغان ساحل سہرامی محلہ منڈی کشورخاں پوسٹ سہرام (ضلع شاہ آباد) بہار

ادھر اُدھر سے

اولغ بیگ مدرسہ کے مینار

اولغ بیگ مدرسہ سمرقند میں ۱۴۱۷ تا ۱۴۲۰ء میں
ا تھا۔ لیکن آج تک اس بات کی تحقیق نہ ہو سکی کہ اس
کے میناروں کی شکل ترچھی اور "گرتی ہوئی سی" کب
سے ہو گئی۔ اس کا سبب مشرقی مسلمانوں کا قدیم فنِ تعمیر
تا ہے جس کی رُو سے میناروں کو ذرا سا ترچھا ہونا
ر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عمارت بہت پرانی ہو گئی ہو یا
ں یا کسی اور آسمانی بلا سے ایسا ہو گیا ہو۔ موجودہ
ے آغاز میں شمال مشرقی مینار کا اوپری سرا عمود سے
اور جنوب مشرقی مینار کا اوپری سرا عمود سے ۱۱۵
ی کے زاویے پر جھکا ہوا تھا۔ یہ صورتِ حال
بناک تھی۔

ز بکستان میں سوویت حکومت قائم ہو جانے کے
ی مرمت اور بحالی کا کام شروع کیا گیا جس کا اصل
تھا کہ قدیم فنِ تعمیر کے ان بے مثال شاہکاروں کو
قرار رکھا جائے۔ دھات کی رسیوں، ٹیکوں اور
نکریٹ کے حلقوں سے ان میناروں کی مضبوطی کے
ں مرمت کی جائے۔

شمال مشرقی مینار کو مضبوط کرنے کا کام
ہوئے کامیابی کے ساتھ انجام کو

پہنچایا گیا تھا۔ مینار کے مرکزِ کشش کے ٹھیک نیچے ایک طاقتور
چرخ رکھا گیا اور اسے گردش دینے والے میکانزم کے ذریعے
گھمانا شروع کیا گیا۔ ۳۳ میٹر اونچا دیو ہیکل مینار دھیرے دھیرے
چرخ کھا کر ۲ منٹ میں بالکل صحیح اپنے عمود پر آ گیا۔ اس
وقت تک مرمت اور بحالی کی ایسی مثالیں نہ سنی گئی تھیں نہ
دیکھی گئی تھیں۔

اب جنوب مشرقی مینار پر بھی جو عمودی شکل میں ہے۔
پچھلے سال بڑے پیمانے پر یہ کام کیا گیا۔ مینار کو بڑے بڑے
رسّوں سے باندھ کر انھیں چاروں طرف سے کھینچ کر مینار کو
کس دیا گیا اور پھر لفٹنگ جیکس کی مدد سے اسے بنیاد پر سے
اٹھا کر عمودی حالت میں نصب کر دیا گیا۔ مرمت اور بحالی کا
کام ابھی جاری ہے اور مینار کے ارد گرد ابھی تک پاڑ بندھی ہے۔
(اطلاعات سوویت یونین)

ایک کار جو اپنے مالک کے اشاروں پر چلتی ہے۔

ملبورن ۲۵ ستمبر۔ آسٹریلیا کے دو نوجوانوں نے ایک
عجیب و غریب کار ایجاد کی ہے جو ان کے حکم کے مطابق کام کرتی
ہے۔ یہ دونوں بھائی ہیں ایک کا نام گراہم ہے دوسرے کا
نیل وکری ہے۔ انھوں نے ملبورن کے ایک [illegible]
میں اپنی کار کا مظاہرہ کیا۔ گراہم نے ایک

ٹرانسسٹر سے کام لیا جو دیاسلائی کے بکس کے برابر تھا۔

اس نے حکم دیا "چل پڑو" کار حرکت میں آگئی۔ پھر اس سے کہا گیا "بائیں طرف مڑو" کار اسی طرف مڑ گئی۔

پھر اس نے کہا "رک جاؤ" کار فی الفور رک گئی۔

اس کے علاوہ اس نے سامنے کا شیشہ صاف کرنے والے پرزے کو حکم دیا کہ وہ شیشہ صاف کرے وہ حرکت میں آگیا اور شیشہ صاف کرنے لگا۔

اسی طرح اس نے ہارن بجنے کے لیے کہا اور وہ بجنے لگا۔ اسی طرح اس کے حکم سے کار کی بتیاں روشن ہوگئیں اور بجھ گئیں۔

جاپانی بچے دہلی میں
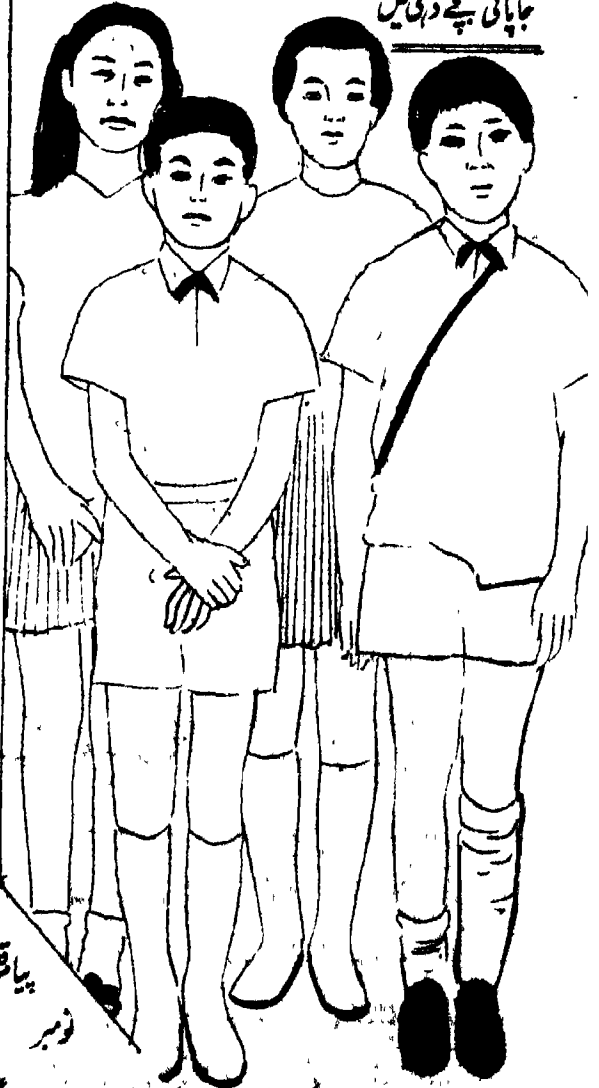
جاپان کی فلمیں بنانے والی ایک کمپنی نے بچوں کی دل چسپی کی ایک ایسی فلم بنانے کا پروگرام بنایا جس میں کچھ جنگلی جانوروں کا بھی کام تھا۔ اس فلم کے لیے کمپنی کو چار بچوں، دو لڑکوں اور دو لڑکیوں کا انتخاب کرنا تھا۔ اس کے لیے اشتہار دیا گیا تو لگ بھگ پانچ ہزار بچوں نے اپنے آپ کو پیش کیا۔ جو چار بچے چنے گئے ان کی عمر نو اور گیارہ سال کے بیچ ہے۔

جاپانی فلم کمپنی اور ہمارے دیس کے محکمہ سیر و سیاحت نے ان چار بچوں کو ہندوستان کی سیر کرانے کا انتظام کیا۔ چنانچہ وہ ابھی حال ہی میں یہاں ہمارے دیس کے مہمان بن کر آئے۔ وہ راج دھانی میں کئی دن رہے اور یہاں کے قابلِ دید مقامات کی سیر کی۔ انھوں نے دہلی کا چڑیا گھر اور گڑیا گھر دیکھا۔ چڑیا گھر میں وہ ایک ہاتھی اور ایک دریائی گھوڑا دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ یہ دریائی گھوڑا جاپان سے لایا گیا ہے۔ گڑیا گھر میں جاپان کی بنی ہوئی گڑیاں دیکھ کر بہت خوش تھے۔ اپنے وطن کو واپس جانے سے پہلے انھوں نے ہماری وزیر اعظم سے بھی ملاقات کی۔

انگلستان کی طرف سے چلڈرنس بک ٹرسٹ لائبریری کو قیمتی تحفہ

نئی دہلی ۱۶ جون۔ آج صبح برطانیہ ہائی کمشنر ہز اکسلنسی فری مین نے ڈاکٹر بی سی رائے چلڈرنس لائبریری کو بچوں کے لیے انگلستان میں چھپی ہوئی نوے کتابوں کا تحفہ پیش کیا۔ یہ کتابیں چھ سے بارہ تک عمر کے بچوں کے لیے خاص طور پر بچوں کے لیے لکھی گئی ہیں۔ ان میں کہانیوں کی کتابیں بھی ہیں معلوماتی اور سائنسی کتابیں بھی ہیں۔ نیچرل ہسٹری کی اور حوالے کی کتابیں ہیں۔ ڈکشنریاں ہیں اور ۱۲ جلدوں میں جونیئر آکسفورڈ انسائکلو پیڈیا ہے۔ ... اس تقریب میں مسٹر شنکر پلائی نے ہائی کمشنر کی خدمت میں چلڈرنس بک ٹرسٹ کی کچھ منتخب کتابیں پیش کیں اور مسٹر فری مین کی خدمت میں راجستھان اور کیرالا کی دو گڑیاں پیش کیں۔

کیوں صاحب! یہ ورزش ہو رہی ہے یا ماسٹر صاحب کچھ خفا ہو گئے ہیں؟

★ ——— فوٹو: شاہد علی خاں

Payam - i - Taleem

NEW DELHI-25.

پیام تعلیم

لیجیے، اب بڑے بڑے مکان بھی اِدھر سے اُدھر لے جانے جانے لگے!
اوپر کی تصویر میں ایک بڑا سا دو منزلہ مکان کرین کی مدد سے ایک جہاز پر لادا جا رہا
ہے۔ یہ مکان سمندروں میں کام کرنے والے تیل مزدوروں کے لیے بنایا گیا ہے۔

(سوویت منصت کے شکریہ کے ساتھ)

ماہنامہ
پیام تعلیم
نئی دہلی
جلد ۵ / دسمبر ۱۹۶۸ء / شمارہ ۱۲
ایڈیٹر: محمد حسین حسّان ندوی
صدر دفتر:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵
شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنسس بلڈنگ، بمبئی ۳
شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
اردو بازار، دہلی ۶
شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
شمشاد مارکیٹ علی گڑھ
قیمت فی پرچہ ۶۰ پیسے
سالانہ چندہ ۶ روپے

سرورق ـــــــ فوٹو فضل الرحمان

فہرست

بچوں سے باتیں

کئی مہینے سے انہی صفحوں میں ہم اگلے سالنامے کا ذکر کر رہے تھے۔ لیجیے اب آپ کا اگلا پرچہ سالنامہ ہوگا۔ یہ پرچہ ۲۰۰۰ کا آخری پرچہ ہے۔ ہم نے باوجود مالی پریشانیوں کے "پیام تعلیم" کو آگے بڑھانے اسے بہتر سے بہتر بنانے کی اپنی سی کوشش کی ہے۔ آپ نے ان کوششوں کو دل سے پسند کیا ہے، جی کھول کے تعریف کی ہے یقین جانئے آپ کی اس پسندیدگی سے ہماری بہت ہمت بندھی ہے بہت سہارا ملا ہے۔

ہمارا پچھلا سالنامہ آپ نے بہت پسند کیا تھا۔ اسے تاریخی یادگار بتایا تھا۔ ہم پوری پوری کوشش کر رہے ہیں کہ اگلا سالنامہ اور بھی اچھا نکلے، آپ کو زیادہ سے زیادہ پسند آئے۔ آپ اسے ترقی کی طرف ایک اور قدم سمجھیں۔ اس سالنامے میں آپ کو بعض چیزیں بالکل نئی نظر آئیں گی اور آپ کو بہت پسند آئیں گی۔

ڈاک کے انتظام میں دھیرے دھیرے باقاعدگی پیدا ہو رہی ہے۔ مگر ابھی تک یہ معمول پر نہیں آیا ہے۔ پچھلے دو مہینوں میں ہمیں شکایتوں کی وجہ سے سخت پریشانی رہی۔ اکتوبر کا پرچہ ستمبر میں شائع ہوا تھا۔ اس کے نہ پہنچنے کی شکایتیں خاص طور پر زیادہ آ رہی ہیں۔

ہمارے منیجر صاحب ہر سال آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ اپنا سالنامہ رجسٹری سے منگائیے۔ مگر اس مرتبہ تو وہ بہت اصرار سے کہتے ہیں کہ یہ سالنامہ رجسٹری سے منگائیے۔ رجسٹری کے ستر پیسے بھیج دیجیے اور اپنا نمبر خریداری بھی لکھیے۔ یہ بہت ضروری ہے۔ آپ کا نمبر خریداری آپ کے پتے پر لکھا ہوتا ہے۔

اس سالنامے کی قیمت ڈھائی روپے ہوگی۔ مگر جو پیامی جنوری ۲۰۰۱ سے خریدار بنیں گے ان سے یہ ڈھائی روپے الگ سے نہیں لیے جائیں گے۔ مگر وہ بھی چھ روپے کی جگہ چھ روپے ستر پیسے بھیجیں۔ ستر پیسے رجسٹری کے

یوں تو پیام تعلیم کے نئے خریداروں کی تعداد ہر مہینے ماشاء اللہ تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ مگر پیامی ان دو مہینوں میں خریدار بنانے کی مہم کو اور تیز کر دیں تاکہ سالنامہ زیادہ سے زیادہ قدر دانوں کے ہاتھوں میں پہنچ سکے۔

پچھلے مہینے (نومبر ۲۰۰۰) میں محترم مالک جعفری صاحب نے دو نئے خریدار مرحمت فرمائے۔ کلکتے کے کاظم جناب آفاق احمد صاحب نے چار، محترم فاروق صاحب مدرسہ ابتدائی جامعہ نے دو، محترم محمد حسین صاحب حیدرآبادی نے دو، عزیزم نعمان لطیف صاحب نے ایک۔ ہم ان سب کے دلی شکر گزار ہیں۔

بہت سے پیامیوں نے ہم سے غالب پر ایک خاص نمبر شائع کرنے کی فرمائش کی ہے۔ غالب نمبر نکالنے کا خیال پہلے سے ہمارے ذہن میں تھا۔ اب یہ خیال اور پختہ ہوگیا ہے۔ کچھ مضمون بھی ہمارے پاس آگئے ہیں۔ بہت سے مضمون نگاروں نے وعدہ بھی کیا ہے۔ اس سلسلے میں خط کتابت کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ ہماری کوشش ہے کہ مارچ کا پرچہ غالب نمبر ہو۔ مارچ کا پیام تعلیم فروری کے آخری ہفتے میں شائع ہوگا۔ غالب سینٹری کی تقریبیں اس مہینے میں خاص طور پر منائی جائیں۔ غالب کا انتقال اسی مہینے میں ہوا تھا۔

احسان الحق صاحب کو تو آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ ہمارے پرانے مضمون نگار ہیں۔ اس سالنامے میں بھی ان کا ایک دلچسپ مضمون آپ پڑھیں گے۔ جامعہ کے پرانے طالب علم ہیں۔ ایک عرصے تک مکتبہ کی بمبئی کی شاخ کے انچارج رہ چکے ہیں۔ افسوس ہے کہ نومبر کے پہلے ہفتے میں ان کی والدہ کا اچانک انتقال ہوگیا۔ بیماری دل کی تھی۔ دل کا دورہ پڑا فوراً ہسپتال لے جایا گیا۔ وہیں انتقال ہوگیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ مرحومہ پرانی تہذیب کا نمونہ تھیں۔ بہت سلیقہ شعار، بہت خوش اخلاق، بہت مہمان نواز اور مذہب کی پابند۔ ہمیں اس حادثے میں محترم اظہر حسن صاحب مرحوم کے صاحبزادوں برادرم ظہور الحق، احسان الحق، مسعود الحق، اقرار الحسن اور بچیوں گگا اور شنو صاحبہ سے اور دوسرے عزیزوں سے دلی ہمدردی ہے۔

لگ بھگ دو سال سے فرزانہ انصاری بی۔ ایس۔ سی کے مضامین آپ پیام تعلیم میں بڑی دلچسپی سے پڑھ رہے ہیں۔ کیڑوں مکوڑوں پر لکھتی ہیں اور بڑے دلچسپ انداز میں لکھتی ہیں۔ پیامیوں کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ پچھلے نومبر میں ان کی شادی بخیر وخوبی انجام پاگئی۔ اس مبارک تقریب پر ہم ان کے والدین اور ان کے ماموں محترم اکبر الدین صدیقی (ریڈر عثمانیہ یونیورسٹی) کی خدمت میں دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ فرزانہ انصاری کا ایک دلچسپ مضمون آپ اگلے سالنامے میں پڑھیں گے۔

اس پرچے میں آپ بچوں کے ادیب اور شاعر نیر صاحب کی ایک اچھی سی نظم پڑھیں گے۔ نیر صاحب جامعہ کالج میں اردو کے لکچرر ہیں۔ بہت مصروف رہتے ہیں۔ بہت دنوں سے پیام تعلیم کے لیے کچھ لکھنے کی فرصت نہ ملتی تھی۔ بارے ہماری بار بار کی درخواست پر انھوں نے توجہ فرمائی اور ایک نہیں دو نظمیں مرحمت فرمائیں۔ دوسری نظم سالنامے میں پڑھیے۔

مولانا مقبول احمد کی بیماری کی وجہ سے مجاہدین آزادی کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اس مرتبہ مقبول صاحب آپ کے لیے سید احمد شہیدؒ کا تحفہ لائے ہیں۔ ضرور پڑھیے کام کی چیز ہے۔ ہم مولانا کے بہت بہت شکر گزار ہیں۔ انھوں نے حضرت سید احمد شہیدؒ جیسے بزرگوں کے حالات پیام تعلیم کے لیے لکھنے کی زحمت فرمائی۔

جناب محمد شفیع الدین نیّر

"سچ تو یہ ہے کہ سچ ہی اچھا ہے"

سچ کو سب نے سدا سراہا ہے
سچ تو یہ ہے کہ سچ ہی اچھا ہے
سچ سے ملتا ہے آدمی کو سرور
سچ سے ہوتا ہے رنج دِل کا دور
سچ سے رہتی ہے آدمی کی شان
سچ ہے دنیا میں آبرو کا نشان
سچ بہادر ہمیں بناتا ہے
آڑے وقتوں میں کام آتا ہے
ہر زمانے میں سچ کی بات بڑی
سچ سے بڑھ کر نہیں کوئی نیکی

سچ اُجالا ہے، سچ اجالا ہے
سچ کا دنیا میں بول بالا ہے
سچ سے ہیں یار آشنا بھی خوش
سچ سے بندے بھی خوش خدا بھی خوش
راستی موجبِ رضائے خداست
کس نہ دیدم کہ گم شد از رہِ راست
یہی نیّر کی رات دن ہے دُعا
مُنہ سے نکلے نہ بات سچ کے سوا

فارسی کا یہ شعر حضرت سعدی شیرازی کا ہے۔ مولوی محمد اسماعیل صاحب میرٹھی نے نہایت خوبی سے اپنے اس شعر میں ادا فرمایا ہے ؎

راستی سیدھی سڑک ہے اس میں کچھ کھٹکا نہیں
کون رہرو آج تک اس راہ میں بھٹکا نہیں

کیے جاؤ کوشش

جناب دینا ناتھ گردھر

انسان کو زندگی میں کبھی کبھی عجیب واقعات پیش آجاتے ہیں۔ یہ واقعات اس کی زندگی کے رُخ کو سرے سے بدل دیتے ہیں۔ لیکن اس کے لیے ایک شرط ہے۔ انسان خود ایسے موقوں کا صحیح اندازہ کرے اور اپنی محنت سے سوجھ بوجھ سے ان سے پورا پورا فائدہ حاصل کرے۔

اے۔ جے۔ کرونن کا نام شاید آپ نے سنا ہو۔ انگریزی زبان کے موجودہ دور کے سب سے اچھے ناول نویسوں میں ان کا شمار ہے۔ وہ دراصل ایک ڈاکٹر تھے اور لندن کے ایک مشہور علاقے میں ان کا مطب تھا۔ ان کی زندگی میں بھی ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ان کو نہ صرف ڈاکٹر سے ناول نویس بنا دیا بلکہ دولت کی دیوی ان کے پاؤں چومنے لگی۔ یہیے ان کی رام کہانی ان کی اپنی زبانی پڑھیے۔

"میں لندن کے مشہور علاقے ویسٹ اینڈ میں ایک پرائیویٹ ڈاکٹر کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ اس وقت میری عمر ۳۴ سال کی تھی۔ اپنے پیشے سے مجھے اتنی آمدنی ہو جاتی تھی کہ آسانی کے ساتھ اپنے گھریلو خرچ چلا لیتا تھا۔ بدقسمتی سے یا کیوں کہیے کہ خوش قسمتی سے ان دنوں پیٹ کے اندر ایک بہت بڑا پھوڑا نکل آیا۔ ڈاکٹروں نے مجھے کچھ عرصے کام چھوڑنے کے لیے لندن سے باہر اسکاٹ لینڈ کے پہاڑی علاقے میں جاکر رہنے کا مشورہ دیا۔ میں وہاں چلا گیا اور ایک کسان کے ہاں جا ٹھہرا۔ کہاں لندن کی گھما گھمی کی زندگی اور کہاں دور دراز کے دیہات میں بے کار پڑا رہنا۔ تنگ آکر میں نے مرغیاں پالنے اور مویشی چرانے میں اپنے میزبانوں کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا۔

اپنے طالب علمی کے زمانے میں کبھی کبھی کہانیاں لکھنے کی خواہش ہوتی تھی۔ یہ خواہش اچانک پھر ابھر آئی۔ میں نے سوچا کہ پھوڑا ٹھیک ہو یا نہ ہو، لیکن اس خاموش فضا میں لکھنے کا کام ضرور کروں گا۔ چنانچہ میں بازار سے فوراً ہی دو درجن کاپیاں خرید لایا۔ اگلی صبح میں اپنے کمرے میں کرسی پر بیٹھا تھا اور میرے آگے میز پر کاپی تھی۔ اب مجھے محسوس ہوا کہ اب تک تو میں نے مطب میں بیٹھ کر نسخے ہی لکھے ہیں، اب مجھ سے کہانی کیا لکھی جائے گی۔ مگر اس مایوسی پر میں نے جلد قابو پا لیا اور طے کیا کہ چاہے کچھ ہو، میں ایک ناول لکھوں گا۔ تین گھنٹے کے بعد میرے میزبان کی بیوی مجھے کھانے کے لیے بلانے آئی تو میں اس وقت تک ایک لفظ بھی نہ لکھ پایا تھا۔ اگلے تین ماہ میں جہاں پھوڑے نے مجھے پریشان رکھا۔ وہاں میرے دماغ نے ایک ناول [illegible] کر لیا۔ حالانکہ

یہ شخص کا تھا جس کے اندر جھوٹی خودداری اور جھوٹے وقار کا مادہ تھا۔

لیکن اس سے زیادہ میں کچھ نہ کر سکا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ناول کیسے شروع کروں۔ مشکل سے چند سطریں لکھتا۔ سوچتا اور پھر انھیں ٹھیک کرتا اور یہ عمل بہت دیر جاری رہتا۔ یہاں تک کہ کاغذ پر کانٹ چھانٹ ہی نظر آتی۔ میں ایسے کاغذ کو پھاڑ ڈالتا اور پھر نئے سرے سے لکھنا شروع کر دیتا۔ میری کہانی کے ایکٹر مجھے رات کو خواب میں اپنا اپنا کام سمجھاتے۔ مجھے لکھنے پر آمادہ کرتے جوش دلاتے، اور جب خواب کے بعد میری آنکھ کھلتی تو میں فوراً اٹھ کر ان حالات کو لکھ لیتا اور صبح کو انھیں ترتیب دیتا۔ اس طرح صبح کے وقت مجھے لکھنے کی عادت ہو گئی۔ پہلے پہلے تو میں مشکل سے پانچ چھ الفاظ روزانہ لکھ سکتا تھا۔ لیکن ایک مہینے کی مشق کے بعد کوئی دو ہزار لفظ روزانہ لکھ لیتا تھا۔

اب پھر مجھ پر مایوسی کا دورہ پڑا۔ میں نے سوچا کہ مجھے اپنی بیماری کے لیے مکمل آرام کرنا چاہیے تھا۔ میں نے خواہ مخواہ یہ دردِ سر مول لے لیا۔ اور سارا لکھا لکھایا باہر کوڑے کے ڈبے میں پھینک دیا۔ خدا کی قدرت اسی دن میں اپنے میزبان کے کھیت میں گھومنے چلا گیا۔ اس وقت بوندا باندی ہو رہی تھی۔ کسان اس وقت زمین کے ایک ٹکڑے کی صفائی کر رہا تھا۔ اس میں بہت سخت خودرو جھاڑیاں تھیں۔ مجھے دیکھ کر وہ رک گیا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ میں نے سب لکھا ہوا کوڑے میں پھینک دیا تو وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر کہا کہ آپ نے ٹھیک کیا ہے۔ میں بھی یہی غلط کام کر رہا ہوں۔ مجھے اس جواب سے بڑا تعجب ہوا۔ میرے تعجب کا اندازہ کر کے اس نے بتایا کہ زمین کے اسی ٹکڑے کو میرا باپ ساری عمر صاف کرتا رہا اور میں نے بھی ساری عمر اسے صاف کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر جھاڑیاں پھر جلد اُگ آتی ہیں۔ پھر بھی میں کوشش کیے ہی جا رہا ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ کوشش بے سود ہی ہے۔

کسان کی اس بات کا میرے دل پر اور دماغ پر فوری اثر ہوا۔ جس بات کو کسان نے غلط بتایا۔ وہ دراصل ٹھیک تھی۔ انسان کو محنت اور کوشش ہمیشہ جاری رکھنا چاہیے۔ چنانچہ میں نے واپس آکر کوڑے کے ڈبے سے وہ سارے کاغذات چن کر نکال لیے انھیں سکھایا اور پھر سے ترتیب دے کر ناول لکھنا شروع کیا اور اگلے تین ماہ میں اسے مکمل کر کے ایک کتاب چھاپنے والے کے پاس بھیج دیا۔ اب میں لندن واپس آگیا اور ناول کے بارے میں سب کچھ بھول سا گیا۔

کچھ عرصے کے بعد میرے تعجب کی کوئی حد نہ رہی جب مجھے کتابیں چھاپنے والے کا تار ملا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ میں اس کتاب کی رائلٹی کے بارے میں گفتگو کرنے کے لیے ان سے ملوں۔ تار میں یہ بھی بتایا گیا کہ یہ ناول بہت اچھے ناولوں میں شمار کیا گیا ہے اور اسے بیک وقت دنیا کی ۱۹ مختلف زبانوں میں چھاپا جا رہا ہے نیز اس کو ڈرامے کی شکل دے کر امریکہ کی سب سے مشہور فلم کمپنی نے فلمانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ یہ میرا پہلا ناول (HATTER 'S CASTLE) تھا جس کی صرف انگریزی زبان میں تیس لاکھ جلدیں فروخت ہوئیں اس ناول نے نہ صرف مجھے دنیا کے بہترین ناول لکھنے والوں کی صف میں لا کھڑا کیا میری قسمت بھی پلٹ دی اور اس ایک ناول سے مجھے لاکھوں روپے رائلٹی کے ملے۔

کسان میزبان کے وہ لفظ آج بھی میرے دل و دماغ پر چھائے ہوئے ہیں۔ سچ ہے انسان کو محنت اور کوشش سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ انسان جس کام کو ہاتھ میں لے اسے مکمل کرنے میں پورا تن من لگا دے۔ خدا ضرور مدد کرے گا۔

★

"سہیلیو سب تیار ہو جاؤ"

"ننھی بہن تم کو ہر کام میں جلدی پڑی رہتی ہے۔ ابھی دیکھو میں نے اپنا دوپٹا رنگ کر پھیلایا ہے ذرا کی ذرا میں وہ سوکھ جائے تو اسے چن لیں۔ ہمدصیا نے چلنا ہے کوئی معمولی جگہ تو ہم لوگ جا نہیں رہے ہیں" شہلا نے کہا۔

"بہن چھوٹی کیا تمھاری تیاری میں ابھی کچھ کسر باقی ہے؟"

"کیوں نہیں کسر تو چلتے چلتے تک باقی ہی رہے گی"

چھوٹی بولیں۔

"اور روزی تم"

"میں تو اپنی بہن بے بی کے یہاں جا رہی ہوں روزی کی طرح چلوں گی مجھے کوئی اہتمام تو کرنا نہیں ہے"

"بہنو بہت دیر ہو رہی ہے"

"ابھی دیر کیا ہوئی ہے آٹھ ہی تو بجے ہیں"

"یہ ٹھیک ہے کہ آٹھ ہی بجے ہیں مگر زیادہ دیر ہو جائے گی تو بے بی بہن کو تم سب کے لیے دوپہر کے کھانے کا بھی انتظام کرنا پڑے گا"

"ہاں یہ بات تو ہے۔ جلدی کرو بہنوں تاکہ ہم لوگ گڑیا کو دیکھ کر چائے اور ناشتہ کر کے لوٹ آئیں"

چھوٹی نے کہا۔

"ابھی سے تو اتنی دیر سے خوشامد کر رہی ہوں کہ بہنوں جلدی کرو مگر تم سب کے کانوں پر جوں ہی نہیں رینگتی" ننھی نے کہا۔

"جوں آخر رینگے تو کیسے رینگے ہم اپنے بالوں کو ہمیشہ خوب صابون سے صاف کرتے رہتے ہیں اور کنگھی سے بالوں کو درست کرتے رہتے ہیں جو" شہلا نے ہنس کر کہا۔

"بہنو اب دیر نہ کرو۔ دیکھو خورشید بھیا اپنی پوں پوں لے کر ٹھیک وقت پر آ گئے ہیں تاکہ ہم سب کو بے بی کے یہاں پہنچا دیں" ننھی نے کہا۔

"ارے تم سب اتنی دیر کرو گی مجھے خبر نہ تھی ورنہ میں ڈرائیور کو بھیج دیتا"

"نہیں خورشید بھیا ہم سب بالکل تیار ہیں" سب نے کہا۔

"اچھا پھر سب آ جاؤ تاکہ تم کو چھوڑ آؤں"

ننھی، شہلا، چھوٹی، روزی سب گاڑی میں جلدی سے گھس پڑیں اور منٹوں میں بے بی کے دروازے پر پہنچ گئیں۔

"آؤ بہنوں بہت انتظار دکھایا آپ سب نے" بے بی نے کہا۔

"یہ جو شہلا ہیں نا ان کی وجہ سے ہمیشہ ہر کام میں دیر ہوتی ہے کیوں کہ ان کو وقت کی کوئی پروا نہیں ہوتی ہے" ننھی نے کہا۔

"بے بی بس! ننھی کو ہمیشہ ہر کام میں دوسروں پہ الزام رکھنے کی عادت ہے" شہلا مسکرا کر بولی۔

سب باتیں کرتے ہوئے ایک خوبصورت کمرے

میں پہنچ گئے کمرے کے دروازے میں بہت عمدہ ریشم سے کڑھا ہوا "خوش آمدید" کا بورڈ لٹک رہا تھا جس کے معنی ہوتے ہیں "آپ سب کا آنا مبارک ہو۔"

اندر سفید چاندنی پر خوب صورت قالین بچھا ہوا تھا۔ قالین پر کڑھے ہوئے تکیے بہت قرینے سے رکھے ہوئے تھے اگر کی بتیاں دو گملوں پر سلگ رہی تھیں جن کی سوندھی بھینی بھینی خوشبو پورے کمرے میں مہکی ہوئی تھی سیلنگ فین دھیمی دھیمی رفتار سے نرم نرم ہوا پورے کمرے میں پھیلا رہا تھا۔ کمرے کی کھڑکیوں پر ہلکے ہرے رنگ کے پردے تھے۔ کمرے کا رنگ بھی ہلکا ہرا سا تھا۔ سامنے بڑے سائز میں فریم کیا ہوا "اللہ اکبر" کا شیشہ لٹک رہا تھا۔ "اللہ اکبر" کے معنی ہوتے ہیں "اللہ میاں سب سے بڑے ہیں۔"

سب سہیلیاں قرینے سے بیٹھ گئیں اور آپس میں گپ شپ کرنے لگیں۔

"بہن امسال بارش بہت اچھی ہو رہی ہے اور بڑے موقع موقع سے پانی برس رہا ہے۔" ننھی نے کہا۔

"مگر بعض بعض جگہ تو اتنی زیادہ برسات ہو رہی ہے کہ ندیوں میں باڑھ آگئی ہے اور اس باڑھ میں ہزاروں آدمی گھر گئے ہیں۔ بہت سے بے گھر ہوئے ہیں اور بڑا نقصان ہوا ہے۔" شہلا بولیں۔

"ہاں بہن ! ہمارے ہی شہر میں دیکھو ایک دن و رات جو لگا تار پانی پڑا تو نہ معلوم کتنے کچے گھر گر گئے اور گلیاں پانی سے بھر گئیں۔ سڑکوں پر ندی کا دھوکا ہونے لگا۔" ملاذی نے کہا۔

"بہن جو ہو گی آپ کے یہاں آج اپنی گڑیا دیکھنے آئے ہیں تو بھیجئے بھی۔"

سامنے ہی پردے کے پیچھے الماری میں تو وہ موجود ہے۔" سہیلی نے کہا۔ پردے کو اٹھایا گیا چھوٹا سا بلب دھیمی دھیمی روشنی الماری میں پھیلا رہا تھا۔ گڑیا چھپر کھٹ پر آرام سے لیٹی ہوئی تھی ہلکا پیازی رنگ کا سوٹ یعنی شلوار قمیص جس میں کامدانی کا بہت دور پر کام بنا ہوا تھا۔ جارجٹ کا ڈوپٹہ۔ بڑی اچھی لگ رہی تھی سجی سنوری ہوئی اس وقت بے بی کی گڑیا۔

"بہن ذرا اسے چلا پھرا کر دیکھ لیتا نہیں تو بے بی لٹھا ہی لیں گی ہم سب کو۔" شہلا نے مذاقاً کہا۔

"بہن تم نے اس کے بال کٹوا دیے کیا اپنی گڑیا کو میم بنانے کا ارادہ ہے؟" روزی بولیں۔

"نہیں بہن، یہ بات نہیں ہے۔ بال اس کے کم بڑھتے ہیں اس لیے ترشوا لیے گئے ہیں تاکہ بڑھ جائیں۔" بے بی نے

"بے بی تمہاری گڑیا بڑی خوب صورت ہے تم کو اور تم دونوں کو مبارک۔" شہلا نے کہا۔

"لاؤ ننھی بی ! اس کو منگنی کی انگوٹھی تو پہنا دیں" روزی بولیں۔

اور ننھی نے ایک ننھی سی چمکتی ہوئی انگوٹھی نکال کر روزی کے ہاتھ میں دی۔ بہت ننھا سا نگینہ اس میں چمک رہا تھا۔ روزی نے انگوٹھی گڑیا کی انگلی میں پہنا دی۔

"اچھا بہنو اب تم سب آپس میں بات چیت کرو میں اماں کی مدد کرا دوں تاکہ ناشتہ تیار ہو جائے۔"

"چلو ہم سب چلتے ہیں اور مل کر اپنے لیے ناشتہ تیار کیے لیتے ہیں۔"

"نہیں ——— نہیں یہ کیسے ممکن ہے تم سب تو آج تو مہمان ہی ہو۔"

"یہ کون کہتا ہے کہ ہم سب مہمان ہیں۔"

بی کی اتنی ناشتہ اور چائے کے انتظام میں لگی ہوئی ہیں ،
" خالہ جان آداب "
" خوش رہو بچیو ! مگر تم سب یہاں گرمی اور آگ
کیوں آئی ہو۔ بس بے بی کو یہاں چھوڑ دو اور تم سب بیٹھ
باتیں کرو آن کی آن میں سب ہوا جاتا ہے "
" نہیں خالہ جان ہم سب تو آپ سے کھانے پینے کی
وں کو تیار کرنے کا ڈھنگ سیکھنے آئے ہیں "
" اچھا اگر یہی تمھاری مرضی ہے تو لو "
" خالہ جان آپ مجھے پکوان کا کوئی سا کام دے دیجیے "
زی نے کہا۔
" لو بیٹی ! یہ ہے پاؤ بھر چینی اس میں آدھا پاؤ پانی ڈال
ذرا دیر کے لیے ہلکی آنچ پر رکھ دو کہ چینی پانی میں گھل جائے
، یہ ڈیڑھ پاؤ میدہ لے کر اس کو چینی کے قوام سے گوندھو
ر آدھ پاؤ پگھلا ہوا ڈالڈا تھوڑا تھوڑا ملاتی جاؤ جب
ب سب مل جائے تو سخت ہاتھوں سے گوندھ کر دو تین
ں نمک کی ڈال کر پھر مل دو اگر تم چاہو تو اس میں ایک
منگ پھلی دکو بھی ، بھی ملا دو۔ پھر پڑے پر پھیلا کر اپنی
ر کے مطابق چوکور یا گول یا کھجوری نما ٹکڑے کاٹ لو دیکھو
ں کڑھائی میں ڈالڈا گرم ہو رہا ہے اس میں ڈال کر دھیمی
ی آنچ میں تل لو بہترین شکر پارے سے تیار ہو جائیں گے "
" خالہ جان آپ نے سارا کام روزی کے سپرد
ر دیا تو اب ہم لوگ کیا کریں " شہلا نے کہا ۔
" اے بھئی روزی رکھانے پینے کی چیزوں ، کا
لہ تو روزی کے سپرد کرنا ہی چاہیے "
اس پر ایک قہقہہ پڑا۔
" بی بی شہلا تم بھی کیا کہو گی کہ بے بی کے

" میں تو خالہ جان دل و جان سے کام کرنا چاہ رہی ہوں "
" ہاں تو تمھارے ذمہ یہ کام ہے کہ سب کی نگرانی رکھو "
" واہ خالہ جان یہ بھی کوئی کام ہوا "
" کیوں ؟ نگرانی کا کام اتنا آسان ہے ۔ تم نے دیکھا
نہیں کہ سارا کام مزدور کرتا ہے اور اس کو بمشکل مزدوری
دو روپے روز ملتی ہے مگر جو نگرانی کرتا ہے اسے پانچ
روپے روز "
" مگر میں نگرانی کس چیز کی کروں "
" بس یہ دیکھتی رہو کہ تمھاری سب سہیلیاں بتائی ہوئی
باتوں کے مطابق کام کر رہی ہیں اگر کہیں کچھ غلطی کریں تو
بتلا دو "
" چھوٹی تم سموسا بناؤ ۔ یہ گندھا ہوا آٹا ہے اس کے
چھوٹے چھوٹے پیڑے بنا کر بیلنے پر بڑھا لو اور اس میں یہ
تیار آلو ، چنے مٹر گری ذرا ذرا سی رکھ کر اور اوپر سے یہ
مصالحہ ڈال کر اس کو تکونا کر کے اس کے کنارے اس طرح
موڑ لو۔ تلنے کا کام میں کر دوں گی۔ کہیں تم سے خراب ہو جائے "
" ننھی تمھارے ذمے یہ کام ہے کہ پھلوں کو صاف
کر کے تشتریوں میں رکھ دو "
" خالہ جان کیا کیلوں کو چھیل کر رکھوں ؟ "
" نہیں بھئی ! کیلوں کو چھیلنے کی ضرورت نہیں ، بس
ذرا کپڑے سے صاف کر دو۔ کیلے دوسرے کے ہاتھ سے
چھلے ہوئے اچھے بھی نہیں لگتے اور پھر اس کے چھیلنے میں
وقت ہی کیا لگتا ہے "
" خالہ جان سیب کاٹ کر چھیل دوں ؟ "
" نہیں ننھی یہ نہ کرنا ۔ بلکہ ہر تشتری میں ایک ایک
سیب پورا پورا رکھ دو۔ سیب کے بارے میں تم نے

پھر اس میں ہوا لگی کہ یہ کالا ہوا اور پھر ذائقہ بھی بدل جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر آدمی چھلا ہوا سیب پسند بھی نہیں کرتا چاقو ساتھ میں رہے گا اسی وقت کاٹ کر اور چھیل کر کھائیں گے۔"

"خالہ جان آپ میرے ذمہ چائے کا انتظام کر دیجیے"
شہلا نے کہا۔

"نہیں بیٹی! چائے بڑی نازک چیز ہے میں خود بنا کر تم سب کو پلاؤں گی تو تم کہو گی کہ ہاں چائے آج پی ہے البتہ ترکیب سن لو۔"

"پہلے چائے کے تمام برتن گرم پانی سے خوب رگڑ کر دھو لو۔ صابون وغیرہ بالکل نہ لگانا۔"

خالہ جان صابن سے تو برتن کی چکنائی وغیرہ چھوٹ جاتی ہے اور برتن صاف ہو جاتا ہے۔"

"بالکل ٹھیک کہتی ہو۔ مگر چائے کے برتن میں صابن لگانے سے چائے کا ذائقہ بگڑ جاتا ہے اگر کوئی چیز بے احتیاطی سے لگ گئی ہو تو البتہ راکھ سے مل کر صاف کر سکتے ہیں۔"

تو برتن خوب دھو کر انھیں کسی چیز پر رکھ دو کہ ان کا پانی سوکھ جائے۔ پھر ان برتنوں کو صاف کپڑے سے پونچھ لو۔ بعض لوگ ایسے ہی پانی سے پیالی کو دھو کر فوراً اس میں چائے پینے لگتے ہیں۔ اس سے چائے کا ذائقہ خراب ہو جاتا ہے۔"

"اب دیکھو چائے یوں بنتی ہے جس قدر پیالیاں تیار کرنی ہوں۔ المونیم کی کیتلی میں اتنی ہی پیالیاں ناپ کر پانی ڈالو پھر ایک پیالی پانی زاید ڈال دو اور آگ پر رکھ دو۔ جب پانی خوب پک کر کیتلی کے اوپر جو ایک ننھا سا چھید ہوتا ہے اس میں سے پھوٹ نکلے اور زور زور سے اس کی بھاپ اڑنے لگے تو جان لو پانی تیار ہو چکا ہے۔ اب پیالیوں کی مقدار کے مطابق چائے کی پتی چمچی سے گن کر اس میں ڈال دو اور کیتلی کو آگ پر سے اتار لو۔ ہمیشہ یاد رکھو کہ چائے والے برتنوں میں کبھی کوئی دوسری چیز نہیں پکانی چاہیے۔"

"اب چائے دانی میں کیتلی کا پانی ڈال دو اور ٹی کوزی سے اس کو چھپا دو۔"

"خالہ جان، چائے دانی کو چھپانے کی ضرورت تو سردیوں میں ہے نا؟"

"نہیں بیٹی! چائے دانی کو اب باہر کی سرد یا گرم کوئی ہوا نہ لگنی چاہیے اس لیے ٹی کوزی سے چھپاتے ہیں۔ ٹی کوزی نہ ہو تو کسی تولیہ کو اس کے چاروں طرف لپیٹ دینا چاہیے۔" اب پیالیوں میں چائے انڈیلنے سے قبل، چائے دانی کا ڈھکن کھول کر ایک چمچی چینی اس میں ڈال کر ڈھکن بند کر کے پھر چھپاؤ اور پانچ سات منٹ تک یونہی رہنے دو۔"

"خالہ جان جب چینی بعد میں ملا کر چائے پینی ہے تو اس میں ایک چمچی کی کیا ضرورت ہے؟"

"اس ایک چمچی چینی سے جانتی ہو کتنا فائدہ پہنچا۔ اگر پانی نے چائے کا پورا رنگ قبول نہیں کیا ہے تو اس چینی کے ملتے ہی اب پورا رنگ اس میں آ جائے گا۔"

پیالی (کپ)، کو تشتری میں رکھ کر پیالی کے اوپر چھلنی ٹکا دو اور چمچے سے دو چمچی چینی چھلنی میں ڈال کر اوپر سے چائے دانی سے چائے کا پانی دھیرے دھیرے گراؤ اور چمچی سے ہلاتی جاؤ، تاکہ پوری چینی گھل جائے پھر دودھ ڈال کر چھلنی اٹھا لو۔

آج میں نے تم لوگوں کے لیے جو چائے منگوائی ہے اس کا نام ہے۔ کرنائی زر CORNIZOR لیٹن کے یہاں کی یہ سب سے عمدہ اور سب سے قیمتی چائے ہے۔ اس میں ایک لطیف اور بے حد عمدہ قسم کی خوشبو ہوتی ہے۔ مجھے چائے کا علم

لیور کھنا چاہیے۔"

" کیوں بچیوں سب کام ختم ہو گیا ؟"

" جی ہاں خالہ جان سب کام ختم !"

" خالہ جان میں نے بھی سموسے تل کر تیار کر لیے ہیں۔"

ب طرف سے چھوٹی کی آواز آئی۔

بے بی جاکر دسترخوان لگاؤ اور سب چیزیں سلیقے سے چن و۔ شکر پارے دو الگ الگ پلیٹوں میں سیو، ڈال موٹھ دو یٹوں میں رکھ دو۔ پھلوں کی تشتریاں اور دو تین صاف چھری ادو۔ ایک پلیٹ میں چنے کا حلوہ دوسری میں سوجی کا حلوا ہ انھیں بھی رکھ دو۔ اگر جگہ ہے تو چائے کی پیالیاں اور شتریاں بھی لگا دو۔ مگر دیکھو تشتری میں پیالیاں الٹ کر رکھنا۔"

" خالہ جان پیالی الٹ کر رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔

ر انھیں سیدھا تو کرنا ہی پڑے گا۔"

اب اس کی حکمت سنو۔ تمھاری پیالی سیدھی کھلی رکھی ہ اور تم سموسا یا دال موٹھ کھا رہی ہو۔ تمھارے ہاتھ سے ئی ٹکڑا پیالی میں گر گیا۔ پیالی میں تیل یا ڈالڈا کا جو اثر ذرا جگہ پر آجائے گا وہ چائے کے سارے مزے کو بگاڑ ے گا۔"

" امی سب کچھ لگ گیا دسترخوان پر۔"

" مگر تم نے ایک چیز نہ نکالی ہو گی !"

" وہ کیا امی ؟"

" اور وہ چیز بے حد ضروری ہے۔"

" امی آپ تو پہیلیاں بجھا رہی ہیں !"

" ارے بھئی ! گلاس بھی تم نے رکھے ہیں !

" واقعی امی گلاس تو ذہن میں بالکل تھے نہیں۔

ں لگاتی ہوں۔"

کچھ صراحی کا پانی پیو گی یا برف منگواؤں۔

" نہیں خالہ جان صراحی کا پانی بہت ٹھنڈا ہے میں نے پیا ہے۔"

" چلو پھر تم سب اب ناشتہ کر لو۔"

" خالہ جان یہ کیسے ہو گا بغیر آپ کے ہم لوگ کچھ بھی نہ کھائیں گے۔"

" اچھا چلو جب تم سب کی یہی ضد ہے تو میں بھی چلتی ہوں۔"

" اُفوہ۔ خالہ جان اتنا اہتمام کرا دیا آپ نے یہ سب کون کھائے گا۔"

" یہ سب تم لوگوں کو کھانا ہے اور کون کھائے گا۔"

خالہ جان میں بھی آسکتا ہوں۔؟

" کون خورشید" گاڑی بان کیا تجھ سے یہاں کوئی پردا کرتا ہے۔"

" خالہ جان آداب۔"

" جیتے رہو میاں خورشید ! خوب آگئے تم بھی وقت پر۔ ہاں اب سب بسم اللہ کرو۔"

قصۂ باغِ ارم آپ سناتے جائیں
میرا پیغام ہے لے دوست پیامِ تعلیم

(محمد شفیع تمنا کلکتوی)

جناب علول جعفری

دسمبر کا پیغام

یہ لیجیے آج ماہ نومبر ہوا تمام — کل سے شروع ہوگا دسمبر کا اب نظام

پڑھنے کا جو سکھائے قرینہ یہی تو ہے — ششماہی امتحاں کا مہینہ یہی تو ہے

اب تک ہمارے شوق کے مرکز کچھ اور تھے — غیراز نصاب[1] و درس توجہ کے دور تھے

کھیلوں کے میچ، کیمپ میں جانے کی باریاں — تقریر کے مقابلے، انشا نگاریاں[2]

آمد پہ یادگار دلوں کی بصد وقار — جلسے کیے ہیں فرطِ مسرت سے بار بار

لکھنے کے کام گھر پہ تو کرتے رہے ہیں ہم — پڑھنے کو اس مہینے پہ دھرتے رہے ہیں ہم

اب ہم ہیں اور کتابوں کی باتیں ہیں دوستو — پڑھنے کے دن ہیں پڑھنے کی راتیں ہیں دوستو

انگریزی، فارسی میں تو اٹھتا نہیں سوال — سب سے زیادہ ہم کو ریاضی کا ہے خیال

وہ نثر ہو کہ نظم، ہمیں اطمینان ہے — اردو میں خوف کیا یہ ہماری زبان ہے

کیا فکر ہم کو علم تمدن[3] کے باب میں — ملتے ہیں سب جواب ہماری کتاب میں

جغرافیہ میں یوں تو ذرا بھی نہیں ہے ڈر — نقشوں پہ ڈال لینی ہے اچھی طرح نظر

لکھنے کی مشق ہندی میں کر لینی ہے ذرا — سائنس یاد کرنی ہے تاریخ سے سوا

محنت کریں گے ہم تو ملے گا ہمیں صلا — محنت کسی کی رائگاں کرتا نہیں خدا

یہ ماہ لے کے آیا ہے پیغام دوستو

ہونا ہے کامیاب تو محنت سے کام لو

۱ غیراز نصاب و نصاب کے علاوہ، درس = سبق یعنی نصابی کتابوں کی پڑھائی کے علاوہ دیگر مشغلے ۲ مضمون لکھنا
۳ سماج [illegible]

جناب مناظر عاشق ہرگانوی

چھوٹا راجکمار

صوبہ بہار کے جنوبی حصے (چھوٹا ناگپور) کی لوک کہانی

کسی راجا کے سات راجکماروں میں چھ تو پڑھتے تھے۔ پڑھنے لکھنے میں تیز بھی تھے۔ مگر ساتواں بہت بودا تھا اور پڑھائی لکھائی میں اس کا دل نہیں لگتا تھا۔ راجا نے ایک گھوڑا دے کر اسے گھر سے نکال دیا۔

بہت دور نکل گیا تو اسے بھوک لگی۔ وہ ایک گاؤں میں جاکر آوازیں لگانے لگا "میں ایک پلیٹ کھانے کو اپنا گھوڑا گروی رکھوں گا"۔ گاؤں کے ایک آدمی نے ایک پلیٹ کھانا دے کر اس کا گھوڑا گروی رکھ لیا۔

کچھ دور اور آگے جاکر اسے پھر بھوک نے ستایا اس بار اس نے جوتا گروی رکھا۔ اسی طرح جب جب اسے بھوک لگتی وہ کسی گاؤں میں جاتا اور کوئی نہ کوئی چیز گروی رکھتا۔ یہاں تک کے ایک ایک پلیٹ کھانے پر اس نے اپنی پگڑی سے لے کر اپنے دونوں پاؤں، دونوں ہاتھ، اور آخر میں اپنا دھڑ تک گروی رکھ دیا۔ صرف اس کا سر بچ گیا۔ اب راجکمار کا سر چلتے چلتے ایک ندی کے کنارے آیا۔ یہاں کئی جھونپڑیاں تھیں۔ وہ پاس والی ایک جھونپڑی میں چھپ گیا۔ وہیں ندی میں سات راجکماریاں غسل کر رہی تھیں۔ وہ سر کراہتی ہوئی آواز میں کہنے لگا "ذرا کوئی پانی پلا دو"۔ آواز سن کر راجکماریوں نے اپنی چھوٹی بہن کو پانی لے کر بھیجا۔ پہلے تو وہ اس سر کو دیکھ کر بہت ڈری۔ لیکن پھر اس نے پانی پلایا۔ اور لوٹ کر جو کچھ اس نے دیکھا تھا اپنی بہنوں کو کہہ سنایا۔

گھر لوٹ کر بڑی راجکماری نے اپنے باپ سے کہا "چھوٹی راجکماری نے نہ جانے کس ذات کے سر کو آج پانی پلایا ہے۔ اسے گھر میں مت رہنے دو"۔

راجا نے اسے گھر سے نکال دیا۔

چھوٹی راجکماری بہت روئی، ڈری بھی گھبرائی بھی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ آخر سوچ کر وہ اسی سر کے پاس گئی اور اسے ساری بپتا کہہ سنائی۔ وہ سر ایک ساتھی پاکر بہت خوش ہوا —— وہ دونوں وہاں سے چل کر نزدیک کے ایک گاؤں میں آئے۔ کسان نے راجا کی بیٹی کو دیکھ کر دونوں کا بے حد احترام کیا اور عزت سے اپنے یہاں ٹھہرایا۔

سسر راجکماری سے بولا "کسان سے ایک کلہاڑی مانگ لو۔" کلہاڑی لے کر وہ دونوں نزدیک کے جنگل میں گئے۔ سسر نے کہا "کلہاڑی کو مجھ سے باندھ دو۔" راجکماری نے ویسا ہی کیا۔

وہ سسر ادھر ادھر گھومتا تھا اور درختوں کو کاٹ کر گراتا جاتا تھا۔ اسی طرح بہت دن گزر گئے۔ آخر اس نے بارہ میل کا جنگل صاف کر دیا۔ پھر ایک مہینے میں سب کٹے ہوئے درخت سوکھ گئے۔ تب سسر کے کہنے سے راجکماری نے ان میں آگ لگا دی۔ درخت جل کر راکھ ہو گئے اور راکھ نے اس زمین کے لیے کھاد کا کام کیا۔ سسر کسان کے پاس پہنچا اور راجکماری بولی "اس زمین کو جوت ڈالو۔"

کسان نے ایک ہی دن میں ساری زمین جوت ڈالی۔ پھر راجکماری گاؤں میں جا کر کسی گھر سے ایک ٹوکری دھان مانگ کر لے آئی۔ وہی اس میں بویا گیا۔ وقت پر بہت دھان پیدا ہوا اور تیار ہونے پر ایک ہی دن میں سسر کی مدد سے راجکماری اور کسان نے دھان کاٹ کر اور اوسا کر گھر بھر لیا۔ راجکماری نے ادھار لیا ہوا دھان واپس کر دیا۔ پھر راجکماری نے بھات تیار کیا اور سسر ایک پلیٹ کھانا لے کر اپنے مہاجنوں کے پاس گیا اور اپنا دھڑ، ہاتھ، پاؤں، پگڑی، جوتا اور گھوڑا سب کچھ واپس لے لیا۔ اب وہ راجکمار تھا۔

پھر راجکمار اور راجکماری میں شادی ہو گئی۔

کچھ عرصہ بعد ان دونوں نے آپس میں کچھ فیصلہ کیا اور وہاں سے چل پڑے اور راجکمار کے باپ کے گاؤں کے نزدیک ڈیرا ڈال دیا۔

اس درمیان میں راجکمار اور راجکماری کے ماں باپ بہت غریب ہو گئے تھے۔

ایک دن راجکمار کی ماں راجکمار کے گھر بھیک مانگنے آئی۔ اس نے اپنے بیٹے کو نہیں پہچانا۔ مگر راجکمار نے اپنی ماں کو پہچان لیا۔ اس نے اسے کچھ چاول دے کر پوچھا۔ "تمھارے کتنے لڑکے ہیں اور وہ کہاں ہیں؟"

جواب ملا "میرے سات لڑکے تھے چھوٹے کو اس کے باپ نے نکال دیا تھا۔ باقی چھ کچھ کر نہیں پائے حکومت چھن جانے سے ہم غریب ہو گئے ہیں۔ لڑکے گھر پر پڑے رہتے ہیں اور اپنے ماں باپ کی خیرات کی کمائی کھاتے ہیں۔"

راجکمار نے کہا "اچھا باقی لڑکوں کو یہاں لے آؤ۔ میں انھیں نوکر رکھوں گا۔ بوڑھے کو بھی لیتی آنا۔"

وہ خوشی خوشی گھر لوٹی اور اس نے ان لوگوں سے سب باتیں کہیں۔ وہ سب بہت خوش ہوئے اور چل پڑے۔ جب وہ راجکمار کے سامنے آئے تو اس نے پوچھا "چھوٹے لڑکے کو کیوں نکالا گیا تھا۔"

بوڑھے نے جواب دیا "وہ پڑھتا نہیں تھا۔ اسی لیے نکال دیا تھا۔"

راجکمار نے کہا "میں وہی نکالا ہوا لڑکا ہوں۔"

بوڑھے نے لڑکے کو سینے سے لگا لیا۔ اور ماں بلائیں لینے لگی۔ پھر سب خوشی خوشی رہنے لگے۔

ایک دن راجکماری کی بہنیں بھیک مانگتی ہوئی وہاں پہنچیں۔ راجکمار اور راجکماری نے انھیں پہچان لیا۔ راجکمار بولا "لو، اپنی بہن کو پہچانو، ایک دن تم ہی سب نے اسے گھر سے نکلوا دیا تھا اور آج اسی سے بھیک مانگنے پہنچی ہو۔"

وہ سب شرمندہ ہوئیں اور اپنی چھوٹی بہن سے معافی مانگنے لگیں۔ راجکماری نے انھیں معاف کر دیا اور ان کی خاطر مدارات میں لگ گئی۔

جناب خلیق انجم اشرفی

ہوائی جہاز کیسے اڑتا ہے

صبح کا وقت تھا۔ میں اخبار میں کھویا ہوا تھا۔ پاس ہی رعنا اور حسنین بیٹھے تھے۔ اخبار میں ہوائی جہاز کے سلسلے چوڑے اشتہار پر رعنا کی نظر پڑ گئی اور وہ ایک دم پوچھ بیٹھی "بھائی صاحب یہ ہوائی جہاز اڑتا کیسے ہے؟" اسے ہر بات کی جاننے کی دھن لگی رہتی ہے۔

میں اس کی بات سن کر سوچنے لگا کہ سائنس نے واقعی کتنی ترقی کرلی ہے جو آج بچوں کے سوال کرنے کا انداز تک بدل گیا ہے۔ سو سال پہلے کا بچہ اپنے بڑے سے پوچھتا تھا "ہم چڑیوں کی طرح کیوں نہیں اڑ سکتے؟" اور آج کا بچہ پوچھتا ہے "ہوائی جہاز اڑتا کیسے ہے؟" میں اسی سوچ میں گم تھا کہ رعنا نے اپنا سوال دہرایا "بھائی صاحب یہ جہاز اڑتا کیسے ہے؟"

"ہاں بھائی صاحب بتائیے نا" حسنین نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"بس پائلٹ انجن اسٹارٹ کرتا ہے۔ جہاز تھوڑی دور تک دوڑتا ہے۔ اس کے بعد ہوا میں اڑ جاتا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہ تو ہم بھی جانتے ہیں" رعنا بولی۔

"تو پھر تم کیا پوچھنا چاہتی ہو؟"

"یہی کہ اتنا بھاری بھرکم جہاز سائنس کے کس اصول سے ہوا میں اتنا اوپر اٹھ کر اڑتا ہے" رعنا بولی۔

"سائنس، سائنس، تمہاری سائنس نے تو ناک میں دم کر دیا ہے۔ جاکر ابا جان سے کیوں نہیں پوچھتیں۔ وہ مجھ سے زیادہ سائنس جانتے ہیں۔ وہ تمہیں سمجھا دیں گے۔ مجھے اخبار پڑھنے دو" میں نے ڈانٹا۔

"وہ ہمیں نہیں بتائیں گے" رعنا روہانسی سی ہو کر بولی "وہ تو کہتے ہیں کہ میں بہت مصروف آدمی ہوں مجھے تنگ نہ کیا کرو۔ آخر سائنس کی کتابیں کس لیے ہیں"

"ہاں بھائی صاحب۔ یا تو چچا جان یہ کہہ دیں گے یا پھر اس طرح ٹال دیں گے کہ تم لوگ بچے ہو۔ بڑے ہو کر سمجھ لینا" حسنین نے ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

"تو تم لوگ مجھے اخبار نہیں پڑھنے دو گے" یہ کہہ کر میں نے اخبار تہہ کرکے ایک طرف رکھ دیا۔ عینک اتار کر میز پر رکھ دی "اچھی میں بتاؤں گا ضرور لیکن یہ بات سمجھانی ذرا مشکل ہے میں خود نہیں

جانتا کہ تمھیں اچھی طرح سمجھا بھی پاؤں گا یا نہیں بہرحال کوشش کرتا ہوں۔ اچھا حسین تم ذرا میری میز سے موٹے چکنے کاغذ کا ایک ٹکڑا توڑ لے آؤ۔

حسین دوڑ کر کاغذ لے آیا۔ میں نے جیب سے دس پیسے کا ایک سکہ نکالا۔ ایک ہاتھ میں سکہ اور دوسرے میں کاغذ لے کر کھڑا ہو گیا اور بولا "پہلے ذرا غور سے دیکھو اور مجھے بتاؤ کہ تم نے کیا نتیجہ نکالا" اور یہ کہہ کر میں نے سکہ اور کاغذ کا ٹکڑا ہاتھ سے بیک وقت چھوڑ دیا۔ ایک عجیب سی بات ہوئی۔ سکہ کھٹ سے سیدھا فرش پر گر پڑا لیکن کاغذ ادھر ادھر ڈولتا ہوا آہستہ سے فرش کے دوسرے کونے پر جا گرا۔

"یہ کیسے ہوا؟" حسین بولے۔

"میں جانتی ہوں" رعنا جلدی سے بول اٹھی "اس سوال کا جواب تو بہت آسان ہے۔ سکہ کاغذ سے بھاری تھا اس لیے وہ جلدی فرش پر آگیا کاغذ ہلکا تھا وہ بعد میں فرش پر پہنچا۔"

"واہ بی رعنا واہ" میں ہنس دیا "کیسا چالاکی کا جواب دیا ہے تم نے! لیکن ہمیں یہ بھی تو دیکھنا ہے کہ یہ جواب صحیح بھی ہے یا نہیں۔"

میں نے پھر کاغذ اور سکہ اٹھایا۔ کاغذ توڑ مروڑ کر ایک چھوٹی سی ٹھوس گیند کی شکل دے دی پھر دوبارہ کھڑا ہو گیا اور دوبارہ اسی طرح سکہ اور کاغذ کی اس ٹھوس گیند کو اسی طرح ایک ساتھ چھوڑ دیا۔ اس دفعہ دونوں چیزیں فرش پر بیک وقت گریں۔

رعنا کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔

"میرا خیال ہے کہ یہ بھاری اور ہلکے ہونے کی بات نہیں" حسین نے اپنا خیال ظاہر کیا۔ "کاغذ پھیلنے پر پہلے سے بھاری تو نہیں ہوا۔ میرا خیال ہے کہ یہ کچھ چپٹے پن کا چکر ہے۔ پہلے یہ چپٹا تھا لیکن اب نہیں ہے۔"

"اور اصل بات پوچھو تو" میں نے حسین کی بات سن کر کہا "یہ وزن اور چپٹے پن دونوں کا چکر ہے۔ سکہ بھی تو کچھ نہ کچھ چپٹا ہی ہوتا ہے لیکن کاغذ جب وہ شیٹ کی شکل میں تھا سکے سے زیادہ لمبا چوڑا تھا۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ ہلکی اور چپٹی چیزیں کسی ایک سمت میں سیدھی تیزی سے نہیں گر جاتیں بلکہ ادھر ادھر ڈولتی رہتی ہیں جیسے کاغذ پہلے ادھر

اُدھر ذرا ہلنے کے بعد کمرے کے دوسرے کونے میں گرا تھا۔"

"ایسا کیوں ہے؟" رعنا نے جو میری بات بڑے غور سے سن رہی تھی، بول اٹھی۔

"صبر کرو۔ صبر میری پیاری بہن۔" میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا "میں ابھی تمھیں سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔"

یہ کہہ کر میں نے جیب سے ایک پوسٹ کارڈ نکالا۔ اسے دو برابر حصّوں میں تقسیم کیا۔ اس کے بعد اس کا ایک حصّہ لے کر اس کے کونے کو بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کے ناخن تلے ہلکے سے دبا لیا اور دائیں ہاتھ کی بیچ کی انگلی سے اس کے ایک سرے پر زور سے مارا۔ کارڈ اُڑتا ہوا کمرے کے دوسرے حصّہ میں جا گرا۔ اب میں نے کارڈ کا دوسرا حصّہ لیا۔ اسے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے پر سیدھا کھڑا کیا اور اس بار اس کے چوڑے حصّے پر زور سے انگلی ماری۔ اس بار کارڈ اُڑ کر کمرے کے دوسرے حصّہ میں نہیں گرا بلکہ وہ ہوا میں کچھ دیر پھڑپھڑا کر زمین پر آرہا۔

"ہم نے دیکھ لیا۔" رعنا اور حسین ایک ساتھ بولے۔

"کیا دیکھ لیا تم نے؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"یہی کہ" رعنا نے جواب دیا "کہ ہوائی جہاز چپٹا ہوتا ہے۔"

"تمھارا مطلب ہے کہ اس کے پر چپٹے ہوتے ہیں۔" حسین نے تصحیح کی۔

"اور سچ پوچھو تو وہ بالکل چپٹے بھی نہیں ہوتے۔" میں نے دوبارہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "وہ ذرا سے ترچھے ہوتے ہیں لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ پر کافی چوڑے ہوتے ہیں اور اگر جہاز کا انجن بند کر دیا جائے تو زمین کے بہت پاس آئے بغیر دو تین میل تک اڑ سکتا ہے۔ اصل میں تو ان کی تیز رفتار اور مشین کا وزن اسے انجن بند ہونے کے بعد بھی آگے بڑھاتے ہیں لیکن جو چیز اسے زمین پر کسی پتھر یا ڈھیلے کی طرح گرنے سے بچاتی ہے اور اسے ترچھے آگے بڑھاتی ہے۔ وہ اس کے پروں کی یہی مخصوص شکل اور ڈیل ڈول ہے۔"

"اوہ ایک بات سمجھ میں آئی۔" رعنا بیچ میں بول اٹھی۔ "تو یہ ہے وہ طریقہ جس سے جہاز نیچے اترتے ہیں۔ پائلٹ پہلے انجن بند کر دیتا ہوگا۔"

"ہاں" حسین نے بھی ہاں میں ہاں ملائی "لیکن مطلب کی بات یہ نہیں بلکہ یہ ہے کہ وہ اوپر کیسے اٹھتے ہیں؟"

"اور جب ہوا میں ہوتے ہیں تو اڑتے کیسے ہیں؟" رعنا نے لقمہ دیا۔

"ذرا صبر تو کرو۔" میں نے بڑی لجاجت سے کہا۔ "اور یہ تو سوچو کہ میں کوئی پائلٹ یا سائنس داں تو نہیں بلکہ صرف ——"

"بلکہ صرف ہمارے پیارے بھائی صاحب ہیں۔" رعنا بڑی شوخی سے مسکرا کر مجھ سے لپٹتے ہوئے بولی "اور آپ ہمیں وہ سب کچھ بتانے کی کوشش کر رہے ہیں جو آپ اس بارے میں جانتے ہیں۔"

"اچھا میں بتاؤں گا ضرور لیکن کل۔" میں بولا۔ "دیکھو شاید امّی ہم لوگوں کو کھانے کے لیے آواز دے رہی ہیں۔ چلو اب کھانا کھا لیں اور کل جب میرے پاس اس بارے میں کتابیں پڑھنے کا وقت ہوگا تو میں پڑھ کر تمھیں کچھ اور بتانے کی کوشش کروں گا۔"

دوسرے روز دونوں صبح ہی صبح میرے کمرے میں آدھمکے اور میں نے انھیں بتانا شروع کیا کہ ایک پائلٹ کس طرح ہوائی جہاز کو زمین کی سطح

سمان کی بلندیوں میں لے جاتا ہے۔
سب سے پہلے میں نے انھیں ایک ہوائی جہاز
رٹ کی طرف توجہ دلائی کہ کس طرح اس کے سامنے کے
ے پچھلے حصّہ تک ڈھالو ہوتا چلا جاتا ہے۔ پھر میں نے
ئراسکریو (AIR SCREW) کے بارے میں بتایا
جہاز کے پنکھوں کے نام سے جانتے تھے اور جو جہاز
منے والے حصہ میں لگے رہتے ہیں یا یوں کہیے کہ جہاز
ہیں۔ میں نے بتایا کہ جب یہ ائراسکریو یا پنکھے تیزی
ہتے ہیں تو زمین پر دوڑتے جہاز کی رفتار تیز ہو جاتی
اس کے چوڑے پروں کے نیچے کی ہوا نیچے سے زور
اسے اوپر اٹھنے میں مدد دیتی ہے۔ اور وہ ہوا میں
رہوا سے باتیں کرنے لگتا ہے۔ اس کے بعد میں نے
تو ہوئی اس کے ہوا میں بلند ہونے کی بات جو تم
ے پہلے سوال کا جواب ہے کہ یہ ہوا میں اوپر کیسے
ں۔ اب دوسری بات کہ وہ ہوا میں اڑتے کیسے ہیں۔
ے عجیب وغریب انجن کا کارنامہ ہے جو اتنے بھاری
ہوا میں یوں ہی اڑائے لیے جاتا ہے۔ گویا کوئی پرند
ر تو اس انجن کے کام کے بارے میں تم بڑے ہو کر
سمجھ سکتے ہو جب سائنس کی ٹیکنیکل معلومات اچھی
ل کر لو۔

رعنا اور حسین بڑی دلچسپی سے یہ سن رہے تھے
بڑے جوش سے کہا کہ میں بڑا ہو کر پائلٹ بنوں گا۔
ہاز اڑایا کروں گا۔ پھر سب باتیں میری سمجھ میں
۔ رعنا کیسے پیچھے رہتی اس نے کہا کہ میں بھی
ں گی اور دنیا کے گرد چکر لگانے والا
ں گی۔ حسین نے اسے انگوٹھا دکھا کر
رنے کہا "رعنا تم سے پہلے
ایک عورت پوری دنیا کا چکر لگا چکی ہے۔" رعنا کھسیانی ہو کر
اسے مارنے لپکی۔ وہ باہر بھاگا اور رعنا بھی دوڑتی ہوئی
اس کے پیچھے پیچھے نکل گئی۔

ذرا نیچے دیکھیے!

ایک گول دائرہ سا بنا ہے۔ اس گول دائرے میں ایک سرخ نشان ہے۔ اس سرخ نشان کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی خریداری کی مدت اس مہینے سے ختم ہو رہی ہے۔

کچھ دنوں سے ہم نے پیام تعلیم کی خریداری کی مہم چلا رکھی ہے۔ یہ مہم خدا کا شکر ہے کہ کامیابی سے چل رہی ہے۔ پچھلے مہینے تو ہم نے آپ کی مدد اور سرپرستی کی بدولت ذرا تیزی سے قدم بڑھایا۔ لگ بھگ دو ڈھائی سو ساتھی آپ کی پیام تعلیم کی برادری میں شامل ہو گئے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ نہ صرف سرپرستی جاری رکھیں گے بلکہ اس برادری کو اور زیادہ سے زیادہ آگے بڑھانے کی کوشش کریں گے۔ پیام تعلیم کے زیادہ سے زیادہ خریدار بنانے کی کوشش کریں گے۔

اس مہینے کی ۲۵ تاریخ تک ساڑھے چھ روپے کا منی آرڈر بھیج دیجیے اور ہاں منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیے

آپ کا خریداری نمبر ——————— ہے

نمبر

پرچہ وی پی سے منگائیے تو آپ کو اتنے پیسے زیادہ دینا پڑیں گے

جناب قاضی سعید الدین

میری گھڑی

ایک دن غلطی سے میں نے اپنی رسٹ واچ الماری میں نہ رکھی ڈریسنگ ٹیبل پر ہی رکھ دی۔ دن بھر تو خیال ہی نہ آیا شام کو جب ہم بازار جانے لگے تو گھڑی کی یاد آئی۔ جلدی سے سنگھار میز پر دیکھا اور پھر ادھر اُدھر تلاش کیا کہیں پتہ نہ چلا۔ میں جلدی میں تھی سوچا رات کو لوٹ کر یا دوسرے دن تلاش کر لوں گی۔ مجھے یقین تھا کہ گھڑی کہیں کھو نہیں سکتی۔ کیونکہ اس دن باہر سے کوئی بھی ہمارے یہاں نہیں آیا تھا اور گھر میں میرے شوہر تین برس کی بچی اور بوڑھے اعتباری نوکر ہری رام کے سوا اور کوئی تھا ہی نہیں۔

بازار میں بہت ہی ضروری سامان خریدنا تھا۔ لیکن میرا دل لگ نہیں رہا تھا۔ رہ رہ کر دھیان گھڑی کی طرف جاتا۔ رات کو گھر لوٹی تو کافی دیر ہو چکی تھی۔ دوسرے دن سویرے میں نے ایک ایک چیز اٹھا کر سارا گھر دیکھ ڈالا۔ گھنٹوں لگاتار تلاش کرنے پر بھی گھڑی نہ ملی۔ میں گھبرائی سی، تھکی سی بیٹھ کر سوچنے لگی ـــــ آخر گھڑی جا کہاں سکتی ہے؟ دل میں کئی طرح کے خیال آنے لگے۔ ہری رام نے تو نہیں لی؟ پھر سوچتی نہیں وہ نہیں لے سکتا۔ آج تک کبھی اس نے ایک پیسے کی چوری نہیں کی۔ پھر گھڑی کون لے سکتا ہے؟ کہتے ہیں کہ دودھ اور انسان کی عقل بگڑتے دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ دل میں شک سا جم گیا کہ گھڑی ہری رام نے چرائی ہے۔ میں نے جلدی سے اُسے بلایا اور کہا دیکھو ہری رام! سچ سچ بتا دو گھڑی کہاں ہے؟

ہری رام کو جیسے کسی نے آسمان سے نیچے پٹک دیا ہو۔ "میں تو نہیں جانتا بی بی جی" کھویا سا حیران سا ہری رام بولا "جانتے کیسے نہیں۔ سوا تمھارے دوسرا کوئی اس کمرے میں گیا ہی نہیں۔ دیکھو زیادہ بننے کی کوشش نہ کرو۔ چپ چاپ ہماری گھڑی دے دو۔ ورنہ بُرا ہوگا" غصے سے کانپتی ہوئی میں یہ سب کچھ اسے ایک سانس میں کہہ گئی۔

نوکر نے بہتیرا کہا کہ اس نے گھڑی نہیں لی۔ مگر میں نے اس کی ایک نہ سنی۔ اسے اسی وقت اپنے یہاں سے نکل جانے کو کہا اور وہ چلا گیا۔

سامنے سڑک کے پار نیا مکان بن رہا تھا۔ بچی کو اسکول سے لوٹتے وقت روز میں ہری رام کو یہاں مزدور کا کام کرتے دیکھتی ــــــ اس کا

دبلا اور کمزور جسم اینٹ اور گارا ڈھونے کے قابل نہ تھا۔ سے دیکھ کر میرے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی۔ پھر سوچا ٹھیک ہے چور کو سزا ملنی چاہیے۔

بچی کے اسکول میں چار دن کی چھٹی تھی۔ وہ بیٹھی کھیل رہی تھی۔ میں قریب ہی اس کا فراک سی رہی تھی مجھے سلائی کرتے دیکھ، وہ جلدی سے اپنے کھلونوں کے بکس میں سے اپنی بڑی گڑیا اٹھالائی اور بولی۔

"امی! میری گڑیا کا بھی نیا فراک بنا دو نا؟" جونہی میں نے نظر اوپر اٹھائی۔ میرے منھ سے ایک چیخ نکل گئی دیکھا گھڑی گڑیا کے بازو میں لپٹی تھی۔ گڑیا بچی کے ہاتھ سے چھین میں جلدی سے وہاں گئی جہاں ہری رام کام کرتا تھا مگر وہاں وہ دکھائی نہ دیا۔ پوچھا تو پتہ چلا کہ دو دن پہلے وہ سیڑھی سے گر گیا تھا۔ اک دن ہسپتال میں رہ کر چل بسا۔ ہری رام ہمیشہ کے لیے چلا گیا اور مجھے ایسا سبق دے گیا۔ جسے میں مرتے دم تک نہ بھول سکوں گی۔

جناب محمد امین

...یس ابابا سے میکلے کا سفر:-

...دیس ابابا مشرقی افریقہ کا سب سے بڑا شہر ہے، اور پھر
...الاقوامی اداروں یو۔ این۔ او کے افریقہ کے اقتصادی کمیشن
...یقہ کو متحد کرنے والے آرگنائزیشن آف افریقن یونٹی اور بین الاقوا
...ی سروس کا مرکز ہے۔ ریل اور سڑکوں کا مرکز ہے۔ ایتھوپیا
...کمراں اور سب سے فوقیت رکھنے والے قبیلے یعنی امہرا کا بھی
...کز ہے۔ اس کے علاوہ یہ صوبے "شوا" میں واقع ہے
...صوبے کا سب سے بڑا شہر اور مرکز ہے۔ گویا یہ ایتھوپیا کا
...ہے۔ یہاں سے رگوں کی طرح سڑکیں ہر سمت دوڑتی ہیں۔

...دیس ابابا کا ماحول خوش نما اور قرب جوار کے مناظر زمرد
...رش سے آراستہ ہیں۔ ایک طرف انطوٹو کے پہاڑ ہیں۔ اس
...دی پر پہنچ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم ایک مسطح پلیٹو پر آگئے
...ور سامنے میلوں ہموار سیاہ علاقہ پھیلا ہوا دیکھ کر خیال آتا
...آیندہ جب عدیس ابابا کچھ پھیل جائے گا تو اس ہموار
...پر ایک نیا ٹاؤن شپ ایک نئی بستی آباد ہو سکتی ہے۔
...افریقہ اور ایتھوپیا میں [illegible] پڑ گئی ہے جسے
...ٹ کی وادی کہتے ہیں [illegible]
...ہے۔ [illegible] کے جھٹکے اور زلزلے

یہ پاک ہے۔

عدیس کے موجودہ شہر میں ایک نقص یہ ہے کہ وہ بالکل رفٹ کی وادی کے کنارے ہے اور وہاں خواہ ہلکے سہی لیکن ہر روز اوسطاً دو جھٹکے آتے ہیں۔ اسی وجہ سے عدیس ابابا میں بولے کے ہوائی اڈہ کی عمارت اور عدیس کی بہترین بین الاقوامی عمارت "افریقہ ہال" میں زلزلے کی وجہ سے دراڑیں پڑ گئی ہیں۔

عدیس ابابا کے دوسری طرف یعنی جنوب اور مشرق میں نشیب ہے۔ سڑکوں سے بشافتو، نازرتھ اور سوڈرے کی طرف جا سکتے ہیں جہاں سیاح کے لیے خوش نما مقامات اور تفریح گاہیں ہیں۔ پھر موجو سے کوکا باندھ اور بحر گیلا کی سڑک سے ہوتے ہوئے رفٹ کی وادی کے ڈھلان میں نیچے اترتے ہوئے جھیلوں کے جھنڈ میں جا سکتے ہیں۔ ان کا ذکر آگے کی قسطوں میں تفصیل سے آئے گا اور ووںجی کا چینی کا کارخانہ بھی دیکھ سکتے ہیں۔

عدیس ابابا سے جنوب مغرب کی طرف جیما [illegible] ہو کر جما بھی جا سکتے ہیں۔ مغرب کی طرف بھی ایک سڑک گئی ہے جو ایتھوپیا [illegible] کے پہاڑوں والے علاقے میں [illegible] اور گزرے [illegible] گئی ہے۔ شمال [illegible] کو [illegible] سڑک [illegible] جاتی ہے اور اس سڑک پر دریائے نیل کا نظارہ

جمیل تنا، بہاردار، نیلے نیل کا زبردست آبشار، گونڈار، دریائے ٹکازی (اتبارا) کا خطرناک غار ملے گا، اکسوم اور عدوا کے تاریخی شہر بھی ملیں گے۔

لیکن مجھے تو میکلے جانا تھا۔ اس لیے میں نے شمال کی طرف جانے والی سڑک کو ترجیح دی۔ یہی سڑک میکلے کے آگے اسمارا تک چلی گئی ہے اور کل فاصلہ ۱۰۷۶ رکلومیٹر ہے۔ میکلے ۷۷۷ رکلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ صوبہ تیگرے کا صدر مقام ہے اور سیاحوں کا مرکز ہے۔ اس کی آبادی ۲۲ رہزار ہے۔

سیاحت کے دفتر سے میں نے ایتھوپیا کی گائڈ کا نقشہ خرید لیا تھا اور میکلے کے جغرافیائی حالات سے کچھ واقف تھا۔ لیکن چشم دید حالات اور اپنے ذاتی تجربے کی بات اور ہے محض کتاب پڑھنے اور کتابی کیڑا بننے سے کام نہیں چلتا۔ سیر و سیاحت کرنا، مشاہدہ کرنا خود دنیا کو دیکھنے سے انسان صحیح معنوں میں انسان بنتا ہے۔ مجھے اپنے سابق وزیراعظم آنجہانی جواہرلال اکثر یاد آتے ہیں۔ وہ جہاں ان تھک کام کرتے تھے یعنی ۱۹ رگھنٹے روزانہ اسی کے ساتھ بے انتہا کتابیں بہترین کتابیں پڑھتے تھے۔ وہاں ان کو سیر و سیاحت کا، قدرتی مناظر کا نظارہ کرنے اور ملکوں کا دورہ کرنے کا بھی شوق تھا۔ افریقہ کی سرزمین پر قدم رکھ کر مجھے معًا خیال آیا کہ باہر نکل کر انسان کا نقطۂ نظر کتنا بدل جاتا ہے۔ کتنا وسیع ہو جاتا ہے۔

میں چاہتا تو میکلے ہوائی جہاز سے بھی جا سکتا تھا۔ کرایہ ۷۵ ر ایتھوپین ڈالر یعنی ۲۲۵ ر روپے تھا لیکن بہ حیثیت جغرافیہ کے طالب علم کے میں نے بس سے سفر کرنا زیادہ پسند کیا۔ بس میں تین دن پہلے میں نے اگلی سیٹ بُک کرالی تھی۔ ۲۰ ر دسمبر ۱۹۷۷ء کو صبح ۷ ر بجے میں نکل پڑا۔ ہماری بس ارات کیلو یعنی وزارت تعلیم و فائن آرٹ کی عمارت کے پاس سے ہو کر شہر کی آبادی کے راستے سے گزری۔

راستے میں ہندوستانی سفارت خانے کا بورڈ اور ڈے نیل صاحب کا گھر بھی نظر آیا۔ آخر میں ہائیلے سلاسی اوّل سکنڈری اسکول بھی پڑا۔ شہر سے اندازاً ۱۱ ر کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔

اس کے بعد سڑک غریب قریب ہموار پلیٹو سے ہو کر گزرنے لگی۔ سڑک کے دونوں طرف دور دور تک کھیت تھے ہرے بھرے کھیت۔ جدھر نظر ڈالیے ہریالی ہی ہریالی۔ مٹی کالی تھی اور یہ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ آتشی چٹانوں کے گھلنے ٹوٹنے اور گھلنے سے بنی ہے۔ بظاہر یہ مٹی زرخیز تھی اور سڑک کے کنارے علاوہ ایکولپٹس کے جھنڈوں اور قطاروں کے چراگاہوں میں گھاس کا مخملی فرش بچھا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ ایتھوپیا سوا نالینڈ یعنی سوڈان کی قسم کی آب و ہوا رکھنے کی وجہ سے بڑا ہی سدابہار قسم کا ملک ہے۔

۲۷ رکلومیٹر پہنچنے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ پلیٹو کی بلندی بڑھ رہی ہے اور ہم رج (Ridge) یعنی ایک پہاڑی کے اوپر چڑھ رہے ہیں۔ بائیں طرف زمین ڈھالو تھی اور کچھ غار دکھائی دے رہے تھے۔ شاید یہ غار ان دریاؤں نے بنائے تھے جو نیلے نیل کے معاون ہیں۔ اس پہاڑی پر جگہ جگہ گاؤں نظر آئے یہ زیادہ پرانے نہیں تھے۔ لب سڑک ہونے کی وجہ سے ان میں کچھ شہری رنگ جھلکتا تھا۔

۱۲۲ رکلومیٹر کے بعد ہمیں ایک بڑا سا گاؤں ملا جہاں کی شاہی محافظ دستوں (باڈی گارڈ) کا کیمپ تھا۔ اس کے بعد پہاڑی کی بلندی پر چڑھتے ہوئے ۱۳۰ ر کلومیٹر کی دوری پر "دیبرے برہان" کا شہر ہے۔ اس شہر کے بارے میں ڈاکٹر احسن نے عدیس ابابا میں ہی بتایا تھا کہ وہاں ایک ٹیچرس ٹریننگ اسکول ہے اور اونی کپڑوں کا بڑا سا کارخانہ ہے۔ یہ شہر بادشاہ زارا یعقوب نے ۱۴۵۶ء میں آباد کیا تھا۔ دیبرے برہان کا مطلب ہے "روشنی کا مرکز"۔ [illegible]

فادر یعقوب نے اپنے زمانے میں اس جگہ آسمان میں ایسی روشنی دیکھی جو عیسائی لوگوں کے گراس سے ملتی جلتی تھی۔ چنانچہ اسی روشنی کے نام پر اس نے اس شہر کا نام رکھ دیا "ڈبرے برہان" اس سے پہلے بھی مشہور تھا کہ وہ انکوبر (ANKOBER) نام کے تاریخی شہر کے قریب تھا اور رفٹ کی وادی سے ساحل تک جو تجارتی راستہ تھا اس پر واقع تھا۔ "انکوبر" "ڈبرے برہان" سے ۴۲ کلو میٹر کے فاصلے پر جنوب مشرق میں واقع ہے۔

"ڈبرے برہان" سے جب بس آگے بڑھی تو میں نے دیکھا کہ دریائے نیلے نیل (BLUE NILE) کے معاون دریاؤں نے چٹانوں کی تہوں کو کاٹ کر غار بنا رکھے ہیں۔ ان غاروں کے کنارے کنارے سڑک ایک پہاڑ پر چڑھنے لگی۔ اس پہاڑ کا نام ماؤنٹ ٹرمابیر (Mt. TERMABER) تھا۔

جب میں ۱۱۱ کلو میٹر پہنچا تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ بس رفٹ کی وادی کے سر پر پہنچ گئی ہے۔ پھر ڈھلان اور ٹیڑھے میڑھے راستے سے ہوکر سڑک نیچے اتری اور ایک پل کو پار کر کے شمال کی طرف چل پڑی۔ یہاں سے داہنی طرف کچھ فاصلے پر رفٹ کی وادی تھی اور ایک غار میں سے ہوکر اس کے راستے کی لکیر بنی ہوئی تھی۔ اس غار کا نام "بیبون کا غار" (BABOON GORGE) تھا۔ اس لیے کہ چوٹی پر یہاں بیبون نام کے بندروں کی بہت سی ٹولیاں رہتی ہیں۔ میں نے دیکھا بھی کہ کچھ بیبون ادھر ادھر کود رہے ہیں۔ آس پاس کوئی آبادی نہیں تھی اس لیے ان کو آزادی تھی اور وہ خوب سیر گشت کر رہے تھے۔

اس کے بعد ہماری بس ایک سرنگ میں گھس گئی۔ یہ سرنگ ۵۰۰ میٹر لمبی، ۴ میٹر چوڑی اور ۵ میٹر اونچی تھی۔ ماؤنٹ ٹرمابیر کو کاٹ کر یہ سرنگ نکالی گئی تھی۔ اسے پار کرنے کے بعد سڑک کم دوری تھی۔ پتھروں، چٹانوں کے ٹکڑے اور روڑی کی بنی تھی۔ پہاڑ اور اس کی چٹانوں کی تہوں کو کاٹ کر بنائی گئی تھی۔ کنارے کنارے سانپ کی لکیر بنائے ہوئے اوپر جاکر پھر بل کھاتے ہوئے نیچے اترتی تھی۔ اب ہم ماؤنٹ ٹرمابیر کے دامن میں واقع "ڈبرے سینا" پہنچ گئے تھے۔ یہاں ہم نے دوپہر کا کھانا کھایا۔ میں نے کھجور، بسکٹ، سنترے اور کیلے کا لنچ لیا۔ یوں تو ہوٹل میں گوشت گرم گرم اور انجرا تیار تھا اور سب لوگ شوق سے لے کر کھا رہے تھے لیکن بھیڑیے بچنے کے لیے میں نے اپنے مخصوص لنچ کو ترجیح دی۔

عدیس ابابا سے ڈبرے سینا کا فاصلہ ۱۹۲ کلو میٹر تھا۔ لنچ کے بعد جب ہم وہاں سے آگے چلے تو تھوڑی دور کے بعد سڑک تیزی سے نیچے اترنے لگی۔ اور ہم فوراً ایک لمبی چوڑی وادی میں داخل ہو گئے۔ گویا اب ہم ایتھوپیا کی رفٹ وادی کے سب سے نشیبی علاقے سے ہوکر گزر رہے تھے۔ اس علاقے میں یہ وادی ڈیڑھ سو کلو میٹر لمبی تھی اور کئی گھنٹے تک بس اس میں سے ہوکر تیز بھاگتی رہی۔ یہ وادی زرخیز تھی اور اس میں مکا، کپاس تماکو اور جوار باجرے کے کھیت لہلہا رہے تھے۔ جگہ جگہ ہمیں گیندنما جھونپڑیاں ملیں جن کو ٹوکل (TUKUL) کہتے ہیں۔

پہاڑ کی بلندی سے ہم نیچے اتر آئے تھے اس لیے گرمی محسوس ہوتی تھی۔ درجۂ حرارت یقیناً بڑھ گیا تھا اور یہ محسوس ہوتا تھا کہ ہم مارچ کے مہینے میں شمالی ہندوستان میں گرینڈ ٹرنک روڈ سے سفر کر رہے ہیں۔ سب نے اپنے اپنے گرم کپڑے اتار دیئے تھے۔ کچھ غنودگی سی محسوس ہوئی اور میری آنکھیں بند ہو گئیں۔ کچھ دیر کے بعد چونک کر جو میں اٹھا تو کچھ خنکی سی محسوس ہوئی اور معلوم ہوا کہ دریائے روبی (Kombolcha) کمبولچا سے گزرنے کے بعد ہم کمبولچا پہنچ گئے ہیں جو ۳۷۶ کلو میٹر کے فاصلے پر واقع تھا۔ یہ ایک جنکشن ہے اور یہاں سے غضب

رہ ۹۵ ۲۵ یہاں کی طرف بھی سڑک جاتی ہے۔ ایک ہوائی اڈہ بھی تھا اور قیام کے لیے بہت عمدہ ہوٹل اور ریستوران ہے۔ شام کی چائے ہم نے یہیں پی اور چند منٹ کے بعد بس ڈیسی (DESSIE) کی طرف روانہ ہوگئی۔ کم بوچا سے ۳۲۲ کلو میٹر کے بعد ہم جلد ہی دیسی پہنچ گئے۔

یہ صوبہ اولو کی راج دھانی ہے اور آبادی کے اعتبار سے ایتھوپیا کا یہ تیسرا سب سے بڑا شہر ہے۔ اس کی آبادی ۸۰ ہزار ہے۔ یہ پہاڑ تسا (MT TASSA) کے دامن میں ۹ ہزار فٹ سے زیادہ بلندی پر واقع ہے اس لیے مجھ کو یہاں عدیس ابابا سے زیادہ ٹھنڈ محسوس ہوئی۔ یہاں گجرات کے ایک دوست مسٹر عبد الغنی سے ملاقات ہوئی۔ رات کا کھانا میں نے ان کے ساتھ کھایا اور ان کی بیوی اور بچوں سے اس دور دراز کے شہر میں مل کر ایسا محسوس ہوا کہ میں اپنے گھر پہنچ گیا ہوں۔ ان سے دل کھول کر باتیں ہوئیں اور انھوں نے اپنے دو سال کے تجربے کی روشنی میں کئی مفید باتیں بتائیں۔

دوسرے دن یعنی ۴ر دسمبر ۱۹۷۵ء کو صبح ۶ ½ بجے بس میکلے کی سڑک پر روانہ ہوگئی۔ یہاں سے میکلے کا فاصلہ ۳۸۰ر کلو میٹر تھا اور پوری مسافت طے کرنے کے لیے ہمیں ۸ر گھنٹے سے زیادہ وقت چاہیے تھا۔ ماؤنٹ تسا کی بلندی سے اترنے کے بعد ہم اونچے نیچے پلیٹو سے ہو کر گزرے۔ ڈیسی سے ۶۸ر کلو میٹر کے بعد سڑک ایک اسکارپمنٹ یعنی پہاڑ کی ڈھلان پر چڑھنے لگی۔ اسے پار کرنے کے بعد ۱۱۲ر کلو میٹر پر ہم ولڈیا (WALDIA) پہنچے۔ یہاں سے پیدل اور خچروں پر چڑھتے ہوئے ایک راستہ للیبیلا (LALIBELA) کو جاتا ہے۔ یہ ایک قدیم شہر ہے جہاں چٹانوں کو کاٹ کر کئی گرجا گھر بنائے گئے ہیں۔ ... جہاں تک پہنچنا

ولڈیا کے بعد سڑک پہاڑوں کے درمیان چکر کاٹتی ہوئی ۳۳ر کلو میٹر کے بعد ایک سرنگ میں سے ہو کر گزرتی۔ اب سامنے ایک لق و دق میدان تھا۔ اس کا نام کوبو کا میدان (PLAIN OF KOBO) تھا اور اس کے بیچ میں کوبو کا چھوٹا سا قصبہ بسا تھا۔ اس میدان میں زیادہ تر آبادی ایتھوپیا کے سب سے بڑے قبیلے یعنی گالا لوگوں کی ہے اور ان کی ٹوکل نما جھونپڑیاں ہر طرف دیکھی جا سکتی ہیں۔ ببول کے درخت جگہ جگہ اُگے ہوئے تھے۔ ان کو کاٹ کر اور جلا کر کوئلہ بنایا جاتا۔ یہ کوئلے بھری سیکڑوں بوریاں سڑک کے کنارے پڑی تھیں۔

آگے بڑھے تو میدان میں پانی با افراط نظر آیا۔ چراگاہوں کی بھر مار تھی۔ جن میں بے شمار مویشی چر رہے تھے۔ ان کی خصوصیت یہ تھی کہ سب کے سینگ لمبے اور دائرہ بناتے ہوئے نوکیلے تھے لمبی سینگوں والی گائیں کہلاتی ہیں۔ ان کے ریوڑ کے ریوڑ ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔

ان کا تماشا دیکھتے ہوئے ٹوکل کی ڈرائنگ بناتے ہوئے چلتے چلتے بس الم آتا (ALLAMATA) پہنچی فوراً ہی بعد الم آتا کے پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ سڑک پہاڑوں کے اندر گھس گئی اور اب مسلسل چڑھائی ہی چڑھائی تھی سڑک کیا تھی ہم ایک لامتناہی دائروں کے ارد گرد چکر کاٹ رہے تھے ۱۳ر ہزار فٹ کی بلند چوٹی کو پار کرنا جوئے شیر لانے کے مصداق تھا۔ بس ٹروڈ پہ ندر لگاتی رہی۔ بعض موڑ ٹیڑھے راستے اور چڑھائی ایسی خطرناک تھی کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے اور دہشت محسوس ہوتی تھی۔ پہاڑ تھے کہ ختم ہی نہ ہوتے تھے۔ آخر عدد گھیرے، دائرے اور چکر کاٹنے کے بعد ہم پہاڑ کے دوسری طرف نکلے۔ ہم نے خدا کا شکر ادا کیا اور بخیریت تمام ہم کورم پہنچے۔ یہاں دوپہر کا کھانا کھا

یہاں سے روانگی کے بعد دیسی سے ۱۵ کلومیٹر پر جھیل آنگی (LAKE ANGHI) نظر آئی جس کے پاس کا علاقہ زرخیز تھا اور فصلیں کھڑی تھیں۔ پھر میں مائیچو (MAICHEW) پہنچ گیا۔ اس جگہ ۱۹۳۶ء میں اٹالین اور ایتھوپین فوجوں میں جھڑپیں ہوئی تھیں اور شہنشاہ ہائیلے سلاسی اول نے جنگ میں حصہ لیا تھا۔ لیکن فاسسٹ فوجوں کا دباؤ زیادہ ہونے کی وجہ سے ایتھوپین فوج پناہ لینے کے لیے پہاڑوں میں پیچھے ہٹ گئی تھی۔

مائیچو کے بعد پھر پہاڑوں سے سابقہ تھا۔ سڑک تنگ اور اونچی نیچی تھی۔ اسکارپمنٹ یعنی پہاڑ کی بلندی کو پار کرنے کے بعد میں ایک ایسے پلیٹو پر پہنچا جو کسی قدر خشک اور پتھریلا تھا۔ ببول کے درخت بھی نہیں تھے۔ اور جھاڑیاں بھی غائب تھیں۔

اب صوبہ تگرے کا علاقہ شروع ہو چکا تھا۔ سڑک کے بجائے جگہ جگہ پتھروں کے چوکور مکانات نظر آ رہے تھے۔ دو ہزار سال پہلے اکسوم کی عمارتوں کا جو ڈیزائن اور نقشہ تھا یہ مکانات ان سے ملتے جلتے تھے۔ اونٹوں کے قافلے بھی ملے جو ڈنیکل کے علاقے سے نمک لاد لاد کر لا رہے تھے۔ ۲۹۰ کلومیٹر کے فاصلے پر کوئیہا (QUIHA) کا قصبہ ملا۔ جہاں سے سڑک سیدھی اسمارا جاتی ہے۔ میکلے اس سڑک سے ہٹ کر دوسری طرف واقع ہے۔ اب ہماری منزل مقصود قریب تھی۔ کوئیہا کے ڈرنک ہوٹل میں میں نے شام کا قہوہ پیا۔ ہوٹل کے مالک اور مالکن اطالین جوڑے سے کچھ معلومات حاصل کیں۔ پھر منٹوں میں ۱۲ کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے میں شام کو ۵ بجے میکلے پہنچ گیا۔

(باقی آئندہ)

جناب معین کوثر

بچوں کا گیت

چھٹی کا زمانہ ختم ہوا
اسکول کھلا اسکول کھلا

آموختہ کوئی یاد نہیں — دل شاد نہیں من شاد نہیں
سنتا ہے کوئی فریاد نہیں — ماں باپ نہیں استاد نہیں
اسکول کھلا اسکول کھلا

ہر روز کا پھر وہ سبق نیا — اور ذہن کی ورزش کھیل کی جا
پھر ٹاسک نہ کرنے پر وہ سزا — ہر روز کی آفت نئی بلا
اسکول کھلا اسکول کھلا

وہ غپ شپ، قصے، پھلجھڑیاں — احباب کی صحبت یہاں وہاں
اب شام و سحر کی سیر کہاں — بس موٹی کتابیں آفت جاں
اسکول کھلا اسکول کھلا

تاریخ حساب اور جیومیٹری — بس ایک قیامت ہر گھنٹی
کچھ خاک سمجھ میں آئے بھی — بیکار کی دن بھر دردسری
وہ صبح نہیں وہ شام نہیں — اب نام کو بھی آرام نہیں
ہر چند غم ایام نہیں! — ہونٹوں پہ ہنسی کا نام نہیں
اسکول کھلا اسکول کھلا

پوری بہار ساری گرمیاں اور عمر بھر

ساری ریلوں کے انجن بالکل ٹھیک ٹھاک تھے، مطلب یہ کہ جیسے انجنوں کو ہونا چاہیے۔ بس یہ انجن تھا کہ کچھ سمجھ ہی میں نہ آتا تھا اسے کیا ہوگیا ہے۔ ہر جگہ دیر سے پہنچتا۔ جانے کتنی بار اس انجن نے قسم کھائی ہوگی کہ اب راستے میں کہیں بھی رک کے نہ دیکھے گا کہ کیا ہو رہا ہے، چاہے کچھ بھی ہو رہا ہو، لیکن ہر بار وہی ہو جاتا۔

ایک بار اسٹیشن ماسٹر نے اس سے بہت اداس ہو کر کہا، "اگر اب کے تم دیر سے آئے ۔۔۔ تو ۔۔ تو میں ۔۔"

انجن سمجھ گیا کہ کیا بات ہے اور اس نے فوراً سیٹی بجا دی ۔۔۔ "میں ۔۔۔ یہ آخری بار ہے ۔۔۔ آپ سے وعدہ کرتا ہوں ۔۔۔ اب ۔۔۔ کبھی ۔۔۔ جو ۔۔۔"

اور لوگوں نے اس عجیب غریب انجن پر بھروسہ کر لیا۔ انجن چھک چھک چھک چھک کرتا روانہ ہوگیا۔ اس نے ایک پھول کھلا دیکھا۔ جی تو اس کا بہت چاہا کہ ذرا رک کر دو باتیں کرے لیکن اسے اپنا وعدہ یاد آگیا اور وہ آگے بڑھ گیا اور اس طرح وہ سیدھا چلتا رہا، ادھر ادھر آنکھ اٹھا کر بھی اس نے نہ دیکھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ لیکن اچانک اس نے جنگل میں سے ایک آواز سنی۔ کوئی ایسی ویسی نہیں۔ بلبل کی آواز۔ بس وہ بھولا انجن نے ٹھنڈی سانس بھری، ایک بار دوبار اور جنگل کی طرف چل پڑا۔

مسافروں نے دیکھا تو سب کے سب چلائے۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے، ہمیں پھر دیر ہو جائے گی۔"

انجن نے جواب دیا۔ "ہاں دیر تو ہوگی لیکن یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ آپ کو اسٹیشن پہنچنے ہی میں دیر ہو جاتی اور میری گاڑی نہ ملتی۔ اور بات یہ ہے صاحبو، کہ اگر اس بلبل کا گیت نہ سنا تو پوری بہاریوں ہی گذر جائے گی۔"

کوئی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ان میں سب سے عقل مند آدمی بولا "شاید یہ ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔" اور ساری رات وہ ریل گاڑی بلبل کا گیت سنتی رہی۔ صبح کے قریب انجن پھر

اپنے راستے پر روانہ ہوا۔ اور پھر چلتا رہا، چلتا رہا، اور اس نے ایک بار بھی اِدھر اُدھر نہ دیکھا۔ لیکن پھر اچانک جنگل کی طرف سے سوسن کی مہک کا ایک جھونکا آیا اور انجن رک گیا۔

مسافر پھر چلائے "پھر وہی بدتمیزی! ہمیں دیر ہو جائے گی۔"

اور پھر انجن نے جواب دیا "دیر تو ہو گی اسٹیشن پر تو دیر سویر پہنچ ہی جائیں گے لیکن بات یہ ہے صاحبو کہ اگر وادی کی پہلی سوسن کو نہ دیکھا تو ساری گرمیاں یوں ہی گذر جائیں گی۔"

لوگوں نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن سب سے عقلمند آدمی پھر بول پڑا "شاید یہ ٹھیک ہی کہہ رہا ہے کیوں نہ تھوڑی سوسن ہم لوگ توڑ لیں۔"

اور پھر کہیں جا کے شام کو یہ لوگ روانہ ہوئے چلتے گئے، چلتے گئے اور انجن نے اِدھر اُدھر دیکھا تک نہیں۔ اچانک وہ لوگ ایک پہاڑی پر پہنچ گئے۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے! کوئی تک ہے؟ آخر ہم اس پہاڑی پر کیوں کھڑے ہیں؟"

انجن نے جواب دیا "سورج ڈوب رہا ہے، ڈوبتے سورج کا سماں اگر آج نہ دیکھا تو عمر بھر پچھتائیں گے، صاحبو ہر روز کا ڈوبتے سورج کا سماں نرالا ہی ہوتا ہے۔"

اس بار کسی نے اس سے بحث نہ کی دیر تک سب وہاں کھڑے ڈوبتے سورج کا سماں دیکھتے رہے اور انتظار کرتے رہے کہ انجن سیٹی دے کر روانہ ہو۔

آخر کار وہ لوگ اسٹیشن پہنچ ہی گئے۔ مسافر تو گاڑی سے اتر کر چلے لیکن انجن بھاگ کے ایک نے [illegible] گیا۔ اسے یقین تھا کہ یہ مسافر جا کر اسٹیشن ماسٹر سے اس کی شکایت ضرور کریں گے۔ لیکن ان لوگوں نے اسٹیشن ماسٹر کا شکریہ ادا کیا۔ اسٹیشن ماسٹر کو بڑا تعجب ہوا "آپ لوگ تین دن دیر سے پہنچے ہیں۔"

مسافروں نے کہا "ہمیں معلوم ہے۔ لیکن اگر یہ نہ کرتے تو پوری بہاریں یوں ہی گذر جاتی، ساری گرمیاں یوں ہی گذر جاتیں اور عمر بھر پچھتاتے۔" اسٹیشن ماسٹر کی کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا۔ لیکن بچو، تم تو سمجھ گئے ہو گے۔ کبھی کبھی جلدی کرنے سے بھی نقصان ہوتا ہے اگر کوئی اچھی چیز نظر آئے تو رک جاؤ۔ نہیں تو پوری بہار اور ساری گرمیاں یوں ہی گذر جائیں گی۔ اور صاحبو عمر بھر پچھتاؤ گے۔"

(سوویت دیس کے شکریہ کے ساتھ)

ــــــــــــ

بدحواسی

میں نے ابا جان کو خط لکھا۔ میری طبیعت خراب ہے۔ ڈاکٹر کا بل ادا کرنا ہے۔ ۱۵ روپے بھیج دیجیے۔ دوسرا خط اپنے دوست کو لکھا "میں نے پیسوں کا انتظام کر لیا ہے۔ ابا جان سے بیماری کے بہانے پندرہ روپے منگوائے ہیں۔ اب ہم بمبئی کی سیر کو چلیں گے۔"

ابا جان نے ۱۵ روپے بھیج دیے اور لکھا طبیعت خراب ہے تو نینی تال چلے جاؤ۔ بمبئی میں تو طبیعت اور زیادہ خراب ہو جائے گی۔ ہوا یہ کہ بدحواسی میں ابا جان کے خط پر دوست کا پتہ اور دوست کے خط پر ابا جان کا پتہ لکھ دیا۔ کچھ نہ پوچھیے کتنی شرمندگی ہوئی ہے۔

اقبال احمد [illegible]

کہتے ہیں ایک دن ایک شکاری جنگل میں جا رہا تھا کیا دیکھتا ہے کہ چھپکلی اور سانپ میں ٹھنی ہوئی ہے۔ سانپ چھپکلی کو بار بار ڈس رہا ہے اور چھپکلی ہر مرتبہ اچھل کر گھاس میں گھس جاتی ہے۔ گھاس پر خوب لوٹتی ہے اور پھر لڑنے کے لیے واپس آجاتی ہے۔ آخر اس نے سانپ کو کاٹا۔ سانپ مر گیا، چھپکلی رینگتی ہوئی آگے نکل گئی۔ اس واقعے میں کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ یہ غالباً بھوری چھپکلی ترکمانستان ہی نہیں بلکہ سوویت یونین میں سب سے بڑی چھپکلی ہے۔ اس پر ناگ سانپ کے ڈسنے کا بھی کوئی اثر نہیں ہوتا۔

ایک دن ترکمان سائنس اکادمی کے ماہر حیوانات یلی زاوتیا شرینیانے، کشکا کے قریب ایک مانیٹر یعنی ریگستانی چھپکلی (جو مگرمچھ کی وضع کی ہوتی ہے) پکڑی۔ چھپکلی نے گھبراہٹ میں ۰، سینٹی میٹر لمبا ایک کیڑا (گیورزا) اگل دیا۔ یہ کیڑا اس کی غذا تھی۔ جنگلی چھپکلی ہر قسم کی چیز کھاتی ہے۔ اس کی غذا میں بعض مہلک زہر بھی شامل ہوتے ہیں یہ زہر اس کو ذرا بھی نقصان نہیں پہنچاتے وجہ کیا ہے یہ اب تک معلوم نہیں ہو سکا۔

حال ہی میں اے۔ دیومن نے جو حیاتیات کے طالب علم ہیں۔ کچھ عجیب و غریب واقعا[illegible] بیان کیے ہیں۔ ہمیں آپ کو اچنبھے میں ڈال دینے وا[illegible] انھوں نے ریگستانی چھپکلی پکڑنے کے لیے کئی بار ریگستان [illegible] کے چکر کاٹے ہیں اور ایک ایسی ریگستانی چھپکلی دیکھی جو وا[illegible] فیل پیکر تھی۔ یہ چھپکلی ۱۳۰۰ ملی میٹر لمبی تھی۔ ان کے ا[illegible] مشاہدہ سے سیمیونوف تیانشانسکی کے اس بیان کی تائید ہے کہ بعض ریگستانی چھپکلیاں ۱۴۲۰ ملی میٹر لمبی ہوتی ہیں

دلچسپ مشاہدات

اچھا اور اگر یہ ریگستانی چھپکلی انسان کو کاٹ لے تو؟ دیومن نے اس سلسلہ میں بھی اپنے بعض دلچسپ [illegible] بیان کیے ہیں۔ ایسی ہی ایک چھپکلی نے ان کے ایک دو[illegible] کو کاٹ لیا تھا۔ ان کی حالت خراب ہو گئی اور وہ دن [illegible] کچھ نہ کھا سکے۔

ایک چھوٹی لڑکی ایک ریگستانی چھپکلی سے د[illegible] میں بند تھی) کھیلنا چاہتی تھی چھپکلی نے اس لڑکی کو کا[illegible] اس کا ہاتھ اپنے جبڑوں میں دبا لیا چھپکلی کے جبڑے کھ[illegible] کے لیے آدھا گھنٹہ لگ گیا۔ دو گھنٹوں کے بعد ل[illegible] بیہوش ہو گئی۔ اس کو اسپتال لے جایا گیا جہا[illegible]

کچھ دیر بعد اس کو ہوش آیا۔

ایک دفعہ ریگستانی چھپکلی نے خود ڈیومن کو کاٹ کھایا۔ ڈیومن چھپکلی کو تول رہے تھے چھپکلی نے جس کے دانت آری جیسے تھے ڈیومن کی کلائی اپنے دانتوں میں دبا لی۔ اس کے دانت ڈیومن کی ہڈی تک دھنس گئے۔ چھپکلی کا منھ کھولنے کے لیے پندرہ منٹ تک کوشش کرنی پڑی۔ ڈیومن نے پٹی باندھ لی۔ وہ کام دوبارہ شروع کرنا چاہتے تھے پر انھیں ایسا لگا جیسے بخار آرہا ہو۔ انھوں نے قمیص اتار دی پھر بھی انھیں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی ہے۔ انھیں چکر آنے لگے اور لیٹ جانا پڑا۔ دل کی حرکت بے قاعدہ ہو گئی۔ متلی بھی ہونے لگی۔ ایسا محسوس ہونے لگا جیسے کانوں میں گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ سننے کی طاقت جواب دے گئی ہے۔ نظروں کے سامنے دھند چھا گئی ہے۔ کوئی بھی چیز دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ یہ کیفیت صرف چند منٹ تک برقرار رہی۔ رات بھر سونے کے بعد ڈیومن کی طبیعت سنبھل گئی۔ ریگستانی چھپکلی کے دانتوں کے زہر کا ڈیومن کو خود اپنی ذات پر پہلی مرتبہ تجربہ ہوا۔

ریگستانی چھپکلی سانپ پر یا چھوٹی چھپکلوں پر اچک کر حملہ کرتی ہے۔ ان کو کاٹ کھاتی ہے۔ اس کے منھ میں ایک لعاب سا ہوتا ہے۔ یہ زہر ہوتا ہے۔ اس زہر کے اثر سے یہ جانور بے ہوش ہو جاتے ہیں۔

ریگستانی چھپکلی کا جب سانپوں سے مقابلہ ہوتا ہے تو وہ نڈر بن جاتی ہے۔ وہ ناگ جیسے زہریلے سانپ سے بھی نہیں ڈرتی۔ ماہرین کے بیان کے مطابق ریگستانی چھپکلی زہریلے سانپوں کو بھی نگل جاتی ہے اور اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔

ڈیومن نے تجربہ کیا ہے کہ ریگستانی چھپکلی پر سانپ کے زہر کا جو اثر نہیں ہوتا اس کی جانچ کی جائے۔ اس جانچ کے لیے خطرناک تجربے کیے گئے۔ ایک ناگ سانپ کو ایک ہاتھ میں اور چھپکلی کو دوسرے ہاتھ میں پکڑا گیا۔ سانپ کو موقع دیا گیا کہ وہ چھپکلی کو جی بھر کے ڈس لے۔

ایک اور تجربے میں چھ ناگ اور چھ ریگستانی چھپکلیاں ایک ساتھ چھوڑ دی گئیں تاکہ وہ آپس میں لڑیں اور ایک دوسرے کو کاٹ کھائیں۔ چھپکلیوں کے جسم پر دھبے اور زخم نمودار ہو گئے۔ لیکن وہ ہلاک نہیں ہوئیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ان پر کوئی اثر ہی نہیں ہوا۔ ان کے جسم پر سوجن تک نہیں آئی۔ اگر سانپ صرف ایک مرتبہ کاٹ کھائے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ کم از کم ۳ گرام انتہائی مہلک زہر جسم کے اندر داخل ہو جاتا ہے۔ زہر کی اتنی مقدار کئی درجن انسانوں کو ہلاک کر دینے کے لیے کافی ہے۔

ڈیومن نے لکھا ہے کہ زہر کی اتنی بھاری مقدار جسم میں داخل ہو جانے کے باوجود ریگستانی چھپکلی اس کے اثر سے محفوظ رہتی ہے۔ وہ ناگ کے زہر کی کوئی پروا نہیں کرتی اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے پاس ایسا زہر ہے جو سانپ کے زہر کا توڑ کرتا ہے۔ اس سے ہم یہ نتیجہ بھی نکال سکتے ہیں کہ دنیا میں جو زہریلے سانپ ہیں ان میں سے کوئی بھی ریگستانی چھپکلی کے زہر کی تاب نہیں لا سکتا۔

یہ بات تو اب مسلم ہو گئی کہ ریگستانی چھپکلی کے خون پر مہلک ترین زہر کا بھی کوئی اثر نہیں ہوتا مگر کیوں نہیں ہوتا۔ سائنس کے ماہر اسی بات کو معلوم کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ جس دن یہ بات معلوم ہو گئی گویا بڑی بات معلوم ہو گئی۔

[illegible]

ہاتھی خرگوش سے ڈر گئے

کوّے نے تب چڑیوں

کو ہاتھی اور خرگوش کی یہ کہانی سنائی:

ایک جنگل میں لمیم شمیم نام کا ایک ہاتھی رہتا تھا۔ وہ اپنے گروہ کا سردار تھا۔ ایک بار اس جنگل میں بہت غضب کا سوکھا پڑا۔ تمام تالاب جھیلیں اور ندیاں سوکھ گئیں۔ سب ہاتھیوں نے مل کر اپنے سردار سے کہا: "ہمارے بچے بھوک پیاس سے تڑپ رہے ہیں آپ کو جلد کسی تالاب کی کھوج کرنی چاہیے"

کچھ دیر سوچنے کے بعد لمیم شمیم نے کہا: "ہاں مجھے ایک تالاب یاد آتا ہے چلو وہیں سب چلیں"

پانچ دن اور پانچ رات کا سفر طے کر کے ہاتھیوں کا گروہ اس نئے تالاب کے کنارے پہنچ گیا۔ تالاب کے چاروں طرف خرگوشوں کے بھٹ تھے۔ جن کی وجہ سے کنارے کی زمین پولی ہو گئی تھی۔ ہاتھیوں کے پیروں سے وہ سب بٹ

ٹوٹ پھوٹ گئے۔ بہت سے خرگوش ہاتھیوں کے پیروں سے کچل گئے۔ کسی کی ٹانگ ٹوٹ گئی تو کسی کا منہ دب کے پچک گیا۔

ہاتھیوں کے چلے جانے کے بعد ان بھٹوں میں رہنے والے لہولہان خرگوشوں نے اپنی ایک میٹنگ کی جس میں اس آفت سے چھٹکارا پانے کی تدبیریں سوچی جانے لگیں۔ انھوں نے سوچا کہ آس پاس کے تالاب سوکھ چکے ہیں لہذا یہ ہاتھی اب یہاں روزانہ آیا کریں گے اور ہم لوگوں کا ستیاناس کر چھوڑیں گے۔ ہاتھی کا چھونا بھی اتنا ہی خطرناک ہوتا ہے جتنا سانپ کا سونگھنا اور راجہ کا ہنسنا غضبناک ثابت ہوتا ہے۔

ایک خرگوش نے یہ تجویز رکھی کہ ہم لوگوں کو یہ جگہ چھوڑ دینی چاہیے۔ مگر دوسرے خرگوشوں نے اس کی بات نہ مانی۔ ایک خرگوش نے یہ مشورہ دیا۔ کہ ایک ہوشیار خرگوش ہاتھیوں کے سردار سے ملے اور اس سے کہے کہ چاند کے اندر جو خرگوش رہتا ہے اس نے ہاتھیوں کو اس تالاب کے نزدیک آنے سے منع

کیا ہے۔ شاید ہاتھی یہ بات مان جاتے۔

بہت سوچ بچار کے بعد دراز گوش نام کے ایک خرگوش کو ہاتھیوں کے پاس بھیجا گیا۔ دراز گوش ہاتھی کے گزرنے کے راستے پر ایک اونچے ٹیلے پر جا بیٹھا اور جب ہاتھیوں کا قافلہ ادھر سے گزرا تو وہیں سے وہ بولا :-

"یہ چاند کے نہانے کی جگہ ہے یہاں تم لوگ کیوں آتے ہو؟"

ہاتھی کے سردار کو اس پر بہت غصہ آیا بولا :-

"ارے تو کون ہے آخر ہمیں روکنے والا؟"

دراز گوش بولا —— میں چاند کے اندر رہنے والا خرگوش ہوں چاند ہی نے مجھے تم لوگوں کے پاس یہ کہنے کے لیے بھیجا ہے کہ اس تالاب کے پاس مت آیا کرو۔ اس میں چاند نہاتا ہے۔ اسے تم لوگ پانی پی کر گندہ مت کیا کرو۔"

لیم شحیم ہاتھی بولا —" جس چاند کا تم سندیسا لے کر آئے ہو وہ چاند اس وقت کہاں ہے؟"

دراز گوش بولا —" وہ اس وقت تالاب میں نہا رہا ہے!"

ہاتھی بولے —" تو پھر ان کے درشن ہمیں بھی کرا دو۔ ہم لوگ اس کے سامنے سر جھکا کر معافی مانگ کر چلے جائیں گے۔"

دراز گوش صرف ہاتھیوں کے سردار کو تالاب کے پاس لے گیا تالاب میں چاند کا عکس پڑ رہا تھا۔ سردار اسے سلام کر کے واپس چلا آیا۔ اور اس کے بعد ہاتھیوں کا وہ گروہ اس تالاب کے کنارے نہیں گیا۔

◆ ◆ ◆ ◆ ◆ ◆ ◆ ◆

"یہ کہانی سنانے کے بعد کوے نے پھر کہا کہ تم لوگوں نے اگر الو جیسے کاہل، بزدل، خراب عادتوں اور کڑوے بول والے پنچھی کو اپنا راجہ بنایا تو تیتر اور خرگوش کی طرح تم لوگ بھی برباد ہو جاؤ گے۔ جنھوں نے بلی کو اپنا پنچ مان کر اپنی بربادی خود مول لی تھی۔"

چڑیوں نے پوچھا —" وہ کیسے؟"

کوے نے کہا —" اچھا تو پہلے میری کہانی سن لو۔ یہ تو میری آپ بیتی ہے۔"

بوڑھی بلی کا انصاف :-

کوے نے کہنا شروع کیا کہ

جس جنگل کی ڈال پر میں رہتا تھا۔ اس کے نیچے جڑ کی کھول میں ایک تیتر رہتا تھا۔ شام کو ہم دونوں میں خوب باتیں ہوا کرتی تھیں، خوب خوب کہانیاں سنتے سناتے تھے۔

ایک دن تیتر اپنے ساتھیوں کے ساتھ دھان کی کونپلیں کھاتے بہت دور نکل گیا۔ رات کافی گزر گئی۔ اور وہ واپس نہیں آیا تو مجھے فکر ہوئی کہ کہیں کسی شکاری کے چنگل میں تو نہیں پھنس گیا یا کسی جنگلی بلی کا لقمہ نہ بن گیا ہو۔ بہت دیر میں اسی ادھیڑ بن میں رہا کہ ایک خرگوش وہاں آیا۔ اور تیتر کے خالی کھول میں گھس گیا۔ اداس ہونے کی وجہ سے میں نے بھی خرگوش کو وہاں جانے سے منع نہیں کیا۔

دوسرے دن میرا دوست تیتر بھی اچانک آ گیا۔ دھان کی کونپلیں کھا کھا کر وہ کافی موٹا تازہ ہو گیا تھا۔ کھول کے اندر گھستے ہی وہاں ایک خرگوش کو موجود دیکھ کر اسے بہت غصہ آیا۔ کہنے لگا۔ "میاں خرگوش رفو چکر ہو جاؤ یہ میرا بن ہے۔" مگر خرگوش بھلا کہاں بھاگنے والا تھا۔ کہنے لگا کہ "جنگل کی یہی ریت ہے کہ جس نے جہاں رات گزاری وہی اس کا ٹھکانا ہو گیا۔ یہ کوئی انسانوں کی بستی تھوڑے ہے کہ مکان لوگوں کی ملکیت ہو۔"

دونوں میں تکرار بڑھتی گئی۔ تیتر نے تیسرے آدمی کو پنچ مان کر اس کے فیصلے کو تسلیم کرنے کی بات کی۔ ان کی اس تکرار اور سمجھوتے کی ساری باتیں ایک جنگلی بلی سن رہی تھی۔ اس نے سوچا کیوں نہ میں ان کی پنچ بن جاؤں۔ پھر [illegible] تو [illegible] کر چٹ کر جاؤں گی۔

یہ سوچ کر وہ ہاتھ میں تسبیح لے کر ندی کے کنارے آسن جما کر بیٹھ گئی۔ اور رام رام جپنے لگی۔ [illegible] تیتر اور خرگوش [illegible]

ہوئی سنیاسن معلوم [illegible] کیوں نہ اسی کو منصف مان لیا جائے۔

تیر کو بلی کو [illegible] کر دیکھا اور دور ہی سے بولا "آپ کوئی پہنچی ہوئی سنیاسن معلوم ہوتی ہیں۔ آپ ہی ہمارے جھگڑے کا نپٹارہ کر دیں۔ ہم دونوں میں سے جو بھی غلطی پر ہوگا اسے تم کھا لینا۔"

یہ سن کر بلی نے آنکھ کھولی اور کہا "رام رام، یہ کیا کہا تم نے۔ میں اب کسی جاندار کو منہ لگاؤں۔ شیو بابا مجھے معاف کرو۔ میں نے تو مار کاٹ سے توبہ کر لی ہے۔ مگر تمہارا فیصلہ کرنا مجھے منظور ہے۔ میں بوڑھی ہوں ذرا اونچا سنتی ہوں۔ میرے پاس آکر اپنی اپنی بات کہو۔"

بلی کی بات پر دونوں کو اعتبار آگیا۔ دونوں اس کے پاس آگئے۔ بوڑھی بلی نے جھپٹا مار دونوں کو ایک ساتھ پنجے میں دبوچ لیا۔

✤ ✤ ✤ ✤ ✤ ✤

الو کی تاج پوشی نہیں ہوئی:۔

یہ کہانی سنانے کے بعد کوا بولا "اس لیے میں کہتا ہوں کہ کمینی عادت والوں کو راجہ بناؤ گے تو تم سب برباد ہو جاؤ گے۔ اس الو کو دن کے اجالے میں تو کچھ سوجھتا نہیں مگر رات کے اندھیرے میں یہ تم سب کو تباہ کر کے رکھ دے گا۔"

کوے کی یہ بات سن کر سب چڑیاں الو کو تاج پہنائے بغیر ہی واپس چلی گئیں۔ صرف الو کا دوست بھجنگ اور کوا وہاں رہ گئے۔ الو نے پوچھا "ارے بھئی یہ میری تاج پوشی میں اتنی دیر کیوں ہو رہی ہے؟"

بھجنگ نے کہا "دوست تاج پوشی کہاں ہوئی۔ ایک کوے نے آکر رنگ میں بھنگ کر دیا۔ سب چڑیاں تو چلی گئیں اب صرف یہ ایک کوا بیٹھا رہ گیا ہے۔"

تب الو نے کوے سے کہا "کیوں بھئی [illegible] بگاڑا تھا کہ تو نے میرا بنا بنایا کام بگاڑ دیا۔ آج سے میری تیری جنم جنم کی دشمنی رہے گی۔"

یہ کہہ کر الو وہاں سے چلا گیا۔ کوا بہت فکر مند ہوا۔ اور سوچنے لگا کہ اس نے بے وجہ الو سے جھگڑا مول لے لیا۔ دوسرے کے معاملات میں دخل دینا کڑوی بات بیان کرنا بھی تکلیف دہ ہوتا ہے۔

تبھی سے کوؤں اور الوؤں میں جنم جنم کی دشمنی چلی آتی ہے۔

✤ ✤ ✤ ✤ ✤ ✤ ✤ ✤ ✤

یہ کہانی سننے کے بعد کوے راجہ نے اپنے خاص وزیر سے پوچھا "کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

خاص وزیر نے تسلی دیتے ہوئے کہا:۔

"ہمیں فریب دے کر دشمن پر فتح حاصل کرنی چاہیے۔ فریب دے کر ٹھگوں نے ایک عقلمند مینڈک کو ٹھگ لیا تھا۔"

کوے شاہ نے پوچھا "وہ کیسے؟"

تب کوے شاہ کے خاص وزیر نے ٹھگوں اور برہمن کی یہ کہانی سنائی:۔

(یہ دلچسپ کہانی آئندہ شمارہ میں پڑھیے گا۔)

✤ ✤ ✤ ✤ ✤ ✤ ✤ ✤

جناب غلام حیدر ایم اے

ایک دلچسپ شکل اُلو کی ہے۔ جو پُرانے یونانی سکوں پر نظر آتی ہے۔ ممکن ہے تمھیں یہ جان کر حیرت ہو کہ یونان میں اُلو کو سمجھداری اور عقل مندی کا نمونہ مانتے تھے۔ وہی جسے تم بے وقوف مانتے ہو اور غصہ میں اپنے دوست کو "اُلو" کہہ دیتے ہو۔ چنانچہ پُرانے سکوں میں ہمیں اُلو کی شکل بھی نظر آتی ہے۔

ان جانوروں کے علاوہ بھی بہت سے اور جانوروں کی تصویریں سکوں پر بنائی گئی ہیں جیسے مچھلی کچھوا بارہ سنگھا، ہاتھی خوبصورت پرندے، شہد کی مکھی وغیرہ۔

[بارہ سنگھا]
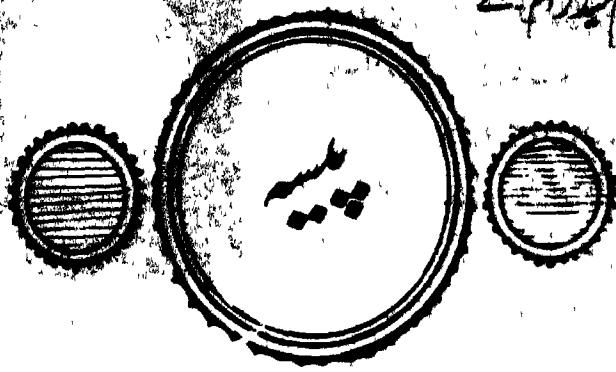
جانوروں کے علاوہ بہت سے زراعتی نشان بھی میری پُرانی شکلوں پر ملتے ہیں بعض ملکوں میں پیدا ہونے والے خاص خاص درخت، گیہوں کی بالی، مثلیف پودے وغیرہ۔

گیہوں کی بالی زراعتی خوش حالی کا اظہار کرتی ہے۔ اور آج بھی ہمارے ملک کے سکوں میں موجود ہے۔ کوئی بھی نوٹ اٹھا کر دیکھ لو تو تمھیں نظر آجائے گی۔

مہاتما گوتم بدھ نے برگد کے پیڑ کے نیچے بیٹھ کر نروان حاصل کیا تھا، تو اس کے بعد سے صدیوں تک سکوں پر برگد کے پیڑ کی تصویر آتی رہی اور صرف ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ چین، برما، لنکا جہاں کہیں بھی بدھ مذہب اپنایا گیا اس درخت کا عکس میری شکل پر نظر آنے لگا۔ اپنے آج کے دس روپیہ کے نوٹ کو اٹھا کر غور سے دیکھو تو تمھیں اسی طرح کی قسم کے درخت نظر آئیں گے۔

میرے اوپر انسانی شکلیں کچھ بعد میں آئیں اور جب آئیں تو ایسی آئیں کہ پھر نہ ہٹ سکیں۔ آج تک ان ملکوں کے سکوں پر جہاں بادشاہوں کا راج ہے۔ وہاں کے بادشاہ کی تصویر ہوتی ہے۔

ابھی پنڈت جواہر لال نہرو کے انتقال کے بعد خود ہمارے آزاد ملک ... کی تصویر ...

(پنڈت نہرو کی تصویر والے سکے)

کے کچھ سکے ایسے چلے ہیں جن پر چاچا نہرو مرحوم کی تصویر نظر آتی ہے۔ مگر ان سکوں کی تصویر اور بادشاہوں کی تصویروں میں بہت فرق ہے۔ بادشاہ اپنی شہرت اور نام کے لیے سکوں پر اپنی تصویریں بنواتے تھے اور پنڈت جی کی موت کے بعد ان کی یاد منانے کے لیے سکوں پر ان کی تصویریں بنوائی گئیں۔

ویسے انسانی شکل میں سب سے پہلے بالکل صاف اور خوبصورت جزیرہ صقلیہ (جسے انگریزی میں Sicily کہتے ہیں) کے ایک سکے پر نظر آتی ہے۔ یہ شکل ایک بہت خوبصورت عورت کا چہرہ ہے جو اس زمانے میں ایک چشمہ

(آرتھیوسا کی تصویر والا صقلیہ کا سکہ)

کی دیوی مانی جاتی تھی۔ اس زمانہ میں اس دیوی کا نام رتھیوسا تھا۔ یہ سکہ تقریباً پانچویں صدی قبل مسیح کے آخر میں جاری کیا گیا تھا۔ اور جیسا میں نے پہلے بھی کہا ہے، اس سکے کو دیکھتے ہی بادشاہوں نے اپنے سکوں پر اپنی تصویر بنوانی شروع کر دی اور یہ رواج تقریباً ہر ملک اور ہر زمانے میں رائج رہا۔

بس ایک صرف مسلمان بادشاہ ایسے تھے جنھوں نے عام طور پر کوئی انسانی یا کسی جاندار چیز کی شکل نہیں بنوائی۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ تھی اسلام نے تصویر بنانے کو منع کیا تھا، اس لیے انھوں نے اس اصول پر عمل کیا۔ مگر اس بات سے بھی بڑا فائدہ ہوا، اور خاص طور پر تاریخ کے پڑھنے والوں کو تو نیا راستہ ہی مل گیا۔

مسلمان بادشاہوں نے جب تصویریں نہیں بنوائیں تو انھیں سکوں پر کافی جگہ خالی مل گئی۔ جس کو انھوں نے خوب استعمال کیا۔ اپنے نام لکھوائے، کبھی کبھی اپنے بزرگوں کے نام بھی لکھوائے۔ سنہ اور سال ڈلوانے کا خاص خیال رکھا۔ پھر جس شہر میں ٹکسال واقع تھی اس کا نام ضرور لکھوایا اپنے لیے جو القاب و آداب استعمال ہوتے تھے وہ لکھوائے۔

تم جانتے ہو کہ اس سے تاریخ کو کتنا فایدہ ہوا؟ بس یہ سمجھ لو کہ ایک پُرانا سکہ ملا تو اس بادشاہ کا پورا نام مل گیا، سال اور زمانے کا پورا ثبوت مل گیا، ٹکسال والے شہر کے متعلق پورا اندازہ ہوا کہ اس بادشاہ کی سلطنت کہاں تک تھی اور یہ باتیں تاریخ پڑھنے والوں کے لیے بہت کام کی ہیں۔

تحریر (سیدہ باقر پرکر)

أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَ
ُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ " (داتیں ہاتھ پر
ے دائرے میں) اَلْوَاثِقُ بِتَائِيْدِ مُحَمَّدْ شَاهِ السُّلْطَان
(باہر کے دائرے میں) ضُرِبَ هٰذَا الدِّيْنَار بِحَضْرَتِ
ُ لِيْ بِسَنَةِ سَبْعِ مِائَةٍ وَ سِتَّ وَ عِشْرِيْنَ "

(باہر کے دائرے کا ترجمہ) (اس دینار پر دہلی
کے حضور میں سنہ سات سو چھبیس (ہجری)
میں مہر لگائی گئی)

اور بھائی میرا اپنا فائدہ اس میں یہ ہوا کہ پرانا ہو کر
ری عزت بڑھی، تاریخ دانوں نے جہاں پرانی کتابیں
، وہاں مجھے بھی اس قابل سمجھا کہ جمع کیا جاؤں۔

اچھا بھائی! کہانی کے اس حصہ کو ختم کرنے سے پہلے
ں دو ایک چھوٹی موٹی باتیں اور بتا دوں۔ اصل میں
ا ایسی دنیا میں داخل ہو گیا ہوں جسے تم بہت آسانی
یخ کی کتابوں میں پڑھ سکتے ہو۔ اور پھر ہر ملک میں
الگ الگ نام ہوئے، الگ الگ دھاتیں استعمال کی
ور میں تمہارے ہی ساتھ یا ہر ملک کے باشندوں
ہ سفر کرتا رہا۔

مگر ہاں میری ایک شکل تو ابھی اور باقی رہ گئی اور وہ
ری سب سے ہلکی شکل ہے۔ دیکھو میں نے کہا تھا کہ
ری بھی ہوں کہ پانی میں ڈوب جاتا ہوں اور ہلکا بھی
ں کہ ہوا میں اڑ بھی سکتا ہوں۔ ابھی تک تم نے میری وہ
بھی جو پانی میں ڈوب سکتی ہے۔ آؤ اب میں تمہیں اپنی
، کے بارے میں بتاؤں جو ہوا میں اڑ بھی سکتی ہے۔
ذ۔ ہاں اب میں کاغذ کی شکل میں بھی چلتا ہوں۔
انی کا یہ ٹکڑا بھی مزے دار ہے۔ مگر اسے
نے سے پہلے تمہیں دو ایک اور باتیں

بتانی پڑیں گی۔ تاکہ تمہاری سمجھ میں یہ بات آجائے کہ میں اتنا
ہلکا کیسے ہو گیا۔؟

پہلے یوں سمجھ لو کہ جب کاغذ کے سکے یا جنہیں تم اب
نوٹ کہتے ہو، یہ نہیں چلتے تھے تب میری کیا شکل تھی۔ دنیا
کے تمام ملکوں میں بڑے سکوں میں سونا استعمال ہوتا تھا۔ وہ
کافی قیمت کے ہوں گے۔

سونے کے سکوں میں دنیا کا شاید سب سے قیمتی سکہ
جنوبی امریکہ کے ایک ملک بولیویا ۱۷۷۲ عیسوی سے ۱۸۴۰
عیسوی کے درمیان چلا تھا۔ اس کی قیمت آج کے روپیوں
میں تقریباً پانچ سو روپے کے برابر ہوتی تھی اور ہندوستان
میں اکبر کا "اکبری ٹنکہ" لگ بھگ اس کے برابر تھا۔ اس میں
کوئی ساڑھے تین تولے سونا ہوتا تھا۔

سونے کے سکوں کے بعد چاندی کے سکوں کا نمبر
آتا ہے اور اس کے بعد چھوٹے سکوں کا جنہیں تم چاہو تو ریزگاری
کہہ سکتے ہو۔ یہ کم قیمت والی دھاتوں کے ہوتے تھے۔ مگر
اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا کہ وہ جتنی قیمت میں بازار
میں چلتے ہوں تقریباً اتنی ہی قیمت کی دھات ان کے بنانے میں
لگائی جائے۔ اسے یوں سمجھ لو کہ اگر اس وقت بازار میں سونے
کا بھاؤ پندرہ روپے تولہ تھا تو ایک تولہ سونے کے سکے کی
قیمت پندرہ روپیہ ہی ہوتی تھی۔ اب چاہے اس سکہ یا اشرفی
کو پندرہ روپے میں چلاتے رہو۔ چاہے اسے پگھلا کر اس کے
سونے کو پندرہ روپے میں بیچ دو۔ بات برابر تھی۔

(باقی آئندہ)

محمد معروف تسنیم

منی منی کہانیاں

کتے اور بکری

گاؤں کا ایک غریب چرواہا اپنی بکریاں جنگل میں چرانے لے گیا۔ اتفاق سے ایک بکری ریوڑ سے الگ ہو گئی جنگل میں دور کہیں جا نکلی چرواہے کو اس کمی کا دھیان بھی نہ آیا ادھر بکری اپنے گھر کا راستہ بھول گئی۔

وہ ادھر ادھر پریشان پھر رہی تھی کہ شکاری کتوں کی نظر اس پر جا پڑی۔ بکری نے بھی دور سے ان کی آواز سن لی۔ وہ تیز تیز بھاگتی ہوئی پاس کی گھنی جھاڑیوں میں چھپ گئی۔

شکاری کتے بکری کے اس طرح اچانک گم ہو جانے پر بہت حیران ہوئے۔ انھوں نے اسے بہت تلاش کیا۔ مگر بے کار۔ تھک کر وہ درخت کے سائے میں بیٹھ گئے۔

آج ان کو بہت بھوک لگی تھی۔ بد قسمتی سے کوئی بھی شکار نہ مل سکا تھا۔ نہ جنگل میں کوئی جانور گھومتا پھرتا انھیں نظر آیا تھا کہ اسے پکڑ کر اپنے پیٹ کی آگ بجھائیں۔ بھوک سے بہت نڈھال ہو رہے تھے۔

بکری بھی کافی دیر سے جھاڑی میں چھپی رہی پھر اب اسے بھی بھوک ستانے لگی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ اٹھی اور جھاڑی کے سبز پتے کھانے لگی۔ آدھی جھاڑی ختم ہو گئی تو سوچنے لگی کہیں کتے اسے دیکھ نہ پائیں اسے پکڑ نہ لیں۔ وہ اس کی تاک میں نہ بیٹھے ہوں لیکن پھر خیال آیا کہ کتے کب کے کہیں دور جا چکے ہوں گے اور پھر وہ جھاڑی کے باقی پتے کھانے لگی۔ چھوٹی سی جھاڑی تھی۔ تھوڑی دیر میں تمام ٹہنیاں پتوں سے خالی ہو گئیں۔

پر اب تو وہ سامنے کھڑی صاف نظر آنے لگی۔ کتے پاس ہی کے درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ جوں ہی انھوں نے بکری کو دیکھا۔ فوراً لپکے اور اس پر ٹوٹ پڑے اور پھر کیا تھا۔ منٹوں میں اسے کھا گئے۔ نا سمجھ بکری! اگر پناہ دینے والی اور بھلائی کرنے والی جھاڑیوں کے ساتھ بدی نہ کرتی اس کے تمام پتے نہ کھاتی تو کیوں اس سزا کو پہنچتی۔

چاندی کی گولیاں

ایک درخت پر ایک کوا رہتا تھا۔ بالکل کالا کلوٹا۔ اسی درخت پر ایک سفید کبوتری رہتی تھی۔ کوا اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ ایک دن کوا خوب بناؤ سنگھار کرکے کبوتری کے پاس گیا اور کہنے لگا: "پیاری کبوتری! آؤ ہم دونوں شادی رچا لیں۔"

کبوتری کبوتری تک سر ہلا کر بولی

بڑا آیا شادی کرنے! کبھی آئینہ میں اپنی شکل دیکھی ہے؟" کوا فوراً اداس ہو کر پاس کے گھر میں گیا۔ آنگن میں ایک بڑی بی بیٹھی تھیں۔ کوا کہنے لگا: "نانی! نانی مجھے تھوڑا سا پیار دے دو میں گورا ہونا چاہتا ہوں۔"

نانی بولیں "ارے بھاگ یہاں سے گورا بن کر کیا کرے گا۔ بننا ہے تو عقلمند بن نیک بن۔"

نانی کی بات کوّے کو پسند آگئی اور اس دن سے وہ نیکی کرنے کے لیے تیار ہوگیا۔

ایک دن ایک بڑھیا کہیں جا رہی تھی۔ راستے میں ٹھوکر کھا کر گر پڑی۔ اس کی لاٹھی بھی دور جا گری۔ کوّے نے فوراً لاٹھی چونچ سے پکڑ کر بڑھیا کو دے دی۔ بڑھیا بہت خوش ہوئی اور بولی "اچھے کوّے تم بہت اچھے ہو۔ تم جو چاہو مانگ لو۔"

یہ سن کر کوا بولا "بوڑھی اماں میں گورا بن کر کبوتری سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

بڑھیا نے کہا "اچھا لو یہ چاندی کی گولیاں اور ان کو سفید پاؤڈر میں ملا کر کھا لینا۔ تین دن بعد بالکل گورے بن جاؤ گے۔"

پہلے ہی دن گولیاں کھانے سے کوّے کا رنگ نکھر گیا۔ کبوتری نے جب یہ دیکھا کہ اس کے گورے گال پر دو چار کالے دھبے تھے۔ اس نے بھی چپکے سے کوّے کے ڈبے میں سے گولیاں نکال کر کھا لیں۔ مگر یہ کیا! تین دن بعد کوا تو گورا چٹا بن گیا مگر سفید کبوتری کالی کلوٹی ہوگئی۔ بے چاری بہت پریشان ہوئی لیکن کوّے نے کہا وہ گھبرائے نہیں۔ اور اس نے دودھ میں سفید پاؤڈر ملا کر پلا دیا۔ دو دن بعد کبوتری پھر پہلے جیسی گوری ہوگئی۔ پھر کیا تھا۔ ایک دن کوا اور کبوتری کی شادی بڑے دھوم دھام سے ہوگئی۔ اس دن سے وحشت کا بھی چہرہ لال ہوا... غوب... گا ... ہوا۔

ڈاک کا انتظام پورے طور پر قابل اطمینان نہیں ہے۔ اس لیے احتیاط اسی میں ہے کہ آپ اپنا سالنامہ رجسٹری سے منگائیں۔ رجسٹری کے ستر پیسے بھیج دیجیے اور ہاں اپنا نمبر خریداری بھی لکھیے۔ یہ بہت ضروری ہے۔ یہ خریداری نمبر آپ کے پتے پر لکھا ہوتا ہے۔

سالنامے کی قیمت دو روپے ہے، مگر جو پیامی جنوری سے خریدار بنیں گے ان سے یہ روپے الگ سے نہیں لیے جائیں گے۔ مگر وہ چھ روپے کے بجائے چھ روپے ستر پیسے بھیجیں۔ ستر پیسے رجسٹری کے۔

نظر کا دھوکا

یہ جال الگ الگ ٹکڑوں کا بنایا گیا ہے۔ کیوں ٹھیک ہے نا۔
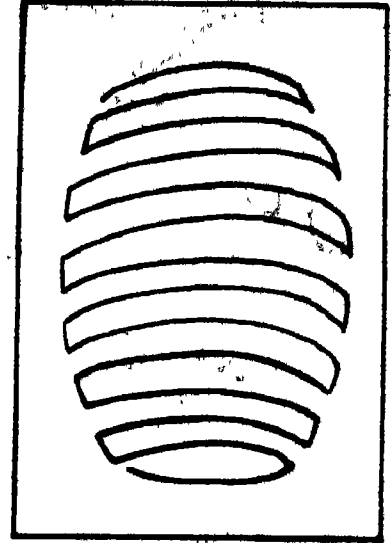
جی نہیں یہ تو ایک مسلسل لائن سے بنا ہوا ہے۔

یہ کانٹے والے تار لگانے والا بھی کتنا اناڑی تھا کہ سیدھے تار بھی نہ کھینچ سکا۔
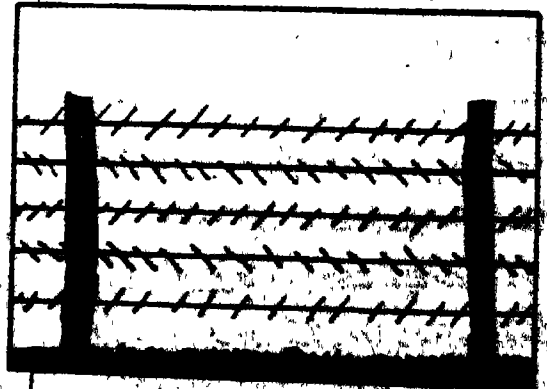
جی نہیں۔ یہ تار تو بالکل سیدھے ہیں آپ فٹے سے ناپ کر دیکھئے یہ تو آرٹسٹ کا کمال ہے کہ اس نے نظر کو دھوکا دیا۔

چھوٹے میاں کہنے لگے کہ ابا جی میں تو آپ کے برابر ہوں۔ بھئی دیکھنے میں تو ابا جی ہی بڑے لگتے ہیں۔

لیکن بھئی ان کو ذرا فٹے سے ناپ کر دیکھیے۔ بھئی واہ ننھے میاں تو واقعی سچ کہہ رہے ہیں۔

ذرا دیکھیے تو یہ کیا ہے۔ شیشے کا ایک بہت ہی خوبصورت پیالہ ہے۔

جی نہیں۔ ذرا غور سے دیکھیے یہ تو دو لڑکیاں ہیں جو ایک دوسرے سے کوئی راز کی بات کہہ رہی ہیں۔

سفرنامہ ابن بطوطہ

مسلسل

پھر ہم اماصیہ ہوتے ہوتے ہوئے سونس پہنچے۔ اماصیہ بھی اچھا شہر ہے۔ نہروں کے ذریعے گھروں اور باغوں میں پانی پہنچایا جاتا ہے۔ سڑکیں بازار کشادہ (کھلے کھلے) اور صاف ہیں۔

سونس میں ابو العباس احمد رفاعی کی اولاد رہتی ہے جناب سجادہ کا نام شیخ عز الدین ہے۔ ہم نے انھی کی خانقاہ میں قیام کیا۔

سونس سے چل کر کمش پہنچے جہاں چاندی کی کانیں ہیں اور عراق و شام کے سوداگر آتے جاتے رہتے ہیں۔ کمش میں ہم اخی مجد الدین کی خانقاہ میں ٹھہرے۔ اور جیسی مدارات ہر جگہ ہوتی تھی یہاں بھی ہوئی۔ امیر کے نائب نے سفرخرچ اور دعوت کا سامان بھیجا۔

ارزن جانی

کمش سے چل کر ارزنجانی آئے۔ ارزن جانی بڑا آباد شہر ہے زیادہ آبادی ارمنی مسلمانوں کی ہے۔ یہ سب ترکی بولتے ہیں۔ یہاں ایک پرگنہ [illegible] ہے جس کا نام ارزنجانی ہے۔ یہاں تانبے کی کانیں ہیں [illegible] برتن بنتے ہیں۔ بھائی چارہ کمیٹی کے ممبر اخی نظام الدین نے ہمیں ٹھہرایا اور خوب خاطر کی۔

ارزنجانی سے ارزاروم پہنچے، شہر اچھا ہے مگر ویران ہے۔ ترکمانوں کے آپس کے جھگڑوں نے اسے ویران کر دیا ہے۔ یہاں اکثر مکانوں میں پائیں باغ ہیں۔

انگوروں کی بیلیں پھیلی ہوئی ہیں۔ طومان پارٹی کی خانقاہ ہے اس کے منتظم کی عمر ۱۳۰ برس ہے۔ لاٹھی کے سہارے چلتے پھرتے ہیں۔ اور تمام نمازیں وقت پر پڑھتے ہیں روزہ رکھنا مشکل ہے۔

دوسرے دن ہم نے جانا چاہا تو شیخ نے روکا اور کہا "تین دن سے پہلے اگر آپ چلے گئے تو میری بے عزتی ہوگی۔"

یہاں سے چل کر ہم برکی پہنچے۔ شہر میں عصر کی نماز کے بعد ہم نے بھائی چارہ کمیٹی کی خانقاہ پوچھی تو ایک آدمی ہمیں اپنے مکان میں لے گیا۔ اس کا مکان باغ میں تھا۔ گرمی کا موسم تھا اس نے ہمیں اپنے گھر کی اونچی چھت پر ٹھہرایا اور بڑی خاطر کی۔

برکی میں محی الدین نام کے ایک بڑے فاضل تھے۔ ہمارا میزبان ان کا ایک شاگرد تھا۔ صبح کو ہمیں فاضل محی الدین کے پاس لے گیا۔ فاضل محی الدین ایک عمدہ خچر پر سوار آرہے تھے۔ دائیں بائیں غلام تھے ہماری ملاقات ہوئی تو ہمارا بڑا احترام کیا اور ہاتھ پکڑ کر اپنی برابر بٹھالیا۔

پھر قاضی عز الدین قریشی سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے ہمیں ایک آراستہ مکان میں ٹھہرایا۔ اور ملاقات کے لیے آتے [illegible] دیر کے لیے گیا تو باغ میں پختہ تالاب کے کنارے نہایت عمدہ پھولدار غالیچے پر بیٹھے تھے۔ طلبار اور غلام دونوں طرف کھڑے تھے۔ بادشاہوں جیسا ٹھاٹ تھا۔ میرا ہاتھ پکڑ کر بٹھایا اور ساتھ کھانا کھایا۔

فاضل محی الدین نے ہماری اطلاع بادشاہ کو دے دی

تھی۔ یہ شہر سے کچھ دور ایک ٹھنڈے پہاڑ پر گیا ہوا تھا۔

سلطان برکی

سلطان برکی کا نام سلطان محمد ہے۔ فاضل کی اطلاع سلطان کے پاس پہنچی تو اس نے اپنا نائب مجھے لینے کے لیے بھیجا۔

فاضل نے کہا جب تک دوسری مرتبہ بلاوا نہ آئے مت جانا۔ دوسری مرتبہ سلطان نے بلاوا بھیجا تو فاضل کے پاؤں میں سخت تکلیف تھی پھر بھی پٹی کس کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

دوپہر کو ہم پہاڑی پر پہنچے اور کچھ دیر ٹھہر کر سلطان کے محل پر گئے۔ بادشاہ کو اطلاع ہوئی تو خضر بک اور عمر بک دونوں بیٹوں کو ہمارے استقبال کے لیے بھیجا۔ دونوں نے فاضل کو سلام کیا۔ فاضل نے میری طرف اشارہ کیا کہ انھیں بھی سلام کرو۔ انھوں نے سلام کیا اور مزاج پرسی کی۔

ہمارے لیے ایک خیمہ لگا دیا گیا۔ اور اسے فرش فروش سے آراستہ کر دیا گیا۔ میں اور فاضل خیمے میں بیٹھے اور میرے ساتھی درختوں کے سائے میں آرام کرنے لگے۔ یہاں خوب سردی تھی۔ سردی کی تکلیف سے میرا گھوڑا مر گیا۔

صبح ہوتے ہی فاضل سلطان سے ملا اور میری بہت تعریف کی پھر واپس آکر سارا حال مجھ سے کہا۔ بادشاہ نے فاضل کو اور مجھے بار دیا۔ دیر تک حجاز، مصر، شام اور یمن کے حالات پوچھتا رہا۔ اس کے بعد کھانا آیا۔ کھانا کھا کر ہم واپس آئے تو بادشاہ نے ہمارے لیے چاول اور گھی بھیجا۔ ہم کئی دن تک بادشاہ سے ملتے رہے۔ کھانا ساتھ کھاتے۔ اور خشک سامان بھی ہمارے لیے بھیج دیا جاتا۔ ترکوں میں یہی دستور ہے۔

ایک دن بادشاہ نے مجھ سے کہا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ حدیثیں لکھ کر دے دوں۔ میں نے حدیثیں لکھ کر دے دیں۔ تو فاضل محی الدین نے انھیں بادشاہ تک پہنچا دیا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ ترکی میں ان کا ترجمہ اور شرح لکھی جائے۔

پہاڑ پر رہتے رہتے میرا جی گھبرا گیا۔ فاضل بھی اکتا گیا تو اس نے میری گھبراہٹ کی اطلاع بادشاہ کو دی۔ اس پر بادشاہ نے اپنا نائب بھیجا۔ نائب دیر تک فاضل سے ترکی میں باتیں کرتا رہا۔ وہ چلا گیا تو فاضل نے بتایا کہ بادشاہ نے یہ معلوم کیا ہے کہ آپ کو کیا دیا جائے میں نے کہہ دیا کہ بادشاہ کے پاس سونا، چاندی، گھوڑے، غلام ہر چیز ہے۔ کمی کس بات کی ہے۔ جتنا جی چاہے بخش دے۔

تھوڑی دیر میں نائب نے واپس آکر کہا: "بادشاہ کا حکم ہے کہ آپ لوگ کل تک پہاڑی پر ٹھہریں۔ اور سلطان کے ساتھ شہر چلیں۔"

دوسرے دن ہمارے لیے خاصے کا گھوڑا آیا جس پر ہم شہر گئے۔ بادشاہ شاہی محل کے دروازے پر پہنچا تو میں مدرسے جانے لگا۔ مگر بادشاہ نے حکم دیا کہ ہمارے ساتھ چلو۔

ڈیوڑھی پر بیس نوعمر اور خوب صورت غلام ریشمی لباس پہنے کھڑے تھے۔ جن کی زلفیں چہروں پر بل کھا رہی تھیں۔ یہ رومی نوجوان تھے۔ کئی سیڑھیاں چڑھ کر نشست گاہ سلطانی (بادشاہ کے بیٹھنے کی جگہ) تک پہنچے۔ بیچ میں پانی کا حوض تھا۔ حوض کے چاروں کونوں پر شیر دل کے چہرے تانبے کے بنے ہوئے تھے۔ ان کے منہ سے پانی نکل رہا تھا۔ اور حوض میں گر رہا تھا۔ آس پاس چبوترے تھے۔ چبوتروں پر نہایت عمدہ فرش تھا۔ ایک طرف سلطان کی نشست تھی۔

بادشاہ کے برابر فاضل محی الدین بیٹھے تھے۔ قاضی کے برابر مجھے جگہ دی گئی۔ نیچے نہایت خوش آواز قاری بیٹھے تھے پھر سونے چاندی کے پیالے آئے۔ ان میں گلاب کا عرق تھا۔ اس میں لیموں نچوڑا گیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی مٹھیاں بھی تیر رہی تھیں۔ ہر ایک پیالی کے ساتھ سونے چاندی کے چمچے بھی تھے۔ دوسری طرف چینی کے پیالے اور لکڑی کے چمچے تھے تاکہ جو لوگ سونے چاندی کے

پھلوں سے کھانا پسند کریں وہ ان پیالوں میں کھائیں۔

اتنے میں ایک شیخ آیا۔ اس کے سر پر عمامہ تھا اور لمبے لمبے گیسو تھے۔ قاضی اور فاضل شیخ کی تعظیم کے لیے کھڑے ہوگئے۔ اور یہ شیخ قاریوں سے اونچی جگہ بیٹھ گیا۔ مجھے جب معلوم ہوا کہ یہودی ہے اور طبیب ہے تو غصے سے لال ہوگیا۔ اور ڈانٹ کر اس سے کہا: "ملعون تیری یہ جرات کہ قاریوں سے اونچا بیٹھے۔"

میرے چیخنے پر سلطان مجھے حیرت سے دیکھنے لگا اور فاضل محی الدین سے پوچھا کیا بات ہے؟ فاضل نے میرے غصے کا سبب بادشاہ کو بتایا۔ اور یہودی نے میری بات سمجھی تو ذلیل ہوکر نکل گیا۔ دربار سے واپسی پر فاضل نے کہا: "خدا آپ کو جزائے خیر دے کسی دوسرے کو اتنی جرات نہ ہوسکتی تھی۔"

سلطان نے مجھ سے پوچھا: "کیا آپ نے آسمان سے گرا ہوا کوئی پتھر دیکھا ہے۔" میں نے انکار کیا تو بادشاہ نے ایک پتھر منگایا یہ ایک چمک دار سیاہ پتھر تھا۔ ڈیڑھ من سے کم وزنی نہ ہوگا۔ پھر سلطان نے پتھر توڑنے والوں کو بلوایا۔ یہ چار آدمی تھے۔ بادشاہ کے حکم سے انھوں نے پتھر پہ تابڑ توڑ چوٹیں لگائیں۔ مگر پتھر جوں کا توں رہا ایک ذرہ تک نہ ٹوٹا (ٹوٹا ہوا ستارہ ہوگا) یہ دیکھ کر مجھے سخت حیرت ہوئی۔

شہر میں داخلے سے تین دن بعد سلطان نے بڑی شاندار دعوت کی۔ پھر جب تک ہم رہے کھانا، پھل، حلوا، روشنی کے انتظام کے ساتھ ہمارے پاس مدرسے میں آتا رہا۔ رخصت کے وقت سو مثقال سونا، ہزار درہم، پورا خلعت، ایک گھوڑا، میخائیل نام کا ایک رومی غلام بھیجا۔ میرے ساتھیوں کو بھی نقدی اور خلعت بھیجے۔ سچ یہ ہے کہ یہ سب فاضل محی الدین کی وجہ سے ہوا۔ شہر اور پہاڑ کو ملا کر ہمارا قیام یہاں چودہ دن رہا۔

یہاں سے تیرہ ہوتے ہوئے ایاسلون پہنچے۔ تیرہ میں اخی محمود کی خانقاہ میں ٹھہرے۔

ایاسلون

اخی محمود ہمیشہ روزہ سے رہتے ہیں بہت نیک آدمی ہیں

ایاسلون میں پتھر کا ایک گرجا ہے جس کا ایک ایک پتھر دس دس گز سے بھی لمبا ہے پتھروں کا جوڑ بہت خوب صورت ہے اور مضبوط ہے۔

ایاسلون کی جامع مسجد بھی بڑی شاندار ہے۔ اس کی دیواریں نہایت اعلیٰ رنگین پتھروں کی بنی ہوئی ہیں۔ فرش سنگ مرمر کا ہے چھت سیسے کی ہے۔ چھوٹے بڑے گیارہ گنبد ہیں۔ پانی کا حوض ہے جس سے نہر گزرتی ہے۔

ایاسلون کے امیر کا نام "امیر خضر بک" ہے۔ یہ اپنے باپ کے پاس برکی میں تھا جب میں نے اسے دیکھا تھا۔ میری اس کی ملاقات شہر سے باہر ہوئی تھی۔ مجھ سے غلطی ہوئی کہ سواری پر بیٹھے بیٹھے اسے سلام کیا تھا۔ جس سے خضر بک ناراض ہوگیا تھا۔ نہ مجھے کچھ دیا نہ میری دعوت کی۔ میں نے یہاں سے ایک رومی کنیز بھی چالیس اشرفی میں خرید لی تھی۔

(باقی آئندہ)

باپو کی اچھی بات

(تلاش حق سے)

میں اپنے چال چلن کی دیکھ بھال بہت سختی سے کیا کرتا تھا۔ اس میں اگر خفیف سا دھبہ بھی آگیا تو میری آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے۔ جب میری کوئی حرکت والد یا استاد کے خیال میں قابل سرزنش ہوتی تو مجھے ایسا دکھ ہوتا کہ میں برداشت نہیں کرسکتا تھا۔

وزیر مصطفیٰ آبادی کا مرحوم
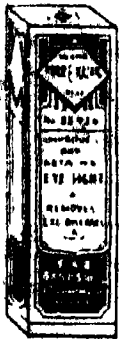
خدمتِ خلق کے لئے ... ہمہ وقت حاضر

پیٹ اور معدہ کی نئی پرانی شکایات اور وبائی امراض سے تحفظ کے لئے بے حد مفید اور زود اثر دوا

آنکھوں کو جملہ امراض سے محفوظ رکھنے۔ انھیں دلکش روشن اور جاذبِ نظر بنانے کیلئے بہترین سرمہ ہے

اکسیر اعظم ڈراپ

سرمہ نورِ نظر

سندری سہاگ

پی لو ٹانک

بالوں کی آرائش۔ قدرتی نشو ونما۔ اور دماغی تازگی کے لئے طبی اصولوں پر تیار کیا ہوا خوشبودار تیل

PEELO TONIC

بچوں کیلئے ایک خوش ذائقہ ٹانک جو انھیں تندرست خوش وخرم اور چاق چوبند رکھتا ہے۔

مزید کاروباری تفصیلات کیلئے براہِ کرم بپتہ ذیل پر خط وکتابت کیجئے

S.A.B. BAKHSHI & CO.
POST BOX 114
CALCUTTA - 1

ایس اے بی بخشی کمپنی

مولانا مقبول احمد سیوہاروی

مجاہدین آزادی

حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ

اللہ تبارک و تعالیٰ کی مشیت یہی ہے کہ ایک طرف ظلم و زیادتی ہے تو دوسری طرف ظلم مٹانے والے ہیں۔ ایک طرف گناہوں کا اندھیرا ہے تو دوسری طرف سعادت نیکی کی روشنی ہے۔

دنیا میں یہی ہوتا چلا ہے، یہی ہوتا رہے گا، ظالم ظلم کرتے رہیں گے اور ظلم مٹانے والے ظلم مٹانے کی خاطر مصیبتیں برداشت کرتے رہیں گے۔

ہر ملک، ہر شہر، ہر گاؤں میں ایسے لوگ پیدا ہوتے رہیں گے، نہ انہیں پھانسی کا ڈر ہوگا، نہ پٹنے اور مار کھانے سے گھبرائیں گے، نہ گالیوں کا برا مانیں گے۔

تو بس یہی ہیں جنھیں ہم مجاہد کہتے ہیں۔ یہی ہیں جو سچائی اور انصاف کے دیوتا ہیں۔ نواب ہو، بادشاہ ہو، بڑے سے بڑا حاکم ہو، آمنے سامنے ہوکر، بے دھڑک ہوکر، سچ بات کہیں گے، نہ مروت کریں گے نہ لحاظ کریں گے۔

ان میں کچھ ایسے ہوتے ہیں جو زبان و قلم سے یہ خدمت انجام دیتے ہیں۔ کچھ آگے بڑھ کر جان و مال سب کچھ نثار کر دیتے ہیں

ہم تری راہ میں مٹ جائیں گے سوچا ہے یہی
دردمندانِ محبت کا طریقہ ہے یہی

یہ طاقت سے تیر و تلوار سے، خنجر آب دار سے برچھے کے وار سے برائیوں کو روکتے ہیں اور ظالموں بدکرداروں کا مقابلہ کرتے ہیں

اور آخر قبائے خون سے آراستہ ہوکر خدا کے حضور میں حاضر ہو جاتے ہیں۔

وعظ و نصیحت کرنے والے، زبان سے برائیوں کو روکنے والے، قلم سے بدی کے مٹانے کی سعی کرنے والے، تیر و تلوار کھا کر خدا کے حضور پہنچنے والے سب کے سب مجاہد ہیں اور ان ہی کے لیے قرآن میں بشارتیں آتی ہیں کہ ان پر ملائکہ نازل ہوتے ہیں۔

آپ کو یاد ہوگا چند دن ہوئے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا پیام تعلیم میں ذکر ہوا تھا۔ یہ زبان اور قلم کے مجاہد تھے۔ جو زبان و قلم سے برائیاں مٹانے کا سامان کر گئے اور ایسے وقت قرآن پاک کا وقت کی زبان فارسی میں ترجمہ کیا (تاکہ مسلمان سمجھیں کہ احکام الٰہی کیا ہیں) قرآن کن چیزوں سے روکتا ہے اور کن باتوں کا حکم دیتا ہے جب کہ خود غرض اور جاہ پرست مولوی جو کچھ فقہ اور عبادات سے ناواقف لوگوں کو سرمایۂ زندگی سمجھتے تھے طویل سجدوں اور لمبی تسبیحوں کو دکھا کر لوگوں کو مرعوب کرتے تھے جنھوں نے حج بیت اللہ کو بھی خطرناک راستہ قرار دے کر مسلمانوں کے لیے حرم پاک جانے میں رکاوٹ ڈالی تھی۔ یہی لمبے لمبے کھینچنے والے مولوی تسبیح

والے ان مجاہدوں کے قتل پر آمادہ ہوگئے تھے۔

اور پھر انہی مجاہدوں کی اولاد میں حضرت شاہ عبدالقادر نے اُردو ترجمہ کیا تاکہ عوام اور کم پڑھے جو عربی فارسی نہیں جانتے قران کا مطلب سمجھنے لگیں

اور پھر اسی پیام تعلیم میں سلطان ٹیپو کے مختصر حالات لکھے گئے جس نے تیر و تلوار اور برچھے کے وار سے آزادیٔ وطن کا اعلان کیا اور بالآخر اپنی گردن درگاہ الٰہی میں پیش کر دی۔

جان دینے کا جو وعدہ تھا تو حاضر ہے سر
لیجیے آپ کا قرضہ ہے ادا کرتے ہیں

اب ایک ایسے مجاہد کا حال لکھا جاتا ہے جس نے زبان سے بھی برائیاں مٹانے کی کوشش کی اور تیر و تلوار بھی کام میں لایا۔

بچپن سے لے کر جب تک دنیا کی زندگی باقی رہی گھڑی بھر بھی چین سے نہ بیٹھا اور حق پرستی کی خاطر جان و خون کا تحفہ بارگاہ الٰہی میں پیش کر دیا۔

دریاؤں سے گذرا تپتی زمینوں پر سفر کیا، سنگلاخ چٹانوں پر اترا چڑھا، بھوکا رہا پیاسا رہا مگر ایک لمحہ کے لیے قدم نہ ڈگمگائے

جس مقدس راستہ کو خود غرض مولویوں نے روکا تھا وہ گیا اور اپنے ساتھ سینکڑوں مسلمانوں کو لے گیا۔ نہ کسی سے کرایہ مانگا نہ کھانے پینے کے لیے کہا، اپنے خرچ سے لے گیا اور اپنے ہی خرچ سے واپس لایا، کھلایا پلایا، پھٹے کپڑے والوں کو لباس پہنایا۔

یہ حضرت سید احمد شہیدؒ کا ذکر ہے۔ رائے بریلی کے رہنے والے بڑے خاندانی والے اصل نسل سید حضرت امام حسن کی اولاد خدا پرستوں کا خاندان عالموں اور درویشوں کا خاندان، ایسا خاندان جو اپنے علم اور درویشی میں دور دور مشہور تھا۔

حضرت سید احمد شہید

سید احمد شہیدؒ ۶ صفر کو ۱۲۰۱ھ ہجری میں پیدا ہوئے۔ چار برس چار مہینے چار دن کے ہوئے تو پڑھنے بیٹھے، مگر کتب میں جی نہ لگا۔ تین برس میں چند سورتیں قرآن کی یاد ہوئیں۔ جن لوگوں نے ان کا حال لکھا ہے وہ کہتے ہیں کہ جب کبھی کتاب کھولتے۔ کتاب کے حروف نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی نے جب یہ حال سنا تو فرمایا۔ ظاہری علم ان کے حصہ میں نہیں ہے۔ انھیں اونچا علم حاصل ہوگا جسے علم لدنی کہتے ہیں۔ وہ علم جو انبیا کو حاصل ہوتا ہے۔

مردانہ کھیلوں کا شوق تھا۔ سپاہیانہ زندگی پسند تھی۔

بستی کے لڑکوں کو جمع کرتے پھر ان کا ایک لشکر تیار کرتے تکبیریں کہتے، نعرے لگاتے ہوئے ایک دوسرے پر حملہ کرتے گویا دشمنوں سے جنگ کر رہے ہیں اور جوش و خروش سے وہ مارا، یہ فتح ہوا کے نعرے لگاتے۔

صبح ہوتے ہی ورزش کرتے، دن چڑھے تک کشتی لڑتے بیس بیس سیر اور ایک ایک من سے بھاری مگدر چار چار گھنٹے تک گھماتے رہتے۔

کچھ دن بعد تیر و تلوار اور بندوق کا نشانہ سیکھا۔

خدمت خلق:۔ خدمت خلق کے جذبہ کا یہ عالم تھا کہ جنگل جاتے، لکڑیاں کاٹ کر گٹھے بناتے سر پر لاد کر لاتے، غریبوں، پڑوسیوں اور عزیزوں کے گھر پہنچا دیتے۔

اپاہجوں اور بیواؤں کے گھر پر جاتے ان کا حال پوچھتے، سودا سلف لاتے یہ تھی سید صاحب کی جوانی۔

نہ مجلس آرائی تھی نہ دوستوں کی محفلیں تھیں، نہ آرائش و زیبائش تھی، ظاہری قوت اور باطنی قوت بڑھانے کی لگن تھی۔

دعا و مناجات میں آہ و زاری، تلاوت قرآن بعد بارگاہ الٰہی میں وقت گذاری تہجد و نوافل شب بیداری

ان کا پورا خاندان مجاہدوں کا خاندان تھا۔ جہاد نفس اور جہاد وجان میں نامور جن کی خدمت کرتے جن کا سودا سلف لاتے وہ انھی کے خاندان کے مرید تھے۔ وہ کہتے صاحبزادہ میاں بھلا آپ سے ہم کسی کام کو کہتے ہیں کیا آپ سے کام لے کر گناہ گار ہوں جواب دیتے "بوڑھے اور لاچاروں کی خدمت ثوابِ عظیم ہے۔ کیا مجھے اس ثواب سے آپ محروم کرنا چاہتے ہیں" اور روز کے روز ان کا کام کر دیتے۔

ایک دفعہ رائے بریلی سے لکھنؤ گئے۔ رائے بریلی سے لکھنؤ انچاس میل ہے۔ دوسرے کچھ عزیز ساتھ تھے جو تلاشِ روزگار میں جا رہے تھے۔ یہ سب سات آدمی تھے۔ سواری فقط ایک تھی۔ ہر ایک اپنا سامان خود اٹھاتا تھا۔ باری باری سوار ہوتے۔ سید صاحب کی باری آتی تو اپنے کسی ساتھی کی خوشامد کرتے اور اسے سوار کرا دیتے اور خود پیدل چلتے۔ آدھا راستہ رہ گیا تو وہ سب تھک گئے اور اسباب کسی سے نہ اٹھا۔ سید صاحب بولے "تم سب لوگ میری بات مانو تو کہوں"۔ سب نے کہا ضرور مانیں گے۔ بات پکی کر لی تو سب کا سامان چادر میں باندھ کر سر پر اٹھا لیا اور ہنسی خوشی لکھنؤ تک پہنچا دیا۔

قوت ایسی تھی کہ رائے بریلی میں معین خاں کا مقبرہ مشہور ہے۔ یہاں پتھر کا ایک کھم پڑا تھا بہت موٹا اور چار ہاتھ لمبا۔ بڑے بڑے پہلوان آتے اور زور آزمائی کرتے۔ پہلے اسے سیدھا کرتے پھر اٹھاتے۔ بہت زور لگایا تو کمر تک اٹھا لیا ورنہ گھٹنوں تک اٹھا کر نیچے ڈال دیا۔

چاندنی رات میں ایک دن سید صاحب اُدھر سے گذرے تو کرتا اتار کر سر پر رکھا۔ پھر پورے کھم کو اٹھا کر اور سر پر رکھ کر بیس قدم تک لے گئے اور زمین پر ڈال دیا۔ صبح کو لوگوں نے کھم کو اپنی جگہ سے ہٹا ہوا دیکھا تو حیران ہو کر کہنے لگے کس کی مجال تھی جو اسے اٹھا کر اتنی دور پھینک دیتا۔

تیراکی میں ایسا کمال تھا کہ پانی کا بہاؤ کتنا ہی تیز ہوتا دھار کی چڑھائی پر تیرتے چلے جاتے۔ غوطہ لگاتے تو اتنی دیر تک پانی میں بیٹھے رہتے کہ نماز پڑھنے والا اطمینان سے دو رکعت نماز پڑھ لیتا۔

سید صاحب کی زندگی گوناگوں انوار و برکات کی زندگی تھی۔ رائے بریلی سے لکھنؤ گئے تو لکھنؤ جانے کا مقصد سیر و تفریح نہ تھا اس زمانے میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے کمالاتِ روحانی کا چرچا تھا۔ کوئی گنہ گار جس کی عمر معصیت میں گذری ہو۔ حضرت کی خدمت میں جاتا تو نیک و پارسا بن جاتا۔ سید صاحب انھی کی خدمت میں جا رہے تھے۔

دہلی پہنچ کر مولانا عبدالعزیز کی خدمت میں حاضر ہوئے مولانا نے ان کے خاندان کا حال سنا تو بہت خوش ہوئے۔ سید صاحب کو اپنے بھائی شاہ عبدالقادر کے پاس پہنچا دیا اور کہہ دیا کہ ان کی خاص طور پر تربیت کی جائے۔

دلی والے سنت کے طریق پر سلام بھولے ہوئے تھے۔ حدیہ کہ حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز کے خاندان والے بھی سلام کرتے تو یوں کرتے۔

عبدالقادر سلام کرتا ہے۔ رفیع الدین تسلیمات بجا لاتا ہے۔ سید صاحب پہنچے اور حضرت شاہ عبدالعزیز سے مخاطب ہو کر السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہا تو بہت خوش ہوئے اور سب سے کہہ دیا کہ آئندہ طریقِ سنت پر سلام کیا جائے اور اس طرح سید صاحب نے رسول اللہ کی بھولی ہوئی سنت یاد دلائی۔

اس سے بھی زیادہ بات یہ ہوئی کہ روحانی تربیت کے لیے حضرت شاہ عبدالعزیز نے شغل برزخ کی تعلیم دی جس میں مرید اپنے شیخ کا تصور کرتا ہے۔ سید صاحب نے ایک [illegible]

سید صاحب نے حیران ہو کر کہا: حضرت تصور شیخ اور مورتی پوجا میں کیا فرق ہے۔ وہاں مورتی سامنے رکھ کر خیال جمایا جاتا ہے، برزخ میں شیخ کا تصور کیا جاتا ہے۔ قرآن و حدیث سے اس کا ثبوت ہو تو خیر، ورنہ مجھے اس شغل سے معاف فرمایا جائے۔ یہ سن کر شاہ عبدالعزیز نے سید صاحب کو سینہ سے لگایا اور فرمایا۔

"خدا نے اپنے فضل و رحمت سے تمہیں ولایت انبیا سے سرفراز فرمایا ہے۔"

ولایت انبیاء کا درجہ جس خوش نصیب کو مل جاتا ہے اس کا دل اللہ کی محبت سے بھرپور ہو جاتا ہے۔ وہ ہر وقت مخلوق الٰہی کو نیکی کا راستہ بتانے میں لگا رہتا ہے، اللہ کی مرضی کے مقابلے میں نہ دنیا والوں کی ملامت کی پروا کرتا ہے نہ کسی سے ڈرتا ہے۔ جان و مال کی قربانی سے دریغ نہیں کرتا۔ مخالف ہوں یا موافق، ہر مجلس میں جاتا ہے اور صراط مستقیم کی دعوت دیتا ہے۔ تکلیفیں اور مصیبتیں پیش آئیں تو ہنسی خوشی جھیلتا ہے اور اُف نہیں کرتا ہے۔

اب آپ دیکھیں کہ سید صاحب کی پوری زندگی اس کی تفسیر ہے یا نہیں؟ کچھ دن بعد شیخ سے اجازت لے کر وطن تشریف لے گئے تو کسی نے پہچانا نہیں کمبل کی ٹوپی کمبل کا لبادہ اور ہاتھ میں چمڑے کا ڈول تھا۔ بستر اثاث کا دوپارچہ کمبل کی کلاہ یا ٹوپی۔

کچھ دن وطن میں رہ کر نواب امیر خان کے پاس چلے گئے

امیر خان سنبھل کے بہادر پٹھان تھے۔ بعد میں امیر الدولہ بن کر ریاست ٹونک کے مالک ہوئے۔

سید صاحب امیر خان کی فوج میں چھ برس سے زیادہ رہے اور فوجیوں کی اصلاح و تربیت کرتے رہے۔

عام لشکریوں کی خدمت کرتے اپنے کپڑے خود دھوتے جب کپڑے دھونے جاتے تو ساتھیوں کے کپڑے بھی زبردستی اٹھا کر لے جاتے اور دھو کر لے آتے۔

ایک دلچسپ قصہ :-

فوج میں پنڈارے بھی تھے ان میں ایک بہت بوڑھا آدمی تھا۔ بوڑھے نے دوپہر کا کھانا کھایا تو اس میں سبزیاں تھیں، سبزیاں کھاتے کھاتے بوڑھے نے اپنے بیٹوں سے پوچھا "وہ جگہ تمہیں یاد ہے۔ جہاں سے یہ سبزیاں توڑی گئی ہیں" بیٹوں نے کہا "جی ہاں، یہاں سے دس بارہ کوس پر ایک گاؤں ہے۔ یہ سبزیاں وہاں سے آئی ہیں" بوڑھا بولا "تیار ہو جاؤ اور گھوڑوں پر سوار ہو کر جس جگہ سے سبزیاں آئی ہیں اس جگہ کو کھودو۔ وہاں خزانہ دبا ہوا ہے۔"

دوسرے دن پنڈاروں کے خیموں میں اعلٰی قسم کی چیزوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ اور ان کی عورتیں گیت گا رہی تھیں۔ بوڑھے سے پوچھا کہ تمہیں اس دولت کا پتہ کیسے چلا تو کہا ہم لوگ سبزیاں اور میوہ کھا کر زمین کے اندر کا حال معلوم کر لیتے ہیں۔ یہ علم ہمیں استادوں نے سکھایا ہے۔

فوج میں رہ کر اصلاحی طریقے

سید صاحب نے فوج میں رہ کر سپاہیوں کی ایسی اصلاح کی کہ سپاہیوں کی زندگی میں سنت کی پیروی کا شوق پیدا ہو گیا۔ اس کی دو مثالیں لکھی جا رہی ہیں۔

دل خاں :- ایک سپاہی تھا۔ اسے [illegible] کی بیماری تھی اور صحت [illegible] تھی۔ دعا کے لیے سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو سید صاحب نے فرمایا

دل خاں!! پہلے بُرے کاموں سے توبہ کرو اور عہد کرو کہ نماز پابندی سے پڑھا کرو گے تو دعا کروں گا۔

دل خاں نے اقرار کیا تو سید صاحب نے دعا فرمائی اور دل خاں چند دن میں اچھا ہوگیا۔

مدار بخش پنساری :- گھوڑوں کا مسالہ بیچا کرتا تھا ایک دن سید صاحب سے عرض کی حضرت!! خرچ سے تنگ رہتا ہوں پورا نہیں پڑتا۔

سید صاحب نے فرمایا پہلے اپنا نام بدلو۔ مدار بخش کی جگہ اللہ بخش نام رکھو۔ پانچوں وقت نماز پڑھو، جھوٹ کبھی نہ بولو، تول میں کمی نہ کرو، کسی کو دھوکا نہ دو، اس نے تمام باتیں مان لیں۔ تو سید صاحب نے دعا فرمائی۔ خدا کا کرنا کہ چند دن میں اس کا کاروبار اتنا بڑھا کہ سات آدمی نوکر رکھ لیے۔

سید صاحب سے عرض کیا حضرت!! میں آپ سے اور آپ کے ساتھیوں سے کسی چیز کی قیمت نہ لوں گا، سید صاحب نے انکار کردیا اور اپنے ساتھ والوں سے بھی کہہ دیا کہ پنساری سے کوئی چیز بغیر قیمت نہ لینا۔

شیخ عبدالسمیع اور رمضان خاں نواب کے ہاتھیوں پر مہاوت تھے۔ خرچ کی تنگی کی سید صاحب سے شکایت کی تو سید صاحب نے فرمایا "کہ ہاتھی کے راتب میں رتی برابر کم نہ کرنا۔ دونوں نے عہد کیا تو چند دن میں خوش حال ہوگئے۔

سید صاحب بات بات میں اصلاح کا خیال رکھتے تھے اور کسی وقت اس فرض سے غافل نہ ہوتے تھے۔

یہ پیغمبرانہ سلوک کا راستہ تھا جس کی خوش خبری سید صاحب کو شیخ حضرت شاہ عبدالعزیز نے دی تھی۔

نواب امیر خاں نے انگریزوں سے صلح کی بات چیت کی تو سید صاحب نے نواب کا ساتھ چھوڑ دیا اور بے پور چلے گئے

— سید صاحب نے نواب صاحب کو ہر چند سمجھایا کہ انگریزوں سے جنگ کی جائے۔ فتح حاصل ہوگئی تو کیا کہنا۔ ورنہ شہید ہوجائیں گے۔ شہید ہوجانا کیا تھوڑی نعمت ہے۔

ہندو راؤ گھوٹلے :- دولت راؤ گھوٹلے والی گوالیار کا نسبتی بھائی تھا۔ دولت راؤ بیمار ہوکر حکومت کے قابل نہ رہا تو ہندو راؤ نے کام سنبھالا۔

سید صاحب نے ہندو راؤ کو خط لکھا جس کا ایک حصہ یہ ہے۔

> وہ غیر جن کا وطن بہت دور ہے بادشاہ بن گئے۔ جو سوداگر سامان بیچتے تھے۔ انھیں بادشاہت حاصل ہوگئی۔ بڑے بڑے امیروں کی ریاستیں خاک میں مل گئیں۔ ان کی عزت چھن گئی۔ اب تھوڑے سے ضعیفوں کا گروہ وطن کی خدمت کے لیے اٹھا ہے۔
>
> یہ لوگ اقتدار کی خاطر نہیں اٹھے ہیں ہندوستان کا میدان دشمنوں سے خالی ہوجائے گا تو جو حکومت کا خواہش مند ہوگا۔ اسے حکومت مبارک رہے گی۔

یہ غیر جن کا اشارہ سید صاحب نے کیا ہے۔ وہی انگریز تھے جنھوں نے تجارت کرتے کرتے ہندوستان کی حکومت پر غاصبانہ قبضہ کر رکھا تھا۔

(باقی آئندہ)

اُف

جناب اطہر عزیز

سورج نکلا، اٹھو مُنّے　　جھٹ سے منہ اب دھولو مُنّے

میں تو ابھی بالکل نہ اٹھوں گا

جو کرنا ہے کرلو امّی!

دیکھو پوری حلوا پکا ہے　　سب ہی تمہارے لیے بنا ہے

میں تو پانی تک نہ پیوں گا

جو کرنا ہے کرلو امّی!

دیکھو تو کیا ڈاکیہ آیا؟　　اور کس کس کا خط وہ لایا

آپ کا میں نوکر نہ بنوں گا

جو کرنا ہے کرلو امّی!

آؤ، بیٹھو، سبق سناؤ　　کیا کیا یاد کیا؟ بتلاؤ

کہہ تو دیا نا، میں نہ پڑھوں گا

جو کرنا ہے کرلو امّی!

اُف! اتنا غصہ نہیں کرتے　　چلو ابھی بازار میں چلتے

پھر تو ہر ایک بات سنوں گا

جو کہنا ہے کہہ لو امّی!!

جناب اظہار الحق صاحب
بی۔ ایس۔ سی استاد مدرسہ ثانوی جامعہ

گلاب

(۳)

کیمیائی کھادوں کا استعمال

پچھلے شمارہ میں قدرتی کھاد اور اس کے ٹھیک ٹھیک استعمال کی بات بتائی گئی تھی۔ اب آپ کو کیمیائی کھادوں اور ان کے استعمال کے متعلق بتانا ہے۔

پودوں میں زیادہ حصہ تو ٹہنیاں ہوتی ہیں۔ اور ہری شاخیں ہوتی ہیں۔ ان میں زیادہ تر پروٹین ہوتی ہے اور یہ پروٹین نائٹروجن سے تیار ہوتی ہے۔ اس لیے پودا سب سے زیادہ نائٹروجن استعمال کرتا ہے۔ اسے وہ اپنی غذا کے طور پر زمین سے حاصل کرتا ہے۔

اس مسلسل استعمال سے زمین میں نائٹروجن کی کمی ہو جاتی ہے اسی طرح زمین میں فاسفورس اور پوٹاش کی کمی ہو جاتی ہے۔ ان چیزوں کی کمی کی وجہ سے پودے کی بڑھوار پر، پھول پر اور پھل پر بہت اثر پڑتا ہے۔ اگر ان چیزوں کی کمی کو دور کر دیا جائے تو پودے اچھی طرح پھولیں گے اور پھلیں گے۔

اس کمی کو دور کرنے کے لیے مختلف قسم کے کھاد استعمال کیے جاتے ہیں۔

قدرتی کھاد میں جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں زمین میں پہنچ کر اور تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ پانی کے محلول (گھول) کی شکل میں بدل جاتی ہے یعنی پانی میں اس طرح گھل جاتی ہے جیسے نمک یا شکر گھل جاتی ہے۔ پودے کی بال کی طرح باریک جڑیں اس محلول کو جذب کر کے پودے کے دوسرے حصوں کو پہنچاتی ہیں۔

اگر نائٹروجن، فاسفورس اور پوٹاش کیمیائی یا نمک کی
[illegible] زمین میں ملا دی جائیں۔ تو یہ فوراً پانی میں گھل کر پودے کے
[illegible] میں آجاتی ہیں اور استعمال میں آسانی بھی ہوتی ہے۔ لیکن
[illegible] کا اثر عارضی ہوتا ہے یعنی جس وقت یہ کھاد دیا جاتا
[illegible] پانی میں گھل کر استعمال ہو جاتا ہے۔ مگر پودوں کو تو ان
[illegible] کی مستقل ضرورت رہتی ہے۔ اس لیے قدرتی کھادوں کا
[illegible] ضروری ہے۔ یہ تو صرف اس طرح استعمال کرنی چاہئیں
[illegible] ہم کبھی کبھی مقوی یا قوت پہنچانے والی دواؤں کو استعمال
[illegible] ہیں۔ ان کھادوں کے مسلسل استعمال سے زمین بھی خراب
[illegible] ہے اور پودے اتنے نازک مزاج ہو جاتے ہیں کہ مختلف
[illegible] بیماریوں کے اثرات جلد قبول کر لیتے ہیں۔

ان کھادوں کا استعمال اس وقت تک بالکل نہ کیجیے
[illegible] پودے پوری طرح نہ بڑھ جائیں گرم موسم میں انھیں استعمال
[illegible] چاہیے۔ چھنٹائی کے بعد قدرتی کھاد استعمال کرنا چاہیے۔
[illegible] نئی کونپلیں پوری طرح بڑھ جائیں تب کیمیائی کھاد بہت کم
[illegible] مٹی میں چھڑک کر پانی دے دیا جائے۔ گلاب کے لیے
[illegible] سلفیٹ کے مقابلہ میں پوٹیشیم نائٹریٹ بہتر ہوتا ہے۔
[illegible] آف پوٹاش گلاب میں کبھی استعمال نہ کریں، اگر پوٹیشیم نائٹریٹ
[illegible] سکے تو امونیم سلفیٹ برابر مقدار سپر فاسفیٹ کی ملا کر
[illegible] کیجیے۔ ایک مربع گز کیاری کے لیے یہ مکسچر ایک ونس
[illegible] بار میں کافی ہوگا۔ اگر دوبارہ استعمال کرنا ہو تو کم از کم تین
[illegible] ہفتے کے بعد کیا جائے۔ گلاب کے لیے سلفیٹ آف ملائم
[illegible] آف میگنیشیا اور سلفیٹ آف آئرن کی بہت ہلکی مقدار
[illegible] ہوتی ہے [illegible] جب [illegible] آئی سی آئی کی

جب پھولوں کی کلیاں بڑی ہو جائیں تو [illegible]
[illegible]

گلاب کی چھنٹائی:-

کامیابی سے گلاب اگانے کے لیے سب سے ضروری کام اس کی چھنٹائی ہے۔ چھنٹائی سے پودوں کی بڑھوار اچھی ہوتی ہے۔ پھول اچھے آتے ہیں۔ پرانی شاخیں جن پر ایک بار پھول آچکے ہیں دوبارہ پھول نہیں آسکتے۔ چھنٹائی کرنے سے نئی شاخیں نکلتی ہیں جن پر پھول آتے ہیں۔ کم از کم ایک سال کی عمر سے پہلے گلاب کے پودے کی چھنٹائی نہیں کرنی چاہیے۔ ایک خاص وقت پر پھول لانے کے لیے چھنٹائی کا کام میدانی علاقوں میں ۶۰، ۵، ۷ دن اور پہاڑی علاقوں میں جہاں زیادہ سردی ہوتی ہے تقریباً تین ماہ پہلے کرنا چاہیے۔

زیادہ بڑھنے والے پودوں کی ہلکی چھنٹائی اور کم بڑھنے والوں کی زیادہ ہونی چاہیے۔ چھنٹائی کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے سوکھی اور کمزور شاخوں کو تیز چاقو یا سکیٹیر سے کاٹ دیا جائے۔ اس کے بعد آڑی ترچھی شاخوں کو چھانٹا جائے تاکہ پودے کا درمیانی حصہ کھل جائے۔ پھر پتیوں کو کاٹ دیا جائے۔ تاکہ چھنٹائی میں آسانی ہو۔ کمزور اور بے کار شاخوں کو بھی نکال دیا جائے۔ اب صرف مضبوط شاخیں چھنٹائی کے لیے رہ جاتی ہیں۔ ان کو زمین سے تقریباً ۱۰ انچ اوپر سے کاٹ دیا جائے۔ ان موٹی شاخوں میں سے پتلی شاخیں نکلی ہوتی ہیں۔ ان میں سے صرف دو یا تین تندرست شاخوں کو چھوڑ کر سب کو کاٹ دیا جائے جو رہ جائیں ان میں صرف دو یا تین آنکھیں ہوں اور اوپر کی آنکھ باہر کی طرف ہو۔

[illegible] گلاب کی [illegible] ہیں۔ کچھ زیادہ بڑھنے والی ہیں۔ کچھ کم بڑھنے والی اور کچھ درمیانی بڑھوار کی ہوتی [illegible] کے بیچ میں [illegible] شاخ [illegible] سے کام لینا چاہیے

عام طور سے ضروری باتیں یہ ہیں کہ خشک شاخوں کو نکالنا، گرد پرانی شاخوں کو کاٹنا، آڑی ترچھی شاخوں کو نکالنا اور درمیانی حصہ کو کھولنا چاہیے۔

میدانی اور معتدل علاقوں میں چھنٹائی کا وقت برسات ختم ہونے کے بعد اور سردیوں کے شروع کا زمانہ ہے۔ گلاب کی چھنٹائی میں جلدی نہیں کرنی چاہیے۔ ۲۰، ۲۵ اکتوبر سے پہلے تو بالکل نہ کی جائے۔ زیادہ بڑھنے والی قسموں کو تو اس سے بھی ایک مہینہ بعد چھانٹا جائے۔ پہاڑی علاقوں میں جہاں زیادہ سردی ہوتی ہے گلاب کی چھنٹائی مارچ کے آخر اور اپریل کے شروع میں کی جاتی ہے۔

پرانی شاخیں جو پھول دے چکی ہیں، ان کو کاٹتے رہنا چاہیے اور نیچے سے نکلنے والی نئی شاخوں کو پھولنے کا موقع دینا چاہیے۔

اگر آپ کو دلچسپی ہے تو آیندہ سینچائی اور ضروری دیکھ بھال کے متعلق بتایا جائے گا۔

جناب حافظ یاقوتی راچوری

ایک بچے کی دعا

مجھے یا خدا تن درستی عطا کر
مرے دل کو تو حق پرستی عطا کر

مرے دم سے دنیا بنے رشکِ جنت
مجھے ایسی پُر لطف مستی عطا کر

وہ دل جس میں تیری محبت بسی ہو
وہ شاداب و گلزار بستی عطا کر

فلک کی بلندی بھی شرمائے جس سے
مرے ذہن کو وہ بلندی عطا کر

سدا وقت پر ہر فریضہ ادا ہو
وہ تیزی، وہ پھرتی، وہ چستی عطا کر

بنا کر جو انساں کو ناکارہ چھوڑے
مجھے ایسی ہرگز نہ سستی عطا کر

رہے میرے سر پر بزرگوں کا سایہ
بڑوں کی مجھے سرپرستی عطا کر

تری یاد میں تیرا حافظ مگن ہو
اسے اپنی الفت کی مستی عطا کر

جناب اقبال مہدی لکچرر ٹیچرس کالج جامعہ
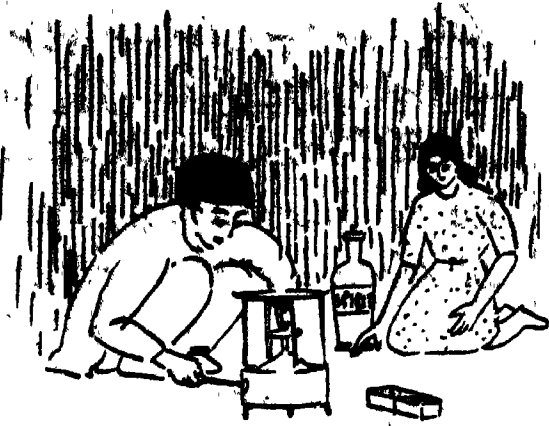
ایک دن کیا ہوا

شام ہو چلی تھی۔ ابّا جان کے آنے کا وقت ہو رہا تھا۔ امّی کچھ سو رہی تھیں سلیم اور سلمہ نے سوچا شام کی چائے آج خود تیار کر لیں۔ امّی کو معلوم ہوگا تو بہت خوش ہوں گی۔ اُن کے لیے ایک کام کم ہو جائے گا۔ ابّا جان کو بتائیں گی تو وہ بھی خوش ہوں گے۔

دونوں باورچی خانے میں پہنچے۔ سلیم نے سلمہ سے کہا۔ تم کیتلی صاف کر کے پانی لے آؤ میں اسٹو جلاتا ہوں۔ سلمہ کیتلی لے کر چلی گئی۔ سلیم نے اسٹو صاف کیا۔ کٹوری میں اسپرٹ ڈالی دیا سلائی جلا کر اسپرٹ میں آگ لگا دی اور اسپرٹ کے جل چکنے کا انتظار کرنے لگا۔

سلمہ کیتلی میں پانی لے کر آ گئی اور برابر میں بیٹھ گئی جب اسپرٹ ختم ہونے لگی تو سلیم نے اسٹو میں ہوا بھرنی شروع کی۔ اسپرٹ ختم ہو گئی، کٹوری کی آگ بجھ گئی لیکن نہ اسٹو جلا نہ گیس نکلی۔

دونوں کو بڑی مایوسی ہوئی۔ سلمہ نے کہا "یہ گیس کا سوراخ بند معلوم ہوتا ہے۔" دونوں نے اسٹو کا پن تلاش کیا۔ اس سے گیس کا سوراخ صاف کیا۔ کٹوری میں پھر اسپرٹ ڈالی اور اس میں آگ لگائی۔ اب پھر دونوں اسپرٹ کے جل چکنے کا انتظار کرنے لگے۔

جب دوبارہ اسپرٹ ختم ہونے لگی تو سلیم نے اسٹو میں پھر ہوا بھرنی شروع کی۔ لیکن پھر ناکامی ہوئی۔ اسپرٹ جل کر ختم ہو گئی اور اسٹو نہ جلا۔ اب تو دونوں کو کوفت ہونے لگی۔ پھر امّی اور ابّا جان سے شاباشی کیسے ملے گی۔

دونوں کچھ دیر خاموش بیٹھے ہوئے اسٹو کو اِدھر اُدھر سے دیکھتے رہے۔ سلمہ نے کہا "بھائی جان شاید آپ نے ہوا نکالنے کا پیچ بند نہیں کیا۔" سلیم نے اسے چھوا۔ وہ واقعی کھلا ہوا تھا۔ اسے کس کر بند کیا۔ دونوں کے اداس چہرے کھل اٹھے۔

سلمہ فخر محسوس کر رہی تھی کہ اس نے مشکل حل کر دی۔ سلیم کچھ کھسیا رہا تھا کہ سلمہ سوچے گی کہ اسے اسٹو جلانا بھی نہیں آتا۔ اسٹو کی کٹوری میں اس بار سلمہ نے اسپرٹ ڈالی۔ سلیم نے آگ لگائی۔ دونوں کا جی چاہ رہا تھا کہ جلد اسٹو جل جائے۔ دونوں بے چینی سے اسپرٹ کے جل چکنے کا انتظار کر رہے تھے۔ انتظار کھل رہا تھا۔

"بہت اسپرٹ ڈال دی تم نے۔" سلیم نے اعتراض کیا۔

"اتنی ہی ڈالی جاتی ہے۔" سلمہ نے جواب دیا۔ وہ اپنی کرائی کرائی محنت کو ٹالنے پر تیار نہ تھی۔

سلیم جھینپ گیا۔ اس نے نعرے سے پمپ کرنا

شروع کیا۔ اسلم نے جھٹکا کھایا۔ اسپرٹ کٹوری سے چھلک گئی اور تیل کی شیشی پر بھی گری۔ کچھ فرش پر بھی ٹپکی۔ اسپرٹ کے ساتھ ساتھ آگ بھی پھیل گئی۔ پھر تو آگ کے شعلے اچھل کر دونوں پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی۔ لیکن اسپرٹ زیادہ نہیں پھیلی تھی۔ جلد ہی شعلے سمٹنے لگے اور سمٹ کر پھر کٹوری تک آگئے۔

سلیم نے پھر ہوا بھرنی چاہی۔ لیکن پمپ گرم ہوگیا تھا۔ اس کو ہاتھ نہیں لگایا جا رہا تھا۔ اب کیا کریں۔ اسی پریشانی میں تھے کہ کٹوری میں اسپرٹ پھر ختم ہونے لگی۔ اس کی آگ بھی بجھنے لگی۔ یہ دیکھ کر اسلم نے اسپرٹ کی بوتل اٹھائی اور چاہا کہ کٹوری کی آگ بجھنے سے پہلے ہی اس میں اور اسپرٹ ڈال دے۔ بوتل کھول کر اس کا منھ کٹوری کے پاس تک ہی لائی تھی کہ "بھبک" سے آواز ہوئی اور آگ کا ایک بڑا سا شعلہ بوتل سے نکل کر سامنے دیوار پر لگا اور تیزی سے اِدھر اُدھر پھیلنے لگا۔

دونوں گھبرا کر باہر بھاگے۔ نہ تو امی کو بتانے کی ہمت تھی نہ امی سے چھپانے کی۔ یہ بھی ڈر تھا کہ دوسرا پہلے شکایت نہ کر دے۔ دونوں ایک ساتھ چلائے "امی! اسلم نے آگ لگا دی"۔

"امی! بھائی جان نے آگ لگا دی"۔

آگ کا نام سن کر اور دونوں کی پریشانی اور گھبراہٹ ہوئی صورتیں دیکھ کر امی دوڑی دوڑی باورچی خانے میں پہنچیں۔ پھیلی ہوئی آگ دیکھ کر بہت گھبرائیں اور چلا چلا کر دونوں سے پوچھنے لگیں:۔

"ارے یہ ہوا کیا؟ یہ کیا ہے میں آگ لگا دی تم لوگوں نے؟" اتنے میں آگ کے شعلے کم ہونے لگے۔ اتفاق سے اسپرٹ اور آگ کسی ایسی چیز تک نہ پہنچے تھے جو جل اٹھتی۔ بڑی خیریت ہوگئی۔

آگ تو کچھ ہی دیر میں بجھ گئی لیکن سلیم اور اسلم پر خوب ڈانٹ پڑی۔ دونوں نے کان پکڑے اب کوئی کام امی سے پوچھے بغیر نہ کریں گے۔

نیر صاحب کی دو نئی کتابیں:۔

گھر کا آئینہ:۔ صفحات ۳۲ صفحے، ٹائیٹل دو رنگا، لکھائی چھپائی اور کاغذ اچھا۔ قیمت ۲۲ پیسے

یادگار انگوٹھی:۔ صفحات ۳۲ صفحے، ٹائیٹل دو رنگا، لکھائی چھپائی اور کاغذ اچھا۔ قیمت ۲۲ پیسے

ملنے کا پتہ:۔ نیر کتاب گھر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

جناب شفیع الدین نیر صاحب کو تو آپ خوب جانتے پہچانتے ہوں گے۔ ہندوستان بلکہ پاکستان کا شاید ہی کوئی کونا ایسا ہو جہاں نیر صاحب کی شاعری بچوں میں مقبول نہ ہو۔ پیام تعلیم سے نیر صاحب کا تعلق بہت پرانا ہے ۲۴ء سے پہلے ان کی نظمیں تو پیام تعلیم میں چھپتی ہی تھیں، ان کی بہت سی اچھی اچھی کہانیاں بھی پہلے پیام تعلیم ہی میں چھپی ہیں۔ بچوں کے شاعر مشہور ہیں لیکن نثر بھی بہت نکھری ستھری آسان اور دلچسپ لکھتے ہیں۔ ان کی یہ دونوں کتابیں ابھی ابھی چھپی ہیں۔ (۱) گھر کا آئینہ اور یادگار انگوٹھی دونوں نثر میں ہیں۔ پہلی (گھر کا آئینہ) میں تین مزے مزے کی سبق آموز کہانیاں ہیں اور ایک بہت ہی دلچسپ نظم ہے (رضیہ کی شرارت) دوسری کتاب (یادگار انگوٹھی) میں ایک لمبا سا طویل کہانی ہے، بہت ہی دلچسپ اور منھ کا مزہ بدلنے کے لیے ایک ننھی سی نظم ہے (لڑکا خواب)۔ کتابیں آپ اوپر کے پتے یا مکتبہ جامعہ سے منگائیے۔

بچوں کی کوششیں

ٹھگ

ایک جگہ دو ٹھگ بیٹھے ہوئے یہ سوچ رہے تھے کہ لوگوں کو ٹھگنے
[illegible]ون سی ترکیب استعمال کی جائے. لیکن دونوں میں سے کسی کو کوئی
[illegible]ہیں سوجھ رہی تھی افسردہ سے تھے۔
تقریباً چار پانچ گھنٹہ سوچنے کے بعد ایک ٹھگ نے دوسرے
کے کان میں کچھ کہا اور پھر دونوں بہت زور زور سے قہقہ[illegible]
لگے۔ اور خوشی خوشی باہر بھاگ گئے
دونوں ٹھگ باہر گئے اور بہت سے پتھر جمع کرکے واپس آگئے
[illegible]نے والی تھی اس لیے انھوں نے اپنے کام کو کل کے لیے چھوڑ دیا
لے
اگلے دن انھوں نے دو دو پتھر ایک ایک ڈبہ میں رکھ کر
دیے۔ اور خوشی خوشی بازار کی طرف چل دیے۔ ایک جگہ
[illegible] بیٹھ کر ٹھگوں نے آواز لگائی — "کھٹمل مار دوا، کھٹمل
[illegible]رف ایک روپیہ میں" کھٹمل تو ان دنوں گھر گھر تھے ہی
[illegible] دوا کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور ٹھگوں کی ساری ڈبیاں
[illegible] اور ٹھگ خوشی خوشی اپنے گھر کی طرف چل دیے۔ ادھر
[illegible] [illegible]

کو بہت افسوس ہوا۔

محمد صہیب۔ مدرسہ ثانوی جامعہ

شریر لڑکا

نسیم بہت شریر لڑکا تھا۔ اس کی شرارت سے گھر
کے سب لوگ پریشان تھے۔ وہ گھر سے آدھے میل کے فاصلہ پر ایک اسکول
میں پڑھتا تھا۔ اسکول سے کچھ فاصلے پر ایک لنگڑا فقیر رہتا تھا۔ نسیم
اپنے کچھ شریر ساتھیوں کے ساتھ اسے "لنگڑا، لنگڑا ہے!" کہہ کر چھیڑتا
تھا۔ اور اس کے اینٹیں وغیرہ بھی مارتا تھا۔ جب وہ بستی میں بھیک
مانگنے کے لیے نکلتا نسیم اور اس کے ساتھی اس کا پیچھا کرتے اور
اس کو بھاگنے پر مجبور کر دیتے۔
ایک دن نسیم اسکول سے واپس آرہا تھا کہ اچانک بڑے
زور کی آندھی آگئی۔ راستہ میں اندھیرا چھا گیا۔ وہ اپنے ساتھیوں سے
بچھڑ گیا اور راستہ بھٹک گیا اور جنگل کی طرف چلنے لگا۔ آندھی کے
ساتھ ساتھ بارش بھی شروع ہوگئی۔ وہ چیخیں لگا رہا تھا مگر اس کی
چیخیں سننے والا کوئی نہ تھا۔
اچانک کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اس کی آنکھوں میں
دھول بھری تھی۔ نسیم اس کو پہچان نہ سکا۔ وہ آدمی اس کو
اپنی جھونپڑی میں لے گیا۔ اس نے نسیم کا منہ دھلایا [illegible]
[illegible]

گئے ـــ وہ آدمی وہی لنگڑا فقیر تھا۔ جس کو وہ ہر روز ستایا کرتا تھا۔
یم ڈرے کانپنے لگا اس نے سوچا یہ آج بدلہ ضرور لے گا۔
فقیر نے کہا: "بیٹا ۔ گھبراؤ مت بارش رکنے کے بعد میں تمھیں
ھارے گھر پہنچا دوں گا۔"
نسیم کی آنکھوں میں آنسو آگئے اس نے کہا: "بابا ۔ میں تم
و ستاتا تھا ۔ مجھ کو معاف کر دو اب میں کبھی ایسا نہیں کروں گا۔"
فقیر نے کہا: "بیٹا! اس کو غلطی نہیں کہتے ۔ اگر صبح کا بھولا
ام کو گھر آجائے تو اس کو بھولا نہیں کہتے۔"
بارش رکنے کے بعد فقیر نسیم کو گھر پہنچا گیا۔
اس دن کے بعد نسیم بہت نیک لڑکا بن گیا ۔ اب وہ کسی کو
ہیں ستاتا ۔ اب وہ پڑھنے لکھنے میں جی لگاتا ہے۔

نعیم مرادابادی

بچی خدمت

بہت دن ہوئے ایوارڈ نام کے پادری نے
یک پہاڑی پر گرجا گھر بنوایا ۔ اس گرجا گھر کو دیکھ دیکھ کر اسے بہت
ھمنڈ ہوتا تھا ۔ اور اپنے دل میں کہتا تھا کہ اس نے گرجا گھر بنوا کر خدا کی
ور لوگوں کی خدمت کی ہے۔
اس گرجے کا جو خاص دروازہ تھا ۔ اس کے اوپر کچھ جگہ خالی
ی ۔ یہاں پر پادری کا نے ایک پتھر کی مورتی کھڑی کرنے کا منصوبہ بنایا
ور دل میں کہتا ۔ کہ آئندہ جب لوگ عبادت کرنے آئیں گے تو اس کی
رانی خدمت کی تعریف کریں گے۔
ایک رات پادری نے خواب دیکھا کہ اس کے پلنگ کے پاس
یک فرشتہ کھڑا ہے جو اس سے کہہ رہا ہے کہ "اٹھ" جب پادری اٹھا
و فرشتہ اس کو اس جگہ لے گیا جہاں مزدور ایک بڑے پتھر کو کھینچنے کی
وشش کر رہے تھے اور بے چارے تھک گئے تھے ۔ اتنے میں
یک لڑکی نے جو بہت پرانے اور میلے کچیلے کپڑے پہنے
[illegible]

کھا کر دونوں تازہ دم ہو گئے پھر پتھر کو کھینچنے لگے۔
اور فرشتہ نے بتایا کہ خدا کے نزدیک یہ لوگ تم سے زیادہ عزت
رکھتے ہیں ۔ جب پادری کی آنکھ کھلی تو اسے معلوم ہوا کہ وہ کتنا گھمنڈی
کتنا بے وقوف تھا ۔ اب سویرے ہی پادری نے اپنی مورتی کے بجائے
اس خالی جگہ میں اس چھوٹی لڑکی کی مورتی بنوا کر رکھوائی ۔ اور
ان ان بیلوں کی مورتیاں سب سے اونچے میناروں پر رکھوائیں۔
یہ پادری مر گیا تو وہیں گرجے کے دروازے کے سامنے گاڑا گیا ۔ اور
اب بھی جب لوگ عبادت کے لیے جاتے ہیں تو اس لڑکی کی خدائی
خدمت کو یاد کرتے ہیں۔

ابواللیث انصاری

لطیفے

(۱) ایک شرابی رات کے وقت نشہ میں دھت چلا جا رہا تھا ـــ
ایکایک نالی میں گر پڑا تو کہنے لگا۔ "میں یہ نالی دن میں سڑک کے
کنارے رہتی ہے اور رات کو بیچ میں چلی آتی ہے۔"
(۲) دو افیمی بیٹھے ہوئے تھے ۔ ایک کے ہاتھ میں ٹارچ تھا۔
اس نے ٹارچ جلایا اور اپنے ساتھی سے پوچھنے لگا تم اس ڈوری
(ٹارچ کی شعاع) کو پکڑ کر آسمان پر چڑھ سکتے ہو؟ ساتھی نے جواب
چڑھ تو جاؤں گا ۔ لیکن جو تم ٹارچ بجھا دو گے تب؟

محمد شاہد خاں (گیا)

ایک افیمی اپنے لڑکے سے ملنا چاہتا تھا ۔ اس نے ایک شخص سے
پوچھا ـــ کیوں صاحب خط تو ڈاک سے آتے جاتے ہیں، آدمی نہیں جا
سکتا؟ اس نے جواب دیا کیوں نہیں دیکھیے یہ پیشانی پر ٹکٹ
چپکا کر دیوار کی طرف منہ کر کے سامنے والے لیٹر بکس کے نیچے بیٹھ
جائیے ۔ جب ڈاکیہ ڈاک نکالے گا تو خطوں کے ساتھ آپ کو بھی لے
جائے گا اور آپ جہاں چاہیں گے پہنچا دے گا ۔ یہ ترکیب سن کر وہ
بہت خوش ہوا اس نے ایسا ہی کیا ۔ ڈاکیہ جب آیا تو اس نے
[illegible]

بڑوں کی کوششیں

ایک پرانا سوال، نئے جواب

ٹیچرس کالج جامعہ میں آسان اُردو سیکھنے والے طالب علموں کو قاعدہ ختم کرانے کے بعد ایک سوال دیا گیا تھا نیچے کے منظر کو سامنے رکھ کر کوئی واقعہ یا بیان اس طرح لکھیے کہ یہ پانچوں لفظ ایک ہی واقعے یا بیان کا حصہ معلوم دیں۔ اس کام کے دو نمونے گذشتہ سال دئے گئے تھے۔ اب یہی سوال اس سال کے طالب علموں کو دیا گیا تھا۔ یہ نئے نمونے درج ہیں۔

"مدیر"

گھر، پارک، لان، پھول، گملے

موسم سہانا تھا۔ وینا گھر کے باہر کھڑی تھی۔ ایک پری آکاش سے اتری۔ وینا کے پاس آئی اور بولی آؤ پارک میں چلیں۔ پہلے تو وینا ڈر گئی پھر اس کی میٹھی میٹھی باتوں سے وہ اس کے ساتھ چل دی۔ وہ اسے پارک میں لے گئی پارک میں بہت سے لان تھے۔ خوب صورت پھول لگے تھے۔ اور گملے بھی تھے۔ وینا اور پری نے تھوڑی دیر پارک میں سیر کی اور پھر ہم گھر لوٹ آئے

وینا کماری

ڈپلوما بیسک جامعہ پہلا سال

گھر، پارک، لان، پھول، گملے

میں آج گھر پر تھی۔ میرا دل نہیں لگ رہا تھا۔ میرا من پارک میں جانے کو چاہتا تھا۔ میں جلدی سے اپنی سہیلی رما کے گھر گئی۔ وہ کھانا کھا رہی تھی۔

اس نے کہا تم بھی کھانا کھا لو۔ پر میں نے منع کر دیا میرا من تو پارک جانے کو کہتا تھا۔ وہ میرے ساتھ جلدی سے چل پڑی۔ میں نے پارک میں لان دیکھا۔ جو بڑا سندر لگ رہا تھا۔ لان میں بالک کھیل رہے تھے۔ مالی گملوں کو پانی دے کر اپنا کام کر رہا تھا۔ مالی سے نظر بچا کر رما نے پھول توڑ لیا پھول کو دیکھ کر رما بہت خوش تھی ہم پھر گھر آ گئے

شکنتلا کور

ڈپلوما بیسک جامعہ پہلا سال

قلمی دوستی

نام:۔ سید ذوالفقار احمد عمر:۔ ۱۴ سال
مشغلہ:۔ بچوں کے اچھے رسالے پڑھنا، مصوری کرنا، نماز پڑھنا، کورس کی کتابیں پڑھنا۔
پتہ:۔ سید ذوالفقار احمد، معرفت ڈاکٹر سید حبیب احمد صاحب میڈیکل افسر:۔ مبارکپور۔ اعظم گڑھ

نام:۔ کوثر علی خاں تخلص آزاد عمر:۔ ۱۲ سال
مشغلہ:۔ پیام تعلیم، کتاب نما، لائبریری کی کتابوں کا مطالعہ کرنا، نماز پڑھنا، کہانی لکھنا۔
پتہ:۔ محلہ دکھنواری۔ مقام اکبرپور۔ رہتاس ضلع شاہ آباد

نام:۔ ابوالقاسم انجم دھچنوی عمر:۔ ۱۲ سال
مشغلہ:۔ قلمی دوستی، ٹکٹ و فوٹو جمع کرنا، قصہ و کہانیاں لکھنا اور سفر وغیرہ۔
پتہ:۔ کیرآف شرف الدین پان فروش۔ محلہ لائن کشن گنج ضلع پورنیہ (بہار)

نام:۔ ابواللیث انصاری عمر:۔ ۱۴ سال
مشغلہ:۔ ادبی جلسے کرنا، ان جلسوں میں مضمون پیش کرنا، تعلیمی تاش کھیلنا۔ ٹکٹ جمع کرنا۔
پتہ:۔ [illegible] ۔۔۔ [illegible] محلہ [illegible]

مئوناتھ بھنجن اعظم گڑھ

نام:۔ نرگس بانو تبسم عمر:۔ ۱۴ سال
مشغلہ:۔ افسانہ نگاری، شعر و شاعری، ڈرامہ نگاری، پیام تعلیم پڑھنا، کشیدہ کاری، آئے ہوئے بھائی بہنوں کے خطوں کا جواب پابندی سے دینا۔
پتہ:۔ معرفت محمد ارمغان ساحل سہسرامی۔ محلہ منڈی کشور خاں:۔ پوسٹ سہسرام:۔ ضلع شاہ آباد

نام:۔ مختار احمد عمر:۔ ۱۶ سال
مشغلہ:۔ پیام تعلیم، کھلونا، اردو کومک پڑھنا، نماز پڑھنا، کہانیاں لکھنا، خریدار بننا اور بنانا، گھر میں لائبریری کا قیام، قلمی دوستی وغیرہ۔
پتہ:۔ مختار احمد ۔ محلہ قانون گو۔ پوسٹ زمانیہ ضلع غازی پور (یو۔پی)

نام:۔ انصاری محمد ابراہیم عمر:۔ ۱۴ سال
مشغلہ:۔ پیام تعلیم، اور دوسرے پرچے پڑھنا، مطالعہ کرنا۔
پتہ:۔ خیال انصاری ۔ مکان نمبر ،،، خوش آمد پورہ مالیگاؤں

نام:۔ ریاض احمد انصاری عمر:۔ ۱۵ سال
مشغلہ:۔ اسکول کا کام خوب جی لگا کر کرنا، ریڈیو پر تلاوت کلام پاک اور اس کا ترجمہ نصیحت خوب جی لگا کر سننا۔
پتہ:۔ ریاض احمد ۵/۷ کلیم النظام الرحمن۔ محلہ سکرول ٹانڈہ فیض آباد

[illegible]

یہاں کے کچھ طالبوں کے خطوط مجھے "پیام تعلیم" میں اس مضمون کے چھپنے کے بعد ملے ہیں جن میں بعض تلخ ہیں اور بعض شیریں۔ کچھ نے لکھا کہ میں نے بہار کے رواجی جہیز کا مذاق اڑایا ہے۔ کچھ نے لکھا ہے کہ میں نے صحیح طور سے اس بدعت پر گرفت کی ہے۔ میں نے ان بہنوں کو جواب میں لکھا ہے کہ وہ اس ذیل میں "پیام تعلیم" کی مشکور ہوں کہ جس نے مجھے اس جرأت پر آمادہ کیا۔ بحمد اللہ یہاں سخت گرمیوں اور تیز دھوپ کے بعد اب ترشح کا سلسلہ شروع ہوا ہے۔ اور سوکھے دھان لہلہانے لگے ہیں۔ آپ کے شفقت نامہ کا انتظار رہے گا۔ فقط

سلمیٰ جاوید پٹنہ

خدا کرے آپ حضرات بہ طور خیر و عافیت کے ساتھ ہوں۔ "پیام تعلیم" کا تازہ ترین شمارہ دستیاب ہوا۔ خوب سے خوب تر بنانے میں آپ حضرات کا انہماک قابلِ ستائش ہے۔ اس دفعہ اور زیادہ نکھر سنور گیا ہے۔ محترمہ سیدہ فرحت صاحبہ کی نظم بڑے مزے کی ہے۔ اس کے تیسرے بند کا چوتھا مصرعہ شایع ہونے سے رہ گیا۔ شاید کاتب صاحب کو ذاتی طور پہ بہت پسند آگیا اور جناب فہرست میں ناچیز کے نام میں تبدیلی نظر آرہی ہے تو خیریت ہوئی کہ "جنس" سلامت ہے۔

مالک جنس انور

کی دیدہ زیبی میں کھو کر رہ گیا۔ پرچے کو سنوارنے اور نکھارنے میں آپ نے جو انتھک محنت کی ہے اس کا اندازہ ہر بالغ نظر قاری لگا سکتا ہے۔ ماہ بہ ماہ اس کا معیار بلند تر ہوتا جا رہا ہے۔ مجھے کہنے دیجیے کہ ہندو پاک میں کوئی بھی بچوں کے لیے اتنا جاندار اور معیاری پرچہ نہ نکال سکا۔ اور نہ موجودہ پرچے اس کے معیار کو چھو سکے۔ "پیام تعلیم" ہر لحاظ سے منفرد ہے۔ اس میں شایع ہونے والے مواد اپنے اندر ٹھوس جامعیت رکھتے ہیں۔ اس کی بلند مقصدیت اس کی انفرادی شان ہے۔ لیکن ان تمام خوبیوں کے باوجود کچھ خامیوں کا بھی احساس ہوتا ہے۔ وہ ہے طباعت کی خامی اور کاتب صاحب کی عدم توجہی بعض بعض جگہ الفاظ لکھنے سے رہ جاتے ہیں یا مضمون نگار کا نام غلط لکھا جاتا ہے۔ یہ پروف ریڈر صاحب کی بھی عدم توجہی کہی جا سکتی ہے۔ میرے مضمون پر بھی میرا نام بجائے مقیم شاد مونگیری کے شا مقیم مونگیری لکھا ہوا ہے۔ اس کی تصحیح کی ضرورت ہے۔

تازہ شمارہ میں خصوصی طور پر "ایتھوپیا کی سرزمین سے" "بہادر بھائی کی بہادر بہن" "اوکھا مزدور" "بھاگو نکل" "ابن بطوطہ" "اور رہبروں کا رہنما" بے حد پسند آئے۔ خدا کرے پیام تعلیم کے ذریعہ آپ بچوں کے ذہن کو ایک بہترین روشنی سے روشن کر دیں۔ "آمین"

مقیم شاد مونگیری بھاگلپور

نومبر کا "پیام تعلیم" نظر نواز ہوا۔ پرچے

[illegible] مطالعہ سے مجھے اور
میرے گھر والوں کو خوشی ہوتی ہے۔ اس کا بیان کرنا مشکل ہے۔
آپ کی محنت اور لگن نے پیام تعلیم کے خاکوں میں رنگ بھر کر
اسے ایک دیدہ زیب تصویر کی صورت ہی نہیں بخشی بلکہ اسے
ایک شاہکار تصویر بنا دیا ہے۔ یوں تو ہمارے ملک میں کئی ایک
بچوں کے رسالے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ لیکن بچوں کی نفسیات کے
مطابق ادب پیش کرنے میں پیام تعلیم کا مقام بہت بلند و برتر ہے۔
میں تو صرف اتنا کہوں گا کہ یہ سب آپ کی ان تھک محنت اور
کوششوں کا بیش بہا ثبوت ہے۔

مخلص

خالد رحیم کٹک

ابھی ابھی آپ کا ارسال کردہ اکتوبر ۶۸ء کا "پیام تعلیم"
ملا۔ شکریہ۔

میرے خیال میں مصنف کا پتہ ہندی رسالوں کی طرح کہانی
یا نظم وغیرہ کے خاتمہ پر دے دیا جائے تو اس میں پڑھنے والوں
کو لکھنے والوں سے خط و کتابت میں آسانی رہے گی۔

اقبال مہدی صاحب کا یہ خیال اچھا ہے۔ اسے ضرور
اپنائیے۔

ایک دوسرا مشورہ یہ ہے کہ مصنف کے نام کے ساتھ
شہر کا نام نہ دیا کریں۔

مخلص

قدیر جاوید پرکیمی بریلی

"پیام تعلیم" برابر آتا ہے۔ اس کرم فرمائی کے لیے مشکور
ہوں۔ "پیام تعلیم" سے مجھے بڑا تعلق خاطر ہے۔ کیوں کہ اس نے
میرے بچپن میں میرے علمی و ادبی ذوق کی آبیاری کی ہے۔
عرصے سے بڑی شرم دامن گیر تھی کہ اپنے
رسالے کی کوئی خدمت نہیں ہو سکی۔ چنانچہ آج
ہی ایک تازہ نظم لکھ کر ارسال خدمت کر رہا ہوں۔ ممکن ہے
فی البدیہہ لکھی ہوئی نظم میں کچھ خامیاں آپ محسوس کریں۔
امید ہے بچوں کے لیے ایک دلچسپ اور پسندیدہ چیز ہوگی

تاج الدین اشعر رام نگر بنارس

آپ کا روانہ کردہ اکتوبر کا "پیام تعلیم" کل ملا۔ سرورق
کی تصویر عقاب کا مظاہرہ اور اس کے دوسرے صفحہ پر
بابو اور آڈیناور کی تصویر دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ سبھی
مضامین اور نظمیں پسند آئیں۔ خاص کر نظم "دوسری اکتوبر"
اور "دوست ہمارے" جو ہمارے اسکول کے ٹیچر جناب عاقل شبلی
صاحب نے لکھی ہے پسند آئی۔ ایک چیز کی "پیام تعلیم" میں کمی
محسوس ہوتی ہے اور وہ ہے پہیلی اور لطیفہ گوئی کا سلسلہ۔
اگر آپ یہ سلسلہ شروع کر دیں تو بہتر ہوگا۔

افضل امام کلکتہ

آپ کا پرچہ (رسالہ) برابر ملتا رہتا ہے۔ بچوں کے
علاوہ میں بھی اسے پڑھتا اور پسند کرتا ہوں۔ البتہ اس ماہ کا پرچہ
نہیں آیا۔ ڈاک کی نذر ہو گیا ہوگا۔

ابو تمیم

ماڈل ٹاؤن۔ لاہور

پیام تعلیم دن بدن ترقی پر ہے اور آپ حضرات
کی کاوشوں کا بانگ دہل اعلان کر رہا ہے۔

اظہر افسر حیدرآباد

روس کا زونڈ ۵ واپس بھی آگیا۔

ابھی تھوڑے دن ہوئے روس کے سائنس دانوں نے اپنا ایک اسپیس کرافٹ یا اسپتنک چاند کا حال معلوم کرنے بھیجا تھا۔ لے بھیجے۔ وہ تو چاند کے اردگرد گھوم پھر کر لوٹ بھی آیا۔ جتنے اسپتنک بھیجے جاتے تھے وہیں رہ جاتے تھے۔ یہاں زونڈ ۵ صاحب چاند کے اردگرد خوب سیر تفریح کر کے چاند کے بارے میں معلومات حاصل کر کے اپنا مزے سے واپس بھی آئے۔

یہ زونڈ ۵ ماریشس کے پاس بحرِ عرب میں اترا۔ ایک روسی سمندری جہاز انتظار میں کھڑا تھا۔ اس نے فوراً اسے سنبھال لیا اور بمبئی لے آیا۔ سمندری جہاز سے یہ ٹرک پر سانتا کروز کے اڈے پر لے جایا گیا اور وہاں سے روسی ہوائی جہاز پر روس پہنچ گیا۔ بمبئی کی خلقت اسے دیکھنے کے لیے ٹوٹی پڑتی تھی۔ ہندوستان کے اور باہر کے اخباری نمائندے بہت بے چین تھے۔ بے قرار تھے۔ مگر سب چاند کو مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ روسی والوں نے اسے ایسا پردے میں رکھا کہ ایک جھلک بھی نہ دیکھ پائے۔

[illegible] معجزہ

میرٹھ کی [illegible] کے وہاں

کی شیوا جی یونیورسٹی کے طالب علموں نے اپنے "شرم دان" سے کولھاپور میں ڈاکٹر پوار اسٹوڈنٹ ہاسٹل ہال تعمیر کیا ہے جس میں ۲۰ غریب طالب علم مفت رہ سکیں گے۔

ان طالب علموں میں سے ایک نے عمارت کا نقشہ خود تیار کیا۔ طالب علموں نے خود بنیادیں کھودیں۔

طالب علموں نے خود اپنے ہاتھوں سے اینٹیں بنائیں انھیں بھٹے میں پکایا۔ خود اینٹ پر اینٹ رکھ کر بنیادیں اور دیواریں کھڑی کیں۔ کھمبے بنائے، چھت کی "سلیب" ڈالی۔ ہاسٹل کے کمروں کے علاوہ ان طالب علموں نے ایک کچن (باورچی خانہ) بھی تعمیر کیا، ایک ڈائننگ ہال، گودام کا کمرہ اور دفتر کا کمرہ بھی بنایا۔

ان طالب علموں میں لڑکے بھی تھے اور لڑکیاں بھی، ان میں امیر گھرانوں کے طالب علم بھی تھے اور غریب گھرانوں کے بھی۔

مہاراشٹر کے وزیرِ تعلیم چودھری صاحب اور مرکزی حکومت کے ایجوکیشنل اڈوائزر شری نائیڈو نے اس ہاسٹل کو بنتے ہوئے دیکھا تو اچنبھے میں رہ گئے۔

مرکزی حکومت کے وزیرِ تعلیم شری ترگونا سین شیواجی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر پوار کے ہمراہ وہاں گئے [illegible]

متاثر ہوئے کہ انھوں نے محنت کرتے ہوئے، پسینے میں شرابور نوجوانوں کو اپنے گلے سے لگالیا۔

چراغ سے چراغ جلتا ہے۔

"ہرناکتورہی کی بستی کی ایک خبر ہے کہ اکھل بھارتیہ ودیارتھی پریشد نے فیصلہ کیا ہے کہ چالیس طالب علموں اور پروفیسروں کا ایک گروہ اپنے "شرم دان" سے گھاٹ کوپر کی غریبوں کی بستی میں ایک سڑک بنائیں گے، بستی کی صفائی کریں گے۔ وہاں گندے پانی کی نکاسی کے لیے نالیاں کھودیں گے۔

(ہفتہ وار بلٹز)

دنیا کا سب سے بڑا کتابی میلا

مغربی جرمنی کے سب سے زیادہ مشہور شہر فرنکفرٹ میں ہر سال ایک نمائش لگتی ہے۔ حال ہی میں وہاں کتابوں کی نمائش ہوئی دنیا کی کتابوں کی اب تک کی تمام نمائشوں سے یہ بڑی نمائش تھی۔ اس میں ستاون یورپی۔ ایشیائی۔ امریکی اور افریقی ملکوں کے کتب فروشوں اور ناشروں نے شرکت کی۔ نمائش میں ۲۹۴۴ سٹال تھے۔ جن میں لگ بھگ تین لاکھ کتابیں رکھی گئیں تھیں۔

جرمنی نیوز بلیٹن

دنیا کا سب سے باریک کاغذ:۔

مغربی جرمنی کے ایک اور مشہور صنعتی شہر ڈوسلڈارف کے ایک کاغذ بنانے والے کارخانے میں ایک ایسا باریک کاغذ بنایا گیا ہے جو اب تک دنیا کے تمام کاغذوں میں سب سے زیادہ باریک ہے۔ اگر اس کاغذ کے پندرہ تختے ایک دوسرے کے اوپر رکھ دیے جائیں تو ان کی موٹائی انسانی بال کی موٹائی سے بھی کم ہوتی ہے۔ تعجب ہے کہ یہ کاغذ بہت مضبوط ہے اور اسے پیکنگ کے کام میں لایا جائے گا۔

جرمنی نیوز بلیٹن

دنیا کا سب سے دل کش ہوائی اڈا۔

مغربی جرمنی کے مشہور تجارتی شہر فرنکفرٹ کا ہوائی اڈا دنیا کے سب سے بڑے ہوائی اڈوں میں شمار ہوتا ہے۔ یہاں سے دنیا کی سب بڑی بڑی ہوائی جہاز کمپنیوں کے ہوائی جہاز گذرتے ہیں۔ اب جرمن سرکار اس ہوائی اڈے کو بہت زیادہ توسیع دے رہی ہے۔ اگلے تین چار سال میں یہ دنیا کا سب سے بڑا ہوائی اڈا بن جائے گا۔ جہاں ہر روز ایک لاکھ مسافروں کے آنے جانے کا انتظام ہوگا۔ اور مسافروں کے لیے ہر طرح کے آرام و آسایش کا انتظام رہے گا۔

جرمنی نیوز بلیٹن

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لبرٹی آرٹ پریس دریا گنج دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی سے شائع کیا۔

امّی، امّی، اوپر دیکھیے، میں یہاں ہوں!
(فوٹو فضل الرحمٰن)

No. D. 1467

DECEMBER 1968

Payam - i - Taleem

NEW DELHI-25.

ٹائیٹل مطبوعہ [illegible] پریس دہلی